احمدی احباب کی تعلیم و تربیت کے لیے

یادداشتیں

شہر خوباں

محمد داؤد طاہر

ISBN 978-969-23059-1-4

مجلّد

بارِاوّل ---------------- ۲۰۱۷ء

تعداد ---------------- ۱۰۰۰

شہرِ خوباں — Shehr-e-Khooban

محمد داؤد طاہر — Muhammad Daud Tahir

مطبع: ضیاء الاسلام پریس، چناب نگر (ربوہ)

email:zipress@gmail.com

صفحات: ۸۴۸

قیمت: ۲۰۰۰ روپے

Purchased 2000/-
26/11/2017

نواب محمد الدّین

کے نام

جن کی مساعیٔ جمیلہ سے مرکزِ سلسلہ کے لیے اراضی کا حصول ممکن ہوا

''شہرِ خوباں'' خوبیوں کی کان ہے
احمدیت کا یہ دل ہے، جان ہے
یہ زمیں کس نے خریدی، کس طرح
سننے والوں کے لیے اعلان ہے
کارنامہ ہے محمد دین کا
بھول سکتا کون یہ احسان ہے؟
اس کا بانی لاجَرم، ذی شان تھا
اس لیے یہ شہر بھی ذی شان ہے
محیطِ نور و ہدایت ہے یہی
نُورافشانی یہاں ہر آن ہے
یہ وہ دل جس میں ہے دردِ گُل جہاں
گُل جہاں کے درد کا درمان ہے
مرکزِ دیں ہے زمانے پر محیط
نور کے مَبدا کی کیسی شان ہے

(عبدالسّلام اسلام)

فہرست

دیباچہ

ربوہ کی تاریخ اور کلچر کے حوالے سے میری پہلی کتاب ''قریۂ جاوداں'' کے نام سے تقریباً دو سال پہلے منصّہ شہود پر آئی تھی۔ میں نے اس کتاب میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۰ء تک کے ربوہ کی تاریخ اپنے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ میری اس کوشش کو بالعموم بنظرِ تحسین دیکھا گیا۔ میں نے اس کتاب کا مسوّدہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی خدمت میں بغرضِ ملاحظہ و دعا بھجوایا تھا۔ حضور نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوصف یہ مسوّدہ ملاحظہ فرمایا اور اپنے خط مرقومہ ۲۳ نومبر ۲۰۱۴ء میں تحریر فرمایا:

''اسے جستہ جستہ میں نے پڑھا ہے...... ربوہ کی بستی کی بہت سی یادیں اُبھر کر سامنے آ گئیں...... آپ کی کتاب پڑھ کر ربوہ کے گلی کوچے اور پرانے لوگ، ہنستے مسکراتے، قانع، پیار کرنے والے، عبادت کا حق ادا کرنے والے، ذکرِ الٰہی سے زبانوں کو تر رکھنے والے بزرگ نظروں کے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک آپ کے والدِ محترم مولانا محمد یعقوب طاہر صاحب تھے۔ لباس سادہ، چہرے پر مسکراہٹ۔ ہم بچے تھے ہم سے ہمیشہ مسکرا کر اور بڑے پیار سے بات کرتے اور یوں لگتا کہ دل سے یہ پیار پھوٹ رہا ہے۔ شاید اس کا اس لیے بھی زیادہ اظہار ہوتا کہ حضرت مسیح موعود کے ساتھ خونی رشتہ بھی ہے۔ مولانا صاحب ایک مصروف شخصیت لیکن کوئی بے چینی نہیں۔ حضرت مصلح موعود کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا لیکن خوب نبھایا۔ محنت، محنت اور محنت ان کا شیوہ لیکن میں نے اس کے باوجود ان کے چہرے پر سختی اور خشکی نہیں دیکھی۔ اسی طرح ابراہیم ناصر صاحب حساب کے استاد ہونے کے باوجود مسکرانے والے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ایسے خاندان کی نسل میں سے ہیں...... اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے کہ بہت سے پرانے لوگوں کی یادیں آپ نے تازہ کروا دیں۔''

حضور کے یہ الفاظ میرے لیے اور میری آنے والی نسلوں کے لیے باعثِ صد افتخار ہیں اور حضور کی رائے کے بعد کسی اور تبصرے کا حوالہ سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے لیکن مجھے خوشی ہے کہ پروفیسر چوہدری محمد علی اور ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا۔ کتاب چھپنے کے بعد میرے کرمفرما، پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے الفضل میں اس پر ایک وقیع تبصرہ لکھا۔ اسی طرح احمدیہ گزٹ، کینیڈا اور امریکہ سے چھپنے والے جماعتی رسالہ ''النور'' نے بھی اس پر تبصرے شائع کئے۔ سید کمال یوسف، مربی سکینڈے نیویا؛ مبارک عابد، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج، ربوہ؛ ثناء اللہ پروفیسر گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، شیخوپورہ؛ ڈاکٹر احسان اللہ ہاشمی، لاہور اور عبدالعزیز منگلا نے بھی قریۂ جاوداں پر خوبصورت تبصرے لکھ کر ارسال کئے جو کسی مناسب وقت پر کسی جماعتی جریدے میں شائع کئے جائیں گے۔

بہت سے دوستوں نے ٹیلیفون، خطوط یا ای میل کے ذریعے اس کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا چنانچہ

حافظ مظفر احمد، صدر مجلس انصار اللہ مرکزیہ نے کتاب نظر سے گزرتے ہی بزبانِ انگریزی اپنے انتیس اپریل ۲۰۱۵ء کے ٹیلیفونک پیغام میں لکھا: ''جسٹ ریڈ فیوُ پیجز آف یوُر بُک۔ ویل ڈَن۔''

داتا زید کا سے تعلق رکھنے والے حمید اللہ ظفر، نیشنل سیکرٹری تحریک جدید، جرمنی نے اپنے چودہ اپریل ۲۰۱۵ء کے خط میں لکھا: ''آپ کی سفری آپ بیتیاں شہرۂ آفاق ہیں اور ان کے ذریعے ہی آپ سے تعارف ہے۔''

پھر قریۂ جاوداں میں گھٹیالیاں کا ذکر پڑھ کر اس جگہ کے بارے میں اپنی بعض یادداشتوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا: ''ایک مرتبہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی ہدایت پر...... میجر محمد عبداللہ مہار جوٹی آئی کالج گھٹیالیاں کے ڈائریکٹر تھے...... ثاقب زیروی صاحب کو گھٹیالیاں لے کر آئے۔ آپ نے کالج کے طلبہ کو اپنی نظم:

اس موڑ کے آگے منزل ہے، بیباک ترانے گاتا جا

سے لطف اندوز کیا تھا۔ پھر ہفت روزہ لاہور کے کالم ''جہاں میں ہوں'' میں اس سفر کی تفصیل اور ایک لمبی نظم بھی لکھی جس میں شہری اور دیہاتی درسگاہوں کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اگر وہ نظم کہیں سے حاصل کر کے شاملِ اشاعت ہوتی تو مزہ میں اور اضافہ ہو جاتا۔ بہرحال اس کا ایک شعر مجھے زبانی یاد ہے:

جب کبھی آتا ہے شہری درسگاہوں کا خیال
پھیل جاتی ہے دلِ ثاقب میں اک گردِ ملال''

استاذی المکرم ماسٹر محمد ابراہیم سارچوری کے صاحبزادے، محمد شعیب طاہر، مربی سلسلہ نے اپنے خط مرقومہ ۱۱ جون ۲۰۱۵ء میں اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''یہ کتاب بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز ہے اور ربوہ کے پرانے باسیوں کے لیے یادوں کا ایک خزانہ ہے۔ جس محنت اور عرق ریزی سے یہ کتاب لکھی گئی ہے آنمکرم اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ نے جس محبت سے ربوہ کے پرانے بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور پھر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے لواحقین سے رابطہ کر کے ان کے حالات زندگی جمع کئے ہیں یقیناً ایک محنت طلب کام تھا جو خدا کے فضل سے آپ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔''

عبدالعزیز ڈوگر، مہتمم مقامی ربوہ، جو اُن دنوں انگلینڈ میں مقیم تھے اور بوجہ کمزوری صحت خود لکھنے سے قاصر تھے نے اپنے ایک صاحبزادے کے ذریعے مجھے اپنے خط میں لکھا: ''آپ نے کچے مکانوں اور کچے سکول سے شروع کر کے پکے کوارٹروں اور تعلیم الاسلام ہائی سکول اور کالج کی خوب سیر کروائی۔ سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ بہت پیارے وجود ربوہ میں موجود تھے جن کا ذکر آپ نے کر کے ایک ادیب کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔''

فیکٹری ایریا ربوہ کے رہنے والے عمر حیات مقیم انگلستان ربوہ آئے تو انہیں قریۂ جاوداں کے مطالعے کا موقع ملا۔ وہ اپنے خط محررّہ ستائیس اپریل ۲۰۱۶ء میں لکھتے ہیں: ''اس بار ربوہ آتے ہی آپ کی شاندار تصنیف قریۂ جاوداں کا بہت شہرہ سنا...... لائبریری سے مل گئی۔ تقریباً ڈھائی بار پڑھی۔ جناب پروازی صاحب کی احمدیہ کلچر کے بعد آپ کی کتاب نے بہت مزہ دیا۔ تقریباً ہر کردار جو آپ نے زندۂ جاوید کر دیا میرا دیکھا سنا ہے۔''

احمدی شاعرہ اور مصنفہ، امۃ الباری ناصر نے اپنی ای میل میں لکھا: ''اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ سے شاندار تاریخی اہمیت کا کام کروالیا ہے۔ خوبصورت زبان و بیان سے مرصّع قریۂ جاوداں قادیان کے دبستانِ ادب میں ایک جاوداں اضافہ ہے۔ کتاب ڈوب کر پڑھی ہے اور رَج کے لطف لیا ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

میں آپ سے تین سال بڑی ہوں۔ ربوہ کا یہ دور دیکھا بھالا ہے مگر آپ نے جس طرح یاد رکھا ہے اور جُزرسی سے بیان کیا ہے لاجواب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت و سلامتی میں برکت دے اور اپنی رضا کے ساتھ بہت سے کام کروالے۔ آمین۔''

ہالینڈ میں مقیم میرے ایک عزیز دوست، سید الیاس بشیر احمد نے اپنی ای میل میں لکھا (انگریزی سے آزاد اردو ترجمہ):

''یقیناً میرا یہ مقام نہیں کہ میں ایک ادبی شہ پارے جسے طویل تحقیق اور بڑی محنت کے بعد بے حد خوبصورت انداز میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا ہو پر کوئی تبصرہ کروں تاہم میں یہ کہے بنا بھی نہیں رہ سکتا کہ میرے نزدیک آپ کی یادداشتیں ہر اس شخص کو جس کا ربوہ سے دُور کا بھی تعلق ہے پسند آئیں گی اور وہ ان سے بے حد لطف اندوز ہوگا۔''

چوہدری ظہور احمد باجوہ، پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے صاحبزادے، ظہیر باجوہ نے اپنی ۶ ستمبر ۲۰۱۶ء کی ای میل میں لکھا (انگریزی سے آزاد اردو ترجمہ):

''میں نے آپ کی کتاب ایک دوست سے حاصل کی ہے اور اس کے ۴۷۵ صفحے پڑھ چکا ہوں۔

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر جماعت کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ سچ پوچھیں تو آپ کی اس کوشش کے اعتراف کے لیے مجھے کوئی موزوں لفظ نہیں مل رہا۔ ٹھیک یُوں کہنے سے کم از کم میرا منشا تو پورا نہیں ہوتا۔

افسوس! مجھے آپ کے ساتھ کبھی وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا۔ بس گزشتہ سال ناظر امور عامہ کے دفتر میں ہماری مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا کبھی واشنگٹن آنا ہو تو آپ میرے پاس ہی ٹھہریں اور اگر میرا لاہور آنا ہوا تو میں ان شاء اللہ آپ سے ضرور ملوں گا۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔''

حضرت صاحبزادہ عبداللطیف رئیسِ کابل کے پوتے اور سیّد ابوالحسن قدسی کے صاحبزادے، فہیم جو سکول کی پہلی جماعت سے میرے ہم جماعت تھے اپنی ۸ ستمبر ۲۰۱۶ء کی ای میل میں رقمطراز ہیں (انگریزی سے آزاد اردو ترجمہ):

''مجھے بالآخر آپ کی کتاب مل ہی گئی۔ یہ ضخیم کتاب آپ کی محنت اور مقصدیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میرے نزدیک آپ نے اس جگہ جہاں ہم سب لوگ پھلے پھولے اور سکول اور کالج جاتے رہے کی تاریخ

مرتب کر کے ایک بے مثال کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کو اس کتاب سے اندازہ ہو سکے گا کہ ربوہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعد میں ایک بارونق شہر بن گیا کی ابتدا کیسے ہوئی تھی۔ کتاب کے آغاز میں آپ نے نعیم قدسی کی نظم ''نذرِ ربوہ'' میں سے کچھ شعر دیئے ہیں۔ میرے نزدیک اس نظم کو اس محبوب بستی کے بارے میں کہی گئی نظموں میں سے بہترین قرار دیا جاسکتا ہے۔''

آصف منصور ڈار، مربی سلسلہ نے اپنی ۳ نومبر ۲۰۱۶ء کی ای میل میں لکھا کہ میں ''قریۂ جاوداں خوب مزے لے لے کر پڑھ رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ کتاب ربوہ کے ابتدائی دور کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ نہایت عمدہ تحقیق اور پُرمغز تحریر ہے۔''

بعض دوستوں نے اس کتاب کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا اور پھر اُن اغلاط کی نشان دہی کی جو کمپوزنگ کی خرابی کے باعث اس میں در آئی تھیں۔ اس حوالے سے تین نام اہم ہیں۔ مولانا ابوالمنیر نورالحق کے بڑے صاحبزادے، منیرالحق شاہد مقیم کینیڈا نے اس کتاب کے مطالعے کے بعد اغلاط کی ایک فہرست مجھے بھجوائی۔ شیخ محبوب عالم خالد، صدر صدر انجمن احمدیہ کے پوتے اور شیخ ناصر احمد خالد کے صاحبزادے، انصر خالد نے بھی اسی طرح کی ایک فہرست مجھے ارسال کی۔ علیٰ ھذا القیاس پروفیسر ثناء اللہ نے بھی اس کتاب میں بعض اغلاط کی نشاندہی کی۔ میں ان سب دوستوں کا ممنون ہوں اور ان ہی غلطیوں کی اصلاح کے ارادے سے اس کتاب کو دوبارہ دیکھ رہا تھا کہ مجھے سید کمال یوسف، مربی سکینڈے نیویا کا ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے اس کتاب میں رہ جانے والی بعض اہم کمیوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ اِس کتاب میں جامعہ احمدیہ اور جماعت کے ان باقی تعلیمی اداروں کا بھی تفصیلی ذکر ہونا چاہئے تھا جنہوں نے جماعت کی تعلیمی ترقی اور تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میں نے موصوف کو بتایا کہ میں نے قریۂ جاوداں میں صرف اُن اداروں یا اشخاص کا احاطہ کیا ہے جن کے ساتھ ربوہ میں قیام کے دوران میرا کسی نہ کسی طور واسطہ رہا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ میں نصرت گرلز ہائی سکول میں پہلی کلاس میں پڑھتا رہا ہوں چنانچہ میں نے اس کا ذکر کر دیا ہے لیکن فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول یا جامعہ نصرت یا جامعہ احمدیہ سے میرا کبھی براہِ راست کوئی واسطہ نہیں رہا لہٰذا میں نے اُن کے ذکر سے اجتناب کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کمال یوسف میرے اس جواب سے مطمئن ہو پائے یا نہیں تاہم میں بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے اس تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جس کی طرف موصوف نے اشارہ کیا ہے چنانچہ میں نے اِن اداروں کے متعلق اُن مردوں اور خواتین سے مدد چاہی جو ابتدائے ربوہ میں یہاں پڑھتے رہے ہیں اور جنہیں اُس زمانے کے معلّمین اور معلّمات کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں۔ بظاہر یہ بات معمولی نظر آتی ہے لیکن یقین کیجئے مجھے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے بے شمار احمدیوں کے ساتھ رابطہ کرنا پڑا اور میں نے اس سلسلے میں شاید کئی ہزار ٹیلیفون کئے اور لاتعداد اِی میلز بھجوائیں۔ اِس کوشش کے نتیجے میں میرے پاس اتنا مواد جمع ہو گیا جسے مناسب قطع و برید اور ترتیب کے بعد آپ کی خدمت میں ''نصرت گرلز ہائی سکول اور جامعہ نصرت'' اور ''فضل عمر جونیئر ماڈل سکول'' کے عنوانات کے

تحت سات مختلف ابواب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کا ایک بڑا حصہ تعلیم الاسلام کالج کے اُن سابق طلبہ کے بارے میں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عملی زندگی میں اپنے اپنے شعبہ میں شہرت سے نوازا۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب میں ایک اور جگہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ایسے طلبہ کی فہرست تیار کرنا ایک مشکل کام تھا۔ کامیابی اور شہرت کے معیار پر سبھی قارئین کا متفق ہونا ضروری بھی نہیں تاہم میں نے ان میں سے کچھ طلبہ سے رابطہ کر کے ان کے بارے میں صحیح ترین معلومات آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس میں غلطی کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یوں بھی اس فہرست کے مکمل ہونے کا دعویٰ حقیقت کے منافی ہوگا لہٰذا تعلیم الاسلام کالج کے جن معروف اولڈ بوائز کا ذکر اس کتاب میں نہیں آ سکا میں اُن سے معذرت خواہ ہوں اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں میری بدنیتی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف میری کم علمی ہے۔

کتاب کا یہ حصہ تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: بابِ اول میں کالج کے ان طلبہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے دوران یا احمدیت کے مقدس نام پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے زندہ جاوید ہو گئے۔ ان طلبہ میں سے کچھ پاکستان ایئرفورس میں جہاز اڑانے پر مامور تھے لیکن اسی دوران جہاز کریش ہو جانے کی وجہ سے راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ کچھ طلبہ فوج میں کمشنڈ آفیسرز کے طور پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈیوٹی کے دوران اپنی جان اپنے وطن کی نذر کر دی جبکہ کچھ طلبہ کو محض احمدی ہونے کی وجہ سے مخالفین کے ہاتھوں راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا گیا۔ دوسرے باب میں ان نامور طلبہ کا ذکر ہے جو کالج میں مجھ سے سینئر تھے یا میرے ساتھ داخل ہوئے جب کہ تیسرے باب میں ان دوستوں کا ذکر ہے جو عمر میں مجھ سے چھوٹے اور کالج میں مجھ سے جونیئر تھے۔

ایک باب میں نصرت جہاں اکیڈمی انٹرمیڈیٹ کالج، ربوہ کے ایک سابق طالب علم کا ذکر ہے جس نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کیا تھا لیکن پاک افغان بارڈر پر اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران شرپسندوں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ میرا اشارہ میجر افضال احمد کی طرف ہے جو بعد از شہادت پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ربوہ میں دفن ہوئے۔

میں نے اس کتاب میں بعض واقفینِ زندگی کے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ باقی واقفینِ زندگی کی قربانیاں کچھ کم ہیں یا ان کے حالات قابلِ بیان نہیں ہیں۔ جماعت کی تاریخ تو لازوال قربانیوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ یہاں صرف ان بزرگان کا ذکر کیا گیا ہے جن سے یا تو میں ذاتی طور پر متعارف تھا یا مجھے کسی اور حوالے سے ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل تھیں۔ الاّ ماشاء اللہ اب یہ سارے بزرگان وفات پا چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے اس کتاب کا نام ''شہرِ خُوباں'' کیوں تجویز کیا ہے۔

اپنی معروضات ختم کرنے سے پہلے میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری

درخواست پر اس کتاب کے متعلق مطلوبہ مواد فراہم کیا۔ یہاں ان سب کے نام گنوانا ضروری نہیں۔ ان کا ذکر اس کتاب میں اپنی اپنی جگہ موجود ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ انہوں نے ربوہ کی تاریخ کو محفوظ کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے جس کا صحیح اندازہ ہم سے بعد آنے والوں کو ہی ہو سکے گا۔

قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ''شہرِ خُوباں'' کے جملہ ابواب کے عناوین اشعار پر مشتمل ہیں۔ یہ اشعار احمدی شعرائے کرام کے کلامِ بلاغت اثر میں سے لیے گئے ہیں۔ اِن شعرا میں امتہ القدیر ارشاد، ثاقب زِیروی، رفعت شہناز، سجاد احمد، سعید احمد اعجاز، صدیق امرتسری، عبدالسلام اختر، فیض چنگوی، محمود احمد مرزا، عبدالصمد قریشی اور ناظر گورداسپوری شامل ہیں۔ اب ان میں سے بہت سے دوست ہم میں موجود نہیں رہے۔ خدا تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے اور آنے والی نسلوں کو ان کے ادبی ورثہ سے متمتع ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

میری بھانجی، عزیزہ امتہ الشافی جو مربی سلسلہ، قریشی سعید احمد اظہر کی چھوٹی صاحبزادی ہیں اور میرے بھانجے زبیر احمد خالد سے بیاہی ہوئی ہیں حسبِ سابق اس کتاب کی تصنیف میں بھی میری معین و مددگار رہی ہیں اور میرے ایک اشارے پر خلافت لائبریری، دفتر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ یا بعض اور جگہوں سے مطلوبہ حوالہ جات تلاش کر کے مجھے بھجواتی رہی ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے اور صحت و عافیت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔ میں یہ بات کسی مبالغے کے بغیر کہہ رہا ہوں کہ عزیزہ امتہ الشافی کے تعاون کے بغیر میں یہ کتاب کبھی مکمل نہ کر پاتا۔

میں نے اس کتاب کا مسوّدہ بھی سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی خدمت میں بغرض مطالعہ و دعا ارسال کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ حضور نے اپنی تمام تر جماعتی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے مطالعہ کے لیے وقت نکالا اور پھر اپنے خط محررہ ۲۶ مئی ۲۰۱۷ء کے ذریعہ اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ یہ حضور کی اپنے ایک غلام پر شفقت ہے جس پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرے کم ہے۔ بطور تبرک حضور کے خط کا عکس اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے تاہم افادۂ احباب کے لیے اسے ذیل میں نقل بھی کیا جا رہا ہے:

''آپ کی نئی کتاب ''شہرِ خوباں'' بھی جستہ جستہ دیکھی۔ کئی بزرگوں اور کئی اساتذہ کا ذکر پڑھا۔ ان کے ذکر ربوہ کی یادوں کو ایک مرتبہ پھر نظروں میں ایک فلم کی طرح لے آئے۔ آخر پر آپ نے کے جی سکول کا ذکر کیا۔ میں بھی اس کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھا۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ ابتداء میں ہم چھ سات لڑکے لڑکیاں تھے بلکہ میں چند دن اکیلا لڑکا تھا۔ پھر یہ تعداد دس پندرہ تک ہوگئی۔ آدھی چھٹی کے وقت ہمیں سکول کی طرف سے بسکٹ وغیرہ بھی کھانے کو دیئے جاتے تھے۔ آپ نے ریحانہ ستار صاحبہ کا ذکر کیا ہے جو بڑی قواعد کی پابند ہیڈ ٹیچر تھیں۔ ریحانہ ستار صاحبہ سے خلافت کے بعد بھی ملاقات ہوتی رہی۔ اِنہیں وہ پرانی باتیں اور یادیں بھی یاد تھیں۔ پھر مسز قدسیہ ارشاد * بھی میری استانی رہیں اسی طرح دوسری تمام استانیاں جنہوں نے بڑی محنت سے تمام بچوں میں دنیاوی تعلیم کے علاوہ دین سے محبت پیدا کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔ اس عرصہ

* نوٹ از مصنف: غالباً امتہ القدیر ارشاد مراد ہیں۔

میں مبارک ساقی صاحب کی اہلیہ جو انگریز تھیں اور شادی سے پہلے کچھ عرصہ ربوہ میں رہیں وہ ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں اور کیونکہ ہمیں براہِ راست انگریزی سمجھنا مشکل تھا اس لیے میجر عارف زماں صاحب کی اہلیہ عموماً ان کے ساتھ کلاس میں ہوتی تھیں۔ ساقی صاحب کی شادی بھی اُن ہی دنوں میں ربوہ ہوئی اور وہی عورت جو چند دن پہلے بغیر پردے کے تھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ پورا نقاب گرائے ہوئے ربوہ میں پھرتی نظر آتی تھیں۔ پھر ساقی صاحب کے بطور مبلغ باہر جانے کی وجہ سے جلد ہی وہ چلی گئیں۔ بہر حال ہمارا ربوہ ایک سادہ سا شہر تھا اور سادہ منش لوگوں کی بستی تھی لیکن اب کھلا شہر ہونے کی وجہ سے بعض قباحتیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ نئی ایجادوں نے وہ خلوص اور وہ سادگی نہیں رہنے دی۔ شاید اب بزرگوں میں بھی وہ بے ساختگی نہیں رہی۔ نئی نسل کے ساتھ بڑوں کی زندگی بھی شاید زیادہ تیز ہوگئی ہے۔

بہر حال دعا ہے کہ ربوہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ربوہ کے باسیوں میں بے ساختگی، سادگی اور محبت اور پیار ہمیشہ پیدا ہوتا رہے اور قائم رہے۔

آپ کا شکریہ کہ آپ ان یادوں کی جگالی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت ہر لحاظ سے بابرکت فرمائے اور پڑھنے والوں کو اس سے خوب فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔''

ارادہ تو میرا پہلے بھی یہ تھا لیکن حضور کے اس خط سے میرے اس ارادے کو مہمیز ملی کہ میں اس سکول میں حضور کے داخلے اور قیام کے بارے میں بنیادی معلومات جمع کر کے اس کتاب میں درج کروں۔ میں نے جب یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ اُس زمانے کا داخل خارج رجسٹر فی الوقت موجود نہیں ہے۔ اس رجسٹر سے اس سکول میں حضور اور حضور کے ہم جماعتوں کی نہ صرف تواریخِ داخلہ کا پتا چل سکتا تھا بلکہ حضور کے کلاس فیلوز کے ذاتی کوائف یعنی ولدیت اور رہائشی پتا بھی معلوم ہو سکتا تھا۔ سکول میں داخلے کی درخواستیں بھی غالباً ضائع ہو چکی ہیں البتہ معلوم ہوا کہ دو سال کے حاضری رجسٹر موجود ہیں جن میں سے پہلا فروری ۱۹۵۸ء سے شروع ہوتا ہے اور دسمبر ۱۹۵۸ء پہ ختم ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا جنوری ۱۹۵۹ء سے دسمبر ۱۹۵۹ء تک کا ہے۔ اِن رجسٹروں سے وقتاً فوقتاً سکول چھوڑ کر جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں اور نئے آنے والے طلبہ کے ناموں کا بھی پتا چل جاتا ہے۔

ان معلومات کی بنیاد پر میں نے اس کتاب میں شامل کرنے کے لیے ایک نوٹ تیار کر کے حضور کی اجازت کے لئے بھجوایا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ حضور نے اس نوٹ کو کتاب میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے اپنے ۲۸ جون ۲۰۱۷ء کے خط میں لکھا:

''آپ کا خط ملا۔ آپ نے اپنی کتاب ''شہرِ خوباں'' میں کے جی سکول کے بارے میں جو نوٹ شامل کرنے کے لیے تیار کیا ہے اسے بے شک شامل کر لیں۔

اس میں عمر احمد غالباً مرزا عمر احمد صاحب مرحوم ابن مکرم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب مرحوم ہیں۔ اسلم خالد صاحب آج کل میرے ساتھ پی ایس کے دفتر میں ہی کام کر رہے ہیں۔ رفیق اختر روزی صاحب بھی

لندن میں ہی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے لڑکوں، لڑکیوں کو بھی پہچان لیا ہے۔

میں اس سکول میں چوتھی تک پڑھا ہوں۔ پھر کچھ دیر گھر میں پڑھ کر چھٹی میں ٹی آئی سکول میں داخل ہوگیا تھا اس لیے میں نے میٹرک ان میں سے اکثر سے شاید ایک سال پہلے کرلیا تھا۔ ''شاید'' اس لیے لکھ رہا ہوں کہ عمر میں جو مجھ سے ایک سال بڑے لڑکے لڑکیاں تھے انہیں کے جی سکول میں ہی ایک سال آگے کر دیا گیا تھا۔ یا شاید پڑھائی کا معیار دیکھ کر انہیں آگے کیا ہو لیکن اس وقت یاد نہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے آپ کی کتاب ''شہرِ خوباں'' کی اشاعت ہر لحاظ سے بابرکت فرمائے۔ آمین''

یہ نوٹ اس دعا کے ساتھ شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور کو صحت و عافیت والی لمبی فعّال زندگی اور مہماتِ دینیہ میں کامیابی عطا فرمائے۔

میں اس موقع پر تین دیگر حضرات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری درخواست پر اس کتاب کا مسوّدہ ملاحظہ فرمایا اور پھر اس پر اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا۔ ان میں سے سرِفہرست صاحبزادہ مرزا خورشید احمد، ناظر اعلیٰ و صدر، صدر انجمن احمدیہ پاکستان ہیں۔ آپ کو ان ہی دنوں اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا اور صحت کے کئی مسائل بھی درپیش تھے لیکن آپ نے میرا مان رکھا اور اس کتاب کا ابتدائیہ لکھا جو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ اور خدمتِ دین والی لمبی زندگی سے نوازے۔

دوسرے محترم بزرگ اور میرے کرمفرما جن کا ذکر یہاں مقصود ہے ڈاکٹر ناصر احمد ہیں جو ادبی حلقوں میں پرویز پروازی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کسی جگہ ذکر کر چکا ہوں میں بچپن میں ان کا پڑوسی، تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ان کا شاگرد اور تعلیم الاسلام کالج میں ان کا سٹوڈنٹ رہا ہوں لہٰذا وہ مجھ سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں کمزوریٔ صحت کا سامنا ہے میں نے ان سے ای میل کے ذریعہ رابطہ کر کے مسوّدہ بھجوانے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے جیسے تیسے اس مسوّدے کا مطالعہ کیا اور پھر دیباچہ لکھا جو شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ یہ مختصر سا دیباچہ اعلیٰ ادبی ذوق کا حامل ہے۔ آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ کتاب چھپنے پر اس پر تفصیلی تبصرہ لکھیں گے۔ خدا تعالیٰ کرے کہ یہ موقع پیدا ہو اور ہم ان کی ایک اور زندۂ جاوید تحریر سے لطف اندوز ہو سکیں۔

تیسرے دوست جن کا ذکر یہاں ضروری سمجھتا ہوں ڈاکٹر عبدالکریم خالد ہیں جو ایک منجھے ہوئے ادیب اور نامور شاعر ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے لیکن دنیائے ادب میں کہیں بلند مقام پر فائز ہیں۔ مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس ماحول سے بخوبی واقف ہیں جس کی عکاسی اس کتاب میں کی گئی ہے۔ آپ مختلف سرکاری کالجوں میں پڑھاتے رہے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کا درس و تدریس کا شغل جاری ہے۔ میری خواہش پر انہوں نے بھی اس کتاب کا مسوّدہ ملاحظہ فرمایا اور پھر اپنی قیمتی رائے سے نوازا جو ''آئینہ تمثال دار'' کے عنوان سے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ تینوں تحریریں جماعت کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور دلچسپی کے

ساتھ پڑھی جایا کریں گی۔

میں نے اس کتاب کا مسوّدہ حسبِ قواعد نظارت اشاعت کی منظوری کے لیے پیش کیا تھا۔ نظارت اشاعت نے مسوّدے پر ضروری غور و خوض کے بعد اپنے خط، روانگی نمبر ۱۰۸۔ ای میل محرّرہ تیرہ اگست ۲۰۱۷ء کے ذریعے اس کی حتمی منظوری عنایت فرمائی ہے جس کے لیے راقم ناظر صاحب اشاعت کا تہِ دل سے ممنون ہے۔

قریۂ جاوداں کی اشاعت سے ذرا پہلے مجھے اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ، عزیزہ کی اچانک وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ انہیں اس کتاب کی اشاعت کا شدت سے انتظار تھا لیکن قضائے الٰہی سے وہ اس کی اشاعت سے چند دن پہلے ہمیں سوگوار چھوڑ گئیں۔ اب کے ایک اور حادثہ رونما ہوا ہے۔ میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ، صادقہ جو قریشی سعید احمد اظہر، مربی سلسلہ کی اہلیہ تھیں اور ربوہ میں مقیم تھیں اور جو ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے ''شہرِ خوباں'' کی تصنیف کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت دریافت کرتی رہتی تھیں اور بے چینی سے منتظر تھیں کہ کب یہ کتاب چھپ کر ان کے ہاتھوں میں پہنچے گی نو اور دس جولائی ۲۰۱۶ء کی درمیانی شب دل کے شدید حملے کے سبب وفات پا گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

صادقہ مجھ سے بڑی لیکن ہمشیرگان میں سے سب سے چھوٹی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار خوبیوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ بے انتہا صفائی پسند تھیں اور بچپن سے ہی امورِ خانہ داری میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ وہ اپنے ماحول کی صفائی کو ہر چیز پر مقدم رکھتیں۔ مجھے یاد ہے وہ اپنی شادی سے قبل دن ڈھلتے ہی صحن میں جھاڑو لگاتیں، چھڑکاؤ کرتیں اور سب ہی افرادِ خانہ کے لیے جن کی تعداد اُن دنوں سات تھی چارپائیوں پر بستر بچھا دیتیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے گھر میں صبح دس بجے تک سب امور سے فارغ ہو جاتیں حتّٰی کہ کھانا بھی تیار کر لیتیں۔ فارغ وقت مطالعہ یا اپنے عزیزوں سے میل جول اور لجنہ کے کاموں میں گزارتیں۔

وہ بی اے میں پڑھ رہی تھیں جب ان کی شادی ہوگئی۔ اس زمانے میں مربیان کی تنخواہیں کم اور مراعات نہ ہونے کے برابر تھیں لہٰذا ان کی زندگی کا بیشتر حصہ عسرت میں گزرا تاہم انہوں نے ان حالات کا ہمت سے مقابلہ کیا اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ بے حد مہمان نواز تھیں۔ مہمان کی آمد پر خوش ہوتیں اور اپنی طاقت سے بڑھ کر اس کی خاطر مدارت کرتیں۔ انتہائی صابر و شاکر تھیں۔ جب ان کے میاں قریباً آٹھ سال تک نائجیریا، کینیڈا اور بعدۂ کینیا میں تعینات رہے تو انہوں نے یہ وقت چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ربوہ میں تنہا گزارا۔ ظاہر ہے چھوٹے بچوں کے ساتھ تنہا وقت گزارنا آسان نہیں ہوتا اور صاحبِ خانہ کی عدم موجودگی میں کئی طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں لیکن انہوں نے ہر مشکل خاموشی سے برداشت کر لی اور کسی کو اپنی پریشانیوں کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ خلافت سے والہانہ عقیدت رکھتی تھیں، حضور کی خدمت میں دعائیہ خطوط لکھتی رہتیں، الفضل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتیں، حضور کا تازہ خطبہ ضرور سنتیں، لجنہ اماء اللہ کے کام میں راحت محسوس کرتیں اور محلّہ کی خواتین کے ساتھ میل جول رکھتیں۔ عزیز و اقارب سے مستقل رابطہ ان کی ایک بہت بڑی خوبی تھی۔ غریبوں کی ممکن حد تک مدد کرتیں۔ یہ ان کا حسنِ اخلاق ہی تھا کہ کوٹ امیر شاہ کی طرف سے دودھ لے کر آنے والی ایک



مصنف

نوجوان خاتون، بلکہ عملاً ان کی مرید ہوگئی اور دودھ کی تقسیم کے بعد دن کا بیشتر حصہ ان ہی کے پاس گزارنے لگی اور معاوضے کے لالچ کے بغیر سالہا سال ان کی خدمت میں دل و جان سے حاضر رہی۔

اپنی صحت کا خیال رکھتیں۔ لمبی سیر ان کی پرانی عادت تھی۔ ان کی وفات سے سات آٹھ سال پہلے جب ان کے چھوٹے بیٹے، عمران اظہر کو اس کے آجر کی طرف سے کار مل گئی تو بھی وہ پیدل ادھر ادھر آنے جانے کو ترجیح دیتیں۔

خدا نے فضل کیا اور ان کے چاروں بچوں کی شادیاں ان کی زندگی میں ہوگئیں۔ اپنی بہوؤں کو ماں سی محبت دی اور کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو اُن کی دلآزاری کا موجب ہوتی۔

ان کے شوہر ۲۰۰۵ء میں وفات پا گئے تھے۔ انہوں نے اس حادثہ پر مثالی صبر کا مظاہرہ کیا اور جزع فزع سے مجتنب رہتے ہوئے

راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تیری رضا ہو

کی عملی تفسیر بنی رہیں۔

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میری ان دونوں ہمشیرگان کی مغفرت فرمائے اور ہمارے خاندان کو مزید ابتلاؤں سے محفوظ رکھے میں بصد عجز و انکسار یہ کتاب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اس کا آغاز حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے اس خط کی نقل سے کیا جا رہا ہے جو آپ نے اس کتاب کا مسوّدہ ملاحظہ فرمانے کے بعد عاجز کو تحریر فرمایا تھا۔

محمد داؤد طاہر
۵۲۔سی/۶، سرور روڈ
لاہور کینٹ

مورخہ: ۱۵ ستمبر ۲۰۱۷ء

واجعل لي من لدنك سلطانا نصيرا
إنا فتحنا لك فتحا مبينا
لقد نصركم الله ببدر وأنتم أذلة

امام جماعت احمدیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالنّاصر

Z-26-05-17

مکرم محمد داؤد طاہر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی نئی کتاب "شہر خوباں" بھی جستہ جستہ دیکھی۔ کئی بزرگوں اور کئی اساتذہ کا ذکر پڑھا۔ ان کے ذکر ربوہ کی یادوں کو ایک مرتبہ پھر نظروں میں ایک فلم کی طرح لے آئے۔ آخر پر آپ نے کے جی سکول کا ذکر کیا۔ میں بھی اس کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھا۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ ابتداء میں ہم چھ سات لڑکے لڑکیاں تھے بلکہ میں چند دن اکیلا لڑکا تھا۔ پھر یہ تعداد دس پندرہ تک ہو گئی۔ آدھی چھٹی کے وقت ہمیں سکول کی طرف سے بسکٹ وغیرہ بھی کھانے کو دیئے جاتے تھے۔ آپ نے ریحانہ ستار صاحبہ کا ذکر کیا ہے جو بڑی قواعد کی پابند ہیڈ ٹیچر تھیں۔ ریحانہ ستار صاحبہ سے خلافت کے بعد بھی ملاقات ہوتی رہی۔ انہیں وہ پرانی باتیں اور یادیں بھی یاد تھیں۔ پھر مسز قدسیہ ارشاد بھی میری استانی رہیں۔ اسی طرح دوسری تمام استانیاں جنہوں نے بڑی محنت سے تمام بچوں میں دنیاوی تعلیم کے علاوہ دین سے محبت پیدا کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔

اس عرصہ میں مبارک ساقی صاحب کی اہلیہ جو انگریز تھیں اور شادی سے پہلے کچھ عرصہ ربوہ میں رہیں۔ وہ ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں اور کیونکہ ہمیں براہ راست انگریزی سمجھنا مشکل تھا اس لئے میجر عارف زماں صاحب کی اہلیہ عموماً ان کے ساتھ کلاس میں ہوتی تھیں۔ ساقی صاحب کی شادی بھی انہیں دنوں میں ربوہ میں ہوئی اور وہی عورت جو چند دن پہلے بغیر پردے کے تھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ پورا نقاب گرائے ہوئے ربوہ میں پھرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ پھر ساقی صاحب کے بطور مبلغ باہر جانے کی وجہ سے جلد ہی وہ چلی گئیں۔ بہر حال ہمارا ربوہ ایک سادہ سا شہر تھا اور سادہ منش لوگوں کی بستی تھی۔ لیکن اب کھلا شہر ہونے کی وجہ سے بعض قباحتیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ نئی ایجادوں نے وہ خلوص اور وہ سادگی نہیں رہنے دی۔ شائد اب بزرگوں میں بھی وہ بے ساختگی نہیں رہی۔ نئی نسل کے ساتھ بڑوں کی زندگی بھی شائد زیادہ تیز ہو گئی ہے۔

بہر حال دعا ہے کہ ربوہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ربوہ کے باسیوں میں بے ساختگی، سادگی اور محبت اور پیار ہمیشہ پیدا ہوتا رہے اور قائم رہے۔

آپ کا شکریہ کہ آپ ان یادوں کی جگالی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت ہر لحاظ سے بابرکت فرمائے اور پڑھنے والوں کو اس سے خوب فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

خاکسار

خلیفۃ المسیح الخامس

ابتدائیہ

عزیزم محمد داوٗد طاہر سلمہٗ اللہ تعالیٰ میرے ہونہار شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ سلسلہ کے دیرینہ خادم اور حضرت مصلح موعود کے جانثار ساتھی، مولانا محمد یعقوب طاہر، انچارج صیغہ زودنویسی کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے مجھے بے حد عزیز ہیں۔ مولانا نے ایک ایسے زمانے میں جب ٹیپ ریکارڈر ایجاد نہ ہوا تھا اور اردو شارٹ ہینڈ بھی پوری طرح رائج نہ ہوئی تھی حضرت مصلح موعود کی تقاریر، خطبات، دُروس اور مجالسِ عرفان میں گفتگو کو اس صحت کے ساتھ محفوظ کیا کہ خود حضرت مصلح موعود بھی یہ اعتراف کئے بنا نہ رہ سکے کہ ”عملی طور پر صرف مولوی محمد یعقوب صاحب ہی اس وقت کام کر رہے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے قدرتی طور پر زودنویسی کا ملکہ عطا کیا ہوا ہے اور جو اکثر خطبات اور ڈائریاں وغیرہ نہایت صحیح لکھتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مضمون کے متعلق میرا ذہن یہ تو تسلیم کر سکتا تھا کہ کسی بات کے بیان کرنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی ہے مگر میرا ذہن یہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے کسی بات کو غلط طور پر تحریر کیا ہے۔“

مولانا کو تصنیف وتالیف کا خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ ان کے بیشمار مضامین سلسلہ کے اخبارات و جرائد میں چھپے ہوئے موجود ہیں۔ کچھ تصنیفات بھی ہیں اور انہوں نے ایک قیمتی شعری خزانہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عزیزم داوٗد نے لکھنے کی صلاحیت اپنے والدِ بزرگوار سے ورثہ میں پائی ہے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز امریکہ اور بعض دیگر ممالک کے سفرنامے سے کیا جس کے بعد انہوں نے ایران، ترکی اور کویت کے سفرنامے لکھے۔ ان سفرناموں نے خوب شہرت پائی اور عزیزم داوٗد کو ملک کے منجھے ہوئے سفرنگاروں میں شامل کیا جانے لگا۔ بعدازاں انہوں نے پنجاب کی تاریخ وثقافت کے حوالے سے چار کتابیں لکھیں جن میں سے دو کو حکومتِ پنجاب کی طرف سے ایک لاکھ روپے اور پچاس ہزار روپے کے نقد انعامات کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ”قریۂ جاوداں“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے ربوہ میں گزرے ہوئے اپنے وقت کی کہانی یادداشتوں کی شکل میں بیان کی ہے۔ یہ ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا لیکن الحمدللہ انہوں نے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ اپنی یادداشتیں بیان کرتے کرتے انہوں نے ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کے ربوہ کی تاریخ اس خوبصورتی سے بیان کر دی ہے کہ قاری خود کو ان گلیوں اور محلّوں میں گھومتا ہوا محسوس کرتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خواب وخیال ہو چکے ہیں۔ وہ اس دور کے ربوہ کے باسیوں سے بھی تعارف کراتے چلے جاتے ہیں جن میں ان کے قریبی اعزّہ و اقارب، سکول اور کالج کے کلاس فیلوز، تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اساتذہ، تعلیم الاسلام کالج کے لیکچررز، ان کے محلّے دار، گول بازار کے دکانداران، ربوہ کے حکماء اور پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنرز، فضل عمر ہسپتال میں کام

کرنے والے ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل سٹاف، ہاکی اور باسکٹ بال کے حوالے سے شہرت پانے والے ربوہ کے معروف کھلاڑی اور مشہور صحافی شامل ہیں۔ ربوہ میں دفن ہونے والے بعض نامور افراد کے جنازوں کا حال اور تاریخی واقعات کا ایک گلدستہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو بے حد پسند کیا گیا بلکہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے تو فرمایا کہ ''آپ کی کتاب پڑھ کر ربوہ کے گلی کوچے اور پرانے لوگ ہنستے مسکراتے، قانع، پیار کرنے والے، عبادات کا حق ادا کرنے والے بزرگ نظروں کے سامنے آ گئے..... اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے کہ بہت سے پرانے لوگوں کی یادیں آپ نے تازہ کروادیں۔''

''قریۂ جاوداں'' ایک ضخیم کتاب ہے جس میں ربوہ کے تقریباً سب ہی اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عزیزم داؤد کے زرخیز دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ ربوہ کے زنانہ و مردانہ تعلیمی اداروں میں پڑھانے والے افراد کے حالاتِ زندگی جمع کئے جائیں اور ان لوگوں کا بھی قدرے تفصیلی ذکر کیا جائے جنہوں نے ان اداروں میں تعلیم حاصل کی اور پھر عملی زندگی میں اپنے بہت سے دیگر ساتھیوں کی نسبت زیادہ شہرت و ناموری پائی۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے ان افراد کا تذکرہ ارادتاً حذف کر دیا ہے جن کے بارے میں کچھ نہ کچھ مواد قریۂ جاوداں میں شامل ہو چکا ہے۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ عزیزم داؤد نے کس طرح دنیا کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی نصرت گرلز ہائی سکول اور جامعہ نصرت کی بعض قدیم طالبات اور جامعہ نصرت کی بعض معلمات سے رابطہ کر کے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور پھر انہیں یکجا کر کے ''شہرِ خوباں'' کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ یہی کیفیت تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹس کی ہے جن میں سے بہت سے ان سے سینئر تھے تو کچھ جونیئر۔ ان ہی کا جگرا ہے کہ انہوں نے ان سب کا کھوج نکالا، ان سے رابطہ کیا، ان سے اُن کے اپنے اپنے زمانے کے تعلیم الاسلام کالج کے حالات سنے، ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی تفصیل کھنگالی اور اس کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ عزیزم داؤد کا جامعہ احمدیہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا لیکن انہوں نے ہمارے بہت سے ریٹائرڈ اور بعض حاضر سروس مربیان کا انٹرویو کر کے جامعہ احمدیہ کے بارے میں وہ معلومات یکجا کر دی ہیں جو اس سے پہلے کسی ایک جگہ اکٹھی نہ ہو سکی تھیں۔ انہوں نے بعض واقفینِ زندگی کی قربانیوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور اس ساری کوشش میں فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول کو بھی فراموش نہیں کیا جسے ابتداءً کے جی سکول کہا جاتا تھا اور جسے ربوہ کے بہت سے ہونہار بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم داؤد کی محنتِ شاقہ قبول فرمائے اور انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر ان بزرگوں کے حالات یکجا کر دیئے ہیں جن کا احمدیوں کی موجودہ نسل کی تعلیم و تربیت میں بہت دخل ہے۔

مرزا خورشید احمد

مرزا خورشید احمد

ناظر اعلیٰ، صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ

شہرِ خُوباں کے خُوباں

کیا بُود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے!

یہ وہ چار مصرعے ہیں جو میر تقی میر نے لکھنؤ پہنچنے پر اپنی غریب الدّیاری کا اظہار کرتے ہوئے پڑھے اور آج تک ادب کی تاریخ میں زندہ چلے آتے ہیں۔ یادِ وطن کا جو نوحہ ان چار مصرعوں میں بیان ہوا ہے آج کے نفسیات دان اسے ناستالجیا (Nostalgia) کی بیماری کا نام دیتے ہیں۔ بیماری یعنی عدمِ صحت۔ ادھر ہمارے ہاں انتظار حسین نے یادِ وطن کا نوحہ لکھنا شروع کیا تو قرۃ العین حیدر تک نے یہ کہا کہ ''انتظار حسین نے ہجرت کا ریکٹ چلا رکھا ہے اور اس کو کیش کرتے کرتے اور اس پر thrive کرتے کرتے وہ ''عہد ساز'' اور ''تاریخ ساز'' اور ''عظیم افسانہ نگار'' بن گئے۔ (''قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام'' مرتبہ خالد حسین صفحہ ۳۰)

مگر یادیں تو انسانی ذہن کی صحت مندی کی علامت ہوتی ہیں۔ ان کے بیان کو عدمِ صحت مندی کیوں کہا جائے؟ اس انگریزی لفظ ناستالجیا کا سراغ لگاتے ہوئے میں نے بہت سی انگریزی لغات دیکھی ہیں۔ سب اسے بیماری ہی کا نام دیتی ہیں۔ چلئے بیماری ہی سہی! ہم غریب الوطن سادہ دل لوگ اسی بیماری میں مبتلا ہیں:

کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا ہے

مشتاق احمد یوسفی نے ''ناستالجیا'' کو ماضی پرستی اور مردم گزیدگی اور ماضی زدگی'' (آبِ گم صفحہ ۲۰) سے تعبیر کیا ہے اور یہ قولِ فیصل ارشاد فرمایا ہے کہ ''اور کبھی کبھی قومیں بھی اپنے اوپر ماضی کو مسلط کر لیتی ہیں۔'' (ایضاً) یہ ناستالجیا ہے جسے نفسیات دان بیماری کہتے ہیں۔

میر نے بھی اپنے اجڑے دیار کا نوحہ کیا تھا۔ داؤد طاہر ایسے دیار کا نوحہ لکھتا ہے جو آباد ہے مگر اس کے مکین اُجڑ چکے ہیں یا بقول حالی

رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

داؤد طاہر کی کتاب ''شہرِ خُوباں'' اس بستی کے در و دیوار کی نہیں ان در و دیوار میں بسنے والوں کی رُوداد ہے اور داؤد طاہر کا ناستالجیا بیماری ہے نہ دیوانگی، محض فرزانگی کا نام ہے۔

عبدالمجید سالک نے اردو ادب میں پہلی بار مختلف شخصیتوں اور اشخاص کے احوال و آثار کے بیان کے لیے ''احوالُ الرّ جال'' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ ''شہرِ خوباں'' بھی تمام تر احوالُ الرّ جال پر مشتمل ہے۔ یہ ان احباب کا احوال ہے جو اس شہر کے مختلف تعلیمی و تنظیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ ان میں کئی ایسے ہیں جنہیں داؤد طاہر نے محض دیکھا ہو گا مگر انہوں نے ان کے مُستند حالات یکجا کرنے کے لیے دور دراز ملکوں میں رابطے کئے اور خود متعلّقہ شخصیت سے گفتگو کر کے ان کی باتوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ یہ کام جوکھوں کا کام تھا لیکن اس کام کی صعوبت ان کی راہ کا پتھر نہیں بن سکی۔ ہر مردے و ہر کارے!

احوالُ الرّ جال میں تکنیکی لحاظ سے بعض بہت مشکل مقام آتے ہیں۔ یہ محض کسی شخصیت کا سراپا لکھنے کا نام ہے نہ اس کے خدّ و خال بیان کر دینے کا۔ کسی دیکھی بھالی شخصیت کو کسی ایسے شخص سے متعارف کروانا جس نے اسے نہ دیکھا ہو بڑے حوصلے کا کام ہے۔ احسان دانش نے اپنی خودنوشت ''جہانِ دانش'' کے دوسرے حصے کو ''جہانِ دِگر'' کا نام دیا ہے۔ اس حصے میں نوسو اصحاب کا ذکرِ خیر ہے۔ ''جہانِ دِگر'' میں صرف ان اصحاب کا ذکر ہے جن سے انہیں دور یا نزدیک کا کوئی تعلق یا واسطہ رہا ہے یا وہ ان سے کسی صورت متاثر ہوئے ہیں۔'' احسان دانش نے ہر ملنے والے کے باب میں اپنی رائے بھی دی ہے اگرچہ ضروری نہیں کہ پڑھنے والا ان کی رائے سے متفق بھی ہو۔ داؤد طاہر نے کسی شخصیت کے بارے میں کوئی محاکمہ نہیں کیا کہ ان کا مقصد شخصیات کے خدوخال جمع کرنا تھا، محاکمہ نہیں تھا۔

دراصل ان کی پہلی کتاب ''قریۂ جاوداں'' پڑھتے ہوئے بعض لوگوں کو محسوس ہوا تھا کہ اس میں اس قریہ کے وہ لوگ بھی معرضِ بیان میں آنے چاہئے تھے جن کا تعلق تعلیم الاسلام ہائی سکول یا تعلیم الاسلام کالج کے علاوہ دیگر تعلیمی و تنظیمی اداروں سے رہا ہے کیونکہ اس قریہ میں صرف اس سکول و کالج کے اساتذہ اور متعلقین ہی نہیں رہتے تھے، دوسرے اداروں کے علما، ادبا اور فضلا بھی اس قریہ کی رونق تھے۔ خواتین کے تعلیمی ادارے بھی اپنی گوناگوں سرگرمیوں اور طالبات کی ذہانت کے مظاہروں سے سارے ملک میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ دینی تعلیم کے اداروں میں ایسے ایسے فضلا جمع تھے کہ ان کے علم کا چرچا دور دور تک تھا۔ ''قریۂ جاوداں'' نے اس بستی کے بے شمار دیگر لوگوں کا احاطہ تو کیا مگر یہ لوگ اس طرح بیان نہیں ہو سکے تھے جس طرح بیان کیا جانا ان کا حق تھا۔ الحمدللہ کہ داؤد طاہر کو اس طرف توجہ ہوئی، انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کمر باندھی اور خدا کے فضل سے کامیاب بھی ہوئے۔ اللّٰھم زِد فزِد۔

میں اس مختصر سی تمہید کے ساتھ ''شہرِ خُوباں'' کو قارئین کے سپرد کرتا ہوں۔ پڑھیے اور سر دھنیے۔

ڈاکٹر پرویز پروازی

مورخہ ۳۱ مارچ ۲۰۱۷ء ۵۹۱۴ لانگ ویلی روڈ۔ مسی ساگا۔ اونتاریو۔ کینیڈا۔ ایل ۵۔ ایم ۶۔ جے ۶

آئینہ تمثال دار

تاریخ نگاری، یادنگاری، مرقع نگاری، شخصیت نگاری اور تذکرہ نگاری بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بہ باطن ایک ہی سِلک میں پروئے ہوئے اعمال ہیں کہ ان سب کا تعلق گزرے ہوئے زمانے سے ہوتا ہے۔ گزرا ہوا زمانہ یا ہمارا ماضی کبھی ہمارے حال کا حصہ ہوتا ہے جو ریت کی طرح ہماری مٹھی سے سرکتا رہتا ہے اور دھیرے دھیرے ماضی کی گھپاؤں میں گم ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر اس پر ایک زمانہ بیت جاتا ہے۔ ہم زندگی کے سفر میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ مستقیم اور غیر مستقیم راستوں پر چلتے ہوئے ہم گزشتہ مناظر اور آثار کو وقت کے حوالے کر دیتے ہیں اور وقت کا تارِ عنکبوت اس پر اپنے جالے بنتا رہتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ہمارے پیچھے کا منظر نامہ مکمل تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور ہم پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں دُور دُور تک کچھ نظر نہیں آتا اور پھر اس پر وقت کا آسیب اُتر آتا ہے اور ماضی جس کا ایک سِرا ہمارے حال سے جُڑا ہوا ہے، ہم سے دُور ہوتے ہوتے اتنا دُور ہو جاتا ہے کہ اسے یاد رکھنا تو ایک طرف، اس کے مانوس خدوخال کو بھی دھیان میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس مشکل کام کو سرانجام دینے کے لیے ماضی کی طرف کھلنے والے دریچوں پر نظریں جما کر بیٹھ جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ ان دریچوں سے آنے والی ہواؤں کے رُخ کو پہچان کر ان کی آغوش میں سوئے ہوئے لمحوں کو دھیان کے لمس سے ہولے ہولے بیدار کرنے کا ہنر آزمانا پڑتا ہے۔ یہ فریضہ عام طور پر مؤرخ کے سپرد ہوتا ہے جس کا بنیادی کام ماضی کی بازیافت ہے اور ان زمانوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے جو ہمارے دستِ وجود سے سِرک گئے اور معلوم سے موہوم کی جانب نکل گئے۔ موہوم کے تاریک اور نیم تاریک اندھیاروں کا سفر ایک عام شخص کے لیے ٹھوکروں کے سوا کچھ نہیں مگر وہ جسے ماضی کے بطن میں اُترنے کا ہنر آتا ہو، جسے گزری ساعتوں کے سکوت میں چھپے ہوئے ہنگاموں کو نئے سرے سے جگانے اور بجھے ہوئے منظروں کو بحال کرنے کا سلیقہ ہو اور جسے وقت کی گرد میں اَٹے ہوئے دھندلے چہروں کو ان کے اصل خدوخال دینے میں مہارت حاصل ہو، جسے محض ماضی کے انبوہِ کثیر ہی سے سروکار نہ ہو بلکہ بہ تحقیق حقائق، واقعات، حادثات و سانحات کی صحت کو جانچنے کا تجربہ ہو، جسے ماضی کے مزاروں میں گڑے مُردے اکھاڑنے اور بال کی کھال اتارنے کے اعصاب شکن عمل سے بہ سلامت گزر جانے کا حوصلہ ہو تو ایسے نادرُالوجود کو سرآنکھوں پہ بٹھانا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں وہ آئینہ تمثال دار ہے جس میں وقت کے ہاتھوں نابود ہونے والے لمحوں کی سانسیں بحال ہوتی نظر آتی ہیں۔ میں اس وقت ایک ایسے ہی آئینہ تمثال دار کے مقابل ہوں جسے نامور قلم کار محمد داؤد طاہر کی بصیرت افروز دانائی نے ہنرمندی سے تراشا ہے۔

محمد داؤد طاہر کا لفظ و معنی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ اُمرت رس اُن کے لہو میں شامل ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اپنے کارِ منصبی انجام دیتے ہوئے انتظامی معاملات کے سلجھاؤ میں وہ صرف ہوئے ہی ہوں گے لیکن اس دوران بھی انہوں نے قرطاس و قلم کو جی جان سے عزیز رکھا اور اپنے ذاتی وقت کو جو آرام و سکون کے لیے وقف تھا تصنیف و تالیف کے لیے بے دریغ خرچ کیا۔ اس وقت جب کہ وہ اعلیٰ سرکاری مناصب سے سبکدوش ہو چکے ہیں، وہ ہمہ وقت اس کام کے لیے وقف ہیں۔ انہوں نے بے شمار سفر کیے ہیں۔ شہر شہر، قریہ قریہ گھومے پھرے ہیں اور پھر اپنے تجربات اور مشاہدات کو سلیقے سے بیان کر کے ہم جیسے لوگوں کو بھی ہم سفری کا اعزاز بخشا۔ شہروں کا حال سنایا تو بہت سے لوگ ان کے حلقہ بگوش ہوئے مگر کچھ عرصے سے وہ ایک دوسرے سفر پر نکلے ہیں۔ یہ تاریخ کا سفر ہے۔ ماضی کے اندھیروں کا سفر، جس میں قدم رکھنا خود کو نامعلوم اور موہوم فضاؤں میں تحلیل کرنا ہے۔ اس سے پہلے وہ ''قریۂ جاوداں'' میں منزلوں پر منزلیں مارتے ہوئے قریۂ جاوداں کے اُن زمانوں کی خبر لائے ہیں جو ہمارے احساس میں سرسراتے ہوئے ایک عجیب گدگدی پیدا کرتے اور سرشاری میں گم کر دیتے تھے۔ انہوں نے کمال ہنرمندی سے گئے زمانوں میں آسودۂ خواب داستانوں کو بیدار کیا، گرد میں دبے ہوئے منظروں کو جھاڑ پونچھ کر آئینہ بنا دیا۔ جس میں نو بہ نو کردار، اُجلے چہروں اور نورانی پیشانیوں والے بزرگ مکالمہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ جانے پہچانے، ٹھہر ٹھہر کر، سُبک خرام، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے، اپنے مادرِ علمی کے در و دیوار پر ثبت نقوش کہنہ کو چُنتے ہوئے یہ جانتے ہوئے کہ ان نقوش کہنہ کو سہج سہج چُنتا ہیولوں کو ہتھیلی پر رکھنا ہے۔ تاریخ کے شکستہ اوراق میں گم افراد کے احوال تک پہنچنا ایک شخص در شخص سلسلہ ہے اور پھر اس سلسلے میں مفقود کڑیوں کو تلاش کرنا خود کو کھیکھن میں ڈالنا ہے۔ مگر محمد داؤد طاہر نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے انسان ہیں کہ اس کام میں ان کے سامنے سدِ سکندری بھی آ جائے تو ان کے ماتھے پر بل نہیں آتا۔ انہیں چشموں سے نکلتے ہوئے پانی کی طرح اپنا رستہ بنانا آتا ہے۔ گاہے چل کر، گاہے تیر کر، گاہے اُڑ کر وہ اپنے ہدف کو یوں جا لیتے ہیں جیسے یہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ ایسے لوگ اب کتنے رہ گئے ہیں۔ ذہن میں ایک کام کا خاکہ بنانا اور پھر اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے مستعدی سے ایسا مصروفِ عمل ہو جانا کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہنا اور جب تک وہ کام مکمل نہ ہونا، بے چین رہنا اور اس بے چینی میں ایک عالم کو شریک کر لینا مجھ ایسے سہل انگار کو گئے وقتوں کی کہانیاں لگتی ہیں۔ مجھے علم ہے کہ اس نوع کے کاموں کے لیے کتنے دروازوں پر دستکیں دینا پڑتی ہیں۔ بعض دفعہ ایک ہی دروازہ پیٹتے ہوئے ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں۔ محمد داؤد طاہر نے یہ کام کیا ہے۔ اگر جواب اثبات میں ملا ہے تو اس سعی مسلسل میں ہزاروں انکار بھی شامل ہیں۔ چلیں کھلا انکار نہ سہی، بند دروازے کے پیچھے اگر کسی مکین کا نام و نشان ہی نہ ملے تو اس سے بڑا انکار اور کیا ہو سکتا ہے۔ محمد داؤد طاہر اپنے اس سفر میں اس مقام تک پہنچے ہیں جہاں انہیں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نظر آئی ہے۔ انہوں نے جلتے بجھتے جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش میں جھاڑ جھنکار میں پاؤں بھی رکھے ہیں اور وہ کھلے میدانوں میں تتلیوں کو پکڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرے بھی ہیں مگر یوں کہ سنبھل کر اُٹھے ہیں اور پھر کسی تتلی کے

تعاقب میں سرگرم ہوئے ہیں۔ یہاں مجھے تیغ الہ آبادی المعروف بہ مصطفیٰ زیدی کا ایک شعر برمحل یاد آیا:

تتلیاں اُڑتی ہیں اور ان کو پکڑنے والے
سعیِ ناکام میں اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

مگر محمد داؤد طاہر کی سعی سعیِ ناکام نہیں، سعی مشکور ہے۔ انہوں نے جس جذبے، خلوص اور محنت سے تتلیوں ایسی اڑتی ہوئی رنگ برنگ یادوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے پوروں پر چپکے ہوئے رنگ اس کی چغلی کھا رہے ہیں۔ ان رنگوں کا حسن ''قریۂ جاوداں'' میں بھی اپنی چھب دکھا رہا ہے مگر یہاں ایک نئی ترتیب سے ان تعلیمی اداروں کی قوسِ قزح بناتا ہے جن سے نہ صرف کئی نسلیں فیض یاب ہوئیں بلکہ ان کے فیضان نے دنیا کو علمی اعتبار سے تسخیر کرنے والے عظیم سپوت پیدا کئے۔ یہ وہ چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے ہیں جہاں تعلیم دینے والے اساتذہ کے ذکرِ خیر کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا ذکر جمیل بھی موجود ہے۔ اس تذکرے میں کم و بیش وہ سارے نام آ گئے ہیں جو ان اداروں کے ماتھے کا جھومر اور ہماری تاریخ کا اعزاز ہیں۔ محمد داؤد طاہر خود بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہیں جو یہاں کسی نہ کسی ادارے سے منسلک رہے ہیں مگر ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے درجہ بہ درجہ ان میں سے اکثر اداروں میں رہ کر زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے اور یوں ان عظیم اداروں کی جیتی جاگتی زندگی سے ایک خاص نوع کی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ جیتی جاگتی زندگی جو ماضی کا قصہ ہوئی، ان کے دھیان میں آتی ہے تو کئی شگفتہ، تروتازہ اور روشن چہرے ان کے مطلعِ ذہن پر طلوع ہونے لگتے ہیں۔ ان میں رفتگاں بھی ہیں اور موجودگاں بھی۔ یہ وہ زیرک اور عالی دماغ لوگ ہیں جو ستاروں کی مثال روشن اور ارفع خیال کی صورت دلوں میں زندہ ہیں۔

اس بات کا احتمال تھا کہ شخصیات کے تذکرے میں کئی نام مصنف کو نہ سُوجھتے اور ان کے تحت الشعور میں دبے کے دبے رہتے۔ سو اس کام کو زیادہ قابل اعتبار بنانے کے لیے انہوں نے ایسے اہلِ قلم ڈھونڈ نکالے جن کی یادداشتیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ یہ بیانیے اپنے اپنے اسلوب میں مرقع نگاری کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ اسلوب کا تنوع پڑھنے والے کو یک رنگے اسلوب کے مقابلے میں زیادہ لطف دیتا ہے۔ ہر طرح کا ماحول اپنی خاص کیفیت کے ساتھ وارد ہوتا ہے اور قاری کو نئے نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ مختلف اسالیب میں لکھے ہوئے بیانیے مصنف کی ذہنی بصیرت سے ایک مجموعی تاثر قائم کرتے ہیں۔ کتاب کی صورت اسی مجموعی تاثر سے بنتی ہے۔

کتاب کا ایک باب تعلیم الاسلام کالج کے ان طلبہ کے ذکر سے معمور ہے جن میں سے کچھ پاک فضائیہ یا پاک فوج سے منسلک تھے اور وطنِ عزیز کے لیے اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے راہیِ ملکِ بقا ہوئے جب کہ باقی طلبہ نے احمدیت کے مقدس نام پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔

تعلیم الاسلام کالج کے نامور اساتذہ اور ممتاز طلبہ کا تذکرہ خاصی طوالت رکھتا ہے۔ کالج کے فارغ التحصیل بہت سے طلبہ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ محمد داؤد طاہر نے کرید کرید کر بہت سوں کے حالات دریافت کئے ہیں۔ یہاں ان کی محققانہ صلاحیتوں کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ایک اچھے محقق

کا کام گئے زمانوں کی دریافت ہی نہیں بلکہ دستیاب معلومات کی قدر و قیمت کا تعین کرنا بھی ہے۔ وہ اپنے خاص اندازِ نظر سے حقائق کی صحت کو جانچ کر تسامحات کو دُور کرتا ہے، مختلف افراد سے منسوب غلط روایات کو رڈ کر کے درست حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کام ایک اعلیٰ درجے کی تنقیدی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ محمد داؤد طاہر کی ذات میں یہ صفات موجود ہیں۔ وہ ''کاتا اور لے دوڑی'' کے قائل نہیں بلکہ ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' کے مقولے پر کاربند ہیں۔ وہ کسی ایک روایت کو محض سن کر یا پڑھ کر قبول کرنے کے بجائے مختلف ذرائع سے اس کی صحت کو جانچتے اور مصدقہ معلومات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ متعلقہ افراد کی خِلوت و جلوت میں حاضر رہے ہیں اور ان سے ایک طویل مکالماتی سلسلہ قائم رکھا گیا ہے۔ تحقیق میں خیال آرائی کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تیز متخیلہ رکھنے والے محقق ہی اس درجہ کمال کو پہنچ سکتے ہیں کہ وہ ماضی کے جسم میں رُوح ڈالنے پر قدرت رکھتے ہوں، گہری نیند سوئے ہوئے زمانوں کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کریں اور افراد کی حرکات و سکنات، دل پذیر گفتگو اور زندگی کی خوب صورت مرقع سازی کر کے انہیں اس سطح پر لے آئیں کہ ہم ایک طویل زمانی بُعد کے باوجود ان کی خوشیوں اور دکھ درد میں شریک ہو سکیں۔

ان کی بھرپور، مضبوط اور شارپ متخیّلہ نے مجھے سرشار کیا ہے۔ اس میں اہم کردار اُن کی حیرت انگیز یادداشت کا بھی ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہیں تیس چالیس سال کے فاصلے پر پڑی سُوئی بھی نظر آ جاتی ہے۔ یادنگاری میں عموماً محسوساتی اور جذباتی پہلو غالب آ جاتا ہے اور بقول میر:

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نہ جائے گا

والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ محمد داؤد طاہر نے اس صورت سے مکمل طور پر کنارہ تو نہیں کیا لیکن اکثر معروضی انداز کو قائم رکھا ہے۔ جہاں واقعات کی تشریح و توضیح مقصود ہے، وہاں بھی اس اسلوب میں خامہ فرسائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے تمام مندرجات حقائق کی بنیاد پر استوار ہیں اور ان کی صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

میں اس تاریخی اور تاریخ ساز کتاب کی اشاعت پر محمد داؤد طاہر کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں اور ان کی صحت و سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ثباتِ قدم اور صلابتِ قلم عطا فرمائے۔ آمین

۲ مئی ۲۰۱۷ء
(ڈاکٹر عبدالکریم خالد)
رحمٰن پورہ، لاہور۔

نصرت گرلز ہائی سکول اور جامعہ نصرت

قربان اُن پہ فکر ونظر، علم وآ گہی: پھیلائیں دہر میں جو کتابوں کی روشنی

میں اپنی کتاب ''قریۂ جاوداں'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ میں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز نصرت گرلز ہائی سکول سے اس زمانے میں کیا تھا جب تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں ہوا کرتا تھا لہٰذا نصرت گرلز ہائی سکول میں چوتھی یا شاید پانچویں جماعت تک مخلوط تعلیم رائج تھی۔ ہاں! جب میں دوسری جماعت میں ہوا تو تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ منتقل ہو چکا تھا چنانچہ میں اُدھر چلا گیا اور یوں میرا رابطہ نصرت گرلز ہائی سکول سے منقطع ہو گیا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ اس ''انقطاع'' کے باوجود میں کبھی بھی اس سکول سے دُور نہیں رہا کیوں کہ نہ صرف میری دو بہنوں، صالحہ (اس کتاب میں جن کا ذکر ''آپی'' کے طور پر کیا جائے گا) اور صادقہ نے یہیں سے میٹرک پاس کیا بلکہ مجھ سے بڑی میری دو چچازاد بہنوں، رضیہ اور صالحہ اور میری ماموں زاد بہن، امۃ الحفیظ نے بھی اسی سکول سے تعلیم حاصل کی۔ یوں ہمارے گھر اور ہمارے ماحول میں ہر وقت اس سکول کا چرچا رہتا۔ آپی اور صادقہ جب اس سکول کی کسی استانی کا ذکر کرتیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا گویا وہ میری بھی استانی ہوں اور اُن کی کسی سہیلی کا حوالہ آتا تو مجھے یوں لگتا کہ میں بھی انہیں عرصۂ دراز سے جانتا ہوں۔

یہ کتاب لکھتے ہوئے مجھے خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں اس ماحول اور ان شخصیات کا بھی کچھ ذکر کر دوں جنہیں مجھے براہِ راست دیکھنے کا تو موقع نہیں ملا تاہم وہ میرے لیے اجنبی ہرگز نہ تھیں۔ میں نے اس حوالے سے اس سکول کی بعض سابق طالبات سے درخواست کی کہ وہ مجھے اُس دور کے نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں کچھ بتائیں اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

اس حوالے سے سب سے پہلا نام تو آپی کا ہے جو ۱۹۴۹ء میں اس سکول میں داخل ہوئیں اور ۱۹۵۶ء میں میٹرک کر کے یہاں سے فارغ ہوئیں۔ وہ آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں اور مختلف عوارض کی بِنا پر ان کی طبیعت مضمحل رہتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ عارضہ قلب کے سبب کئی روز تک ہسپتال میں بھی داخل رہیں تاہم اس کے باوجود جب اُنہیں علم ہوا کہ میں نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو وہ برابر کئی روز تک فون پر مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی کے حالات سناتی رہیں اور جو کچھ انہوں نے بتایا میں اِسے قلمبند کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

وہ بتاتی ہیں: قادیان سے ہجرت کے بعد قیامِ لاہور کے دوران میں نے راوی روڈ کے ایک سرکاری سکول میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ سکول میں پڑھائی تو اتنی ہی ہوتی تھی جتنی سرکاری سکولوں میں ہوتی ہے لیکن گھر آتی تو ماسی جی جن کا قدرے تفصیلی ذکر ''قریۂ جاوداں'' میں موجود ہے مجھے لے کر بیٹھ جاتیں اور

سکول کا سارا کام ختم کرا کے اٹھنے دیتیں۔ اگر وہ حساب کا کوئی سوال مشکل محسوس کرتیں تو اپنے بھانجے، قاضی منظور احمد (جنہیں ہم بھائی جی کہتے تھے) کا انتظار کرتیں۔ وہ دفتر سے واپس آتے تو سوال ان سے سمجھ کر مجھے سمجھا دیتیں۔ ماسی جی کی خصوصی توجہ سے مجھے اپنے کورس پر خاصی دسترس حاصل ہوگئی اور میرا شمار سکول کی لائق طالبات میں ہونے لگا۔ یقیناً سکول میں میری استانی نے بھی یہ سب کچھ محسوس کرلیا ہوگا چنانچہ مجھے مانیٹر بنا دیا گیا۔

ربوہ کی بنیاد رکھے جانے کے بعد جب ہم یہاں منتقل ہوئے تو نصرت گرلز ہائی سکول کھل چکا تھا لیکن یہ اس کا پہلا سال تھا۔ امی مجھے ہیڈ مسٹریس کے پاس لے گئیں اور ایک چھوٹے موٹے ٹیسٹ کے بعد مجھے چوتھی جماعت میں داخلہ مل گیا۔ یہ ربوہ کا ابتدائی دور تھا اور سکول میں طالبات کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جماعتی ریکارڈ کے مطابق ۱۹۵۱ء میں جب اس سکول کی لڑکیاں پہلی بار میٹرک کے امتحان میں شامل ہوئیں میٹرک پاس کرنے والی لڑکیوں کی تعداد صرف آٹھ تھی۔

چوتھی جماعت میں اپنی ہم جماعتوں میں سے مجھے صاحبزادی امۃ الجمیل بنت حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (جن کا ذکر باقی گفتگو میں ''جمیل'' کے طور پر کیا جائے گا) طاہرہ بنت حضرت سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ، امۃ الرشید بنت مولوی عطا محمد، کارکن نظارت بہشتی مقبرہ (جنہیں ہم ''اچھی'' کہتے ہیں) اور رشیدہ اختر بنت قریشی محمد احسن (جنہیں ہم ''اختر'' کہہ کر پکارتے تھے) کے نام ابھی تک یاد ہیں۔ ان میں سے کچھ کالج تک میری کلاس فیلو رہیں۔ بعد میں جمیل چوہدری فتح محمد سیال کے صاحبزادے ناصر احمد سیال سے بیاہی گئیں، طاہرہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے صاحبزادے، مرزا حنیف احمد کے عقد میں آئیں، اچھی کی شادی چوہدری حمید اللہ، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید کے بھائی، عبدالغنی سے ہوئی اور اختر عبدالرشید درویش کے نکاح میں آئیں۔ ان میں سے اختر بہت عرصہ پہلے وفات پا چکی ہیں۔ الحمدللہ ان سب سہیلیوں کے ساتھ ساری زندگی میرا میل جول رہا اور ہم عمر بھر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہیں۔ ضعیف العمری کے باوجود ہمارا رابطہ آج بھی قائم ہے۔ خدا اس تعلق کو نظرِ بد سے بچائے۔

سکول کا زمانہ ہماری زندگی کا خوبصورت ترین دور تھا۔ بے فکری اس کا خاصہ تھا۔ سکول بند ہونے کے بعد ہم بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے اور گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔ آپس میں ہمارا کوئی حجاب تھا نہ ایک دوسرے کے گھر جانے پر کوئی قدغن۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح رہا کرتے تھے۔ کہاں گیا وہ زمانہ!

جب میں سکول میں داخل ہوئی تو یہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے تاہم کچھ ہی عرصہ بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ سے ربوہ منتقل ہوگیا اور یوں ہمارا سکول صرف لڑکیوں کے لیے مختص ہوکر رہ گیا۔ ان میں سے تین لڑکوں کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔ یہ لڑکے تھے حمیدہ چپراسن کے صاحبزادے برکت اللہ طاہر، قریشی محمد احسن کے بیٹے، محمد اسلم اور مولانا نسیم سیفی، سابق ایڈیٹر الفضل کے بیٹے ظفر اقبال۔

برکت اللہ طاہر کی شادی لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی کارکن، سراج بی کی بیٹی شمس النساء المعروف شمسی سے ہوئی اور وہ کینیڈا منتقل ہو جانے کے بعد وفات پا چکے ہیں۔ قریشی محمد اسلم نے بعد میں زندگی وقف کی اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران ٹرینیڈاڈ میں کسی بد باطن کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ ماریشس میں اپنی تقرری کے دوران انہیں ملکہ الزبتھ سے ملاقات اور جماعتی لٹریچر پیش کرنے کا نادر موقع ملا تاہم ملاقات سے قبل انتظامیہ کو یہ بات نوٹ کرادی گئی تھی کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے پیشِ نظر ملکہ سے ہاتھ نہ ملا سکیں گے چنانچہ ملاقات کے وقت انہوں نے جھک کر ملکہ کے لیے اظہارِ تعظیم کیا۔ اسی طرح انہیں ہندوستان کی وزیرِ اعظم، مسز اندرا گاندھی سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ ایک موقع پر وہ گورنر جنرل ماریشس سے بھی ملے۔ رہے ظفر اقبال تو سنتے ہیں وہ بعد میں نیشنل بنک میں ملازم رہے۔ اب معلوم نہیں کہاں ہیں۔

ہم پانچویں جماعت میں تھیں تو معلوم ہوا کہ محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک امتحان کی بنیاد پر طالبات کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ اس امتحان میں صرف منتخب طالبات ہی شریک ہوسکتی تھیں۔ اس سال ہماری کلاس میں سے میں اور حلیمہ، صرف دو لڑکیاں اس امتحان کے لیے منتخب ہوئیں۔ یاد رہے کہ حلیمہ چوہدری غلام مرتضیٰ، وکیل القانون کی صاحبزادی تھیں جو بعد میں ڈاکٹر بنیں اور کچھ عرصہ فضلِ عمر ہسپتال میں بھی کام کرتی رہیں۔ ہم دونوں استانی حمیدہ صابرہ (بنت حضرت ڈاکٹر فیض علی صابر، رفیق حضرت مسیح موعود) کی نگرانی میں چنیوٹ گئیں۔ ہم ٹرین سے وہاں گئیں اور ٹرین ہی سے واپس آئیں۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ استانی حمیدہ صابرہ بچیوں کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔ سردی بہت تھی اور ہم دونوں بغیر سویٹر کے ہی چنیوٹ جانے کے لیے سٹیشن پر پہنچ گئی تھیں۔ موصوفہ نے دیکھا تو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا کہ یہ سردی ہمیں بیمار کردے گی۔ انہوں نے ہمیں گھر واپس بھجوایا تاکہ ہم سویٹر یا گرم چادر لے آئیں۔ الحمدللہ اس امتحان کی بنیاد پر ہم دونوں وظیفے کی مستحق قرار پائیں چنانچہ سکول میں ہماری خوب واہ واہ ہوئی۔ ہمیں اگلے تین سال یہ وظیفہ ملتا رہا۔

میں اپنے بچپن میں ناصرات الاحمدیہ کی سرگرمیوں میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتی تھی۔ تلاوت، نظم اور تقریری مقابلوں میں شمولیت میرا معمول تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح کا ایک اجلاس سکول میں ہوا۔ تقریری مقابلہ تھا اور اس میں مہمانِ خصوصی حضرت اماں جان تھیں۔ یہ درست ہے کہ میں جمیل سے ملاقات کے لیے قصرِ خلافت جاتی رہتی تھی اور بعض دفعہ کئی کئی گھنٹے وہاں گزارتی لیکن میری محرومی کہ مجھے حضرت اماں جان سے ملاقات کی کبھی تحریک ہی نہیں ہوئی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ حضرت اماں جان کا چہرۂ پُرنور آج بھی روزِ اوّل کی طرح میرے دل پر نقش ہے۔ آپ کے چہرے میں ایک ایسی چمک تھی جس کا الفاظ میں بیان آسان نہیں۔ سچ پوچھیں تو ان کا ملکُوتی حُسن میری آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

اس تقریب میں تلاوت بھی میں نے ہی کی تھی اور مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط والے رکوع کی قرأت کی تھی۔ حضرت اماں جان نے مجھے تین چار جگہ روک کر میری تصحیح کی۔ بعد میں تقریری مقابلہ ہوا تو جج کے فیصلے کے مطابق میں اس میں اول قرار پائی۔ اس مقابلے کی

بنیاد پر مجھے حضرت اماں جان کے بابرکت ہاتھوں کسی انعام کا ملنا تو یاد نہیں البتہ انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور اباجی اور امی کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ یہاں یہ بتاتی چلوں کہ امی بھی حضرت اماں جان کے عقیدت مندوں میں سے تھیں اور نہ صرف وہ آپ کے پاس حاضر ہوتی تھیں بلکہ حضرت اماں جان بھی ازراہِ شفقت ان کے ہاں قدم رنجہ فرماتی رہتی تھیں اور اس امر کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر امی نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے جو حضرت اماں جان کی وفات کے بعد ماہنامہ مصباح کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔

اب سوچتی ہوں کہ میں اس عظیم ہستی کی قربت سے کیوں کر محروم رہی تو افسوس ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے درجات بلند سے بلند فرماتا چلا جائے۔

ہم ساتویں جماعت کا سالانہ امتحان دے رہے تھے۔ ہم نے اردو کا پرچہ معمول کے مطابق دیا لیکن ہمارا تاثر یہ تھا کہ پرچہ مشکل ہے۔ پرچے کے بعد میں، جمیل اور طاہرہ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنی استانی سے شکایت کرنی چاہیئے کہ انہیں پرچہ بناتے وقت طالبات کا عمومی تعلیمی معیار نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یہ طے کر کے ہم سب استانی سیّدہ میمونہ (جو سیّد عبدالباسط، معتمد مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی اہلیہ تھیں) کے گھر چلی گئیں اور ان کے سامنے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ اس کے بعد ہم نے معمول کے مطابق باقی پرچے دیئے اور نتیجے کا انتظار کرنے لگیں۔

خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ ہم سب خوشی خوشی سکول پہنچیں لیکن اس وقت حیران رہ گئیں جب ہمارا نام بھی فیل شدگان میں پڑھا گیا۔ یہ خبر ہمارے لیے بے حد افسوسناک تھی۔ ہم سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ اپنی عمدہ کارکردگی کے باوجود ہم فیل ہو جائیں گی چنانچہ ہم روتے دھوتے واپس اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

مجھے باقی لڑکیوں کے والدین کے ردعمل کا تو کچھ اندازہ نہیں البتہ اباجی نے مجھے روتے ہوئے دیکھا تو سخت پریشان ہوئے۔ وہ تو آس لگائے بیٹھے تھے کہ ان کی بیٹی کلاس میں اول آئے گی لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں فیل ہوگئی ہوں تو ابتداءً انہیں اس بات کا یقین ہی نہیں آیا تاہم جب میں نے روتے ہوئے کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں درست ہے تو انہوں نے فوراً کوٹ پہنا، پگڑی سر پر رکھی اور چھڑی ہاتھ میں پکڑ کر یہ جا وہ جا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ ہیڈ مسٹریس سے ملنے جا رہے ہیں تا کہ معلوم کر سکیں کہ ان بچیوں کو فیل کئے جانے کا اصل سبب کیا ہے۔

کچھ دیر کے بعد اباجی واپس آ گئے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ استانی سیّدہ میمونہ نے ہیڈ مسٹریس کے پاس ہمارے باغیانہ رویّہ کی شکایت کی تو وہ آگ بگولہ ہوگئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ سکول کی بچیوں میں یہ رویّہ پنپے چنانچہ انہوں نے ہمیں سبق سکھانے کے لیے فیل کیا تھا تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ یہ سزا وقتی ہے اور یہ کہ جب سکول کھلے گا تو ہمیں اگلی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے گی اور ہوا بھی ایسے ہی۔

اگرچہ اس سزا سے ہم وقتی طور پر بہت آزردہ ہوئے لیکن اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سکول میں نظم و ضبط اور اخلاقیات کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی۔ ہیڈ مسٹریس نے یہ جانتے ہوئے بھی امتحان میں ہماری

ناکامی کا اعلان کر دیا کہ فیل شدگان میں سے ایک خلیفة المسیح کی بیٹی ہے۔ ہیڈ مسٹریس کو یقیناً اندازہ تھا کہ سکول کے اندرونی معاملات میں ان کا فیصلہ حرفِ آخر ہے اور یہ کہ ان کے اس اعلان کو کسی بھی شخص کی طرف سے ذاتی انا کا مسئلہ بنا کر ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی کئے جانے کا امکان نہیں ورنہ وہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچتیں۔

سکول کا زمانہ عجیب معصومیت کا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو بعض دفعہ ہنسی آتی ہے کہ ہماری سوچ کس قدر بچگانہ تھی۔

اس زمانے میں طالبات کو وبائی امراض خصوصاً ٹی بی، چیچک اور ہیضہ کے ٹیکے ایک مخصوص وقفے کے بعد لگا کرتے تھے۔ اس کے لیے حکومت کی طرف سے خصوصی ٹیمیں تشکیل دی جاتی تھیں جو باری باری سب سکولوں کے بچوں کو ٹیکے لگایا کرتیں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو چیچک اور ہیضے کا ٹیکہ ایک ہی بار لگتا لیکن ٹی بی کا ٹیکہ دو حصوں میں لگتا تھا۔ پہلی بار یہ ٹیکہ لگانے کے بعد چوبیس یا شاید اڑتالیس گھنٹے انتظار کیا جاتا۔ پھر ویکسینیٹر اسے دیکھتا۔ اگر وہ محسوس کرتا کہ ٹیکے والی جگہ پر سوزش یا سوجن ہو چکی ہے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ اس طالبہ کے اندر ٹی بی کا مادہ موجود ہے چنانچہ اسے ایک اور ٹیکہ لگایا جاتا جو پہلے ٹیکے سے کہیں زیادہ سخت ہوتا تھا۔ اگر کسی طالبہ کو مزید ٹیکے کی ضرورت نہ ہوتی تو اس کے بازو پر نہ مٹنے والی جامنی رنگ کی روشنائی سے کراس لگا دیا جاتا۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت کی بات ہوگی۔ ایک بار ویکسینیٹر نے ہم پانچوں کی کلائیاں چیک کرنے کے بعد دوسرے ٹیکے کی ضرورت سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہماری کلائیوں کا اچھی طرح معاینہ نہیں کیا گیا چنانچہ ہم نے ارادہ کر لیا کہ ہم یہ کراس مٹا کر دوبارہ لائن میں لگ جائیں گے لیکن اس روز پتا چلا کہ روشنائی کا یہ نشان مٹانا کس قدر مشکل ہے۔ ہم دو دن تک ٹھیکریوں کے ساتھ ان نشانوں کی رگڑائی کرتے رہے تب جا کر یہ مٹ سکے جس کے بعد ہم دوبارہ اس لائن میں کھڑے ہو گئے تاہم ویکسینیٹر نے ہماری کلائیوں پر پھر کراس لگا دیا۔ اب ہم مطمئن ہو گئیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم سب ٹی بی کے بداثرات سے محفوظ ہیں لیکن اپنی حماقت پر خود ہی ہنستی بھی رہیں۔

سکول میں سردیوں کے موسم میں ظہر کی نماز باجماعت ہوا کرتی تھی۔ استانی میمونہ صوفیہ امامت کرایا کرتی تھیں۔ گرمیوں میں نماز سے پہلے چھٹی ہو جاتی تھی تاہم طالبات کو تاکید کی جاتی تھی کہ وہ گھر جا کر سونے سے پہلے نمازِ ظہر ضرور ادا کر لیا کریں۔

میں یہاں عرض کرتی چلوں کہ استانی میمونہ عام طور پر سفید شلوار، مردانہ طریق پر سلی ہوئی قمیص اور واسکٹ پہنتی تھیں۔ نہ صرف میں بلکہ پورا سکول ہی ان سے بہت ڈرتا تھا۔ بلند آواز میں پڑھاتی تھیں اور ذرا سی بے ادبی اور لاپروائی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ وہ استانیوں والی گلی میں رہتی تھیں۔ جب ریٹائر ہوئیں تو لجنہ اماء اللہ کے کوارٹرز میں چلی گئیں اور لمبا عرصہ تک نصرت جنرل سٹور کی انچارج رہیں۔

''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ موصوفہ لجنہ کی ابتدائی ممبرات میں سے تھیں اور

عمر بھراس کی انتہائی فعّال رکن رہیں۔ انہیں جلسہ سالانہ کے موقع پر مختلف ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق بھی ملتی رہی۔

انہوں نے ۱۹ جون ۱۹۸۰ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ان کا ایک بیٹا اور ایک ہی بیٹی تھی۔ بیٹے کا نام غلام احمد عطا تھا اور بیٹی کا صادقہ بیگم۔ اب یہ دونوں بچے بھی وفات پا چکے ہیں۔ غلام احمد عطا واقفِ زندگی تھے اور انہوں نے لمبا عرصہ سندھ میں جماعت کے فارمز پر گزارا اور غالباً وکیل الزراعت بھی رہے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں سات بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ بیٹوں میں سے ایک ڈاکٹر خالد احمد عطا حضرت مصلح موعود کی نواسی اور میاں عبدالرحیم احمد کی صاحبزادی، امۃ الحیٔ سے بیاہا گیا جب کہ ایک، ظفر احمد عطا میری بیٹی، عزیزہ مبارکہ حنا سے شادی شدہ ہے۔ خالد عطا امریکہ میں اور ظفر عطا آج کل کینیڈا میں ہے۔

استانی میمونہ کی وفات پر بعض لوگوں نے جماعتی اخبارات و جرائد میں ان کے بارے میں مضامین لکھے جن میں سے ایک اتفاقاً میرے سامنے موجود ہے۔ یہ مضمون رضیہ درد کا لکھا ہوا ہے اور چوبیس جولائی ۱۹۸۰ء کے الفضل میں چھپا تھا۔ اس میں مضمون نگار نے استانی میمونہ کی بعض خوبیوں کا ذکر کیا ہے لہٰذا اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتٰكُمْ کے حکم کے تحت ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''کہتے ہیں خوف اور محبت دو الگ الگ کیفیتیں ہیں مگر آپ کی ذات ان دونوں کا مجموعہ تھی۔ ہر لمحہ ہر شخص کو نصیحت کرنے، نیک بات کہنے، بُری بات سے روکنے میں جرأت مند پہلو کارفرما رہتا۔ کسی میں کوئی نقص دیکھا تو بڑے اعتماد اور پُروقار طریق سے توجہ دلانے میں کبھی غفلت اور سستی ظاہر نہ ہوتی۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ جب کسی میں کوئی نقص یا کمزوری دیکھیں تو خاموش رہتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بُری بات ہے۔ بعض کا خیال ہوتا ہے کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم دشمنی مول لیں۔ اس کے اعمال اس کے ساتھ، ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ کچھ کرم فرما سامنے تو کچھ نہیں کہتے لیکن پیٹھ پیچھے بڑھا چڑھا کر ان کمزوریوں اور عیوب کو اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے آپس میں رنجش پیدا ہو کر تعلقات بھی متاثر ہوتے ہیں لیکن موصوفہ کا طریق اس کے برعکس سنتِ نبوی کے تحت ہوتا۔ جس میں کوئی بُرائی دیکھی وہیں اس کو تنبیہہ کر دی۔ ذاتی دشمنی کا خیال آپ کے دل میں شاید کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا اور آپ کی اس اخلاقی دلیری کی وجہ سے ہر کسی کے دل میں محبت کے ساتھ ساتھ آپ کا رعب بھی ہوتا۔ آپ کے شاگرد نہ صرف تعلیم کے زمانے میں ہی آپ کا احترام کرتے یا آپ سے ڈرتے تھے بلکہ بعد میں بھی جب کہ وہ خود بھی اساتذہ کے مقام پر فائز ہو گئے آپ کی ذات اور آپ کی شخصیت کا اسی طرح لحاظ کرتے جیسے اب بھی وہ دوزانو ہو کر آپ کی شاگردی میں آپ کے سامنے بیٹھے ہیں......

دعاؤں سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ جب بھی اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا بڑے اعتماد سے فرماتیں: گھبراؤ نہیں، میں دعا کروں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آخر اس مولیٰ کے آگے ہی سر جھکانا ہے۔ وہ سنتا ہے۔ وہ ضرور سنے گا۔ ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہمیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔''

میرے زمانۂ طالب علمی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی قصرِ خلافت میں خواتین میں قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے جس میں ہم طالبات کو بھی لے جایا جاتا تھا۔ جس روز حضور پر چاقو سے قاتلانہ حملہ ہوا اس روز بھی صبح کے وقت درس ہوا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ یہ درس قرآن شریف کے کس حصہ کا تھا البتہ یہ بات مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ اس میں سورہ بقرہ کی آیت قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ٥ کا حوالہ بھی آیا تھا۔

اس شام میں اور طاہرہ نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہم قصرِ خلافت اور بیتِ مبارک کے درمیان سے گزرے تو لوگوں کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھی۔ ہم نے کسی سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو بتایا گیا کہ حضور پر چاقو سے وار کیا گیا ہے اور آپ کو گہرا زخم آیا ہے۔ اس وقت تک حضور کو بیت مبارک سے قصرِ خلافت منتقل کیا جا چکا تھا لیکن محراب سے لے کر قصرِ خلافت کے داخلی دروازے تک زمین پر جا بجا خون گرا ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی خون تھا جو حضور کے زخم سے بہا تھا۔ وہ منظر اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے جب ڈیوٹی والے لوگ ان نشانات کو محفوظ کرنے کے لیے ان پر پلچھی کے ٹوکرے الٹے رکھ رہے تھے۔

یہ خبر ہمارے لیے بہت اندوہناک تھی لیکن ہمارا وہاں رکنا چنداں مناسب نہ تھا چنانچہ ہم تیز قدم بیت مبارک کے بڑے گیٹ سے باہر نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیں۔

اس زمانہ میں حضرت اماں جی حرم حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل حیات تھیں اور استانی امۃ الرحمٰن عمر اہلیہ میاں عبدالمنان عمر، ہیڈ مسٹریس کے گھر سے ملحق ایک کمرے میں رہائش پذیر تھیں۔ شاید اور کچھ نوکرانیاں بھی ان کی خدمت پر مامور ہوں مگر حفیظہ جو بعد میں قادر بخش، کارکن فضلِ عمر ہسپتال کے عقد میں آئیں بھی وہیں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار دادی جی نے مجھے بتایا کہ وہ حضرت اماں جی سے ملاقات کے لیے جانا چاہتی ہیں اور فرمائش کی کہ میں ان کے ہمراہ چلوں۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی چنانچہ ایک روز ہم دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئیں۔

میں اس سے پہلے حضرت اماں جی سے براہِ راست متعارف نہ تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ایک معروف رفیقہ حضرت مسیح موعود کی پوتی اور ایک نامور خادم سلسلہ کی بیٹی ہوں تو انہوں نے میرے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اس کے بعد یہ دونوں بزرگان آپس میں محوِ گفتگو ہو گئیں اور سچی بات ہے مجھے ان کے درمیان ہونے والی باتوں میں سے کوئی بھی یاد نہیں۔ دادی جی وہاں کم و بیش ایک گھنٹہ بیٹھی ہوں گی۔ جب انہوں نے حضرت اماں جی سے اجازت طلب کی تو وہ مجھے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں: آدھی چھٹی کے وقت کبھی جی چاہے تو آ جایا کرو۔ مجھے یاد ہے میں چار پانچ بار ان کے پاس گئی ہوں گی۔ وہ ہر دفعہ مجھے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور دیتیں خواہ وہ کوئی پھل ہو، دودھ کی پیالی ہو یا روٹی کا ٹکڑا ہی ہو۔ میں اس وقت چھوٹی تھی۔ میں ان کے مقام سے پوری طرح آگاہ تھی نہ ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک تھی کہ ہم آپس میں کوئی یاد رہ جانے والی بات کر سکتے مگر مجھے ان کی شفقت و محبت کبھی نہیں بھولتی اور میں اب سوچتی ہوں کہ کہاں حرم حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اور کہاں یہ نابکار

مگر وہ ہمیشہ مسکرا کر ملتیں، میری دلجوئی کے لیے موقع کے مطابق خاطر کرتیں اور واپسی پر ڈھیروں دعاؤں سے نوازتیں۔

ان دنوں سکول میں کمروں کی صفائی کے لیے کوئی جمعدار نہیں ہوتا تھا اور کلاس رُومز کی صفائی بچیوں کی اپنی ذمہ داری تھی۔ مجھے یاد ہے ہم جتنا عرصہ سکول میں رہے اس کام پر ہر طالبہ کی ڈیوٹی ہفتہ عشرہ میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔

میں، جمیل، طاہرہ، اچھی اور اختر بالعموم اکٹھی ڈیوٹی لگواتی تھیں۔ چھٹی ہوتے ہی ہم ڈیسک اور بنچ کمرے سے باہر نکالتیں، فرش سے گند مند اٹھاتیں، جھاڑو لگاتیں اور اس پر پوچا پھیرتیں۔ پھر پوچا خشک ہونے کا انتظار کرتیں اور آخر میں تمام ڈیسک بنچ کمرے میں رکھ کر چھٹی کرتیں۔ یہ ایک بورنگ اور تھکا دینے والا کام تھا لیکن ہم عمر کے اس حصے میں تھیں جب تھکاوٹ نام کی کوئی چیز قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ یوں بھی ہم یہ کام ڈیوٹی سے زیادہ تفریح سمجھ کر کرتے۔ ساتھ کے ساتھ خوش گپیاں چلتی رہتیں اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔

استانی میمونہ ہمیں مختلف اوقات میں عربی اور دینیات پڑھاتی رہیں۔ ان کی سختی مشہور تھی لیکن وہ طالبات سے محبت بھی بے پناہ کرتی تھیں۔ ایک بار ابھی وہ کلاس میں نہ آئی تھیں کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مانیٹر تو میں تھی ہی، شاید لڑکیوں کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے کوئی بات شروع کر دی ہوگی۔ اسی اثنا میں استانی میمونہ پہنچ گئیں۔ مجھے اپنی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو کسی ناراضگی کا اظہار کئے بغیر حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کا یہ شعر پڑھا:

جب گزر جائیں گے ہم تم پہ پڑے گا سب بار
سستیاں ترک کرو طالبِ آرام نہ ہو

انہوں نے اس شعر کے ذریعے ایک طرح سے میری حوصلہ افزائی کی اور کلاس کو بتایا کہ اگلی نسل کی قیادت ہم طالبات کے ہاتھ میں ہے جس کے لیے ہمیں ابھی سے تیاری شروع کر دینی چاہئے۔

استانی حور بانو (جو ادیبِ شہیر، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کی صاحبزادی تھیں) سے بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ لائق طالبات کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار اردو کا ٹیسٹ ہوا۔ اس میں ایک سوال خالی جگہ پُر کرنے کا تھا۔ اتفاق سے میں واحد طالبہ تھی جس نے یہ سوال پورے طور پر ٹھیک حل کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور مجھے شاباش دینے کے علاوہ میرا پرچہ کلاس میں پڑھ کر سنایا اور اس توقع کا اظہار کیا کہ آئندہ باقی طالبات بھی اس قسم کا سوال اسی انداز میں حل کرنے کی کوشش کریں گی۔

ہماری ایک استانی، امۃ الحفیظ ثریا بھی تھیں جو مہاشہ محمد عمر کی صاحبزادی تھیں۔ مہاشہ محمد عمر کی اہلیہ، خالہ امیر اور ان کی والدہ کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کے خاندان سے بخوبی واقف تھے۔ استانی ثریا نے نویں جماعت میں ہمیں کچھ عرصہ اردو پڑھائی۔ ان دنوں ہماری ٹیکسٹ بک کا نام ''سرمایۂ اردو'' تھا۔ وہ بہت محنت سے پڑھاتی تھیں۔ شادی کے بعد لندن چلی گئی تھیں اور اب وفات پا چکی ہیں۔

افسر خزانہ صدر انجمن احمدیہ، سعید احمد عالمگیر کی خواہرِ نسبتی، استانی امۃ العزیز بیگ بھی اُن دنوں سکول میں پڑھاتی تھیں۔ میں ان کی براہِ راست شاگرد تو نہ رہی تھی لیکن ان سے متعارف ضرور تھی۔ کئی سال بعد جب میں اپنی پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد کئی طرح کی طبی الجھنوں کا شکار رہی اور انہوں نے یہ خبر سنی تو عیادت کے لیے خاص طور پر ہمارے ہاں آئیں اور دیر تک بیٹھی مجھے تسلی دیتی رہیں۔

ہماری استانیاں باقاعدہ واقفِ زندگی نہ ہونے کے باوجود وقف کی روح سے سرشار تھیں اور وہ بغیر عذرِ حقیقی کبھی چھٹی نہ کرتیں۔ کمزور طالبات ان کی توجہ اور شفقت کی خصوصی مُورد بنتیں اور وہ انہیں اوور ٹائم لگوانے پر بھی بخوشی تیار ہو جاتیں۔ یہ سب کچھ ہمدردی کے جذبہ کے تحت بغیر کسی معاوضے کی توقع کے کیا جاتا تھا۔

استانی امۃ الرحمٰن عمر بہت ہی قابل اور محنتی معلّمہ تھیں۔ ان کے والد، حضرت مولوی شیر علی نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کیا تھا اور انگریزی پر دسترس انہیں ورثہ میں ملی تھی یا کم از کم ہم یہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے طلبہ کی رہنمائی کے لیے انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھ رکھی تھی جو وہ آٹھویں نویں میں ہمیں پڑھایا کرتی تھیں۔ انہوں نے انگریزی گرامر ہمیں بہت اچھی طرح پڑھائی اور اس قابل بنا دیا کہ صحیح انگریزی لکھ سکیں۔

میرا شمار ان کی چہیتی شاگردوں میں تھا۔ جب میں دسویں میں تھی تو ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس میٹرک کے انگریزی بی کے پرچے مارکنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ اس کام کو نمٹانے کے لیے میری مدد کی طلبگار ہیں۔ مجھے بھلا اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا چنانچہ میں کئی دن تک ان کے گھر جا کر ان کے پاس بیٹھ کر اس معاملے میں ان کی مدد کرتی رہی۔ مجھے بچپن سے سر درد رہتا تھا اور بعض دفعہ بڑی تکلیف دہ شکل اختیار کر لیتا تھا۔ ایک بار ان کے گھر میں تھی کہ درد شروع ہو گیا۔ استانی امۃ الرحمٰن نے میری بے چینی بھانپ لی۔ وہ باورچی خانے میں گئیں اور گرم دودھ کا ایک پیالہ لے آئیں۔ میں تکلفاً انکار کرتی رہی مگر انہوں نے بہت اصرار اور محبت سے وہ دودھ مجھے پلایا اور پھر کہنے لگیں: صالحہ! تم ہر روز دودھ کا ایک گلاس ضرور پیا کرو۔ صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ تمہارے سر درد کا علاج بھی یہی ہے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں اپنی ایک وفات یافتہ سہیلی کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔ ان کا نام امۃ الحفیظ تھا۔ وہ ملک عمر علی، رئیس ملتان کی صاحبزادی اور نصرت گرلز ہائی سکول میں ہماری ہم جماعت تھیں تاہم انہوں نے کسی وجہ سے میٹرک کرنے سے پہلے ہی یہ سکول چھوڑ دیا اور ملتان منتقل ہو گئیں۔ وہ اپنی سوتیلی جرمن والدہ کے ہمراہ بعد میں جلسہ سالانہ پر ربوہ آتیں تو ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں ابھی ایف اے کر رہی تھی کہ ان کی شادی پروفیسر قاضی محمد اسلم، سابق ہیڈ آف فلاسفی ڈیپارٹمنٹ، پنجاب یونیورسٹی کے صاحبزادے، قاضی منصور احمد سے ہو گئی جو پاکستان فارن سروس کے رکن اور اُن دنوں جاپان میں پاکستانی سفارت خانے میں تعیّنات تھے تاہم وہ شادی کے دو ماہ بعد اچانک وفات پا گئیں جس کا ہم سب کو بہت صدمہ ہوا۔ ان کی وفات کی اطلاع ہمیں الفضل ۱۷ جون ۱۹۵۹ء سے ملی۔ اس خبر کے مطابق ان کی وفات دل کی حرکت بند ہو جانے سے ہوئی تھی۔

ان کی وفات کے بعد قاضی محمد اسلم کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۱۷ جولائی ۱۹۵۹ء) سے ان کی شادی

،، بعد کے حالات کا علم ہوا۔ تفصیلات کے مطابق موصوفہ کا نکاح پچیس اکتوبر ۱۹۵۸ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ربوہ میں پڑھا تھا اور ان کی رخصتی پندرہ اپریل ۱۹۵۹ء کو ہوئی جس کے بعد وہ جاپان چلی گئیں تاہم اسی سال ۱۴ جون کو وہ آناً فاناً اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ قاضی محمد اسلم کے الفاظ میں:

''اس روز اتوار تھا۔ کسی قسم کا کھٹکا نہ تھا۔ چند روز پیشتر سے ڈاکٹر نے چلنے پھرنے اور موٹر میں گھومنے کی اجازت دے رکھی تھی چنانچہ وہ ناشتے کے بعد بازار گئے۔ عزیزہ نے اپنے ایک ڈریسنگ گاؤن کے لیے کپڑا خریدا اور درزی کو اس کے متعلق ہدایات دیں۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ کچھ سر درد کی شکایت کی جو دوائی کھانے سے جاتی رہی۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے لگی۔ منصور احمد پاس بیٹھا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ منصور احمد کا دھیان ایک طرف ہوا کہ اس نے ذرا سی سانس کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو امۃ الحفیظ کی روح پرواز کر چکی تھی۔ قفسِ عنصری باقی تھا۔ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر بھی آ پہنچا۔ اس نے کہا کہ ایک سیکنڈ کا حصہ بھی نہیں لگا کہ حفیظ عالمِ جاوداں کو سدھار گئی۔''

اگرچہ ہم سکول کے زمانے میں سنا کرتے تھے کہ خلقی طور پر ان کے دل میں کوئی نقص ہے مگر زیرِ نظر مضمون سے اس کی جزئیات معلوم ہوئیں۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''یہاں تو اسے معمولی تکان کی شکایت تھی یا بھوک کی کمی جسے معمولی سمجھا گیا۔ ٹوکیو پہنچ کر ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے اس تکلیف کو دل کی طرف منسوب کیا یعنی دل کے کسی پیدائشی نقص کی طرف۔ اور بھی تحقیق ہوئی اور علاج بھی ہوا۔ آرام اور احتیاط بتائی گئی۔ عزیزہ کو آرام آنے لگا یہاں تک کہ آخری دنوں میں اکثر ان احتیاطوں اور قیود سے آزاد کر دیا گیا جو علاج کے شروع میں لگائی گئی تھیں چنانچہ جس روز وہ فوت ہوئی منصور احمد اور وہ موٹر میں گھومتے رہے اور ہشاش بشاش گھر واپس پہنچے۔

کُل دو ماہ کی رفاقت اور سسرال سے تعلق لیکن ایسا جو نہایت گہرا اثر چھوڑ گیا۔ اس سے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مدتوں کا تعلق تھا جو ٹوٹ گیا۔ منصور احمد نے لکھا: میں مان نہیں سکتا کہ حفیظ جدا ہوگئی۔ خدا مغفرت کرے اور اپنے قرب میں جگہ دے۔ بڑی شخصیت کی مالک۔ جواں سال لیکن بڑی عمر والے وقار اور سمجھ بوجھ والی بچی تھی۔ ذہین اور زیرک، مختصر لیکن پُرمعنی کلام کرنے والی۔ کئی نیک تمناؤں اور پاک ارادوں کو اپنے ساتھ لے گئی جن کی جزا اب اس کے رب کے پاس ہے۔

منصور احمد نے ایک اور خط میں لکھا: کوئی کہہ سکتا ہے کہ کُل دو ماہ میں دو مکمل اجنبیوں کے درمیان ایسی مفاہمت، ایسی چاہت اور ایسا اعتماد پیدا ہو سکتا ہے جو ہم دونوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

پھر لکھا: میں اپنا کیا لکھوں، مجھ سے بیتا سان، خادمہ کا حال دیکھا نہیں جاتا جس نے ایک عرصہ مسز احمد کی انتظار میں گزارا۔ گھر کا سامان جمع کیا۔ میں اسے کھولنے اور استعمال کرنے کو کہتا تو وہ کہتی: نہیں ابھی نہیں، مسز احمد کے آنے پر کھولیں گے۔ اس کی یاد میں بے حال ہے۔ آج حفیظ کا پورا نام ایک ایک حرف الگ کر کے لکھوایا اور کہا میں اپنے معبد میں اس کے لیے دعا کروں گی۔ عزیزہ امۃ الحفیظ معصوم تھی۔ معصومیت کے عالم میں

اپنے حقیقی مولا سے جاملی۔''

آپی کہتی ہیں: یہ تھا نصرت گرلز ہائی سکول میں اپنی بعض اساتذہ اور ہمجولیوں کا ذکر۔ اب سوچتی ہوں تو سکول میں گزرا ہوا وقت اپنی زندگی کا سب سے سنہری دور معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی فکر تھی نہ فاقہ۔ یہ درست ہے کہ امتحانات کی آمد آمد بعض اوقات پریشانی پیدا کر دیتی تھی لیکن مجموعی طور پر یہ ایسا زمانہ تھا جس کے پلٹنے کی زندگی بھر خواہش ہی رہی۔ سکول کے زمانے کی سہیلیاں اور ان کے ساتھ کئی کئی گھنٹے جاری رہنے والی پُرلطف مجلسیں اور طالبات کی شرارتیں اور استانیوں کی محبت و شفقت میں ملفوف جھڑکیاں اب یاد آتی ہیں تو دل میں اک ٹیس سی اٹھتی ہے۔

میں نے ۱۹۵۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مجھے اب یہ تو یاد نہیں کہ ہمارے سکول کی طرف سے کتنی طالبات اس امتحان میں شامل ہوئی تھیں لیکن پاس ہونے والی طالبات کی تعداد اٹھائیس تھی۔ ان میں سے سولہ طالبات فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھیں۔

اُس سال چوہدری حمید اللہ، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید کی ہمشیرہ رضیہ سلطانہ سکول میں اول رہیں جب کہ بہت اچھے نمبر حاصل کرنے والی دیگر طالبات میں میرے علاوہ حلیمہ مرتضیٰ بھی شامل تھیں۔

آپی کی باتیں تمام ہوئیں۔ اب اسی سکول کا کچھ ذکرِ خیر امۃ الباری ناصر کی زبانی جو آپی کی کلاس فیلو تھیں۔ انہوں نے آپی کے ساتھ ہی نصرت گرلز ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر جامعہ نصرت سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں لیکچرر ہوگئیں۔ امریکہ سے شائع ہونے والے جماعتی رسالہ، النور میں چھپے ہوئے ان کے ایک مضمون کے مطابق، اُن کے اپنے الفاظ میں: ''۱۹۶۳ء کے آخر میں مکرم ناصر احمد قریشی صاحب سے شادی کے بعد کراچی جانا پڑا۔ سروس جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد ۱۹۶۵ء کے آخر میں استعفیٰ دے دیا۔ لیکچررشپ کا عرصہ مختصر رہا مگر جامعہ کی محبت لاانتہا ہے۔......

ناصر صاحب سرکاری ملازم تھے۔ کچھ عرصے بعد ٹرانسفر ہو جاتی۔ زندگی کی گاڑی کراچی، اسلام آباد، لاہور کے سٹیشنوں پر رکتی چلتی رواں دواں رہی۔ ہر جگہ بحمد للہ خدمت کی راہیں نکلتی رہیں۔

۱۹۸۰ء سے کراچی میں لجنہ کا کام شروع کیا۔ نو سال قیادت میں جنرل سیکرٹری رہی۔ ۱۹۸۸ء سے سیکرٹری اشاعت نامزد کر کے جماعت کے صد سالہ جشنِ تشکر کے لیے سو کتب کی اشاعت کا منصوبہ دیا گیا۔ اصحابِ کہف والرّقیم جیسے زمانے میں قلم کا جہاد میسر آ جانا محض احسانِ خداوندی ہے۔ آج ۲۰۱۴ء میں حمد و شکر سے لبریز دل سے یہ لکھ رہی ہوں کہ ننانوے کتب شائع ہو چکی ہیں۔ سوویں زیرِ اشاعت ہے......

اپنی ٹیم کے ساتھ سو کتب کی ایڈیٹنگ اور پبلشنگ کی توفیق ملی جس میں بائیس کتب خاکسارہ نے لکھیں مثلاً مرزا غلام قادر احمد، حضرت مفتی محمد صادق، زندہ درخت اور نمی کا عکس (شعری مجموعہ)۔ بائیس کتب مرتب کیں جن میں اہم ترین درثمین اردو مع فرہنگ، درثمین فارسی مع فرہنگ و ٹرانسلٹریشن، کلامِ محمود مع فرہنگ،

کلامِ طاہر مع فرہنگ، حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کے مضامین، بخارِ دل، آپ بیتی، تواریخ بیت فضل لندن اور کر نہ کر شامل ہیں......

سو کے قریب ایم ٹی اے کے لیے پروگرام کئے جن میں درثمین درست تلفظ اور مشکل الفاظ کے معانی کے پروگرام کئی کئی دفعہ چلے۔ مضامین و نظمیں چھپنے کا سلسلہ مصباح سے شروع ہوا تھا۔ اس نرسری نے حوصلہ افزائی کی اور اب جماعت کے سب اردو اخبار و رسائل میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہتا ہے۔ نثر اور نظم پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے انتہائی شفقت سے دل کھول کر دعا اور داد دی جو بحمد للہ میرا زادِ راہ ہے۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر جلسوں میں میزبانی اور تقاریر کا موقع ملا۔ مشاعروں میں کلام سنایا۔ جماعت کی ویب سائٹ کے لیے آڈیو بکس تیار کرتی ہوں اور کراچی لجنہ کی کتب سکین کر کے الاسلام ڈاٹ آرگ کے لیے بھیجتی ہوں۔ ہر وقت یہی خیال رہتا ہے:

ترے کوچے میں کن راہوں سے آؤں
وہ خدمت کیا ہے جس سے تجھ کو پاؤں

آج کل ڈیٹرائٹ (امریکہ) میں مقیم ہوں۔''

میرا امۃ الباری ناصر سے پہلا تعارف اُس وقت ہوا جب وہ کراچی میں ہوا کرتی تھیں اور میں عبیداللہ علیم پر کچھ کام کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے اِن سے موصوف کے بارے میں کیا معلومات بہم پہنچانے کی درخواست کی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ ان کی طرف سے مجھے فوراً جواب موصول ہوا۔ مدت گزر گئی اور جب مجھے اُن سے دوسری بار رابطے کی ضرورت پیش آئی تو وہ امریکہ منتقل ہو چکی تھیں۔ میں ''قریۂ جاوداں'' میں بابا جی فضل محمد ہرسیاں والے کے فرزند، محمد عبداللہ کا ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن اُن کے بارے میں میرے پاس خاطر خواہ معلومات نہ تھیں۔ میرے علم کے مطابق یہ معلومات صرف امۃ الباری ناصر جو اُن کی بھتیجی ہیں سے ہی مل سکتی تھیں۔ پرویز پروازی نے بتایا کہ وہ امریکہ میں ہیں لیکن اُن کا فون نمبر ان کی رضامندی کے بغیر نہیں دے سکتے۔ خدا کا شکر ہے موصوفہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا چنانچہ میری رہنمائی کے لیے انہوں نے مجھے اپنی تصنیف ''زندہ درخت'' کی ڈیجیٹل کاپی ارسال کردی۔

''قریۂ جاوداں'' کی اشاعت کے بعد تو گویا میرا اُن سے مستقل رابطہ ہو گیا۔ انہوں نے نصرت گرلز ہائی سکول میں گزرے ہوئے وقت پر ایک نظم لکھ کر مجھے ارسال کی ہے جو ذیل میں نقل کی جا رہی ہے۔ امید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔

گھر، گلیوں، اسکول کی یادیں
بچپن کی معصوم سی باتیں
اب بھی اکثر یاد آتی ہیں
اور ماضی میں لے جاتی ہیں

ربوہ نیا آباد ہوا تھا
نصرت گرلز سکول بنا تھا
گھر سے تھا پیدل کا رستہ
گلے میں ڈالے اپنا بستہ
تختی ہاتھ میں لے جاتے تھے
ہم اسکول چلے جاتے تھے
امّی دعا سے رخصت کرتیں
پڑھنے کی تاکید بھی کرتیں
برسوں اک معمول رہا تھا
گھر اور پھر اسکول رہا تھا
تختی سلیٹ پہ لکھ لیتے تھے
بغیر کتابوں کے پڑھتے تھے
چٹائی یا چوکی پر بیٹھے
گا گا کر پہاڑے رٹتے
بنچیں ڈیسکیں بعد میں آئیں
نئی کتابیں چھپ کر آئیں
بعد میں پکّا سکول بنا تھا
بہت اچھا اور بہت بڑا تھا
استانیاں بہت قابل تھیں
ہم کو پیار سے پڑھاتی تھیں
استانی کنیز، سلیمہ، مسعودہ
حور بانو، محمودہ، سیّدہ
امۃ الرشید اور حمیدہ راشدہ
امۃ العزیز اور حمیدہ صابرہ
امۃ الرحمٰن ، زبیدہ ، میمونہ
بلقیس ، ثریا ، رحمت ، صادقہ
کس محنت سے پڑھاتی تھیں!
تربیت بھی فرماتی تھیں

ان سے ڈانٹ بھی کھائی ہم نے
ہلکی مار بھی کھائی ہم نے
گھوٹ کر انگلش گرامر پڑھائی
ہم کو سلائی، کڑھائی سکھائی
مسئلہ فیثاغورث رٹتے
انگلستان کی ہسٹری پڑھتے
ذو اضعاف اقل اور عادِ اعظم
پڑھتے تھے ہم اردو میڈیم
سہیلیاں سکھیاں یاد ہیں اب بھی
تاری، چھیدی یاد ہیں اب بھی
صالی، چھاکی، جمیل اور اچھی
مبارکہ، ساجی، ارشاد اور باچھی
بے حد اچھا وقت گزارا
شرارتیں کرنا یاد ہے سارا
سکول کی کھیلیں یاد ہیں اب تک
رسّی کودنا یاد ہے اب تک
روڑے ، ٹاپو ، ککلی ڈالتے
گڈے گڈی کی شادی کرتے
میرو ڈبہ ، چھپّن چھپائی
کوکلہ چھپاکی ، چور سپاہی
مٹی، دھول میں اَٹ جاتے تھے
ہاتھ اور پاؤں پھٹ جاتے تھے
بے فکری کا شاہی زمانہ
الہڑ شوق ، شریر زمانہ
ٹک شاپ سے اِملی کھانا
چھٹی کرنی کر کے بہانہ
سچے، سُچے، سادے دن تھے
بچپن کے کیا پیارے دن تھے

آپ نے امۃ الباری ناصر کی یہ نظم ملاحظہ کی۔ اب نصرت گرلز ہائی سکول کا کچھ ذکر میری منجھلی ہمشیرہ، صادقہ مرحومہ کی زبانی۔ قیامِ پاکستان کے وقت ان کی عمر بمشکل سات سال تھی چنانچہ انہوں نے ربوہ پہنچنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں دوسری جماعت میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ اپنی کلاس کی محنتی اور ذہین طالبات میں شمار ہوتی تھیں اور اپنی اساتذہ کی چہیتی تھیں۔ وہ بعد میں قریشی سعید احمد اظہر، مربی سلسلہ سے بیاہی گئیں اور اپنی زندگی کے بیشتر ایام ربوہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد میں گزارے اور ۱۰ جولائی ۲۰۱۶ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

ان سے کبھی نصرت گرلز ہائی سکول کی بات ہوتی تو گویا اک دبستان کھل جاتا اور وہ اپنی اساتذہ کرام کی محبت وشفقت کے کئی واقعات سناتیں تاہم یہ مختصر مضمون ان تمام تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا لہٰذا یہاں صرف دو واقعات پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

وہ بتایا کرتی تھیں: استانی میمونہ دینیات اور عربی کی کلاسز لیا کرتی تھیں۔ یہ سکول جماعت کی بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے قائم کیا گیا تھا لہٰذا دینیات اس کے نصاب کا جزولاینفک تھا اور قرآن کریم اور حدیث دینیات کے نصاب کے بنیادی اجزا تھے۔ بچیوں کو ادعیۃ القرآن اور ادعیۃ الرسول زبانی یاد کرائی جاتی تھیں اور سکول کا آغاز دعا سے ہوتا جو استانی میمونہ کراتی تھیں۔ موصوفہ کا بچیوں کی تربیت کا اپنا انداز تھا چنانچہ بعض اوقات وہ کسی طالبہ کو اچانک آواز دے کر سٹیج پر بلا لیتیں اور اسے دعا کرانے کے لیے کہتیں۔ ابتدائی کلاسز کی بات ہے۔ ایک بار انہوں نے مجھے سٹیج پر بلا لیا۔ اس وقت تک مجھے نہ تو کسی مجلس میں تلاوتِ کلام پاک کا موقع ملا تھا، نہ میں نے کبھی نظم پڑھی تھی اور نہ ہی تقریر کی تھی چنانچہ جب میں نے دعائیں پڑھنا شروع کیں تو میری آواز تھرتھرانے لگی اور سننے والوں کو یوں محسوس ہوا گویا مجھ پر رقت طاری ہوگئی ہو۔ مجھے یقین ہے استانی میمونہ نے میری یہ کمزوری بھانپ لی ہوگی مگر انہوں نے میری حوصلہ افزائی کے لیے اس روز دعا میں رقت کی اہمیت پر گفتگو کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ خدائے سمیع وبصیر ہماری آج کی دعائیں ضرور قبول فرمائے گا کیونکہ اس میں درد والحاح کا غلبہ تھا۔ بعد میں انہوں نے مجھے علیحدگی میں بلا کر تسلی دی کہ مجھے اس "گھبراہٹ" سے فکرمند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ سٹیج شائی نیس پر صرف اور صرف پریکٹس سے ہی غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے موقع بموقع سٹیج پر بلاتی رہا کریں گی تا کہ میرے اندر اعتماد کے ساتھ حاضرین وسامعین کا سامنا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے اور الحمدللہ بعد کے مواقع پر میری کارکردگی بہتر ہوتی گئی حتیٰ کہ میں خود سٹیج پر آنے کا اشتیاق ظاہر کرنے لگی۔

صادقہ کہا کرتی تھیں: میں سمجھتی ہوں یہ استانی میمونہ صوفیہ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے جس کا بدلہ ان کی بلندی درجات کے لیے دعاؤں کی صورت میں ہی اتارا جا سکتا ہے۔

سکول کی اساتذہ میں سے ایک استانی حمیدہ صابرہ تھیں۔ بے حد شفیق اور اپنی شاگردوں سے بے لوث محبت کرنے والی۔ صادقہ بتایا کرتی تھیں: مجھے یاد ہے ایک روز شدید گرمی تھی۔ سکول میں بجلی کے پنکھے تو تھے نہیں، میری طبیعت یکا یک خراب ہوگئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مجھے کیا ہوا ہے لیکن میرے لیے کلاس میں بیٹھنا مشکل

ہو گیا۔ موصوفہ پیریڈ لے رہی تھیں۔ انہوں نے میری یہ کیفیت دیکھی تو گھبرا سی گئیں اور ایک طالبہ کو سوڈا واٹر لانے کے لیے بھگایا تاہم میں نے انہیں منع کر دیا۔ تب انہوں نے مجھے کمرے سے باہر بھجوا دیا اور دو لڑکیوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مجھے گتے سے پنکھا کرتی رہیں۔ خدا کا شکر ہے کھلی ہوا میں بیٹھنے سے میری طبیعت جلد ہی بحال ہو گئی اور میں دوبارہ کلاس میں جا کر بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔

اگرچہ میں اب بالکل ٹھیک تھی اور باقی پیریڈز اٹینڈ کر سکتی تھی مگر موصوفہ نے مجھے باقی وقت کی چھٹی لے کر گھر جانے پر مجبور کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے اور ہو سکے تو مجھے کسی طبیب سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے تاکہ اس صورتِ حال کا اعادہ نہ ہو۔

یہ ایک وقتی اور معمولی تکلیف تھی لیکن قریباً ساٹھ سال گزرنے کے باوجود مجھے استانی حمیدہ صابرہ کی طرف سے ملنے والی شفقت و محبت نہیں بھولی۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔

جب کبھی نصرت گرلز ہائی سکول میں کھیلی جانے والی کھیلوں کا ذکر ہوتا تو صادقہ بعض دلچسپ باتیں سنایا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ ہمارے ہاں آج والی جدید کھیلیں رائج نہ تھیں لیکن انسان ہر حال میں اپنی تفریح کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے چنانچہ ہم لوگ ایسی کھیلیں کھیلا کرتے تھے جن پر کوئی خرچ نہ ہو اور تفریح بھی خوب ہو جائے۔ ان میں سے سب سے آسان کھیل تو رسی کودنا تھی۔ یہ کھیل کوئی لڑکی، جب جی چاہے، تنہا بھی کھیل سکتی تھی اور اگر کوئی سہیلی ساتھ مل جاتی تو کھیل کا مزا دو آتشہ ہو جاتا۔ اُس وقت تو اس بات کا احساس نہ تھا لیکن صحتِ جسمانی کی بحالی کے لیے اس سے سخت اور مفید ورزش غالباً اور کوئی نہیں ہے۔ رسی کودنے کے علاوہ تفریح کے اوقات میں لڑکیوں کی دوسری مصروفیت ''کِکلی'' ہوتی تھی جو کسی بھی وقت کوئی سی دو لڑکیاں مل کر ڈال سکتی تھیں۔ اس کھیل میں دونوں لڑکیوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر اتنی دیر تک ایک دائرے میں گھومنا پڑتا تھا جب تک وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بے سُدھ ہو کر گرنے کے قریب نہ پہنچ جائے اور کھیل ختم کرنے کا اعلان نہ کر دے۔ آدھی چھٹی کے دوران جہاں بعض لڑکیاں سکول کا باقی رہ جانے والا کام مکمل کرنے لگتیں اور کچھ یوں ہی بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتیں، چند ایک اپنے اپنے طور پر کِکلی ڈال کر اپنے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچانے لگتیں۔

کِکلی کے حوالے سے ایک لوک گیت یاد آ رہا ہے:

کِکلی کلیر دی
تے پگ میرے وِیر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا
تے فِٹّے منہ جوائی دا

یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس گیت میں ''دوپٹہ میرے بھائی دا'' سے کیا مراد ہے لڑکیاں موقع بہ موقع یہ گیت الاپتی پھرتیں اور خوش ہوتیں۔

اس کے بعد صادقہ اس لوک گیت کی اُس پیروڈی کا حوالہ ضرور دیا کرتی تھیں جو آج کل سوشل میڈیا پر گردش کر رہی ہے۔ آپ بھی سننا چاہیں گے یہ پیروڈی؟

کِکلی کلیر دی
تے پینٹ میرے وِیر دی
شرٹ پاء بشیر دی
تے ٹائی پاء نذیر دی
کوٹ وڈّے پائی دا
لنڈے تو لیائی دا
فِٹ شِٹ کرا کے
دھوبی تو توائی دا
سینٹ شینٹ لائی دا
تے شوق نال پائی دا
دو سو روپے وِچ
باؤ بَن جائی دا
تے فِٹّے منہ مہنگائی دا

یہ پیروڈی سنانے کے بعد وہ باقی کھیلوں کا بھی بہت تفصیلی ذکر کرتیں اور کہتیں: اُس زمانے میں دوسرا انتہائی مقبول کھیل ٹاپو (جسے بعض بچیاں شٹاپو بھی کہا کرتی تھیں) تھا جس کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ اس کھیل کے لیے کھلاڑیوں کے علاوہ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے اور صرف ایک ٹھیکری کی ضرورت ہوتی تھی۔ ٹاپو دراصل ایک ٹانگ پر زیادہ سے زیادہ دیر تک توازن برقرار رکھنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ ہم ٹاپو کھیلنے میں بسا اوقات اتنا مگن ہو جاتے کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔

''کوکلا چھپا کی'' کے لیے کھلاڑیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لڑکیاں ایک دائرے میں بیٹھ جاتیں اور جتنی دیر چاہتیں یہ کھیل کھیلتی رہتیں۔ ایک لڑکی اپنے دوپٹے کو بل دے کر رسّے کی شکل دیتی اور پھر دائرے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے اچانک یہ دوپٹہ کسی لڑکی کے پیچھے پھینک دیتی۔ اگر تو اس لڑکی کو پتا چل جاتا کہ دوپٹہ اس کے پیچھے پھینکا گیا ہے تو وہ اسے اٹھا کر دوپٹہ پھینکنے والی لڑکی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتی اور جب تک وہ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر نہ بیٹھ جاتی بل دیا ہوا دوپٹہ اس کی کمر پر کوڑے کی طرح برساتی جاتی۔ یوں ان سبھی لڑکیوں کو باری باری ''پدنا'' پڑتا۔

وہ بتاتی تھیں کہ ''پدنے'' والی لڑکی دائرے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کے گرد دوڑتے ہوئے یہ شعر ضرور پڑھا کرتی تھی:

کوکلہ چُھپا کی جمعرات آئی اے
جیہڑا اگے پچھے ویکھے اوہدی شامت آئی اے

پھر وہ ایک اور کھیل کا ذکر کرتیں جس میں تین چار لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑی ہو جاتیں اور ان سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر اتنی ہی تعداد میں کچھ اور لڑکیاں اسی انداز میں کھڑی ہو جاتیں۔ لڑکیوں کی ایک قطار آہستہ آہستہ دوسری قطار کی طرف قدم بڑھاتی اور گاتے ہوئے کہتی:

آتے ہیں، ہم آتے ہیں،
بھیگے موسم میں

تب دوسری قطار کی لڑکیاں جواباً کہتیں:

آتے ہو، تم آتے ہو، بھیگے موسم میں
تم کس کو لینے آتے ہو، بھیگے موسم میں

اس پر پہلی قطار کی لڑکیاں دوسری قطار میں کھڑی لڑکیوں میں سے کسی ایک کا نام (فرض کریں رابعہ) لے کر گاتے ہوئے کہتیں:

آتے ہیں، ہم آتے ہیں، بھیگے موسم میں
ہم رابعہ کو لینے آتے ہیں، بھیگے موسم میں

یہ گیت سن کر رابعہ اپنی دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر گانے والی لڑکیوں کے ہمراہ چلی آتی۔
اس کے بعد دوسری قطار یہی کھیل رچاتی جس دوران وہ پہلی قطار کی کسی لڑکی کو ہمراہ لے جاتی۔
یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا تاوقتیکہ اِدھر والی لڑکیاں اُدھر اور اُدھر والی تمام لڑکیاں اِدھر منتقل ہو جاتیں۔
''لُکن میٹی'' کا کھیل بھی عام تھا جس میں ایک لڑکی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاتی اور گانے کے انداز میں کہتی:

لُک چھپ جانا، مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی آئی جے!

وہ تین مرتبہ یہ فقرہ دہراتی اور کھیل میں حصہ لینے والی دیگر لڑکیوں کو ڈھونڈنے لگتی جو اس دوران اِدھر اُدھر چھپ چکی ہوتی تھیں۔
سوشل میڈیا پر لُکن میٹی کا کھیل دیکھیے:

میں تے اوہنوں تھاں تھاں لبھیا لا کے پورا زور
اوہدی میٹی آئی تے اوہنے لبھ لیا کوئی ہور

ایک اور کھیل جسے نہ جانے کیوں ''چیچو چیچ گنڈ یریاں۔ دو تیریاں دو میریاں'' کہتے تھے یوں تھا کہ باری دینے والی لڑکی کے سوا باقی تمام کھلاڑی کسی اینٹ، پتھر، لکڑی یا کاغذ کے ٹکڑے پر کوئلے، سلیٹی یا پنسل سے

چھوٹی چھوٹی لکیریں لگا کر کسی جگہ چُھپا دیتے۔ باری دینے والی لڑکی نے اسے ڈھونڈنا ہوتا تھا۔ جس کی ''چیچو چیچ'' سب سے پہلے مل جاتی اب اسے باری دینا پڑتی۔

روڑے کبھی گیند کے ساتھ اور کبھی گیند کے بغیر کھیلے جاتے تھے۔

پٹھو گرم بڑی مزیدار گیم تھی جو چند لڑکیاں مل کر کھیلتی تھیں۔ اس کے لیے صرف کچھ ٹھیکریاں اور ایک گیند درکار ہوتی تھی۔

صادقہ بتاتی تھیں کہ یہ ساری تو آؤٹ ڈور گیمز تھیں جو سکول کے علاوہ محلّوں میں بھی بہت شوق کے ساتھ کھیلی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں کئی اِن ڈور گیمز بھی رائج تھیں جن میں سے ایک خانہ بند کرنے والی کھیل تھی۔ یہ کھیل کوئی دو لڑکیاں مل کر کھیل سکتی تھیں اور اس کے لیے فراغت یا مصروفیت کی کوئی قید نہ تھی۔ اگر کوئی لیکچر بور محسوس ہوتا تو لڑکیاں استانی کی نظر بچا کر اپنی کسی نوٹ بک یا رَف کاغذ پر یہ کھیل کھیلنا شروع کر دیتیں۔ جو لڑکی زیادہ خانے بند کر لیتی وہی یہ کھیل جیتتی۔

دوسری کھیل بھی اس سے ملتی جلتی تھی جس میں اپنے مدِ مقابل کی نظر بچا کر سلیٹ یا کاپی پر کوئی ہندسہ یا حرف لکھا جاتا اور پھر اس سے بہ آواز بلند پوچھا جاتا: پایا پایا کی پایا؟ اگر وہ اس سوال کا صحیح جواب دے پاتی تو باری اس کے پاس چلی جاتی۔ ذرا سی فرصت ملنے پر بچیاں یہ کھیل بھی بڑے ذوق و شوق سے کھیلا کرتی تھیں۔
یہی نہیں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے رنگ برنگے ٹکڑے جمع کرنا بھی ہمارا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ ان ٹکڑوں کو سلیٹ یا زمین پر جوڑ کر پھول اور پتے بنائے جاتے تھے۔

کبھی جو عہدِ گزشتہ کو لَوٹ کر دیکھا
دل و نگاہ نے کیا کیا نہ اس میں رنگ بھرے

اس زمانے میں کھیلنے کے لیے بچوں کو آج والے جدید کھلونے میسر نہ تھے لہٰذا وہ مٹی گوندھ کر خود ہی اسے مختلف شکلیں دیتے رہتے۔ جانوروں، انسانوں، پھلوں کی شکل کے یہ کھلونے خشک کر لئے جاتے اور کھیل کے لیے استعمال ہوتے۔

مٹی کے کھلونوں کا ذکر ہوتا تو صادقہ بتاتیں کہ ہم اپنی سادگی میں گُندھی ہوئی مٹی کا ایک گولہ بناتے اور پھر اپنے انگوٹھے کو دبا کر اس کے درمیان ایک گڑھا سا بنا دیتے۔ پھر ہم اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ہاتھ کو دائیں بائیں حرکت دیتے اور ساتھ ہی ایک لوک گیت گاتے چلے جاتے۔ اس کا کچھ حصہ یاد رہ گیا ہے:

آ کا با کا چڑی چڑاکا
نائن دے گھر ہویا کاکا
کاکے نے ماری چیخ

صادقہ بتاتی تھیں: ''چیخ'' کا لفظ ادا کرتے ہوئے ہم مٹی کے اس گولے کو فرش پر دے مارتیں جس سے عین اس جگہ جہاں انگوٹھے کے دباؤ سے گڑھا بنایا گیا ہوتا تھا ''ٹھاہ'' یا ''پٹاخ'' کی آواز کے ساتھ ایک سوراخ بن

جاتا۔ ہم لڑکیاں اس کھیل سے بھی خوب لطف اندوز ہوتیں۔

مٹی کے علاوہ ان دنوں کاغذ کے کھلونے بنانے کا بھی راج تھا۔ اس کے لیے ردی کاغذوں (خصوصاً پرانے اخبارات یا ناقابلِ استعمال کتابوں اور کاپیوں) کو رات بھر کے لیے وافر پانی میں بھگو دیا جاتا۔ صبح تک یہ کاغذ نرم پڑ جاتا چنانچہ اسے مسل کر ایک ملیدہ سا بنا لیا جاتا۔ اس ملیدے سے کھلونے تیار کئے جاتے۔ بعض سگھڑ خواتین اس ملیدے سے گھر کے استعمال کے لیے برتن علی الخصوص ٹوپے یا چنگیریں اور پراتیں تیار کر لیتی تھیں۔ یہ ٹوپے یا چنگیریں جو وزن میں بے حد ہلکی ہوتیں خشک اجناس رکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔

اُن دنوں بعض خانہ بدوش بھی اس قسم کے کھلونے تیار کر کے گلی گلی بیچا کرتے تھے اور ان کھلونوں کی سب سے ترقی یافتہ شکل کاغذ اور بھوسے کے بنے ہوئے وہ دیدہ زیب گھوڑے تھے جو بالفاظِ صادقہ ہم جیسے ''غیر متمدن'' بچوں کو بہت فیسینیٹ کرتے تھے۔ ان کھلونوں کو عرفِ عام میں ''گُھگو گھوڑے'' کہا جاتا تھا۔ اگر یہ کھلونے بھی خریدنے کی استطاعت نہ ہوتی تو ہم اپنے ہاتھ سے بھنبھیری تیار کر لیتے جس کے لیے صرف ایک سرکنڈے، کاغذ اور ایک پیپر پِن کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم بھنبھیری کو ہاتھ میں پکڑ کر تیزی سے بھاگتے تو بھنبھیری ہوا کے زور سے خود بخود گھومنے لگتی اور بڑا مزا آتا۔

سکول کے نتائج کا اعلان عام طور پر ۳۱ مارچ کو ہوتا جس کے بعد دو ہفتے کے لیے بہار کی چھٹیاں ہو جاتیں۔ ان چھٹیوں میں ہم نئی کلاس کے لیے ''بستہ'' تیار کرتے یعنی نئی یا استعمال شدہ کتابیں اور کاپیاں خریدتے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں استعمال شدہ ٹیکسٹ بکس بازار میں ایک تہائی قیمت پر بِک جاتی تھیں جب کہ ضرورت مند یہی کتابیں نصف قیمت پر خرید سکتے تھے۔ یقیناً ربوہ کے کئی دکاندار یہ کاروبار کرتے ہوں گے مگر پیر مبارک احمد کا پیر جنرل سٹور واقع تعلیم الاسلام ہائی سکول اس کاروبار کی خاص شہرت رکھتا تھا۔ حسبِ ضرورت ان کتابوں کو جِلد کرایا جاتا اور جلد کو میل کچیل سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر بڑے اہتمام کے ساتھ اخبار کا کاغذ یا خاکی رنگ کا موٹا کاغذ چڑھایا جاتا۔ کتابوں کے علاوہ نئے سال کے لیے پین یا قلم اور پنسلوں کا انتظام بھی ان ہی چھٹیوں کے دوران میں کیا جاتا۔

میری یہ مرحومہ بہن اپنی گفتگو کو جابجا اپنی سہیلیوں کے ذکر سے ضرور مزیّن کرتیں اور کہا کرتی تھیں: ہماری کلاس میں یوں تو بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن میری زیادہ دوستی صادقہ رمضان، آنسہ، طاہرہ رمضان، ماہ رخ پروین، راشدہ مبارکہ اور نعیمہ سے تھی۔

صادقہ رمضان انجمن کوارٹرز کے ایک مکین، منشی رمضان علی کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے بعد میں انگریزی میں ایم اے کیا اور جامعہ نصرت میں پڑھانے لگیں۔

آنسہ حضرت سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ کی صاحبزادی ہیں۔ آج کل لاہور ہوتی ہیں۔

طاہرہ رمضان کیپٹن ڈاکٹر محمد رمضان، ساکن محلہ دارالصدر غربی کی چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ ان کی شادی قریشی نورالحق تنویر سے ہوئی جو جامعہ احمدیہ میں پروفیسر رہے ہیں۔

ماہ رخ پروین جنہیں گھر میں ''وِینی'' کہا جاتا تھا سیّد بشیر شاہ، منیجر دواخانہ خدمتِ خلق کی بیٹی تھیں جو بعد میں سیّدہ مہر آپا حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے بھائی، سیّد نسیم شاہ کے عقد میں آئیں۔

راشدہ مبارکہ نواب محمد احمد کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کے صاحبزادے، سیّد محمد امین سے ہوئی تھی۔

رہیں نعیمہ تو وہ انجمن کوارٹرز ہی کے ایک رہائشی، ملک عبدالرحمٰن کی بیٹی تھیں۔

صادقہ بتایا کرتی تھیں کہ ان میں سے راشدہ مبارکہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں جب کہ باقی سب سہیلیاں بفضلہٖ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں اگرچہ ان سے ملاقات کم کم ہوتی ہے۔ بقول میر:

صاحب سلامت اب بھی مری شیخ جی سے ہے
لیکن چھٹے چھ ماہے وہی راہ باٹ ہیں

بلکہ ہماری ملاقاتوں پر تو کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

آپ نے نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں بعض بھولی بسری باتیں میری ہمشیرہ، صادقہ کی زبانی سنیں۔ اب میں آپ کی ملاقات ان ہی کی ہم نام، ان کی ایک کلاس فیلو اور گہری سہیلی، صادقہ رمضان (جنہوں نے شادی کے بعد صادقہ ظفر کہلانا شروع کر دیا ہے) سے کرانا چاہتا ہوں جن کا ذکر کچھ ہی دیر پہلے گزرا ہے۔ وہ انجمن کوارٹرز میں لمبا عرصہ ہماری پڑوسن رہیں۔ انہوں نے صادقہ کے ساتھ ہی ۱۹۴۹ء میں نصرت گرلز ہائی سکول میں داخلہ لیا تھا اور ۱۹۵۸ء میں میٹرک کیا۔ وہ اب بھی ربوہ میں مقیم ہیں اور نصرت گرلز ہائی سکول میں گزرے ہوئے وقت کی یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے کہتی ہیں: میں سمجھتی ہوں یہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کا اپنی جماعت پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے خواتین کی تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دی اور قیامِ پاکستان کے بعد انتہائی نامساعد حالات میں نصرت گرلز ہائی سکول اور کچھ سال کے بعد جامعہ نصرت قائم کر کے خواتین کی ترقی کی راہیں کھولیں۔ اگرچہ اس زمانے میں جماعت کے کارکنان کے مالی حالات بے حد مخدوش تھے اور روزمرہ کے اخراجات پورے کرنا بھی دوبھر تھا لیکن ان میں سے کوئی بدنصیب ہی ہوگا جس کی بچیاں زیورِ تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ اگر کوئی بچی معمولی فیس ادا کرنے کی سکت بھی نہ رکھتی تو اسے آدھی فیس کی رعایت دے دی جاتی اور استثنائی حالات میں پوری فیس بھی معاف کر دی جاتی۔ کوشش یہ کی جاتی تھی کہ کوئی بچی نامساعد حالات کی وجہ سے کم از کم ابتدائی تعلیم سے محروم نہ رہے اور میرا خیال ہے جماعت کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ آج ربوہ کی آبادی میں پڑھی لکھی خواتین کا تناسب ملک کے کسی بھی شہر سے زیادہ نہیں تو برابر ضرور ہے۔

صادقہ ظفر کہتی ہیں: اب میں یہ عرض کرنا چاہوں گی کہ نصرت گرلز ہائی سکول کی معلّمات اپنے پیشے کے ساتھ بے حد مخلص تھیں۔ انہوں نے اپنی شاگردوں کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح سمجھا اور ان کی تعلیم و تربیت پر ہر ممکن توجہ دی۔ یہ اسی محبت اور محنت کا ثمر تھا کہ ہم میں سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر جانے والی یا امتحانات میں پے در پے فیل ہونے والی طالبات کی تعداد بہت محدود رہی اور اکثر لڑکیاں کم از کم میٹرک تک ضرور پڑھ جاتی

تھیں۔ اس امر سے قطع نظر کہ ان معلّمات نے ہمیں کتنا عرصہ پڑھایا ہم شاگردوں کے دل میں ان کی یاد ہمہ وقت تازہ رہتی ہے اور ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ انہیں ان کی اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ نصرت گرلز ہائی سکول کی قابلِ فخر معلّمات کے بارے میں باقی لوگوں نے بھی آپ کو ضرور کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا لہٰذا میں بہت اختصار کے ساتھ ان میں سے صرف چند کے ذکر پر اکتفا کروں گی۔

وہ کہتی ہیں: سکول میں میری پہلی استاد، استانی کنیز فاطمہ تھیں۔ وہ مرزا محمد اسماعیل آف کپورتھلہ کی صاحبزادی اور مرزا نور احمد نامی ایک بزرگ کی اہلیہ تھیں۔ انہیں حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا بھی شرف حاصل تھا چنانچہ بتایا جاتا تھا کہ ۱۹۵۰ء میں جب لجنہ ہال کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو اس کی بنیاد میں ایک اینٹ انہوں نے بھی نصب کی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار استاد تھیں۔ مزاج میں معمولی سی سختی ضرور تھی لیکن انہوں نے اپنے شاگردوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے سکول کے ساتھ ہماری محبت اور پڑھائی کے شوق میں اضافہ ہوا۔

استانی امۃ الرحمٰن عمر کے بعد استانی امۃ العزیز عائشہ ہماری ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ وہ ہمارا کوئی پیریڈ نہیں لیتی تھیں تاہم مجھے یاد ہے کہ ہائی کلاسز میں ایک بار جب ہماری ہسٹری کی معلّمہ طویل رخصت پر گئیں تو موصوفہ نے ہماری یہ کلاس لینا شروع کر دی۔ ہمارے تاریخ کے نصاب میں قدیم ہندوستان کا بالکل ابتدائی دور اور مختلف ہندو خاندانوں کی حکومت، مسلمانوں کی برصغیر میں آمد اور مختلف مسلمان حکمران خاندانوں کا عروج و زوال، سکھ دور، برٹش انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں سرگرمیاں، برصغیر پر انگریزی تسلّط اور برطانوی حکومت سے برصغیر کی آزادی شامل تھی۔ موصوفہ کے لیکچر سن کر مجھے احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پڑھانے کا ملکہ عطا کر رکھا ہے۔ وہ اس دلچسپ انداز میں لیکچر دیتیں کہ سبق ساتھ کے ساتھ ازبر ہوتا چلا جاتا اور گھر جا کر ایک دو مرتبہ دہرانے سے تو گویا ذہن پر نقش ہو جاتا۔

امۃ المنان ریحانہ جو منور احمد فوٹوگرافر، درویش قادیان کی اہلیہ اور مرزا برکت علی کی بہو تھیں ایک اچھی اور قابل استاد تو تھیں ہی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بے حد خوبصورت آواز سے بھی نواز رکھا تھا جس کا مظاہرہ وہ مختلف اجتماعات میں کرتی رہتی تھیں۔ مجھے یوم مصلح موعود اور لجنہ کے بعض جلسوں میں ان کا ترنّم سے نظمیں پڑھنا آج تک یاد ہے۔ سننے والے ان کی آواز سن کر وجد میں آ جاتے اور جی چاہتا کہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری رہے۔

استانی میمونہ نے ہمیں روزمرہ کی بنیادی لیکن اہم دعائیں یاد کرائیں۔ اجتماعات میں اکثر وہی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ سورۃ آلِ عمران کے آخری رکوع کی وہ بکثرت تلاوت کرتیں اور میں اس بات کی چشم دید گواہ ہوں کہ ایسا کرتے ہوئے رقّت کی وجہ سے ان کا قمیص تر ہونے لگتا۔

میں استانی امۃ الرشید شوکت (اہلیہ ملک سیف الرحمٰن، مفتی سلسلہ) کا یہ احسان کبھی نہیں بھلا سکتی کہ انہوں نے ہمیں قرآن مجید اور اس کا ترجمہ، حضرت مسیح موعود کی تصنیفِ لطیف کشتی نوح اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی کتاب دعوۃ الامیر پڑھائی۔ وہ اس محنت اور محبت سے پڑھاتی تھیں کہ قرآن حکیم کی تعلیمات میرے دل و دماغ

پر نقش ہو گئیں۔ ان کی بہن امۃ المنان قمر (جو بعد میں میر غلام احمد نسیم، مربی سلسلہ کے عقد میں آئیں) ہائی کلاسز میں ہمیں سائنس پڑھاتی تھیں۔ وہ اپنے مضمون کو دلچسپ اور آسان طریق پر ذہن نشین کراتیں اور پریکٹیکلز کے لیے دیر تک سکول میں رکتیں۔ کچھ عرصے تک فائنل امتحان کے پریکٹیکلز تعلیم الاسلام ہائی سکول کی لیبارٹری میں ہوتے تھے لیکن جب ہمارے سکول کی اپنی لیبارٹری مکمل ہو گئی تو پریکٹیکلز یہیں ہونے لگے۔

استانی سیّدہ (جو حضرت سیّد مہدی حسین موج، یکے از ۳۱۳ رفقائے حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی تھیں) کی کس کس خوبی کا ذکر کروں! انہیں انگریزی اور اردو، دونوں زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی اور دونوں برابر مہارت اور اعتماد کے ساتھ پڑھا سکتی تھیں۔ وہ اس شوق اور انہماک سے پڑھاتیں کہ ان کا بتایا ہوا ایک ایک لفظ دماغ میں بیٹھتا چلا جاتا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ طالبات کی ذہنی اور نظریاتی تربیت پر بھی بہت زور دیتیں۔ وہ طالبات کو کلاس روم کے آداب نہ صرف سکھاتیں بلکہ ان پر عمل بھی کراتیں۔ وہ محنت میں عظمت ہے کے اصول پر خود بھی کاربند تھیں اور یہی جذبہ اپنی شاگردوں میں پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ وقارِ عمل کی اہمیت سے بخوبی آشنا تھیں اور چاہتی تھیں کہ طالبات بھی کسی کام میں حجاب نہ محسوس کریں۔

نصرت گرلز ہائی سکول کی ایک اور استانی، رضیہ غزنوی نیک محمد غزنوی کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے بعد ان کی ہمشیرہ، رفیعہ غزنوی بھی سکول میں پڑھاتی رہیں اور ہیڈ مسٹریس بن کر ریٹائر ہوئیں۔ نیک محمد غزنوی کی جماعت کے لیے قربانی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ انہوں نے غزنی کے راج محل کو لات مار کر قادیان کی گداگری کو ترجیح دی تھی لہٰذا ان دونوں کے لیے ان کے رفقائے کار کے علاوہ ان کے شاگردوں کے دل میں بھی بہت عزت تھی۔

قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ پاکستان گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن کا قیام قائداعظم کی زیرِ ہدایت ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو عمل میں آیا تھا۔ اس روز مس فاطمہ جناح اس ایسوسی ایشن کی تاحیات سرپرست مقرر ہوئیں اور انتخاب کے ذریعے بیگم جی اے خان کا بطور چیف کمشنر تقرر عمل میں آیا۔ اس ایسوسی ایشن کے قیام کی بڑی غرض و غایت یہ تھی کہ بچیوں اور نوجوان عورتوں میں ایسی صلاحیت پیدا کی جا سکے کہ وہ پُر اعتماد، محبّ وطن اور قانون کا احترام کرنے والے شہری کے طور پر اپنے اپنے گھروں، اپنے ماحول اور اپنے ملک کے حوالے سے خود پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں بطریقِ احسن ادا کر سکیں۔ نصرت گرلز ہائی سکول کے ابتدائی ایام میں یہاں بھی گرلز گائیڈ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور استانی امۃ الحفیظ ثریا اس کی انچارج مقرر ہوئیں تاہم چند سالوں کے بعد نامعلوم وجوہات کی بنا پر سکول کا اس تنظیم سے تعلق ختم کر دیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں نصرت گرلز ہائی سکول کچی عمارت سے محلّہ دارالصدر میں واقع اپنی موجودہ پختہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔ اس عمارت کے کمرے کشادہ اور روشن تھے اور ہمارے لیے یہ ایک بہت خوشکن تبدیلی تھی۔ کمروں کی کھڑکیاں بڑی بڑی تھیں اور آہستہ آہستہ سکول میں سائنس لَیب اور لائبریری بھی بن گئی تھی۔

نصرت گرلز ہائی سکول میں شروع سے ہی یہ طریق چلا آ رہا تھا کہ کلاس روم کی صفائی لڑکیوں کی اپنی

ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ ہر روز کسی ایک ڈیسک پر بیٹھنے والی لڑکیوں کی ڈیوٹی ہوتی کہ وہ چھٹی کے بعد کمرے کی اطمینان بخش صفائی کرنے کے بعد گھروں کو جائیں۔ کچے سکول میں چونکہ کمروں کے فرش کچے تھے اس لیے بچیاں پہلے بالٹی میں پانی لے کر آتیں، فرش پر چھڑکاؤ کرتیں اور اس کے بعد جھاڑو لگا کر پوچا پھیرتیں۔ ہر کلاس کی اپنی بالٹی اور جھاڑو تھے اور ہر بچی بخوشی اس کام میں حصہ لیتی تھی۔ پختہ سکول میں کمروں میں اینٹوں کا فرش لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے صفائی کرنا نسبتاً آسان ہوگیا۔

نئی عمارت میں کھیل کے وسیع و عریض میدان بھی موجود تھے۔ پرائمری سیکشن کی عمارت ہائی سکول کی عمارت سے ذرا ہٹ کر تعمیر کی گئی تھی۔ اسی طرح ایک چھوٹا سا ہوسٹل بھی موجود تھا۔

جب تک میں نصرت گرلز ہائی سکول میں رہی، سکول کا اپنا کوئی ہال نہیں تھا چنانچہ مڈل اور میٹرک کے بورڈ کے امتحانات لجنہ اماء اللہ کے ہال میں ہوا کرتے تھے۔

ہم ساتویں جماعت میں تھے جب ہمیں خانہ داری کا مضمون پڑھایا جانے لگا۔ اس مضمون کی ایک ٹیکسٹ بک بھی اُن دنوں رائج تھی جس میں انڈہ ابالنے، اسے فرائی کرنے، اس کا آملیٹ بنانے اور چائے بنانے کا طریقہ سکھایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں مختلف ڈِشز تیار کرنے کے لیے مفصّل ہدایات بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ کتاب میں بتایا گیا تھا کہ باورچی خانہ کو ایک قابلِ عمل مطبخ بنانے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہئے اور اس کی صفائی ستھرائی کے لیے کون کون سی احتیاط لازم ہے۔ یہ کتاب ہمیں کچھ اس طرح پڑھائی گئی کہ کھانا پکانے کے بارے میں بنیادی باتیں ہمارے ذہن نشین ہوگئیں اور زندگی بھر کام آتی رہیں۔

سال میں غالباً چار مرتبہ یعنی سہ ماہی، ششماہی، نوماہی اور سالانہ امتحان کے آخری روز خانہ داری کا پریکٹیکل ہوا کرتا تھا۔ اس امتحان کے لیے ہر طالبہ کو چولہا یا سٹوو یا انگیٹھی اور اس میں جلایا جانے والا ایندھن، ضروری برتن، آٹا، دال، چاول، گھی، چینی، سبزی، گوشت اور مرچ مصالحے گھر سے لے جانا پڑتے تھے۔ مجھے یاد ہے ابھی تک پسے ہوئے مصالحہ جات مارکیٹ میں رائج نہیں ہوئے تھے لہٰذا ہر طالبہ کو گونڈی ڈنڈا یا سِل بٹا بھی ہمراہ لے جانا پڑتا تھا۔ طالبات کے لیے یہ سامان اٹھا کر لے جانا ممکن نہ ہوتا تھا چنانچہ ان کے والد، والدہ یا کوئی بھائی بہن اس معاملہ میں ان کی مدد کرتے اور یوں اس روز وہ لدے پھندے سکول پہنچتے۔ ہر طالبہ کو ایک مخصوص جگہ الاٹ کر دی جاتی جہاں ایک مقررہ وقت کے اندر مطلوبہ ڈِشز تیار کرنا ہوتیں۔ قریب ہی ایک میز پڑا ہوتا تھا۔ کھانا تیار ہو جاتا تو اس میز پر سجا دیا جاتا۔ ممتحن معلّمات ہر میز کا چکر لگاتیں اور ہر ڈِش چکھنے کے بعد اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ اگر ڈِش مزیدار ہوتی تو زیادہ نمبر ملتے لیکن اگر گزارا ہی ہوتا تو اس طالبہ کو محض پاس مارکس پر قناعت کرنا پڑتی۔ مجھے یاد ہے کچھ نمبر اس بات کے بھی ہوتے تھے کہ ڈِشز پیش کیسے کی گئی ہیں۔ اس حوالے سے برتنوں کا معیار بھی ممتحن کو متاثر کرتا تھا لیکن اس زمانے میں عام طور پر طالبات کا معیار زندگی ایک ہی جیسا تھا اور متموّل خاندانوں کی لڑکیاں سکول میں نہ ہونے کے برابر تھیں لہٰذا الّا ماشاء اللہ اس معاملہ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا کم ہی موقع پیدا ہوتا۔ نمبر دیتے وقت یہ امر بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ کھانا

پکانے کے بعد چولہے اور اس کے ماحول کی صفائی کس طرح کی گئی ہے اور اسی سے کسی طالبہ کے سگھڑ یا پھوہڑ ہونے کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ خانہ داری ایک دلچسپ عمل ہوتا جس کے ہم بے چینی سے منتظر رہتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے لیے باقی پرچوں کی طرح دماغ سوزی نہیں کرنا پڑتی تھی اور کھیل ہی کھیل میں یہ امتحان مکمل ہو جاتا۔ اس روز بعض ایسی ڈِشز بھی کھانے کو مل جاتیں جو ہمارے گھروں میں عام طور پر نہیں پکتی تھیں۔

یاد رہے کہ ہمارے زمانے میں خانہ داری کے پریکٹیکلز لجنہ ہال کے برآمدے میں ہوا کرتے تھے۔

نصرت گرلز ہائی سکول کے نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد یہاں ہر سال مینا بازار کا بھی انعقاد ہونے لگا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ طالبات کی انتظامی صلاحیتوں کو صیقل کیا جا سکے۔ یہ درست ہے کہ اس موقع پر کھانے پینے کے سٹال لگائے جاتے اور طالبات کے ہاتھوں سے بنی ہوئی اشیاء کی فروخت کا انتظام بھی ہوتا تاہم اس ساری سرگرمی کا مقصد پیسہ کمانا ہرگز نہ تھا۔ چونکہ مینا بازار کی تیاری کم و بیش ہفتہ دس دن پہلے شروع ہو جاتی تھی لہٰذا سکول کی فضا بدل جاتی اور طالبات اس دن کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگتیں۔ مینا بازار میں ربوہ کی عورتیں بھی شاپنگ کے لیے آیا کرتی تھیں لہٰذا اس روز سکول میں خوب چہل پہل رہتی۔ مجھے یاد ہے ہر سٹال کی انچارج ایک ٹیچر ہوا کرتی تھی اور سٹالز پر ہائی کلاسز کی بچیوں کے علاوہ ساتویں آٹھویں کلاس کی بچیوں کو بھی معاونات کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ یوں افرادی قوت کی کمی بھی محسوس نہ ہوتی اور بچیوں میں ٹیم ورک کا جذبہ بھی بیدار ہوتا۔ اسی طرح انہیں سینئر طالبات اور ٹیچر انچارج کی اطاعت کا سبق بھی ملتا۔

مینا بازار کا ایک حصہ ورائٹی پروگرام پر مشتمل ہوتا تھا جس میں نظمیں اور ٹیبلوز پیش کئے جاتے تھے۔ ٹیبلوز میں عموماً چھوٹی بچیوں کو مختلف کرداروں کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سب کردار مزاحیہ لیکن سبق آموز ہوتے۔ ایک ٹیبلو آج تک مجھے یاد ہے جو مختلف ممالک اور قوموں کی عادات سے متعلق تھا۔ اس میں ہر بچی ایک ملک یا ایک علاقے کی نمائندگی کرتی تھی اور ناظرین کو بتایا جاتا تھا کہ یہ بچی صبح اٹھ کر سب سے پہلا کام کیا کرتی ہے۔ اس ٹیبلو کے آخر میں ایک ہندو بچی دکھائی گئی جو اپنی صبح کا آغاز رام کا نام جپنے سے کرتی ہے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک بچی جس نے اپنے گلے میں صلیب لٹکائی ہوئی تھی مسیحی برادری کے رہن سہن کی عکاسی کرتی تھی۔ پھر ایک گوری چٹی انگریز بچی دکھائی گئی جو صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنے دانتوں کو برش کرتی ہے اور پھر بریک فاسٹ ٹیبل پر جانے کی تیاری کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک پنجابی بچی آئی۔ وہ جاگتے ہی آنکھیں ملتی ہوئی سیدھی اپنی ماں کے پاس جاتی ہے اور روتے روتے دو تین دفعہ آواز لگاتی ہے: ''اماں! روٹی......'' آخر میں ایک احمدی بچی دکھائی گئی جو آنکھ کھلنے کے بعد کچھ دیر اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتی ہے اور سنتِ نبوی کی پیروی میں صبح اٹھنے کی دعا باآوازِ بلند پڑھتی ہے۔ اس کے بعد وہ وضو کرتی ہے اور پھر نماز پڑھتی ہے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ ابتدائے ربوہ میں چوتھی یا شاید پانچویں جماعت تک مخلوط تعلیم رائج تھی۔ دراصل لڑکوں کا ہائی سکول چنیوٹ میں تھا اور پرائمری کلاسز کے بچوں کا روزانہ ربوہ سے چنیوٹ جا کر واپس آنا آسان نہ تھا لہٰذا انہیں لڑکیوں کے سکول میں داخل کرلیا جاتا تھا۔ صادقہ ظفر کہتی ہیں: مجھے اپنے کلاس فیلوز میں سے

صرف ایک نام یاد ہے اور وہ ہے شاہد احمد قریشی کا جو مربی سلسلہ قریشی محمد افضل کے صاحبزادے ہیں۔ یہ شناخت بھی صرف اس لیے رہی کہ ان کی ایک بہن میری سہیلیوں میں سے تھی اور ہماری گفتگو میں کبھی کبھار ان کا ذکر آ جاتا تھا۔

شاہد نے بعد میں مائیکروبائیالوجی میں ایم ایس سی کیا اور لمبا عرصہ غانا اور نائیجیریا کے جماعتی سکولوں میں پڑھانے کے بعد نصرت جہاں اکیڈمی میں تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اب وہ مستقل طور پر ربوہ ہی کے محلّہ دارالرحمت وسطی میں مقیم ہیں۔

صادقہ ظفر کا بیان ختم ہوا۔ اب میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شاہد احمد قریشی میرے احباب میں سے ہیں چنانچہ میں نے ان سے سوال کیا کہ نصرت گرلز ہائی سکول میں ان کے کلاس فیلوز میں کون کون سے طلبہ شامل تھے تو انہوں نے بتایا: ''بہت سے لڑکے تھے۔ کچھ راستے میں ہی چھوڑ گئے۔ باقی سب کے نام بھی اب یاد نہیں نہ ہر ایک سے رابطہ ہے۔ فوری طور پر جو نام ذہن میں آ رہے ہیں ان میں شیخ مامون احمد، حمید احمد خالد، عبدالسلام بدر اور بشیر احمد سالک شامل ہیں۔''

''مامون وہی تو نہیں جو شیخ عبدالواحد مربی ایران وچین کے صاحبزادے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی۔ بالکل وہی۔ انہوں نے باہر کی کسی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تھی۔ لاہور میں ہوا کرتے تھے۔ اب وفات پا چکے ہیں۔''

''جب میں کالج میں داخل ہوا تو وہ غالباً بی ایس سی کے آخری سال میں تھے۔ میں نے انہیں اسی زمانے میں دیکھا، بعد میں کبھی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔''

''حمید احمد خالد کو بھی آپ جانتے ہیں؟''

''وہی تو نہیں جو جامعہ احمدیہ کے لائبریرین ہوا کرتے تھے؟''

''جی وہی۔ سنا ہے اب جرمنی جا چکے ہیں۔''

''اور عبدالسلام بدر؟''

''ابتدائے ربوہ میں بدرالدین نامی ایک ٹھیکیدار ہوا کرتے تھے۔ عبدالسّلام ان کے بیٹے ہیں۔''

''بدرالدین...... وہی نا جن کی فیکٹری ایریا میں آٹا چکی تھی؟ میں تو انہیں عبدالسلام مبشر کے طور پر پہچانتا ہوں۔ وہ الیکشن کمیشن میں ہوا کرتے تھے لیکن خدا جانے ریٹائرمنٹ سے پہلے یا فوراً بعد کینیڈا چلے گئے تھے۔''

''بشیر احمد سالک ان ہی کے بھائی تھے۔''

''میں نے شاید انہیں بھی دیکھ رکھا ہو لیکن یاد نہیں آ رہا۔ وہ اب کدھر ہوتے ہیں؟''

''وہ چوہدری سمیع اللہ سیال کے ہم زلف ہیں۔ ان کی ملازمت کا زیادہ حصہ ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسز میں گزرا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد میں ہیں۔ ہوسکتا ہے ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفیسر ہو کر ریٹائر ہوئے ہوں۔'' ''ان کے علاوہ کوئی اور نام؟''

''ہمارے کلاس فیلوز میں سے تو اور کوئی نام یاد نہیں آ رہا البتہ ملک فاروق احمد کھوکھر ہم سے ایک کلاس سینئر تھے۔''

''ملک عمر علی کھوکھر کے بیٹے؟''

''جی ہاں۔ وہی۔ میرا خیال ہے وہ کچھ عرصہ ملتان میں امیر جماعت بھی رہے ہیں۔''

شاہد قریشی کے ساتھ ہونے والی گفتگو آپ نے سنی۔ آیئے اب ملتے ہیں نصرت گرلز ہائی سکول کی ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ، طیّبہ کریم شاہد سے۔ سچ پوچھیں تو کچھ مہینے پہلے تک آپ کی طرح یہ نام میرے لیے بھی اجنبی تھا لیکن اللہ بھلا کرے میرے تایازاد بھائی، محمد رفیع مقیم لندن کی اہلیہ، بھابھی کشور کا جن کی وہ کلاس فیلو رہی ہیں۔ بھابھی نے ہی میرا ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ ان کی نظر میں اپنے اعلیٰ علمی و ادبی ذوق اور عمدہ حافظے کی بدولت صرف وہی اُس دور کی صحیح عکاسی کر سکتی ہیں۔ یہ طیّبہ کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھ سے اُس زمانے کی کچھ یادیں شیئر کیں۔ یاد رہے کہ طیّبہ جمعدار فضل الدین کمبوہ اوورسیئر، رفیق حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی ہیں۔

انہوں نے ۱۹۵۰ء میں نصرت گرلز ہائی سکول کی نویں جماعت میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد جامعہ نصرت سے ایف اے کیا اور پھر لاہور منتقل ہو گئیں۔

انہوں نے لاہور کالج فار ویمن سے بی اے اور لیڈی میکلیگن کالج سے بی ایڈ پاس کرنے کے بعد ایک مقامی سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی عرصے میں ان کی شادی عبدالکریم نامی ایک نوجوان سے ہو گئی جو یوں تو نیوی میں انجینئرنگ کے شعبے سے متعلق تھے لیکن انہوں نے ریٹائرمنٹ لے کر ایک ریڈیو ٹیلی کمیونیکیشن سنٹر کھول لیا تھا۔ ان دنوں پاکستان میں ٹی وی کی آمد آمد تھی۔ ان کے شوہر نے سوچا کہ اگر وہ انگلستان جا کر ٹیلی ویژن کا کوئی چھوٹا موٹا کورس کر لیں تو یہ بات کاروباری لحاظ سے بڑی نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ یوں وہ ۱۹۶۳ء میں انگلستان چلے گئے۔ اس کے جلد بعد طیّبہ بھی وہاں چلی گئیں تاہم وہاں جا کر وہ دونوں اسی ماحول میں رچ بس گئے اور انہوں نے پاکستان واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ طیّبہ ۱۹۶۴ء سے وہیں ہیں۔ وہ اپنے نوٹ میں رقمطراز ہیں:

''میں آپ کے لیے احساسِ نیازمندی کے ساتھ دست بدعا ہوں کہ آپ نے اپنی اس کتاب میں شمار کرنے کے لیے مجھے چند الفاظ اس زمانے کے بارے میں ورطۂ تحریر میں لانے کو کہا ہے جس کی یاد کی دھیمی لو اب بھی چاہتوں اور محبتوں کے اَن گنت دیئے روشن کر دیتی ہے...... لہٰذا اے میرے گزرے زمانے!

تو جو آیا مرے خیالوں میں
بربطِ دل کے تار بجنے لگے
جو دیئے بجھ چکے تھے برسوں سے
وہ دیئے پھر سے آج جلنے لگے

تو لیجئے قارئینِ کرام! یادوں کے اَن گنت دیپ روشن کر کے قلم ہاتھ میں تھاما ہے اور یہ بات میرے لیے باعثِ طمانیتِ قلب ہے کہ اُن یادگار واقعات جو بطور امانت میرے ذہن میں محفوظ ہیں میں سے چند ایک

آپ کو بھی سنانے کا موقع مل رہا ہے۔

میں ربوہ کے ابتدائی حالات ہی سے بات شروع کرتی ہوں جب چھوٹے چھوٹے کچی مٹی کے گھروندے تیار ہوئے، کچے سکول تعمیر ہوئے، ہر طرف گرد ہی گرد اُڑا کرتی تھی، آندھیاں چلتی تھیں، پانی کی قلت تھی اور حالات انتہائی نامساعد تھے۔ زمین ربوہ کا سروے انتہائی مشکل کام تھا جس کے شروع کرنے کی سعادت میرے اباجان، فضل الدین کمبوہ، اوورسیئر کو نصیب ہوئی۔ تاریخ احمدیت جلد ۱۳ میں ان کی اس خدمت کا ذکر بہ ایں الفاظ موجود ہے: ''سرزمین ربوہ کا سروے ایک نہایت کٹھن مرحلہ تھا جس کے شروع کرنے کی اولیں سعادت حضرت سیّدنا مسیح موعود کے رفیق، جمعدار فضل الدین صاحب کمبوہ کو حاصل ہوئی۔''

۱۹۵۰ء میں لیڈی میکلیگن ہائی سکول، لاہور سے آٹھویں کا امتحان پاس کرلیا تو میرے اباجان مجھے مزید تعلیم کے لیے ربوہ لے آئے اور نصرت گرلز ہائی سکول کی نویں کلاس میں داخل کروا دیا۔ رہائش کے لیے اباجان نے دو کمروں کا ایک کچا مکان بنوالیا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں لکڑی کا ایک بڑا سا میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ اباجان رات کے وقت اس میز پر بیٹھ کر لیمپ کی روشنی میں عمارتوں کے نقشے بنایا کرتے اور دن کے وقت تپتی دھوپ میں سائیکل پر سوار ہوکر زیرِتعمیر عمارتوں کے سروے پر نکل جایا کرتے تھے۔ میں نے بچپن ہی میں اباجان سے عمارتوں کے نقشوں کی کاپیاں بنانا سیکھ لیں اور ان کی مدد کرنے لگی۔

ربوہ کی وہ زندگی بھی کیا عجیب زندگی تھی۔ بعض اوقات آندھی اٹھتی اور مٹی فضا میں اس طرح معلّق ہو جاتی گویا گرد و غبار کی چادر تن گئی ہو۔ پھر آندھی چلنا شروع ہوتی۔ گھر کی ہر چیز پر مٹی کی کئی کئی انچ موٹی تہ جم جاتی۔ سوتے میں منہ، سر اور بالوں کی جڑوں میں اس قدر مٹی جمع ہو جاتی کہ صبح اٹھ کر کنگھی کرنا دشوار ہو جاتا۔ ایک طرف پانی کی کمی اور دوسری طرف اگر سر دھو بھی لیا جائے تو کھاری پانی کی وجہ سے بال نمدہ بن جاتے۔ میں کئی دفعہ چپکے چپکے رویا کرتی کہ میں کیوں باقی بہن بھائیوں اور امی کے ساتھ لاہور میں نہیں رہی اور اباجان کے ساتھ ربوہ آ گئی ہوں لیکن فوراً ہی میرا دل مجھے ملامت کرنے لگتا کہ ایسا مت سوچو، تم یہاں سے وہ کچھ لے کر جاؤ گی جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوگا...... اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے ربوہ میں تعلیم حاصل کر کے جو کچھ حاصل کیا اس کا پھل مجھے آج تک مل رہا ہے۔ الحمدللہ، ثم الحمدللہ۔ یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ اگر زندگی میں کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور لکھوں گی۔

آندھی کے فضاؤں میں معلّق ہو جانے کے تعلق میں ایک واقعہ عرض کرتی ہوں۔

شام کا وقت تھا۔ اباجان نے لیمپ جلا کر میز پر رکھا اور مغرب کی نماز کے لیے چلے گئے۔ میں گھر میں اکیلی تھی اور ڈر رہی تھی کہ کہیں آندھی چلنا نہ شروع ہو جائے۔ اسی کیفیت میں اٹھ کر کمرے کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ میری کمر کے پیچھے لیمپ جل رہا تھا اور سامنے کھلی فضا اور گھلا آسمان تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا سایہ ہے جس کا سر آسمان سے لگا ہوا ہے اور پاؤں زمین پر ہیں۔ فوراً جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں دماغ میں گھوم گئیں اور مجھے یقین ہوگیا کہ میرے سامنے کوئی جن کھڑا ہے۔ میں بے ہوش

ہو کر گرنے کو تھی کہ اچانک میرا بازو ہل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس سائے کا بازو بھی ہلا ہے۔ تب مجھے اطمینان ہوا کہ یہ میرا اپنا سایہ ہے لیکن یقینِ کامل کے لیے میں نے اپنا دوسرا بازو اٹھایا تو اس سائے نے بھی بازو اٹھا لیا ہے۔ اب مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ میرا اپنا سایہ ہی ہے۔ پھر تو خوب اچھل کود کر دیکھا اور یقین ہو گیا کہ یہ جن میں ہی ہوں۔ اتنے میں اباجان واپس آ گئے اور اپنے ساتھ آندھی کو بھی لیتے آئے۔ میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا۔ وہ بھی خوب ہنسے۔ اب میں آہستہ آہستہ اس ماحول سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ پھر تو کچا سکول، محبت کرنے والے اساتذہ اور سکول کے سب ساتھی بہت اچھے لگنے لگے۔ میں شروع شروع میں ہر تیسرے چوتھے ہفتے وِیک اینڈ گزارنے لاہور جاتی تھی مگر پھر میرا دل ربوہ میں اس قدر لگ گیا کہ صرف لمبی چھٹیوں میں ہی لاہور جانے لگی۔

سکول کی ہیڈ مسٹرس استانی امۃ الرحمٰن عمر جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی بہو تھیں اور ہمیں انگلش پڑھایا کرتی تھیں بہت قابل اور بارعب استاد تھیں۔ ان کی پڑھائی ہوئی بعض چیزیں خصوصاً ڈائریکٹ اِن ڈائریکٹ؛ ایکٹو پیسو اور ٹینسز آج تک نہیں بھولے۔

استانی حمیدہ راشدہ ہمیں حساب پڑھاتی تھیں۔ انہیں اپنے مضمون پر عبور حاصل تھا اور پڑھانے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ وہ یوں بھی بے حد بااخلاق اور محبت کرنے والی تھیں لہٰذا ہم ان کے پیریڈ کا باقاعدہ انتظار کیا کرتے تھے۔

اردو زبان پڑھانے کے لیے انتہائی لائق اور اہلِ زبان خاتون، استانی سیّدہ مقرر تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ہمیں اپنا گولڈ میڈل دکھایا جسے دیکھ کر ہم بے حد حیران ہوئے۔ ہماری اردو کی کتاب کا نام ''سرمایۂ اردو'' تھا۔ یہ کتاب بھی کیا خوب کتاب تھی۔ اسے مشہور رومانوی شاعر، اختر شیرانی کے والد، حافظ محمود شیرانی نے مرتب کیا تھا اور اس میں میر امن دہلوی اور مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر خواجہ حسن نظامی اور سیّد محمد عمر حسنی تک تمام معروف اردو نثر نگاروں کے شہ پارے شامل تھے۔ شعری انتخاب میں سودا اور میر تقی میر سے لے کر حفیظ جالندھری تک تمام مشاہیر کا کلام شامل تھا۔ مجھے تو یوں بھی شروع ہی سے اردو ادب کا شوق رہا ہے لہٰذا میرے لیے یہ کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے اس کا ایک ایک لفظ اپنے دل و دماغ میں بسا لیا تاہم مجھے اس اعتراف میں باک نہیں کہ اس کتاب کو طالبات کے ذہن نشین کرانا استانی سیّدہ ہی کا کمال تھا۔ یہ ان ہی کی توجہ تھی جس نے ہمارے اندر مرزا غالب کا مشکل سے مشکل کلام سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی تھی۔ سخت مزاج ضرور تھیں اور ہم ان سے ڈرتے بھی بہت تھے لیکن بہت محبت کرنے والی تھیں۔

استانی میمونہ قرآن کریم اور اس کا ترجمہ پڑھاتی تھیں۔ وہ اپنے سادہ اور صوفیانہ لباس کی وجہ سے دور سے ہی پہچانی جاتی تھیں۔ بے حد لائق تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت بہت رِقّت سے کیا کرتی تھیں۔ ان سے بھی ہمیں بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ وہ چھوٹی کلاسز کی بچیوں کی پٹائی کرنے سے بھی نہ چوکتی تھیں۔ اب تاریخ لجنہ میں ان کا نام جابجا پڑھنے میں آتا ہے تو ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

مجھے استانی مسعودہ بشیر (جو اسی سکول کی ایک استاد، استانی کنیز فاطمہ کی صاحبزادی تھیں) اور

استانی حمیدہ صابرہ سے بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور دیگر بہت سے اساتذہ سے بھی تعلق رہا۔ سبھی بے حد لائق اور اپنے پیشے کا حق ادا کرنے والے شفیق اور مہربان تھیں۔

ایک مرتبہ استانی حمیدہ صابرہ نے جلسہ سالانہ کے موقع پر نمائش کے سٹال پر دیگر چند لڑکیوں کے ساتھ میری ڈیوٹی بھی لگائی۔ سٹال پر اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ والی چاندی کی انگوٹھیاں بھی رکھی گئی تھیں۔ ہمیں انگوٹھی کی قیمت نہیں بتائی گئی تھی لیکن خدا جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ایک انگوٹھی کی قیمت آٹھ آنے ہے لہٰذا جب نمائش دیکھنے والی خواتین میں کسی نے ہمارے سٹال پر آ کر انگوٹھی کی قیمت دریافت کی تو میں نے بڑے اعتماد سے کہہ دیا: آٹھ آنے۔ بس پھر کیا تھا...... ایک کے بعد دوسری خاتون آتی چلی گئی، انگوٹھیاں آٹھ آٹھ آنے میں فروخت ہوتی گئیں اور کچھ ہی وقت میں انگوٹھیوں سے بھرا مرتبان خالی ہو گیا۔ اب باقی ماندہ چیزیں فروخت ہو رہی تھیں اور میں اپنی طرف سے سرخرو ہو کر ایک طرف کھڑی تھی کہ اچانک استانی حمیدہ صابرہ آ گئیں اور مجھ سے پوچھا: طیبہ! وہ انگوٹھیاں کدھر ہیں؟ میں نے عرض کیا: آپا جی! وہ تو سب فروخت ہو گئیں۔ انہوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے یہ انگوٹھیاں آٹھ آٹھ آنے میں فروخت کر دی ہیں تو انہوں نے بتایا کہ انگوٹھی کی قیمت تو پانچ روپیہ تھی تاہم انہوں نے کسی غصہ کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے صرف اتنا کہا: اوہ طیبہ جی! پھر میری سمجھ میں آیا کہ میں تو بہت بڑے نقصان کا سودا کر بیٹھی ہوں۔ میں افسردہ سی ہو گئی۔ آپا جی میری طرف بڑھیں، میری کمر پر پیار سے تھپکی دی اور صرف اتنا کہا کہ دھیان سے کام کیا کرو۔ پھر آپ تشریف لے گئیں۔ مجھے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ان کے ظرف اور ان کی شفقت کو یاد کر کے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

یہ ان ہی مہربانیوں کا نتیجہ تھا کہ سکول چھوڑنے کے بعد بھی میرا رابطہ استانی حمیدہ صابرہ کے ساتھ برابر رہا بلکہ اگر میں کہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق مستحکم ہوتا چلا گیا تو غلط نہ ہوگا۔ انگلینڈ آنے کے بعد میری ان کے ساتھ خط و کتابت رہی اور اگر میں کبھی پاکستان جاتی تو ان سے ضرور ملتی۔ ایک بار میں نے اپنے شوہر سے مشورے کے بعد انہیں دعوت دی کہ وہ انگلستان تشریف لا کر مجھے میزبانی کا موقع دیں۔ چند روز بعد ان کا جواب آیا جس میں انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ یہ شعر بھی لکھا تھا:

راستہ تو خضر نے بتلا دیا
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

یہ خط پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ موصوفہ زادِ راہ کی کمی کے باعث انگلستان آنے سے قاصر ہیں۔ میرے شوہر نے سنا تو ناراض ہوئے کہ مجھے دعوت نامے کے ساتھ انہیں آنے جانے کا ٹکٹ بھی بھجوانا چاہئے تھا۔ مجھے اپنی اس کوتاہی پر بہت ندامت ہوئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اگلے خط میں اپنی درخواست دہراتے ہوئے انہیں آنے جانے کا ٹکٹ بھی بھجوا دوں گی۔

کرنے کو تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا لیکن روزمرّہ کی مصروفیات نے موقع ہی نہ دیا کہ میں انہیں فوری طور پر

خط لکھ سکتی۔ اسی دوران ایک بار نمازِ جمعہ کے لیے بیت الذکر گئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے جن احباب کے جنازہ ہائے غائب پڑھائے ان میں استانی حمیدہ صابرہ بھی شامل تھیں۔ مجھے ان کی وفات کی خبر سن کر جس قدر صدمہ پہنچا الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ان کی بے پایاں شفقت و محبت کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا اور میں دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگی کہ انہیں انگلستان آنے کے لیے کرائے کی رقم نہ بھجوا سکی تھی۔ کاش! وہ میرے پاس تشریف لائی ہوتیں اور میں ان کی کچھ خدمت کر سکی ہوتی۔

اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے عرض کروں گی کہ سکول میں نویں اور دسویں جماعت کے کمرے ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ طالبات کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی اس لیے ہم سب کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ چھٹی کے بعد روزانہ دو دو لڑکیوں کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹیاں لا کر اپنے کلاس روم کے کچے فرش پر لپائی کریں۔ ڈیوٹی والی لڑکیاں لپائی کرنے کے بعد کلاس روم کا دروازہ بند کر کے چلی جاتیں تا کہ اگلی صبح جب سکول کھلے تو گرد بیٹھی ہوئی ہو۔

اچانک ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ جلسہ سالانہ کے مہمانوں کی رہائش کے لیے بیرکوں کی تعمیر میں نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبات کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ ہم بڑی بڑی بالٹیوں میں گارا ڈال کر اینٹوں کی چنائی میں مدد کرتے تھے۔ جب ایک اینٹ رکھی جاتی تو اس پر گارا اپنے ہاتھوں سے ڈالتے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا اور دیوار تیار ہوتی رہتی۔

ایک مرتبہ ایسا ہی کام ہو رہا تھا۔ کافی شام ہو چکی تھی۔ سردی بھی خاصی تھی۔ میری ڈیوٹی تھی لیکن میری طبیعت خراب تھی۔ غالباً بخار ہونے والا تھا۔ اس وقت ہماری نگران، بیگم حضرت میر محمد اسحاق تھیں۔ میری طبیعت گارے میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہ ہو رہی تھی چنانچہ میں تھوڑا سا پیچھے سرک گئی۔ بیگم صاحبہ نے مجھے ڈانٹ پلائی اور فرمایا: والد تو ربوہ کی تعمیر کرواتے پھر رہے ہیں اور صاحبزادی ہیں کہ ایک دیوار کی تعمیر میں ہاتھ نہیں بٹا سکتیں۔

میں نے آہستہ سے جواب دیا: وہ گارے مٹی میں تو ہاتھ نہیں ڈالتے۔

میں نے یہ جملہ کئی بار زیرِ لب دہرایا۔

بڑوں کو جواب نہیں دیتے، یہ کہہ کر بیگم صاحبہ نے میرے ماتھے کو چھوا اور فوراً گھر بھیج دیا۔ گھر پہنچی تو ابا جان عشاء کی نماز کے لیے جا چکے تھے۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد ابا جان آ گئے۔ ساتھ ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے اپنی ملازمہ کے ہاتھ میرے لیے گرما گرم کھانا بھجوایا تھا۔ یہ تھا ان بزرگوں کا بچوں کے ساتھ پیار اور حسنِ سلوک! اگلی صبح میں تازہ دم ہو کر اٹھی اور بڑے شوق کے ساتھ ڈیوٹی پر حاضر ہو گئی۔ ایسے سلسلے جاری رہتے۔ ہمیں اپنے ہاتھوں اور کپڑوں کی بالکل پروا نہیں ہوتی تھی۔ گھر آ کر اپنے کپڑے دھو کر پھیلا دیتے۔ کوئی دھوبی نہیں تھا، کسی لانڈری کا تصور نہیں تھا، زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ریڈیو تک نہیں تھا، ابھی بیٹری سے چلنے والے ریڈیو پاکستان نہیں پہنچے تھے۔ جب چھٹیوں میں لاہور جاتے تو ریڈیو سننے کو ملتا۔ ہمارا دل بہلاوا

صرف کتابیں تھیں یا چند کھیلیں جو ہم سکول کی کچی گراؤنڈ میں کھیل لیتے تھے۔

میرے ابا جان علم دوست انسان تھے۔ وہ میرے پڑھنے کے لیے ڈھیروں کتابیں خرید کر لاتے جن میں علاّمہ راشدالخیری، علاّمہ رازق الخیری، علامہ صادق الخیری اور اس قسم کے دیگر لکھنے والوں کی کتابوں کے پورے پورے سیٹ ہوتے۔ سلسلے کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی علمی، ادبی کتابیں لاکر دیتے۔ نظموں کی بھی کتابیں لاتے۔ خود بھی بہت اچھی نظمیں لکھا کرتے تھے، خاص طور پر پوربی ہندی اور فارسی میں۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا اور ہم نویں کے سالانہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ خوش تھے کہ اب ہم پاس ہوکر سکول کی سب سے بڑی جماعت میں چلے جائیں گے اور ہماری بڑی عزت اور شان ہوگی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ غم بھی تھا کہ دسویں جماعت کی طالبات جو ہماری گہری دوست ہیں ہمیں چھوڑ جائیں گی۔

ان دنوں جامعہ نصرت کے قیام کی خبریں ربوہ کی فضاؤں میں گردش کررہی تھیں۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب ہم دسویں کلاس کی طالبات کو الوداعی پارٹی دینے والے تھے۔ شام کو چار بجے سکول کی گراؤنڈ میں چھڑکاؤ کیا گیا، کرسیاں لگائی گئیں، میزیں سجائی گئیں اور یوں پارٹی کا انتظام ہوگیا۔ حضرت مسیح موعود کے خاندان کی بعض خواتین بشمول حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم بطور مہمان مدعو تھیں۔ جن کرسیوں پر دسویں کلاس کی طالبات نے بیٹھنا تھا ان کرسیوں پر ہم نے ہر ایک کی شخصیت کے مطابق اشعار لکھ کر چٹیں لگائی ہوئی تھیں۔ جو طالبہ غلط کرسی پر بیٹھ جاتی اس پر ہم لوگ خوب ہنستے۔ اسے شرمندہ ہوکر اٹھنا پڑتا اور اپنی اصل جگہ تلاش کرنا ہوتی۔ اس مشغلے میں بہت لطف رہا۔ ہم نے اپنے اساتذہ کی کرسیوں پر بھی منتخب اشعار کی چٹیں لگائی ہوئی تھیں جنہیں خواتینِ مبارکہ نے بہت سراہا۔ یہ تھے ہمارے مشاغل اور ہماری زندگی!

میں نے رخصت ہونے والی طالبات کے لیے چند اشعار لکھے تھے جو تلاوت قرآنِ پاک اور الوداعی ایڈریس کے بعد میں نے ترنّم سے پڑھ کر سنانا شروع کئے۔ میرے دوسرے شعر پر ہی حضرت نواب مبارکہ بیگم نے فرمایا: مکرّر۔

بدقسمتی سے مجھے مکرّر کا مطلب نہیں آتا تھا لہٰذا میں نے ان کی بات سُنی ان سُنی کر کے اگلا شعر پڑھ دیا۔

آپ نے پھر فرمایا: مکرّر۔

میں گھبرا سی گئی اور سمجھی کہ شاید میری نظم حضرت نواب مبارکہ بیگم پر گراں گزر رہی ہے چنانچہ میں نے نظم جلدی جلدی پڑھ کر ختم کر ڈالی۔

جب میں سٹیج سے نیچے اتری تو آپ نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا، تھپکی دی اور فرمایا: لڑکی! اتنی اچھی نظم کہہ لی اور پڑھی بھی خوب تو کیا مکرّر کا مطلب نہیں سمجھتی ہو؟ میں نے عرض کیا: جی نہیں۔ آپ نے تبسّم فرمایا۔

لیجئے چند اشعار قارئین کی نذر کرتی ہوں:

رہیں اب تک تو تم اس بزم میں روحِ رواں ہو کر
بنی جاتی ہو کیوں نامہرباں اب مہرباں ہو کر
یہ فرقت کی خبر ہی سربسر پیغامِ وحشت ہے
امنگوں کے گریباں اُڑ رہے ہیں دِھجیاں ہو کر
تمہارے چھوڑ جانے سے یہ حالت ہوگئی اپنی
نظر آتی زمیں ہے ہر قدم پر آسماں ہو کر
نہ کیفِ بے خودی باقی نہ ذوقِ زندگی باقی
بہاریں تھیں سو وہ بھی اُڑ چلیں نذرِ خزاں ہو کر
محبت سے بھرے دل کی دعائے طیّبہ یہ ہے
جہاں میں تم جہاں جاؤ رہو جانِ جہاں ہو کر

گزرتا وقت کب رکتا ہے..... تو قارئینِ کرام! امتحانات ہوئے اور ہم سب کامیاب ہوگئے۔ نویں جماعت والے کمرے سے اٹھ کر دسویں جماعت والے کمرے میں آگئے اور دسویں کی طالبات کامیاب ہوکر جامعہ نصرت پہنچ گئیں۔''

آپ نے طیّبہ کریم شاہد کی یادداشتیں ملاحظہ فرمائیں۔ اب ذکر ہو رہا ہے ربوہ ہی میں مقیم نصرت گرلز ہائی سکول کی ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ، صادقہ قمر کا جو مولوی محمد شریف، اکاؤنٹنٹ جامعہ احمدیہ کی ہمشیرہ ہیں اور جامعہ نصرت کی پرنسپل بن کر ریٹائر ہوئیں۔ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی کے حالات خاصی تفصیل کے ساتھ سناتی ہیں۔ وہ بتایا کرتی ہیں کہ وہ ۱۹۵۰ء میں اس سکول میں داخل ہوئیں اور ۱۹۶۰ء میں میٹرک کرنے کے بعد یہاں سے فارغ ہوئیں لہٰذا اس سکول اور اس کی اساتذہ کے بارے میں جو معلومات انہیں حاصل ہیں وہ کم لوگوں کے پاس ہوں گی۔ وہ بتاتی ہیں کہ پہلے تین سال ان کی کلاسز جن کمروں میں ہوتی رہیں وہ حضرت اماں جی کی رہائش گاہ کے بہت قریب تھے۔ یوں صادقہ قمر اور دیگر بچوں کو ان کی زیارت کا موقع ملتا رہتا اور وہ ان کی دعائیں سمیٹ کر واپس لوٹتیں۔

نصرت گرلز ہائی سکول میں موصوفہ کی سب سے پہلی ٹیچر استانی رحمت النساء تھیں جو انڈونیشیا کے مربی مولوی رحمت علی کی صاحبزادی تھیں۔ موصوف مختلف وقفوں سے ربع صدی تک انڈونیشیا رہے تھے۔ استانی رحمت ان کی عدم موجودگی میں پیدا ہوئی تھیں اور جب ان کے والدِ بزرگوار واپس آئے تو وہ کافی بڑی ہوچکی تھیں۔ استانی رحمت طالبات کو جماعتی بزرگان کی قربانیوں کا حال سناتے ہوئے فخریہ اس بات کا ذکر کرتی تھیں کہ وہ پہلی بار اپنے والد سے اُس وقت ملیں جب وہ ذی شعور ہوچکی تھیں۔ یاد رہے استانی رحمت اُن استانی رحمت النساء سے مختلف خاتون تھیں جو حضرت مسیح موعود کی رفیقہ، حضرت ماسٹر مولا بخش، رفیق حضرت مسیح موعود کی اہلیہ اور لجنہ کی ایک سرگرم کارکن، نصیرہ نزہت کی والدہ تھیں۔

صادقہ قمر بتاتی ہیں کہ صبح کی دعا استانی میمونہ کرایا کرتی تھیں۔ وہ خود ایک چبوترے پر کھڑی ہوتیں اور

طالبات اپنی اپنی کلاس کے اعتبار سے قطاروں میں ان کے سامنے کھڑی ہوجاتیں۔ صادقہ قمر کی یادداشت کے مطابق استانی میمونہ بعض اوقات کسی لڑکی کا نام لے کر اسے سٹیج پر بلالیتیں اور بعض دفعہ کھلی دعوت دے ڈالتیں کہ کوئی لڑکی جو دعا کرانا چاہتی ہو آجائے۔ ایک بار صادقہ قمر آگے بڑھیں اور سٹیج پر پہنچ گئیں۔ وہ بتاتی ہیں: ہم جو دعائیں روزانہ مانگا کرتے تھے مجھے اَزبر تھیں چنانچہ میں نے وہ تمام دعائیں فَرفَر پڑھ دیں۔ استانی میمونہ اس بات پر بے حد خوش ہوئیں اور مجھے شاباش کے علاوہ ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ بعد میں بھی میں نے کئی دفعہ اسمبلی میں دعا کرائی۔ میری دیکھا دیکھی بہت سی اور لڑکیوں نے بھی جرأت کا مظاہرہ کیا اور وہ سٹیج پر آکر دعا کرانے لگیں۔ اس چیز نے طالبات کے اندر خوداعتمادی پیدا کی جو اُن کی عملی زندگی میں ان کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔

موصوفہ استانی امۃ العزیز عائشہ، استانی حمیدہ صابرہ، استانی زبیدہ اور استانی حمیدہ راشدہ کی بھی شاگرد رہی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں: استانی امۃ العزیز عائشہ کی قابلیت شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ انہوں نے اُس زمانے میں بی اے بی ٹی کیا تھا جب اعلیٰ تعلیم خواتین کے لیے شجرِ ممنوعہ سمجھی جاتی تھی۔ انہیں قادیان اور ربوہ کے علاوہ بلوچستان کے بعض سرکاری سکولوں میں پڑھانے کا بھی تجربہ حاصل تھا لہٰذا وہ طالبات کے مسائل کو باقی اساتذہ کی نسبت بہت بہتر طریقے سے سمجھتی تھیں اور تعلیمی نظم ونسق سے بھی زیادہ آگاہی رکھتی تھیں۔ ان کی بیٹی دسویں کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور جا چکی تھی اور وہ خود ربوہ میں تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ اس قسم کی طرزِ زندگی بعض اوقات شخصیتِ انسانی پر اپنے منفی اثرات چھوڑ دیتی ہے لیکن وہ اس سے بڑی حد تک مبرّیٰ تھیں اور کبھی غیرضروری چڑچڑے پن کا مظاہرہ نہ کرتیں۔ وہ ایک محنتی استاد تھیں جنہیں اپنی طالبات کی تعلیم وتربیت کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

جہاں تک استانی حمیدہ صابرہ کا تعلق ہے صادقہ قمر کو یہ بات اب تک یاد ہے کہ وہ اس زمانے کے رواج کے مطابق اپنا نِٹنگ بیگ ضرور ہمراہ رکھتیں۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی اسے کھول لیتیں۔ پڑھاتی بھی جاتیں اور ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی چیز بُنتی جاتیں تاہم ان کا یہ شوق ان کی تدریس میں کبھی حائل نہ ہوا۔

استانی زبیدہ کا ذکر آجائے تو صادقہ قمر بتاتی ہیں: موصوفہ پرائمری ٹیچر تھیں۔ وہ حکیم غلام حسن، لائبریرین صدر انجمن احمدیہ کی بیٹی اور بشیر احمد شمس، مربی سلسلہ کی اہلیہ تھیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں محلّہ دارالعلوم شرقی میں مقیم رہیں اور وہیں ۱۷ جولائی ۲۰۰۷ء کو وفات پائی۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کم وبیش بیس سال زندہ رہیں۔ خدا کے فضل سے ان کا ایک بیٹا ڈاکٹر بنا اور ایک لیکچرر۔ خوش قسمت تھیں کہ ان کی دونوں بیٹیاں بھی ان کی زندگی میں بیاہی گئیں۔

صادقہ قمر استانی زبیدہ سے بے حد متاثر ہیں خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ ان کی ابتدائی معلّمات میں سے تھیں اور ان کے اندر علم کی لگن پیدا کرنے میں موصوفہ کا بہت عمل دخل تھا۔ وہ برملا کہتی ہیں کہ اگر استانی زبیدہ نہ ہوتیں تو عین ممکن ہے وہ پڑھائی سے بددل ہوکر جہالت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہی ہوتیں۔

رہیں استانی حمیدہ راشدہ تو صادقہ قمر کے الفاظ میں وہ بے حد ذہین، حلیمُ الطّبع اور اپنے مضمون پر عبور رکھنے والی تھیں۔ وہ طالبات کے ساتھ سختی سے بالعموم اجتناب کرتیں اور کمزور طالبات کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی بجائے پیار سے سمجھاتیں لیکن اگر پھر بھی کوئی مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو وہ انہیں اوورٹائم دیتیں۔ صادقہ قمر بتاتی ہیں: ہمیں کوئی مشکل درپیش ہوتی تو ہم بے تکلفانہ ان کے گھر چلے جاتے اور سوالات سمجھ کر واپس آجاتے۔ ہم نے تو اس زمانے میں ٹیوشن کا لفظ بھی نہ سنا تھا نہ کبھی کسی نے ہم سے اوورٹائم کا کوئی معاوضہ طلب کیا۔ کیا اچھا زمانہ تھا!

ان نامی اساتذہ کے علاوہ صادقہ قمر کو استانی سیّدہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ وہ بتاتی ہیں: ''استانی سیّدہ نے ہمیں کچھ عرصہ انگریزی پڑھائی۔ وہ تلفّظ پر بہت زور دیتی تھیں مگر ہم طالبات واجبی تعلیمی پس منظر رکھتی تھیں لہٰذا ہمارا انگریزی کا تلفّظ بس ایسا ہی تھا۔ وہ اس بات پر بجا طور پر سیخ پا ہوتیں اور کہا کرتیں ''اَلْغَلَطُ غَلَطٌ۔'' اگر کسی طالبہ سے کوئی غلطی ہوجاتی تو وہ اسے کھڑا کر دیتیں اور صحیح تلفظ بتانے کے بعد کہتیں'' سے اِٹ اگین۔'' اگر تو وہ طالبہ اس لفظ کو صحیح تلفّظ کے ساتھ ادا کر لیتی تو اس کی بلا ٹل جاتی لیکن اگر وہ پھر بھی غلطی کرتی تو اسے کھڑا ہو کر کہنا پڑتا: ''آئی ایم سوری۔ آئی وِل ناٹ ڈُو سو اگین''۔ بعض طالبات یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے بدحواسی میں ناٹ کا لفظ چھوڑ جاتیں۔ اس پر وہ مزید ناراض ہوتیں اور پوری کلاس کو ڈانٹنے لگتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دفعہ ایک طالبہ کی ایسی ہی غلطی پر انہوں نے ساری کلاس کو پورا پیریڈ کھڑا رہنے کی سزا سنا دی تھی چنانچہ ہم نے حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق اس روز پورا پیریڈ کھڑے ہو کر گزارا۔

صادقہ قمر کے حوالے سے فی الحال اتنا ہی کچھ۔ میں ''قریۂ جاوداں'' میں تفصیل کے ساتھ ذکر کر چکا ہوں کہ استانی امۃ العزیز عائشہ ایک زمانے میں ہمارے محلّہ میں مقیم تھیں۔ ان کی ایک ہی صاحبزادی ہیں جن کا نام امۃ السّمیع ہے۔ گھر میں پیار سے چھمّو کہلاتی تھیں لہٰذا باہر بھی اسی نام سے پہچانی جانے لگیں۔ امۃ السّمیع کی ابتدائی تعلیم کوئٹہ میں ہوئی تھی تاہم ۱۹۵۳ء میں جب وہ نویں جماعت میں تھیں اپنی والدہ کے ہمراہ ربوہ آکر نصرت گرلز ہائی سکول میں داخل ہوگئیں۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا جس کے بعد وہ ایف ایس سی کے لیے لاہور کالج فارویمن میں داخل ہوئیں۔ خداتعالیٰ نے ان کے ارادے میں برکت ڈالی اور انہوں نے ۱۹۶۳ء میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج، لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرلیا۔

انہوں نے اپنی ملازمت کے ابتدائی پانچ سال کوئٹہ میں گزارے۔ وہ لاہور اور فیصل آباد میں بھی رہیں تاہم ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ پی او ایف ہسپتال، واہ کینٹ میں گزرا۔ پچھلے کچھ سالوں سے وہ آسٹریلیا منتقل ہوچکی ہیں۔ انہیں نصرت گرلز ہائی سکول کی طالبہ کے طور پر اس دور کی اکثر استانیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ویسے بھی چونکہ ان کی والدہ اس سکول کی ہیڈمسٹریس تھیں لہٰذا بعد میں بھی کئی سال تک ان کا اس ماحول سے رابطہ رہا۔ میری ان سے اس دور کے نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں مختلف اوقات میں بہت سی باتیں ہوتی

رہی ہیں جن کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر امۃ السمیع نے نصرت گرلز ہائی سکول میں صرف دو سال پڑھا لیکن اس زمانے کی خوشگوار یادیں آج بھی اُن کے ذہن میں تازہ ہیں۔ ان کی زندگی کے ابتدائی کچھ سال کوئٹہ میں گزرے تھے جو ایک بڑا شہر ہے لیکن ربوہ آ کر وہ اُس شہر کی رونقوں کو یکسر بھول گئیں اور یہ نوخیز بستی ان کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ انہیں یہاں کی ہر چیز سے اُنس سا ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور جانا پڑا تو وہ ہر ہفتے دو ہفتے کے بعد ضرور ربوہ آتی تھیں۔ والدہ کے پاس وقت گزارنے کا اپنا مزا تھا لیکن وہ بہت سا وقت اپنی سکول کی سہیلیوں کے ساتھ گزارتیں جن میں سے کچھ اب جامعہ نصرت میں پڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر گزرے ہوئے وقت کی باتیں کرتیں اور موقع ملتا تو والی بال کھیلتیں۔ ان کی والدہ ڈاکٹر امۃ السمیع کی ربوہ میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض اوقات سکول کی چھٹی ساتویں جماعت کو حساب پڑھانے کی ذمہ داری اِنہیں سونپ دیتیں۔ اسی طرح وہ استانی امۃ المنان قمر کی عدم موجودگی میں نویں دسویں جماعت کو سائنس کے پریکٹیکلز بھی کرا دیتیں۔

وہ بتاتی ہیں: اُس زمانے میں نصرت گرلز ہائی سکول اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ اس کی عمارت خام اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور کلاس رومز تک فرش سے عاری تھے۔ ہر طرف مٹی اور دُھول تھی۔ آندھی کیا چلتی گویا ایک طوفان آ جاتا اور گرمیوں میں لُو اور سردیوں کی یخ بستہ ہوائیں برداشت نہ ہو پاتیں لیکن دل تھا کہ اسی بستی اور اسی سکول سے پیار کرتا تھا۔

ڈاکٹر امۃ السمیع کہتی ہیں: سکول کے حوالے سے مجھے جو پہلی بات یاد آتی ہے یہ ہے کہ میری جماعت میں بشریٰ نام کی کم سے کم آٹھ لڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو خان صاحب فرزند علی کی بیٹی، سعیدہ بشریٰ تھیں۔ وہ میری بہت قریبی دوست تھیں چنانچہ میں اپنے زمانۂ تعلیم میں جب بھی لاہور سے ربوہ جاتی ان سے ضرور ملتی۔ شادی کے بعد وہ کراچی چلی گئی تھیں۔ اللہ نے انہیں ایک ہی بیٹے سے نوازا تھا۔ اب وفات پا چکی ہیں اور سنا ہے ان کے میاں بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

بشریٰ شاہدہ مندرجہ بالا سعیدہ بشریٰ کی خالہ زاد بہن تھیں اور مولوی فضل دین وکیل کی چھوٹی صاحبزادی۔

رشیدۃُ البشریٰ جنہیں لڑکیاں ''تُل بشریٰ'' کہا کرتی تھیں چوہدری غلام مرتضیٰ، وکیل القانون، تحریک جدید کی بڑی صاحبزادی اور میری دوست، ڈاکٹر حلیمہ مرتضیٰ کی بڑی بہن تھیں۔ ان کا نکاح کیپٹن محمد حسین چیمہ، افسر حفاظتِ خاص کے بیٹے الیاس احمد چیمہ مقیم انگلینڈ سے ہوا اور وہ پیا دیس سدھار گئیں۔ بعد میں انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ مدت ہوئی وفات پا چکی ہیں اور ربوہ ہی میں دفن ہیں۔

بشریٰ ملک نامی لڑکی ملک طاہر احمد، امیر جماعت احمدیہ، لاہور کی چچازاد بہن تھیں۔ گھر قریب ہونے کی وجہ سے ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہم اکٹھے کھیلتیں اور رات کو اکٹھے نلکے سے پانی بھرنے جاتیں۔ کبھی وہیں بیٹھ جاتیں اور دیر تک گپیں لگاتی رہتیں۔ انہیں کڑھائی کا شوق تھا اور وہ ہر وقت اس کام میں مصروف نظر آتی تھیں۔ بعد میں ان کی شادی محمد احمد ملک آف دیپالپور سے ہوئی اور وہ ربوہ سے

وہاں منتقل ہو گئیں۔

نسیم بشریٰ چنیوٹ والے سیٹھ محمد صدیق کی صاحبزادی اور میری اچھی دوست تھیں۔ میں ان کے گھر جاتی رہی ہوں۔ وہ ریلوے لائن کے اُس پار رہا کرتی تھیں۔ بعد میں ان کی شادی مجید آئرن سٹور والے مجید احمد کے بھائی ملک عبدالرب سے ہو گئی جن کے پاس غالبًا سیمنٹ کی ایجنسی تھی۔ وہ بھی فوت ہو چکی ہیں۔ سنا ہے ان کا ایک بیٹا، ملک عبدالقیوم لاہور میں ڈاکٹر ہے۔ فضل عمر ہسپتال میں امراضِ خواتین کی علاج گاہ، زبیدہ بانی وِنگ کا خرچ برداشت کرنے والی زبیدہ بانی ان ہی نسیم بشریٰ کی بہن تھیں۔

بشریٰ ثریا جسے لڑکیاں ''بچھی ثوری'' کہا کرتی تھیں قاری محمد امین کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی دین محمد شاہد، مربی سلسلہ سے ہوئی۔ ان کے شوہر کافی عرصہ واہ کینٹ میں تعینات رہے لہٰذا میرا بھی بشریٰ ثریا سے ملنا ملانا رہا۔ سنتے ہیں اب یہ خاندان کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے۔

ان چھ لڑکیوں کے علاوہ بشریٰ تسنیم اور پروین بشریٰ نام کی دو لڑکیاں بھی ہماری کلاس میں تھیں۔ بشریٰ تسنیم بھیرہ سے آئی تھیں جب کہ پروین بشریٰ ربوہ ہی کی رہائشی تھیں لیکن بدقسمتی سے مجھے ان میں سے کسی کے والد کا نام یاد نہیں۔ بعد میں ان سے میرا رابطہ بھی نہیں رہ سکا لہٰذا نہیں معلوم اب وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔

''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق نصرت گرلز ہائی سکول ربوہ کے ابتدائی دور میں دیگر استانیوں کے علاوہ استانی منظور فاطمہ بنت چوہدری غلام محمد، استانی عائشہ ایوب زوجہ محمد ایوب، استانی رقیہ بنت ولی محمد، استانی امۃ الرشید بنت وزیر محمد اور استانی محمدی بیگم بھی پڑھاتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر امۃ السمیع بتاتی ہیں: بدقسمتی سے استانی منظور فاطمہ کے علاوہ میرے ذہن سے باقی تمام استانیوں کی تصویر بالکل محو ہو چکی ہے۔ ہاں! جن استانیوں سے مجھے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع ملا یا جنہیں میں نے اپنی امی کے ساتھ ملاقاتوں کے دوران دیکھا ان کے چہرے اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

وہ بتایا کرتی ہیں: جب میں نصرت گرلز ہائی سکول میں داخل ہوئی تو استانی امۃ الرحمٰن عمر ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ان کی شخصیت بہت شاندار تھی۔ انہوں نے کچھ عرصہ ہمیں انگریزی پڑھائی۔ پھر شاید بچی کی پیدائش کی وجہ سے چھٹی پر چلی گئی۔ ان کے ربوہ سے چلے جانے کے بہت عرصہ بعد میں نے انہیں لاہور میں کسی مریض کی عیادت کرتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے سیاہ برقع پہنا ہوا تھا اور وہ بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔

ان کے دو بیٹوں اسامہ اور حتّی کے بارے میں مجھے اب بھی کچھ کچھ یاد ہے۔ حتّی دوسری جماعت میں حافظ عبدالسلام، وکیل المال تحریک جدید کے دو بیٹوں، بھالُو اور باشی کا کلاس فیلو تھا۔ بھالُو کا اصل نام شاہد اور باشی کا اصل نام مبشر تھا۔ اسامہ سے بہت عرصہ بعد ایک مرتبہ واہ کینٹ میں ملاقات اس کے ایک کزن، حفیظ (ابن حضرت مولوی عبدالسلام عمر) کی بیوہ، سسٹر الماس (جو پی او ایف ہسپتال میں نرسنگ ٹیوٹر تھیں) کے پاس ہوئی۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں حفیظ اور اس کا ایک بھائی حضرت اماں جی کے پاس رہتے تھے۔ سسٹر الماس سے پتا چلا کہ حفیظ نے آرمی جوائن کر لی تھی۔ وہ ایک بار بیمار ہو کر کمبائنڈ ملٹری ہسپتال، لاہور میں داخل ہوا تو

اس کی الماس سے ملاقات ہوئی جو بعد میں ان دونوں کی شادی پر منتج ہوئی۔ ان کی دو بہت پیاری بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ حفیظ کی جلد ہی وفات ہوگئی تھی جس کے بعد الماس نے کافی پریشانی دیکھی۔ وہ آج کل امریکہ میں ہے۔

ایک بار حافظ عبدالسلام کا ایک بیٹا، کیپٹن ڈاکٹر شاہد پی او ایف ہسپتال، واہ کینٹ میں میرے ہی ڈیپارٹمنٹ میں پوسٹ ہوکر آیا تھا۔ میں نے اسے عرصہ دراز کے بعد دیکھا تھا لہٰذا پہچاننے میں کچھ دقت ہوئی۔ میرے پوچھنے پر کہ بھالو ہو یا باشی تو پتا چلا کہ بھالو ہے، اب بڑا ہو چکا ہے اور ڈاکٹر شاہد کہلاتا ہے۔ بہت ہی پیارا اور تمیزدار نوجوان تھا۔ دو سال بعد اس کی کہیں اور پوسٹنگ ہوگئی تھی۔

مجھے یاد ہے حضرت اماں جی کا کمرہ مستطیل تھا اور استانی بلقیس بنت محمد عثمان قریشی (جو پرائمری کی ٹیچر تھیں اور عوام النّاس میں باجی بلقیس کے نام سے معروف تھیں) اپنی والدہ سمیت ان ہی کے ساتھ رہتیں اور ان کی خدمت کرتیں۔ اُمّی اکثر حضرت اماں جی سے ملنے جایا کرتی تھیں اور میں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہیں کہیں مائی راجو نامی ایک خاتون بھی نظر آتی تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سکول کی ملازمہ ہیں یا نہیں تاہم یہ یاد ہے کہ وہ بہت خوددار اور بارعب تھیں اور حضرت اماں جی اور استانی امۃ الرحمٰن عمر کے گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔

سچی بات ہے اُس وقت تو مجھے مائی راجو کی عظمت کا اندازہ نہیں ہو پایا لیکن مدتوں بعد جب میں نے ''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' میں پڑھا کہ موصوفہ (جو محبوب علی نامی ایک بزرگ کی اہلیہ، حضرت مسیح موعود کی رفیقہ اور نصرت گرلز ہائی سکول میں مددگار کارکن تھیں) لجنہ ہال کی بنیادی اینٹیں رکھنے والوں میں شامل تھیں اور انہوں نے اپنی تمام تر عُسرت کے باوجود ہیمبرگ میں احمدیہ بیت الذکر کی تعمیر کے لیے ۱۹۵۶ء میں ۱۵۰ روپیہ چندہ دیا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی نیک خاتون تھیں اور میرے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے وعدے مَنْ بَنٰی مَسْجِدًا لِلّٰہِ بَنَی اللّٰہُ لَہٗ فِی الْجَنَّۃِ مِثْلَہٗ کا مصداق بنائے۔

اب کچھ ذکر استانی مسعودہ کا جو استانی کنیز فاطمہ کی صاحبزادی تھیں اور حساب پڑھاتی تھیں۔ وہ بہت اچھی معلمہ تھیں اور زیادہ نالائق لڑکیوں کو ہم جیسے کم نالائقوں کے سپرد کر دیتی تھیں۔ وہ پیپر ہمارے سامنے ہی بیٹھ کر چیک کرتیں اور نمبروں کا ٹوٹل لگانے کے لیے پرچے کسی لڑکی کو دیتی جاتیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک کلاس ٹیسٹ میں مطلوبہ تعداد سے زیادہ سوالات حل کر دیئے۔ اتفاق سے سارے جوابات ٹھیک تھے چنانچہ جب ٹوٹل لگایا گیا تو میرے نمبر ایک سو دس بنتے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سو نمبر کے پرچے میں سے ایک سو دس نمبر کس طرح آ سکتے ہیں۔ بعد میں جب پرچہ دوبارہ چیک کیا گیا تو یہ مسئلہ حل ہوا۔

استانی مسعودہ ایک خوش لباس خاتون تھیں اور نظر کی خوبصورت عینک استعمال کرتی تھیں۔ ان کے شوہر، مرزا بشیر احمد ضلعدار نہر ابن حضرت مرزا افضل بیگ، رفیق حضرت مسیح موعود ربوہ سے باہر رہتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے ان کا بڑا سا دو منزلہ مکان رحمت بازار اور فیکٹری ایریا کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ ان کی والدہ جو سفید شٹل کاک برقع پہنتی تھیں ان کے بچوں کی پرورش میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں بلکہ ان کی بیٹی جو ''دانا''

کہلاتی تھی دن رات رہتی ہی اپنی نانی کے پاس تھی۔ چھٹیوں میں استانی مسعودہ اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی تھیں۔ ان کے شوہر جنوری ۱۹۵۹ء میں چند یوم کی مختصر علالت کے بعد لاہور میں وفات پا گئے۔ اس وقت ان کا سب سے چھوٹا بچہ، شاہد صرف چھ ماہ کا تھا۔ ظاہر ہے ان کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا جسے وہ کبھی بھی پوری طرح فراموش نہیں کر سکیں۔

وہ یکم ستمبر ۱۹۶۳ء کو میری امی کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس سکول کی ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ میں ۷۱-۱۹۷۰ء میں فیصل آباد میں میاں محمد ٹرسٹ ہسپتال میں تھی تو وہ ایک بار اپنے بیٹے کو لے کر میرے پاس چیک اَپ کے لیے آئی تھیں۔ اس وقت تک وہ کافی کمزور ہو چکی تھیں۔

میں اپنے قیامِ پاکستان کے زمانے میں جب بھی ربوہ جاتی اپنی امی کی یاد تازہ کرنے کے لیے لڑکیوں کے سکول ضرور جایا کرتی اور ہیڈ مسٹریس سے مل کر آتی تھی۔ آخری بار جب میں وہاں گئی تو رفیعہ غزنوی ہیڈ مسٹریس بن چکی تھیں۔ اُن ہی کے آفس میں استانی مسعودہ سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ بہت کمزور اور حالات کے ہاتھوں پریشان تھیں۔ اس کے بعد ملاقات نہیں ہوئی۔ وفات کی خبر ہی ملی۔ الفضل کی اطلاع کے مطابق انہوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۹۲ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔ خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

استانی میمونہ کے ایک پیریڈ میں قرآن کریم کا ترجمہ اور حضرت مسیح موعود کی کتب پڑھائی جاتی تھیں جب کہ دوسرے پیریڈ میں عربی کلاس ہوتی تھی۔ یہ بات ذاتی طور پر میرے علم میں ہے کہ نصرت گرلز ہائی سکول میں چھٹی کلاس سے باترجمہ قرآن کریم پڑھایا جاتا، بعض سورتیں حفظ کروائی جاتیں، منتخب حدیثیں یاد کرائی جاتیں اور حضرت مسیح موعود کی کتب کا مطالعہ کرایا جاتا۔ پھر باقاعدہ امتحان ہوتا اور میٹرک کا داخلہ بھجوانے سے پہلے یہ امتحان پاس کرنا لازمی تھا۔

موصوفہ کا بہت دبدبہ اور رعب ہوا کرتا تھا۔ جب میں سکول میں داخل ہوئی تو غالباً سائنس کا مضمون نیا نیا رائج ہوا تھا چنانچہ میرے سمیت کچھ لڑکیوں نے سائنس رکھ لی اور عربی چھوڑ دی۔ دراصل امی کا ارادہ مجھے ڈاکٹر بنانے کا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میٹرک میں سائنس پڑھی جائے چنانچہ آخری روز جب عربی کا پیریڈ شروع ہونے پر عربی چھوڑ کر سائنس لینے والی لڑکیاں اٹھ کر جانے لگیں اور میں بھی کھڑی ہوگئی تو موصوفہ نے زوردار آواز سے کہا: ''چھمّو! تم کدھر جا رہی ہو؟ تم نے عربی ہی پڑھنی ہے، کوئی سائنس وائنس نہیں پڑھنی۔'' یہ بات سن کر میں دبک کر بیٹھ گئی۔ بعد میں امی نے ان سے بات کی تو مجھے سائنس پڑھنے کی اجازت مل گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے طالبات کا عربی چھوڑ کر کوئی اور مضمون پڑھنا پسند نہیں کیا۔ یہ عربی اور بالواسطہ دینِ حق کے ساتھ ان کی محبت کی ایک دلیل تھی۔

میں نے آخری بار انہیں ایک جلسہ سالانہ کے کسی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بہت کمزور ہو چکی تھیں اور چلنے پھرنے میں دشواری محسوس کرتی تھیں۔ جلسہ گاہ لجنہ ہال کے گراؤنڈ میں

تھی۔ وہ اپنی بہت سی شاگردوں کے جلو میں پیدل جا رہی تھیں لیکن بڑھاپے کے زیرِ اثر بہت کم شاگردوں کو پہچان پا رہی تھیں۔

استانی سیّدہ ہماری اردو کی استاد تھیں۔ موصوفہ کی زبان انتہائی شستہ تھی۔ وہ نظموں کی تشریح اور شاعروں کے حالات وغیرہ بہت عمدگی سے بیان کرتی تھیں اور شاگردوں کی بہت ہمّت افزائی کرتی تھیں۔ ایک دفعہ میرے پرچے میں کوئی تشریح پسند آئی تو لکھا:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھنے والی طالبات کو بہت پسند کرتی تھیں اور یوں میں بھی ان کی چہیتی شاگردوں میں شامل ہوگئی۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ طالبات اردو ادب کی مشہور کتابوں کے علاوہ ادبی رسائل بھی پڑھا کریں۔ اس مقصد سے انہوں نے کلاس کے لیے ''حور'' رسالہ جاری کروا رکھا تھا۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ یہ رسالہ برانڈرتھ روڈ، لاہور کی حور سٹریٹ سے نکلا کرتا تھا اور پچھلے کئی سالوں (غالبًا پارٹیشن سے بھی پہلے) سے نکل رہا تھا۔ اس میں سنجیدہ علمی مضامین بھی ہوتے تھے لیکن رسالے کا زیادہ زور افسانوں اور نظموں غزلوں پر ہوا کرتا تھا۔ حفظانِ صحت اور گھر کی آرائش پر مشورے بھی چھپا کرتے تھے۔ اس کی ایڈیٹروں میں سے اتفاقاً زیب عثمانیہ لدھیانوی کا نام میرے ذہن میں رہ گیا ہے۔ یہ شعر بھی بالعموم رسالے کے ماتھے پر لکھا ہوتا تھا:

جو لہلہاتے تھے کبھی آغوشِ طُور میں
وہ جلوے بے قرار ہیں دامانِ حور میں

طالبات یہ رسالہ باری باری اپنے گھر لے جاتیں اور پڑھ کر واپس لے آتیں۔ جس طالبہ کے نمبر کلاس ٹیسٹ میں سب سے زیادہ ہوتے رسالہ اسے پہلے ملتا۔ عام طور پر شمیم طاہرہ بنت حافظ عبدالسلام اور امۃ المجید بنت مولانا محمد احمد جلیل (جو بعد میں جامعہ نصرت کی پرنسپل کے عہدے پر پہنچیں) کی باری سب سے پہلے آتی تھی۔ کبھی کبھار میری باری بھی پہلے آجاتی تھی۔ میں اس کے افسانے بہت شوق سے پڑھتی تھی۔

ڈاکٹر امۃ السمیع بتاتی ہیں کہ استانی سیّدہ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتی تھیں۔ سکالرز جیسی عینک اور سادہ لیکن صاف ستھرا لباس پہنتیں۔ ایک بار موصوفہ کسی وجہ سے سکول پہنچنے میں کچھ لیٹ ہوگئیں۔ اتفاقاً سکول کے دروازے پر ہی ان کا میری امی سے آمنا سامنا ہوگیا چنانچہ انہوں برجستہ یہ مصرع پڑھا:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اور میری امی کا جواب تھا:

تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

میٹرک کے بعد جب میرا داخلہ لاہور کالج فار ویمن میں ہوا تو ایک سال بعد استانی سیّدہ بھی انگریزی میں ایم اے کرنے کے لیے اسی کالج میں آگئیں۔ یوں میں اور موصوفہ ایک سال ایک ہی کالج میں پڑھتے

رہے۔ ہمارا ہوسٹل بھی ایک ہی تھا لیکن کالج میں چھوٹی اور بڑی کلاسز کا زیادہ میل جول نہیں ہوتا تھا۔ ایم اے والوں کے رہائشی کمرے اوپر تھے جہاں ہم لوگ عام طور پر نہیں جاتے تھے اور کھانے کے کمرے بھی الگ الگ تھے اس لیے سامنا کبھی کبھار ہی ہوتا۔ یہ ملاقات اچھی تو لگتی تھی لیکن میں ان کے مقام کے مدنظر میں کبھی ان سے بے تکلفی کی جرأت نہیں کر سکی۔

استانی سیّدہ استانیوں والی گلی میں رہائش پذیر اور اس وقت تک غیر شادی شدہ تھیں تاہم بعد میں ان کی شادی علی بن عبدالقادر سے ہوگئی جو لاہور میں وکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔

موصوفہ نے ٦ جون ١٩٨٤ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

استانی امۃ المنان قمر ہماری سائنس ٹیچر تھیں۔ ہمیں ہائجن اور فزیالوجی پڑھاتی تھیں۔ شاید کیمسٹری اور بیالوجی ہمارے سکول میں نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں ایف ایس سی میں داخل ہوئی تو یہ دونوں مضامین بالکل ہی نئے محسوس ہوئے۔ اردو میڈیم سکول سے آ کر لاہور میں سب کچھ انگریزی میں پڑھنا ویسے بھی بہت مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور آہستہ آہستہ میں کلاس کے ساتھ چل پڑی۔

ڈاکٹر امۃ السمیع کہتی ہیں: میں یہ بتاتی چلوں کہ استانی امۃ المنان قمر سلسلے کے ایک پرانے خادم، مولوی چراغ دین کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی والدہ کا نام سارہ بیگم تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ سارہ بیگم کو بہت شوق تھا کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر سلسلے کی خدمت کرے چنانچہ ان کے بچوں نے تعلیم بھی حاصل کی اور بعض کو دین کی خدمت کی توفیق بھی ملی۔

استانی امۃ المنان قمر عمر میں ہم سے زیادہ بڑی نہیں تھیں چنانچہ ان سے سب طالبات کی دوستی ہوگئی۔ میں باقی سب ٹیچرز سے ڈرتی تھی لیکن استانی امۃ المنان قمر سے قربت تھی اور میں ان کے پیریڈ کا بے چینی سے انتظار کیا کرتی تھی۔ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے میاں، غلام احمد نسیم، مربی سلسلہ نے ''یادِ ایام'' کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کا احسن رنگ میں اجر دیا چنانچہ ان کے دونوں بیٹے اور دونوں بیٹیاں ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں۔ بیٹے اب امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں اور استانی امۃ المنان ان ہی کے ہمراہ مقیم ہیں۔

ان کی ایک چھوٹی بہن امۃ القیوم تھیں جو ہماری کلاس میں پڑھتی تھیں۔ لڑکیاں کبھی اُن کا مذاق اڑاتیں تو وہ بھاگی بھاگی استانی امۃ المنان کے پاس شکایت کرنے چلی جاتیں چنانچہ وہ بے چاری ہماری ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان کی اشک شوئی کر دیتیں۔

سکول کی معلّمات میں امۃ الرشید قمر بھی شامل تھیں جو عبدالرحیم دیانت درویش کی صاحبزادی تھیں۔ بتایا جاتا تھا کہ وہ جامعہ نصرت کے پہلے بیچ میں شامل تھیں۔ وہ سکول کی ڈائریکٹریس یعنی حضرت سیّدہ مریم صدّیقہ حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی (جو جماعتی حلقوں میں ''چھوٹی آپا'' کے نام سے معروف تھیں) کی تحریک پر بی ٹی کرنے کے بعد ١٩٥٦ء میں نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھانے لگیں اور اگلے چار سال تک سکول کے سٹاف

میں شامل رہیں۔

استانی حمیدہ صابرہ بہت فصیح البیان اور خوش خُلق تھیں۔ مجھے ان سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ شاید چھٹی یا ساتویں کی کلاس ٹیچر تھیں۔ موصوفہ ایک دفعہ واہ کینٹ اپنے کسی غیر احمدی عزیز ڈینٹسٹ کے پاس آئیں تو امی کو ملنے کے لیے خاص طور پر ہمارے گھر آئیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے امی کی وفات پر مجھے ایک تسلی آمیز تعزیتی خط لکھا تھا جسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ میری امی کی خوبیوں کی معترف تھیں۔

موصوفہ کے بعد میں ذکر کرنا چاہتی ہوں استانی احمد بی کا جو مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ان کی بیٹیوں کے نام خاصے منفرد تھے۔ سب سے بڑی بیٹی حمامۃ البشریٰ، اس سے چھوٹی ریحانۃ البشریٰ اور سب سے چھوٹی فرزانۃ البشریٰ تھیں۔ ایک بیٹے مبشر تھے جو خاصے خوش الحان تھے۔ استانی احمد بی پرائمری کی ٹیچر تھیں اور بعد میں خانہ داری بھی ان ہی کی ذمہ داری بن گئی۔ میری امی کا بہت احترام کرتی تھیں اور کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ کرتیں۔ میری امی بھی ان پر بہت اعتماد کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی حمامۃ البشریٰ جو بعد میں جامعہ نصرت میں عربی کی لیکچرر رہیں مجھ سے شاید دو یا تین کلاسیں پیچھے تھیں۔ استانی احمد بی دھیمے مزاج کی مالک تھیں لیکن ان کا رعب بہت تھا اور کلاس کے بچے ان سے بے حد ڈرتے تھے۔

اگر بات میری انتہائی پسندیدہ ٹیچر کی ہو تو میں استانی حمیدہ راشدہ کا نام لوں گی۔ ان کے میاں، فیض محمد ٹبہ سلطان پور میں رہتے تھے جب کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی غرض سے ۱۹۴۹ء میں ربوہ آ گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے وہ آٹھ بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی بہنوں یعنی امۃ الحفیظ، سعیدہ، مجیدہ، امۃ الرفیق، امۃ الباسط، طیّبہ اور طاہرہ میں سے کچھ نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھتی تھیں۔ ایک بہن طاہرہ اور بھائی، مبارک مصلح الدین چنیوٹ میں والدین کے ساتھ رہتے تھے۔ ہماری کلاس کو تو نہیں پڑھایا لیکن میں ان کے پاس گھر حساب پڑھنے جاتی تھی۔ بہت ہی پیاری شخصیت کی مالک تھیں اور بے حد شفقت سے پیش آتی تھیں۔ ان کی بہن امۃ الرفیق میرے میاں، محمد اکبر کے دوست، رشید احمد چٹھہ کی بیگم تھیں۔ چٹھہ صاحب کی اچانک وفات ہوگئی تھی۔ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ میری بیٹی کے عقیقہ پر دونوں میاں بیوی واہ کینٹ آئے تھے۔ بچہ ان لوگوں کا کوئی نہیں تھا۔ امۃ الباسط پہلے لاہور میں رہتی تھیں لیکن اپنے میاں، چوہدری غلام مجتبیٰ ایڈووکیٹ کی وفات کے بعد بچوں سمیت لاس اینجلس منتقل ہو چکی ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ استانی حمیدہ راشدہ پڑھائی کے زمانے سے ہی بہت ذہین اور لائق تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ جب ان کے استاد سوال لکھوانا شروع کرتے تو وہ اسے ساتھ ساتھ حل کرتی جاتیں۔ ایک سوال کچھ مشکل تھا۔ استاد یہ سوال لڑکیوں کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن خود ان ہی سے حل نہیں ہو پا رہا تھا۔ استانی حمیدہ راشدہ نے جب یہی سوال حل کر کے اپنے استاد کو دکھایا تو انہیں اپنی ناکامی پر غصہ آ گیا اور حل شدہ سوال پر پین سے اتنی سختی سے کاٹا لگایا کہ صفحہ پھٹ گیا۔ آخر جب استاد سے سوال حل نہیں ہوا تو ان سے کاپی واپس مانگی۔ پھٹے ہوئے ٹکڑوں کو جب جوڑا گیا تو سوال صحیح حل ہوا تھا۔ تب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے کلاس کے سامنے آپ سے اپنی

سخت روی کی معذرت طلب کی۔

ان کی ایک بیٹی، بریرہ مقیم انگلستان کی روایت کے مطابق وہ ۱۵ جولائی ۱۹۲۳ء کو قادیان میں پیدا ہوئی تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی بے حد پابند اور تہجد کی عادی تھیں۔ نرم گو، نرم مزاج، مخلوقِ خدا کی ہمدرد...... غرض کون سی ایسی خوبی تھی جو اُن میں نہ پائی جاتی ہو۔ کبھی کوئی سخت بات کہتا تو بھی خاموش رہتیں اور کہتیں کہ میں نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ تادیر تلاوتِ قرآن مجید میں مصروف رہتیں۔ ہمدردیٔ خلق کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ضرورت مندوں کا تانتا لگا رہتا لیکن وہ کسی کو مایوس نہ کرتیں۔ کوئی بیمار ہوتا تو فوراً دوا دارُو کے انتظام میں لگ جاتیں، کسی کو پڑھائی میں مدد چاہئے ہوتی تو اس کی تعلیمی کمی پوری کروا دیتیں بلکہ بعض دفعہ ہمیں بھی انہیں پڑھانے کو کہتیں اور یہ سب کام بغیر کسی لالچ کے فی سبیل اللہ ہوتا۔ انہوں نے بلا مبالغہ سینکڑوں بچوں کو قرآن پاک پڑھایا۔

وہ ۱۹۶۰ء تک نصرت گرلز ہائی سکول میں رہیں جس کے بعد واپس ٹبہ سلطان پور چلی گئیں۔ اس قصبے میں لڑکیوں کا ایک پرائمری سکول ہوا کرتا تھا جس کی ہیڈ مسٹریس ۱۹۶۱ء میں اچانک وفات پا گئیں۔ تب استانی حمیدہ راشدہ کے شوہر کے ایک قریبی دوست، میاں سعید الدین، نائب تحصیلدار نے اپنی بہن، مسز سعید (جو ڈسٹرکٹ انسپکٹریس آف سکولز تھیں) سے کہہ سن کر استانی حمیدہ راشدہ کو اس سکول کی ہیڈ مسٹریس مقرر کرا دیا۔ موصوفہ نے اس سکول کی حالت بہتر بنانے کی ہر ممکن سعی کی جس کے نتیجے میں چھ سات سال بعد اسے مڈل سکول اور اس کے مزید دو سال بعد ہائی سکول کا درجہ حاصل ہو گیا۔ جب اس سکول میں ہائی کلاسز شروع ہو گئیں تو یہاں ایک نئی ہیڈ مسٹریس کا تقرر کر دیا گیا اور استانی حمیدہ راشدہ نے اپنی وفات تک کا باقی وقت بطور سیکنڈ مسٹریس گزارا۔

انہوں نے ۱۸ مئی ۱۹۷۸ء کو قریباً پچپن سال کی عمر میں وفات پائی۔

ڈاکٹر امۃ السمیع کہتی ہیں: میرے اپنے مشاہدے کے مطابق استانی حمیدہ راشدہ اور ان کی بہنیں بہت دھیمی طبیعت کی مالک تھیں۔ سب بہنیں اپنے بھائی، مبارک مصلح الدین کا ذکر اسی پیار سے کرتی تھیں جس طرح بی بی جمیل (یعنی صاحبزادی امۃ الجمیل بنت حضرت مصلح موعود) طاری بھائی (یعنی صاحبزادہ مرزا طاہر احمد) کا ذکر کیا کرتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ ہمیں ایسے لگتا تھا گویا ہم بھی صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کو بالکل اسی طرح جانتے ہوں جیسے بی بی جمیل انہیں جانتی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے آپا قوسی (یعنی صاحبزادی امۃ القدوس) سے کہا کہ ہم لوگ تو خلیفہ رابع کے ساتھ ساتھ بڑے ہوئے تھے۔ یہی حال بھائی مبارک مصلح الدین کا تھا حالانکہ میں نے انہیں کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ ان سے ملاقات چند سال قبل واہ کینٹ میں ہوئی جب وہ جماعتی رابطوں کے سلسلے میں ہمارے گھر حضور کا پیغام دینے آئے تھے۔

استانی امۃ الرحمٰن طیّبہ جو حضرت خدا بخش مومن جی کی صاحبزادی اور محمد نواز مومن، کارکن دفتر صدر انجمن احمدیہ کی اہلیہ تھیں مڈل کلاسز کو پڑھاتی تھیں۔ دھیمے لہجے میں بات کرتیں اور پنجابی ہونے کے باوجود اردو سپیکنگ معلوم ہوتی تھیں۔ عینک لگاتی تھیں۔ لڑکیوں میں کافی مقبول تھیں۔ بچپن میں ہم لوگ چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے عزیزوں کے پاس لاہور جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے چوبرجی میں ایک بڑی سی بلڈنگ

تھی۔اسی بلڈنگ کے ایک کمرے میں استانی امۃ الرحمٰن طیّبہ کے بھائی عبدالشکور اسلم اور بہن مومنہ رہتی تھیں۔ عبدالشکور اسلم ان دنوں پڑھتے تھے۔ان کی ایک سائیکل سیڑھیوں کے نیچے کھڑی رہتی تھی۔کبھی کبھار جب وہ سائیکل چھوڑ جاتے تو میری اور میرے کزن کی موج ہوجاتی۔ان کی عدم موجودگی میں ہم دونوں یہ سائیکل لے اڑتے اور گھر کے پاس ہی ایک میدان میں اسے چلا کر اپنا شوق پورا کرتے رہتے۔ایک دفعہ میری امی نے عبدالشکور اسلم کو دھاگہ لانے کے لیے بھیجا تو میں بھی ضد کر کے ان کے ساتھ چل پڑی اور کہا کہ سائیکل میں چلاؤں گی۔انہوں نے طوعاً وکرہاً میری بات مان تو لی لیکن راستہ بھر آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے کہ لوگ کیا کہیں گے چھوٹی سی لڑکی سائیکل چلا رہی ہے اور ایک نوجوان پیچھے کیریئر پر بیٹھا ہے۔ سنتے ہیں اب وہ پاکستان سے نقلِ مکانی کر کے انگلستان جا بسے ہیں۔خدا انہیں صحت و عافیت سے رکھے۔

ہماری یہ استاد بڑی خوش پوش تھیں۔وہ اپنا کام بہت توجہ اور سلیقے سے کرتی تھیں۔

استانی رحمت النساء پرائمری سکول ٹیچر تھیں۔ ہمارے کلاس روم کے ساتھ گلی میں ان کی کلاس ہوتی تھی۔جہیر الصّوت تھیں۔پٹائی بھی خوب کیا کرتی تھیں لیکن تھیں بہت اچھی اور ہمدرد۔دراصل اس زمانے میں پٹائی کے بغیر پڑھائی مکمل سمجھی ہی نہیں جاتی تھی۔

میں استانی حمیدہ اہلیہ ملک مبارک علی جو اپنے میاں کی وفات کے بعد بچوں کے ہمراہ ربوہ منتقل ہوئی تھیں کا ذکر کئے بنا نہیں رہ سکتی۔اُن کا ایک بیٹا میرے کزن، رفیق کا ہم عمر تھا اور اسی کا کلاس فیلو۔بیٹیاں مجھ سے جونیئر تھیں۔شاید پرائمری کلاسز کو پڑھاتی تھیں اور خانہ داری کی ذمہ داری میں استانی احمد بی کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔انہوں نے بہت ہمدرد طبیعت پائی تھی چنانچہ شام سویرے جب بھی میری امی ان کی ضرورت محسوس کرتیں، استانی حمیدہ فوراً ان کے پاس حاضر ہوجاتیں۔شوہر کے نہ ہونے کے باعث اکثر مسائل کا شکار رہتی تھیں۔اس کے بعد ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔الفضل کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے ۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔اُن کی وفات پر نصرت گرلز مڈل سکول، ربوہ کے سٹاف نے اپنی قراردادِ تعزیت میں اُنہیں ''نہایت ملنسار، خلیق اور فرض شناس'' قرار دیا۔

استانی حور بانو استانیوں والی گلی میں رہتی تھیں۔ ساتھ ان کی والدہ بھی قیام پذیر تھیں۔ان کی استانی امۃ الرحمٰن عمر اور استانی سیّدہ سے خاص دوستی تھی۔شادی کے بعد ربوہ سے چلی گئی تھیں۔ان کو دیکھ کر ''حور'' رسالہ یاد آجاتا تھا یا پھر ڈپٹی نذیر احمد کی کہانیاں۔

اور اب کچھ ذکر استانی محمودہ ثروت اور ان کی دو بہنوں کا جو سکول میں پڑھایا کرتی تھیں۔باقی بہنوں کے نام رشیدہ ثروت اور جمیلہ ثروت تھے۔بعد میں جب زمانہ بدل گیا تو لوگ انہیں ''ثروت سسٹرز'' کہنے لگے تھے۔ان کے والد کا نام شیخ محمد ذاکر تھا اور ان کے ایک بھائی شیخ عبدالخالق کسی زمانے میں الشرکۃ الاسلامیہ لمیٹڈ میں اکاؤنٹنٹ ہوا کرتے تھے۔اب رشیدہ ثروت اور جمیلہ ثروت اللہ کو پیاری ہوچکی ہیں البتہ محمودہ ثروت حیات ہیں اور محلّہ دارالصدر جنوبی میں حضرت نواب امۃ الحفیظ کے مکان کے قریب رہائش پذیر ہیں۔

استانی امۃ المنان ریحانہ پرائمری سکول کی ٹیچر تھیں۔ ان کے بچے چھوٹے تھے اور انہیں گھر میں سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا لہٰذا ان کا پریشان رہنا قابلِ فہم تھا۔اس زمانے میں تنخواہیں بھی کم ہوتی تھیں لہٰذا ہر کوئی مسئلوں میں الجھا نظر آتا تھا۔میری امی کے ساتھ اکثر آتے جاتے اپنے ذاتی مسائل پر گفتگو کرلیتی تھیں۔ سکول چھوڑنے کے بعد ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ایک بار میں اپنے میاں کی قبر پر دعا کرنے کے لیے بہشتی مقبرے گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ استانی امۃ المنان ریحانہ ان کی قبر کے پاس ہی دفن ہیں۔خدا تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

چنیوٹ کے بابا جیون کی صاحبزادی اور سابق ایڈیٹر الفضل، مولانا نسیم سیفی کی خواہر نسبتی، استانی سلیمہ بھی اسی سکول میں پڑھاتی تھیں۔ان کے ایک بھائی محمد رشید ریلوے میں ملازم تھے اور دوسرے بھائی عبدالسمیع اسلم راولپنڈی میں ہوا کرتے تھے۔موصوفہ پرائمری کی ٹیچر تھیں۔ بہت ہی شائستہ اور نرم مزاج۔ان کا کوئی طبی مسئلہ تھا چنانچہ وہ میری امی کے مشورے پر ایک بار میرے پاس گنگا رام ہسپتال علاج کے لیے آئیں۔ میں ان دنوں میڈیکل کالج کی طالبہ تھی لیکن میری پروفیسر نے میرا مان رکھا اور ان کے معاینے کے بعد بہت احتیاط سے ایک آپریشن بھی کیا لیکن افسوس! خاطر خواہ نتائج پھر بھی حاصل نہ ہوسکے۔

''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ موصوفہ لجنہ کی ایک فعّال رکن تھیں چنانچہ اپریل ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۳ء تک جن ممبرات کو مختلف عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملا ان میں موصوفہ بھی شامل تھیں۔اسی طرح جلسہ سالانہ کے موقع پر انہیں بھی مختلف ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق ملتی رہی۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد فیکٹری ایریا ربوہ میں اپنے بھائی محمد رشید کے ہمراہ رہیں۔اب وفات پا چکی ہیں اور بہشتی مقبرے میں مدفون ہیں۔

ڈاکٹر امۃ السمیع مزید بتاتی ہیں: جب میں سکول میں داخل ہوئی تو نیٹ بال کا کھیل نیا نیا رائج ہوا تھا اور لڑکیاں اسے سیکھ رہی تھیں۔ میں نے بھی اس کھیل میں حصہ لینا شروع کر دیا۔میری یہ ٹریننگ بعد میں میرے بہت کام آئی چنانچہ جب میں لاہور گئی تو میں نے مسلسل پریکٹس سے اپنی کھیل کو بہتر بنایا جس کے نتیجے میں مجھے کالج گیمز کے علاوہ یونیورسٹی گیمز میں بھی حصہ لینے کا موقع ملتا رہا۔

موصوفہ کہتی ہیں: میں ایک بات اور بتاتی چلوں اور وہ یہ کہ جب نصرت گرلز ہائی سکول اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہوا تو اس کے اندر ہیڈ مسٹریس کی رہائش کے لیے ایک گھر موجود تھا مگر کسی وجہ سے نامکمل رہ گیا تھا چنانچہ میں، میری والدہ اور میرا کزن رفیق شام کے وقت صدر انجمن احمدیہ کے کوارٹر نمبر ۳۲ میں آجاتے تھے۔ ہمیں سکول والے مکان میں رات گزارنے سے ڈر لگتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ ہم بارش برسات میں بھی شام کو بہر حال کوارٹر میں پہنچ جاتے۔ جب کبھی شام کو آندھی کے آثار پیدا ہونے لگتے تو میں بھاگ کر نظارت خدمتِ درویشاں والے مختار احمد ہاشمی کے گھر ان کی والدہ یا بہن، زاہدہ سلطانہ ہاشمی کو کہہ آتی کہ آج آپ ہمارے گھر سوئیں اور خدا تعالیٰ ان کو جزا دے وہ فوراً آ بھی جاتیں۔ یوں ہماری رات قدرے سکون سے گزر جاتی۔

وہ اعتراف کرتی ہیں کہ وہ اپنے مادرِ علمی کی کبھی کوئی خدمت نہیں کر سکیں البتہ ایک بار جب وہ وہاں گئیں تو ہیڈ مسٹریس، رفیعہ غزنوی نے بتایا کہ بچیوں کو اپنی تختیاں دھونے یا پانی کی دیگر ضروریات پوری کرنے کے لیے کلاس رومز سے دُور جانا پڑتا ہے۔ سکول کے پاس اتنے فنڈز نہ تھے کہ وہ کوئی متبادل انتظام کر سکے۔ انہوں نے ڈاکٹر امۃ السمیع سے پوچھا کہ کیا وہ یہ کام کروا سکتی ہیں۔ خدا نے انہیں توفیق دے رکھی تھی چنانچہ انہوں نے سکول کی عمارت کے قریب کسی جگہ کچھ ٹوٹیاں لگوانے کے لیے رقم بھجوا دی۔

ڈاکٹر امۃ السمیع نے نصرت گرلز ہائی سکول میں بہت کم وقت گزارا لیکن اس ادارے نے انہیں بعض بہت اچھی سہیلیاں دیں جن کے ساتھ ان کے مراسمِ مخلصانہ عمر بھر قائم رہے۔ ان میں سے سب سے پہلے وہ (پرویز پروازی کی اہلیہ) جِیدا یعنی امۃ المجید کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں: جِیدا اسکول کے زمانے سے میری بہت ہی پیاری دوست ہے۔ جان پہچان تو تقریباً ساری کلاس فیلوز سے تھی لیکن جِیدا اور بعد میں اس کی وساطت سے اس کی دوست، ڈاکٹر خیر دین بٹ کی صاحبزادی، رشیدہ تسنیم سے بھی میری بے حد دوستی ہوگئی۔ اکثر ملاقات رہتی تھی۔ میں جب بھی ربوہ جاتی تو ان دونوں سے ضرور ملاقات بلکہ ملاقاتیں ہوتیں۔ جِیدا کا گھر دارالرحمت وسطی میں میرے ماموں کے گھر کے سامنے تھا۔ رشیدہ بھی اکثر وہاں آئی ہوتی تھی۔ جِیدا کے ایک دیور واہ کینٹ میں رہتے تھے۔ جِیدا ایک دو بار وہاں آئی تو بھی ملاقاتیں رہیں۔ ایک بار میں کینیڈا گئی تو اس کے ساتھ لمبی ملاقات رہی اور ہم نے خوب سیریں کیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اگلی سردیاں پاکستان میں گزارے گی مگر وہ نہ آسکی۔ اسی دوران مجھے آسٹریلیا منتقل ہونا پڑ گیا۔ اب دیکھیں کہاں اور کب ملاقات ہوتی ہے۔

رشیدہ چند سال پہلے امریکہ منتقل ہوگئی تھی۔ ایک بار جِیدا سے اس کی شدید علالت کا پتا چلا تو میں نے اسے فون کیا۔ باوجود خرابیٔ طبیعت کے مجھے امریکہ آنے کی پُرزور دعوت دی اور روہانسی آواز میں کہا کہ اگر میں نہ بھی موجود ہوئی تو میرے بچے تمہیں یہاں کی سیر کروائیں گے، یہ بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ بات ختم ہوئی تو فون ان کے شوہر، پروفیسر محمد شریف خان نے پکڑ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: پلیز آپ اسے جلد جلد فون کرتی رہا کریں، آپ کے ساتھ بات کر کے اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی ہے۔ چند دنوں کے بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ رشیدہ کی شدید بیماری کی وجہ سے اس کے ساتھ بات ممکن نہیں۔ اسی شام اس کا انتقال ہوگیا۔

میری سکول کے زمانے کی ایک بہت پیاری سہیلی فریدہ بنت سیّد سردار حسین شاہ، اوورسیئر تھی۔ واہ کینٹ میں بیاہی گئی اور جب میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو کے لیے وہاں گئی تو اسی کے پاس ٹھہری تھی۔ پھر تو واہ میں ستائیس سال ساتھ رہا۔ وہ وہاں پر میری ''بچپن کی سہیلی'' کے نام سے مشہور تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ شدید بیمار ہو کر اپنی بیٹی، عالیہ کے پاس کراچی چلی گئی تھی۔ کسی کو نہیں پہچانتی تھی حتّٰی کہ عالیہ سے بھی پوچھتی تھی کہ وہ کون ہے لیکن کمال یہ ہے کہ میں کراچی اس کا حال پوچھنے گئی تو اس نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اب اس کی بھی وفات ہو چکی ہے اور وہ بہشتی مقبرے میں آسودۂ خاک ہے۔

حلیمہ مرتضیٰ مجھ سے کچھ جونیئر لیکن بہت ہی اچھی دوست تھی۔ اس کی ضد تھی کہ جہاں چھمّو پڑھے گی وہ بھی وہیں پڑھے گی۔ اس کے گھر والوں نے اس کی بات مان لی اور اس طرح وہ میرے پیچھے پیچھے لاہور کالج فار ویمن اور بعد میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں پہنچ گئی۔ اس کی زندگی نے بھی وفا نہ کی اور وہ چھوٹی عمر میں چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئی۔

میری ایک اور اچھی دوست، راشدہ مبارکہ تھی جو اَب وفات پا چکی ہے۔ وہ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کے صاحبزادے، سیّد محمد امین سے بیاہی ہوئی تھی۔

نواب مسعود احمد خاں کی بیٹی، نصرت جہاں جسے پیار سے نَجّھن کہا جاتا تھا مجھ سے جونیئر لیکن میری بہت اچھی دوست رہی ہے۔ بعد میں فیصل آباد اور ربوہ میں بھی ملاقاتیں رہیں بلکہ میں نے اس کی والدہ، طیّبہ بیگم کی آخری بیماری میں کافی وقت اس کے ہمراہ سی ایم ایچ، راولپنڈی میں گزارا۔

میری ایک اور دوست صدر انجمن احمدیہ کے ایک کارکن، پیر خلیل احمد کی بیٹی امتی تھیں۔ وہ تھیں تو مجھ سے سینئر لیکن ہمارے محلے میں رہتی تھیں لہٰذا ان سے گہرا تعلق قائم ہوگیا۔ ان کی ایک سہیلی مولوی فضل دین وکیل کی بیٹی، کشور تھیں۔ نہ جانے کیوں لیکن یہ دونوں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ امتی کی شادی ہمارے دُور کے عزیزوں میں ہوئی تھی۔ ان کے میاں ڈاکٹر صفی الرحمٰن فوج میں کرنل تھے۔ کوئٹہ میں میری سروس کے دوران وہ بھی وہاں رہے۔ بعد میں سرگودھا اور واہ کینٹ میں بھی ملاقات رہی۔ امتی بھی اب وفات پا چکی ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ کے ایک اور کارکن، عبدالرحمٰن شاکر کی بیٹی، محمودہ میری کلاس فیلو اور اچھی دوست تھی۔ ان کی شادی میٹرک کے بعد ہی ہوگئی تھی اور وہ بی ٹی صاحب کے بیٹے، منور احمد نمّی کے ساتھ بیاہ کر انگلستان چلی گئی تھیں۔ عرصۂ دراز کے بعد ان سے لندن میں ملاقات ہوئی تو وہ بہت اصرار کر کے مجھے، میرے میاں اور میری بیٹی کو اپنے ساتھ گلاسگو لے گئیں۔ کئی سال بعد ان کے ایک بیٹے کی شادی واہ میں ہوئی تو بارات ہمارے گھر سے گئی تھی۔

یہ تو تھیں وہ باتیں جو ڈاکٹر امۃ السمیع نے مجھے بتائیں اور آپ نے ازراہِ مہربانی بکمالِ توجہ انہیں پڑھا۔ اب میں آپ کا تعارف ممتاز عطاء اللہ اہلیہ چوہدری عطاء اللہ بنگوی، سیکرٹری انسٹیٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس، کراچی سے کرانا چاہتا ہوں جو مولوی عبدالغفور کی صاحبزادی ہیں اور عرصۂ دراز تک کراچی میں رہی ہیں۔ موصوفہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی اکلوتی صاحبزادی، عمرانہ کے ہمراہ آسٹریلیا منتقل ہو چکی ہیں۔ انہوں نے میری بہن صادقہ کے ساتھ جامعہ نصرت سے ۱۹۶۰ء میں ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور سے سی ٹی کیا اور پھر ایک سال نصرت گرلز ہائی سکول میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ وہ بتاتی ہیں: ''مجھے جو کلاس دی گئی وہ انتہائی نالائق اور فیل شدہ طالبات پر مشتمل تھی لہٰذا مجھے جلد ہی سمجھ آ گئی کہ ان نکمی طالبات کو پڑھائی کی طرف راغب کرنا آسان بات نہیں۔ اس کے باوجود میں نے اپنی طرف سے پورا زور لگایا تاہم حسبِ توقع نتیجہ اچھا نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر سکول ہی چھوڑ دیا۔''

اس زمانے میں استانی امۃ العزیز عائشہ ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ممتاز عطاء اللہ ان سے بہت متاثر ہیں اور اب تک انہیں بہت اچھے الفاظ میں یاد کرتی ہیں۔ میں نے ان سے موصوفہ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے اسے بخوشی قبول کرلیا اور اگلے ہی روز ایک نوٹ لکھ بھیجا۔ میری خواہش ہے کہ یہ تحریر استانی امۃ العزیز کے بارے میں اس تفصیلی نوٹ کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے جو ''قریۂ جاوداں'' میں ایک جگہ موجود ہے۔ ممتاز عطاء اللہ لکھتی ہیں:

''بلا کی ذہین تھیں۔ فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتیں۔ اللہ کی طرف سے حکیمانہ انداز عطا ہوا تھا۔ اس زمانے میں جب خواتین کے لیے میٹرک تک تعلیم بھی بہت سمجھی جاتی تھی انہوں نے بی اے، بی ٹی کیا اور نصرت گرلز ہائی سکول کی ہیڈ مسٹریس مقرر ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا۔ ان کی کوشش رہی کہ بچی کو اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت سے آراستہ کریں چنانچہ ان کی محنت اور دعا سے بچی ڈاکٹر بنی اور اللہ کے فضل سے اسے اپنی عملی زندگی میں خدمتِ خلق کے بیشمار مواقع میسر آئے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ایک کامیاب گھریلو زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ یوں بچی معاشرے کے لیے ایک فیض رساں وجود ثابت ہوئی۔

میں نے استانی امۃ العزیز سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کا ماٹو تھا کہ بچیوں کی تعلیم و تربیت شروع سے ہی اچھی ہونی چاہئے تاکہ انہیں اپنی آئندہ زندگی میں کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔ وہ چاہتی تھیں کہ اطاعت و فرمانبرداری اور سلیقہ و وفا شعاری ان کی سرشت میں رچ بس جائے تاکہ یہ سونا تعلیم کی بھٹی میں سے کندن بن کر نکلے۔ وہ عقابی نگاہیں رکھتی تھیں۔ بچیوں کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا حتیٰ کہ بال سنوارنا بھی ان کی نظر سے اوجھل نہ رہتا۔ وہ ایک نظر میں بچیوں کی خامیوں کو بھانپ لیتیں اور پھر کسی مناسب وقت پر انہیں اپنے پاس بلا کر اپنی اصلاح کی طرف توجہ دلا دیتیں۔ جب وہ راؤنڈ پر نکلتیں تو لڑکیاں اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتیں تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ مجھے یاد ہے بچیاں اپنی آنکھیں صاف کرنا شروع کر دیتیں تاکہ موصوفہ کی نظر ان کے کاجل پر نہ پڑ جائے۔ دوپٹہ فوراً ٹھیک کر لیتیں۔ بچیوں کے سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کے نتائج دیکھ کر ٹیچرز کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرتیں تاکہ بچیوں کی تعلیم میں رہ جانے والی کمی پوری کی جا سکے اور وہ زندگی میں کامیابی کے افق پر ایک روشن ستارہ بن کر چمکیں۔

مجھے یاد ہے سکول میں ہر پندرہ دن کے بعد لڑکیوں کی خانہ داری کی کلاس ہوتی تھی۔ اس میں لڑکیوں کو کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور سلیقہ طریقہ سکھایا جاتا اور ان کی خامیوں سے آگاہ کیا جاتا۔ بچیوں کو کھانا پکاتے وقت یہ ہدایت ہوتی تھی کہ کام ختم ہونے پر تمام چیزیں سمیٹ کر اس جگہ کو صاف کریں اور کھانا ڈھک کر رکھیں تاکہ گردو غبار اور مکھی مچھر سے محفوظ رہے۔

ان باتوں پر نصف صدی بیت چکی ہے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہمارے راستے بھی الگ ہو گئے اور یوں بھی وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ مدھم پڑ گیا ہے لہٰذا مزید کیا لکھوں۔ دعا گو ہوں کہ خدا ان کے درجات بلند کرے اور جنت میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔''

آپ نے استانی امۃ العزیز عائشہ کے حوالے سے ممتاز عطاء اللہ کی باتیں سنیں۔ آیئے اب ہم فیروزہ فائزہ سے ملتے ہیں جن کا تفصیلی تعارف ''قریۂ جاوداں'' میں آ چکا ہے لیکن ان لوگوں کی سہولت کے لیے جنہیں یہ کتاب دیکھنے کا موقع نہیں ملا اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ وہ تعلیم الاسلام کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ، جنید ہاشمی کی منجھلی صاحبزادی ہیں۔ وہ نصرت گرلز ہائی سکول کی سابق طالبہ ہیں اور تکمیلِ تعلیم کے بعد اس کے سٹاف پر بھی رہی ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں اس سکول کو ہر نظر سے دیکھنے کا موقع ملا ہے لہٰذا حق رکھتی ہیں کہ ان کی باتیں غور سے سنی جائیں۔

موصوفہ یہ بات عجز و افتخار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ جماعت کی خواتین میں تعلیم کی ترویج کے لیے ان کے خاندان کی خدمات کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں وہ ''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کی جلد اوّل کا حوالہ دیتی ہیں جس میں لکھا ہے کہ ''استانی سکینۃ النساء صاحبہ کا نصرت گرلز ہائی سکول کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ جلسہ سالانہ ۱۹۰۸ء میں ہجرت کر کے قادیان آ گئی تھیں۔ حضرت قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل تو ۱۹۰۵ء میں ہی ہجرت کر کے قادیان آ گئے تھے اور ''البدر'' میں کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن آپ ۱۹۰۸ء میں مستقل طور پر آئیں۔ ان کی اپنی روایت ہے کہ ''حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل نے فرمایا کہ سکول سنبھال لو۔ عذر کیا کہ میں سکول میں پڑھی نہیں ہوں اس لیے مشکل ہے۔ حساب نہیں آتا تو فرمایا: آپ چارج لے لیں خدا سب کام کر دے گا۔ دوسرے دن درس میں فرمایا: تم سکول نہیں گئیں؟ جاؤ جا کر مدرسہ سنبھالو۔ اس پر آپ سکول حاضر ہوئیں اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔''

نیز اس کی اطلاع البدر میں اس طرح ملتی ہے:

''انجمن نے مسز اکمل کی خدمات مدرسہ تعلیم الاسلام کی زنانہ شاخ کے لیے محفوظ کر لی ہیں۔''

استانی سکینۃ النساء صاحبہ کی روایت کے مطابق گرلز سکول حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے مکان میں ہی جاری کیا گیا تھا جہاں حضور کا مطب تھا۔ اس کے جنوبی طرف دو تین کمرے اور ایک بڑا چبوترہ ہوا کرتا تھا جس کے سامنے صحن کی طرف صفوں کے پردے ڈال دیئے گئے تھے۔

فیروزہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ قاضی محمد ظہور الدین اکمل ان کے دادا اور استانی سکینۃ النساء ان کی دادی تھیں۔

جہاں تک نصرت گرلز ہائی سکول کے ساتھ فیروزہ کے ذاتی تعلق کا ذکر ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ اس سکول میں میرا داخلہ ۱۹۵۵ء میں گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد چوتھی جماعت میں ہوا۔ اسی سکول کے ایک کونے میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی اہلیہ صغریٰ بیگم المعروف حضرت ''اماں جی'' رہائش پذیر تھیں۔ ان سے میری دادی اماں کے دیرینہ مراسم تھے چنانچہ جب وہ مجھے سکول داخل کروانے گئیں تو میں نے ان کے ساتھ حضرت اماں جی سے بھی ملاقات کی۔ مجھے ان کا چہرہ تو ابھی تک یاد ہے مگر اس کے سوا اور کوئی بات یاد نہیں کہ وہاں کچھ اور خواتین بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔

چھوٹی جماعتوں میں بعض مرتبہ کلاس صحن میں ہوتی جو دھوپ کے ساتھ ساتھ دیوار کی طرف سمٹتی جاتی۔

پیاس لگنے پر ہم سکول کے ایک کونے میں لگا نلکا ''گیڑ'' کر پانی پیتے۔ سکول سے واپسی پر راستے میں اُگی ہوئی اِکا دُکا بیری سے بیر جھاڑ کر کھاتے۔ یہ کڑوے سے ہوتے مگر نہ جانے کیوں اس وقت بڑا مزا دیتے تھے۔

ہم انجمن کے دفاتر سے اپنے کوارٹر تک کا فاصلہ تقریباً بھاگ کر طے کرتے کیونکہ یہ ایک چٹیل میدان تھا۔ بعض دفعہ دھوپ سے بچنے کے لیے ہم تختی چھتری کے طور پر سر پر رکھ لیتے۔ پھر کوارٹرز کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چھاؤں تلاش کرتے آگے بڑھتے چلے جاتے۔

اباجان کا خط بہت خوبصورت تھا چنانچہ وہ ہمیں سکول کے لیے چارٹس بنا کر دیا کرتے تھے۔ سکول انسپکشن کے موقع پر تو ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے چارٹ کے سائز کا بڑا سا پیمانہ بنوا رکھا تھا۔ مختلف موٹائیوں کی قلمیں، سیاہی کی دوات اور رنگدار پنسلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ سکول کے زمانۂ طالب علمی کے بعد بھی ہماری بعض استانیاں چارٹ بنوانے کے لیے ہم سے رابطہ کرتیں تو اباجان بڑی محبت سے ان کے حکم کی تعمیل کر دیتے۔ یہ سلسلہ میرے سکول کے زمانۂ تدریس میں بھی چلتا رہا۔

سکول میں میری پہلی استانی امۃ المنان ریحانہ تھیں۔ تقریبات میں اپنی سریلی آواز کا جادو جگاتیں۔ نہایت شفیق اور نرم دل تھیں۔ جب میں سکول میں داخل ہوئی تو گرمی کے باوجود ہماری کلاس باہر صحن میں ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھے غالباً جغرافیے کا سبق سنانے کو کہا۔ جب میں نے سبق سنایا تو انہوں نے کہا: ''اِدھر آؤ۔'' میں سکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھی اس لیے ذرا سہمی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے ضرور کوئی غلطی کی ہے لہٰذا اب میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہوگا۔ جب میں ان کے قریب پہنچی تو خلافِ توقع انہوں نے اپنا بازو میرے گرد حمائل کیا اور پھر کلاس کو مخاطب کر کے کہا: ''دیکھو لڑکیو! اس بچی نے کتنا اچھا سبق سنایا ہے۔'' پھر انہوں نے نہایت پیار سے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا، میرا پسینہ پونچھا اور اپنے سینے کے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ پھر لڑکیوں کی طرف منہ کر کے کہا: ''یہ بچی نئی آئی ہے۔ اس کی کوئی سہیلی نہیں ہے۔ کون اس کی سہیلی بنے گی؟'' کئی لڑکیوں نے ہاتھ کھڑے کئے مگر مجھے رقیہ (بنت صوفی مطیع الرحمٰن) یاد ہے جو دیوار کے ساتھ چھاؤں میں تختے پر سب سے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ استانی جی نے مجھے اس کے ساتھ بٹھا دیا اور کہا: ''یہ بچی روزانہ یہاں بیٹھا کرے گی۔ اسے یہاں سے کوئی نہ اٹھائے۔'' ان کا یہ محبت بھرا سلوک میرے دل سے کبھی محو نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کے دامن میں سمیٹ لے۔ بعد میں ان سے ملاقات ہوتی تو بھی نہایت محبت سے ملتیں۔

اب کچھ ذکر استانی زبیدہ کا جو پانچویں جماعت میں میری استاد تھیں۔ استانیوں والی گلی میں رہائش پذیر تھیں۔ بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتیں۔ ابھی سوال ان کے منہ میں ہوتا کہ میں حل کر کے ان کے پاس لے جاتی۔ وہ مسکرا کر میرا سوال چیک کرتیں اور پھر مجھے دیگر لڑکیوں کا سوال چیک کرنے کو کہتیں۔ مجھے انہوں نے کلاس مانیٹر مقرر کر رکھا تھا۔ میں نے ان ہی کے ساتھ جا کر چنیوٹ کے کسی سکول میں وظیفہ کا امتحان دیا تھا۔ حساب، اردو اور جغرافیہ وغیرہ کا تحریری اور زبانی امتحان ایک ہی دن میں ہو گیا تھا اور خدا کے فضل سے میں وظیفہ کی حقدار ٹھہری۔ وظیفہ کی رقم صرف چار روپے ماہانہ تھی۔ اپنی محنت کی یہ ''کمائی'' پا کر میں بہت خوش ہوئی۔ اب

چار روپے کی رقم بہت معمولی لگتی ہے مگر اس زمانے کے لحاظ سے جب چیزیں بہت سستی تھیں یہ رقم کافی معلوم ہوتی تھی۔ استانی زبیدہ بھی میری اس کامیابی پر بہت خوش ہوئیں اور مجھے پیار سے تھپکی دی۔

میری ان دونوں اساتذہ کی صاحبزادیاں ایک مرحلے پر اسی سکول میں میری شاگرد رہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ان کی ماؤں کی شفقت یاد آ جاتی اور میرے دل میں ان کے لیے محبت کا ایک ناقابلِ بیان قسم کا جذبہ بیدار ہو جاتا۔

استانی حمیدہ صابرہ نے کسی زمانے میں میرے اباجان سے پڑھ رکھا تھا سو مجھ پر خصوصی شفقت فرماتیں۔ ایک دفعہ جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو ہوم ورک نہ کرنے پر مجھے کوئی سزا دینے کی بجائے نہایت پیار سے تھپکی دے کر کہا: ''یہ تو میرے استاد کی بیٹی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ کل کام کر لائیں گی۔''

موصوفہ بہت زندہ دل اور خوش وضع تھیں۔ شعری ذوق بھی خوب تھا۔ بعض اوقات شعر گنگنایا کرتیں اور اکثر اوقات سُنایا بھی کرتیں۔ یہ اشعار بڑے برمحل ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ محبت اور دنیا کی ناپائیداری پر بات ہو رہی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے اختر شیرانی کی ''نور جہاں'' پر نظم کے یہ مشہور اشعار سنائے تو سارا اسٹاف واہ واہ کر اٹھا:

اسی سنسان نخلستاں میں اک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اک شہنشاہِ گرامی کی محبت ہے
یہاں وہ بانوئے عفّت نشاں سوتی ہے تُربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں
ادب! اے دل ادب کر! روضۂ نورِجہاں ہے یہ
مقدّس خواب گاہِ ملکۂ ہندوستان ہے یہ

استانی سعیدہ قاضی جو قاضی محمد نذیر لائلپوری کی صاحبزادی اور ماسٹر محمد ہارون کی اہلیہ تھیں ہماری محلّہ دار تھیں۔ نہایت سادہ اور محبت کرنے والی۔ مڈل کلاسز میں ہماری کلاس انچارج رہیں۔ چونکہ امّی فوت ہو چکی تھیں اور گھر میں کھانا پکانا ہم سب بہنیں مل کر کرتی تھیں لہٰذا میں خانہ داری میں طاق ہو چکی تھی چنانچہ خانہ داری میں تو میرے خوب نمبر آتے مگر میں سلائی کڑھائی میں کلاس سے ذرا پیچھے تھی۔ ہمیں خاکی کاغذ کے بڑے سائز کی ایک کاپی بنانا پڑتی تھی۔ اسے ''سلائی کی کاپی'' کہتے تھے اور اس میں سلائی اور کڑھائی کے مختلف نمونے چسپاں کرنے ہوتے تھے مثلاً ترپائی، تارکشی، پیوندکاری، کاج، بخیہ، گُم سلائی، کروشیا، ہِننگ، پھول پتوں کی کڑھائی وغیرہ۔ یہ کام مجھے بہت مشکل محسوس ہوتا تھا مگر اللہ غریقِ رحمت کرے استانی سعیدہ قاضی کو کہ انہوں نے سلائی کی ایک تیار شدہ کاپی میرے گھر آ کر مجھے دے دی اور میری سہیلی امۃ الحلیم بنت چوہدری فرزند علی جو سلائی کڑھائی میں خوب ماہر تھی کو تاکید کی کہ وہ امتحان کے دن مجھے بھی چھوٹا سا پھول کاڑھ کر دے دے۔ یہ پہلی اور آخری ''بُوٹی'' تھی جو میں نے کسی امتحان میں استعمال کی۔ چند سال پہلے امۃ الحلیم کا شیخوپورہ آنا ہوا تو وہ مجھے بھی ملنے کے لیے آئی اور ہم نے یہ بات یاد کر کے خوب لطف لیا تھا۔

میرے سسرال والے کچھ عرصہ محلّہ دارالعلوم، ربوہ میں مقیم رہے۔ سعیدہ قاضی بھی قریب ہی رہائش پذیر تھیں۔ ایک مرتبہ وہ ہمارے ہاں تشریف لائیں مگر افسوس میں اس وقت گھر پر موجود نہ تھی۔ بعد میں خواہش کے باوجود ان سے ملنے کا موقع نہ مل سکا مگر میرے دل میں ان کی محبت بھری یاد موجود ہے۔

ہم نے استانی سیّدہ سے غالباً ساتویں جماعت میں انگریزی پڑھی۔ وہ ہماری قابلیت بڑھانے میں ہمیشہ کوشاں رہتیں۔ اردو اور انگریزی میں نہایت نستعلیق تھیں۔ ایک دفعہ ہمارے گھر بھی تشریف لائی تھیں۔ غالباً دادی یا دادا کی وفات پر۔

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکی ہوں چونکہ اس وقت کمروں میں پنکھے نہ تھے اس لیے بعض استانیاں موسم گرما میں سکول کے صحن میں کسی چھاؤں والی جگہ کلاس لے لیتیں مگر کسی وجہ سے ہیڈ مسٹریس (استانی امۃ العزیز عائشہ) نے باہر کلاسز لینے سے منع کر دیا۔ ابھی اس بات پر چند روز گزر رہے ہی تھے کہ ایک دن استانی سیّدہ نے بطور مانیٹر مجھے حکم دیا کہ میں ہیڈ مسٹریس کو جا کر بتاؤں کہ کمرے میں سخت حبس ہے اور ان سے صحن میں کلاس لینے کی اجازت طلب کروں۔ مجھے علم تھا کہ انہوں نے باہر کلاس لینے سے منع کر رکھا ہے لہٰذا میں سخت پریشان ہوئی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑی تو ہوگئی مگر جانے میں متذبذب تھی۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ کاش میں کلاس مانیٹر نہ ہوتی یا مجھے سلیمانی ٹوپی مل جاتی تو میں استانی سیّدہ کی نظروں سے اوجھل ہو سکتی۔ جب ان کے تین چار مرتبہ کہنے کے باوجود میں اپنی جگہ سے نہ ہلی تو انہوں نے کہا: ''فیروزہ! میں تمہارے مستقبل سے مایوس ہوں۔'' اس وقت مجھے مستقبل کی تو ایسی کوئی فکر نہ تھی مگر ان کی حکم عدولی کے خیال سے کلاس سے باہر آ گئی۔ ہیڈ مسٹریس کا دفتر کچھ ہی دور تھا مگر مجھے اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ غالباً ہیڈ مسٹریس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے چق اٹھا کر پوچھا۔ ''کیہہ گل اے کُڑیے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے استانی سیّدہ کا پیغام دیا تو غصے میں آ گئیں اور انکار کر دیا۔ میں منہ لٹکائے واپس آ گئی۔ بمشکل تمام استانی سیّدہ کو بتایا اور بنچ پر ڈھیر ہوگئی۔

استانی زبیدہ چوہدری جو چوہدری رحمت خاں، مربی سلسلہ انگلستان کی صاحبزادی ہیں اور ''استانی زبیدہ'' جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے سے مختلف ہیں ہمیں انگریزی پڑھایا کرتی تھیں۔ کمزور طالبات کو چھٹی کے بعد اوور ٹائم دیتیں۔ تب معاوضہ لے کر ٹیوشن پڑھانے کا رواج نہ تھا۔ انسپکشن کے لیے خوب تیاری کرواتیں۔ سوالات کے جوابات اور سپیلنگ یاد کرواتیں۔ ان کا گھر فضلِ عمر ہسپتال کے پچھواڑے میں تھا۔ زمانۂ تدریس میں جب میری بعض اساتذہ میری کولیگ بن گئیں تو ان سے قدرے بے تکلفی ہوگئی۔ ہم کبھی کبھار ان کے گھر جاتے تو خاطر تواضع کے علاوہ اپنی آواز کا جادو بھی جگاتیں۔ ان کی گائی ہوئی ایک غزل کا یہ شعر ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے:

تاروں کے ٹوٹنے کی ادا ان کو بھا گئی
افشاں لگا لگا کے چھڑائی تمام رات

ہماری محلّہ دار، استانی امۃ الرحمٰن طیبہ نہایت شفیق اور سادہ طبیعت کی مالک تھیں۔ ہم ۱۹۵۵ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں ربوہ منتقل ہوئے تھے۔ ہمارا کوارٹر ہسپتال کی طرف سے سڑک کے سامنے تیسرا تھا۔ ایک دن ہم اپنے گھر کے باہر ٹاپُو کھیل رہی تھیں کہ محلے کے ایک شرارتی سے لڑکے ''شہابی'' نے ہمارا ٹاپُو پاؤں سے روند ڈالا اور کھیلنے والی ٹھیکری اٹھا کر بھاگ گیا۔ جب اس نے دو تین مرتبہ یہی حرکت کی تو میں نے اور میری بڑی بہن قانتہ نے اس کے گھر جو ہمارے گھر سے زیادہ دُور نہ تھا جا کر شکایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کھولنے والی استانی امۃ الرحمٰن طیبہ تھیں مگر ہمیں علم نہ تھا کہ یہ کون ہیں۔ ہم نے شہابی کی شکایت کی۔ انہوں نے نہایت توجہ سے ہماری بات سنی اور شہابی کو آواز دے کر کہا: ''وے شہاب! نہ کُڑیاں نُوں تنگ کریا کر۔'' جب ہم سکول میں داخل ہوئے تو علم ہوا کہ یہ تو قانتہ کی استانی ہیں۔ قانتہ بہت گھبرائی مگر انہوں نے ہمارے ساتھ ہمیشہ محبت اور شفقت کا سلوک کیا۔

سکول میں تدریس کے زمانے میں یہ تعلق اور بھی مستحکم ہوگیا۔ فرمایا کرتیں: سکول میں لڑکیاں تنگ کرتی ہیں اور گھر میں بچے۔ میں ان کی شفقت کی وجہ سے بعض دفعہ ان کی کاپیاں چیک کر دیتی یا سکول رجسٹر کا کام کر دیتی تو بہت خوش ہوتیں اور از راہِ محبت بعض دفعہ گھر سے کوئی کھانے کی چیز بھجوا دیتیں۔

معروف خادمِ سلسلہ، مولانا عبدالرحیم درد کی صاحبزادی استانی رضیہ درد بھی ہماری محلّہ دار تھیں۔ سکول میں کچھ عرصہ ان سے اردو پڑھی۔ ان سے جماعتی تقریبات میں بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ کسی جماعتی تقریب (غالباً صد سالہ جشن تشکر) کے موقع پر شیخوپورہ تشریف لائیں تو مل کر بہت خوش ہوئیں۔ ان کی ساس جو ''محمودہ مالیر کوٹلے والی'' کہلاتی تھیں میری دادی اماں کی شاگرد رہی تھیں۔ وہ اکثر انہیں ملنے آتیں۔ بعض دفعہ ساگ اور مکی کی روٹی یا کوئی اور سوغات لے آتیں۔ رضیہ درد کی چھوٹی بہن صفیہ پنجاب یونیورسٹی میں ہم سے سینئر تھیں۔ باقی بہنوں سے بھی ملاقات رہی۔

استانی امۃ النصیر جو بعد میں نصیر احمد نامی ایک وکیل کے ہمراہ بیاہی گئیں نہایت محنتی اور فرض شناس تھیں۔ غالباً لائبریری کی انچارج تھیں۔ مجھے اپنی معرفت کتابیں جاری کر دیا کرتیں۔ تاریخ جغرافیہ پڑھاتیں۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے نام جو اردو رسم الخط میں لکھے ہوتے یاد کرنے نہایت مشکل تھے۔ بعد میں علم ہوا کہ ہم نے ان ناموں کا تلفظ غلط یاد کر لیا تھا۔ جنگوں کے سن اور نام بھی عام طور پر گڈمڈ ہو جاتے۔ استانی امۃ النصیر ہماری غلطیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش میں سزا سے بھی گریز نہ کرتیں تاہم میرا لحاظ کرتیں۔ ایک بار انہوں نے سوٹیوں کی اجتماعی سزا دیتے ہوئے میرے آگے کئے ہوئے ہاتھ سوٹی ہی کے ساتھ نرمی سے نیچے کر دیئے تھے۔

وہ اور استانی زبیدہ چوہدری کلاس میں شاذ ہی مسکرایا کرتی تھیں۔ اگر کبھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتیں تو پھر

مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

مگر بعد میں جب وہ دونوں میری کولیگ بن گئیں تو ان کی سختی کا تاثر دور ہوگیا۔ تب پتا چلا کہ یہ سختی صرف طالبات کا ڈسپلن برقرار رکھنے تک محدود تھی۔

سلائی کڑھائی کی کلاس استانی احمد بی لیا کرتی تھیں۔ جب لڑکیاں اس مقصد کے لیے گھر سے کوئی کپڑا نہ لاتیں تو غصے سے فرماتیں: تمہاری مائیں تمہیں کپڑے کا ایک ٹکڑا تک نہیں دے سکتیں۔ ایک دفعہ انہوں نے کاج بنانے کے لیے کہا تو میں نے الٹا بنا دیا یعنی دھاگے کی زنجیر باہر کر دی تو فرمایا: ''اے کی کیتا ای، فیر بنا کے لیا'' اور مجھے کچھ سمجھایا بھی مگر مجھے سمجھ نہ آئی۔ بہر حال میں دوبارہ بنا کر لے گئی تو کہا: ''فیر الٹا؟'' شکر ہے اس کے بعد گھنٹی بج گئی۔ ان کی ڈیوٹی سکول کی گھنٹی بجوانے پر تھی۔ وہ پیریڈ ختم ہونے سے ایک آدھ منٹ پہلے کلاس روم سے نکل کر کھڑی ہو جاتیں اور گھڑی پر نظر رکھتیں۔ پھر ان کی آواز گونجتی: لڑکی گھنٹی کرو! مگر گھنٹی بجنے سے پہلے ان کی آواز کلاس ختم ہونے کا مژدہ سنا دیتی۔ صبح سکول آتے ہوئے ان کے محلے کی بعض بچیاں ان کے ساتھ سکول آتیں۔ اگر وہ سمجھتیں کہ ان کے سکول پہنچنے تک اسمبلی کی گھنٹی کو دیر ہو جائے گی تو وہ ان میں سے دو لڑکیوں کے بستے خود پکڑ لیتیں اور ان کو حکم دیتیں کہ بھاگ کر جائیں اور گھنٹی بجوائیں۔ یہ ان کی فرض شناسی کی دلیل تھی۔

استانی مسعودہ بشیر حساب پڑھاتی تھیں۔ غلط جواب پر جب کاپی پر بڑا سا کاٹا مارتیں تو بہت خوف آتا۔ وہ ساتھ ہی غلط جواب والی کاپی اس طالبہ کے سر پر دے مارتیں مگر خدا کا شکر ہے میں اس ذائقے سے ناآشنا ہی رہی۔

ہم نے استانی امۃ المنان قمر سے نویں دسویں میں ہائجین اور فزیالوجی پڑھی۔ سبق اتنی اچھی طرح سمجھاتیں کہ ذہن نشین ہو جاتا۔ ایک دفعہ ایک شریر سی لڑکی کو سبق نہ سنانے پر کھڑا کر دیا۔ جب وہ اپنی جگہ پر کھڑی ارد گرد کی لڑکیوں کے ساتھ شرارتیں کرنے لگی اور سزا کو بھی انجوائے کرنے لگی تو استانی امۃ المنان قمر نے اسے پیچھے جا کر کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے شکایت کی کہ اسے مچھر کاٹ رہے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا: ''لڑکیو! دیکھو تو سہی۔ لوگوں کو مچھر رات کے وقت کاٹتے ہیں لیکن اسے دن کے وقت ہی کاٹ رہے ہیں۔'' ان کی بیٹی امۃ الشکور بعد ازاں میری شاگرد رہی۔

جب ہم سکول میں داخل ہوئے تو استانیوں کو ''آپا جی'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور باہم گفتگو میں بھی ان کا ذکر اسی طور پر کرتے مثلاً استانی زبیدہ کا ذکر آتا تو ''آپا جی زبیدہ'' کے الفاظ استعمال کرتے۔ ہیڈ مسٹریس کو ''بڑے آپا جی'' یا ''وڈّے آپا جی'' کہا جاتا تھا۔ بعد میں استانیوں کے لیے ''باجی'' کا لفظ استعمال ہونے لگا جیسے ''آپا جی زبیدہ'' کی بجائے ''باجی زبیدہ۔'' زمانہ اور بدلا تو استانیوں کو ''مِس'' اور ہیڈ مسٹریس کو ''میڈم'' کہا جانے لگا اور یہ رواج غالباً اب تک قائم ہے۔

ہم سکول میں لکھنے کے لیے سلیٹ اور تختی استعمال کرتے۔ بیٹھنے کے لیے لکڑی کے لمبے لمبے تختے ہوتے جن کو ''پھٹے'' کہا جاتا تھا۔ چھوٹی جماعتوں میں بعض دفعہ کلاس صحن میں ہوا کرتی جو دھوپ کے ساتھ ساتھ دیوار کی طرف سمٹتی جاتی۔ بنچ اور ڈیسک تو ہمیں بہت بعد میں نصیب ہوئے۔

میں غالباً ساتویں جماعت میں تھی جب مربی فلسطین، مولوی محمد شریف کی صاحبزادیاں پہلے دن سکول آئیں۔ وہ وہاں کے رواج کے مطابق سکارف، لمبے سکرٹ اور جرابوں میں ملبوس تھیں۔ طالبات نے اس سے پہلے کسی

لڑکی کو اس قسم کے لباس میں نہ دیکھا تھا لہٰذا وہ انہیں دیکھنے کے لیے ان کے گرد جمع ہو گئیں۔ یہ حیرت و استعجاب کئی دن تک قائم رہا تاوقتیکہ ان بچیوں نے بھی اپنے لباس کو یہاں کے رواج کے مطابق ڈھال نہیں لیا۔

سبق یاد نہ کرنے پر عام طور پر کھڑے ہو کر یاد کرنے کی سزا ملتی جو سبق سنانے پر ختم ہو جاتی۔ یہ سبق بسا اوقات استانی کی بجائے مانیٹر بھی سنا کرتی تھی۔

بعض اوقات استانی کی غیر حاضری میں شور مچانے یا کسی اجتماعی غلطی پر پوری کلاس کو سوٹیوں کی سزا ملتی۔ اس مقصد کے لیے لکڑی کی ایک تقریباً دو انچ چوڑی تختی استعمال کی جاتی تھی۔ تمام لڑکیوں کو کھڑے ہونے کا حکم ملتا اور استانی صاحبہ اس تختی کی ایک ایک ضرب ہر طالبہ کے دونوں ہاتھوں پر لگاتی جاتیں مگر اکا دکا طالبہ جس پر استانی صاحبہ کو یقین ہوتا کہ بے گناہ ہے اور پڑھائی میں بھی اچھی ہے اس سزا سے مستثنیٰ قرار پاتی۔ اس وقت کلاس روم میں مکمل سکوت طاری ہوتا اور صرف سوٹی کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی۔

ایک اور سزا جس میں اجتماعی افادیت کا بھی ایک پہلو تھا سکول کے صحن میں سے اینٹیں اور روڑے چُننا تھی۔ اس کام کے لیے لڑکیاں عام طور پر کلاس مانیٹر کی نگرانی میں قطار کی صورت میں روانہ ہوتیں مگر کچھ دور جا کر منتشر ہو جاتیں اور صحن میں بکھرے ہوئے کنکر، کاغذ اور ٹھیکرے اٹھانے کی آڑ میں خوب ہنستیں اور اسے سزا کی بجائے تفریح کا ایک ذریعہ سمجھنے لگتیں۔ کبھی نلکا ''گیڑ'' کر پانی پیتیں اور کبھی روڑے کھیلنے لگتیں یا ٹاپُو کی صورت ٹھیکریوں کو ٹھوکریں مار کر منزلِ مقصود پر پہنچانے کی کوشش کرتیں مگر جب ہیڈ مسٹرس دفتر سے باہر نکلتیں تو سب جلدی جلدی جمع شدہ اینٹیں روڑے اٹھا کر دفتر کے آگے ڈھیر کر آتیں۔

اُس وقت تک کمروں کے سامنے برآمدہ نہیں بنا تھا البتہ برآمدہ کی بنیادوں میں بھرتی ڈالی جا چکی تھی۔ سکول بند ہونے پر طالبات باری باری اپنا کلاس روم اور برآمدہ کا ملحقہ حصہ صاف کرتیں اور نلکے سے پانی لا کر اس پر چھڑکاؤ کرتیں۔ کبھی کبھار خاص طور پر سکول اِنسپکشن یا کسی اور تقریب کے موقع پر برآمدہ والی جگہ پر ہاتھوں سے پوچا دیتیں۔

سکول اِنسپکشن کا موقع بعض اعتبار سے پریشانی اور بعض اعتبار سے دلچسپی کا باعث بن جاتا۔ ایسے مواقع پر سکول کو بہت اچھی طرح صاف کیا جاتا۔ کمرے مختلف مضامین کے متعلق ہاتھ سے بنائے ہوئے چارٹوں سے مزیّن کئے جاتے۔ تختہ سیاہ کو گیلے کپڑے سے صاف کر کے اس پر سیاہی پھیری جاتی۔ غرض سکول میں خوب رونق اور چہل پہل ہوتی۔ سبق کی ریہرسل کی جاتی۔ بعض دفعہ انسپکٹریس کوئی ایسا سوال بھی پوچھ لیتیں جو کورس میں نہ پڑھا ہوتا مگر ہمارے سکول میں تعلیم کا معیار اچھا تھا اور استانیاں محنتی اور دیانتدار تھیں لہٰذا خدا ایسے موقع پر عزت رکھ لیتا۔ سفارش اور نقل کا رواج نہ تھا۔ کمزور طالبات کو سکول کے بعد اوورٹائم لگوایا جاتا۔ لائق طالبات بھی کمزور طالبات کی مدد کرتیں۔ عام طور پر سکول کے نتائج اچھے رہتے اور بہت کم طالبات فیل ہوتیں۔ آٹھویں کے ورنیکولر فائنل اور دسویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات میں طالبات بسا اوقات نمایاں پوزیشنیں اور سکالرشپ حاصل کرتیں۔

دینیات کے پیریڈ میں قرآن کریم اور حدیث کے علاوہ جماعتی لٹریچر بھی پڑھایا جاتا۔ نہم اور دہم میں حضرت مصلح موعود کی تصنیفِ لطیف ''دعوت الامیر'' پڑھنا اور اس کا امتحان دینا یاد ہے۔ ایک بار مجھے اس امتحان میں سو میں سے اٹھانوے نمبر ملے اور استانی جمیلہ ثروت سے ایک پنسل انعام میں ملی۔

سکول میں جمعہ کو چھٹی اور جمعرات کو آدھی چھٹی ہوتی تھی۔ آدھی چھٹی کے بعد جماعتی اجلاسات استانی امۃ الرشید شوکت کرواتیں۔ پارٹیوں یا قومی تہواروں کے موقع پر ''ٹیبلو'' پیش کئے جاتے مثلاً علاّمہ اقبال کی اس نظم پر:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری

ان مواقع پر فینسی ڈریس شو بھی ہوتا۔ مجھے یاد ہے ایسے ہی ایک موقع پر نعیمہ نامی ایک طالبہ نے حلوائی کا بہروپ بھرا تھا۔ لڑکیوں کو اس کا یہ بہروپ اتنا پسند آیا کہ انہوں نے بعد میں اسے ''نعیمہ حلوائی'' کہنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکی، ناصرہ مرزا جو غالباً ایسٹ افریقہ سے آئی تھی نے حبشن کا بہروپ بھرا۔ اس لڑکی نے یہ بہروپ اس کامیابی سے بھرا تھا کہ اسے پہچاننا مشکل ہو گیا۔

سکول میں چھوٹی سی لائبریری تو تھی مگر طالبات خود اپنے نام کوئی کتاب نہ جاری کرا سکتی تھیں۔ اس کے لیے انہیں اپنی کسی استانی کی پیشگی منظوری درکار ہوتی تھی۔

مددگار کتب جنہیں عام طور پر گائیڈ یا خلاصہ کہا جاتا ہے کلاس روم میں لانے کی سخت ممانعت تھی۔ اگر کسی طالبہ سے خلاصہ برآمد ہو جاتا تو اسے ''خلاصے'' کی دو تین ضربیں سہنے کے علاوہ ضبطیٔ خلاصہ بحقِ سرکار کی سزا بھی بھگتنا پڑتی۔

جماعتی تقریبات مثلاً لجنہ اماء اللہ کا سالانہ اجتماع اور خواتین کا جلسہ سالانہ سکول کی گراؤنڈ میں ہوتا۔ کمرے زنانہ مہمان خانے میں تبدیل ہو جاتے اور ہم کھوری یا کسیر اٹھا اٹھا کر ان کمروں میں بچھاتے۔

مجھے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک اپنی مادرِ علمی میں تدریس کا موقع بھی ملا۔ اس طرح مجھے ان اساتذہ کی قربت نصیب ہوئی جن کے سامنے میں نے ایک زمانے میں زانوئے تلمّذ تہ کیا تھا۔ اُس وقت مسعودہ بشیر ہیڈ مسٹریس تھیں اور میری رفقائے کار میں کئی اور استانیوں کے علاوہ جن کے نام اس وقت مستحضر نہیں ہیں باجی بلقیس؛ احمد بی بی؛ حمیدہ صابرہ؛ امۃ الرحمٰن طیّبہ؛ ناصرہ رحمٰن (بنت عبدالرحمٰن و زوجہ طفیل منیر، ایڈووکیٹ)؛ رفیعہ غزنوی؛ زبیدہ؛ محمودہ ثروت، رشیدہ ثروت اور جمیلہ ثروت؛ طیّبہ صوفی (بنت حضرت صوفی غلام محمد رفیق حضرت مسیح موعود)؛ بشریٰ طیّبہ (بنت عبدالعزیز ٹال والے، فیکٹری ایریا ربوہ)؛ بشریٰ (اہلیہ اللہ بخش صادق)؛ امۃ المنان قمر؛ نعیمہ صدیق (بنت مولوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری)؛ بشریٰ لال دین (بنت لال دین قلعی گر)؛ محسنہ (بنت غلام رسول برادر محمد شریف خالد، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج ربوہ و زوجہ عبدالباری)؛ سعیدہ قاضی؛ مسعودہ اکمل (زوجہ عبدالحکیم اکمل، مربی سلسلہ)، امۃ الحمید اختر (زوجہ عبدالشکور اکمل، مربی سلسلہ)؛ امۃ النصیر؛ امۃ الرفیق (بنت میاں عطاء الرحمٰن پروفیسر تعلیم الاسلام کالج) اور شمس النساء المعروف شمسی (بنت قریشی محمد عبداللہ،

آڈیٹر صدر انجمن احمدیہ) شامل تھیں۔

میں نویں اور دسویں جماعت کی کلاسز لیا کرتی تھی اور انگریزی، مطالعہ پاکستان اور اردو پڑھاتی تھی۔ یوں تو روزانہ آٹھ یا شاید نو پیریڈ ہوا کرتے تھے (پانچ آدھی چھٹی سے پہلے اور باقی بعد میں) لیکن ہر ٹیچر کو کم از کم چھ پیریڈ لینا پڑتے تھے۔ اگر کوئی ٹیچر رخصت پر ہوتی تو اس کی جگہ حاضر ٹیچرز کو پیریڈز لینا پڑتے۔

اس زمانے میں نویں اور دسویں جماعت کے چار چار سیکشنز (اے، بی، سی اور ڈی) ہوا کرتے تھے۔ سائنس پڑھنے والی طالبات اے سیکشن میں ہوتی تھیں۔ ڈی سیکشن میں عام طور پر وہ طالبات ہوتیں جن کا داخلہ کسی وجہ سے لیٹ ہوتا تھا۔ یہ طالبات بالعموم اردگرد کے دیہات سے آئی ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنی پہلی تعلیم دیہاتی سرکاری سکولوں سے حاصل کی ہوتی تھی لہٰذا ان کا تعلیمی معیار وہ نہ ہوتا جس کی ان سے توقع کی جاتی تھی۔ وہ مروّجہ آداب سے بھی بالعموم ناآشنا ہوتیں لہٰذا انہیں اس سکول کے معیار پر لانے کے لیے ٹیچرز کو بہت محنت کرنا پڑتی۔ میرے ذاتی تجربے کے مطابق یہ طالبات انگریزی میں بے حد کمزور ہوتیں اور دسویں جماعت کے امتحان میں رہ جانے والی طالبات زیادہ تر اسی سیکشن سے تعلق رکھتی تھیں۔

رفیعہ غزنوی اور رشیدہ ثروت کی نوک جھونک بہت لطف دیتی۔ دونوں خاصی بذلہ سنج تھیں۔

سکول کے اوقاتِ کار کا آغاز اسمبلی سے ہوتا جسے ''دعا'' کہا جاتا تھا۔ اس کا اعلان گھنٹی کے ایک ''ٹن'' سے ہوتا۔ دعا کے وقت تمام اساتذہ کی حاضری لازمی تھی چنانچہ ان کی کوشش ہوتی کہ ''ٹن'' سے پہلے سکول پہنچ کر رجسٹر میں اپنی حاضری لگا لیں۔ اگر کوئی ٹیچر کسی وجہ سے لیٹ ہو جاتی تو اسے لیٹ ہونے کی وجہ درج کرنا پڑتی۔ اس پابندی کی وجہ سے جملہ ٹیچرز کی کوشش ہوتی کہ وہ مقررہ وقت سے پہلے سکول پہنچ جائیں اور رجسٹر میں حاضری لگا لیں تاکہ غیر ضروری وضاحتوں کی نوبت نہ آئے۔

گرمیوں کے رمضان میں ''دعا'' پانچ بجے صبح ہوتی اور چھٹی ساڑھے دس بجے ہوتی۔

ہیڈ مسٹرس کے دفتر کے سامنے برآمدے کی دو تین سیڑھیاں اتر کر تھوڑی سی جگہ پر اینٹوں کا پختہ فرش تھا جہاں ہیڈ مسٹرس کے اپنے استعمال کے لیے ایک صوفہ، کرسی اور میز وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ یہاں سٹاف ممبرز کا بیٹھنا منع تھا۔

ہر روز ایک ٹیچر کی ''ڈے ڈیوٹی'' ہوتی۔ اس حیثیت میں وہ اس بات کو یقینی بناتی کہ تمام ٹیچرز وقت پر اپنی کلاسز لے رہی ہیں اور سکول میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ وہ ہیڈ مسٹریس کی نمائندہ کے طور پر اس دن کے لیے سکول کے مجموعی نظم و نسق کی نگران ہوا کرتی تھی۔ اگر کوئی ٹیچر رخصت پر ہوتی تو وہی فارغ ٹیچرز کی ان کی جگہ ڈیوٹی لگاتی۔ فارغ ٹیچرز ڈے ڈیوٹی والی ٹیچر کی شکل دیکھتے ہی ادھر ادھر چُھپنے کی کوشش کرتیں تاکہ وہ ''بیگار'' میں پکڑی نہ جائیں۔

بعض اوقات کوئی ٹیچر کسی وجہ سے کلاس میں نہ پہنچ سکتی تو لڑکیاں شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اگر اس شور کی آواز ہیڈ مسٹریس کے کانوں تک پہنچ جاتی تو وہ فوری طور پر اپنی چپراسن کو صورتِ حال کے جائزے کے

لیے بھجواتیں جو واپس جا کر ہیڈ مسٹریس کو اس شور شرابے کی وجوہات سے آگاہ کرتی اور ہیڈ مسٹریس اس ہنگامے کے تدارک کے لیے ضروری احکامات جاری کرتیں۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو ہمارے سکول کی یونیفارم نیلی قمیص، سفید شلوار اور سفید دوپٹے پر مشتمل تھی۔ جو طالبہ یونیفارم پہن کر نہ آتی اسے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ جرمانہ اس کے علاوہ ہوتا۔ ہاں! جب جماعت دہم کی الوداعی پارٹی ہوتی تو نویں اور دسویں جماعت کی طالبات کو حسب توفیق رنگ برنگے کپڑے پہن کر آنے کی اجازت تھی۔ ایک دفعہ کسی بچی کے والدین نے چھوٹی آپا سے شکایت کردی کہ ان پارٹیوں پر خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں اچھے اچھے کپڑے پہن کر آجاتی ہیں جس سے غریب بچیاں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتی ہیں اور درخواست کی کہ الوداعی پارٹیوں کے موقع پر بھی یونیفارم میں سکول آنے کا حکم جاری کیا جائے۔ اس کے بعد طالبات کو الوداعی پارٹیوں میں یونیفارم پہن کر آنے کی تاکید کردی گئی مگر دلچسپ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب لالیاں کی ایک غیراز جماعت طالبہ یونیفارم کے اوپر سرتا پا سونے کا زیور پہن کر پورے میک اَپ میں پارٹی میں چلی آئی اور ہمہ وقت لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ یوں جس مقصد کے لیے رنگین کپڑوں پر پابندی لگائی گئی اس کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں۔ بعد میں غالباً یہ پابندی ہٹالی گئی۔

اس دور میں طالبات کو تقریری مقابلہ جات کے لیے ضلعی صدر مقام یعنی جھنگ اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر یعنی سرگودھا لے کر جانا پڑتا تھا۔ ایک بار سرگودھا ڈویژن کے انگریزی تقریری مقابلہ میں ہماری مقررّہ کو اول انعام ملا۔ یاد رہے کہ ان مقابلوں میں مقررات کو صرف رول نمبر الاٹ کئے جاتے تھے اور ان کے سکول کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔

سکول کا ہوسٹل موجود تھا جس میں باہر سے آنے والی طالبات کے قیام وطعام کا انتظام تھا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ بورڈرز کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔ اس کی سپرنٹنڈنٹ ''سردار'' نامی ایک خاتون تھیں جو جامعہ نصرت کی ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ، استانی سردار سے الگ شخصیت تھیں۔ میری ان سے سرراہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ خوب دراز قد تھیں۔ ۱۹۶۹ء میں دادی اماں کی وفات پر وہ بھی ہمارے گھر تعزیت کے لیے آئیں اور بتایا کہ وہ ان کی چہیتی شاگرد تھیں۔ جب ان کو علم ہوا کہ وہ میری دادی تھیں تو کہنے لگیں کہ مجھے کیا علم تھا کہ میری پیاری استانی کی پوتی میرے ''آلے دوالے'' پھرتی ہے۔ کاش! مجھے یہ علم ہوتا تو میں اپنی پیاری استانی سے زندگی میں ہی مل لیتی۔ انہوں نے خود بتایا کہ ان کے لمبے قد کی وجہ سے انہیں ''لمی سردار'' کہا جاتا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ جب دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ کوئی میری لمی سردار کو تو ڈھونڈ لائے تو وہ موصوفہ ہی کا ذکر کر رہی ہوتی تھیں۔ دادی اماں یہ بھی بتاتی تھیں کہ ایک دفعہ شبلی (جو بعد میں شبلی بی کام کے نام سے معروف ہوئے) نے لمی سردار کو ڈھاب میں دھکا دے دیا تھا۔ یہ بات بعد میں مجھے خود لمی سردار نے بھی بتائی کہ ''اک واری تیرے چاچے شبلی نے میئوں ڈھاب وچ دھکا دے دتا سی۔ میں مرن لگی ساں''۔ جب انہیں بتایا گیا کہ ان کی استانی بھی ان کو بہت یاد کرتی تھیں اور ہمیں ان کو ڈھونڈنے کے لیے کہتی رہتی تھیں تو وہ زار وقطار رونے لگیں۔

میرے مشاہدے کے مطابق سکول ٹیچر کی زندگی بہت پُرمشقت ہے۔ طالبات کی کاپیاں چیک کرنا تو

ٹیچرز کی ذمہ داریوں کا ایک معمولی حصہ ہے، انہیں اگلے دن کا لیکچر تیار کرنا پڑتا ہے، اپنی ڈائری لکھنا پڑتی ہے، چھوٹی موٹی رپورٹیں تیار کرنا ہوتی ہیں، سکول کی ہم نصابی سرگرمیوں میں اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے، بچیوں کی عمومی نگرانی کرنا پڑتی ہے اور ان کی حاضری کا ریکارڈ رکھنے کے علاوہ ہر ہفتے اس کا ایک خلاصہ تیار کر کے ہیڈ مسٹریس کو پیش کرنا پڑتا ہے۔

ٹیچرز سکول میں پہنچتے ہی سٹاف روم جاتیں، اپنا فالتو سامان وہاں چھوڑتیں اور پھر اپنا روزمرہ کا معمول شروع کرتیں۔ فری پیریڈز کے دوران وہ سٹاف روم میں جا بیٹھتیں اور یہاں دنیا جہان کے مسائل پر گفتگو ہوتی۔ یہاں کا ماحول خاصا کھلا ڈُلا ہوتا مگر ہیڈ مسٹریس کی طرف سے ہدایت تھی کہ کوئی ٹیچر ٹانگیں پھیلا کر نہ بیٹھے اور وہ اپنی اس ہدایت پر عمل کرانا بھی خوب جانتی تھیں۔

آدھی چھٹی کا دورانیہ نصف گھنٹہ ہوتا تھا جس میں طالبات ٹک شاپ کا رخ کرتیں یا صحن میں اپنی کھیل کود میں مگن ہو جاتیں۔ صحن کچا تھا لہٰذا اتنی مٹی اڑتی کہ خدا کی پناہ۔ گرد وغبار کے اس طوفان کا حملہ سٹاف روم پر بھی ہوتا اور ہمارا منہ سر مٹی سے بھر جاتا تاہم اس سے قطع نظر ٹیچرز اپنا اپنا لنچ کھول کر کھانے بیٹھ جاتیں۔ آدھی چھٹی کا وقت ایک نعمت محسوس ہوتا اور جی چاہتا کہ یہ وقفہ کبھی ختم نہ ہو، تاہم آدھا گھنٹہ پلک جھپکتے میں گزر جاتا۔ ادھر ٹن کی آواز کانوں میں پڑتی سٹاف روم میں بھگدڑ سی مچ جاتی اور سب ٹیچرز اپنی اپنی کلاس کی طرف بھاگ اٹھتیں۔

اُس زمانے میں ٹیلیفون کی آج والی سہولت میسر نہ تھی۔ پورے سکول میں صرف ایک ٹیلیفون ہوا کرتا تھا جو ہیڈ مسٹریس کی ٹیبل پر پڑا ہوتا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ تالا لگا کر رکھتیں اور کسی ٹیچر کو اس کے استعمال کی اجازت نہ تھی تاوقتیکہ کوئی بہت بڑی مجبوری نہ آن پڑے۔

یہ ساری باتیں اس زمانے کی ہیں جب یہ سکول جماعت کے زیر انتظام چل رہا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں نیشنلائزیشن کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ سنتے ہیں یہ سکول ابھی تک حکومت کے پاس ہے اور اس کا پہلے سا معیار نہیں رہا۔ اس کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی:

مگر اے گردشِ دوراں نہیں ہے ملتِ احمد
ہوئی مایوس اب بھی رحمتِ باری تعالیٰ سے
درسگاہیں کئی اس جاوداں قریہ کے دامن میں
مثالِ کِشتِ نَو اب بھی پنپتی، بڑھتی جاتی ہیں

ان اشعار کے ساتھ ہی فیروزہ کی باتیں ختم ہوئیں۔

اب تک آپ نے نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں اس کی بہت سی ایسی طالبات کی یادداشتیں ملاحظہ فرمائی ہیں جنہیں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران یہاں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سکول کی اکثر ابتدائی معلمات اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو چکی ہیں البتہ استانی امۃ المنان قمر خدائے بزرگ و برتر کے فضل وکرم سے زندہ ہیں اور آج کل امریکی ریاست نیوجرسی میں مقیم ہیں۔ خوش قسمتی

سے میرا ان کے ساتھ بھی رابطہ ہو گیا چنانچہ میں نے ان سے اس سکول کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلمبند کر کے بھجوانے کی درخواست کی۔ انہوں نے میری اس تجویز کو پسند کیا اور میرے ساتھ اتفاق کیا کہ یہ باتیں جو اَب قصہٗ ماضی بن چکی ہیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور ضابطہ تحریر میں آنی چاہئیں۔ اللہ نے انہیں اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی چنانچہ انہوں نے اپنا ایک نوٹ محررّہ ۲۳ جنوری ۲۰۱۶ء ارسال کیا ہے۔ اس نوٹ میں اس سکول کے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں جو اس سے پہلے میرے کسی کرمفرما نے بیان نہیں کیں مثال کے طور پر حضرت اماں جان کا سکول میں تشریف لانا اور کھردری چارپائی پر بیٹھ کر سکول کی معلّمات اور طالبات کو شرفِ باریابی بخشنا، دریائے چناب کے کنارے دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی کا انعقاد، حضرت مائی راجو کی ریٹائرمنٹ اور ان کے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام؛ میٹرک کے امتحان کے لیے سنٹر کا چنیوٹ بننا؛ سالانہ کھیلوں کے موقع پر بڑھے چلو! بڑھے چلو! کے ترانے پر طالبات کا مارچ پاسٹ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی اس سکول میں آمد اور خطاب۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے استانی امۃ المنان قمر کو جو رقمطراز ہیں:

''آج نیوجرسی میں برف کا طوفان آیا ہوا ہے۔ دو سے تین فٹ برف کی موٹی تہ نے زمین کو ڈھانپ رکھا ہے اور سرد ہوا چل رہی ہے۔ شہر میں ایمرجنسی نافذ ہے۔ باہر نکلنے کی اجازت نہیں اور میں آج سے چھیاسٹھ سال قبل کے نصرت گرلز ہائی سکول کے کچھ واقعات لکھ رہی ہوں۔ بہت زمانہ گزر چکا ہے لہٰذا اکثر باتیں اور ان کی تفصیلات ذہن میں نہیں رہیں تاہم میں کوشش کروں گی کہ چند باتیں جو میرے ذہن میں اچھی طرح مستحضر ہیں اپنے قارئین کی نذر کر سکوں۔

قیامِ پاکستان کے وقت میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھی۔ پاکستان بنا تو ہماری دنیا زیروزبر ہو گئی اور ہم بمشکل تمام اپنی عزتیں اور جانیں بچا کر لاہور پہنچے۔ مجھے پڑھائی کا شوق تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا کوئی وقت ضائع ہو لہٰذا میں نے یہاں آ کر کسی نہ کسی طرح آٹھویں اور نویں کی کتابیں جمع کرلیں اور گھر پر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کسی سکول میں داخلے کا موقع تو نہیں ملا لیکن اپنی محنت سے میں نے ان دونوں کلاسوں کا کورس ختم کر لیا۔ اسی اثنا میں ربوہ بن گیا اور اس میں لڑکیوں کا سکول بھی جاری ہو گیا۔ یہاں مجھے دسویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ الحمدللہ میرا کوئی سال ضائع نہیں ہوا۔

نصرت گرلز ہائی سکول ربوہ کے چٹیل میدان میں ایک کچی عمارت میں شروع ہوا تھا۔ طالبات کی تعداد بہت کم تھی۔ ہم صرف تین لڑکیاں جماعت دہم کی طالبات تھیں۔ میری کلاس فیلوز میں سے ایک چنیوٹ کی سارہ تھیں۔ احمدی تھیں لیکن ان کے والد کا نام مجھے بھول چکا ہے۔ دوسری ذکیہ تھیں جو حضرت مولوی شیر علی کی نواسی اور استانی امۃ المنان عمر کی بھانجی تھیں۔

اُس وقت اساتذہ کی تعداد بھی محدود تھی۔ ہائی کلاسز کو مسز مسعودہ بشیر حساب پڑھاتی تھیں اور استانی میمونہ دینیات۔ اس زمانے کی معلّمات میں سے جو نام فوری طور پر میرے ذہن میں آ رہے ہیں ان

میں استانی حمیدہ صابرہ اور استانی امۃ الرشید شوکت شامل ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک روز حضرت اماں جان سکول تشریف لائیں۔ یقیناً ان کے شایانِ شان استقبال کا انتظام نہیں ہو گا لہٰذا وہ ایک کھردری چارپائی پر ہی بیٹھ گئیں۔ سب استانیاں اور طالبات اس چارپائی کے اردگرد کھڑی ہو کر آپ کے ارشادات سے مستفیذ ہو رہی تھیں اور آپ کی دعائیں حاصل کر رہی تھیں۔ مجھے اس محفل میں ہونے والی کوئی بات اب یاد نہیں البتہ اس محفل کا عمومی رنگ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ کتنی خوش نصیب ہیں میری آنکھیں جنہیں اس روز اور اس کے بعد بھی ایک سے زیادہ بار حضرت اماں جان کی زیارت نصیب ہوئی۔

میٹرک کے امتحان سے کچھ پہلے ہمیں بتایا گیا کہ نویں جماعت کی طرف سے ہمارے لیے الوداعی پارٹی دریائے چناب پر ہو گی۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا ربوہ نہیں دیکھا وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہاں پر تفریح کے مواقع کی کس قدر کمی تھی۔ ایسے میں دریائے چناب پر پکنک کا تصور ہمارے لیے بے حد پُرفسوں تھا اور ہم بہت بیتابی کے ساتھ اس دن کا انتظار کرنے لگے۔ بالآخر وہ دن آ گیا اور نویں اور دسویں کی سب طالبات استانی امۃ الرحمٰن عمر کی سرکردگی اور سکول کی جملہ معلّمات کی معیت میں دریا پر پہنچ گئیں۔

اس زمانے میں دریائے چناب آج کے دریائے چناب سے بالکل مختلف تھا۔ سندھ طاس معاہدے کے بعد تو یہ دریا بالعموم خشک رہنے لگا ہے مگر اس روز یہ اپنے پورے جوبن پر تھا۔ ہمیں اجازت دی گئی کہ ہم اپنی مرضی سے دریا کے کنارے چہل قدمی کر سکتی ہیں چنانچہ ہم لڑکیاں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔ ہم نے اپنا جملہ ساز و سامان ایک گھنے درخت کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بعد میں ہم سب وہاں جمع ہوئے۔ اس موقع پر حضرت مسیح موعود کے خاندان کی بعض خواتین بھی مدعو تھیں۔ ان میں سے حضرت مصلح موعود کی صاحبزادی بی بی امۃ الرشید (جنہوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے) کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ کھانے سے پہلے شعروسخن کی چھوٹی سی محفل بھی بجی۔ مجھے اب بالکل یاد نہیں کہ اس موقع پر کن کن لڑکیوں نے شعر سنائے البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میں نے ایک نظم پڑھی تھی تاہم کون سی؟ اب یہ بات بھی ذہن سے بالکل اُتر چکی ہے۔

جوانی اور بےفکری تھی لہٰذا ہم نے اپنی الوداعی پارٹی کا ایک ایک لمحہ دل بھر کر انجوائے کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دریا کی لہریں بھی ہماری شعروشاعری سے متاثر ہو کر ہمیں داد دے رہی ہوں۔

حضرت مائی راجو جو سکول کی ایک پرانی خادمہ تھیں اور تکمیلِ ملازمت کے بعد ریٹائر ہونے والی تھیں کو اس موقع پر بطور مہمانِ خاص مدعو کیا گیا اور ہیڈمسٹریس نے اپنے اختتامی خطاب میں سکول کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے طالبات کی کم تعداد کی وجہ سے اس سال ربوہ میں امتحانی سنٹر نہ بن سکا چنانچہ ہم نے دسویں کا سالانہ امتحان چنیوٹ جا کر دیا۔ ہم تانگے پر چنیوٹ جایا کرتی تھیں اور پرچہ دینے کے بعد گھر لوٹ آیا کرتی تھیں۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ ہم نے یہ امتحان ریگولر سٹوڈنٹ کے طور پر دیا تھا یا پرائیویٹ طور پر۔

عین ممکن ہے اُس وقت تک ہمارے سکول کو محکمہ تعلیم کی طرف سے منظوری حاصل نہ ہو پائی ہو اور ہم نے یہ امتحان پرائیویٹ امیدواروں کے طور پر ہی دیا ہو۔

میں میٹرک کرنے کے بعد لاہور چلی گئی اور لاہور کالج فار ویمن میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکی ہوں میں نے آٹھویں اور نویں جماعت کی تیاری اپنے طور پر کی تھی اور نصرت گرلز ہائی سکول میں بھی سائنس ٹیچر کوئی نہ تھی لہٰذا میں کسی نہ کسی طرح ایف ایس سی میں داخل تو ہو گئی مگر بنیادی کمزوری کی وجہ سے میں نے ایف ایس سی کا امتحان دو سال کی بجائے تین سالوں میں پاس کیا۔

میری ربوہ واپسی تک نصرت گرلز ہائی سکول میں کوئی سائنس ٹیچر نہیں تھی چنانچہ ناظر تعلیم نے میرے بھائی، نورالدین منیر سے کہا کہ وہ مجھے یہاں پڑھاتے پر آمادہ کریں۔ مجھے یہ تجویز اچھی لگی۔ ہمارا خاندان ویسے ہی جماعت کے خدمت گزاروں میں سے تھا لہٰذا میں نے بخوشی یہ سکول جوائن کر لیا۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں نے ایک مختصر وقفے کے علاوہ جب میری تبدیلی فیصل آباد کر دی گئی تھی اس سکول میں بتیس سال پڑھایا ہے۔ اس عرصے میں مجھے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کا موقع بھی ملا چنانچہ میں نے ایم اے کر لیا اور بی ایڈ بھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس سکول کا نام حضرت اماں جان کے نام پر رکھا گیا تھا اور یہ اسی نام کی برکت تھی کہ اس سکول نے وقت گزرنے کے ساتھ بہت ترقی کی اور اس کا نام ضلع کے اچھے سکولوں میں لیا جانے لگا۔

سکول کے قومیائے جانے سے پہلے ہمارے یہاں سرکاری تعطیلات کے علاوہ جماعتی تہواروں مثلاً یوم مسیح موعود اور یومِ مصلح موعود کے موقع پر بھی چھٹی ہوتی تھی۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود میں کسی ولادت کے موقع پر بھی عام طور پر سکول بند ہو جایا کرتا تھا تاہم ایک بار سکول میں آدھے دن کی چھٹی کر دی گئی۔ تقریب یہ تھی کہ ایک ٹیچر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹیوں کے بعد بیٹا عطا فرمایا تھا۔ اب آپ سے کیا پردہ یہ ٹیچر میری اپنی سگی بہن یعنی امۃ الرشید شوکت تھیں۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ میں ذکر کر رہی تھی اس سکول کا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے ۱۹۵۵ء میں سکول اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔ ربوہ کی آبادی روز بروز بڑھ رہی تھی اس لیے سکول میں طالبات کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ ہر سیکشن میں پچاس سے زیادہ طالبات ہوتی تھیں۔ مڈل تک تو ہر کلاس کے چار چار سیکشن ہوتے تھے اور ہائی کلاسز کے بھی دو یا ضرورت پڑنے پر تین سیکشن بنا دیئے جاتے تھے۔

اس سکول میں میری تقرری بطور سائنس ٹیچر ہوئی تھی۔ اگرچہ ایف ایس سی پاس کسی خاتون کے لیے میٹرک کی کلاسز کو پڑھانا آسان نہیں ہوتا تاہم مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس تھا۔ میں یہ بھی سمجھتی تھی کہ میری شاگردوں کا مستقبل اب میرے ہاتھ میں ہے لہٰذا میں نے مقدور بھر محنت کی اور خدا کا شکر ہے اس نے میری کوشش میں برکت ڈالی چنانچہ میری کئی شاگردیں بعد میں ڈاکٹر بنیں۔ ان میں سے دو کے نام فوری طور پر ذہن میں آ رہے ہیں۔ ایک تو امۃ السمیع تھیں جو استانی امۃ العزیز عائشہ کی بیٹی تھیں اور دوسری حلیمہ مرتضیٰ۔

سکول کے موجودہ عمارت میں منتقل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ سائنس لیبارٹری بھی تیار ہو گئی۔ سنا تھا کہ سائنس بلاک کی عمارت ڈیزائن کرتے وقت سرگودھا کے پائلٹ سکول کا نقشہ مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسی بلاک میں ہوم اکنامکس کے لیے بھی ایک کمرہ بنایا گیا۔ خانہ داری اور سلائی سکھانے کا کام استانی احمد بی اور استانی حمیدہ کیا کرتی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنس بلاک میں فزکس، کیمسٹری، ہائجین، فزیالوجی اور بیالوجی کے پریکٹیکل کا سارا سامان آ گیا اور استانی بشریٰ اہلیہ اللہ بخش صادق اور نعیمہ حمید بڑی دلچسپی سے پریکٹیکل کروایا کرتی تھیں۔

اب ہوسٹل بھی قائم کر دیا گیا تھا تا کہ باہر کی طالبات بھی اس سکول سے استفادہ کر سکیں۔

سکول میں تقریری مقابلہ جات ہوتے اور سٹیج پر سبق آموز تفریحی اور مزاحیہ ڈرامے اور ٹیبلو پیش کئے جاتے تھے۔

کھیل کے میدان میں بھی طالبات خوشی سے حصہ لیتیں۔ والی بال کے میچ ہوتے۔ طالبات مس رفیعہ غزنوی کی نگرانی میں بہت عمدہ کھیل پیش کرتیں۔ کھیلوں کے اختتام پر مارچ پاسٹ کا نظارہ بھی بہت حسین ہوتا اور استانی امۃ المنان ریحانہ کی مترنم آواز میں گایا ہوا ترانہ دلوں کو بہت سرور بخشتا۔ اس ترانے میں سے صرف ''بڑھی چلو، بڑھی چلو'' کے بول یاد رہ گئے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں حکومتی پالیسی کے تحت اس سکول کو ہائر سیکنڈری سکول کا درجہ دے دیا گیا اور مڈل تک کلاسز الگ کر دی گئیں۔ یہ حصہ دارالضیافت کی کچی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ مڈل سکول کی ہیڈ مسٹریس مجھے بنایا گیا مگر یہ تبدیلی جلد ہی کالعدم ہو گئی اور پرانا نظام بحال ہو گیا۔

۱۹۶۷ء میں ایک بہت یادگار پروگرام ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث جب بعض یورپی ممالک کے کامیاب دورے سے واپس تشریف لائے تو آپ کو سکول میں بھی ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اس تقریب میں حضرت نواب مبارکہ بیگم اور خاندان کی بہت سی دیگر معزز خواتین بھی مدعو تھیں۔ اس موقع پر میں نے سٹاف اور طالبات کی طرف سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ آپ نے خطاب فرمایا اور اپنے دورے کے دوران اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے کچھ واقعات سنائے جس کے بعد یہ تقریب اپنے اختتام پر پہنچی۔

میں اس سکول میں ۱۹۸۵ء تک رہی ہوں جس کے بعد کے حالات کا مجھے کچھ علم نہیں۔''

نصرت گرلز ہائی سکول کے بارے میں فی الحال اتنا ہی کچھ تاہم اپنی بات ختم کرنے سے پہلے مجھے یہ عرض کرنے دیں کہ رفیعہ غزنوی جو اس سکول کی ہیڈ مسٹریس رہی ہیں کے پاس ان کی ایک پیشرو، استانی مسعودہ بشیر کے ہاتھ کی بنی ہوئی اُن استانیوں کی ایک فہرست موجود ہے جو اس سکول کے قومیائے جانے کے وقت یہاں پڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے بکمالِ مہربانی اس فہرست کی ایک نقل مجھے عنایت فرمائی ہے۔

اس فہرست کے مطابق اس وقت سکول میں سترہ سینئر انگلش ٹیچرز تھیں جن کی کم از کم تعلیمی قابلیت بی اے بی ایڈ تھی۔ ان میں سے بعض ٹیچرز بی ایس سی بی ایڈ اور بعض ایم اے بی ایڈ بھی تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں: مسعودہ بشیر، امۃ الرحمٰن طیبہ، مسعودہ بیگم، امۃ المنان قمر، نصیرہ بیگم، رفیعہ غزنوی، طیبہ صدّیقہ، زبیدہ خانم، ناصرہ رحمٰن، نعیمہ بیگم، بشریٰ نسرین، رشیدہ فرحت، فیروزہ فائزہ، امۃ الرفیق، صادقہ کریم، رشیدہ سعدیہ اور بشریٰ طیبہ۔

جونیئر انگلش ٹیچرز تعداد میں چودہ تھیں۔ ان کی کم از کم کوالیفیکیشن ایف اے/ ایف ایس سی، سی ٹی/ ایس وی تھی۔ اس فہرست کے مطابق ان کے نام یہ تھے: سعیدہ بیگم، امۃ الحفیظ سیال، بشریٰ بیگم، جمیلہ ثروت، جمیل النساء، امۃ الحمید اختر، سارہ قدسیہ، محمودہ اختر، علیمہ خالدہ، مسعودہ بیگم، صفیہ طاہرہ، محسنہ، امۃ الوحید، امۃ الرشید۔

جے وی ٹیچرز کی تعداد دس تھی۔ ان کی بنیادی کوالیفیکیشن میٹرک تھی۔ ان کے نام ہیں: صالحہ بیگم، زبیدہ بیگم، بلقیس جہاں، محمودہ ثروت، امۃ المنان، سلیمہ اختر، سعیدہ بیگم، امۃ الباسط، رقیہ اور بشریٰ بیگم۔

احمد بی واحد ٹیچر تھیں جو مڈل جے وی پاس تھیں۔

فہرست کے مطابق نیشنلائزیشن کے وقت سکول کا کلیریکل سٹاف صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ امیر احمد اور رشیدہ۔ امیر احمد میٹرک پاس تھے جب کہ رشیدہ نے ایف اے پاس کر رکھا تھا۔

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ربوہ کی خواتین میں تعلیم کی روشنی پھیلانے والی وفات یافتہ معلّمات کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اور باقیوں کو صحت و عافیت والی لمبی زندگی عطا فرمائے میں آپ کو جامعہ نصرت لیے چلتا ہوں جس کا قیام حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے عظیم الشان کارناموں میں سے ایک ہے۔

علومِ نو کی تابش سے ہے ہر قلب ونظر روشن: مگر تہذیب کی رنگینیوں سے جام خالی ہے

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ میرا جامعہ نصرت کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا تاہم میری دو ہمشیرگان یعنی آپی اور صادقہ اس کالج میں پڑھتی رہی ہیں۔ آپی نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں یہاں داخلہ لیا اور بی اے کر کے اس کالج سے فارغ ہوئیں۔ صادقہ ۱۹۵۸ء میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اگلے چار سال میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ آپی اور صادقہ کی وجہ سے ہمارے گھر میں جامعہ نصرت کا بہت تذکرہ رہتا تھا۔ ان دونوں کی سہیلیاں ہمارے گھر آتی جاتیں تو مجھے ان کے بارے میں جاننے اور ان میں سے بعض کی باتیں سننے کا موقع مل جاتا۔ کالج کی لیکچررز کا ذکر ہوتا اور کچھ ازراہِ شفقت ہمارے گھر تشریف لاتیں تو ان کے ناموں اور بعض حالات کا علم ہوتا رہتا۔ یوں میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جامعہ نصرت میرے لیے کوئی غیر مانوس لفظ نہیں تھا اور باوجودیکہ میں اس کالج کے اندر ایک یا شاید دو بار سے زیادہ نہیں گیا مجھے یہ کالج ہمیشہ اپنا ہی محسوس ہوا اور مجھے اس کے در و دیوار سے محبت سی رہی۔

جامعہ نصرت کا قیام حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ہمیشہ باقی رہ جانے والے کارناموں میں سے ایک ہے۔ اس کے قیام کا پس منظر ''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' میں بہ ایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

''سیّدنا حضرت مصلح موعود کو ابتدا ہی سے خواتین کی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی اور آپ اس یقین پر قائم تھے کہ قومی ترقی کے لیے خواتین کا زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ قادیان میں آپ نے بچیوں اور خواتین کی اعلیٰ دینی و دنیوی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ نصرت گرلز سکول کے ساتھ ساتھ جامعہ نصرت قائم فرمایا جس میں اردو، انگریزی کے علاوہ قرآنِ کریم، احادیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور حضرت مسیح موعود کی کتب پڑھانے کا انتظام تھا چنانچہ ہر سال لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد جامعہ نصرت سے فارغ التحصیل ہونے لگی۔ ۱۹۴۷ء کے انقلابِ عظیم کی وجہ سے جماعت کو اپنا مرکز...... چھوڑنا پڑا۔ ۱۹۴۹ء میں ربوہ آباد ہونا شروع ہوا اور دو سال بعد ہی حضرت مصلح موعود نے بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ نصرت کا قیام ایک نئی صورت میں فرمایا۔ قادیان میں جامعہ نصرت کی جماعتوں کا امتحان مجلسِ تعلیم لیا کرتی تھی لیکن یہاں جامعہ نصرت کا باقاعدہ الحاق بورڈ ثانوی تعلیم اور یونیورسٹی سے کروایا گیا۔''

اس ادارے کا افتتاح ۱۴ جون ۱۹۵۱ء کو حضرت مصلح موعود کے بابرکت ہاتھوں سے ہوا۔ اس موقع پر حضور نے ایک پُر معارف خطاب فرمایا جو اَب جماعتی ریکارڈ کا حصہ ہے لہٰذا اسے دہرائے بغیر میں یہ عرض کروں گا کہ چھوٹی آپا اس کی ڈائریکٹریس مقرر ہوئیں اور مسز فرخندہ اختر شاہ اہلیہ حضرت سیّد محمود اللہ شاہ، ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول

اس کی پرنسپل۔ کتاب ''حضرت سیّد محمود اللہ شاہ صاحب'' مؤلفہ احمد طاہر مرزا کے مطابق موصوفہ حضرت شیخ نیاز محمد، رفیق حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی اور سیّد محمود اللہ شاہ کی تیسری بیگم تھیں۔ ۱۹۴۳ء میں جب حضرت سیّد محمود اللہ شاہ کینیا سے رخصت پر قادیان آئے تو آپ کی ان کے ساتھ شادی ہوئی۔

اگرچہ قیامِ جامعہ نصرت کے وقت موصوفہ محض گریجوایٹ تھیں اور انہوں نے ایم اے انگریزی کا امتحان بعد میں پاس کیا لیکن جیسا کہ بعد میں حالات نے ثابت کر دکھایا انہوں نے کالج کو اس خوبی سے چلایا کہ جلد ہی اس کا شمار ملک کے خواتین کے مایہ ناز تعلیمی اداروں میں ہونے لگا۔

ابتداءً اس کالج میں معدودے چند طالبات داخل ہوئیں جن میں سے ایک تایا اسحاق کی بیٹی، رقیہ شمیم بھی تھیں جو بعد میں سپین کے مربی، کرم الٰہی ظفر کے عقد میں آئیں اور شادی کے بعد سپین ہی کی ہو کر رہ گئیں۔ جب ان سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا: ''کالج کا قیام مرزا خلیل احمد کی کوٹھی میں عمل میں آیا۔ وہ کالج کا بالکل ابتدائی دور تھا چنانچہ اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو پہلے سال کالج میں داخلہ لینے والی طالبات کی تعداد صرف سولہ تھی۔''

''صرف سولہ؟'' میں نے ان سے مکرّر تصدیق چاہی۔

''جی صرف سولہ۔ سولہ لڑکیاں بھی خدا جانے کس مشکل سے جمع ہو سکی تھیں۔ آپ تو بہت چھوٹے تھے لہٰذا اس زمانے کے حالات سے واقف نہیں۔ اُس وقت لڑکیوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی اور انہیں میٹرک سے آگے پڑھانا تو گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ لڑکیوں نے آگے چل کر گھر گرہستی سنبھالنی ہے لہٰذا انہیں کالج بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ کالج میں تعلیم حاصل کر کے لڑکیاں آزاد خیال ہو جاتی ہیں جس سے ان کی آئندہ زندگی پر بُرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی اس زمانے میں میٹرک کرنے والی لڑکیوں کی تعداد خال خال تھی چنانچہ جب کالج شروع ہوا تو مسز شاہ ہر احمدی میٹرک پاس لڑکی کے گھر جا کر والدین کو آمادہ کرتی رہیں کہ مزید تعلیم کے لیے اسے کالج بھجوایا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مسز شاہ چنیوٹ میں ہمارے گھر بھی آئی تھیں۔ امی عیالدار تھیں اور انہیں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورا کرنے مشکل ہو رہے تھے لہٰذا انہوں نے معذرت کی مگر مسز شاہ نے انہیں یقین دلایا کہ اگر وہ مجھے کالج میں داخل کرا دیں تو فیس میں رعایت دلانا ان کی ذمہ داری ہوگی۔ امی بالآخر کالج میں میرے داخلے پر رضامند ہو گئیں۔ اب مسئلہ تھا چنیوٹ سے روزانہ ربوہ جانا اور شام کو واپس آنا۔ میرا بھائی، ہادی روزانہ مجھے چنیوٹ ریلوے سٹیشن پر چھوڑنے اور پھر لینے کے لیے آیا کرتا تھا۔ اب یاد نہیں ہے یہ سلسلہ کتنی دیر چلا۔ پھر ہم لوگ ربوہ منتقل ہو گئے تو اس سردردی سے جان چھوٹی۔''

''ہاں! آپ بات کر رہی تھیں کہ پہلے سال جامعہ نصرت میں داخل ہونے والی طالبات کی تعداد صرف سولہ تھی۔ کیا آپ کو ان کے نام یاد ہیں؟''

''اتفاقاً مجھے ان سب کے نام یاد ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں تو حضرت سیّدہ بشریٰ بیگم تھیں جو

حضرت مصلح موعود کے حرم میں شامل تھیں اور ''مہر آپا'' کے لقب سے معروف تھیں۔ پھر حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کی صاحبزادی امۃ القدّوس تھیں جو دورانِ تعلیم ہی مرزا وسیم احمد کے عقد میں آ کر قادیان چلی گئی تھیں۔''

''یہ دونوں نام تو خاصے معروف ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی کلاس فیلوز میں کون کون سی لڑکیاں شامل تھیں؟''

''ایک امۃ الرشید قمر تھیں جن کے والد قادیان میں درویش ہوا کرتے تھے۔ ان کا نام عبدالرحیم دیانت تھا۔ ایک امۃ المجید تھیں جن کے والد کا نام عبدالرحمٰن تھا اور وہ حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ، رفیق حضرت مسیح موعود کے عزیزوں میں سے تھیں اور تیسری منظورُ النساء تھیں جو قریشی محمد اسماعیل معتبر کی صاحبزادی تھیں۔''

''امۃ الرشید قمر امۃ الباری ناصر حال مقیم امریکہ اور عبدالباسط شاہد، مربی سلسلہ کی بہن ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ امۃ المجید میرے ایک برادرِ نسبتی کے سسرالی عزیزوں میں سے تھیں۔ انگلستان میں رہتی تھیں کہ کئی سال پہلے سڑک کے ایک حادثے میں انتقال کر گئیں۔ رہیں منظور النساء تو وہ میرے بہنوئی، قریشی سعید احمد اظہر کی تایازاد بہن ہیں اور اس حوالے سے میں ان سے بھی بخوبی متعارف ہوں۔ وہ بالاکوٹ کے نذیر احمد نغمانی جو پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے، سے بیاہی گئیں۔ انہوں نے شادی کے بعد کچھ عرصہ ایبٹ آباد میں گزارا لیکن ۱۹۹۷ء میں امریکہ منتقل ہو گئیں۔ اب ان کے خاوند کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنے بیٹے ڈاکٹر نعیم احمد نغمانی کے ہمراہ میری لینڈ میں مقیم ہیں۔''

''واہ! آپ تو ان سب کو جانتے ہیں۔''

''میری زندگی کا ابتدائی سارا زمانہ ربوہ میں گزرا اور احمدی ہونے کے ناتے جماعت سے خوب رابطہ بھی رہا لہٰذا اللہ کے فضل سے میرا حلقۂ احباب وسیع ہے اور میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''پھر تو آپ سعیدہ حبیب کو بھی جانتے ہوں گے، حبیب اللہ کوزہ گر کی صاحبزادی۔''

''ہاں جی! کیوں نہیں۔ بعد میں ان کے والد نے حبیب کلاتھ ہاؤس کے نام سے گول بازار میں کپڑے کی دکان شروع کر دی تھی جو اُن کی وفات کے بعد ان کے بیٹے، بشیر چلاتے رہے۔ یہی دُکان اب ربوہ کلاتھ ہاؤس کے نام سے بشیر کے بیٹے، لطیف چلا رہے ہیں۔ سعیدہ نے شادی کے بعد ایک عرصہ اٹک میں گزارا لیکن اب ربوہ میں مقیم ہیں۔ میں ان سے ایک بار مل بھی چکا ہوں۔''

''امۃ الحئی عمر بھی ہماری ہم جماعت تھیں۔ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے صاحبزادے، مولوی عبدالسّلام عمر کی بیٹی تھیں۔''

''مولوی عبدالسّلام عمر خود تو بہشتی مقبرے کی اندرونی چاردیواری میں دفن ہیں لیکن امۃ الحئی عمر اب کہاں ہیں، اس بارے مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''آپ چوہدری ظہور احمد، ناظر دیوان کو تو جانتے ہوں گے؟''

''جی۔ ان کا ایک بیٹا، انیس میرا ہم جماعت تھا اور ان کے صاحبزادے، لئیق جو نیشنل بنک میں تھے میرے دوستوں میں سے ہیں۔''

''ان ہی کی ایک بیٹی مبارکہ خاتون ہماری ہم جماعت تھی۔''

''یہ وہی مبارکہ ہیں جو بعد میں ڈاکٹر رشید احمد کے عقد میں آئیں اور طویل مدت تک مسقط رہیں۔ ڈاکٹر رشید نے کچھ عرصہ ربوہ میں بھی گزارا اور پھر سویڈن چلے گئے۔ اب وفات پا چکے ہیں۔''

''کسی نے ذکر کیا تھا کہ مبارکہ اب لندن منتقل ہو چکی ہیں۔''

''جی ہاں۔ لئیق نے ایک بار مجھے بھی بتایا تھا۔''

''کمال ہے۔ آپ ان کو بھی جانتے ہیں!''

''آپ نام لیتی جائیں۔ عین ممکن ہے میں کسی کو نہ بھی پہچانتا ہوں۔''

''صدیقہ خانم کو جانتے ہیں؟ خان بہادر ابوالہاشم خان کی بیٹی۔''

''آپ کے تو علم میں ہے کہ ابوالہاشم خان کی ایک بیٹی، عابدہ خانم یوسف بریلوی کی بیگم تھیں اور اپنے ایک بیٹے کے ہاتھوں غلطی سے بندوق چل جانے کے باعث راہیِ ملکِ عدم ہو گئی تھیں۔ صدیقہ ان ہی کی بہن تھیں۔ ڈاکٹر ظفر قریشی نے جو اُن کے عزیزوں میں سے ہیں اور آج کل امریکہ کی ریاست اریزونا میں مقیم ہیں مجھے ایک بار بتایا تھا کہ صدیقہ نے جامعہ نصرت میں بی اے تک پڑھا تھا جس کے بعد ان کی شادی ایک میجر سے ہو گئی جن کا تعلق اس زمانے کے مشرقی پاکستان سے تھا اور یہ کہ صدیقہ اب فوت ہو چکی ہیں۔''

''ہماری ایک کلاس فیلو قدسیہ بھی تھیں جو واہ سے پڑھنے کے لیے ربوہ آئی ہوئی تھیں۔''

''انہیں تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگرچہ میں ان سے ملا تو نہیں لیکن وہ میرے سمدھی، ڈاکٹر سمیع اللہ باجوہ کی سگی خالہ ہیں اور آج کل اپنے بچوں کے ہمراہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ پاکستان میں قیام کے دوران وہ ماڈل ٹاؤن، لاہور کی صدر لجنہ اور نگران قیادت بھی رہی ہیں۔''

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ نے ماسٹر نور الٰہی کا نام بھی ضرور سنا ہوگا۔''

''چنیوٹ والے جو کسی زمانے میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ڈرائنگ ماسٹر تھے؟''

''وہی وہی۔ ان کی بیٹی مریم صدیقہ بھی میری کلاس فیلو تھی۔''

''میں نے ان کا ذکر بھی سن رکھا ہے۔ بعد میں انہوں نے انگریزی میں ایم اے کر لیا تھا اور ایم ایڈ بھی۔ وہ محکمہ تعلیم میں ملازم تھیں۔ ہیڈ مسٹریس رہیں اور ان کی آخری تعیناتی قصور میں بطور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھی۔ وہ ۱۹۸۷ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ ہی عرصہ زندہ رہیں اور ۱۸ مارچ ۱۹۸۹ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔''

''ذہن پر زور دے رہی ہوں تو تمام نام آہستہ آہستہ یاد آ رہے ہیں۔ ایک لڑکی امۃ الشافی نام کی بھی تھی۔''

''جی۔ میں نے ان کا ذکر بھی سن رکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹر سمیع اللہ باجوہ کی والدہ نے بتایا ہے کہ امۃ الشافی ضلع سیالکوٹ کے ایک زمیندار، چوہدری نذیر حسین کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی چوہدری ظفر اللہ خان کے بھائی، چوہدری شکر اللہ خان کے بیٹے محمود نصر اللہ سے ہوئی۔ چند سال پہلے وفات پا

چکی ہیں۔ آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں کہ عبدالحفیظ ایڈووکیٹ جو ۲۸ مئی ۲۰۱۰ء والے واقعے میں بیت النّور، ماڈل ٹاؤن لاہور میں لقمۂ اجل بنے ان ہی امۃ الشافی کے بھائی تھے۔''

''ہماری ایک کلاس فیلو کا نام حمیدہ بانو تھا جو لیفٹیننٹ ڈاکٹر عبدالکریم نامی ایک صاحب کی بیٹی تھیں۔''

''مجھے کسی نے بتایا ہے کہ حمیدہ بانو نے بعد میں ڈی پی ای کا کورس کر لیا تھا اور وہ ایک مدت تک جامعہ نصرت میں سپورٹس کی انچارج رہیں۔ بعد میں وہ ''حمیدہ خلجی'' کے نام سے پہچانی جانے لگیں تھیں۔''

''میں تو شادی کے بعد سپین آ گئی تھی لہٰذا میرا کسی سے رابطہ نہیں رہا نہ مجھے یہ علم ہے کہ حمیدہ بانو بعد میں حمیدہ خلجی کے نام سے جامعہ نصرت میں ڈی پی ای کے طور پر خدمت بجا لاتی رہیں لیکن اگر آپ نے یہ بات سنی ہے تو ضرور درست ہوگی۔''

''اب صرف ایک لڑکی کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔''

''اچھا تو آپ ساتھ ساتھ گنتے جا رہے ہیں۔ باقی رہ جانے والی لڑکی کا نام نعیمہ تھا اور وہ ماریشس والے حضرت صوفی غلام محمد کی صاحبزادی تھیں۔''

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو حضرت صوفی غلام محمد حضرت مسیح موعود کے ۳۱۳ رفقا میں سے تھے اور انہیں ایک لمبا عرصہ ماریشس میں جماعت کی نمائندگی کا موقع ملا۔ ان کی وفات قیامِ پاکستان کے پُر آشوب ایام میں لاہور میں ہوئی لہٰذا ان کی تدفین امانتاً میانی صاحب کے قبرستان میں عمل میں آئی تاہم بعد میں جب ربوہ بن گیا تو ان کا تابوت نکال کر وہاں لے جایا گیا۔''

باجی رقیہ کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی۔ ''آپ کو جامعہ نصرت کے افتتاح کا دن یاد ہے؟'' میں نے ان سے دریافت کیا۔

''یاد ہے۔ یہ ایک بہت بارونق تقریب تھی۔ اس روز ہر خاتون کے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت ہویدا تھی اور ہوتی بھی کیوں نہ۔ ان کے اپنے شہر میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک ایسا ادارہ کُھل رہا تھا جہاں ان کی بچیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکتی تھیں۔ حضرت مصلح موعود مہمانِ خصوصی تھے۔''

باجی رقیہ کو تو اس تقریب کی اور کوئی تفصیل یاد نہیں البتہ طیبہ شہناز کریم جنہیں اللہ تعالیٰ نے عمدہ حافظے کی دولت کے ساتھ قوتِ بیان کی خوبی سے بھی بدرجۂ اتم نوازا ہے اور جن کا ذکر نصرت گرلز ہائی سکول کے ضمن میں ہو چکا ہے اس وقت دسویں کلاس کی طالبہ تھیں۔ انہیں بھی اس تقریب میں شمولیت کا موقع ملا۔ وہ بتاتی ہیں:

''یہ تقریب حضرت مصلح موعود کے اپنے کسی عزیز کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ کوٹھی کے لان میں معزز مہمانوں کے لیے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ اگرچہ صبح کا وقت تھا مگر سورج اپنی تمام تر تمازتوں کے ساتھ بلند ہو رہا تھا۔ ہم سب طالبات قطار در قطار زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کالج میں داخلہ لینے والی طالبات اگلی قطاروں میں تھیں اور ہم پچھلی قطاروں میں بیٹھے تھے۔ ربوہ کی کچھ دیگر خواتین اور لجنہ کی بعض عہدے داران بھی ہمارے ساتھ زمین پر تشریف فرما تھیں۔ سب کی نگاہیں سٹیج پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک حضرت مصلح موعود چھوٹی آپا کے ہمراہ مجمع میں

تشریف لائے۔ مجھے بخوبی یاد ہے میں حضور کی روشن پیشانی پرنظریں جمائے ہوئے تھی جس پر حدّتِ آفتاب کی وجہ سے پسینے کے ننھے ننھے قطرے موتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد آپ نے افتتاحیہ خطاب فرمایا جس کا وہ حصہ مجھے آج تک اَزبَر ہے جس میں حضور نے فرمایا تھا: مجھے بتایا گیا ہے کہ کالج میں آنے والی طالبات میں سے اکثر نے تاریخ کے مضمون سے اجتناب کیا ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ تاریخ تمہیں بتاتی ہے کہ تمہارے آباء واجداد کیا تھے اور اب تم کیا ہو۔ تاریخ سے کسی شخص کا بھاگنا اور اسے بوجھل سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے وہ اپنے آباء واجداد کی بات سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ حضور نے طالبات سے پوچھا: تو کیا حقائق اور تاریخ کے آئینہ میں تم اپنے آباء واجداد کی شکلیں دیکھنے سے گھبراتی ہو......؟

یہ ایک نہایت ہی پُر معارف، مدلّل اور بہتے دریا کی سی روانی والی تقریر تھی جس نے اس کم عمری میں ہی میری مشامِ جاں کو معطر کردیا۔''

جامعہ نصرت کا افتتاح ایک جماعتی ادارے کے طور پر ہوا تھا اور پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے احمدیوں کی بچیوں نے یہاں آنا تھا تاہم بیرونِ ربوہ سے آکر جامعہ نصرت میں داخلہ لینے والی طالبات کے لیے رہائش ایک بڑا مسئلہ ثابت ہوسکتی تھی چنانچہ کالج کے افتتاح کے ساتھ ہی یہاں ایک ہوسٹل بھی قائم کردیا گیا۔ شروع میں ہوسٹل میں رہنے والی طالبات کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان سولہ طالبات میں سے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے صرف ایک طالبہ نے ہوسٹل میں رہائش اختیار کی۔ اس طالبہ کا نام قدسیہ تھا اور وہ واہ سیمنٹ فیکٹری کے چیف انجینئر، چوہدری عبدالحمید کی صاحبزادی تھیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے موصوفہ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ جب میری ان سے بات ہوئی تو انہوں نے تصدیق کی کہ ایک طویل عرصے تک وہ ہوسٹل میں مقیم واحد طالبہ تھیں اور یہ کہ وہ بہت دنوں تک جامعہ نصرت میں داخلے اور ہوسٹل میں قیام کے فیصلے پر پچھتاتی رہیں لیکن آہستہ آہستہ ان کا دل یہاں اس قدر لگ گیا کہ وہ تکمیلِ تعلیم پر بہت بوجھل دل کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئیں۔ وہ بتاتی ہیں:

''میں جامعہ نصرت کے ہوسٹل میں داخل ہونے والی سب سے پہلی طالبہ تھی۔ میرے والد بزرگوار، واہ سیمنٹ فیکٹری میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور ہمیں اپنے گھر میں دنیا جہان کی نعمتیں میسر تھیں۔ خدا کے فضل سے ہمارا بنگلہ خاصا وسیع تھا اور بجلی کمپنی کی طرف سے مفت مہیا تھی۔ اسی طرح خانساماں، مالی اور صفائی کرنے والے بھی فیکٹری کی طرف سے ملے ہوئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک آرام دہ زندگی کی عادی تھی۔ میں نے اسی زمانے میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن مقامی طور پر لڑکیوں کا کوئی کالج موجود نہ تھا۔ ابا مجھے ہوسٹل میں داخل کروانے پر رضامند نہ تھے۔ اتفاق دیکھئے ان ہی دنوں جامعہ نصرت کا افتتاح ہو رہا تھا۔ میں نے یہ خبر سنی تو کسی نہ کسی طرح ابا کو ربوہ میں اپنے داخلے پر رضامند کرلیا اور اس طرح میں وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی، خاندان حضرت مسیح موعود اور آپ کے بہت سے رفقا ربوہ میں موجود تھے اور ان کے دم سے یہ نوخیز قصبہ روشن تھا لیکن سچ پوچھیں تو میرے لیے ربوہ بالکل تاریک

تھا جس کا احساس مجھے ربوہ پہنچنے پر ہوا۔ ہم لوگ ربوہ ریلوے سٹیشن پر اترے تو اس کی ویرانی نے مجھ پر وحشت طاری کردی۔ ایک کمرے پر مشتمل کچے ریلوے سٹیشن پر ربوہ نام کی ایک چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی اور سٹیشن پر ہُو کا عالم تھا۔ میں اپنے بڑے بھائی سی اے رحمٰن، ایڈووکیٹ جو اُس زمانے میں ٹی آئی کالج، لاہور میں زیرِ تعلیم تھے اور بعد میں امیر جماعت احمدیہ، گوجرانوالہ اور صدر قضا بورڈ بھی رہے کے ہمراہ تھی۔ وہ مجھے ہوسٹل وارڈن کے سپرد کرکے لاہور چلے گئے۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ ہوسٹل میں میرے علاوہ کوئی اور لڑکی موجود نہیں ہے اور یہ کہ مجھے یہاں پر اپنا سارا وقت قریباً تنہا گزارنا ہوگا۔ یہ خیال ہی میرے لیے رُوح فرسا تھا۔ میں ایک ہنستے بستے گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کی عادی تھی لہٰذا یہاں پہنچ کر میرا پہلا ردِعمل سخت مایوسی کا تھا۔

ان دنوں ربوہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں بجلی تھی نہ پینے کا پانی میسر تھا۔ گرمی بھی خوب پڑتی تھی اور آندھیاں بہت زور کی چلا کرتی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے افسانوں اور ناولوں میں دوپہر کی چلچلاتی دھوپ، رات کے پُرہول اندھیرے سناٹوں، زوردار آندھیوں اور ریت کے بگولوں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا لیکن عملی زندگی میں کبھی ان چیزوں سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ ربوہ کی کُل آبادی چند کچے مکانات (جنہیں گھروندے کہنا زیادہ مناسب ہوگا) پر مشتمل تھی جن میں رات کو لالٹین یا دیئے جلائے جاتے تھے اور دُور دُور تک سنسانی اور ویرانی کا راج تھا۔ یہ سب باتیں مجھے بددِل کرنے کے لیے کافی تھیں لیکن اب میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا کیونکہ میں ابا کے ساتھ ضد کرکے خود ربوہ آئی تھی۔ اب انہیں واپس لے جانے کے لیے کہتی بھی تو کس منہ سے؟

ہمارا کالج اور ہوسٹل مرزا خلیل احمد کی کوٹھی میں تھا جو چار کمروں پہ مشتمل تھی۔ ایک کمرے میں کلاسز ہوتی تھیں اور ایک کمرہ پرنسپل کے دفتر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ تیسرا کمرہ ہوسٹل کے لیے مختص تھا جب کہ چوتھا کمرہ ہوسٹل کی وارڈن کے زیرِ استعمال تھا۔ اب میں تھی اور ہوسٹل جہاں میں بالکل تنہا تھی۔ دن کا کچھ حصہ تو کالج کی لڑکیوں کے ساتھ پڑھائی لکھائی اور خوش گپیوں میں گزر جاتا لیکن جوں جوں رات قریب آتی میرے دل میں ہول اٹھنا شروع ہو جاتے۔ ہوسٹل کی وارڈن استانی سردار تھیں۔ جناتی کہانیوں میں رات کے گُھپ اندھیرے، دیئے یا لالٹین کی مدّہم روشنی، ہواؤں کی سنسناہٹ اور دروازوں اور کھڑکیوں کی کھٹکھٹاہٹ کے بارے میں پڑھ تو رکھا تھا لیکن ربوہ میں یہ سب کچھ واقعتاً موجود تھا اور میں اسی میں رہ رہی تھی۔ ساری رات خوف سے دبکی پڑی رہتی۔ شام کے وقت بالعموم آندھی چل پڑتی اور آسمان سیاہ یا سرخ رنگ کے گرد و غبار سے اَٹ جاتا۔ تیز ہوا کی وجہ سے لکڑی کے بنے ہوئے ناقص دروازوں کے کواڑ آپس میں بجتے تو ایک انجانا سا خوف طاری ہو جاتا۔ صبح اٹھتی تو کمرے میں ہر طرف ریت ہی ریت ہوتی۔ چہرہ بھی مٹی سے اٹا ہوتا اور بال نمدہ بن جاتے۔ افسوس! ربوہ کے کھاری پانی سے ان بالوں کی صفائی بھی ممکن نہ تھی۔ سر دھوتی تو بال آپس میں جڑ جاتے جس سے سر میں خارش ہونے لگتی اور طبیعت ایک ناقابلِ بیان قسم کی افسردگی کا شکار ہو جاتی۔

تکلیف اور پریشانی کے اس دور میں چھوٹی آپا نے مجھ سے بہت محبت اور شفقت کا سلوک کیا۔ انہوں نے وارڈن سے کہہ رکھا تھا کہ وہ شام کے وقت مجھے ان کی امی المعروف ممانی جان کے گھر لے جایا کریں۔ ان کا گھر ہوسٹل کے قریب تھا۔ میں شام کے وقت اکثر ان کے ہاں چلی جاتی اور رات کو کافی دیر تک وہاں ٹھہری رہتی۔ چھوٹی آپا کی بہن امۃ القدوس میری کلاس فیلو تھی اور امۃ الرفیق ذرا چھوٹی چنانچہ میری ان کے ساتھ بے تکلفی ہوگئی۔ میں ان کے ساتھ مل کر ہوم ورک کرتی اور رات کا کھانا بھی بالعموم وہیں کھاتی۔ اس کے باوجود پریشان ہوتی تو ہمت کر کے ابّا سے کہتی کہ وہ چھوٹی آپا سے اجازت لے کر مجھے ربوہ سے واپس بلوالیں مگر وہ اس بات پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ یوں وقت گزرتا گیا اور میں آہستہ آہستہ ممانی جان کی محبت کی گرویدہ ہوگئی۔ ان کی پانی کی صراحیاں اور چاندی کے کٹورے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان صراحیوں کا ٹھنڈا پانی ربوہ کی شدید گرمی میں کسی نعمتِ غیر مترقّبہ سے کم نہ تھا۔

ہوسٹل میں ہر روز ماش کی چھلکے والی دال پکتی تھی۔ شروع میں یہ کھانا بہت ناگوار گزرتا لیکن پھر یہ سب کچھ اچھا لگنے لگا۔

چھوٹی آپا صاحبزادی امۃ المتین کے ساتھ ہفتے میں ایک بار شام کے وقت ہوسٹل آیا کرتی تھیں۔ بہت ہی محبت کے ساتھ میرا حال احوال دریافت کرتیں اور جاتے وقت کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز میرے لیے چھوڑ جاتیں۔ اب اس وقت کو یاد کرتی ہوں تو بہت مزا آتا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد امۃ الشافی جو میری رشتے دار بھی تھیں ہوسٹل میں میرے ساتھ رہنے کو آگئیں۔ پھر تین چار لڑکیاں جو کہ سکول کی طالبہ تھیں ہوسٹل میں داخل ہوگئیں۔ اس طرح ہوسٹل میں چہل پہل ہوگئی اور ہمارا وقت قدرے اطمینان کے ساتھ گزرنے لگا۔''

قدسیہ کے بیانِ مندرجہ بالا میں استانی سردار کا ذکر آیا ہے جو ہوسٹل وارڈن تھیں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک یہ خدمت سرانجام دی۔ یاد رہے کہ موصوفہ سیّد عارف حسین نامی ایک غیر از جماعت بزرگ کی صاحبزادی، سیّد افضل حسین شاہ کی اہلیہ اور سیّد سردار حسین شاہ، اوورسیئر، افسرِ تعمیرات صدر انجمن احمدیہ کی ہمشیرہ تھیں۔ ان کی ایک بھتیجی سیّدۃ الزہرا بنت سیّد سردار حسین شاہ کی روایت کے مطابق ''وہ قادیان کی ان ابتدائی خواتین میں شامل تھیں جنہوں نے مولوی فاضل کیا اور نصرت گرلز ہائی سکول قادیان میں پڑھاتی رہیں۔ ربوہ آکر انہوں نے پڑھایا تو نہیں البتہ انہیں ایک طویل مدت تک بطور سپرنٹنڈنٹ، جامعہ نصرت ہوسٹل کام کرنے کا موقع ملا۔ بڑی بارعب شخصیت کی مالک تھیں اور ان کی آواز بے حد گرجدار تھی۔ ہوسٹل میں مقیم طالبات کی تربیت کا ہر ممکن خیال رکھتیں۔ انہوں نے ۵ جولائی ۱۹۹۳ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔ ان کے تین بیٹے تھے: محمد اکمل جو فوج میں کیپٹن رہے، پھر سرکاراما میں ملازمت کرتے رہے اور لاہور ہی میں ایک حادثے میں وفات پاگئے؛ محمد احمد جنہوں نے کچھ عرصہ لیبیا اور پھر شاہنواز موٹرز میں گزارا اور ڈاکٹر محمد اجمل جو ڈینٹسٹ تھے اور لاہور سے انگلستان منتقل ہوگئے تھے۔ ان کی شادی ڈاکٹر میر مشاق احمد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔''

استانی سردار کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ اب میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس ہوسٹل میں مقیم لڑکیوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی گئی چنانچہ جامعہ نصرت کی سالانہ رپورٹ برائے ۶۳-۱۹۶۲ء مطبوعہ النصرت (جنوری تا مارچ ۱۹۶۴ء) کے مطابق اس سال یہاں بورڈرز کی تعداد پچپن سے بھی زیادہ رہی۔ اس وقت یہ ہوسٹل تین ڈارمٹریز اور دو کیوبیکلز کے علاوہ ایک کامن روم پر مشتمل تھا اور بورڈرز کی روز افزوں تعداد کے لیے ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ہوسٹل میں رہنے والی طالبات کو ایک ایسا ماحول مہیا کیا گیا تھا جو اُن کی مذہبی اور دینی اقدار کے عین مطابق ہو۔ ہوسٹل میں نماز باجماعت کا انتظام تھا، انہیں نماز جمعہ کے لیے بیت مبارک لے جایا جاتا تھا اور رمضان کے بابرکت مہینے میں قرآن کریم کے درس میں شمولیت ان کا معمول تھا۔ ہوسٹل کے معاملات کو خیر وخوبی سے چلانے کے لیے بورڈرز خود اپنے میں سے ''ہوسٹل کونسل'' کے ممبران کا انتخاب کرتیں اور میس کی نگرانی کے لیے ان کی اپنی ''میس کمیٹی'' موجود تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خوبصورت ماحول میں گزرا ہوا زمانہ بورڈرز کی یادوں کا قیمتی ترین سرمایہ بن جاتا تھا۔ دیکھئے تو سہی کالج کی ایک اولڈ سٹوڈنٹ، امۃ القدیر نے بورڈرز کی ان یادوں کو کس عمدگی سے نظم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

ہماری ڈارمٹری کچھ کچھ جواں معلوم ہوتی ہے
مسلسل قہقہوں سے گلستاں معلوم ہوتی ہے
اگر گانے پہ مُوڈ آیا، تو سب نے مل کے یوں گایا
یہ گانا کیا ہے، مرغے کی اذاں معلوم ہوتی ہے
وہ اپنی ''نادرہ'' ہے، دیکھو کیسی بھولی بھالی سی
جوانی میں بھی بچپن کا نشاں معلوم ہوتی ہے
ہے شہزادہ سلیم ان میں کہ جس کی شوخ فطرت میں
محبت ہر گھڑی، ہر دم جواں معلوم ہوتی ہے
وہ نازک سی کلی، کچھ شوخ سی، کچھ تلخ، کچھ شیریں
مگر باتوں میں لقمانِ زماں معلوم ہوتی ہے
وہ ہر اک بات میں ریزن، وہ ہر اک بات پر ڈسکس
جرح کرتے ہوئے قانون داں معلوم ہوتی ہے
ملاحت اور متانت پھر تبسّم اس کے چہرے پر
حقیقت میں وہ اک کوہِ گراں معلوم ہوتی ہے
اب اپنا حال کیا لکھوں کسک دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی، وہیں معلوم ہوتی ہے

یہ تو تھا جامعہ نصرت کے افتتاح، پہلے سال اس میں داخلہ لینے والی طالبات اور جامعہ نصرت ہوسٹل کا کچھ ذکر خیر۔ اب میں آپ کا مفصل تعارف کالج کے پہلے سال میں داخلہ لینے والی طالبات میں سے ایک، منظور النساء سے کرانا چاہتا ہوں۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ نصرت گرلز ہائی سکول، قادیان میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھیں۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۱ء میں ربوہ سے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں پانچویں پوزیشن حاصل کی۔ نامساعد خانگی حالات کے باوجود وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے میں کامیاب رہیں اور جامعہ نصرت کے پہلے بیچ میں شمولیت کا اعزاز پایا۔ انہوں نے یہیں سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کئی سال جامعہ نصرت میں درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ وہ اس زمانے کی یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے کہا کرتی ہیں:

''یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ جب میں نے جامعہ نصرت میں داخلہ لیا کالج کی ڈائریکٹریس چھوٹی آپا تھیں اور پرنسپل مسز شاہ۔ چھوٹی آپا اپنی دفتری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہمیں عربی بھی پڑھاتی تھیں۔ مسز شاہ ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں لیکن جلد ہی وہ ایم اے کرنے کے لیے لاہور چلی گئیں تو حضرت سیّد محمود اللہ شاہ نے ان کی جگہ لے لی۔ واپس آنے کے بعد مسز شاہ ہمیں دوبارہ انگریزی پڑھانے لگیں۔

ہمارے باقی تمام اساتذہ مرد تھے اور لڑکیاں پردے کے پیچھے بیٹھ کر ان سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ مرد اساتذہ میں قاضی محمد نذیر لائلپوری، عبدالسلام اختر، پروفیسر علی احمد اور بی ٹی صاحب شامل تھے۔ قاضی محمد نذیر لائلپوری دینیات کے پروفیسر تھے، عبدالسلام اختر انگریزی اور سائیکالوجی پڑھایا کرتے تھے، پروفیسر علی احمد اردو اور فارسی پڑھاتے تھے اور بی ٹی صاحب تاریخ پڑھانے پر مقرر تھے۔ عطاء الرحمٰن طالب بھی ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔

لیکچرر حضرات چونکہ پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھاتے تھے لہٰذا بلیک بورڈ پر کچھ لکھنا ضروری ہوتا تو لکھ کر پردہ سے آگے کی طرف سرکا دیتے۔ ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے۔ ماحول بہت پاکیزہ تھا۔ اگرچہ یہ ایک مشکل دور تھا مگر ہم نے اس کا ہر دن پوری طرح انجوائے کیا۔

کالج کے افتتاح کے وقت حضرت مصلح موعود نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ تاریخ بہت اچھا مضمون ہے اور اسے پڑھنا بڑا مفید ہے۔ آپ نے دینی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ میں نے تو پہلے ہی یہ مضمون رکھا ہوا تھا۔ حضور کی تقریر سننے کے بعد کچھ اور لڑکیاں بھی پہلے سے اختیار شدہ کوئی مضمون بدل کر تاریخ پڑھنے لگیں۔

مسز شاہ بہت اچھی منتظمہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی استاد بھی تھیں۔ ان کی ہر طالبہ پر نظر ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ لڑکیاں دوسرے کالجز میں جا کر مباحثوں میں حصہ لیں تاکہ وہ اچھی مقررہ بن سکیں۔ کالج ہمارے ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا اس لیے جب ہم نے بی اے کیا تو کالج میں کانووکیشن کی تقریب بھی ہونا شروع ہوگئی۔ کالج میں مختلف سوسائٹیاں سرگرمِ عمل تھیں۔ انگلش سوسائٹی، عربی سوسائٹی اور اردو سوسائٹی وغیرہ وغیرہ اور خوب مقابلے، تقاریر اور ڈرامے کروائے جاتے تھے۔ کالج کی کانووکیشن ہمارے بی اے پاس کرنے

کے بعد ہی ہونا تھی مگر کانووکیشن کے تصور سے روشناس کرانے کے لیے مسز شاہ ایک بار ہمیں گورنمنٹ کالج فار ویمن، لائلپور لے گئیں اور کانووکیشن کی تقریب دکھائی۔

لڑکیاں کھیلوں میں باقاعدہ حصہ لیتی تھیں اور میرے جیسی طالبات جنہوں نے سکول میں کبھی نہ کھیلا تھا کالج میں خوب کھیلنے لگتیں۔ میں سائیکل ریس، رسہ کشی، سیک ریس، میوزیکل چیئر اور شارٹ پٹ میں حصہ لیتی مگر انعام سیک ریس اور میوزیکل چیئر میں ہی ملتا۔ ان دونوں میں کالج میں میرا چاروں سال کا ریکارڈ ہے۔

۱۹۵۲ء میں ہمارا پہلا سالانہ ٹورنامنٹ اور تقسیمِ انعامات کی تقریب منعقد ہوئی جس کی مہمانِ خصوصی حضرت اُمّ داوٗد تھیں۔

میں بی اے کے بعد ہسٹری میں ایم اے کرنا چاہتی تھی مگر چھوٹی آپا کو معلوم ہوا تو وہ کہنے لگیں: منظور! تم عربی میں ایم اے کرو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اپنی طالبات ہمارے کالج میں پڑھائیں۔ جہاں تک ہسٹری کا تعلق ہے تو حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ کی بیٹی نعیمہ اس مضمون میں ایم اے کر رہی ہے، وہ یہاں آجائے گی۔ تم عربی میں ایم اے کرو۔ مجھے کچھ خوف سا تھا کہ نہ معلوم میں عربی میں ایم اے کر پاؤں گی یا نہیں لہٰذا تذبذب میں تھی۔ گھر گئی تو ابا جان نے فرمایا: بیٹی! تم یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمہیں ربوہ سے باہر کسی جگہ لیکچرر کے طور پر ملازمت کرنے دوں گا۔ اگر پڑھانا چاہتی ہو تو یہیں جامعہ نصرت میں پڑھانا ہوگا۔ دوسرے خلیفۂ وقت کی بیگم اور تمہارے کالج کی ڈائریکٹریس کا حکم ہے کہ تم نے عربی میں ایم اے کرنا ہے لہٰذا تم عربی میں ہی ایم اے کرو گی۔ اندریں حالات میں نے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ میرے بھائی، قریشی محمود احمد اس وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں کام کرتے تھے۔ میں ان کے پاس رہنے لگی۔ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کا سارا کام بھی خود کرتی تھی۔ اسی مکان کی اوپر والی منزل میں ہماری ایک عزیزہ، امۃ الرحمٰن طاہرہ رہا کرتی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتی تھیں کہ کرتو ایم اے رہی ہے مگر چوبیس گھنٹے گھر کے کام کاج میں جُتی رہتی ہے۔ انہیں میرے حال پر رحم آگیا اور جب میرے امتحان میں صرف تین ماہ رہ گئے تو انہوں نے میری بڑی بہن، آپا حفیظ کو ربوہ سے بلا لیا تاکہ وہ گھر کا کام کاج سنبھال لیں اور میں پوری توجہ پڑھائی پر دے سکوں۔ آپا حفیظ آگئیں تو گھر کے کاموں سے میری جان چھوٹ گئی اور تین ماہ مجھے پوری دلجمعی سے پڑھنے کا موقع مل گیا۔ خوب پڑھا اور اللہ کے فضل سے امتحان مکمل کرنے کے بعد ربوہ واپس چلی گئی۔

میرا ایم اے کا آخری پرچہ گیارہ جون ۱۹۵۷ء کو ہوا اور میں اسی شام ربوہ پہنچ گئی۔ چھوٹی آپا اور مسز شاہ کو معلوم ہوا کہ منظور واپس آگئی ہے تو انہوں نے مجھے اگلے ہی دن سے کلاسز لینے کو کہا چنانچہ میں نے ۱۲ جون ۱۹۵۷ء کو کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔ جب نتیجہ نکلا تو میں یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں فرسٹ رہی تھی۔ میں نے بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا چنانچہ نہ شاباش ملی نہ واہ واہ ہوئی۔ ایم اے کے امتحان میں اس نمایاں کامیابی پر میں خود بھی بے حد حیران تھی۔ دل نے کہا کہ چھوٹی آپا کا کہا ماننے اور ابا جان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ سب بے حد خوش ہوئے۔ اسی زمانے میں مجھے حضرت مولوی محمد دین ناظر تعلیم کا ایک

خط ملا جس میں انہوں نے میری نمایاں کامیابی پر مبارکباد دینے کے بعد مشورۃً لکھا تھا کہ اب مجھے اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ میں ابھی کوئی فیصلہ بھی نہ کر پائی تھی کہ مسز بشریٰ بشیر اسلامیات میں ایم اے کرکے کالج میں لیکچرر آ لگیں جس کی وجہ سے میں مزید ایم اے کرنے کی کوفت سے بچ گئی۔

اب ہمارے کالج میں کانووکیشنز کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم لیکچررز گاؤن پہن کر قطار میں جب سٹیج پر جاتیں تو بہت فخر محسوس کرتیں اور حاضرین بھی اس تقریب کو بہت دلچسپی سے دیکھتے۔ کانووکیشنز میں شمولیت کے لیے بیرونی کالجز کی پرنسپلوں کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔ مختلف کانووکیشنز پر ہم نے لاہور سے کنیرڈ کالج کی پرنسپل، مس منکت رائے؛ کالج آف ہوم اکنامکس کی پرنسپل مسز بشیر اور لاہور کالج فار ویمن کی پرنسپل مسز لال کو بلایا تھا۔ طالبات عزت و احترام سے ان کا استقبال کرتیں اور سٹاف بھی دل و جان سے انہیں خوش آمدید کہتا چنانچہ وہ بھی یہاں کی اچھی یادیں لے کر واپس لوٹتیں۔

ہماری لائبریری زیادہ بڑی تو نہ تھی مگر اس میں بہت سی عمدہ کتابیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ سعیدہ احسن اس کی انچارج تھیں۔ میں اکثر لائبریری میں جا بیٹھتی تھی۔ میں نے اپنی شاگردوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو وہ لائبریری میں میرے پاس آ کر پوچھ لیا کریں چنانچہ میری کوئی نہ کوئی شاگرد آئے روز میرے پاس آ کر بیٹھی رہتی۔

میرے زمانۂ تدریس میں امۃ الحفیظ قاضی، صفیہ چودھری، نعیمہ حشمت اللہ، سعیدہ حبیب اللہ، نصیرہ شاہنواز، امینہ مرزا، رشیدہ شریف، امۃ المجید اور بشریٰ بشیر کالج میں لیکچررز ہوا کرتی تھیں جب کہ حمیدہ بانو کھیلوں کی انچارج تھیں۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ میری اپنی شاگردیں کالج کی لیکچررز میں شامل ہوتی گئیں۔ جب کسی لیکچرر کی شادی ہو جاتی تو کوئی دوسری ان کی جگہ لے لیتی اور میرے کالج سے چلے آنے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میری بعض شاگردیں یکے بعد دیگرے جامعہ نصرت کی پرنسپل بھی بنیں۔

میں نے جتنے سال کالج میں پڑھایا تقریباً ہر سال میری کوئی نہ کوئی شاگرد عربی کے مضمون میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہ کر طلائی تمغے حاصل کرتی۔ میں میڈل حاصل کرنے والی ہر بچی کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کی کانووکیشن میں جایا کرتی تھی اور جب میڈل اس کے سینے پر سجتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا گویا یہ میڈل مجھے ہی مل رہا ہو۔

میری شاگردیں کانووکیشن میں گاؤن کے نیچے برقع پہن کر جاتیں جس پر لوگ انہیں حیرت سے دیکھتے تھے۔ ایک سال تو پنجاب یونیورسٹی کی کانووکیشن میں صدر ایوب کو اعزازی ڈگری دی جانی تھی اس لیے بہت شاندار تقریب کا اہتمام تھا۔ غالباً ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ میری دو شاگردوں یعنی امۃ الحمید بنت عبدالرحیم درویش اور امۃ الرشید غنی بنت عبدالغنی نلکا ساز کو گولڈ میڈلز عطا ہونا تھے۔ جب ان کا نام پکارا گیا تو دونوں برقع میں سٹیج پر گئیں۔ وائس چانسلر نے میڈل دے کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ان بچیوں نے معذرت کر لی۔ یقیناً یہ اُس

ماحول کی برکت تھی جس میں ان بچیوں نے پرورش پائی تھی۔ اخبارات کے رپورٹرز آئے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک اچنبھا تھا چنانچہ اگلے روز اخبارات میں یہ خبر چوکھٹوں میں شائع ہوئی جس سے کالج کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔

ایک دفعہ مسز شاہ نے مجھے بلا بھیجا۔ میں حاضر ہوئی تو وہ کہنے لگیں: ہر سال تمہاری کوئی نہ کوئی شاگرد گولڈ میڈل لیتی ہے۔ تم کس طرح پڑھاتی ہو کہ تمہاری ساری کلاس عربی میں فرسٹ ڈویژن لے لیتی ہے؟ پھر کہنے لگیں: میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں ان مسلسل کامیابیوں پر کالج کی طرف سے گولڈ میڈل دیا جائے مگر کیا کروں کالج کا بجٹ اس خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے جواب دیا: میڈم! آپ نے کہہ دیا، بس میرے لیے یہی کافی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ مجھے آپ کی طرف سے میڈل مل گیا ہے۔ میری یہ شاگردیں چلتی پھرتی میڈل ہی تو ہیں، مجھے بھلا کسی اور میڈل کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟

میں آٹھ دس سال پہلے لندن کے جلسہ سالانہ میں گئی تو اپنی بہن امۃ القیوم کے ہاں ٹھہری۔ ان کا گھر بیت الفضل کے بہت قریب تھا چنانچہ میں پیدل وہاں پہنچ جاتی۔ ایک دفعہ جمعہ کی نماز کے بعد بہت ساری لڑکیوں نے ''مس منظور! مس منظور!'' کہتے ہوئے میرے گرد جمگھٹا کر لیا۔ میں نے ان پر نظر دوڑائی تو وہ سب میری شاگردیں تھیں اور ان میں کم سے کم تین وہ بھی تھیں جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے مضمون میں اول رہ کر گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ اس سے اگلے جمعہ پر ان میں سے بعض میرے لیے سینٹ، کپڑوں کے جوڑے اور کچھ اور چیزیں لے کر آئیں۔ میں نے کہا: یہ کیا، تم سے ملاقات ہو گئی تھی، کیا یہی کافی نہ تھا؟ کہنے لگیں: کالج کے زمانے میں تو ہم آپ کو کچھ دے نہیں سکتی تھیں مگر اب ہمارے حالات بدل گئے ہیں لہٰذا جی چاہتا تھا کہ آپ کو کوئی تحفہ دیا جائے۔ مہربانی کر کے آپ قبول فرمائیں۔

مجھے ربوہ میں گزرے ہوئے دن بے حد یاد آتے ہیں۔ وہ ہماری زندگی کا سنہری دور تھا۔ تمام لیکچررز آپس میں گھل مل کر بڑے پیار سے رہتی تھیں اور شاگرد بھی بہت سعادتمند اور ہر حکم پر عمل کرنے والی تھیں۔ ہم میں سے کچھ لیکچررز رات کو اکٹھی واک کرتیں۔ لطیفے، چٹکلے، کہانیاں اور مذاق بھی ہوتا۔ غرض سب کچھ چلتا رہتا۔ یہ ہماری تفریح کا وقت ہوتا تھا جس سے ہم سب خوب لطف اندوز ہوتیں۔

نماز جمعہ پر ہم سب جاتے تھے اور رمضان کا مہینہ بہت سی برکات لے کر آتا۔ ہم درس سننے بیت مبارک جاتے اور روحانی خزائن سمیٹ کر گھر واپس لوٹتے۔

میں اشارۃً ذکر کر چکی ہوں کہ میں نے کچھ وقت چھوٹی آپا سے عربی پڑھی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب وہ بہت بیمار تھیں اور مہمانوں کو پہچاننے میں بھی دقت محسوس کرنے لگی تھیں میں ایک بار ایبٹ آباد سے ان سے ملاقات کے لیے ربوہ حاضر ہوئی۔ وہ اس وقت سو رہی تھیں۔ ان کی خادمہ نے بتایا کہ وہ اب اٹھنے والی ہیں اس لیے آپ مل کر ہی جایئے گا سو میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھیں اور باہر آئیں۔ مجھے دیکھا تو بے ساختہ گلے سے لگا لیا اور کہنے لگیں: ''میری شاگرد! منظور!'' میں بے حد خوش ہوئی کہ انہوں نے مجھے پہچان

لیا ہے۔ کیا عجیب ہستی تھیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا بہت سا کام، لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کی صدارت اور مختلف شہروں میں لجنات کے دورے آپ کی ذمہ داریاں تھیں۔ جلسہ سالانہ پر آپ کی مصروفیات اور زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ اکثر شادیوں کی تقاریب کو بھی رونق بخشتی تھیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کے وجود میں کئی وجودوں کی طاقت سمو رکھی تھی۔ دیکھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ وہ آرام اور تحمل سے لوگوں کی بات سنتیں اور ان کی مشکلات کا مداوا کرتیں۔ خدا تعالیٰ ان کے درجات کو بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے۔ انہوں نے صرف خلیفۂ وقت کی نہیں بلکہ دکھی انسانیت کی خدمت کی تھی۔ وہ ایک ایسا پھول تھیں جس کی خوشبو سے آج بھی ہمارے دل و دماغ معطر ہیں۔

شروع شروع میں ربوہ کی فضا گرد آلود اور پانی کڑوا کسیلا تھا مگر آہستہ آہستہ اسی جگہ پھل پھول اُگنے لگے اور جامعہ نصرت کا ظاہری حسن بھی دوبالا ہوگیا۔ فضا پہلے جیسی گرد آلود نہ رہی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگا۔ کیا سڑکیں، کیا کوٹھیاں اور کیا بہشتی مقبرہ، ہر طرف سرسبز درخت لہلہانے لگے اور وہ نظارہ جو حضرت مصلح موعود کو خواب میں دکھایا گیا تھا کہ ہم ایک سرسبز و شاداب زمین پر وارد ہوئے ہیں پورا ہوگیا۔ کوئی شخص اب یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی یہاں گھاس کی ایک پتی بھی نہ اگتی تھی اور دن رات بگولوں کا راج رہتا تھا۔

ایک دفعہ ایبٹ آباد سے ربوہ گئی تو کالج بھی گئی۔ پرنسپل آفس میں جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ میری انتہائی شرارتی اور چنچل شاگرد، امۃ المجید پرنسپل کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ میں دروازہ پر رُک گئی اور کہا: مے آئی کم اِن میڈم؟ امۃ المجید کی مجھ پر نظر پڑی تو انہوں نے اٹھ کر میرا استقبال کیا اور کہنے لگیں: آئیں مس آئیں۔ میں اندر گئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے ان کی خیریت دریافت کی اور پرنسپل بننے پر مبارکباد بھی دی۔ اتنے میں ایک لڑکی آئی تو امۃ المجید اس سے کہنے لگیں: مس منظور میری ٹیچر تھیں اور یہ جو پرنسپل کے آفس کے دروازہ پر میڈل لینے والی لڑکیوں کے ناموں والا بڑا سا بورڈ لگا ہوا ہے یہ سب ان کی شاگرد ہیں۔ وہ لڑکی حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن پھر مجھ سے مصافحہ کیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اسے اپنے کالج کی ایک ابتدائی ٹیچر سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔

اس کے بعد میں مسز شاہ سے ملنے ان کے گھر گئی۔ وہ ان دنوں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی تھیں اور علیل تھیں۔ چند منٹوں کے انتظار کے بعد وہ غسل خانے سے نکلیں۔ مجھے دیکھتے ہی سینے سے لگالیا اور پیار کیا اور کہنے لگیں: منظور! تم بہت عرصے کے بعد آئی ہو۔ جب بھی ربوہ آؤ تو مجھے ملا کرو۔ میں نے وعدہ کیا مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور میرے دوبارہ آنے سے قبل ہی انہوں نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ کر بہشتی مقبرے کو اپنا مسکن بنالیا۔ میں بہشتی مقبرے گئی اور بڑی دیر تک ان کی قبر پر کھڑی ہوکر بزبانِ خاموشی انہیں خراجِ تحسین پیش کرتی رہی۔

اب کالج کی پُر بہار فضا، چھوٹی آپا اور مسز شاہ کا وقار، لیکچررز کی باتیں، شوخیاں اور چٹکلے اور لڑکیوں کی شرارتیں...... یہ باتیں یاد آتی ہیں تو دل میں اک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ کھیلوں میں حصہ لینا اور انعام پانا؛ کانووکیشنز

اور ہمارا بصد افتخار گاؤن پہن کر ان میں شامل ہونا؛ بین الکلیاتی مباحثے اور مقررین کا ایک دوسرے سے بڑھ کر دلائل پیش کرنا؛ عربی سوسائٹی کے اجلاس، عربی ڈرامے اور بچیوں کا ان میں بے حد جوش و خروش سے حصہ لینا اب بھی یاد آتا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ بتاتی چلوں کہ میری ایک شاگرد ہیں قانتہ صالحہ۔ وہ لمبا عرصہ امریکہ کی ناصرات کی صدر رہی ہیں۔ ایک بار ایک جلسہ کے موقع پر مجھ سے ملیں اور کہنے لگیں: مس! آپ نے جامعہ نصرت میں عربی میں جو ڈرامہ کروایا تھا اس میں میرا اپنا پارٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں نے کہا: سناؤ تو انہوں نے اپنا پورا پارٹ فرفر سنا دیا۔ میں حیران ہوئی کہ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی انہیں یہ سب کچھ حرف بحرف یاد تھا۔ مسز شاہ کا کالج کا انتظام، چھوٹی آپا کی لڑکیوں کو نہایت ہی پیار سے سیدھا راستہ اختیار کرنے کی تلقین ایک منفرد انداز میں ہوتی تھی۔ ہم ان محسنات کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات کا وارث بنائے۔ ہم جو کچھ بھی کرلیں مگر

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامعہ نصرت سے فارغ ہونے والی اکثر طالبات نے بعد کی زندگی میں جماعت کی حتی المقدور خدمت کی ہے جس سے ربوہ اور جامعہ نصرت کا نام روشن ہوا ہے۔ میں نے خود لجنہ اماء اللہ، ایبٹ آباد کی جنرل سیکرٹری کے طور پر کئی سال تک کام کیا۔ میں نے اس عرصے میں کتنے ہی اجلاس اور اجتماعات کروائے اور کتنی ہی رپورٹیں اور چندہ جات مرکز کو بھجواتی رہی ہوں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ تو تھیں جامعہ نصرت کے بارے میں اس طالبہ کی بعض یادداشتیں جو اس کالج کے پہلے بیچ میں شامل تھیں اور جنہیں بعد میں ایک عرصہ یہیں بطور لیکچرر کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ اب یہاں طیّبہ کریم شاہد (جن کا ذکر نصرت گرلز ہائی سکول کے ضمن میں پہلے بھی ہو چکا ہے) کا وہ نوٹ نقل کیا جا رہا ہے جو انہوں نے میری درخواست پر لندن سے لکھ کر ارسال کیا ہے۔ یاد رہے کہ طیّبہ نے ۱۹۵۲ء میں جامعہ نصرت میں داخلہ لیا اور وہ ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور منتقل ہوگئیں لیکن ان دو سالوں کی بہت سی خوشگوار یادیں اب تک ان کے ذہن پر حاوی ہیں۔ وہ پرانے کاغذات کو خوب سنبھال کر رکھنے کی عادی معلوم ہوتی ہیں چنانچہ ان کی یادداشتوں میں عبدالسلام اختر کی وہ دو نظمیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے بعض کلاسز کے الوداع کے موقع پر طالبات کی طرف سے کہیں تھیں۔

طیّبہ کریم اپنے بعض اساتذہ کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''جب میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تو جامعہ نصرت کا تمام سٹاف مرد اساتذہ پر مشتمل تھا۔ ہاں! چھوٹی آپا ہمیں عربی پڑھایا کرتی تھیں اور خوب پڑھاتی تھیں۔ ان کے علاوہ مسز شاہ نے بھی کچھ عرصہ ہمیں انگریزی پڑھائی۔

عبدالسلام اختر سائیکالوجی، فلسفہ اور انگلش پڑھاتے تھے۔ انتہائی لائق اور خوش مزاج تھے۔ شاعر بھی

تھے۔ کبھی بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ موصوف ایک روز ہمیں سائیکالوجی پڑھا رہے تھے۔ فطرتِ انسانی اور فطری جذبوں کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ ہم بے تکلفی سے بہت سے سوالات کے سیر حاصل جوابات حاصل کر لیا کرتے تھے۔ ایک طالبہ نے فطرتِ انسانی میں مختلف جذبوں کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے ''جذبۂ محبت'' پر بھی سوال کر ڈالا لیکن ساتھ ہی اپنی آواز کو بہت دھیما کر لیا...... ہم سب اس کے سوال پر ہنسنے لگے تاہم عبدالسلام اختر چونکہ سن نہ پائے تھے اس لیے پوچھتے ہی رہ گئے ''کیا کہا؟ کیا کہا؟'' لیکن ہماری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اونچی آواز میں یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ریاضی کے پروفیسر محمد ابراہیم ناصر تھے۔ بہت لائق اور محنتی تھے اور کلاس میں کوئی فالتو بات نہیں کرتے تھے۔ ایک روز کچھ شرارتی لڑکیوں نے ان کی سائیکل پنکچر کر دی لیکن بعد میں خود ہی افسوس کرنے لگیں کہ اتنے شریف النفس استاد کو یوں پریشان نہیں کرنا چاہئے تھا۔

مولوی عطاء الرحمٰن طالب اردو، فارسی اور قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر پڑھایا کرتے تھے۔ انتہائی لائق لیکن بہت شرمیلی طبیعت کے مالک تھے۔ بعض الفاظ کے معنی بتاتے ہوئے بھی شرما جاتے تھے۔ ایک روز ''بانگِ درا'' پڑھا رہے تھے۔ جب یہ مصرع پڑھا:

''مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو''

تو اس کی تشریح کرتے ہوئے ہر بات ذہن نشین کروا دی لیکن لفظ ''آبستن'' کے معنی نہیں بتائے۔ آخر ایک لڑکی نے پوچھ ہی لیا کہ مولوی صاحب ''آبستن'' کے کیا معنی ہیں؟ قدرے کرختگی سے فرمانے لگے: گھر جا کر اپنی ماں سے پوچھ لینا۔ لڑکی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: مولوی صاحب! میری امی پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ مولوی صاحب چپ رہے اور ہم سب بھی ڈر کے مارے بالکل خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب تشریف لے گئے۔

طیبہ کریم بتاتی ہیں: ''ہم لوگ فرسٹ ایئر میں آئے تو صاحبزادی امۃ القدوس کی شادی مرزا وسیم احمد سے ہو گئی اور وہ بیاہ کر قادیان رخصت ہو گئیں۔ اسی طرح ایک اور طالبہ، رقیہ شمیم کی شادی کرم الٰہی ظفر مربیٔ سلسلہ سے ہو گئی اور وہ سپین چلی گئیں۔ ہم لوگوں نے ان دونوں رخصت ہو جانے والی طالبات کے لیے چھوٹی چھوٹی الوداعی پارٹیاں منعقد کیں جو ایک یادگار کی طرح ذہن میں محفوظ ہیں۔

میں نے طالبات کی بعض شرارتوں کا ذکر کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں میں کچھ سنجیدگی آتی جا رہی تھی اور ہر وقت کی شرارتیں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ کالج میں بی اے کلاسز کا اجرا ہونے والا تھا اور سیکنڈ ایئر کی طالبات ایف اے کا امتحان دے کر تھرڈ ایئر میں جانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ہم فرسٹ ایئر کی طالبات نے ان کے لیے ایک پارٹی کا انتظام کیا۔ ان کے لیے الوداعی نظم عبدالسلام اختر نے لکھی اور پڑھنے کے لیے مجھے عطا فرمائی۔ میں نے ایک بڑے مجمع میں ترنم کے ساتھ یہ نظم پڑھ کر سنائی۔ نظم پڑھنے

سے پہلے الوداعی ایڈریس پیش کرنے کی سعادت بھی مجھے نصیب ہوئی اور یہ ایڈریس لکھا بھی میں نے ہی تھا۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے لکھے گئے بوسیدہ کاغذ آج بھی میری ایک فائل میں موجود ہیں...... ماضی کے دریچے کھول بیٹھی ہوں تو بہت کچھ نظر آ رہا ہے۔ خیر عبدالسلام اختر کی لکھی ہوئی نظم ملاحظہ کیجئے:

کچھ اِس طرح کا عالم محفل پہ چھا رہا ہے
اِک رنگ آ رہا ہے، اِک رنگ جا رہا ہے
یہ مختصر زمانہ دل میں سما رہا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
ہمجولیو سلامت! رخصت کا آج دن ہے

دامن پہ آج دل کے برسات ہو رہی ہے
اک آنکھ ہنس رہی ہے، اک آنکھ رو رہی ہے
یہ تاجِ علم و حکمت، یہ فخرِ علم و دانش
تقدیر اپنی دُھن میں موتی پرو رہی ہے
ہمجولیو سلامت! رخصت کا آج دن ہے

پیشانیوں پہ روشن انوار کے خزینے
جیسے سمندروں پر بہتے ہوئے سفینے
ہم کو یقیں ہے اک دن یہ جگمگا اٹھیں گے
یہ محنتوں کی گھڑیاں، یہ کام کے مہینے
ہمجولیو سلامت! رخصت کا آج دن ہے

کالج کی آبرو ہو، تم آنکھ ہو وطن کی
تم مرکزِ نظر ہو، سب اہلِ انجمن کی
بیداریوں کی مخزن، تہذیب کا سہارا
تم نور ہو وطن کا، امید ہو چمن کی
ہمجولیو سلامت! رخصت کا آج دن ہے

سوز و ساز کی دل نشینی، طرزِ ادا کی دلکشی اور قلب و روح میں اترنے کی خوبی، سبھی کچھ ہے ان اشعار میں۔

یہ تھے ہمارے اساتذہ کرام!

اب ہمارا گروپ تمام شرارتیں چھوڑ کر پڑھائی میں مصروف تھا...... وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ آخر وہ وقت آن پہنچا کہ ہمارے ایف اے کے امتحان میں چند ہفتے رہ گئے۔ ہمیں الوداعی پارٹی دی گئی۔ ہمارے لیے بھی الوداعی اشعار عبدالسلام اختر ہی نے لکھے اور بزبانِ شعر ہم لوگوں کی ترجمانی کردی...... لیجیے، آپ بھی لطف اٹھائیں:

رخصت کا وقت آیا خاموش ہے زمانہ
آنکھیں سنا رہی ہیں دل کا کوئی فسانہ
اے بُلبلو چمن کی تم اپنا آشیانہ
لے کر جہاں چلی ہو ہم کو نہ بھول جانا
کچھ زادِ راہ لے لو، رخصت کا آج دن ہے

دو سال کا زمانہ کالج میں یوں گزارا
جیسے ہو آسماں پر ہنستا ہوا ستارا
یا صبح کی جبیں پر خورشید کی تجلّی
یا جھیل کے کنارے مہتاب کا نظارا
کچھ زادِ راہ لے لو، رخصت کا آج دن ہے

علم و ہنر کی شمعیں ہر سُو جلا رہی ہو
شادابیوں سے دل کو مرکز بنا رہی ہو
یہ دولتِ سخن ہے یا علم کا خزانہ
اِس ہاتھ دے رہی ہو، اُس ہاتھ پا رہی ہو
کچھ زادِ راہ لے لو، رخصت کا آج دن ہے

جاؤ کہ زندگی میں ہر گام پر بھلا ہو
مقصود ہو میسر، نخلِ چمن ہرا ہو
شادابیوں کا گلشن ہر دم ہرا بھرا ہو
سر پہ خدا کا سایہ دامن میں مدّعا ہو
کچھ زادِ راہ لے لو، رخصت کا آج دن ہے"

آپ نے طیّبہ کریم کی کچھ یاداشتیں ملاحظہ فرمائیں۔ اب میں آپ کا تعارف اپنی ماموں زاد ہمشیرہ، امۃ الحفیظ مرزا سے کرانا چاہتا ہوں جن کا قدرے تفصیلی ذکر "قریۂ جاوداں" میں موجود ہے۔ موصوفہ ۱۹۵۰ء کی

دہائی کے نصفِ اوّل میں جامعہ نصرت میں پڑھتی رہیں تاہم بدقسمتی سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ناکام ہونے پر کالج چھوڑ دیا۔ خداتعالیٰ نے انہیں شعر کہنے کا ملکہ عطا کر رکھا تھا اگرچہ ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بوجوہ کُھل کر سامنے نہ آسکیں اور ان کا زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ ہی رہا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیٹی سے ملنے والی ایک نوٹ بُک میں درج ان کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالج میں بطور شاعرہ ان کی خاصی پہچان تھی اور وہ مسز شاہ اور مس صفیہ چوہدری کی فرمائش پر بکثرت شعر کہتی رہی ہیں۔ ان کی یہ غزل جس کا عنوان ہے: "ہے غضب یہ تیری جرأتیں (طرحی غزل)" ملاحظہ ہو:

ہے غضب یہ تیری جرأتیں، تجھے کچھ بھی خوفِ خدا نہیں
نہ ہے ڈر شماتتِ خلق کا، میری جاں یہ باتیں روا نہیں
تو بیا بیا اے نگارِ من! اے شکیبِ من! اے قرارِ من
ذرا اس طرف بھی تو دیکھ تُو، میری جان آنکھیں چُرا نہیں
اے نہالِ کشتِ آرزو، اے امید و مرکزِ جستجو
میری جاں لبوں پہ ہے آرہی، رہا تسمہ جاں کا لگا نہیں
ہے رقیبِ رُوسیہ ہوگیا تیرے التفات کا مستحق
یہ سِتم نہیں ہے تو اور کیا، یہ ہے اور کیا جو جفا نہیں
کہا مسکرا کے یہ اس نے کل، گیا دَر پہ اُس کے جو نامہ بَر
مجھے وہ سمجھتی ہے جو گل، تو گُلوں میں بُوئے وفا نہیں
جسے غفلتوں سے ہے کھودیا، کل تک میں اس کے قریب تھی
اے رقیب بات یہ یاد رکھ، وہ سدا کسی کا رہا نہیں
جسے ڈھونڈا میں نے نگر نگر، جسے ڈھونڈا میں نے گلی گلی
رہی بے ثمر میری جستجو اُسے پاکے، میری خطا نہیں
میں نہیں ہوں ایسی رقیق دل کہ بچھڑ گیا جو رفیقِ دل
بھری بزم میں بیٹھ کے رو دیئے، میرا کوئی آنسو بہا نہیں
جو خیال میں بھی نہ آسکے وہ ہے میرے دل میں سما گیا
میری آنکھوں میں ہے وہ جلوہ گر، یہ تری نظر کی خطا نہیں
یہ لگاوٹیں تیری غیر سے، یہ نوازشیں تیری دہر پہ
اے حسین و مہ جبیں، دلنشیں مجھے اس قدر تُو ستا نہیں
تو جو اپنے دل کا ہے بادشاہ، تجھے دل جلوں سے ہے واسطہ
جو چاہے کر تجھے کس کا ڈر، مجھے تجھ سے کوئی گِلہ نہیں

تجھے اپنے حسن پہ ناز ہے، مجھے اپنے عشق پہ ناز ہے
تجھ سا نہ ہو کوئی بے وفا، مجھ سا تو با وفا نہیں
میں ہی امتیاز نہ کرسکی کبھی سنگ و لعل کے درمیاں
قسمت کا میری قصور ہے، یہ مری نظر کی خطا نہیں
تجھے چھوڑ کر بنوں غیر کی، مری جاں یہ ہو سکتا نہیں
میں ہوں ابتدا سے وہ پارسا کہ کیا کبھی یہ گناہ نہیں
میرے حوصلے ہیں بلندتر، تیری بے رخی سے نہ ہوں گے کم
تُو جو بے نیاز ہے اس قدر، میں تجھ سے پھر بھی خفا نہیں

موصوفہ کے اپنے نوٹ کے مطابق ''مندرجہ بالا اشعار مخدومہ مکرمہ جنابہ پرنسپل صاحبہ جامعہ نصرت کے ایما پر سپردِ قلم کئے گئے۔''

زیرِ نظر نوٹ بک سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مختلف سہیلیوں کی فرمائش پر بھی اشعار کہتی رہیں جو انہوں نے اپنے نام کے ساتھ مختلف مشاعروں میں پڑھے تاہم ان کا ذکر چھوڑتے ہوئے یہاں میں ان کی صرف دو نظمیں نقل کررہا ہوں۔ پہلی نظم انہوں نے اَپوا کی ایک اعلیٰ عہدیدار جن کا نام ''سلیمیٰ'' معلوم ہوتا ہے کے لیے منعقد ہونے والی الوداعی تقریب میں پڑھنے کے لیے مس صفیہ چوہدری کو لکھ کر دی تھی۔ موصوفہ کے اپنے الفاظ میں ''یہ نظم ہماری عزیز پروفیسر جنابہ محترمہ مس چوہدری صاحبہ نے ہم سے لکھوائی برموقع الوداعیہ پارٹی صدرِ اپوا۔'' اگرچہ اس نظم پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے تاہم مس چوہدری کے جامعہ نصرت میں قیام کا زمانہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۱ء تک قریباً سات سال پر محیط ہے۔ اس زمانے میں اپوا کی صدر بیگم رعنا لیاقت علی خان تھیں لہٰذا عین ممکن ہے یہ خاتون جن کی الوداعی تقریب کے موقع پر پڑھی جانے کے لیے یہ نظم کہی گئی تھی اس ادارے کی صوبائی صدر ہوں یا ان کے پاس مرکزی سطح پر کوئی اور عہدہ ہو۔ بہرحال اس بحث میں پڑے بغیر یہ بات تقریباً یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مس چوہدری اپوا کی رکن تھیں اور اس الوداعی تقریب میں انہوں نے ہی یہ نظم پڑھی تھی۔ اب ملاحظہ فرمائیے یہ نظم:

خوش اقبال، خوش بخت، خوش خُو سلیمیٰ
گُلِ علم و دانش کی خوشبو سلیمیٰ
ذہانت، فطانت، لیاقت کا منبع
فصاحت، بلاغت، حلاوت کا منبع
نزاکت، بشاشت، لطافت کا منبع
وساحت، رشاقت، مہابت کا منبع
ظرافت، فراست، نباہت کا منبع
حقیقت، طریقت، ولایت کا منبع

امانت، دیانت، صداقت کا منبع
قناعت، عبادت، اطاعت کا منبع
نجابت، شرافت، سعادت کا منبع
ملاست، عدالت، وضاوت کا منبع
حکومت، امارت، صدارت کا منبع
زکاوت، ذکاوت، رشادت کا منبع
حماست، شجاعت، بسالت کا منبع
مثانت، مَتانت، ملاحت کا منبع
بطالت، اِنابت، رِیاست کا منبع
مجاعت، کفالت، مکانت کا منبع
حِصانت، حَصانت، شفاعت کا منبع
مسرت، محبت، مروّت کا منبع
ہدایت، کرامت، روایت کا منبع
اِیالت، اِعانت، جسارت کا منبع
ملاحت، طلاوت، وجاہت کا منبع
دلالت، اِجادت، سفارت کا منبع
خوش اقبال، خوش بخت، خوش خو سلیمیٰ
گُلِ علم و دانش کی خوشبو سلیمیٰ
خواتین کو اُبھت دلانے کی ٹھانی
یہ نازک سا پیکر یہ بارِ گرانی
نہ تن اپنا سمجھا، نہ من اپنا جانا
نہ وقت اور دولت کی کچھ قدر جانی
غریبوں کا ہیں آپ ماویٰ و ملجا
فسردہ دلوں کے لیے شادمانی
مصیبت میں جب بھی کسی نے پکارا
سنی مضطرب ہوکے اُس کی کہانی
کسی کے لیے آگ میں کُود جانا
اور آرام میں آگ اپنے لگانی

خدائی مزے میں کبھی سو رہی ہے
اُنہیں سونے دے کب ہے دردِ نہانی
بنا لینا اغیار کے غم کو اپنا
اُدھر زندگی تلخ اپنی بنانی
اعانت غریبوں کی اِس طرح کرنا
کہ کر کے مدد پھر نہ ہرگز جتانی
رہے شاملِ حال نصرت خدا کی
گزاریں اِسی طرح ساری جوانی
فصاحت، بلاغت کے چشمے بہاتیں
کہاں بحر میں ہوگی ایسی روانی
خدا نے کیا بارور کوششوں کو
بنا ڈالا اپوا کو بھی غیرفانی
ہمیں چھوڑ کر وہ چلی جا رہی ہیں
بنے گی مگر یاد اُن کی نشانی
لگائی ہے جو آگ دل میں ہمارے
پڑے گی وہ اب آپ ہی کو بجھانی
خوش اقبال، خوش بخت، خوش خو سلیمیٰ
گُلِ علم و دانش کی خوشبو سلیمیٰ

صف باندھ روانہ ہوئیں اشکوں کی قطاریں
اِس فوجِ ظفر موج کا مسکن ہیں یہ غاریں
گلشن میں ہمارے نہیں اب تازگی باقی
بے کیف ہیں، بے رنگ ہیں، سُونی ہیں بہاریں
ہر طرف بھٹکتی ہیں نگاہیں نہیں پاتیں
اُس مایۂ خوبی کو کہاں جا کے پکاریں
اب زندگی میں کوئی مسرت نہیں واللہ
پھر کس لیے الجھی ہوئی زلفوں کو سنواریں
جب چاہنے والے نہیں اِس بزم میں باقی
کس واسطے پھر اہلِ چمن حسن نکھاریں

اے باعثِ صد ناز ہوا کیسے گوارا
ٹھکرانا اُنہیں آپ پہ جو جان بھی واریں
خوش اقبال، خوش بخت، خوش خو سلیمیٰ
گُلِ علم و دانش کی خوشبو سلیمیٰ

ہمارے لیے باعثِ ناز تھیں وہ
نہ ہو جس کا انجام آغاز تھیں وہ
ہمیں چھوڑ کر کس لیے وہ گئی ہیں
نہایت ہی پُرسوز اک ساز تھیں وہ
شکستہ دلوں کے دلوں کا سہارا
بہل جائے دل جس سے آواز تھیں وہ
خدائی میں اُن سا کہاں آج کوئی
نہ سمجھا جسے کوئی وہ راز تھیں وہ
مصیبت زدوں کے لیے تھیں سکینہ
غریبوں کی دنیا میں انباز تھیں وہ
نہ دیکھی گئی صنفِ نازک کی پستی
دلایا اُسے جس نے اعزاز تھیں وہ
چمن کی گئیں رونقیں ساتھ اُن کے
نہ ہوتا یہ کیوں پنچھم آواز تھیں وہ
بہت منتیں کیں بہت آہ و زاری
نہ مانا کہ مائل بہ پرواز تھیں وہ
خوش اقبال، خوش بخت، خوش خو سلیمیٰ
گُلِ علم و دانش کی خوشبو سلیمیٰ

امۃ الحفیظ مرزا نے ایف اے کے امتحان میں ناکامی پر بھی ایک نظم لکھی جو اُن کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔ کالج کی اس ہونہار طالبہ کی یاد میں یہ نظم بھی نذرِ قارئین کی جا رہی ہے:

وہ حسیں خواب کہ دیکھے تھے کبھی
میرے اُن خوابوں کی تعبیر جدا ہوتی ہے
تھی یہ ناکامی و رسوائی مری قسمت میں
میرے مقصود کی تصویر جدا ہوتی ہے

قلبِ تاریک میں کر دے جو اجالا یکسر
یہ نہیں آہ وہ تنویر جدا ہوتی ہے
میری آہیں، میرے نالے ہی تو قاتل ہیں مرے
کون کہتا ہے وہ شمشیر جدا ہوتی ہے
تیری رحمت کی سزاوار نہیں، مانتی ہوں
لیک ہر جرم کی تعزیر جدا ہوتی ہے
کیسے کم بخت یہ قسمت میری پلٹا کھائے
میری تدبیر سے تقدیر جدا ہوتی ہے
جو تیرے در کی گدائی کا مزا لیتے ہیں
اُن کی سنتی ہوں کہ توقیر جدا ہوتی ہے
ناز تھا مجھ کو کہ محبوب ہوں استادوں کی
آج مجھ سے یہی تشہیر جدا ہوتی ہے

اس کے ساتھ ہی امۃ الحفیظ مرزا کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ اب میں آپ کو دوبارہ آپی کے پاس لیے چلتا ہوں جن کے پاس اپنے دور کے جامعہ نصرت کی دلچسپ یادوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ دوبارہ عرض کر رہا ہوں کہ آپی ۱۹۵۶ء میں میٹرک کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں داخل ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں جب وہ ایف اے کا امتحان دے رہی تھیں اچانک بیمار ہوگئیں جس کی وجہ سے ان کا ایک تعلیمی سال ضائع ہوگیا۔ وہ ۱۹۵۹ء میں دوبارہ تھرڈ ایئر میں داخل ہوئیں اور ۱۹۶۱ء میں بی اے کر کے وہاں سے نکلیں۔ اس عرصے میں انہیں مسز شاہ اور سعیدہ حبیب سے انگریزی، مس نعیمہ سے تاریخ، مس منظور سے عربی، عثمان صدیقی سے اسلامیات، عطاء الرحمٰن طالب اور مرزا رشید احمد چغتائی سے دینیات اور میجر محمد اسماعیل سے فارسی پڑھنے کا موقع ملا۔

وہ کہتی ہیں: اُس زمانے کے ربوہ کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ تمام لوگ ایک دوسرے کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اساتذہ کرام کو پتا ہوتا تھا کہ ان کی شاگرد کا تعلق کس خاندان سے ہے اور اس کی خدماتِ سلسلہ کیا ہیں لہٰذا اساتذہ اپنی شاگردوں سے اپنی بیٹیوں کی طرح برتاؤ کرتے اور ان کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ کالج میں قیام کے دوران آپی کا ان سب اساتذہ سے ذاتی تعلق قائم ہوگیا جو عمر بھر قائم رہا۔ ان اساتذہ نے بھی آپی کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں اپنی بے پایاں محبت سے نوازا۔

کالج میں آپی کی کلاس فیلوز میں سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی صاحبزادی، امۃ الشکور المعروف بی بی شکری؛ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی ہمشیرہ، صاحبزادی امۃ القدوس المعروف بی بی قوسی؛ ادیبہ و شاعرہ، امۃ الباری ناصر مقیم امریکہ؛ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی صاحبزادی، نعیمہ جو بعد میں شیخ محبوب عالم خالد کے صاحبزادے، ناصر خالد سے بیاہی گئیں اور اب وفات پا چکی ہیں؛ کیپٹن ڈاکٹر محمد رمضان کی صاحبزادی، بشریٰ رمضان جو بعد

میں مرزا ناصر بیگ سے بیاہی گئیں اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں اور عبداللطیف لون المعروف لطیف بھٹے والے کی صاحبزادی، امۃ الرشید لطیف حال مقیم انگلستان شامل ہیں۔

آپی نے اپنے زمانے کے بعض دلچسپ واقعات سناتے ہوئے کہا: سیکنڈ ایئر میں ہم اپنی تاریخ کی لیکچرر، مس نعیمہ کی سرکردگی میں تریموں ہیڈ پکنک کے لئے گئے۔ اس مقصد کے لیے سپیشل بس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم پروگرام کے مطابق علی الصبح کالج پہنچ گئے جہاں سے ہماری روانگی ہوئی۔ یوں سمجھ لیں کہ کالج پہنچنے کے بعد کم از کم میرا یہ پہلا تفریحی دورہ تھا لہٰذا مجھے اس میں بہت لطف آیا اور ہم ہنستے کھیلتے، گانے گاتے اور شرارتیں کرتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ ہمارا قیام ریسٹ ہاؤس میں تھا جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور کچھ آرام کیا۔ باقی وقت ہیڈ کی سیر میں گزر گیا اور ہم شام ڈھلے گھر واپس آئے۔ الحمدللہ راستے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور سفر بخیریت گزرا۔ ہاں! سردی بہت تھی لہٰذا امی میری واپسی بلکہ اس کے بعد اگلے دو تین روز تک دعاؤں میں لگی رہیں کہ خدا مجھے سردی کے بداثرات سے محفوظ رکھے۔ یہ اسی کا احسان تھا جس نے مجھے ہر طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھا۔

مجھے یاد ہے اس سفر میں مہر آپا بھی ہمارے ساتھ گئی تھیں۔ واپسی کے سفر سے پہلے جب ہم ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے تھے لڑکیاں مہر آپا سے درخواست کرنے لگیں کہ ایف اے کے امتحان میں ان کی کامیابی کے لیے دعا کی جائے۔ جانے کیوں میں ان سے یہ درخواست نہیں کر سکی۔ امتحان سے کچھ عرصہ پہلے ہم نے زور و شور سے اس کی تیاری شروع کر دی۔ میری بچپن کی سہیلی، اچھی ہمارے گھر آ جاتی اور ہم دونوں مل کر سارا سارا دن پڑھتے رہتے۔ ربوہ کی شدید گرمی میں جدید سہولیات کے بغیر اس قدر محنت مجھے راس نہ آئی چنانچہ جب امتحان شروع ہوا تو میری طبیعت غیر متوقع طور پر اتنی خراب ہوگئی کہ میں ایک پرچہ دے ہی نہ پائی۔ اُن دنوں سپلیمنٹری امتحان کا آج والا رواج نہ تھا اور صرف میڈیکل گراؤنڈز پر ہی کسی مضمون میں سپلیمنٹری حاصل کی جا سکتی تھی جب کہ مجھے مطلوبہ میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں بعض دشواریاں حائل تھیں لہٰذا میں نے کچھ سوچ بچار کے بعد دوبارہ امتحان دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں میرا ایک سال ضائع ہوگیا جس دوران مجھے یہ خیال بار بار پریشان کرتا رہا کہ اگر باقی لڑکیوں کی طرح میں نے بھی مہر آپا سے دعا کے لیے درخواست کر دی ہوتی تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی اور میرا قیمتی وقت یوں ضائع نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

میرا ایک تعلیمی سال ضائع تو ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت احسن رنگ میں میرا یہ نقصان پورا کر دیا اور وہ یوں کہ اگلے سال پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دینے کے باوجود میں لاہور بورڈ میں لڑکیوں میں اول رہی اور قومی قابلیت کے تمغہ کی حقدار قرار پائی۔ اپنی اس کامیابی پر میں کئی دنوں تک اپنے حلقۂ احباب سے مبارکبادیں وصول کرتی رہی البتہ چھوٹی آپا اور مسز شاہ نے بہت دفعہ اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کاش میں نے یہی امتحان جامعہ نصرت کی ریگولر سٹوڈنٹ کے طور پر دیا ہوتا تو کالج کی نیک نامی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

بفضلہٖ تعالیٰ میں کالج کے زمانے میں اکثر امتحانات میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتی تھی چنانچہ تقسیم انعامات کی ہر تقریب میں مجھے انعامات ملا کرتے تھے۔ یہ انعامات بالعموم کتابوں کی شکل میں ہوتے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں کئی سال تک میرے پاس محفوظ رہیں البتہ کینیڈا نقل مکانی کے وقت مجھے بڑے بوجھل دل کے ساتھ اس قیمتی اثاثے سے محروم ہونا پڑا۔ ان میں سے ہر کتاب پر مسز شاہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ نوٹ موجود تھا کہ یہ کتاب مجھے کس مضمون میں کونسی پوزیشن حاصل کرنے پر بطور انعام دی جا رہی ہے۔ آج ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی مجھے ان میں سے دو کتابوں کے نام یاد رہ گئے ہیں یعنی ''دعوت الامیر'' اور ''اسلام میں اختلافات کا آغاز''۔

یوں ہی مجھے یاد آ گیا ہے کہ ۱۹۵۷ء کا جلسہ تقسیم انعامات تھا۔ میں فرسٹ ایئر کے سالانہ امتحان میں تقریباً تمام مضامین میں اوّل رہی تھی لہٰذا مجھے پانچ یا چھ انعامات ملنا تھے۔ اس موقع پر کالج کی طرف سے انعام یافتہ لڑکیوں کو اپنی مائیں ہمراہ لانے کی اجازت دی گئی تھی۔ میں نے امی اور ماسی جی کو بتایا تو وہ دونوں تیار ہو گئیں۔ میری کالج لائف میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب آپ دونوں میرے ہمراہ کالج گئیں۔

اس موقع پر غالباً ہوم اکنامکس کالج، لاہور کی پرنسپل (نام مجھے بھول رہا ہے) مہمانِ خصوصی تھیں۔ جب مجھے پانچ چھ بار سٹیج پر بلایا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''بیٹا! جتنا تم پڑھائی کا فکر کرتی ہو، اتنا ہی فکر اپنی صحت کا بھی کیا کرو''۔ انہوں نے غالباً میرے چہرے مہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میری صحت بہت عمدہ نہیں ہے۔

ایک ایسی ہی تقریب میں باجی قدیر کو کالج کی بہترین شاعرہ کے طور پر انعام دیا گیا۔ مہمانِ خصوصی نے انعام دیتے ہوئے ان سے فرمائش کی کہ وہ موقع کے مطابق کوئی فی البدیہہ شعر کہیں چنانچہ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے ایک شعر پڑھ دیا جو مجھے اتفاقاً یاد رہ گیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہم تو سمجھے تھے ہمارا قدرداں کوئی نہیں
دینے والے خوب دیں شعروں کی داد

حاضرین یہ شعر سن کر پھڑک اٹھے۔

کالج میں ایک مشاعرہ تھا۔ حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم اور خاندانِ حضرت مسیح موعود کی بعض دیگر خواتین بھی آئی ہوئی تھیں۔ طرح مصرع تھا:

اُکتا چکے ہیں لذّتِ زخمِ جگر سے ہم

اس مشاعرے میں بہت سی باقی شاعرات کے علاوہ باجی قدیر نے بھی اپنی ایک غزل پیش کی جس کا صرف ایک ہی شعر حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے:

تجھ کو سلام، تیری محبت کو بھی سلام
وہ تیرا راستہ ہے، اِدھر جا رہے ہیں ہم

کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں طالبات مختلف لیکچررز کے خاکے پیش کر رہی تھیں۔ ایسے مواقع پر مسز شاہ بھی ان کی زد سے نہ محفوظ رہتیں چنانچہ قوالی کے رنگ میں ایک نظم پیش کی گئی جس کا ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے:

ہم تو سمجھے تھے کہ کالج اپنا ہے
جس کے ہاتھ میں ڈنڈا کالج اُس کا ہے

یاد رہے کہ مسز شاہ ایک زبردست منتظمہ تھیں اور اس شعر میں ان کی اسی صلاحیت کی طرف اشارہ تھا۔

جامعہ نصرت کے ہوسٹل کی اپنی ہی دنیا تھی۔ اگرچہ میں ڈے سکالر تھی لیکن ہوسٹل میں مقیم طالبات اور بعض لیکچررز کے ساتھ میری گاڑھی چھنتی تھی چنانچہ میں کالج ٹائم کے بعد اکثر ہوسٹل چلی جاتی تھی۔ بعض اوقات چھٹی کے روز بھی وہاں چلی جاتی اور خوش گپیوں کے بعد واپس آتی۔ ہوسٹل کی طالبات نے وقت گزاری کے لیے اپنے اپنے طریقہ اپنا رکھے تھے جن میں سے ایک گڈے گڈی کی شادی بھی تھی۔ اس طرح کی تقریبات وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ایک بار مس نعیمہ کے گڈے اور ہوسٹل کی کسی لڑکی کی گڑیا کی شادی ہوئی۔ اس روز ہوسٹل میں قابلِ دید چہل پہل تھی، کمروں اور کاریڈارز کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا، تمام لڑکیوں نے حسبِ حالات زرق برق لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور کھانے کا بھی خاص اہتمام تھا۔ اس موقع پر لڑکیوں نے ایک دائرے میں بیٹھ کر ایک خود ساختہ گیت بھی گایا جس کے دو شعر تھے:

کاش کہ ہم بھی گڈے ہوتے
مس نعیمہ کے مُنڈے ہوتے
آج ہماری شادی ہوتی
ہم بھی دُلہنیا گھر لے جاتے

اس گانے میں پیش پیش جہلم کی ایک غیر از جماعت طالبہ، بشریٰ تھیں اور ممکن ہے یہ اشعار بھی ان ہی کے ہوں۔

مس چوہدری جن کا نام صفیہ تھا کالج میں اردو پڑھاتی تھیں۔ ان کا تعلق مظفر گڑھ سے تھا۔ ان کے والدِ بزرگوار، چوہدری نور احمد اباجی کے جاننے والوں میں سے تھے۔ ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر وہ اباجی سے ملے اور ذکر کیا کہ ان کی بیٹی کا جامعہ نصرت میں اردو کی لیکچرر کے طور پر تقرر ہوا ہے۔ اباجی نے گھر آ کر اس ملاقات کا ذکر امی سے کیا تو انہوں نے بتایا کہ چوہدری نور احمد ان کے والدِ گرامی (یعنی میرے نانا) کے بھی واقف کاروں میں سے تھے اور زمانۂ قادیان میں جلسہ سالانہ کے موقع پر ان ہی کی بیٹھک میں ٹھہرا کرتے تھے۔

یہ ذکر بھی کرتی چلوں کہ موصوفہ ان لوگوں میں سے تھیں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی اردو تھا۔ وہ شعر و ادب کی دلدادہ تھیں اور ان کی گفتگو مشاہیر کے اشعار سے مرصّع ہوتی تھی۔ کالج میں کوئی تقریب ہوتی تو سٹیج سیکرٹری کے فرائض وہی سرانجام دیتیں اور سالانہ کھیلوں کے موقع پر وہی رننگ کمنٹری کرتیں۔ وہ موسم کی رنگینی پر بالعموم کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتیں۔ اسی طرح جب کوئی مقابلہ ختم ہوتا تو کبھی وہ جیتنے والی لڑکیوں کی خوشی اور کبھی ہار جانے والی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے باموقع اشعار پڑھ کر نہ صرف ان کے لیے تقویت کا باعث بنتیں بلکہ سننے والے بھی ان کی اس خداداد صلاحیت سے خوب محظوظ ہوتے۔ ایک موقع پر جب کسی مقابلہ میں جیتنے والی

لڑکیاں باہم بغل گیر ہو رہی تھیں انہوں نے عدم کا یہ مشہور شعر پڑھا تھا:

گلے ملتے ہیں دو بچھڑے ہوئے ساتھی جب آپس میں
عدم ہم بے سہاروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے

ایک بار انہوں نے ہارنے والی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میر کا یہ شعر پڑھا:

شکست و فتح مقدر سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ایسے ہی کسی موقع پر ان کا پڑھا ہوا اکبرالہ آبادی کا یہ شعر بھی مجھے اب تک یاد ہے:

زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

ہم تھرڈ ایئر میں تھے اور ہم نے کالج چھوڑ کر جانے والی فورتھ ایئر کو الوداعی پارٹی دے رکھی تھی۔ اس موقع پر اور بھی بہت کچھ ہوا لیکن زرینہ نامی ایک لڑکی نے جو انتہائی خوش گلو تھی اور جو بعد میں کینیڈا منتقل ہو گئی تھی اس موقع پر ترنّم سے ایک نظم پڑھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نظم کسی معروف شاعر کی ہے یا زرینہ کی اپنی لیکن یہ نظم مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے اپنی کاپی میں نوٹ کر لیا اور بعد میں لمبا عرصہ اسے گنگناتی رہی حتّٰی کہ مجھے یہ نظم پوری کی پوری یاد ہو گئی۔ اب اس بات پر مدتیں گزر چکی ہیں لہٰذا اس کا کوئی مصرع اوپر نیچے ہو گیا ہو تو ازراہِ مہربانی اس فروگذاشت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اشعار تھے:

اے دوست تری فرمائش ہے اک تحفۂ الفت دوں تجھ کو
میں سوچ رہی ہوں رہ رہ کر کیا نذرِ محبت دوں تجھ کو
جی میں آتا ہے میں تجھ کو رنگین بہاریں دے ڈالوں
پھولوں کی مہک، کلیوں کی چٹک، بھونروں کا ترنّم دے ڈالوں
دریا کی روانی دے ڈالوں، موجوں کا تلاطم دے ڈالوں
لیکن یہ حسیں سوغاتیں بھی تیرے شایانِ شان نہیں
(یہ مصرع بھول گیا ہے)
وہ چیز کہ بزمِ عالم میں ہے رونقِ محفل دیتی ہوں
اے جانِ تمنا میں تجھ کو ارمان بھرا دل دیتی ہوں

زرینہ کی آواز اور انداز کو حاضرین میں سے ہر ایک نے سراہا۔

اگرچہ ہمارے زمانے میں جامعہ نصرت میں بھی سالانہ بین الکلیاتی مباحثوں کا رواج چل نکلا تھا لیکن ان میں بہت کم کالجوں کی ٹیمیں شرکت کرتیں۔ ان مباحثات کا معیار بھی وہ نہ ہوتا جو کسی پرانے تعلیمی ادارے کا ہو سکتا ہے۔ اندریں حالات طالبات سارا سال تعلیم الاسلام کالج کے بین الکلیاتی مباحثوں کا انتظار کرتیں جس میں کئی

معروف کالجوں کے نامور ڈیبیٹرز حصہ لیتے تھے۔ ان کی تقریریں اپنے نفسِ مضمون کے علاوہ اپنے انداز میں بھی ایک انفرادیت لئے ہوتی تھیں۔ ہوسٹل کی لڑکیاں تو اپنی سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں جا کر یہ مباحثات سنتیں اور باقی لڑکیاں اپنے اپنے سرپرستوں کی رضامندی سے اپنے انتظام کے تحت حاضرین میں جا شامل ہوتیں۔ مجھے یاد ہے خواتین کے بیٹھنے کا انتظام گیلری میں ہوتا تھا جب کہ ہال لڑکوں یا مردوں کے لیے مختص ہوتا۔ یہ مباحثات رات گئے تک جاری رہتے اور بعد میں کئی دن جامعہ نصرت میں بھی موضوعِ بحث بنے رہتے۔

ان مباحثات کے ساتھ ہی (یعنی اگلے روز یا شاید ایک دن پہلے) لڑکوں کے کالج کا سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا۔ اُس دور میں تعصب ذرا کم تھا اور پنجاب کے علمی و ادبی حلقوں میں تعلیم الاسلام کالج کی اپنی شناخت اور اس کے پرنسپل، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی اپنی پہچان تھی لہٰذا اس میں کئی معروف شعراء شریک ہوتے اور اپنے اپنے کلامِ بلاغت اثر سے حاضرین کو مستفیض کرتے۔ اس زمانے میں علم و ادب میں دلچسپی کے حوالے سے تعلیم الاسلام کالج کے جن طالب علموں کے نام کا ڈنکا بجا کرتا تھا ان میں پرویز پروازی اور لطف الرحمٰن محمود شامل تھے۔ پرویز پروازی کی ذات تو کسی تعارف کی محتاج نہیں البتہ یہ ذکر شاید ضروری ہو کہ لطف الرحمٰن محمود کالج کے وائس پرنسپل، پروفیسر عطاء الرحمٰن کے صاحبزادے ہیں۔ بعد میں ان مباحثوں اور مشاعروں کی رُوداد المنار میں شائع ہوتی تو یہ رسالہ جامعہ نصرت میں بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا۔

میں اشارۃً ذکر کر چکی ہوں کہ میں اپنے پسندیدہ اشعار نوٹ کر لیا کرتی تھی اور پھر انہیں گنگناتی رہتی جس کی وجہ سے یہ شعر مجھے یاد ہو جاتے۔ اب ڈھلتی عمر کے زیرِ اثر اکثر شعر بھول گئے ہیں لیکن ایسے ہی کسی مشاعرہ میں پڑھے گئے یہ دو شعر جو معلوم نہیں کس کے ہیں ابھی تک یاد ہیں:

یاد آتے ہو یاد کرتے ہیں
ورنہ میں اور تم سا ہرجائی!

....

تمنا کی تخلیق سے ڈر رہا ہوں
کہ پامال کر دے نہ ظالم زمانہ

ایک شعر کا صرف ایک مصرع ہی یاد رہ گیا ہے:

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں

کہنے کو تو یہ چند لفظوں پر مشتمل کسی شعر کا ایک حصہ ہے لیکن اس میں شاعر نے انسان کی دلی کیفیت کی کیا خوب عکاسی کر دی ہے۔ آخر وہ کون سا شخص ہو گا جس کی کسی آرزو کا کبھی خون نہ ہوا ہو؟

آپی بتاتی ہیں: باجی رقیہ جو ہماری تایازاد بہن ہیں عمر میں مجھ سے بڑی اور کالج میں مجھ سے کم از کم پانچ سال سینئر تھیں۔ ان کی شادی مجاہدِ سپین، کرم الٰہی ظفر سے ہوئی تھی۔ باجی رقیہ اس وقت تھرڈ ایئر کی طالبہ تھیں جب کہ کرم الٰہی ظفر عمر میں ان سے کافی بڑے اور جسیم تھے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس شادی کو اس جوڑے کے لیے بے شمار

برکات کا باعث بنایا مگر اس وقت بعض لوگ اسے بے جوڑ قرار دیتے تھے۔ مجھے اپنی سینئرز سے معلوم ہوا کہ اس موقع پر ان کی ہم جماعتوں نے ان کے لیے ایک الوداعی پارٹی منعقد کی جس میں اس شادی کے حوالے سے بعض نظمیں پڑھی گئیں۔ ان نظموں میں سے سینہ بہ سینہ مجھ تک صرف ایک ہی شعر پہنچا ہے:

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا
رقیہ کو ...... اُڑا لے گیا

وہ مزید بتاتی ہیں: رشید چغتائی ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ بہت اچھے اور قابل استاد تھے لیکن لڑکیاں تو آخر لڑکیاں تھیں۔ اپنی غیر موجودگی پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی اور سے ملتی جلتی آواز میں اپنی حاضری لگوالینا یا حاضری لگوانے کے بعد کلاس سے کھسک جانا، مقررہ ٹیکسٹ بکس لے کر نہ آنا، موقع بموقع فقرے کسنا یا انہیں تنگ کرنے کا کوئی اور طریقہ ڈھونڈ لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایک بار لڑکیوں نے انہیں اتنا زِچ کیا کہ وہ اپنا لیکچر اُدھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ان کی ناراضگی عارضی ہے اور وہ کچھ دیر بعد واپس آجائیں گے چنانچہ وہ جوں ہی کلاس سے باہر نکلے میں نے چاک سے بلیک بورڈ پر یہ شعر لکھ دیا:

محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں
شاید مجھے نکال کر پچھتا رہی ہوں آپ

ہمارے اندازے کے عین مطابق رشید چغتائی کچھ دیر کے بعد کلاس میں واپس آگئے لیکن یہ شعر پڑھا تو سیخ پا ہوئے اور اس روز دوبارہ واپس نہ آنے کے لیے کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔

آپی اس موضوع پر اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے اکثر کہا کرتی ہیں کہ کالج کا یہ چار سالہ دور پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اب یہ سب باتیں خواب وخیال ہو چکی ہیں۔ اپنی وہ ہمجولیاں جن کے بغیر ایک پل گزارنا بھی مشکل لگتا تھا مدتوں سے نظر سے اوجھل ہیں۔ معلوم نہیں کہاں ہیں اور ہیں بھی یا نہیں۔ اب کچھ بھی باقی نہیں بچا لیکن کالج میں گزرا ہوا ہر پل ہر دم یاد رہتا ہے۔ اب جامعہ نصرت سے بہت دور کینیڈا میں مقیم ہوں اور صحت دو قدم چلنے کی بھی اجازت نہیں دیتی لیکن یہ کالج اب بھی میرے دل ودماغ پر حاوی ہے۔ خدا اسے آباد رکھے اور ہمیں وہ دن بھی جلد دیکھنا نصیب ہو جب اس کا انتظام وانصرام دوبارہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جنہوں نے اسے بڑی امنگوں اور ارمانوں کے ساتھ قائم کیا تھا۔

اب کچھ باتیں آپی ہی کی ایک کلاس فیلو، امۃ الباری ناصر کے حوالے سے جو کالج میں تدریس کے دوران ''مس امۃ الباری'' کے نام سے اور شادی کے بعد ''امۃ الباری ناصر'' کے نام سے معروف ہوئیں۔ موصوفہ کئی سال تک جامعہ نصرت میں اردو کی لیکچرر رہی ہیں۔ انہوں نے جامعہ نصرت میں گزرے ہوئے اپنے وقت کے کچھ حالات امریکہ سے شائع ہونے والے مجلّہ ''النور'' میں ''جامعہ نصرت برائے خواتین ربوہ: شیریں ثمرات، تحدیثِ نعمت'' کے زیرِ عنوان لکھے ہیں اور اپنے علاوہ اپنی تمام بہنوں اور تعلیمی میدان میں ان کی ترقیات اور لجنہ کے لیے ان کی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ جو اُن کے اپنے حالات پر مشتمل ہے ذیل

میں نقل کیا جارہا ہے:

''۱۹۵۶ء میں گہوارۂ علم جامعہ نصرت میں داخل ہوئی۔ جامعہ اپنا دوسرا گھر لگتا تھا۔ بہنوں سے ذکر سن سن کر اس جنت کی ہر نعمت سے آشنائی تھی۔ باجی کی کلاس فیلوز اب کالج میں لیکچرر تھیں۔ باجی قدیر کی نظم ''ڈی'' اور مرد پروفیسر صاحب کے اردو اشعار کی تشریح میں م ح ب ت کہنے جیسے خوشگوار جھونکوں والے پُر بہار ماحول کا حصہ بن گئی۔ کالج میں مضامین سائیکالوجی، اردو اور عربی رکھے۔ انگلش لازمی تھی۔ ایف اے کے امتحان کے لیے فارم بھر کے بھیجے تو یہ اعتراض آیا کہ مضامین درست نہیں رکھے گئے، بیک وقت دو زبانیں نہیں رکھی جاسکتیں۔ فوراً عربی کی جگہ اسلامک سٹڈیز بھر کے بھیجا۔ دو سال کی پڑھائی جلدی جلدی کر کے امتحان دیا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اچھے نمبر آگئے۔

انگلش مکرمہ سعیدہ حبیب صاحبہ اور مکرمہ مسز شاہ صاحبہ نے کمال محبت اور محنت سے پڑھائی۔ مکرمہ صفیہ چودھری صاحبہ نے اردو پڑھانے کا حق ادا کردیا۔ سائیکالوجی مکرم عبدالسّلام اختر صاحب اور مکرمہ نصیرہ شاہ نواز صاحبہ سے پڑھی۔...... یہ ان سب کی مہربانیاں ہیں کہ خاکسار اپنے مضامین میں اکثر پہلی پوزیشنز لیتی رہی اگرچہ پڑھائی اور امتحان کی تیاری میری ترجیحات میں دوسرے نمبر پر ہوتی تھی، غیر نصابی سرگرمیاں زیادہ پُرکشش تھیں۔ ہر بزم کی تقریبات، مباحثوں اور مشاعروں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی۔ مزاحیہ نظموں کی فرمائش پر قلم بے قابو ہوکر رواں ہو جاتا۔ دماغ جیسے کوئی کارگہِ شرارت تھا جس میں نت نئے منصوبے ڈھلتے۔ سولہویں سال سے انیسویں سال تک کی شرارتوں کا حال لکھا نہیں جاسکتا۔

اسمبلی میں مسز شاہ صاحبہ ہماری تعلیم وتربیت کے خیال سے بہت خوبصورت انداز میں نصائح کرتیں۔ غلطیوں پر سرزنش بھی ہوتی تھی۔ آپ کی سب سے بڑی ڈانٹ یہ ہوتی تھی کہ تمہیں پتا ہے تمہارا تعلق کس خاندان سے ہے، اپنے خاندان کے وقار کا خیال رکھا کرو۔ بے جا سختی نہیں ہوتی تھی۔ محبت پیار کا مثالی ماحول تھا، ہر صلاحیت نکھارنے کا سامان موجود تھا۔ خاکسار قریباً ہر پروگرام میں حصہ لیتی تھی۔ ایک دفعہ ایک مینا بازار میں ثقافتی شو ترتیب دیا گیا جس میں پاکستان کے ہر صوبے کی ثقافت کے منفرد رنگ دکھائے گئے تھے۔ سالانہ کھیلوں کا دن بھی بہت مزے کا ہوتا تھا۔ مہمانانِ خصوصی ہمارے نظم وضبط سے بہت متاثر ہوکر جاتے۔ مسز شاہ نے ایسے انداز میں تربیت کی تھی کہ اشارے پر چلنا ہماری عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔......

ہماری لائبریری کا معیار بہت اچھا تھا۔ اس میں ہر موضوع پر معیاری کتب، رسائل اور اخبار موجود ہوتے تھے۔ مکرمہ سعیدہ احسن صاحبہ بہت پُرخلوص، محبت کرنے والی لائبریرین تھیں۔ سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب کی خاص تیاری اور اہتمام ہوتا۔ مجھے بہت سے انعامات ملتے جو زیادہ تر شعر وادب کے موضوع پر کتب ہوتیں۔ کالج کی ایک قیمتی یاد پوری کلاس کا کچھ عرصے تک صبح کے وقت قصرِ خلافت جا کر حضرت مصلح موعود کا درسِ قرآن سننے کی سعادت حاصل کرنا بھی ہے۔ اسی طرح پوری کلاس رمضان المبارک کے درس القرآن سے استفادے کے لیے بیت مبارک جاتی۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات تھی جس کی قدر اب زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

کالج کا ماحول بہت سادہ اور تکلفات سے پاک تھا۔ سفید یونیفارم لازمی تھا۔

بی اے پاس کرلیا تو آگے پڑھنے کے شوق نے بے چین کردیا۔ اس میں دو مشکلات تھیں: اوّل یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم تھی۔ دوم فیس اور ہوسٹل کا خرچ وہ بھی دو سال تک اپنی پہنچ سے باہر تھا مگر دل تھا کہ کھیلنے کو چاند مانگ رہا تھا۔ ابا جان ہمارے نتائج اور اساتذہ کی اچھی رپورٹوں سے خوش تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے بلکہ فرماتے تھے کہ بچیوں کو جہیز جائیداد تو نہیں دے سکتا تعلیم کے زیور سے کیوں محروم رکھوں مگر یہ بہت بڑی چھلانگ تھی۔ اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی مدد کے لیے بہت عاجزانہ دعائیں کرتی رہی۔ نتیجہ آیا تو اردو میں یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن تھی جس کا مطلب تھا وظیفہ ملے گا۔ کچھ آسرا ہوا کہ خرچ کی دِقّت نہیں ہوگی۔ ابا جان کو اپنے شوق اور خرچ کی سہولت کا ذکر کر کے اجازت کے لیے خط لکھا۔ ایک ایک لمحہ جواب کا انتظار کرتے کرتے وہ دن آگیا کہ اجازت کا خط نہ آیا اور داخلے کا وقت نکل گیا۔ مایوس ہو کر بے حد مشکل سے صبر کر کے پرنسپل صاحبہ کی کالج میں کلرک بننے کی پیش کش قبول کرلی۔ بوجھل دل سے آفس میں بیٹھی تھی کہ چھوٹی آپا کا فون آیا۔ میری آواز پہچان کر فرمایا: تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میری رُوداد سن کر اگلے دن اپنے پاس بلایا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے اور دعا کرنے کی تلقین کے ساتھ ازراہِ کرم کچھ رقم ازخود بطور قرضہ حسنہ عنایت کی۔ آپ نے یقیناً دعا بھی کی ہوگی۔ اللہ کا کرم دیکھئے کہ میں اجازت کے خط کے لیے رو رہی تھی کہ اچانک ابا جان خود آگئے۔ میرے آنسو پونچھے اور فرمایا بیٹی آپ کا داخلہ ہوگا۔ میں اس زیور سے آپ کو محروم نہیں رکھوں گا۔ اگلے دن باپ بیٹی ایک ساتھ لاہور گئے۔ بحمد اللہ بنتِ درویش پنجاب یونیورسٹی پہنچ گئی۔ پرنسپل صاحب نے رزلٹ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور پرانی تاریخ ڈال کر داخلہ دے دیا جس سے لیٹ فیس سے بھی بچ گئے۔ اورینٹل کالج میں حمد و شکر کرتے ہوئے دل لگا کر پڑھا۔ ہوسٹل میں رہائش تھی۔ لاہور کی ہر لائبریری کے اردو ادب حصے کی شاید ہی کوئی کتاب پڑھنے سے رہ گئی ہو۔ ایک سال گزرا تو جماعت کا وظیفہ جاری رکھنے کے لیے تعلیمی رپورٹ کی ضرورت تھی۔ پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب کی تحریر پر پرنسپل مکرم ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب نے دستخط کئے جس میں خاکسار کے لیے بہت تعریفی کلمات تھے۔ وظیفہ ملتا رہا۔ ایک امتحان حضرت مرزا بشیر احمد نے بھی لیا۔ ایک دن آپ سے ملنے گئی تو آپ نے دریافت فرمایا: اردو تنقید کی کون سی کتاب میں حضرت اقدس مسیح موعود کا ذکر ہے؟ مجھے جواب دینے میں ایک سیکنڈ بھی نہ لگا۔ شیخ محمد اکرام صاحب کی موجِ کوثر میں۔ اس وقت صفحہ نمبر بھی یاد تھا۔ آپ نے خوشنودی کا اظہار فرمایا۔

دوسرے سال جامعہ نصرت کے سالانہ تقریری مقابلوں اور مشاعرے میں حصہ لینے کے لیے یونیورسٹی کی طالبات کی ٹیم اپنے جامعہ میں لے کر آئی۔ ربوہ کی سیر بھی کرائی۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ پردے کی پابندی کے ساتھ نیک نامی سے تعلیم مکمل کی۔......

نتیجہ آیا تو چھوٹی آپا کو جو اُس وقت جابہ سرگودھا میں مقیم تھیں خط لکھا۔ آپ نے ازراہِ شفقت جواب لکھا کہ چھٹیاں ختم ہوں تو کالج میں سروس شروع کردینا۔ اس آسانی سے جاب مل جانا بھی جماعت کی برکت سے

تھا۔ ۱۹۶۲ء میں اپنے پیارے جامعہ کے سٹاف میں شامل ہو کر اپنی اساتذہ کی کولیگ بن گئی۔ وہی اپنا پیارا کالج تھا۔ وسیع صحن کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری کا اضافہ ہوا تھا۔ مادرِ علمی سے وابستگی کا یہ دور بھی بہت حسین تھا۔ اردو پڑھانا نہایت آسان جاب تھا۔ اس دور میں کالج کا پہلا مجلّہ ''النصرت'' نکالنے کی توفیق ملی جس کے لیے خاص طور پر چھوٹی آپا اور حضرت مرزا بشیر احمد سے پیغام حاصل کیا۔ پہلی دفعہ میگزین کے لیے اداریہ لکھا۔ جامعہ سے تحریر کے میدان میں یہ ابتدا ساری عمر کے تحریری کام کا پیش خیمہ تھی۔ اس دور میں شاندار مشاعرے کروائے۔ خاندانِ حضرت اقدس مسیح موعود کی خواتینِ مبارکہ بھی رونق افروز ہوتیں بلکہ اپنے پُرمعارف کلام سے محفل کو چار چاند لگا دیتیں۔ فرشی نشست، شمعوں کی دھیمی روشنی، دلفریب سماں ہوتا جو ہمیشہ میرے ساتھ ایک خوشگوار یاد بن کے رہتا ہے۔ جامعہ کے مباحثے بھی بہت جاندار ہوتے۔ تفریح اور تعلیم کی صحت مند سرگرمیوں کی روایات قائم کی جا رہی تھیں۔ ایک دفعہ لاہور سے لائبریری کے لیے کتب خریدنے کا کام سونپا گیا۔''

۱۹۶۳ء کے آخر میں مس امۃ الباری کی شادی ہوگئی۔ ان کے شوہر ناصر احمد قریشی بسلسلہ ملازمت کراچی میں مقیم تھے لہٰذا اُن کے لیے سروس جاری رکھنا مشکل ہوگیا چنانچہ وہ ۱۹۶۵ء کے آخر میں مستعفی ہوگئیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ''لیکچررشپ کا عرصہ مختصر رہا مگر جامعہ کی محبت لاانتہا ہے۔ خاص طور پر مسز شاہ تو ہمیں ماں کی طرح عزیز تھیں۔

مجھے قلبی محبت جامعہ نصرت سے اب بھی ہے
ذرا سا دُور رہنے سے تعلق کم نہیں ہوتا''

امۃ الباری ناصر آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے وہ ایک اچھی شاعرہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تصنیف و تالیف کا ملکہ بھی عطا فرمایا ہے۔ اب تک ان کی کچھ تصنیفات اور کئی مضامین منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے جامعہ نصرت میں گزرے ہوئے وقت کی کچھ دلچسپ یادیں لکھ کر ارسال فرمائیں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے اپنی گوناں گوں علمی مصروفیات میں سے اس کام کے لیے وقت نکالا اور مجھے ایک شگفتہ تحریر لکھ کر بھیجی جس میں طالبات کی ''شرارتوں'' اور ''شوخیوں'' کا بھی کچھ ذکر ہے۔ یہ تحریر اس امید کے ساتھ پیش خدمت کی جا رہی ہے کہ اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ موصوفہ لکھتی ہیں:

''کالج میں پڑھنے کی عمر ہی ایسی دیوانی اور بلاخیز ہوتی ہے کہ کچھ نیا انوکھا کرنے کے لیے سوچنا نہیں پڑتا، خود بخود ہنسنے ہنسانے کے مواقع مل جاتے ہیں، بے ساختہ شوخی، شرارت اور تفریح سوجھتی ہے۔ ہمارے کالج کا ماحول بہت دوستانہ اور بے تکلّفانہ تھا جیسے ایک بڑا سا خاندان ہو جس میں سب ہنسی خوشی رہتے ہوں۔ ہم پہروں ہنستے اور دل کھول کر شرارتیں کرتے۔ اچھی شرارتوں پر ڈانٹ نہیں پڑتی تھی۔ جامعہ میں درس و تدریس کے سارے زمانے میں ہم مذاق سہیلیاں ملتی رہیں جن کی محبت میں گزرا زمانہ زندگی کی سنہری یادوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پھلجھڑیاں چھٹتیں اور ہم لطف اندوز ہوتے۔ خاص طور پر رشیدہ تسنیم

کی بے ساختہ فی البدیہہ فقرے بازیوں سے ہر محفل کشتِ زعفران بنی رہتی۔ اسے اس فن میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے وہ بھی کوئی ہنسنے کی باتیں تھیں مگر اس وقت چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل کھول کر ہنستے تھے۔

ایک لڑکی نے بعض کیمیکلز کے بارے میں کہیں پڑھا کہ ان کو ملادیں تو سخت بدبو پیدا ہوتی ہے۔ صبح کالج کھلنے سے پہلے وہ کھڑکی کے پیچھے ایک بوتل رکھ کر چلی گئی۔ سارا دن پرنسپل صاحبہ اور سٹاف ممبرز نے کالج میں پھیلی بدبو کا سبب تلاش کرنے میں گزارا، صفائیاں کرائی گئیں، اتھل پتھل مچی رہی مگر بدبو نہ گئی۔ اب دیکھیں یہ بھی کوئی شرارت ہے مگر اس وقت بہت مزا آیا تھا۔

امرود کا ایک پیڑ ہماری توجہ کا مرکز رہتا۔ شاید ہی کبھی اس پر کوئی پھل پکا ہوگا۔ ہرے ہرے امرود پکنے کے قریب ہوتے تو اس خیال سے کہ کوئی اور نہ توڑ لے کچے توڑ لئے جاتے اور صرف چاند ماری کے کام آتے۔ کچے امرود توڑنے پر جرمانہ بھی تھا مگر جو امرود توڑتی وہ اپنا نام پتہ لکھ کر نہیں جاتی تھی۔

ایک خاتون مددگار کارکن جسے ''ماسی'' کہا جاتا تھا کالج کا ایک مقبول کردار تھا۔ اس کا کام پرنسپل صاحبہ کی ڈاک متعلقہ شخص تک پہنچانا تھا۔ اس کا چلنے کا انداز عجیب تھا۔ وہ چلتے وقت اپنی چپل سے ایسا بے نیازانہ سلوک کرتی کہ جیسے اسے ساتھ لے کر چلنا گوارا نہ ہو۔ لمبے برآمدے میں ایک طرف سے داخل ہوتی تو چپل کی گھسڑ گھسڑ کی آواز مسلسل یہ اعلان کرتی کہ اس وقت وہ کہاں ہے، کہاں رُکی، پھر کب چلی، کتنی مسافت طے کرلی ہے اور کب واپس چلی گئی۔ ایک دن پردے کے پیچھے ہمارے پروفیسر صاحب نے انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا۔ گھسڑ گھسڑ کی آواز دروازے کے قریب آ کر رکی تو فرمایا: ہاں مائی! کیا بھیجا ہے پرنسپل صاحبہ نے؟ اب پروفیسر صاحب کی ذہانت کی آزمائش ہم پر فرض ہوگئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چپل کو گھسٹا کر چلنا اور دروازے کے پاس آ کر رک جانا مستقل مشغلہ بنالیا لیکن انہوں نے پھر کبھی نہیں پوچھا کہ ماسی کیا لائی ہو۔

پردے کے پیچھے پروفیسر صاحب کو ہمارے کلاس سے کھسکنے کا اندازہ نہ ہوتا۔ ایک دن میچ ہو رہا تھا۔ کسی بھی لڑکی کا کلاس میں بیٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ میں نے ٹک شاپ میں چائے کا معاوضہ طے کر کے اپنی ذمے داری پر سب کو میچ دیکھنے جانے دیا اور بائیس طالبات کی حاضری صرف جگہ اور آواز بدل بدل کر اکیلی نے لگوادی۔ آسانی سے کام بن گیا۔ پروفیسر صاحب کو اندازہ بھی نہ ہوا کہ وہ صرف ایک لڑکی کو پڑھا کر چلے گئے ہیں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ادھر سے ماسی نہ گزری ورنہ شکایت ہوجاتی۔

ہماری پرنسپل صاحبہ نے زندگی کے کچھ سال نیروبی میں گزارے تھے۔ وہ اکثر وہاں کے تجربات کا ذکر کرتیں۔ کئی باتوں میں نیروبی کا حوالہ دیتیں۔ نیروبی میں تو ایسے ہوتا تھا، کبھی فرماتیں نیروبی میں تو ایسے نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے یہ جملہ پکڑ لیا۔ ہماری بے تکلف گفتگو میں کوئی لڑکی بے ساختہ گرہ لگاتی کہ نیروبی میں تو یہی ہوتا تھا تو ساری محفل لوٹ پوٹ ہوجاتی۔

ایک دفعہ تو ہم نے کالج میں چھٹی ہی کرادی۔ ہوا یوں کہ پرنسپل صاحبہ نے اپنے پیڈ پر کوئی نوٹس لکھا اور نوٹس بورڈ پر لگوادیا مگر ان سے غلطی سے پیڈ کے دو صفحے اتر گئے۔ نوٹس بورڈ پر پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ دو کاغذ

ہیں۔ میں نے چپکے سے پیچھے والا کاغذ نکالا۔ اب میرے ہاتھ میں پرنسپل کے لیٹر پیڈ کا کورا کاغذ تھا۔ اس پر اگلے دن کی چھٹی کا اعلان لکھا اور بورڈ پر لگا دیا۔ منٹوں میں مشہور ہوگیا کہ کل چھٹی ہوگی۔ پھر وہ کاغذ غائب کر دیا لیکن چھٹی کا اعلان معمہ بنا رہا اور اچھا ہی ہوا کہ معمہ رہا ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

ہمارے لیے تفریح کا سامان کچھ مہمان خواتین بھی مہیا کرتیں۔ پس منظر یہ ہے کہ جامعہ کی تعلیم و تربیت یافتہ لڑکیاں اچھی بہوئیں ثابت ہو رہی تھیں۔ قابلِ شادی لڑکوں کی مائیں حیلے بہانے سے لڑکیاں دیکھنے آتیں اور اتنی عجیب و غریب باتیں کر جاتیں جو کافی مدت دہرا دہرا کر ہم لطف اندوز ہوتے رہتے۔ جو لڑکی خاص مرکزِ نگاہ ہوتی اس کا تو جینا دوبھر کر دیا جاتا۔ یہاں تفصیل لکھوں تو زندگی بھر ہنستے رہنے کا سامان ہوجائے۔

کالج کی بعض لیکچررز کے تکیہ کلام سے ان کے نام پڑ جاتے اور ہم اصل نام بھول جاتے مثلاً ایک محترمہ کو ''یُوسی'' کہنے کی بہت عادت تھی۔ ہم انہیں ''یُوسی'' کے نام سے ہی پکارنے لگیں۔

سالانہ تقریبات میں مزاحیہ اشعار بنا کر لیکچررز کو ٹائٹل دیئے جاتے، ان کے مخصوص انداز، جملوں اور لباسوں کی نقل کی جاتی جس سے خوب مزا آتا۔ غرضیکہ ہم نے اپنے پیارے کالج میں بہت مزے دار وقت گزارا۔

چھوٹی آپا شعر و سخن کا گہرا ذوق رکھتی تھیں۔ اُن ہی کے کہنے پر پرنسپل صاحبہ نے کالج میں مشاعروں کا آغاز کیا۔ اردو کی لیکچرر صفیہ چودھری کے حسنِ ذوق اور حسنِ انتظام سے مشاعرے خالص روایاتی شان سے ہوتے۔ ابتدا میں کالج کا اپنا ہال نہیں تھا۔ مشاعرے کے لیے پرانے لجنہ ہال کے سٹیج کو سجایا جاتا۔ چاندنیاں بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیئے جاتے۔ سامنے شمع دان، پان دان، اگردان سجائے جاتے۔ جامعہ نصرت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی اور اپنے عارفانہ کلام سے نوازا۔ مجھے جامعہ کے مشاعروں میں صاحبزادی ناصرہ بیگم، مہر آپا اور صاحبزادی امۃ الرشید کا کلام سنانا یاد ہے۔ حضرت اقدس مسیح موعود کے مبارک خاندان کی معزز و محترم شاہزادیوں کی آمد سے مشاعرے کے وقار کو چار چاند لگ جاتے۔ شعر گوئی اور شعر فہمی اس خاندان پر مولا کریم کی خاص عنایت ہے۔ معیاری اشعار پر داد و تحسین سے حوصلہ افزائی کرتیں جس سے مشاعروں میں جان پڑ جاتی۔ اسی ادب پرور ماحول نے امۃ القدیر ارشاد جیسی شگفتہ بیان اور صاحبزادی امۃ القدوس جیسی صاحبِ طرز شاعرات پیدا کیں۔

جامعہ سے درس و تدریس کا سارا زمانہ میں نے اپنے فطری ذوق کی وجہ سے مشاعروں میں گہری دلچسپی لی۔ یہیں سے شعر گھڑنا سیکھا۔ سب اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اپنی دو پیروڈیز یاد آ گئی ہیں۔ شاید آپ کو پسند آئیں۔

میر تقی میر کے یہ تین مشہور اشعار آپ نے ضرور سن رکھے ہوں گے:

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئے آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں، ہم کو عبث بدنام کیا

میں نے ان اشعار کو یوں پیروڈائز کیا:

اُلٹی ہوگئی سب بریانی، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ پیٹ نے آخر کام تمام کیا
رات ڈرامے دیکھ کے کاٹی، پرچے میں لی آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئے آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتی ہیں جو پرنسپل کریں ہم کو عبث بدنام کیا

غالب کی کسی غزل کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

اب ملاحظہ ہو اس کی پیروڈی:

سر ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے پھٹ نہ جائے کیوں
تم کو تو کچھ خبر نہیں، کرتے ہیں ہائے ہائے کیوں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری شاعری صرف پیروڈیز تک محدود تھی۔ سچ پوچھیں تو اس کا بڑا حصہ طنز ومزاح کا تھا۔ مثال کے طور پر:

کھنکتی ہیں کسی کو چوڑیاں میری کلائی کی
مرے ماتھے پہ یہ آوارہ لٹ اچھی نہیں لگتی
مرے کانوں کے آویزے کسی پر کیوں گراں گزریں
اگر اچھی نہیں لگتی تو میں اچھی نہیں لگتی

تحت اللفظ پڑھتی تھی۔ ہر مشاعرہ میں نظمیں پڑھیں بلکہ خدمت خلق بھی کی۔ ہر طرح مصرع پر اشعار کہہ کے حصہ لینے والیوں میں بانٹ دیا کرتی۔ مشاعروں کو معیاری بنانے کے لیے میں نے صفیہ چودھری کی روایات کو آگے بڑھایا۔ اچھی غزلیں منتخب کی جاتیں۔ بار بار نظمیں سن کر پیش کرنے کا انداز سکھایا جاتا۔ کئی دفعہ ریہرسل ہوتی۔ ربوہ کی خواتین جوق در جوق آتیں اور خوب محظوظ ہوتیں۔ یہ پروگرام بہت مقبول ہوتا۔ بہت دن چرچا رہتا۔ داد وتحسین کے پیغام ملتے رہتے۔ ایک مشاعرے کے بعد اگلے کا انتظار شروع ہو جاتا۔ موضوعِ سخن زیادہ تر کالج میں گزرے واقعات، لیکچررز، وارڈن اور ہوسٹل ہوتے۔ پرنسپل صاحبہ پر بھی کہا جاتا۔ وہ برا نہیں مانتی تھیں۔ مشاعروں نے دوسرے کالجوں سے مراسم بڑھانے میں کردار ادا کیا۔ دعوت دینے پر باہر سے ٹیمیں

آنے لگیں جو ہوسٹل میں ٹھہرتیں۔ جیسا کہ میں النور میں چھپنے والے اپنے مضمون میں بھی ذکر کر چکی ہوں میں ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم لے کر ربوہ آئی۔ مقابلوں میں حصہ لینے کے علاوہ مہمان طالبات کو شہر کی سیر کرائی۔ اس سال نظم کے مقابلہ میں پہلا انعام ملا۔ عنوان تھا: محبت

طرحی غزلیں جو بعض مشاعروں میں سنانے کا موقع ملا اب پوری طرح یاد نہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو سنتا ہے ہم اس کو صدا کیوں نہیں دیتے؟
پتھر کے صنم دل سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟
خود آنکھوں سے دیکھیں کہ بھلا کیا ہے، برا کیا
بدخواہوں کو جینے کی دعا کیوں نہیں دیتے؟

مری خواب سی زندگی، کوئی سایہ ہے یا سراب ہے
اسے یاد کرتی ہوں ہر گھڑی جو کبھی بھی میرا ہوا نہیں
مری داستاں ہے اداس سی، کوئی اہلِ دل نہ ملول ہو
بڑی بے مزا سی ہے کیفیت، کوئی غمگسار ملا نہیں
بڑے تیز طنز کے تیر تھے کہیں گہرے دل میں اتر گئے
میں نے ہونٹ سی کے گزار دی، کبھی کوئی شکوہ گلہ نہیں

امۃ الباری ناصر کے علاوہ جامعہ نصرت سے تعلق رکھنے والی ایک اور بہت اچھی شاعرہ صاحبزادی امۃ القدوس ہیں جو حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کی بیٹی، حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی ہمشیرہ اور صاحبزادہ مرزا غلام احمد کی اہلیہ ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ جامعہ نصرت میں تعلیم وتدریس کے دوران مشاعروں میں ان کا کلام بہت پسند کیا جاتا تھا اور اس بات کا مزید ثبوت سلسلے کے اخبارات وجرائد میں شائع ہونے والی ان کی نظمیں ہیں جو جماعت میں ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔

ان کا کلام ''ہے دراز دستِ دعا مرا'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس کا دیباچہ چوہدری محمد علی مضطر نے لکھا ہے۔ جس میں ان کے منتخب کلام کا حوالہ بھی آ گیا ہے۔ موصوف تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں میرے استاد اور محسن ہونے کے علاوہ ایک قادرالکلام شاعر تھے جن کے اشعار کو حضرت خلیفۃ المسیح الرابع اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس، دونوں پسند فرمایا کرتے تھے بلکہ ان کے کلام کی کتابی شکل میں اشاعت تو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی خاص دلچسپی کے نتیجے میں ہی عمل میں آ سکی ہے لہٰذا صاحبزادی امۃ القدوس کے کلام کا ذکر چوہدری محمد علی مضطر کے الفاظ میں ہی اچھا لگے گا جو فرماتے ہیں:

''اگرچہ آپ کا سارا کلام ہی شعری اور جذباتی حسیت کے لحاظ سے ایک اکائی کا حکم رکھتا ہے اور کہیں بھی اس منفرد، پاکیزہ اور ارفع سطح سے نیچے نہیں گرنے پاتا لیکن جگہ جگہ ایسے مقام بھی آتے ہیں جو

ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح سے دور سے الگ نظر آتے ہیں۔ خصوصاً آپ نے ریختے میں جو غزلیں کہی ہیں اپنا جواب آپ ہیں...... چند ایک اشعار کو نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں۔ آگے سارا سمندر پڑا ہے، غوطہ زن ہوں اور موتیوں سے اپنے اپنے دامن بھرلیں۔ فرماتی ہیں:

نہ کُوک کوئلیا کُو کُو کُو تو آگ لگا اس ساون کو
من میرا بیکل بیکل ہے، نیناں ڈھونڈیں من بھاون کو
جب تک بھادوں کی جھڑی رہی میں بیچ جھروکے کھڑی رہی
برکھا بھی جھرجھر برسے ہے مجھ برہن کے کلپاون کو
جا دَوڑ لپٹ جا سینے سے من موہن سامنے بیٹھا ہے
پگلی ہے ساری عمر پڑی گھبراون کو، شرماون کو
ان اُونچے پیڑھے والوں کا اُس وقت تماشا کیا ہوگا
تقدیر کا ڈمرو باجے گا جب تگنی ناچ نچاون کو
سَر بھاری، پنڈا دُکھتا ہے، من پھوڑا، نظریں گھائل ہیں
وہ کول ہاتھ ہی چاہئے ہیں ان زخموں کے سہلاون کو

حضرت امیر خسرو کی زمین میں ایک لمبی کیف آگیں غزل ہے۔ چند شعر سنئے:

خسرو میاں کا قول یہ جی کو مرے خوش آگیا
"تجھ دوستی بسیار ہے اک شب ملو تو آئے کر"
اوروں کا ہر عیب و ہنر ہر دم رہا پیشِ نظر
شیشہ جو دیکھا غور کر نظریں جھکیں شرمائے کر
اس سے ملاقاتاں ہوئیں، نہ دید نہ باتاں ہوئیں
پر کچھ تو ڈھارس ہوگئی اس کی گلی میں جائے کر
کیا ہے رقیباں جو مری راہوں میں کانٹے بو دیئے
میری جزا تو مل گئی اُس یار کا کہلائے کر
چھوٹا سا یہ فتنہ مجھے پل کو بھی دم لینے نہ دے
پہلو سے نکلا جائے ہے زچ آ رہی بہلائے کر

پھر اور بہت سی غزلیں ہیں جو ایسی تازہ کربلاؤں کے پس منظر میں کہی گئی ہیں جہاں جسم مجبور ہیں لیکن دل بدستور آزاد ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

اے تخت نشینو! ہم تو ان ہی آنکھوں کا اشارہ دیکھتے ہیں
خوش فہم نہ ہو کہ چلتے ہیں فرمان تمہارے ربوہ میں

وقت نے کیسے چٹانوں میں دراڑیں ڈال دیں
رو دیا وہ بھی کہ جو پہلے کبھی رویا نہ تھا
پیار کے اک بول نے آنکھوں میں ساون بھر دیئے
اس طرح تو ٹوٹ کے بادل کبھی برسا نہ تھا
جانے کیوں دل سے مرے اس کی کسک جاتی نہیں
بات گو چھوٹی سی تھی اور وار بھی گہرا نہ تھا
موسمِ گل میں تھا جس ٹہنی پہ پھولوں کا حصار
جب خزاں آئی تو اس پہ ایک بھی پتا نہ تھا

روح کے روابط میں اس طرح بھی ہوتا ہے
فرقتیں تو ہوتی ہیں فاصلہ نہیں ہوتا

پھر اپنے رب کے حضور دست بدعا ہیں:

اَب جلد آ کہ سنگِ عداوت کی زد میں ہے
میری ......، میری عبادت، مری نماز

میری آنکھوں میں بند ہے برسات
میرے دل میں الاؤ جلتے ہیں

اور پھر بزعمِ خود خدا بننے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

کوئی نمرود ہو، شدّاد کہ فرعون کوئی
اب بصد جاہ و حشم کوئی کہاں ہے سوچو
اب تو قصّوں میں ہی بس ان کا نشاں ہے سوچو
تم کہ اس دَور کے فرعون بنے بیٹھے ہو
سوچ لو خوب کہ موسیٰ بھی اسی دور میں ہے
آج کے دن تو فقط اتنا ہی کہنا ہے مجھے

بات لمبی ہو رہی ہے۔ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

نظموں تک پہنچتے پہنچتے دیر ہوگئی۔ ایک نظم جو اول تا آخر ایک اکائی ہے اگرچہ لباس غزل کا ہے لیکن اس کا انتخاب ممکن نہیں۔ سترہ شعر ہیں...... اس نظم کا عنوان ہے "خدا کرے"

خدا کرے کہ صحبتِ امام بھی ہمیں ملے
یہ نعمتِ خلافتِ مدام بھی ہمیں ملے
خدا کرے کہ عشقِ مصطفیٰ ہمارے دل میں ہو
رضائے حق کی مسندِ کرام بھی ہمیں ملے

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے چالیس دن کے چلّے کے ثمر پر مثنوی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث اور بزرگ خواتین کی وفات پر منظوم دعائیں ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع سے فرقت کے لمحات کا ذکر ہے۔

آقا ترے بغیر یہ گلشن اداس ہے

سب کا سب ایک ہی رنگ اور تاثیر میں ڈوبا ہوا کلام ہے۔
ایک ترکیب بند مسدّس ہے جس کے نو بند ہیں۔ چند بند سنیئے:

انسانی لغزشوں سے میں ماورا نہیں ہوں
ماحول سے علیحدہ ربّ الوریٰ نہیں ہوں
لیکن میں تجھ سے غافل میرے خدا نہیں ہوں
میں بے عمل ہوں بیشک پر بے وفا نہیں ہوں
نظریں بھٹک رہی ہیں پر دل میں تُو مکیں ہے
"جو صبر کی تھی طاقت وہ مجھ میں اب نہیں ہے"

میں مانتی ہوں میرا خالی ہے آبگینہ
نہ آہِ صبح گاہی، نہ زاریٔ شبینہ
تسلیم کا سلیقہ، نہ پیار کا قرینہ
پر میری جان میرا شق ہو رہا ہے سینہ
اب اس میں تابِ فکر و رنج و محن نہیں ہے
"جو صبر کی تھی طاقت وہ مجھ میں اب نہیں ہے"

پھر سات بند کی ایک دعا ہے جو "زمانے کے مالک" سے کی گئی ہے:

الٰہی دعاؤں کی توفیق دے دے، کہ سجدوں میں یہ گڑگڑانے کے دن ہیں
ہمارے قدم ڈگمگانے نہ پائیں، یہ ایمان کے آزمانے کے دن ہیں
خداوندا بندے خدا بن گئے ہیں، یہی تیری قدرت دکھانے کے دن ہیں
بہت ہو چکی اے زمانے کے مالک، بس اب اپنے لطف و کرم کی نظر کر

جو تُو نے اُتارا تھا اس دین سے اب، جُدا اک نرالا نصاب آ گیا ہے
عمل جو بھی احکام پہ کر رہا ہے، وہی شخص زیرِعتاب آ گیا ہے
ترے نام پر ہو رہی ہیں وہ باتیں، کہ انسانیت کو حجاب آ گیا ہے
بہت ہو چکی اے زمانے کے مالک، بس اب اپنے لطف و کرم کی نظر کر

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی علالت کے سلسلے میں دعائیہ نظم ہے۔ دیگر بزرگوں کی وفات پر دعائیہ نظمیں ہیں۔ اپنے والد گرامی قدر حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد پر دو نظمیں ہیں۔ ایک آزاد نظم ہے "یہ میرا باپ ہے" اور دوسری وفات کے بعد "مرے ابّا"......

پھر ایک طویل نظم ہے جس کا عنوان ہے "گھر"۔ یہ بھی پڑھنے کی چیز ہے۔"

صاحبزادی امۃ القدوس کے بارے میں فی الحال اتنا ہی کچھ۔ اب میں دوبارہ آپ کی ملاقات اپنی منجھلی بہن، صادقہ سے کرا رہا ہوں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں داخل ہوئی تھیں۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ تھرڈ ایئر کی طالبہ تھیں ان کی شادی ہوگئی جس کی وجہ سے انہیں کالج سے کافی وقت رخصت پر رہنا پڑا۔ نتیجتاً ان کی حاضریاں یونیورسٹی کے مقررہ معیار سے کم رہ گئیں چنانچہ انہیں بی اے کا امتحان ریگولر سٹوڈنٹ کی بجائے پرائیویٹ طور پر دینا پڑا تاہم خدا تعالیٰ نے ان پر مہربانی فرمائی اور انہوں نے ۱۹۶۲ء ہی میں یہ امتحان پاس کر لیا۔

صادقہ ایک محنتی طالبہ تھیں جس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۹۶۰ء کے انٹرمیڈیٹ امتحان میں جامعہ نصرت کی ان طالبات میں شامل تھیں جو بورڈ کی طرف سے وظیفہ کی مستحق قرار پائی تھیں۔

وہ کالج میں اپنے اساتذہ کا ذکر بہت محبت سے کیا کرتی تھیں۔ وہ خاص طور پر مسز شاہ، اپنی انگریزی کی استاد مس امینہ مرزا اور تاریخ کی لیکچرر، مس نعیمہ سے بہت متاثر تھیں اور نصف صدی گزرنے کے باوجود اپنی وفات تک انہیں اسی محبت وعقیدت سے یاد کرتی رہیں۔ وہ بتایا کرتی تھیں:

ایک بار مس امینہ مرزا نے کلاس سے کسی لفظ کے سپیلنگ پوچھے تو میرے علاوہ اور کوئی طالبہ نہ بتا سکی۔ وہ اس بات سے بے حد متاثر ہوئیں چنانچہ انہیں جہاں موقع ملتا وہ میری لیاقت کی تعریف کرتیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار مس امینہ مرزا نے مسز شاہ کے سامنے بھی میری بہت تعریف کی تھی۔ وہ مجھے آپی کی چھوٹی بہن ہونے کے ناتے پہچانتی تو پہلے ہی سے تھیں تاہم مس امینہ مرزا کی طرف سے میری تعریف کے بعد وہ میری پہلے سے بھی زیادہ عزت کرنے لگیں۔

اُن دنوں ہر سال بورڈ کی سطح پر اردو اور انگریزی زبان میں کالجوں کے مابین مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ ایک سال کالج کی طرف سے انگریزی مضمون نویسی کے مقابلے کے لیے میں نامزد ہوئی جب کہ اردو مضمون نویسی کے لیے ڈاکٹر عبدالعزیز سندھی کی صاحبزادی، بشرہ اخوند کا انتخاب ہوا۔ مسز شاہ اور مسز امینہ مرزا ہم دونوں کو لے کر لاہور گئیں اور ہم نے ان کے ساتھ تین دن گزارے۔ اُن ہی دنوں لاہور کالج فار ویمن کی

کانووکیشن ہو رہی تھی جس میں مسز شاہ اور مس امینہ مرزا بطور مہمان مدعو تھیں۔ انہوں نے ہمیں بھی اس کانووکیشن میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا۔

صادقہ بتایا کرتی تھیں: میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں اتنے عالیشان فنکشن میں شامل ہوئی تھی۔ اگرچہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد میرے دو سال لاہور میں گزرے تھے مگر وہ میرا بچپن کا زمانہ تھا اس لیے لاہور کو دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس لحاظ سے اس فنکشن میں شمولیت میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ لڑکیوں کی سج دھج اور ان کا میک اَپ میرے لیے یقیناً ایک نئی چیز تھی لیکن جس چیز نے مجھے بے پناہ متعجب کیا وہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط تھا۔ ربوہ کا ماحول بالکل اور قسم کا تھا اور میرا خیال تھا کہ پوری دنیا میں پردے کا اسی طرح التزام ہوگا۔ سچ پوچھیں میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی عورت گھر سے باہر پردے کے بغیر یوں آزادانہ گھوم سکتی ہے لہٰذا میرا فوری ردِعمل حیرت واستعجاب کا تھا جس میں سے میں کئی دن تک باہر نہ نکل سکی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے ہم لوگ انہیں دیکھ کر پانی پانی ہو رہے تھے حالانکہ اپنے اس فعل پر شرمانا انہیں چاہیے تھا۔

میں نے اس مقابلے میں ''ڈائری آف مائی لاسٹ وِیک'' کے موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ میری تو اس مقابلے میں کوئی پوزیشن نہ آسکی البتہ مبشرہ اردو مضمون نویسی کے مقابلے میں اوّل رہیں اور انعام حاصل کیا۔

صادقہ اپنی شادی کے موقع پر لی گئی رخصت کے بعد جب کالج پہنچیں تو مس امینہ مرزا نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ ان کے اعزاز میں اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑی ہو جائیں اور تالیاں بجا کر ان کا استقبال کریں۔ مس امینہ مرزا کے اس ''حکم'' پر تمام لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں اور دیر تک تالیاں بجاتی رہیں۔

تاریخ کی لیکچرر، مس نعیمہ اباجی کے ایک قریبی دوست کی بیٹی اور آپی کی استاد رہی تھیں اور ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتی تھیں۔ صادقہ کہا کرتی تھیں: مس نعیمہ بطور استاد تو اچھی تھیں ہی، انہیں اس رشتے کا بھی بے حد لحاظ تھا اور وہ ہمیشہ میرا بہت خیال رکھتیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے تاریخ کا مضمون زیادہ اچھا لگنے لگا اور اس میں میرے نمبر باقی مضامین سے بہتر آنے لگے۔

موصوفہ بتاتی تھیں: ہم ایف اے میں تھیں جب ہمیں کالج کی طرف سے تریموں ہیڈ لے جایا گیا۔ یہ جگہ ربوہ سے زیادہ دُور نہ تھی اور صبح جا کر شام تک باآسانی واپس گھر پہنچا جا سکتا تھا لہٰذا کالج کی طالبات کے اکثر ٹرپ وہیں جایا کرتے تھے۔ اس سفر میں کھانا ربوہ سے ہی پکوا کر ساتھ لے جایا گیا تھا اور مسز شاہ کے علاوہ مس نعیمہ اور مس امینہ مرزا ہمارے ساتھ تھیں۔ بے پروائی کا زمانہ تھا چنانچہ سفر شروع ہوتے ہی لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا۔ مسز شاہ نے کچھ دیر تو برداشت کیا لیکن پھر لڑکیوں کو سمجھانے لگیں کہ اور کچھ نہیں تو وہ بس ڈرائیور اور کنڈکٹر ہی کا لحاظ کریں جو اِن کے بارے میں نہ جانے کیا رائے قائم کر رہے ہوں گے تاہم لڑکیاں ان کی بات کہاں سننے والی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوتیں لیکن جلد ہی پھر گانا شروع کر دیتیں۔

اُن دنوں اہلِ ربوہ کے حالات بس ایسے ہی تھے۔ ایک لڑکی نہ جانے کہاں سے ایک پرانا سا کیمرہ ساتھ لے کر گئی تو تھی مگر تریموں پہنچ کر پتا چلا کہ کیمرہ خراب ہے چنانچہ اس موقع کی کوئی تصویر نہ بنائی جا سکی۔ چونکہ

ہمارے کالج کے ٹرپ شاذ ہی باہر جاتے تھے اور اپنے طور پر بھی ہمیں ربوہ سے باہر نکلنے کا موقع بہت کم ملتا تھا لہٰذا ہمیں اس ٹرپ کی فوٹوگرافی نہ ہو سکنے کا مدتوں بہت افسوس رہا۔

ربوہ سے تریموں ہیڈ جاتے وقت سب لڑکیاں تازہ دم تھیں لہٰذا سارا رستہ گانے گاتے اور لطیفے سناتے ہوئے ہنسی مذاق میں گزرا تھا البتہ واپسی کے وقت اکثر لڑکیاں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے تھک جانے کی وجہ سے خوابیدہ سی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں بس طرح طرح کے خراٹوں سے گونجنے لگی۔ مسز شاہ کو یہ صورتِ حال بھی اچھی نہ لگی چنانچہ انہوں نے لڑکیوں سے کہا: بھئی کچھ ہلّہ گلّہ کرو، آخر پکنک پہ آئی ہوئی ہو۔ اس پر کچھ لڑکیوں نے اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی لیکن بات بنی نہیں۔

عطاء الرحمٰن طالب انہیں دینیات پڑھایا کرتے تھے۔ وہ چونکہ پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر لیکچر دیا کرتے تھے لہٰذا طالبات بسا اوقات حاضری لگوا کر کھسک جاتیں۔ کبھی عطاء الرحمٰن طالب کو پتا چل جاتا اور بعض اوقات وہ اس سے مکمل طور پر بے خبر رہتے۔ اگر تو وہ اس معاملہ سے لاعلم رہتے تو لیکچر جاری رہتا اور کھسکنے والی طالبہ سے کوئی باز پرس نہ ہوتی لیکن اگر کبھی ان کو علم ہو جاتا تو وہ سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ صادقہ بتایا کرتی تھیں: ایک بار میں ایک ضرورت کے تحت اٹھ کر باہر جانے لگی تو انہیں پتا چل گیا۔ وہ اباجی کو اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ جب میں واپس آئی تو فرمانے لگے: بھئی مولوی صاحب کی بیٹی ہو لہٰذا تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا ورنہ وہ سزا دیتا کہ تمہیں لمبا عرصہ یاد رہتی۔

صادقہ کے حوالے سے اب کوئی قابلِ ذکر بات رہ نہیں گئی لہٰذا آیئے اب ملاقات کرتے ہیں مبارکہ انجم سے جو بھاٹی گیٹ لاہور والے حکیم سراج الدین احمد کی صاحبزادی ہیں اور ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک جامعہ نصرت میں اردو پڑھاتی رہی ہیں۔ ان کی ساری تعلیم لاہور کے مختلف مدارس اور کالجز سے تھی جب کہ ایم اے کا امتحان انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج سے ۱۹۶۲ء میں پاس کیا تھا۔

ان کے والد ان کی ملازمت کے خلاف تھے چنانچہ جب ایم اے میں داخلے کا وقت آیا تو انہوں نے موصوفہ سے وعدہ لیا کہ وہ انہیں صرف اسی صورت مزید پڑھائی کی اجازت دیں گے کہ وہ تکمیلِ تعلیم کے بعد ملازمت کے لیے اصرار نہیں کریں گی۔ موصوفہ کی کتاب ''یادوں کے دِیپ'' (جو اُن کے والد محترم کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے) سے پتا چلتا ہے کہ جب ان کا ایم اے کا نتیجہ نکلا اور وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئیں تو ربوہ کی رہنے والی ان کی بعض کلاس فیلوز کی زبانی اس کا علم چھوٹی آپا کو بھی ہو گیا۔ نتیجہ نکلے ابھی چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ انہیں چھوٹی آپا کا ایک خط موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ جامعہ نصرت میں اردو کی ایک لیکچرر کی ضرورت ہے اور انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ فوری طور پر ربوہ پہنچ کر یہ ذمہ داری سنبھال لیں۔ موصوفہ کو اپنے والدِ بزرگوار سے کئے گئے وعدے کے پیشِ نظر یقین تھا کہ انہیں یہ پیشکش قبول کرنے کا موقع نہیں ملے گا لیکن جب انہوں نے اپنے والد کو چھوٹی آپا کا یہ خط دکھایا تو انہوں نے ایک لمحے کا توقف کئے بغیر اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور کہا: خلیفۂ وقت کی بیگم نے بلایا ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ یوں مبارکہ انجم کی جامعہ نصرت

کے ساتھ ملازمت کا سلسلہ اسی وقت شروع ہوگیا جو اگلے تیرہ سال تک جاری رہا۔ اس عرصے میں مبارکہ انجم نے ایک اچھے استاد کے طور پر شہرت کمائی۔

جامعہ نصرت کی نیشنلائزیشن کے بعد حالات بدل گئے۔ یوں بھی وہ اپنے خاندان سے دُور رہ رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ان کا تبادلہ لاہور ہوجائے۔ ۱۹۷۵ء میں یہ موقع پیدا ہوگیا اور ان کی تعیناتی اسلامیہ کالج، گوپر روڈ پر ہوگئی۔ بعد میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج باغبانپورہ میں ہوگیا جہاں وہ ۱۹۹۸ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک پڑھاتی رہیں۔ ۲۰۰۰ء میں وہ انگلستان منتقل ہوگئیں اور تب سے وہیں مقیم ہیں۔

جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ جامعہ نصرت میں گزرے ہوئے وقت کی کچھ یادداشتیں مجھے لکھ کر دیں تو انہوں نے اسے بخوشی قبول کرلیا اور چند ہی روز میں مجھے ایک نوٹ لکھ بھیجا جس میں وہ ''یادوں کے دیپ'' میں درج مندرجہ بالا واقعے کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اپنے خیالات و احساسات کو زیرِ تحریر لانے سے پہلے مجھے انتہائی اختصار کے ساتھ اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں کچھ ضروری امور کا ذکر کرنا ہے کیوں کہ اس کا میرے جامعہ نصرت سے منسلک ہونے کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ آپ کو یہ سن کر شاید کچھ تعجب ہو کہ میرے والدِ محترم میری میٹرک کے بعد مزید تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میٹرک تک تعلیم بہت کافی ہے، اب مجھے دینی کتب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور گھرداری سیکھنی چاہئے۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ ہر کلاس میں کامیابی کے بعد اگلی کلاس میں داخلے کے لیے بضد ہوجاتی۔ اس سلسلے میں میری والدہ محترمہ مرحومہ برکت بی بی میری بہت مدد کرتیں۔ میں اُن کی منت سماجت کرکے ان کا ووٹ اپنے حق میں حاصل کرلیتی اور یہ ووٹ بہت قیمتی اور میری کامیابی کا ضامن ثابت ہوتا۔ اس طرح ہوتے ہوتے میں نے بی اے کرلیا۔ جب ایم اے میں داخلے کے لیے ضد کی تو صاف انکار ہوگیا۔ یہاں والدہ کا ووٹ بھی کام نہ آیا۔ اباجان نے فرمایا: اب مزید تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کون سا ملازمت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اباجان پر بہت فضل وکرم تھا اور ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ بن مانگے اور بغیر ضرورت کا اظہار کئے ہر چیز مل جاتی اور ہر ضرورت پوری ہوجاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر احسان رہا جس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ جب ایم اے میں داخلے کی اجازت نہ ملی تو خیال آیا کہ کیوں نہ بی ایڈ کرلیا جائے چنانچہ بڑی ہمت کے ساتھ اباجان کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کردیا اور یہ کہتے ہوئے کہ صرف ایک سال کا تو کورس ہے ان سے داخلے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملی مگر مشروط کہ ملازمت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ میں نے فوراً شرط مان لی اور وعدہ کیا کہ ٹھیک ہے میں ملازمت نہیں کروں گی۔ خوش تھی کہ اجازت تو ملی۔ اس طرح بی ایڈ بھی ہوگیا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ایم اے کے لیے کہنا شروع کردیا۔ پھر صاف انکار ہوگیا۔ اس کی وجہ کو ایجوکیشن تھی۔ میں فلاسفی میں ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ پھر کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ لسانیات کی کلاسیں لڑکے لڑکیوں کی ہوتی تو اکٹھی ہیں مگر لڑکے ایک طرف بیٹھتے ہیں، لڑکیاں دوسری طرف بیٹھتی ہیں اور درمیان میں پردہ ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر اردو

میں ایم اے میں داخلہ کے لیے اجازت مانگی تو یہ کہہ کر انکار ہوگیا کہ مزید تعلیم کی ضرورت نہیں۔ میں خاموش ہوگئی مگر قدرت کو میرا ایم اے کرنا منظور تھا۔ میرے ہاتھ بڑی اہم خبر لگی اور وہ یہ کہ چھوٹی آپا کی بہن سیّدہ امۃ الرفیق پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کررہی ہیں۔ میں نے اباجان کو ان کا حوالہ دیا۔ حیرت ہوئی کہ اجازت مل گئی ہے مگر کوئی نئی شرط نہیں لگائی گئی۔ سروس نہ کرنے کا وعدہ تو میں پہلے ہی کرچکی تھی۔ اب میں نے اباجان سے کہا کہ اگر دورانِ تعلیم آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہوئی تو آپ مجھے بتادیں، میں یونیورسٹی جانا چھوڑ دوں گی۔ اباجان مسکرادیئے اور کہا کچھ نہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ایم اے کا نتیجہ آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے چھوٹی آپا کا ایک خط ملا جس میں انہوں نے مجھ سے جامعہ نصرت میں بطور لیکچرر خدمات انجام دینے کی خواہش کا اظہار فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ تم فوراً ربوہ آکر مجھے ملو۔ یہ خط پڑھ کر میرے تو اوسان خطا ہوگئے۔ میں حیران و ششدر تھی کہ اس خط کا کیا جواب دوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ خط اور وہ بھی ایسی قابلِ احترام ہستی کی طرف سے جس کے سامنے انکار کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اسی شش و پنج میں تھی کہ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ یہ خط اباجان کو دے دوں چنانچہ میں نے یہ خط ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے کہا: خط تمہارے نام ہے، مجھے کیوں دے رہی ہو؟ میں نے کہا: اباجان! آپ خط پڑھیں تو سہی۔ خط پر ایک نظر ڈالی اور بغیر توقف کئے فرمایا: ہاں تو جاؤ ربوہ۔ میری حیرت کا یہ عالم کہ اپنی سماعت پر یقین نہیں ہورہا تھا۔ اباجان کو مجھ سے ملازمت کروانا پسند نہ تھا اور میں نے بھی ان سے ملازمت نہ کرنے کا وعدہ کررکھا تھا لیکن اباجان جو جماعت اور خلافت سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور خلیفہ ثانی کے فدائی و شیدائی تھے کیسے انکار کرتے۔ میرے خیال میں ان سے اس جواب کے علاوہ کسی اور جواب کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

المختصر میں لاہور سے جامعہ نصرت بغرضِ ملازمت آگئی تاہم پریشان تھی کہ میں گھر سے اتنا دُور کیسے رہ پاؤں گی۔ اس وقت تو یہ بھی خیال نہیں گزرا کہ یہ عرصہ کتنا ہوگا۔

یہاں میں یہ عرض کرتی چلوں کہ مجھے جلسوں اور اجتماعات پر ربوہ جانے کا موقع ملتا رہتا تھا لہٰذا اس شہر سے مجھے کوئی اجنبیت نہ تھی۔ اس سے پیشتر میں طالب علمی کے زمانے میں رمضان المبارک میں ایک ماہ کے لیے منعقد ہونے والی تربیتی کلاس میں بھی شرکت کرچکی تھی اور جامعہ نصرت کے سٹاف میں سے بھی کچھ لوگوں سے میری شناسائی تھی لیکن مسز شاہ سے پہلی بار ملاقات ہورہی تھی۔ ان سے ملنا بہت اچھا لگا۔ بہرحال ملازمت کا آغاز ہوگیا جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

جہاں تک اس ادارے کے تعلیمی معیار کا تعلق ہے وہ قابلِ تعریف وتحسین تھا۔ میں نے اس ادارے کو ان تعلیمی اداروں سے جن میں مجھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل چکا تھا بہت بہتر پایا۔ میں نے سٹاف کو بڑی محنت اور لگن سے اپنی ذمہ داری نباہتے ہوئے دیکھا۔ سٹاف اور طالبات میں دوری نہیں بلکہ اپنائیت تھی۔ اگر سٹاف کو کسی طالبہ میں تعلیمی لحاظ سے کوئی کمی نظر آتی تو کوشش یہ ہوتی کہ زائد وقت دے کر مذکورہ کمی پوری کردی

جائے۔ اس کے پیچھے مسز شاہ کی تنظیمی صلاحیت کارفرما تھی۔ اس طرح کمزور طالبات کو کوشش سے کلاس کی دوسری طالبات کے برابر لایا جاتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ غیراز جماعت سٹاف ممبرز بھی پوری لگن اور محنت سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتی تھیں۔ مس صفیہ بھٹی، مس ساجدہ جعفر اور مس جسارت ہمارے ساتھ ہوسٹل میں مقیم تھیں۔ ہم سب بڑے پیار و محبت سے رہتے۔ شروع شروع میں کچھ عرصہ ہوسٹل سے کھانا کھایا۔ پھر ہم نے اپنا الگ انتظام کرلیا۔ ہم سب ایک جگہ رہتے، ایک جگہ کھانا کھاتے۔ ہمارے درمیان کبھی بھی عقیدے سے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ ہماری ان رفقا کا تعلق جماعت سے نہیں ہے۔

مسز شاہ کی نظر اور کوشش نہ صرف تعلیمی معیار اونچا رکھنے کی طرف تھی بلکہ کھیلوں کی طرف بھی ان کی پوری توجہ رہتی۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسی پرنسپل ہوگی جو اُن کی طرح کالج کے لیے درد رکھتی ہو۔ اپنی تعلیمی زندگی میں بے شمار لیکچررز اور پرنسپلز دیکھیں مگر ان جیسی کوئی نہیں دیکھی۔ حضرت مصلح موعود کا انتخاب بہت اچھا اور درست ثابت ہوا اور مسز شاہ نے بھی اس انتخاب کا حق ادا کردیا۔

میری رہائش چونکہ ہوسٹل میں تھی اس لیے کالج کے اوقات کے علاوہ بھی مسز شاہ سے ملاقات کے مواقع ملتے رہتے۔ ہوسٹل کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہمیں باری باری ملتی تھیں۔ ایک دفعہ مسز شاہ نے بتایا کہ جب ان کا تقرر بطور پرنسپل جامعہ نصرت ہوا تو وہ صرف بی اے پاس تھیں اور ان کے اس منصب کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد ایم اے کرلیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کو اس کمی کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے مسز شاہ کو انگریزی میں ایم اے کرنے کے لیے لاہور بھجوادیا۔ اُس وقت ان کے دونوں بچے اور علی الخصوص بیٹی بہت چھوٹی تھی اور اس کا ماں سے الگ رہنا اتنا آسان نہ تھا لیکن وہ جماعت کے مفاد میں اس قربانی پر بھی تیار ہوگئیں، جیسے تیسے یہ وقت گزار لیا اور خدا کے فضل سے ایم اے کے امتحان میں کامیاب ہوگئیں۔ انہوں نے جامعہ نصرت کو جس حسن و خوبی سے چلایا، یہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔

موصوفہ کو پودوں اور پھولوں سے محبت تھی۔ جب وہ صبح چہل قدمی کرتیں تو پودوں کا بغور جائزہ لیتیں۔ میں نے ایک بار دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی دیوار کے باہر پودوں کے پاس کھڑی گویا کچھ سوچ رہی ہیں۔ میں نے انہیں عالمِ استغراق میں پاکر کہا: ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے آپ پھول گِن رہی ہیں۔ وہ میری بات سن کر مسکرائیں لیکن جواب نہیں دیا۔ پھول توڑنا انہیں پسند نہیں تھا۔ میری نظر میں وہ ایک کامیاب پرنسپل تھیں۔ ان کی لگن اور تدریسی و انتظامی صلاحیتیں ان کی کارکردگی میں کارفرما نظر آتی تھیں۔

بعض اوقات مسز شاہ خود بھی کلاسز لیا کرتی تھیں۔ کالج کے لیے ان کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ سٹاف کی محنت اور کوشش کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی کوششوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں سٹاف نے بھی بھرپور حصہ ڈالا۔ یہ ٹیم ورک ہی تھا جس کے نتیجے میں نہ صرف کالج ٹیسٹس کے نتائج اچھے رہتے بلکہ بورڈ اور یونیورسٹی کے نتائج بھی امتیازی ہوا کرتے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں کالج کی انتہائی قابلِ احترام و تحسین ڈائریکٹریس، چھوٹی آپا کا ایک بار پھر ذکرِ خیر کرنا چاہوں گی۔ وہ انتہائی شفقت اور پیار و محبت سے ملنے والی ایک حسین شخصیت تھیں۔ کالج کی ہر تقریب میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتیں۔ ان کے آنے سے تقریب کو چار چاند لگ جاتے اور رونق دوبالا ہوجاتی۔ ان میں دیگر بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ وہ وقت کی بے حد پابند تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر بڑی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔''

مبارکہ انجم کے بعد اب جامعہ نصرت کے بارے میں کچھ باتیں ''مس ذکیہ عطا'' کی زبانی جو تعلیم الاسلام ہائی سکول کے اورینٹل ٹیچر، ماسٹر عطاء اللہ کی صاحبزادی ہیں۔ وہ جامعہ نصرت ہی کی سابق طالبہ ہیں جنہوں نے ۱۹۶۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں داخلہ لیا اور ماسٹرز کا امتحان دے کر ربوہ واپس آ گئیں۔ ابھی رزلٹ بھی نہ آیا تھا کہ جامعہ نصرت میں انگریزی کی لیکچرر کی پوسٹ آفر ہوگئی چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں یہاں پڑھانا شروع کردیا۔

''آپ سے پہلے یہاں کون کون سی لیکچررز انگریزی پڑھا رہی تھیں؟'' ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

''مسز شاہ کے علاوہ ایک تو سعیدہ حبیب تھیں اور دوسری امینہ مرزا'' ان کی طرف سے جواب آیا۔ ''ایک غیراز جماعت لیکچرر جن کا نام صفیہ بھٹی تھا بھی یہاں ہوا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے ایک لیکچرر اور بھی ہوا کرتی تھیں لیکن مجھے ان کا نام بھول رہا ہے۔''

''آپ نے کتنے سال جامعہ نصرت میں پڑھایا؟''

''قریباً چھ سال۔ میں نے ۱۹۷۱ء میں کالج چھوڑ دیا تھا۔ دراصل اسی اثنا میں میری شادی ہوگئی تھی۔ لطیف شاہد کی نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت غانا میں تقرری ہوگئی تو مجھے ان کے ہمراہ جانا پڑا۔''

''آپ کو بھی وہاں پڑھانے کا موقع ملا؟''

''جی۔ اللہ کے فضل سے مجھے چودہ پندرہ سال اس خدمت کی توفیق ملی۔ یہ سارا عرصہ Wa اور Asoaora نامی دو جگہوں پر گزرا۔ وہاں پر میں احمدیہ سیکنڈری سکولز میں پڑھاتی تھی۔''

''افریقہ سے واپسی کب ہوئی؟''

''اب تو اس بات پر اٹھائیس انتیس برس ہوگئے ہیں۔ ہم لوگ ۱۹۸۷ء میں واپس آئے تو اپنی رہائش کے لیے اسلام آباد کو پسند کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مجھے ایف ۶/۲ کے اسلام آباد ماڈل کالج فار گرلز میں جاب مل گیا۔ میرا تقرر ایڈہاک بنیاد پر تھا۔ پندرہ سال وہاں گزر گئے۔''

''اور اب؟''

''بہت کام کرلیا ہے۔ اب میں گھر داری کرتی ہوں یا لجنہ کا کام۔ وقت اچھا گزر رہا ہے۔''

جب میں نے ان سے جامعہ نصرت میں گزرے ہوئے وقت کے حوالے سے اپنی یادداشتیں تازہ کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے بتایا: ''آپ کو پتا ہے میرے والدِ بزرگوار تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ٹیچر

تھے۔ شاید یہ ان کی تربیت کا اثر تھا کہ مجھے بچپن سے ہی پروفیسری کا شوق تھا اور میں سکول میں ہوتے ہوئے بھی کالج پہنچنے کے لیے دن گنا کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کا وقت آیا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کون سے مضامین پڑھوں۔ پروفیسر محمد ابراہیم ناصر جو تعلیم الاسلام کالج میں میتھ کے استاد تھے والدِ بزرگوار کے اُس زمانے سے دوست تھے جب وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں استاد ہوا کرتے تھے۔ والدِ بزرگوار نے ان سے مشورہ لیا تو انہوں نے بعض دیگر مضامین کے علاوہ مَیتھ رکھنے کو کہا۔ یوں میں نے ایف اے میں اپنی پڑھائی کا آغاز کیا۔

میں تو ڈے سکالر تھی لیکن کالج کا اپنا ہوسٹل موجود تھا۔ مختلف شہروں سے آئی ہوئی طالبات اس ہوسٹل میں قیام پذیر تھیں۔ ان میں سے بہتوں کے ساتھ میری دوستی تھی۔ وہ ہوسٹل لائف کے بارے میں مزے مزے کی باتیں سناتیں تو کبھی کبھی دل میں خیال آتا گویا ہوسٹل میں رہنے والی طالبات ہم سے زیادہ بہتر طریقے پر زندگی انجوائے کر رہی ہیں۔

کالج کا ماحول انتہائی سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ میرے نزدیک پڑھنے والی طالبات کے لیے اس سے اچھا ماحول کسی اور جگہ شاید ہی میسر ہوگا۔ ہماری لیکچررز بہت محنتی اور پیار کرنے والی تھیں۔ یوں بھی طالبات کی تعداد محدود تھی لہٰذا ان کی ہر طالبہ پر ذاتی توجہ رہتی جو اُن کی تعلیمی اور اخلاقی ترقی کے لیے بہت ضروری تھا۔

سعیدہ حبیب ہمیں انگلش پڑھاتی تھیں۔ انہیں انگریزی زبان پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ وہ کلاس میں اردو کا ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھیں۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ انہوں نے انگلش میں اتنی مہارت کیسے پیدا کی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے کئی بار خیال آتا کہ وہ وقت کب آئے گا جب میں بھی ان ہی کی طرح طالبات کو انگلش پڑھایا کروں گی۔

مس قاضی جغرافیہ پڑھاتی تھیں۔ ان کا لیکچر دینے کا انداز بہت دلچسپ تھا۔ مس منظور ہمیں عربی پڑھاتی تھیں۔ وہ بہت قابل اور محنتی استاد تھیں۔ چونکہ میرے والدِ بزرگوار عربی زبان خود بھی بہت اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا کوئی دقّت پیش آتی تو میں ان کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھا لیتی۔ یوں مجھے اس مضمون میں کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ ریاضی کی لیکچرر مس رشیدہ شریف تھیں۔ وہ ہمیں اس طرح پڑھاتیں کہ یہ مضمون ہمیں کبھی مشکل نہ لگا۔

مولوی عطاء الرحمٰن موٹے کالے کپڑے کے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ہمیں دینیات پڑھاتے تھے۔ سردیوں میں کچھ طالبات مونگ پھلی یا چلغوزے کلاس میں لے آتیں اور چھیل چھیل کر کھاتی رہتیں۔ عجیب بات تھی کہ مولوی صاحب ان کی یہ حرکت فوراً نوٹ کر لیتے اور بارعب انداز میں پوچھتے کہ فلاں کونے میں کون سی لڑکی لیکچر سننے کی بجائے مونگ پھلی کھا رہی ہے تاہم ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود لڑکیوں کی شرارتیں جاری رہتیں۔

یہ سب استاد اپنی خوبیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے اور کالج کی پرنسپل مسز شاہ ان سب کی نگران اور بڑے رعب و دبدبہ کی مالک تھیں۔ ہمیں ان سے خوف بھی آتا تھا مگر اچھی بھی بہت لگتی تھیں۔ اسمبلی میں ہر روز ان سے آمنا سامنا ہوتا۔ وہ خود پورے کالج کی حاضری لیتیں اس لیے کالج بروقت پہنچنا بہت ضروری تھا۔

ان دنوں کالج میں والی بال، فٹ بال اور ٹیبل ٹینس بڑے شوق سے کھیلا جاتا تھا۔ ہماری ٹیمیں

انٹر کالجیٹ میچز میں حصہ لیتیں۔ ۱۹۵۹ء میں ہمارے کالج کی فٹ بال ٹیم نے کوئٹہ ٹیم کو ہرایا تھا۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۵ء میں ہماری والی بال ٹیم نے لاہور بورڈ سے ٹرافی حاصل کی۔ اس سے اگلے سال ہمارا کالج بورڈ اور یونیورسٹی، دونوں سطحوں پر والی بال چیمپئن قرار پایا۔ کالج میں سالانہ کھیلیں باقاعدگی سے ہوتیں اور طالبات کے علاوہ مہمان بھی ان سے خوب محظوظ ہوتے۔

۱۹۶۱ء میں طالبات کے چندے سے کالج کے وسط میں ایک بارہ دری تعمیر کی گئی۔ یہ بارہ دری ہمارے لیے مغلیہ خاندان کے کسی اعجوبے سے کم نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بارہ دری کالج لائف کا مرکز بن گئی۔ فارغ وقت میں طالبات وہاں بیٹھتیں اور لطف اندوز ہوتیں۔ بعض اوقات لیکچررز کلاسیں بھی بارہ دری میں لے لیتی تھیں۔ مینا بازار کے موقع پر اس بارہ دری میں سٹال لگائے جاتے اور اس کے ستونوں کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا جاتا۔ ہم وہاں بیٹھ کر گرمیوں میں گرم ہوا اور سردیوں میں سرد ہوا کے تھپیڑے کھا کر بھی عجیب لطف اٹھاتے تھے۔

میں جس زمانے میں جامعہ نصرت میں بطور لیکچرر آئی کالج تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ تعلیم اور کھیل کے میدان میں اس کالج کا بڑا نام تھا۔ کالج یونین بہت سرگرم تھی۔ بین الکلیاتی مباحثوں میں ہمارے کالج کی لڑکیاں باہر کے کالجوں سے بالعموم انعام جیت کر لاتیں۔ کالج کے اپنے سالانہ بین الکلیاتی مباحثوں کے اختتام پر رات کے وقت جگمگاتی روشنیوں میں مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا جس میں طالبات اپنا اپنا کلام پیش کرتیں۔ کالج یونین کے علاوہ بزم ادب، مجلسِ تاریخ، مجلسِ عربی، مجلسِ اسلامیات، مجلسِ دینیات اور مجلسِ سیاسیات بھی کالج میں کام کر رہی تھیں۔ ان مجالس کے پروگراموں سے طالبات بہت کچھ سیکھتیں۔

جلسہ تقسیم اسناد و انعامات بھی بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوتے۔ یہ جلسے لجنہ ہال میں ہوا کرتے تھے۔ ان کے لیے کئی دن پہلے سے ہال کی صفائی شروع کر دی جاتی۔ سٹیج تیار کیا جاتا اور فرنیچر سیٹ کیا جاتا۔ ۱۹۶۸ء کے تقسیم اسناد کی تقریب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے طالبات سے خطاب کیا۔ یہ ایک رُوح پرور خطاب تھا جس میں آپ نے فرمایا: ’’پس ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہئے کہ آپ مردوں سے بھی اور دوسری مدّ مقابل لڑکیوں سے بھی آگے بڑھیں۔ اسی جدوجہد کو قائم رکھنا اور اس احساس کو بیدار رکھنا بڑا ضروری ہے۔ اللہ آپ کے اچھے نتائج آپ کے لیے اور اس ادارے کے لیے مبارک کرے اور آپ کے بعد آنے والیوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس سے زیادہ اچھے نمبر لیں اور اس ادارے کو توفیق دے کہ وہ اس سے بھی زیادہ اچھے نتائج نکالیں۔‘‘

اسی خطاب میں آپ نے کالج کے دینیات کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کے لیے انعام مقرر کیا جو سال بھر کی فیس کے برابر تھا۔ بعد میں اس سکیم کی تفصیلات دیتے ہوئے حضور نے فرمایا: ’’آئندہ سال سے جو طالبہ قرآن مجید اور کتب حضرت مسیح موعود کے امتحان میں جس کا کورس میں مقرر کروں گا ۶۶ فیصدی نمبر لے کر اول آئے گی اس کو سال بھر کی ٹیوشن فیس میری طرف سے بطور انعام دی جائے گی لیکن اس کے لیے یہ شرط بھی ہوگی کہ کم از کم اس کلاس کی پچاس فیصد طالبات نے اس امتحان میں شرکت کی ہو تا کہ طالبات میں زیادہ سے زیادہ قرآن مجید اور کتب حضرت مسیح موعود کے مطالعہ کا شوق بڑھے۔‘‘

بیرونی دنیا کے طلبہ کو پڑھانے کے بعد میری نظروں میں جامعہ نصرت کی طالبات کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ طالبات انتہائی مہذب، بااخلاق اور فرمانبردار و وفا شعار تھیں۔

یہ سب کچھ کالج کے سرپرستوں کی محنت اور لگن کا نتیجہ تھا۔ بلاشبہ جامعہ نصرت دینی اور دنیوی تعلیم کے مخصوص امتزاج کا حامل ایک ایسا ادارہ تھا جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ طالبات کی تربیت اور کردار سازی پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔''

صادقہ قمر جن کا ذکر اس کتاب میں نصرت گرلز ہائی سکول کے حوالے سے پہلے بھی آچکا ہے اس کالج کی ایک ہونہار طالبہ تھیں۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں یہاں سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات سے ایم اے کا امتحان دیتے ہی ان کا تقرر جامعہ نصرت میں لیکچرر کے طور پر ہوگیا۔ وہ ایک طویل ملازمت کے بعد اس کالج کی پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئیں۔ میری ان کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے یاد اللہ ہے۔ اُن کے پاس جامعہ نصرت کی تاریخ کے حوالے سے یادوں کا ایک انمول خزانہ موجود ہے جسے وہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں مزے لے لے کر سناتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں: ''عطاء الرحمٰن طالب بڑے ہی شفیق استاد تھے اور اپنی شاگردوں کے ساتھ ہمیشہ شفقتِ پدری کا مظاہرہ کرتے۔ میں اپنی محنت اور کلاس میں اپنی سنجیدگی کے باعث ان کی چہیتی شاگرد تھی۔ انہوں نے مجھے مانیٹر مقرر کر رکھا تھا۔ چونکہ وہ شعر کہتے تھے لہٰذا ایک بار میں نے اُن سے فرمائش کی کہ وہ میرے بارے میں کچھ کہیں۔ اُن کی مہربانی دیکھئے، اگلے ہی روز وہ ایک طویل نظم لکھ لائے جسے انہوں نے کلاس میں پڑھ کر سنایا۔ اب وہ پوری نظم تو یاد نہیں رہی البتہ اس کے کچھ شعر حافظے میں محفوظ ہیں جو پیش کر رہی ہوں:

اے مری ہمشیرہ! میری نظم کی شَیدا ہے تُو
میرے منہ سے کچھ سُنے، رکھتی ہے اس کی آرزو
نظم اپنی آج میں تم کو سناؤں گا ابھی
اور قلم کی اپنی جولانی دکھاؤں گا ابھی
بات جب کرتی ہے تُو ہوتا ہوں میں بھی شادکام
دل کو دل سے راہ ہے سچا ہے بالکل یہ کلام
تو ہوئی پیدا ہے اللہ کی عبادت کے لیے
اپنے پیدا کرنے والے کی اطاعت کے لیے
صادقہ ہے قول میں تُو اور عمل میں ہے قمر
تیرے ہی گن گائے گی دنیا سبھی شام و سحر

صادقہ قمر کو عطاء الرحمٰن طالب کی کلاس کی بعض اور باتیں بھی یاد ہیں۔ وہ بتاتی ہیں: موصوف کلاس میں آتے ہی پوچھتے: کوئی طالبہ بُننگ تو نہیں کر رہی؟ میں مانیٹر تو تھی لیکن مجھے سب کا پردہ رکھنا پڑتا تھا لہٰذا میں کہہ

دیتی کہ تمام کلاس ان کی طرف متوجہ ہے۔ ایسے میں کسی طالبہ کے ہاتھ سے سلائی اچانک نیچے گر جاتی تو موصوف بہت ناراضگی کا اظہار فرماتے۔ ہمارے کورس میں ''تجرید بخاری'' بھی شامل تھی۔ اصولاً ہر طالبہ کے پاس اس کا نسخہ ہونا چاہئے تھا لیکن لڑکیاں بالعموم تجرید بخاری ہمراہ نہیں لاتی تھیں۔ وہ پوچھتے کہ کتنی لڑکیاں یہ کتاب لائی ہیں تو جواب ہوتا کہ سب کے پاس موجود ہے۔ پھر وہ کہتے: اچھا ہاتھ سے اٹھا کر دکھاؤ۔ اس سوال کے جواب میں صرف دو تین لڑکیوں کے ہاتھ اوپر اٹھتے تو وہ غصے کا اظہار فرماتے اور کہتے: صادقہ! آپ اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر نہیں دے رہی ہیں لیکن بات کو اس سے آگے کبھی نہ بڑھاتے۔

موصوفہ بتاتی ہیں: ہم نے محمد عثمان صدیقی سے بھی پڑھا ہے۔ وہ جامعہ احمدیہ کے فارغ التحصیل تھے، انہیں یورپ اور افریقہ کے بعض ممالک میں اشاعتِ دین کا تجربہ بھی حاصل تھا اور انہوں نے پاکستان واپسی پر اسلامیات میں ایم اے بھی کر لیا تھا۔ انہیں اپنے مضمون پر پورا عبور حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے وہ انتہائی نرم خُو تھے اور بہت اچھا پڑھاتے تھے۔

صادقہ قمر کو میجر محمد اسماعیل کی شاگردی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ اُن کی روایت کے مطابق میجر صاحب کا قد بہت لمبا تھا، اتنا لمبا کہ پردے کے اوپر سے ان کا سر نظر آیا کرتا تھا چنانچہ وہ مذاقاً کہا کرتے تھے: لڑکیو! یا تو تم نیچے جھک جاؤ یا میرے پاؤں نیچے سے کاٹ دو۔ وہ ایک منجھے ہوئے استاد تھے جو کئی سال تک فوج میں تدریس سے منسلک رہے تھے۔ وہ انتہائی بااخلاق انسان تھے اور اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آشنا۔

وہ بتایا کرتی ہیں کہ ان کے زمانہ طالب علمی اور زمانہ تدریس کے ابتدائی سالوں میں کالج میں مشاعروں کی روایت بڑی مستحکم تھی۔ مشاعرے رات کے وقت ہوتے اور کوئی معزز مہمان اس کی صدارت کرتا۔ ان مواقع پر کالج گراؤنڈ سامعین سے تقریباً بھر جاتا اور یہ محفلیں رات گئے تک جاری رہتیں۔ مشاعرے کے لیے عام طور پر طرح مصرع دے دیا جاتا جس پر طبع آزمائی کی جاتی۔ ان مشاعروں میں بعض اوقات بیرونی کالجز سے بھی شاعرات شامل ہوتیں جس سے ان کی رونق دوبالا ہو جاتی۔

صادقہ قمر بتاتی ہیں: ایک بار طرح مصرع تھا:

جو ہے رائیگاں تری جستجو یہ مری نظر کی خطا نہیں

میں نے اس مشاعرے میں جو اشعار پڑھے وہ سنائے دیتی ہوں:

میں نے رات رات کو جاگ کر جو چراغ دل میں جلائے تھے
ترے ظلم نے وہ بجھا دیئے، میری زندگی میں ضیا نہیں
کوئی ہنس کے دیکھ بھی لے اگر، میری کائنات نثار ہو
دل و جان اس پہ فدا کروں اس سے آگے کوئی صلہ نہیں
یہاں بگڑا بگڑا مزاج ہے، یہاں اُلٹا اُلٹا رواج ہے
جو تمہیں سنانے کی بات ہے، کبھی تم نے اس کو سنا نہیں

میں نے دل دیا، میں نے جان دی، میرے پاس کچھ بھی بچا نہیں
جو ہے رائیگاں تری جستجو یہ مری نظر کی خطا نہیں

انہیں وہ مشاعرہ بھی ابھی تک یاد ہے جس کے لیے یہ طرح مصرع دیا گیا تھا:

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

صادقہ قمر نے اس طرح مصرعے پر بھی طبع آزمائی کی۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کی یہ غزل خاصی پسند کی گئی:

لے کے سامانِ غزل وہ گل عذار آ ہی گیا
میرے ویرانے کو پیغامِ بہار آ ہی گیا
مصلحت تو روکتی تھی ہر قدم پر بار بار
تھا ترا دیوانہ میں دیوانہ وار آ ہی گیا
آستاں پر رکھ دی گھبرا کر جبینِ بندگی
رحمتِ یزداں کو اس لغزش پہ پیار آ ہی گیا
کیا بتاؤں موت جب آ کر گلے سے لگ گئی
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا
صادقہ پر ظلم کرتے عمر اُن کی کٹ گئی
قمر شکوہ لب پہ آخر ایک بار آ ہی گیا

موصوفہ کو یہ بات بھی ابھی تک نہیں بھولی کہ وہ لاہور میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے دوران جامعہ نصرت کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئی تھیں۔ ان کی یادداشت کے مطابق یہ ایک بے حد دلچسپ محفلِ مشاعرہ تھی۔
انہیں ان کی جس نظم پر پہلا انعام ملا اس کے چند اشعار ہیں:

ہنس ہنس کے مری بات ہر اک ٹال رہے ہو
شاید مری مجبور تمنا کے صلے ہیں
دل درد سے بیتاب، جگر غم سے ہے ٹکڑے
کیا میری وفاؤں کے یہی پھول کھلے ہیں
ہونے کو سحر ہو تو چلی ہے مگر اے دوست
ٹھہرو کہ ابھی دل میں کئی اور گلے ہیں
شکوہ نہ کرو گردشِ دوراں سے قمر تم
ہر چاہنے والے کو یہاں زخم ملے ہیں

اگرچہ صادقہ قمر اور ان کی شاعری کے حوالے سے مزید بات ہوسکتی ہے تاہم ان کا ذکرِ خیر موقوف کرتے ہوئے میں آپ کی ملاقات فیروزہ فائزہ سے کروا رہا ہوں جو ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک جامعہ نصرت میں

پڑھتی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے جس کا اظہار امتحانات میں ان کی مسلسل نمایاں کامیابیوں اور کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں بھرپور شمولیت سے ہوتا ہے۔ انہیں ایک طالبہ اور بعد میں لیکچرر کے طور پر اس ماحول کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جب میں نے ان سے اپنے زمانے کے جامعہ نصرت کے حالات بیان کرنے کو کہا تو انہوں نے از راہِ مہربانی میری یہ درخواست قبول کرلی اور میں فون پر ان سے اس زمانے کے حالات سنتا رہا اور ساتھ ساتھ نوٹس لیتا رہا۔ میں بعد میں اُن کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو ضابطۂ تحریر میں لے آیا اور سارا کچھ صیغۂ واحد متکلم میں بیان کردیا۔ یوں ہی سمجھئے کہ فیروزہ لکھ رہی ہیں:

جماعتی روایات کے مطابق کالج کا ماحول نہایت پاکیزہ اور پُرسکون تھا۔ جامعہ نصرت میں پردے کی پابندی لازمی تھی حتّٰی کہ مردانہ کلیریکل سٹاف بھی ایک ایسے کمرے میں بیٹھتا تھا جو گیٹ سے کالج کے اندر آنے والی سڑک پر واقع تھا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی پرنسپل آفس اور دوسری لیڈی کلرک کی میز کے قریب کھلتی۔ ان کھڑکیوں پر پردہ لٹکا رہتا اور کاغذات کا لین دین پردے کے نیچے سے ہوتا۔ اس بات کو یقینی بنایا جاتا تھا کہ طالبات اور سٹاف ممبرز کسی صورت بے پردگی کی مرتکب نہ ہوں۔

تمام معلمات نہایت محنت اور دیانتداری سے پڑھاتیں جس کی وجہ سے جامعہ نصرت کے بورڈ اور یونیورسٹی کے نتائج اکثر بہت شاندار رہتے۔ فیل ہونے والی اِکا دُکا طالبہ صرف انگریزی میں فیل ہوا کرتی تھی۔

کلاس رومز کے سامنے برآمدہ تھا جہاں سے پڑھائی کے اوقات میں گزرنا منع تھا۔

صبح اسمبلی میں مسز شاہ خود موجود ہوتیں اور طالبات (جن کی تعداد ان دنوں بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی) کی حاضری بذاتِ خود لیتیں۔ پھر نہایت آسان اور شُستہ انگریزی میں ان سے خطاب کرتیں جس میں عام طور پر کوئی نصیحت، کسی اجتماعی غلطی کی نشاندہی یا کوئی نئی اطلاع شامل ہوتی۔ وہ نہایت دلنشیں اور پُراثر انداز میں اپنی بات سمجھاتیں۔ وہ سادہ مگر پُروقار شخصیت کی مالک اور طالبات میں بے حد ہردلعزیز تھیں۔ زیادہ تر ساڑھی زیبِ تن کرتیں۔ ان کی رہائش گاہ کالج کے اندر ہوسٹل کے سامنے تھی۔ ان کے وقت میں جامعہ نصرت کا شمار ملک کے بہترین زنانہ تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا۔ اچھی شہرت کی وجہ سے کئی غیر از جماعت طالبات بھی باہر سے یہاں آکر تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

مسز شاہ کی طبیعت میں مزاح تھا۔ ایک مرتبہ میری ایک انگریزی نظم ''النصرت'' میں شائع ہوئی۔ یہ نظم پڑھ کر انہوں نے مجھے اپنے دفتر طلب کیا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوئی تو وہ ناک پر عینک رکھے رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھا تو ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگیں: یہ نظم تم نے خود لکھی ہے یا ابّا نے لکھ کر دی تھی؟ میں نے کہا: میڈم! آپ کہتی ہیں ابّا نے لکھ کر دی ہے اور ابّا کہتے ہیں کہ مسز شاہ نے لکھ کر دی ہوگی۔ اس پر وہ ہنس پڑیں اور مجھ سے بعض الفاظ کے معنی دریافت کئے جو میں نے بتا دیئے۔ پھر انہوں نے میرے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا: ''ہیرو کا نام چارلی کیوں رکھا ہے؟'' میں نے جواب دیا کہ انگریزی کی نظم ہے اس لیے ہیرو کا نام بھی انگریزوں والا ہی رکھا ہے۔ اس پر انہوں نے مجھے شاباش دی اور کہا کہ نظم

بہت اچھی ہے، اس کا میٹر درست ہے اور تمہارا ذخیرہ الفاظ بھی ماشاء اللہ وسیع ہے۔ کاش تم انگریزی ادب پڑھ سکتیں۔ یاد رہے کہ سٹاف کی کمی کی وجہ سے اس زمانے میں کالج میں انگریزی ادب بطور اختیاری مضمون رائج نہ تھا۔

پڑھائی کے ساتھ ساتھ پورا سال کالج میں ہم نصابی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ علمی سرگرمیوں کے لیے کالج یونین موجود تھی جس کے عہدیداروں کا انتخاب سال کے سال ہوا کرتا تھا۔ صدر یونین سرخ اور سیکرٹری زرد رنگ کا گاؤن پہن کر سٹیج پر رونق افروز ہوتیں۔ کلاسز کی نمائندگی کے لئے نائب صدر اور جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے بھی موجود تھے۔ مجھے چاروں سال یونین میں طالبات کی نمائندگی کا موقع ملتا رہا۔

جب میں کالج میں داخل ہوئی تو حکومتی ہدایات کے تحت گیارہویں اور بارہویں جماعت کو نصرت گرلز ہائی سکول کے ساتھ جوڑ کر اسے ہائر سیکنڈری سکول کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس سکول کی سٹوڈنٹس یونین کا الیکشن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اعزاز بخشا تھا چنانچہ میں صدر منتخب ہوئی اور حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد کی بیٹی، عتیقہ فرزانہ اس کی سیکرٹری۔

کالج یونین کے زیر اہتمام بین الکلیاتی اردو و انگریزی مباحثات اور مشاعرے نہایت جوش و خروش سے ہوتے اور تین چار دن کالج میں خوب گہما گہمی رہتی۔ آخری دن سالانہ ڈنر ہوتا جس میں مقررین، یونین کے عہدیداران، ججز اور کالج سٹاف کے علاوہ ربوہ کی بعض معزز خواتین بھی شامل ہوتیں۔

۱۹۶۴ء میں کالج کی تاریخ میں پہلی مرتبہ میں بلا مقابلہ یونین کی صدر منتخب ہوئی۔ مجھے اب بھی یاد ہے میرے ساتھ منتخب ہونے والی باقی عہدیداروں میں تھرڈ ایئر کی عتیقہ فرزانہ سیکرٹری اور سیکنڈ ایئر کی بشریٰ طیبہ جوائنٹ سیکرٹری تھیں۔ میری خوش قسمتی کہ اس سال کالج کے بین الکلیاتی مباحثہ میں کوئی درجن بھر کالجوں کی ٹیمیں شامل ہوئیں جو ایک ریکارڈ تھا۔

ہر سال نئے عہدیداروں کے انتخاب کے بعد یونین کی رسمِ افتتاح منعقد ہوتی جس میں آؤٹ گوئنگ صدر کرسی صدارت پر رونق افروز ہوتیں اور الوداعی خطاب کرتیں۔ پھر وہ نومنتخب صدر کو خوش آمدید کہہ کر اپنا گاؤن اسے پہناتیں اور کرسی اس کے حوالے کر دیتیں۔ اس کے بعد نومنتخب صدر کا افتتاحی خطاب ہوتا اور سابقہ صدر کو سپاسنامہ پیش کیا جاتا۔ یوں صدارت سابقہ سے نومنتخب صدر کو منتقل ہو جاتی۔ یہ تقریب بے حد باوقار اور پُر لطف ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے اُس سال کالج یونین کا افتتاحی اجلاس چار اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ہوا تھا جس میں چھوٹی آپا مہمانِ اعزاز تھیں۔ تلاوتِ کلام پاک اور نظم کے بعد سابقہ صدر یعنی میری بہن قانتہ فردوس نے پچھلے سال کی رپورٹ پڑھ کر سنائی، مہمانِ خصوصی نے یونین کا افتتاح کیا اور پھر مجھے کرسی صدارت سنبھالنے کو کہا۔ میں نے اپنے ''صدارتی خطبے'' میں کالج یونین کی دیگر عہدیداران کا حاضرین سے تعارف کرایا جس کے بعد چھوٹی آپا نے اپنے خطاب میں قرآن پاک پڑھنے اور اسوۂ رسول کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنانے پر زور دیا۔

کالج میں مختلف مضامین کی سوسائٹیز موجود تھیں جو ہر ہفتے کے اختتام پر باری باری اپنی تقاریب منعقد کرتیں جن میں طالبات بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔

ہم نصابی سرگرمیاں کالج ٹائم کے دو گھنٹے بعد شروع ہوتیں اور شام ڈھلے تک جاری رہتیں۔ ربوہ کے پاکیزہ ماحول کی وجہ سے طالبات کو رات کے وقت گھروں کو واپس جانے میں کوئی دِقت ہوتی نہ والدین کو اس پر کوئی اعتراض ہوتا۔ مشاعرے اور پارٹیاں تو ہمیشہ رات گئے ہی ختم ہوتیں۔

کالج میں مردانہ گیٹ اَپ اور اداکاری ممنوع تھی اس لیے سال کے سال ٹیبلو اور فینسی ڈریس شو پیش کئے جاتے تھے۔ ہاں! بہادر شاہ ظفر اور میکبتھ جیسے تاریخی ڈراموں کا انعقاد مجھے یاد ہے لیکن ان مواقع پر مہمانوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔

سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی، قدسیہ نے ایک دفعہ قلوپطرہ اور ایک دفعہ ہیلن آف ٹرائے کا بہروپ بھرا۔ میں ایک دفعہ نور جہاں اور دوسری مرتبہ رضیہ سلطانہ کے روپ میں سٹیج پر آئی۔ استانی امۃ العزیز کی ایک بھانجی، امۃ الباسط ایک بار چاند بی بی بنیں۔

ان شوز میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے لباس کا تعارف بھی کرایا جاتا۔ جن لڑکیوں کو ان علاقوں کی زبان آتی تھی وہ اس زبان کا کوئی قومی یا لوک گیت بھی سناتیں۔ اسی طرح دوسرے ملکوں کے لباس پہن کر دکھائے جاتے۔ مختلف کرداروں کا بہروپ بھی بھرا جاتا جیسے فقیرنی، پکّھی واس اور دودھ بیچنے والی جانگلیانڑیاں۔ ٹیبلوز میں سورج، چاند، ستارے، بہار، جنت، شفق، شام، رات، پھول، کلی وغیرہ کا روپ بھرا جاتا۔ ایک لڑکی خوش الحانی سے پردے کے پیچھے نظم پڑھتی جاتی اور جس کردار کا ذکر آتا وہ آ کر اپنی مقررہ جگہ کھڑا ہو جاتا۔ آج سے نصف صدی پہلے ربوہ جیسی جگہ میں جہاں عام طور پر لوگوں کے مالی حالات اچھے نہ تھے اس بہروپ کے لیے مطلوبہ لباس مہیا کرنا آسان نہ تھا مگر ہم یہ چیزیں در در مانگنے سے بھی نہ شرماتے اور کوئی نہ کوئی بندوبست کر ہی لیتے۔ بھلا ہو ان خواتین کا جو تعاون کرتیں اور اپنے شادی والے کپڑے ذرا احتیاط سے استعمال کرنے کی تاکید کے ساتھ دے دیتیں۔ کچھ لڑکیاں اپنی ماؤں کی نظر بچا کر اس قسم کے کپڑے گھر کی پیٹیوں میں سے نکال کر لے آتیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ طاہرہ روحی ایسا ہی ایک ''سنہری آنچل'' جو مجھے ایک ٹیبلو میں اس شعر کے لیے درکار تھا:

اب نہ لہراؤ بہاروں کا سنہری آنچل

اپنے گھر کی پیٹی سے نکال لائی۔ اتفاقاً اس کی والدہ حاضرین میں موجود تھیں۔ انہوں نے اپنا دوپٹہ پہچان لیا اور فوراً طاہرہ روحی کو بلوایا مگر وہ چھپ گئی۔ گھر پہنچی تو اسے حسبِ توقع خوب ڈانٹ پڑی۔

روحی کا ذکر ہوا ہے تو یہ بتاتی چلوں کہ وہ اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ ان ہی دنوں مشرقی افریقہ سے ربوہ آئی تھی اور شرارتی لڑکی تھی۔ ایک دفعہ اس نے کالج میں ایک درخت سے انجیریں توڑ لیں جب کہ پھل توڑنا سخت منع تھا۔ اس پر مسز شاہ کی طرف سے اس کی جواب طلبی ہوئی تو اس نے بہانہ گھڑا کہ افریقہ میں انجیر نہیں ہوتی، میں نے پکی ہوئی انجیر پہلی بار دیکھی تو اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی اور یہ حرکت کر بیٹھی۔ وہ اس سے پہلے یہی بہانہ اپنی بعض اور شرارتوں کے جواز میں پیش کر چکی تھی چنانچہ اس بار اسے خوب ڈانٹ پڑی کہ ہر بات

میں افریقہ کا بہانہ نہ بنالیا کرے۔

دینیات کلاس میں طالبات کی حاضری لازمی تھی۔ غیر حاضری پر جرمانہ ہوتا۔ یہ کلاس سلسلے کے کوئی بزرگ لیتے تھے۔ درمیان میں سیاہ رنگ کا پردہ لٹکا ہوتا جس میں سے نظر آر پار نہیں گزر سکتی تھی۔ عموماً ان بزرگان کے لیکچرز بہت توجہ سے سنے جاتے تھے تاہم کچھ شریر طالبات بعض اوقات حاضری لگوانے کے بعد کلاس سے کھسک جاتیں۔ جب یہ شکایت عام ہونے لگی تو استادِ محترم ایک پیریڈ کے دوران دو دفعہ حاضری لینے لگے۔ دوسری حاضری اچانک ہوتی مگر اس میں بھی بعض دفعہ پراکسی کام دے جاتی۔ مسز شاہ اس پیریڈ میں اکثر راؤنڈ لیتیں اور اس امر کو یقینی بناتیں کہ کوئی طالبہ اس میں سے غیر حاضر نہ ہو۔ دینیات کا امتحان بھی ہوتا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے امتحان پاس کرنے والوں کو نظارتِ تعلیم باقاعدہ سند جاری کرتی تھی۔

صحتِ جسمانی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے کے لیے طالبات کا کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لینا ضروری تھا۔ سالانہ سپورٹس ڈے کے موقع پر جن کھیلوں میں طالبات اور تماشائی یکساں دلچسپی لیتے ان میں سیدھی دوڑ، اُلٹی دوڑ، تین ٹانگوں کی دوڑ، چاٹی ریس، سَیک ریس، سائیکل ریس، ہائی جمپ، لانگ جمپ، گولہ پھینکنا اور نیزہ پھینکنا شامل تھیں۔

کالج میں والی بال کی چار ٹیمیں تھیں۔ اے اور بی ٹیم برائے سیکنڈری بورڈ اور اے اور بی ٹیم برائے یونیورسٹی۔ یہ چاروں ٹیمیں شام کے وقت آپس میں میچ کھیلا کرتی تھیں۔ اے ٹیمیں بہترین کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی تھیں اور یہ ٹیمیں بورڈ اور یونیورسٹی کے مقابلوں میں شرکت کرتیں۔

۱۹۶۴ء میں ہماری ٹیم نے یونیورسٹی گراؤنڈ، لاہور میں ہونے والے بین الکلیاتی والی بال ٹورنامنٹ میں چیمپئن شپ جیتی۔ اس سے پہلے یہ ٹیم ۱۹۶۲ء میں بورڈ کے والی بال ٹورنامنٹ میں رنرز اَپ رہ چکی تھی۔ یونیورسٹی کی سطح پر ہمارا مقابلہ گجرات، کنیرڈ اور لاہور کالج کی مضبوط ٹیموں سے تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے روحی ہماری ٹیم کی کپتان تھی جب کہ کھلاڑیوں میں میرے علاوہ امۃ الرشید اختر، حامدہ اور محمودہ شامل تھیں۔

اپنے ماحول کے زیر اثر ہمیں دعا پر بہت یقین تھا چنانچہ ہم میچ شروع ہونے سے پہلے اجتماعی دعا کرتے، ہر سروس پر دعا پڑھ کر گیند پر پھونکتے اور کھیل کے دوران بھی مسلسل زیرِ لب دعائیں پڑھتے رہتے جس پر مشہور ہو گیا کہ ربوہ کی لڑکیاں گیند پر جادو ٹونا کرتی ہیں۔ اگرچہ ہماری ٹیم کو داد دینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ دیگر کالجز کی بہت سی لڑکیاں اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کے لیے موجود ہوتیں تاہم خدا کے فضل سے ہم یہ ٹورنامنٹ جیت کر آئے۔

ربوہ پہنچ کر ہم پروگرام کے مطابق صبح کالج گیٹ کے قریب جمع ہوئے اور پھر روحی کی قیادت میں ''جامعہ نصرت زندہ باد'' کے پُرجوش نعرے لگاتے ہوئے اکیڈیمک بلاک کے سامنے پہنچ گئے۔ لڑکیاں جو اسمبلی کے لیے جمع ہو رہی تھیں وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں۔ اسی اثنا میں مسز شاہ تشریف لے آئیں۔ انہوں نے ٹیم کو مبارکباد اور شاباش دی اور کھلاڑیوں کو گلے لگایا۔ ان کا موڈ خوشگوار پا کر طالبات نے چھٹی کا مطالبہ کر ڈالا

لیکن مسز شاہ اتنی آسانی سے چھٹی دینے والی کہاں تھیں۔ انہوں نے تو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران بھی کالج کھلا رکھا تھا اور ہوائی جہازوں کی گھن گرج میں بھی پڑھائی کے محاذ پر جمی رہی تھیں۔ بہرحال انہوں نے اتنی رعایت دے دی کہ ایک روز کے لیے کھلاڑیوں کو کلاسز اٹینڈ کرنے سے استثنا دے دیا۔

یوں ہی یاد آ گیا ہے کہ ایک بار جب ہم میچ کھیلنے کے لیے مس خلجی کے ہمراہ لاہور پہنچے تو لیڈی میکلیگن کالج نے ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ اس پر ہم سب بہت پریشان ہوئے۔ مس خلجی نے پوچھا کہ کیا ہم میں سے کوئی ہم سب کو ٹھہرانے کا بندوبست کر سکتا ہے؟ میں نے اپنے بھائی جاوید مرحوم سے رابطہ کیا تو انہوں نے اردو بازار، لاہور والے ہمارے مکان کے دو کمرے خالی کروا دیئے اور ہوٹل سے کھانے کا بندوبست بھی کر دیا۔ جاوید کو وفات پائے اب کتنے ہی برس گزر چکے ہیں لیکن ان کی اور باتوں کے ساتھ ساتھ ان کی یہ نیکی بھی مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے اور میں ان کی مغفرت کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔

والی بال کے علاوہ طالبات نیٹ بال یا باسکٹ بال بھی کھیلتیں اور میچز بھی ہوتے رہتے۔ سال میں ایک مرتبہ طالبات اور اساتذہ کرام کے درمیان نیٹ بال کا ایک دوستانہ میچ ہوتا جسے دیکھنے کے لیے سارا کالج اُمڈ پڑتا بلکہ خبر ملنے پر بعض سابقہ طالبات بھی پہنچ جاتیں۔ طالبات کو تو پریکٹس ہوتی تھی مگر اساتذہ پہلی دفعہ میدان میں اتری ہوتی تھیں لہٰذا وہ ایسے حربے استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کرتیں جو کھیل کے قواعد کے تحت ممنوع تھے مثلاً گیند پکڑ کر بھاگ اٹھنا یا بال کو باسکٹ کرتے وقت ڈنڈی مارنا یا مقابل کھلاڑی کو پکڑ کر گیند ہاتھ میں لینے سے باز رکھنا۔ طالبات ان مناظر سے خوب لطف اندوز ہوتیں۔ چونکہ یہ میچ نمائشی ہوتا تھا لہٰذا مس خلجی ہر فاؤل درگزر کر دیتیں اور یوں جیت سٹاف ٹیم ہی کی ہوتی۔ سب کو علم ہوتا کہ یہ جیت کیسے ہوئی ہے مگر اس پر کوئی احتجاج نہ ہوتا اور مس صفیہ چوہدری کوئی حسبِ حال سا شعر پڑھ کر اس موقع کو یادگار بنا دیتیں۔

موقع بموقع ان کھیلوں کے نمائشی میچ ہوتے رہتے تھے جنہیں سابق طالبات اور ربوہ کی مستورات شوق سے دیکھا کرتی تھیں۔ تماشائی خواتین کھلاڑیوں کو خوب داد دیتیں اور فقرے بھی کستیں۔ میں کالج میں گزرے ہوئے اپنے یہ دن کبھی نہیں بھلا سکتی۔

طالبات کے لیے اعلانات اور اطلاعات کالج کے نوٹس بورڈ پر آویزاں ہوتیں۔ کالج ڈسپلن کی ذرا سی خلاف ورزی پر نام نوٹس بورڈ پر لگ جاتا۔ طالبات سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ آپس میں ترجیحاً انگریزی یا پھر اردو میں بات کریں گی اور پنجابی میں گفتگو سے مکمل اجتناب کریں گی۔ ان کی شخصیت سازی کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ اس کے باوجود طالبات پنجابی میں گفتگو سے باز نہ آتیں کیونکہ یہی تو ان کی مادری زبان تھی اور اپنے گھروں میں یا گھروں سے باہر انہیں اسی زبان میں بات کرنے کی عادت تھی چنانچہ اگر دو طالبات آپس میں پنجابی میں گفتگو کرتی پکڑی جاتیں تو انہیں جرمانہ ہوتا۔ پھول توڑنے یا ممنوعہ علاقۂ سبزہ و گل میں داخل ہونے پر بھی جرمانہ ہوتا تھا اور اس امر کا اعلان نوٹس بورڈ پر آویزاں ہو جاتا۔

جب سیکنڈ ایئر یا فورتھ ایئر کی طالبات کی الوداعی پارٹی ہوتی یا ان کو امتحان کی تیاری کے لیے کالج سے

فارغ کیے جانے کا وقت آتا تو فرسٹ ایئر اور تھرڈ ایئر کی طالبات کی طرف سے ایک ''وِش'' بنا کر نوٹس بورڈ پر آویزاں کی جاتی۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں امتحانات کے موقع پر دوسروں کے لیے نیک تمناؤں کے اظہار کا یہی طریقہ رائج تھا۔ وِش عام طور پر کسی سفید ورق پر تیار کی جاتی۔ وِش کرنے والا اپنے ہاتھ سے اس کاغذ پر کوئی پھول (لیکن عام طور پر دل کی تصویر) بنا کر اردو یا انگریزی زبان میں کچھ دعائیہ کلمات لکھتا۔ بازار سے گوٹا خرید کر اسے باریک کاٹ لیا جاتا اور گوند لگے کاغذ پر ایک ترتیب سے چھڑک دیا جاتا۔ جس کو وِش کرنا مقصود ہوتا اس کا نام اُوپر آتا اور وِش کرنے والے کا نام آخر میں۔ ایسی وِشیں انفرادی طور پر بھی بھجوائی جاتی تھیں۔

اوقاتِ کار میں کالج کے اندر مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس حکم سے استثنا صرف ایک ادھیڑ عمر، دبلے پتلے، پست قد ماشکی کو حاصل تھا جسے ہم سب ''چاچا ماشکی'' کہتے تھے۔ وہ غضِ بصر کے حکم کی چلتی پھرتی تصویر تھا اور گھونگھٹ نکال کر اپنا کام کرتا رہتا تھا۔

ربوہ کی شورزدہ زمین اور کھاری پانی کی وجہ سے سبزہ وگل اُگانا بہت محنت طلب اور مشکل تھا لہٰذا اسے نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت تھی۔ کالج میں ڈی کی شکل کا ایک باغیچہ تھا جس میں گھاس اور پھول وغیرہ اگائے گئے تھے۔ ہمارے کالج میں داخلے سے بہت پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ ایک گدھا کسی طرح اس ڈی میں داخل ہو کر گھاس چرنے لگا۔ اس واقعے پر کالج کی ایک طالبہ، باجی قدیر نے اپنی مشہور نظم ''ڈی'' لکھی جو اکثر ان سے فرمائش کر کے سُنی جاتی تھی۔ وہ یہ نظم اپنے مخصوص ترنم میں سناتیں تو مزا آ جاتا۔

کالج کے ایک لان میں جو سٹاف روم اور پرنسپل کی رہائش گاہ کے درمیان واقع تھا اینٹوں سے تعمیر کردہ چار منزلہ گول کیاریوں میں خوبصورت رنگ برنگے پھول اگائے گئے تھے۔ ہم اس علاقے کو ''بیوٹی سپاٹ'' کہتے تھے۔ اس سپاٹ میں بھی داخلہ منع تھا مگر ہم کبھی کبھار موقع پا کر اس میں گھس ہی جاتے اور تصویر کشی کا شوق پورا کر لیتے۔ انتظامیہ کی نظر بچا کر ان کیاریوں سے پھول توڑنے کا مزا اپنا ہی تھا۔

جلسۂ تقسیم انعامات واسناد کالج کی ایک نہایت پُروقار تقریب ہوتی تھی۔ کئی دن پہلے سے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں پوزیشنز حاصل کرنے والی طالبات کی فہرستیں بننے لگتیں اور انعامات پیک کیے جانے لگتے۔ یہ تقریب کالج سے ملحق لجنہ ہال میں منعقد ہوتی تھی۔ تقریب سے کچھ روز پہلے کالج انتظامیہ ہال حاصل کر لیتی اور طالبات اس کی صفائی کے ساتھ ساتھ اس کی حتی المقدور سجاوٹ بھی کرتیں۔ ہاتھ سے تیار کیے گئے چارٹس دیواروں پر آویزاں کیے جاتے، اسے پھولدار گملوں سے سجایا جاتا، سٹیج پر تین بڑی بڑی خوبصورت کرسیاں رکھی جاتیں اور ان کے آگے رکھے گئے میز کو کڑھائی والے میز پوش سے ڈھک کر اوپر گلدستہ رکھ دیا جاتا۔ پھر طالبات کالج سے کرسیاں اٹھا اٹھا کر ہال میں رکھتیں۔ سب سے آگے خاص مہمانوں کے لیے صوفہ رکھا جاتا جو سٹاف روم یا دفتر سے اٹھا کر لایا جاتا تھا۔ ڈائس اور مائیک کا بندوبست بھی ہوتا۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں ایک بار بیگم محمودہ سلیم وزیر تعلیم تشریف لائیں۔ ایف اے کے امتحان میں بورڈ میں ٹاپ کرنے پر نقرئی تمغہ مجھے ان ہی کے ہاتھوں ملا تھا۔ بی اے میں تھی تو بیگم وقار النساء تشریف لائیں۔

کالج کی لائق طالبہ ہونے کی وجہ سے مجھے تقریبات کے بعد مہمانانِ خصوصی کے ساتھ لنچ یا ڈنر میں بھی مدعو کیا جاتا جس کی وجہ سے مجھے ان سے ذاتی تعارف اور گفتگو کا موقع ملتا رہا جو اس وقت ایک بڑا اعزاز محسوس ہوتا تھا۔

اس موقع پر جب کسی طالبہ کو نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں نمایاں کامیابی پر انعام ملتا تو سارا ہال تالیوں اور بارک اللہ کی صدا سے گونج اٹھتا۔ جو طالبہ کالج میں قیام کے دوران نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں عمدہ کارکردگی کے علاوہ بہترین اخلاقی اوصاف کا مظاہرہ کرتی اسے ''آل راؤنڈ گڈ گرل'' کا ایوارڈ ملتا جو اس ماحول میں ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں اس اعزاز کی بھی حقدار قرار پائی۔

مینا بازار کالج کا ایک اہم فنکشن ہوتا تھا۔ اس دن کالج رنگین آنچلوں اور ماکولات ومشروبات کے لاتعداد سٹالز سے سج جاتا۔ کالج میں تعطیل ہوتی اور طالبات کے علاوہ ربوہ کی خواتین کو بھی شمولیت کی دعوتِ عام ہوتی چنانچہ صبح سے لے کر شام ڈھلے تک کالج میں خوب گہما گہمی رہتی۔ کھانے پینے کے سٹالز چھوٹے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی توجہ کا بھی خصوصی مرکز بنے رہتے۔

ٹک شاپ لجنہ ہال اور کالج کی درمیانی دیوار کے ساتھ تھی جہاں برفی، چائے، پکوڑے، آلو چنے کی چاٹ اور فروٹ ملتا تھا۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں ایک بار طالبات کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے کلاس رُومز کم پڑ گئے تو لان میں ایک ٹینٹ لگا کر کلاس روم بنایا گیا۔ بعض اوقات تیز ہوا یا کسی طالبہ کی شرارت کی وجہ سے ٹینٹ گر جاتا تو عجیب سی صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ کبھی کبھار یہ ٹینٹ اساتذہ کی نظروں سے چھپنے کے کام بھی آتا۔

کالج میں چار سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ بعد میں دو سال پنجاب یونیورسٹی میں گزرے۔ پھر تلاشِ معاش کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب میں ملازمت کی تکمیل کے بعد ریٹائر بھی ہو چکی ہوں لیکن کالج میں گزرے ہوئے خوبصورت دنوں کی یاد ذہن میں ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔

یہ تو تھا جامعہ نصرت کا ذکر فیروزہ کی زبانی۔ اب اس ''پری وَش'' کا ذکر سیّدہ نزہت الماس کی زبانی سنئے جو آج کل اپنے حلقۂ احباب میں نُزہت صدیقی کے نام سے معروف ہیں اور کینیڈا میں مقیم جامعہ نصرت کی ایک اولڈ سٹوڈنٹ ہیں۔ وہ ڈاکٹر سیّد بشیر احمد کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے منڈی بہاؤالدین سے میٹرک اور لاہور کالج فار ویمن سے ایف اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۶ء میں جامعہ نصرت میں داخلہ لیا اور پھر لیڈی میکلیگن سے بی ایڈ اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کر کے بہاولپور کے کسی سرکاری کالج میں لیکچرر ہو گئیں۔ وہ ساہیوال میں بھی رہیں تاہم ۱۹۷۹ء میں کینیڈا منتقل ہو گئیں۔ انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق تھا چنانچہ جلد ہی انہوں نے یونیورسٹی آف ٹورانٹو سے ایم ایڈ اِن سوشل ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے امنِ عالم کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ شروع کر دی لیکن اسی عرصے میں ان کے شوہر کو فالج ہو گیا اور وہ کئی سال تک صاحبِ فراش رہے۔ ان کے ضعیف العمر والد جن کی بینائی ختم ہو چکی تھی اور جن کے کولہے کی ہڈی کا فریکچر بھی ہو چکا تھا ان کے پاس تھے۔ ان دونوں کی نگہداشت اور اوپر نیچے وفات نے

ان کے مسائل میں بے پناہ اضافہ کر دیا لہٰذا وہ مزید پڑھائی کا ارادہ ترک کر کے منسٹری آف سٹیزن شِپ کے فیملی وائلینس پروگرام میں کوآرڈینیٹر کے طور پر کام کرنے لگیں۔ وہ اس عرصے کو اپنی زندگی کا انتہائی باثمر دور قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فیملی وائیلنس کی کونسلر اور کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے انہیں مظلوم عورتوں اور ان مردوں کی کونسلنگ کرنے کا موقع ملا جو غصہ پر قابو نہ پانے کی وجہ سے زیادتی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اس کام کے دوران ہمیشہ کوشش کی کہ خاندان ٹوٹنے نہ پائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مرد ہو چاہے عورت، کسی کو دوسرے پر کسی قسم کی زیادتی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وہ بچوں کے معاملے میں بے حد حساس ہیں اور کہتی ہیں کہ ماں باپ بچوں سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن آپس میں جھگڑتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی اس روش کا ان کے بچوں کی شخصیت پر کتنا منفی اثر پڑتا ہے۔ بچے کی متوازن اور صحت مند شخصیت کے لیے اس کی زندگی میں ماں اور باپ دونوں کی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جھگڑوں کے نتیجے میں علیحدگی کی صورت پیدا ہو جائے تو بچہ اپنے اس جائز حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور محبت سے بے شمار جوڑوں کی خانگی زندگی کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مزدوروں اور فیکٹری ورکرز کے حادثوں اور بیماریوں کی صورت میں یونیورسٹی ہیلتھ نیٹ ورک ٹورانٹو، ورکمین کمپنسیشن بورڈ اور ٹریبونلز میں ان کے کیسز میں مدد بھی کرتی رہی ہیں۔

کچھ ہی سال گزرے تھے کہ نزہت صدیقی ہائی وے پر ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گئیں۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو اپنا کچھ کام شروع کیا لیکن اب ان کا بڑا بیٹا پڑھ لکھ کر ان کا دست و بازو بن گیا ہے لہٰذا وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو چکی ہیں اور اپنے موجودہ شوہر، ڈاکٹر طاہر قاضی (جو قاضی محمد نذیر لائلپوری کے عزیزوں میں سے ہیں اور بفلو میں پریکٹس کرتے ہیں) کے ساتھ قدرے مطمئن زندگی گزار رہی ہیں۔

نزہت بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ وہ بتاتی ہیں: ''ہمارے گھر کا ماحول بہت لٹریری تھا۔ میرے والد پیشہ کے اعتبار سے تو ڈاکٹر تھے لیکن انہیں پنجابی صوفیانہ کلام بہت پسند تھا اور وہ اپنی گفتگو میں یہ اشعار بکثرت استعمال کرتے تھے۔ میری والدہ کو مطالعے کا شوق تھا اور میرا خیال ہے اردو ادب کی ہر قابلِ ذکر کتاب ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ شاید یہ اس ماحول کا اثر تھا کہ میری طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف راغب ہو گئی اور ابھی دوسری یا تیسری جماعت میں تھی کہ چھوٹے موٹے شعر گھڑنے لگی۔ ہمارے گھر میں بیت بازی کی محفلیں بھی ہوتیں جس کی وجہ سے مجھے آہستہ آہستہ اساتذہ کے بہت سے اشعار ازبَر ہو گئے۔ میری سہیلیوں اور اساتذہ کو اس بات کا علم تھا چنانچہ جب میں لاہور کالج فار ویمن میں داخل ہوئی تو میری ایک لیکچرر، مسز خان نے فرمائش کی کہ میں کالج میگزین کے لیے غزل لکھوں۔ میں نے کوشش کی اور جلد ہی ایک غزل مکمل کر کے ان کے حوالے کر دی۔ موصوفہ نے اسے پسند کیا اور کالج میگزین میں شائع کر دیا۔ اس کے دو شعر جو مجھے اب بھی یاد ہیں سنائے دیتی ہوں:

یہ صلہ دیا مرے ہمنشیں، مرے پیار کا یہ صلہ دیا
مرے آشیانے کو لُوٹ کے مجھے خاک و خوں میں ملا دیا

وہ تو ڈر رہے تھے پیامبر بھی پیامِ یار نہ جان لے
میں نے سب کے سامنے خط لکھا اور نامہ بر کو کُھلا دیا

جب نزہت جامعہ نصرت میں داخل ہوئیں تو ان کی ہمجولیوں کو بھی جلد ہی ان کے اس شوق کا علم ہو گیا اور آہستہ آہستہ ان کی یہ شہرت باہر بھی پھیل گئی۔ موصوفہ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں: میں نے محسوس کیا کہ ربوہ میں اچھے شعر کو بہت پذیرائی ملتی ہے چنانچہ مشاعروں میں خواتین بکثرت آتیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں پر تفریح کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا عوام الناس ایسے موقعوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔

وہ بتاتی ہیں: جامعہ نصرت میں میرے دو سال میری زندگی کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ میں پڑھائی میں اچھی تھی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لیتی تھی۔ میں کھیلوں میں بھی باقاعدگی سے حصہ لیتی اور انعامات حاصل کرتی تھی۔ باہر کے کالجوں سے مشاعروں کی دعوت موصول ہوتی تو مسز شاہ مجھے بھجوا دیتیں چنانچہ مجھے سرگودھا اور گجرات کے زنانہ کالجز کے علاوہ اسلامیہ کالج کوپر روڈ، لاہور کے مشاعروں میں جانا یاد ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان کالجز سے شیلڈز لے کر آئی۔

نزہت چند لمحے توقف کرتی ہیں اور پھر بتانے لگتی ہیں: اس زمانے میں ایک حکومتی ادارہ جس کا نام غالباً بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن تھا مغربی اور مشرقی پاکستان کے کالج سٹوڈنٹس کے لیے مختلف مقابلے منعقد کراتا تھا۔ یہ مقابلے لاہور میں ہوا کرتے تھے جس میں سابقہ مشرقی پاکستان سے بھی طالبات آتی تھیں۔ شاعری کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ طرح مصرع دے دیا جاتا اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اندر اس مصرعے پر ایک غزل مکمل کر کے پیش کرنا ہوتی تھی۔ الحمدللہ! مجھے دونوں سال اس مقابلے میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ فلاور ارینجمنٹ میں بھی مجھے اول انعام ملا اور یوں میری کامیابیاں کالج کی نیکنامی کا باعث بنیں۔ ان مقابلوں میں اول پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ٹی وی پر بلایا جاتا تھا۔ مجھے بھی دونوں سال دعوت ملتی رہی مگر پردے کی پابندی کی وجہ سے میں جا نہ سکی۔

جامعہ نصرت میں اپنے قیام کا زمانہ یاد کرتے ہوئے وہ مزید بتاتی ہیں: ایک بار سرگودھا مقابلے کے لیے جانے سے پہلے مسز شاہ نے وہ غزل طلب کی جو میں نے طرح مصرع پر لکھی تھی۔ دو چار دنوں کے بعد ان کے دفتر میں حاضری کا حکم ملا۔ میں سمجھی کہ شاید کسی شرارت پر ڈانٹ پڑنے والی ہے۔ ڈرتے ڈرتے ان کے دفتر میں قدم رکھا تو انہوں نے بیٹھ جانے کو کہا۔ پھر ایک خط کھولا اور کہنے لگیں ''میں نے تمہاری غزل میاں طاہر کو بھجوائی تھی کہ وہ اس کی تصحیح کر دیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ اس غزل میں تصحیح کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کے کالج میں مستقبل کی ایک بڑی شاعرہ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔'' مسز شاہ خوش تھیں اور میری خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ میں نے ان سے وہ خط مانگا مگر انہوں نے یہ کہہ کر کہ وہ اسے کالج کے ریکارڈ میں رکھنا چاہتی ہیں معذرت کر دی۔ بفضلہ تعالیٰ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی یہ پیشگوئی اس حد تک ضرور پوری ہوئی کہ میرے اشعار کو بالعموم پسند کیا جانے لگا۔

جب جامعہ نصرت کی اساتذہ کا ذکر ہو تو وہ کہتی ہیں: میں یہ اعتراف کئے بنا نہیں رہ سکتی کہ میری اساتذہ نے مجھے بہت محبت دی اور میری صلاحیتوں کو نکھارنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ سچ پوچھیں تو آج میں جو کچھ ہوں ان ہی کی بدولت ہوں۔ مجھے یاد ہے کچھ سال پہلے جماعتی انتظام کے تحت ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سامعین میں پرویز پروازی کی بیگم بھی موجود تھیں۔ انہوں نے میری طرف دیکھا تو ملاقات کے لیے آگے بڑھیں۔ میں بھی ان کی طرف بڑھی۔ جب سلام دعا ہو چکی تو وہ کہنے لگیں: عام طور پر شاگرد اپنے استادوں کو یاد رکھتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ لیں تو دو قدم آگے بڑھ کر ان سے ملتے ہیں لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹ ہے۔ ایک استاد آگے بڑھ کر اپنی شاگرد سے مل رہی ہے اور یہ سب کچھ اس کی اس شہرت کی وجہ سے ہے جو اس نے کالج میں قیام کے دوران کمائی تھی۔

ان سے ان کی پوسٹ گریجوایشن کے حوالے سے بات ہو تو وہ بتایا کرتی ہیں: بی اے میں میرے اختیاری مضامین پولیٹیکل سائنس اور سوشل ورک تھے اور مجھے اپنے نمبروں کی بنیاد پر ان دونوں مضامین میں ایم اے کے لیے وظیفہ مل سکتا تھا تاہم میرے والد جو ایک راسخ العقیدہ احمدی تھے مجھے کسی ایسے تعلیمی ادارے میں بھجوانا نہیں چاہتے تھے جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی بہت بڑے حامی تھے چنانچہ انہوں نے مجھے لاہور کے لیڈی میکلیگن کالج میں داخل کرا دیا جہاں سے میں نے بی ایڈ کیا۔ اس زمانے میں مجھے اردو شاعری کے ایک مقابلے میں ٹرافی ملی جو میں نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ہاتھوں وصول کی تھی۔

ان ہی دنوں میری ایک کلاس فیلو، نسرین صوفی نے مجھے بتایا کہ اورینٹل کالج میں لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ بیٹھتی ہیں۔ نسرین کی بات سن کر مجھے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی چنانچہ میں نے اپنے والدِ بزرگوار سے اس بات کا ذکر کیا۔ وہ خود اورینٹل کالج گئے اور اس کے پرنسپل، ڈاکٹر عبادت بریلوی سے مل کر اس خبر کی تصدیق کے بعد مجھے لاہور بھجوا دیا۔

میں اورینٹل کالج کی طالب علمی کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے انٹر ڈپارٹمینٹل سالانہ شعری مقابلوں میں حصہ لیتی اور انعامات حاصل کرتی رہی۔ اسی دور میں مجھے احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، احمد فراز، کشور ناہید، جیلانی کامران، حبیب جالب اور فیض سے ملاقات کا موقع ملا۔ دراصل ان میں سے اکثر شعری مقابلوں میں ججز کے فرائض انجام دیا کرتے تھے چنانچہ وہ میری شعری صلاحیتوں کی کھل کر تعریف کرتے۔ احمد ندیم قاسمی تو میری غزلیں اور نظمیں فنون میں بھی شائع کرتے تھے۔

ایم اے کا نتیجہ آیا تو میں فرسٹ ڈویژن لے کر یونیورسٹی میں دوم رہی تھی۔ فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے والے کے مجھ سے صرف چار نمبر زیادہ تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں پہلی پوزیشن کیوں نہ لے سکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے جلد ہی میرے اس دکھ کا مداوا کر دیا۔ ان ہی دنوں پنجاب پبلک سروس کمیشن نے اردو کی لیکچرر کی ایک اسامی مشتہر کی۔ میں نے درخواست دے دی۔ انٹرویو کے بعد میرا انتخاب کر لیا گیا جب کہ مجھ سے زیادہ نمبر حاصل

کرنے والے پیچھے رہ گئے۔ کچھ سال سرکاری ملازمت میں گزارنے کے بعد میں ۱۹۷۹ء میں کینیڈا منتقل ہو گئی۔

جب میں پاکستان سے کینیڈا منتقل ہوئی تو یہاں پاکستانی بہت تھوڑے تھے۔ اس وقت صرف ایک ادبی انجمن یہاں کام کر رہی تھی جس کا نام تھا ''انجمنِ اردو۔'' ہندوستان کے ایک بزرگ اس کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ میرے شوہر کے واقف تھے اور ان سے میرا تعارف میرے شوہر کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ انجمنِ اردو کی میٹنگز اُن کے گھر میں ہوتیں جن میں معدودے چند افراد ہی شامل ہوا کرتے تھے۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی مگر میں نو وارد تھی اور کینیڈا کے حالات سے پوری طرح باخبر نہ تھی لہٰذا صورتِ حال سے سمجھوتہ کئے رکھا لیکن کچھ عرصے کے بعد میں نے مشورہ دیا کہ اس ادارے کو بہتر طور پر منظّم کیا جائے، اسے قانونی شکل دی جائے اور اس کے اجلاس گھر کی بجائے کسی لائبریری میں ہوا کریں۔ بہر حال ہم سب کی کوششوں سے انجمنِ اردو میں کچھ جان پڑی اور اس نے شمالی امریکہ کا پہلا مشاعرہ کرایا جس میں بعض نامور شاعر شامل ہوئے۔ ان میں سے فیض احمد فیض، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام آج بھی یاد ہیں۔

میں نے ۱۹۸۳ء میں ''رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈئینز'' کے نام سے مروّجہ قانون کے تحت ایک ادارہ تشکیل دیا۔ میں اس کی فاؤنڈنگ ڈائریکٹر ہوں لیکن اس کے عہدیداروں کا انتخاب ہر تین سال بعد ہوتا ہے۔ اس کی ممبر شپ صرف ادبا شعرا کو دی جاتی ہے اور وہی اس کے لیے چندہ دیتے ہیں لہٰذا اس کے مالی وسائل محدود ہیں۔ پہلے اس فورم کا اجلاس ہر مہینے ہوتا تھا۔ ہم کسی لائبریری کا ہال کرائے پر لے لیتے تھے لیکن اب کرائے بہت بڑھ گئے ہیں جب کہ فورم کی آمدنی نہیں بڑھ پائی لہٰذا اب ہم ہر دو ماہ بعد آپس میں ملتے ہیں۔ ہم نے اس فورم کے تحت بہت سے مشہور ادیبوں اور شاعروں کو کینیڈا مدعو کیا ہے۔ ان میں جمیل الدین عالی، جان ایلیا اور انتظار حسین شامل ہیں۔ پرویز پروازی تو کینیڈا ہی میں مقیم ہیں۔ وہ بھی اس فورم کی سرپرستی کرتے ہیں اور یوں یہ فورم چل رہا ہے۔

جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے میں گلوبل پیس مُوومنٹ ایکٹیوسٹ ہوں۔ عالمی امن، ماحولیات اور روحانیت میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ پچھلے تیس سال سے میری ساری شاعری ان ہی موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔ میں نثر بھی لکھتی ہوں اور مختلف فورمز پر ٹاکس بھی دیتی ہوں چنانچہ مجھے ''پیس پوئیٹ'' یا ''امن کی شاعرہ'' کے طور پر پہچانا جانے لگا ہے۔

نزہت صدیقی نے آزاد نظم میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا اور کہیں بھی نظم کی شعریت پر آنچ نہیں آنے دی۔ ان کی ہر نظم ان کی زبان و بیان پر گرفت کی اعلیٰ مثال ہے۔ ان کی نظموں کا رِدھم ان کے موضوع اور بیان کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک خوبصورت اکائی کی شکل میں قاری تک پہنچتا ہے۔ ان کی نظمیں معاشرے کی ابتری، انسانیت کے فقدان اور مادہ پرستی کے خلاف ایک ایسی دنیا کی آرزو ہیں جس میں انصاف، مساوات اور امن ہو، جس میں تمام انسان اپنے آپ کو ایک برادری کا فرد ہونے کی حقیقت مان کر بھائی چارے کی زندگی گزار سکیں۔

اپنی ابتدائی شکل میں نزہت صدیقی کے یہ جذبات صرف اپنے وطن تک محدود تھے مگر وطن سے باہر جا کر انہیں ملٹی کلچرل اِزم کا تجربہ ہوا۔ اسلحہ کی دوڑ اور ماحولیات کی تباہی سے آگاہی نے انہیں وہ وسعتِ نظر عطا کی جس کے نتیجے میں آج وہ پورے گلوب کو اپنا وطن اور نسلِ انسانی کو اپنا کنبہ مانتی ہیں اور یہی نہیں بقول ان کے ''کرۂ ارض پر بسنے والی ہزار صورت مخلوق کا بھی انسان پر حق ہے۔'' وہ انسانی برادری میں ان حقائق کا شعور بیدار کرنے کو اپنا فرضِ اوّلین سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آج کے مادہ پرست معاشرے کو ہوا دینے والی قوتوں نے انسانوں میں تفرقہ پیدا کر کے جس طرح لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے اور تباہ کاری کے جو سامان پیدا کر لیے ہیں وہ کرۂ ارض سے نسلِ انسانی کا ہی نہیں، پوری ہستی کا نشان مٹا سکتے ہیں۔

نزہت صدیقی کی امن کے لیے ان کاوشوں کو اہلِ نظر نے سراہا۔ انہیں ۱۹۸۷ء میں دہشت گردی کے خلاف ہونے والی انٹرنیشنل اردو کانفرنس، دہلی میں قلی قطب شاہ ایوارڈ دیا گیا۔ قلی قطب شاہ اردو شاعری کی ابتدا کرنے والوں میں سے تھے۔ اسی نسبت سے امنِ عالم کی شاعری کو اردو ادب کا حصہ بنانے پر نزہت صدیقی کے ایوارڈ کو یہ نام دیا گیا۔ اسی موقع پر ان کی پہلی کتاب ''ندائے امن'' کے نام سے چھپی اور اسی کانفرنس میں اس کی رونمائی ہوئی۔ نزہت کو یہ ایوارڈ ہندوستان کے وزیرِ اعظم، راجیو گاندھی کے ہاتھوں ۲۱ نومبر ۱۹۸۷ء کو ملا تھا۔

ہندوستان میں ان کو پانچ بار مختلف کانفرنسوں اور مشاعروں میں بلایا گیا اور انہیں پونڈیچری یونیورسٹی میں شعبہ امنِ عالم کے اجرا کے موقع پر اپنے استاد کے ساتھ مل کر تحقیق کیا ہوا مقالہ پیش کرنے کا بھی موقع ملا جو تعلیم برائے امنِ عالم کے موضوع پر تھا۔ ہندوستان میں انہیں بہت سے نامور ادیبوں اور معاشرتی علوم کے ماہرین سے ملنے کا موقع بھی ملا۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں ان کے انٹرویو نشر ہوئے اور چھپتے رہے اور ان پر کالم بھی لکھے گئے ہیں۔ انہیں ''اینجل آف پیس'' کا نام دیا گیا۔ سب سے زیادہ قابلِ ذکر امرتا پریتم اور خشونت سنگھ کے کالم تھے۔ خشونت سنگھ نے ان پر لکھے گئے ہندوستان ٹائمز کے اپنے کالم کا عنوان ہی ''پیس ایمبیسیڈرس'' رکھا۔ امرتا پریتم نے نزہت صدیقی پر اپنے کالم کا عنوان ان کے موضوعات کو دیکھتے ہوئے ''برہمانڈ کی گواہی'' یعنی کائنات کی گواہی رکھا۔ انہوں نے نزہت کی امن کی شاعری کو تخلیقی اعتبار سے اردو ادب میں ایک نئی سمت کا اضافہ قرار دیا۔ وہ ممبر آف پارلیمنٹ بھی تھیں۔ انہوں نے نزہت کی ''ماحولیات'' کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کے نہ صرف پارلیمنٹ کی تقریروں میں بلکہ سوویت یونین میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل ویمن کانفرنس میں بھی حوالے دیئے۔ چند سال بعد شائع ہونے والی امرتا پریتم کی کتاب ''سات پھولوں کی گاتھا'' میں جو اُن کے سات پسندیدہ لوگوں پر تھی انہوں نے نزہت کو بھی شامل کیا۔ یہ ایک عظیم شاعرہ کی طرف سے جو انسانیت اور مساوات کی علمبردار تھی نزہت صدیقی کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ امرتا پریتم کے شوہر اور مشہور مصور امروز نے نزہت کی کتاب ''ندائے امن'' کا سرورق بنایا۔

کینیڈا کے انگریزی اخبارات ٹورنٹو سٹار اور گلوبل میل نے انہیں ''پوئیٹ آف پیس'' کا خطاب دیا ہے۔

آخر میں نزہت صدیقی کی شعری کاوشوں کی چند جھلکیاں آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان

کے نظریہ امن کے تین بنیادی رکن ہیں جو سب یکتائی کی قدرِ مشترک رکھتے ہیں یعنی پوری نسلِ انسانی کی یکتائی، نسلِ انسانی کی کرہ ارض پر موجود تمام مخلوق سے یکتائی اور نسلِ انسانی کی کائنات سے یکتائی جہاں آج کا انسان قدم رکھ رہا ہے۔ یہ تین ارکان تین قدروں پر مبنی ہیں یعنی امنِ عالم، ماحولیات اور روحانیت اور نزہت صدیقی ان ہی تین قدروں کے عمیق دائروں میں محوِ سفر ہیں اور ان کی شاعری اسی کی آئینہ دار ہے۔

ان کی نظم ''شناخت'' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

یہ نسلِ آدم
مرا گھرانہ
یہ کرۂ ارض گھر ہے میرا
مرا وطن کائنات ہے
کائنات کے صد ہزار جلووں میں ایک میں بھی
بنانے والے کی جنبشِ مُوقلم کا ادنیٰ سا معجزہ ہوں
مرا حوالہ اس ایک فنکار کا حوالہ
جو سب میں ظاہر، جو سب میں پنہاں
بنانے والا، مٹانے والا
مرا حوالہ اس ایک فنکار کا حوالہ......

ایک اور نظم ''عذاب آ رہا ہے'' کا ایک بند حاضرِ خدمت ہے:

پہاڑوں کی گہری جڑیں ٹوٹتی ہیں
زمیں کا بدن ریزہ ریزہ
سمندر کی تہ پھٹ رہی ہے
آگ کا اور ہواؤں کا اور پانیوں کا عذاب آ رہا ہے
وہ جو اس دورِ مردود سے پہلے گزرے وہ خوش بخت ٹھہرے
مگر ہم سے خوابیدہ بختوں پہ لازم ہوا ہے کہ دیکھیں ہلاکت کے رقصِ ستم خیز کو
جس کا سامان ہم نے بڑے علم و دانش، بڑے دبدبے اور بڑے شوق سے خود کیا ہے
سو اب اپنے ہاتھوں سے بوئی ہوئی فصل تو کاٹنی ہی پڑے گی
عذاب آ رہا ہے......

غزل کے کچھ اشعار بھی آپ کے ذوق کی نذر ہیں:

نشاں سے بے نشاں کا رابطہ ہے
زمیں سے آسماں کا رابطہ ہے

شبِ الہام کی چپ بولتی ہے
خموشی سے بیاں کا رابطہ ہے
دیئے کی لو ہے مٹی کے بدن میں
یقیں سے بھی گماں کا رابطہ ہے
خرد سے بھی سرِ صحرائے وحشت
سرِ آشفتگاں کا رابطہ ہے
مسلسل بہنے والے پانیوں سے
مری عمرِ رواں کا رابطہ ہے
مری پہچان بس انسانیت ہے
کہ یہ سارے جہاں کا رابطہ ہے

اوراب ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

اب جنوں کس موڑ پر، اب شوق کس منزل میں ہے
قیس کس صحرا میں، لیلیٰ کون سے محمل میں ہے
کون ہے اس شہرِ ناپرساں میں اب دل کا رفیق
دشتِ تنہائی کا سناٹا بھری محفل میں ہے
ابر و باراں سم اثر، مسموم ہیں اب بحر و بر
پھر بھی امکانِ نمو اس دہرِ آب و گِل میں ہے

اگر چہ موصوفہ وطنِ عزیز سے دُور ہیں لیکن یہاں کے حالات سے بے خبر نہیں ۔ مساجد اور امام بارگاہوں پر خودکش حملوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والے جانی نقصان کی خبریں ان تک پہنچتی ہیں تو وہ آزردہ ہو جاتی ہیں ۔ اسی لیے کہتی ہیں:

مارنے والوں کی دیکھو کیسی فنکاری ہے
مسجد کی دہلیز سے ممبر تک گلکاری ہے
جسموں کے گلدانوں میں تھے پھولوں جیسے لوگ
ان پھولوں سے خالق کے گھر میں گلباری ہے

خودکش حملے اور اس کے نتیجے میں مرنے والے بے گناہوں کے جنازے انہیں پریشان کر دیتے ہیں ۔ وہ حیران ہیں کہ لوگ کون سے دین کی خدمت کر رہے ہیں ۔ المیہ یہ ہے کہ کفر کو ایمان، تیرگی کو روشنی، جبر کو عدل، ظلم کو امن، بندگانِ جہل کو صاحبانِ عرفان، عبادت گاہوں میں خونِ ناحق کو بندگی کی شان اور شر کو خیر سمجھا جا رہا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے ان کے یہ اشعار:

وہم کو ایقان سمجھا جا رہا ہے
کفر کو ایمان سمجھا جا رہا ہے
گمرہی کی تیرگی میں زندگی کا
راستہ آسان سمجھا جا رہا ہے
جبر کے باضابطہ قانون کو اب
عدل کی میزان سمجھا جا رہا ہے
ظلم کی اندھی قیادت کا حوالہ
امن کی پہچان سمجھا جا رہا ہے
حیف کہ اب بندگانِ جہل کو بھی
صاحبِ عرفان سمجھا جا رہا ہے
خیر کو جھٹلا دیا ہے اور شر کو
ترا فرمان سمجھا جا رہا ہے
خودکشی سے مارنے مرنے کا مجرم
دین پر قربان سمجھا جا رہا ہے
مسجدوں میں خونِ ناحق کو خدایا
بندگی کی شان سمجھا جا رہا ہے

نزہت صدیقی کی باتیں تمام ہوئیں ۔ اب جامعہ نصرت کے بارے میں کچھ باتیں میری اہلیہ، راشدہ طاہر کی زبانی جو چوہدری بشیر احمد، چیف انجینئر، لاہور میونسپل کارپوریشن کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں ۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، کارخانہ بازار، لائلپور سے پاس کیا تھا جہاں ان کے والد بزرگوار اُن دنوں ڈسٹرکٹ کونسل کے ایگزیکٹو انجینئر تھے تاہم وہ کسی وجہ سے کسی مقامی کالج میں ان کے داخلے کے لیے بروقت درخواست نہ جمع کرا سکے ۔ جب انہوں نے اپنا یہ مسئلہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین، کارخانہ بازار کی پرنسپل، مس عبداللہ کے سامنے رکھا تو انہوں نے تجویز کیا کہ اگر اس بچی کو گرد و نواح کے کسی کالج میں داخل کروایا جا سکتا ہو تو کچھ دنوں کے بعد اس کی مائیگریشن لائلپور ہو سکتی ہے ۔ انہوں نے ہی بتایا کہ جامعہ نصرت، ربوہ میں داخلے کی تاریخ ابھی باقی ہے چنانچہ راشدہ نے جامعہ نصرت میں داخلہ لے لیا ۔ وہ بتایا کرتی ہیں: ربوہ میرا دیکھا بھالا تھا ۔ ہم ہر اجتماع اور جلسہ سالانہ پر وہاں جایا کرتے تھے اور سہیلیوں، رشتہ داروں سے ملاقات اور روحانی مائدہ سے خوشہ چینی سے لطف اندوز ہوتے تھے ۔ یوں بھی لائلپور سے ربوہ ایک گھنٹے کا راستہ تھا اور وہاں پر ہمارے بہت سے عزیز آباد تھے اس لیے وقتاً فوقتاً وہاں جانے کا موقع ملتا رہتا تھا ۔ جب مجھے پتا چلا کہ میں جامعہ نصرت میں داخل ہونے جا رہی ہوں تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ اگر چہ گھر

سے نکلنے اور ماں، باپ، بہن بھائیوں سے دُوری کا غم ضرور تھا لیکن میں اِک گونہ بے خودی کے عالم میں چھلانگیں مارتی ہوئی ربوہ پہنچ گئی۔ ان دنوں پھوپھی عزیزہ وہاں رہائش پذیر تھیں۔ میں ان ہی کے پاس ٹھہر گئی۔

راشدہ کا اپنا برقع ان دنوں کسی وجہ سے قابلِ استعمال حالت میں نہ تھا اور نیا برقع فوری طور پر سِل نہیں سکتا تھا لہٰذا انہوں نے اپنی پھوپھی کا برقع پہن کر کالج آنا جانا شروع کر دیا۔

وہ بتاتی ہیں: جامعہ نصرت میں برقعوں کے لیے ایک برقع روم بنا ہوا تھا۔ میں نے پہلے روز برقع اتار کر وہاں رکھ تو دیا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ واپسی پر کس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چھٹی کے بعد جب میں برقع لینے کے لیے پہنچی تو وہاں بیسیوں لڑکیاں جمگھٹا کئے ہوئے تھیں۔ ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور معلوم نہیں کس طرح اپنا اپنا برقع پہچان کر لے جا رہی تھیں۔ میں بڑی دیر تک پریشان بیٹھی یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے سوچا کہ میں انتظار کرتی ہوں۔ جب تمام لڑکیاں برقعے لے کر چلی جائیں گی تو آخری برقع میں لے لوں گی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی میری خام خیالی تھی کیونکہ آخری برقع وہ نہ تھا جو میں پہن کر آئی تھی۔ اس کی ابری اور تھی اور نیچے والا حصہ کوئی اور۔ بہرحال مجھے یہی برقع پہن کر گھر واپس جانا پڑا۔ میرے دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ میں نے ابری کسی اور کپڑے کی اور نیچے والا حصہ کسی اور کپڑے کا پہن رکھا ہے اور برقع میرے سائز کے مطابق بھی نہیں ہے لہٰذا دل ہی دل میں کچھ شرمندگی محسوس کر رہی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ پریشانی یہ تھی کہ پھوپھی کیا کہیں گی، پہلے ہی روز میں ان کا برقع گم کر آئی ہوں۔ بہرحال گھر پہنچ کر میں نے پھوپھی کو پوری بات بتا دی لیکن خدا کا شکر ہے انہوں نے میری ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی اور جیسے تیسے وقت گزر گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے چنانچہ ربوہ میں اپنے قیام کے باقی دن مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

میری کلاس فیلوز میں صاحبزادی امۃ الصّبوح (جو اپنی ساتھیوں میں ''صبوحی' کے نام سے معروف تھیں اور بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے عقد میں آئیں) اور امۃ الرافع بنت مرزا حفیظ احمد شامل تھیں۔ خاندان حضرت مسیح موعود کی یہ دونوں بچیاں میرے ساتھ بہت محبت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ مرزا منور احمد کی بیٹی، امۃ الحیٔ مجھ سے دو یا تین سال آگے تھیں لیکن نہ جانے کیوں مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتیں۔ وہ جامعہ نصرت میں میرے دو ہفتے کے قیام کے دوران مجھے دو تین بار ٹک شاپ پر لے کر گئیں۔ ہو سکتا ہے اب میں انہیں بھول بھی چکی ہوں لیکن میں ان کے حسنِ سلوک سے آج بھی متاثر ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ کبھی ملاقات ہو۔ سنا ہے شادی کے بعد انگلستان جا چکی ہیں۔

رشتے میں میری ایک خالہ زاد بہن، فردوس جو مولوی محمد تقی کی نواسی ہیں اور آج کل امریکہ میں ہیں کالج میں مجھ سے سینئر تھیں۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتیں جس کی وجہ سے مجھے اجنبیت کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ یوں بھی مجھے علم تھا کہ مجھے جلد ہی لائلپور واپس چلے جانا ہے لہٰذا میں نے ربوہ میں اپنے قیام کو ایک پکنک کے طور پر لیا اور میرا وقت ہنسی خوشی گزر گیا۔ دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں میرا معمول تھا اور میں نے یہ وقت اسی انداز

میں گزارا۔

سچ پوچھیں تو مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ایف اے میں مضامین کیا رکھے تھے اور کون کون سی لیکچررز ہمیں پڑھایا کرتی تھیں البتہ دو نام مجھے نہیں بھولے۔ انگریزی ذکیہ عطا پڑھاتی تھیں اور اردو مبشرہ اخوند۔ دونوں محنتی اور قابل ٹیچرز تھیں۔

جامعہ نصرت کے بارے میں اپنی گفتگو سمیٹنے سے پہلے میں آپ کا تعارف نعیمہ سلہری سے کرانا چاہتا ہوں جو نیاز الدین سلہری کی صاحبزادی، ثاقب زیروی کی بہو اور طاہر زیروی کی اہلیہ ہیں۔ موصوفہ یکم جنوری ۱۹۶۸ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۶ء تک جامعہ نصرت میں اسلامیات کی لیکچرر رہیں۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ لاہور ہو گیا اور تقرری اسلامیہ کالج، کوپر روڈ میں ہوئی۔ اس ماحول میں اسلامیات کی ایک احمدی لیکچرر کو اپنی جگہ بنانے میں جو دِقتیں پیش آ سکتی ہیں موصوفہ نے ان سب کا مقابلہ کیا اور اکتیس سال کی مسلسل ملازمت کے بعد اکتوبر ۲۰۰۷ء میں ریٹائر ہوئیں۔ اگرچہ انہیں جامعہ نصرت میں قریباً نو سال ہی پڑھانے کا موقع ملا تاہم وہ اسے اپنی زندگی کا سب سے یادگار حصہ تصور کرتی ہیں۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں کہ انہیں چھوٹی آپا کی سرپرستی میں مسز شاہ کے زیرِ سایہ اس ادارے کی خدمت کا موقع ملا۔

اللہ تعالیٰ نے نعیمہ سلہری کو قابلِ تعریف حافظے سے نوازا ہے چنانچہ انہیں اب تک اپنی اکثر رفقائے کار کے نام یاد ہیں۔ اُن کی روایت کے مطابق اس دور میں انگریزی پڑھانے پر مس اریبہ، مس وحیدہ سلطانہ، مس صفیہ بھٹی، مس ذکیہ اور مس صادقہ رمضان مامور تھیں۔ اردو کی بات ہو تو وہ مس مبارکہ انجم، مس مبشرہ اخوند، مس امۃ الحفیظ اور مس امۃ الکریم وزیر کا نام لیتی ہیں جب کہ اسلامیات وہ خود پڑھاتی تھیں اور اس شعبے کی صدر مسز بشریٰ بشیر تھیں۔

وہ بتاتی ہیں کہ اس عرصے میں جن خواتین نے عربی پڑھائی ان میں مس سعیدہ احسن، حمامۃ البشریٰ اور قانتہ راشد شامل ہیں جب کہ دینیات رضیہ درد پڑھاتی تھیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اُس زمانے میں تاریخ کا مضمون مس طاہرہ کلثوم اور مس حامدہ کی ذمہ داری تھا جب کہ سیاسیات صادقہ قمر اور امۃ الوہاب کا شعبہ تھا۔ اکنامکس محمودہ قریشی اور ان کے بعد رفعت شہناز پڑھاتی تھیں جب کہ ریاضی کی لیکچررز میں مس حسین، مس رضیہ فردوس، مس امۃ الحنیف اور مسز امۃ الحفیظ عابدہ شامل تھیں۔ فلاسفی مسز امۃ المجید، فارسی مس رشیدہ تسنیم جب کہ سوشل ورک دُرِّ نجف پڑھایا کرتی تھیں جو مسز شاہ کی بہو تھیں۔ کالج میں سپورٹس کی انچارج حمیدہ خلجی تھیں جب کہ لائبریری محمودہ عصمت، طاہرہ اور حمیدہ راشدہ کی نگرانی میں تھی۔

نعیمہ سلہری کی روایت کے مطابق اس زمانے میں کالج کے آفس میں تین لیڈی کلرکس ہوا کرتی تھیں جن کے نام تھے ناصرہ، انیسہ اور حمیدہ۔ ہیڈ کلرک مبارک احمد تھے۔ اُن دنوں ہوسٹل وارڈن آپا جان نعیمہ تھیں اور کالج کی مددگار کارکنوں میں مائی حمیدہ اور مائی نواب شامل تھیں جب کہ یعقوب اور لطیف مالی کا کام کرتے تھے۔

وہ بتاتی ہیں: ۱۹۷۲ء میں کالج قومیائے گئے۔ اس سے قبل کالج کا ماحول انتہائی سادہ، پُروقار اور

خوبصورت تھا۔ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اکثر اس کالج کی کسی نہ کسی طالبہ کی کوئی نہ کوئی پوزیشن آتی۔ کالج کی طالبات بی اے کی ڈگری کے ساتھ ساتھ ان چار سالوں میں قرآنِ مجید باترجمہ ختم کرلیتیں۔ دینیات سوسائٹی کی طرف سے ترجمہ قرآن میں اول، دوم اور سوم آنے والی طالبات کو ایک خاص تقریب میں میڈل دیئے جاتے چنانچہ میرے قیام کے دوران حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث ایسی بعض تقاریب میں تشریف لائے۔ اسی طرح لجنہ اماء اللہ کی پچاس سالہ تقریبات میں بھی حضور تشریف لائے تھے۔

کالج کی تقریبات میں خلیفۂ وقت کی بیگم اور خاندانِ حضرت مسیح موعود کی خواتین تشریف لا کر ان کی رونق دوبالا کرتیں۔ مشاعروں میں خواتینِ مبارکہ کے علاوہ گویا پورے ربوہ سے اہلِ ذوق خواتین اُمڈ پڑتیں۔ مشاعرے رات گئے تک جاری رہتے۔ اس شہر کے امن و امان اور سیکیورٹی کا کیا کہنا کہ کسی خاتون یا بچی کو تنہا گھر واپس جانے میں خوف کا احساس نہ ہوتا۔

ہوسٹل میں کثیر تعداد میں دوسرے شہروں کی غیر از جماعت بچیاں بھی مقیم تھیں اور محبت و اخوت کا ایک مثالی ماحول قائم تھا۔ میرے قیام کے دوران ماریشس اور افریقہ سے آئی ہوئی کچھ طالبات ہوسٹل میں رہا کرتی تھیں۔ یہاں کئی لیکچررز بھی قیام پذیر تھیں جن میں میرے علاوہ صفیہ بھٹی، مبارکہ انجم، زاہدہ ملک، درّ نجف، متین احمد، کوثر، وحیدہ، محمودہ قریشی اور لائبریرین محمودہ عصمت شامل تھیں۔ محمودہ عصمت ہوسٹل کا راؤنڈ بھی لیتیں اور طالبات کی سٹڈی اور صفائی ستھرائی سے متعلق جملہ امور کا خیال رکھتیں۔ افسوس! یہ ماحول کالج قومیائے جانے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

جلسہ سالانہ چونکہ دسمبر کی چھٹیوں میں ہوتا تھا لہٰذا اسٹاف ممبرز اور طالبات کی اس موقع پر ڈیوٹیاں لگ جاتیں۔ گرلز کالج اور سکول کی عمارت میں زنانہ قیام گاہ ہوتی تھی۔ ان ایام میں شب و روز اس قدر مصروف گزرتے تھے کہ نیند کا نام و نشان نہ ہوتا۔

پردے کے حوالے سے جامعہ نصرت ایک مثالی درسگاہ تھی چنانچہ غیر از جماعت لیکچررز اور طالبات جو پردہ نہیں بھی کرتی تھیں کالج سے باہر پردہ ہی میں جاتیں۔

یہ تھیں جامعہ نصرت کے بارے میں نعیمہ سلہری کی کچھ یادداشتیں۔ اب مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگرچہ جامعہ نصرت کو قائم ہوئے بیس سال کا عرصہ بیت رہا تھا مگر اس میں سائنسی مضامین کی تدریس کا انتظام نہ تھا چنانچہ ربوہ کی ان طالبات کو جو ایف ایس سی کر کے میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ کالجز میں جانا چاہتیں یا کسی سائنسی مضمون میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنا چاہتیں بہر طور ربوہ سے باہر جانا پڑتا تھا۔ یہ طریقِ کار ان طالبات کے سرپرستوں کے لیے کئی طرح کی مشکلات کا باعث بن رہا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے اپنے دورِ خلافت میں اس کمی کو شدت سے محسوس کیا اور جامعہ نصرت میں سائنس کلاسز کے اجرا کا فیصلہ کرلیا تاہم اس مقصد کے لیے موجودہ بلڈنگ کو وسیع کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو سائنس بلاک کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

الفضل ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کے مطابق اُس روز حضور ساڑھے چار بجے شام جامعہ نصرت میں تشریف لائے۔ اس موقع پر دعا میں شمولیت کی خاطر جو احباب مدعو تھے ان میں قاضی محمد اسلم، ناظر تعلیم؛ ڈاکٹر سلطان محمود شاہد، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج؛ مرزا مبارک احمد، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید؛ میر داؤد احمد، پرنسپل جامعہ احمدیہ اور چوہدری فضل احمد، نائب ناظر تعلیم کے علاوہ حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم؛ چھوٹی آپا اور پرنسپل و جملہ ممبرات سٹاف جامعہ نصرت شامل تھیں۔ مدعوئین میں ایک اہم نام چوہدری محمد تقی کا بھی تھا جنہوں نے جامعہ نصرت میں تعمیر ہونے والی بیتُ الذّکر کا جملہ خرچ اپنی اہلیہ، لیڈی ڈاکٹر غلام فاطمہ کی طرف سے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ الفضل کی خبر کے مطابق: ''حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث ایدہ اللہ کی تشریف آوری پر تمام موجود احباب نے حضور کا استقبال کیا اور پھر حضور چوہدری نذیر احمد صاحب افسرِ تعمیرات، صدر انجمن احمدیہ کے ساتھ جامعہ نصرت کی بیتُ الذّکر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے گئے۔ یہ بیتُ الذّکر ہوسٹل کے جنوب مغربی کونے میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ حضرت اقدس نے بیتُ الذّکر کے مسقّف حصہ کی مغربی دیوار کے دائیں کونے میں دعائیں پڑھتے ہوئے تین اینٹیں رکھیں، بیتُ الذّکر کے قبلہ کے صحیح رُخ کے بارے میں استفسار کیا اور پھر بیتُ الذّکر کی برکات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے دعا فرمائی۔

بعد ازاں حضور نے ڈسپنسری کی عمارت کا معاینہ فرمایا اور پھر سائنس بلاک کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ بلاک جامعہ نصرت کی بڑی عمارت اور بارہ دری کے درمیانی پلاٹ میں تعمیر ہو رہا ہے۔ اس بلاک پر اندازاً سوا لاکھ روپے خرچ ہوں گے......

سائنس بلاک کیمسٹری، فزکس اور بیالوجی کی لیبارٹریز، بیالوجی میوزیم، دو لیکچر روم، تین پروفیسرز روم، تین سٹورز، بیلنس رُوم اور ڈارک رُوم پر مشتمل ہے۔ اس بلاک کے شمال مشرقی حصے کے دائیں کونے پر دعائیں پڑھتے ہوئے حضرت اقدس نے تین اینٹیں رکھیں اور پھر ایک اینٹ محترم قاضی محمد اسلم صاحب نے رکھی۔ بعدہٗ حضرت اقدس نے اس بلاک کے بابرکت ہونے کے لیے دعا فرمائی۔''

الفضل ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کی ایک رپورٹ کے مطابق سائنس بلاک کا افتتاح ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو ہوا۔ اس موقع پر ایک یادگاری تختی کی نقاب کشائی ہوئی جس پر تاریخ تنصیب سنگِ بنیاد یعنی ۸ مارچ ۱۹۷۰ء اور تاریخِ افتتاح یعنی ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء درج کرنے کے بعد ذیل کی عبارت لکھی ہوئی ہے:

''سائنس بلاک
(جامعہ نصرت)
تنصیبِ سنگِ بنیاد و افتتاح
از دستِ مبارک حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث حافظ مرزا ناصر احمد صاحب ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل اور رحمت سے اس عمارت میں پڑھنے والی
طالبات کو ملک و ملت کی صحیح اور زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے
اس بلاک کی تعمیر کا نصف خرچ لجنہ اماء اللہ کی طرف سے دیا گیا''

الفضل کی اطلاع کے مطابق ''یہ عمارت جامعہ نصرت کے وسیع میدان میں ۱۰۰×۶۰ فٹ کے رقبہ پر مشتمل ہے اور نہایت خوبصورت اور جاذبِ نظر ہے۔ یہ صدر انجمن احمدیہ کے محکمہ تعمیرات کے زیر اہتمام اور مکرم پروفیسر ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاہد ایم ایس سی، پی ایچ ڈی، صدر شعبہ کیمسٹری، تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی عمومی نگرانی میں پایۂ تکمیل تک پہنچی ہے۔ اس پر کم و بیش ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس میں دو لیکچر روم، تین لیبارٹریز، چار لیکچررز کے ذاتی کمرے اور ایک بیالوجی میوزیم بھی موجود ہے۔

لیبارٹریز سائنس کے تمام ضروری سامان سے آراستہ ہیں۔

افتتاحی تقریب کے موقع پر ممبرات مجلسِ عاملہ لجنہ اماء اللہ مرکزیہ اور ربوہ کے محلّہ جات کی لجنات کی صدروں کے علاوہ ان خواتین کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے سائنس بلاک کی تعمیر کے لیے تین صد روپیہ یا اس سے زائد رقوم بطور عطیہ پیش کی تھیں چنانچہ مختلف مقامات سے ایسی خواتین کثرت کے ساتھ تشریف لا کر اس میں شامل ہوئیں۔ ان کے نام سائنس بلاک کے بڑے دروازہ کے قریب کندہ کر دیئے گئے ہیں۔ مردوں کے لیے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام تھا۔ اس میں دیگر احباب کے علاوہ محترم صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب وکیل الاعلیٰ تحریک جدید، محترم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ پاکستان اور محترم الحاج مرزا عبدالحق صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ پنجاب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔

پونے پانچ بجے حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز تشریف لائے۔ جامعہ نصرت کی طرف سے محترم پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے، ناظر تعلیم اور محترم پروفیسر سلطان محمود شاہد صاحب نے آگے بڑھ کر حضور کا خیر مقدم کیا اور حضور کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے۔ حضور نے سب سے پہلے سنگ مرمر کی اس تختی کی نقاب کشائی فرمائی جو اِس بلاک میں نصب ہے اور جس میں اس کی تاریخِ سنگ بنیاد اور تاریخِ افتتاح درج ہے۔ پھر حضور نے تمام کمروں کا معاینہ فرمانے کے بعد خوشنودی کا اظہار فرمایا اور ضروری ہدایات سے نوازا۔ بعد ازاں حضور خوبصورت قناتوں اور شامیانوں سے مزیّن اس پنڈال میں تشریف لے گئے جہاں طالبات اور دیگر مستورات کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ حضور کے کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد تلاوتِ قرآن پاک سے کارروائی کا آغاز کیا گیا جو کہ امۃ الکریم نزہت صاحبہ نے کی۔ پھر عزیزہ امۃ الکافی صاحبہ نے مکرم الحاج چوہدری شبیر احمد صاحب کی وہ نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ کر سنائی جو الفضل کے اسی پرچہ میں شائع ہو رہی ہے۔

تلاوت اور نظم کے بعد حضرت سیّدہ مریم صدیقہ، صدر لجنہ اماء اللہ مرکزیہ نے حضور کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جس میں یہ بتایا کہ کس طرح حضرت مصلح موعود...... کی خصوصی توجہ سے جون ۱۹۵۱ء میں جامعہ نصرت کا قیام عمل میں آیا اور مرکزِ سلسلہ میں بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوا اور پھر یہ ادارہ بتدریج ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔

سپاس نامہ میں بتایا گیا تھا کہ یہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی احسان ہے احمدی بچیوں اور خواتین

پر کہ حضور نے ازراہِ شفقت سائنس بلاک کے قیام کی اجازت مرحمت فرمائی اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ حضور کی خواہش کے مطابق احمدی مستورات کو مالی قربانی کے ذریعے اس کا نصف خرچ فراہم کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ ایڈریس کے آخر میں حضور سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ حضور اب جامعہ نصرت میں بی ایس سی کلاسز کے اجرا کی منظوری بھی عطا فرمائیں تا کہ ہماری بچیاں ربوہ میں رہ کر بی ایس سی اور ایم ایس سی کر سکیں۔

سپاس نامہ پڑھے جانے کے بعد حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے تشہّد و تعوّذ کے بعد اپنا بصیرت افروز خطاب شروع فرمایا۔ حضور نے قرآن پاک کی آیت وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ تلاوت فرمائی اور پھر بتایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اس زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے یعنی انسان میں یہ طاقت رکھی گئی ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اگر چاہے تو انہیں نیک مقصد کے لیے استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا کا وارث بن جائے اور اگر چاہے تو انہیں ایسے رنگ میں استعمال کرے جو اسے ہلاکت تک پہنچا دے۔ حضور نے فرمایا: فرشتوں کی طرح کائنات کی تمام چیزوں میں بھی یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ وہ از خود کچھ نہیں کر سکتیں۔ انہیں جو حکم دیا جائے وہ صرف اس کی تعمیل کرتی ہیں اور انسانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں کو حکم دیں اور اپنی مرضی کے مطابق انہیں ترقی یا ہلاکت کے لیے استعمال کریں۔ حکم دینے کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت خدا سے دور لے جاتی ہے اور دوسری خدا کا قرب عطا کرتی ہے۔ اگر انسان خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کر کے حقیقی علم حاصل کرے تو وہ علم میں جتنی ترقی کرے گا اتنا ہی وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے نئے سے نئے جلوے دیکھے گا اور اس کے ایمان و عرفان میں ترقی ہو گی لیکن اگر وہ علم تو حاصل کرے مگر اپنے راستے سے بھٹک جائے تو پھر وہ خدا سے دُور ہو جائے گا اور اس کا علم فائدہ پہنچانے کی بجائے دنیا کی ہلاکت کا موجب بن جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضور نے فرمایا: ہم جو اپنے طلبہ اور طالبات کے لیے سائنسی علوم حاصل کرنے کا انتظام کرتے ہیں تو اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہمارے بچے ایسے رنگ میں تسخیرِ کائنات میں حصہ لیں اور دنیا کے تمام علوم کو حاصل کریں کہ وہ اپنے ایمان و عرفان میں بڑھتے چلے جائیں۔ اسلام علوم کو سیکھنے پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ ہر مسلمان کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے مگر یہ علم وہی ہونا چاہیے جس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور دنیا میں امن و سکینت کی فضا پیدا ہو، وہ علم نہیں ہونا چاہیے جسے آج دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں نے ہلاکت اور بربادی کا موجب بنا رکھا ہے اور جس نے دنیا کا امن و چین چھین رکھا ہے۔ حضور نے فرمایا: پس اے میری عزیز بچیو! بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے آپ پر۔ آپ پوری کوشش سے دُنیوی علم حاصل کرتے ہیں اور کسی سے بھی علم میں پیچھے نہیں رہنا مگر آپ کی ہر کوشش ایسی ہونی چاہیے جو آپ کو خدا کے قریب کرے نہ کہ اس سے دُور لے جانے کا موجب ہو۔ آپ کا زاویہ نگاہ درست ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی نگاہ کے شیشے میں کوئی نقص نہ ہو گا تو آپ خدا تعالیٰ کی ہر خلق اور ہر چیز میں اس کے حسن و احسان کے جلوے دیکھ سکتی ہیں کیونکہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ○ ہر

ن جو چڑھتا ہے اس میں ہم اپنے خدا کے نئے سے نئے جلوے دیکھ سکتے ہیں۔ آپ نے صرف خود ہی حقیقی علم وعرفان حاصل نہیں کرنا بلکہ دنیا کے بچوں کو بھی علم سکھانا ہے۔ پس بڑی ذمہ داری ہے جو آپ پر عائد ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ آپ اس ذمہ داری کو پوری طرح ادا کرنے کی توفیق پائیں۔ پس اپنے زاویۂ نگاہ کو درست رکھتے ہوئے علم سیکھو اور بڑھ چڑھ کر سیکھو۔ پھر اسے دنیا میں پھیلاؤ اور اس طرح خدا تعالیٰ کے بے شمار فضلوں کے وارث بنتے چلے جاؤ۔ حضور نے اپنی تقریر کے دوران آئندہ سال بی ایس سی کلاسز کے اجرا کا بھی اعلان فرمایا۔

تقریر کے بعد حضور نے اجتماعی دعا کرائی جس کے بعد حضور اس جگہ تشریف لے گئے جہاں پر مردوں کے لیے دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں پر حضور نے اپنے خدام کی معیّت میں چائے نوش فرمائی اور پھر بذریعہ کار واپس تشریف لے گئے اور اس طرح یہ تقریب بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوئی۔

حضور کے تشریف لے جانے کے بعد رات گئے تک مستورات بڑے شوق سے سائنس بلاک دیکھتی رہیں۔ اس عمارت کو اور اس سے ملحق میدان میں درختوں کو اس موقع پر خوبصورت رنگ برنگ کے برقی قمقموں سے بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا جس کی وجہ سے بہت خوبصورت منظر معلوم ہوتا تھا۔ اس تقریب کے انتظامات میں لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے علاوہ جامعہ نصرت کے سٹاف اور طالبات نے بھی پرنسپل مسز شاہ صاحبہ کی زیرنگرانی بھرپور حصہ لیا۔''

اگرچہ سائنس بلاک کا باضابطہ افتتاح تو مارچ ۱۹۷۲ء میں ہوا مگر کالج میں ایف ایس سی کلاسز ۱۹۷۰-۷۱ء سیشن سے شروع ہوگئی تھیں۔ ان کلاسز کو کیمسٹری پڑھانے پر مس امۃ المتین مامور ہوئیں، فزکس مس زاہدہ ملک کی ذمہ داری قرار پائی اور بیالوجی مس نصرت دین پڑھانے لگیں۔

یاد رہے کہ امۃ المتین فضلِ عمر ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر، ڈاکٹر عبدالاحد کی صاحبزادی اور جاوید سلطان کی اہلیہ ہیں۔ وہ ماڈل ٹاؤن لاہور کے کسی گورنمنٹ سکول سے میٹرک کرنے کے بعد چار سال لاہور کالج فارویمن میں پڑھتی رہیں اور ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے ساتھ ہی انہیں لیکچرر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ اس حوالے سے وہ کوئٹہ اور شیخوپورہ میں رہیں۔ ان ہی دنوں جامعہ نصرت میں سائنس کلاسز کا اجرا ہوا تو وہ چھوٹی آپا کی تحریک پر ربوہ آ گئیں۔ وہ دسمبر ۱۹۷۴ء تک ربوہ میں رہیں اور پھر ڈیپوٹیشن پر پہلے چھ سال یوگنڈا اور اس سے اگلے چھ سال نائجیریا میں تدریس کے شعبے سے منسلک رہیں۔ ۱۹۸۶ء میں کینیڈا منتقل ہوگئیں اور تب سے وہیں ہیں۔

زاہدہ ملک جنہیں سائنس کلاسز کے اجرا سے لے کر ستمبر ۱۹۷۴ء تک جامعہ نصرت میں فزکس کی استاد کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا ہندوستان کی ایک مشہور شخصیت، پروفیسر عبدالمجید (جو لوک سبھا کے ممبر، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے وائس چانسلر اور ممالکِ غیر میں ہندوستان کے سفیر رہے ہیں) کی صاحبزادی ہیں۔ جب انہوں نے جامعہ نصرت کے سٹاف میں شمولیت اختیار کی تو یہ ایک نجی ادارے کے طور پر کام کر رہا تھا لیکن ۱۹۷۲ء میں قومیائے جانے کے بعد اسے ایک سرکاری ادارے کی حیثیت حاصل ہوگئی چنانچہ وہ ۱۹۷۴ء میں

اپنا تبادلہ کرا کے کنیرڈ کالج، لاہور اور وہاں سے ڈیپوٹیشن پر کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض چلی گئیں۔ انہوں نے قریباً بارہ سال سعودی عرب میں پڑھایا۔ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پروفیسر کے عہدے پر فائز تھیں اور ان کا تقرر گورنمنٹ کالج برائے خواتین، بند روڈ، لاہور میں تھا۔

میں نے انہیں فون کیا تو انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ میرے ہر سوال کا تفصیلی جواب دیا۔ موصوفہ آج کل لاہور کینٹ میں رہائش پذیر ہیں اور احمدی نہ ہونے کے باوجود بعض احمدیوں سے قریبی تعلقات رکھتی ہیں۔ ''میرے والد احمدی نہ تھے'' وہ مجھے بتا رہی تھیں ''لیکن میری سات میں سے پانچ پھوپھیاں احمدی گھرانوں میں بیاہی گئیں۔'' ان ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ محمد یونس جو اپنی ملازمت کے آخری دنوں میں ریلوے پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور میرے کرمفرماؤں میں سے تھے ان کے سگے پھوپھا تھے۔ اسی طرح پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے قمر سردار خان (جن سے میرے بھی نیازمندانہ تعلقات رہے) ان کی ایک پھوپھی کے داماد تھے۔

وہ احمدیوں کے حسنِ اخلاق کی گرویدہ ہیں اور ان کی تعریف میں رطبُ اللّسان۔ ''یہ ٹھیک ہے بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں نے باضابطہ طور پر احمدیت قبول نہیں کی'' وہ کہتی ہیں ''لیکن سچ پوچھیں تو میرا دل آپ کے ساتھ دھڑکتا ہے اور میں سمجھتی ہوں یہ میری احمدی دوستوں کی دعائیں ہی ہیں جن کی وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض دفعہ بہت مشکل حالات سے باہر نکالا۔''

''آپ کو جامعہ نصرت میں ملازمت کا خیال کیسے آیا؟'' ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

''میری ایک سہیلی ہیں، امۃ المتین۔ وہ منیر احمد فرخ، سابق امیر جماعت احمدیہ، اسلام آباد کی بہن ہیں۔ جب جامعہ نصرت میں سائنس کلاسز کا اجرا ہوا اور امۃ المتین وہاں کیمسٹری کی لیکچرر مقرر ہوئیں تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فزکس میں لیکچررشپ کے لیے درخواست دوں۔ میں نے ان کے کہنے پر درخواست تو دے دی لیکن ایک انجانا سا خوف تھا کہ شاید منتخب نہ ہو پاؤں مگر جب مسز شاہ کو میرے حالات کا تفصیلی علم ہوا تو انہوں نے بخوشی مجھے جاب دے دیا۔''

''اس دور کا کوئی خاص واقعہ؟''

''بہت سے واقعات ہیں لیکن صرف ایک عرض کروں گی'' ادھر سے جواب آیا ''جب ہم لوگوں کا تقرر ہوا تو کالج کی وائس پرنسپل، بشریٰ بشیر ہمیں چھوٹی آپا سے ملاقات کے لیے لے گئیں۔ چھوٹی آپا نے میرے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی سنا تو وہ بے حد خوش ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایک بار جب ہندوستان کی جماعت کو کوئی مشکل درپیش تھی اور اس کا حل نظر نہیں آ رہا تھا تو حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد نے میرے ابا کے نام ایک خط کے ذریعے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے جماعت کی مدد کا کوئی راستہ نکالیں۔ میرے ابّا نے قادیان سے جماعت احمدیہ کے وفد (جس میں مرزا وسیم احمد اور عبدالحمید عاجز شامل تھے) کی ملاقات پنڈت نہرو سے کرائی اور ان کی اعانت سے جماعت کا وہ

مسئلہ حل ہو گیا۔"

"بہت خوب!"

"مجھے معلوم نہیں اس واقعے کا ذکر تاریخِ احمدیت میں کسی جگہ موجود ہے یا نہیں لیکن بعد میں قادیان میں میری ملاقات مرزا وسیم احمد سے ہوئی تو انہوں نے از خود یہی واقعہ مجھے سنایا اور کئی سال بعد انگلینڈ میں اپنی پھوپھی، شاہدہ ریاض سے ملنے گئی تو اتفاقاً عبدالحمید عاجز بھی وہاں آ گئے۔ انہیں میری موجودگی کا علم ہوا تو انہوں نے بھی یہ بات مجھے بتائی تھی۔"

"اچھا! آپ قادیان بھی جا چکی ہیں؟"

"جی ایک بار نہیں بلکہ دو بار۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ کا تعلق امرتسر سے ہے۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں امرتسر جا کر ان کا مکان دیکھ کر آؤں۔ میں اسی حوالے سے ہندوستان گئی تھی۔ قادیان وہاں سے دُور نہ تھا چنانچہ میں دو بار وہاں سے ہو آئی ہوں۔ آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں لیکن قادیان میں قیام کے دوران میں نے بیت الدّعا میں نمازیں بھی پڑھی ہیں۔"

"آپ کا جماعت کے کسی اور فرد سے بھی رابطہ ہے؟"

"میرا کچھ لوگوں سے رابطہ ہے۔ ابھی کل ہی میری بات صاحبزادی امۃ القدوس سے ہوئی ہے۔ جامعہ نصرت میں تدریس کے دوران میرا قیام ہوسٹل میں تھا۔ وہاں مجھے جو بہت اچھی دوستیں ملیں ان میں نعیمہ سلہری شامل ہیں۔ خدا کے کرم سے یہ دوستی آج بھی قائم ہے۔ میں ان کے خسر، ثاقب زیروی کو "ماموں جان" کہا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے تھے۔ ان کے ایک بیٹے کی شادی تھی۔ گھر میں مہندی کا فنکشن تھا۔ نعیمہ نے کسی وجہ سے مجھے اس میں بلانا مناسب نہیں سمجھا لیکن شام کے وقت جب سب لوگ اکٹھے ہوئے تو ثاقب زیروی نے میری غیر حاضری محسوس کی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ میں تو اس فنکشن میں مدعو ہی نہیں تو انہوں نے فوراً خود مجھے فون کر کے شامل ہونے کی دعوت دی۔ میں اس وقت سر کو تیل لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وقت کی تنگی کے پیشِ نظر مجھے اسی حالت میں فنکشن میں شامل ہونا پڑا۔"

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے جامعہ نصرت میں بیالوجی کی سب سے پہلی استاد مس نصرت دین تھیں جو جلد ہی یہ ادارہ چھوڑ کر چلی گئیں۔

اس کالج نے جسے احمدی خواتین کی تعلیم و تربیت کی غرض سے قائم کیا گیا تھا اپنے مقاصدِ حسنہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور یہاں سے بہت سی ایسی طالبات نکلیں جنہوں نے اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور یا پنجاب یونیورسٹی کی سطح پر نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ان طالبات میں سے فیروزہ اور قانتہ شاہدہ بنت قاضی محمد رشید خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فیروزہ نے ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۵ء میں علی الترتیب انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانات میں بورڈ اور یونیورسٹی میں طالبات میں اول پوزیشن حاصل کی جب کہ قانتہ شاہدہ ۱۹۶۴ء میں بی اے کے امتحان میں یونیورسٹی کی طالبات

میں اول رہیں۔

انفرادی مضامین میں یونیورسٹی کی سطح پر پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبات کی فہرست قدرے طویل ہے تاہم ان کے ذکر سے پہلے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ "دی کیلنڈر آف دی یونیورسٹی آف دی پنجاب فار دی ییئر ۶۴ ـ ۱۹۶۳ء" جلد اوّل میں درج قواعد و ضوابط کے مطابق پنجاب یونیورسٹی مختلف امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو طلائی اور نقرئی تمغوں سے نوازتی رہی ہے۔ ان تمغوں میں سے تین کا تعلق بی اے کے امتحان سے ہے بشرطیکہ امتحان پاس کرنے والوں کا ایک اختیاری مضمون عربی ہو۔ ان قواعد کے مطابق "خلیفہ محمد حسین جوبلی میڈل" اور "ڈین مالیر کوٹلہ میڈل" نامی طلائی تمغہ جات بی اے پاس کرنے والے اُن طلبہ میں سے مجموعی طور پر اوّل پوزیشن حاصل کرنے والے طالب علم کو عطا کئے جاتے تھے جن کا ایک مضمون عربی ہوتا۔ تیسرا میڈل جس کا نام "خان بہادر چوہدری محمد حسین مبارک علی گولڈ میڈل" تھا بی اے پاس کرنے والی اُس طالبہ کو دیا جاتا تھا جس نے عربی کے مضمون میں جملہ طالبات میں اوّل پوزیشن حاصل کی ہو۔

جامعہ نصرت کی میڈل حاصل کرنے والی طالبات کا ذکر سعیدہ حبیب کے نام سے شروع ہوتا ہے جو جامعہ نصرت کے پہلے بیچ میں شامل تھیں۔ وہ ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی میں عربی پڑھنے والی جملہ طالبات میں اول رہیں اور "خان بہادر چوہدری محمد حسین مبارک علی گولڈ میڈل" کی مستحق قرار پائیں۔

اگلا میڈل دو سال بعد حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل کی صاحبزادی، سیّدہ امۃ الرفیق کے حصے آیا کہ انہوں نے بھی عربی کے مضمون میں یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

اس حوالے سے امۃ الرشید غنی اور امۃ الحمید کے اسمائے گرامی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ امۃ الرشید غنی قریشی عبدالغنی نلکا ساز (جنہوں نے ربوہ میں پانی کی تلاش کے حوالے سے اہم خدمات سرانجام دی تھیں) کی صاحبزادی تھیں جب کہ امۃ الحمید عبدالرحیم دیانت، درویش قادیان کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۹۵۹ء میں ان دونوں کو ایک ایک گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیا گیا۔

امۃ الرشید لطیف بنت چوہدری عبداللطیف بھٹہ اونر نے ۱۹۶۰ء میں بی اے کے امتحان میں عربی کے مضمون میں جملہ طالبات میں اول رہنے پر طلائی تمغہ حاصل کیا۔

اس سے اگلے سال ثریا سلطانہ بنت شیخ دلاور علی نے بی اے کے امتحان میں ان ہی تین طلائی تمغوں میں سے ایک جیتا۔

۱۹۶۴ء میں قانتہ شاہدہ بنت قاضی رشید احمد نے پنجاب یونیورسٹی سے وہ تینوں طلائی تمغہ جات حاصل کئے جن کے نام اوپر آ چکے ہیں۔

اسی سال جامعہ نصرت کی ایک اور طالبہ، امۃ الواحد بنت گیانی واحد حسین نے بی اے کے امتحان میں جغرافیہ کے مضمون میں یونیورسٹی میں اول رہ کر "ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد سلور میڈل" حاصل کیا۔

ایک سال بعد فیروزہ نے یہی تینوں تمغہ جات جیت کر قانتہ شاہدہ کی کامیابی کی یاد تازہ کر دی۔

۱۹۶۷ء میں قریشی فضلِ حق نلکاساز (برادر قریشی عبدالغنی نلکاساز) کی صاحبزادی امۃ الرفیق قریشی نے بی اے کے امتحان کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک طلائی تمغہ حاصل کیا۔

جب یہ کالج مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گیا اور تعلیمی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں اس کی طالبات کے نام کا دور و نزدیک ڈنکا بجنے لگا تو ایک حکومتی حکم نامے کے ذریعے اسے قومیا لیا گیا جس کے بعد اس کالج کی روایات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تاہم اس کے جماعتی مزاج کو ممکن حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے خاص طور پر التزامِ پردہ کے حوالے سے اس کے مسلّمہ کردار میں کوئی دراڑ نہیں پڑنے دی گئی۔ ملاحظہ ہو نعیمہ سلہری کا یہ بیان:

''ایک بار جب سرکاری افسران کی ایک ٹیم کالج بلڈنگ کے معاینہ کے لیے آئی تو طے پایا کہ کالج کی کوئی طالبہ مرد حضرات کے سامنے نہیں آئے گی۔ اس فیصلے کے تحت پرنسپل اور دو تین لیکچررز پردے کی مکمل رعایت کے ساتھ اس ٹیم کو عمارت کا معاینہ کرواتی رہیں اور کالج کی طالبات جن کی تعداد تین سے چار صد کے درمیان تھی کو کالج ہال میں بٹھا کر ان کی نگرانی میرے سپرد کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر انسان کو طریقے بھی سجھا دیتا ہے چنانچہ میں نے طالبات سے کہا کہ اسلامیات سے متعلق جو بھی سوال ان کے ذہن میں ہو وہ ایک پرچی پر لکھ کر مجھے پہنچاتی جائیں، میں باری باری سب سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرچیوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان سوالات کے جواب دینا شروع کیے جنہیں طالبات نے انتہائی خاموشی اور دلچسپی سے سنا اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا تاوقتیکہ یہ خبر آ گئی کہ سرکاری ٹیم اپنا کام مکمل کر کے واپس جا چکی ہے۔

بعد میں پتا چلا کہ ہماری اس احتیاط پسندی نے ٹیم کے اراکین پر گہرا اثر چھوڑا اور وہ جامعہ نصرت کی طالبات کی طرف سے پردے کی اسلامی اقدار کی کماحقہٗ پابندی کے حوالے سے ان کے لیے توصیفی کلمات کہے بغیر نہ رہ سکے۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس مضمون میں جامعہ نصرت کی پرنسپل، مسز شاہ کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ یوں تو میرے نزدیک موصوفہ کی خدمات کے حوالے سے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے جو کسی مناسب وقت پر ضرور لکھی جائے گی تاہم قارئینِ کرام کو فی الحال موصوفہ کے بارے میں میرے اس مختصر مضمون ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا جو اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سرزمینِ جامعہ کے ذرّے ذرّے سے عیاں: تیرے عزمِ بے پناہ کے، تیری عظمت کے نشاں

مسز فرخندہ اختر شاہ جو عام طور پر ''مسز شاہ'' کے مختصر نام سے پہچانی جاتی تھیں ۱۹۵۱ء میں جامعہ نصرت کے قیام سے لے کر ۱۹۷۵ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک اس کی پرنسپل رہیں۔ جب ان کا تقرر ہوا تو وہ محض گریجوایٹ تھیں لیکن جلد ہی انہوں نے انگریزی میں ایم اے کر لیا اور پھر اپنی ساری زندگی درس و تدریس کے لیے وقف کیے رکھی۔

موصوفہ جامعہ نصرت کی قدم بقدم ترقی کی نہ صرف چشم دید گواہ تھیں بلکہ اُن تمام حالات و واقعات اور مسائل سے بھی باخبر تھیں جن کا اس ادارے کو اپنے عہدِ طفولیت میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے ربوہ میں بچیوں کی کم از کم دو نسلوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے معاشرہ کا مفید وجود بنایا۔ ان کی اس خدمت کا اجر یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے انہیں جنت الفردوس میں اپنی تمام نعمتوں سے نواز رہا ہو گا۔

میں نے مسز شاہ کا صرف نام ہی سن رکھا ہے۔ گھر میں آپی، صادقہ یا ان کی قریبی سہیلیاں ان کا ذکر کرتیں تو معلوم ہوتا کہ کالج کی پرنسپل ایک نہایت باوقار اور ذمّہ دار خاتون ہیں جن کی زندگی کا مقصدِ واحد اس ادارے کی خدمت اور اس کے نام کی سربلندی ہے اور سوائے ایک بار کے (جب بی اے کے امتحان منعقدہ ۱۹۶۵ء کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دو گولڈ میڈلوں کی جامعہ نصرت کی ایک طالبہ کو غلط تقسیم کی اپنی شکایت کے ازالے کے لیے میرا ان سے رابطہ ہوا تھا) میرا ان سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ جب یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو اس وقت انہیں وفات پائے عرصہ گزر چکا تھا لیکن ان کے اکلوتے صاحبزادے، سیّد مشہود احمد المعروف ''شودی'' بقیدِ حیات تھے۔ وہ کالج میں مجھ سے سینئر تھے اور میں انہیں اپنے قریبی دوستوں میں شمار نہ کر سکتا تھا لیکن میں انہیں ایک معروف ڈِبیٹر کی حیثیت سے اچھی طرح پہچانتا تھا چنانچہ میں نے انہیں بذریعہ ای میل مسز شاہ کے بارے میں کچھ لکھ کر بھجوانے کی فرمائش کی۔ ابتداءً وہ رضامند بھی ہو گئے لیکن افسوس! انہیں اپنا وعدہ اِیفا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ غالباً ان کی صحت کمزور رہتی تھی چنانچہ کچھ عرصہ بعد ان کی وفات ہو گئی جس کی وجہ سے میری یہ خواہش تشنہ تکمیل رہ گئی۔

کچھ عرصہ پہلے جامعہ نصرت کے علمی مجلّہ النصرت کا تازہ شمارہ شائع ہوا ہے جس کا ایک گوشہ ''وہ اک مشعلِ عہدِ رفتہ'' کے عنوان سے مسز شاہ کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس گوشے میں ان کی بعض شاگردوں اور رفقائے کار کے تاثرات شائع کیے گئے ہیں۔ مسز طیّبہ چیمہ، پرنسپل جامعہ نصرت کی مہربانی ہے کہ انہوں نے اس رسالے کا ایک نسخہ اس عاجز کو بھی ارسال فرمایا جس کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مسز شاہ کی جامعہ نصرت کے لیے خدمات کے اعتراف کے حوالے سے یہ ایک عمدہ کوشش ہے اور اس

لائق ہے کہ نئی نسل اسے غور سے پڑھے تا اسے جماعتی خواتین کی ترقی کے لیے اپنے اسلاف کی قربانیوں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

ان مضامین سے پتا چلتا ہے کہ صبح کی اسمبلی میں مسز شاہ ضرور موجود ہوتیں اور کسی نہ کسی اخلاقی موضوع پر مختصر خطاب ان کا معمول تھا۔ پردے کی پابندی ان کا پسندیدہ ترین موضوع تھا۔ طاہرہ نسیم، ایسوسی ایٹ پروفیسر کے الفاظ میں: وہ کہا کرتی تھیں کہ اب آپ بچیاں نہیں رہیں، خواتین بن چکی ہیں، آپ کے ادارے کا نام ''جامعہ نصرت برائے خواتین'' ہے لہٰذا آپ پر پردہ لازم ہے۔ آپ تاکید کیا کرتی تھیں کہ نہ صرف گھر سے باہر پردے کا التزام کیا جائے بلکہ گھر کے اندر بھی مناسب لباس زیبِ تن کیا جائے۔

ڈاکٹر طاہرہ صدّیقہ المعروف آپا طاہرہ حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے اپنے مختصر مضمون میں ان کی اس خوبی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ وہ ہر طالبہ کی انفرادی ضروریات پر نظر رکھتیں اور مناسب رہنمائی فرماتیں۔ آپا طاہرہ ایف ایس سی کے دوران ایک دو مرتبہ ڈِبیٹس کے لیے ربوہ سے باہر گئیں تو مسز شاہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ انہیں علم تھا کہ ایک ایسی بچی جس کا مطمحِ نظر ڈاکٹر بنا ہو کے لیے ایف ایس سی کا امتحان بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں اعلیٰ نمبروں کا حصول اس کی آئندہ کامیابیوں کے لیے کتنا ضروری ہے لہٰذا اسے غیر نصابی سرگرمیوں سے ممکن حد تک اجتناب کرنا چاہیے۔ اسی پس منظر میں انہوں نے آپا طاہرہ کو نصیحت کی کہ وہ یہ شغل ترک کر کے اپنی توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھیں۔ انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور خدا کے فضل سے تعلیمی میدان میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ طیّبہ چیمہ اور رفعت شہناز کے مطابق مسز شاہ ہر طالبہ کو اس کی تعلیمی حالت سے انفرادی طور پر باخبر رکھتیں اور بورڈ یا یونیورسٹی کے امتحانات کے موقع پر پرچہ شروع ہونے سے پہلے امتحانی سنٹر پہنچ کر اجتماعی دعا کرانا ان کا معمول تھا۔ وہ اپنی شاگردوں کے ذاتی معاملات میں گہری دلچسپی لیتیں۔ صادقہ شمس لکھتی ہیں: وہ مجھے ماں کی طرح پیار کرتی تھیں اور مجھے ان سے ذاتی باتیں کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ جب میرا نکاح ہوا تو مجھے دفتر میں بلا کر پوچھنے لگیں: تمہارا میاں کیا کرتا ہے اور کون ہے؟ کیا پہلے سے کوئی رشتہ داری ہے؟ میں نے عرض کی کہ میری سگی خالہ کے بیٹے ہیں اور ان کی دو بہنیں میرے بھائیوں سے بیاہی ہوئی ہیں۔ میری بات سن کر کہنے لگیں: مائی گاڈ! اب تم اپنے بچوں کی شادیاں ان کے بچوں سے نہ کرنا۔ اس وقت تو مجھے ان کی یہ بات سمجھ نہ آئی مگر بعد میں پتا چلا کہ کزن میرجز بعض خطرناک میڈیکل مسائل کو جنم دے سکتی ہیں اور ان کا یہ مشورہ اسی حوالے سے تھا۔

طیّبہ چیمہ مسز شاہ سے انگریزی پڑھتی رہی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں: ''میرا شمار اُن خوش نصیبوں میں ہوتا ہے جن کو بحیثیت طالبہ مسز شاہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اگرچہ یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں تھا مگر ایک ایک دن ذہن پر نقش ہے۔ ۱۹۷۲ء میں سائنس بلاک کا افتتاح ہوا تو میں ایف ایس سی فرسٹ ایئر نان میڈیکل کی طالبہ تھی اور مسز شاہ ہماری انگلش کی استاد تھیں...... بے شمار غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک اور پڑھانے کا دلنشین انداز۔ ہاتھ میں

کتاب لیے، کلاس روم کے چھوٹے سے اسٹیج پر لیکچر دیتے ہوئے وہ لٹریری کہانیوں کا ایک چلتا پھرتا، جیتا جاگتا کردار لگتی تھیں۔ طالبات کی محویت اور خاموشی انگلش جیسے مشکل مضمون میں ان کی بے انتہا دلچسپی کا مظہر تھی اور یہ یقیناً ان کے طرزِ تدریس کا کمال تھا۔''

بطور استاد مسز شاہ کی بعض خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے قدسیہ طاہر، اولڈ سٹوڈنٹ لکھتی ہیں: ''ہمارا بولنا، ہمارا مسکرانا، ہمارا پڑھنا، ہمارا ایک دوسرے سے بات کرنا، ان کی ہر بات پر نظر رہتی...... ایک مادرِ مہربان کی نظر، ایک پُر اعتماد منتظم کی نظر، ایک باوقار پرنسپل کی نظر۔ اسمبلی میں آتیں تو ایک نگاہ میں بچیوں کی غلطیوں اور خامیوں کا جائزہ لے لیتیں۔ بچیوں نے اگر فُل سلیوز نہیں پہنیں تو یونیفارم کی خلاف ورزی ہے، بات کرنے کے انداز میں شائستگی نہیں جھلکتی تو خود اعتمادی کی کمی یا زیادتی ہے...... ہر صورت میں آپ کی رہنمائی موجود تھی۔ مسز شاہ کے اندر صفات کا ایک جہان آباد تھا۔ ایک ایسی خود اعتمادی جو تکبر و غرور کی نہیں بلکہ وقار کی حامل تھی۔ ان کی آنکھیں چمکتی تھیں۔''

قدسیہ طاہر مزید لکھتی ہیں: ''میرے تعلیمی سفر میں مسز شاہ کی رہنمائی میرے لیے ایک نعمت تھی۔ آپ کے بولنے کا سٹائل بہت خوبصورت تھا۔ آپ طلسماتی شخصیت کی حامل تھیں۔ پوئٹری پڑھانے کا خوبصورت انداز احاطۂ ذہن سے نہیں نکل سکتا۔ ایک سحر تھا آپ کے طرزِ تدریس میں۔ آپ کو ورڈز ورتھ بہت پسند تھا اور ورڈز ورتھ ہی کی طرح فطرت سے عشق رکھتی تھیں۔ اصول پرست مگر محبت کرنے والی اس شخصیت نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ آپ وقت کی بے حد پابند تھیں۔ پانچ منٹ کا مطلب پانچ منٹ اور دس منٹ کا مطلب دس منٹ ہی ہوتا۔ مستحکم اور مضبوط شخصیت۔''

مسز شاہ بحیثیت کولیگ کیسی تھیں، ملاحظہ ہو امۃ المجید ناصر، سابق پرنسپل کا یہ بیان کہ ''ان کا اپنے کولیگز کے ساتھ سلوک بے حد مشفقانہ تھا۔ ان کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لینا، ان کی رہنمائی کرنا اور ان کے اندازِ تدریس کو بہتر بنانا ان کی ترجیحات میں شامل تھا۔ وہ خود بھی فرض شناس تھیں اور اپنے ساتھی اساتذہ سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن انداز سے نبھائیں گی۔''

موصوفہ اپنے سٹاف ممبرز کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ رکھتیں اور ایک اچھے منتظم کی طرح ان کی رہنمائی بھی کرتیں۔ رفعت شہناز، سابق پروفیسر کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ایک سٹاف ممبر ذکر کر بیٹھی کہ اس نے انگلش کے ڈیڑھ سو پرچے ایک ہی رات میں دیکھ لیے ہیں۔ مسز شاہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مارکنگ کا معیار برقرار نہیں رہ سکتا۔ مضمون نگار بتاتی ہیں کہ لیکچررز کے معیارِ تدریس کا جائزہ لینے کے لیے وہ دورانِ لیکچر اچانک کلاس روم میں آ کر لیکچر سننے لگتیں اور بعد میں لیکچررز کو ان کی خامیوں سے آگاہ کرتیں۔ ذمہ دار اور فرض شناس اساتذہ کی بے حد قدر کرتیں اور غیر ذمہ دار اساتذہ کو سخت تنبیہہ کرتیں۔

رفعت شہناز مزید بتاتی ہیں: ایک بار مسز شاہ نے راؤنڈ لیا تو ایک کلاس جو ٹائم ٹیبل کے مطابق اس وقت ہو رہی ہونی چاہیے تھی نہیں ہو رہی تھی۔ سٹاف میٹنگ ہوئی تو انہوں نے متعلقہ لیکچرر کو اس طرف توجہ دلائی۔ اپنی

غلطی تسلیم کرنے کی بجائے وہ فوراً بولیں کہ وہ باہر درخت کے نیچے کلاس لے رہی تھیں۔ مسز شاہ کو علم تھا کہ وہ صدق بیانی سے کام نہیں لے رہیں چنانچہ کہنے لگیں: بھئی ہمیں بھی تو پتا چلے کالج کی چار دیواری میں کون سا ایسا درخت ہے جس کے نیچے پچاس ساٹھ طالبات چھپ جائیں اور نظر نہ آئیں۔

مسز شاہ کالج کے چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی ذاتی دلچسپی لیتیں۔ امۃ الحفیظ بھٹی، سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر لکھتی ہیں: لائبریری کے لیے کتب کی خریداری کا مرحلہ آتا تو مسز شاہ اپنی نگرانی میں فہرستیں تیار کرواتیں۔ ان ہی کی کوششوں سے لائبریری میں کلاسیکل ادب کی کتب، شہرت یافتہ ادیبوں کے فن پارے اور شعر و شاعری کا عہد بہ عہد ذخیرہ جمع ہوا۔ اکثر اس خواہش کا اظہار کرتیں کہ انعام یافتہ کتب بھی لائبریری میں ضرور موجود ہونی چاہئیں۔ مباحثوں کے لیے کسی بیرونی کالج میں کوئی ٹیم بھجوانے کی بات ہوتی یا کھیلوں میں حصہ لینے کا مرحلہ، مسز شاہ مقررین اور کھلاڑیوں کی ہر طرح سے رہنمائی اور مدد کرتیں۔ وہ نادار طالبات کی عزتِ نفس کا بے حد خیال رکھتیں تھیں۔ ان کے لیے نصابی کتب الگ سے منگواتی تھیں۔ آپ بے حد قانع، متوکّل اور راضی بہ رضا رہنے والی تھیں۔ طالبات سے گہری ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتی تھیں۔ آپ جامعہ نصرت کی طالبات کو اعلیٰ ترین مقام پر دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔

واقفانِ حال اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ربوہ ایک بے آب و گیاہ خطہ اراضی پر تعمیر ہوا تھا اور ابتداءً یہاں سبزہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ جب جامعہ نصرت کا افتتاح ہوا تو وہ ربوہ کا بالکل ابتدائی دور تھا اور کالج کی چار دیواری میں گھاس کا ایک تنکا تک نہ اگتا تھا۔ مسز شاہ کو اس کمی کا شدید احساس تھا چنانچہ انہوں نے اس طرف بھرپور توجہ دی۔ بہت محنت سے گھاس کے تختے اگائے گئے اور پھلواڑیاں رنگ برنگے پھولوں کی بہار دکھانے لگیں۔ مسز شاہ کی اس معاملہ میں سنجیدگی کا اندازہ امۃ الحفیظ بھٹی کے بیان کردہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی کام سے مسز شاہ کے گھر گئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ عبداللطیف مالی نے پانی کی بالٹی میں سونے کا گلوبند ڈبو رکھا ہے۔ وہ حیران ہوئیں اور مسز شاہ سے اصل ماجرا دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: وہ یہ گلوبند مجھ سے لے کر گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اگر کلّر زدہ زمین کو ایسا پانی دیا جائے جس میں کچھ دیر سونا ڈوبا رہا ہو تو پودے خوب پھلتے پُھولتے ہیں سو میں نے اسے دے دیا۔ ان کا یہی جذبہ تھا جس نے کچھ ہی سالوں میں کالج کو ایک سرسبز باغ میں تبدیل کر دیا چنانچہ النصرت کے تازہ ترین شمارے کے مطابق اس وقت جامعہ نصرت کے صحن میں ساڑھے چار سو سے زیادہ درخت موجود ہیں۔

مسز شاہ کی ذاتی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ بیوگی میں گزارا لیکن صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنے ذاتی مسائل اور پریشانیوں کو اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں روک نہ بننے دیا۔ لمۃ الباری ناصر کے الفاظ میں: ''ایک تنہا عورت کئی محاذوں پر لڑتی رہی مگر صبر، ضبط، دعا سے کام لیا۔ آستانہ الٰہی پر جھکی رہیں۔ اپنا درد اپنے خدا تعالیٰ کے حضور بیان کرتیں۔ اپنے وقار کو قائم رکھا۔ اگر کسی نے کوشش بھی کی کہ ان کے نہاں خانۂ دل میں جھانکا جائے تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے اپنے آنسو چھپا لیتیں۔''

جامعہ نصرت کے ریکارڈ کے مطابق مسز شاہ ۳۰ جون ۱۹۷۵ء کو ریٹائر ہوئیں۔ اس موقع پر ان کے لیے جو الوداعی تقریبات منعقد ہوئیں ان میں سے کسی کی تفصیل میرے سامنے موجود نہیں۔ ہاں! طاہرہ نسیم کی ایک تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس الوداعی تقریب میں ہر شخص افسردہ تھا کیونکہ آج وہ ہستی اس کالج سے رخصت ہو رہی تھی جس نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ اس موقع پر خود مسز شاہ کی اپنی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ ان کے اس فقرے سے لگایا جا سکتا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا: اس کالج سے میرا تعلق میرے مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا اور مجھے یقین ہے کہ میری روح یہیں کہیں مُنڈلاتی رہا کرے گی۔

اس تقریب میں رفعت شہناز نے بزبانِ شعر مسز شاہ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ نظم النصرت کے زیرِ نظر شمارہ میں موجود ہے۔

یہاں شاید اس امر کا ذکر بے جا نہ ہو کہ مسز شاہ کی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے جامعہ نصرت کی ایک اولڈ سٹوڈنٹ، امۃ القدیر ارشاد کی لکھی ہوئی ایک نظم ان کی بیٹی امۃ الشافی کے پاس موجود ہے۔ یقین سے کہنا مشکل ہے کہ یہ نظم اس الوداعی پارٹی میں پڑھی گئی تھی یا نہیں مگر اس کی شانِ نزول یہی تقریب ہے۔ اس نظم میں مسز شاہ کی بہت سی خوبیوں کا ذکر ہے لہٰذا اسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

آج افسردہ نظر آتی ہے کالج کی فضا
مضطرب، بے چین ہے مدہوش گُن ٹھنڈی ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے اِک تیرگی سی چھا گئی
جگمگاتی، مسکراتی سی فضا دُھندلا گئی
کس کے جانے سے چمن کی دلکشی جاتی رہی
باغباں کے ساتھ اپنی ہر خوشی جاتی رہی
پھول مرجھاتے ہوئے، کلیاں ہیں کملائی ہوئی
دیکھیے ہر شے نظر آتی ہے سنولائی ہوئی
تُو نے اس گہوارۂ علم و ادب کو دی جِلا
اپنے جوشِ علم و فن سے اس کو کندن کر دیا
تیرا اندازِ تعلّم، تیری شفقت کا سلوک
یاد ہے اب تک ہمیں تیری محبت کا سلوک
سرزمینِ جامعہ کے ذرّے ذرّے سے عیاں
تیرے عزمِ بے پناہ کے، تیری عظمت کے نشاں
پیروی میں تیری آئیں گے بہت سے رہنما
جن کا نصب العین بھی ہوگا وہی جو تیرا تھا

ہُو بہُو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
چل دیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟
الوداع شریں سخن، شیریں زباں، شیریں بیاں
الوداع جانِ چمن، روحِ رواں، زیبِ جہاں

مبشرہ بشارت، اولڈ سٹوڈنٹ کو مسز شاہ کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان سے ملاقات کا موقع ملتا رہا ہے۔ وہ کہتی ہیں: میں آج بھی چشمِ تصور سے انہیں اپنے گھر کے برآمدے میں لکڑی کے ایک تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے دیکھ سکتی ہوں۔ ملاقات ہوتی تو گزرے ہوئے واقعات کی گویا ایک رِیل چل پڑتی۔ ان کے سرہانے ایک ڈائری پڑی ہوتی تھی جس میں انہوں نے اپنی انگریزی شاعری جمع کر رکھی تھی۔ موقع ہوتا تو وہ ہمیں اپنے اشعار بھی سناتیں۔

فیروزہ کی روایت کے مطابق ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک بار ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئیں۔ مسز شاہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور دیر تک پرانی باتیں دہراتی رہیں۔ وہ قومیائے جانے کے بعد کالج کی حالتِ زار پر بے حد رنجیدہ تھیں۔ انہوں نے فیروزہ سے کہا کہ وہ اپنی ٹرانسفر یہاں کروالیں اور کالج کی حالت سنوارنے کی کوشش کریں۔ فیروزہ نے اپنی مجبوری بتائی مگر وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بہت دیر تک اس وعدے کے لیے اصرار کرتی رہیں کہ وہ اپنی تبدیلی ربوہ کروانے کی کوشش کریں گی۔ ان کی رنجیدگی اور اصرار دیکھ کر فیروزہ کو وعدہ کرنا پڑا تاہم بعد میں حالات نے انہیں اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کا موقع نہیں دیا۔

مسز شاہ سے ایک اور ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے فیروزہ بتاتی ہیں: ایک بار میں کسی کی وفات پر تعزیت کے لیے ربوہ گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ برقع میں ملبوس ایک خاتون جن کی چال ڈھال سے کمزوری عیاں ہے نظر کا چشمہ لگائے اور ہاتھ میں چھڑی پکڑے آہستہ آہستہ چلی آرہی ہیں۔ یہ مسز شاہ تھیں لیکن یہ وہ مسز شاہ نہ تھیں جنہیں میں جانتی تھی۔ انہیں دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے وہ صحت منداور چاق و چوبند مسز شاہ یاد آگئیں جو کبھی اپنے دفتر میں بیٹھی ہوتیں تو کبھی کالج کا راؤنڈ لے رہی ہوتی تھیں، کبھی اسمبلی میں طالبات کو نصائح کر رہی ہوتی تھیں تو کبھی کالج کنووکیشن کے موقع پر خطاب کر رہی ہوتی تھیں۔ تب مجھے یہ شعر یاد آگیا:

چھلتر چھلتر ہو کے بھر گئے رُکھاں ورگے بندے
تیز سمے دے رندے

مسز شاہ نے ۷ ستمبر ۲۰۰۵ء کو بعمر ستاسی سال وفات پائی۔ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی ممانی تھیں اور الفضل ۱۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کے مطابق ''وہ جامعہ نصرت کی شروعات سے...... نہایت درجہ خوش اسلوبی سے بطور پرنسپل خدمات بجالاتی رہیں۔'' ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں عمل میں آئی۔

موصوفہ کا ذکرِ خیر آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب میں ان بزرگان کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے جامعہ نصرت کے ابتدائی دور میں یہاں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔

''تم'' نے اِس گہوارۂ علم وادب کو دی جلا: اپنے جوشِ علم وفن سے اس کو کندن کر دیا

جامعہ نصرت کا افتتاح ایک ایسے وقت میں ہوا تھا جب جماعت کی خواتین میں تعلیم عام نہ تھی اور ایسی خواتین کا ملنا امر محال تھا جو کالج کی طالبات کو پڑھانے پر مامور کی جاسکتی ہوں۔ سچ پوچھا جائے عورتیں تو درکنار ایسے تعلیم یافتہ مرد بھی بہ آسانی میسر نہ تھے جن کی جامعہ نصرت میں تقرری ہوسکتی۔ اندریں حالات ابتدائی کچھ سالوں میں جن بزرگان کی خدمات اس کالج کے لیے مستعار لی گئیں ان میں پروفیسر محمد ابراہیم ناصر؛ عبدالسلام اختر؛ مولوی محمد عثمان صدیقی؛ قاضی محمد نذیر لائلپوری؛ حکیم خورشید احمد شاد؛ حضرت سیّد محمود اللہ شاہ؛ پروفیسر علی احمد بھاگلپوری؛ چوہدری علی محمد بی اے، بی ٹی؛ مرزا رشید احمد چغتائی؛ شیخ عبدالواحد؛ میجر محمد اسماعیل؛ چوہدری محمد عبداللہ؛ مولوی عطاء الرحمٰن طالب؛ میاں محمد ابراہیم جمونی اور قریشی محمد نذیر ملتانی شامل ہیں۔ ان میں سے عبدالسلام اختر، پروفیسر محمد ابراہیم ناصر، مولوی محمد عثمان صدیقی، قاضی محمد نذیر لائلپوری، حکیم خورشید احمد شاد اور میاں محمد ابراہیم جمونی کا تفصیلی تعارف ''قریۂ جاوداں'' میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔ باقی سارے بزرگان بھی ربوہ کی جانی پہچانی شخصیات تھیں تاہم ان قارئین کے لیے جنہیں ربوہ میں قیام کا کم موقع ملا ہے یا جو یہاں کے ماحول سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے ذیل میں ان کا قدرے تفصیلی تعارف کرایا جا رہا ہے:

حضرت سیّد محمود اللہ شاہ حضرت ڈاکٹر سیّد عبدالستار شاہ کے صاحبزادے، حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے ماموں اور جامعہ نصرت کی پرنسپل، مسز فرخندہ شاہ کے شوہر تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے اور اس کے چند سال بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ وہ ۱۹۴۴ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے پُرآشوب دور میں انہوں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول، چنیوٹ کی سربراہی کے فرائض سرانجام دیئے اور سکول ربوہ منتقل ہوا تو موصوف ہی اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انہوں نے ۱۶ دسمبر ۱۹۵۳ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق موصوف نے ''باوجود اپنی مصروفیت اور علالت کے حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر چند ماہ آنریری طور پر طالبات کو انگریزی پڑھائی۔''

چوہدری محمد عبداللہ سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور کے ہیڈ ماسٹر تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ منتقل ہوگئے تھے۔ وہ طالبات کو انگریزی اور اکنامکس پڑھاتے تھے۔ اپنے زمانے کے معروف ٹیسٹ کرکٹر، خان محمد کی ربوہ میں آمد چوہدری صاحب موصوف سے ملاقات کے لیے ہی تھی جو سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں ان کے استاد رہے تھے۔

مولوی عطاء الرحمٰن طالب جنہیں جامعہ نصرت میں السنۂ شرقیہ پڑھانے کا موقع ملا حضرت ماسٹر مولا بخش، رفیق حضرت مسیح موعود کے بیٹے، مولانا عبدالقادر ضیغم مربی سلسلہ کے بھائی اور حافظ بشیر الدین عبید اللہ، مربی سلسلہ کے برادرِ نسبتی تھے۔ میں نے ان کو دیکھا ہے اور تعارف کی حد تک ان سے تعلق بھی تھا چنانچہ آتے جاتے ان سے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ انہوں نے چوبیس اگست ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات پر الفضل میں ان کے بارے میں چھپنے والے مضامین سے اندازہ ہوا کہ وہ کس پائے کے انسان تھے۔ مولوی نور احمد نے اپنے ایک مضمون میں ان کی تدریسی خدمات کے علاوہ تحقیق کے ساتھ ان کے گہرے شغف کا ذکر کیا ہے جب کہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ وہ ''بہت کم آمیز، بہت کم گو اور نہایت خاموش رہنے والے اور بڑے درویش صفت انسان تھے۔ کسی سے تعلق اور واسطہ نہ رکھنے والے، سب سے الگ تھلگ رہنے والے، کسی جھگڑے قضیئے میں نہ پڑنے والے اور صحیح معنوں میں ایک گوشہ نشین انسان تھے مگر جس سے دل مل جاتا اس کے نہایت ہی گہرے دوست ثابت ہوتے...... لاہور سے میں جب ربوہ جاتا تو گھنٹوں بیٹھ کر بڑے اخلاص کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ ان کی باتوں میں اتنا رس، اتنا پیار اور اتنی محبت بھری ہوئی ہوتی تھی کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو دل بالکل نہ چاہتا تھا اور اس وقت یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے اور عوام میں بڑا خشک مزاج مشہور ہے۔...... مولوی صاحب مرحوم میں ایک خاص صفت یہ تھی کہ جس سے تعلقات قائم ہو جاتے تو پھر خواہ کتنے ہی ناگوار اور خلافِ طبع واقعات پیش آتے اور خواہ مولوی صاحب کا کتنا ہی نقصان ہوتا مگر مولوی صاحب اس سے تعلقات نہ توڑتے۔ ان کا ایک شاگرد تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے مگر اس نے ان کی محبت اور شفقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی بہت سی قیمتی چیزیں چُرا لیں اور تحقیقات سے ثابت بھی ہو گیا کہ وہی چور ہے.......... مگر مولوی صاحب نے اپنے کثیر نقصان کے باوجود اس سے کچھ بھی نہ کہا اور بدستورِ سابق اس سے مہربانی سے پیش آتے رہے بلکہ اس واقعہ کے بعد ایک دفعہ لاہور آئے تو خود اس سے ملنے کے لیے اس کے مکان پر گئے۔'' بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ''ان کی زندگی مولانا حالی کے ان اشعار کی صحیح تفسیر تھی:

جس سے کرتے تھے محبت بے ریا کرتے تھے ہم
جس سے ہوتی تھی شکایت برملا کرتے تھے ہم
شکوہ ہوتا تھا تو اکثر منہ پہ کہہ دیتے تھے ہم
شکر کرتے تھے تو غیبت میں سوا کرتے تھے ہم
دوست بن جاتے تھے جس کے اس سے کرتے تھے نباہ
عہد کرتے تھے تو عہدوں کو وفا کرتے تھے ہم
جن کے ہو جاتے تھے ساتھی ان کا ہم دیتے تھے ساتھ
رنج و راحت میں شریک ان کے رہا کرتے تھے ہم''

ان کی وفات پر النصرت میں چھپنے والی تعزیتی نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس سال تک جامعہ نصرت میں فارسی، عربی، اردو اور دینیات پڑھاتے رہے۔ اس نوٹ کے مطابق ''آپ نہایت ہی خلوص، جانفشانی اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ اس وقت جامعہ نصرت کی اکثر لیکچررز آپ کی شاگرد ہیں اور سبھی آپ کی مداح ہیں۔''

میجر محمد اسماعیل جنہوں نے ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک جامعہ نصرت میں پڑھایا مولوی اختر علی بھاگلپوری کے صاحبزادے تھے۔ میجر صاحب موصوف کے پوتے، محمد داؤد اسماعیل جو اُن کے بیٹے محمد زکریا اسماعیل کے صاحبزادے ہیں اور آج کل کینیڈا کے شہر ایڈمنٹن میں مقیم ہیں کے مطابق میجر محمد اسماعیل بھاگلپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے اور انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور پھر انگریزی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ وہ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی تھے اور اپنی یونیورسٹی کی ٹیم میں بھی شامل رہے۔

انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز پٹنہ کالج سے بحیثیت لیکچرر کیا۔ اسی دوران انہوں نے فوج کے شعبہ تعلیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کی پہلی پوسٹنگ دانا پور چھاؤنی جو پٹنہ شہر سے کچھ دُور ہے میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے وقت فوجیوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو ہندوستان کی فوج میں ہی رہیں یا پاکستانی فوج میں شمولیت اختیار کر لیں۔ انہوں نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں عربی، فارسی اور انگریزی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ اپنی ملازمت کے آخری ایام میں ان کی پوسٹنگ ڈھاکہ میں ہوئی جہاں سے وہ ۱۹۵۵ء میں بحیثیت میجر ریٹائر ہوئے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے جلد ہی بعد ربوہ منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے سات سال تک جامعہ احمدیہ اور جامعہ نصرت میں حسبِ ضرورت انگریزی، اسلامیات، عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ وہ ۱۹۶۲ء میں ربوہ سے لاہور منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ۱۹۷۶ء میں وفات پائی۔ وہ موصی تھے چنانچہ ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں ہوئی۔

محمد داؤد اسماعیل بتاتے ہیں: ان کی شادی اپنی خالہ زاد بہن، امینہ بیگم سے ہوئی تھی جن کا تعلق بھاگلپور کی قاضی فیملی سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس شادی کے نتیجے میں انہیں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائیں۔ لڑکوں کے نام محمد اسحاق اسماعیل، محمد زکریا اسماعیل، محمد سلیمان اسماعیل، محمد شعیب اسماعیل اور محمد موسیٰ اسماعیل تھے جب کہ رضیہ، آسما اور آمنہ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ ان کی اولاد میں سے محمد موسیٰ اسماعیل اور آسما کے علاوہ باقی تمام بچے وفات پا چکے ہیں۔

ہو سکتا ہے میں نے میجر محمد اسماعیل کو دیکھا ہو لیکن سچ پوچھیں تو میرے ذہن میں ان کی تصویر موجود نہیں ہے تاہم پرویز پروازی کی روایت کے مطابق موصوف محلّہ دارالرحمت غربی میں حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کے مکان کے قریب رہائش پذیر تھے۔ وہ ہمیشہ شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس رہتے تھے۔ پروفیسر شیخ عبدالقادر کے عزیزوں میں سے تھے کیوں کہ انہیں اکثر مولوی احمد علی بہاری کے ہمراہ دیکھا جاتا تھا جو حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے داماد اور صاحبزادی امۃ الرشید کے شوہرِ نامدار، میاں عبدالرحیم احمد کے والد تھے۔

چوہدری علی محمد بی اے، بی ٹی جو جماعتی حلقوں میں ''بی ٹی صاحب'' کی عرفیت سے پہچانے جاتے تھے

رفیق حضرت مسیح موعود، حضرت چوہدری نعمت اللہ گوہر کے برادرِ اصغر تھے اور انہیں خود بھی حضور کی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ ان کا خاندان ضلع لدھیانہ کے ایک گاؤں، ہٹھور کا رہنے والا تھا جہاں وہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ انہیں حضرت چوہدری نعمت اللہ گوہر کی تحریک پر ۱۹۰۶ء میں حضور کی تحریری بیعت کا شرف حاصل ہوا تاہم اگست ۱۹۰۷ء میں جب وہ مڈل سکول جگراؤں میں ساتویں جماعت کے طالب علم تھے قادیان میں حضور کی دستی بیعت سے مشرف ہوئے۔ ان کے صاحبزادے، ونگ کمانڈر طارق پرویز کی روایت کے مطابق موصوف نے اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت میں اس یادگار دِن کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے:

''تیئیس اگست ۱۹۰۷ء کو قادیان پہنچا۔ غسل کر کے، لباس تبدیل کر کے عصر کی نماز سے پہلے بیت مبارک جا پہنچا۔ اُس زمانے میں بیت مبارک بہت چھوٹی ہوتی تھی جس میں ایک صف میں پانچ یا چھ آدمی مشکل سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی۔ بیت میں میں نے پوچھا: حضرت صاحب کون سے ہیں؟ مجھے بتایا گیا کہ حضرت صاحب ابھی تشریف نہیں لائے۔ اتنے میں حضرت مسیح موعود تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر جائے نماز پر تشریف فرما رہے۔ پھر فرمایا: جو بیعت کرنے والے دوست ہیں وہ آگے تشریف لے آئیں چنانچہ خاکسار حضور کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ حضور کے دستِ مبارک میں میرا ہاتھ تھا۔ حضور نے بیعت کے الفاظ دہرائے۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہراتا جاتا تھا۔ الفاظِ بیعت عربی زبان میں تھے اور کچھ اردو میں تھے۔ گو مجھے عربی نہیں آتی تھی مگر میں عربی الفاظ صحت کے ساتھ ادا کرتا چلا گیا یا دہراتا گیا۔ وہ ایک عجیب کیفیت تھی جس کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بیعت کے بعد حضور نے دعا فرمائی۔ میرے ساتھ بیعت کرنے والے ایک دو آدمی اور بھی تھے مگر ان کے ہاتھ حضرت مسیح موعود کے ہاتھ اور میرے ہاتھ کے اوپر تھے۔ بیعت کے بعد پانچ روپے اپنی طرف سے اور پانچ روپے برادرم چوہدری نعمت اللہ گوہر کی طرف سے بطورِ نذرانہ پیش کئے جو چاندی کے سکے تھے۔ ان دس روپوں کے علاوہ جو مجھے بڑے بھائی صاحب نے دیئے تھے میری جیب میں کچھ اور روپے بھی تھے جو ایک ہی جیب میں تھے...... بڑی مشکل سے میں نے روپے نکالے اور حضور کی خدمت میں پیش کئے۔ اس کے بعد نماز شروع ہوگئی۔ حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب نے نماز پڑھائی۔ حضرت مسیح موعود مولوی صاحب کے داہنے ہاتھ کھڑے تھے۔ یہ تیئیس اگست ۱۹۰۷ء کا دن تھا اور عصر کا وقت تھا اور میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور مبارک دن۔''

بیعت کے بعد موصوف قادیان ہی میں سکول میں داخل ہو گئے۔ اسی دوران حضرت مسیح موعود کی وفات ہوئی تو انہیں حضور کے جنازے میں شمولیت اور اسے کندھا دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

وہ ۱۹۱۱ء میں میٹرک اور پھر جے اے وی کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام ہائی سکول میں بطور مدرّس کام کرنے لگے۔ اسی دوران انہوں نے بی اے اور بی ٹی کے امتحانات پاس کر لیے۔ وہ ۱۹۴۶ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ریٹائر ہوئے جس کے بعد کچھ عرصہ جامعہ احمدیہ میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۷۴ء تک جماعتی ماہنامے Review of Religions کے ایڈیٹوریل سٹاف میں

شامل رہے۔ ''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق وہ جامعہ نصرت کے ابتدائی سٹاف میں بھی شامل تھے اور طالبات کو تاریخ پڑھانے پر مامور تھے۔ ان کی اکثر شاگردیں معترف ہیں کہ وہ ایک قابل اور محنتی استاد تھے اور انہیں اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل تھا۔

انہوں نے ۱۴ جنوری ۱۹۷۹ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ روزنامہ الفضل (۱۵ جنوری ۱۹۷۹ء) نے ان کی وفات کی خبر شائع کرتے ہوئے لکھا: ''حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث......اور خاندان حضرت مسیح موعود...... کے بہت سے دیگر افراد کو پڑھانے کا آپ کو شرف حاصل ہوا اور جماعت میں تو آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ...... دیگر اہم عہدوں پر بھی خدمتِ سلسلہ کی توفیق ملتی رہی چنانچہ مختلف اوقات میں پرائیویٹ سیکرٹری حضرت مصلح موعود، نائب ناظر امور عامہ، نائب ناظر تالیف وتصنیف کے عہدوں پر کام کیا۔ جامعہ نصرت میں بھی پڑھاتے رہے......''

ان کی صاحبزادی، امۃ الباسط کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل کے مطابق: ''میرے پیارے ابا میں بہت سی خوبیاں تھیں مگر ایک خوبی جس کے بغیر ان کی شخصیت کا ذکر ادھورا محسوس ہوتا ہے وہ ہے ان کی سادگی۔ یہ سادگی ان کی طبیعت کا ایک حصہ تھی۔ وہ اتنے سادہ، صاف دل اور صاف طبیعت کے تھے کہ چالاکی، دنیاداری اور بناوٹ وظاہرداری ان کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائی تھی۔ ان کی پاک وصاف زبان ان کے صاف دل کی پرتَو تھی، ان کے سادہ ذہن کی آئینہ دار تھی۔ لباس کے معاملے میں بھی اتنے ہی سادہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں اپنی ذات کے لیے کچھ خواہش نہیں رکھتا۔ بس میری خواہش ہے کہ میری تمام اولاد دین دار ہو، جماعت کی وفادار ہو۔''

میں نے بی ٹی صاحب کو دیکھا ہے اور ان سے گفتگو کا موقع بھی ملا ہے۔ ان کا لب ولہجہ عام لوگوں سے قدرے مختلف ضرور تھا مگر وہ جماعت کے چنیدہ علماء میں سے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں گریجوایشن کی تھی جب برصغیر میں تعلیم عام نہ ہوئی تھی اور ایک لحاظ سے یہ ان کا ایک قابلِ قدر کارنامہ تھا۔

مرحوم شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور سرور تخلص کرتے تھے۔

عبدالسّلام اختر بی ٹی صاحب کے صاحبزادے تھے جب کہ لارڈ طارق احمد ان کے پوتے ہیں۔

مرزا رشید احمد چغتائی ۲۷ جولائی ۱۹۱۹ء کو شاہ پور ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نور احمد چغتائی تھا جنہوں نے ان کی پیدائش کے دو سال بعد احمدیت قبول کی تھی۔ موصوف نے مدرسہ احمدیہ سے تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل اور مربیان کا کورس مکمل کیا۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں ان کا وقف منظور ہوا۔ دو سال دارُالواقفین میں رہے جس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ان کا تقرر بلادِ عربیہ کے لیے ہوا۔ انہیں رخصت کرنے کے لیے حضرت مصلح موعود خود قادیان کے ریلوے سٹیشن پر تشریف لائے۔ وہ فلسطین، اردن، شام اور لبنان میں چھ سال تک خدمات بجالاتے رہے۔ پاکستان واپس آ کر انہوں نے نظارت اصلاح وارشاد کے تحت بطور مربی کام کیا۔ وہ دس سال تک قاضی سلسلہ بھی رہے اور انہوں نے کچھ عرصہ الفضل میں بھی کام کیا۔ انہیں دو سال تک جامعہ نصرت ربوہ میں عربی اور دینیات پڑھانے کا موقع ملا۔ اخبارات ورسائل میں لکھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ بلادِ عربیہ میں نمائندہ الفضل

بھی رہے اور وہاں پر سرکاری تقریبات میں شامل ہوتے رہے۔ بلادِ عربیہ میں آپ کی خدمات کا کچھ ذکر تاریخِ احمدیت جلد سیزدہم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انہیں دیگر اردنی شخصیات کے علاوہ شاہِ اردن سے بھی ملاقات کا موقع ملا جس دوران انہوں نے شاہ کو حضرت مصلح موعود کا ایک تحریری پیغام پہنچایا۔ شاہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس پیغام کا جواب لکھوایا اور اس پر سرخ روشنائی سے اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ اس پیغام کا ترجمہ کچھ یوں ہے: ”آپ کا پیغام ابھی ہمارے دوست رشید احمد صاحب احمدی نے مجھے پڑھ کر سنایا اور آپ کا سلام بھی مجھے پہنچایا ہے جو آپ کے خوبصورت اور پاکیزہ جملوں کے شروع میں ہے اور جو مجھ سے اور میرے والد مرحوم اور میرے بھائی سے متعلق ہیں۔ میں اس یاددہانی پر آپ کا شکرگزار ہوں اور آپ کی بہت تعریف کرتا ہوں...... بارگاہِ الٰہی سے آپ کو جزائے خیر عطا کی جائے اور آپ کو برکت حاصل ہو۔ ہمیں امید ہے ہم آپ کو کسی وقت ...... ایک عظیم الشان حالت میں پہنچا ہوا دیکھیں گے اور میں یہاں اپنے ہر پاکستانی بھائی کی جب بھی ضرورت پڑے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔“

مرزا رشید احمد چغتائی نے ۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء بروز جمعرات وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔
مرحوم دبلے پتلے جسم کے مالک تھے۔ قد لمبا تھا۔ میں نے انہیں ربوہ کی سڑکوں پر بارہا پیدل یا سائیکل پر ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا ہے۔ موسم کی مناسبت سے بالعموم اچکن زیبِ تن کئے رکھتے اور سر پر پگڑی پہنتے۔ ان کے ایک بھانجے قمر احمد ابن مولوی ابوالفضل محمود سکول میں میرے ہم جماعت تھے اور میں ان کے ہمراہ ایک دو بار ان سے ملا بھی ہوں۔ اگرچہ یہ ملاقاتیں سرسری تھیں تاہم میں ان کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

قریشی محمد نذیر ملتانی نے ۱۹۲۹ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد بطور مربی تربیت حاصل کی اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی ۱۹۳۱ء میں مربی کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ وہ کئی سال تک برصغیر کے مختلف علاقوں میں پیغامِ حق پہنچانے میں مصروف رہے۔ اس عرصہ میں بہت سے کامیاب مناظرے کئے۔ انہیں جماعت کے اختلافی مسائل پر بڑا عبور حاصل تھا اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا خاص موضوع تھا۔ عربی بہت روانی اور فصاحت کے ساتھ بولتے تھے اور ایک کامیاب مقرر تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب وہ احمد آباد میں مقیم تھے ان پر کسی بدباطن نے چاقو سے حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی جان تو بچ گئی لیکن ان کی صحت بہت متاثر ہوئی۔

وہ جامعہ احمدیہ میں سالہا سال تعلیم و تدریس سے منسلک رہنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ مختلف اوقات میں پروفیسر جامعہ احمدیہ و جامعہ نصرت، انسپکٹر بیت المال اور انسپکٹر انصاراللہ مرکزیہ کی حیثیت سے خدمات بجالاتے رہے۔ ایک لمبا عرصہ جماعت احمدیہ، احمد نگر کے صدر رہے۔ وہ بہت عالم و فاضل، مخلص و فدائی اور دعاگو بزرگ تھے۔

انہوں نے ۳ جنوری ۱۹۷۰ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔
حضرت مسیح موعود کے رفیق، پروفیسر علی احمد بھاگلپوری کو اپنے زمانۂ طالب علمی میں حضرت مسیح موعود کے

دعویٰ ماموریت پر ایمان لانے کا اعزاز حاصل ہوا جس کے نتیجہ میں انہیں بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ثابت قدمی کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ انہوں نے احمدیت کے رنگ میں رنگین ہو کر نہایت پاک و مطہر زندگی بسر کی۔ بہت منکسر المزاج اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا خاص اہتمام کرنے والے بزرگ تھے۔

ان کی وفات پر جو ۲۲ جون ۱۹۵۷ء کو ہوئی مولانا ابوالعطا جالندھری نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء) میں لکھا: ”حضرت مولوی علی احمد ایم اے بھاگلپوری نے عمر بھر دین کی خدمت کا فرض ادا کیا۔ آپ خاموش طبع اور ہر قسم کے نمود و نمائش سے بیزار تھے۔ ٹھوس اور مؤثر خدمت کے قائل تھے...... طبیعت میں بنی نوع انسان کی ہمدردی اور بھلائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے جامعۃ المبشرین میں ان کے ساتھ چار سال تک کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایسے نیک بزرگ اور ہمہ تن خیر انسان کی جدائی بہت شاق ہوتی ہے مگر قدرت کا نظام اسی طرح ہے کہ ایک عمر کے بعد ہر انسان کو اس جہانِ فانی سے آخرت کی طرف کوچ کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم بڑھاپے کے باوجود باقاعدگی اور نظام کی پابندی میں ایک نمونہ تھے۔ انہیں فطری شوق تھا کہ دُور دراز سے آنے والے...... طلبہ کی علمی ترقی میں میرا بھی حصہ ہو اور اسی ذریعے سے میں ثواب میں شریک رہوں اس لیے بیماری کے باوجود بھی وہ محنت سے پڑھاتے رہے۔

سن رسیدگی کے باوجود حتی المقدور باجماعت نماز بیت الذکر میں ادا فرماتے۔ بہت دعاگو بزرگ تھے۔ آخری سالوں میں حضرت ڈاکٹر غلام غوث صاحب مرحوم سے بہت ہی لگاؤ تھا۔ اکٹھی مجلسیں ہوتی تھیں اور بیت مبارک میں بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے قریب ہی صفِ اول میں شریکِ نماز ہوتے تھے۔“

شیخ عبدالواحد جو تاریخِ لجنہ اماء اللہ کے مطابق جامعہ نصرت میں فارسی پڑھانے پر مامور تھے چین، ایران اور جزائر فجی میں مربی سلسلہ رہے ہیں۔ انہوں نے دو اپریل ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ الفضل مورخہ اٹھارہ اپریل ۱۹۸۳ء میں ان کی وفات کی خبر بہ ایں الفاظ شائع ہوئی:

”نہایت افسوس اور دکھ سے احباب کی خدمت میں اطلاع دی جاتی ہے کہ محترم شیخ عبدالواحد صاحب مربی چین، ایران، فجی دو اپریل ۱۹۸۳ء کو صبح ڈھائی بجے کے قریب وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی وفات دماغ کی رگ پھٹنے سے ہوئی۔ وفات سے قبل چار پانچ دن متواتر بیہوشی رہی اور اسی حالت میں آپ نے وفات پائی۔ مرحوم اگست ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں دینی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس کے بعد بفضلِ خدا لمبے عرصہ تک چین، ایران اور جزائر فجی میں آپ کو قابلِ قدر خدماتِ دینیہ کا موقع ملا۔ اندرونِ ملک بھی ایک لمبے عرصہ تک آپ بحیثیت مربی خدمات بجالاتے رہے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیٹا، شیخ مامون احمد اور ایک بیٹی، عزیزہ قدسیہ چھوڑی ہے۔ عزیزہ قدسیہ تو وفات سے ایک دن قبل ربوہ پہنچ گئی تھیں لیکن عزیز مامون احمد افریقہ میں ہونے کے باعث پہنچ نہیں سکے۔ دو اپریل ۱۹۸۳ء کو بعد نماز مغرب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں مقامی احباب کے علاوہ مجلس مشاورت پر آنے والے بیرون از ربوہ احباب نے بھی ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ آپ کی

تدفین بوجہ موصی ہونے کے بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔"

یاد رہے کہ ماموں تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اولڈ سٹوڈنٹ تھے۔ جب میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوا تو وہ غالباً تھرڈ ایئر میں تھے اور ان ہی دنوں امیریکن یونیورسٹی آف بیروت میں آرکیٹیکچر کے شعبہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ ایک فعّال زندگی گزارنے کے بعد وہ ۲۰۱۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں جب کہ نسیمہ قدسیہ خدا کے فضل سے حیات ہیں اور جرمنی میں مقیم ہیں۔

میرا خیال ہے جامعہ نصرت کے مرد سٹاف کا ذکر مبارک احمد کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جو سیّد والا ضلع شیخوپورہ کے رہائشی، امام الدین علیانہ کے صاحبزادے تھے اور جامعہ نصرت میں کلرک ہوا کرتے تھے۔ ان کی رہائش انجمن کوارٹرز میں تھی لہٰذا میری ان سے اکثر و بیشتر ملاقات رہتی تھی۔ انتہائی شریف النفس انسان تھے اور ہمیشہ بڑی محبت سے پیش آتے۔ کبھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ تنہا ہی جامعہ نصرت کے دفتری معاملات چلا رہے تھے یا انہیں اس حوالے سے کسی اور کی معاونت بھی حاصل تھی مگر قیاساً لکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی ملازمت کے آخری حصہ میں ہیڈ کلرک ہو گئے ہوں گے۔

وہ بشیر قادیانی کے بھائی تھے لیکن طبیعتاً ان سے بہت مختلف۔ دھیمے مزاج کے اور اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ نہ معلوم کب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کینیڈا چلے گئے تھے۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے ان سے رابطے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ پاکستان واپس آ چکے ہیں۔ مزید کریدا تو راوی نے ان کی وفات کی خبر سنا دی۔ افسوس ہوا کہ میں کئی سال ان سے محرومِ ملاقات ہی رہا۔

یہ تو تھا ان بزرگان کا مختصر ذکرِ خیر جنہیں جامعہ نصرت کے ابتدائی دور میں تدریس یا انتظامی معاملات میں معاونت کی سعادت حاصل رہی۔ آہستہ آہستہ جامعہ نصرت سے گریجوایشن کرنے والی بعض طالبات نے اپنے اپنے پسندیدہ مضامین میں ماسٹرز کر لیا۔ ان کی جامعہ نصرت میں تقرری سے مرد اساتذہ کی ضرورت ختم ہوتی گئی۔ جس مضمون میں احمدی لیکچررز میسر نہ تھیں وہاں غیر از جماعت لیکچررز سے بھی کام چلایا گیا اور یوں کچھ ہی سالوں میں وہ وقت آ گیا جب جامعہ نصرت کے سٹاف میں ایک مرد استاد بھی باقی نہ رہا۔ اگلے باب میں ان ہی خواتین میں سے کچھ کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

مری راہوں میں کانٹوں کو بچھانے والو خود آ کر : مری راہِ طلب کی کامرانی دیکھتے جاؤ

انگریزی تمام ادوار میں ہمارے تعلیمی نصاب کا ایک اہم جزو رہی ہے اور بی اے تک ہر طالب علم کے لیے اس کا پڑھنا اور اس میں کامیاب ہونا لازمی رہا ہے تاہم بدقسمتی سے ابتدائی کچھ سالوں میں جامعہ نصرت کو انگریزی کی کوئی خاتون لیکچرر میسر نہ رہی چنانچہ مسز شاہ (جو اُس وقت محض بی اے پاس تھیں)؛ عبدالسلام اختر (جنہوں نے فلسفہ میں ایم اے کر رکھا تھا)؛ میاں محمد ابراہیم جمونی (جو اپنی کوالیفیکیشن کی نسبت سے کہلاتے ہی "بی اے صاحب" تھے) اور حضرت سید محمود اللہ شاہ، ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول سے کسی نہ کسی طرح کام چلایا جاتا رہا۔ حبیب کلاتھ ہاؤس، ربوہ والے حبیب اللہ کی صاحبزادی اور بشیر احمد سیالکوٹی کی بہن، سعیدہ حبیب اس کالج میں انگریزی کی پہلی خاتون لیکچرر تھیں۔ انہوں نے بی اے کا امتحان ۱۹۵۵ء میں جامعہ نصرت ہی سے پاس کیا تھا۔ بی اے میں ان کے اختیاری مضامین میں سے ایک عربی تھا جس میں وہ یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں اول رہی تھیں لیکن انہوں نے ماسٹرز کے لیے انگریزی کا مضمون منتخب کیا۔ وہ اپنے اس فیصلے کا پس منظر واضح کرتے ہوئے بتایا کرتی ہیں: عربی سے مجھے خاص شغف تھا لیکن میں انگریزی میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھی چنانچہ جب میں بی اے کر چکی تو چھوٹی آپا نے مجھے انگریزی میں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایم اے عربی کے لیے پہلے ہی میری ہم جماعت، منظور النساء کو آمادہ کر چکی ہیں لہٰذا میرے انگریزی میں ایم اے کرنے سے کالج کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ قصہ مختصر میں لاہور کالج فارویمن، لاہور کے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں جا پہنچی اور اللہ کے فضل سے ۱۹۵۷ء میں ایم اے کا امتحان دے دیا۔ امتحان دیتے ہی مجھے جامعہ نصرت میں ملازمت مل گئی۔

انہوں نے ۲۰ جون ۱۹۵۷ء کو جامعہ نصرت کے سٹاف میں شمولیت اختیار کر لی تھی جب کہ نتیجہ دو تین ماہ بعد آیا۔ انہوں نے سات سال یہاں پڑھایا لیکن اپنی شادی کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۴ ستمبر وہ تاریخ تھی جب انہوں نے بڑے بوجھل دل کے ساتھ جامعہ نصرت کو الوداع کہا تھا۔

شادی کے فوراً بعد انہیں راولپنڈی کے ایک سرکاری کالج میں ایڈہاک بنیاد پر ملازمت مل گئی۔ بعد میں ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ان کا تقرر محکمہ تعلیم میں ہو گیا۔ انہوں نے اس حیثیت میں تقریباً تیس سال کام کیا۔ ان تیس برسوں میں سے ان کا زیادہ عرصہ تو اٹک میں گزرا لیکن وہ ملازمت کے سلسلے میں راولپنڈی کے علاوہ گجرات اور مری میں بھی رہیں۔ وہ کہتی ہیں: یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس دوران مشکل وقت بھی آئے لیکن خدا کا شکر ہے میں اپنی ملازمت کی تکمیل پر یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو باعزت طور پر ریٹائر ہوئی۔

ان کے خاوند، محمد سعید قریشی وفات پا چکے ہیں اور دونوں بیٹے غیر ممالک میں ہیں۔ ان کی بیٹی

رشیدہ فوزیہ ڈاکٹر ہیں اور داماد، مبارک احمد بھی اسی شعبے سے وابستہ ہیں۔ وہ دونوں مل کر ربوہ میں مریم میڈیکل سنٹر کے نام سے ایک ہسپتال چلا رہے ہیں۔ سعیدہ حبیب آج کل ان ہی کے ساتھ مقیم ہیں۔ خدا کا شکر ہے ان کی صحت عمر کے اعتبار سے اچھی ہے اور ان کا وقت ٹھیک گزر رہا ہے۔

وہ بحیثیت استاد کیسی تھیں، ملاحظہ فرمایئے فیروزہ کا یہ بیان: ملیح، دراز قد اور بہت باوقار خاتون تھیں۔ نہایت اعتماد سے انگریزی پڑھایا کرتیں۔ انگلش بی کا پیریڈ زیادہ تر وہی لیتیں۔ ان کے پُرشفقت لہجے کی وجہ سے ان کی کلاس میں بہت مزا آتا۔ کلاس میں انگریزی میں ہی گفتگو کرتیں اور اس سلسلے میں ہماری بھی حوصلہ افزائی کرتیں۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی کو کسی سوال کا جواب دینے کے لیے کہا۔ وہ کھڑی تو ہوگئی مگر جواب دینے میں متذبذب تھی۔ انہوں نے لڑکی کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا: ''کم آن!'' اس پر وہ چل کر آپ کی میز کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی جس پر آپ مسکرانے اور لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

سعیدہ حبیب کے بعد جامعہ نصرت میں انگریزی کی دوسری خاتون لیکچرر مس امینہ مرزا تھیں جو حافظ عبدالسلام، وکیل المال تحریک جدید انجمن احمدیہ کی صاحبزادی ہیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے کراچی کے کسی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جامعہ نصرت میں داخلہ لیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے بی اے کیا اور ۱۹۵۸ء میں لاہور کالج فار ویمن لاہور سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوگئیں۔ امینہ کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا اور وہ اکثر امتحانات میں کوئی نہ کوئی پوزیشن لیا کرتی تھیں چنانچہ وہ ایم اے کے امتحان میں بھی یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں اوّل رہیں۔

انہوں نے چار سال تک جامعہ نصرت میں پڑھایا۔ اسی عرصہ میں ان کی شادی شمس الاسلام نامی ایک نوجوان سے ہوگئی جو پی آئی اے میں ملازم تھے۔ شادی کے بعد امینہ یہ ملازمت چھوڑ کر پیا دیس سدھار گئیں اور اپنے شوہر کے ساتھ دنیا کے مختلف ملکوں میں مختلف المیعاد قیام کے بعد آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

ایک اور خاتون جنہیں انتیس سال تک جامعہ نصرت میں انگریزی پڑھانے کا موقع ملا مس اریبہ ہیں جو حضرت مولوی محمد جی ہزاروی ساکن داتہ ضلع مانسہرہ، رفیق حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی ہیں۔

موصوفہ آج کل ربوہ میں اپنی ہمشیرہ، خالدہ خانم اہلیہ مولوی احمد حسن، پرنسپل تعلیم الاسلام انٹرمیڈیٹ کالج، گھٹیالیاں کے پاس محلّہ دارالرحمت وسطی میں مقیم ہیں۔ فون پر گفتگو تو کر لیتی ہیں لیکن عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں یادداشت ساتھ چھوڑنے لگتی ہے اور کئی باتیں بھولنے لگتی ہیں۔ ان کی کبرسنی کی وجہ سے ان کے ساتھ تو کوئی معنی خیز گفتگو نہ ہوسکی البتہ ان کے ایک بھانجے انیق نے اس حوالے سے میری کچھ مدد کی اور بتایا: جیسا کہ خالہ کے میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ مجریہ پنجاب یونیورسٹی سے عیاں ہے ان کی تاریخ پیدائش ۷ استمبر ۱۹۳۰ء ہے اور انہوں نے یہ امتحان ۱۹۴۷ء میں نصرت گرلز ہائی سکول، قادیان سے پاس کیا تھا تاہم قیامِ پاکستان کے پُرآشوب حالات کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ ربوہ میں لڑکیوں کا کالج بنا تو انہوں نے یہاں سے بی اے کیا تاہم ان کی ڈگری کی عدمِ دستیابی کی وجہ سے اب سال کا حتمی تعین آسان نہیں۔ بعد میں انہوں نے

میرے ابا (یعنی اپنے بہنوئی) کے پاس پشاور میں مقیم رہ کر ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کرلیا۔ بی اے کی طرح ان کی ایم اے کی ڈگری کا بھی سراغ نہیں ملتا تاہم ان کی پنشن بک کے مطابق انہوں نے انتیس سال ملازمت کی تھی۔ وہ ۷ استمبر ۱۹۹۰ء کو ریٹائر ہوئیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۱ء میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ میں نے سن رکھا ہے کہ ایم اے کرتے ہی انہیں جاب مل گیا تھا لہٰذا تقریباً وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے یہ امتحان اسی سال پاس کیا تھا۔

ان کی پنشن بک کے مطابق وہ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوئیں اور ان کی ملازمت کا سارا زمانہ جامعہ نصرت میں ہی گزرا۔

صادقہ رمضان جو شادی کے بعد صادقہ ظفر کے نام سے معروف ہوئیں ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں لیکچرر مقرر ہوئیں۔ وہ گیارہ اپریل ۲۰۰۲ء کو اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت اس کالج کی پرنسپل تھیں۔

مس زکیہ عطا جن کا تفصیلی تعارف پہلے آ چکا ہے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران یہاں انگریزی پڑھاتی رہیں۔

اُن کے بعد ایک اور خاتون لیکچرر انگریزی پڑھانے کے لیے جامعہ نصرت کے سٹاف میں شامل ہوئیں۔ میرا اشارہ مس وحیدہ سلطانہ کی طرف ہے جو اَب مسز اعجاز احمد کے نام سے پہچانی جاتی ہیں اور سرگودھا میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد، پیر عبدالحق نوشاہی نے اپنے چچا، پیر فیض احمد کی تحریک پر احمدیت قبول کی تھی اور پھر ساری عمر خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہد پر اخلاص کے ساتھ قائم رہے۔

وحیدہ نے ۱۹۵۸ء میں سرگودھا کے گرلز پائلٹ سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور دو سال بعد اسی شہر کے گورنمنٹ کالج برائے خواتین سے ایف اے کیا۔ وہ مزید تعلیم کے لیے جامعہ نصرت میں داخل ہوئیں۔ انگریزی سے خاص شغف رکھتی تھیں چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں بی اے (آنرز اِن انگلش) کا امتحان پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں داخلے کا مرحلہ آیا تو پروفیسر سراج جو اُن دنوں ہیڈ آف انگلش ڈیپارٹمنٹ تھے نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ ایم اے میں ایک سال کی بجائے دو سال لگا لیں تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہوگا چنانچہ وحیدہ نے ایم اے کا امتحان ۱۹۶۵ء میں دیا۔ نتیجہ کی منتظر تھیں کہ انہیں چھوٹی آپا کی طرف سے جامعہ نصرت میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ یوں وحیدہ اوائل ۱۹۶۶ء سے جامعہ نصرت میں پڑھانے لگیں۔

موصوفہ بتایا کرتی ہیں: میں ۱۹۷۶ء کے آخر یا ۱۹۷۷ء کے شروع تک ربوہ رہی۔ اس عرصے میں جامعہ نصرت قومیایا جا چکا تھا اور سٹاف کی تبدیلی معمول کی بات بن کر رہ گئی تھی چنانچہ میری تبدیلی لالہ موسیٰ ہوگئی۔ کچھ عرصہ وہاں رہی۔ پھر بھلوال بھجوا دی گئی۔ کئی سال وہاں گزر گئے۔ تب میری تبدیلی گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن، سرگودھا میں ہوئی۔ اپنی ملازمت کے آخری دس سال میں نے یہیں گزارے اور میں ۲۷ جنوری ۲۰۰۱ء کو ریٹائر ہوئی۔ اُس وقت میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھی۔

ان کے شوہر، اعجاز احمد زمیندارہ کرتے ہیں۔ لیّہ میں ان کی کچھ زمین ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن ان کی رہائش سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا ہے۔ بیٹا ابوظہبی میں ملازمت کر رہا ہے جب کہ ایک بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔

مِس صفیہ بھٹی ایک غیر از جماعت خاتون ہیں جو کچھ عرصہ جامعہ نصرت میں انگریزی پڑھاتی رہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ میجر عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر کے قریبی رشتہ داروں میں سے ہیں تاہم ان کے باقی کوائف یا جامعہ نصرت میں ان کے عرصۂ ملازمت کا پتا نہیں چل سکا۔ صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ وہ آج کل امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوفہ ایک محنتی و مخلص استاد تھیں جو اپنے شاگردوں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی شاگردیں پڑھ لکھ کر معاشرے کا مفید وجود بن سکیں اور اس مقصد سے وہ ہر ممکن ان کی حوصلہ افزائی کرنے کو تیار رہتی تھیں۔ مبارکہ انجم کا بیان ہے کہ ایک دن دورانِ لیکچر مِس صفیہ بھٹی نے اپنی ایک سٹوڈنٹ، فیروزہ سے کہا کہ اگر وہ بورڈ میں کوئی نمایاں پوزیشن حاصل کر دکھائیں تو موصوفہ انہیں اپنی انگوٹھی بطور انعام دیں گی۔ اس وقت انہوں نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی اور ان کا اشارہ اسی انگوٹھی کی طرف تھا۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ فیروزہ نے وہی کر دکھایا جس کی ان سے توقع کی گئی تھی۔ صفیہ بھی اپنا وعدہ نہیں بھولیں چنانچہ انہوں نے حسبِ وعدہ انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر فیروزہ کو دے دی۔

النصرت کے شمارہ ۲ جلد ۲ میں مس صفیہ بھٹی کا ایک مضمون ''انگلش لٹریری سوسائٹی'' کے عنوان سے چھپا ہوا موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ نصرت میں اس سوسائٹی کا قیام سراسر موصوفہ ہی کی کوششوں کا مرہونِ منّت تھا۔ اس سوسائٹی کے پہلے الیکشن کے نتیجے میں فورتھ ایئر کی شائستہ قیصر اور نسرین ملک اس کی صدر اور نائب صدر؛ تھرڈ ایئر کی ریحانہ کوثر اور شاہدہ صالح اس کی سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری اور فورتھ ایئر کی کلثوم اس کی خزانچی منتخب ہوئیں جب کہ سیکنڈ ایئر کی بشریٰ طیّبہ اور سیارہ حکمت جونیئر لٹریری سوسائٹی برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز کی علی الترتیب صدر و سیکرٹری منتخب ہوئیں۔

سوسائٹی کا افتتاحی اجلاس ۲۱ نومبر ۱۹۶۴ء کو ہوا جس کی صدارت بیگم میجر (ر) عارف زمان، ناظرامور عامہ نے کی جن کا رسالہ میں تعارف انگریزی کی محبت سے سرشار دل والی ایک خاتون کے طور پر کرایا گیا ہے۔ بیگم عارف زمان کے افتتاحی خطاب کے بعد تھرڈ ایئر کی نصرت احمد نے لٹریچر کی اہمیت پر ایک مضمون پڑھا، فیروزہ نے ایک نظم سنائی اور طاہرہ روحی نے اے پی ہربرٹ کا ایک مضمون ''اباؤٹ باتھ رُومز'' پڑھ کر سنایا۔

صفیہ بھٹی کے اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سوسائٹی کی میٹنگز ہر ہفتے ہوا کرتی تھیں چنانچہ سوسائٹی کی دوسری میٹنگ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ تھا جب طاہرہ روحی اور بشریٰ قریشی نے حاضرین کو انگریزی گانے گا کر سنائے۔

مضمون کے آخر میں مس صفیہ بھٹی نے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ اگر طالبات اس سوسائٹی کی

سرگرمیوں میں اسی جوش و خروش سے حصہ لیتی رہیں تو وہ وقت دور نہیں جب یہ سوسائٹی پاکستان میں انگریزی زبان کی بہت بڑی مؤید و مددگار بن کر ابھرے گی۔

''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق قانتہ فردوس جو جماعت کے معروف صحافی اور مشہور شاعر، حضرت قاضی محمد ظہورالدین اکمل کی پوتی، تعلیم الاسلام کالج کے آفس سپرنٹنڈنٹ، عبدالرحمٰن جنید ہاشمی کی سب سے بڑی صاحبزادی اور سیّد حمید احمد انسپکٹر کوآپریٹوز، شیخوپورہ کی اہلیہ تھیں بھی کچھ عرصہ جامعہ نصرت میں انگریزی پڑھاتی رہی ہیں۔ وہ اسی کالج کی اولڈ سٹوڈنٹ تھیں اور انہوں نے ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ اگرچہ ان کی جامعہ نصرت میں ملازمت کا عرصہ تو متعین نہیں ہو سکا مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایم اے کا امتحان دینے یا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد چند مہینے اس کالج میں پڑھایا۔

جامعہ نصرت سے فراغت کے بعد وہ ابتداءً فاطمہ جناح کالج، شیخوپورہ میں ملازمت کرتی رہیں لیکن جب یہی کالج قومیا لیا گیا تو وہ خود بخود سرکاری ملازمت میں آ گئیں اور گورنمنٹ کالج فار ویمن، شیخوپورہ سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہوئیں۔

وہ ربوہ میں ہماری محلّہ دار اور آپی کی سہیلی تھیں۔ اس نسبت سے ان کا ہمارے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا تاہم ۱۹۷۰ء میں ربوہ سے مستقل طور پر باہر منتقل ہو جانے کے بعد میرا ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

۲۰۰۴ء کے وسط میں جب میرا تقرر بطور ریجنل کمشنر انکم ٹیکس لاہور تھا میں نے الفضل کے ایک پرانے پرچے میں ان کے شوہر کا ایک مضمون پڑھا جو قانتہ کے بارے میں تھا۔ یہ مضمون پڑھ کر مجھے پتا چلا کہ موصوفہ ۲۰ جولائی ۲۰۰۳ء کو وفات پا گئی تھیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا اور وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ ہمارے گھر آیا کرتی تھیں اور دیر تک آپی کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ تب میں نے ان کے شوہر کا نمبر تلاش کیا اور زندگی میں پہلی بار انہیں فون کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کے پاس ان کی اہلیہ کی وفات کی تعزیت کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ حمید کو مجھ سے غائبانہ تعارف حاصل تھا چنانچہ انہوں نے بڑی خوش دلی سے میرا فون سنا اور میں اسی شام ان کے گھر شیخوپورہ جا پہنچا۔ معلوم ہوا کہ قانتہ کو جلد کا کینسر لاحق ہو گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور انہیں اس موذی مرض سے نجات عطا فرما دی۔ اسی وجہ سے وہ اپنی رفقائے کار میں ''معجزہ بیگم'' کے نام سے بھی مشہور ہوئیں۔ وہ اس کے بعد قریباً دس سال زندہ رہیں لیکن ایک روز بیٹھے بیٹھے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ شاید کوئی کلاٹ ان کی اچانک موت کا سبب بن گیا۔

میں نے ان کی وفات پر افسوس کا اظہار کیا اور اس خواہش کا بھی کہ اگر میری رہنمائی ہو سکے تو میں ان کی قبر پر جا کر دعا کرنا چاہوں گا۔ یوں میں، حمید اور قانتہ کی چھوٹی بہن، فیروزہ احمدیہ قبرستان، شیخوپورہ جا پہنچے۔ راستے میں فیروزہ نے بتایا: قانتہ کی وفات کے وقت میرا چھوٹا بھائی نوید کینیڈا میں تھا۔ اس وقت وہاں رات تھی۔ بقولِ نوید: اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر قانتہ کھڑی تھیں۔ انہوں نے کہا: کہ میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آئی ہوں کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں اور یہ کہتے ہی منظر سے غائب ہو گئیں۔

یہ تقریباً وہی وقت تھا جب وہ اس عالمِ ناپائیدار سے رخصت ہوئیں۔

میں قانتہ کی قبر پر مغموم وسوگوار کھڑا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے قانتہ کی تصویر آ گئی اور میری آنکھ سے ایک آنسو نکل کر میرے رخسار پر ڈھلک گیا۔

یہ تو تھا جامعہ نصرت میں انگریزی کی خواتین لیکچررز کا کچھ ذکر۔ جہاں تک اردو زبان کی تدریس کا تعلق ہے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عطاالرحمٰن طالب جامعہ نصرت میں اس مضمون کے اولیں استاد تھے تاوقتیکہ یہاں ''مس چوہدری'' کا تقرر ہو گیا۔

مس چوہدری جن کا اصل نام صفیہ تھا چوہدری نور احمد نامی ایک بزرگ کی صاحبزادی تھیں جن کا تعلق یوں تو جالندھر سے تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد مظفر گڑھ میں آ مقیم ہوئے تھے۔ وہ تعلیم کے شعبے سے منسلک تھے۔ ابتدا میں کسی سرکاری سکول میں ٹیچر تھے لیکن ریٹائر بطور ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ اللہ نے انہیں تین صاحبزادیوں سے نوازا تھا۔ زہرہ رؤف سب سے بڑی تھیں، ان سے چھوٹی رضیہ ہیں جب کہ صفیہ سب سے چھوٹی تھیں۔

پارٹیشن کے وقت رضیہ اور صفیہ، دونوں دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھیں۔ یہاں آ کر ان کا ایک سال ضائع ہو گیا لیکن مشکل حالات کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری اور جیسے تیسے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ اللہ نے انہیں ایسے والدین کی سرپرستی عطا فرمائی تھی جو لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ دیکھ کر دلی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اس زمانے میں مظفر گڑھ میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہ تھا چنانچہ صفیہ نے اگلی ساری تعلیم ملتان میں حاصل کی اور گورنمنٹ کالج سے اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کے فوراً بعد ان کا تقرر جامعہ نصرت میں ہو گیا۔

یہ کس سن کی بات ہو گی؟ میں نے ایک بار رضیہ سے دریافت کیا۔

رضیہ جو خود ہیڈ مسٹریس رہی ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد مظفر گڑھ میں ایک پرائیویٹ سکول چلا رہی ہیں عمر کے اس حصے میں جہاں نسیان ایک معمول بن جاتا ہے۔ انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر کہا: میرے لیے اس سوال کا جواب دینا ممکن نہیں لیکن آپ اندازہ کرلیں اگر ہم نے ۱۹۴۹ء میں بھی میٹرک پاس کیا ہو تو صفیہ کا ایم اے ۱۹۵۵ء کا بنتا ہے۔

جب میں نے ان سے پوچھا کہ صفیہ آج کل کہاں ہوتی ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا: اللہ میاں کے پاس۔ انہوں نے کچھ ہی عرصہ پہلے گیارہ اپریل ۲۰۱۵ء کو وفات پائی ہے۔ انگلستان میں نیوکیسل میں رہا کرتی تھیں۔ ان کے شوہر چوہدری محمد طفیل (جن کا انتقال ان سے بھی پہلے ہو گیا تھا) کاروباری آدمی تھے۔ صفیہ نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

صفیہ نے انگلینڈ منتقل ہونے کے بعد بھی کسی جگہ پڑھایا نہ کوئی اور ملازمت کی۔ انہوں نے یہ تمام وقت ہاؤس وائف کے طور پر گزارا۔

رضیہ بتاتی ہیں کہ شادی کے بعد صفیہ کئی بار پاکستان آئیں۔ ایک دفعہ تو وہ اس ارادے سے آئی تھیں

کہ اب یہیں رہیں گی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو سکولوں میں بھی داخل کرا دیا لیکن افسوس بچوں کو یہاں کی آب وہوا راس نہ آئی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ مجبوراً صفیہ کو واپس جانا پڑا۔ ایک بار وہ زہرہ کی آخری بیماری کے دوران آئی تھیں۔ اسی عرصے میں زہرہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ صفیہ کی انگلستان روانگی سے ایک روز پہلے انتقال کر گئیں۔ اس وقت سیٹ کا آگے لے جانا مشکل تھا چنانچہ میں نے بڑے بوجھل دل کے ساتھ اسے سمجھایا کہ جو حادثہ ہونا تھا وہ تو ہو چکا اور اب اس کا پاکستان میں مزید رکنا یا نہ رکنا بے معنی ہے لہٰذا اگر وہ پروگرام کے مطابق انگلستان واپس چلی جائے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ یوں عین اس وقت جب ہم زہرہ کا جسدِ خاکی لے کر ربوہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے صفیہ انگلستان واپس جانے کے لیے لاہور چلی گئی۔

رضیہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ صفیہ نے کتنا عرصہ جامعہ نصرت میں پڑھایا تاہم النصرت کے ایک شمارے میں صفیہ کا نیوکیسل سے ۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کا لکھا ہوا ایک خط بعنوانِ ذیل چھپا ہوا موجود ہے:

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کرلیا ہے، کنجِ قفس بہاراں

اس خط میں یہ ذکر موجود ہے کہ وہ سات سال تک جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہیں۔ یوں یہ بات درست ثابت ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ایم اے کیا تھا اور امتحان دیتے ہی ان کا تقرر یہاں ہو گیا تھا۔

یہ خط اپنے اندر ایک خاص ادبی چاشنی رکھتا ہے لہٰذا اس خط کو صفیہ چوہدری کی ایک یادگار سمجھتے ہوئے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے:

''انتظار کے بے شمار لمحے جو میرے لیے طویل ترین ہوتے گئے گزارنے کے بعد آپ کے دو نوازش نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ یاد آوری کے لیے ہدیۂ تشکر اپنے دامن میں لے کر ہزاروں میل کی دوری سے آپ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔

گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

میں نادم ہوں کہ جلد خط تحریر نہ کرسکی۔ اس میں کچھ تو میری ناسازیٔ طبع اور کچھ آپ کے پہلے ناتمام نوازش نامے کا دخل ہے۔ اب میں بہتر ہوں اور آپ کے دوسرے نوازش نامے نے بہت حد تک میری تشنگی کا مداوا کردیا ہے۔ آپ کی نوازشات کی بدولت ذوقِ نظر کے سامان تو فراہم ہو جاتے ہیں، تسکینِ قلب کے لیے نہ معلوم کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے بھولنا اور بھلانا میری فطرت میں نہیں۔ وقت کا بڑے سے بڑا عرصہ گزر جانے پر بھی یہ باتیں کل کی ہی معلوم ہوں گی۔ مجھے ہمیشہ ہر اس چیز سے انس رہا ہے جسے دنیا ماضی کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ پھر یاد رکھنا اور یاد کرنا ہی جن کا ایمان ہو ان کا تو یہ حال ہے کہ:

ہر گھڑی تیرا تصور، ترا ہر لمحہ خیال
اس جدائی کی بدولت یہ عبادت سیکھی

اس لیے ماضی اپنی تمام تر دلکشی، رعنائی اور زیبائی کے ساتھ ہمیشہ میری ذہنی دنیا کے افق پر فروزاں رہے

گا اور یادوں کے یہ مُنّے مُنّے دیپک ہمیشہ میری دنیا میں مسرتوں کی بے شمار شمعوں کی جھلملاتی روشنی بکھیرتے رہیں گے۔ میرے شوہر (ابھی یہ لفظ بڑا اجنبی سا لگتا ہے) بھی کہا کرتے ہیں: تم اس والہانہ شیفتگی کے ساتھ جامعہ اور جامعہ کے لوگوں کا ذکر کرتی ہو تو مجھے بے اختیار ان پر رشک آتا ہے۔ یقین کیجئے آپ نے اپنی نکھری ستھری زندگی کا عکس میری زندگی پر ڈال کر اسے تابندہ بنایا تھا لیکن دور کچھ ایسا مختصر تھا کہ آج بھی دل بے اختیار ان ساعتوں کے لوٹ آنے کی تمنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں:

اک بار جو مل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے
سو بار مجھے تلخیِ ایام گوارا

سوچ کے ان دھاروں پر بہتی ہوئی میں دُور چلی جاتی ہوں۔ تب زندگی کے قدم رک جاتے ہیں، وقت ختم ہو جاتا ہے اور میری یادوں کے افق کے سنہرے روپہلی گوشوں سے بہت سے قوس قزحی لمحے اپنی زرتار چلمنوں کو اٹھا کر جھانکنے لگتے ہیں۔ سات سال کی رفاقت اگر شناسائی کے کسی ضمن میں شمار ہو جائے تو بھی اتنی مختصر معلوم ہوتی ہے جیسے راہِ حیات میں صرف پَل بھر کے لیے ہی آپ سے ملاقات ہوئی مگر اس دور کی طوالت کے باوصف اس کے ایک ایک لمحہ کے نقوش میرے دل و دماغ پر ثبت ہیں اور یہاں اداسیوں اور تنہائیوں کے گھرے سایوں تلے میرے دل نے مجھ سے کہا ہے:

سکونِ دل تو کہاں راحتِ نظر بھی نہیں
یہ کیسی بزم ہے جس میں ترا گزر بھی نہیں

مسز شاہ! آپ مجھے ہمیشہ ہی ایسے حسین اور پیارے انداز میں دیکھتی ہیں۔ سچ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔ یہ محض آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ جو علمی صلاحیت میں نے آپ میں پائی اس کا عشرِ عشیر بھی اپنے میں نہیں پاتی۔ میرے خطوط اس قابل کہاں کہ النصرت میں کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ یہ آپ کی کرم نوازی ہے کہ آپ کو میرے خطوط دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ خط لکھنا تو ایک آرٹ ہے واقعی...... اور میں ابھی اس آرٹ کے آئین سے آشنا نہیں۔ میں ہنوز اتنی ہی ناپختہ ہوں جتنا ایک مبتدی ہو سکتا ہے۔ آپ کا حسنِ ظن ہی کہہ لوں اسے ورنہ میرے خطوط میں شاید ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسی بات نہ مل سکے جو آپ جیسے ادبی ذوق رکھنے والوں کے رفیع القدر معیار پر پوری اتر سکے۔

بی اے کا نتیجہ واقعی مسرت بخش ہے۔ خدا کرے جامعہ کی یہ رفیع الشان روایات اپنی عظمت ہمیشہ برقرار رکھ سکیں اور علم و ادب کی تشنگی کے مداوا کے تمنائی ہمیشہ اس کے نام کو عظمت اور رفعت عطا کریں۔ آپ کی کاوشیں واقعی قابلِ صد ستائش ہیں جن کی بدولت جامعہ کا علمی و ادبی معیار ہمیشہ بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔

میں ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ماہ تک داخلہ وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر کے آپ کو مطلع کر سکوں گی کیونکہ آئندہ ماہ لندن جانے کا خیال ہے۔ مجھے خود یہ خواہش ہے کہ لندن سے بی اے کر سکوں۔ آپ کے اس معاملہ میں استفسار پر مجھے علامہ اقبال کی ایک نظم کا (جو انہوں نے اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں بطور

نذرانۂ عقیدت یا خراجِ عقیدت پیش کی تھی) کا بند یاد آ گیا۔ مجھے اگرچہ آپ کی شاگرد رشید ہونے کی سعادت اور فخر حاصل نہ ہو سکا پھر بھی بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوں:

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائش سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند

اس پر بھی اگر میں آپ کی خواہش کا احترام کر سکی اور آپ کی توقعات پر پوری اتر سکی تو یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہوگی۔

یہاں سردی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا ہے کہ برف گرنے کا منظر اتنا حسین ہوتا ہے۔ آپ تو آشنا ہوں گی۔ کیسے روئی کے ننھے منے گالے فضاؤں میں دبے پاؤں رقصاں نظر آتے ہیں جیسے انہیں اس بات کا ڈر ہو کہ ان کی آہٹ سے پُرسکون ماحول کا طلسم ٹوٹ جائے گا...... ایسے پُرسکوت انداز میں ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہیں:

اے مرے ہمرقص مجھ کو تھام لے

اور پھر بڑے پیار بھرے انداز میں آ کر دامن سے لپٹ جاتے ہیں یا زمین کے مرمریں سفید قالین میں جذب ہو جاتے ہیں...... بعد میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف سفید سنگِ مرمر کا فرش بچھ گیا ہو۔

مائی حمیدہ کی دلچسپ باتیں مجھے اکثر یاد آتی ہیں۔ وہ تو یقیناً مجھے بھول چکی ہوگی۔ سٹاف میں سے بھی جن سے میں آشنا ہوں لیکن جو مجھے بھول چکی ہیں ان سے کہئے کہ:

رکھتے ہیں ربطِ نہاں ان سے بھی ہم اہلِ وفا
نہ سلام آتے ہیں جن کے نہ پیام آتے ہیں

اور حمیدہ کو میرا سلام کہہ دیجئے۔ ممنون ہوں گی۔

آپ کی ذہنی جمالیات میری اس مادی جمالیات سے بدرجہا حسین ہیں۔ غالب کی ایک بات کو اگر میں کچھ ترمیم کے ساتھ پیش کر سکوں تو شاید میرے احساس کی ترجمانی ہو سکے کہ:

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے ''جمال''
کچھ اور چاہئے وسعت ''مری نظر'' کے لیے

''غزل'' اور ''بیان'' کے لفظ کی جگہ میں نے ''جمال'' اور ''نظر'' کی جو تبدیلی کی ہے وہ شعری ذوق رکھنے والوں اور پرکھنے والوں کو شاید گوارا نہ ہو اور شعری عروض کی غلطی بھی قابلِ اعتراض ہوگی لیکن میرا مطلب ضرور

واضح ہو جاتا ہے اس بات سے۔

لیجئے اب اپنی گرانمایہ مصروفیات میں دخل در معقولات اور تضیعِ اوقات کے لیے معذرت قبول فرمائیے۔ کتب کا پتہ کر کے پھر حاضر ہوں گی۔ بے بی کو پیار۔''

یہ تو تھا صفیہ چوہدری کا خط جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ بحیثیت استاد کیسی تھیں، اس حوالے سے فیروزہ کہتی ہیں: خوش لباس و خوش وضع تھیں۔ ان کے چہرہ پر ہر وقت مسکراہٹ ہوتی حتٰی کہ ڈانٹتے ہوئے بھی ان کا چہرہ مسکرا رہا ہوتا تھا۔ ہماری کلاس میں دو جڑواں بہنیں تھیں۔ جب ایک سے مخاطب ہوتیں تو مسکرا کر کہتیں: ''آپ آپ ہیں کہ آپ کی بہن؟'' جس پر ہم سب محظوظ ہوتے۔ اردو کے تلفظ اور ہجّوں کا بہت خیال رکھتیں۔ غلط شعر پڑھنے پر بہت جز بز ہوتیں۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ ''حور'' اور ''زیب النساء'' وغیرہ رسالوں میں شعر غلط چھپے ہوتے ہیں لہٰذا اشعار اصل کتابوں سے ہی پڑھنے چاہئیں اور پسندیدہ شعر ایک کاپی میں مع شاعر کے نام کے درج کرتے رہنا چاہیے۔

اس خط اور فیروزہ کے اس بیان کے بعد میرے پاس صفیہ چوہدری کے بارے میں آپ کو بتانے کے لیے کچھ اور نہیں بچا ماسوا اس کے کہ ان کی بڑی بہن، زہرہ رؤف کی شادی کے موقع پر ان کی شاگرد، امۃ الحفیظ مرزا نے ان کی فرمائش پر ایک نظم لکھی جو غالباً برواجِ قدیم صفیہ چوہدری کی طرف سے زہرہ رؤف کو خوشخط لکھوا کر ایک فریم میں پیش کی گئی ہوگی۔ یہ نظم امۃ الحفیظ مرزا کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے غیر مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اور وہیں سے نقل کر کے آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے:

''کھلا ہے غنچۂ دل کس لیے فرطِ مسرت سے
میرے کوچے معطّر ہوگئے کس گُل کی نکہت سے''
یہ کون آتا ہے جس کے اہتمامِ خاص کی خاطر
نرالا حسن ملتا ہے چمن کو دستِ قدرت سے
چمن کا ذرّہ ذرّہ یوں حسیں معلوم ہوتا ہے
چمکتی ہے جبیں جیسے کہ عابد کی عبادت سے
صبا اترائی پھرتی ہے، بہار آتی ہے گلشن میں
فسانہ شاخِ گل پر چھیڑا بلبل نے فصاحت سے
نرالی وضع سے گل شاخِ گل پہ لہلہاتے ہیں
نہیں، پریاں ہیں جھولا جھولتی ہیں جو نزاکت سے
سنہری ہے، کوئی ہے سرخ اور سیمیں قبا کوئی
نرالے روپ اِن پریوں نے دھارے ہیں شرارت سے
ہیں جس کے قصرِ عالیشاں کے شمس و قمر دروازے

کسی دنیا کا ہوگا بادشاہ ظاہر ہے عظمت سے
یہ کس نے رُوئے تاباں سے ہے زلفوں کا نقاب اُلٹا
اجالا ہوگیا ایسے ہو جیسے مہ کی طلعت سے
رہا کرتی تھی نرگس چشم وا جس کے نظارے کو
ہوا کرتا تھا سورج زرفشاں جس کی حرارت سے
کیا تھا وقف گُل نے گوش جس آواز کی خاطر
وہ آتا ہے، وہ آتا ہے صدا آتی ہے رفعت سے
وہ جس کی یاد میں کھویا سا رہتا تھا گلِ لالہ
جگر تھا پارہ پارہ گُل کا بھی جس کی محبت سے
بہاریں شاداں ہوکر پلٹ آئیں نظارے کو
گئی افسردگی چھائی تھی گلشن پر قدامت سے
مرا نخلِ تمنا بارور اب ہونے والا ہے
مری دنیا میں آئے گی بہار اس کی کرامت سے
تڑپتا ہے دلِ بیتاب کیوں سیماب کی صورت
ہوا کیا چاہتا ہے پاک تُو اشکِ ندامت سے
خدارا روک لو اُس کو، یہ منزل ہے، یہ منزل ہے
کہیں آگے نہ بڑھ جائے، کوئی کہہ دے مہاوت سے
میں حیراں ہوں کہ کیسی وہ نگاہ ناز تھی واللہ
میرا دل لے لیا معصوم گو لگتی تھی صورت سے
وہ جس کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر
جب آئے گا تو میں منہ کو چھپالوں گی شرارت سے
نہ جانے کون اکثر دھیرے دھیرے گیت گاتا ہے
سکوں پاتی ہے فطرت، دل مچلتا ہے محبت سے
دبے پاؤں یہ کون آیا ہے بزمِ ناز میں میری
یہ فتنہ کم نظر آتا نہیں واللہ قیامت سے

اس نظم کے ساتھ ہی صفیہ چوہدری کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ موصوفہ کے کالج سے چلے جانے کے بعد جامعہ نصرت میں بیک وقت دو خاتون لیکچررز کا تقرر ہوا۔ ان میں سے ایک تو اسی کالج کی اولڈ سٹوڈنٹ، امۃ الباری تھیں اور دوسری مبارکہ انجم۔ امۃ الباری ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء کے دوران یہاں رہیں جب کہ مبارکہ انجم

۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۵ء تک۔

میرا خیال ہے یہاں تین دیگر خواتین اساتذہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے ایک صاحبزادی امۃ القدوس ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے موصوفہ جامعہ نصرت ہی کی اولڈ سٹوڈنٹ اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والی ایک معروف شاعرہ ہیں۔ ان کے شوہر، مرزا غلام احمد، ناظر دیوان صدر انجمن احمدیہ کے بیان کے مطابق وہ ۶۵۔۱۹۶۴ء کے دوران جامعہ نصرت میں اردو پڑھاتی رہی ہیں۔

مبشرہ اخوند (جو ڈاکٹر عبدالعزیز سندھی، فضل عمر ہسپتال ربوہ کی صاحبزادی؛ سیّد سردار حسین شاہ، افسرِ تعمیرات صدر انجمن احمدیہ کی نواسی اور جامعہ نصرت کی اولڈ سٹوڈنٹ ہیں) ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک یہاں پڑھاتی رہی ہیں۔ یاد رہے کہ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا تھا۔ وہ شادی کے بعد جامعہ نصرت سے مستعفی ہو کر کراچی منتقل ہو گئیں اور تا حال وہیں مقیم ہیں۔

امۃ الرشید اختر جو غلام محمد اختر، ناظرِ اعلیٰ ثانی کی صاحبزادی اور محمود احمد لون، امیر جماعت احمدیہ، چین کی اہلیہ ہیں کو بھی کچھ عرصہ جامعہ نصرت میں اردو پڑھانے کا موقع ملا۔ موصوفہ آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔ وہ بتاتی ہیں: بی اے تک میری تعلیم ربوہ کی ہے۔ میں نے ۱۹۶۹ء میں اورینٹل کالج، لاہور سے اردو میں ایم اے کیا۔ واپس آئی تو جامعہ نصرت میں اس مضمون کی لیکچرر کی ضرورت تھی۔ یوں میں یہاں پڑھانے لگی۔ اوائل ۱۹۷۲ء میں اپنی شادی کی وجہ سے مجھے مجبوراً یہ ملازمت چھوڑنا پڑی۔

جامعہ نصرت میں انگریزی اور اردو کے علاوہ اُم الالسنہ، عربی کی تدریس کا بھی اہتمام رہا ہے اور طالبات اس مضمون میں یونیورسٹی کی سطح پر بالعموم کوئی نہ کوئی پوزیشن بھی لیتی رہی ہیں۔ یہ کامیابیاں ان مخلص اساتذہ کی محنت کی مرہونِ منت تھیں جن میں سے سب سے پہلا نام منظور النساء کا ہے جو ۱۲ جون ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء کی کسی تاریخ تک یہاں پڑھاتی رہیں۔ ان کی موجودگی ہی میں کالج میں عربی کی ایک اور لیکچرر کا اضافہ ہوا اور وہ تھیں سعیدہ احسن۔

سعیدہ احسن قریشی محمد احسن کی صاحبزادی اور قریشی محمد اسلم مربی سلسلہ (جو ٹرینیڈاڈ میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران کسی نامعلوم قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے) کی ہمشیرہ ہیں۔ موصوفہ آج کل محلہ دارالرحمت وسطی میں اپنے بھائی، قریشی محمد ارشد کے ہمراہ مقیم ہیں۔ ضعیف ہو چکی ہیں اور شدید ثقلِ سماعت کا شکار بھی۔ انہوں نے اپنی کتاب ''حافظ محمد حسین'' جو اُن کے بعض بزرگان کی سوانح حیات اور ان کے خاندان کی جماعتی خدمات کے تذکرے پر مشتمل ہے میں اپنے حالاتِ زندگی بھی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچپن ہی میں بعض ایسے عوارض کا شکار ہو گئیں جو عملاً ان کی معذوری پر منتج ہوئے اور انہوں نے اپنی تمام زندگی اسی کیفیت میں گزار دی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نو ماہ کی عمر میں جب انہوں نے اپنے پاؤں پر چلنا شروع کر دیا تھا ایک دن ان کی کھِلائی انہیں گھر سے باہر لے گئی۔ وہاں وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں اور ان کے دائیں کولہے

پر چوٹ آئی۔ اس وقت تو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس نہیں ہو سکا لیکن چند روز بعد چوٹ والی جگہ متورّم ہو گئی اور ان کا چلنا پھرنا ختم ہو گیا۔ قادیان کے ڈاکٹروں سے حتی المقدور علاج کروایا گیا مگر صورتِ حال مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی تھی۔ ان کے بعض آپریشن بھی ہوئے لیکن بالآخر میو ہسپتال کے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر واپس کر دیا۔

ان کے دائیں کولہے پر چھ سات گہرے زخم تھے جن میں سے ہر وقت خون اور پیپ رِستی تھی۔ اس پر شدید بخار اور پیچش کی تکلیف مستزاد تھی۔ ان کے والد انہیں قادیان کے ایک حکیم کے پاس لے گئے۔ اس نے بچی کی کیفیت دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ دوا کی بجائے اس بچی کے لیے دو گز لٹھا لے جائیں لیکن اللہ کے فضل سے ان کا یہ انتہائی مشکل وقت ٹل گیا۔

جب ان کی عمر سات آٹھ سال کی ہو گئی تو ان کے والدِ بزرگوار نے انہیں سورۃ فاتحہ سکھا دی اور تاکید کی کہ اور کچھ نہیں تو وہ لیٹی لیٹی دعا کرتی رہا کریں۔ اب ان کے بڑے بھائی اور ہم عمر کزنیں سکول داخل ہو چکی تھیں۔ ان کی گلی سکول آنے جانے والے بچوں کا راستہ تھی۔ ان کے ہنسنے کھیلنے اور باتوں کی آوازیں ہر وقت ان کے کان میں پڑتیں۔ یہ ماحول سخت بیماری کے باوجود انہیں سکول داخل ہونے کے لیے بے چین کر دیتا اور انہیں یہ خیال ستانے لگتا کہ سب لوگ آگے نکل جائیں گے مگر وہ پیچھے رہ جائیں گی۔ مجیب الدّعوات اور قادر خدا نے بالآخر ان کی دعا قبول فرمائی اور آہستہ آہستہ ان کے زخموں کو مندمل کر دیا مگر ٹانگ بہت خراب ہو چکی تھی اور عام صحت بھی کمزور تھی۔ بعد میں انہوں نے گھر میں چھڑی کے سہارے چلنا شروع کر دیا اور پھر وہ سکول میں داخل ہو گئیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر چکی تھیں۔

ربوہ آنے کے بعد سعیدہ احسن ایک جمعہ پر گئیں تو حضرت مصلح موعود نے خطبہ جمعہ میں عورتوں کو بھی زندگی وقف کرنے کی تحریک فرمائی چنانچہ انہوں نے اسی وقت زندگی وقف کرنے کی نیت کر لی۔ اس دوران انہوں نے میٹرک پاس کر لیا تھا چنانچہ جب حضور کو نتائج سے مطلع کیا گیا تو آپ نے وقف منظور فرماتے ہوئے انہیں جامعہ نصرت میں داخلے کی ہدایت فرمائی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے حضور کے منشا کے مطابق کراچی یونیورسٹی میں ایم اے فلاسفی میں داخلہ لے لیا اور ایک سال تعلیم حاصل بھی کی مگر نامساعد حالات کی بنا پر ان کا کراچی رہنا مشکل ہو گیا چنانچہ وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آ گئیں۔ پھر جامعہ نصرت کی ضرورت کے پیشِ نظر انہیں لائبریرین کا ایک سال کا کورس کرنے کے لیے کہا گیا۔ امتحان دیتے ہی انہوں نے جامعہ نصرت کی لائبریری کا کام سنبھال لیا تاہم وہ لائبریری سائنس کا امتحان پاس نہ کر سکیں۔ بعد میں انہوں نے ایم اے عربی کا امتحان دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس میں کامیاب ہو گئیں۔

شروع میں وہ کئی سال تک جامعہ نصرت میں لائبریرین کے طور پر کام کرتی رہیں تاہم ۱۹۶۲ء میں جب حکومتی پالیسی کے تحت ایف اے کلاسز کا الحاق نصرت گرلز ہائی سکول کے ساتھ کر دیا گیا تو نئے سٹاف کی

ضرورت پیش آئی چنانچہ وہ عربی کی لیکچرر منتخب ہوگئیں۔ انہوں نے قریباً اٹھائیس سال اس حیثیت میں کام کیا اور ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء کو اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہوئیں۔

منظور النساء اور سعیدہ احسن کے بعد جامعہ نصرت میں عربی کی تیسری لیکچرر ملک ممتاز علی اور نصرت گرلز ہائی سکول والی استانی احمد بی کی سب سے بڑی صاحبزادی، حمامۃ البشریٰ تھیں۔ یاد رہے کہ ملک ممتاز علی ایک مخلص احمدی تھے اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ جات کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد دارالصدر غربی ربوہ میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔

موصوفہ نصرت گرلز ہائی سکول اور جامعہ نصرت کی اولڈ سٹوڈنٹ تھیں۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے ایم اے (عربی) کا امتحان پاس کیا۔

اُن دنوں حمامہ کے شوہر، عبدالشکور اسلم تعلیم الاسلام کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے صوفی بشارت الرحمٰن، صدر شعبۂ عربی سے اچھے مراسم تھے۔ صوفی صاحب کو معلوم تھا کہ شکور اسلم رشتے کے متلاشی ہیں چنانچہ انہوں نے حمامہ کا رشتہ تجویز کیا جسے موصوف نے منظور کر لیا اور گیارہ ستمبر ۱۹۶۵ء رخصتانہ کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس اثنا میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ چھڑ گئی تاہم بزرگان کے مشورہ کے تحت شادی تاریخ مقررہ ہی کو ہوئی۔

حمامہ کی جامعہ نصرت میں بطور لیکچرر تقرری شادی سے پہلے ہوگئی تھی۔ وہ تدریس کے علاوہ جماعتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک ''مصباح'' کی نائب ایڈیٹر رہیں، ان کے مضامین جماعتی رسائل میں چھپتے رہے اور انہیں خواتین کے جلسہ سالانہ پر نظمیں پڑھنے اور تقاریر کا موقع بھی ملتا رہا۔

۱۹۶۹ء میں شکور اسلم نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت سیرالیون چلے گئے مگر سانس کی تکلیف کی وجہ سے انہیں وقت سے بہت پہلے اپنا کنٹریکٹ ختم کر کے واپس آنا پڑا۔ واپسی پر انہوں نے ایچی سن کالج، لاہور میں ملازمت اختیار کر لی۔ آگے کی داستان آپ شکور اسلم کی زبانی سنئے جو آج کل ترکِ وطن کے بعد انگلستان میں مقیم ہیں۔ موصوف بتاتے ہیں: میں چونکہ مستقل طور پر لاہور آ گیا تھا اس لیے فیصلہ کیا کہ حمامہ بھی جامعہ نصرت کی ملازمت چھوڑ کر لاہور آ جائیں۔ اُن ہی دِنوں پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے عربی کی لیکچررز کی اسامیاں مشتہر ہوئی تھیں۔ حمامہ نے بھی درخواست دے دی اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئیں۔ ان کی پہلی تعیناتی پسرور میں ہوئی لیکن قریباً ایک سال بعد ان کی تبدیلی گورنمنٹ کالج فار ویمن، سمن آباد، لاہور میں ہوگئی۔

لاہور آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد انہیں آسٹیو ملیشیا کی تکلیف ہوگئی۔ ان کی ٹانگوں اور ہاتھوں کی ہڈیوں میں کریکس آنے لگے اور چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا۔ کئی ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا مگر آرام نہ آیا۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹر نبیہہ حسن (جو بعد میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج، لاہور کی پرنسپل رہیں) سے علاج کرایا جائے۔ میں ان سے ملا، حمامہ کی بیماری کی کیفیت انہیں بتائی اور درخواست کی کہ وہ گھر آ کر مریضہ کا معاینہ کر لیں تاہم انہوں نے انکار کر دیا اور فرمانے لگیں کہ میں معاینہ کے لیے کبھی کسی کے گھر نہیں گئی مگر جب میں باہر نکلنے لگا

تو نہ جانے انہیں کیا خیال آیا۔ انہوں نے مجھے واپس بلایا اور میرا تفصیلی تعارف حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ ہمراہ چلنے کو تیار ہوگئیں اور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ہمارے گھر پہنچ گئیں۔ وہ حمامہ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ ان سے ان کی دوستی ہوگئی۔ اکثر اپنی گاڑی میں ہمارے گھر آتیں، حمامہ کو اپنے کلینک لے جاتیں اور معاینہ کے بعد خود ہی واپس گھر چھوڑ جاتیں۔ فیس لینا تو درکنار، وہ کئی مرتبہ اپنی طرف سے ہمارے لیے تحائف بھی بھجوا دیتیں۔

ڈاکٹری ہدایت کے مطابق حمامہ کو روزانہ کیلشیم کا ایک انجکشن لگتا تھا مگر بیماری میں افاقہ نہ ہوا۔ مرض کی خصوصی نوعیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر نبیہہ حسن نے ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا مگر اس بورڈ کو بھی بیماری کی وجہ سمجھ نہ آ سکی۔ یہ بیماری ہڈیوں میں کیلشیم کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور عجیب بات ہے کہ جب بھی ٹیسٹ کیا جاتا تو خون میں کیلشیم کی مقدار بالکل نارمل نکلتی۔ ایک ڈاکٹر نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ پیراتھائیرائیڈ گلینڈ میں کوئی خرابی نہ ہو۔ میں نے لاہور کی تمام لیبارٹریز سے پتا کیا مگر اس ہارمون سے متعلق کسی ٹیسٹ کی سہولت میسر نہ تھی۔ میرے بھائی شہاب نے جو کہ سویڈن میں مقیم ہیں تجویز کیا کہ اگر حمامہ کا کچھ خون منجمد کر کے سویڈن بھجوا دیا جائے تو وہ یہ ٹیسٹ کروا دیں گے مگر جس دن ان کا یہ خط موصول ہوا اس سے اگلے روز یعنی ۱۸ نومبر ۱۹۸۱ء کو ان کی وفات ہوگئی۔ ان کی نعش ربوہ لے جائی گئی اور وہ قطعہ شہدا میں دفن ہوئیں۔

حمامہ خدا تعالیٰ کے فضل سے مخلص احمدی تھیں اور خلافت سے وابستگی نہیں عشق رکھتی تھیں۔ چھوٹی آپا سے نہ صرف رابطہ تھا بلکہ بہت حد تک دوستی بھی ہوگئی تھی اس لیے ان کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ انتہائی صابر و شاکر تھیں حتّٰی کہ اپنی بیماری کا بھی کبھی شکوہ نہیں کیا۔ غریبوں کی ہمدرد تھیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب ہم نے ٹی وی خریدا اس وقت ایچی سن کالج کی سرونٹ کالونی میں کسی کے پاس ٹی وی نہ تھا چنانچہ سرِ شام کالونی کے بیسیوں بچے ٹی وی دیکھنے ہمارے گھر میں جمع ہو جاتے۔ حمامہ خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتیں اور خود ٹی وی آن کر کے انہیں احترام کے ساتھ کمرے میں بٹھاتیں۔ اب بھی جب کبھی میں ایچی سن کالج جاتا ہوں تو وہ بچے جوانی کی منزل پھلانگ کر بڑھاپے کے قریب پہنچ چکے ہیں مجھے ملتے ہیں اور حمامہ کو یاد کرتے ہیں۔

وفات سے چند ماہ پیشتر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نعت لکھی۔ گورنمنٹ کالج فار ویمن، سمن آباد میں اردو کی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ، راحت بخاری نے یہ نعت بہت پسند کی اور ان کی وفات کے بعد کالج کے میگزین ''فکرِ تاباں'' میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کر دی کہ حمامہ نے یہ نعت لکھ کر اپنی زندگی میں ہی جنت کا سامان پیدا کر لیا تھا۔

حمامہ کے بعد اب کچھ ذکر قانتہ شاہدہ کا جو عطاء المجیب راشد، مربی سلسلہ انگلستان کی اہلیہ ہیں اور جامعہ نصرت کی ایک ہونہار اولڈ سٹوڈنٹ تھیں۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا اور حمامۃ کی عدم موجودگی میں ۱۹۶۸ء میں کچھ عرصہ جامعہ نصرت میں یہ مضمون پڑھایا۔

آخر میں کچھ باتیں رضیہ درد کے بارے میں جو ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۹ء تک جامعہ نصرت میں ابتداءً

دینیات اور بعد میں عربی پڑھاتی رہیں۔

موصوفہ ۲۴ جولائی ۱۹۲۹ء کو قادیان میں پیدا ہوئیں اور وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھایا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے اور جب تعلیم الاسلام کالج میں ایم اے عربی کی کلاسز کا اجرا ہوا تو انہوں نے ایم اے کرلیا۔ اس کے بعد انہیں دو دہائیوں تک جامعہ نصرت میں تدریس کا موقع ملا۔ وہ ستائیس اپریل ۲۰۱۴ء کو چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پاکر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی اور دو بیٹوں سے نوازا۔ بیٹی ایک واقفِ زندگی سے بیاہی ہوئی ہے اور دونوں بیٹے (حامد مقصود عاطف اور ڈاکٹر محمود عاطف) خود واقفینِ زندگی ہیں۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر محمود عاطف کے الفاظ میں: وہ طالبات میں بے حد ہردلعزیز تھیں۔ شاگردوں کے ساتھ ان کا نہایت قریبی تعلق ساری عمر قائم رہتا۔ لجنہ اماء اللہ کی سرگرم رکن تھیں۔ لمبا عرصہ لجنہ اماء اللہ مقامی میں حضرت صاحبزادی ناصرہ بیگم اور بعد میں لجنہ اماء اللہ مرکزیہ میں چھوٹی آپا کے ساتھ مختلف شعبہ جات میں خدمت کا موقع ملا۔ نائب صدر لجنہ پاکستان رہیں اور متعدد بار چھوٹی آپا کی غیر موجودگی میں قائم مقام صدر کی ذمہ داریاں نبھائیں۔

انہیں فنِ تقریر پر عبور حاصل تھا۔ محفل میں بات مختصر لیکن واضح اور سامعین کے ذہنی معیار کے مطابق کرتیں۔ جماعتی اجتماعات اور جلسہ سالانہ پر ان کی تقاریر دلچسپی سے سنی جاتی تھیں۔ کالج میں مختلف تقاریب پر سٹیج سیکرٹری کی ذمہ داری نباہتیں۔ ان کی آواز میں ایک بارعب ترنّم تھا۔

اعلیٰ شعری ذوق کی مالک تھیں اور خود بھی شعر کہتیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی سیرت پر دو کتابچے لکھے اور ان کے متعدد مضامین جماعتی اخبارات ورسائل کی زینت بنے۔

رضیہ درد کا ذکرِ خیر ختم ہوا۔ اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ برصغیر پاک و ہند کے کلچر میں فارسی زبان کی اہمیت ہمیشہ اظہر من الشمس رہی ہے۔ اگرچہ اب بدلتے ہوئے حالات کے سبب ترجیحات میں تبدیلی آچکی ہے اور یہ زبان پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے تاہم ایک زمانے میں بہت سے طلبہ بطور اختیاری مضمون اسے پڑھا کرتے تھے۔ اسی ذوق وشوق کے مدنظر یہ مضمون شروع سے جامعہ نصرت کے نصاب میں شامل رہا ہے تاہم پہلی خاتون جسے یہاں فارسی کی لیکچرر کے طور پر خدمت کا موقع ملا رشیدہ تسنیم بنت ڈاکٹر خیر دین بٹ تھیں۔ ڈاکٹر خیر دین بٹ محکمہ لائیوسٹاک کے ملازم تھے جو سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ربوہ آ آباد ہوئے تھے اور گول بازار میں ''بٹ میڈیکل سٹور'' کے نام سے ادویہ کی ایک دکان چلا رہے تھے۔ رشیدہ تسنیم قیامِ پاکستان کے وقت نصرت گرلز ہائی سکول، قادیان کی ابتدائی کلاسوں کی طالبہ تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد ان کا کچھ وقت بعض دیگر مقامات پر گزرا مگر جب ۱۹۵۲ء میں ان کا خاندان ربوہ منتقل ہوگیا تو انہوں نے یہیں رہ کر ۱۹۵۹ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں موصوفہ نے چھوٹی آپا کی تحریک پر پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرلیا اور یہ مضمون جامعہ نصرت میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ چونتیس

سال اس ادارے سے منسلک رہیں۔ اس دوران انہوں نے وائس پرنسپل کی ذمہ داری کے علاوہ سٹاف سیکرٹری، نگران امورِ طلبہ، انچارج باغبانی اور صدر لجنہ حلقہ کالج وغیرہ کی ڈیوٹیاں بھی بطریقِ احسن نبھائیں۔ وہ ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو ریٹائر ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ منتقل ہوگئیں جہاں انہوں نے تیئس اپریل ۲۰۱۱ء کو وفات پائی۔ موصیہ تھیں۔ نیوجرسی میں دفن ہوئیں اور ان کا یادگاری کتبہ بہشتی مقبرہ، ربوہ میں نصب ہوا۔

موصوفہ کی عمدہ کارکردگی اور نیک نامی کا کچھ اندازہ اس قراردادِ تعزیت سے ہوتا ہے جو اُن کی ریٹائرمنٹ کے چودہ سال بعد پرنسپل اور سٹاف، گورنمنٹ جامعہ نصرت برائے خواتین کی طرف سے ان کی وفات کے موقع پر پاس کی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''آپ جامعہ نصرت کے شعبہ فارسی کی ایک قابل استاد کے طور پر چونتیس سال تدریسی فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ آپ کا شمار ادارے کے بے حد ذمّہ دار اور قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔ نہایت فرض شناس، محبت کرنے والی، ہمدرد اور مہربان ہستی تھیں۔ ہمیشہ اپنے رفقا کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتی تھیں۔ رنجشوں کو دُور کرنے میں ہمیشہ پہل کرنے والی اور جلد معاف کرنے والی تھیں۔ آپ نہایت شگفتہ مزاج اور باغ و بہار شخصیت کی مالک تھیں۔ اپنے سٹوڈنٹس کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی تھیں اور ان کے ذاتی مسائل کو حل کرنے میں کوشاں رہتی تھیں۔

علم وادب کے موضوعات پر آپ کا عمیق مطالعہ تھا، علمی موضوعات پر آپ کی رائے معتبر سمجھی جاتی اور دنیاداری کے معاملات پر آپ کی گہری نظر تھی۔ نہایت غریب پرور، کھلے ذہن اور صاف دل کی مالک تھیں۔ ایک اچھی منتظم، بہترین دوست اور ایک فرض شناس استاد تھیں۔ یقیناً ایسی محبت کرنے والی، مہربان ہستی کا انتقال ہم سب کے لیے باعثِ رنج ہے۔''

مرحومہ ڈاکٹر محمد شریف خان، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج کی اہلیہ تھیں۔ موصوف بیان کرتے ہیں کہ ان کی شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی تھی۔ ان کی اہلیہ ملازمت کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں سے احسن طریق پر عہدہ برا ہوئیں اور ایک مثالی زندگی گزاری۔ مرحومہ نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق اور رہنمائی سے بچوں کی پرورش اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اچھے ماحول میں اعلیٰ تعلیم دلا کر کی۔ جب ریٹائر ہوئیں سب بچے اپنے گھروں میں شادوآباد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحومہ کو صحت مند پوتوں، پوتیوں، نواسوں اور نواسی سے نوازا جو پڑھ رہے ہیں، دیندار اور جماعت کے خادم ہیں۔

روزنامہ الفضل (۱۹ مئی ۲۰۱۲ء) میں عبدالسمیع خان کے قلم سے ''جماعت احمدیہ اور خدمتِ قرآن: صادقانہ محبت کے عاشقانہ نظارے'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ''محترمہ رشیدہ تسنیم صاحبہ'' کے ذیلی عنوان سے موصوفہ کے بارے میں پروفیسر محمد شریف خان کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے:

''لجنہ کے زیرانتظام منعقدہ کلاس برائے درستگی تلفّظِ قرآن میں شامل ہوکر محترم قاری محمد عاشق صاحب سے صحیح تلاوت سیکھی۔ اس کے علاوہ لجنہ نے رشیدہ کی محلہ جات کی لجنات میں جا کر حضرت مسیح موعود کی متعدّد کتب کا خلاصہ سنانے اور نفسِ مضمون سمجھانے کی ڈیوٹی لگائی تھی جسے بڑی خوبی اور خوش دِلی سے نبھایا اور اس

طرح ربوہ کی لجنات سے تعارف حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اب رشیدہ کا زیادہ وقت قرآن کریم کی تلاوت اور حضرت مسیح موعود کی فرمودہ تفسیر قرآن کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ ایم ٹی اے پر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے قرآن شریف کے درس بڑے انہماک سے سنتیں اور ساتھ ساتھ نوٹس لیتی جاتیں اور ان کی روشنی میں گھر میں مختلف دینی مسائل پر بچوں کے ساتھ ڈِسکشَن کرتیں۔

ستمبر ۱۹۹۹ء میں ہم امریکہ شفٹ ہوئے تو نئے ماحول میں بھی رشیدہ کا گھرداری کے علاوہ دینی شوق جاری رہا اور دعاؤں کا موقع ملا۔ یہاں رشتہ داروں کے بچوں میں گھل مل گئیں۔ انہیں قاعدہ یسّرنا القرآن اور قرآن کریم پڑھاتیں۔ اردگرد رہنے والی مستورات کو ان کی خواہش پر قرآن کریم گھر جاکر پڑھاتیں۔ ایم ٹی اے پر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی قرآن کلاس میں باقاعدہ شامل ہوتیں، قرآن کریم ہاتھ میں رکھتیں اور مشکل آیات پر اپنے پہلے سے لیے ہوئے نوٹس میں اضافہ کرتی جاتیں۔ لجنہ کے اجلاسات میں جاتیں اور دین کے متعلق لجنات کے سوالات کا جواب دیتیں۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کا قرآن کریم کا ترجمہ چھپا تو بہت خوش ہوئیں، خرید کر عزیزوں کو تحفہ دیا، فون پر عزیزوں کو اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کرتی رہتیں۔ ہر سورۃ کے آغاز میں دیئے گئے خلاصے کو غور سے پڑھتیں اور مجھے بھی ماحصل بتاتیں۔

جب آنکھوں میں موتیا کی تکلیف شروع ہوئی تو...... قرآن کریم پڑھ نہیں سکتی تھیں جس کا بہت احساس تھا۔ بڑی تقطیع میں لکھا قرآن کریم کچھ عرصہ پڑھا، تکلیف زیادہ ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپریشن کے بعد نظر بحال ہوگئی، بہت خوش تھیں۔ پھر تلاوت اور کتب کے مطالعہ میں زیادہ وقت گزارتیں۔‘‘

انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کے علاوہ ایک اور اہم مضمون اسلامیات ہے جو اَب ہمارے نصابِ تعلیم میں لازمی مضمون کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ جب تک جامعہ نصرت کو اس مضمون کی کوئی خاتون لیکچرر میسر نہ آسکی، مولوی محمد عثمان صدیقی یہ مضمون پڑھاتے رہے تاہم ۱۹۶۱ء میں بشریٰ بشیر کے تقرر کے بعد وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔

بشریٰ بشیر جو طویل مدت تک جامعہ نصرت میں اسلامیات کی لیکچرر اور پھر پرنسپل رہیں عرصہ دراز سے امریکی ریاست نیوجرسی میں مقیم ہیں۔ میں نے موصوفہ کا ذکر تو سن رکھا تھا لیکن ان سے کبھی رابطے کا موقع نہ ملا تھا۔ منظور النساء نے ان کا فون نمبر فراہم کر کے یہ مشکل آسان کردی۔ یوں نہ صرف ان سے گفتگو ہوگئی بلکہ ان کے شوہرِ نامدار، بشیر احمد سے بھی تعارف ہوگیا۔

بہت دیر تک چلنے والی اس گفتگو کے دوران کئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ بشریٰ بشیر نے بتایا: میرے والدِ بزرگوار جن کا نام محمد عبداللہ تھا کلاس والا کے رہنے والے تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے اوورسیئر تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں برما میں مقیم تھے اور سال کے سال سیالکوٹ آیا کرتے تھے جہاں انہوں نے اپنی فیملی کو سَیٹل کر رکھا تھا۔ وہ ۱۹۳۵ء میں سیالکوٹ آئے تو ان کی وفات ہوگئی۔ ہم سات بہنیں اور تین بھائی تھے جن کی پرورش میں ہماری والدہ کو سخت محنت کرنا پڑی۔ تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے ۱۹۵۰ء میں جب میری والدہ کی وفات پر

تین سال بیت چکے تھے اور میں نے میٹرک پاس کیا تھا میری شادی ہوگئی۔ مجھے حصولِ تعلیم کا شوق تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے شوہر بھی ایسا ملا جس نے اس معاملے میں میری ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی چنانچہ میں نے ایف اے کا امتحان دینے کا فیصلہ کرلیا۔ گھریلو ذمہ داریاں بھی تھیں لیکن خدا نے توفیق دی اور میں نے یہ امتحان پاس کرلیا۔ ان دنوں جامعہ نصرت کھلے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ احمدی طالبات کے لیے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی جہاں وہ اپنے ماحول میں رہتے ہوئے تعلیم جاری رکھ سکتی تھیں سو میں نے بھی یہاں داخلہ لے لیا۔ میرا ایک مضمون اسلامیات تھا۔ ۱۹۵۸ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں نے اس مضمون میں پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور وظیفے کی مستحق ٹھہری۔ اب اگلی منزل اور آسان ہوگئی چنانچہ میں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں داخلہ لے لیا۔

بشریٰ بشیر نے خود پر خدا تعالیٰ کے افضال کا مزید تذکرہ کرتے ہوئے کہا: ایم اے میں ہمیں ایک تھیسس بھی لکھنا پڑتا تھا۔ ہمارے ہیڈ آف ڈِپارٹمنٹ علاّمہ علاؤ الدین صدّیقی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں احمدی ہوں چنانچہ انہوں نے میرے تھیسس کے لیے ایک ایسا عنوان مقرر کردیا جس کے تحت اشاعتِ دین کے لیے خواتینِ جماعت احمدیہ کی قربانیوں کا ذکر لابد تھا۔ میں گھبرائی کہ اگر خدانخواستہ ایکسٹرنل ایگزامینر کا رویّہ جماعت کے ساتھ متعصّبانہ ہوا تو وہ مجھے فیل ہی نہ کردے اور میرے کئے کرائے پر پانی پھر جائے تاہم علاّمہ نے مجھے کامیابی کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ مجھے بے فکر ہوکر اپنے تھیسس پر کام شروع کردینا چاہئے۔ ان کے اطمینان دلانے کے باوجود مجھے دھڑکا تو لگا رہا لیکن خدا کا نام لے کر میں نے کام شروع کردیا۔ دعا بھی کرتی رہی۔ جب وائیوے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی نے قاضی محمد اسلم کو میرا ایکسٹرنل ایگزامینر مقرر کیا ہے۔ قاضی صاحب، آپ جانتے ہیں، اسی یونیورسٹی میں فلاسفی ڈِپارٹمنٹ کے ہیڈ اور انتہائی مخلص احمدی تھے۔ جب نتیجہ آیا تو میں نے خدا کے کرم سے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور گولڈ میڈل کی مستحق قرار پائی۔

لجنہ اماء اللہ کراچی نے یہ مقالہ بعد میں ’’محسنات‘‘ کے نام سے شائع کردیا اور اسے جماعتی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

امتحان دیتے ہی موصوفہ کا تقرر جامعہ نصرت میں بطور لیکچرر ہوگیا۔ یہ وسط ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ جب کالج نیشنلائز ہوا تو مسز شاہ پرنسپل تھیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بشریٰ بشیر پرنسپل مقرر ہوئیں۔ وہ ۱۹۸۱ء تک یہاں رہیں اور پھر پری میچوئر ریٹائرمنٹ لے کر امریکہ منتقل ہوگئیں جہاں ان کے چار بچے پہلے سے سَیٹل ہو چکے تھے۔

بشریٰ بشیر اپنے اہل و عیال کے ساتھ امریکہ میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے شوہر جن کا تعلق ضلع سیالکوٹ کے موضع چندر کے منگولے سے ہے پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں۔ ابتداءً وہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور میں پڑھاتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے واپڈا میں ملازمت اختیار کرلی اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ بشریٰ بشیر کے علاوہ اسلامیات کی جن لیکچررز کو جامعہ نصرت میں

خدمت کا موقع ملا ان میں امۃ الرشید لطیف بھی شامل ہیں جو ربوہ کی ایک معروف شخصیت، عبداللطیف لون المعروف لطیف بھٹے والے کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم احمدیہ سکول، سیالکوٹ میں ہوئی لیکن پھر وہ ربوہ میں نصرت گرلز ہائی سکول میں پڑھتی رہیں۔ وہ سکول اور کالج میں آپی کی کلاس فیلو تھیں اور ان کا شمار لائق اور ذہین طالبات میں ہوتا تھا چنانچہ انہیں بی اے کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک طلائی تمغہ عطا ہوا۔ وہ ۱۹۶۲ء میں ایم اے کے امتحان میں یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں اوّل رہنے پر ایک اور طلائی تمغے کی بھی مستحق قرار پائیں۔ وہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہیں تاہم شادی کے بعد انہیں یہ ملازمت ترک کرنا پڑی اور وہ اپنے شوہر، میر رفیق احمد (جو پاکستان میں سِول ایوی ایشن کے شعبے میں تھے) کے ہمراہ انگلستان منتقل ہو گئیں۔ ان سے بات ہوئی تو انہوں نے برجستہ کہا: آپ نے کس خوبصورت زمانے کی یاد دلا دی ہے۔ جوانی تھی۔ کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ اب تو بڑھاپا ہے اور ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ اپنی تعلیم اور پھر تدریس کا زمانہ یاد آتا ہے تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ مسز شاہ انتہائی شفیق تھیں، ہمارے شعبے کی صدر مسز بشریٰ بشیر بہت مہربان تھیں اور ہماری شاگردیں علم کی لگن رکھتی تھیں۔

ان کی کوئی گفتگو چھوٹی آپا کے ذکر سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ کہا کرتی ہیں: جامعہ نصرت میں لیکچرر شپ کے دوران میں نے ان کی شفقت اور مہربانی سے لجنہ کی خدمت کا خوب موقع پایا چنانچہ اس عرصے میں مجھے لجنہ اماء اللہ مرکزیہ میں نائب سیکرٹری اصلاح وارشاد، نائب سیکرٹری تعلیم، سیکرٹری ناصرات اور جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔

جب وہ شادی کے بعد انگلستان منتقل ہوئیں تو ابتداءً ان کا قیام شیفیلڈ میں تھا جہاں کوئی دوسری احمدی فیملی موجود نہ تھی جس کی وجہ سے انہیں ہر وقت تشنگی کا احساس رہتا چنانچہ وہ کوشش کر کے ۱۹۶۹ء میں لندن منتقل ہو گئیں جہاں وہ لجنہ کی ایک فعّال کارکن ہیں۔

امۃ الرشید لطیف کے بعد نعیمہ سلہری اسلامیات پڑھانے پر مامور ہوئیں۔ وہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۶ء کے دوران یہاں رہیں۔

جہاں تک مَیتھ کا تعلق ہے ۱۹۶۰ء تک پروفیسر محمد ابراہیم ناصر اس مضمون کی تدریس پر مامور رہے۔ یہی وہ سال تھا جب جامعہ نصرت میں اس مضمون کی ایک خاتون لیکچرر کا تقرر ہوا۔ ان کا نام رشیدہ شریف ہے اور وہ بریلی سے تعلق رکھنے والے شریف احمد، ایگزیکٹو انجینئر کی صاحبزادی ہیں۔ شریف احمد اپنے خاندان میں اکیلے احمدی تھے اور انہوں نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔

رشیدہ شریف جو شادی کے بعد رشیدہ منیر کہلانے لگی ہیں عرصہ دراز سے آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ میں مقیم ہیں اور اس ملک میں جا کر آباد ہونے والے ابتدائی احمدیوں میں سے ہیں۔ ان کے شوہر، منیر احمد عابد نے شادی کے وقت باٹنی میں ایم ایس سی کر رکھا تھا اور وہ جامشورو یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں انہیں

پی ایچ ڈی کے لیے آسٹریلیا کا وظیفہ مل گیا۔ انہیں یہ ملک اتنا پسند آیا کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ رشیدہ منیر سے بات ہوئی تو انہوں نے میرے مختلف سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا: ”میں نے میٹرک گجرات کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول سے کیا تھا جہاں اُن دنوں میرے والدِ بزرگوار کا تقرر تھا۔ بعدہٗ میں نے لاہور کالج فار ویمن میں داخلہ لیا اور ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) وہاں سے کی۔ اس اثناء میں والدِ گرامی کا تقرر پشاور میں ہو گیا چنانچہ میں نے بی ایس سی کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے پاس کیا جس کے بعد ایم اے کے لیے مجھے پنجاب یونیورسٹی جانا پڑا جہاں سے میں نے ۱۹۵۹ء میں مَیتھ میں ماسٹرز کی ڈگری لی۔ میں نے جامعہ نصرت میں ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک پڑھایا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں میری شادی ہو گئی چنانچہ مجھے مجبوراً یہ ملازمت چھوڑنا پڑی۔ کچھ وقت سندھ میں گزرا لیکن ۱۹۷۲ء سے آسٹریلیا میں ہوں۔ یوں سمجھ لیں ساری عمر یہیں بیت گئی ہے تاہم جامعہ نصرت میں گزرا ہوا وقت مجھے اب بھی بہت یاد آتا ہے۔

موصوفہ کے استعفیٰ کے بعد مس رشیدہ حسین جو اپنی دوستوں کے حلقے میں ”مس حسین“ کے نام سے معروف تھیں اور محمد حسین کاہلوں، عربی ٹیچر کی صاحبزادی تھیں جامعہ نصرت میں ریاضی پڑھانے پر مامور ہوئیں لیکن عین جوانی کے عالم میں ۱۱ جون ۱۹۶۹ء کو وفات پا گئیں۔ ان کی وفات پر جامعہ نصرت ربوہ کی تعزیتی قرارداد مطبوعہ الفضل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا وجود کالج کے لیے کس قدر قیمتی تھا۔ اس قرارداد میں یہ کہا گیا ہے کہ ”ہم ایک انتہائی دیانتدار، خوش خُلق اور قابلِ رشک حد تک محنتی کارکن سے محروم ہو گئے ہیں۔ جامعہ نصرت ہمیشہ اس خندہ پیشانی کے ساتھ فرائض کی ادائیگی بجالانے والی اور ہمہ وقت کام میں مصروف ہستی کو یاد رکھے گا۔ وہ ہر ایک سے ہمدردی کرنے والی، صوم وصلوٰۃ کی پابند اور پرہیزگاری کے اُس مقام پر تھیں کہ کبھی بُھولے سے بھی اُن کی زبان پر کسی کی برائی یا شکوہ نہ ہوتا تھا...... استاد کی حیثیت میں...... لیاقت اور منتظمہ کی حیثیت سے ان کا نمونہ ہمیشہ مشعلِ راہ رہا ہے۔“

لجنہ اماء اللہ مرکزیہ میں ان کے پاس سیکرٹری مال کی ذمہ داری تھی۔ ان کی وفات پر لجنہ کی قرارداد سے پتا چلتا ہے کہ ”اس اہم ذمہ داری کو انہوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے نباہا۔ مرکزی حسابات کی چیکنگ، سالانہ بجٹ آمد وخرچ کا مرتب کرنا، سالانہ تفصیل چندہ جات ترتیب دینا، ہر قسم کے کاموں کو باوجود اس کے کہ جامعہ نصرت میں لیکچرار تھیں اور وہاں بھی ان گنت ذمہ داریاں تھیں نہایت احسن طریق سے پوری دلچسپی اور انہماک سے سرانجام دیتی رہیں۔ سالانہ بجٹ آمد وخرچ بناتے وقت ان میں بہت کچھ اصلاح کرتیں اور ہمیشہ کوشاں رہتیں کہ مجوّزہ بجٹ میں کسی قسم کی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

اگرچہ جسمانی لحاظ سے انتہائی کمزور تھیں اور صحت دن بدن گرتی جاتی تھی پھر بھی باقاعدگی اور ہمت سے دفتر میں آتی رہیں۔ ان کے نحیف و ناتواں جسم کے مقابلہ میں دماغ نہایت روشن اور ذہین تھا اور اپنی خداداد ذہانت کے باعث شعبہ مال کا کام صحیح رنگ میں کرتی رہیں اور پیسے پیسے کا حساب ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتیں اور اس کام میں کسی دوسرے کے کام سے ان کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ آپ تادمِ آخر کام کرتی رہیں چنانچہ جس شام کو ان کی

وفات ہوئی اس دن دوپہر کو بھی لجنہ مرکزیہ کے چند بل اور چیک ان کے پاس دستخطوں کے لیے بھجوائے گئے جن میں سے دو پر انہوں نے باوجود شدید نقاہت اور گھبراہٹ کے دستخط کر دیئے اور ایک بل یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ اس وقت مزید کام کی ہمت نہیں شام کو دوبارہ بھجوا دیں لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ شام ان کی زندگی کی آخری شام بن کر رہ جائے گی اور...... وہ اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔''

النصرت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ موصوفہ کی وفات پر اس رسالہ کے ادارتی سٹاف کی طرف سے انگریزی زبان میں ایک تعزیتی نوٹ شائع کیا گیا اور مِس وحیدہ نے ''مس رشیدہ حسین'' کے عنوان سے انگریزی زبان میں پانچ صفحات پر مشتمل ایک مضمون لکھا۔ اسی طرح ایف ایس (جو غالباً فرخندہ شاہ کا مخفف ہے) نے "May her soul rest in peace" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں مرحومہ کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب مِس حسین کا جامعہ نصرت میں تقرر ہوا، مَیتھ کی ایک اور لیکچرر نے بھی اس کالج کے سٹاف میں شمولیت اختیار کی اور وہ تھیں رضیہ ناصر جو راقم الحروف کے چچا، پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی کے ساتھ رغبت انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار سے ورثہ میں پائی ہے چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں جامعہ نصرت سے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا اور اس سے اگلے سال پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔ انہیں ۸ مارچ ۱۹۶۷ء سے لے کر اکتیس اگست ۱۹۷۰ء تک ڈھائی سال اس ادارے کی خدمت کا موقع ملا جس کے بعد وہ شادی کے نتیجے میں انگلستان منتقل ہو گئیں۔ لمبا عرصہ گلاسگو میں گزارا لیکن آج کل نارتھ یارک شائر میں سکاربورو نامی قصبے میں مقیم ہیں۔

رضیہ ناصر کی ایک ہمعصر امۃ الحسیف تھیں جو گوکھووال کے ایک احمدی، عبدالواحد کی صاحبزادی ہیں۔ وہ ۱۹۶۷ء میں جامعہ نصرت سے گریجوایشن کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے مَیتھ ڈِپارٹمنٹ میں داخل ہوئیں اور ۱۹۶۹ء میں ایم ایس سی کر کے فارغ ہوئیں۔ اس وقت جامعہ نصرت میں مَیتھ کے لیکچرر کی ایک جگہ خالی تھی چنانچہ ان کا تقرر یہاں ہو گیا۔ وہ دو سال یہاں رہیں اور ۱۹۷۱ء میں اپنی شادی کے بعد کراچی منتقل ہو گئیں۔ ان کا کچھ وقت فارغ گزرا لیکن پھر پبلک سروس کمیشن کی طرف سے منتخب ہونے کے بعد گوجرہ، اٹک اور راولپنڈی کے گورنمنٹ کالجز میں پڑھاتی رہیں جب کہ ان کے شوہر، عبدالکریم جاوید پی سی ایس آئی آر میں ملازم تھے۔

امۃ الحسیف آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں اور ریٹائرڈ لائف گذار رہی ہیں۔

رضیہ ناصر کے استعفیٰ کے بعد صوفی خدا بخش عبد زیروی کی صاحبزادی جو حافظ مظفر احمد کی اہلیہ ہیں جامعہ نصرت میں پڑھانے لگیں۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مَیتھ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں پڑھانا شروع کیا اور ماسوا اس ایک سال کے جب وہ شورکوٹ میں متعین رہیں، ان کا کُل عرصۂ ملازمت ربوہ میں ہی گزرا۔ انہیں جامعہ نصرت کی پرنسپل شپ کا اعزاز بھی حاصل ہوا جس کے بعد وہ اکیس اکتوبر ۲۰۰۷ء کو ریٹائر ہوئیں۔

جامعہ نصرت میں مَیتھ کی ابتدائی خواتین لیکچررز کا ذکرِ خیر آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب کچھ باتیں معاشیات کی لیکچررز کے بارے میں۔

معاشیات کی پہلی خاتون لیکچرر، امۃ المجید ان سولہ طالبات میں شامل تھیں جنہوں نے ۱۹۵۱ء میں جامعہ نصرت کے قیام پر فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا۔ انہوں نے بی اے تک ربوہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر ان کے کزن جمیل احمد خاں ولد عبدالواحد خان آف دلگشا پرفیومری کی روایت کے مطابق اسلامیہ کالج کوپر روڈ، لاہور سے اکنامکس میں ایم اے کیا۔ اگر ان کا کوئی تعلیمی سال ضائع نہ ہوا ہو تو انہوں نے ۱۹۵۷ء میں ایم اے کر لیا ہوگا۔ اس کے فوراً بعد ان کی تقرری جامعہ نصرت میں ہو گئی۔

''تاریخ لجنہ اماءاللہ'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوفہ دُنیوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم پر بھی دسترس رکھتی تھیں اور ایک اچھی مقرّرہ تھیں چنانچہ انہوں نے ۱۹۵۳ء کے جلسہ سالانہ پر ''کائناتِ عالم کی پیدائش اور حضرت آدم کی خلافت قرآن کریم کی روشنی میں'' کے موضوع پر؛ ۱۹۵۵ء کے جلسہ سالانہ پر ''اخلاقِ فاضلہ'' کے موضوع پر؛ ۱۹۵۷ء کے جلسہ سالانہ پر ''عورت کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر اور ۱۹۵۸ء کے جلسہ سالانہ پر ''حضرت مسیح موعود کی بعثت کا مقصد'' کے موضوع پر خواتین سے خطاب کیا۔

الفضل ۲۳ دسمبر ۱۹۶۱ء کی ایک خبر کے مطابق ان کا نکاح عبدالرشید ظفر، سوشل میڈیکل آفیسر، راولپنڈی جنرل ہسپتال سے فروری ۱۹۶۱ء میں ہوا جب کہ رخصتی دسمبر میں ہوئی جس کے بعد (النصرت: جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء کے مطابق) وہ ۱۹۶۲ء کے دوران جامعہ نصرت کی ملازمت سے مستعفی ہو گئیں۔

بعد میں امۃ المجید اور ان کا خاندان پاکستان سے انگلستان منتقل ہو کر گلاسگو میں آباد ہو گیا۔ وہ انگلستان کے ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر لندن جاتے ہوئے سڑک کے ایک حادثہ میں وفات پا گئیں۔ تفصیلات کے مطابق کار کی پچھلی نشست پر بیٹھی تھیں کہ اچانک ان کا دروازہ کھل گیا۔ وہ برق رفتاری سے چلتی ہوئی کار میں سے لڑھک کر سڑک پر جا گریں اور پیچھے سے آتی ہوئی کسی اور موٹر وہیکل کے نیچے کچلی گئیں۔

موصوفہ کے بعد محمودہ قریشی جو ''مس محمودہ'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں اور خانیوال والے حضرت حکیم انوار حسین، رفیق حضرت مسیح موعود کی بڑی صاحبزادی تھیں جامعہ نصرت میں اکنامکس کی لیکچرر مقرر ہوئیں۔ وہ اس کالج کی اولڈ سٹوڈنٹ تھیں اور آپی سے ایک یا دو سال سینئر لیکن ان کی اچھی دوستوں میں سے تھیں اور اسی حوالے سے غریب خانے پر بھی آتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد میں اپنے دھندوں میں الجھ کر انہیں بھلا بیٹھا اور مجھے کبھی یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ مس محمودہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ یہ کتاب لکھنے کا خیال آیا تو تجسس ہوا۔ تب آپی نے بتایا کہ وہ تو وفات پا چکی ہیں۔

''وہ کالج میں کب تک پڑھاتی رہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ یاد نہیں لیکن میری معلومات کے مطابق انہوں نے شادی کے بعد جامعہ نصرت چھوڑا تھا'' ادھر سے جواب آیا۔

"ان کی شادی کہاں ہوئی تھی؟"

"چوہدری حمید اللہ، وکیل الاعلیٰ تحریک جدید کے برادرِ نسبتی، عبدالرحیم سے۔"

یہ سِرا ہاتھ آنے پر میں نے چوہدری صاحب موصوف کو فون کیا اور پوچھا: "سر! آپ کی بیگم کے بھائی، عبدالرحیم کہاں ہوتے ہیں؟"

"آپ کے شہر لاہور میں۔ ان کی رہائش علامہ اقبال ٹاؤن میں ہے۔"

موصوف نے ان کا فون نمبر فراہم کیا تو میری عبدالرحیم سے بات ہوگئی جو وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں: "محمودہ بیمار رہتی تھیں لیکن سبب کا تعین نہیں ہو رہا تھا" انہوں نے بتایا "وفات سے قریباً ایک ہفتہ پہلے کینسر تشخیص ہوا لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ تین اکتوبر ۲۰۱۴ء کو ہمیں روتا پیٹتا چھوڑ کر عالمِ جاوداں کو سدھار گئیں۔ موصیہ تھیں چنانچہ ان کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔"

"آپ کو تو علم ہوگا انہوں نے جامعہ نصرت میں کب ملازمت شروع کی تھی اور کب چھوڑی؟"

"ملازمت کب شروع کی؟ اس سوال کا صحیح جواب میرے پاس نہیں ہے۔ ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء کی بات ہوگی۔ ہماری شادی کے بعد کچھ سال تو ان کی ملازمت کا سلسلہ جاری رہا لیکن اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بیٹے سے نواز دیا۔ ملازمت کی وجہ سے محمودہ کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا چنانچہ وہ ۱۹۷۲ء میں مستعفی ہو کر لاہور آ گئیں۔"

"یہاں انہوں نے ملازمت نہیں کی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی اپنے بچوں کے لیے وقف کر رکھی تھی چنانچہ بیٹا ماشاء اللہ ڈاکٹر بن گیا اور آج کل انگلستان میں بطور کنسلٹنٹ کام کر رہا ہے۔ بیٹی، ثمینہ قرۃ العین نے ہیومن ریسورس میں پی ایچ ڈی کر رکھا ہے اور وہ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز میں پڑھا رہی ہے بلکہ اب وہ ایک سال کی ایک اسائنمنٹ پر دبئی جا رہی ہے۔"

برسبیلِ تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ محمودہ قریشی کی ایک شاگرد، امۃ الرشید عابدہ (جو خدا بخش عبدِ زیروی کی صاحبزادی اور مولانا محمد اعظم اکسیر کی اہلیہ ہیں اور جنہوں نے ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کیا) نے ۱۹۶۹ء میں ایک بار تین ماہ کے لیے اور دوسری بار سات آٹھ ماہ کے لیے محمودہ قریشی کی جگہ لیو ویکنسی پر جامعہ نصرت میں پڑھایا۔

اکنامکس کے بعد اب کچھ باتیں جغرافیہ کی تدریس کے بارے میں!

مروّجہ علوم میں جغرافیہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے قبل جامعہ نصرت میں یہ مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اوائل ۱۹۵۷ء میں "مس قاضی" کے تقرر کے ساتھ ہی یہ مضمون بھی یہاں پڑھایا جانے لگا۔

مس قاضی کا نام امۃ الحفیظ تھا اور وہ جماعت کی معروف قاضی فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے دادا،

حضرت قاضی کرم الٰہی حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے اور ان کے والد قاضی عبدالمجید مشہور ماہرِ تعلیم، قاضی محمد اسلم کے چھوٹے بھائی اور پیشہ کے اعتبار سے مائننگ انجینئر تھے۔

موصوفہ کی تعلیم لاہور کے مختلف تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ماسٹرز کیا اور کنیرڈ کالج میں پڑھانے لگیں تاہم انہیں اپنے والدِ گرامی کی اچانک وفات کی وجہ سے ربوہ منتقل ہونا پڑا جہاں ان کے ایک خالو، معروف آرکیٹیکٹ، قاضی محمد رفیق پہلے سے مقیم تھے۔ ربوہ منتقل ہونے کے بعد انہوں نے جامعہ نصرت میں تدریس کے فرائض سنبھال لیے۔

تعلیمی زندگی میں انہوں نے اپنی محنت سے ہمیشہ نمایاں مقام حاصل کیا تھا اور زمانہ تدریس میں بھی ان کی شہرت یہی رہی۔ وہ ستمبر ۱۹۵۶ء سے مارچ ۱۹۵۷ء تک کنیرڈ کالج میں پڑھاتی رہیں۔ اس زمانے میں پی منکت رائے اس کالج کی پرنسپل تھیں۔ جب موصوفہ نے کالج چھوڑا تو پرنسپل نے اپنے سرٹیفیکیٹ میں ان کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ "concientious" اور "pains taking teacher" ہونے کے علاوہ "a very acceptable member of the staff" بھی رہی ہیں۔

وہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۹ء تک جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہیں۔ اس دوران وہ نصرت ہائر سیکنڈری سکول کے قیام پر اس کی پرنسپل مقرر ہوئیں لیکن جب حکومتی پالیسی کے تحت دوبارہ اس ادارے کا ادغام جامعہ نصرت سے ہوگیا تو وہ کالج میں واپس آ گئیں اور وائس پرنسپل مقرر ہوئیں۔

۱۹۶۵ء میں ان کی شادی ملک محمد مستقیم ایڈووکیٹ، ساہیوال کے صاحبزادے ملک فہیم احمد سے ہوئی۔ تقریبِ رخصتانہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث بھی شامل ہوئے۔ انہوں نے اس موقع پر اپنے خطاب میں ان دونوں خاندانوں کی جماعت کے لیے خدمات کا اعتراف بہ ایں الفاظ کیا:

"آج جس بچی کی تقریبِ رخصتانہ ہو رہی ہے وہ قاضی فیملی سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ خاندان حضرت مسیح موعود کے زمانہ میں احمدیت کی بڑی خدمت کر چکا ہے...... انہوں نے بغیر کسی قسم کی جھجک اور ہچکچاہٹ کے اپنی زندگیوں کو دین کی خدمت میں لگا دیا اور اس بات کی پروا نہ کی کہ دنیوی طور پر انہیں کیا ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ انہیں دین میں بھی عزت دی اور دنیوی طور پر بھی اپنی نعمتوں سے نوازا جس میں بعد کے آنے والے نوجوانوں کے لیے سبق ہے کہ جو لوگ یا جو خاندان اپنے آپ کو دین کی خدمت میں لگا دیتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کس طرح نوازتا ہے اور کس حد تک انہیں دینی طور پر ترقی دیتا ہے۔ اس خاندان کے بعض افراد میرے استاد بھی ہیں۔ سکول کے زمانہ میں بھی ایک استاد رہے ہیں اور کالج کے زمانہ میں بھی میرے ایک استاد قاضی فیملی میں سے تھے۔ مجھے اس خاندان کی اس بچی کے رخصتانہ کی تقریب میں شمولیت پر خوشی ہے۔

آج کے دولہا کے چچا مولوی محمد الدین صاحب...... سلسلہ کے (مبشر) اور نذر اور بے خوف (اشاعتِ دین) کرنے والے تھے۔ وہ میرے کلاس فیلو بھی تھے۔ سمندر کی لہروں میں انہوں نے اپنی جان

اللہ تعالیٰ کے سپرد کردی۔ وہ اس وقت مشرقی افریقہ میں (اشاعتِ دین) کی خاطر جانے کے لیے جہاز پر سوار تھے اور جنگ کے ایام تھے۔ جہاز تار پیڈو سے ڈبو دیا گیا اور وہ (غرقِ آب) ہو گئے۔ مولوی صاحب موصوف میں یہ بڑی خوبی تھی کہ خدا کی راہ میں تکلیف کو وہ قطعاً تکلیف نہ سمجھتے تھے۔''

موصوفہ شادی کے کچھ عرصہ بعد تک جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہیں لیکن اپنے شوہر کی خواہش پر ۱۹۶۹ء میں جامعہ نصرت سے مستعفی ہو گئیں۔ انہوں نے ستائیس اپریل ۲۰۰۶ء کو وفات پائی۔ انہیں کینسر ہو گیا تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی تدفین ماڈل ٹاؤن کے احمدیہ قبرستان میں ہوئی۔

ملک فہیم احمد نے ان کی وفات پر الفضل میں ایک مضمون لکھا جس میں مرحومہ کی بعض خوبیوں کا تفصیلی احاطہ کیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے اس مضمون کا یہ حصہ:

''میری جیون ساتھی ایک بہترین بہو، بہترین بیوی، بہترین ماں اور ہر رشتے میں بہترین تھی اور ہمارے لیے خدا کی بہت بڑی نعمتوں سے ایک نعمت تھی۔ دعا گو اور درود شریف کا وِرد کرنے والی تھی۔ مجھے جب بھی کوئی مشکل کام ہوتا صدقہ دیتا، حضور کو خط لکھتا اور مرحومہ کو دعا کے لیے کہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مشکل دُور کر دیتا۔ ہم اکثر ایک دوسرے کو کہ خداوند کریم ہر قسم کی معذوری سے بچائے، انجام بخیر کی دعا کے لیے کہتے۔ وفات سے قبل جب طبیعت زیادہ خرابی کی طرف مائل تھی تو مجھے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں سٹیشن پر بیٹھی ہوں اور حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب تشریف لاتے ہیں، میرے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیٹی کیسے بیٹھی ہو؟ میں نے عرض کیا کہ گھر سے گھوڑی ابھی آئی نہیں، اس کا انتظار ہے۔ انہوں نے کہا: میں بندوبست کرتا ہوں۔

مرحومہ نے سب کی خدمت کی مگر کسی سے کوئی خدمت نہ کروائی۔ انسانوں سے تو ان کا سلوک بہترین تھا ہی مگر گھر کے جانوروں کا بھی خیال رکھتیں۔ مرحومہ کی وفات کے بعد ہمارے گھر کے کتے نے کھانا چھوڑ دیا اور اسی حالت میں باوجود ہمارے اسے پیار وغیرہ کرنے کے ساتویں دن مر گیا۔''

مس قاضی کی جامعہ نصرت میں موجودگی کے دوران ایک اور خاتون بھی یہاں جغرافیہ پڑھانے پر مامور ہوئیں۔ وہ ''مسز شریف'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں اگرچہ ان کا نام نسیم اختر تھا۔ وہ سانگلہ ہل کے چوہدری غلام سرور کی صاحبزادی ہیں اور جامعہ نصرت میں مس قاضی کی شاگرد بھی تھیں۔ انہوں نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا اور اس کے فوراً بعد اپنی مادرِ علمی میں پڑھانے لگیں۔ قریباً تین سال پڑھایا تاہم ان کے اپنے الفاظ میں: جغرافیہ پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے وہاں دو لیکچررز کی ضرورت نہ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ۱۹۶۷ء میں کالج چھوڑنا پڑا۔

انہوں نے مزید بتایا: اس کے بعد میں نے کبھی کسی جگہ نہیں پڑھایا۔ ۱۹۶۲ء میں میری شادی شریف احمد چیمہ سے ہوئی۔ ہم کئی سال پاکستان میں رہے لیکن ۱۹۹۶ء میں کینیڈا منتقل ہو گئے۔ اب ہم ٹورنٹو میں رہتے ہیں اور الحمدللہ میرے بچے اپنی اپنی جگہ شادکام ہیں اور ہمارا وقت اچھا گزر رہا ہے۔

جامعہ نصرت کی سالانہ رپورٹ برائے ۶۳-۱۹۶۲ء مطبوعہ النصرت شمارہ ا جلد ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مس قاضی نصرت گرلز ہائرسیکنڈری سکول کی سربراہی کے لیے منتخب ہوئیں تو ''مسز تاثیر'' جامعہ نصرت میں جغرافیہ پڑھانے لگیں تاہم وہ کون تھیں، ان کا تعلیمی پس منظر کیا تھا اور ان کا تعلق کس جگہ سے تھا، راقم کو اس حوالے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے فلسفہ ان مضامین میں شامل تھا جو جامعہ نصرت میں پڑھائے جا رہے تھے لیکن کالج کی اس زمانے کی طالبات کے علاوہ شاید کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ کالج میں اس مضمون کی پہلی خاتون لیکچرر کون تھیں: آیئے میں بتاتا ہوں۔

نصیرہ شاہنواز جو اُس زمانے میں مس شاہنواز کے نام سے معروف تھیں جامعہ نصرت میں فلسفہ کی پہلی خاتون لیکچرر تھیں۔ وہ ممتاز خادمِ سلسلہ، میجر ڈاکٹر شاہنواز خان (جو نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت سیرالیون جا کر کام کرنے والوں میں سرِفہرست تھے) کی صاحبزادی ہیں۔ انہوں نے میٹرک کراچی کے کسی سکول سے، بی اے (آنرز) لاہور کالج فار ویمن سے اور فلسفہ میں ایم اے گورنمنٹ کالج، لاہور سے کیا تھا۔ وہ ایک محنتی اور لائق طالبہ تھیں چنانچہ انہوں نے ایم اے کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

ایم اے کا رزلٹ آتے ہی انہیں لاہور کالج فار ویمن میں ملازمت کی پیشکش ہوئی جو انہوں نے قبول بھی کر لی لیکن خدمتِ سلسلہ کی سعادت ان کے نصیب میں تھی چنانچہ وہ جامعہ نصرت پہنچ گئیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا، خود ان ہی کی زبانی سنیے: حضرت سیّد محمود اللہ شاہ میرے ابّا کے دوستوں میں سے تھے اور اسی حوالے سے مسز شاہ میرے ابّا سے ذاتی طور پر متعارف تھیں چنانچہ جب میں نے ایم اے کر لیا تو مسز شاہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ذریعے ابا کو کہلوایا کہ وہ مجھے جامعہ نصرت میں بھجوا دیں۔ ابا کے لیے حضور کی اس خواہش سے اختلاف ممکن نہ تھا چنانچہ انہوں نے مجھے لاہور کالج فار ویمن سے فوری طور پر مستعفی ہو کر ربوہ پہنچنے کو کہا۔ میں نے بھی اسے اپنے لیے ایک سعادت جانا اور اسی وقت ربوہ آ گئی۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ جب میرا تقرر ربوہ میں ہوا تو ابا کو یہاں اپنا مکان تعمیر کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا چنانچہ انہوں نے غلہ منڈی جسے اب رحمت بازار کہا جانے لگا ہے کے قریب اپنا مکان تعمیر کر لیا جس سے میری رہائش کا مسئلہ بخوبی حل ہو گیا۔

نصیرہ شاہنواز آج کل امریکی ریاست نیوجرسی میں مقیم ہیں۔ میرا ان سے فون پر رابطہ ہوا اور میں نے ان سے جامعہ نصرت میں ملازمت کے زمانے کا کوئی دلچسپ واقعہ سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا: دلچسپ واقعہ سنانے سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گی کہ جامعہ نصرت کی طالبات بہت محنتی تھیں لیکن ان کی اکثریت اردو میڈیم سکولوں اور خاص طور پر نصرت گرلز ہائی سکول سے آتی تھی لہٰذا اپنی تمام تر خوبیوں کے باوصف وہ انگریزی میں قدرے کمزور ہوتی تھیں اور انگریزی زبان میں دیا گیا لیکچر سمجھنے یا اس کے نوٹس لینے میں دِقّت محسوس کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میرا بہت سا وقت طالبات کو فلسفہ کی بجائے انگریزی پڑھانے میں گزر جاتا تھا۔ الحمدللہ میری اس کوشش کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے اور میرا نتیجہ سو فیصد رہنے لگا چنانچہ نئے بیچز میں

طالبات کی ایک بڑی تعداد نے فلسفہ کا مضمون اختیار کرنا شروع کر دیا۔ مسز شاہ کے نزدیک یہ رجحان قابلِ اصلاح تھا چنانچہ ان کی خواہش پر بعض طالبات کو یہ مضمون چھوڑ کر کوئی اور مضمون رکھنا پڑتا۔

ان کی گفتگو جاری تھی: دوسری بات جس کا میں ذکر ضروری سمجھتی ہوں یہ ہے کہ جامعہ نصرت میں انٹر کالجیٹ ڈیبیٹس کا سلسلہ میری اس کالج میں آمد کے بعد شروع ہوا۔ پہلے وہاں ان مباحثات کا رواج نہ تھا۔ میں چونکہ لاہور میں پڑھتی رہی تھی اور اپنے زمانہ کے طلبہ اور اساتذہ سے بہت اچھی طرح متعارف تھی لہٰذا میری کوشش سے کالج میں پہلی انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ کا انعقاد ہوا اور میری ہی کوشش سے اس میں لاہور کے کالجز کی ٹیمیں شامل ہوئیں۔

اور وہ دلچسپ واقعہ؟ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

ہاں! یاد آ گیا۔ جامعہ نصرت میں اپنی پوری ملازمت کے دوران میں کبھی کسی طالبہ کے گھر نہیں گئی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ اس طرح سکینڈلز بننے لگتے ہیں اور اساتذہ کی غیر جانبداری متاثر ہوتی ہے۔ میری شاگردوں میں حضرت مسیح موعود کے خاندان کی بعض بچیاں بھی تھیں۔ صاحبزادی امۃ القدوس ان میں سے ایک تھیں۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی بیٹی، امۃ الشکور، جو بی بی شکری کہلاتی ہیں بھی میری شاگرد تھیں۔ یہ دونوں بچیاں مجھے وقتاً فوقتاً اپنے گھروں میں آنے کی دعوت دیتی رہتی تھیں جو میں نے کبھی قبول نہیں کی۔ جب صاحبزادی امۃ القدوس جامعہ نصرت سے فارغ ہو گئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب میں کالج میں آپ کی شاگرد نہیں رہی ہوں لہٰذا اگر آپ ہمارے گھر قدم رنجہ فرما سکیں تو یہ آپ کا احسان ہوگا۔ ان کے اصرار پر ایک روز میں ان کے گھر چلی گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ان کی والدہ یعنی حضرت سیّدہ ناصرہ بیگم ایک تخت پر براجمان ہیں اور ان کے دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بچے اپنی آپا کی استاد کو دیکھنے کے آرزومند تھے لہٰذا میری آمد کے بڑی بے تابی سے منتظر تھے۔ ان بچوں سے میری کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی لیکن میں جتنی دیر ان کے ہاں بیٹھی، وہ مسلسل وہاں موجود رہے اور غور سے ہماری باتیں سنتے رہے۔ یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ کئی سال کے بعد میں ۲۰۰۷ء میں ربوہ گئی تو صاحبزادی امۃ القدوس سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا اور اس دعوت میں بی بی شکری کو بھی مدعو کیا۔ وہاں بہت سی باتیں ہوئیں اور بیچ میں پچھلی ملاقات کا بھی ذکر آ گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ مذکورہ بالا دو بچوں میں سے ایک حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد کے بڑے بیٹے، ڈاکٹر مرزا مغفور احمد تھے اور دوسرا بچہ وہ تھا جسے اب ہم حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے طور پر پہچانتے ہیں۔ جب مجھے اس بات کا پتا چلا تو میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگی۔ اب سوچتی ہوں کہ مجھے یہ واقعہ لکھ کر حضور کو بھیجنا چاہیے لیکن ابھی تک اس کا موقع نہیں ملا۔

نصیرہ شاہنواز چار سال تک جامعہ نصرت کے ساتھ منسلک رہیں۔ ۱۹۶۱ء میں اپنی شادی کے بعد وہ مستعفی ہو گئیں۔ وہ کچھ عرصہ کراچی کے ایک انگلش میڈیم سکول کی پرنسپل رہیں لیکن پھر ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سرکاری ملازمت میں آ گئیں۔ اس عرصہ میں وہ بہاولپور اور لاہور کے کالجوں میں لیکچرر رہیں۔

۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوئیں اور اس کے چار سال بعد امریکہ منتقل ہو گئیں۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ امریکہ میں ان کا وقت کیسا گزر رہا ہے انہوں نے کہا: یہاں آ کر میں نے کونسلنگ سائیکالوجی میں ماسٹرز کیا اور پرائیویٹ پریکٹس کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تاہم اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کی وجہ سے مجھے امریکہ میں ملازمت نہیں مل سکی۔ ہاں میں اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں ضرورت مندوں کی رہنمائی میں مصروف رہتی ہوں۔ یہ سارا کام میں اعزازی طور پر کرتی ہوں۔"

نصیرہ شاہنواز کے بعد جامعہ نصرت میں فلسفہ کی دوسری لیکچرر محمد احمد جلیل، مفتی سلسلہ کی سب سے بڑی صاحبزادی، امۃ المجید ہیں۔ انہوں نے بی اے کا امتحان ۱۹۵۹ء میں اسی کالج سے پاس کیا اور ۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلاسفی کا امتحان دینے کے بعد جامعہ نصرت میں لیکچرر کے طور پر کام کرنے لگیں۔ وہ اس کالج کی پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئیں۔

موصوفہ پرویز پروازی کی اہلیہ ہیں اور آج کل اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ ٹورنٹو میں مقیم ہیں۔ ان سے اگر ان کی ملازمت کا کوئی اہم واقعہ بیان کرنے کی فرمائش کی جائے تو وہ کہتی ہیں: یوں تو ہر نیا دن کسی کالج کی پرنسپل کے لیے نئے سے نئے مسائل لے کر آتا ہے جن میں سے کوئی بھی اپنی اہمیت میں دوسروں سے کم نہیں ہوتا تاہم میرے لیے میرے ڈی پی آئی، ڈاکٹر عبدالرؤف کی یہ ہدایت بہت تکلیف دہ تھی کہ میں جامعہ نصرت کی لائبریری میں موجود تمام جماعتی لٹریچر باہر نکال کر سب لوگوں کی نظروں کے سامنے نذرِ آتش کر دوں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اس ہدایت پر عمل نہیں کرتی تو میرے خلاف تادیبی کارروائی شروع ہو جائے گی لیکن اس ہدایت پر عمل کرنا بھی میرے بس میں نہ تھا۔ احمدیت میرے رگ و ریشے میں بسی ہوئی تھی اور میری تربیت مجھے ایسے کسی اقدام کے بارے میں سوچنے کی بھی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ میں نے چند لمحوں کے لیے ڈاکٹر عبدالرؤف کی ہدایات پر غور کیا اور پھر ایک جرأت مندانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ کتابیں لائبریری سے اٹھا دی گئیں مگر وہ نذرِ آتش ہونے سے بھی محفوظ رہیں۔ خدا نے میری لاج رکھی اور افسرانِ بالا کی طرف سے کسی معاندانہ کارروائی سے مجھے محفوظ رکھا۔

نصیرہ شاہنواز اور امۃ المجید کے علاوہ ایک اور خاتون جنہیں عارضی طور پر کالج میں فلسفہ پڑھانے کا موقع ملا فیروزہ ہیں جنہوں نے اس مضمون میں ایم اے کا امتحان ۱۹۶۷ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پاس کیا تھا۔ وہ بتاتی ہیں: ان دنوں کالج میں اس مضمون کی لیکچرر کی ایک لیو ویکنسی موجود تھی۔ مسز شاہ مجھے ذاتی طور پر پہچانتی تھیں اور مجھ سے بڑی محبت فرماتی تھیں چنانچہ ان کی طرف سے ملاقات کے لیے پیغام موصول ہوا۔ میں حاضر ہوئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا میں کچھ مہینوں کے لیے جامعہ نصرت میں کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں فارغ تھی اور مجھے پڑھانے کا شوق بھی تھا لہٰذا میں نے بسر و چشم حامی بھر لی۔ اب یہ تو یاد نہیں ہے کہ میں نے کتنا عرصہ کالج میں پڑھایا مگر یہ مدت چند مہینوں سے زیادہ نہ تھی۔

فلسفہ کے علاوہ پولیٹیکل سائنس ایک اور اہم مضمون ہے جو ہمارے کالجوں میں عام طور پر پڑھایا جاتا ہے اور جسے مختلف وجوہ کی بنا پر بہت سے طلبہ پڑھنا پسند بھی کرتے ہیں تاہم جامعہ نصرت کے ابتدائی گیارہ سالوں

کے دوران یہ مضمون یہاں رائج نہیں تھا۔ مس ساجدہ جعفر اس مضمون کی پہلی لیکچرر تھیں۔ وہ غیر احمدی تھیں۔ ان کا تعلق سرگودھا سے تھا اور وہ بنیادی طور پر 9 بلاک کی رہنے والی تھیں۔

صادقہ شمس کی روایت کے مطابق: ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ جب بی اے میں داخلے کا مرحلہ آیا تو میں پولیٹیکل سائنس پڑھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت تک جامعہ نصرت میں یہ مضمون پڑھایا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے مسز شاہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے فوری طور پر اخبار کے ذریعے پولیٹیکل سائنس کی لیکچرر کے لیے درخواستیں طلب کرلیں۔ چند ہی روز میں سیلیکشن کے مراحل طے ہوگئے اور مس ساجدہ جعفر یہاں آ گئیں۔ میں نے ان سے دو سال پڑھا ہے۔ جب میں ایم اے کرنے کے لیے لاہور گئی تو وہ یہیں پڑھاتی تھیں تاہم ۱۹۶۶ء میں میری واپسی سے قبل وہ یہ ملازمت چھوڑ چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا ریزلٹ نکلنے سے پہلے ہی جامعہ نصرت میں میرا بطور لیکچرر پولیٹیکل سائنس تقرر ہوگیا تھا۔ اس اعتبار سے مس ساجدہ جعفر کم و بیش چار سال جامعہ نصرت میں رہیں اور پھر بہ روایت وحیدہ سلطانہ اسلامیہ کالج، فیصل آباد چلی گئیں اور وہاں سے سرگودھا تبدیل ہوگئیں۔ یکم اپریل ۲۰۰۹ء کو اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، سرگودھا کی پرنسپل تھیں۔

وحیدہ سلطانہ بتاتی ہیں: مس ساجدہ جعفر جو بعد میں مسز افضل کے نام سے معروف ہوئیں مجھ سے سکول میں دو سال سینئر تھیں چنانچہ جب میرا تقرر جامعہ نصرت میں ہوا تو وہ مجھ سے پہلے یہاں موجود تھیں۔ میری ان سے جان پہچان تو سرگودھا کے زمانے سے تھی لیکن بے تکلفی ربوہ میں اکٹھے رہنے کی وجہ سے ہوئی جو ساری زندگی قائم رہی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے وہ 9 بلاک سے سیٹلائٹ ٹاؤن، ہمارے گھر کے قریب منتقل ہوئی تھیں۔ یہ گھر انہوں نے بنا بنایا خریدا تھا تاہم انہیں زیادہ عرصہ یہاں رہنا نصیب نہ ہوسکا اور جلد ہی وہ ایک مختصر سی بیماری کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کی تاریخ وفات ۲۲ مئی ۲۰۱۵ء ہے۔ یہ درست ہے کہ مرحومہ احمدی نہ تھیں لیکن احمدیوں کے متعلق حسنِ ظن رکھتی تھیں اور ان کی گہری سہیلیوں میں سے کچھ احمدی بھی تھیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مس ساجدہ جعفر کے بعد صادقہ شمس طویل عرصہ تک جامعہ نصرت میں سیاسیات پڑھاتی رہیں تاہم اسی دوران لمۃ الوہاب (جو لمۃ الکریم وزیر، لیکچرر اردو، جامعہ نصرت کی بہن ہیں اور آج کل انگلستان میں مقیم ہیں) نے بھی مختصر مدت کے لیے یہاں پڑھایا۔ وہ کب سے کب تک جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہیں، اب انہیں خود بھی یاد نہیں۔

جامعہ نصرت کی ابتدائی خواتین لیکچررز کے بارے میں میری یہ تحریر نامکمل رہے گی اگر تاریخ جیسے اہم مضمون کا ذکر حذف کر دیا جائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے جامعہ نصرت کے افتتاح کے موقع پر اس مضمون کی اہمیت خاص طور پر اجاگر کی تھی تاہم پہلے چند سال تک ہسٹری کی کوئی خاتون لیکچرر میسر ہی نہ آ سکی چنانچہ بی ٹی صاحب یہ مضمون پڑھاتے رہے۔ ہاں! ۱۹۵۵ء میں مس نعیمہ جو ڈاکٹر حشمت اللہ کی صاحبزادی تھیں تاریخ میں ایم اے کرنے کے بعد جامعہ نصرت میں آ گئیں۔ آپ ان کی چہیتی شاگردوں میں سے تھیں اور مجھے اچھی

طرح یاد ہے ان کی ہر بات میں کسی نہ کسی طرح مس نعیمہ کا ذکر ضرور آ جاتا تھا۔

''ایازِ محمود'' نامی کتاب جو بنیادی طور پر حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ کی سوانح عمری ہے میں مس نعیمہ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کے مطابق وہ قادیان میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے اپنی تعلیم لاہور میں مکمل کی۔ جب انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو ان کے والدِ گرامی نے ایک نظم کہی جو یوں تھی:

دل مرا پھر آج کیوں مسرور ہے
رنج و غم اس سے ہوا پھر دُور ہے
ہے خبر آئی کہ بیٹی نیک خُو
ہوگئی ہے پاس اور مسرُور ہے
تھی بہت وہ غمزدہ اور دل حزیں
رحم ربّی سے ہوئی مغفور ہے
مانگتی تھی فضلِ رحمٰن رات دن
سعی پیہم ہوگئی مشکور ہے
شکرِ ربّی میں لگے ہیں جان و دل
ذرّہ ذرہ ہو رہا بھرپور ہے
ہو نعیمہ عِلم میں برکت مدام
دیکھ لوں دل کو ترے پُرنور ہے
فضل کرنا، رحم کرنا رات دن
ربِ محسن کا مرے دستور ہے

وہ جامعہ نصرت میں ساڑھے چھ سال تک پڑھاتی رہیں۔

ان کی شادی سیّد محمد اکرم، انفارمیشن آفیسر کے ساتھ ہوئی جس کے بعد وہ جامعہ نصرت سے مستعفی ہوگئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے بیٹے اکبر شاہ (جو امراضِ قلب میں تخصّص حاصل کرنے کے بعد امریکی ریاست اوہیو میں بطور کارڈیالوجسٹ کام کر رہے ہیں) کے پاس گزارے۔

جامعہ نصرت کی ایک اولڈ سٹوڈنٹ، سیّدۃ الزہرا جو سیّد سردار حسین شاہ، افسرِ تعمیرات، صدر انجمن احمدیہ کی صاحبزادی اور چوہدری رشید حسین، سینئر سائنس ٹیچر، سنٹرل ماڈل سکول، لاہور کی اہلیہ ہیں اور آج کل سمن آباد، لاہور میں مقیم ہیں کی روایت کے مطابق مس نعیمہ کی شادی کے بعد ''مس حمید'' اس مضمون کی تدریس پر مامور ہوئیں۔ موصوفہ غیر احمدی تھیں اور انہوں نے سیّدۃ الزہرا کی کلاس کو تھرڈ اور فورتھ ایئر میں پڑھایا۔ اگرچہ موصوفہ مس حمید کے جامعہ نصرت میں قیام کا عرصہ تو معین نہیں کرسکتیں البتہ وہ یہ بات وثوق سے کہتی ہیں کہ اُن کے چلے جانے کے بعد طاہرہ کلثوم بطور لیکچرر آئی تھیں۔

طاہرہ کلثوم حافظ عبدالرحمٰن کی صاحبزادی، نصرت گرلز ہائی سکول کی استانی ناصرہ کی چھوٹی بہن اور عرصۂ دراز سے پورٹ لینڈ، امریکہ میں مقیم میرے ایک سکول و کالج فیلو بشارت الرحمٰن ظفر کی ہمشیرہ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں جامعہ نصرت سے بی اے کا امتحان اور اس کے دو سال بعد پنجاب یونیورسٹی سے ہسٹری میں ایم اے کیا۔ انہیں یہ امتحان پاس کرتے ہی اپنی مادرِ علمی میں لیکچرر شپ مل گئی۔ وہ سات سال یہاں پڑھاتی رہیں اور شادی کے بعد لاہور منتقل ہو گئیں۔ وہ لمبا عرصہ اپوا کالج برائے خواتین میں یہی مضمون پڑھانے کے بعد اب ریٹائر ہو چکی ہیں اور لاہور ہی میں مقیم ہیں۔

۱۹۶۸ء میں طاہرہ کلثوم کی طویل رخصت کے دوران سیّدۃ الزہرا لیو ویکنسی پر جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہی ہیں۔

آخر میں کچھ ذکر فزیکل ایجوکیشن کا!

''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جامعہ نصرت کے پہلے کچھ سالوں کے دوران یہاں پر فزیکل ایجوکیشن کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا تاہم ۱۹۵۹ء میں رشیدہ چوہدری اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئیں۔ وہ بہت مختصر مدت یہ خدمت انجام دے سکیں چنانچہ ۱۹۶۰ء میں ان کی جگہ حمیدہ بانو خلجی بطور ڈی پی ای آ گئیں۔ حمیدہ خلجی کو جامعہ نصرت کی پہلی کلاس کی طالبہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے گریجوایشن کرنے کے بعد لاہور سے ڈپلومہ اِن فزیکل ایجوکیشن حاصل کیا اور جامعہ نصرت ہی میں ملازمت اختیار کر لی۔

ان کی ایک شاگرد، حمیدہ بشارت اہلیہ بشارت احمد صابر، مقیم محلّہ دارالنصر غربی، ربوہ حمیدہ خلجی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ وہ بتاتی ہیں: میں جامعہ نصرت فار ویمن میں ۱۹۶۶ء میں داخل ہوئی تھی۔ میں فیصل آباد سے آئی تھی اور ربوہ میں میرا کوئی شناسا نہ تھا لہٰذا اداس سی تھی۔ آدھی چھٹی کے وقت دوسری لڑکیوں کے ساتھ گراؤنڈ میں چلی گئی۔ ہم سے سینئرز نیٹ بال کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ میں نے اس سے قبل نیٹ بال کھیلنا تو در کنار، بال کو چُھوا تک نہ تھا۔ گیم ختم ہوئی تو بال گراؤنڈ میں پڑا دیکھ کر میرا دل مچل اٹھا چنانچہ میں نے بال اٹھایا اور اسے باسکٹ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ خلافِ توقع بال باسکٹ میں ڈل گیا۔ میں کچھ دیر اسی طرح نشانہ باندھ کر بال شُوٹ کرتی رہی اور مجھے اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ اس سے مجھے ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا اور میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

اگلے دن ہماری کلاس ہو رہی تھی کہ دو تین سینئرز کے ساتھ ایک نہایت ہی باوقار خاتون ساڑھی زیبِ تن کئے کلاس میں داخل ہوئیں۔ وہ نئے کھلاڑیوں کی تلاش میں آئی تھیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان سینئرز نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ساڑھی والی خاتون کو بتایا کہ اس کی شوٹنگ بھی اچھی ہے۔ میرے لاکھ انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے ساتھ گراؤنڈ میں لے گئیں اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں: کھلاڑی اکثر مانتے ہی نہیں کہ وہ کھلاڑی ہیں۔ اس کے بعد مجھے بہت سا وقت گراؤنڈ میں گزارنے کا موقع ملا۔ اس گراؤنڈ نے زندگی میں مجھے بہت کچھ سکھایا۔ یہ سب کچھ ہماری ڈی پی ای، مس حمیدہ بانو خلجی کی وجہ سے ہی ممکن ہوا۔

آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا سلوک فرمائے۔ میرے اندر کے کھلاڑی کو کھوجنا اور میری کھیل کو جلا بخشنا ان ہی کا کام تھا۔ وہ ایک نہایت ہی اچھی منتظمہ تھیں اور اپنی کھلاڑیوں کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت سے پیش آنا ان کا شعار تھا۔ کھیل کو جوش اور ہوش سے کھیلنا اور صبر آزما جدوجہد یعنی مسلسل پریکٹس میں نے ان سے ہی سیکھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے دھوپ میں کھڑے رہ کر شُوٹنگ پریکٹس کرواتیں۔ اپنی ٹیم کی صحت اور خوراک کا بھی خاص خیال رکھتیں۔ ان کے ساتھ بہت دفعہ ربوہ سے باہر میچز کھیلنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ وہ سفر کے دوران کھلاڑیوں کا اتنا خیال رکھتیں کہ ہمارا گھر واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

مرحومہ کی ایک بھانجی، امۃ الکریم (جو حمیدہ خلجی کی بہن، غلام حاجرہ کی بیٹی اور محلّہ دارالنصر غربی کے ایک مکین، خلیل احمد فرحان کی اہلیہ ہیں) بتاتی ہیں کہ مرحومہ نہایت صالح، پرہیزگار، صوم وصلوٰۃ کی پابند، دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی تھیں۔ وہ انتہائی ملنسار اور سب کی غمگسار تھیں۔ ان کا پسندیدہ لباس ساڑھی تھا۔ سروس کے دوران ہی بیمار ہوئیں۔ انہیں کینسر تھا لیکن شروع میں بیماری کی تشخیص نہ ہو پائی۔ وہ ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹرز ہسپتال، فیصل آباد میں ڈاکٹر ولی محمد ساغر کے پاس اور بعد میں مشن ہسپتال، فیصل آباد میں زیرِ علاج رہیں اور بالآخر انگلستان چلی گئیں۔ وہاں وہ تین سال تک علاج کراتی رہیں۔ بیچ میں کچھ عرصہ طبیعت میں بہتری آئی لیکن جانبر نہ ہو سکیں۔ ان کا انتقال ۱۱ جنوری ۱۹۷۶ء کو ہوا اور تدفین قطعہ شہدا میں عمل میں آئی۔

ان کی قبر پر لگے ہوئے کتبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فی الاصل اس پر مرحومہ کے تفصیلی حالات درج تھے مگر یہ تحریر آہستہ آہستہ مدھم پڑ گئی۔ اس کتبے کو ٹھیک کرانے کی کوشش کی گئی تو رہی سہی کسر بھی نکل گئی چنانچہ اب کتبے پر ان کے نام کے علاوہ کچھ بھی پڑھا نہیں جاتا۔

حمیدہ خلجی کی وفات پر جامعہ نصرت کی اساتذہ اور طالبات کے ایک غیر معمولی اجلاس میں اتفاق رائے سے پاس کئے گئے ریزولیوشن (مطبوعہ الفضل ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء) سے عیاں ہے کہ ''مرحومہ اسمِ بامسمیٰ تھیں یعنی اوصافِ حمیدہ ہی کی مالک! ان کا تعلق جامعہ نصرت سے نہایت گہرا، پُرخلوص اور طویل تھا۔ اپنی تعلیم کا چار سالہ دور اور ملازمت کا قریباً سولہ سالہ زمانہ مرحومہ نے نہایت مثالی رنگ میں گزارا۔ محنت، سچائی، دیانت، ہمدردی اور خلوص مرحومہ کا شیوہ رہا۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ، تہجد گزار اور غریبوں کی سچی ہمدرد تھیں۔ اپنے رفقائے کار سے گہری ہمدردی اور سچی محبت تھی اور اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری زندگی کا مقصدِ اولین تھا۔''

امۃ الحفیظ مرزا جن کی شاعری کا کچھ ذکر اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہوں پر موجود ہے نے اپنے غیر مطبوعہ دیوان میں بعض جگہ وضاحت دے رکھی ہے کہ فلاں فلاں نظم فلاں شخص کی فرمائش پر کہی گئی۔ اس حوالے سے تین نام قابلِ ذکر ہیں: ''مس مختار''، ''مس خورشید زہرہ'' اور ''مس امۃ النصیر''۔ امۃ الحفیظ مرزا نے یہ نظمیں ان تینوں خواتین کی فرمائش پر علی الترتیب ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۶ء میں کہی تھیں۔ انہوں نے مس صفیہ چوہدری کی فرمائش پر بھی کچھ نظمیں کہی ہیں لہٰذا مختار، خورشید زہرہ یا امۃ النصیر کے ناموں کے ساتھ لفظ ''مس'' سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خواتین بھی جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہی ہیں۔

النصرت شمارہ ا جلدا کے انگریزی حصہ میں چھپے ہوئے مضمون ''اِن دی جامعہ'' کے مطابق ''مِس کشور قریشی'' بھی جامعہ نصرت میں پڑھاتی رہی ہیں اور وہ ۱۹۶۲ء میں یہاں سے رخصت ہوئیں۔ جامعہ نصرت کی سالانہ رپورٹ برائے ۶۳۔۱۹۶۲ء مطبوعہ النصرت (شمارہ ا جلد۲) کے مطابق مس اے راشد لطیف بھی اس کالج میں لیکچرر رہی ہیں تاہم ان دونوں کے مضامین کا ذکر موجود نہیں۔

اسی مجلّہ کے شمارہ ا جلد۲ کے اردو حصہ میں ''مس فرحت صبوحی ایم اے'' کے کچھ اشعار بعنوان ''غم کے گیت'' اور ''مس زبیدہ صدیقی ایم اے'' کی ایک فارسی غزل بھی شامل اشاعت ہے۔ ان خواتین کی کوالیفیکیشنز اور ان کے ناموں کے ساتھ لفظ ''مِس'' کا استعمال یہ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ یہ دونوں خواتین بھی جامعہ نصرت کے سٹاف میں شامل رہی ہیں۔

مبارکہ انجم نے اپنی یادداشتوں میں ایک غیراز جماعت لیکچرر ''مس جسارت'' کا ذکر کیا ہے۔ انہیں اب کچھ یاد نہیں کہ وہ کس مضمون کی استاد تھیں اور ان کا تفصیلی تعارف کیا تھا۔

یہ معاملہ تحقیق طلب ہے کہ ''مس مختار'' ''مس خورشید زہرہ'' ''مس امۃ النصیر'' ''مس کشور قریشی'' ''مس اے راشد لطیف'' ''مس فرحت صبوحی'' ''مس زبیدہ صدیقی'' اور ''مس جسارت'' کون تھیں اور وہ یہاں کب اور کیا پڑھاتی رہی ہیں۔

جامعہ نصرت کی خواتین لیکچررز کے بارے میں آپ کو فی الحال اسی مختصر مضمون پر قناعت کرنا ہو گی لیکن اس جماعتی ادارے کا ذکرِ خیر ختم کرنے سے پہلے میں اس کے علمی مجلّہ ''النصرت'' کے بارے میں کچھ باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ وقت ہو گا آپ کے پاس میری یہ باتیں سماعت کرنے کا؟

اے ہمارے جامعہ! ماضی کی یادوں کے وطن: یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کُہن؟

جامعہ نصرت کے علمی مجلّہ کا اجرا سنِ عیسوی ۱۹۶۳ میں ہوا۔ اس کا نام کالج کے اپنے نام پر ''النصرت'' تجویز ہوا اور اس کا پہلا شمارہ جو جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء کے لیے تھا اردو کے اسّی اور انگریزی کے چھپّن صفحات پر مشتمل تھا۔ حضرت مرزا بشیر احمد، حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پیغامات کے علاوہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور کا پیغام بھی اس رسالے کی زینت بنا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں لکھا تھا: ''کالجوں اور سکولوں سے اس قسم کے رسالوں کی اشاعت ان دنوں ایک رسم بن گئی ہے مگر فی الحقیقت ایسے اقدامات محض رسم سے زیادہ اہمیت کے مستحق ہیں۔ اچھے رسائل کی کمیابی نے ہمارے ہاں سستے مذاق اور کم تر درجے کے ادب کو جو فروغ دیا ہے اس کے سدِّ باب کے لیے ضروری ہے کہ اس ذریعے سے فائدہ اٹھا کر نوخیز نسلوں کو معیاری تحریروں کے صحیح مزاج سے روشناس کیا جائے تا کہ ان کی صلاحیتیں اور ذہنی قوتیں منفی رجحانات اختیار کرنے کی بجائے ان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں صرف ہو سکیں۔'' اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ''آپ کا میگزین آپ کے کالج کی دوسری شاندار روایات میں ایک اور قابلِ تعریف روایت کے اضافے کا سبب بنے گا اور کالج کی تعلیمی، ادبی اور تفریحی سرگرمیوں کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ وہ اجتماعی فضا بھی پیدا کرے گا جو اِن سرگرمیوں کو پاکیزہ زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھ سکے اور آپ کی طالبات کو علمی اور عملی دنیا کی صحت منداور غیر صحت مند حدوں کے شعور سے بہرہ وَر کر سکے۔''

چوہدری ظفراللہ خان جو اُن دنوں یونائیٹڈ نیشنز کی جنرل اسمبلی کے صدر تھے نے اس موقع پر اپنے انگریزی پیغام میں کہا کہ وہ النصرت کے پہلے شمارہ کی اشاعت کے موقع پر جامعہ نصرت کی اساتذہ اور طالبات کو اپنا سلام بھجواتے ہوئے علمی میدان میں ان کی شاندار کامیابیوں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ جامعہ نصرت کی اساتذہ اور طالبات زندگی کے تمام شعبوں میں اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھیں گی جو انہوں نے خود اپنے لیے مقرر کر رکھا ہے اور جو ہمارے ملک کی عزت میں اضافے کا باعث ہے۔

اس رسالے کے اردو حصہ کی اوّلین ''سٹاف ایڈیٹر'' امۃ الباری تھیں اور ''نائب مدیرہ'' امۃ الحئی کوثر جب کہ اس کے انگریزی حصہ کی ''ایڈیٹر اِن چیف'' سعیدہ حبیب اللہ تھیں اور ''سٹوڈنٹ ایڈیٹر'' صادقہ رمضان۔

میں ربوہ میں اپنے قیام کے دوران النصرت باقاعدگی سے دیکھا کرتا تھا۔ اس رسالے میں جہاں بہت سے علمی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے وہیں یہ جریدہ کالج میں جاری غیر نصابی، ادبی اور تفریحی سرگرمیوں کی بھی خوب خوب عکاسی کرتا تھا۔ نظمیں، غزلیں اور رپورتاژ طالبات کے بے مثال علمی ذوق اور حساسیت کی نشاندہی کرتے تھے۔

فیروزہ کی والدہ اُن کے بچپن میں اُس وقت وفات پا گئی تھیں جب موصوفہ بمشکل نو سال کی تھیں۔ وہ اور ان کے بہن بھائیوں نے اپنا سارا وقت والدہ کی محبت سے محرومی میں گزارا۔ دیکھئے تو سہی انہوں نے "The Memorium" کے عنوان سے اپنی والدہ کی یاد میں کیسی خوبصورت نظم کہی ہے:

It was a moon-lit night,
Queen Mab shone clear and bright,
The star looked dim at height.
The landscape lit with silver rays,
T' was a charming, glorious sight.
All was solemn, calm and clear.
In this calmness I thought,
Of my dear mother who was lost,
In the bottomless death,
Far off from this world of sorrow,
Into the region Divine.
Of that dearest Being I thought,
And felt a pain in my heart.
I sobbed and wept,
For one who in heaven slept,
Unconcious of her loving child.
The moon above tired and low,
While I knelt in prayers for blessing to flow.

النصرت کے پہلے ہی شمارے میں جامعہ نصرت کی ایک اولڈ سٹوڈنٹ، امۃ القدیر ارشاد، ہیڈ مسٹریس، فضل عمر جونیئر ماڈل سکول کی ایک نظم شامل ہے جس کا عنوان ہے ''ڈی''۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ نصرت میں انگریزی زبان کے حرف ڈی کی شکل کا ایک باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ اس باغیچے کا حسن برقرار رکھنے کے لیے طالبات کو اس میں داخلے کی سخت ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر پانچ روپیہ جرمانے کی سزا مقرر تھی۔ ایک دفعہ ایک گدھا اس باغیچے میں گھس گیا۔ امۃ القدیر اور ان کی ہم جماعتوں نے اس گدھے کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ امۃ القدیر کو تادمِ اشاعتِ جریدۂ ہٰذا یہ بات یاد تھی اور انہوں نے اس واقعے کی اس طرح منظوم عکاسی کی:

ایک دن مرغِ تخیّل نے ذرا پرواز کی
آ گئی نظروں میں میرے جامعہ نصرت کی ڈی
ایک خر دنیا و مافیہا سے یکسر بے خبر
ناز سے اٹھکھیلیاں کرتا مجھے آیا نظر
بے خبر اس بات سے کہ ڈی میں آنا جرم ہے
شجرِ ممنوعہ ہے، اس کے پاس جانا جرم ہے
یہ وہ جنّت ہے کہ اس کو کوئی پا سکتا نہیں
کیسا آدم، کیسی حوّا، کوئی جا سکتا نہیں
آ گیا کالج میں لیکن شوق فرماتا ہوا
منہ اٹھائے، دُم جھکائے، خوب شرماتا ہوا
ڈھینچوں ڈھینچوں کا ترانہ زیرِ لب گاتا ہوا
لڑکیوں سے گاہ بچتا، گاہ ٹکراتا ہوا
ناگہاں اک شور سا اٹھا، نگاہیں جھک گئیں
اٹھتے قہقہے تھم گئے اور چلتی نبضیں رک گئیں
بھاگ جا! اب بھاگ جا! وہ آ گئے، لو آ گئے
ان کی ہیبت سے در و دیوار سب تھرّا گئے
تیری یہ جرأت کہ تو کالج میں آوارہ پھرے
ڈی میں آ کر اس طرح کلیوں کا نظارہ کرے
پانچ کا اک نوٹ تجھ کو ساتھ لانا چاہیے
ڈی میں آنا ہو تو جرمانہ بھی لانا چاہیے

کالج کے صحن میں ایک بارہ دری ہوا کرتی تھی۔ ''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق یہ بارہ دری ۱۹۶۱ء میں طالبات کے چندے سے تعمیر کی گئی تھی۔ گمانِ غالب ہے کہ اس بارہ دری کی تعمیر کا ایک مقصد کالج کے حُسن میں اضافہ تھا لیکن عملاً یہ عمارت طالبات کے فرصت کے لمحات کو رنگین تر بنانے میں بھی ممد ثابت ہوتی رہی۔
دیکھئے بنتِ جُنید نے ''بارہ دری'' کے موضوع پر النصرت میں چھپے ہوئے اپنے اس مضمون میں اس بارہ دری کا کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے:

''ایک اہم چیز جس کے بغیر جامعہ نصرت کا تصوّر بھی ناممکن ہے اس کے وسط میں بنی ہوئی بارہ دری ہے۔ بارہ دری کا نام سن کر آپ کے ذہن میں مغلوں کے دور کی لبِ دریا بنی ہوئی کسی حسین سی بارہ دری کا تصوّر آ گیا ہوگا۔ خیر ہمیں اپنی گول مٹول سی بارہ دری اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ شاہجہان کو راوی کے کنارے بنی ہوئی بارہ دری۔

یہ کالج کے عین وسط میں چُپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہتی ہے جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ پہلے یہ ہمیشہ خاکستری لباس میں ملبوس رہتی تھی لیکن گزشتہ موسمِ بہار میں بادِ بہاری نے اسے نہ جانے کس کی آمد کا پیغام سنایا کہ خاکستری لباس اتار کر بہاروں کا سبز لباس زیبِ تن کر لیا لیکن جب آنے والا نہ آیا تو اس نے خزاں کا زرد لباس پہن لیا مگر سبز آنچل اب بھی اس کے شانوں پر پڑا رہتا ہے۔ خزاں اور بہار کا یہ امتزاج بہت دلکش ہے۔ کہتے ہیں خزاں اور بہار کا جوڑ ممکن نہیں مگر بارہ دری اس بات کی مصدّق ہے کہ بہار اور خزاں کا ملاپ ہو سکتا ہے۔ اس کے دامن میں بہار کی رعنائیاں بھی ہیں اور خزاں کی اُداسیاں بھی لیکن یہ خزاں کی اُداسیوں کو صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھتی ہے اور ایک اجنبی صرف بہار کی رنگینی ہی دیکھ سکتا ہے۔ یہ ہر ایک کا دکھ درد سمیٹ لیتی ہے لیکن اپنا درد کسی پر ظاہر نہیں کرتی۔ اس کے ستون کسی دکھی دل کو نہ جانے کیا کہتے ہیں کہ انسان اپنی بپتا اسے سنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ ہر ایک کے رازدار ہیں اور ہر ایک کی تنہائی کے ساتھی۔

بارہ دری کالج کی رنگارنگ سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہ لاوارث طالب علموں کے لیے کلاس روم کا کام بھی دیتی ہے لیکن عموماً تفریح کے سامان مہیا کرتی ہے۔ کالج کھلتے ہی الیکشنز کا موسم آ جاتا ہے۔ ہر امیدوار یہاں بیٹھ کر اپنی کامیابی کے متعلق سوچ کر آئندہ منصوبے بناتا ہے۔ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے امیدوار کے ووٹوں کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ بارہ دری ہر ایک کی رازدارانہ گفتگو سنتی مگر خاموش رہتی ہے۔

الیکشنز کے بعد ووٹوں کی قیمت ادا کرنے کے لیے بھی اسی جگہ کو منتخب کیا جاتا ہے اور بارہ دری میں قہقہے بلند ہونے لگتے ہیں۔

اس کے ایک طرف کھیل کا میدان ہے۔ بارہ دری کھلاڑیوں کی سرگرمیوں کو مستحسن نظروں سے دیکھتی ہے۔ جب ان کا دل ذرا ستانے کو چاہتا ہے تو وہ اپنا دامن اور بھی کشادہ کرتی ہے اور ان کو خوش آمدید کہتی ہے۔ کھلاڑی یہاں بیٹھ کر ایک کیف، ایک سکون محسوس کرتے ہیں۔ جب بوندا باندی ہونے کی وجہ سے کھیلنا ناممکن ہو جاتا ہے تو اِن ڈور گیمز کے لیے بھی بارہ دری کو ہی منتخب کیا جاتا ہے۔

جب آپ کالج کے تعلیمی ماحول سے اُکتا کر سٹڈی رومز کی طرف سے منہ موڑ کر بارہ دری کی سیڑھیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوں تو آپ کی نظر نو تعمیر شدہ کیفے ٹیریا پر پڑے گی جس کے سامنے کے لان میں مخملیں گھاس پر پانی کے ننھے منے سے شریر قطرے فوّارے سے نکل کر سورج کی کرنوں کو پکڑنے کی کوشش میں فوّارے کی مرمریں دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے لیکن یہ فوّارہ ابھی آپ کے تصور ہی میں ہوگا کیوں کہ اس کے وجود میں آنے کے لیے وقت درکار ہے۔

موسمِ گرما میں جب کسی ٹھنڈے مشروب کی طلب آپ کو کیفے ٹیریا میں جانے پر مجبور کرے گی تو بارہ دری راستے میں چوکی کا کام دے گی اور آپ کچھ دیر اس کے دامن تلے ستانے میں راحت محسوس کریں گے......

کالج کی خاص تقریبات کے موقع پر بارہ دری کا حسن نکھر آتا ہے۔ اگر ایسے موقع پر آسمان ابر آلود ہو تو بے حد لطف آتا ہے۔ سرمئی سی فضائیں ماحول کو بے حد حسین بنا دیتی ہیں۔ ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے مولسری

کے درختوں سے گرتے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی مہک شاعرانہ مزاج والوں کو پاگل بنا دیتی ہے۔ بارہ دری کے اردگرد اُگے ہوئے مور پنکھ کے پودے جھومنے لگتے ہیں...... یہ کیف آفریں سماں دیکھ کر دل کہتا ہے:

اے رندِ بلانوش ترا جام کہاں ہے؟

جب آخری تاریخوں کا ساحر چاند آکاش کی جھیل میں ہولے ہولے تیرنے لگتا ہے اور ہوا کے گداز جھونکے رات کی رانی کی مہک چُرا کر فضا میں بکھیر دیتے ہیں تو آسمان سے ننھی ننھی پریاں اتر کر کلیوں کو گدگدانے لگتی ہیں اور یہ معصوم سی کلیاں ہنسنے کی کوشش میں کِھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ اس وقت بارہ دری ایک دم اداس ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو اس وقت اس کے قریب جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اس کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں گی لیکن آپ اس کے رونے کی وجہ پوچھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ یہ آپ کو اپنا رازداں بالکل نہیں بنائے گی۔ بارہ دری کی یہ سسکیاں سن کر ننھے منے پھول بھی جو دن بھر شرارتوں اور ہنسی مذاق میں مشغول رہتے ہیں خاموش ہو جاتے ہیں اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ ندیا ساگر میں ڈوب جاتے ہیں۔

چھٹیوں میں جب بارہ دری کے باسی دُور دیسوں میں چلے جاتے ہیں تو بارہ دری بے حد اداس ہو جاتی ہے کیوں کہ اسے اپنے باسیوں سے بہت پیار ہے۔ جب وہ الوداعی ملاقات کے لیے اس کے پاس آتے ہیں تو یہ ان سے کہتی ہے: ''جاؤ میرے دوستو اور آتے ہوئے میرے لیے بہت سی خوشیاں اور مسکراہٹیں لانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی یہاں تک کہ میں گر کر دم توڑ دوں۔ جاؤ میرے ساتھیو۔ خدا حافظ'' اور وہ اس سے جدا ہو جاتے ہیں، ان میں سے بعض کبھی نہ لوٹنے کے لیے مگر ان کی یاد بارہ دری کے دل سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ اس وقت جب اسے مانوس سے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی، جب کوئی نازک سے قدم بجری کو روندتے ہوئے اس تک نہیں پہنچتے تو بارہ دری کا احساسِ تنہائی شدید ہو جاتا ہے۔ شام ڈھلے جب ہوسٹل کی عمارت سبز روشنیوں سے خواب آور سماں پیدا کرنے کی بجائے اندھیاروں میں ڈوب جاتی ہے تو بارہ دری کو پردیس جانے والوں کی یاد شدّت سے ستاتی ہے۔

بارہ دری نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں مگر یہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے...... خاموش تماشائی بن کر جس کے سینے میں نہ جانے کتنے درد، کتنی مسرتیں اور کتنی یادیں ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ اسے اپنا ہمدرد اور رازداں سمجھتے ہیں۔ کتنی اچھی ہے ہماری بارہ دری۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ اپنا رازداں کسی کو نہیں بناتی لیکن نہ جانے کتنے لوگوں کا درد سمیٹے بے حد وقار سے کھڑی رہتی ہے۔''

کامن روم کسی بھی تعلیمی ادارے میں طلبہ کی غیر نصابی سرگرمیوں کا محور ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک کامن روم جامعہ نصرت میں تھا۔ کالج کے صحن میں امرود کا ایک درخت بھی ہوا کرتا تھا۔ ان دونوں چیزوں کا قدرے اختصار کے ساتھ ذکر ایک طالبہ کے اس مضمون میں ہے جو ''کچھ یادیں، کچھ نقوش'' کے عنوان سے النصرت کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ دیکھئے تو انہوں نے کس سلیقے سے ان دونوں چیزوں کا ذکر اس ایک مضمون میں سمو دیا ہے:

''......میں نے اپنی زندگی کا ایک بہترین سال اس کالج کی رنگین اور قہقہوں سے بھرپُور فضاؤں میں گزارا ہے۔ جامعہ نصرت ...... کتنی کشش، کتنا پیار، کتنا سُرور ہے ان الفاظ میں، کوئی میرے دل سے پوچھے۔

کامن روم میں ہر وقت قہقہے گونجا کرتے تھے۔ کیرم کھیلتے ہوئے ...... شیبی اکثر ہم سے جھگڑ پڑتی اور جب کوئی اس کی طرف داری نہ کرتا تو وہ ...... واک آؤٹ کر جاتی اور پھر اسے منانے کے لیے ٹک شاپ کا ایک چکر لگانا پڑتا، ٹک شاپ جہاں گرم گرم چائے اور سموسے ملتے تھے۔ انتخابات کے دنوں میں تو وہاں امیدواروں کے حامیوں کا ہجوم ہو جاتا اور پھر چائے کے خوب خوب دور چلتے اور بحثیں ہوتیں۔ کالج میں بات مشہور ہونے کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ سچی ہو یا اس کا کوئی ثبوت ہو۔ وہاں تو لوگ آنکھوں سے افسانے چھین لینے اور اشاروں سے داستانیں تیار کر لینے میں ماہر تھے۔ ان باتوں میں اکثر اوقات پیریڈ گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اس بات کا ثبوت اس وقت ملتا جب نوٹس بورڈ پر ہمارے نام مع فائن کے ہمارا منہ چڑا رہے ہوتے۔

چاروں طرف سے سرسبز باڑھ میں گھرے ہوئے لان میں امرود کا پیڑ، ہمارے کتنے ہی خالی پیریڈز کا ساتھی اب ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ کتنی ہی شرارتوں کے پلان اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر بنائے گئے لیکن آفرین ہے اس پر کہ اس نے کبھی ہمارا راز افشا نہ کیا۔ کتنا سکون اور خنکی تھی اس کی آغوش میں!۔ کوئی پارٹی ہو یا کوئی میٹنگ، تمام ریزولیوشن اسی کے نیچے بیٹھ کر پاس ہوتے گویا اسے ہمارے سیکریٹریٹ کا درجہ حاصل تھا۔ جب ہم کوئی فیصلہ کرتے تو اس کی شاخیں سر ہلا ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کرتیں اور پھر مالی کی نظر بچا کر کچے امرود کھانے میں بھی تو کتنا لطف ملتا تھا۔''

النصرت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ امرود کے مندرجہ بالا درخت کے علاوہ کالج کے صحن میں کیکر کا ایک تنومند درخت بھی ہوا کرتا تھا جو یقیناً اس ادارے کے قیام سے بھی پہلے زمانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس درخت نے بچشمِ خود اس کالج کو قائم ہوتے اور ترقی کی منازل طے کرتے دیکھا تھا۔ طالبات اس درخت کے نیچے بیٹھتیں اور ربوہ کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اس کے خنک سایہ سے لطف اندوز ہوتیں۔ وہ اس کے نیچے اپنا فارغ وقت گزارتیں، اساتذہ کی طرف سے ملا ہوا وہ کام مکمل کرتیں جو وہ گھر سے نہ کر کے آئی ہوتی تھیں، ٹیسٹوں کی تیاری کرتیں، مباحثات کے لیے اپنی تقریریں یاد کرتیں، مشاعروں کے لیے مشقِ سخن کرتیں اور ایک دوسرے سے بے سروپا باتیں کر کے بات بات پر قہقہے بکھیرا کرتی تھیں مگر پھر نہ جانے کیا ہوا، اس کی رگِ حیات منقطع کر دی گئی اور وہ درخت جو اس کالج کی آن تھا اور شان تھا زمین بوس ہو گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کا نشان بھی باقی نہ رہا، صرف اس کی یادیں باقی رہ گئیں۔ ملاحظہ کیجئے ''بنتِ کیکر'' کا یہ مضمون جو ''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں کٹنے والے میں'' کے زیرِ عنوان النصرت کے ایک شمارے میں چھپا ہوا ہے:

''قارئینِ کرام! آپ نے میر کا یہ شعر سنا ہوگا:

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

غالب کا بھی خیال تھا:

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

دیوار اہلِ دل کے لیے بڑی معنویت رکھتی ہے۔ یہ ایسی پناہ گاہ ہے جس کے سائے میں فرمانروائے سخن کشورِ ہندوستان ذرا دیر ستانے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ سر پھوڑنے کے کام بھی آ سکتی ہے۔ یہ رازداں بھی ہوتی ہے۔ اگر دشمنوں کی قسمت سے یہ خستہ حال ہو تو گر کر جسم ہی کو کیا، روح کو بھی کچل دیتی ہے۔ دیوار ہماری قسمت میں نہ تھی لیکن ترقی یافتہ زمانہ کے تقاضوں کی بدولت ہم سرگشتۂ رسوم و قیود فرہاد نہ تھے کہ تیشے بغیر سر نہ پھوڑ سکیں۔ مرنے کے لیے تو دردِ دل ہی بہت کافی ہوتا ہے۔ اس دردِ دل کے سہارے ہم نے ایک آسرا ڈھونڈ لیا تھا۔ آسرا قائم رہتا تو ہم یوں نوحہ کناں نہ ہوتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ:

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

شاعر کو شاخ ٹوٹ جانے پر شکوہ ہے تو ہمارا تصور کیجئے جن کا پورے کا پورا درخت ہی کاٹ دیا گیا ہو۔ جب انجانے میں راز کی بات زباں پر آ ہی گئی ہے تو پھر آپ سے کیا چھپانا۔ جس کے لیے ہم ماتم کناں ہیں کیکر کا ایک سروقد، حسین و جمیل، پُرشباب درخت تھا جس کے ساتھ ہم نے ایک عمر بِتا دی تھی۔

کالج میں اب جتنی اہمیت بارہ دری کو حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ اہم وہ کیکر کا درخت تھا جسے کاٹ دیا گیا ہے۔ بارہ دری تعمیر ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور وہ درخت جب کالج وجود میں آیا تھا تو فارسی غزل کا موضوعِ خاص ہونے کے لائق تھا۔ اس نے کالج کی ترقی کا ایک ایک واقعہ دیکھا، پلا، بڑھا، جوان ہوا اور پھر نامراد کاٹا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہماری آنکھیں نم آلود تھیں۔ ہمارے دل ڈوب رہے تھے جب پرنسپل صاحبہ نے کھیل کے میدان کو مزید وسعت دینے کے لیے اس کی رگِ حیات کٹوا دی۔

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھا بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

یہ سوال تو یقیناً آپ کے ذہن میں پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر یہ درخت ہمارے لیے اتنا اہم کیوں تھا۔ پہلے آپ بتائیے اگر کالج میں آپ کا پہلا دن ہو اور آپ کی کیفیت یہ ہو کہ

نوگرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں

تو آپ کہاں جائیں گی؟ جب صرف یہی بیس پچیس منٹ لیٹ ہو جانے پر مس صاحبہ کلاس روم میں آنے کی اجازت نہ دیں تو آپ وقت کہاں گزاریں گی؟ جب کالج کے اربابِ حل وعقد کی توصیف یا کسی نئے حکم پر احتجاج کرنا ہو تو ریزولیوشن کہاں پاس ہوں گے؟ میٹنگ شروع ہو چکی ہو اور اس میں آپ کو مضمون پڑھنا ہے تو وہ کہاں بیٹھ کر لکھیں گی؟ ڈانٹ پڑنے پر یہ سوچتے ہوئے کہ

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

آپ کس جگہ پناہ لیں گی؟ ان سب کا جواب مرحوم کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے سے پہلے کیکر کا درخت ہی تھا۔ درخت کا سایہ کافی ہوتا یا ناکافی، بیٹھنے کے لیے اینٹیں ہوتیں یا نہ ہوتیں، بس ہم وہیں پہنچ کر دم لیتے۔ چند واقعات جو فراموش کرنے مشکل ہیں آپ بھی سنئے......

ایک دفعہ ہمارے اس اوپن ائیر اسمبلی ہال میں یہ خبر اڑی کہ پرنسپل صاحبہ کل دو پیریڈز کے بعد لاہور تشریف لے جارہی ہیں۔ صلاح ٹھہری کہ دو پیریڈز کے بعد کالج کے کسی اصول کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ صبح ہر لڑکی نے یونیفارم کی سفید قمیص کے نیچے شوخ رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ ہسٹری کی لیکچرر جو پرنسپل صاحبہ کے بعد کرتا دھرتا تھیں شرافت سے پیریڈ لے کر اپنے کمرے میں چلی جائیں گی مگر کچھ نہ پوچھئے عین وقت پر پکڑ لئے گئے اور جو فائن ہوا تو کئی دن پیٹ کاٹ کر ادا کیا۔

جنوبی دروازے سے داخل ہونے والوں کے انتظار میں بہت سی سر پھری لڑکیاں اس درخت کے نیچے بیٹھی شاعری کرتی نظر آتیں۔ بہت سی شرارتیں جن کے سوچنے اور کرنے والوں کے نام ہنوز صیغہ راز میں ہیں یہیں سوچی جاتی تھیں۔

کسی میٹنگ میں لب سی کر مؤدب بن کر دو گھڑی بیٹھنا پڑتا تو فوراً یہ شعر زبانوں پر آجاتا:

میں دیوانہ بھلا مجھ کو مرے صحرا میں پہنچا دو
کہ میں پابندِ آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

اس درخت کے نیچے سکون ہی سکون تھا۔ اگر کبھی اٹھتے بھی تو یہ درخت ہولے سے ہمارا دامن تھام لیتا اور کچھ دیر اور بیٹھ جانے کی التجا کرتا۔ ہم سوچتے واقعی

گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں

یہ درخت ہمارے دکھ سکھ کا ساتھی تھا۔

اب یہ درخت کٹ چکا ہے۔ نہ کسی سے گلہ ہے نہ شکوہ۔ مقدّر سے آج تک کون لڑا ہے۔ پس دعا ہے کہ خدا تعالیٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل اور نعم البدل عطا کرے۔ آہ ہمارا کیکر!''

امرود اور کیکر کے ان درختوں کے بعد کچھ ذکر کالج کی انتہائی قابلِ قدر روایات کا جن میں سے ایک کا تعلق پردے سے ہے۔ یاد رہے کہ جامعہ نصرت کی طالبات کے لیے پردے کی پابندی لازمی تھی۔ میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ عام طور پر طالبات سیاہ رنگ کا برقع استعمال کرتیں۔ بعض طالبات سفید برقع کو ترجیح دیتیں اور کبھی کبھار کسی اور رنگ کا برقع بھی نظر آجاتا۔ کالج پہنچ کر طالبات برقع اتار دیتیں اور اپنا برقع، برقع روم میں چھوڑ دیتیں۔ برقع روم کی وضاحت ایک طالبہ، سلیمہ کے اس مضمون سے ہوتی ہے جو النصرت کے ایک شمارے میں چھپا۔ آپ ملاحظہ فرمانا چاہیں گے یہ مضمون جس میں فاضل مضمون نگار کالج میں اپنے پہلے دن کا حوالہ دیتی ہوئی

لکھتی ہیں:

''سر کو ذرا جنبش دے کر پوچھا کہ کہاں ہے برقع روم؟ بڑی بیزاری سے جواب ملا: دیکھتی نہیں آفس کی دائیں طرف۔ میں حیران تھی برقع روم ہی تو پوچھا ہے، یہ صاحبہ اس قدر کیوں چڑ گئیں؟ خیر اَب سمجھ میں آیا کہ وہ سامنے کونے کھدرے میں جو زمانہ جدید کا مربع نما ماڈل نظر آرہا ہے شاید وہی ہے برقع روم۔ یہ تو تھی ہماری خیر سے پہلی ملاقات۔ خوب جانچ پڑتال کی تاکہ پھر نہ تلاش کرنا پڑے...... جی ہاں! اپنی یادداشت بڑی کمزور ہے۔

ہمارے اس عظیم الشان برقعوں کے رکھوالے کو کچھ اس ترتیب سے آراستہ کیا گیا ہے: تین عدد قدیم طرز کے شیڈ جو محرّم ہو نہ ہو سیاہ لبادے اوڑھے رہتے ہیں، دو عدد درمیانے سائز کے صندوق اور ایک جدید ڈیزائن کی الماری۔ یہ تینوں (یعنی دونوں صندوق اور الماری۔ ناقل) مقفل رہتے ہیں۔

جہاں تک اس تحقیق کا تعلق ہے کہ ان میں کیا مقفّل ہے میں نے خود بھی سوچا اور کالج کی اعلیٰ درجوں کی طالبات سے بھی رابطہ قائم کیا تو انکشاف ہوا کہ شاید ان میں قارون کا خزانہ دفن ہے اور تالوں کی چابیاں کنجوس قارون، برا ہو اس کا، ساتھ لے مرا۔ شکر ہے ایک بہت بڑا مسئلہ تو حل ہوا۔ اس خزانے کے علاوہ سات آٹھ عدد کرسیاں بھی کمرے کے اندر براجمان ہیں۔ بڑی آرام طلب ہیں یہ کرسیاں۔ کبھی ہلنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ حالت غیر ہے اس کے باوجود برقعوں کے لیے موزوں نشست گاہ ہیں۔ خواہ ہزاروں برقعے براجمان ہو جائیں کوئی پس و پیش نہیں کرتیں۔ ہاں! سچی بات ہے یہ بہت ہی سعادت مند ہیں۔

دُور اندیش طالبات نے اسے (یعنی برقع روم کو۔ ناقل) مختلف خطابوں سے نواز رکھا ہے۔ کچھ لوگ تو اسے منگلا ڈیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جب کبھی بارش کی چار بوندیں ٹپکیں تو پانی منگلا ڈیم کے کناروں یعنی قدیم شیڈوں پر ٹھہر جاتا ہے اور پھر اگلی بارش ہونے تک یہ پانی برقعوں کی ڈرائی کلیننگ کے لیے کافی ہوتا ہے۔

قابلِ ستائش بات یہ ہے کہ اس ڈیم کے اردگرد خاصی بستی بس گئی ہے۔ برقع روم اور آفس کے درمیان ایک نئی پرشکوہ واٹر بلڈنگ تعمیر ہوگئی ہے۔ یہ ۱۹۶۹ء کا نیو ماڈل ہے۔ دو عالی شان ستون اس کی عظمت و رفعت کی غمازی کرتے ہیں۔ مسٹر کولر موسم گرما میں چند روز کے لیے بغرضِ سیر یہاں آتے ہیں اور فخریہ طور پر آبِ حیات مہیا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آبِ حیات جیسی چیز کمیاب تو ہوگی!

برقع روم پر ہر روز ایک لشکرِ جرار ہلّہ بولتا ہے لیکن یہ بھی بہادر قوم کا مایہ ناز سپوت ہے۔...... اس لشکرِ جرار کی کمان فسٹ ایئر کے ہاتھ ہے۔ دھینگا مشتی، مار کٹائی، مکّا بازی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ روزِ محشر کا نقشہ یاد آجاتا ہے اور غالب شاید اسی کو دیکھ کر کہہ گئے تھے:

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غرض ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنا برقع حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ آگے پیچھے سے کوڑوں کی طرح گھونسے پڑتے ہیں۔

ابھی برقع کو ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ کسی نے دھکا دیا اور ہم دھم سے نیچے آرہے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

امید پر زندگی کا دارومدار ہے۔ہم کپڑوں کو جھاڑ پونچھ کر مردانہ وار ڈٹ جاتے ہیں۔

جاتی ہے اے امید کہاں دل اُجاڑ کے

پہلے تو طوفان کا ایک زبردست ریلا آیا۔ پھر مدّ و جزر شروع ہوگیا۔اس قسم کی آوازیں تو اکثر سنائی دیتی ہیں: ''پلیز میرا برقع بھی لیتی آنا۔ بیمار کرسی پر پڑا ہے۔'' اندر والی صاحبہ کبھی تو کرم کی بھیک عنایت کر دیتی ہیں اور کبھی دھتکار دیا: ''بابا! ہم نے کوئی تمہارا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔خود بھی جہاد کرو۔ جہاد فرض ہے۔''

اور سنیئے! اکثر نفاست پسند لیڈیز جوتے کی صفائی بھی ان برقعوں ہی سے کرتی ہیں۔غرضیکہ کیا کیا ناانصافی ہے جو اِن سے نہیں ہوتی اس لیے ہم نے کبھی بھول کر بھی برقع کو دھویا نہیں اور استری کرنے کا خیال ہی خام ہے۔ جب برقع پہننے لگیں تو پتا چلتا ہے کہ اس کے اندر بہت سے مچھروں نے پناہ لے رکھی تھی۔

جب اہلِ علم برقع روم سے اپنی اپنی امانت لے کر باہر نکلتے ہیں تو اکثر ایک آواز سنی جاتی ہے: ''اے لوگو! نئے برقعے پرانے برقعوں سے بدل کر نہ لے جانا کیونکہ اس فعل سے میری تقدیس پر حرف آتا ہے'' لیکن برقع روم دیانت کا پُتلا کیا جانے کہ اس وقت کوئی اس کی آواز نہیں سن رہا۔بس ہر کوئی اپنی جان سلامت لے کر بچ نکلنے کا متمنّی ہے۔''

''برقع روم'' پر ایک طالبہ، صالحہ بشریٰ نے بھی خامہ فرسائی کی ہے لیکن یہ مضمون انگریزی میں ہے لہٰذا طوالت و تکرار کے خوف سے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ ٹک شاپ کسی بھی تعلیمی ادارے کا جُزوِ لاینفک ہوتی ہے۔طلبہ اپنے فارغ اوقات میں یہاں بیٹھ کر نہ صرف لذتِ کام و دہن کا سامان فراہم کرتے ہیں بلکہ دوستانہ مجالس سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان مجالس میں کیا کچھ زیرِ بحث نہیں آتا: طلبہ کی ایک دوسرے کے خلاف شکایات، ان کے باہمی تعلقاتِ محبت و نفرت، اساتذہ کی تعریفیں (یا خدانخواستہ بدخوئیاں)، پڑھائی میں رہ جانے والی خامیاں، امتحانات کی تیاری میں رہ جانے والی کمی، کالج سے باہر اپنے ساتھیوں کے بارے میں چہ میگوئیاں......غرض دنیا کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہوتا جو ٹک شاپ میں زیرِ بحث نہ آتا ہو۔طلبہ کی اکثریت چونکہ مالی بحران کا شکار رہتی ہے لہٰذا وہ چائے کے ایک کپ ہی کو انتہا درجے کی تفریح سمجھتی ہے اور اس سے اس طرح لطف اندوز ہوتی ہے گویا وہ کسی پنج تارہ ہوٹل میں بیٹھے کوئی عظیم الشّان دعوت اڑا رہے ہوں۔ٹک شاپ میں دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا یہ وقت طلبہ کو کبھی نہیں بھولتا اور ان کی یادوں کا ایک خوبصورت حصہ بن کر ہمیشہ ان کے ذہن میں گردش کرتا رہتا ہے۔کالج کی ایک طالبہ، شہناز نے اپنی ٹک شاپ کے بارے میں انگریزی میں ایک مضمون لکھا ہے۔دیکھئے ذرا وہ کیا لکھتی ہیں لیکن اگر آپ کو اس مضمون میں شرارت کا کوئی شائبہ نظر آئے تو مت بھولیے کہ نوجوانی کی اس عمر میں جب گناہ ثواب کا تصور ذہن میں اتنا راسخ نہیں ہوتا ایسی چھوٹی موٹی لغزشیں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں۔

"Believe it or not, I happen to be a lgtton. The first thing about

which I was in search of in college was the tuck shop. It took me no time to find it. Now it was difficult for me to wait for a free period to satiate my ever-increasing hunger. But the dragon of discipline had to be obeyed and I waited for the third period when I would be free.

Within a few minutes I would find myself in the tuck shop with other friends. We sat at a table in the corner. We were glad to see that there was no other girl to make a fool of us, for we, being first year students, were often considered fools. Meanwhile, Hamida, incharge of the shop came to us and I asked her for three glasses of soda water and ice cream. The ice cream was delicious. We spent the whole period in the cold, airy tuck shop, in examining the sweets and cold drinks. I consulted my watch; only five minutes were left in the period. I paid the bill and hurried to my class.

That day when I returned home, I was worried - not about the money I had spent but about the money I would need daily to enjoy such fine things. At last an idea struck me and I congratulated myself for having formed such an unusual plan.

In a few days I became famous in the college for my generosity, as money did not matter much with me.

Now I am in the second year and have many friends, but none of them knows how and when I pay the bills of the tuck shop. Similarly, none of the staff members could guess my mischievous behaviour. Their monthly bills of the tuck shop rose considerably and they paid without a murmur. There is no doubt they must have been amazed why they had to pay such a huge sum to the tuck shop. The thief, however, went scot free. Hence I say that the tuck shop proved a blessing in disguise for me and may every college have a tuck shop."

اس ٹک شاپ کی انچارج امۃ الحیٰ نامی ایک خاتون تھیں جن کا ذکر النصرت کے بعض پرچوں میں موجود ہے۔جامعہ نصرت کی ایک گمنام مضمون نگار (غالباً نعیمہ سلہری) نے ''انچارج کیفے ٹیریا'' کے عنوان سے موصوفہ کے بارے میں یہ مضمون لکھ کر اسے زندۂ جاوید بنا دینے کی کوشش کی ہے:

''جامعہ نصرت میں آپ کو چند ایسی شخصیتیں نظر آئیں گی جو قدم قدم پر اپنی ہستی کا احساس دلائیں گی اور پھر آپ ان کو لاکھ فراموش کرنا چاہیں...... کسی نہ کسی صورت میں آپ کے سامنے آ موجود ہوں گی۔ لیجئے ان میں سے ایک امۃ الحیٰ، انچارج کیفے ٹیریا تو آپ کے سامنے ہیں۔ان سے ملئے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کا تعارف کرواؤں ماحول کا گرد و پیش بھی آپ کو بتلانا ہوگا۔ یہ سٹاف روم سے ملحق مستقبل بعید کا ''لان'' ہے جس کو ہموار کرنے کے لیے چند روز پیشتر ریت اور بجری ڈلوائی گئی ہے۔ جی ہاں! وہیں آٹھ دس بے آرام کرسیاں پڑی ہیں جن میں سے ہر ایک پر اس جامعہ کی تعلیم کی روحِ رواں

تشریف فرما ہیں۔

امۃ الحیٰ کو دیکھتے ہی:

''امۃ الحیٰ! دو گھنٹے ہوئے تمہیں کہا تھا کہ رکتو دے جانا۔ اس دوران میں دو پیریڈ بھی لے آئی ہوں اور تم نے اب شکل دکھائی ہے!''

''امۃ الحیٰ! ایک پاؤ دودھ اور ایک پاؤ برفی لے آؤ۔''

''امۃ الحیٰ! بھوک سے آنتیں قُل ھُو اللہ پڑھنے لگیں۔ خدارا کچھ تو لے آؤ۔''

''امۃ الحیٰ! اگر کیلے ہوں تو لے آنا۔''

امۃ الحیٰ اس تمام گفتگو سے بے نیاز ازار بند کے ساتھ چابی لٹکائے، نیلے کے اوپر پیلا سویٹر زیبِ تن کئے، ایک ہاتھ سے جس سے شاید ابھی ابھی پکوڑے بنا کر آئی ہے اپنے گیسو سنوارتے ہوئے، دوپٹے سے بے نیازیوں گویا ہوئیں: ''آپا جی تسی پہلے پیسے تے لکھ دیئو۔''

''بھئی امۃ الحیٰ! تم پہلے کچھ لاؤ تو سہی۔ پھر لکھ بھی دیں گے۔''

''نہیں جی۔ مینوں فیر چیتا بھُل جاندا اے'' اور وہ تب تک نہ ٹلے گی جب تک لکھوا نہ لے حالانکہ اس کا ''چیتا'' اس قدر تیز ہے کہ لاکھ کہتے جایئے امۃ الحیٰ یہ دیکھو کل کی تاریخ ڈالی ہوئی ہے لیکن وہ اصرار کرتی جائے گی کہ نہیں آپ نے بھول کر پرسوں کل کی لکھ دی ہوگی۔

مجھے ویسے بھی اس کی ہمسایہ ہونے کا شرف حاصل ہے اس لیے اس کو تھوڑا بہت آنکھ کا لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ذرا آنکھ کا لحاظ ملاحظہ ہو:

''لو آپا جی رکتو تسی کِنّے منگوائے سی؟''

''چار! امۃ الحیٰ۔''

''لو جی: اک، دو، تن تے چار۔ آپا جی چھلکے ایس ٹرے وچ سُٹ دے جانا۔''

یہ صرف آنکھ کا لحاظ ہے جی ورنہ وہ نمک اور پلیٹ سے بے نیاز آپ کو رکتو پکڑا جائے گی۔

''مِس سلہری، آپ سے کاپی پر اس نے نہیں لکھوایا'' میری برادری میں سے کسی کی آواز آئی۔

''بس جی ہم نے بھی، دیکھ لیں، امۃ الحیٰ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے'' ہم فخر سے بولے، ٹیک لگائی اور ایک ہاتھ سے رکتو چھیلنا شروع کیا۔ چوتھے رکتو کی آخری پھانک ابھی ہاتھ ہی میں ہے کہ امۃ الحیٰ کی مخصوص آواز کان میں آئی۔ ''پھڑو آپا جی کاپی تے لکھ دیو۔''

اب آخری پھانک بھلا آپ سوچئے جان کنی کی سی کیفیت ہی میں کھائی گئی ہوگی لیکن یہ تو آپ کی آنکھ کا لحاظ ہے ورنہ وہ پیشگی بھی لکھوا سکتی تھی۔

بارش زور شور سے ہو رہی ہو اور کالج میں کہیں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ ہو، ایسے موسم میں کلاس روم سے سٹاف روم تک کی مسافت طے کرنے میں کیا حالت ہوگی؟ خیر بھیگتے بھاگتے، لڑکھڑاتے ایک میل کی

مسافت طے کرتے اگر اس حصار میں پہنچ جائیں تو پاس ہی چند قدم پر کیفے کی روحِ رواں، امۃ الحیٰ کے سوا اور کوئی نظر نہ آئے گا۔

ایک دن ہم اسی روحِ رواں پر اعتماد کر بیٹھے اور کانپتے، دانت بجتے کہہ بیٹھے کہ ''امۃ الحیٰ! ہاف سیٹ چائے تو لے آؤ'' لیکن اس سے قبل کہ پوری رُوداد بتائی جائے ''ہاف سیٹ'' پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے۔ ہاف سیٹ کیا؟ بمشکل ڈیڑھ کپ اس چائے دانی سے نکلے گا اور پھر پوچھنے پر کہ ''امۃ الحیٰ! یہ ہاف سیٹ ہے؟ دو کپ بھی پورے نہیں'' تو امۃ الحیٰ اپنے شاہانہ انداز میں نصیحت فرمائیں گی: ''آپا جی! دُدھ پاؤ فیر بن گیاں دو پیالیاں۔ ہُن تُسی ہاف سیٹ کہوتے پوری چاء دانی بھر لیاواں۔''

سن لی جی آپ نے اس کی گفتگو۔ تو ہاں میں بتا رہی تھی کہ ایک دن ہم اسی قسم کے ہاف سیٹ کا آرڈر دے بیٹھے لیکن امۃ الحیٰ کا انتظار جان لیوا تھا۔ اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ نہ جانے کون سا جذبۂ محبت کام آیا کہ تقریباً تین گھنٹے کے بعد یعنی تقریباً چار پیریڈ کے وقفے سے ساقی جام لئے پلانے آ ہی گیا لیکن اس کے ہاتھوں سے کہاں نصیب! وہ تو روایتی بے نیازی سے مکھ موڑے یہ جا وہ جا۔ آخر خود ہی اٹھے۔ لیکن یہ کیا؟ یہ دیکھنا تھا کہ چائے پینے کا سارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا اور اپنی یہ کیفیت تھی۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

اور ساقی سے گِلہ کرنے پر یہ جواب:

''آپا جی برسات دا موسم اے۔ میں اینآں مکھیاں نُوں کتھے لے جاواں۔'' اب ساغر و مینا کا سارا نشہ تو ہرن ہو چکا تھا اور ہم صحیح الدّماغ ہو کر چائے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ آخر کہا کہ ''لے جاؤ بھئی اس چائے کو۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں'' اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ہاف سیٹ لے کر سدھاری بغیر کسی معذرت کے۔ اب وہ وہی مے جسے ہم نے تلخ سمجھ کر لوٹا دیا تھا یہ کہتے ہوئے دوسرے گاہکوں کو دینے میں مصروف تھی کہ ''لو جی گرما گرم چاء تے کڈ دوبارہ آنے!'' اب بھلا ہم میں قوتِ گویائی کہاں؟ کان سر لپیٹے دیارِ غیر سے ایسے لوٹے کہ کئی روز تک چائے پینے کو تو کیا دیکھنے کو بھی دل نہ چاہا۔

ایک دن سوچا یہاں منگوانے سے بہتر ہے آج خود امۃ الحیٰ کے حضور حاضر ہو جائیں، اپنے وقت کی بھی بچت ہو اور امۃ الحیٰ بھی کوفت سے بچے۔ دروازہ کھولا۔ اندر جو پہنچے تو دیکھا امۃ الحیٰ اپنا فریج کھولے کھڑی ہے اور درجنوں لڑکیاں کھڑی کچھ نہ کچھ طلب کر رہی ہیں۔ فریج میں نظر جو دوڑائی تو ایک ہی خانے میں رکتو، کیلے، برفی، پکوڑے اور سویّاں بھری پڑی تھیں۔

لڑکیاں ہمیں دیکھتے ہی ہٹنے لگیں کہ ''مِس آ گئی ہیں۔ امۃ الحیٰ! پہلے مِسّوں کو دے لو۔'' کچھ کچن کی طرف بھاگنے لگیں۔ گو ہم حتی المقدور اسی لیے امۃ الحیٰ کے حضور حاضر ہونے میں تأمل کرتے ہیں لیکن امۃ الحیٰ لڑکیوں کی جھجک اور ہماری موجودگی کو سراسر نظر انداز کرتے ہوئے ہاتھ میں ترازو پکڑے لڑکی پر برسی: ''جلدی کرتُوں گُروئیے!

ینوں ہور تھوڑے کم نے۔'' ہم امۃ الحیٔ کو بے بس نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''کتنی برفی تولاں زرینہ؟''

''......ہم......امۃ الحیٔ......''

''تے پھڑ چار کیلے تے ادھ پاء سیویاں''۔

ہم اپنی عزت بچاتے ہوئے بہانے سے کچن کی طرف سدھارے۔ یہاں امۃ الحیٔ کی اسسٹنٹ، زینب بی بی ہوتی ہیں۔ دودھ کو بغیر ڈھکا دیکھ کر جب رہا نہ گیا تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''زینب! یہ دودھ سارا دن اسی طرح پڑا رہتا ہے؟'' زینب بی بی سموسے بناتی بناتی مرچوں کی وجہ سے بہتی ناک کو پونچھتے ہوئے بولی: ''تے فیر اسی کی کریئے۔ ایہہ تے ایس طرح ای ہندا اے''۔ اتنے میں امۃ الحیٔ اپنے گاہکوں کو نپٹا کے آچکی تھی۔

''امۃ الحیٔ! دودھ کس بھاؤ دے رہی ہو؟''

''اک رُوپے سیر۔''

''ہیں امۃ الحیٔ! بازار میں تو دس آنے سیر ہے۔''

''ہوئے گا۔ ساڈی نہیں پُوری پیندی جی'' اور میں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے مصداق بول پڑی ''امۃ الحیٔ! جو پانی ڈالتی ہو وہ کہاں جاتا ہے؟''

''ہیں آپا جی! قسم خدادی۔ ہن تے میں کدی نہیں پایا'' اور سب لوگ جو وہاں موجود تھے ہنسنے لگے۔

ہم نے دیکھا کہ ہمیں تو ابھی تک کچھ نہیں ملا اور امۃ الحیٔ کچھ لفٹ نہیں کرا رہی تو کہا ''امۃ الحیٔ لو پکڑو پلیٹ اور رکھو اس میں کیلے اور رکنو اور ہمارے ساتھ چلو۔''

بس جی اب کچھ کام بنتا نظر آتا ہے۔ رکنو آ گئے ہیں۔ ہم نے کھانے شروع کر دیئے ہیں......وہ دیکھئے دوبارہ......امۃ الحیٔ بمع اپنی کاپی اور ہمارا نامۂ اعمال آ رہی ہے۔ بس اب تاب نہیں......''

یہ تو تھا امۃ الحیٔ کا کچھ ذکر۔ اب کالج کے ایک اور اہم کردار، مائی حمیدہ کا ذکرِ خیر وحیدہ نامی ایک طالبہ کے قلم سے لیکن ذرا ہوشیار ہو جایئے کہ یہ ذکر انگریزی میں ہے۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ مائی حمیدہ کی جامعہ نصرت میں وہی مقبولیت تھی جو شادی کی تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں تھی:

"You can see the dark slanting figure of Mai Hamida, walking slowly through the long corridorone hand holding a small chit of paper and the other dangling leisurely. She glances at you through her dark beady eyes and passes on. But that is not the whole of her. She has her peculiarity with which she attracts your attention and that is in the musical noise produced by the click-clacking of her half worn-out slippers.

I wish you were inside the class room she has just entered because then you would know her more. Entering without any permission, she stands there smiling before the lecuturer's table and however serious the topic of our study, she attracts our whole attention. When she delivers her message in shrill voice and turns away without caring for the answer even

our lecturers cannot help smiling.

How funny and interesting Hamida appeared the day our Principal lost a book. When she asked, "Hamida, have you seen my green-coloured book?"

What an answer she makes, "No, dear, I have no knowledge of such a thing."

At that moment, though amazed at her boldness, we could not help smiling; even our worthy Principal smiled at her because Hamida, though harsh and bold, has nothing of rudeness in her manner. It is but natural to her. It is a fact that when losing the things the fault often lies with Hamida, such as delivering the letters to wrong hands, putting things in wrong places and never fetching the important articles in time.

Some time she astonishes us with regard to her curiosity about the knowledge found in "bright coloured" books and "magazines full of picutres" as she calls them. One day our worthy Principal was holding a book entitled ``Rabwah". When Mai Hamida heard the name of the book, she poured out questions, one after the other: "What is written in it?" Where has it come from?" Is Shah Sahib's photo there?" So forth and so on. And when the Principal asked her, "Will you read it, Hamida?" she answered half smiling, "Yes, I would like to."

She is quite ignorant although she can sign her name. There is a history behind it. Once all the servants were told that they would receive their pay only if they signed and no thumb-impression was to be tolerated. Hamida scribbled her name day and night, for fear of losing her pay. She is now looking forward to joining the adult education class that is to be held in the near future.

Though Mai Hamida appears to carry on her routine work in her lazy walk, yet she has a peculiar place among the small college comumunity. She feels very proud while bringing the Principal's bag and newspapers and becomes quite authoritative when she delivers some order from the Principal to other servants. In her relationship with other servants she seems always to be defending herself, often using a tone of voice and a manner that said, "now, look here, I am doing all I can do and if you had a grain of sense you would see the sacrifice I am making.' She is quick to rebuke those colleagues who displease her and of course they avoid being in her presence when they find it possible to be elsewhere.

Hamida, in spite of all this, has a heart of gold. She always wishes you well and is very religeous. She says her prayers regualrly and makes the best of the opportunity. When she goes in the office early in the morning for dusting, she sits in the sacred calm of the morning reciting the Holy Quran.

Even when I leave college I can never forget the ringing of the college gong by Hamida, early in the misty mornings of winter and in the pleasant weather of early summer. Also when our examinations draw near and we are busy, she invites the students to college with the sweet musical ringing of the bell. She has been doing so for many years in the past and will continue to do so for many years to come. We have often heard her saying that she has served the college for full twelve years, and you cannot think of Jamia Nusrat without Mai Hamida.

May God bless her and let her serve for many more years."

النصرت کے پہلے شمارے میں چھپی ہوئی ’’بزمِ ادب‘‘ کی ایک رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بزم کے تحت ربوہ میں انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان کی ایک شاخ کھولنے کا منصوبہ بھی زیرِ غور رہا۔ ملاحظہ فرمایئے اس رپورٹ کا یہ حصہ:

’’ابھی سال کا آغاز ہے اور بزمِ ادب کے تحت ایک رنگارنگ پروگرام...... کے علاوہ یونیورسٹی پروفیسر، جناب محترم وحید قریشی صاحب کا لیکچر بھی ہوا۔ بزمِ ادب کے سال بھر کے پروگرام کے اہم عنوانات ربوہ میں انجمنِ ترقیِ اردو، پاکستان کی شاخ کھولنا اور بین الجامعی مشاعرہ منعقد کرانا ہے۔‘‘

افسوس! ربوہ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کھولنے کا منصوبہ تو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا البتہ وقتاً فوقتاً مشاعرے ضرور ہوتے رہے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے کی رُوداد النصرت کے جنوری تا جون ۱۹۶۵ء شمارے میں موجود ہے۔ یاد رہے یہ مشاعرہ ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء کو ہوا تھا۔

دیکھئے تو سعیدہ ناصرہ نے اس مشاعرے کا حال کتنے دلنشیں انداز میں قلمبند کیا ہے:

’’جامعہ نصرت کی پُرسکون فضا میں ہر سال موسمِ بہار کا آغاز ایک ہلچل اور چہل پہل پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی رعنائیاں ماحول کو دلکشی و خوشنمائی عطا کرتی ہیں۔ کالج کے سوئے ہوئے ہنگامے ایک مرتبہ پھر بیدار ہو جاتے ہیں اور سرگرمیاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ انتخابات کے بعد مختلف مجالس کے وقتاً فوقتاً اجلاس اس کی زندگی میں نئی روح پھونکتے رہتے ہیں لیکن بین الجامعی مباحثہ اور مشاعرہ کا انعقاد اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر...... ہر جانب مخصوص سفید لباس کی جگہ رنگین آنچل لہرانے لگتے ہیں اور نئے نئے چہرے اور رنگین پیراہنوں کے قوسِ قزحی رنگ جامعہ میں طرفگی اور ندرت کی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

کالج کا روایتی مشاعرہ اس سال بھی پوری آن بان سے منعقد کیا گیا اور ۲۸ فروری کی شام اپنے جلو میں عظیم ہنگامہ لے کر آئی۔ موسم کھلا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کالج کی ہر طالبہ مصروف و مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتا، آج تو شعرا کو اپنا وہ کلاس پیش کرنا تھا جس کے متعلق کسی نے کہا ہے:

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب کہیں بنتی ہے اک مصرعۂ تر کی صُورت

لیکن یہاں تو مصرعۂ تر کی صُورت دینے کے بعد انہوں نے اسے مجلسِ عام کے سامنے پیش بھی کرنا تھا۔

مباحثہ شام کے وقت ختم ہوا تو ہال چند منٹ کے لیے خالی کروالیا گیا اور انتظامِ مشاعرہ کے لیے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی۔ ہال کو ہر ممکن طریق سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی چنانچہ رنگ برنگی جھنڈیوں نے ہال کو دلہن کی طرح بنا دیا۔ برقی قمقموں کے ساتھ مومی شمعوں کی روشنی مشرق و مغرب کا امتزاج پیش کرنے کے علاوہ فضا کی روحانیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ سٹیج پر سفید بزاق چاندنی کے فرش پر سوزنی اور گاؤ تکیہ دِلّی کے مشاعروں کی یاد دلا رہا تھا اور رنگین آنچلوں سے تیار کیا ہوا دروازہ آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

سات بجے سے پہلے ہی سامعین آنا شروع ہو گئے جب کہ مشاعرہ آٹھ بجے شروع ہونا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہال کھچا کھچ بھر گیا اور تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔

عین وقت پر شاعرات سفید لباس میں ملبوس نصف دائرے کی صورت میں بیٹھ گئیں۔ درمیان میں میر مشاعرہ کی مسند تھی اور میرِ مشاعرہ کے فرائض آنسہ امۃ القدوس نے سرانجام دیئے۔‘‘

تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ میرِ مشاعرہ نے مقرر کردہ مصرع ہائے طرح پڑھ کر سنائے اور پھر ’’اپنی مترنّم آواز سے مشاعرہ کے آغاز کا اعلان کیا جسے تالیوں کے شور میں سنا گیا۔ یہ محفل دو ادوار میں منقسم تھی۔ پہلا دور مہمان شاعرات کا تھا اور دوسرا دور مقامی شاعرات کا۔ جمیلہ نصرت سیالکوٹ نے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ وہ اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے شمعوں کے سامنے آ کر بیٹھیں تو ایک مرتبہ پھر ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ ان کی غزل کے ان اشعار پر کافی داد دی گئی:

ہزاروں چاند یکجا ہم نے دیکھے تیری راہوں میں
وہ خاکِ پائے محمل تھی جسے ہم چاندنی سمجھے
جبیں اپنی جھکا دے ان کے در پہ آج اے نصرت
تمہارے غم کو غم سمجھے، خوشی کو جو خوشی سمجھے

ان کے بعد صفیہ انجم نے مخصوص شاعرانہ انداز سے غزل پڑھی جس کے اشعار بلند پایہ اور لہجہ نہایت دلکش تھا۔ ماہ جبیں نے اپنی غزل خاص انداز سے مترنم آواز میں سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔ چند اشعار عرض ہیں:

نہ آنے کی خوشی سمجھے، نہ جانے کی خوشی سمجھے
ہم اپنی زندگی کو ایک دورِ بے کسی سمجھے
سمجھتے ہی نہیں ہیں لوگ ان کو کیا میں سمجھاؤں
چمن والے مرے رونے کو برسوں تک ہنسی سمجھے

اب حمیدہ رضویہ اور شگفتہ حنا کے بعد شائستہ ناہید کی باری تھی۔ وہ اک ادا سے اٹھیں۔ غزل کے ساتھ ترنم نے بھی بہت داد پائی:

تھی سانس آخری تو وفا میں ہوا اثر
بجھنے لگا چراغ تو لَو تیز ہوگئی

امۃ المالک دوپٹہ شریف بیبیوں کی طرح اوڑھے چہرہ پر دلآویز تبسم لئے مائیک کے سامنے تشریف لائیں اور تحت اللّفظ غزل سنائی۔ تمام اشعار بار بار سنے گئے:

نگاہیں بند کر کے یاد میں بیٹھے تھے جن کی ہم
وہ گزرے پاس سے اپنے تو ہم کو پوتی سمجھے

صادقہ قمر کے اٹھتے ہی ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ ہر ایک شعر سامعین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا داد و تحسین وصول کر رہا تھا۔

ریحان فاطمہ نے غزل سرائی شروع کی تو معلوم ہو رہا تھا خاص طور پر غزل کے موڈ میں ہیں۔ نہ معلوم انداز تھا یا وجد۔ غزل اچھی تھی اور دورانِ غزل آپ خاص طور پر سامعین کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔

اب مہمان شاعرات نے نظمیں پیش کرنا تھیں۔ اس میں رضوانہ عزیز، نسرین کوثر، حمیدہ رضویہ، شائستہ، ناصرہ مرزا، صادقہ قمر، شگفتہ حنا، جمیلہ نصرت، ریحان فاطمہ اور صفیہ انجم نے حصہ لیا۔ نظمیں ...... بے حد پسند کی گئیں ......

اب مقامی شاعرات کی باری تھی۔ سب سے پہلے امۃ الرشید اختر جھلملاتے لباس میں آگے بڑھیں۔ مندرجہ ذیل اشعار بہت پسند کئے گئے:

ستارے سینکڑوں ڈوبے ہیں چاندنی کے لیے
ہزار اشک نکلتے ہیں اک ہنسی کے لیے
بہشت کیا ہے، جہنم ہے کیا، کہیں کیا ہم
یہ کائنات اچنبھا ہے آدمی کے لیے

ان کے بعد شاہدہ نسیم تشریف لائیں۔ وہی مخصوص ادا، وہی مخصوص تبسم، مگر لہجہ کا فرق تھا اور وہ لہجہ تھا شاعرانہ۔ آپ بھی سنئے:

میں مسکراؤں تو کیسے بتاؤ میرے ندیم
ہزار اشک نکلتے ہیں اک ہنسی کے لیے
ہے دل کو گھیرے ہوئے کیوں غمِ زمانہ نسیم
کہ ہے بہت غمِ جاناں ہی بے کلی کے لیے

داد و تحسین کا جوش...... پھر سے عروج پر پہنچ گیا۔ نسیم رضوی کے اس شعر پر خوب خوب داد ملی:

تلخیوں میں غم کی گھر کے دل تھا مرجھایا ہوا
یاد کر کے تم کو چہرے پہ نکھار آ ہی گیا

طاہرہ روحی تشریف لائیں تو دھیمے ترنم کے ساتھ یوں گویا ہوئیں:

جگر کے خون سے جلتے ہوئے وفا کے چراغ

جلائے ہم نے زمانہ کی رہبری کے لیے
یہ دل کا فیصلہ ہے کس قدر کڑا روحی
جتن اٹھاؤ غموں کے اک اجنبی کے لیے

خالدہ مبارکہ تالیوں کی گونج میں مائیک کی طرف بڑھیں اور مسکرا کر، پھر منہ کو برا سا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوئیں:

کتنے ارمانوں کو لے کر میں گیا تھا تیرے پاس
پر لُٹا کے آرزو کو سوگوار آ ہی گیا

تمام اشعار بے حد پسند کئے گئے اور بار بار سنے گئے۔ آخر میں خراجِ تحسین کا بارِ گراں لے کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھیں تو امۃ النور نے دھیمے انداز سے غزل چھیڑ دی۔

نسیم افضل کے بعد نعیمہ درد کی باری تھی۔ اُن کے لطیف و دلکش ترنّم اور سوز سے تمام محفل پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور اس وقت پتا چلا جب وہ غزل کہہ کر واپس جا چکی تھیں مگر ہر زبان پر مندرجہ ذیل اشعار رواں تھے:

دیکھا ہمیں جو جانبِ ساحل رواں دواں
طوفاں کی موج موج بلاخیز ہو گئی
لو آج اُن کے دل میں بھی پیدا ہوا ہے درد
لو آج اُن کی آنکھ بھی لبریز ہو گئی

سامعین کا اشتیاق لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ نیلوفر تشریف لائیں تو مخصوص ترنم میں اشعار سنائے:

دیکھ کر اے دوست یہ تیری وفا کی شدّتیں
میری افسردہ طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

امۃ الوحید، حفیظہ صادقہ اور امۃ الشکور کی داد طلب غزلوں کے بعد مقابلہ کا مشاعرہ ختم ہو گیا۔ اب سامعین کو اپنا کلام پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔

سب سے پہلے میرِ مشاعرہ نے اپنی غیر طرحی غزل مترنّم آواز اور مخصوص لہجہ کے ساتھ چھیڑی۔ اشعار نہایت بلند پایہ اور دلکش تھے۔ ہر ہر شعر نے متاعِ تحسین حاصل کی:

میکدے کا میکدہ ویران ہو کے رہ گیا
ساقیِ افسردہ باقی ہے یا پیمانوں کی راکھ
سوچتا ہوں مجھ سے اب دنیا نہ یہ بھی چھین لے
میں کہاں رکھوں چھپا کے اپنے ارمانوں کی راکھ

مس مبارکہ انجم نے ترنّم سے اپنی غزل پیش کی جو بہت پسند کی گئی:

حسرت یہ تھی کہ اس کی گلی میں رہے یہ خاک

ہم خاک ہوگئے تو ہوا تیز ہوگئی
انجم یہ آرزو کی کلی بھی عجیب ہے
ڈھلنے لگا شباب تو نوخیز ہوگئی

اب امۃ المالک آئیں اور اپنی مزاحیہ نظم سنائی جو بے حد دلچسپ تھی۔ لیجئے آپ بھی سنئے ایک شعر اور محظوظ ہوئیے:

ہاں معجزہ یہ ان کی کریموں کا دیکھئے
اس دور میں تو لیلیٰ بھی انگریز ہوگئی

صالحہ بیگم نے اپنی نظم نہایت دردناک انداز سے پڑھی جس نے ہر دل کو بے حد متاثر کیا۔ اس نظم میں انہوں نے اپنی نوعمر بیٹی کی وفات کا ذکر کیا تھا جو دسویں میں زیرِ تعلیم تھی......

آخر میں بیگم صاحبہ صاحبزادہ مرزا منصور احمد نے انعامات تقسیم کئے۔ تقریباً بارہ بجے رات محفلِ مشاعرہ نہایت کامیابی سے بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوئی۔"

النصرت میں حضرت مسیح موعود، حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی اور حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم کا کلام تو باقاعدگی سے شائع ہوتا ہی رہا ہے ایک بار صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی حرمِ اوّل کی غزل بھی شائع ہوئی۔ موصوفہ کے صاحبزادے، مرزا فرید احمد کے بیان کے مطابق بیگم صاحبہ ایک اچھی شاعرہ تھیں مگر اپنا کلام چھپوانے سے بالعموم احتراز کرتیں۔ اس پس منظر میں ان کی اس غزل کو بطور تبرک شاملِ کتاب کیا جارہا ہے:

مری آرزو کا حاصل، مری زِیست کا سہارا
وہ جو ایک عہدِ رنگیں ترے ساتھ ہے گزارا
بے مہر ہے یہ دنیا، تخریب جن کا شیوہ
یہ دو دلوں کا ملنا، کرتی نہیں گوارا
وہ جو خود ہی بے نوا ہیں، وہ جو خود شکستہ پا ہیں
ترے ذوقِ جستجو کو بھلا دیں گے کیا سہارا
طوفاں ہزار بپھریں، کشتی کو ڈر نہیں ہے
کیوں کہ خدا ہمارا ہے ناخدا ہمارا
اک آس سی بندھی ہے، امید سوچتی ہے
اس زندگی میں شاید وہ آملیں دوبارہ

اس مجلّے کے بعض شماروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کالج کی کوئی لیکچرر کسی وجہ سے کالج چھوڑ کر جاتی تو اس کے اعزاز میں باقاعدہ الوداعی تقریب منعقد کی جاتی جس میں موصوفہ کی خدمات کو سراہا جاتا اور طالبات کی طرف سے اس کے لیے محبت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا۔ ایسی ہی ایک نظم "اکنامکس کی لیکچرر" کی

الوداعی پارٹی کے موقع پر بارہویں جماعت کی طرف سے کہی گئی۔ افسوس! یہاں نہ تو شاعرہ کا نام دیا گیا ہے نہ اکنامکس کی لیکچرر کا نام مذکور ہے تاہم نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

سُونی رہے گی بزمِ مسرت ترے بغیر
پھیکی رہے گی محفلِ اُلفت ترے بغیر
تجھ کو جو انجمن میں نہ پائیں گے ہم تو پھر
کس درجہ ہوگی ہم کو اذیت ترے بغیر
گلہائے رنگارنگ سے مہکے گا گو چمن
پھر بھی کہاں وہ لطف، وہ نگہت ترے بغیر
دل کو تھا تجھ سے اُنس اے محبوبِ برگ و بار
مغموم و سوگوار ہے فطرت ترے بغیر
کلیاں اداس، پھول ہیں گلشن میں دلفگار
کانٹوں بھرا ہے دامنِ الفت ترے بغیر
اے جانے والی چھوڑ کر بس اتنا جان لے
روتی رہے گی چشمِ محبت ترے بغیر

النصرت کے ایک شمارے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالج ہال میں ایک گھڑیال نصب تھا جو لمبا عرصہ خراب رہا لیکن پھر انتظامیہ کی توجہ سے درست ہوگیا۔ یہ گھڑیال لیکچرز کے اوقات کے نظم وضبط میں بہت ممد ثابت ہوتا تھا۔ امۃ السلام نامی ایک طالبہ نے "دی کلاک اِن مائی ہال" کے زیرِ عنوان اس کلاک کے بارے میں یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"It was my first day in College. I was shy, rather puzzled or I should say shy of going to College for I was afraid of second year girls lest they should befool me, but I had to. I was afraid but longing to enter the class room. My heart beat loudly. I looked towards my left and my right and made my acquaintance with two girls who belonged to the place from where I came and timidly entered the hall, a big white-washed room the walls of which were decorated with beautiful pictures of great men and golden mottoes. I heard the melancholy sound of 'chick', 'chick' or rather I imagined some sound. Oh, what is it?" thought I and with frightened eyes searched hither and thither and caught sight of a beautiful, plump thing with smooth, fair complexion and extended hands as if to embrace every new comer. It wore a pure white dress with red borders.

I thought that these hands would move to shake hands with me, but they were motionless. I put my hand on its heart to feel the rythm of life in it. It was sinking. Oh! it was a patient, a withering soul with hardly any

life in it.

It was nine o' clock when the first bell went and we entered the hall and it was still nine o' clock when the last bell rang. So I realized either it was dead or fell into a fit of unconsciousness.

I asked myself why this useless thing was fixed on the wall. For several minutes I revolved the question in my mind. Hundreds of ideas were suggested and rejected. It might have been fixed to give an idea that our college had such a beautiful clock, or it might be artificial and put there only to lend colour to the beauty of hall or it might be there just to give psychological influence that it was morning always, therefore, minds of the students must always be fresh and ready to grasp whatever was taught to them, but none seemed valid.

By degrees, our eyes grew accustomed to see the rueful appearance of this clock daily. Whenever our professors scolded us we found an ironic smile on its lips. The hall was the centre of all activities. Meetings and debates were held here every day. When these functions were held we found him staring, why these people were disturbing him? The slow revolving wheels of time passed on, young bloosoms changed into beautiful flowers and withered but the hands of our clock did not move. To speak the truth it had no chances as if it was immune from the effect of weather and time, but its waist bent a little bit more and it could not stand erect. Anyhow, it was a part of life.

One day, when I glanced at the wall I was taken aback because our clock was not at it's real place. All the things of our hall wore a sad expression. The chairs were weeping, the tables were sobbing, even the wall was unable to hide it's tears. One of our lectureres was delivering her lecture and when the tears fell upon her she was frightened, but she could not find out that a poor soul was sad on the disappearance of her friend and thought that it was dripping of the rain drops.

A few days passed and when one day I stepped into the hall I heard a delicious voice singing gaily.

O Love! O Love, O gateway of Delight!
Thou porch of peace, thou pageant of the Prime
Of all God's creatures.

I was amazed as to who was singing and I came to know that it was a wall which was singing and when I glanced at the wall the clock was at its usual place and was smiling. What a playful thing it was, that played hide and seek with us!

Now our joy knew no bounds. We could watch the clock whenever we got bored.

Now it became more aged, all it's hair turned white and it's legs

began to stagger but I wonder it goes on untiringly and without a pause as if it will live for ever."

ایک مرحلے پر کالج بلڈنگ کے ناکافی ہوجانے کی وجہ سے کالج کی بعض کلاسز ٹینٹ کے نیچے بھی ہوتی رہیں۔ ''تاریخِ لجنہ اماء اللہ'' کے مطابق ''۱۹۶۲ء میں ایف اے کلاسز کو ڈگری کلاسز سے علیحدہ کردیا گیا۔ اس سلسلہ میں پچاس ہزار روپیہ کی رقم گورنمنٹ مغربی پاکستان سے موصول ہوئی چنانچہ یہ رقم نصرت گرلز ہائی سکول کی عمارت پر خرچ کر دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں ہائر سیکنڈری سکول بند کر دیا گیا اور ایف اے کلاسز کو دوبارہ جامعہ نصرت سے ملحق کر دیا گیا چنانچہ یہ تبدیلی اس عمارت پر اثر انداز ہوئی جو کہ پہلے ہی ڈگری کلاسز کے لیے ناکافی تھی اس لیے ثانوی جماعتوں کا بھی اس مختصر سی عمارت میں سماجانا ناممکن تھا چنانچہ ان کو وقتی طور پر نصرت گرلز ہائی سکول کی عمارت میں ہی رکھا گیا۔ اس کے بعد چھ ماہ تک جامعہ نصرت میں خیموں میں وہ کلاسز جاری رہیں۔''

ان خوبصورت ایام کا تذکرہ اس طالبہ کے قلم سے موجود ہے جو اَب مسز فائزہ نُوری کے نام سے معروف ہیں اور آسٹریلیا میں مقیم ہیں۔ ان کا مضمون جو ''سٹڈی اِنگ انڈر دی ٹینٹ'' کے عنوان سے النصرت کے کم وبیش تین صفحات پر محیط ہے خاصے کی چیز ہے۔ مجھے یقین ہے یہ مضمون پڑھ کر اس زمانے کی طالبات کو وہ سارا منظر یاد آجائے گا۔

النصرت کے باقی شمارے بھی جامعہ نصرت اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں بھرے پڑے ہیں۔ مینابازار اس کالج کا ایک سالانہ اِیونٹ تھا جس میں طالبات خود کھانے پینے کے سٹال لگاتیں اور ربوہ کی خواتین کو اس میں شمولیت کی دعوتِ عام ہوتی۔ اس دن کا بالعموم بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جاتا کیونکہ یہ گہما گہمی اور رونق مدتوں یاد رہتی تھی۔ میری بات کا یقین نہ آئے تو موصوفہ ہی کا وہ انگریزی مضمون پڑھ لیں جو آپ کو ''اَوَر اینیول مینابازار'' کے عنوان سے اسی میگزین کے صفحات پر مل جائے گا۔

اس عظیم الشان ادارے میں تعلیم کا حصول طالبات کے لیے ہمیشہ باعثِ صد افتخار رہا ہے اور وہ کالج چھوڑنے کے بعد یہاں پر گزرے ہوئے وقت کو کبھی بھلا نہیں پائیں۔ کالج کی ایک سابق طالبہ کی اس نظم میں آپ یادوں کی اس کسک کو واضح طور پر محسوس کرسکتی ہیں:

آج بھی مجھ کو وہ کالج کا زمانہ یاد ہے
اُن کی شفقت یاد ہے اپنا ستانا یاد ہے
آئے دن جرمانے کھا کر بھول جانا یاد ہے
ہر بہانہ یاد ہے، ہر اک فسانہ یاد ہے
اے ہمارے جامعہ! رنگیں بہاروں کے چمن
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟

آج بھی نظروں میں میرے وہ نصاب آیا ہوا
مولوی صاحب کو غصے سے عتاب آیا ہوا
امتحاں سر پر تمہارے لڑکیو! آیا ہوا
بے نیاز ہر بات سے ان پر شباب آیا ہوا
اے ہمارے جامعہ! عرفان و حکمت کے وطن
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟

ایک کیکر کا درخت اور چند گملے یاد ہیں
تیری وسعت میں لڑھکتے چند لوٹے یاد ہیں
ہر طرف صحرا ہی صحرا، چند ٹیلے یاد ہیں
ڈی کے سینے پر اُگے دوچار بُوٹے یاد ہیں
اے ہمارے جامعہ! گہوارۂ علم و فن!
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟

اب بھی آتی ہیں ہوائیں جھومتی گاتی ہوئی
چاندنی راتوں میں ہر سُو نُور برساتی ہوئی
لڑکیاں کالج میں بکھری چارسُو گاتی ہوئیں
جھڑکیاں کھا کر بھی ہنستی اور اٹھلاتی ہوئیں
اے ہمارے جامعہ! ماضی کی یادوں کے وطن
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟
تیری شفقت آج بھی اپنے دلوں میں ہے نہاں
تیری سِطوت آج بھی اپنے دلوں پر حکمراں
تیری عظمت کے ترانے آج بھی رطبُ اللّساں
"تُو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں"
اے ہمارے جامعہ! روشن ستاروں کے وطن
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟

ہم کبھی مائی حمیدہ کو بھلا سکتے نہیں

نام اس کا لوحِ دل سے ہم مٹا سکتے نہیں
یاد "بابےؔ" کی کبھی دل سے ہٹا سکتے نہیں
گزری راہوں سے کبھی دامن بچا سکتے نہیں
اے ہمارے جامعہ! خوش رنگ پھولوں کے چمن
یاد آتے ہیں کبھی تجھ کو بھی یارانِ کہن؟

جامعہ نصرت جسے اس کے بانی ایک مثالی درسگاہ کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہے چنانچہ یہاں کی فارغ التحصیل طالبات نہ صرف پڑھائی کے میدان میں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی کامیابیوں اور کامرانیوں کے جھنڈے گاڑتی رہیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں جامعہ نصرت نے اپنے نام کی دھاک نہ بٹھائی ہو۔ ڈیبیٹنگ میں اس کالج کی طالبات بیرونی کالجز سے ٹرافیاں لے کر آتیں، کھیلوں کے میدان میں اس کالج کا نام روشن کرتیں اور پڑھائی میں یونیورسٹی اور بورڈ کی سطح پر مختلف پوزیشنز حاصل کرتیں تاہم افسوس کہ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ایک فیصلے کے تحت اسے قومیا لیا گیا جس کے بعد اس پر زوال کا ایک لامتناہی دَور شروع ہوا۔ قومیائے جانے سے پہلے جامعہ نصرت کا مقام دوسروں کی نظر میں کیا تھا، ذیل کی نظم سے عیاں ہوتا ہے جو عبدالماجد انور نے کہی تھی اور النصرت کے کسی شمارے میں چھپ چکی ہے:

جامعہ نصرت تری تعریف میں رطبُ اللّساں
کیوں نہ ہوں اس پاک مٹی کے حقیقی قدرداں
جامعہ نصرت کے سالانہ نتائج شاندار
جامعہ تیرے گلستاں پر رہے دائم بہار
پرچمِ علم و ہنر کو تو نے رکھا ہے بلند
تو نے ڈالی آسمانوں پر ترقی کی کمند
تیری پیہم کوششوں نے آج بازی جیت لی
ہے نگاہ تجھ پر یقیناً ذُوالمنن کے فضل کی
تیری ہیں نگرانِ اعلیٰ حضرتِ اُمِ متیں
کیوں نہ ہو خود تجھ کو اپنی کامیابی کا یقیں
حضرت محمود شاہ کی زوج تیری منتظم
اس لیے ہر طالبہ ہے تیری اک دریائے علم
جامعہ کے لیکچراروں کی توجہ کا کمال
بن گیا ہے دوسروں کے واسطے اعلیٰ مثال
اے مقدّس سرزمیں کی بیٹیو! بڑھتی چلو

علم کی شوقین بن کے رات دن پڑھتی چلو
جستجوئے علم میں بازی لگا دو جان کی
دھاک دنیا پر بٹھا دو ارضِ پاکستان کی
خون کے قطروں میں پنہاں ہے بہارِ زندگی
آنسوؤں سے پھوٹتی ہے آبشارِ زندگی

جامعہ نصرت کا ذکر تمام ہوا۔ اب ہم جماعت کے ایک اور اہم تعلیمی ادارے، تعلیم الاسلام کالج کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی بنیاد حضرت مسیح موعود کی حیاتِ مبارکہ میں آپ ہی کے منشا کے مطابق رکھی گئی تھی تاہم بعض وجوہ کی بنا پر اسے جلد ہی بند کرنا پڑا۔ ۱۹۴۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ہاتھوں قادیان میں اس کالج کا احیا ہوا مگر ہجرت کی وجہ سے جماعت کا یہ قیمتی اثاثہ بھارت میں رہ گیا اور انتہائی نامساعد حالات میں اسے لاہور میں نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ چند سال بعد یہ کالج ربوہ منتقل کر دیا گیا لیکن ۱۹۷۲ء میں نیشنلائزیشن کے بعد یہ ادارہ جماعت کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

یہ کالج صرف احمدی نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مختص نہ تھا اور غیر از جماعت طلبہ بھی اس میں بصد شوق داخل ہو سکتے تھے تاہم یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ میں مجموعی طور پر زیادہ تعداد احمدی طلبہ کی رہی۔ ان میں سے کچھ طلبہ کو اللہ تعالیٰ نے طویل خدمتِ دین کی توفیق بخشی اور بعض کو عملی زندگی کے دیگر شعبوں میں نمایاں کامیابیوں سے نوازا۔ اگلے باب میں ایسے ہی بعض طالب علموں کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی تفصیل بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا، فی الحال دیکھئے کہ میں نے یہ انتخاب کس بنیاد پر کیا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج اور نصرت جہاں اکیڈمی انٹر کالج

خزاں کے خوف سے ہو کر نڈر تم آگے بڑھو: تمہارا سلسلہ مربوط ہے بہار کے ساتھ

میں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۶۱ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تھا اور گریجوایشن کے بعد ایم اے کرنے کے لیے لاہور چلا گیا۔ چار سال کا یہ عرصہ جو اس کالج میں گزرا میری زندگی کا سنہرا دور تھا۔ نہ صرف تعلیم بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کالج کو پنجاب بھر کے کالجز میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس کالج کے طلبہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں پوزیشن حاصل کر رہے تھے، رونگ میں اسے پنجاب بھر کے کالجز پر برتری حاصل تھی اور باسکٹ بال میں اس کالج کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ڈیبیٹنگ میں بھی تعلیم الاسلام کالج کی دھاک چہار سُو بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے مقرر جس بین الکلیاتی مباحثے میں حصہ لیتے، کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کر کے ہی لوٹتے۔ آہستہ آہستہ پتا چلا کہ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ روزِ اول سے ہی تعلیم الاسلام کالج کو یہ شہرت حاصل رہی ہے اور یہ کہ اس کے بہت سے فارغ التحصیل طلبہ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں قابلِ تحسین مقام حاصل کیا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر ایسے بہت سے طلبہ کے نام مذکور ہیں جنہوں نے عملی زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کے ذریعہ اس کالج کا نام روشن کیا تاہم اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ احمدی طلبہ نے اپنی دنیاوی کامیابیوں کے باوجود احمدیت کے ساتھ اپنا ناتہ برقرار رکھا اور الحمد للہ احمدی معاشرہ میں آج بھی ان کا نام عزت سے لیا جا رہا ہے۔ ویب سائٹ پر آج مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۱۷ء کو جن معروف طلبہ کے نام موجود ہیں ان میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے اسمِ گرامی کے علاوہ مندرجہ ذیل سابق طلبہ کا ذکر کیا گیا ہے:

اُن سابق طلبہ میں سے جنہیں واقفینِ زندگی کے طور پر لمبا عرصہ جماعت کے مرکزی دفاتر میں خدمت کا موقع ملا: مرزا خورشید احمد، چوہدری حمید اللہ، بشیر احمد رفیق، مرزا غلام احمد، مبارک مصلح الدین، سمیع اللہ سیال، منصور احمد خاں، مرزا انس احمد، محمد اسلم منگلا، ملک مسعود احمد خالد، محمود احمد کاہلوں، محمد قاسم خان اور سیّد طاہر احمد۔

اُن سابقہ طلبہ میں سے جو مرکزی یا صوبائی اسمبلیوں کے ممبر رہے یا جنہیں سرکاری ملازم کے طور پر حکومت پاکستان اور اس کی کارپوریشنوں یا بعض صوبائی حکومتوں میں خدمت کا موقع ملا: کنور ادریس، محمد اسلام بھٹی، میاں احسان الحق، بشیر احمد المعروف حاجی فیض اسلم، سعید رحمانی، آفتاب احمد، محمد داؤد طاہر، راجہ غالب احمد، طاہر عارف، محمد رشید شریف اور سیّد الیاس بشیر۔

اُن سابق طلبہ میں سے جنہیں افواجِ پاکستان میں خدمت کا موقع ملا: وِنگ کمانڈر رشید قیصرانی،

کیپٹن شمیم احمد خالد، کرنل راجہ محمد اسلم، کرنل سلیم احمد ناصر، کرنل سعید احمد، شاہد احمد کاہلوں، شاہد احمد سعدی اور انصر احمد۔

اُن سابق طلبہ میں سے جنہیں بیرونِ پاکستان بطور مربّی کام کرنے کا موقع ملا: فضل الٰہی انوری، مسعود احمد جہلمی، عطاء المجیب راشد، منصور احمد قمر، عطاء الکریم اور محمد انور قریشی۔

اُن سابق طلبہ میں سے جنہوں نے مختلف جماعت ہائے احمدیہ کی امارت کی توفیق پائی: حمید نصر اللہ، مودود احمد خان، لال خان، ڈاکٹر محمد شفیق سہگل، رانا محمد خان، خواجہ عبدالباسط اور زرتشت منیر احمد۔

اُن سابق طلبہ میں سے جنہوں نے بعد میں وکالت میں نام پیدا کیا: عبدالسمیع نون، ادریس نصر اللہ، مبشر لطیف، مختار احمد، وحید سلیم، سی اے رحمٰن، بشیر احمد، بشارت احمد اور عابد علی بُٹر۔

اُن سابق طلبہ میں سے جو بعد میں انجینئر بنے: عطاء الرحمٰن، لال خان، کریم احمد، مجیب اصغر، سلطان احمد اور محمد احمد خان۔

اُن سابق طلبہ میں سے جنہوں نے اپنے لیے طب کا شعبہ پسند کیا: محمد ظفر قریشی، حامد احمد خان، خلیل احمد، مرزا مبشر احمد، ظہیر احمد اور لئیق احمد۔

جماعت کے دیگر خدام میں سے وسیم احمد، صدر انصار اللہ یو کے؛ ہدایت اللہ ہادی، ایڈیٹر احمدیہ گزٹ کینیڈا؛ زکریا ورک؛ صفی اللہ؛ مجیب اللہ؛ نذیر احمد؛ بشارت احمد جمیل، جلال الدین، کلیم اللہ خان، فلاح الدین، سعید مجید، صفی اللہ چوہدری، آصف علی پرویز، محمد علی تاوٴنی؛ مبارک احمد عابد؛ مشہود الحق؛ مقصود الحق؛ منیر الحق؛ نصیر الحق اور محمد علی (یو کے)۔

ان سابق طلبہ میں سے جنہوں نے تعلیم و تدریس یا ریسرچ کے شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی: ڈاکٹر منیر رشید، ڈاکٹر ظفر وینس، ڈاکٹر اعجاز احمد، ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا، ڈاکٹر منور انیس، ڈاکٹر نعیم احمد طاہر، ڈاکٹر مظفر احمد، ڈاکٹر مرزا محی الدین اور ڈاکٹر ظفر اللہ۔

ویب سائٹ پر اس فہرست کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا اور نہ یہ مکمل کہلائی جا سکتی ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ تعلیم الاسلام کالج نے یقیناً بہت سے ایسے ہونہار طلبہ پیدا کئے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑے تاہم اس سے پہلے کہ ہم ان ہونہار طلبہ کا ذکرِ خیر شروع کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بات کا آغاز اُن اولڈ سٹوڈنٹس کے ذکر سے کیا جائے جنہوں نے احمدیت کے مقدس نام پر یا دفاعِ وطن کے دوران یا اپنے فرائضِ منصبی کی ادائی کے دوران اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخ میں اپنا نام محفوظ کرالیا۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرمائے۔ آج وہ ہم میں موجود نہیں ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگوں نے انہیں دیکھا بھی نہیں ہوگا مگر وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ان میں سے پہلے کچھ ذکر محمد منیر خان شامی کا جو ڈاکٹر حبیب اللہ خان ابوحنیفی کے منجھلے صاحبزادے اور ڈاکٹر محمد شریف خان پروفیسر تعلیم الاسلام کالج حال مقیم امریکہ کے بڑے بھائی تھے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں تنزانیہ میں

پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی لیکن بعد میں قادیان منتقل ہو گئے۔ انہیں عربوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی تھی اور وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے تھے لہٰذا ملکِ شام سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود اپنے حلقہٴ احباب میں وہ ''شامی'' کی عرفیت سے پہچانے جانے لگے۔ وہ ایک خاموش طبع اور محنتی طالب علم تھے۔ مطالعہ کا بے حد شوق تھا اور انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ شروع سے ہی جماعت سے دلی وابستگی رکھتے تھے اور امامِ وقت کے ہر حکم پر لبیک کہنا اپنا فرضِ منصبی جانتے۔ انہوں نے زندگی وقف کر رکھی تھی۔

بتایا جاتا ہے کہ جماعت کی طرف سے انہیں سائنس کے کسی مضمون میں تخصیص حاصل کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا اور اسی حوالے سے انہوں نے تعلیم الاسلام کالج قادیان میں داخلہ بھی لیا تھا لیکن ابھی آغاز ہی تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور قادیان کی احمدی آبادی پاکستان منتقل ہونے پر مجبور ہو گئی۔

ان دنوں قادیان پر سکھوں کی یلغار جاری تھی اور سخت پریشانی کا عالم تھا۔ جماعت نے اپنے دفاع کے لیے خدام الاحمدیہ کی تنظیم کو متحرک کیا اور اس کے اراکین ایک نظام کے تحت مختلف مقامات پر ڈیوٹیاں دینے لگے۔ منیر شامی کی ڈیوٹی اپنے گھر واقع محلّہ دارالرحمت برمکان خان ارجمند خاں تھی۔ ان کے پاس ایک دونالی بندوق تھی جس کے بل بوتے پر وہ سکھوں کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ایک رات سکھوں نے موقع پا کر منیر شامی کے گھر میں گھس کر انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ جب صبح خدام کو ہوسٹل میں جمع ہونے کا حکم ملا تو منیر شامی کو وہاں نہ پا کر سب کو تشویش ہوئی۔ تحقیق پر انہیں اپنے گھر کے صحن میں خون میں لت پت پایا گیا۔ پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ۱۱ جون ۱۹۹۹ء کو اپنے خطبہٴ جمعہ میں موصوف کا تفصیلی ذکر فرمایا جس کا یہ حصہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ جب ان کے والد کو جو اُن دنوں تنزانیہ میں تھے اس اندوہناک واقعے کی خبر ملی تو انہوں نے جزع فزع کرنے کی بجائے اسے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام سمجھ کر قبول کر لیا چنانچہ ان کی ڈائری میں ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کی تاریخ میں یہ پُرخلوص عبارت درج ہے: ''آج قادیان میں عزیز محمد منیر خاں شامی نے (......) کی سعادت پائی۔ الحمدللہ رب العالمین۔''

تعلیم الاسلام کالج کے ایک سابق طالب علم جنہیں مفوّضہ فرائض کی ادائی کے دوران اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی توفیق ملی پائلٹ آفیسر اعزاز اللہ المعروف بجّی تھے جو بابو اکبر علی کے صاحبزادے اور اِنڈس ویلی کنسٹرکشن کمپنی والے کرنل عطاءُ اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ وہی اعزاز اللہ ہیں جن کا ذکر چوہدری محمد علی نے ایم ٹی اے پر اپنے ایک پروگرام میں ٹی آئی کالج کے ایک طالب علم کے طور پر کیا ہے۔

میں اپنے زمانہٴ طالب علمی میں نمازِ عصر کے بعد اپنے بعض دیگر ہم جماعتوں کی طرح یا تو کوٹ امیر شاہ کی طرف نکل جاتا اور کسی درخت کے نیچے یا پھر ربوہ کے قبرستانِ عام کے کسی کونے میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا۔ میں بعض قبروں پر بالالتزام رکتا جن میں سے ایک قبر ان ہی اعزاز اللہ کی تھی۔ میں ان کی قبر پر لگا کتبہ پڑھ کر دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا تھا۔ میں نے یہ کتبہ اتنی بار پڑھا کہ مجھے اس پر کندہ بعض مصرعے آج تک زبانی یاد ہیں۔

یہ قبر آج بھی موجود اور اس کا کتبہ ابھی تک سلامت ہے۔

هُوَ الْبَاقِی

....

....

پائلٹ آفیسر محمد اعزاز اللہ ابن بابو اکبر علی صاحب مرحوم

رائل پاکستان ایئر فورس

تاریخ پیدائش: ۲ جولائی ۱۹۳۰ء سانحہ وفات: ۲۵ مئی ۱۹۵۰ء

کہا یہ کس نے کہ دلچسپ ہے جہانِ خراب یہاں قیام ہے انسان کا مثالِ سراب
ہوائے دہر نہ راس آئی غنچۂ نو کو ہوا غروب بہت جلد صورتِ مہتاب
ہوائی حادثہ گزرا قریب پیشاور اجل نے لُوٹ لیا بڑھ کے زندگی کا شباب
جوان موت بڑی دردناک ہوتی ہے یہ واقعہ ہے دلِ کائنات ہے بیتاب
"سرِ بہشت" سے تاریخ یہ کہی ہے مجاز
"ریاضِ خلد کا اعزاز ہے حسین گلاب"
۴۸ ء ۱۹
۲
۵۰ ب ء ۱۹

یہ کتاب لکھتے وقت مجھے ان کے واقعۂ شہادت کے بارے میں کوئی تفصیل میسّر نہ تھی چنانچہ میں نے شہید کے ایک بھتیجے، میجر شاہد عطاء اللہ مقیم گلبرگ، لاہور سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا: ہاں! وہ میرے چچا تھے لیکن یہ واقعہ پینسٹھ سال پرانا ہے۔ اب مجھے اس کی تفصیلات یاد نہیں ہیں تاہم آپ نے یہ موضوع چھیڑ کر اچھا کیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس بارے میں معلومات جمع کر کے آپ کو مہیا کروں۔

انہوں نے مہربانی فرمائی اور جلد ہی پاکستان ایئر فورس سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد بتایا کہ شہید نے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو رائل پاکستان ایئر فورس میں کمیشن حاصل کیا تھا اور اپنی ملازمت کے پہلے ہی سال ۲۵ مئی ۱۹۵۰ء کو معمول کی ایک تربیتی پرواز کے دوران فیوری طیارہ گر جانے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ ایئر فورس کے پانچویں سکواڈرن سے وابستہ تھے، ان کے جہاز کا نمبر ایل ۹۱۴ اور ان کا پی اے ایف نمبر پاک ۹۹۴ تھا۔

میجر شاہد عطاء اللہ نے مزید وضاحت کی کہ اس حادثے کے وقت ان کی اپنی عمر تقریباً دس سال تھی۔ ایک روز انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کو آبدیدہ دیکھا تو پریشان ہوئے۔ تب ان کی والدہ نے بتایا کہ ان کے چچا کا جہاز گر گیا ہے اور وہ اس حادثے میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔

اعزاز اللہ اس وقت غیر شادی شدہ تھے۔

الفضل ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء میں اس حادثے کی خبر جو شہید کی والدہ کی طرف سے ایک اعلان کی صورت میں تھی موجود ہے۔ موصوفہ "حادثۂ ارتحال" کے زیرِ عنوان لکھتی ہیں:

"میرا لڑکا عزیزم اعزاز اللہ پائلٹ آفیسر ۲۵ مئی کو صبح ہوائی حادثہ پیش آنے کی وجہ سے پشاور کے قریب شہید ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے امریکہ سے ایئر فورس کی ٹریننگ لے کر آیا تھا۔ نہایت ہونہار، سعید فطرت اور ہنس مکھ اور واقفِ زندگی تھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی اجازت سے ایئر فورس میں بھرتی ہوا تھا۔

۲۶ مئی بروز جمعہ اس کا جنازہ بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لایا گیا۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب و افرادِ خاندان حضرت مسیح موعود اور دیگر احباب جماعت از راہِ شفقت و ہمدردی ہوائی اڈے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ لاہور میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد لاش ربوہ لے گئے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور عصر کے وقت سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بزرگانِ سلسلہ و احبابِ جماعت کی خدمت میں التماس ہے کہ دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اپنے قرب میں جگہ دے اور ہم سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اللّٰھم آمین

اہلیہ بابو اکبر علی صاحب مرحوم، نلوہ بلڈنگ، گوجرانوالہ"

محمد اعزاز اللہ کی شہادت پر تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ان کے ایک ہم جماعت، صلاح الدین ناصر خلف خان بہادر چوہدری ابوالہاشم خان، ساکن میرپور خاص نے الفضل (یکم جون ۱۹۵۰ء) میں "آہ! اعزاز اللہ" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا جس میں مرحوم کی بعض خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون قارئین کے دل میں مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی تحریک پیدا کرنے کی غرض سے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"گو یہ سنتِ الٰہی ہے کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ یعنی ہر انسان نے ایک دن موت کا سامنا کرنا ہے مگر بعض اموات عزیز و اقارب کے لیے انتہائی تکلیف و غم کا موجب ہوتی ہیں چنانچہ برادرم اعزاز اللہ...... محلہ دارالعلوم قادیان کی اچانک وفات بھی ان ہی المناک و اندوہناک حادثات میں ہے۔ آپ پاکستان ایئر فورس میں بطور ہواباز ملازم تھے۔ ایک ہوائی حادثے میں وفات پا گئے...... انا للہ وانا الیہ راجعون۔

...... مجھے اپنے سکول کا طویل زمانہ...... ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ان کو خوش و خرم پایا۔ کبھی بھی طالب علمی کے زمانے میں ان کو افسردہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ہر ایک سے بہت ملنساری سے پیش آتے بلکہ بہت ہی خوش طبع واقع ہوئے تھے۔ بہت چست طبیعت رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی رضاکارانہ کام کی تحریک ہوتی مرحوم ہمیشہ اس میں پیش پیش ہوتے تھے۔ قابلِ رشک صحت اور خوش رُو نوجوان کا

اس طرح اچانک اوائل شباب میں رخصت ہونا بہت ہی تکلیف دہ امر ہے۔ مرحوم کی عمر مشکل سے بائیس سال کی ہوگی۔...... پاکستان پہنچ کر ایئر فورس میں بھرتی ہوئے۔ ٹریننگ کے لیے امریکہ اور انگلستان بھی جانے کا موقع ملا۔ الفضل کی ایک گذشتہ اشاعت میں ان کے امریکہ کے مشن کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھی ذکر آچکا ہے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر ان کے بچپن کا ایک ایک واقعہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان کا اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے والد صاحب کے ہمراہ بیت نور کی نمازوں میں شامل ہونا، کھیل کے میدان میں پیش پیش ہونا، تیراکی میں اول آنا اور بیتِ مبارک کی مجلسِ علم و عرفان میں آگے بیٹھنے کے لیے نماز عصر سے پہلے ہی بیتُ الذّکر میں آ بیٹھنا، یہ سب واقعات ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں جن سے ان کی نیکی، ہونہاری اور سعیدُ الفطرتی پر روشنی پڑتی ہے۔ ہر ایک منعقد ہونے والی مجلس میں آپ کا موجود ہونا، صرف موجود ہی نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے لیے پیش پیش ہونا، بچپن میں مجلس مشاورت میں پانی پلانے کا فریضہ، جلسہ سالانہ کی ڈیوٹیاں آپ کے جذباتِ خدمتِ خلق کی ترجمانی کرتی ہیں۔

جب ہمارے سکول کا تالاب بنا تو آپ بھی ان چند روح رواں نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے تیراکی کے مقابلہ میں حصہ لے کر کئی مرتبہ اپنے سکول کے نام کو چار چاند لگائے۔‘‘

تعلیم الاسلام کالج کے ایک اولڈ سٹوڈنٹ جنہیں ۱۹۵۳ء میں لاہور میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی توفیق ملی جمال احمد تھے جو مستری نذر محمد آف بھاٹی گیٹ کے صاحبزادے، ۱۷ سال کے ایک خوبصورت نوجوان اور تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں ایف اے کے طالب علم تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ مجلس خدام الاحمدیہ کے ایک مستعد رکن، سکاؤٹ اور کالج کی ہاکی اور فٹ بال ٹیم کے ممبر تھے اور جب حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی لاہور تشریف لے جاتے تو وہ ڈیوٹی کے لیے ہمہ وقت حاضر رہتے۔ وہ اپنی خوش اخلاقی اور شرافت کے باعث دوستوں اور دشمنوں میں برابر چاہے جاتے تھے۔ جب فتنہ پردازوں کی احمدیوں کے خلاف بھڑکائی ہوئی آگ پاکستان بھر میں پھیل گئی تو شر پسندوں نے مستری نذر محمد کا لکڑی کا آرا جو چوک یادگار کے قریب ٹکسالی گیٹ کے سامنے تھا نذرِ آتش کر دیا۔ نذر محمد موصوف اپنے آرے کا پتا کرنے کے لیے جاتے وقت جمال کو کہہ گئے کہ وہ گھر والوں کی خیریت معلوم کر آئیں جنہیں حفاظت کے خیال سے بعض رشتے داروں کے ہاں رنگ محل منتقل کر دیا گیا تھا۔

مارچ ۱۹۵۳ء کی چھ تاریخ اور جمعہ کا دن تھا۔ وہ اپنے والدِ بزرگوار کے حکم کی تعمیل میں اہلِ خانہ سے ملاقات کے لیے سائیکل پر رنگ محل جا رہے تھے۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ان کے کچھ محلّہ دار جو انہیں اچھی طرح پہچانتے تھے ایک جلوس کی شکل میں بپھرے کھڑے تھے۔ وہ پاس سے گزرے تو انہوں نے پتھر برسانا شروع کر دیئے۔ وہ رک گئے تو ہجوم گالیاں دیتا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا: مرزائی ہے، اسے مارو۔ ایک شخص جو انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا وہ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: جمال! تم کہہ دو کہ تم احمدی نہیں ہو تو میں تمہیں بچا لیتا ہوں۔ اگر تم علی الاعلان یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہتے تو میرے کان میں ہی کہہ دو، میں پھر بھی ہجوم کو سمجھا لوں گا۔ دشمن کو کیا پتا تھا کہ جمال نے کبھی جھوٹ نہیں بولا چنانچہ انہوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا کہ میں خدا تعالیٰ کے

فضل سے احمدی ہوں اور اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول سکتا، تم نے جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ ہجوم نے انہیں نیچے گرا کر چاقوؤں کے پے در پے وار سے قتل کر دیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے اس واقعے کا تفصیلی ذکر اپنے ایک خطبۂ جمعہ میں کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو افراد موصوف کے قتل میں پیش پیش تھے حد درجہ المناک انجام سے دوچار ہوئے چنانچہ آپ نے جمال احمد کے بھائی نصیرالدین بلال کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ اگرچہ پولیس نے تو ان کے قاتلوں کو چھوڑ دیا تھا مگر ان میں سے ایک پاگل ہو کر نہایت بری حالت میں مرا اور دوسرا اندھا ہو کر۔

اگرچہ جمال موصی نہ تھے تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی خاص ہدایت کے تحت بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر ان کے نام و ولدیت اور پتے کے علاوہ مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے:

’’مرحوم ۶ مارچ ۱۹۵۳ء جمعہ کے دن بعمر ۱۷ سال لاہور میں مخالفین کے ہاتھوں جامِ (......) نوش کر کے راہی ملکِ بقا ہو گیا۔ مرحوم ایف اے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ نیک اور مخلص لڑکا تھا۔ ۶ مارچ ۱۹۵۳ء لاہور میں وہ دن تھا جو تاریخِ احمدیت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مخالف علماء کے متواتر پے در پے مشتعل کرنے کے باعث عوام مسلمان یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جماعت احمدیہ کے تمام افراد کو مٹا کر دم لیں گے اور اس پودا کو (جو) خدا تعالیٰ نے لگایا تھا جو ترقی کر کے عظیم الشان درخت ہو چکا تھا اکھاڑنے کا تہیہ کر چکے تھے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہوں گے البتہ جن چند نفوس کو انہوں نے جامِ (......) پلایا ان میں یہ نیک بچہ بھی تھا جو فوت نہیں ہوا بلکہ قرآن کریم کے فرمان کے مطابق ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ اس دارِ فانی میں جو آیا آخر وہ یہاں سے رخصت ہوا مگر وہ موت جو (......) کی ہوئی وہ مولیٰ کریم کو پیاری اور ابدی حیات بخش ہوتی ہے۔ پس یقیناً عزیز کا خون احمدیت کی کھیتی کے لیے آبپاشی کا کام دے گا اور اس کے خون کا ہر قطرہ احمدیت کو ترقی دینے اور اس کی نشوونما کا موجب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اے خدا تو اس عزیز کی تُربت پر ابرِ رحمت برسا اور اس کے والدین اور بہن بھائیوں کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے۔ آمین‘‘

محمد منیر شامی، اعزاز اللہ جنجی اور جمال احمد کے ذکر کے بعد اب کچھ ذکر تعلیم الاسلام کالج، قادیان کے ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ، سلیم الدین احمد کا جو شیخ رفیع الدین احمد، سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے رائل پاکستان ایئر فورس میں بطور پائلٹ شمولیت اختیار کی تھی لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو ایک المناک ہوائی حادثے میں شہید ہو گئے۔ ان کی وفات پر شیخ عبدالحق کے قلم سے سات اکتوبر ۱۹۵۳ء کے الفضل میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی زندگی کے بعض حالات، رائل پاکستان ایئر فورس میں ان کی شمولیت کا پس منظر اور اس جانکاہ حادثے کی کچھ تفصیلات موجود ہیں۔ اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حادثے کے روز سلیم ایک جیٹ طیارے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ روزانہ کی مشق کے لیے پرواز کو گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد طیارے کو آگ لگ گئی جس کی وجہ سے اس کے سارے سوارانِ واحد میں جاں بحق ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کے پاس حاضر ہو گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سلیم الدین احمد نے ابتدائی تعلیم صوبہ سندھ میں حاصل کی جہاں ان کے والدِ بزرگوار اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ۱۹۳۷ء کے آخر میں ان کے والد نے محلہ دارالعلوم، قادیان میں اپنا مکان تعمیر کر لیا اور بچوں کو تعلیم کے لیے وہاں بھیج دیا۔ وہ چوتھی جماعت سے دسویں تک تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتے رہے جس کے بعد وہ تعلیم الاسلام کالج، قادیان میں ایف ایس سی میں داخل ہوگئے۔

فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں: ''عزیز واقعی اسمِ بامسمّٰی تھا۔ نیک سیرت، پاک خُو، خوش خلق، ملنسار، مہمان نواز اور پرہیزگاری میں ایک نمونہ تھا۔ قریباً ساری نمازیں بیت الذکر میں جا کر باجماعت ادا کیا کرتا تھا بالخصوص صبح کی نماز روزانہ بیت مبارک میں ادا کرنے کا عادی تھا اور وہاں سے فارغ ہوکر مقبرہ بہشتی جانا اور حضرت مسیح موعود اور حضرت خلیفۃ المسیح اول اور دیگر بزرگانِ سلسلہ اور اپنی دادی کے مزاروں پر دعائیں کرنا اور پھر گھر واپس آنا۔ قرآن شریف کی تلاوت بڑے ذوق وشوق سے کیا کرتا تھا۔ قرآن شریف سے اس کو بہت محبت تھی۔ کسی دوست کو تحفہ دینا ہوتا تو قرآن شریف ہی پیش کرتا......

اپنے ماں باپ کا فرماں بردار تھا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا ہر وقت خیال رکھتا تھا۔ بہن بھائیوں اور باقی رشتہ داروں سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا اور سب کی خوشی اور غم میں شریک ہونا عین فرض سمجھتا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اپنوں اور پرایوں میں ایک خاص عزت حاصل کر چکا تھا۔

سلسلے کے کاموں میں خاص طور پر دلچسپی لیتا تھا۔ مفوّضہ ڈیوٹی کو نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے فرضِ منصبی اور کارِ خیر سمجھ کر ادا کرتا۔ دینی کاموں میں اپنے دوستوں کو شامل کرنے کے لیے پوری کوشش کرتا۔ خدام کی میٹنگوں اور عملی کاموں میں سوائے اشد مجبوری کے کبھی غیر حاضر نہ ہوتا۔ ہر مجلسِ عرفان میں پہنچتا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتا اور مستفید ہوتا۔ فسادات کے موقع پر عزیز نے باقی دوستوں کے ساتھ پوری پوری مستعدی سے اہم خدمات انجام دیں۔ وہ نہایت بہادر تھا۔

ایف سی کالج میں عزیز کو فلائنگ کا شوق ہوا اور وہ ہوائی جہازوں کی معلومات کے حصول میں مصروف رہنے لگا۔ عزیز کی اس بڑھتی ہوئی رغبت اور شوق کو دیکھ کر اس کے والدین نے عزیز کو کہا کہ یہ لائن ہمیں پسند نہیں لیکن عزیز یہ کہہ کر ان کی تسلی کرتا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جو قوم ان خطرات کو دیکھتی ہے وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ ہم نے دین اور ملک اور قوم کی خدمت کرنی ہے۔ ہم کو ایسے خیال دل سے نکال دینے چاہئیں۔ کیا اگر میں ایئر فورس میں نہ جاؤں تو پھر میں نے مرنا نہیں؟ موت تو لازمی چیز ہے۔ وہ کسی کے روکنے سے تو رک نہیں سکتی۔ اس کا خطرہ ہر جگہ ہے۔ اسی شوق کے غلبہ میں عزیز فروری ۱۹۵۰ء میں تعلیم چھوڑ کر ایرو کلب کراچی میں داخل ہوگیا۔ فلائنگ شوق سے سیکھی اور آخری سال میں اپنی قابلیت کی وجہ سے آر پی اے ایف ریزرو فورس میں کیڈٹ چنا گیا اور ٹریننگ کے لیے رسالپور بھیجا گیا...... نہایت محنت اور شوق سے کام سیکھا اور آخری امتحان میں اعلیٰ نمبروں پر پاس ہوا اور دسمبر ۱۹۵۱ء کو کمیشن حاصل کیا۔ پھر ماڑی پور میں فائٹرز کورس کی ٹریننگ کے لیے پوسٹ ہوا اور...... تین ماہ میں ٹریننگ ختم کر لی۔ اعلیٰ نمبر لے کر پاس ہوا۔ خصوصاً فائٹنگ میں سب سے اچھا رہا اور

اعلیٰ درجہ کا پائلٹ شمار کیا گیا اور جیٹ سکواڈرن میں ٹریننگ کے لیے منتخب کیا گیا اور ڈرگ روڈ بھیجا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۵۲ء سے جیٹ طیارہ کو بہت اعلیٰ طریق پر چلاتا رہا اور ریگولر کمیشنڈ آفیسر ہوگیا۔ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء تک یہ جہاز خوب چلایا۔ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء بروز سوموار عزیز کو المناک حادثہ پیش آیا۔''

ان کی وفات پر شیخ مبارک احمد، جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ حلقہ شرقی، کراچی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل ۶ فروری ۱۹۵۴ء میں وہ خطوط نقل کیے ہیں جن میں سلیم کے افسران نے ان کی قابلیت کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''فلائٹ لیفٹیننٹ ایم زیڈ مسعود، کمانڈنگ آفیسر، نمبر ۱۱ سکواڈرن تحریر فرماتے ہیں کہ مرحوم ہمارے بہترین ہوابازوں میں سے تھے۔ ان کا ہمارے ساتھ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ رہنا ہمارے لیے سُود مند تھا۔ انہوں نے اپنے کام میں نظم وضبط اور جوانمردی میں بطور ایک افسر اور ایک ہواباز اعلیٰ شان قائم کی اور اپنے آپ کو قابل ہواباز ثابت کیا۔ گروپ کیپٹن ایم رب، کمانڈنگ آفیسر آر پی اے ایف سٹیشن، ڈرگ روڈ تحریر فرماتے ہیں کہ مرحوم ماہر پائلٹ تھے اور پاکستان کی ہوائی طاقت کو ان کا نقصان گراں گزر رہا ہے۔ وہ بہت ہوشیار اور مستقبل کے لیے شاندار ہواباز معلوم ہوتے تھے اور اپنے سکواڈرن کے ہردلعزیز آفیسر تھے۔ ایئر وائس مارشل ایل ڈبلیو کینن، کمانڈر انچیف آر پی اے ایف تحریر فرماتے ہیں کہ مرحوم ایک لائق اور مستقبل کے لیے شاندار ہواباز تھے۔ پاکستان کی ہوائی طاقت ان کے کام سے مسلسل فائدے کی امید رکھتی تھی۔ ان کی بے وقت موت سے بڑا نقصان ہوا ہے جس کی کمی پوری نہیں کی جا سکتی۔''

اعزاز اللہ اور سلیم الدین کے بعد پاکستان ایئر فورس کے فلائنگ آفیسر عبدالحمید غزنوی تعلیم الاسلام کالج کے تیسرے سابق طالب علم تھے جن کا طیارہ اپنے فرائض کی ادائی کے دوران چترال میں گر کر تباہ ہوگیا اور وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ حادثہ بارہ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ہوا۔ اس جہاز میں مہتر چترال، پرنس سیف الرحمٰن سوار تھے۔ وہ بھی لقمۂ اجل بن گئے۔ الفضل تیرہ اکتوبر ۱۹۵۴ء نے اس حادثے کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''پشاور بارہ اکتوبر: آج صبح ایک ہوائی حادثے میں مہتر چترال پرنس سیف الرحمٰن کا انتقال ہوگیا۔ وہ فضائی فوج کے ایک دو نشستوں والے ہوائی جہاز میں سوار تھے۔ پشاور میں دس دن قیام کرنے کے بعد آج واپس جاتے ہوئے ان کا جہاز چترال اور دِیر کے درمیان دس ہزار فٹ بلند درّہ لواری سے ٹکرا گیا۔ ہوائی جہاز چترال خاص سے پینتیس میل جنوب میں چترال جانے والے بڑے راستے پر گرا۔ حادثے میں فلائنگ آفیسر غزنوی بھی جو ہوائی جہاز چلا رہے تھے ہلاک ہوگئے۔ مہتر چترال کی عمر چونتیس سال تھی۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں چترال کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اسلامیہ کالج پشاور اور ملٹری اکیڈمی، کاکول میں تعلیم پائی تھی اور صوبہ سرحد میں ایڈمنسٹریشن کی تربیت حاصل کی تھی۔''

اس حادثے پر جماعت کے دو بزرگان نے اپنے اپنے مضامین میں عبدالحمید غزنوی کا ذکرِ خیر کیا۔ حضرت مرزا بشیر احمد نے اپنے مضمون مطبوعہ الفضل پندرہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ''دو دردناک حادثات اور ایسے حادثات کا حقیقی فلسفہ'' کے عنوان سے خان بہادر دلاور خان، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کے چار سالہ نواسے کی کوہ مری

میں اپنی کوٹھی کی ایک اونچی کھڑکی سے اچانک گر کر وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''میں اس تلخ حادثے کے متعلق ایک نوٹ لکھنے اور اپنے دوستوں کو اس قسم کے دردناک حادثات کے دینی فلسفہ کی طرف توجہ دلانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اپنی بیماری کی وجہ سے رُکا رہا اور اپنی شفایابی کا انتظار کرتا رہا کہ اچانک آج کے اخباروں سے ایک اور دردناک حادثے کی اطلاع پہنچی اور وہ یہ کہ پاکستان کی ہوائی فوج کا ایک ہونہار نوجوان فلائنگ آفیسر عبدالحمید خان غزنوی ایک ہوائی حادثے میں اچانک فوت ہوگیا ہے۔ عبدالحمید خاں نہ صرف اپنی ذات میں ایک بہت ہونہار اور ترقی کرنے والا نوجوان تھا جو غالباً آگے چل کر پاکستان کی ایئرفورس کے لیے زینت کا موجب بنتا بلکہ اپنے خاندان کے لیے بھی جو باوجود اپنے وطن میں بہت معزز ہونے کے اس وقت غربت اور تنگدستی کی حالت میں ہے بظاہر واحد سہارا تھا۔ مرحوم کا والد نیک محمد خاں افغانستان کے شہر غزنی کا مہاجر ہے جسے نہ صرف ملکی تقسیم کے گذشتہ فسادات میں دُہری ہجرت کا دھکّا برداشت کرنا پڑا بلکہ وہ قریباً ایک سال سے ربوہ میں فالج زدہ ہوکر صاحبِ فراش بھی ہے اور اس طرح اپنے غریب والدین اور بہت سے بہن بھائیوں کا سارا بوجھ مرحوم عبدالحمید خان غزنوی فلائنگ آفیسر کے سر پر تھا۔ گویا اس نوجوان کی اچانک موت نے ایک پورے خاندان کو بظاہر بالکل اپاہج اور بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ وہ دوسرا دردناک حادثہ ہے جس کی اطلاع ہمیں ایک ماہ کے اندر اندر اوپر تلے پہنچی ہے۔ مرنے والوں کی روحیں اپنے آسمانی آقا کے قدموں میں پہنچ چکی ہیں جہاں ان شاء اللہ ان کے لیے رحمت ہی رحمت ہے مگر ان کے پسماندگان کے درد و الم کا کیا علاج ہے جن پر گویا مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور ان کی زندگیوں کے لہلہاتے کھیت آنِ واحد میں سوکھ کر پیوندِ خاک ہوگئے ہیں؟ یہ علاج صرف ہمارے خدا کے ہاتھ میں ہے جو اپنی ازلی ابدی طاقتوں میں اگر ممیت ہے تو اس کے ساتھ ساتھ الحیی بھی ہے اور تاریک گھروں کو روشن کرنا اور خشک کھیتوں کو ہرا کرنا اس کی لاانتہا قدرتوں کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسی کی رحمت زخمی دلوں پر مرہم کا پھایہ رکھ سکتی ہے اور اسی کے ہاتھ کا چھینٹا مردہ کھیتوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پس ہم اسی حیی و قیوم اور اسی قادرِ مطلق آقا کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ اگر تیری کسی تقدیر نے مرنے والوں کو مارا ہے تو اب تُو ہی اپنی کسی دوسری تقدیر سے پیچھے رہنے والے زندہ درگور لوگوں کو زندگی کی شادابی عطا کر اور ان کی بے چین روحوں کو تسکین دے اور ان کے دلوں پر صبر نازل فرما اور ان کے بوجھوں کے لیے اپنی رحمت کے شہتیروں کا سہارا مہیا کر......''

اس کے بعد حضرت مرزا بشیر احمد نے اس طرح کے غیر متوقع حادثات سے خام طبائع میں پیدا ہونے والے بعض منفی اثرات اور ان کے ازالے کی ضرورت کے تحت ایک قدرے طویل مضمون لکھا جو کتابِ ہٰذا کے موضوع سے غیر متعلق ہونے کے باوجود اپنے نفسِ مضمون کی اہمیت کی وجہ سے ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''ان حادثات کے نتیجے میں مرنے والوں اور ان کے پسماندگان سے تو میرا خطاب ختم ہوا اور اس سے

زیادہ کی مجھ میں طاقت بھی نہیں مگر اس قسم کے دردناک حادثات کے نتیجے میں جو اثر خام طبیعتوں پر پڑ سکتا ہے اور جس قسم کے شبہات میں وہ مبتلا ہوسکتے ہیں اس کا ازالہ ابھی باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو خالقِ فطرت نے دو جوہروں سے مرکب کیا ہے۔ ایک عقل کا جوہر ہے اور دوسرا جذبات کا جوہر ہے جنہیں انگریزی میں رِیزن اور سینٹیمنٹ کہتے ہیں۔ انسان کے اعلیٰ اخلاق اور متوازن تخیّل کے لیے ان دونوں کا وجود نہایت ضروری ہے مگر بدقسمتی سے بعض لوگ خارجی اثرات کے ماتحت اس فطری توازن کو کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ یا تو جذبات کے پہلو کو ضائع کر کے عقل کی خشک وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں یا عقل کے جوہر کو کھو کر جذبات کے طوفان میں تھپیڑے کھاتے پھرتے ہیں اور ان دونوں باتوں کا نتیجہ ضلالت اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ ان میں سے ایک طبقہ پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتا ہے اور دوسرا طبقہ جذبات کے سیلاب میں غوطے کھا کھا کر دم توڑتا ہے چنانچہ اس قسم کے دردناک حادثات کے نتیجے میں بھی جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہی غیر فطری منظر نظر آتا ہے کہ خشک عقل کے پجاری لوگ یہ سمجھ کر کہ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں اس قسم کے ظالمانہ واقعات نہ نظر آتے کہ اچانک ایک ہرا بھرا باغ تباہ و برباد ہوکر رہ جاتا ہے اور ایک ہونہار زندگی کا چراغ بے وقت گل ہوکر ختم ہوجاتا ہے اور دوسری طرف جذبات کی رو میں بہنے والے لوگ ایسے واقعات سے تناسخ یعنی آواگون کے عقیدہ کی طرف جھک جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خدا تو ظالم نہیں ہے اس لیے ضرور موجودہ زندگی سے پہلے بھی کوئی اور زندگی گزری ہوگی جس کے نیک و بد اعمال کے نتیجے میں اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں یعنی بعض لوگ بغیر کسی ظاہری سبب کے غیر معمولی حادثات کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ گویا ایسے واقعات ایک طبقہ کو دہریت کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور دوسرے طبقہ کو تناسخ کے غیر معقول عقیدہ کی طرف کھینچ کر لے جاتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں نتائج بالکل غیر فطری ہیں جو محض عقل اور جذبات کے توازن کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

یہ ایک بہت وسیع اور باریک مضمون ہے لیکن افسوس ہے کہ اپنی صحت کی موجودہ حالت میں میں اس کے متعلق زیادہ تفصیل سے نہیں کہہ سکتا۔ صرف مختصر طور پر بیان کرتا ہوں کہ یہ سارا دھوکا خدا تعالیٰ کے دو قانونوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوا ہے جنہیں خالقِ فطرت نے دو علیحدہ علیحدہ قانونوں کی صورت میں جاری کیا ہے اور اس کی ازلی حکمت کا تقاضا ہے کہ ان دو قانونوں کو خلط ملط ہونے سے بچایا جائے۔ ان میں سے ایک قانون تو شریعت کا قانون ہے جو افراد کی نیکی بدی اور ان کے نتائج سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا قانون قضا و قدر کا قانون ہے جسے قانونِ نیچر کہتے ہیں۔ اس قانون کو لوگوں کی نیکی بدی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ نظامِ عالم کے عام قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کے ماتحت مثلاً آگ جلاتی ہے اور پانی غرق کرتا ہے۔ پتھر کچلتا ہے اور سنکھیا مارتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ شریعت کے قانون کی جزا سزا کے لیے آخرت یعنی موت کے بعد کی زندگی مقرر ہے مگر نیچر کے قانون کی جزا سزا اسی دنیا میں ساتھ ساتھ چلتی ہے اور خدا تعالیٰ نے ان دو قانونوں کا الگ الگ دائرہ معیّن کر رکھا ہے۔ شریعت کا قانون نیچر کے قانون میں دخل انداز نہیں ہوتا اور نیچر کا قانون شریعت کے قانون

پر کوئی اثر نہیں رکھتا بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی مرکزی حکومت کے ماتحت گویا دو جداگانہ صوبے ہیں جو اپنی اپنی جگہ آزادی کے ساتھ کام کرتے ہیں اور موجودہ اصطلاح کے مطابق کہہ سکتے ہیں کہ ان دو صوبوں کو گویا پراونشل ایٹانومی حاصل ہے کیونکہ وہ خدا کی مرکزی حکومت کے ماتحت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ الگ دائرے میں چلتے اور ایک دوسرے کے اثر سے آزاد ہیں۔ (سوائے مستثنیات کے جن کے ذکر کی اس جگہ گنجائش نہیں) مثلاً انسان کی نیکی اور بدی اور اس کی دینداری اور بداعمالی شریعت کے قانون سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مثلاً ایک نیک انسان کی نیکی اسے سنکھیا کے اثر سے بچالے یا ایک دیندار انسان جو تیرنا نہیں جانتا وہ محض اپنی نیکی کی وجہ سے گہرے پانی میں جا کر ڈوبنے سے بچ جائے کیونکہ سنکھیا کا زہریلا اثر یا گہرے پانی کی غرقابی قانونِ نیچر سے تعلق رکھتی ہے اور کسی انسان کی نیکی (جس کا تعلق شریعت کے قانون سے ہے) نیچر کے قانون کے دائرے میں اس کے کام نہیں آسکتی۔

اس مختصر تشریح سے ظاہر ہے کہ جو بچہ اونچی کھڑکی سے گر کر فوت ہو گیا وہ خواہ کیسا ہی معصوم تھا اور خواہ اس کی موت سے اس کی غم رسیدہ والدہ کو کیسا ہی صدمہ پہنچنے والا تھا وہ چونکہ قانونِ نیچر کی زد میں آگیا تھا اس لیے اس کی معصومیت اور اس کی والدہ کا غم والم اسے اس حادثے سے بچا نہیں سکے۔ اسی طرح ہونہار غزنوی جو ہوائی جہاز کے حادثے میں موت کا شکار ہو گیا وہ خواہ کیسا ہی دیندار اور خوش اخلاق تھا اور خواہ اس کے والدین اس کی موت سے بالکل بے سہارا رہ جانے والے تھے مگر ہوائی جہاز کا حادثہ چونکہ نیچر کے قانون سے تعلق رکھتا تھا اس لیے مرنے والے کی نیکی اور پیچھے رہنے والوں کی مصیبت اسے اس حادثے کے طبعی نتیجے سے محفوظ نہیں رکھ سکی۔ پس ان حادثات سے ''عقل والوں'' کا دہریت کی طرف بہک جانا یا ''جذبات والوں'' کا تناسخ کے عقیدہ کے حق میں نتیجہ نکالنا ایک بالکل باطل نظریہ ہے جو خدا تعالیٰ کے دو جداگانہ اور حکیمانہ قانونوں کو آپس میں خلط ملط کرنے اور ان کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے مگر جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس کی اس مختصر نوٹ میں گنجائش نہیں اور نہ میری موجودہ بیماری مجھے کسی لمبی تشریح میں جانے کی اجازت دیتی ہے البتہ جو دوست چاہیں وہ میری تصنیف ''ہمارا خدا'' کے متعلقہ ابواب میں اس کی مفصل بحث مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

بالآخر میں پھر مرنے والوں کے عزیزوں سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے زخمی دلوں کو قرار عطا کرے اور انہیں اپنی رحمت سے نوازے اور ان کا حافظ و ناصر ہو۔ انہیں چاہئے کہ اس حقیقت کو کبھی نہ بھولیں کہ گو مرنے والے مر گئے مگر ہمارا خدا، ہمارا آسمانی آقا جو رحیم بھی ہے اور کریم بھی ہے اور حیّ بھی ہے اور قیوم بھی ہے اور قادر بھی ہے اور علیم بھی ہے وہ زندہ ہے اور رنج و غم کی گھڑیوں میں اس کی طرف جھکنے والا انسان کبھی بھی اس کی رحمت سے محروم نہیں رہتا۔ بے شک یہ امتحان بھاری ہے مگر تبھی تو یہ کہا گیا ہے کہ ہے تو بھاری مگر خدائی امتحان کو قبول کر۔

پس تم بھی خدا کے اس امتحان کو وفادار مومنوں کی طرح قبول کرو اور اس کے آستانہ پر جھکے رہو اور عسر و یسر اور رنج و راحت میں اس کا دامن نہ چھوڑو کیونکہ یہ حضرت آدم سے لے کر حضور سرور کائنات تک اور

سرور کائنات سے لے کر اس وقت تک کا آزمایا ہوا نسخہ ہے کہ خدا کے دامن سے لپٹنے والے لوگ بالآخر خدا کی رحمت سے ضرور حصہ پاتے ہیں۔ خواہ اسی دنیا میں پائیں اور خواہ اگلے جہان میں اور سچے مومنوں کے لیے اگلے جہان کا سودا بھی کوئی دُور کا سودا نہیں بلکہ ایسا ہی یقینی ہے جیسا کہ اس جہان کی نعمتیں بلکہ ان سے بڑھ کر اور ایک لحاظ سے ان سے قریب تر۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی کو آنکھوں کا صدمہ لاحق ہو گیا اور بصارت کا ضائع جانا یقینی ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور میری آنکھوں کے لیے دعا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہاری نظر کی بحالی کے لیے دعا کروں گا اور خدائی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ تمہیں بصارت عطا کر دے لیکن چاہو تو اس صدمہ کے بدلے جو اٹل نظر آتا ہے آخرت کا انعام قبول کر لو۔ نیک دل صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آخرت والے انعام کو قبول کرتا ہوں۔ یقیناً یہ ایک بہت آزمایا ہوا نسخہ ہے پس

اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما''

حضرت مرزا بشیر احمد کا مضمون ختم ہوا۔ اس حادثے پر لکھا جانے والا دوسرا مضمون جماعت کے مشہور صحافی، حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل، رفیق حضرت مسیح موعود کا تحریر کردہ تھا جو اکیس اکتوبر کے الفضل میں ''عزیز عبدالحمید خان غزنوی مرحوم'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

''ہوائی جہاز کے حادثۂ فاجعہ میں مہتر چترال کے ساتھ فلائنگ افسر غزنوی کی مرگِ ناگہانی کا ذکر بھی تھا جو ریڈیو پر، پھر اخبارات میں نشر ہوا مگر میں اس وقت یہ نہ جان سکا کہ غزنوی ہمارا عزیز نوجوان عبدالحمید خاں ہے جو مجھ سے بہت مانوس تھا اور دارُالامان میں اکثر میرے پاس آیا کرتا اور مجھ سے حضرت مسیح موعود کے عہدِ سعادت کے واقعات اور بعض دینی مسائل کی توضیحات سُن کر مسرتِ روحانی حاصل کیا کرتا۔ میں نے اسے شریف، دیندار اور مخلص و نیازمندِ امام کامگار پایا۔ اس کے ساتھ عموماً خاندان مسیح موعود کا کوئی صاحبزادہ بھی ہوتا جس سے اس کے میل جول اور قلبی رجحانات اور نیک ماحول کا ثبوت ملتا تھا۔ عشا کی نماز بیت مبارک میں ادا کر کے گھر لوٹتا ہوا رستے میں مجھے بعض اوقات سلام و دعا کے لیے کہتا اور فوراً گھر چلا جاتا اور بتاتا کہ والد صاحب ذرا سی دیر بھی عشا کے بعد باہر رہنا پسند نہیں کرتے۔ ایک روز امتحان کے لیے جاتے ہوئے میرے پاس آیا، بہت خوش خوش۔ میں نے کہا: کیا بات ہے؟ طالب علم تو اس موقع پر متفکّر ہوتے ہیں۔ کہنے لگا حضرت اماں جان نے مجھے ہولڈر عنایت فرمایا ہے (یا اسے برکت دی ہے)۔ ان کی دعا سے ان شاء اللہ پرچے اچھے ہو جائیں گے۔ فکر کی بات نہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب ہم قادیان سے مجبور ہوئے تو وہ بھی تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوا اور مجھے ملنے کے لیے آیا۔ بچشمِ پُرآب مگر زبان سے یہی کہا حضور خلیفۃ المسیح اور حضرت اماں جان اور دیگر بزرگوں کی زیارت یہاں بھی نصیب ہو رہی ہے۔

میں اس عزیز کے والد اور نانا مغفور مرحوم کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں تا معلوم ہو کہ یہ کن کے دل کا

سرور، آنکھوں کا نُور، لختِ جگر تھا۔

میں سیّدنا حضرت مسیح موعود کے مزارِ پُرانوار پر بلاناغہ روزانہ دعا کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں حسبِ معمول آنکھیں بند کیے حضور پُرنور کے مقاصدِ عالیۂ بعثت کی تکمیل اور اپنے حق میں حسناتِ دنیا و آخرہ کی تحصیل کے واسطے دعا کر رہا تھا کہ نہایت سُریلی وجدانگیز آواز میں کوئی یہ شعر پڑھتا ہوا حریمِ قدس میں داخل ہوا:

آں مسیحا کہ بر افلاک مقامش گویند
لُطف کردی کہ ازیں خاک نمایاں کردی

میں نے آنکھیں کھول مڑ کر دیکھا۔ ایک اجنبی ہے خوش پوش جوان۔ پوچھا آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دُور دراز کا سفر طے کر کے آئے ہیں مگر ان پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ کچھ جواب نہ دیا البتہ ایک شعر پڑھا:

اے محبت عجب آثار نمایاں کردی
زخم و مرہم بہ رہِ یار تو آساں کردی

باہر نکلے تو رستے میں پھر ملاقات ہوئی۔ وضع قطع اور لہجہ سے کابلی سمجھ کر فارسی میں ان سے گفتگو ہوئی۔ یہ نیک محمد خاں تھا، ہمارے نوجوانی میں داغِ مفارقت دینے والے عزیز کا باپ جس نے آتے ہی اپنی مخلصانہ خدمات سے جلدتر اہلِ بیت سیدنا مسیح موعود کی توجہاتِ خصوصی حاصل کرلیں۔ صاحبزادگان کی خدمت کا بہت موقع ملا۔ اپنی دیانت وامانت اور محنت کی عادت کی وجہ سے کچھ عرصہ سندھ کی زمینوں کی نگہداشت بھی ان کے سپرد رہی اور کارخانوں کی نگرانی بھی۔ حضرت اماں جان نے میاں عبداللہ صاحب کی لڑکی جو بوجہ یتیم ان کی زیرِ تربیت تھی، سے نکاح کردیا۔ یہ ازدواج نہایت بابرکت ثابت ہوا۔ نیک محمد خاں کو پُل کے پاس چوراہے پر زمین مل گئی اور اس پر انہوں نے ایک پختہ مکان بنالیا۔ اولاد نیک نہاد بھی اللہ نے دی جن میں سے ایک یہ شہید تھا جو زمانۂ طالب علمی میں میرے پاس بیٹھا کاغذ پر ہوائی جہاز کی تصویریں بنایا کرتا اور اخبار میں کوئی مضمون اس بارے میں ہوتا تو بڑے شوق سے پڑھتا اور میں اسے کہتا تم سائنس کا مضمون لو۔ غالباً ہواباز بنو گے۔

اس کے نانا کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتادوں کہ ۱۹۰۷ء میں مجھے محترم حافظ روشن علی کے بڑے بھائی، پیر برکت علی مرحوم اپنے موضع رَمل لے گئے کہ وہاں نوشاہیوں کا میلہ (عرس) ہے جس کی گدی وہ چھوڑ چکے تھے...... میں بیمار، سفر کے قابل نہ تھا مگر ان کے اصرار سے وہاں بہ امداد پیر امام الدین صاحب پہنچا۔ حافظ غلام رسول وزیرآبادی پاپیادہ اپنے بھائی دھیر کی والے کے ساتھ پچیس چھبیس میل سفر طے کر کے پہنچے۔ جمعہ کا خطبہ مجھ سے سنا گیا جس میں حسبِ موقع شرک کی تردید تھی اور خدا کی طرف سے قائم ہونے والے مرکزِ توحید کا مذکور اور دارالایمان قادیان میں ہجرت کر جانے کی ترغیب و تاکید تھی۔ میاں عبداللہ مونگ رسول (ضلع گجرات) کے رہنے والے نماز کے بعد پکار اٹھے کہ میں اب مونگ نہیں ٹھہروں گا اور قادیان پہنچوں گا چنانچہ جب میں واپس پہنچا تو ان کو وہاں موجود پایا۔ دودھ کی دکان کر رہے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ خریدار کو دودھ دے

رہے تھے اور چوک میں سیدنا مسیح موعود سیر کے لیے تشریف لائے تو آپ پیمانہ جو ابھی آدھا بھرا تھا وہیں چھوڑ کر چل دیئے۔ میں نے کہا: سامان تو سنبھالتے جاؤ۔ کہنے لگے: اللہ مالک و حافظ ہے۔ جس غرض کے لیے آئے ہیں وہ مقدّم ہے، یہ موقع پھر کہاں؟ اس وقت دیانت و امانت کا یہ حال تھا کہ خریدار پیسے چٹائی پر رکھتے جاتے اور خود ہی مناسب مقدار میں دودھ کڑاہی سے نکال لیتے۔ ایک روز میرے واپس آتے ہوئے میاں عبداللہ نے پُل کے پاس جانبِ جنوب اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا: حضور! اگر اجازت ہو تو یہاں کچھ بھرتی ڈال کر ایک جھونپڑا بنالوں۔ فرمایا: میر صاحب سے ذکر کر کے بنالو چنانچہ وہاں میاں عبداللہ نے خود اکیلے ہی ایک کوٹھا بنالیا اور ڈھاب سے مٹی لے کر صحن بھی کشادہ کرلیا۔ یہ بند بعد میں غلام یاسین و غلام حُم صاحبان مرحومین نے خرید کر اپنے مکان بنالئے اور موصوف نے کچے تالاب کے پاس سڑک کے شرقی حصے میں ایک کشادہ مکان بنالیا۔

جب حضرت خلیفہ اول مسیح موعود واصل بحق ہوئے اور صبح بیت نور میں تقریریں ہونے لگیں اور اس کے بعد لوگ بیت نور سے نکلے تو میاں عبداللہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا: یہ کیا ہو رہا ہے اور بیعت میں کیوں توقف ہے؟ میں نے کہا: فیصلہ ہو رہا ہے تو مجھے شمالی جانب بیت نور کے کنارے پر کھڑے انگلی سے مغرب اور مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھئے فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب اکیلے اپنے مکان کی طرف جا رہے تھے اور دوسری طرف ایک جمِ غفیر ہونے والے حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ میاں عبداللہ جلد فوت ہوگئے تو ان کی بچیاں حضرت اماں جان کی تربیت میں آئیں اور ان ہی میں سے جوانمرگ حمید کی والدہ پروان چڑھی اور بچپن کا بہت سا حصہ عبدالحمید نے اسی خاندان مبارک میں گزارا۔ اللہ تعالیٰ اس کے مغموم والدین کو صبرِ جمیل و اجرِ جزیل عطا فرمائے۔''

میرا خیال تھا کہ مرحوم ربوہ میں ہی دفن ہوں گے تاہم ان کی ہمشیرہ، نسیم غزنوی نے یہ انکشاف کر کے کہ وہ چترال میں دفن ہیں مجھے قدرے حیران کردیا۔ بہرحال میں نے چترال میں مقیم اپنے ایک دوست سے درخواست کی کہ وہ ان کی قبر کی تصویر بنا کر مجھے ارسال کریں۔ انہوں نے شہید کی قبر تلاش کر کے اس کی کچھ تصاویر مجھے ارسال کی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شہید کی قبر پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

....

فلائنگ آفیسر عبدالحمید غزنوی

ابن

نیک محمد خان غزنوی

تاریخ وفات: تیرہ اکتوبر ۱۹۵۴ء

(نوٹ از مصنف: صحیح تاریخِ وفات بارہ اکتوبر ہے۔ کتبہ پر لکھی ہوئی تاریخ غلط ہے)

میں یہ ساری تگ و دو کر چکا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ شہید کے چھوٹے بھائی، حفیظ غزنوی مقیم کیولری گراؤنڈ، لاہور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر میں چترال گئے تو شہید کی قبر کا کتبہ غائب ہو چکا تھا۔ انہوں

۔ز وہاں ڈیرا لگا لیا اور چترال سکاؤٹس کے افسران کے ذریعہ مقامی لوگوں کی شہادت کے بعد قبر کا تعین کیا اور یہ کتبہ جسے وہ لاہور سے اپنے ساتھ بنوا کر لے گئے تھے اس پر نصب کرایا۔

اور اب ذکر سکواڈرن لیڈر منیر الدین احمد شہید کا جنہوں نے جنگ ستمبر کے دوران امرتسر کے ریڈار پر فضائی حملے کے دوران جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ تاریخ احمدیت جلد ۲۳ میں شہید کا پورا تعارف موجود ہے اور اُس حملے کی جملہ تفصیلات بھی درج ہیں جو موصوف کی شہادت پر منتج ہوا۔ فاضل مصنف تاریخ احمدیت لکھتے ہیں:

''خلیفہ منیر الدین احمد ایک معزّز و معروف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد حضرت ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب (رفیق حضرت مسیح موعود) لاہور کے میو ہسپتال میں ایک عرصے تک سرجن انچارج رہے۔ (حضرت ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے بانی، خلیفہ حمید الدین کے بیٹے تھے) آپ ۸ ستمبر ۱۹۲۵ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ان کی خوش بختی ہے کہ اس موقع پر حضرت مصلح موعود نے ان کے کان میں نِدا کہی۔ آپ حضرت مصلح موعود کے برادرِ نسبتی تھے۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے انہیں ایئر فورس میں شامل ہو کر خدمتِ قوم و وطن کا شوق تھا۔ اسی شوق کے تحت تعلیم الاسلام کالج سے ایف اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۴۹ء کے آخر میں فلائنگ کلب، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت اس کلب میں تربیت حاصل کرنے والوں کی تعداد اٹھارہ تھی۔ امتحان ہوا تو صرف چھ نوجوان کامیاب ہوئے۔ خلیفہ منیر الدین ان سب میں اوّل آئے تھے۔

۱۹۵۱ء میں وہ ایئر فورس کے لیے منتخب ہوئے اور کراچی اور رسالپور میں کچھ عرصہ بطور فلائٹ لیفٹیننٹ خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ترقی دے کر انہیں سکواڈرن لیڈر بنا دیا گیا اور اُس وقت سے تادمِ آخر وہ سرگودھا میں سکواڈرن لیڈر ہی کی حیثیت سے ایئر فورس کی خدمت بجالاتے رہے۔ فرائضِ منصبی کی ادائی میں مستعدی اور باقاعدگی ان کا طرّۂ امتیاز تھا۔ ان کے دل کو تو خلوص و محبت کا روشن دیا جانئے۔

جنگ کے ایام میں گھڑی دو گھڑی کے لیے گھر آتے تو انہیں یہی احساس مضطرب رکھتا کہ کہیں ڈیوٹی پر پہنچنے میں تاخیر نہ ہو جائے۔

سکواڈرن لیڈر خلیفہ منیر الدین احمد شہید (ستارہ جرأت) جانباز قوم کا ایک نڈر جیالا سپوت تھا، ایک ایسا دلیر ہواباز جس کی نگاہوں میں عقاب کی لپک اور سینے میں شیر کا دل تھا۔

پاک فضائیہ کا یہ جیالا ۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دشمن کی ہوائی طاقت کے ایک قریبی مرکز کو بالکل تہس نہس کرتے ہوئے موت سے ہنستا کھیلتا جامِ شہادت پی گیا۔ اس وقت اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔

اس واقعے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جن دنوں دشمن کے بُزدل ہواباز سرگودھا کے ہوائی ٹھکانے پر بمباری کی ناکام کوشش کر رہے تھے خلیفہ منیر الدین کے سپرد پلاننگ کی ڈیوٹی تھی۔ دشمن کے ہوائی حملوں کو روکنے کے لیے امرتسر کے ریڈار سٹیشن کو مسمار کرنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں کئی کوششیں کی گئیں مگر ان میں سے کوئی بھی

کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ دشمن کے طیارے روزانہ سرگودھا کے آسمان پر منڈلاتے اور ادھر ادھر بے نشانہ بم گرا کر بھاگ جاتے۔ یہ دیکھ کر خلیفہ منیر الدین کے دل میں دشمن کے ہوش ٹھکانے لگانے کا جذبہ موجزن ہوا اور انہوں نے بڑے پُر جوش انداز میں کہا: ''اب میں جاؤں گا اور دشمن کے ریڈار کو تباہ کر کے ہی آؤں گا۔''

اور پھر وہ سچ مچ اپنے ساتھ تین اور شاہینوں کو لے کر ہوا کے دوش پر پرواز کر گئے۔ آن کی آن میں امرتسر پہنچ کر جب وہ ریڈار پر لپکے تو منیر الدین احمد ہی ان کی (بطور ڈپٹی لیڈر) قیادت کر رہے تھے۔ ان کے ہمراہ جانے والے ایک ہواباز نے بتایا کہ پہلے غوطے میں ریڈار اُن کی زد میں نہیں آیا۔ اس پر خلیفہ منیر الدین نے گرج کر اپنے ساتھیوں سے کہا: ''میں نے ریڈار کو تاڑ لیا ہے۔ اب میں دوبارہ جاؤں گا اور اس کا قلع قمع کر کے ہی آؤں گا۔''

اور اب کے جو پاکستان کا یہ دلیر شاہین تنہا اس ریڈار پر بے مثال برق رفتاری سے جھپٹا تو دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کا بے حد محفوظ اور مخفی ریڈار آگ کے ہولناک شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔''

اس کے بعد فاضل مصنف، تاریخ احمدیت نے مشرق ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والا ایک مضمون نقل کیا ہے جس میں اس معرکے کی مندرجہ ذیل تفصیلات بیان ہوئی ہیں:

''جنگ چھڑے چھ روز گزر چکے تھے اور میدانِ جنگ کے ہنگاموں سے بہت دور فضائیہ کے ایک اڈے پر اترنے اور چڑھنے والے لڑاکا بمباروں کی گرج سے ظاہر ہوتا تھا کہ پُر سکون مقام پر سرگرمی حالات کی نزاکت کی علامت ہے۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ اڈے کے آپریشن روم میں وِنگ کمانڈر محمد انور شمیم اس روز کی انتہائی اہم اور خطرناک مہم کے لیے ہوابازوں کو ہدایت دینے والے تھے۔ اس مہم کا نشانہ امرتسر کا ریڈار سٹیشن تھا۔

شمیم نے اس مشن کے لیے تین ہواباز منتخب کئے تھے۔ انہوں نے پکارا تو ان میں سے صرف دو آئے۔ تیسرے کے متعلق انہوں نے ونگ آپریشن آفیسر، سکواڈرن لیڈر منیر الدین احمد صاحب سے دریافت کیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا ''تیسرا تو میں ہوں جناب!''

''لیکن میں نے تو آپ کا نام اس مہم میں نہیں رکھا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے فلائنگ آفیسر مسعود کو منتخب کیا تھا۔''

''یہ ٹھیک ہے سر! لیکن مسعود تو پہلے ہی ایک مہم پر گیا ہوا ہے'' منیر نے جواب دیا اور شمیم اب کچھ نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ پہلا موقع نہ تھا۔ اس ریڈار سٹیشن پر پہلے جتنے حملے ہوئے تھے ان میں بھی سکواڈرن لیڈر منیر ضرور شامل ہوئے تھے۔

منیر کو اس دنیا میں یا تو اپنے بال بچوں سے الفت تھی یا پرواز سے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اب تک وہ آٹھ مرتبہ زمینی فرائض دوسرے ساتھیوں کے سپرد کر کے فضائی حملوں میں شریک ہو چکے تھے۔ اس مرتبہ پھر وہ تیار ہو گئے تھے اور ونگ کمانڈر شمیم بولے: ''اچھا بھئی! تم ہی سہی۔'' اس کے بعد انہوں نے ہدایات

جا ی کیں۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد پاک فضائیہ کے چار سیبر دشمن کی تباہی کا سامان بازوؤں میں دبائے پرشکوہ انداز میں اڈے سے اڑے اور نشانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ دس منٹ بعد وہ دشمن کے علاقہ پر اُڑ رہے تھے۔

وہ کم بلندی پر امرتسر کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک دشمن کی توپوں کے دہانے کھل گئے۔ پہلے تو اِکا دُکا گولہ آیا لیکن رفتہ رفتہ تانتا بندھ گیا۔ ہلکی، بھاری ہر قسم کی طیارہ شکن توپیں آگ اُگل رہی تھیں۔ ہمارے طیاروں کے چاروں طرف گولے پھٹ رہے تھے لیکن آگ کے اس کھیت میں وہ گویا ہل چلاتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہے۔

منیر اس دستے کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ انہوں نے نشانے پر جھپٹنے کی تیاری مکمل کی۔ دوسرے طیارے اوپر اٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر دشمن کے سارے توپچیوں نے اپنا رخ منیر کی طرف کر دیا تھا۔ دھماکوں کے ارتعاش سے ان کا طیارہ ڈول رہا تھا لیکن وہ پورے انہماک کے ساتھ نشانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ریڈار سٹیشن کے قریب پہنچ کر ایک گولہ منیر کے سیبر کو لگا۔ انہوں نے جلدی سے ونگ کمانڈر شمیم کو پکارا: مجھے گولہ لگ گیا ہے اور پھر ان کا ریڈیو خاموش ہوگیا۔ شمیم نے جو اس مہم کی قیادت کر رہے تھے دوبارہ ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ فضا میں چاروں طرف دیکھا لیکن منیر کا کہیں نشان نہ تھا۔ ایک عظیم ہواباز شہید ہو چکا تھا۔‘‘

سکواڈرن لیڈر منیر الدین احمد شہید کے بارے میں اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے منور شمیم خالد کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل کا اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا محرک جنگ میں چھپنے والا ایک مضمون تھا۔ موصوف لکھتے ہیں:

’’جنگ اخبار کا مضمون پڑھا تو آج سے دو عشرے قبل لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک واقعے کی یاد تازہ ہوگئی جس کے چشم دید راوی سینئر ایڈووکیٹ چوہدری غلام مجتبیٰ ہیں جو ایوانِ عدل کے اندر انسانی بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے عدلیہ کے محاذ پر تادمِ واپسیں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ بار کے اجلاسِ عام میں سینکڑوں وکلاء کو پاک فضائیہ کے سابق سربراہ ایئر مارشل (ر) محمد اصغر خان نے خطاب کیا۔ خطاب کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ چلا۔ کسی وکیل نے نہ جانے کس مقصد اور کس قسم کا جواب حاصل کرنے کے لیے مہمانِ خصوصی سے سوال کیا کہ کیا پاکستان کے احمدی/ قادیانی ملک و قوم کے وفادار ہو سکتے ہیں؟ اس طرح کے سوال کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جس قسم کا سلوک احمدیوں سے ہوتا رہا ہے، اُس سلوک کے ہوتے ہوئے فوج یا فضائیہ میں خدمات سرانجام دینے والے احمدیوں سے وفاداری یا جاں نثاری کی توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ سوال سن کر جناب اصغر خان صاحب نے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کا ایک...... ذاتی تجربہ بیان کر کے اس نہایت ہی چبھنے والے سوال کا جواب دیا۔ ایئر مارشل (ر) اصغر خان نے بتایا کہ جنگ کے دوران دشمن کی فضائی برتری نے ہمارا ریڈار سسٹم منجمد کر دیا تھا۔ اس نازک صورتِ حال سے نمٹنے کا صرف ایک ہی طریق تھا کہ جس

بھارتی ہوائی اڈے (امرتسر) سے دشمن کے جہاز اڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہو رہے ہیں اُس کو تباہ کر دیا جائے۔ اس واضح اور معیّن مقصد کے لیے...... پاک فضائیہ کے ہوابازوں کو ایک جگہ طلب کیا گیا اور جنگ کی نازک صورتِ حال سے آگاہ کر کے سب پائلٹوں سے کہا گیا کہ اس قومی دفاعی مقصد کے حصول کے لیے جان کی بازی لگا کر دشمن کا ہوائی اڈہ تباہ کرنا ضروری ہے لہٰذا ہواباز از خود، رضاکارانہ طور پر اس ناگزیر مشن کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں۔ جناب اصغر خان نے ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے اجلاسِ عام میں اراکین کو بتایا کہ سب سے پہلے جس پائلٹ نے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا وہ پائلٹ احمدی/ قادیانی تھا۔ جی ہاں! یہ وہی...... اسکواڈرن لیڈر خلیفہ منیر الدین احمد تھے جن کا ذکر صاحبِ مضمون نے اخبار جنگ میں کیا اور جن کو شہادت کا رتبہ پانے پر ستارہ جرأت عطا کیا گیا۔‘‘

تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ جو دشمنانِ احمدیت کے ہاتھوں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے سیٹھی مقبول احمد ہیں جنہوں نے ۲ جولائی ۱۹۷۴ء کو جہلم میں اپنی جان راہِ مولیٰ میں قربان کی۔

موصوف حضرت میاں محمد ابراہیم (یکے از ۳۱۳ رفقائے حضرت مسیح موعود) کے پوتے؛ حضرت شیخ فرمان علی، رفیق حضرت مسیح موعود کے نواسے اور سیٹھی محمد اسحاق کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم جہلم میں حاصل کی اور پھر بی اے تک تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں پڑھتے رہے۔ بعدہٗ جہلم میں مقبول شُو سٹور کے نام سے ذاتی کاروبار کرنے لگے۔

۱۹۷۴ء میں جہلم میں ایک اوباش نوجوان قتل ہوگیا۔ مولویوں نے اس قتل کا الزام احمدیوں پر لگا کر جماعت کے خلاف پہلے سے جاری اشتعال انگیزی میں اضافہ کر دیا۔ مساجد کے لاؤڈ سپیکروں سے لوگوں کو بار بار قتل و غارت اور لُوٹ مار پر اکسایا گیا۔ اس اشتعال انگیزی کے نتیجے میں بعض احمدی گھرانوں اور ان کے کاروباری ٹھکانوں کو لُوٹ کر آگ لگا دی گئی جس سے مخالفین کی کچھ دکانیں بھی جل گئیں۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ پولیس، چودھری محمد رمضان نے اعلان کیا کہ اب آگ نہ لگائی جائے کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی دکانوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے، صرف سامان لُوٹا جائے۔ اسی دوران اسلحہ بردار جلوس سیٹھی مقبول احمد کے گھر پر حملہ آور ہوا اور اندھا دھند فائرنگ کر کے موصوف کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس واقعے کا تفصیلی ذکر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے خطبۂ جمعہ فرمودہ ۲۵ جون ۱۹۹۹ء میں بھی موجود ہے۔

سیٹھی مقبول احمد کے بعد اب ذکر فلائنگ آفیسر ابرار احمد سُوری شہید کا جو ۲ مئی ۱۹۵۴ء کو نواب شاہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ویٹرنری سرجن تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ربوہ کے محلّہ دارالرحمت شرقی میں اپنا مکان تعمیر کر کے بچوں کو تعلیم کی غرض سے وہاں منتقل کر دیا تھا۔

ابرار نے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۹ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے پاس کیا اور پھر تعلیم الاسلام کالج میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں داخل ہوگئے۔ اُن کے ایک کلاس فیلو اور عزیز دوست، جمیل الرحمٰن حال مقیم انگلستان بتاتے ہیں کہ ابرار انتہائی ذہین، ہنس مکھ، خاموش طبع، خوش خصال اور وجیہہ ہونے کے باعث اپنے دوستوں

اور اساتذہ میں یکساں مقبول تھے، وہ تعلیم الاسلام کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے ایک فعال رکن تھے اور بطور ایتھلیٹ جیولین تھرو اور بعض دیگر ایونٹس میں بھی حصہ لیتے تھے۔

انہوں نے ایف ایس سی (پری میڈیکل) کا امتحان ۱۹۷۱ء میں اچھے نمبروں میں پاس کیا لیکن وہ ڈاکٹر بننے کی بجائے ایئر فورس میں شمولیت کے خواہاں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش پوری بھی کر دی۔ انہوں نے ایف ایس سی کے بعد آرمی اور ایئر فورس، دونوں کے لیے درخواست دے رکھی تھی لیکن اتفاق دیکھئے کہ انہیں دونوں انٹرویوز کے لیے ایک ہی دن طلب کر لیا گیا۔ انہوں نے ایئر فورس کو ترجیح دی اور اس کے لیے منتخب بھی ہو گئے۔ عام طور پر وہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ والی انگوٹھی نہیں پہنتے تھے لیکن انٹرویو والے روز وہ اسے بطور خاص پہن کر گئے اور اس آیتِ قرآنی کی صداقت کا خود مشاہدہ کیا۔

رسالپور اکیڈمی میں ان کا شمار ٹاپ کیڈٹس میں ہوتا رہا۔ اعزازی تلوار تو وہ حاصل نہ کر سکے مگر انہیں دوسری پوزیشن مل گئی۔ کچھ عرصے کے بعد انہیں ٹریننگ کے لیے ترکی بھیجا گیا جہاں سے واپسی پر وہ پشاور متعین ہوئے۔

۶ مئی ۱۹۷۷ء کو وہ مسرور ایئر بیس کراچی میں تھے جہاں معمول کی ایک تربیتی پرواز کے دوران ان کے جہاز کا انجن بند ہو گیا لیکن کسی غلط فہمی کے تحت بیل آؤٹ ہونے میں ان سے تاخیر ہو گئی اور وہ پیراشوٹ کے ساتھ طیارے سے اس وقت کودے جب اس کا زمین سے فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ سیدھے زمین سے آ ٹکرائے اور آنِ واحد میں اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ ۷ مئی ۱۹۷۷ء کو ان کا جسدِ خاکی ربوہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

الفضل (۱۳ مئی ۱۹۷۷ء) نے ''ہوائی حادثے میں ایک ہونہار نوجوان کی شہادت'' کے عنوان سے اس حادثے کی خبر دیتے ہوئے لکھا: ''افسوس کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ فلائنگ آفیسر...... ابرار احمد خان سُوری ابن مکرم ڈاکٹر انوار احمد خان سُوری مورخہ ۶ مئی ۱۹۷۷ء کو ماڑی پور، کراچی میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں شہید ہو گئے......

نعش کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز سرگودھا لائی گئی اور وہاں سے بذریعہ ایمبولینس پونے ایک بجے شب ربوہ پہنچائی گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث...... نے ازراہِ شفقت اگلے دن پونے دس بجے صبح نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں کثیر تعداد میں احباب شامل ہوئے جس کے بعد قبرستان نمبر ۱ میں عزیز کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ قبر تیار ہونے پر صوفی غلام محمد، ناظر بیت المال خرچ نے دعا کرائی۔ عزیز مرحوم مکرم چوہدری عبدالواحد، افسر پراویڈنٹ فنڈ کی بھانجی کے بیٹے اور مکرم راجہ محمد یعقوب خاں (خلافت لائبریری) کے ماموں زاد بھائی کے بیٹے تھے۔ عمر صرف ۲۳ سال تھی۔ سروس کا ریکارڈ نہایت شاندار رہا۔ جہاں بھی رہے اپنے افسروں اور دوستوں میں ہر دلعزیز رہے۔''

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ شہید کو جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، شہید کی قبر پر نصب کتبہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

....

مزار

فلائنگ آفیسر ابرار احمد خان طاہر

ولد

ڈاکٹر انوار احمد خان

ولادت: ۲ مئی ۱۹۵۴ء

وفات: ۶ مئی ۱۹۷۷ء

عمر ۲۳ سال

پاک سرزمین کی سرحدوں کی حفاظت اور وطنِ عزیز کی
سربلندی کے لیے پرواز کرتے ہوئے فضائی حادثہ میں جان قربان
کر دی جن کا آخری پیغام یہ تھا
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

ابرار سُوری کے علاوہ تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور سابق طالب علم، میجر سیّد انصر احمد بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے دوران شہادت کے رتبۂ بلند پر سرفراز فرمایا۔ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان کے ایک مضمون بعنوان ''سید محمد اکمل صاحب کی جوانا مرگ'' مطبوعہ الفضل ۱۱ جولائی ۱۹۶۸ء کے مطابق انصر نے ایف ایس سی (پری میڈیکل) کا امتحان تعلیم الاسلام کالج سے پاس کیا تھا۔

وہ کیپٹن سیّد محمد اکمل کے صاحبزادے اور مربی انڈونیشیا، محمد ادریس کے داماد تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ فوج میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ بے حد ذہین اور بلا کے محنتی تھے چنانچہ فوج کے اکثر محکمانہ امتحانات میں اوّل آیا کرتے تھے اور ان کی کارکردگی نہایت غیر معمولی ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں آرمی ایوی ایشن میں کمپنی سارجنٹ میجر کے طور پر کام کر رہے تھے۔

بوقتِ شہادت شہید کی عمر صرف ساڑھے اٹھائیس سال تھی۔ وہ ۳۰ جولائی ۱۹۷۹ء کو لاہور میں طیارہ کریش ہو جانے کے باعث شدید زخمی ہو گئے تھے اور قریباً ایک ماہ تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انتیس اگست ۱۹۷۹ء کو سی ایم ایچ لاہور میں انتقال کر گئے۔

الفضل تیس اگست ۱۹۷۹ء کے مطابق: ''مرحوم کا جسدِ خاکی آج دن کے قریباً پونے ایک بجے آرمی ایوی ایشن کے ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے ربوہ لایا گیا۔ مرحوم کی میت ایک تابوت میں رکھی تھی جو کہ قومی پرچم میں لپٹا ہوا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے بعد از نماز ظہر قریباً پونے دو بجے بیت مبارک کے مشرقی جانب نمازِ جنازہ پڑھائی جس کے بعد جنازہ قبرستان عام نمبر ۲ لے جایا گیا جہاں مرحوم کو تین بجے کے قریب قطعہ شہدا

میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ مرحوم کو فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کرنے کے لیے کیپٹن باصر کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ سرگودھا سے ربوہ آیا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور، راولپنڈی، سرگودھا اور رسالپور سے بیس کے قریب فوجی افسران مرحوم کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے ربوہ تشریف لائے تھے۔ ان میں آرمی ایوی ایشن، آرٹلری اور اے ایم سی کے افسران شامل تھے۔''

میجر انصر کی شہادت کا ایک افسوسناک پہلو یہ تھا کہ تیرہ اگست ۱۹۷۹ء کو اُن کے ہاں پہلی بچی کی ولادت ان کی آخری بیماری کے دوران ہوئی جس کا نام ماہ رُخ رکھا گیا۔ انہیں اس بچی کی پیدائش کی خبر بھی نہیں دی جا سکی کیونکہ وہ حادثے کے بعد سارا وقت نیم بیہوش رہے۔ آخری ایام میں خون کی سخت کمی کی وجہ سے ان کو قریباً چالیس بوتلیں خون دیا گیا مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری ہو کر رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شہید کی بہادری کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے انہیں بعد از مرگ ''تمغہ بسالت'' کا اعزاز دیا گیا۔

پاکستان ٹائمز لاہور نے پچیس اگست ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں یہ خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بہادری کے تمغہ جات کی تقسیم کے لیے ایک روز پہلے کور آڈیٹوریم، لاہور چھاؤنی میں ایک سادہ مگر پُروقار تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں لیفٹیننٹ جنرل سردار فاروق شوکت خاں لودھی، کور کمانڈر نے چار تمغہ بسالت اور دو تمغہ امتیاز (ملٹری) تقسیم کیے۔ تمغہ بسالت کا اعزاز غیر معمولی کارکردگی، بہادری اور اپنے فرائض کو کامل اخلاص کے ساتھ ادا کرنے کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ میجر انصر احمد شہید کا تمغہ بسالت ان کی والدہ محترمہ نے جو کہ سیاہ برقع میں ملبوس تھیں وصول کیا...... پاکستان ٹائمز نے اس تقریب کی چار کالمی تصویر بھی شائع کی جس میں میجر انصر احمد شہید کی والدہ بُرقع میں ملبوس تمغہ وصول کرتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔''

شہید کی قبر پر نصب کتبہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

....

میجر سیّد انصر احمد اکمل

ابن

کیپٹن سیّد محمد اکمل صاحب مرحوم

ولادت: ۵ جنوری ۱۹۵۱ء

وفات: انتیس اگست ۱۹۷۹ء

عمر ۲۸ سال

ڈیوٹی کے دوران جہاز کے حادثہ
میں شہید ہوئے اور تمغہ بسالت پایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ جنہیں راہِ مولیٰ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ڈاکٹر شمس الحق طیّب تھے جو ۱۹۶۷ء میں اس کالج میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ان طالب علموں میں سے تھے جو پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں چنانچہ ایک روایت کے مطابق موصوف ایک اچھے ڈیبیٹر تھے، انہوں نے مختلف بین الکلیاتی مباحثات میں اپنے کالج کی نمائندگی کی اور انعامات حاصل کرتے رہے۔

موصوف ڈاکٹر فضل حق، سابق صدر جماعتِ احمدیہ، لالیاں کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول اور ایف ایس سی کا امتحان تعلیم الاسلام کالج سے پاس کیا تھا جس کے بعد انہوں نے پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے بہت جلد ایک آرتھوپیڈک سرجن کے طور پر اپنا نام پیدا کر لیا۔ کسی حادثے کے نتیجے میں جسم سے علیحدہ ہو جانے والے کسی حصے کو جسم کے ساتھ دوبارہ جوڑنا آسان نہیں ہوتا اور اس کے لیے فنی مہارت اور تجربے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ موصوف نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر ایک مریض کا ہاتھ جو کسی حادثے کی وجہ سے جسم سے الگ ہو گیا تھا نہایت مہارت سے جوڑ کر سرجری کی دنیا میں بہت شہرت پائی تھی اور بعض اخبارات نے اس واقعہ پر خصوصی فیچرز بھی شائع کیے تھے۔

انہیں اکتالیس سال کی عمر میں ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ء کو فیصل آباد لاہور روڈ پر راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا گیا۔ واقعات کے مطابق وہ رات ساڑھے دس بجے ساحل ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر نکلے تو انہیں ان کی کار میں ہی اغوا کر لیا گیا۔ نامعلوم اشخاص ان کو لاہور روڈ پر لے جا رہے تھے کہ فیصل آباد سے بیس بائیس میل دُور اُن کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا کر سڑک سے اتر کر کیچڑ میں پھنس گئی۔ اس وقت رات کے قریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ غالباً یہی وہ وقت تھا جب اغوا کنندگان نے ان کی کنپٹی پر فائر کر کے انہیں راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا۔ الفضل کی اطلاع کے مطابق قتل کے بعد نامعلوم حملہ آور کھیتوں میں فرار ہو گئے۔ لاہور سے آنے والی ایک کار نے رک کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب موصوف زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ پولیس کو اطلاع دی گئی جو اُن کو الائیڈ ہسپتال لے آئی۔ اُن کی نمازِ جنازہ بیت مبارک میں صاحبزادہ مرزا مسرور احمد، امیر مقامی و ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ نے پڑھائی جس میں اہلِ ربوہ اور فیصل آباد سے تشریف لائے ہوئے دوستوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔

مرحوم موصی نہ تھے چنانچہ ان کی تدفین عام قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کی قبر پر سنگِ مرمر کا ایک تفصیلی کتبہ نصب ہے جس پر ان کے ذاتی کوائف کے علاوہ واقعہ قتل کی بعض تفصیلات اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے الفاظ میں ان کا ذکرِ خیر شامل ہے۔ اس کے علاوہ مرحوم کی بعض خوبیوں کو بزبانِ شعر بیان کیا گیا ہے اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے قبر پر نصب کتبے کی نقل:

....

ڈاکٹر شمس الحق طیب (......)

ولد ڈاکٹر فضل حق صاحب ربوہ

ولادت: پندرہ اپریل ۱۹۵۹ء

مرحوم...... (کو) ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ء کو رات کو ساحل ہسپتال، فیصل آباد سے واپس گھر جاتے ہوئے نامعلوم دشمنوں نے اغوا کر کے رات کی تاریکی میں (راہِ مولیٰ میں قربان) کر دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ فیصل آباد کے مشہور آرتھوپیڈک سرجن تھے۔ آپ کی شہرت بین الاقوامی طور پر مسلّم تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع (......) نے ان کی (وفات) پر تحریر فرمایا: ''عزیزم شمس صاحب ایک قابل ڈاکٹر تھے اور جماعت کے مخلص خادم تھے۔ ہر ایک کی خدمت کرنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کی یہ خوبیاں احمق دشمنوں کے لیے انگارہ بنی رہیں اور اندھی دشمنی میں ایک معصوم کی جان لیتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ تو اور بھی امر ہو گئے۔''

خوش نصیب و خوش خصال و خوش نوا و خوش خطاب
ہائے اوجھل ہو گیا اک سرجری کا آفتاب
شمس طیّب پر خدا کی رحمتیں ہوں بے شمار
زندگی بھی کامیاب اور موت بھی ہے کامیاب

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَنَوِّرْ مَرْقَدَہٗ وَ اَدْخِلْہُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْم

حضور نے مرحوم کی اہلیہ کے نام ۱۹ جنوری ۲۰۰۰ء کے مکتوب میں لکھا: ''عزیزم ڈاکٹر شمس الحق طیّب کی (وفات) کی خبر سن کر افسوس تو ہوا لیکن جو بلند مرتبہ خدا نے اپنے فضل سے انہیں عطا فرمایا ہے اور جس ابدی زندگی سے انہیں سرفراز فرمایا ہے اس پر بلاشبہ وہ ایک بے حد قابلِ رشک وجود بن گئے ہیں۔ وہ آپ کے ہی پیارے نہیں تھے، مجھے بھی بہت عزیز تھے۔ ابھی پچھلے سال ہی تو وہ مجھ سے یہاں مل کر گئے تھے۔ ان کا وہی کھلا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے ہے۔ اللہ انہیں اعلیٰ علیّین میں جگہ دے اور اپنے قربِ خاص سے نوازے۔''

مرحوم کی وفات پر ان کے ایک دوست آفتاب احمد کے قلم سے الفضل ۷ فروری ۲۰۰۰ء میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی دلرُبا شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بہت خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے آفتاب احمد کی یہ تحریر:

''آج سے قریباً تیس برس قبل کی بات ہے۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کے خوبصورت میدان میں صبح آٹھ بجے اسمبلی کے وقت سیّدنا حضرت مصلح موعود کی ایک نظم پڑھی جاتی تھی:

ذکرِ خدا پہ زور دے ، ظلمتِ دل مٹائے جا
گوہرِ شب چراغ بن ، دنیا میں جگمگائے جا

اس نظم کو پڑھنے والا لڑکا شمس الحق طیّب سکول کا ایک نہایت ہونہار طالب علم تھا۔ وہ نہ صرف اساتذہ کرام کا محبوبِ نظر تھا بلکہ دیگر طالب علم ساتھیوں میں بھی بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنی خوش الحانی کے علاوہ وہ ایک بہترین مقرر تھا۔ اسے اکثر بین الاضلاعی تقریری مقابلوں میں سکول کے ایک اور نامور طالب علم، ڈاکٹر عبدالخالق خالد کے ساتھ تعلیم الاسلام ہائی سکول کی نمائندگی میں شرکت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ ان دو بہترین مقررین کی موجودگی میں تقریری مقابلوں میں شرکت کرنے والے دیگر سکولوں کے مقررین کے لیے مقابلہ جیتنا تقریباً ناممکن سی بات سمجھی جاتی تھی۔ شمس الحق طیّب ایک بہترین طالب علم، پاکیزہ سیرت نوجوان اور نہایت مخلص ساتھی تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں، مسلسل محنت اور ربوہ کی پاکیزہ تربیت نے اس نوجوان کی شخصیت کو ایک آبدار موتی بنا دیا۔

پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد سے ایم بی بی ایس اور بعد ازاں آرتھوپیڈک سرجری میں ایف سی پی ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ فیصل آباد کے طبّی حلقوں میں ایک نمایاں آرتھوپیڈک سرجن کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے۔ گزشتہ دس سالہ طبی تاریخ کے دور میں بہت سے ایسے پیچیدہ اور مشکل آپریشن ان کے ریکارڈ پر ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ایک ماہر آرتھوپیڈک سرجن کی حیثیت سے شہرت عطا کی۔ چند برس قبل تحصیل سمندری کے ایک بچے کا بازو جو چارہ کاٹنے والی مشین کی زد میں آ کر کٹ گیا تھا ایک طویل آپریشن کے بعد نہایت کامیابی سے دوبارہ جوڑنے پر ملک کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ جنگ نے ان پر ایک خصوصی مضمون شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر ولی محمد ساغر جو پاکستان کے چند سینئر اور چوٹی کے سرجنز میں شمار ہوتے ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں: وہ اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک بہترین میڈیکل سٹوڈنٹ تھے۔ ان کا شمار میرے بہترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک نہایت لائق اور قابل سرجن تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہاتھ میں خدا نے بہت شفا رکھی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو کتنا حسین تھا کہ وہ اپنی اس صلاحیت کو سلسلہ سے وابستگی اور پیارے آقا کی دعاؤں کا اعجاز سمجھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم احمدی ڈاکٹروں کو عام ڈاکٹروں کی نسبت نمایاں اور منفرد ہونا چاہئے اور ہماری انفرادیت کا معیار ہماری لیاقت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ایک ہمدرد اور غریب پرور انسان کی حیثیت میں گردانا جائے کہ یہی ایک سچے اور مخلص احمدی ڈاکٹر کی شان ہے۔ سرزمینِ ربوہ سے ایک خاص محبت ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کا طرّہ امتیاز تھی چنانچہ اس شہر سے آنے والے مریضوں سے وہ خصوصی شفقت سے پیش آتے تھے۔ غریب اور حاجت مند مریضوں کی ہر ممکن مدد فرماتے۔ انہیں اپنے پاس سے دوائیاں دینے کے علاوہ ان کی مالی معاونت بھی فرماتے تھے۔ کیس کی نوعیت کے پیش نظر کسی دوسرے ماہر ڈاکٹر کی مشاورت درکار ہوتی تو اس مریض کو اپنے کسی دوست ڈاکٹر کے پاس رَیفر کرتے۔ آدھا مرض تو ان کی دلکش شخصیت، پُراعتماد گفتگو اور تسلی تشفی کے بول سن کر جاتا

رہتا۔ وہ ایک بہترین انسان اور قابل ڈاکٹر تھے۔ انہیں اپنے سبجیکٹ پر مکمل گرفت تھی۔ فوراً مرض کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ نسخے میں ایک یا دو دوائیاں تجویز کرتے۔ احمدی مریضوں کو بالخصوص دعا اور حضرت صاحب کی خدمت میں دعائیہ خطوط لکھنے کی ہدایت فرماتے۔ افسوس! ان کی ناگہانی وفات سے فیصل آباد کی سرزمین ایک عظیم مسیحا سے محروم ہوگئی ہے۔

آپ اکثر امیر صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں جمعۃ المبارک کے روز حلقہ کریم نگر میں جماعت کے زیر اہتمام اپنی اہلیہ کے ساتھ جو خود بھی ڈاکٹر ہیں فری میڈیکل کیمپ میں شرکت فرماتے تھے۔ اس فری میڈیکل کیمپ میں آپ کے علاوہ ڈاکٹر ولی محمد ساغر اور ڈاکٹر انیس احمد، ماہر دماغی امراض بھی شرکت کرتے تھے۔ جماعت احمدیہ کریم نگر، فیصل آباد کے ان فری میڈیکل کیمپوں سے احمدی احباب کے علاوہ غیر از احباب بھی استفادہ کرتے تھے چنانچہ ماسوائے ان امراض کے جن میں ڈاکٹروں کی طویل مشاورت درکار ہوتی ہے اکثر احباب کو اپنی جملہ بیماریوں کے سلسلہ میں ایک ہی چھت تلے رہنمائی میسر ہو جاتی تھی یا علاج کی مزید پیش رفت کے سلسلہ میں کوئی لیبارٹری ٹیسٹ وغیرہ درکار ہوتے تو مریض کو اس بارہ میں مشورہ دے دیا جاتا۔ یوں ان فری میڈیکل کیمپوں کے انعقاد سے مریضوں کا قیمتی وقت اور سرمایہ محفوظ رہتا یا بچ جاتا۔ فیصل آباد کی جماعت ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس پہلو سے بھی اپنی مخصوص دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

ان کی نمازِ جنازہ کے موقع پر امیر جماعت احمدیہ فیصل آباد، شیخ مظفر احمد نے نمائندہ الفضل سے اپنی گفتگو میں بتایا کہ ڈاکٹر شمس الحق طیّب "بہت نفیس مزاج، بے انتہا نرم دل اور غریبوں کا مفت علاج کرنے والے تھے۔ آپ بہت قابل ہونے کی وجہ سے مہنگے سرجن تھے لیکن جب کسی غریب آدمی نے کہا کہ وہ آپریشن کے اخراجات ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو دس دس ہزار روپے کی فیس معاف کر دیتے تھے۔ آج کل وہ دن کے وقت میاں محمد ٹرسٹ ہسپتال اور شام کو ساحل ہسپتال میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب احمدی ڈاکٹرز کی ایسوسی ایشن کی فیصل آباد شاخ کے صدر تھے۔ امیر صاحب نے بتایا کہ جب بھی ان کو دین کی خدمت کے لیے کہا جاتا سب کام چھوڑ کر حاضر ہو جاتے۔ میڈیکل کیمپس کے قیام میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن کے اجلاسات ان کے گھر پر ہوتے تھے۔ دونوں میاں بیوی جماعتی خدمت کے کاموں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔"

اس موقع پر فضل عمر ہسپتال کے ڈاکٹر عبدالخالق خالد نے بتایا کہ "ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کئی بار ربوہ آکر مریضوں کے آپریشن کیے۔ خصوصاً صاحبزادہ ڈاکٹر مرزا مبشر احمد کے بیرونِ ملک قیام کے دنوں میں فضل عمر ہسپتال تشریف لا کر کئی آپریشن کیے۔ انہوں نے بہت کم عمری میں غیر معمولی مہارت حاصل کی۔"

تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور سابق طالب علم جنہیں دشمنانِ احمدیت نے راجن پور میں راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا میاں اقبال احمد تھے جو میرے ایک کلاس فیلو، مقبول احمد ناصر کے چچازاد بھائی تھے۔ یوں تو میں نے اور مقبول نے بی اے کا امتحان اکٹھے ہی پاس کیا تھا لیکن ہمارے درمیان زیادہ بے تکلفی اس وقت ہوئی جب ہم دونوں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں ایم اے کے لیے داخلہ لیا اور یہ بے تکلفی اس قدر بڑھ گئی کہ

ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا شروع ہوگیا۔ مقبول کا گھر فیکٹری ایریا میں تھا۔ میں وہاں جاتا تو عموماً اقبال سے بھی ملاقات ہو جاتی اور یوں آہستہ آہستہ میری ان سے دوستی ہوگئی تاہم ایم اے کرنے کے بعد مقبول کراچی چلے گئے اور میں تلاشِ معاش میں الجھ کر یہیں رہ گیا لہٰذا بعد میں اقبال سے رابطہ نہ رہ سکا۔ ہاں! مقبول کی ہمشیرگان کی شادی کی تقاریب میں ان سے ایک دو بار ضرور ملاقات ہوئی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا اُن سے آخری رابطہ ۱۹۹۵ء میں ہوا جب امیر جماعت احمدیہ، ملتان ان کا ایک خط لے کر میرے پاس آئے۔ یہ خط جو ۲۶ نومبر ۱۹۹۵ء کو لکھا گیا تھا امیر جماعت احمدیہ، ملتان کے نام تھا لیکن اس میں مجھ سے ایک کام کے سلسلے میں مدد چاہی گئی تھی لہٰذا وہ یہ خط مجھے اس درخواست کے ساتھ پہنچانے آئے تھے کہ اگر میں سائل کا یہ مسئلہ حل کر سکوں تو وہ اسے میری مہربانی متصوّر کریں گے۔ یہ خط موصوف کی یادگار کے طور پر ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"عزیزم مکرم محمد مشتاق احمد صاحب بطور ٹائپسٹ (بلا تنخواہ) ڈپٹی کمشنر صاحب انکم ٹیکس، راجن پور کے پاس کام کر رہے ہیں۔ ان کے والد صاحب تمنائی ہیں کہ ان کو باقاعدہ محکمہ مذکور میں مستقل طور پر ملازم رکھ لیا جاوے۔ یہ کام محمد داؤد طاہر، کمشنر انکم ٹیکس ملتان کر سکتے ہیں۔ اگر جنابِ والا ان کو سفارش کریں کہ وہ یہ کام کر دیں تو اس سے ایک بے روزگار کو روزگار مل سکتے ہیں۔

میرے متعدّد احباب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس معاملہ میں جناب والا کو زحمت دینے کی عزت حاصل کروں۔ چونکہ آپ خدمتِ خلق کرتے رہتے ہیں لہٰذا آپ کی اس صفتِ حسنہ کے طفیل باامید مکمل تعاون عریضہ ہٰذا پیشِ خدمت ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ممکنہ حد تک ان سے ضرور تعاون فرمائیں گے۔"

وہ بعد میں امیر جماعت احمدیہ راجن پور رہے اور اسی دوران ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء کو راہِ مولیٰ میں قربان کر دیئے گئے۔ مجھے ان کی زبانی ان کے قبولِ احمدیت کے حالات سننے کا موقع نہ ملا تھا اور نہ ہی ان کے مضمون بعنوان "میری زندگی کے نشیب و فراز: اللہ تعالیٰ کے افضال اور قبولِ احمدیت کی یادیں" مطبوعہ الفضل انیس اکتوبر ۲۰۰۲ء میں یہ حالات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں چنانچہ یہ کتاب لکھتے ہوئے میں نے مقبول کے ساتھ رابطہ کیا اور درخواست کی کہ وہ مجھے یہ حالات لکھ کر بھجوا سکیں تو ان کا احسان ہوگا۔ انہوں نے ازراہِ مہربانی جو حالات لکھ کر بھجوائے ذیل میں قارئین کی نذر کیے جا رہے ہیں:

"میاں اقبال احمد میرے چچازاد بھائی تھے۔ میرے والدِ بزرگوار میاں عارف محمد نے بتوفیقہٖ تعالیٰ ۱۹۳۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ہاتھ پر احمدیت قبول کر لی تھی لیکن میرے چچا، میاں عنایت محمد متشدّد اور کٹّر قسم کے شیعہ ہی رہے۔ والد صاحب ہمیں تعلیمی و تربیتی اغراض کے لیے ۱۹۵۹ء میں ربوہ لے گئے جہاں میں نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ اقبال بہاولپور میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ابا جی کی تحریک پر ان کے والد نے انہیں ۱۹۶۰ء میں ربوہ کالج میں داخل کرا دیا۔

اقبال احمدیت کے شدید مخالف تھے اور مجھ سے اکثر بحث مباحثہ کرتے رہتے تھے۔ میں بھی اس وقت

تک مولویوں اور اپنے بعض غیراز جماعت رشتہ داروں کی باتوں میں آ کر احمدیت کے بارے میں کئی طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو چکا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے تو خود اس کے اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔

میں نے کسی بزرگ کا یہ فرمان کسی جگہ پڑھ رکھا تھا کہ جو شخص خالی الذہن ہو کر چالیس روز تک نماز اور نوافل پر زور دے اور اپنے خدا سے صراطِ مستقیم کی ہدایت چاہے تو وہ ضرور اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔ میں نے بھی نمازوں کا التزام کیا اور حتی الوسع نوافل پر زور دیا۔ دعائیں بھی کیں چنانچہ میں نے خواب دیکھا گویا جمعہ کا دن ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیتِ مبارک کے پرانے گیٹ کے سامنے تشریف فرما ہیں۔ نہایت سفید شلوار قمیص زیبِ تن فرمائے ہوئے ہیں۔ سفید اچکن پہنی ہوئی ہے۔ سر پر شملے والا سفید عمامہ ہے۔ سر کے سیاہ بال ریشمی ہیں اور ڈاڑھی کا ایک ایک بال الگ الگ نظر آتا ہے۔ میں نے آج تک ایسا روشن چہرہ، ایسے چمکتے بال اور ایسی رِیش مبارک نہیں دیکھی۔ رنگ گندمی لیکن ہلکی سرخ چھاپ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن بند۔ چہرۂ مبارک تھوڑا لمبوترا، قد درمیانہ لیکن مجمع میں بے حد وجیہہ نظر آتے ہیں۔ آقائے نامدار کا چہرۂ مبارک پہاڑیوں کی طرف ہے۔ اس دور کے عمائدینِ سلسلہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں اور جو لوگ دُور ہیں وہ آقائے نامدار کو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے ہیں۔ ان خوش قسمتوں میں ایک میں بھی تھا جو حضور سے آٹھ یا دس گز کے فاصلے پر شمال مغربی کونہ میں کھڑا تھا۔ آناً فاناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خوبصورت اور پُرکشش آنکھیں کھولیں اور بلانے کے انداز میں گویا ہوئے: ''خلیفہ محمود!'' یہ آواز سن کر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی جو اس وقت بیت مبارک کے پرانے گیٹ کے جنوبی کونہ میں کھڑے تھے تیز قدموں سے آنحضور کے قریب آئے اور عرض کی: ''یا رسول اللہ!'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت فرمایا: ''اشاعتِ دین کی صورتِ حال کیسی جا رہی ہے'' حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! بیرونی ممالک میں تو لوگ کلمہ پڑھ کر حضور کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں لیکن پاکستان میں مولوی بہت نفرت پھیلاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی مبارک انگلیاں اکٹھی کیں اور اسی حالت میں اپنے ہاتھ کو نیچے کی طرف جھٹکا دیتے ہوئے فرمایا: ''ان مولویوں کو چھوڑیں۔ آپ کوشش جاری رکھیں۔ میں دعا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب و کامران کرے گا۔'' ایسا حضور نے دو دفعہ فرمایا۔ اس وقت حضور کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پر غصہ سے شکن پڑ رہے تھے۔

اس کے بعد میری نیند کھل گئی اور میں وضو کر کے نمازِ تہجد اور فجر کے لیے دارالنصر غربی والی بیت میں چلا گیا۔ صبح کالج جانے سے پہلے دل کی میل کچیل دھو کر احمدیت کے چشمۂ صافی سے اپنا اندرونی گند صاف کیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت اقدس میں بیعت کا خط لکھ دیا۔

یہی وہ واقعہ تھا جو اقبال کی ہدایت و رہنمائی میں ممد اور معاون ثابت ہوا۔ وہ اس طرح کہ اقبال مجھ سے احمدیت کے متعلق گفتگو کے دوران اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے والد نے احمدیت قبول کر کے خاندان کا بھٹہ

بٹھا دیا ہے اور اب میں نے ضلالت اختیار کر لی ہے۔ میں انہیں سمجھاتا اور رفقائے حضرت مسیح موعود کے قبولِ احمدیت کے واقعات سناتا لیکن ان کی ایک ہی رَٹ ہوتی اور وہ یہ کہ احمدی غربت کی وجہ سے عام طور پر اپنے گھروں میں بھی اور علی الخصوص جلسہ سالانہ کے دنوں میں دال کھاتے ہیں جو اُن کے سر کو چڑھ جاتی ہے اور بوجہ بدہضمی و خمار انہیں اُوٹ پٹانگ خوابیں آتی ہیں جنہیں وہ سچ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اس پر میں نے انہیں اپنے قبول احمدیت کا واقعہ سنایا۔ قبل ازیں میں جھجکتا تھا کہ میرے جیسا گنہگار انسان اور ایسی خواب لہٰذا اس کا اظہار مناسب نہیں لیکن جب میں نے اقبال کو یہ خواب سنایا اور احمدیت پر غور کرنے کی تحریک کی تو وہ کہنے لگے کہ تم نے اُس رات ضرور دال کھائی ہوگی۔ میں نے کہا پہلے آپ کے تایا نے دال کھائی، اب میں نے بھی وہی دال کھالی ہے۔ دیکھو دال کھانے والوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زیارت سے مشرف کیا ہے۔ آپ بھی ذرا یہ دال کھا کر دیکھیں تو سہی کیسا نشہ دیتی ہے۔

میری یہ بات سن کر اقبال نے مجھ سے قرآن شریف مانگا۔ میں نے تفسیرِ صغیر دے دی۔ پھر کشتی نوح دے دی اور ساتھ ہی غالباً حقیقۃ الوحی یا ازالہ اوہام انہیں پڑھنے کے لیے دی۔ ہمارے گھر میں تفسیر کبیر کی ایک آدھ جلد پڑی تھی۔ وہ بھی انہوں نے لے لی اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جو بیٹھک سے ملحق تھا بند ہو کر ان کتب کا مطالعہ کرنے لگے۔ میرے ایک ماموں زاد، ناصر جو ہم سے چار یا پانچ سال چھوٹے تھے انہیں اسی کمرہ میں کھانا پہنچا دیتے۔ جائے نماز دے دی تھی۔ اقبال دس بارہ دن کمرہ میں بند رہے۔ اچانک ایک روز انہوں نے دروازہ کھولا اور بہ آواز بلند میرا نام لے کر مجھے پکارا: ''مقبول! مقبول!'' میں ڈر گیا ہوں۔ میں نے پوچھا: ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' کہنے لگے: ''میں سویا ہوا تھا۔ یوں کہو نیم بیدار تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت فاطمۃ الزہرا میرے پاس تشریف فرما ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ کیا میں نے کتب کا مطالعہ کر لیا ہے۔ توبہ توبہ! کہاں میں اور کہاں حضرت فاطمۃ الزہرا، استغفراللہ۔ میں کہیں مارا ہی نہ جاؤں۔'' میں نے انہیں پیار سے سمجھانے کی کوشش کی: ''یہ پاک اور مطاہر لوگ شیطانی شکل میں کسی کو نظر آ ہی نہیں سکتے۔ سنیں! آپ نے مجھے کہا تھا کہ ہم لوگ دال کھا کر خواب کو الہام و وحی بنا لیتے ہیں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ ہمیں بھی کچھ نظر آئے تو تب ہے! اب سنائیں کچھ نظر آیا ہے یا نہیں؟ اس سے زیادہ کیا خوش بختی ہو سکتی ہے کہ خاتونِ جنت آپ کو نظر آئی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ کیا آپ نے کتب کا مطالعہ کر لیا ہے؟ اقبال آپ کتنے مبارک ہیں۔ آخر آپ اور کیا دیکھنا چاہتے ہیں اس سے زیادہ رہنمائی سیدھے راستے کے لیے۔ ڈریں نہیں۔ صراطِ مستقیم پر قدم ماریں۔'' اقبال اسی دن بہشتی مقبرے گئے اور وہاں سے سیدھے قصرِ خلافت چلے گئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے دستِ حق پرست پر بیعت سے مشرف ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۶۱ء کا ہے۔

پھر وہی اقبال تعلیم الاسلام کالج کی اردو سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور محلّہ دارالنصر غربی کے زعیم بھی رہے۔ انہوں نے ایف اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں میں داخلہ لے لیا۔ تھرڈ ایئر وہاں سے کیا لیکن مخالفت کی بنا پر گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں منتقل ہو گئے اور بی اے وہاں سے پاس کیا۔ انہوں

نے جماعتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ڈویژنل قائد خدام الاحمدیہ بھی رہے۔ احمدیت سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ جماعت احمدیہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے نائب امیر رہے اور راجن پور کے ضلع بننے پر وہاں کے امیر ضلع مقرر ہوئے۔ بیت الذکر اور مربی ہاؤس کے لیے اپنی زمین میں سے جگہ دی۔ بیت الذکر میں پنکھوں اور دیگر اخراجات کا بیڑا اٹھایا۔ غرضیکہ وہ عجیب شخص تھا جو احمدیت پر مرمٹا۔ وہ رسوم اور بدعات کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے جماعتی مقدمات اور افراد جماعت احمدیہ کے خلاف راجن پور، جام پور، ڈیرہ غازی خاں، لیہ اور ملتان تک مذہبی مقدمات کی پیروی کی۔ احمدیت کے مخالفوں، مولویوں اور دہشت گردوں نے جماعت کے اس بطلِ جلیل کو ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء رات نو اور دس بجے کے درمیان ان کے دفتر میں راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ میرے عم زاد ہونے کے علاوہ بہنوئی بھی تھے اور میری دوسری بیوی کے بھائی بھی لہٰذا میرا ان کے ساتھ دوہرا تہرا رشتہ تھا۔"

اس واقعے کی خبر الفضل نے ۲۷ فروری ۲۰۰۳ء کے اخبارات میں ان الفاظ میں شائع کی:

"نذر احمدی، معروف قانون دان اور خادمِ سلسلہ، امیر ضلع راجن پور

مکرم میاں اقبال احمد صاحب ایڈووکیٹ راہِ مولیٰ میں قربان کر دیئے گئے

۱۹۶۱ء میں بیعت کی، اسیرِ راہِ مولیٰ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا

احبابِ جماعت کو نہایت دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع راجن پور محترم میاں اقبال احمد صاحب ایڈووکیٹ مورخہ ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء بروز منگل نامعلوم حملہ آوروں کی فائرنگ سے ۶۱ سال کی عمر میں (راہِ مولیٰ میں قربان) کر دیئے گئے۔

تفصیلات کے مطابق مورخہ ۲۵ فروری رات ساڑھے نو بجے آپ اپنے دفتر میں جو آپ کے مکان کے ایک حصہ میں ہے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اس وقت ان کے پاس ان کا بھائی (جو غیر از جماعت ہیں) اور بیٹی بھی بیٹھی ہوئی تھی کہ دو پگڑی پوش آدمی دفتر میں آئے۔ انہوں نے میاں صاحب کی بیٹی کو کہا کہ تم اندر چلی جاؤ۔ اس کے اٹھتے ہی انہوں نے فائرنگ کر دی اور میاں اقبال احمد صاحب موقع پر ہی (راہیٔ ملکِ عدم) ہو گئے......

محترم میاں اقبال احمد صاحب تحصیل چشتیاں ضلع بہاولنگر کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور پھر میٹرک کے بعد تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں تعلیم حاصل کی۔ تیئس اپریل ۱۹۶۱ء کو بیعت کر کے سلسلۂ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۰ء کو نظام وصیت میں شامل ہوئے۔ کئی سال پہلے دفتر وصیت میں اپنے تجہیز و تکفین کے اخراجات کی رقم جمع کروا چکے تھے۔ آپ ایم اے اسلامیات اور ایل ایل بی پاس تھے اور راجن پور میں وکالت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔

۱۹۷۱ء میں آپ نائب امیر ضلع ڈیرہ غازی خان مقرر ہوئے اور جب ۱۹۸۰ء میں راجن پور ضلع بنا تو آپ راجن پور کے امیر ضلع مقرر ہوئے اور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء کے عرصے کے علاوہ تا حال اس عہدے پر خدمات

بجا لا رہے تھے۔ مجالسِ شوریٰ پر بھرپور شرکت کرتے اور اپنی آراء پیش کرتے۔ آرڈیننس کے تحت آپ پر متعدد مقدمات قائم ہوئے اور آپ کو اسیرِ راہِ مولیٰ رہنے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ روزنامہ الفضل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔"

میاں اقبال احمد کی تدفین ۲۷ فروری ۲۰۰۳ء کو ربوہ میں عمل میں آئی۔ اس کی خبر دیتے ہوئے روزنامہ الفضل نے اپنی ۲۸ فروری ۲۰۰۳ء کی اشاعت میں لکھا:

"مورخہ ۲۵ فروری ۲۰۰۳ء کو راہِ مولیٰ میں قربان ہونے والے امیر ضلع راجن پور محترم میاں اقبال احمد صاحب، ایڈووکیٹ کو مورخہ ۲۷ فروری ۲۰۰۳ء بروز جمعرات ربوہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آپ کی میت ۲۶ فروری کی رات ساڑھے آٹھ بجے ربوہ پہنچی۔ دارالضیافت میں جماعتی عہدیداران استقبال کے لیے موجود تھے۔

مورخہ ۲۷ فروری کی صبح نو بجے احاطہ دفاتر صدر انجمن احمدیہ پاکستان میں آپ کی نمازِ جنازہ محترم صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب ناظرِ اعلیٰ و امیر مقامی نے پڑھائی جس میں ربوہ اور بیرون جات سے ہزاروں افراد نے شرکت کی اور پھر قطاریں بنا کر اپنے (مرحوم) بھائی کا آخری دیدار کیا۔ خدام ربوہ نے ایک دائرہ بنا کر آپ کے جسدِ خاکی کو اعزاز کے ساتھ قبرستان نمبر ۱ میں پہنچایا جہاں آپ کی تدفین مکمل ہونے پر محترم صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب نے دعا کروائی۔ قبل ازیں مورخہ ۲۶ فروری کو دن بارہ بجے راجن پور میں آپ کی نمازِ جنازہ مکرم ملک خالد مسعود صاحب ناظر امور عامہ نے پڑھائی جو (اس واقعہ) کے بعد ایک وفد کے ہمراہ راجن پور پہنچ گئے تھے۔"

زمانے کی ریت کے عین مطابق اس بہیمانہ قتل پر غیر از جماعت حلقوں نے عمومی طور پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا البتہ روزنامہ جنگ، لاہور (۲۷ فروری ۲۰۰۳ء) کی اطلاع کے مطابق: ڈسٹرکٹ بار راجن پور کے صدر سردار حبیب الرحمٰن خان دریشک نے اس قتل کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس وحشیانہ قتل پر دو روز سوگ منایا جائے گا اور اس دوران عدالتوں میں کام بند رہے گا۔ مزید برآں اسلامی تحریک پاکستان راجن پور کے ضلعی صدر سیّد احسن حسین شمسی، ایڈووکیٹ نے اس واقعے کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے اسے کھلی دہشت گردی قرار دیا۔

مرحوم نے دو بیٹے: سعید احمد اور حمید احمد اور تین بیٹیاں: نمود سحر، شیریں ثمر اور امۃ النور اپنی یادگار چھوڑیں۔

اس حادثۂ فاجعہ کے موقع پر عبدالسلام اسلام نے کیا خوب کہا تھا:

تیرا مٹنا ہے ابھرنے کے لیے
موت تیری زندگانی کا ثبوت
زندۂ جاوید قربانی تری
مکر اُن کا مثلِ بیت عنکبوت
حضرتِ طاہر کا تُو حلقہ بگوش
حضرتِ احمد کا تُو زندہ سپوت

کیوں نہ پائے گا ابد تک زندگی
تیرے ماتھے پر ہے لکھا لَا یَمُوْت
ایک ہنگامہ ہے تیری روح میں
گرچہ لب پہ ثبت ہے مہرِ سکوت
پیشِ دشمن تو کُجا لرزیدہ ای
من نمی دانم تُو چہ نوشیدہ ای

میاں اقبال احمد کے بعد اب ذکر کیا جارہا ہے تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ کا جنہوں نے ۲۸ مئی ۲۰۱۰ء کو بیت النور، ماڈل ٹاؤن پر دہشت گردوں کے حملہ کے دوران اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ میری مراد سیّد ارشاد علی سے ہے جو تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان کے ایک استاد سیّد سمیع اللہ شاہ کے صاحبزادے تھے۔

۸۸۔۱۹۸۷ء کے دوران جب میری تقرری فیصل آباد میں تھی تو میرا اور ان کا دفتر ملحق تھا۔ ایک بار وہ تعلیم الاسلام کالج ہی کے ایک سابق طالب علم، ایمپلائز اولڈ ایج بینیفیٹس کارپوریشن والے محمد اکرام کے ہمراہ مجھ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تو آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۲۰۰۵ء میں جب میرا تقرر بطور ممبر، پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور ہوا تو میں نمازِ جمعہ کے لیے بیت النُّور، ماڈل ٹاؤن جانے لگا۔ میں گھٹنوں میں تکلیف کی وجہ سے نیچے بیٹھنے سے قاصر تھا۔ میرے جیسے افراد کے لیے بیتُ الذّکر کے صحن میں کچھ کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ میجر جنرل ناصر احمد، سعید درد، ارشاد علی شاہ اور سات آٹھ دیگر دوست وہیں بیٹھا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوتی تو بہت خوشی کا اظہار کرتے۔ وہ شیخ محبوب عالم خالد کے ایک بیٹے، ناصر خالد کے بھی دوست تھے چنانچہ نماز جمعہ کے بعد کئی بار ہم بہت دیر تک باہر کھڑے رہ کر خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ جس روز بیت النُّور پر دہشت گردوں نے دھاوا بولا کرسیوں پر بیٹھنے والے اکثر لوگ اس حملہ کا نشانہ بن گئے۔ ارشاد علی بھی ان میں سے ایک تھے۔

پرویز پروازی نے اپنے مضمون ''لاہور کے بعض جاں نثاروں کا ذکرِ خیر'' مطبوعہ الفضل ۱۲ نومبر ۲۰۱۰ء میں موصوف کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''قادیان میں ہمارے ایک سکول کے استاد تھے، سیّد سمیع اللہ شاہ صاحب۔ نہایت صاحبِ ذوق اور مہربان استاد تھے۔ انگریزی پڑھاتے تھے۔ رومی ٹوپی پہنتے تھے، ساتھ میں سوٹ۔ پھر خدا معلوم تقسیم کے بعد کہاں جا بسے۔ چنیوٹ میں ان سے پڑھنا یاد نہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے سیّد ارشاد علی شاہ کالج میں تھرڈ ایئر، فورتھ ایئر میں ہمارے کلاس فیلو تھے۔ اردو میں ہم تین ہی طالب علم تھے: ارشاد علی شاہ، اکرم میر اور میں۔ بی اے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں چلے گئے اور ایک بار اچانک سالوں بعد ملاقات ہوئی تو فیصل آباد میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے منیجر تھے۔ ان کا دفتر کالج جاتے ہوئے ہماری راہ میں تھا اس لیے کبھی کبھار ہم ارشاد کے پاس رک جاتے اور چائے وغیرہ پیتے، گپ لگاتے۔ باپ سے خوش مذاقی کا ورثہ اس

نے پایا تھا۔ ان کے بھانجے، سیّد سجاد حیدر کے بیٹے، سیّد نعیم حیدر ہمارے شاگرد تھے۔ کسی زمانے میں لاہور کے ایک نیم ادبی، نیم سماجی پرچہ دھنک کے ایڈیٹر ہوتے تھے۔ پھر خدا جانے کہاں گئے، سننے میں نہیں آئے۔ سیّد ارشاد علی شاہ سے ربوہ میں جلسہ سالانہ پر ملاقات ہوتی اور بس۔ اس سے زیادہ ہمیں کبھی پتا نہ چلا کہ شاہ صاحب کہاں ہیں اور ان کے کیا شغل ہیں مگر احمدیت کا رشتہ ایسا رشتہ ہے جو چُھپائے نہیں چُھپتا نہ بھلائے بھولتا ہے۔ پر ہم تو کلاس فیلو بھی تھے۔ لاہور کے جاں نثاروں کا ذکر سن لیا مگر ارشاد کا نام ذہن میں نہ آیا۔ پھر حضرت اقدس نے ان کا ذکرِ خیر کیا تو پتا چلا کہ ہمارا ''چھادو'' بھی ان جاں نثاروں میں شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے اور اس کی اولاد کا حافظ و ناصر ہو۔ سیّد سمیع اللہ شاہ صاحب تو سیالکوٹ کے پرانے احمدی خاندان سے تھے۔ غالباً چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے گہرے دوست، سیّد انعام اللہ شاہ صاحب سے ان کی قرابت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سیّد ارشاد علی شاہ کی وجہ سے اس خاندان کو چار چاند لگا دیئے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اپنے خطبۂ جمعہ فرمودہ ۱۸ جون ۲۰۱۰ء میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''...... مرحوم گوچہ میر حسامُ الدین، سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا حضرت سیّد خصیلت علی شاہ ...... اور نانا حضرت سیّد میر حامد شاہ سیالکوٹی ...... حضرت مسیح موعود کے رفقائے خاص میں شامل تھے۔ سیالکوٹ میں قیام کے دوران حضرت مسیح موعود نے ان کے گھر قیام کیا۔ ان کے والد صاحب جامعہ احمدیہ، چنیوٹ اور ربوہ کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنا گھر جماعت کو وقف کر دیا تھا۔

...... مرحوم بی اے کے بعد ...... اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھرتی ہوئے اور ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر ڈپارٹمنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ گارڈن ٹاؤن میں اس وقت سیکرٹری مال کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ...... ان کی عمر اسّی سال تھی (۔)

ان کے گھر والے کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے جانے سے قبل گھر میں سینے پر ہاتھ باندھے لیٹے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج سکون کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے چلے گئے اور جاتے ہوئے آواز دی کہ میں جا رہا ہوں۔ پھر دوسری دفعہ کہا کہ میں جا ہی رہا ہوں۔ داماد کے ساتھ بیتُ النُّور میں باہر صحن میں پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے، شروع کے حملے میں کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو فوری طور پر ہال کے اندر بھجوا دیا گیا جہاں ان کی (وفات) ہوئی۔ جسم پر تین گولیاں لگی ہوئی تھیں۔

ان کے اہلِ خانہ نے بتایا کہ کافی سال قبل ...... مرحوم نے بتایا کہ ان کو آواز آئی ...... اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ ...... کہتے ہیں: مجھے آواز آئی لیکن مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ کہتے ہیں ...... دس پندرہ بیس دن پہلے مجھے یہ آواز آئی کہ We receive you with open arms with red carpet ...... مرحوم نے ...... چند دن قبل خواب میں ایک گھر دیکھا۔ اس میں ایک خوبصورت بگھی آ کر رکی اور آواز آئی ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد آئے ہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے کہا کرتے تھے کہ میں اپنے آباء و اجداد کی طرح دین کی

خدمت نہیں کر سکا۔ اس سے بڑے پریشان ہوتے تھے۔ حقوق العباد کی ادائیگی ان کا خاص وصف تھا۔ صلہ رحمی کرنے والے تھے اور بڑے زندہ دل آدمی تھے۔"

میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے تعلیم الاسلام کالج کے سابق طلبہ کا تذکرہ امریکہ کے مشہور ماہرِ امراضِ قلب، ڈاکٹر مہدی علی بشیر الدین قمر کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جنہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد ایف ایس سی ۱۹۸۲ء میں تعلیم الاسلام کالج سے کی تھی۔

وہ طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں وقفِ عارضی کے لیے آئے ہوئے تھے کہ ۲۶ مئی ۲۰۱۴ء کی صبح بہشتی مقبرہ محلّہ دارالفضل، ربوہ کے گیٹ کے سامنے دو موٹر سائیکل سوار قاتلوں کی فائرنگ کا نشانہ بن کر موقع پر ہی راہِ مولیٰ میں قربان ہو گئے۔ اگلے جمعہ کے روز حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اپنے خطبے میں مہدی علی کے بہیمانہ قتل اور اس قتل پر عالمی پریس کے ردعمل کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ چونکہ حضور کے اس خطبے میں ڈاکٹر مہدی علی کے خاندان، ان کی شخصیت، جماعت کے لیے ان کی خدمات، ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا اعتراف اور اس واقعے پر انٹرنیشنل پریس کے ردعمل کا تفصیلی ذکر موجود ہے لہٰذا تعلیم الاسلام کالج کے اس ہونہار طالب علم کے ذکرِ خیر کے طور پر اس خطبے سے ذیل کے تفصیلی اقتباسات نقل کئے جا رہے ہیں۔ حضور نے فرمایا:

"مکرم ڈاکٹر مہدی علی جو ہارٹ سپیشلسٹ تھے اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ دو یوم قبل امریکہ سے وقفِ عارضی کے لیے طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی رہائش بھی وہیں تھی اور ۲۶ مئی ۲۰۱۴ء کی صبح بعد نماز فجر اہلیہ، ایک بیٹے اور عزیزہ کے ہمراہ بہشتی مقبرے دعا کے لیے جا رہے تھے۔ کچی سڑک پر بہشتی مقبرے کے گیٹ کے سامنے پہنچے تھے کہ ایک موٹر سائیکل پر سوار دو افراد آئے جنہوں نے آ کر ڈاکٹر صاحب پر فائرنگ کر دی اور فائر کر کے مین روڈ پر سرگودھا کی طرف فرار ہو گئے اور گیارہ گولیاں فائر کیں جو اُن کو لگیں جس سے ڈاکٹر صاحب کی موقع پر ہی (وفات) ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب ...... کے خاندان کا تعلق گوکھووال ضلع فیصل آباد سے ہے۔ ان کے خاندان میں احمدیت کا نفوذ آپ کے والد مکرم چوہدری فرزند علی صاحب کے ذریعے سے ہوا تھا جنہوں نے اوائل جوانی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے ہاتھ پر بیعت کر کے احمدیت میں شمولیت اختیار کی تھی......

ڈاکٹر صاحب ...... ۲۳ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ربوہ میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش کے روز حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کا وصال ہوا۔ اسی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب کے والد نے ان کے نام کے ساتھ "قمر" کا لقب لگا دیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے نانا...... نے حضرت مصلح موعود کے نام کا حصہ "بشیر الدین" بھی ساتھ شامل کر دیا چنانچہ ڈاکٹر صاحب...... کا پورا نام "مہدی علی بشیر الدین قمر" ہو گیا اور یہی نام ہر جگہ لکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب...... نے ابتدائی تعلیم ربوہ میں ہی تعلیم الاسلام ہائی سکول اور کالج میں پائی۔ نہایت ذہین اور ہونہار طلبہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ پھر پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد میں میڈیکل کی تعلیم شروع کی۔ وہاں پڑھائی

کے دوران احمدیت کی وجہ سے طلبہ نے کافی مخالفت کی، کتابیں اور سامان وغیرہ جلا دیا جس کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے واپس ربوہ آ گئے۔ پھر حالات بہتر ہوئے تو دوبارہ جا کر تعلیم شروع کی۔ ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۸۹ء سے جولائی ۱۹۹۱ء تک دو سال فضلِ عمر ہسپتال، ربوہ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بعدازاں اپنی والدہ کے ساتھ کینیڈا منتقل ہو گئے۔ کینیڈا میں میڈیکل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ہاؤس جاب کیا۔ پھر برُوک لِن یونیورسٹی، نیویارک چلے گئے۔ وہاں کارڈیالوجی میں سپیشلائزیشن کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کولمبس، اوہایو، امریکہ میں آپ نے جاب شروع کیا۔ وہیں پھر مستقل رہائش اختیار کر لی اور طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ کے قیام کے بعد جب میں نے ڈاکٹروں کو تحریک کی تو یہ بھی وقفِ عارضی کے لیے آتے تھے۔ اس سے پہلے بھی دو دفعہ آ چکے تھے۔ اب تیسری دفعہ تشریف لائے تھے۔ جماعتی طور پر مختلف سطح پر ان کو کام کرنے کی توفیق ملی۔

بڑے نرم مزاج، نرم خُو اور نرم رُو شخصیت کے مالک تھے۔ ہر کسی کے ساتھ ہمدرد اور دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا یا تنگی ترشی نہیں کی ...... مہمان نوازی ان کا ایک بہت بڑا شیوہ تھا۔ جماعتی تقریبات کے موقع پر اپنے گھر میں مہمان ٹھہرانے کا اہتمام کرتے۔ پھر ایئرپورٹ سے لانے لے جانے کا کام کرتے۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی کثرت سے امداد کیا کرتے تھے۔

(مرحوم) اپنے شعبے کے علاوہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا مجموعہ کلام "برگِ خیال" کے نام سے طباعت کے مراحل میں ہے۔ اسی طرح کیلیگرافی بھی اچھی کر لیتے تھے۔

ان کا خلافت سے انتہائی گہری محبت اور خلوص کا تعلق تھا اور ہر تحریک پر فوری لبیک کہنے والے تھے۔ بڑھ چڑھ کر چندہ دیتے تھے۔ کولمبس کی بیت کی تعمیر میں بھی ایک بہت خطیر رقم انہوں نے پیش کی۔ اس کی زیبائش اور آرائش کا کام بھی کیا۔ اسی طرح اپنے آبائی محلّہ دارالرحمت غربی ربوہ کی بیت کے لیے بھی بڑی رقم دی۔ طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ کے لیے بھی عطیات کی فراہمی میں پیش پیش رہتے تھے۔ دعوت الی اللہ کا جنون کی حد تک ان کو شوق تھا اور دینی مطالعہ بھی اللہ کے فضل سے کافی تھا۔ یُوٹیوب پر غیر احمدیوں اور معترضوں کے اعتراضوں کے مؤثر جواب دینے میں مستعد تھے۔

ان کی شاعری کی بات کی تھی تو وہ نمونۃً میں بتا دوں۔ ۲۸ مارچ ۲۰۱۴ء کو انہوں نے جو اپنی آخری نظم کہی اس کے دو تین شعر یہ ہیں:

موت کے رُوبرو کریں گے ہم
زندگی کے حصول کی باتیں

نہ مٹا پائے گا یزید کوئی
حق ہیں ابنِ بتول کی باتیں

سب فنا ہو گا پر رہیں گی تمام
باقی اللہ رسول کی باتیں

......ان کو ربوہ سے ایک خاص محبت تھی جو ساری زندگی آپ کے دل میں رہی یہاں تک کہ اپنی جان بھی اسی سرزمین ربوہ میں اپنے خدا کے حضور پیش کی۔ والدین کی خواہش پر ڈاکٹر بنے اور بہت پائے کے ڈاکٹر بنے اور کئی اعزازات حاصل کئے۔ یہ معمولی ڈاکٹر نہیں تھے۔ طبیعت میں بہت ٹھہراؤ تھا۔ کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ علم کی جستجو رہی۔ بچوں کی بھی بہت اعلیٰ تربیت کی۔ مصروف الاوقات ہونے کے باوجود اپنی بیوی بچوں کے لیے وقت نکالتے۔ اپنے بچوں کو قرآن کریم بھی انہوں نے خود سکھایا اور پڑھایا......

دوسروں کے معاملے میں عفو سے کام لینے والے۔ خود تکالیف برداشت کر لیتے تھے اور پوچھنے پر یہی بتاتے تھے کہ اللہ کی رضا کی خاطر کر رہا ہوں......

ربوہ کا پہلا بلڈ بنک بھی ڈاکٹر مہدی علی ......اور ڈاکٹر سلطان مبشر اور ڈاکٹر محمود نے شروع کیا لیکن اس میں زیادہ کوشش ڈاکٹر مہدی علی کی تھی۔ اب یہ بلڈ بنک اللہ تعالیٰ کے فضل سے اردگرد کے لوگوں کو بھی جب بھی خون کی ضرورت پڑے، خون مہیا کرتا ہے......

خلافت سے ایک والہانہ رنگ میں عشق تھا اور جب میں ۲۰۱۲ء میں وہاں کولمبس امریکہ کے دورے پر گیا ہوں تو رات بھر جاگ کر (بیت الذکر) کی آرائش اور خطاطی کا کام کرتے رہے۔ کئی بینر لگائے اور ان کے بھائی ہادی صاحب بھی ساتھ تھے اور رات بھر (بیت الذکر) میں کام کرنے کے بعد صبح اپنے ہسپتال کی ڈیوٹی بھی پوری نبھائی اور پھر یہ کہ (بیت الذکر) کی سجاوٹ پر جو بھی خرچ ہوا انہوں نے ہمیشہ اپنی جیب سے ادا کیا اور جب (بیت الذکر) میں کام کر رہے ہوتے تھے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ آپ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ نہایت سادگی سے اپنی خدمت کر رہے ہوتے تھے۔ مالی قربانی میں صف اول میں رہے......

ڈاکٹر نوری جو ربوہ میں طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں ہمارے ڈاکٹر ہیں کہتے ہیں: ڈاکٹر مہدی علی صاحب مریضوں میں بے حد مقبول تھے۔ غریب اور نادار مریض آپ کے پاس بہت خوشی اور امید سے علاج کے لیے آتے تھے۔ ذاتی دلچسپی اور توجہ سے ہر مریض کو دیکھتے۔ طبیعت میں انتہائی سادگی تھی۔ لباس اتنا سادہ ہوتا کہ ان کو مریضوں کے درمیان دیکھ کر پہچاننا مشکل ہوتا تھا۔ طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں خدمت کے لیے اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر اور بغیر کسی تکلف کے پیش کیا۔ ارادے کے بہت پکے تھے۔ بے لوث خدمت خلق کے لیے ان کا اس ہسپتال میں آتے رہنا اپنے پیشہ کے ساتھ پُرخلوص وابستگی کا ثبوت ہے......

ڈاکٹر سلطان مبشر لکھتے ہیں کہ غریبوں کا بہت خیال رکھنے والے تھے۔ گزشتہ سال آئے تو بنک اکاؤنٹ کھلوا کے مجھے بتایا کہ میں نے یہاں پیسے جمع کروا دیئے ہیں ان سے ضرورت مندوں کی مدد کر دیا کرو۔ ایک دن فون آیا کہ فلاں جماعت کا سابق کارکن ہے۔ اب وہ کارکن نہیں اور ان کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ مکان بنا رہے ہیں تو ان کو ایک لاکھ روپیہ دے دو۔ اسی طرح یہ بھی کہا کہ اگر کوئی سٹوڈنٹ جو میڈیکل کالج میں پڑھنا چاہے تو میں اس کا سارا خرچ دوں گا......

''ڈان'' اخبار کی ویب سائیڈ پر ڈاکٹر صاحب (کے قتل) پر جماعت احمدیہ کی مخالفت کا پس منظر بیان

کر کے یوں ذکر کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر مہدی علی قمر صاحب کوئی عام ڈاکٹر نہیں تھے۔......سال ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں امریکہ کے بہترین فزیشنز میں ان کا شمار ہوا۔ اس کے علاوہ سال ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۶ء، ۲۰۰۷ء میں مسلسل تین سال تک اور ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۲ء میں مسلسل چار سال تک امریکہ کے بہترین کارڈیالوجسٹس میں ان کا شمار ہوا۔ نیز انہیں امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے بھی ایوارڈ ملا۔ پھر اخبار والے لکھتے ہیں کہ میں نے انٹرنیٹ پر مہدی صاحب کا ایک پروفائل اور ان کی مسکراتی ہوئی روشن تصویر دیکھی جس کے ساتھ ان کے یہ الفاظ لکھے تھے کہ میں اعلیٰ ترین پیشہ وارانہ معیار کو قائم رکھتے ہوئے مریض کی بہترین دیکھ بھال پر یقین رکھتا ہوں تا کہ ان اداروں کی ترقی میں معاون ثابت ہو سکوں جن سے میں وابستہ ہوں۔ میری ترجیح پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو قابلیت، سچائی اور دیانت داری سے نبھانا ہے اور یقیناً قابلیت، سچائی اور دیانت داری سے انہوں نے یہ سب نبھایا۔

پھر آخر میں لکھنے والے نے لکھا کہ ڈاکٹر مہدی علی قمر! میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو بچا نہیں سکا لیکن میں نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ میں نے اپنی سلامتی خطرے میں ڈال دی ہے تا کہ کل میں ایسے نہ مروں کہ میری آواز نہ سنی گئی ہو۔

پھر پاکستان، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور دنیا کے متعدّد اخباروں اور نیوز چینلز نے اس نہایت بہیمانہ قتل اور انسانیت سوز فعل کی سخت مذمت کی ہے۔ اب تک ان اخباروں اور دیگر ذرائع ابلاغ کی تعداد تیس سے زیادہ ہے جن میں خبریں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں نیشنل پوسٹ، کینیڈا؛ دی سٹار، کینیڈا؛ سی بی سی نیوز، کینیڈا؛ گلوبل نیوز؛ سی این این؛ یو ایس اے ٹوڈے؛ نیویارک ٹائمز؛ واشنگٹن پوسٹ؛ کولمبس ڈِسپیچ؛ دی وال سٹریٹ جرنل...... دی ایکسپریس ٹریبیون؛ واشنگٹن ٹائمز؛ ڈیلی میل؛ بی بی سی اردو، الجزیرہ، ڈان وغیرہ شامل ہیں۔

ان تمام تر اخباروں اور ذرائع ابلاغ میں جہاں ڈاکٹر مہدی علی قمر...... کے بہیمانہ قتل کی مذمت کی گئی ہے وہیں جماعت احمدیہ کا تعارف اور پچھلی کئی دہائیوں سے ہونے والے جبر وتشدد کا بھی انتہائی تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ ان تمام تر اخباروں اور دوسرے میڈیا نے جماعت احمدیہ کا تعارف کرواتے ہوئے جہاں حضرت اقدس مسیح موعود کے نام اور دعویٰ نبوت اور مسیحیت کا ذکر کیا ہے وہیں اس امر کا بھی ذکر کیا ہے کہ جماعت احمدیہ ایک امن پسند جماعت ہے جو جہاد کے نام پر مظلوموں کو قتل کرنے کی مذمت کرتی ہے۔ اسی طرح بعض اخباروں نے جماعت کے فلاحی کاموں کو بھی سراہا۔ پس یہ جان دے کر بھی (اشاعتِ دین) کے نئے سے نئے راستے کھول گئے اور دنیا کو متعارف کروا گئے۔

وال سٹریٹ جرنل امریکہ کا مشہور اخبار ہے، دنیا میں کئی جگہ چھپتا ہے۔ اس کے نامہ نگار نے (اس) واقعہ، جماعت احمدیہ کے تعارف اور جماعت کے خلاف ہونے والے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی چیئرپرسن صاحبہ کا تجزیہ پیش کیا کہ گو پاکستان میں تمام تر اقلیتیں ہی مظالم کا شکار ہیں مگر جماعت احمدیہ سخت ترین ظلموں کا شکار ہے۔ پاکستان کی کئی لوکل اخباریں احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز

خبریں شائع کرتی رہتی ہیں۔

ایک اخبار نے (مرحوم) کے ایک ساتھی ڈاکٹر سنہا کا بھی انٹرویو شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر سنہا نے ......مرحوم کے متعلق کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ دیانتدار اور خوش اخلاق شخص نہیں دیکھا۔ آپ کے جسم میں ایک بھی شر پسند ذرّہ نہ تھا۔ آپ بہت زیادہ خدمت خلق کرنے والے شخص تھے اور گو کہ آپ جانتے تھے کہ آپ کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے مگر اس کے باوجود خدمت خلق کے لیے پاکستان گئے۔ میں بس اس قدر چاہتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ کس طرح ایک انتہائی بااخلاق انسان جو انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے گیا ہوا تھا اس کو انتہائی بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔ پھر آخر میں پولیس انسپکٹر کی طرف سے ایک پولیس اہلکار کا بیان ہے کہ ہم اکثر ایسے پمفلٹ دیکھتے رہتے ہیں جن میں ربوہ کے اس ہسپتال اور یہاں علاج کروانے کی مخالفت کی جاتی ہے اور غالباً یہ قتل بھی اسی سے متعلق ہے۔

اسی طرح الجزیرہ کے تجزیہ نگار نے بھی یہی لکھا ہے کہ اکثر احمدیوں کے خلاف ظلم اور تشدد کی خبریں ملتی رہتی ہیں اور مجرم یہ ظلم اس تسلی کے ساتھ کرتے ہیں کہ حکومت انہیں سزا دینے کے لیے کچھ نہیں کرے گی۔

واشنگٹن پوسٹ نے ......لکھا کہ جرم اس لیے ہو رہے ہیں کہ پتا ہے کچھ نہیں ہونا۔

کولمبس ڈسپیچ نے اپنی خبر میں مرحوم کے بڑے بیٹے کا انٹرویو لیا۔ یہ لکھتا ہے کہ سولہ سالہ عبداللہ علی سے جب پوچھا گیا کہ وہ اپنے والد صاحب کے اس طرح قتل کئے جانے پر کیسا محسوس کر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ "I am disappointed" نامہ نگار نے اس جواب کو پسند کرتے ہوئے خاص طور پر ذکر کیا کہ اس بچے کے دل میں غصہ یا انتقام کا جذبہ نہیں۔ ایک اور اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے عبداللہ علی نے کہا...... مجھے یقین ہے کہ اگر قاتل کچھ دیر رک کر آپ سے بات کرتے تو یقیناً آپ ان کی زندگی میں بھی کوئی مثبت تبدیلی لے آتے......

بہرحال (ہمارا یہ مخلص دوست) تو اپنی زندگی میں بھی کامیابیاں دیکھتا رہا اور مخلوق خدا کی خدمت کرتا رہا اور موت بھی ایسی پائی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے دائمی زندگی دے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس پیارے بھائی کو جنت میں اعلیٰ درجے عطا فرمائے، لحظہ لحظہ ان کے درجات کی بلندی ہوتی رہے اور اپنے پیاروں کے قدموں میں اس کو جگہ دے۔ ان کے بیوی بچوں کو بھی اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ڈاکٹر صاحب...... کی تمام نیک خواہشات اور دعائیں جو انہوں نے اپنے بچوں کے لیے کیں، انہیں قبول فرمائے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی اس دعا میں شریک ہوتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کرنے والے دوستوں کی قربانیاں قبول فرمائے اب ذکر کیا جا رہا ہے اس شہید کا جنہوں نے ایف ایس سی کا امتحان نصرت جہاں انٹرمیڈیٹ کالج، ربوہ سے پاس کیا تھا اور تکمیلِ تعلیم کے بعد فوج میں شمولیت اختیار کی تھی۔ انہوں نے دفاعِ وطن کے لیے اپنی جان قربان کر کے شہدا کی صف میں شمولیت کا اعزاز پایا اور ربوہ میں دفن ہوئے۔

میرا اشارہ میجر افضال احمد شہید کی طرف ہے۔

وفا کی آن پر ہم کر کے جاں نثار چلے: تمہارے کل کے لیے اپنا آج وار چلے

میجر افضال احمد شہید جو اقبال احمد بھٹی کے صاحبزادے تھے اور جنہوں نے میٹرک کا امتحان راولپنڈی سے پاس کیا تھا ایف ایس سی کرنے کے لیے نصرت جہاں انٹرمیڈیٹ کالج میں داخل ہوئے۔ فارغ التحصیل ہوتے ہی پاک فوج جوائن کر لی۔ ۱۹۹۵ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول سے پاس آؤٹ ہوئے۔ ۲۰۰۶ء میں بطور میجر ترقی پائی۔ ۲۰۰۸ء میں ان کی خدمات وزیرستان سکاؤٹس، فرنٹیئر کانسٹیبلری کو تفویض کر دی گئیں جہاں ابتداءً وہ شمالی وزیرستان میں تعینات رہے۔ ۱۹ جون ۲۰۰۹ء کو ان کی شہادت کے وقت ان کا تقرر باجوڑ میں تھا۔

پاک فوج کے ترجمان، ماہنامہ ''ہلال'' نے انتہاپسندوں کی طرف سے پاکستان کو دہشت و بربریت کے الاؤ میں جھونکنے کی کوششوں اور پاک فوج کی طرف سے ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے کی جانے والی سرفروشانہ کوششوں اور جرأت و استقلال اور شہادتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے نومبر ۲۰۰۹ء کے شمارہ میں لکھا ہے:

''ملک و ملت کو جب بھی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا اہلیانِ پاکستان نے ہمیشہ افواجِ پاکستان کو ناممکن امر کو ممکن کر دینے کے لیے پکارا اور آفرین ہے ان جانبازوں پر کہ انہوں نے لحظہ بھر کی تاخیر کئے بغیر ملک و ملّت کی آواز پر لبیک کہا اور خود کو دل و جان سے پیش کیا۔ میری سوہنی دھرتی کو اس وقت دہشت گردی و شدّت پسندی کے بھیانک عفریت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پاکستان کے عوام اور افواجِ پاکستان بھلا یہ کہاں برداشت کر سکتے ہیں کہ...... امن و سکون کے عالمگیر مذہب، اسلام کے چند نام نہاد نام لیوا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے اس کو ایک ناکام ریاست ثابت کریں۔

مالاکنڈ ڈویژن بشمول سوات، بُونیر، اپّر دیر، لوئیر دیر، بشام کی جنّت نظیر وادیوں کو جب دین کے نام نہاد بُردہ فروشوں نے بربریت و شدّت پسندی کا مسکن بنانا چاہا تو حکومتِ پاکستان کے حکم اور اہلیانِ پاکستان کی خواہش پر افواجِ پاکستان کے شیر دل جوان دل میں یقین، ہتھیلی پر سر اور دوش پر کفن لے کر سرسبز و شاداب قطعہ زمین کے امن و حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں اترے۔ ہمارے یہ غیور سپوت، ملک و ملّت کے یہ بہادر بیٹے ملک کی جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے تن من دھن قربان کر دینے کے جذبے سے سرشار ہیں اور اپنی پاک سرزمین کو دینِ امن کے منکروں کی آماجگاہ نہیں بننے دیں گے۔

افواجِ پاکستان کے درخشاں ستاروں میں ایک درخشندہ ستارہ میجر افضال احمد شہید بھی ہے۔ میجر افضال احمد شہید وطن کا ایک ایسا نڈر رکھوالا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے جگری سے دشمن پر

ٹوٹ پڑنے والوں میں سے تھا۔ اس شیر جوان کے لیے ''تھا'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے زبان لڑکھڑا جائے اور کلیجہ منہ کو آئے۔ وہ جونڈر، دلیر، جفاکش، مضبوط اور پیکرِ وفا تھا، وہ سراپا اخلاص تھا، وہ بہترین نشانہ باز اور بہترین کھلاڑی تھا، وہ ماں کی آنکھوں کا تارا تھا، میجر افضال احمد شہید جس کی شہادت پر موت بھی بَین کر کے روئی ہوگی۔

میجر افضال احمد شہید ۲۲ مئی ۱۹۷۷ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول، حیدر آباد سے حاصل کی اور ایف ایس سی نصرت جہاں انٹر کالج، چناب نگر سے کیا۔ میجر افضال احمد شہید نے ۱۴ مئی ۱۹۹۵ء کو ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن حاصل کیا اور گیارہ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ایئر ڈیفنس کی مایہ ناز رجمنٹ Chinaries میں شامل ہوگئے۔ آپ نے رجمنٹ میں رہتے ہوئے مختلف اوقات میں اپنی تمام پیشہ ورانہ خدمات بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۵ کو میجر افضال احمد شہید جے ایل اے شنکیاری میں پوسٹ ہوگئے۔ وہاں پر بھی انہیں پلاٹون کمانڈر اور مختلف ڈیوٹیاں سرانجام دینے اور آپ کی قابلیت کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ۲۱ نومبر ۲۰۰۶ء کو واپس آ کر انہوں نے یونٹ میں بیٹری کمانڈر کے فرائض سنبھالے۔ پھر میجر افضال احمد شہید کو فوج کی پیشہ وارانہ خدمات سرانجام دینے اور سرفروشیٔ وطن کے لیے ہیڈ کوارٹر، فرنٹیئر کانسٹیبلری، این ڈبلیو ایف پی، ٹل سکاؤٹس میں پوسٹ کیا گیا۔ آپ کی پیشہ وارانہ اور دلیرانہ صلاحیتوں کے مدِّ نظر سینئر حکام نے آپ کو افغان بارڈر پر ایک پوسٹ قائم کرنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں عظیم سپوت اپنے پچیس ساتھیوں کی مدد سے پوسٹ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور چند دن وہاں برسرِ پیکار رہے۔

باجوڑ ایجنسی کے علاقے میں آرمی اور ایف سی کا جوائنٹ آپریشن المیزان (شیر دل) جاری تھا جس میں آپ کو دائیں اور بائیں آرمی یونٹس سے رابطہ بحال کرنے کا حکم ملا لہٰذا اس مقصد کے لیے میجر افضال احمد شہید نے اپنے ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور روانہ ہوگئے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ دہشت گردوں نے گھات لگا کر بزدلانہ حملہ کر دیا۔ میجر افضال احمد شہید نے فوراً اپنے ساتھیوں کو صف آرا کیا اور بہادرانہ انداز میں دشمن کا مقابلہ کیا اور ظالموں کو منہ کی کھانا پڑی۔

اس مقابلے میں آپ کے دو ساتھی زخمی ہوگئے۔ اس کے باوجود میجر افضال احمد نے اپنا مشن جاری رکھنے کے لیے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ آپ کے کچھ ساتھی زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے آپ کی آواز سن نہیں پائے تو آپ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھے اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیا اور پھر دوبارہ اپنے مقصد کی خاطر آگے بڑھے۔ اسی اثنا میں دشمن کی ایک گولی میجر افضال کے گھٹنے میں لگی تو آفرین ہے ایسے شیر دل افسر پر کہ جس نے گھٹنے پر گولی لگنے کے باوجود بھی اپنے مشن کو جاری رکھنے کو ترجیح دی۔ اس موقع پر شاعر نے کیا خوب پذیرائی کی ہے:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
اس جاں کی تو کوئی بات نہیں، یہ جان تو آنی جانی ہے

میجر افضال احمد اور ان کے ساتھی مصمّم ارادے لے کر جوں ہی روانہ ہوئے تھوڑا ہی فاصلہ اور طے کیا

ہوگا تو آپ کو ایک اور گھات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ دہشت گردوں نے آپ کی پارٹی پر چاروں طرف سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے ان کا دلیرانہ انداز میں مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک لمبی لڑائی کے بعد دشمن پسپا ہوا اور اسی اثنا میں دشمن کے ایک نشانہ باز کی گولی میجر افضال احمد کے سر سے آر پار ہوگئی اور آپ نے موقع پر ہی جامِ شہادت نوش فرمایا اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔''

روزنامہ الفضل ۲۳ جون ۲۰۰۹ء کے مطابق ''آپ کی میّت باجوڑ سے بذریعہ ہیلی کاپٹر پشاور لائی گئی۔ پشاور سے بذریعہ موٹروے سرگودھا پہنچی جہاں یونٹ ۱۸۹ آرٹلری رجمنٹ کا دس گاڑیوں پر مشتمل فوجی افسران و اہلکاروں کا قافلہ میّت کو فوجی اعزاز کے ساتھ ربوہ لایا۔ اس قافلے کی قیادت کمانڈر ۸ سٹریٹجک میزائل گروپ جناب بریگیڈیئر نوید احسن اور سٹیشن کمانڈر جناب بریگیڈیئر اکبر منہاس سرگودھا کر رہے تھے۔

یہ قافلہ سہ پہر پانچ بج کر دس منٹ پر دارالضیافت پہنچا جہاں محترم سلیم الدین صاحب ناظر امور عامہ، محترم چوہدری اللہ بخش صادق صاحب صدر عمومی لوکل انجمن احمدیہ، بزرگانِ سلسلہ اور ربوہ کے احباب کی کثیر تعداد نے استقبال کیا۔ میّت کو دیدار کے لیے دارالضیافت میں رکھا گیا جہاں ہزاروں کی تعداد میں احباب نے ملک کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے والے بہادر احمدی فوجی افسر کا آخری دیدار کیا۔ چھ بج کر دس منٹ پر پاکستانی پرچم میں لپٹے تابوت کو خدام کے حفاظتی دائرہ میں بیت مبارک لے جایا گیا۔ جنازہ کے آگے آرمی کی گاڑی اسکارٹ کر رہی تھی۔

آپ کی نمازِ جنازہ بعد نمازِ عصر بیت مبارک میں محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب ناظر اعلیٰ و امیر مقامی نے پڑھائی۔ آپ خدا تعالیٰ کے فضل سے موصی تھے۔ آپ کی عام قبرستان میں امانتاً تدفین کی گئی۔

آرمی کے ڈیڑھ صد سے زائد جوانوں نے قبرستان میں شامیانے لگا کر اور رسیوں کے ذریعے راستے بنا کر ایک باقاعدہ تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ پاکستان آرمی نے اپنے اس بہادر فوجی افسر کو الوداع کہنے اور سپردِ خاک کرنے کے لیے بہت سے انتظام کئے تھے۔ جوں ہی جنازہ عام قبرستان پہنچا آرمی کے جوانوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا، تابوت کے اوپر میجر افضال احمد صاحب کے میڈل اور ٹوپی سجائی۔ تابوت کو ٹرالی میں سے نکال کر چھ جوانوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھایا اور آرمی طریقہ کار کے ساتھ قبر کی طرف لے کر چلے۔ راستہ کے دونوں اطراف کھڑے الرٹ آرمی نوجوانوں نے سلامی دی۔ تابوت کو قبر کے پاس رکھا گیا اور میڈلز اور ٹوپی لکڑی کی ایک ٹرے میں سجا کر مرحوم کے بھائی مکرم ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کے سپرد کی گئی۔ تابوت سے سبز ہلالی پرچم کو اتار کر چار فوجی نوجوانوں نے ایک خاص طریقہ سے فولڈ کیا اور وہ مرحوم کے بھائی کے سپرد کیا۔ میّت کو قبر میں اتارنے کے بعد خدام نے مٹی ڈالی۔ قبر تیار ہونے پر فائرنگ کر کے اور بگل بجا کر سلامی دی گئی۔ سٹیج پر آ کر ایک فوجی افسر نے پاکستان آرمی کی طرف سے خراجِ تحسین پیش کیا جس میں مرحوم میجر کی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی کا تعارف اور آپ کے اس کارنامے کی تفصیلات بیان کیں۔

انہوں نے کہا: میجر افضال احمد شہید نے ایف ایس سی کے بعد ۸۵ پی ایم اے میں پاک آرمی میں شمولیت اختیار کی۔ پاکستان کے اس جانباز بیٹے نے پی ایم اے میں ٹریننگ کے مراحل مکمل کرنے کے بعد بارہ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لاہور میں ۱۴۸۔ ایس پی ایئر ڈیفنس رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ اپنی عسکری زندگی کے دوران میجر افضال احمد شہید لاہور، پنّوں عاقل اور شنکیاری میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ پچھلے ایک سال سے میجر افضال احمد شہید ملک وقوم کی خاطر اس کے دشمنوں کے ساتھ ایف سی، این ڈبلیو ایف پی میں نبرد آزما تھے۔ انہوں نے کہا: جذبۂ حبُّ الوطنی سے سرشار میجر افضال احمد شہید ۱۹ جون کو جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ پاک افغان بارڈر پر گشت کے لیے نکلے تو باجوڑ کے قریب بزدل اور عیّار عسکریت پسند پتھروں کی اوٹ سے نکل کر اچانک آپ کے دستے پر حملہ آور ہوئے۔ وطن کے اس بہادر بیٹے نے بڑی جانفشانی سے جوابی حملہ کر کے دشمن پر کاری ضرب لگائی لیکن سر میں ایک گولی لگنے سے آپ نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس خراجِ تحسین کے بعد قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ پہلی چادر (wreath) صدرِ پاکستان جناب آصف علی زرداری، دوسری چادر چیف آف آرمی سٹاف، جنرل اشفاق پرویز کیانی اور ۱۰ چادریں مختلف آرمی افسران کی طرف سے اس تقریب میں موجود آرمی افسروں نے چڑھائیں اور شہید ہونے والے آرمی افسر کو اپنے انداز میں اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ سٹیج پر موجود آرمی افسر نے محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب...... کو اجتماعی دعا کروانے کی دعوت دی۔ محترم صاحبزادہ صاحب موصوف قبر کے قریب تشریف لائے اور دعا کرائی۔ نمازِ جنازہ اور تدفین میں ربوہ اور بیرونِ ربوہ سے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ قبرستان عام میں تاحدِّ نگاہ احباب کا جمِ غفیر نظر آتا تھا جو اپنے بہادر نوجوان کی نمازِ جنازہ اور تدفین کے لیے آیا تھا۔ فوجی افسران اور جوان جماعتی نظم وضبط اور دیگر جملہ انتظامات کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے اور خوشنودی کا اظہار کیا...... میڈیا سے گفتگو کے دوران میجر افضال احمد کے بارے میں آرمی افسران نے برملا کہا کہ ہمارے لیے یہ بہادری کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور لڑنے کا جو حق تھا وہ انہوں نے ادا کر دیا۔''

الفضل کے مطابق پاکستان کے تمام بڑے ٹی وی اور ریڈیو چینلز اور اخبارات کے نمائندگان جنازے کی کوریج کے لیے موجود تھے۔ ٹی وی چینلز میں پاکستان ٹیلی ویژن، ایکسپریس، چینل ۵، رائل ٹی وی اور کوک ٹی وی شامل تھے جب کہ اخبارات میں روزنامہ آج کل؛ روزنامہ مساوات اور یوکے ٹائمز، لندن قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں ریڈیو پاکستان اسلام آباد اور ایف ایم وَن او وَن، اسلام آباد کے نمائندے بھی اس موقع پر موجود تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان چینلز اور اخبارات نے بعد میں اپنے اپنے رنگ میں اس واقعہ کی رپورٹنگ کی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو اس شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ نے شہید کی والدہ کے نام ۲۴ جون ۲۰۰۹ء کے خط میں تعزیت کرتے ہوئے شہید کی بلندیٔ درجات کے لیے خاص طور پر دعا فرمائی اور لکھا کہ ''آپ کا غم ہمیشہ ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے دعاؤں میں ڈھلتا رہے۔'' ملاحظہ فرمایئے حضور کا یہ خط:

''مکرمہ ومحترمہ والدہ صاحبہ میجر افضال احمد صاحب شہید

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے بیٹے کی وطن کی خاطر شہادت کی اطلاع ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند سے بلند کرتا چلا جائے۔

اس عمر میں آپ کے لیے آپ کے جوان بیٹے کی موت یقیناً ایک بہت بڑا صدمہ ہے لیکن خدا تعالیٰ نے ایسی موت کو دائمی زندگی کے اعزاز سے نوازا ہے۔ مرحوم نے یقیناً وطن کی خاطر قربانی دیتے ہوئے اپنے لیے دائمی زندگی کے سامان پیدا کر لیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی والی زندگی عطا فرمائے اور آپ کا غم ہمیشہ ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے دعاؤں میں ڈھلتا رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سب عزیزوں کو میری طرف سے تعزیت کر دیں۔ اللہ حافظ وناصر ہو۔ آمین

والسلام

خاکسار

مرزا مسرور احمد

خلیفۃ المسیح الخامس''

اسی طرح چیف آف آرمی سٹاف، جنرل اشفاق پرویز کیانی نے شہید کی اہلیہ، محترمہ ثناء آصف کے نام اپنے ۲۹ جون ۲۰۰۹ء کے تعزیتی خط میں ہوئے لکھا:

Mrs Sana Asaf

House No.56-C, Askari 7,

Adiala Road, Rawalpindi.

السلام علیکم!

Major Afzaal Ahmed embraced shahadat while performing his duties اناللہ وانا الیہ راجعون

The spirit of sacrifice, devotion and commitment to the profession displayed by your husband in discharge of professional pursuits is a matte of immense pride for me. It is the supreme sacrifice rendered by your husband that nurtures our very existence as an independent nation. And, it is the debt from a valiant son that no nation can ever repay.

I pray to God Almighty to bestow His infinite blessings on the

departed soul. Notwithstanding the fact that his departure from this world is an unbearable loss. I on behalf of Pakistan Army sincerely pray that in this hour of trial Allah Almighty may grant you the fortitude and courage to bear this irreparable loss. Ameen !

Let me assure you that Pakistan Army will always be at your beck and call and do all it can to mitigate the effects of this tragedy on your family.

Signed

Gen. Ashfaq Parvez Kiani'

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ۲۶ جون ۲۰۰۹ء کو لندن میں خطبہ جمعہ کے بعد میجر افضال احمد شہید کا نمازِ جنازہ غائب ادا فرماتے ہوئے آپ کا تعریفی رنگ میں ذکر کیا اور بتایا کہ آپ کی شہادت اس عوامی تاثر کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہے کہ احمدی پاکستان کے دشمن ہیں۔

حکومت پاکستان کی طرف سے شہید کو تمغۂ بسالت بعد از مرگ عطا کیا گیا۔ ملاحظہ ہو لیفٹیننٹ جنرل جاوید ضیا، اڈجوٹنٹ جنرل، جی ایچ کیو کا ۲۶ مارچ ۲۰۱۰ء کا شہید کی بیوہ کے نام یہ خط:

''حکومتِ پاکستان نے آپ کے شہید شوہر کی ذاتی شجاعت، بہادری اور فرض شناسی کا اعتراف کرتے ہوئے بعد از شہادت تمغۂ بسالت کا اعزاز عطا کیا ہے۔

شہادت کا بلند مقام حاصل کر کے آپ کے شوہر نے مسلمانوں کی شجاعت اور قربانی کی عظیم روایات کی آبیاری کی ہے۔ ان کی یہ قربانی اور شہادت ہمیشہ دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہوگی۔ اللہ عزّ وجل آپ کے شہید شوہر کی عظیم قربانی کو قبول فرمائے اور انہیں ابدی راحتیں عطا فرمائے۔ آمین!

میں آپ کے شہید شوہر کی کارکردگی پر فخر محسوس کرتا ہوں اور اس بات سے مطمئن ہوں کہ حکومتِ پاکستان نے شہید کے درخشاں کارنامے کا اعتراف کیا ہے۔''

شہید کے بارے میں مزید گفتگو کسی اور وقت پر مؤخر کرتے ہوئے اب تعلیم الاسلام کالج کے ان ہونہار طلبہ میں سے کچھ کا ذکر کیا جا رہا ہے جو مجھ سے پہلے تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور میرے کالج چھوڑنے سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے یہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔

صد حیف کہ تو اب بھی ہے پابستۂ اوہام: پہنچا ہے کہاں قافلۂ بے جگراں دیکھ

جن لوگوں کی نظر سے ''قریۂ جاوداں'' گزر چکی ہے میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ اس میں تعلیم الاسلام کالج کے بہت سے ہونہار طلبہ کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ان میں میرے اپنے بعض کلاس فیلوز اور دوست، تعلیم الاسلام ہائی سکول کے کچھ اساتذہ، کالج کے بعض پروفیسر صاحبان، فضلِ عمر ہسپتال کے کئی ڈاکٹرز اور کچھ اعلیٰ سرکاری افسران شامل ہیں لہٰذا ''شہرِ خوباں'' میں ان کا ذکر ارادتاً حذف کر دیا گیا ہے۔ باقی دوستوں میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر دیرینہ خادمِ سلسلہ، فضل الٰہی انوری کا جن کا تعلق حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی جنم بھومی، بھیرہ سے ہے اور جنہیں بفضلہٖ تعالیٰ جرمنی، نائیجیریا اور غانا میں نہ صرف پیغامِ احمدیت پہنچانے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ وہ ایک عرصے تک ان جماعتوں کی امارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

یوں تو میں فضل الٰہی انوری کو بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ سامنے آ جاتے یا میں ان کی تصویر دیکھ لیتا تو پہچان جاتا لیکن سچ پوچھیں تو میں نے ان کے بارے میں اتنا کچھ پڑھ اور سن رکھا ہے کہ چاہوں تو ان کے بارے میں پوری کتاب لکھ ڈالوں۔ ربوہ کے محلّہ دارالبرکات میں اپنے قیام کے دوران میں انہیں دیکھا کرتا تھا لیکن علیک سلیک اس وقت شروع ہوئی جب ان کے برادرِ اصغر، نصرت الٰہی سکول میں ہماری جماعت میں داخل ہوئے۔ میں کبھی نصرت الٰہی سے ملنے ان کے پاس جاتا تو بسا اوقات فضل الٰہی انوری دروازہ کھولتے۔ تب انہیں اندازہ ہو گیا کہ میں ان کے چھوٹے بھائی کا دوست ہوں اور وہ اسی نسبت سے میری عزت کرنے لگے۔

مدتوں بعد جب چوہدری حمید احمد کی کوششوں سے جرمنی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا قیامِ عمل میں آیا تو ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کے حوالے سے فضل الٰہی انوری کا نام بھی کان میں پڑا۔ میں اُن دنوں ''قریۂ جاوداں'' کی تصنیف میں مصروف تھا اور مجھے نصرت الٰہی کا پتا درکار تھا۔ تب موصوف نے ہی مجھے یہ افسوسناک اطلاع پہنچائی کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

بات یہیں ختم ہو سکتی تھی لیکن ان کی شفقت و محبت ہے کہ انہوں نے میری ہر ای میل کا فوری جواب دیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ موصوف تعلیم الاسلام کالج کے پہلے بیچ میں شامل تھے بلکہ اس لحاظ سے کہ ان کا رول نمبر وَن تھا انہیں اس کالج کا سب سے پہلا طالب علم بھی کہا جا سکتا ہے۔ میرے پاس اس اطلاع کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا ماسوا اس کے کہ میں ان سے خود اس کی تصدیق یا تردید کرنے کی درخواست کروں۔ جب میری یہ درخواست ان تک پہنچی تو انہوں نے اس کا فوراً جواب دیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف تعلیم الاسلام کالج قادیان میں رول نمبر وَن تھے بلکہ انہیں تعلیم الاسلام کالج لاہور میں بھی یہی اعزاز

حاصل رہا۔ ان کے جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ جب قادیان میں یہ کالج قائم ہوا تو کم وبیش پچاس طلبہ نے داخلہ لیا۔ چونکہ میٹرک میں ان کے نمبر سب طلبہ سے زیادہ تھے لہٰذا رول نمبر الاٹ ہوئے تو انہیں رول نمبر وَن ملا۔ اگر چہ بعد میں ان سے زیادہ نمبروں والے بعض طلبہ نے بھی کالج میں داخلہ لے لیا تھا مگر رول نمبروں کی ترتیب نہ بدلی گئی اور وہ رول نمبر وَن ہی رہے۔ یہی حسین اتفاق ان کے لاہور میں بی ایس سی میں داخلہ کے وقت ہوا۔ وہ پہلے طالب علم تھے جس نے اس کلاس میں داخلہ لیا تھا چنانچہ یہاں بھی انہیں رول نمبر وَن ہی الاٹ ہوا۔

تعلیم الاسلام کالج کا ذکر ہو تو وہ جذباتی ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: بدقسمتی سے اس کالج کو ابتلا و آزمائش کے کئی ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے۔ جب یہ کالج قائم ہوا جنگ عظیم دوم جاری تھی، برصغیر میں افراتفری اور غیر یقینی کی فضا چھائی ہوئی تھی اور عملاً ہر چیز کا قحط تھا حتّٰی کہ سٹاف اور طلبہ کی بھی کمی تھی لیکن جماعت احمدیہ کے اولوالعزم امام نے یہ ادارہ قائم کر دکھایا۔ ابھی اس کے قیام پر کم وبیش تین سال ہی گزرے تھے کہ پاکستان بن گیا اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر آنا پڑا۔ قادیان میں کالج کی خوبصورت اور وسیع عمارت ان لوگوں کے قبضے میں چلی گئی جن کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اور ان مقاصد کے لیے استعمال ہونے لگی جن کے لیے وہ تعمیر نہ ہوئی تھی۔ اس کے متبادل کے طور پر ہمیں ابتداءً کینال پارک کے ایک متروکہ اصطبل میں اور پھر ڈی اے وی کالج کے کھنڈرات میں بسیرا کرنا پڑا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب ہمیں اس عمارت کا قبضہ ملا تو اس کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور یہ عمارت انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ جماعت زرِکثیر کے خرچ سے اسے قابلِ استعمال حالت میں لائی لیکن جلد ہی کالج کو ربوہ منتقل ہونا پڑا اور پھر چند ہی سال بعد اسے نیشنلائزیشن کا صدمہ برداشت کرنا پڑا چنانچہ وہی کالج جس میں تعلیم حاصل کرنا باعثِ اعزاز سمجھا جاتا تھا آہستہ آہستہ اینٹوں اور مٹی کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

فضل الٰہی انوری عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں ایک کے بعد دوسری بیماری حملہ آور ہوتی رہتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دیر تک ہر بیماری کا بہت بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر خدا کی تقدیر غالب آ کر رہی اور حمید احمد چوہدری کی طرف سے بھجوائی گئی ایک ای میل کے مطابق وہ چار مارچ ۲۰۱۷ء کی شام اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

تعلیم الاسلام کالج کے ''سب سے پہلے طالب علم'' کے بارے میں فی الحال اتنا ہی کچھ۔ اب میں آپ کی ملاقات ان ہی کے ایک کلاس فیلو، ڈاکٹر عبدالکریم سے کرا رہا ہوں جنہیں تعلیم الاسلام کالج، لاہور کے پہلے طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ بتاتے ہیں: میں نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان سے ۱۹۴۴ء میں کیا تھا۔ اسی سال تعلیم الاسلام کالج کھلا چنانچہ میں اس میں داخل ہو گیا۔ ایف اے کیا تھا کہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کی وجہ سے لاہور منتقل ہونا پڑا چنانچہ میں نے بی اے ۱۹۴۸ء میں لاہور سے کیا۔ مروجہ قواعد کے مطابق پوسٹ گریجوایٹ کلاسز ہوتی تو یونیورسٹی میں تھیں لیکن طلبہ کو اپنی نسبت کسی نہ کسی کالج سے برقرار رکھنا پڑتی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نہ صرف شعبہ معاشیات

میں بلکہ پوری پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم الاسلام کالج، لاہور کا پہلا اور اپنے وقت میں واحد فلیگ بیئرر تھا۔ میرے لیے یہ بات بھی باعثِ اعزاز ہے کہ میں نے کالج میں اکنامکس کا پہلا سبق صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے پڑھا لیکن بعد میں خالدِ احمدیت ملک عبدالرحمٰن خادم، ایڈووکیٹ، مصنف ''احمدیہ پاکٹ بک'' کے بھائی، پروفیسر فیض الرحمٰن فیضی کی کالج سٹاف میں شمولیت کی وجہ سے یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا۔

موصوف بیان کرتے ہیں: بہت کم لوگوں کو اب یہ یاد ہوگا کہ تعلیم الاسلام کالج، لاہور نے ''ینگ اکانومسٹ'' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں ایک کتابی سلسلہ شروع کیا تھا جس میں حالاتِ حاضرہ سے متعلق ماہرینِ اقتصادیات کے گراں قدر مقالے شائع ہوتے تھے۔ فیض الرحمٰن فیضی اس کے انچارج یا شاید چیف ایڈیٹر تھے جب کہ میں ان کا نائب تھا لیکن دو شماروں کے بعد یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ یاد نہیں کہ یہ سلسلہ بند ہونے کی وجوہات کیا تھیں۔ شاید مالی مسائل روک بن رہے تھے۔ ان شماروں میں میرے مضامین بھی شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک مضمون کا عنوان مجھے اتفاقاً یاد رہ گیا ہے اور وہ تھا ''روس میں بنکاری''۔

ڈاکٹر عبدالکریم کو شروع سے ہی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں سے بھی دلچسپی رہی ہے چنانچہ وہ ۱۹۴۴۔۴۶ء کے دوران کالج کی فٹ بال ٹیم کے اور ۱۹۴۶۔۵۱ء کے دوران کالج کی ہاکی ٹیم کے کپتان رہے اور انہیں پنجاب یونیورسٹی اور پھر پنجاب کی سطح پر بھی کھیلنے کا موقع ملا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب وہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے امریکہ کی جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں تھے تو انہیں لان ٹینس کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ چوراسی سال کی عمر تک باقاعدگی سے یہ کھیل کھیلتے رہے لیکن دو تین سال پہلے جب ان کے گھٹنے بہت خراب ہو گئے تو انہیں مجبوراً ٹینس کو خیر باد کہنا پڑا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے ۱۹۵۲ء میں سٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بنک کی ملازمت کے دوران وہ دو بار ڈیپوٹیشن پر مرکزی وزارتِ خزانہ میں بھی کام کرتے رہے اور آئی ایم ایف ایڈوائزر کے طور پر بنک آف سوڈان میں بھی رہے۔ وہ ۱۹۸۸ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصہ ایشین ڈیویلپمنٹ بنک کنسلٹنٹ کے طور پر بھوٹان میں اور سٹیٹ اکنامکس یونیورسٹی، تاشقند میں وِزِیٹنگ پروفیسر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

اس وقت تک ڈاکٹر عبدالکریم کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں: ''اسلام: دی بیسکس'' روزنامہ ڈان میں چھپنے والے ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جب کہ ''اسلام: فلاسفی آف لائف اینڈ اکنامک پرنسپلز'' ان کی دوسری کتاب ہے۔

آج کل موصوف سود سے پاک معیشت کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ سُود کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنا ناممکنات میں سے نہیں۔ ان کا کہنا ہے: جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سُود کو ختم نہیں کیا جا سکتا دراصل خدا تعالیٰ کی ان صفات کے منکر ہیں کہ وہ خبیر بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔ اگر سُود دنیا سے ختم نہ کیا جا سکتا ہوتا تو وہ قرآنِ پاک میں کبھی ارشاد نہ فرماتا: یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ

اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

موصوف علما اور ماہرین کی اس کمیٹی کے ممبر ہیں جو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے سود سے متعلقہ مسائل پر غور وفکر کے لیے دار الافتاء کے تحت قائم فرمائی ہے۔ یاد رہے کہ اس کمیٹی کے صدر شیخ مظفر احمد، امیر جماعت احمدیہ، فیصل آباد ہیں اور باقی ممبران میں فہیم الدین، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ؛ میر محمود احمد، انچارج ریسرچ سیل؛ جمیل الرحمٰن رفیق، وکیل التصنیف؛ ڈاکٹر قاضی بشیر احمد، ایف سی کالج اور بعض دوسرے صاحبانِ علم شامل ہیں۔

میں نے ڈاکٹر عبدالکریم کا نام پہلی بار اس وقت سنا تھا جب میں ایم اے کرنے کے بعد بیکار تھا اور ہر اس شخص تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں رہتا تھا جو مجھے ملازمت دلانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہو۔ تب معلوم ہوا کہ وہ وزارتِ خزانہ میں اسسٹنٹ فنانشل ایڈوائزر ہیں اور یہ کہ وہ مولوی محمد تقی کے داماد ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ اسسٹنٹ فنانشل ایڈوائزر کے عہدے کا حامل اس معاملہ میں کسی شخص کی کتنی مدد کر سکتا ہے میں نے مولوی محمد تقی سے جو اُن دنوں محلہ دار الرحمت غربی میں مقیم تھے ان کے نام تعارفی رقعہ بھی حاصل کیا تاہم کسی وجہ سے یہ ملاقات نہ ہو پائی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے حالات اللہ تعالیٰ کے فضل سے بدل گئے۔ ۱۹۷۷ء میں میری شادی ہوئی تو میں نے اپنی اہلیہ کی زبان سے ان کا ذکر بطور ''ماموں کریم'' کے سنا۔ وہ ان دنوں وزارتِ خزانہ میں فنانشل ایڈوائزر کے طور پر ترقی پا چکے تھے اور ایف ۶، اسلام آباد کے کسی سرکاری مکان میں رہائش پذیر تھے۔

اس زمانے میں ہماری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ انتہائی شریف النفس انسان ہیں۔ ان کی اہلیہ کا نام امتہ الرشید تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔ اس وقت دونوں بیٹے امریکہ میں ہیں۔ عطاء الکریم تو اپنے والدِ گرامی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں جب کہ رضاء الکریم نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں تخصیص حاصل کی ہے۔ رہیں نبیلہ تو وہ ربوہ میں مقیم ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالکریم کراچی سے ربوہ منتقل ہو گئے تھے۔ انہوں نے محلہ دار العلوم شرقی میں ایک وسیع گھر تعمیر کیا ہے تاہم ربوہ آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کی اہلیہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس صدمے نے ڈاکٹر عبدالکریم کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے لیکن آدمی باہمت ہیں۔ تحقیق و تصنیف کے کام میں منہمک رہتے ہیں۔

آپ نے تعلیم الاسلام کالج کے پہلے بیچ میں شامل دو طلبہ کے بارے میں میری گزارشات ملاحظہ فرمائیں۔ اب میں ذکر کر رہا ہوں راجہ غالب احمد کا جو حضرت راجہ علی محمد، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور معروف خادمِ سلسلہ ملک عبدالرحمٰن خادم کے بھانجے تھے اور سترہ اگست ۱۹۲۸ء کو گجرات میں پیدا ہوئے تھے۔

انہوں نے سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور سے میٹرک؛ تعلیم الاسلام کالج، قادیان سے ایف اے اور

گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم اے (نفسیات) کا امتحان لڑکوں میں اوّل رہ کر پاس کیا۔ ان کا تھیسس ختنے کی تاریخ کے حوالے سے تھا جسے ایک روایت کے مطابق اس کے اعلیٰ معیار کے پیشِ نظر بعد میں خود گورنمنٹ کالج نے کتابی شکل میں شائع کیا۔

ان کے تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم ہونے کی تصدیق نہ صرف تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ اور الفضل میں ان کی وفات کی خبر بلکہ پروفیسر چوہدری محمد علی مضطر عارفی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق راجہ غالب بطور طالب علم تعلیم الاسلام کالج سفرِ پانگی میں ان کے ہمراہ تھے۔ تاریخِ احمدیت جلد ۹ کے مطابق یہ سفر جولائی ۱۹۴۶ء میں اختیار کیا گیا تھا لہٰذا اندازہ ہے کہ راجہ غالب ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔

انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز پاکستان ایئرفورس میں بطور سائیکالوجسٹ کیا تاہم وہ بطور فلائٹ لیفٹیننٹ ایئرفورس چھوڑ کر محکمۂ تعلیم میں آ گئے۔ وہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور کے سیکریٹری؛ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، سرگودھا کے چیئرمین اور آخر میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے دفتر میں آویزاں چیئرمینوں کی فہرست کے مطابق دوسری اور آخری بار وہ فروری ۱۹۷۶ء تک وہاں رہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں او ایس ڈی بنا دیا گیا۔ حکومت یہ طریقِ کار عام طور پر ناپسندیدہ سرکاری ملازموں سے چھٹکارا پانے کے لیے اختیار کرتی ہے۔ اس عرصے میں متعلقہ سرکاری ملازم کو تنخواہ تو ملتی رہتی ہے تاہم اسے کوئی ذمہ داری تفویض نہیں کی جاتی۔ اس کے بعد وہ ۱۹۸۸ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک تقریباً بارہ سال او ایس ڈی رہے۔ سرکاری ملازمت کے دوران اتنا لمبا عرصہ او ایس ڈی رہنے کی شاید ہی کوئی اور مثال مل سکے۔

راجہ غالب بحیثیت شاعر، دانشور، ماہرِ تعلیم اور اردو ادب کے ناقد، ملک کے مقتدر علمی اور ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور بعض ادبی جرائد میں ان کی نظمیں اور تحریریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان کا اردو اور انگریزی ادب و شاعری سے پختہ تعلق نصف صدی سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں حنیف رامے، احمد ندیم قاسمی، احمد مشتاق، نثار حسین، انتظار حسین، منّو بھائی، شہزاد احمد، مظفر علی سیّد، صوفی تبسّم، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر اجمل قابلِ ذکر ہیں۔ یقیناً ان کے بارے میں ان تمام مشاہیر نے کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا تاہم فی الوقت میرے سامنے انتظار حسین کی کتاب ''اپنی دانست میں'' پڑی ہے جس کا ایک باب بعنوان ''دوسری واپسی'' (ضمیمہ الف) راجہ غالب کے بارے میں ہے۔ ان کی دو خودنوشتوں ''چراغوں کا دھواں'' (ضمیمہ ب) اور ''جستجو کیا ہے'' (ضمیمہ ج) میں بھی موصوف کا ذکرِ خیر موجود ہے۔

پرویز پروازی نے راجہ غالب کی وفات پر اپنے مضمون مطبوعہ الفضل (یکم جولائی ۲۰۱۶ء) میں ان کی ادبی بصیرت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو پڑھا جانے کے لائق ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''غالب احمد...... کی ادبی بصیرت کا ایک منظر میرا آنکھوں دیکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب

"تخلیقی عمل"، چھپی تو ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی مگر کہیں کہیں سے اس کتاب کے مندرجات پر تنقید و تنقیص کی آوازیں بھی اٹھیں۔ کشور ناہید نے اپنے دولت خانہ پر ایک ادبی مکالمہ کا اہتمام کیا۔ آغا صاحب سرگودھا سے پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو اور ربوہ سے مجھ جیسے ہیچ مداں کو لے کر لاہور آئے اور ہم کشور ناہید کے ہاں حاضر ہوئے۔ کشور نے لاہور سے جناب جیلانی کامران اور غالب احمد کو مدعو کر رکھا تھا۔ ایسی مکالماتی نشست میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھی جس میں مدعوئین نے ایک دوسرے کے نظریات اور خیالات پورے تحمل اور بُردباری سے سنے ہوں اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہو۔ چار پانچ گھنٹے تک یہ نشست جاری رہی۔ غالباً کشور ناہید نے اسے ریکارڈ بھی کیا تھا۔ شاید اس کی رُوداد کہیں چھپی ہو مگر میرے علم میں نہیں۔ اس نشست میں غالب احمد نے جس بالغ نظری سے کتاب کے مالۂ اور ماعلیہ پر بحث کی تھی وہ ادب میں یادگار رہنے والی چیز ہے۔ اس نشست میں شامل ہونے والے ہر ایک شخص نے غالب احمد کو داد دی تھی اور وہ حسبِ طبیعت سر جھکائے بیٹھے رہے۔"

ان کی کتب "تشدد کا تاریخی پس منظر"، "راحتِ گمنام" اور "زحمتِ ہُنر" نے خدا کے فضل سے قبولیتِ عامہ کی سند حاصل کی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ فاضل مصنف نے "زحمتِ ہُنر" کا ایک نسخہ مجھے اپنے دستخط سے عنایت فرمایا تھا جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ آپ نے لکھا تھا:

....

مکرم و محترم داؤد طاہر صاحب کے لیے

بصد عجز و نیاز

غالب احمد

۲۷/۶/۲۰۰۹

موصوف ۲ جون ۲۰۱۶ء کو صبح چار بجے سی ایم ایچ لاہور میں بعمر اٹھاسی سال انتقال کر گئے۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ بیت النّور، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں ادا کی گئی۔ اسی دن بعد نماز عصر مرزا خورشید احمد نے بیت مبارک، ربوہ میں اس مخلص خادمِ سلسلہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور بہشتی مقبرے میں تدفین عمل میں آئی۔

راجہ غالب کی جماعتی خدمات کا سلسلہ خاصا طویل ہے۔ وہ جماعت احمدیہ، لاہور کے جنرل سیکرٹری، سیکرٹری تعلیم اور کئی دیگر عہدوں پر کام کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے بعد انہیں کئی بار بطور ترجمان جماعتِ احمدیہ پریس کانفرنسیں منعقد کرنے، پریس ریلیز ز اور بیانات جاری کرنے، خطوط لکھنے اور اخبارات کو وضاحتی بیانات جاری کرنے کا موقع بھی ملا۔ وہ لمبا عرصہ ڈائریکٹر فضل عمر فاؤنڈیشن، ڈائریکٹر وقف جدید اور نائب صدر ناصر فاؤنڈیشن بھی رہے۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے ان دنوں پاکستان ٹائمز میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، سرگودھا کی طرف سے ایک اشتہار کے ذریعے بعض خالی

آسامیاں مشتہر کی گئیں تھیں جن میں سے ایک آسامی سپرنٹنڈنٹ کی تھی اور اس کے لیے بنیادی کوالیفیکیشن بی اے فرسٹ ڈویژن یا ایم اے سیکنڈ ڈویژن قرار دی گئی تھی جب کہ سات سالہ تجربے کے حامل گریجوایٹس ڈویژن کی کسی قید کے بغیر درخواست دینے کے مجاز تھے۔ میں اُن دنوں تعلیم الاسلام انٹرمیڈیٹ کالج، گھٹیالیاں میں پڑھا رہا تھا لیکن ہر صورت وہاں سے نکلنے کا متمنّی تھا۔ میں نے یہاں بھی درخواست بھجوا دی۔ راجہ غالب اس زمانے میں سرگودھا بورڈ کے سیکرٹری تھے اور میں نے سن رکھا تھا کہ وہ فیض الرحمٰن فیضی، پروفیسر ایف سی کالج، لاہور کے بھانجے ہیں۔ یہ بھی میرے علم میں تھا کہ فیض الرحمٰن فیضی کی اہلیہ، وسیمہ آپی کی بچپن کی سہیلی، طاہرہ (اہلیہ مرزا حنیف احمد) کی بڑی بہن ہیں چنانچہ طاہرہ کے ذریعے راجہ غالب سے کہلوایا گیا اور میں اگلے روز ان سے ملاقات کے لیے سرگودھا ان کے دفتر جا پہنچا۔

راجہ غالب نے میری رام کہانی توجہ کے ساتھ سنی لیکن انہوں نے میری مدد کے بارے میں کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آفس سپرنٹنڈنٹ کا کام لمبے تجربہ کا متقاضی ہوتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے اور یہ کہ تجربے کے بغیر ماتحت کلرکان اپنے سپرنٹنڈنٹ کے لیے ایسے مسائل پیدا کر سکتے ہیں جن پر ایک ناتجربہ کار شخص کے لیے قابو پانا مشکل ہو سکتا ہے۔ مجھے اس وقت راجہ غالب کی یہ بات پسند نہ آئی تھی تاہم عملی زندگی میں آنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کہتے تو وہ ٹھیک ہی تھے۔

اس وقت مجھے یہ علم نہ تھا کہ موصوف کے ساتھ میری اگلی ملاقات اس وقت ہو گی جب میں پینتیس سالہ ملازمت کے بعد ریٹائر بھی ہو چکا ہوں گا۔

۲۰۰۶ء میں میرا تقرر پنجاب پبلک سروس کمیشن میں ممبر کے طور پر ہوا تو میں دفتر سے اپنی قیامگاہ کی طرف جاتے ہوئے نہر پر "گرین وِلاز" کا ایک بورڈ دیکھا کرتا تھا۔ ایک بار مجھے کسی نے بتایا کہ راجہ غالب ان ہی میں سے ایک وِلا میں رہتے ہیں چنانچہ ایک دن میں نے اپنی گاڑی کا رخ "گرین وِلاز" کی جانب موڑ دیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو راجہ غالب نے خود ہی کھولا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو انہوں نے فوراً پہچان لیا اور کہنے لگے: کیا آپ کو بھی تعارف کرانے کی ضرورت ہے؟ میں نے آپ کی دو تین کتابیں دیکھ رکھی ہیں۔ آپ انکم ٹیکس میں ہیں نا؟ میں نے وضاحت کی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر میرا تقرر پنجاب پبلک سروس کمیشن میں ہوا ہے اور میں اسی حوالے سے لاہور میں ہوں تو وہ بے حد خوش ہوئے اور ہم ان کے ڈرائنگ روم میں دیر تک بیٹھے چائے کے پیالے پر خوش گپیوں میں محو رہے۔

اس کے بعد میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ انہوں نے ایک راطوطا پال رکھا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس کا پنجرہ ڈرائنگ روم میں پڑا ہوتا۔ موصوف بتایا کرتے تھے کہ ان کے پاس یہ طوطا مدتوں سے ہے اور وہ اور ان کی اہلیہ بسا اوقات اس سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھانجے اسامہ منیر، کارکن دفتر تحریک جدید سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ طوطا پچیس تیس سال ان کے پاس رہنے کے بعد ان کی وفات سے پہلے مر گیا تھا۔ خوش قسمت تھا کہ اسے اپنی مالکن کی وفات کے بعد اپنے مالک کی وفات کا

صدمہ برداشت نہیں کرنا پڑا۔

راجہ غالب صرف ایک بار غریب خانے پر تشریف لا سکے۔ ہوا دراصل یوں کہ میری کتاب ''نئی منزلیں ہیں پکارتی'' کو حکومتِ پنجاب کی طرف سے پنجاب پر چھپنے والی کتابوں میں سے پچاس ہزار روپے کے اوّل انعام کا مستحق قرار دیا گیا تو میں نے بعض احمدی احباب کو ڈنر پر مدعو کیا۔ مدعوئین میں شیخ منیر احمد، امیر جماعت احمدیہ، لاہور؛ ملک طاہر احمد حال امیر جماعت احمدیہ ضلع لاہور؛ میجر شاہد عطاء اللہ، نائب امیر؛ ریاض محمود، نائب امیر اور سیّد حسین احمد، مربی سلسلہ کے علاوہ راجہ غالب بھی شامل تھے۔ اس وقت تک راجہ غالب نے رات کی ڈرائیونگ ترک کردی ہوئی تھی لہٰذا انہوں نے اس دعوت میں شمولیت کا وعدہ اس شرط پر کیا تھا کہ انہیں گھر سے لے کر واپس پہنچانا میری ذمہ داری ہوگی۔ الحمدللہ میرے بیٹے نبیل نے یہ ذمہ داری بڑی محبت سے ادا کی اور یوں مجھے کئی گھنٹے تک ان سب بزرگان سے اکتسابِ فیض کا موقع ملتا رہا۔

آپ کی اہلیہ، محترمہ انور غالب ۱۴ مارچ ۲۰۰۸ء کو وفات پا گئیں۔ میں اور میری اہلیہ اُن سے ملتے رہے تھے اور ان کی شفقت و اپنائیت کے گرویدہ تھے اس لیے اس وفات پر بے حد رنجیدہ ہوئے۔

مرحومہ ایم اے میں راجہ غالب کی کلاس فیلو تھیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک بے مثال رشتۂ مؤدت میں بندھے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کی اہلیہ کا انتقال ایک ایسا سانحہ تھا جسے صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جسے اس قسم کے حادثے کے ساتھ سابقہ پڑ چکا ہو۔

موصوفہ مولوی محمد حسین بٹالوی کی پڑنواسی تھیں اور شادی کے وقت تک جماعت میں شامل نہ ہوئی تھیں تاہم انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ذاتی مطالعہ اور تحقیق کے بعد احمدیت قبول کر لی۔ الفضل (۲۰ مارچ ۲۰۰۸ء) کے مطابق ان کے ''تحریر کردہ ناول علمی و ادبی حلقوں میں روحانیت اور صوفی اِزم کے حوالے سے ایک درجہ اور شہرت رکھتے ہیں''۔

اگرچہ بروقت اطلاع نہ ہونے کے سبب میں مرحومہ کے جنازے یا تدفین میں تو شامل نہ ہو سکا البتہ بعد میں تعزیت کے لیے راجہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری حاضری ان کے غم میں تو کسی قسم کی کمی نہ کر سکتی تھی تاہم مجھے مرحومہ کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا کا موقع مل گیا۔

۲۰۰۹ء کے آخر میں حکومت پنجاب کے ساتھ میرا کنٹریکٹ ختم ہوگیا تو میرا اس راستے سے آنا جانا کم ہوگیا لیکن ان کے ساتھ رابطہ بدستور رہا۔ ۲۰۱۱ء میں جب میری کتاب ''ارمغانِ ملتان'' چھپ کر آئی اور میں نے اس کا ایک نسخہ آپ کی نذر کیا تو آپ نے اسے پڑھنے اور اس پر الفضل کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ کیا۔ آپ نے اس کتاب کا مطالعہ تو فرمالیا لیکن مضمون لکھنے کا وعدہ ان کی کمزوری صحت کی وجہ سے تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

۲۰۱۲ء میں میرا انتخاب بطور زعیمِ اعلیٰ، مجلس انصاراللہ حلقہ گلبرگ ہوا۔ آپ کی رہائش اسی حلقے میں تھی چنانچہ ایک بار ہم نے آپ کو حلقے کے انصار سے خطاب کے لیے مدعو کیا۔ آپ نے میری یہ دعوت بخوشی قبول کر لی اور وقت مقررہ پر بیت الفضل، گلبرگ میں تشریف لائے۔ وہ شام احبابِ حلقۂ گلبرگ کے لیے خصوصی

اہمیت کی حامل تھی کیونکہ آج انہیں اس معتبر ہستی کی صحبت نصیب ہو رہی تھی جس کی علمی، ادبی اور جماعتی خدمات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔

اسی عرصے میں مجھے بعض ایسے عوارض کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے میری نقل و حرکت محدود ہوکر رہ گئی اور میں لمبا عرصہ آپ سے ملاقات نہ کر پایا۔

۲۰۱۶ء کے آغاز میں سیّد کمال یوسف مربی سلسلہ اوسلو سے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے ایک احمدی دوست، ناصر بلوچ کے پاس ای ایم ای ہاؤسنگ کالونی میں مقیم تھے۔ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے آئے تو ناصر نے یہ انکشاف کر کے مجھے پریشان کردیا کہ راجہ غالب کو نسیان کا مرض لاحق ہوگیا ہے اور یہ کہ جماعت کی طرف سے انہیں نماز جمعہ کے لیے بیت الذّکر میں لانے لے جانے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے۔ میں بے چین تھا کہ کسی طرح راجہ غالب سے ملاقات ہو لیکن ان کا فون کوئی اٹھاتا نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیٹی، غزالہ کے ہمراہ جو امریکہ سے خاص ان کی تیمارداری کے لیے آئی ہوئی ہیں اسلام آباد تشریف لے گئے۔ بالآخر ایک روز غزالہ سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے والدِ بزرگوار اب کسی کو پہچانتے نہیں ہیں لہٰذا میرا ان سے ملاقات کے لیے آنا یا نہ آنا برابر ہے مگر میں نے ان سے عرض کی کہ وہ بھلے مجھے نہ پہچانیں میں تو ان کو پہچانتا ہوں اور یوں ایک روز میں ان سے ملاقات کے لیے جا پہنچا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ چند ہی لمحوں میں راجہ صاحب تشریف لے آئے۔ صاف ستھرا لباس اور وہی سدا مسکراتا چہرہ لیکن افسوس ان کی گفتگو کا مخصوص رنگ خواب و خیال ہو چکا تھا۔ دس پندرہ منٹ باتیں ہوئیں جس دوران ایک دوسرے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا گیا تاہم یہ بات بہت واضح تھی کہ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس کے بعد وہ اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے: اچھا پھر کسی وقت ملیں گے۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اندر تشریف لے گئے۔

افسوس! اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ ان کی وفات کے قریباً ڈیڑھ ماہ بعد میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ، صادقہ وفات پا گئیں اور ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں ہوئی۔ تدفین سے فراغت ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ صادقہ کی قبر راجہ غالب کی قبر کے عین نیچے ہے۔

اس اتفاق کا مجھے یہ فائدہ ضرور ہے کہ میں جب بھی صادقہ کی قبر پر جاتا ہوں مجھے مرحوم کے لیے بھی دعا کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

سلسلے کے اس فدائی کے قدرے مختصر ذکر کے بعد میں آپ کی ملاقات ایک اور مخلص احمدی دوست سے کرا رہا ہوں جن کا نام مبشر احمد ہے اور جو مشہور خادمِ سلسلہ اور انگریزی مترجم و مفسرِ قرآن، ملک غلام فرید کے صاحبزادے ہیں۔ ملک غلام فرید تو اباجی کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے لیکن مبشر سے میرا تعارف نہ تھا۔ جب میں نے اپنی رہائش گلبرگ سے لاہور کینٹ منتقل کی اور نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے کڑک ہاؤس جانے لگا تو موصوف سے ملاقات ہوئی۔ اباجی کے ذکر پر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ان کے وہ صاحبزادے جو سِول سروس کے رکن رہے کہاں ہوتے ہیں۔ تب میں نے وضاحت کی کہ وہ غالباً میرے بارے میں پوچھ

رہے ہیں کیونکہ میرا اور کوئی بھائی نہیں ہے۔ وہ اس ملاقات پر بے حد خوش ہوئے اور بتانے لگے: میں قریب ہی لِنک شامی روڈ پر رہتا ہوں۔ کسی وقت آئیں تو ڈھیر ساری باتیں ہوں گی۔ اس کے کچھ دنوں بعد راقم ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں سمیت ایک ہی کمپاؤنڈ لیکن الگ الگ گھروں میں رہائش پذیر ہیں۔

موصوف کی ساری ابتدائی تعلیم قادیان میں ہوئی چنانچہ انہوں نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ ایف ایس سی (پری انجینئرنگ گروپ) میں داخل ہوئے تھے اور ان کے اساتذہ کرام میں پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن جو تعلیم الاسلام کالج کے وائس پرنسپل کے طور پر ریٹائر ہوئے، پروفیسر سلطان محمود شاہد اور پروفیسر اخوند عبدالقادر شامل تھے۔ انہیں پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن کی شاگردی کا بھی اعزاز حاصل ہے جو انہیں دینیات پڑھاتے رہے ہیں۔ مبشر بتاتے ہیں: انہوں نے ہمیں تیسواں پارہ پڑھایا تھا لیکن اس عمدگی سے کہ نہ صرف قرآن پاک ناظرہ پڑھنا آ گیا بلکہ میں اس کا ترجمہ بھی سمجھنے لگا۔ انہیں چوہدری محمد علی سے براہِ راست اکتسابِ فیض کا موقع تو نہیں ملا لیکن انہوں نے ان کی شفقت سے بھی بے پایاں حصہ پایا ہے۔

مبشر بی ایس سی کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے تاہم انہوں نے ایم ایس سی (کیمیکل ٹیکنالوجی) کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز تو کسی اور جگہ سے کیا لیکن جلد ہی وہ اسے چھوڑ کر پی آئی ڈی سی (پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن) میں چلے گئے جہاں انہیں سیمنٹ کے شعبے میں کام کرنے کا موقع ملا اور وہ بالآخر ۱۹۸۹ء میں بطور مینجنگ ڈائریکٹر (سیمنٹ)، پی آئی ڈی سی ریٹائر ہوئے۔

یوں تو انہیں زندگی میں کئی بیرونِ ملک سفروں کا موقع ملا تاہم انہیں نیوزی لینڈ کا ایک سفر ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ وہ ملازمت میں آنے کے بعد پہلی بار ٹریننگ کے لیے وہاں گئے تھے۔ وہ اس ملک کے ساؤتھ آئی لینڈ میں مقیم رہے۔ یہیں ہندوستان سے بھی ایک افسر اسی قسم کی ٹریننگ کے حصول کے لیے آیا ہوا تھا۔ ان دونوں کی دوستی ہو گئی اور انہوں نے نیوزی لینڈ سے سیر و سیاحت کی غرض سے امریکہ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ قواعد کی رُو سے وہ اس ویزے کے لیے اپنے ملک میں درخواست دینے کے پابند تھے تاہم انہوں نے بھاگ دوڑ کی اور کسی طرح اس ملک کے وزیراعظم سر سِڈنی جارج ہالینڈ سے ملاقات میں کامیاب ہو گئے جنہوں نے نیوزی لینڈ میں پاکستان کے سفیر جن کا نام غالباً یوسف ہارون تھا کو فون کر کے ان کی مدد پر آمادہ کر لیا۔ یوسف ہارون نے امریکی سفارت خانہ سے رابطہ کیا اور یوں ایک ایسا کام جو بظاہر ناممکن العمل نظر آتا تھا ان کے لیے آسان ہو گیا۔ انہیں امریکہ کا ویزا مل گیا اور وہ بحری جہاز کے ذریعے آک لینڈ سے سان فرانسسکو پہنچ گئے۔ یہ سفر فی ذاتہٖ بہت خوبصورت تھا لیکن وہ پانچ یا چھ ماہ جو انہوں نے امریکہ میں گزارے اس سے بھی زیادہ یادگار تھے۔ اگر آپ ان کے ساتھ اس سفر کی خوبصورت

یادیں شیئر کرنا چاہتے ہیں یا یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے ہوں کہ کس طرح ہندوستان اور پاکستان سے گئے ہوئے دو زیرِ تربیت افسران ملک کے وزیراعظم سے ملاقات میں کامیاب ہو گئے تو اس کے لیے آپ کو مبشر سے خود ملنا ہو گا جو آج کل ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں لیکن ان کی صحت ماشاء اللہ اچھی ہے اور وہ دوستوں سے مل کر خوش بھی ہوتے ہیں۔

مبشر کے بعد تعلیم الاسلام کالج کے جس ہونہار طالب علم کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کا نام بشیر احمد تھا جو بطور سپرنٹنڈنگ انجینئر، لوکل گورنمنٹ اینڈ رُورل ڈیویلپمنٹ ڈپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف دی پنجاب، لاہور ریٹائر ہوئے۔ گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ، رسول سے اوورسیئری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ۱۹۴۶ء میں تعلیم الاسلام کالج، قادیان میں داخل ہوئے اور ایف ایس سی کرنے کے بعد پشاور یونیورسٹی سے بی ایس سی انجینئرنگ اور امریکہ سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ وہ میرے خسر تھے اور ان کے تفصیلی حالات ''قریۂ جاوداں'' میں بیان ہو چکے ہیں لہٰذا انہیں دہرائے بغیر یہاں صرف اسی قدر ذکر مقصود ہے کہ کالج میں قیام کے دوران انہوں نے اِنڈین ایئرفورس ٹریننگ کور کے تحت ایروناٹکس کا مضمون باقاعدہ طور پر پڑھا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ اس مضمون میں کامیابی پر انہیں جو سند جاری ہوئی ان کے بیٹے ظفر اقبال کے پاس محفوظ ہے۔ اس سند کو بطور سوونیئر ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

CERTIFICATE OF PROFICIENCY

SPECIAL AIR FORCE CLASS

This is to certify that Bashir Ahmad a student of the Talim-ul-Islam College, Qadian, Punjab University has successfully completed, in the first division, the I.A.T.C. course in Aeronautics between the dates 15th November 1946 and 25th May 1947.

Signed this twenty-fifth day of May 1947.

Signed

for Air Marshal,

Air Officer Commanding-in-Chief

Air Forces in India.

اب تعلیم الاسلام کالج کے جس معروف طالب علم کا ذکر مقصود ہے ان کا نام محمد سعید احمد ہے اور وہ ایم ای ایس یعنی ملٹری انجینئرنگ سروس سے سپرنٹنڈنگ انجینئر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور کینٹ میں مقیم رہے۔ وہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے۔ فزکس اور ریاضی کے ساتھ بی اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور کی یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے بی ایس سی انجینئرنگ

کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۵۵ء میں ایم ای ایس کے محکمے میں شمولیت اختیار کر لی۔ چونتیس سالہ بے داغ سروس کے بعد وہ ریٹائر ہو کر وہ کمزوری صحت کے باوجود اپنے رنگ میں جماعتی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے۔

موصوف سے میری پہلی ملاقات کئی سال پہلے راولپنڈی میں تعیناتی کے دوران اس وقت ہوئی جب میرے ایک احمدی رفیق کار اور دوست، ملک محمود احمد کی خواہرِ نسبتی کی شادی ان کے ایک صاحبزادے کے ساتھ ہوئی تاہم بعد میں ان سے رابطہ نہ رہ سکا۔ مئی ۲۰۱۴ء میں جب میں گلبرگ سے لاہور کینٹ منتقل ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ان سے دوبارہ رابطے کے اسباب پیدا کر دیئے۔

انہوں نے ''گمنام و بے ہنر'' کے عنوان سے اپنی زندگی کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ اس کتاب میں تعلیم الاسلام کالج میں ان کے گزرے ہوئے ایام کا بھی کچھ ذکر موجود ہے جسے کالج کی تاریخ کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''۱۹۴۶ء میں میٹرک پاس کر کے تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوا تو زندگی کا ایک نیا اور پُرکشش موڑ تھا۔ کالج میں ہمارے ساتھ کثرت سے بیرونِ قادیان سے آنے والے طلبہ داخل ہوئے۔ میری قادیان کے مخصوص ماحول کی پُرسکون زندگی میں ایک زلزلہ آ گیا۔ ہر طرح کے اچھے بُرے لڑکوں سے واسطہ پڑا۔ پھر سکول کے اور کالج کے ماحول اور طریقہ تعلیم میں فرق تھا۔

قادیان میں رہنے والے ایک خاص قسم کی شریفانہ حجامت بنواتے تھے۔ انگریزی کٹ پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ کالج کے ماحول کا پہلا منفی اثر میرے سر کے بالوں کا انگریزی کٹ بنوانا تھا۔ قادیان کے دکاندار بہت اچھی روایات کے حامل تھے۔ ریتی چھلّہ میں واقع ایک احمدی حجّام کی دکان سے خاکسار بال بنوایا کرتا تھا۔ احمدی حجّام نے پہلے تو انگریزی کٹ بنانے سے انکار کر دیا۔ پھر میرے اصرار پر بال بنانے سے پہلے مجھے ''وارننگ'' دی کہ اس فعل کے نتائج کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہوگی۔

......والد صاحب ہفتہ وار تعطیل پر لاہور سے قادیان آ جاتے تھے۔ جب اگلے ہفتہ آئے تو میرے انگریزی کٹ کو دیکھا مگر خاموش رہے جس سے میں نے ان کی پسندیدگی اور رضامندی کا تاثر لیا۔ دوسرے روز صبح کہنے لگے: ذرا بازار چلنا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید...... گھر کے راشن وغیرہ کی خریداری کرنا ہوگی۔ ہم دونوں بازار روانہ ہو گئے۔ ریتی چھلّہ اسی حجّام کی دکان پر مجھے اندر لے گئے اور اسے کہا کہ میں ذرا آگے جا رہا ہوں، اس برخوردار کی ٹِنڈ کر دو۔ حجام نے مجھے اپنی ''وارننگ'' یاد دلاتے ہوئے فوراً میری ٹِنڈ کر دی۔ اس کے بعد میں ہفتہ بھر کالج نہ جا سکا مگر دینی شعار کا احترام کرنا ہمیشہ کے لیے سیکھ لیا۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کالج میں ہر طرح کے لڑکوں کے داخلہ سے قادیان کے لڑکوں پر ان کی تربیت کے مخصوص اور محفوظ حصار پر دباؤ پڑنا شروع ہوا۔ جائز اور ناجائز، صحیح یا غلط، ضروری یا غیر ضروری، فیشن پرستی یا قدامت پسندی کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ اساتذہ بھی بیرونِ قادیان سے آئے تھے اور ان کا اپنا اپنا رنگ تھا۔ غرض یہ ایک کشمکش کا دور تھا۔ ہم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ تقسیمِ ملک کی طوفانی لہر آئی اور ایک

خونی دور میں سے گزرنا پڑا۔ خاکسار ایف ایس سی کے آخری سال میں تھا۔ احمدی آبادی کا انخلا شروع ہو گیا...... خاکسار اکتیس اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خون کا دریا عبور کر کے لاہور پہنچ گیا...... ہجرت کے داغ گہرے تھے۔ مٹنے میں کافی وقت لگا۔

تعلیم الاسلام کالج، لاہور سے خاکسار نے ۱۹۴۸ء میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت لاہور میں نہ کالج کی مناسب عمارت تھی، نہ سائنسی تجربہ گاہیں اور نہ اساتذہ پورے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایف ایس سی کے امتحان کے دوران جب آرگینک کیمسٹری کا پرچہ تھا تو میری کوئی تیاری نہ تھی۔ خوش قسمتی سے پرچہ سے قبل تین چھٹیاں تھیں۔ اس مضمون کے استاد پروفیسر حبیب اللہ خان تھے۔ وہ میرے ہمسائے بھی تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کیفیت بیان کی کہ قادیان میں...... پہرے اور ڈیوٹیاں دیتا رہا ہوں۔ لاہور آیا تو پڑھائی کا کوئی ماحول ہی نہ تھا۔ گھر اجڑنے اور نیا گھر بنانے کی فکر تھی۔ پروفیسر صاحب بہت عبادت گزار، عاجز اور شفیق استاد اور اپنے مضمون کے ماہر تھے۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ کل صبح آ جانا۔ میں تین دن صبح سے شام تک ان سے پڑھتا رہا۔ انگریزی میں پڑھاتے۔ مجھے مضمون سمجھ میں نہ آتا تو اردو میں پڑھانا شروع کر دیتے۔ انہوں نے تین دن بڑے خلوص و محبت سے پڑھایا اور میرے لیے دعائیں بھی کیں۔ ہم انتیس لڑکے ایف اے/ ایف ایس سی کے امتحان میں شامل ہوئے۔ صرف نو پاس ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار بھی پاس ہو گیا۔ پھر ڈی اے وی کالج لاہور کی خستہ عمارت کا ایک حصہ تعلیم الاسلام کالج کو الاٹ ہو گیا تو ہمارے تعلیمی ماحول میں قدرے بہتری پیدا ہوئی۔

اس زمانے کے دو احمدی اساتذہ کی نیکی اور اعلیٰ علمی معیار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک پروفیسر عطاالرحمٰن تھے جو ہمیں فزکس پڑھاتے تھے۔ کبھی اپنے ساتھ نوٹس نہیں لائے۔ آتے ہی گزشتہ روز کا سبق دہراتے، پھر نیا سبق دیتے۔ آخر میں اگلے روز کے سبق کا مختصر سا تعارف کروا دیتے۔ دعا گو بزرگ تھے اور طلبہ کے بڑے ہمدرد تھے۔ دوسرے استاد اخوند عبدالقادر تھے۔ میرے سکول کے زمانے میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے۔ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اچھے استاد کی ساری خوبیاں ان میں اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ انہوں نے اپنے پروفیسری کے زمانے میں کسی طالب علم کو کبھی سزا نہیں دی۔ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی تھے۔ طلبہ کا ہوم ورک بڑی محنت سے چیک کرتے تھے۔ مشکل سے مشکل عنوانات پر مضامین لکھواتے۔ مجھے روزانہ ایک مضمون زیادہ لکھنے کو دیتے۔ میرے لیے روزانہ انگریزی کے دو مضمون لکھنے مشکل ہوتے کیونکہ میں سائنس کا طالب علم تھا مگر مجھے بعد میں اس محنت کا بہت فائدہ پہنچا۔ بی اے میں دو سال ان کا شاگرد رہا مگر یہ حسرت رہی کہ کم از کم ایک مضمون ہی ہوتا جس پر وہ اپنا سرخ قلم استعمال نہ کرتے۔ وہ تو جب کبھی قائم مقام پرنسپل بنتے اساتذہ کی رخصتوں کی درخواستوں کی پہلے انگریزی عبارت درست کرتے۔ لمبا قد، شیروانی اور سر پر پگڑی ان کا مخصوص لباس تھا۔ بڑی بارعب اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ انتظامی امور میں بالکل دخل نہ دیتے۔ طلبہ کے اصرار پر اتنا فرماتے کہ پرنسپل صاحب کے پاس جاؤ۔ پڑھاتے ہوئے کلاس میں

متواتر ٹہلتے رہتے۔ تدریس کا انداز اتنا دلرُبا اور آواز اتنی پُرکشش تھی کہ الفاظ مجسّم ہو کر تصویری صورت میں طلبہ کے سامنے آجاتے۔ ڈرامہ پڑھاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ ہم اسٹیج پر کرداروں کو اداکاری کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج، لاہور کے پاس کھیل کے میدان اور دیگر وسائل نہ تھے۔ کشتی رانی کی طرف شاید اسی لیے زیادہ توجہ دی گئی۔ پھر بھی سالانہ سپورٹس بڑے اہتمام اور جوش کے ساتھ منعقد کی جاتیں۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، پرنسپل خود شرکت فرماتے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ مختلف مقابلہ جات کے لیے مقررہ انعامات کے علاوہ موقع پر مزید انعام مقرر کرتے اور لڑکوں میں مقابلہ کرنے کا جوش پیدا کرتے۔

خاکسار دبلا پتلا مگر مضبوط تھا۔ قادیان میں رہنے کی وجہ سے مختلف کھیلوں میں تربیت یافتہ تھا۔ کلائی پکڑنے کی خوب مہارت تھی۔ اس مقابلہ میں خاکسار اول آیا تو میاں صاحب کو یقین نہ آیا۔ ہمارے ساتھ دیہات سے آئے ہوئے قد آور اور جسیم لڑکے تھے۔ پرنسپل صاحب نے ان میں سے چُن چُن کر میرے ساتھ مقابلہ شروع کروا دیا۔ جب میں دو تین لڑکوں کو شکست دے چکا تو پرنسپل صاحب نے پہلے ایک روپیہ انعام مقرر کیا۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے پانچ روپے کر دیئے۔ ۱۹۵۰ء میں یہ بہت بڑا انعام تھا۔ پھر بھی کوئی لڑکا مجھ سے نہ جیت سکا تو میاں صاحب نے خود میرے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا۔ اب میں متواتر مقابلہ کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ پھر میاں صاحب کی کلائی میرے دونوں ہاتھوں میں نہ آئی۔ بار بار مجھ سے بڑی آسانی سے جیتتے رہے۔ پھر دیہاتی لڑکوں کو ناراضگی کے رنگ میں کہا کہ سعید میں تو بالکل جان نہیں ہے۔ اس کی گرفت تو میں ایک انگلی سے چھڑا گیا ہوں۔ تم خواہ مخواہ اس سے ڈر رہے ہو۔ غرض میاں صاحب اس طرح سے طلبہ کو مقابلہ جات میں آگے بڑھنے کے لیے تحریک وتحریص فرماتے۔

بی اے میں خاکسار کے مضامین انگریزی کے علاوہ فزکس اور ریاضی تھے...... علمی اور ورزشی مقابلہ جات میں زیادہ انہماک کی وجہ سے خاکسار دسمبر ٹیسٹ میں فزکس اور ریاضی میں فیل ہو گیا...... اس لیے میرا داخلہ روک دیا گیا۔ یہ میرے حالات کے لحاظ سے بہت تکلیف دہ تھا۔ خاکسار صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے حالات بیان کئے نیز عرض کیا کہ میں کبھی بھی سالانہ امتحان میں فیل نہیں ہوا اس لیے میرا داخلہ بھجوا دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ فزکس اور ریاضی تمہارے اصل مضامین ہیں اس لیے یہ مشکل ہے۔ اگر تمہارے ان مضامین کے پروفیسر صاحبان سفارش کر دیں تو داخلہ بھجوا دیا جائے گا۔ مجبوراً میں پروفیسر صاحبان کے پاس گیا۔ فزکس کے پروفیسر عطاالرحمٰن نے فوراً سفارش کر دی۔ ریاضی کے پروفیسر صاحب نے مجھے کافی پریشان کیا۔ یہ کوئی نوجوان تھے۔ نیا نیا ایم اے کر کے آئے تھے۔ جلد ہی کالج چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر انہیں کبھی نہیں دیکھا۔...... میرے اصرار پر بالآخر سفارش کر دی۔ داخلہ بھیج دیا گیا اور خاکسار نے بڑی محنت کی اور میاں صاحب اور پروفیسر عطاالرحمٰن اور دوسرے بزرگان کی خدمت میں دعا کے لیے درخواست کرتا رہا۔ خود بھی خوب دعاؤں کا موقعہ ملا۔ نتیجہ نکلا تو اپنے کالج کے آرٹس کے طلبہ میں اول، آرٹس اور سائنس کے طلبہ کو ملا کر پورے کالج میں دوم تھا۔"

محمد سعید احمد نے طویل علالت کے بعد ۲۹ اپریل ۲۰۱۷ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کے بارہ میں فی الحال اتنا ہی کچھ۔ اب تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور معروف طالب علم، رشید قیصرانی کا ذکر کیا جا رہا ہے جو قیصرانی قبیلے کے سردار گھرانے اور ایک مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا بہت سا حصہ پاکستان ایئر فورس کی ملازمت میں گزرا تھا اور وہ اردو زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

رشید قیصرانی کے والد، حضرت سردار شیر بہادر خان اور تایا، حضرت سردار امام بخش خان حضرت مسیح موعود کے رفقاء میں سے تھے۔ حضرت سردار امام بخش وہی بزرگ ہیں جو اپنے حقِ سرداری سے محرومی کے بعد دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے قادیان پہنچے تھے اور پھر حضرت مسیح موعود کی دعا سے ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا حق انہیں مل کر رہا۔ انہوں نے یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ ان کے جاہ و جلال کی بحالی صرف اور صرف حضور کی دعاؤں ہی کی مرہونِ منت تھی بلکہ ایک ایسے موقع پر جب کہ شہزادہ ویلز کی ہندوستان آمد پر ان کے استقبال کے لیے دہلی دربار سجا ہوا تھا حضرت سردار امام بخش نے اپنی غیرتِ ایمانی کا ایک ایسے انداز میں مظاہرہ کیا جس کی نظیر ملنا آسان نہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) سردار محمد حیات قیصرانی کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۲۹ جولائی ۲۰۰۴ء) کے مطابق: "دہلی ہندوستان کا قدیم پایۂ تخت ایک عجیب شان سے سجا ہوا تھا۔ وائسرائے ہند نے کھڑے ہو کر شاہی دربار پر فاتحانہ نگاہ ڈالی۔ ہندوستان کے والیانِ ریاست اور رؤسائے ملک زرق برق لباسوں میں ملبوس اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے قیصرِ ہند، تاجدارِ برطانیہ جارج پنجم کے ولی عہد شہزادے کا انتظار کر رہے تھے۔ وائسرائے ہند کو احساس ہوا کہ دربار میں بیٹھا ہوا ایک بلوچ سردار کچھ ایسے انداز سے بیٹھا ہے کہ اس کی پشت "شہزادہ سلامت" کے تخت کی طرف ہو رہی ہے اور ایسا کرنا آدابِ شاہی کے خلاف تھا۔ گورنر پنجاب نے بتایا کہ آدابِ شاہی سے بے نیاز یہ بلوچ سردار، سردار امام بخش خان تمندار قیصرانی ہے۔ وائسرائے ہند کی ہدایت پر گورنر پنجاب سردار صاحب کی طرف آئے اور کہا کہ جس انداز سے سردار صاحب بیٹھے ہوئے ہیں یہ آدابِ شاہی کے خلاف ہے۔ سردار صاحب نے جواباً کہا کہ انہیں آدابِ شاہی کا بخوبی احساس ہے لیکن جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تھے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد ہیں جو ماموریزدانی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے فرزند و جانشین ہیں اس لیے وہ (سردار صاحب) احتراماً کچھ اس انداز سے بیٹھے کہ جس سے صاحبزادہ موصوف کی طرف ان کی پیٹھ نہ ہو۔

گورنر پنجاب، سردار صاحب کے جواب سے برہم سے ہوئے اور کہا کہ دربارِ شاہی کے انعقاد کی اصل غرض ہی تاجدارِ برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ ویلز کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھی اور ولی عہد شہزادہ کی ذات ہی بلاشرکتِ غیر باعثِ صد تکریم تھی۔ اصولی طور پر سردار صاحب شہزادہ ویلز کے مقامِ عزّ و جاہ سے بخوبی واقف تھے لیکن دربار میں بیٹھے ہوئے سردار صاحب کا ذہن ایک عجیب کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ ایک طرف شہزادہ ویلز کی تخت گاہ تھی جس پر شہزادہ موصوف رونق افروز ہونے والے تھے تو دوسری طرف شاہِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم، مملکتِ آسمانی کے تاجدار، مسیح الزّماں کا جانشین شہزادہ تھا۔ ایک طرف تن کی دنیا کے ثقیل ضوابط اور ضوابط

کے بوجھل جھکاؤ تھے تو دوسری طرف من کی دنیا کی لطیف و پُر کیف راجدھانی!

......سردار صاحب دفعتاً کھڑے ہوگئے۔ اپنی چادر کندھے پر رکھی اور گورنر صاحب سے کچھ یوں مخاطب ہوئے:

''گورنر صاحب! میں آپ کی برہمی کو سمجھ گیا ہوں۔ پہلے بھی انگریز سرکار مجھ سے برہم ہوئی تو مجھے جلاوطن کیا۔ جلاوطنی کے دوران حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کا گھر ہی میرے لیے اور میرے اہل وعیال کے لئے جائے پناہ بنا...... مجھے ان کے احسانوں کا پاس ہے۔ میں آج دربار میں حضرت مرزا صاحب کے فرزند و جانشین صاحبزادہ موصوف کی طرف پیٹھ کئے ہوئے نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا کرنا ان احسانوں کی توہین ہے جو مجھ پر کئے گئے۔ گزرتا ہوا وقت احسانوں کی قدر و منزلت کو کم نہیں کیا کرتا۔ بلوچوں کی احسان شناسی ضرب المثل ہے۔ میں کیوں کر احسان فراموش بن کر دربار میں بیٹھ سکتا ہوں؟ اگر ممکن ہو تو میری کرسی صاحبزادہ موصوف کے پیچھے ڈال دی جائے وگرنہ مجھے اجازت دیں میں خود ہی دربار سے باہر چلا جاؤں۔ دنیاوی عزت کے بغیر میں پھر بھی جی لوں گا۔''

سردار صاحب کا اٹھنا تھا کہ ڈیرہ جات کے سب بلوچ سردار کھڑے ہوگئے اور دربار سے باہر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وائسرائے ہند بھاگے ہوئے آئے اور مداخلت کی۔ وائسرائے نے تمام سرداروں کو دربار میں بیٹھنے کے لیے کہا لیکن سرنواب میر بہرام خان تمندار مزاری (جناب میر بلخ شیر صاحب سردار مزاری کے دادا محترم) سینہ سپر ہو گئے۔ بالآخر بلوچ سرداروں نے اس شرط پر بیٹھنا منظور کیا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب کی کرسی بلوچ سرداروں سے آگے رکھ دی جائے۔ شاہی دربار میں فوری ردّوبدل بظاہر ناممکن اور انگریز قوم کی روایات کے خلاف تھا لیکن وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے وائسرائے ہند مجبور ہو گئے۔ ان کے لیے کوئی چارہ نہ رہا چنانچہ وائسرائے ہند خود آگے بڑھے اور حضرت صاحبزادہ صاحب سے درخواست کی کہ وہ آگے تشریف فرما ہوں، ان کی کرسی بلوچ سرداروں سے آگے رکھ دی جائے گی۔''

ان ہی حضرت سردار امام بخش قیصرانی کے بھتیجے، رشید قیصرانی نے ۱۹۳۰ء میں اپنے آبائی گاؤں، شیر گڑھ میں آنکھ کھولی۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان سے میٹرک کرنے کے بعد بی اے تعلیم الاسلام کالج، لاہور سے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ایئرفورس میں ملازمت اختیار کرلی اور ۱۹۷۹ء میں وِنگ کمانڈر کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملتان ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں ڈائریکٹر فنانس رہے۔ اسی طرح سیکرٹری، ادارہ ثقافتِ پاکستان کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

۱۹۵۰ء میں جب تعلیم الاسلام کالج لاہور کا رسالہ ''المنار'' جاری ہوا تو موصوف اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ فیض اسلم جو بعد میں سیشن جج ہو کر ایک حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے بھی ان کے ساتھ ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھے۔ المنار کے پہلے شمارہ میں رشید قیصرانی کی ایک نظم بعنوان ''حقائق'' شائع ہوئی ہے

جو اس خیال کے تحت یہاں نقل کی جا رہی ہے کہ شاید یہ ان کی پہلی مطبوعہ نظم ہو:

انسان کی تدبیر کے پُرہول نظارے
بدلی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے تیور
الجھے ہوئے ماحول سلجھ جائیں تو اچھا
بگڑا ہوا انسان سنور جائے تو بہتر
وہ مردِ خدا مرد خدا ہی نہیں ہوتا
آتا نہیں قطرے میں نظر جس کو سمندر
کافر تو کیا کرتا ہے شیطان کی تقلید
اور بندۂ مومن ہے فرشتوں کا بھی رہبر
آ دیکھ لے اے گشتۂ اوہام یہاں پر
نظارۂ شمشیرِ علی، بازوئے حیدر
مسلم ہے تو مسلم کی روایات کو مت بھول
میدان میں آ، چھوڑ یہ کمخواب کے بستر

ان کے کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں ''فصیلِ لب'' ''صدیوں کا سفر'' اور ''نین جزیرے'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منور بلوچ کی روایت مطبوعہ روزنامہ الفضل کے مطابق انہیں اپنی یہ نظم جو انہوں نے ''بہشتِ نظر (یومِ حشر)'' کے عنوان سے لکھی تھی بہت پسند تھی اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں بکثرت سنایا کرتے تھے:

مرے فرشتے
بتا مجھے وہ نگار خانہ
کہ جس میں تجسیم ہوں گے منظر، تمام منظر، سبھی قرینے
جہاں شگفتہ دنوں کی مرجھائی آرزوئیں
حسین پیکر میں ڈھل کے اُس دن
حضورِ جاناں میں پیش ہوں گی
جہاں بدن کے تمام اعضا
خود اپنا قصہ بیاں کریں گے
جہاں ہر اک کی چھپی ہوئی شباہتوں کا
مرے فرشتے
لگے گا میلہ
وہ دن جب آئے

اوراپنے مسند پہ جلوہ گر ہو نگارِ یکتا
تو عرض کرنا
کہ ایک دامن تہی
دریدہ لباس مفلس جو اپنے کندھوں پر
اَن گنت لغزشیں اٹھائے
کمر خمیدہ کھڑا ہوا ہے
نہ پاس اس کے کوئی اثاثہ
نہ معتبر اس کی ذات کا ہے کوئی حوالہ
بس ایک تیری محبتوں کا علَم اٹھائے
اُدھر بہت دور ایک کونے میں
تیرے رخ پر نظر جمائے
وہ منتظر ہے
کہ کب تری اک نظر، شناسا
نظر ہو اس پر
تیرے قلندر کو اس جہاں میں
یہی بہشتِ نظر بہت ہے

انہوں نے ۲۲ جون ۲۰۱۰ء کو تقریباً ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی اور شیر گڑھ میں دفن ہوئے۔ روزنامہ الفضل ۳۰ جون ۲۰۱۰ء کے مطابق ''وہ ایک مخلص اور نڈر احمدی تھے اور خلافت سے گہری وابستگی رکھنے والے تھے۔''

اگرچہ میں نے رشید قیصرانی کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھ اور سن رکھا تھا لیکن ان سے ملاقات کا موقع کبھی نہ ملا تھا۔ ایک دفعہ جمیل یوسف جو ملٹری لینڈز اینڈ کینٹونمنٹس سروس کے ایک ریٹائرڈ غیر احمدی افسر اور معروف ادیب ہیں نے مجھے اپنی اسلام آباد کی تعیناتی کے دوران فون کر کے بتایا کہ رشید قیصرانی یہاں آئے ہوئے ہیں اور فلاں دن اتنے بجے ان کے گھر واقع آئی ٹین میں تشریف فرما ہوں گے۔ انہوں نے مجھے دعوت دی کہ اگر اس وقت میں بھی ان کے گھر پر حاضر ہو سکوں تو اچھی نشست رہے گی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا اور وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ اکبر حمیدی جو کسی کالج میں پڑھاتے تھے اور معروف احمدی ادیب و شاعر تھے بھی وہاں آ گئے۔

اس نشست میں جو گھر کے ماحول میں ہوئی ایک دوسرے کو نظمیں سنانے سے اجتناب کیا گیا البتہ رشید قیصرانی تعلیم الاسلام کالج میں اپنے زمانہ تعلیم کی، اکبر حمیدی جماعت کے ساتھ اپنے رابطوں اور جمیل یوسف سرگودھا میں اپنی تعیناتی کے دوران جلسہ سالانہ اور بعض دیگر مواقع پر ربوہ کی وزِٹس کا حال سناتے رہے جس کے

بعد یہ مجلس برخواست ہوگئی۔ افسوس! اس کے بعد رشید قیصرانی سے ملاقات کا موقع کبھی نہیں ملا۔

پرویز پروازی نے الفضل بائیس اکتوبر ۱۹۹۹ء میں شائع شدہ اپنے مضمون ''ٹین جزیروں کا باسی'' میں رشید قیصرانی کے فن پر بہ این الفاظ تبصرہ کیا ہے:

''جماعت احمدیہ کے جن شعراء نے جدید اردو شاعری میں اپنی اعلیٰ شاعری کی وجہ سے اپنا مرتبہ منوایا ان میں رشید قیصرانی کا نام بہت نمایاں ہے۔ رشید قیصرانی کے تین مجموعے چھپ کر ادبی حلقوں سے تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں حضرت امام جماعت احمدیہ الرّابع نے ازراہِ کرم رشید کا کلام اپنی اردو کلاس میں پڑھ کر سنوایا اور اپنی زبانِ مبارک سے بھی پڑھا۔

یہ مختصر سا مضمون رشید قیصرانی کے تینوں مجموعوں ''فصیلِ لب'' ''صدیوں کا سفر'' اور ''ٹین جزیرے'' کے ایک مختصر ادبی جائزے پر مشتمل ہے۔ رشید کے ادبی مرتبے پر اردو کے اہم نقادوں اور ادیبوں نے بہت لکھا ہے۔ یہ ایک احمدی نقاد کی طرف سے رشید قیصرانی کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش ہے۔

رشید قیصرانی مشہور احمدی قیصرانی سرداروں کی اولاد ہے۔ اس کے نانا یا دادا وہ بزرگ تھے جنہوں نے وائسرائے کے دربار میں اپنی کرسی کا رخ ٹیڑھا کر لیا تھا کہ سیدھا رکھنے سے ان کی پیٹھ حضرت امام جماعت الثّانی کی طرف ہوتی تھی اور اس غیور بلوچ سردار کو اپنے روحانی سردار کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔ رشید کے بہنوئی جماعت احمدیہ کی مشہورِ زمانہ فرقان فورس کے کماندار، کرنل سردار حیات خاں قیصرانی تھے اور رشید خود اپنی شاعری کے ناطے اردو کے جدید شعراء میں ممتاز ہے۔ اس کی ساری عمر پاکستانی فضائیہ کی سروس میں گزری اس لیے سیّد ضمیر جعفری نے اسے ''اردو کا ایف سولہ'' قرار دیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جن شعراء نے دفعتاً شعر کے افق پر طلوع ہو کر نظروں کو خیرہ کر دیا ان میں رشید قیصرانی کا نام سب سے نمایاں نام ہے۔ بلوچوں کے ہاں پیدا ہونے والا یہ شاعر ایک نئی شعری حسّیت لے کر پیدا ہوا۔ اس کے لہجے میں رومانوی شاعروں کی ساری ملائمت اور کلاسیکی شاعروں کی ساری توانائی یکجا نظر آتی ہے۔ اندھیروں کا جگر چیر کر نکلنے والے اس شاعر کے ماتھے پر ایک نہیں کئی خورشید چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ''فصیلِ لب'' سے چل کر ''صدیوں کا سفر'' طے کر کے ''ٹین جزیرے'' تک پہنچا ہے اور یہ سفر اور یہ منزل ہر کسی کے مقدّر میں نہیں ہوتی۔ ہر مردے و ہر کارے! رشید قیصرانی نے یہ شعری فاصلہ اپنی توانائی، صلابتِ فکر اور اصابتِ اظہار کے زور سے طے کیا ہے، اسے کسی پی آر کی بیساکھی کی ضرورت نہیں پڑی کہ اسے کسی اور کا سہارا لینا پڑتا۔ یوں لگتا ہے وہ اپنا سفر طے کر کے واپس اپنی زمین میں پہنچ گیا ہے اور اب ایک ثمر آور پودے کی طرح اپنے پھل ایک ایک کر کے لوگوں میں بانٹ رہا ہے۔ میں اس کے اس سفر کا عینی گواہ ہوں!

رشید قیصرانی نے شعر کہنا تو بہت پہلے شروع کر دیا تھا مگر اس کے جوہر اس وقت کھلے جب وہ اپنے کالج یعنی تعلیم الاسلام کالج کے میگزین، المنار میں چھپنا شروع ہوا۔ اس کی نظموں کے موضوعات دوسروں سے الگ ہوتے تھے اور لوگ اس کے موضوعات پر چونکتے تھے مگر رشید قیصرانی نے اچانک غزل کا دامن پکڑا اور اس

ہدّت کے ساتھ غزل کہنا شروع کی کہ پڑھنے والے چونکے ہی نہیں حیران بھی ہوئے کہ یہ شخص کہاں سے طلوع ہوا ہے؟ اس کے سفر کا آغاز ایسی جگہ سے ہوا جہاں اسے اپنے اردگرد اپنے لب و لہجے میں شعر کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ رشید نے اس لہجہ کو اپنایا جو ایک رُومان پسند بلوچ کا لہجہ ہو سکتا تھا۔ بلند آہنگ، مضبوط اور محبت کی بُو باس میں رچا ہوا۔ اس کی پہلی غزل جس نے سب کو چونکایا ہو گا یہ تھی:

صدیوں سے میں اس آنکھ کی پتلی میں چُھپا تھا
پلکوں پہ اگر مجھ کو سجا لیتے تو کیا تھا

یہ ''تو کیا تھا'' کی حیرانی نے عمر بھر رشید کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہ کون سا سورج میرے پہلو میں کھڑا ہے
مجھ سے تو رشید اب میرا سایہ بھی بڑا ہے

نکلا ہوں لفظ سے میں ڈوب ڈوب کر
یہ تیرا خط ہے یا کوئی دریا چڑھا ہوا

مانا وہ ایک خواب تھا، دھوکہ نظر کا تھا
اس بے وفا سے ربط مگر عمر بھر کا تھا

مگر سب سے زیادہ حیرت اسے اس بات پر ہوتی ہے کہ لوگ بھی اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ تب اس نے کہا:

ہے شوق تو بے ساختہ آنکھوں میں سمو لو
یوں مجھ کو نگاہوں کے ترازو میں نہ تولو

نگاہوں میں تُلنے کے اس احساس نے اس کے ہاں لفظ اور معنی کے نئے امکانات کے دروازے کھولے۔ آواز اور لفظ اس کے ہاں علامت بن کر ابھرے۔ ان لفظوں کا جتنا ظہور رشید قیصرانی کے ہاں ہوا ہے اور کسی کے ہاں نہیں ہوا۔ ''فصیلِ لب'' بجائے خود آوازوں، رنگوں، صداؤں، بانسریوں اور گونجتی ہوئی پکاروں کا مرقّع ہے۔

رنگوں کی وہ پکار تھا، شعلہ صدا کا تھا
جو کچھ بھی تھا حسین وہ ظالم بلا کا تھا

بن جاتے ہیں پَل بھر میں صدا کے کئی پیکر
میں نے یہ کسی بانسری والے سے سنا ہے
اے شب! تو کسی سانولے سورج کو جنم دے
صدیوں سے سلگتی ہوئی دھرتی کی صدا ہے

میں نے کاغذ پہ سجائے ہیں جو تابوت نہ کھول
جی اٹھے لفظ تو میں خوف سے مر جاؤں گا

موجۂ آب پہ قندیل جلائی نہ گئی
تیری آواز کی تصویر بنائی نہ گئی
مجھ سے توڑا نہ گیا گُنگ صداؤں کا بھرم
تجھ سے الفاظ کی دیوار گرائی نہ گئی

یہاں پہنچ کر وہ لمحہ آیا جب رشید نے محسوس کیا کہ اب اس بزمِ صدا سے رہائی ممکن نہیں۔ تب اس نے ''فصیلِ لب'' پر سے پہرہ اٹھا لیا۔

یوں بھی اک بزمِ صدا ہم نے سجائی پہروں
کان بجتے رہے آواز نہ آئی پہروں
اک ترا نام تھا ابھرا جو فصیلِ لب پر
ورنہ سکتے میں رہی ساری خدائی پہروں

صدا کے امکانات میں سدا بھٹکتے رہنا اس شاعر کو گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے رنگوں کا سہارا لینا چاہا۔ تب اسے احساس ہوا کہ شاید رنگ بھی اس کا ساتھ نہ دے پائیں گے کیونکہ وہ ایسی منزل کا راہی ہے جہاں چاہنا لازم ہے مگر جستجو کرنا منع ہے۔

ترے خیال کو پابندِ رنگ و بُو نہ کروں
میں تجھ کو چاہوں مگر تیری جستجو نہ کروں

اور

یہ دھڑکنوں کا شور قیامت سے کم نہیں
اے ربِّ صوت! مجھ کو دلِ بے زبان دے

دلِ بے زبان کی اس منزل پر رشید کا ''صدیوں کا سفر'' شروع ہوا۔

آکاش کی سرحد سے پرے تیرا نگر تھا، صدیوں کا سفر تھا
میں ذرّۂ آوارہ تھا اور محوِ سفر تھا، صدیوں کا سفر تھا

رشید قیصرانی کی اس کتاب کا لب و لہجہ ایک بدلا ہوا لب و لہجہ ہے۔ اس میں صدا کا دامن چاک اور شاعر کا اپنا دامن پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ہاں کسی صوفی شاعر کا لہجہ اُبھر کر سامنے آ گیا ہے۔ رشید نے اس مقام پر آ کر دوہوں کا سہارا لیا ہے۔ سرائیکی روایت کے مطابق یا وہ کافی کا پیرایہ اپناتا یا کسی ایسی صنفِ سخن کا جو اس کے بدلتے ہوئے منظر نامے کا ساتھ دے سکے۔ رشید نے دوہوں کو چنا اور انہیں ''تین جزیرے'' کا نام دے

دیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ''حضرت بابا فرید گنج شکر سے لے کر موجودہ دور تک زبان کی سادگی اور مٹھاس، جذبے کی شدت اور والہانہ پن، یار کی راہ میں اپنے آپ کو مٹا دینے کا جذبہ اور درویشانہ طرزِ اظہار ہی ہے جو ہمیشہ دوہے کی صنف میں ایک غالب عنصر کی حیثیت سے موجود رہا ہے اور یہی عناصر دوہے کا مزاج متعیّن کرتے ہیں۔'' رشید قیصرانی کے دوہے اس کی اپنی ذات کے اس کڑے سفر کا بیان ہیں جو اس نے خود اپنی ہمّت سے طے کیا ہے اور صدیوں کے سفر کے بعد وہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ اپنے ''مرشد'' تک پہنچ گیا ہے۔ اس کی غزل کا گھن گرج کا لہجہ ایک صوفی کی ملائمت اور دھیرج میں بدل گیا ہے۔ اس نے ''صدیوں کا سفر'' کے دیباچہ میں کہا تھا: ''میرے نزدیک محبوب اور مرشد میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ دونوں زیراثر شخصیت کے ظاہر اور باطن میں انقلاب برپا کرتے ہیں اور اس انقلاب کا منبع وہی آنسو ہوتے ہیں جو انسان کو پگھلا دیتے ہیں۔'' رشید کو احساس ہے کہ اب اس کی ذات برتر پاکیزگی کے اس مقام پر آ گئی ہے کہ اسے صوفیانہ لب و لہجہ کی ضرورت ہے۔ یہ لہجہ اس نے دوہوں سے مستعار لیا ہے۔ اس نے ''صدیوں کا سفر'' میں نعرہ لگایا تھا کہ:

دست بستہ نظر آئے ہیں ہر ایک موڑ پہ لفظ
ہم جو پروانۂ سلطانِ قلم لے کے چلے

اور رشید کو دست بستہ لفظوں میں سے مناسب لفظوں کو برتنے کا سلیقہ تو پہلے ہی آتا تھا اب اسے ان لفظوں کے اندر جھانکنے کا موقع بھی مل گیا ہے اور رشید نے دوہوں کے حوالے سے اپنے اور اپنے لفظوں کے اندر جھانکنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اب دو چار دوہے:

آج تلک جو بیتا جیون، یار وہ جیون تیرا تھا
سچ پوچھو تو نام تھا میرا ورنہ تن من تیرا تھا
جانے کون سی گُل وادی میں اس کا رَین بسیرا تھا
وہ اک شخص جو بستی بستی خوشبو بانٹتا پھرتا تھا
دنیا والو! پاس ہمارے دل تو تھا دلدار نہ تھا
ہم تو سب کے یار تھے لیکن کوئی ہمارا یار نہ تھا
کیا جانے کیوں اپنا گھر بھی بیگانہ گھر لگتا تھا
ایسے بھی دن آئے جب خود اپنوں سے ڈر لگتا تھا
چلتے پھرتے مُردوں کو جو چھیڑے گا پچھتائے گا
ایسے میں اب اس بستی میں کون مسیحا آئے گا؟

مگر رشید امید کا دامن چھوڑنے کا قائل نہیں، وہ سانول کو پکارتا رہتا ہے اور اس کا منتظر ہے:

اس اندھی بے رنگ فضا کو رنگوں کی بارات کرو
سانول آؤ، دِیپ جلاؤ، گیت سناؤ، بات کرو

اور یہ خواہش ہر اس شخص کی خواہش ہے جس کا دل رشید کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہے۔

امید ہے رشید قیصرانی کی تینوں کتابیں اپنے نئے نویلے سُبک لہجے کی بدولت جماعت احمدیہ کے ادب میں زندہ رہیں گی۔''

یہ تو تھی رشید قیصرانی کی شاعری پر پرویز پروازی کی رائے لیکن جن لوگوں کو رشید قیصرانی کے فن اور شخصیت کے بارے میں مزید معلومات کی خواہش ہو انہیں چاہئے کہ وہ خالد اقبال یاسر اور جلیل حیدر لاشاری کی کتاب ''رشید قیصرانی: فن اور شخصیت'' کا ضرور مطالعہ کریں جو راولپنڈی کے ایک طباعتی ادارے، ابلاغ نے ۲۰۰۷ء میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں رشید قیصرانی پر ڈاکٹر وزیر آغا، ضمیر جعفری، خاطر غزنوی، محسن احسان، انور سدید، خیال امروہوی، ایئر مارشل ظفر چوہدری، خالد اقبال یاسر، عاصی کرنالی، جمیل یوسف، شریف اشرف، منور بلوچ، انور جمال اور حمید المحامد برکی کے مضامین شامل ہیں۔

رشید قیصرانی کا ذکر موقوف کرتے ہوئے یہاں پر اب تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور ہونہار طالب علم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو رشید قیصرانی سے کچھ ہی جونیئر ہوں گے۔ اگرچہ انہوں نے شعر و ادب کے میدان میں تو شہرت نہیں پائی لیکن انجینئرنگ کے شعبے میں اپنے نام کے خوب جھنڈے گاڑے اور ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد آج کل اپنے بچوں کے ہمراہ امریکہ میں مقیم ہیں۔ میرا اشارہ عطاء الرحمٰن کی طرف ہے جو چوہدری علی اکبر، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے صاحبزادے ہیں۔ یہ وہی علی اکبر ہیں جنہوں نے ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازمت سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی وقف کردی تھی اور ایک طویل عرصہ نائب ناظر تعلیم، صدر انجمن احمدیہ رہے۔ عطاء الرحمٰن جنہوں نے میٹرک کا امتحان ۱۹۴۷ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان سے پاس کیا تھا مزید تعلیم کے لیے زمیندارہ کالج، گجرات میں داخل ہوئے مگر جلد ہی وہ تعلیم الاسلام کالج، لاہور منتقل ہوگئے اور انہوں نے بی ایس سی کا امتحان یہیں سے پاس کیا۔

دورانِ تعلیم وہ فضل عمر ہوسٹل میں رہے جہاں ان کے ساتھیوں میں رانا محمد خاں، امیر جماعت احمدیہ بہاولپور اور سی اے رحمٰن بھی شامل تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ہمارے پروفیسروں میں ایک میاں عطاء الرحمٰن بھی تھے۔ کالج کی لیبارٹری کے ساتھ ایک کمرہ میں رہائش پذیر تھے۔ جب بھی کوئی معاملہ فزکس کا سمجھنا ہوتا ہم بے تکلفی سے ان کے پاس چلے جاتے اور وہ نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا مسئلہ حل کر دیتے۔

موصوف نے ۱۹۴۸ء میں تعلیم الاسلام کالج میں اس وقت داخلہ لیا تھا جب اسے لاہور میں نہر کے کنارے ایک متروکہ اصطبل میں قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ ۱۹۵۲ء تک یہاں رہے اور بی ایس سی کرنے کے بعد میکلیگن انجینئرنگ کالج، لاہور جو اَب یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کی شکل اختیار کر چکا ہے سے بی ایس سی (سِول انجینئرنگ) کا امتحان پاس کیا۔ وہ بتاتے ہیں: میری سب سے پہلی تقرری پشاور کے انجینئرنگ کالج میں لیکچرر کے طور پر ہوئی۔ اسی دوران پنجاب پبلک سروس کمیشن کی طرف سے محکمہ انہار میں ایک اسامی مشتہر ہوئی تو میں نے بھی درخواست بھجوا دی لیکن اسے تُھرو پراپر چینل نہیں بھجوا سکا۔ انٹرویو ہوا تو پبلک سروس کمیشن

نے مطالبہ کیا کہ میں اپنے کالج سے عدمِ اعتراض کا سرٹیفکیٹ پیش کروں ورنہ میری درخواست پر غور نہ ہو سکے گا۔ مجھے اس حوالے سے کچھ دقّتیں درپیش تھیں چنانچہ میں نے سوچا کہ کیوں نہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ سے دعا کی درخواست کی جائے سو میں ربوہ چلا گیا۔ مغرب کی نماز کا وقت تھا۔ حضور نماز پڑھانے کے لیے آئے۔ بعد نماز محراب میں ہی حضور کی خدمت میں صورتِ حال گزارش کی جس پر آپ نے فرمایا کہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، آرام سے بیٹھے رہو۔ میں نے ایسے ہی کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری محکمہ نہر میں سیلیکشن ہوگئی۔ وہاں سے مجھے جبراً ڈیپوٹیشن پر واپڈا میں بھیج دیا گیا لیکن میں نے بعد میں اپنی مرضی سے واپڈا ہی کی ملازمت اختیار کر لی۔

وہ خوش قسمت ہیں کہ واپڈا کی ملازمت کے دوران انہوں نے یونیورسٹی آف ایریزونا، ٹسکن، امریکہ سے ہائیڈرالوجی میں ایم ایس سی کر لی اور انہیں ہارورڈ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجوایٹ ریسرچ کا موقع بھی ملا۔ وہ اپنی پوری ملازمت کے دوران واپڈا کے ساتھ منسلک رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء میں اپنی ملازمت کا آغاز جونیئر ہائیڈرالوجسٹ کے طور پر کیا تھا تاہم بعد میں وہ پراجیکٹ ڈائریکٹر پلاننگ؛ چیف انجینئر (فلڈز)، فیڈرل فلڈ کمیشن؛ ڈائریکٹر جنرل انٹرنیشنل واٹر لاگنگ اینڈ سیلینٹی ریسرچ انسٹیٹیوٹ؛ چیف انجینئر (واٹر ریسورسز پلاننگ) اور جنرل منیجر واٹر (ویسٹ) رہے۔ موصوف ایک کامیاب کیریئر کے بعد سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد نیشنل انجینئرنگ سروس والوں نے ان سے رابطہ کیا اور ورلڈ بنک کے ایک پراجیکٹ کے سلسلے میں ملازمت کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ وہ تقریباً پانچ سال ان کے ساتھ بطور پراجیکٹ منیجر کام کرتے رہے اور ۱۹۹۶ء کے آخر میں نوکری چھوڑ کر ربوہ میں سکونت اختیار کر لی۔

خدا تعالیٰ کے فضل سے انہیں جماعت کی بعض قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے کی توفیق ملی ہے چنانچہ جامعہ احمدیہ ربوہ کی موجودہ عمارات میں سے بہت سی ان ہی کی نگرانی میں مکمل ہوئی ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں حضرت مسیح موعود کی کتب کو کمپیوٹر پر منتقل کرنے، انٹرنیٹ پر الفضل کے اجرا اور کتب وملفوظات حضرت مسیح موعود کی آڈیوز بنانے کی سعادت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے وہ الفضل کے سو سالہ جوبلی نمبر کے صفحہ ۲۸۱ پر شائع شدہ اپنے ایک مضمون کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں یہ ساری تفصیلات درج ہیں۔ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو جماعت کی کس قدر عظیم الشان خدمت کی توفیق بخشی ہے۔

موصوف کی اہلیہ استاذی المکرّم چوہدری سلطان اکبر جو کالج میں ہمیں عربی پڑھایا کرتے تھے کی ہمشیرہ ہیں اور کرنل ڈاکٹر الطاف الرحمٰن جو آج کل فضل عمر ہسپتال، ربوہ میں واقفِ زندگی کے طور پر خدمت بجالا رہے ہیں اور زمانۂ سکول میں میرے ہم جماعت تھے ان کے بھائی ہیں۔ وہ اسیرِ راہِ مولیٰ، طاہر مہدی امتیاز احمد وڑائچ، مربی سلسلہ کے برادرِ نسبتی بھی ہیں لہٰذا ان سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود فون پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے میں انہیں ہمیشہ سے جانتا ہوں۔

وہ امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ ان کا ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ جا آباد ہونے کا تجربہ کیسا رہا تو وہ کہتے ہیں: میں اس وقت عمر کے پچاسیویں سال میں ہوں اور میری اہلیہ کی عمر بھی کم وبیش

اسّی سال ہے۔ ہم دونوں کی صحت کمزور ہو چکی ہے اور اس قابل نہیں رہے کہ تنہا زندگی گزار سکیں۔ بچے پاکستان آ نہیں سکتے لہٰذا مجبوری ہے لیکن خدا کا شکر ہے مجموعی طور پر ہمارا وقت اچھا گزر رہا ہے۔

عبدالحلیم جو تعلیم الاسلام کالج کے پہلے بیچ میں شامل ڈاکٹر عبدالکریم کے چھوٹے بھائی ہیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ میٹرک کر کے کالج میں داخل ہوئے تھے اور بی ایس سی کا امتحان پاس کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ اُن دنوں پاکستان آرڈیننس فیکٹریز، واہ کینٹ اپنے قیام کے ابتدائی مراحل میں تھیں۔ وہاں پر ''ٹرینی سپروائزرز'' کی کوئی اسامی مشتہر ہوئی تو انہوں نے درخواست دے دی اور منتخب بھی ہو گئے۔ اس وقت یہ کوئی بڑی کامیابی نظر نہ آتی تھی لیکن اللہ نے فضل کیا اور جلد ہی انہیں دو سال کے ایک تربیتی کورس پر جرمنی بھجوا دیا گیا جہاں انہوں نے اپنا کام سیکھنے کے علاوہ ذاتی ذوق وشوق سے جرمن زبان میں خوب مہارت پیدا کر لی۔ ان کی یہ مہارت اُس وقت ان کی ایک اضافی قابلیت متصوّر کی گئی جب حکومتِ پاکستان جرمنی میں اپنے سفارت خانے میں تقرّر کے لیے کسی ٹیکنیکل اٹیچی کی تلاش میں تھی۔ حکومتی ذمّہ داران کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور وہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء کے دوران چار سال تک جرمنی میں حکومتِ پاکستان کے ''ٹیکنیکل اٹیچی'' کے طور پر خدمت بجالاتے رہے۔ اس تقرری نے ان کی ترقی کے اگلے مراحل قدرے آسان بنا دیئے چنانچہ ۱۹۹۱ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ جنرل منیجر وَیپنز فیکٹری کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔

پاکستان آرڈیننس فیکٹریز میں اپنے تقرّر کے دوران وہ کم وبیش سات سال تک POF Skeet Club کے سیکرٹری رہے۔ صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق کو بھی سکیٹنگ کا شوق تھا اور وہ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وقتاً فوقتاً پی او ایف آتے رہتے تھے۔ سکیٹ کلب کے سیکرٹری کے طور پر حلیم ان کا استقبال کرتے اور سکیٹنگ کے دوران ان کے بالکل ساتھ کھڑے ہو کر نہ صرف انہیں ایمونیشن مہیا کرتے بلکہ نشانہ بہتر بنانے کے لیے انہیں ضروری مشورے بھی دیتے۔

حلیم بتاتے ہیں: مجھے اس دوران صدر کے بہت قریب کھڑا ہونا پڑتا تھا چنانچہ ایک بار کسی خفیہ ایجنسی کے ایک اہلکار نے ضیاء الحق کو متنبّہ کیا کہ حلیم ''قادیانی'' ہیں لہٰذا صدرِ پاکستان کو ان سے محتاط رہنا چاہئے جس پر ضیاء الحق نے یہ خوبصورت تبصرہ کیا کہ اگر حلیم واقعی قادیانی ہے تو مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔

وہ مزید بتاتے ہیں: صدر ضیاء الحق کے علاوہ بہت سے منسٹرز، پاکستان میں بعض غیر ممالک (بشمول امریکہ وسعودی عرب کے) سفراء اور پاکستان کی کئی اہم شخصیات بھی سکیٹنگ کے لیے کلب آتی رہتی تھیں۔

ان کی اہلیہ، پروین مشہور شاعر عبدالرشید تبسّم کی صاحبزادی ہیں۔ حلیم اور ان کی بیگم، دونوں میری اہلیہ کے عزیزوں میں سے ہیں۔ واہ کینٹ میں میرے اپنے بھی بعض عزیز موجود تھے جن میں میرے چچازاد، منور احمد جاوید اور ایک چچازاد، ثریا کے میاں، ملک مبارک احمد شامل ہیں۔ ہم جب بھی ان سے ملاقات کے لیے جاتے تو موصوف کے ہاں بھی ضرور چکر لگاتے۔ میں نے انہیں بہت بااخلاق اور محبت کرنے والا پایا۔

بیٹوں کے علاوہ اللہ نے انہیں ایک ہی بیٹی سے نوازا جس کا نام عُرفی ہے۔ وہ ملک مبارک احمد کے سب سے بڑے بیٹے، طارق کے عقد میں آئیں جو مدتِ دراز سے کینیڈا کے ہو چکے ہیں۔

حلیم ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد تک تو پاکستان میں مقیم رہے لیکن ان کے برادرانِ نسبتی جو بہت پہلے سے امریکہ میں آباد ہو چکے تھے نے انہیں سپانسر کر رکھا تھا چنانچہ ۱۹۹۴ء میں جوں ہی انہیں امیگریشن ملی وہ امریکہ چلے گئے۔

ابتداءً کچھ عرصہ کسی کالج میں جرمن زبان پڑھاتے رہے لیکن پھر مکمل ریٹائرڈ لائف گزارنے لگے۔ اب تو وہ گزشتہ بیس سال سے امریکہ میں ہیں اور پکے امریکن بن چکے ہیں۔ وہ آج کل شکاگو میں رہائش پذیر ہیں۔ فارغ وقت قرآن وحدیث کے مطالعہ میں گزارتے ہیں۔ صحت مناسب ہے اور وہ اپنے حالات پر مطمئن نظر آتے ہیں۔

عبدالحلیم کے بعد اب ذکر کیا جا رہا ہے جماعت کی ایک جانی پہچانی شخصیت، مجیب الرحمٰن ایڈووکیٹ کا جو کئی سال تک راولپنڈی کے امیر جماعت رہے اور جماعت کے خلاف بعض مقدمات کی عدالتوں میں قابلِ قدر پیروی کی شہرت رکھتے ہیں۔ موصوف اباجی کے مدّاحوں میں سے ہیں اور مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۴ء میں جب میری پوسٹنگ راولپنڈی میں ہوئی تو ان سے میرے تعارف کا بڑا حوالہ اباجی کی ذاتِ گرامی ہی تھی۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ محبت دی اور عزت بخشی جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کی بے حد قدر ہے۔

موصوف کا تعلق بنگال کے ایک ایسے خاندان سے جو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے زمانے میں احمدیت میں داخل ہوا چنانچہ ان کے والد ظِلّ الرحمٰن قادیان میں تعلیم وتربیت پانے کے بعد بنگال میں مربی مقرر ہوئے اور ان کے چچا، صوفی مطیع الرحمٰن کا بہت سا وقت امریکہ میں پیغامِ احمدیت پہنچانے میں گزرا۔

مجیب قادیان میں پلے بڑھے۔ وہ بتایا کرتے ہیں: قادیان میں آپ کے والدِ گرامی بھی اسی محلّہ میں رہائش پذیر تھے جہاں ہم رہا کرتے تھے۔ یوں بچپن ہی سے مجھے نہ صرف حضرت مولوی صاحب کو بلکہ اس محلّہ کے باقی معروف رہائشیوں یعنی ملک صلاح الدین (مؤلف اصحابِ احمد)، مولوی احمد خان نسیم، حضرت مولوی محمد ابراہیم بقاپوری، حضرت ڈاکٹر سیّد غلام غوث اور بی ٹی صاحب کو بھی دیکھنے کا موقع ملا اور حضرت مسیح موعود کے بہت سے دیگر رفقائے کبار کی صحبت بھی نصیب رہی۔

انہوں نے میٹرک تعلیم الاسلام ہائی سکول، چنیوٹ سے ۱۹۴۹ء میں پاس کیا جس کے بعد انہوں نے تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ وہ بتاتے ہیں: اس زمانے میں تعلیم الاسلام کالج ڈی اے وی کالج کی عمارت میں منتقل ہو چکا تھا۔ اگرچہ مہاجرین کے ہاتھوں کالج کی عمارت میں کافی توڑ پھوڑ کی جا چکی تھی مگر فی ذاتہٖ عمارت خوبصورت تھی اور اس میں ایک وسیع ہال بھی تھا۔ شام کے وقت بیڈمنٹن کا کھیل اس ہال میں ہوتا تھا اور طلبہ شوق سے اس میں حصہ لیتے۔ کالج یونین کی تقریبات بھی اسی ہال میں ہوتی تھیں اور میں نے اسی ہال میں پہلی مرتبہ کانووکیشن کا خوبصورت نظارہ بھی دیکھا۔ اس کانووکیشن میں صدارتی خطبہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے

ارشاد فرمایا تھا۔

وہ مزید کہتے ہیں: داخلے کے فوراً بعد ایک بار صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے کالج ہال میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کالج میں فُولز کو داخلہ نہیں دیا جاتا اور یوں بالواسطہ طور پر فرسٹ ایئر فُول بنانے کی قبیح رسم کی بڑے خوبصورت انداز میں نفی فرمائی۔ مجھے آپ کے یہ الفاظ آج بھی یاد ہیں کہ میں نے آکسفورڈ جیسی یونیورسٹی میں بھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا، یہاں نہ جانے یہ رسم کہاں سے آ گئی ہے۔

اپنے اساتذہ کرام کا ذکر کرتے ہوئے مجیب بتاتے ہیں: اخوند عبدالقادر انگریزی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے۔ دراز قامت اور چھریرے بدن کے۔ ان پر شیروانی اور انگریزی سوٹ دونوں خوب سجتے تھے۔ بہت روانی سے انگریزی بولتے تھے۔ دورانِ لیکچر وہ دونوں انگوٹھے واسکٹ کی جیبوں یا شیروانی کی اوپر کی جیبوں میں ڈال لیتے تھے۔ بڑی باوقار شخصیت تھی۔ سائنس ڈپارٹمنٹ میں حبیب اللہ خان اور پروفیسر سلطان محمود شاہد (جو بعد میں ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کے طور پر معروف ہوئے) ہوا کرتے تھے۔ آرٹس کی طرف آئیں تو صوفی بشارت الرحمٰن عربی کے پروفیسر تھے، فیض الرحمٰن فیضی اکنامکس پڑھاتے تھے، خان ارجمند خان اسلامیات کے استاد تھے اور حساب کا مضمون مقبول احمد نامی ایک استاد پڑھاتے تھے۔ گو میں نے حساب کا مضمون لے رکھا تھا مگر میں اس میں ہمیشہ کمزور ہی رہا۔ خصوصاً ٹِرگنومیٹری میرے پلّے بالکل نہیں پڑتی تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے پسندیدہ استاد تھے۔

مجیب کو یہ بھی یاد ہے کہ شام کو کھیل میں شامل ہونا ہر طالب علم کے لیے ضروری تھا اور کالج ہال کے علاوہ کرشن نگر کی ایک گراؤنڈ میں بھی کھیلیں ہوا کرتی تھیں تاہم انہیں کھیل کود سے زیادہ دلچسپی نہ تھی اور اُن کا یہی وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔

انہیں ڈِبیٹنگ سے دلچسپی تھی۔ پشاور کے میاں حسامُ الدین اس وقت تھرڈ ایئر کے طالب علم اور سٹوڈنٹ یونین کے صدر تھے۔ مجیب بتاتے ہیں: پہلی مرتبہ مجھے گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایک ڈِبیٹ سننے کا موقع ملا۔ مجھے نوک جھونک کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ مجھے یاد ہے اس وقت تک تعلیم الاسلام کالج میں ڈِبیٹنگ سوسائٹی نہیں تھی۔ جہاں تک میرا علم ہے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ایک موقع پر اس بات کو ناپسند فرمایا تھا کہ کسی مضمون کی ضرور مخالفت کی جائے کیونکہ اس سے کج بحثی کی عادت پڑتی ہے اور انسان غلط بات پر بھی ڈٹ جانے کا عادی ہو جاتا ہے چنانچہ تعلیم الاسلام کالج میں ڈِبیٹس کی بجائے تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے جس سے طلبہ میں مضمون آفرینی اور فصاحت وبلاغت پیدا ہوتی اور فنِ تقریر میں مہارت بھی حاصل ہوتی۔ اس بات کی طرف اشارہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی اس تقریر میں بھی موجود ہے جو آپ نے قادیان میں کالج کے افتتاح کے موقع پر فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا: "یہ طریق ہمارے ہاں پسندیدہ نہیں اس لیے ان شاءاللہ العزیز ہم کالج کی بزمِ حسنِ بیان میں ڈِبیٹس کے طریق کو ترک کر کے تقریر کے طریق کو رائج کریں گے اور امید ہے کہ ہمارے طلبہ تقریر کے میدان میں محض اس طریق کی وجہ سے دوسروں سے پیچھے نہ رہیں گے۔"

معلوم ہوتا ہے بعد میں کسی وقت وضاحت ہوگئی کہ جس بات کو حضور نے ناپسند فرمایا تھا وہ یہ تھی کہ کسی مذہبی مسئلہ یا مسلّمہ صداقت کی مخالفت میں تقاریر نہ کی جائیں ورنہ ایسے امور جن میں اطراف اپنے اپنے طور پر درست ہو سکتے ہوں پر مباحثہ میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں سٹوڈنٹس یونین کا قیام عمل میں آیا اور انٹر کالیجیٹ ڈِبیٹس کا رواج شروع ہوا لیکن ان کے لیے قراردادیں نہایت احتیاط سے منتخب کی جاتی تھیں۔

ڈِبیٹنگ میں مجیب کے ذوق وشوق کے پیش نظر انہیں مختلف کالجوں میں بھجوایا جانے لگا چنانچہ انہیں اسلامیہ کالج سمیت لاہور کے بعض کالجز کی ڈِبیٹس میں اپنے کالج کی نمائندگی کا موقع ملا۔ وہ بتاتے ہیں: اسلامیہ کالج والی ٹیم میں میرے علاوہ رشید قیصرانی تھے۔ قرارداد زیر بحث تھی: ''اب وقت آ گیا ہے کہ روایتی پردہ ترک کر دیا جائے۔'' مجھے اس قرارداد کے حق میں بولنا تھا لیکن میں عجیب مخمصے میں تھا۔ میرا ضمیر اجازت نہیں دے رہا تھا کہ میں احمدی ہونے کے ناطے پردے کی مخالفت میں کچھ کہوں۔ میں سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ قرارداد میں ''روایتی پردہ'' ترک کرنے کی بات کی گئی ہے نہ کہ پردہ ترک کرنے کی۔ میں نے روایتی پردے کی مختلف شکلوں پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پردے کی ایک شکل تو وہ ہے جو اَب بھی بعض خاندانوں میں مروّج ہے یعنی عورت کو پردے میں قید کر دیا جائے اور اگر وہ تانگے میں بیٹھے تو چادریں تان کر تانگے کو بھی ایک خیمے کی شکل دے دی جائے۔ روایتی پردے کی دوسری شکل یہ ہے کہ خاتون برقع تو پہنے مگر ننگے منہ بازاروں اور گلیوں میں گھومتی پھرے۔ ہاں! جب اس کا کوئی جاننے والا یا عزیز رشتہ دار سامنے آ جائے تو وہ منہ پر نقاب ڈال لے۔ میں اپنی تقریر میں یہی نقطہ سامنے لایا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ روایتی پردے کی یہ دونوں شکلیں اسلامی روح کے خلاف ہیں اور اس قابل ہیں کہ انہیں ترک کر دیا جائے۔ رشید قیصرانی کی تقریر خوب تھی لیکن میرا خیال ہے کہ میرے طرزِ استدلال کو بھی ججز نے پسند کیا چنانچہ جب نتیجے کا اعلان ہوا تو ٹرافی ہمارے کالج کے حصہ میں آئی۔

رشید قیصرانی کا ذکر آ جائے تو مجیب جذباتی ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: رشید طالب علمی کے زمانے میں بھی بلند پایہ شاعری کرتے تھے۔ جانا پہچانا نام تھا۔ اشتراکیت کے خلاف ان کی بعض نظمیں ان دنوں بہت ہی مشہور تھیں۔ ان کی زبان اور آہنگ ترقی پسند شعرا کا اور سوچ اسلامی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو اس عمر میں زبان و بیان پر ان کی قدرت ایک اعجوبہ معلوم ہوتی ہے۔

مجیب اپنے باقی دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہمارے ساتھیوں میں فیض اسلم فیض بھی پختہ کلام شاعر تھے۔ رشید قیصرانی تو تعلیم مکمل کر کے ایئرفورس میں گئے تھے، فیض اسلم عدلیہ میں چلے گئے۔ میرے باقی ساتھیوں میں سے چوہدری حمید اللہ، مبارک مصلح الدّین، سمیع اللہ سیال، ڈاکٹر شفیق سہگل اور بشیر احمد رفیق شامل ہیں۔ یہ سارے دوست واقفِ زندگی تھے اور انہوں نے اپنے اس عہد کو خوب نبھایا۔

بعد میں مجیب نے سندھ مسلم لا کالج کراچی میں داخلہ لیا تو انہیں اپنا ڈِبیٹنگ کا شوق پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ بتاتے ہیں: اس زمانے میں معراج محمد خان، فتحیاب علی خان اور شائستہ بیزار کراچی کے مشہور ڈِبیٹرز

تھے۔ معراج محمد خان بعد میں بھٹو کے دور میں وزیر ہوئے۔ سوشلسٹ خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ وہ ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے مباحثات میں حصہ لے چکے ہیں۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ وہاں نہ جانے سامعین تالیاں کیوں نہیں بجاتے تاہم ان کا کہنا تھا: یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ربوہ کے سامعین ذہین، پوری طرح متوجہ اور بیدار مغز ہیں اور وہ تالی نہ بھی بجائیں تو ان کی طرف سے پسندیدگی ظاہر ہو جاتی ہے۔

ہُوٹنگ اس کالج کی روایت نہیں تھی مگر جس تقریر کو سامعین پسند نہیں کرتے تھے اس کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔

مجیب بتاتے ہیں: کالج کے ساتھ ہی ہوسٹل تھا۔ چوہدری محمد علی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ صوفی بشارت الرحمٰن ہوسٹل کی بالائی منزل پر رہائش رکھتے تھے اور ہوسٹل کے نگران تھے۔ ہوسٹل کی اپنی روایات تھیں۔ نمازوں میں شمولیت پر اصرار ہوتا تھا۔ ہوسٹل میں غیر احمدی طلبہ بھی تھے۔ ان کے لیے پابندی تھی کہ وہ اپنے طور پر وقت پر ترجیحاً باجماعت نماز ادا کریں۔ ہوسٹل کا میس منتخَب میس کمیٹی چلاتی تھی اور فی حاضری کھانے کی قیمت نہایت مناسب تھی۔ کھانے کا معیار اچھا تھا اور مقدار بھی ایسی ہوتی کہ ہر کوئی سیر ہو کر اٹھتا۔ ہاں! بعض خوش خوراک طلبہ دو حاضریاں بھی منگوا لیتے تھے۔ بل کچھ زیادہ نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل کے بعض طلبہ بھی بسا اوقات ہمارے ہوسٹل میں کسی کے مہمان ہو جاتے۔ ہفتہ میں ایک روز فیشن ڈے کہلاتا تھا۔ اس دن کھانا بھی خاص پکتا اور سویٹ ڈِش بھی ہوا کرتی تھی۔ صبح کا ناشتہ طلبہ ٹک شاپ سے کیا کرتے تھے۔ بند، مکھن اور ایک پاؤ دہی کی گاڑھی لسّی طلبہ کا مرغوب ناشتہ ہوتا تھا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مجیب الرحمٰن نے اپنی گفتگو کے دوران اپنے ایک دوست، فیض اسلم کی شاعری کا حوالہ دیا تھا۔ اگرچہ وہ شاعری میں تو کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہ کر پائے تاہم عدلیہ کے ایک قابل اور دیانتدار افسر کے طور پر خوب شہرت پائی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ اور مہلت دی ہوتی تو عین ممکن ہے وہ اپنے شعبے میں مزید ترقی کرتے لیکن

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہو

فیض اسلم قیامِ پاکستان کے وقت سکول کی ہائی کلاسز میں پڑھ رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کا خاندان ضلع ملتان میں جا پہنچا جہاں انہوں نے تلمبہ کے کسی سکول میں داخلہ لے لیا۔ اس سکول کے ایک احمدی استاد، مرزا محمود احمد نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (بائیس اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں ان کے سکول میں داخلے اور میٹرک کے امتحان میں کامیابی کی رُوداد اِن الفاظ میں بیان کی ہے:

''۱۹۴۷ء میں خاکسار بطور اوٹی مدرّس ہائی سکول تلمبہ ضلع ملتان میں تعینات تھا۔ ملک نیا نیا تقسیم ہوا تھا، قافلوں پر قافلے آ رہے تھے اور اس سلسلے میں بعض دردناک واقعات بھی مشاہدے میں آتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی ایک دمکتی صبح کو خاکسار کو ڈاک خانہ تلمبہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔...... اپنا کام ختم کر کے خاکسار ڈاک خانہ

سے باہر نکلا تو برآمدہ میں ایک صاحب سادہ سے لباس میں سر اور پاؤں سے ننگے کھڑے تھے جنہوں نے مجھے السلام علیکم کیا اور کہا کہ وہ مہاجر ہیں، ان کا ایک بچہ زیر تعلیم ہے، وہ اسے میاں چنوں ہائی سکول میں داخل کرائیں یا تلمبہ سکول میں؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر وہ اسے...... تلمبہ میں داخل کرائیں تو میں ہر ممکن تعاون کے لیے حاضر ہوں۔ یہ صاحب برادرم چوہدری مبارک علی، فیض صاحب کے والدِ محترم تھے۔ چند یوم کے بعد یہی صاحب مجھے سکول میں ملے اور الگ لے جا کر بتایا کہ وہ احمدی ہیں اور یہ کہ ان کو میرا علم ڈاک خانہ میں میرے نام آنے والے الفضل سے ہوا ہے۔ یہ پورا علاقہ احمدیت سے محروم تھا اور یہ اطلاع میرے لیے ایک مژدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ بڑے تپاک سے بغلگیر ہوئے۔ لمبی گفتگو ہوئی اور آخر میں عزیز فیض کے داخلہ کی بات ہوئی۔ اس سے اگلے دن میں سکول کے ایک کام سے ملتان چلا گیا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے عزیز فیض کے سکول میں داخلہ سے انکار کر دیا ہے۔ خاکسار اسی دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر ملا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کسی آدمی کے زیر اثر انکار کیا تھا۔ بہر حال اگلے دن عزیز فیض سکول میں داخل ہو گئے۔ عزیز فیض صاحب کا اس سکول میں کم و بیش ڈیڑھ سال قیام ہر لحاظ سے مثالی تھا۔ وہ طلبہ اور اساتذہ میں یکساں ہر دلعزیز تھے۔ نہایت ہونہار، محنتی، ذہین، شریف اور مخلص احمدی طالب علم تھے۔ مارچ ۱۹۴۹ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنی کلاس میں اوّل آئے۔''

بعدہٗ وہ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخل ہوئے اور گریجوایشن یہیں سے کی۔ وہ کالج کے لائق طلبہ میں سے تھے۔ انہوں نے بی اے پاس کرنے کے بعد فلاسفی میں ایم اے اور بعدہٗ ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ وہ کچھ عرصہ خانیوال میں بطور وکیل پریکٹس کرتے رہے، پھر کچھ وقت بطور لیکچرر گزارا اور بالآخر پی سی ایس (جیوڈیشل) کا امتحان پاس کرنے کے بعد بطور سب جج تعینات ہوئے۔ اسلام بھٹی اپنی کتاب ''عدالتِ عالیہ تک کا سفر'' میں ان ہی فیض اسلم کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''سروس میں ہم بیچ میٹ تھے۔ میری پہلی تعیناتی بطور سب جج چارسدہ ہوئی اور ان کی صوابی۔ میری صوابی پوسٹنگ سے قبل ہی ان کی ٹرانسفر مردان ہو چکی تھی۔ مردان چونکہ ضلعی ہیڈ کوارٹر تھا جب بھی مردان جانے کا اتفاق ہوا تو ان سے ملاقات ہوتی۔ بہت چاہت سے کھانے پر بلاتے۔ خوب باغ و بہار شخصیت تھے۔ شاعر مزاج ہی نہیں خوب شعر بھی کہتے اور ہفت روزہ ''لاہور'' میں ان کی نظمیں اور غزلیں رسالہ کی زینت بنتیں۔ میں مردان گیا تو وہ میرے جانے سے پہلے ہی ایبٹ آباد جا چکے تھے۔ ایبٹ آباد شہر کی خوبصورتی اور پہاڑوں کے حسن کی باتیں سنا سنا کر مجھے بھی ایبٹ آباد آنے کی دعوت دی چنانچہ میں اور میری اہلیہ سردیوں میں ان کے پاس گئے اور ان کے پیار اور خلوص کی گرمی سے خوب مالا مال ہوئے۔ میں ہری پور تعینات ہوا تو وہ پشاور چلے گئے۔ پشاور میں بھی ان سے خوب ملاقات رہی۔ پشتو کا امتحان چونکہ لازمی طور پر پاس کرنا ہوتا تھا ہم دونوں تیاری کر رہے تھے تو مشکل مشکل فقرے بول کر مجھے اپنی کم علمی کا خوب احساس دلاتے۔ ایک بار کہنے لگے: مڑ کڑم یعنی تم نے مجھے مار دیا۔ میرے فرشتوں نے بھی کبھی اتنا مشکل فقرہ نہیں سنا تھا۔ دو تین دن نیند غائب رہی مگر خدا کا شکر ہے ان

کے ساتھ ہی پشتو کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہری پور سے میری ٹرانسفر کیمبل پور ہو گئی۔ کیمبل پور میں ان کے سسرال تھے۔ دراصل سِول ججی سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں لیکچرار تھے۔ ڈاکٹر دارالفضل کی دختر سے ان کی شادی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا نام تو ڈاکٹر مرزا عبدالرؤف تھا مگر سبھی لوگ انہیں ڈاکٹر دارالفضل کے نام سے پکارتے تھے۔ ''دارالفضل'' دراصل ان کے کلینک کا نام تھا۔ ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے غضب کی شفا رکھی تھی۔ وہ احمدی غیر احمدی کی بلاتمیز خدمت کرتے تھے۔ مجھے اکثر غیر از جماعت احباب نے بتایا کہ وہ کبھی کسی مریض سے فیس وغیرہ نہیں لیتے تھے بلکہ امیر سے بھی شاذ ہی۔ سردیوں میں گرم کوٹ پہنتے اور گرمیوں میں اووَر آل۔ جس کو جتنی توفیق ہوتی وہ ان کی جیب میں ڈال دیتے۔ اسی طرح کسی غریب کا علاج کرتے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنی رقم ہاتھ میں آ جائے مریض کو یہ کہہ کر دے دیتے کہ بیماری میں اچھی خوراک بھی ضروری ہے۔ پھل وغیرہ کھا لینا۔

میں ایڈیشنل سیشن جج لاہور ہوا تو کچھ عرصہ کے بعد فیض صاحب کی تعیناتی بھی لاہور ہو گئی۔''

یہی وہ زمانہ تھا جب میری فیض اسلم سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ نئے نئے لاہور آئے تھے اور کرشن نگر کے نواح میں کسی گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ وہ میرے خسر، چوہدری بشیر احمد، چیف انجینئر، لاہور میونسپل کارپوریشن کے غالباً اس زمانے کے بے تکلف دوست تھے جب دونوں کی تقرری فیصل آباد میں تھی۔ ان کی فیملیز کا بھی آپس میں گہرا میل جول تھا اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ دونوں اپنے انتہائی ذاتی معاملات بھی ایک دوسرے سے ڈسکس کر لیا کرتے تھے۔ میرے خسر نے ہی ان سے میری پہلی ملاقات کرائی جس کے بعد میں دو چار بار اپنے طور پر بھی فیض اسلم سے ملا مگر میں ان سے کسی بے تکلفی کا دعویدار نہیں ہوں اگرچہ ان کے ساتھ احترام کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔

یہ دس اپریل ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ میں پشاور میں تعینات تھا اور کمر میں شدید درد کی وجہ سے صاحبِ فراش۔ معلوم ہوا کہ فیض اسلم سڑک کے ایک حادثے کا شکار ہو کر راہی ملکِ عدم ہو گئے ہیں۔ مجھے ان کی وفات کی اطلاع تو بروقت ہو گئی مگر میں اپنی بیماری کے سبب ان کی تدفین میں شامل نہ ہو سکا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔

بعد میں اس حادثے کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو افسوس دوچند ہو گیا۔ ان دنوں فیض اسلم کی تقرری راولپنڈی میں سپیشل جج (سنٹرل) کے طور پر تھی۔ ان کے ایک دوست سیالکوٹ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ہمراہ اپنی گاڑی میں جسے ان کا بیٹا توصیف چلا رہا تھا اسلام آباد گئے۔ مارگلہ روڈ پر مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک کار جسے ایک خاتون چلا رہی تھی ان کی گاڑی میں آ لگی۔ ٹکر اس قدر شدید تھی کہ فیض اسلم موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کا کوئی فریکچر ہوا نہ انہیں کوئی زخم آیا۔ نہ جانے کس جگہ کیسی ضرب لگی کہ کام تمام ہو گیا۔

مرحوم کی نمازِ جنازہ راولپنڈی میں بھی ادا کی گئی تاہم ان کی تدفین ربوہ کے قطعہ شہداء میں ہوئی۔

بتایا جاتا ہے کہ مرحوم اپنوں اور غیروں میں یکساں مقبول تھے چنانچہ ان کی وفات پر لاہور سے چھپنے والے ایک ہفت روزہ، کہکشاں نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا:

''ان کے ایک قریبی دوست، جناب اوصاف علی، سولسٹر حکومت پنجاب کے مطابق مرحوم ایک صاحبِ نظر اور اہلِ درد انسان تھے اس لیے قومی فلاح کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ فیض صاحب نے اپنے پیشہ کو ہمیشہ فلاح کا ذریعہ سمجھا۔ مظلوموں کی دادرسی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ مرحوم اعلیٰ اوصاف کے مالک تھے، فیصلوں میں ہمیشہ تدبّر سے کام لیتے، مہمان نوازی اور صاف گوئی میں بہت آگے تھے۔ بڑے مدبّرانہ ذہن کے مالک تھے اسی لیے ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے۔''

جماعت سے وابستگی ان کی زندگی کا سب سے بڑا اصول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات پر جماعت احمدیہ، راولپنڈی نے اپنے ایک غیر معمولی اجلاسِ عام منعقدہ پندرہ اپریل ۱۹۸۳ء میں ایک قراردادِ تعزیت پاس کی جو الفضل پچیس اپریل ۱۹۸۳ء میں چھپ چکی ہے۔ اس قرارداد میں مرحوم کو ''نہایت شریف النفس، با اخلاق، نافع الناس، متواضع، شفیق اور صالح وجود'' قرار دیا گیا تھا۔

مرحوم کی اہلیہ، تسنیم اختر، دونوں بیٹے (نعمان اور توصیف) اور تینوں بیٹیاں (ثریا، مہ جبین اور سعدیہ) اب بیرونی ممالک میں آباد ہو چکی ہیں لیکن ان کا کسی نہ کسی ضرورت کے تحت پاکستان آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تسنیم سے بات ہو تو وہ فیض اسلم کی خوبیاں بیان کرتے کرتے اشکبار ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں: ''فیض صاحب بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ بہت ہی خوش مزاج، مہمان نواز، انصاف پسند، عزیز رشتہ داروں سے محبت بھرا سلوک کرنے والے اور سادہ مزاج تھے۔ جماعت کے ساتھ بے انتہا لگاؤ تھا۔ جہاں بھی ٹرانسفر ہوتی سب سے پہلے بیت الذکر جا کر متعارف ہوتے تھے۔ تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے چندے کی ادائیگی کرتے۔

خلیفہ وقت کے ساتھ دلی عقیدت تھی۔ خلیفہ ثالث تو ان کے استاد بھی رہے تھے۔ خلیفہ رابع کے ساتھ بھی بے حد محبت رکھتے تھے اور ان کے خطبۂ جمعہ کی کیسٹیں اپنے غیر از جماعت رفقائے کار کو ضرور سناتے۔

احسان کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ جب ہم بہاولپور تھے تو وہ دورہ پر بہاولنگر جایا کرتے تھے۔ بہاولنگر میں ان کے ایک چپراسی کا بیٹا تھا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا تو اسے اندر بلا کر میز پر کھانا کھلاتے۔ ایک دفعہ میں نے کہہ دیا کہ اسے اندر بلانے کی کیا ضرورت ہے باہر ہی کھانا بھجوا دیتے ہیں تو کہنے لگے: جب میں دورہ پر جاتا ہوں تو چاہے میں آدھی رات کو وہاں پہنچوں اس کا باپ میرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ ہے تو وہ میرا چپراسی مگر یہ اس کا احسان ہے اس لیے مجھے بھی اس کے بیٹے کی عزت کرنی چاہیے۔

گھر کا ماحول بے حد خوشگوار رکھتے۔ بچوں سے بہت محبت، پیار اور دوستانہ سلوک تھا۔ سب دوست احباب اور رشتے داروں سے اچھے مراسم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک سب ان کو یاد کرتے ہیں۔''

ان کی وفات پر ان کے بعض دوستوں نے نثر و نظم میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ راولپنڈی کے عطا حسین کلیم کہتے ہیں:

نغمات لب پہ، عدل کی میزان ہاتھ میں
شاعر بھی تھا وہ منصفِ حق آشنا بھی تھا

ایثار، صدق و فیض رسانی کے ساتھ ساتھ
وہ باوفا تھا نازشِ اہلِ وفا بھی تھا

سوزِ نفس سے اُس کے تھے روشن کئی چراغ
فیضِ سخن سے اس کے تھیں آباد محفلیں
کاٹے گا کون شوق سے اب بیستونِ درد
اب کون سر کرے گا محبت کی منزلیں

تھا جادۂ حیات پہ یہ روح کا سفر
یا بوئے گُل تھی جس کو صبا ساتھ لے گئی
روشن تھا اُن کے دم سے شبستانِ زندگی
کیا لوگ تھے کہ جن کو قضا ساتھ لے گئی

کل تک تھا چشم و دل میں وہ ممدوحِ دوستاں
جھپکی پلک تو ہو گیا اوجھل نگاہ سے
موت اس کی ساتھ لے گئی خوشیاں حیات کی
دل خون ہو کے بہہ گیا اشکوں کی راہ سے

سرمایۂ حیات ہیں وہ زندگی کے دن
گزرے جو فیضِ اسلمِ شیریں نوا کے ساتھ
اپنی یہی دعا ہے، یہی آرزو کلیم
حق اُس سے خوش، وہ خوش رہے اپنے خدا کے ساتھ

فیض اسلم کے بعد آپ کی ملاقات کرائی جا رہی ہے ان ہی کے ایک کلاس فیلو سے جو ماشاء اللہ واقفِ زندگی ہیں۔ انہوں نے کیمسٹری میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، کارخانے لگائے، وافر پیسہ کمایا اور اللہ کی راہ میں بھی خوب خرچ کیا اور جب مرکز نے انہیں آواز دی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے۔ میرا خیال ہے آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ڈاکٹر محمد شفیق سہگل، نائب وکیل التصنیف، تحریک جدید انجمن احمدیہ کی بات کر رہا ہوں جن سے میری یاد اللہ اس زمانے سے ہے جب میری تعیناتی بطور کمشنر انکم ٹیکس ملتان میں تھی۔ وہ ان دنوں امیر جماعت ملتان تھے تاہم میں ابھی ان سے متعارف بھی نہ ہو پایا تھا

کہ کسی بدخواہ نے رات کے وقت میرے گھر پر فائرنگ کر دی۔ اس امر سے قطع نظر کہ یہ فائرنگ کس نے کرائی تھی اور اس کا مقصد کیا تھا میرے لیے یہ واقعہ وجہِ پریشانی بنا ہوا تھا۔ اگرچہ ضلعی انتظامیہ نے اس موقع پر میری ہر ممکن مدد کی اور مجھے مناسب سیکیورٹی بھی مہیا کر دی مگر دل ہر وقت ایک انجانے سے خوف میں مبتلا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تھی اور وہ میرے پاس اس واقعے پر اظہارِ افسوس و ہمدردی کے لیے تشریف لائے تھے۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جس دوران میں ان کی نفاستِ طبع اور منکسرُ المزاجی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، میرے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات میں سرِمُو فرق نہیں آیا۔ میں جتنی دیر ملتان میں رہا ان سے بکثرت ملتا رہا۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے بارہا مجھے بچوں سمیت اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ میں ملتان سے آ گیا تو یہ رابطہ قدرے کمزور پڑ گیا لیکن جب بھی آمنا سامنا ہوتا تو محسوس ہوتا گویا ہم ایک دن کے لیے بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوئے۔ چند سال پہلے جب ان کی تعیناتی وکیل التصنیف کے دفتر میں ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ وہ ملتان میں اپنا کاروبار بند کر کے ربوہ منتقل ہو گئے ہیں۔ اتفاق سے اس دفتر کی سربراہی چوہدری محمد علی کے پاس تھی جن سے راقم الحروف کو دلی عقیدت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب بھی ربوہ جاتا وکالتِ تصنیف میں ضرور حاضری دیتا اور ایک پنتھ دو کاج کے مصداق چوہدری صاحب کی زیارت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شفیق کے ساتھ ملاقات سے فیضیاب ہو کر واپس لوٹتا۔

ڈاکٹر شفیق چنیوٹ کی شیخ برادری کے ایک ممتاز رکن ہیں۔ ان کے خاندان میں احمدیت ان کے والد، میاں محمد عمر سہگل کے ذریعے لگ بھگ ۱۹۳۵ء میں آئی۔ ان کے والدِ بزرگوار کو رشتے داروں کی بھرپور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ خدا کے فضل سے وہ اور ان کی اہلیہ، دونوں بہشتی مقبرے میں مدفون ہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر شفیق کا تعلق ہے ان کی ابتدائی تعلیم چنیوٹ کی ہے۔ وہ کسی اور سکول میں پڑھ رہے تھے لیکن جب تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں کھل گیا تو موصوف بھی یہاں منتقل ہو گئے۔ احمدیت کی برکت تھی کہ جلد ہی ان کے اندر اپنائیت کا احساس اُبھرا اور یوں محسوس ہونے لگا گویا نئے چہروں سے بھی پرانی شناسائی ہو۔ سکول میں ان کے دوستوں میں مبارک مصلح الدین شامل تھے۔ جب انہیں علم ہوا کہ موصوف سائنس نہیں پڑھ رہے تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے: کیوں، تم نے کالج نہیں جانا؟ ڈاکٹر شفیق کا جواب اثبات میں پا کر وہ کہنے لگے: پھر سائنس کیوں نہیں پڑھ رہے؟ اس فقرے نے ڈاکٹر شفیق کے لیے مہمیز کا کام کیا اور وہ سکول میں سائنس کے استاد، حضرت صوفی غلام محمد کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے مضامین تبدیل کر کے سائنس پڑھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابتداءً کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا لیکن بالآخر اس شرط پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ چونکہ شفیق نے نویں جماعت میں سائنس نہیں پڑھی اس لیے جو پڑھائی ہو چکی ہے وہ اس کا ہفتہ واری ٹیسٹ دیا کریں گے اور انہیں تازہ سبق کے ہفتہ واری ٹیسٹ میں بھی شامل ہونا ہوگا۔ شفیق نے یہ شرط

بشاشتِ قلب کے ساتھ قبول کر لی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ اگلے ہی ہفتہ اپنے پہلے ٹیسٹ میں کلاس میں اول رہے۔ حضرت صوفی غلام محمد نے دو تین ہفتے اس نئے طالب علم کی پراگریس واچ کی اور پھر خود ہی ہفتہ وار ٹیسٹوں کی شرط ختم کر دی۔ وقت گزرتا گیا اور جب میٹرک کا نتیجہ آیا تو ان کے استاد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شفیق نے اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر شفیق بتاتے ہیں: واقفِ زندگی ہونے کی بنا پر میں ۱۹۴۹ء میں بعض دیگر واقفِ زندگی دوستوں کے ہمراہ ربوہ حاضر ہوا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ملاقات کا شرف عطا فرمایا۔ مجھے اس ملاقات میں ہونے والی کوئی اور بات یاد نہیں ماسوا اس کے کہ حضور نے ہمارا ایک تحریری امتحان لیا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر شفیق نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ موصوف بتاتے ہیں کہ سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے انہیں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے براہِ راست پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا اور نہ ہی کالج میں قیام کے دوران آپ سے زیادہ رابطہ رہا تاہم ان کے اپنے الفاظ میں: میرا مشاہدہ تھا کہ طلبہ آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے آپ کو ایک رعب عطا فرمایا ہوا ہے۔ اس خداداد رعب اور مقام کے باوجود آپ طلبہ کی کھیلوں اور تفریحات میں ہمیشہ بطیبِ خاطر شامل ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ ہوسٹل میں سال کے سال میس نائٹ منائی جاتی تھی اور میس چیمپئن کا مقابلہ ہوتا تھا۔ آپ بھی ازراہِ شفقت تشریف لاتے اور اس دلچسپ مقابلہ سے محظوظ ہوتے۔

ڈاکٹر شفیق پروفیسر سلطان محمود شاہد اور پروفیسر حبیب اللہ خان کے شاگرد رہے ہیں۔ انہیں یہ بات یاد ہے کہ یہ دونوں اساتذہ طلبہ کے ساتھ بہت شفقت اور محبت کا سلوک کرتے۔ صوفی بشارت الرحمٰن فضل عمر ہوسٹل میں رہائش پذیر طلبہ کی نگرانی پر بھی مامور تھے۔ شروع کے ہی ایام میں ان کی طرف سے یہ حکم نامہ موصول ہوا کہ طلبہ رات دس بجے تک ضرور پڑھائی کیا کریں۔ ڈاکٹر شفیق اس قسم کی پابندی کے عادی نہ تھے۔ انہوں نے چند روز تو اس حکم پر عمل کیا لیکن پھر غفلت نے آ لیا چنانچہ ایک روز جب صوفی بشارت الرحمٰن چیکنگ کی غرض سے آئے تو انہیں سویا ہوا پایا۔ صبح جواب طلب ہوئی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ میں پڑھائی میں کوئی سستی نہیں کرتا البتہ رات کو دس بجے تک جاگنا میرے لیے ممکن نہیں اور جوشِ بیان میں یہ تک کہہ دیا کہ اگر مجھے اس پابندی کی پاسداری پر مجبور کیا گیا تو میں یہ کالج ہی چھوڑ دوں گا۔ صوفی صاحب نے یہ بات سنی تو قدرے حیران ہوئے لیکن پھر کمال شفقت سے فرمایا: نہیں نہیں۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔ ہم تم سے یہ پابندی اٹھا لیتے ہیں۔

موصوف چنیوٹ جیسے قصبہ سے نئے نئے لاہور گئے تھے اور یہاں کے میلوں ٹھیلوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب میلہ چراغاں کی آمد آمد تھی تو انہوں نے صوفی صاحب سے گزارش کی کہ وہ یہ میلہ دیکھنے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: لکھ کر اجازت لے لو چنانچہ انہوں نے اسی وقت ایک درخواست لکھ کر دے دی جو منظور ہو گئی۔

اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات صوبائی سطح پر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شفیق نے ۱۹۵۱ء میں یہ امتحان

پاس کیا، یونیورسٹی میں دسویں پوزیشن حاصل کی اور وظیفہ کے حقدار ٹھہرے۔

ڈاکٹر شفیق کہتے ہیں: میں ایف ایس سی کر چکا تو والدِ بزرگوار نے میری مزید تعلیم کے سلسلے میں بذریعہ خط حضور سے رہنمائی کی درخواست کی جس پر حضور کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اپنے خط کے ذریعے اطلاع دی کہ حضور نے دعا کی ہے، اس نمایاں کامیابی پر مبارکباد بھجوائی ہے اور فرمایا ہے: میرے نزدیک تو عزیز کو نان میڈیکل بی ایس سی کروانی چاہئے۔ عزیز بہت ذہین ہے اور اگر وہ محنت کرے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھے نمبروں پر پاس ہوسکتا ہے۔''

موصوف بتاتے ہیں کہ یہ خط پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ میں کیوں نہ کیمسٹری میں آنرز کرلوں چنانچہ میں نے حضور کی خدمت میں رہنمائی کے لیے درخواست کی جس پر پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے حضور کا یہ ارشاد موصول ہوا: ''آنرز بہرحال بہتر ہے، اگر آپ کرسکیں۔'' حضور کے ارشاد پر میں نے ۱۹۵۴ء میں بی ایس سی (آنرز اِن کیمسٹری) کا امتحان دیا۔ ہماری کلاسز یونیورسٹی کے انسٹیٹیوٹ آف کیمسٹری میں ہوتی تھیں۔ نتیجہ آیا تو میں یونیورسٹی میں دوم رہا تھا۔

ڈاکٹر شفیق کو یہ بات ابھی تک یاد ہے کہ ۱۹۵۳ء میں جب لاہور میں جماعت کے خلاف فسادات کے دوران ایک رات فضل عمر ہوسٹل پر حملے کا اندیشہ تھا ہوسٹل کے طلبہ نے وہ رات جاگ کر دعائیں کرتے ہوئے گزاری۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ دشمنوں کو اس کی توفیق ہی نہ ملی۔

جب تعلیم الاسلام کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہوگیا تو ڈاکٹر شفیق نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ان کے آرگینک کیمسٹری کے استاد ڈاکٹر کریم اللہ تھے جنہوں نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے کیمسٹری میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررکھی تھی۔ وہی ان کے انٹرنل ایگزامینر بھی تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر شفیق پروفیسر ڈی ایچ آر بارٹن جو نوبل لارئیٹ تھے کے ساتھ پی ایچ ڈی کے لیے کام کریں چنانچہ پروفیسر بارٹن جو اس وقت Birkbeck College لندن میں تھے کو درخواست بھجوائی گئی جو انہوں نے منظور کرلی۔ ڈاکٹر شفیق اپنا سال ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ڈاکٹر کریم اللہ کے مشورے کے تحت وہ اپنا تھیسس ان کے حوالے کر کے انگلستان چلے گئے۔ اسی اثنا میں پروفیسر بارٹن کی طرف سے اطلاع آئی کہ وہ پرانی جگہ سے گلاسگو یونیورسٹی میں جا رہے ہیں لہٰذا اگر ڈاکٹر شفیق ان کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہوں تو گلاسگو آ جائیں۔ یوں موصوف نے انگلستان پہنچ کر تعلیمی سال ۵۶-۱۹۵۵ء کے لیے بطور ریسرچ سٹوڈنٹ گلاسگو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

اس کے بعد کیا ہوا، یہ کہانی ڈاکٹر شفیق کی زبانی سنئے۔ وہ کہتے ہیں: میرے ساتھ ہی انڈیا سے بھی ایک طالب علم گلاسگو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ ۱۹۵۷ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''پروفیسر بارٹن تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو کہ کیا غیرممالک سے آنے والے طلبہ بھی ڈی ایس آئی آر سکالرشپ کے اہل ہیں؟ غالباً وہ مالی امداد کے خواہاں تھے۔ میں نے کہا: اچھا پوچھ دوں گا۔ لیبارٹری کی بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ میں نے پروفیسر بارٹن کو ہمیشہ اسی کمرہ

میں بیٹھے دیکھا اور جب کبھی میں نے ان سے ملنا ہوتا تو اسی کمرہ میں جا کر ملتا تھا ورنہ ریسرچ کے کام کے سلسلے میں وہ روزانہ ہر ایک سے خود اس کے ڈیسک پر جا کر ملتے تھے۔ جب میں نے ان کے سامنے وہ مسئلہ رکھا جس کے لیے مجھے میرے ہندوستانی دوست نے کہہ رکھا تھا تو انہوں نے نفی میں جواب دیا لیکن چند لمحے کے توقف کے بعد فرمایا: کچھ دیر کے بعد مجھے دوبارہ ملنا۔ میں واپس آ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ خود میرے پاس آ گئے اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: آؤ اپنے کمرہ میں چلیں۔ ان کا یہ کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ میں جب ان کے کمرہ میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ ایک کشادہ کارپیٹڈ کمرہ جس میں صوفے رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور پھر پوچھا: ویل محمد! ہاؤ اِز یوٴر فنانشیل پوزیشن؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو یہ بات اپنے انڈین دوست، کا ہنے کے لیے پوچھ رہا تھا جس پر انہوں نے کہا: نہیں نہیں۔ وہ یہ وظیفہ حاصل نہیں کرسکتا۔ ساتھ ہی فرمایا: اسے بتا دو کہ اگر اسے میرے ساتھ کام کرنا ہے تو پھر اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں بلکہ ایم ایس سی کی ڈگری ملے گی۔ پھر مجھے کہنے لگے: تمہیں پتا ہے ہم امپیریل کالج لندن جا رہے ہیں۔ وہاں تمہیں سکالرشپ لے دوں گا۔ غالباً ستمبر کا مہینہ تھا جب ہم امپیریل کالج، لندن گئے۔ یہ وہی دن تھے جب پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج میں تشریف لائے تھے۔ ہمارے پہنچنے کے اگلے روز کالج میں ان کا خطاب تھا۔ مجھے بھی شامل ہونے کا موقع مل گیا۔ اس موقع پر پروفیسر بارٹن نے بھی خطاب کیا جو اسی ریسرچ سے متعلق تھا جو میں ان کی رہنمائی میں کررہا تھا۔ امپیریل کالج میں مجھے چھ ماہ کا سکالرشپ مل گیا۔ میں نے ۱۹۵۸ء میں اپنا تھیسس پروفیسر بارٹن کے حوالے کیا اور پاکستان واپس آ گیا۔

مارچ ۱۹۵۸ء میں لاہور میں سائنس کانفرنس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کریم اللہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس موقع پر میں بھی اپنی ریسرچ کے بارے میں لیکچر دوں۔ میں نے ان کی خواہش کے احترام میں لیکچر دیا اور اس کے بعد ہونے والی بحث میں حصہ لیا۔ پی سی ایس آئی آر کراچی میں ایک جرمن ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔ وہ اس سیشن کی صدارت کر رہے تھے جس میں میں نے لیکچر دیا تھا۔ دوسرے روز انہوں نے مجھے ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی (جو پی سی ایس آئی آر کے سربراہ تھے) کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نہ گیا تو دوسرے دن پھر یہی پیغام ملا مگر واقفِ زندگی ہونے کی وجہ سے میں نے کسی دوسری جگہ کام نہیں کرنا تھا اس لیے ان سے ملاقات سے مجتنب رہا۔

۱۹۵۵ء کی بات ہوگی۔ حضور نے ایک دن مجھے یاد فرمایا۔ میں ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تو آپ نے میری والدہ کی کلکتہ سے آمد اور ان کی طرف میرے لیے مناسب رشتے کی تلاش کے لیے کی جانے والی کوششوں کا حوالہ دیا اور ساتھ ہی شیخ بشیر احمد، ایڈووکیٹ، لاہور کی ہمشیرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میرا یہاں رشتہ ہو جائے تو حضور کو بڑی خوشی ہوگی چنانچہ یہ رشتہ طے پا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں میری لندن سے واپسی پر مولانا ابوالعطا جالندھری نے اس کمرہ میں جہاں حضرت مصلح موعود بیماری کی وجہ سے لیٹے رہتے تھے میرے نکاح کا اعلان کیا۔ اس تقریب میں حضرت مرزا بشیر احمد اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے بھی شرکت فرمائی۔ حضرت مصلح موعود نے دعا کروائی۔

فالحمدللہ علیٰ ذالک۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ رشتہ میرے لیے بے حد بابرکت ثابت ہوا۔

موصوف اس بات کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں کہ انہیں افریقہ میں بعض جماعتی خدمات کی توفیق ملی اور وہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی ذرّہ نوازی سے ۲۰۰۵ء سے وکالتِ تصنیف میں خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق سہگل کی طرح ایک اور مخلص خادمِ سلسلہ، چوہدری عبدالرحمٰن کو بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ وہ تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ چوہدری عبدالرحمٰن جنہیں عام طور پر سی اے رحمٰن کے مختصر نام سے پہچانا جاتا تھا اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی خدماتِ سلسلہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک درخشندہ مثال کی صورت اختیار چکی ہیں۔

چوہدری عبدالرحمٰن تعلیم الاسلام کالج لاہور کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھے جنہوں نے ان کے ایک ہم جماعت، چوہدری حمید نصر اللہ، امیر جماعت احمدیہ، لاہور کے بیان کے مطابق ۱۹۵۳ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ ان کے والد، عبدالحمید وڑائچ واہ سیمنٹ فیکٹری میں انجینئر تھے جب کہ ان کے دادا اور نانا دونوں کو حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ صرف یہی نہیں سی اے رحمٰن کی والدہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ رفقائے حضرت مسیح موعود میں سے زندہ رہنے والی آخری خاتون تھیں جنہوں نے ۳۰ جنوری ۲۰۰۰ء کو اپنے اس بیٹے کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں وفات پائی۔ بوقتِ وفات ان کی عمر سو سال سے متجاوز تھی۔ الفضل نے اس وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا تھا:

''رسول بی بی صاحبہ ۲۸ دسمبر ۱۸۹۸ء کو چوہدری محمد حسین باجوہ کے گھر پیدا ہوئیں۔ صد سالہ جلسہ سالانہ قادیان ۱۹۹۱ء کے موقع پر سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے آپ کے بارے میں اعلان فرمایا کہ عورتوں کی جلسہ گاہ میں سٹیج پر رسول بی بی صاحبہ تشریف فرما ہیں۔ عورتیں ان سے ملاقات کر کے برکت حاصل کر لیں۔ موصوفہ کی اولاد میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے چوہدری عبدالرحمٰن (سی اے رحمٰن) ادارۂ القضا کے بورڈ کے صدر، مجلس افتاء کے نائب صدر اول، مجلس تحریک جدید کے ممبر، تدوین فقہ کمیٹی کے ممبر اور سٹینڈنگ فنانس کمیٹی کے رکن ہیں۔ دوسرے صاحبزادے انگلستان میں ہیں جب کہ تیسرے صاحبزادے، مظفر احمد وفات پا چکے ہیں۔ بیٹیوں میں بلقیس سیف اللہ اہلیہ چوہدری سیف اللہ، ماڈل ٹاؤن، لاہور؛ فرحت قدوس بیوہ عبدالقدوس، کینیڈا؛ قدسیہ اعجاز بیوہ اعجاز احمد، ماڈل ٹاؤن، لاہور اور بشریٰ محمود اہلیہ محمود احمد، ڈیفنس، لاہور ہیں۔''

موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۶ء میں گوجرانوالہ میں ہوئی۔ میں اسی سال فروری کے مہینے میں راولپنڈی سے تبدیل ہو کر گوجرانوالہ گیا تھا۔ ابتداءً تو کئی دن لاہور میں رہائش رہی چنانچہ دن کا بہت سا حصہ اپنے مفوّضہ فرائض کی ادائیگی یا سفر میں گزر جاتا لہٰذا ان سے ملاقات کا موقع اس وقت ملا جب میرا نکاح ہونے والا تھا۔ جماعتی دستور کے مطابق نکاح فارم پر امیر جماعت کی تصدیق ضروری ہوتی ہے۔ موصوف ان دنوں امیر جماعت گوجرانوالہ تھے۔ جب میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مدعا عرض کیا تو انہوں نے بلاتاخیر فارم

پر دستخط کر دیئے۔

یہ تو تھی میری ان سے پہلی ملاقات لیکن بعد میں ان کے ساتھ چوہدری غلام مجتبےٰ ایڈووکیٹ کے چیمبر واقع مال روڈ، لاہور پر کئی بار ملاقات ہوئی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ اس وقت تک گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو چکے تھے اور اسی پلومر بلڈنگ میں اپنا چیمبر بنا لیا تھا۔ میں اس چیمبر میں بھی ایک یا دو بار ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ یہ ساری ملاقاتیں محض سوشل کالز تھیں اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے ان سے کبھی کسی کام کی فرمائش کی ہو۔

دو تین سال پہلے میرے چھوٹے بیٹے، نبیل کا رشتہ طے ہوا تو پتا چلا کہ دلہن کی دادی، بلقیس سیف اللہ (جنہیں ان کے بچے، پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں سبھی باجی کہتی ہیں) سی اے رحمٰن کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کے ساتھ جب ملاقات ہو تو ہم سی اے رحمٰن کا ذکرِ خیر ضرور کرتے ہیں۔

انہوں نے ۷ امئی ۲۰۰۱ء کو وفات پائی۔ الفضل نے ان کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع کی:

''احباب جماعت کو افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے مخلص فدائی خادم، صدر قضا بورڈ محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ و سپریم کورٹ (جو سی اے رحمٰن کے نام سے معروف تھے) آج صبح دو بجے شیخ زید ہسپتال، لاہور میں رحلت فرما گئے۔ آپ کی عمر ۶۸ سال تھی۔

محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب نہایت دیندار، متدیّن، صاحبِ فراست، باریک بین، حلیم الطّبع، متحمل اور دھیمے مزاج کے مالک اور مخلوقِ خدا سے محبت کرنے والے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جب گوجرانوالہ کے احمدیوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی محترم چوہدری صاحب امیر ضلع گوجرانوالہ تھے۔ ان دنوں میں ان کا گھر ایک وسیع مہمان خانہ اور مظلوموں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ ہر آنے والے کو اس کوٹھی میں جگہ ملتی تھی اور قیام و طعام کا انتظام تھا۔ محترم چوہدری صاحب نے اس دوران خدمتِ خلق اور احمدی بھائیوں سے بے نظیر محبت، ہمدردی اور دلداری کا جو نمونہ دکھایا اس کی یاد آج بھی دلوں کو گرما دیتی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ جمیلہ رحمٰن صاحبہ اور خود چوہدری صاحب ہر احمدی کی خدمت اور مہمان نوازی میں مصروف رہتے اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی ماتھے پر بَل نہ آیا۔''

موصوف کی تدفین بہشتی مقبرے کے قطعہ خاص میں عمل میں آئی۔ الفضل کی اطلاع کے مطابق:

''جنازے اور تدفین میں شمولیت کے لیے احمدی احباب کے علاوہ غیر از جماعت سینئر وکلاء بھی تشریف لائے ہوئے تھے جو محترم چوہدری صاحب کی فراست، حلیمی، نفاستِ طبع اور جذبۂ ہمدردی کا ذکر نہایت محبت بھرے اور جذباتی انداز میں کر رہے تھے۔''

ان کی وفات پر ممبران قضا بورڈ نے ایک قراردادِ تعزیت کے ذریعے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا:

''آپ ۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو لوریوالہ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین سیّدنا حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے۔

مکرم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب ۱۹۶۵ء میں ممبر قضاء بورڈ مقرر ہوئے اور پھر ۱۹۸۸ء میں حضور انور نے آپ کو صدر قضاء بورڈ مقرر فرمایا۔ آپ صدر قضا بورڈ کی نہایت اہم اور نازک ذمہ داری پر تیرہ سال تک فائز

رہے اور نہایت مخلصانہ خدمات سرانجام دیں۔

اس کے علاوہ آپ کی دینی خدمات کا دائرہ خدا کے فضل کے ساتھ بہت وسیع ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مجلس خدام الاحمدیہ میں گوجرانوالہ کے قائد ضلع رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں امیر ضلع گوجرانوالہ مقرر ہوئے۔ اس دوران ۱۹۷۴ء کے پُر آشوب دور میں بھی آپ کو بے لوث خدمات کا موقع ملا۔

۱۹۷۹ء سے آپ ممبر، اِفتا کمیٹی چلے آرہے تھے اور ۱۹۹۵ء سے تاحال نائب صدر اول، مجلسِ افتا تھے۔ آپ تدوین فقہ کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔ سترہ سال تک آپ ممبر مجلس تحریک جدید بھی رہے نیز مجلس شوریٰ میں مختلف سب کمیٹیوں کے ممبر اور کئی بار صدر سب کمیٹی بھی مقرر ہوتے رہے۔

محترم چوہدری صاحب ماہر قانون دان تھے۔ دیوانی مقدمات میں ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد جماعتی مقدمات میں بطور وکیل آپ نے خدمات سرانجام دیں۔ آپ متحمل مزاج، متدیّن، باریک بین اور معاملہ فہم تھے۔''

اب تک تعلیم الاسلام کالج کے جن ہونہار طلبہ کا ذکر ہو چکا ہے ظفر احمد وینس کا نام ان میں ایک خوبصورت اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اس کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ رہے بلکہ انہیں کئی سال تک کالج میں تدریس کا بھی موقع ملا چنانچہ جب میں کالج میں داخل ہوا تو موصوف وہاں پر اکنامکس کے لیکچرر تھے اور وہی ہمیں یہ مضمون پڑھانے پر مامور ہوئے۔ وہ انگریزی زبان میں لیکچر کے عادی معلوم ہوتے تھے جب کہ میری ساری تعلیم اردو میڈیم سکول میں ہوئی تھی لہٰذا ان کا دھوُاں دار لیکچر میرے سر کے اُوپر سے گزر جاتا۔

اس وقت میری عمر بمشکل سترہ سال تھی اور ظفر وینس کالج کے قدرے سینئر اساتذہ میں سے تھے لہٰذا ہمارے درمیان بے تکلفی کا کوئی امکان نہ تھا چنانچہ مجھے تو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا البتہ عزیز طاہر (جو اُن کے بعد ہمیں معاشیات کا مضمون پڑھاتے رہے) بتاتے ہیں: میں نے ان سے چار سال اکنامکس پڑھی ہے اور سچ پوچھیں تو انہوں نے ہی اس مضمون کے لیے میرے ذوق کو جلا بخشی۔ انہیں اپنے مضمون پر پورا عبور حاصل تھا اور پڑھانا بھی خوب جانتے تھے اور آج میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے اس مضمون میں ایم اے کرنے کا اصل کریڈٹ ان ہی کو جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں: مجھے یاد ہے جب ایوب خان کا مارشل لا آیا میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس زمانے میں لینڈ ریفارمز بھی ہوئیں اور ملک کی معیشت کو ترقی دینے کے لیے بہت سے ایسے اقدامات اٹھائے گئے جن کا پہلے ہمارے ہاں کوئی تصور ہی نہ تھا۔ یوں پاکستانی معیشت کے بارے میں بہت سی وہ باتیں جو پرانی ٹیکسٹ بکس میں لکھی ہوئی تھیں مکمل طور پر نظر ثانی کی محتاج ہو کر رہ گئیں۔ ظفر وینس نے سمجھایا کہ پاکستان کی بدلتی ہوئی معاشی پالیسیوں سے باخبر رہنے کے لیے ہمیں پاکستان ٹائمز کے مطالعہ کی عادت ڈالنی چاہئے اور ان مضامین یا خبروں کے تراشے اپنے پاس محفوظ رکھنے چاہئیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہو۔ میں باقی طلبہ کا تو کہہ نہیں سکتا لیکن میں نے اس مشورے کے مطابق پاکستان ٹائمز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیا اور اس کے تراشوں کے فائل

بناتا گیا۔ یہ مواد امتحان میں میرے بہت کام آیا۔

عزیز طاہر مزید بتاتے ہیں: ایم اے کے امتحان میں ہمارا ایک پرچہ ڈیویلپمنٹ اکنامکس کا ہوا کرتا تھا۔ آپ شاید اس بات پر یقین نہ کریں کہ میں اس پرچے کی ٹیکسٹ بک جو اُن دنوں پینتیس روپے میں ملتی تھی صرف اس لیے نہ خرید سکا کہ مجھے مطلوبہ رقم میسر نہ تھی۔ میں نے اس پرچے کی تیاری ان ہی تراشوں سے کی اور الحمدللہ میں اس میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا۔ یاد رہے کہ ہمارے استاد اور ممتحن ڈاکٹر ایس ایم اختر تھے جو ایک منجھے ہوئے پروفیسر اور اکنامکس کی بعض نصابی کتب کے مصنف بھی تھے۔

چار سال کی رفاقت کچھ کم طویل نہیں ہوتی، عزیز طاہر کہتے ہیں، اس عرصے میں اپنے ملنے جلنے والوں کو پرکھنے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔ میں اپنے کلاس کے محنتی اور لائق طلبہ میں سے تھا اور اکنامکس کے مضمون میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ظفر وینس مجھے پسند کرنے لگے اور آہستہ آہستہ مجھ پر اعتماد بھی کرنے لگے۔ مجھے یاد ہے اس وقت تک وہ غیر شادی شدہ تھے اور تنہا رہ رہے تھے چنانچہ انہوں نے جب ربوہ سے باہر جانا ہوتا وہ اپنے گھر کی چابی میرے حوالے کر جاتے۔ ان کی طرف سے ہدایت ہوتی تھی کہ رات مجھے بہر حال ان کے گھر پر سونا ہے چنانچہ میں سرِ شام وہاں پہنچ جاتا اور علی الصبح واپس آجاتا۔ الحمدللہ اس تمام عرصے میں ان کا گھر چوری چکاری سے محفوظ رہا۔

عزیز طاہر ایم اے کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں لیکچرر بن کر آئے تو ظفر وینس ابھی وہیں پڑھا رہے تھے۔ اس طرح ان دونوں کو بحیثیت کولیگ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ عزیز طاہر بتاتے ہیں کہ ظفر وینس ایک اچھے کولیگ اور رونقِ محفل تھے۔ بذلہ سنج تھے چنانچہ سٹاف روم میں ان کی سنائے ہوئے بعض لطائف کی بازگشت آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

جب ظفر وینس پی ایچ ڈی کرنے کے لیے کالج سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے نام کالج لائبریری کی بعض کتب جاری شدہ تھیں۔ وہ یہ کتب کچھ عرصہ مزید اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے عزیز طاہر سے پوچھا کہ کیا وہ یہی کتب اپنے نام پر جاری کرا کے انہیں دے سکتے ہیں۔ عزیز طاہر کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن دو تین ماہ بعد کالج لائبریری کی طرف سے انہیں ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں ان کتب کی واپسی کا تقاضا کیا گیا تھا۔ اس وقت ظفر وینس بیرونِ ملک جا چکے تھے۔ عزیز طاہر کو کچھ اور تو نہ سوجھا چنانچہ وہ لاہور میں ظفر وینس کے والدین کے ہاں چلے گئے۔ ان کے تعاون سے یہ کتابیں مل گئیں جو انہوں نے لائبریری کو واپس کر کے اپنا حساب بیباق کر دیا۔

تعلیم الاسلام کالج چھوڑنے کے بعد کبھی کبھار دوستوں کی باہم گفتگو میں ظفر وینس کا ذکر آتو جاتا تھا لیکن سچ پوچھیے تو اُن سے ملاقات یا رابطے کا کوئی موقع ہی پیدا نہ ہو سکا۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے حتّٰی کہ اگست ۲۰۱۵ء میں اُن کی صاحبزادی، ڈاکٹر عظمیٰ وینس کی طرف سے موصول ہونے والی ایک ای میل سے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے اپنی جوابی ای میل کے ذریعے عظمیٰ وینس کو ظفر وینس کی وفات پر تعزیت پیش کی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر وہ مجھے مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی بھجوا سکیں تو میں اُن کا ممنون ہوں گا۔ انہوں نے مہربانی فرمائی اور میری یہ درخواست قبول کر لی۔

اُن کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ظفر وینس جن کے والد کا نام ولی محمد تھا ۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو گجرات میں ایک احمدی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان اے آئی ہائی سکول، جتوں سے پاس کیا تھا جب کہ بی اے آنرز اِن اکنامکس تعلیم الاسلام کالج سے کیا۔ وہ اس کے فوراً بعد ۱۹۵۴ء میں اسی کالج میں پڑھانے لگے تھے۔ اگلے سال انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ کم و بیش نو سال یہاں رہنے کے بعد انگلستان چلے گئے اور یونیورسٹی آف لنڈن سے پی ایچ ڈی کیا۔ بعدۂ انہوں نے تعلیم الاسلام کالج میں واپس آنے کی بجائے وہیں پر ہینڈن کالج آف ٹیکنالوجی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۰ء میں ظفر واپس آئے تو ملازمت کے لیے قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کا انتخاب کر لیا جہاں وہ تین سال تک شعبہ معاشیات میں سینئر ریسرچ فیلو رہے۔ اس کے بعد وہ جارج واشنگٹن یونیورسٹی، امریکہ میں فل برائٹ وِزیٹنگ پروفیسر؛ نائیجیریا کی University of Maiduguri میں ریڈر اور قائداعظم یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور وہ مختلف اوقات میں اکنامکس سوسائٹی، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کے سرپرست؛ آل پاکستان اکنامکس ایسوسی ایشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر اور پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس کے سینئر فیلو رہے۔ وہ ایک معروف غیر سرکاری تنظیم، دی مارگلہ ہلز سوسائٹی کے فاؤنڈنگ ممبر بھی تھے۔

ان کے کئی مقالہ جات معاشی جریدوں میں شائع ہوئے اور انہیں بہت سی انٹرنیشنل کانفرنسز میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ وہ بعض ٹریننگ پروگراموں کے ٹیم لیڈر بھی رہے۔

قائداعظم یونیورسٹی سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کچھ عرصہ سعودی عرب میں رہے جہاں ان کی اہلیہ، شمیم ظفر کسی یونیورسٹی سے وابستہ تھیں۔ اسی دوران ان کی بڑی بیٹی، نائلہ (جنہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ڈینٹسٹری میں گریجوایشن کی تھی) اور سب سے چھوٹی بیٹی، بشریٰ (جس نے قائداعظم یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا) انگلستان اور منجھلی بیٹی، ڈاکٹر عظمیٰ امریکہ منتقل ہو گئیں تو ظفر وینس اور ان کی اہلیہ کا وقت ان دونوں جگہوں پر گزرنے لگا۔

ان کی زندگی کے آخری ایام امریکہ میں بسر ہوئے جہاں انہوں نے پانچ اگست ۲۰۱۵ء کو وفات پائی۔ ان کی تدفین میری لینڈ میں ہوئی۔

تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کے پروفیسر، حمید احمد چودھری کے بیان کے مطابق ظفر وینس نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک ان کے ساتھ رابطہ رکھا چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ زمانہ طالبِ علمی میں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شفقت و محبت کے خاص مورد رہے اور اگر انہیں آپ کی طرف سے یہ توجہ نہ ملتی تو شاید وہ پڑھائی جاری ہی نہ رکھ سکتے۔ حمید کے بیان کے مطابق ظفر وینس نے اپنی وفات سے ایک ہفتہ پہلے

انہیں درخواست کی تھی کہ وہ حضرت صاحب کو ان کے لیے دعا کے لیے لکھیں اور بتائیں کہ اب وہ بہت بدل چکے ہیں۔

ظفر وینس کے بعد اب جس دوست کا ذکر کیا جا رہا ہے انہوں نے اوائل عمری ہی میں اپنی زندگی جماعت کی خدمت کے لیے وقف کی اور ماشاء اللہ اپنے اس عہد کو نبھایا بھی خوب۔ ان کی جماعتی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے اور وہ لمبا عرصہ امام بیت فضل لندن بھی رہے۔ میرا اشارہ بشیر احمد رفیق کی طرف ہے۔

بشیر رفیق ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک تعلیم الاسلام کالج میں رہے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد انہیں ایک عرصے تک خدمتِ دین کا موقع ملا تاہم میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۸۷ء میں اس وقت ہوئی جب وہ وکیل الدیوان تحریک جدید تھے۔ ہوا دراصل یوں کہ کچھ ہی عرصہ پہلے میرے ایک ماموں زاد بھائی، مرزا محمد اسماعیل، کارکن دفتر تحریک جدید اچانک وفات پا گئے تھے۔ ان کی وفات پر معلوم ہوا کہ دفتری کیش ۶۹۵۳.۶۰ روپے کم ہے چنانچہ مجھے وکیل الدیوان کی طرف سے ایک چٹھی (نمبر ۲۴۵۴ محررہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۷ء) موصول ہوئی جس میں اس وضاحت کے بعد کہ کمی کیش کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی لکھا تھا: ''مرحوم سلسلے کے دیرینہ خادم تھے۔ بہت نیک اور مخلص انسان تھے۔ کیش کا کم ہونا ان کی نیکنامی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قدر استطاعت دی ہوئی ہے کہ اگر آپ ہمت کریں اور ان کی نیکنامی کو متاثر نہ ہونے دیں تو یہ بہت ثواب کا موجب ہو گا۔'' اس توقع کے ساتھ کہ مرحوم کی طرف سے میں یہ ادائیگی دفتر کو کر دوں گا خط کے آخر میں لکھا تھا: ''ہمارا آپ سے کوئی مطالبہ نہیں بلکہ نیکی کی ایک تحریک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔''

میں یہ خط موصول ہونے پر بشیر رفیق سے ملا اور وعدہ کیا کہ میں یہ رقم جلد از جلد ادا کرنے کی کوشش کروں گا اور خدا کا شکر ہے اس نے مجھے اس سلسلے میں سرخ رو کیا چنانچہ وکالت دیوان کی طرف سے ایک اور چٹھی (نمبر ۲۵۹۶ محررہ پانچ اپریل ۱۹۸۷ء) کے ذریعے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے موصوف نے لکھا:

''خاکسار آپ کا از حد ممنون ہے کہ سلسلے کے ایک دیرینہ خادم مکرم مرزا محمد اسماعیل صاحب کی ذات پر آپ نے کسی قسم کا دھبہ نہیں آنے دیا اور یہ جو مبلغ ۶,۹۵۳.۶۰ روپے کی کیش تھی وہ آپ نے پوری کروا دی ہے۔ یہ ہماری طرف سے تحریک تھی ورنہ قانونی لحاظ سے ہم تو آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے مگر خوب آپ نے اقربا پروری کا جو حق تھا وہ ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی احسن رنگ میں جزا دیں۔ آمین''

اس کے بعد بشیر رفیق کی انگلستان منتقلی کی وجہ سے میرا ان سے زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ ہاں! ان کی طرف سے عمومی دلچسپی کے مواد پر مبنی ای میلز ملتی رہتی تھیں۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے میں نے ان سے رابطہ کر کے کالج میں گزرے ہوئے مہ و سال کی سرگزشت سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے معذرت چاہی کہ وہ کمزوری صحت کے سبب ایسا کرنے سے قاصر ہیں تاہم بتایا کہ وہ اپنے حالاتِ زندگی کتابی شکل میں شائع کر چکے ہیں اور یہ کہ اس کتاب کا ایک باب کالج کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ بشیر رفیق نے از راہِ مہربانی اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے

بذریعہ ای میل ارسال فرمادیا۔ مجھے یقین ہے آپ جانتے ہوں گے کہ اس کتاب کا نام ''چند خوشگوار یادیں'' ہے اور اس میں ذیل کے صفحات ان کے تعلیم الاسلام کالج کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں بیان کردہ واقعات بہت دلچسپ ہیں خاص طور پر وہ واقعہ جس کا تعلق بی اے کے امتحان میں ان کی کامیابی سے ہے اور جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی قبولیتِ دعا کا ایک معجزہ بھی بیان ہوا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ہم نے چونکہ قادیان سے ہجرت کی تھی اور انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں کالج دوبارہ شروع کیا تھا لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی دعاؤں اور اساتذہ کی بے لوث محنت کے نتیجے میں کالج کے نتائج یونیورسٹی میں نوّے فیصد رہے اور خدا کے فضل سے کالج کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ کھیلوں کے میدان میں بھی کالج نے زبردست نام پیدا کیا......

اپریل ۱۹۵۰ء میں تعلیم الاسلام کالج نے اپنے علمی رسالہ ''المنار'' کا اجرا کیا۔ یہ اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا تھا اور بہت جلد اس نے اپنے اعلیٰ مضامین، خوبصورت گیٹ اَپ اور اعلیٰ پیپر پر شائع ہونے کی وجہ سے اپنا نام پیدا کرلیا۔ لاہور کے دوسرے کالجوں کے علمی رسائل جو سالہا سال سے چل رہے تھے اور کافی شہرت رکھتے تھے، المناران کو پیچھے چھوڑ گیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ رسالہ کے اردو سیکشن کا میں پہلے سال نائب ایڈیٹر مقرر ہوا اور پھر اگلے دو سال میں اس کا ایڈیٹر مقرر رہوا۔ میرے کئی مضامین بھی اس میں شائع ہوئے۔ میرا ایک مضمون جو خوشحال خان خٹک کی زندگی اور شاعری پر تھا بے حد پسند کیا گیا۔ یہ میری ادبی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے کئی مضامین الفضل اور سلسلے کے دیگر رسائل میں شائع ہوئے۔

۱۹۵۳ء میں جب میں بی اے کے فائنل امتحان کی تیاری میں مگن تھا اچانک اینٹی احمدیہ فسادات پُھوٹ پڑے۔ ان فسادات کا آغاز لاہور سے ہوا۔ احراریوں اور احمدیت کے دشمنوں نے یہاں تک دعوے کئے کہ وہ احمدیت کا نعوذ باللہ نام ونشان تک مٹا دیں گے۔ تعلیم الاسلام کالج ان کے حملوں کا نمایاں ٹارگٹ تھا۔ ہر روز جلوس کی شکل میں سینکڑوں فسادی کالج کے اردگرد جمع ہوکر نعرہ بازی اور خشت باری کیا کرتے۔ کالج میں گھسنے اور آگ لگانے کی کوشش کرتے لیکن کامیاب نہ ہوسکتے۔ پرنسپل حضرت مرزا ناصر احمد کی اعلیٰ قیادت کے نتیجے میں کالج ایک مضبوط قلعہ کی صورت اختیار کرگیا تھا۔ میں بھی دن رات کالج کے دفاع میں دوسرے طلبہ کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ پڑھائی کا تو ان دنوں تصوّر بھی نہ ہوسکتا تھا۔ یہ بہت کٹھن وقت تھا۔ لاہور میں حالات تشویشناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ کئی احمدیوں نے راہِ مولیٰ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ بے شمار احمدیوں کے گھر جلا دیئے گئے۔ احمدی گھروں کو لوٹا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی حکومت موجود نہیں، جنگل کا قانون رائج ہے۔

ہمیں کالج کی حفاظت کے علاوہ دیگر احمدی احباب کی حفاظت کے لیے بھی بھجوایا جاتا تھا۔ شیخ بشیر احمد،

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور ان دنوں لاہور کے امیر تھے۔ ان کے مکان پر بھی حملہ ہوا اور بالآخر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ میری ڈیوٹی کئی بار ان کے گھر کی حفاظت پر لگی۔ بہرکیف یہ بہت پریشانی کے ایام تھے۔

فسادات پر بالآخر فوج نے قابو پالیا لیکن میں بروقت تیاری نہ ہونے کی وجہ سے بی اے کے امتحانات میں شریک نہ ہوسکا اور ستمبر میں بی اے کے سپلیمنٹری امتحان میں شریک ہوا۔ چونکہ کوئی خاص تیاری نہ تھی اس لیے پاس ہونے کی بھی کوئی امید نہ تھی۔

اُن دنوں میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی خدمت میں متواتر دعا کی درخواست کروں۔ تیاری نہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پاس تو کرسکتا ہے چنانچہ میں نے ایک دن بیٹھ کر تیس کے قریب دعائیہ خطوط تیار کئے اور انہیں لفافوں میں بند کر کے ان پر پوسٹیج ٹکٹ لگا کر رکھ لیے۔ روزانہ ایک خط میں حضور کی خدمت میں ربوہ بھجوا دیتا تھا۔ چند دنوں بعد حضور کی طرف سے جوابات ملنے شروع ہوئے جس میں لکھا ہوتا تھا کہ حضور نے تمہارے لیے دعا کی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن مجھے حضور کی طرف سے ایک خط ملا کہ روزانہ تمہاری طرف سے مجھے ایک خط دعا کا ملتا ہے اور میں تمہاری کامیابیوں کے لیے دعا کرتا ہوں، تم ان شاء اللہ امتحان میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے، اطمینان رکھو اور مجھے دعا کے لیے یاددہانی کراتے رہا کرو۔ مجھے حضور کے اس خط سے بہت تسلی ہوئی لیکن تیاری نہ ہونے سے پریشانی بھی رہتی تھی۔ میرا سب سے کمزور مضمون انگلش لٹریچر تھا اور اس طرف سے میں بالکل ناامید ہو چکا تھا۔

خیر امتحان میں جب چار دن باقی رہ گئے تو ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی شخص نے مجھے پرچہ امتحان دے کر کہا کہ یہ تمہارا انگلش لٹریچر کا پرچہ ہے، اسے یاد کرلو۔ میں نے پرچہ پڑھا تو اس شخص سے کہا کہ یہ تو بہت مشکل پرچہ ہے اور مجھے ان سوالات کے جوابات بھی نہیں آتے۔ اس نے کہا اسی واسطے تمہیں یہ دکھا رہا ہوں کہ ان سوالات کو یاد کرلو۔ اس کے ساتھ ہی میں خواب سے بیدار ہوا۔ میں نے جلدی سے ان سوالات کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور پھر سو گیا۔ اگلے روز مجھے خواب یاد نہ رہی۔ شام کو یوں ہی اس کاغذ پر نظر پڑی تو یہ خواب بھی یاد آ گئی۔ میرے دوست اسلم باجوہ جو میرے ساتھ ایک ہی کمرہ میں تھے انہیں میں نے خواب سنائی اور سوالات دکھائے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ سوالات تو ہرگز نہیں آسکتے اور کسی گیس پیپر میں بھی یہ درج نہیں ہیں لیکن میں نے سوچا کہ خواہ یہ سوالات نہ بھی آئیں انہیں یاد کرنے میں اور جوابات تیار کرنے میں کیا حرج ہے۔ آخر یوں ہی تو خواب نہیں آئی چنانچہ میں نے نہ صرف خوب تیاری کی بلکہ ان سوالات کے جوابات کو ایک حد تک حفظ کرلیا۔ چند دن بعد جب میں انگلش لٹریچر کے امتحان کے لیے کمرۂ امتحان میں داخل ہوا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بعینہٖ لفظ بہ لفظ وہی پرچہ میرے سامنے تھا جو میں خواب میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سوالات حل کرنے شروع کر دیئے اور خدا کے فضل سے سو فیصد پرچہ حل کر کے کمرہ امتحان سے باہر آ گیا۔ میرے دوست جنہیں میں چند دن قبل اپنی خواب سنا چکا تھا سب حیرت زدہ تھے اور اس بات پر بار بار افسوس کررہے تھے کہ وہ میری خواب پر اعتبار نہ کر کے پرچہ صحیح حل نہیں کرسکے تھے۔ میں خود اس معجزے پر

حیران وششدر تھا اور بار بار شکر ادا کرتا تھا۔

اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ ایک طرف حضور کا خط تھا کہ تم پاس ہو جاؤ گے دوسری طرف اس سچی خواب نے حوصلہ بلند کر دیا اور میں مطمئن ہوکر امتحان کے بعد گاؤں چلا گیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ نکل آیا اور مجھے رزلٹ دیکھ کر شدید شاک پہنچا کہ میں فیل ہوگیا ہوں۔ میں سخت پریشان ہوا کہ اگر مجھے فیل ہی ہونا تھا تو کیوں مجھے اللہ تعالیٰ نے امتحان سے قبل پرچہ دکھایا اور پھر حضور نے انتہائی وثوق سے لکھا کہ تم پاس ہو جاؤ گے۔ بعض اوقات میرا ایمان متزلزل ہونے لگتا تھا اور دل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگتے تھے۔ میں پشاور میں نتیجہ اخبارات میں دیکھنے کے بعد مایوسی کی حالت میں واپس گاؤں آ گیا تو والد صاحب نے دریافت کیا کہ نتیجہ کیا نکلا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں فیل ہوگیا ہوں۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ کوئی بات نہیں، تمہاری تیاری بھی تو فساداتِ پنجاب کی وجہ سے مکمل نہیں تھی، اگلے سال ان شاءاللہ پاس ہو جاؤ گے۔

دو چار دن گزرے تو ایک دن والد صاحب نے فرمایا کہ میں جب بھی رات کو اٹھ کر تمہارے لیے دعا کرتا ہوں تو آواز آتی ہے کہ بشیر احمد تو پاس ہو چکا ہے۔ میں نے والد صاحب کو کالج کی طرف سے آمدہ نتیجے کا خط لا کر دکھایا جس میں کالج والوں نے مجھے باقاعدہ اطلاع دی تھی کہ میں فیل ہو چکا ہوں تو والد صاحب خاموش ہوگئے۔ دو چار روز کے بعد والد صاحب نے فرمایا کہ عجیب بات ہے مجھے ہر رات دعا کے دوران آواز آتی ہے کہ بشیر احمد تو پاس ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا کہ ممکن ہے یہ اگلے سال کے لیے اطلاع ہو۔ دن گزرتے چلے گئے۔ میں نے دوبارہ کالج میں داخل ہونے کی تیاری مکمل کرلی۔ ایک دن ڈاک میں میرے نام دس پندرہ خط آئے تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اتنے سارے خطوط کہاں سے آگئے۔ ان میں سے ایک خط کالج کی طرف سے تھا۔ میں نے پہلے وہ کھولا تو اسے پڑھ کر مبہوت ہوکر رہ گیا۔ خط میں لکھا تھا کہ یونیورسٹی نے غلطی سے تمہیں فیل قرار دے دیا تھا۔ اب پرچوں کی دوبارہ پڑتال ہونے کے بعد تم پاس قرار دیئے گئے ہو۔ باقی خطوط دوستوں کی مبارکباد کے تھے۔ میں نے جب والد صاحب کو اطلاع دی تو وہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور پھر فرمایا کہ مجھے تو ہر رات تمہارے پاس ہونے کی خوشخبری دی جا رہی تھی لیکن یونیورسٹی کی غلطی سے معاملہ الٹ گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے معجزانہ رنگ میں مجھے پاس کر دیا۔

کچھ دنوں بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضور کو سارا واقعہ بتایا۔ حضور نے فرمایا کہ مجھے دعاؤں کے بعد ہی تمہارے پاس ہونے کی خبر دی گئی تھی جس کی اطلاع میں نے تمہیں کر دی تھی۔ خدائی بات کو کون ٹال سکتا ہے؟

کالج کا دور میرے لیے بہت ایمان افروز بھی تھا۔ وقتاً فوقتاً کالج کی طرف سے رفقا حضرت مسیح موعود کو دعوت دی جاتی تھی۔ وہ ہمیں حضرت مسیح موعود کے زمانۂ مبارک کی باتیں بتاتے تھے جو ہمارے لیے ازدیادِ ایمان

کا باعث ہوتی تھی۔ کالج میں مجھے ایک نہایت مشفق استاد، مولانا ارجمند خان کی صورت میں ملے۔ آپ پٹھان تھے اور حضرت خلیفہ اول کے زمانۂ خلافت میں افغانستان سے ہجرت کر کے قادیان آئے تھے۔ یہاں مولوی فاضل پاس کیا اور پھر مدرسہ احمدیہ میں استاد مقرر ہوئے۔ لاہور جب تعلیم الاسلام کالج کھلا تو آپ کی تقرری بطور استاد دینیات کالج میں ہوگئی۔ آپ شگفتہ مزاج اور انتہائی مہمان نواز انسان تھے۔ مجھ پر خاص شفقت رکھتے تھے۔ کالج کے اوقات کے بعد میرا اکثر وقت آپ کی صحبت میں گزرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے......

اس زمانے کے میرے کئی کلاس فیلوز کو خدمتِ دین کی بہت توفیق ملی اور مل رہی ہے۔ ان میں سے بعض اُمرائے جماعت ہیں، بعض مرکزی دفاتر ربوہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ بعض دنیوی اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے اور بعض اب بھی ہیں۔ غرضیکہ میری زندگی کا یہ نہایت خوشگوار دور تھا۔

لاہور کی یادیں اب تک میرے دل و دماغ کو گرماتی ہیں۔ لاہور میں طالب علمی کے دوران مجھے ادبی سرگرمیوں کا بھی شوق رہا۔ میں کالج کی اردو سوسائٹی کا صدر ہونے کے ناتے بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں سے بارہا ملتا رہا۔ انہیں کالج کی اردو سوسائٹی کی میٹنگز میں بلاتا رہا۔ ان میں شوکت تھانوی،، وقار عظیم، ڈاکٹر تاثیر مرحوم شامل ہیں۔ جگر مرادآبادی سے بھی شوکت تھانوی کے ذریعے ملنے کا موقع ملا۔ حلقہ اربابِ ذوق، جو مشہور ادبی تنظیم ہے، کے درجنوں اجلاسات میں مجھے شرکت کرنے کا موقع ملا۔ جن لوگوں سے ملاقات کے مواقع ملے ان میں سعادت حسن منٹو، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی اور ظہیر کاشمیری جیسے عظیم ادیب اور شعراء شامل ہیں۔

۱۹۵۳ء میں میں نے بی اے کا امتحان پاس کرلیا۔ جون ۱۹۵۴ء میں کالج کانووکیشن منعقد ہوا جس میں اس وقت کے وزیر خارجہ حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب نے ہمیں ڈگریاں دیں اور ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ میں نے حضرت چوہدری صاحب کو دُور سے قادیان میں بار بار دیکھا تھا لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بعد میں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں ان کی صحبت سے خوب سیراب ہوا۔"

بشیر رفیق نے گیارہ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو لندن میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اکیس اکتوبر ۲۰۱۶ء کو ان کی نمازِ جنازہ غائب پڑھانے سے قبل خطبۂ جمعہ میں ان کا طویل ذکرِ خیر کیا اور ان کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے علاوہ ان کی خدماتِ سلسلہ پر بھی روشنی ڈالی۔ حضور نے ان کے زندگی وقف کرنے کے واقعے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

"ایک خطبے میں حضرت مصلح موعود نے نوجوانانِ احمدیت کو زندگی وقف کرنے کی تحریک کی چنانچہ نماز جمعہ کے ختم ہوتے ہی کئی نوجوانوں نے اپنے نام پیش کئے اور ان خوش نصیب نوجوانوں میں یہ بھی شامل تھے اور اس زمانے میں باقاعدہ انتظام اس طرح نہیں تھا تو اس کے بعد حضرت مصلح موعود کا ذاتی خط ان کو ملا کہ آپ کا وقف قبول کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء تک جب تک پارٹیشن نہیں ہوئی انہوں نے قادیان میں تعلیم جاری رکھی۔ میٹرک

پاس کرنے کے بعد یا شاید پارٹیشن سے کچھ عرصہ پہلے اپنے علاقے میں چلے گئے تھے۔ کالج میں جب داخلہ لے لیا تو یہ کہتے ہیں اچانک ایک دن مجھے پرائیویٹ سیکرٹری کا خط ملا کہ حضرت مصلح موعود نے فرمایا کہ قادیان میں ایک پٹھان طالب علم تھا جس نے زندگی وقف کی تھی لیکن اس کا نام نہیں پتا کون تھا اور پارٹیشن کی وجہ سے ریکارڈ بھی گم ہوگیا یا ربوہ میں موجود نہیں۔ اس کا پتا کریں ۱۹۴۵ء میں پڑھنے والے طلبہ میں سے کون تھا وہ جس نے وقف کیا تھا۔ اتفاق سے ان کے گھر خط آیا۔ انہوں نے لکھا کہ وہ میں ہی تھا چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے انہیں حکم دیا کہ فوراً ربوہ حاضر ہو جائیں اور تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں داخلہ لو اور بی اے کرو۔''

بی اے کرنے کے بعد انہیں مختلف رنگوں میں جماعت کی خدمت کا موقع ملا چنانچہ وہ لمبا عرصہ امام بیت فضل لندن رہے؛ انہیں رسالہ ہیرلڈ اور اخبارِ احمدیہ کے اجرا Review of Religions کی ادارت کی توفیق ملی؛ وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے؛ ربوہ میں بطور وکیل الدیوان، وکیل التصنیف اور ایڈیشنل وکیل التبشیر کام کیا اور ممبر صدر انجمن احمدیہ، ممبر اِفتا کمیٹی اور ممبر قضا بورڈ رہے۔ ۱۹۶۸ء میں لائبیریا کے صدر مملکت، ٹب مَن کی خصوصی دعوت پر ان کے ملک گئے اور لائبیریا کے اعزازی چیف مقرر کیے گئے۔

ان کی وفات پر آدم چغتائی نے اپنے جذباتِ غم کا اظہار کچھ یوں کیا:

واہ رے غمِ فراق یہ کیا کر گیا ہے تُو
پَل بھر میں خشک آنکھوں کو تر کر گیا ہے تُو
ممکن نہیں یہ سوزشِ غم ہو سکے بیاں
پلکوں میں جُوئے اشک رواں کر گیا ہے تُو
چہرے کا نور دے ہے گواہی وفاؤں کی
اوڑھے ہوئے وفاؤں کی چادر گیا ہے تُو
ہاتھوں سے نذرِ لحد کیا پھر بھی جانے کیوں
دل ہے کہ مانتا ہی نہیں مرگیا ہے تُو

تعلیم الاسلام کالج کے ہونہار طلبہ کا ذکر ہو رہا ہے تو لگے ہاتھوں منظور حسین بسرا کا ذکر بھی ہو جائے جو ایک نومبائع بزرگ، حاجی بلند بخش کے صاحبزادے ہیں اور فی الاصل راؤ کے رتّیاں ضلع نارووال کے رہنے والے ہیں۔ وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء کے دوران اس کالج میں پڑھتے رہے اور گریجوایشن یہیں سے کی۔ اللہ نے اچھی صحت اور جواں ہمت سے نوازا تھا چنانچہ وہ کالج روئنگ ٹیم کے کپتان رہے۔

یوں تو بی اے کے بعد موصوف نے ایم اے اکنامکس میں داخلہ لیا تھا لیکن اسی دوران ان کی سوچ میں ایک تبدیلی رُونما ہوئی چنانچہ انہوں نے وکالت کا پیشہ اپنانے کا فیصلہ کرلیا اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ساہیوال میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۳ء میں حکومتِ مغربی پاکستان نے انٹرویوز کی بنیاد پر کچھ

سِول ججز کا تقرر کیا۔ موصوف اس فہرست میں اوّل رہے اور انہوں نے یکم جنوری ۱۹۶۴ء کو گوجرانوالہ میں بطور سِول جج اپنا کام شروع کیا۔ وہ بعد میں چکوال، احمد پور شرقیہ، ایبٹ آباد، گجرات، لاہور، شیخوپورہ، ملتان، رحیم یار خاں، فیصل آباد، ڈیرہ غازی خان اور جھنگ میں تعینات رہے اور وہاڑی اور بہاولنگر میں سیشن جج کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ وہ ۱۹۹۰ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت سپیشل جج سنٹرل انٹی کرپشن، لاہور کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد بطور وکیل پریکٹس کا آغاز کیا اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے نامی وکلاء میں ہوا۔

ان کے سب سے بڑے صاحبزادے، خالد بسرا ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے رکن تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بطور ڈپٹی کمشنر تقرری کے دوران لاہور آتے ہوئے سفر کے دوران دل کے شدید حملے میں چل بسے اور ماڈل ٹاؤن کے احمدیہ قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ بات ۱۹۹۸ء کی ہے۔

خالد بسرا سے میری پہلی اور آخری ملاقات اس حادثے سے چند سال پہلے اس وقت ہوئی جب میں ملتان میں تھا۔ ہوا دراصل یوں کہ ایک روز ملتان کے ڈپٹی کمشنر، خالد سلطان کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ ان کے ایک دوست، خالد بسرا ملتان آئے ہوئے ہیں اور وہ ان کی سرکاری رہائش گاہ پر رات کے کھانے کے بعد اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ تب معلوم ہوا کہ خالد بسرا کو موسیقی کا شوق ہے اور وہ کچھ ہی عرصہ پہلے باہر کی کسی یونیورسٹی سے سوشل اینتھروپالوجی میں پی ایچ ڈی کر کے وطن واپس لوٹے ہیں۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر، وقار منظور بسرا جو ربوہ میں مقیم ہیں اور اپنے شعبے میں مہارت کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں ان ہی منظور بسرا کے صاحبزادے ہیں۔ میں ان سے بھی دو بار طبی مشورے کے حصول کے لیے ملاقات کر چکا ہوں۔

ان دونوں بھائیوں کے برعکس منظور بسرا سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور جب یہ کتاب لکھتے ہوئے ان سے ملاقات کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سخت علیل ہیں اور ملاقاتوں سے مکمل اجتناب کرتے ہیں۔ صرف ایک بار فون پر مختصر سی گفتگو ہو سکی جس دوران انہوں نے زمانۂ کالج میں کشتی رانی میں اپنی دلچسپی کا ذکر کیا۔ باقی سب باتیں ان کے صاحبزادے، ڈاکٹر آصف منظور بسرا نے بتائی ہیں اور ان ہی کے حوالے سے یہاں پر بیان کی گئی ہیں۔

منظور بسرا کے بعد ذکر کیا جا رہا ہے ایک غیر از جماعت دوست، کیپٹن (ر) رضا علی کا جو فوج سے سِول سروس آف پاکستان میں اِنڈکٹ ہونے کے بعد حکومتِ پاکستان کے تحت کئی عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے۔ ایک روایت کے مطابق سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد وہ ۱۹۵۰ء میں اس کالج میں داخل ہوئے اور دو سال یہاں گزارنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مطیع الرحمٰن، نائب ناظر امور عامہ، صدر انجمن احمدیہ کے بیان کے مطابق کیپٹن رضا علی ان سے ایک سال سینئر تھے چنانچہ جب وہ ۱۹۵۱ء میں اس کالج میں داخل ہوئے اور فضل عمر ہوسٹل میں رہائش اختیار کی تو انہیں ابتداءً اسی کمرے میں جگہ ملی تھی جس میں کیپٹن رضا علی پہلے سے مقیم تھے۔ مطیع الرحمٰن ہی بتاتے ہیں کہ رضا علی کالج کی اس روئنگ ٹیم کا حصہ تھے جس نے اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتی تھی۔ وہ سٹیئر ہوا کرتے تھے۔

میری آج تک رضا علی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے دل میں ان سے ملاقات کی تحریک پیدا ہوئی لیکن ان کا اتا پتا معلوم نہ تھا۔ اللہ بھلا کرے میجر محمد اکرم، ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل آف پولیس کا جو ان سے متعارف تھے اور جن کے ذریعہ مجھے کیولری گراؤنڈ، لاہور میں ان کی جائے رہائش کا بھی پتا چل گیا تاہم یہ جان کر افسوس ہوا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ خود کو اس قابل محسوس نہیں کرتے کہ کسی اجنبی سے مل سکیں یا اس کے سوالات کا جواب دے سکیں۔ اسی ذریعے سے پتا چلا کہ موصوف کے دو بیٹے امریکہ میں ہیں چنانچہ رضا علی موسمِ گرما کے چھ ماہ ان کے پاس امریکہ میں گزارتے ہیں اور موسمِ سرما کے چھ ماہ پاکستان رہتے ہیں تاہم کمزوری صحت کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت آرام میں ہی گزرتا ہے۔

ایک اور دوست کا ذکر جن کا نام تاریخِ احمدیت مؤلفہ مولانا دوست محمد شاہد (جلد۹) میں درج اساتذہ کی اس فہرست میں شامل ہے جو تعلیم الاسلام کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اس فہرست میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ان میں سے کون کون سا استاد اس کالج کا سابق طالب علم تھا۔ ڈاکٹر نصیر اے بشیر جن کا تعلق چک مہیر نزد سانگلہ ہل سے تھا اور جو بشیر احمد نامی ایک پولیس آفیسر کے صاحبزادے اور خالد بشیر، ایڈووکیٹ، فیصل آباد کے بھائی تھے کا نام اساتذہ کی فہرست میں تو موجود ہے تاہم مولانا دوست محمد شاہد کی تحقیق کے مطابق وہ اس کالج کے طالب علم نہیں رہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر محمد شریف خان، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج اپنے مضمون بعنوان ''تعلیم الاسلام پرائمری سکول، قادیان سے تعلیم الاسلام کالج، ربوہ تک کا سفر'' مطبوعہ النُّور، یو ایس اے (جنوری ۲۰۱۳ء) میں ڈاکٹر نصیر اے بشیر کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موصوف تعلیم الاسلام کالج، لاہور میں طالب علم رہے...... آپ ۱۹۵۷ء میں تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں میرے استاد تھے۔ ۱۹۶۵ء میں اتفاقاً بیتِ اقصیٰ، ربوہ میں جمعہ کے دن موصوف سے ملاقات ہوئی۔ تعارف ہوا، خوش ہوئے کہ ان کی جگہ پر کالج میں ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ آپ امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے اور غیراز جماعت افراد کی سخت مخالفت میں فیصل آباد میڈیکل کالج میں فزیالوجی کے پروفیسر رہے۔''

محمد شریف خان کی شہادت ہی کی بنیاد پر نصیر اے بشیر کو تعلیم الاسلام کالج کا اولڈ سٹوڈنٹ متصوّر کیا گیا ہے۔

سچ پوچھیں تو میں نے کبھی نصیر اے بشیر کا نام بھی نہ سنا تھا لیکن جن دنوں ان کا تقرر پنجاب میڈیکل کالج، فیصل آباد میں پروفیسر کے طور پر ہوا میری پوسٹنگ اسی شہر میں بطور انسپیکٹنگ اسسٹنٹ کمشنر آف انکم ٹیکس تھی اور میری رہائش انکم ٹیکس کالونی میں تھی جو میڈیکل کالج کے تقریباً سامنے واقع تھی۔ کسی نے موصوف کی اس کالج میں بائیوکیمسٹری کے پروفیسر کے طور پر تقرری کا میرے سامنے ذکر کیا تو مجھے ان سے ملاقات کا اشتیاق ہوا اور میں ایک روز ان سے ملنے کے لیے ان کی سرکاری رہائش گاہ واقع الائیڈ ہسپتال جا پہنچا۔ موصوف بڑی محبت سے پیش آئے۔ ان سے بعد میں بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں جس دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ انہوں نے امریکہ میں اپنے قیام کے دوران ایک امریکی عورت سے شادی کی تھی اور اس سے ان کے ہاں تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

جب یہ بیٹیاں بڑی ہوئیں تو نصیر اے بشیر ان کی آزاد روی برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تاہم جب انہوں نے اپنی اہلیہ اور بیٹیوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بہت حیران ہوئیں اور یہ کہہ کر ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کہ پاکستان نصیر اے بشیر کا وطن تو ہو سکتا ہے، ان کا وطن تو امریکہ اور صرف امریکہ ہے لہٰذا اگر وہ پاکستان جانا چاہیں تو بڑے شوق سے جائیں وہ امریکہ نہیں چھوڑ سکتیں۔ نصیر اے بشیر ان کے اس رویّہ پر بے حد دل برداشتہ ہوئے اور انہیں وہیں چھوڑ کر پاکستان واپس آ گئے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں پنجاب میڈیکل کالج میں بائیوکیمسٹری کے پروفیسر کی جگہ مشتہر ہوئی تو انہوں نے درخواست دے دی۔ اپنی کوالیفیکیشنز کی بنیاد پر وہ اس پوسٹ کے لیے منتخب ہو گئے اور جب میں ان سے ملا تو وہ اس کالج میں پڑھا رہے تھے۔

پنجاب میڈیکل کالج میں ان کی ملازمت ان کے لیے آسان ثابت نہ ہوئی۔ غالباً احمدی ہونے کے ناتے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور طلبہ کی طرف سے ان پر بعض الزامات لگائے جانے لگے۔

اسی عرصے میں ان سے ایک بار ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک شیرخوار بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے پاکستان آ کر ایک اور شادی کر لی ہے اور یہ بچہ اسی شادی کا نتیجہ ہے۔

میں اگست ۱۹۸۸ء میں فیصل آباد سے تبدیل ہو کر راولپنڈی چلا گیا۔ وہیں مجھے ان کی وفات کی افسوسناک اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب میں نے اس کتاب پر کام شروع کیا تو استاذی المکرّم حمید احمد چوہدری سے جرمنی میں مقیم سابق طلبائے تعلیم الاسلام کالج کے کوائف حاصل کئے۔ اس فہرست میں ایک نام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بُھٹّہ کا بھی تھا۔ ان سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں، ان کا لمبا عرصہ جماعتی خدمت میں گزرا ہے اور انہوں نے اپنے حالاتِ زندگی بھی قلمبند کر رکھے ہیں جو ''شکرانِ نعمت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جو لوگ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ کتاب لکھنا (خواہ وہ اپنی سوانح عمری ہی کیوں نہ ہو) بچوں کا کھیل نہیں ہے اور یہ کام صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے علم و ادب سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ محنت اور مسلسل محنت کی عادت ہو۔ اس لحاظ سے مجھے موصوف کے ساتھ بات کر کے بے حد خوشی ہوئی۔

ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ فضل کریم بُھٹّہ نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے اور فی الاصل ضلع لدھیانہ کے ایک گاؤں، رام گڑھ سرداراں کے رہنے والے ہیں لیکن پچھلی دو دہائیوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ وہ ۱۹۵۱ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور دو سال بعد ایف ایس سی کر کے یہاں سے نکلے۔ انہوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا اور پھر ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی پہلی پوسٹنگ ریلوے ہسپتال، احمد وال میں ہوئی۔ یاد رہے کہ احمد وال کوئٹہ زاہدان سیکشن پر ایک چھوٹا سا سٹیشن ہے جہاں وہ دو سال رہے۔ ان کے اگلے سات سال وزیر آباد اور دو سال کندیاں میں گزرے۔ اسی زمانے میں انہوں نے نصرت جہاں لیپ فاورڈ پروگرام کے تحت زندگی وقف کر دی چنانچہ انہیں

نائیجیریا بھجوایا گیا جہاں وہ اِکارے، اجی بواُوڈے اور کانو میں طبی خدمات بجالاتے رہے۔ وہ اٹھارہ سال نائیجیریا میں رہنے کے بعد جرمنی منتقل ہوگئے۔

ڈاکٹر بُھٹہ نے ازراہِ مہربانی مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ''شکرانِ نعمت'' کا ایک نسخہ مجھے ارسال فرمائیں گے۔ چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک ٹیلیفون کال موصول ہوئی۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف عبدالمصوّر رجبار کے نام سے کرایا اور بتایا کہ وہ ڈاکٹر بُھٹہ کے بھتیجے ہیں، لاہور میں مقیم ہیں اور مجھے ان کی کتاب پہنچانا چاہتے ہیں۔ میرا ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد انہوں نے یہ کتاب مجھے اسی روز بھجوادی۔ آرٹ پیپر پر جرمنی سے چھپی ہوئی اس کتاب میں فاضل مصنف نے تعلیم الاسلام کالج کے زمانے کے کچھ حالات و واقعات بھی بیان کئے ہیں جو موضوع کی مناسبت سے ذیل میں نقل کئے جا رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے تو میں تکلّف اور تصنّع سے پاک اس سادہ اور ستھرے دینی ماحول کا ذکر کروں گا جو اس کالج میں میسر تھا۔ کوئی شور وغوغا تھا نہ سخت کلامی۔ کوئی لڑائی جھگڑا تھا نہ باہمی رنجش و کدورت، بس پیار و محبت سے معمور اور سکون وطمانیت سے بھرپور ہنستی مسکراتی سی فضا تھی۔ اس میں ایک طرف شُستہ مذاق، ادبی چٹکلے، شعر و شاعری اور لطائف اگر خوشیاں بکھیر رہے تھے تو دوسری طرف صبح کی تلاوت، پنج وقتہ ندا، باجماعت نماز اور قرآن و حدیث کے درس اس میں تقدّس کا رنگ بھر رہے تھے۔ چوہدری محمد علی اور صوفی بشارت الرحمٰن ایسے بزرگوں کا مربیانہ سلوک ایک نعمتِ عظمیٰ سے کم نہ تھا۔ جن سینئر طلبہ کی رہنمائی اور نگرانی شامل حال رہی اُن میں سمیع اللہ سیال، چودھری حمید اللہ، مبارک مصلح الدین، بشیر احمد رفیق اور رفیق احمد ثاقب شامل ہیں۔''

موصوف اپنے پرنسپل، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شفقت و محبت کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انہیں جب کوئی مشکل پیش آتی وہ سیدھے میاں صاحب کے پاس جا کر بیان کردیتے اور میاں صاحب ان کی مدد کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیتے۔ وہ بتاتے ہیں:

''ایک روز ہاکی ٹیم کے کیپٹن نے نوٹس لگایا کہ آج فلاں کالج کے ساتھ میچ ہے۔ سب کھلاڑی تین بجے وہاں پہنچ جائیں۔ میں نے کیپٹن سے کہا کہ آج بعد دوپہر میرا پریکٹیکل ہے۔ تین بجے نہ آسکوں گا۔ کچھ دیر ہوجائے گی۔ اس نے سختی سے کہا کہ نہیں نہیں پورے تین بجے پہنچنا ہوگا۔ میں پریشان ہوکر پرنسپل صاحب کے پاس چلا گیا اور جا کر اپنی مشکل بیان کردی۔

آپ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا لیا۔ اس پر لکھا ''عبدالرحمٰن آج پریکٹیکل کریں گے'' اور وہ کاغذ مجھے دے دیا اور پھر جلد ہی وہ ٹکڑا واپس لے کر میرے نام سے پہلے ''عزیزم'' کا لفظ لکھا اور پھر مجھے دے دیا۔ میں نے وہ چٹ جا کر کیپٹن کو دے دی۔ ہوسٹل کے کمرۂ نماز میں جب نماز ظہر ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ پرنسپل صاحب پچھلی صف میں عین میرے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ نماز کے بعد میں نے سلام کیا تو آپ نے آہستہ سے مجھ سے کہا: تمہارا کیپٹن آیا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کو کہہ دیں کہ پریکٹیکل کے بعد آجائے۔ اب تم پریکٹیکل ختم کرکے چلے جانا۔''

وہ بتاتے ہیں: ''عام طور پر تو میں ٹوپی ہی پہنتا تھا لیکن انارکلی سے میں نے ایک ہَیٹ بھی خرید لیا تھا۔ کبھی تیز دھوپ میں نکلنا پڑتا تو میں وہ سر پر رکھ لیتا۔ ایک روز بعد دوپہر سخت دھوپ تھی۔ میں کالج سے باہر لیٹر بکس میں خط ڈالنے نکلا تو ہَیٹ سر پر رکھ لیا۔ کالج بند تھا اور ہر طرف خاموشی تھی۔ گیٹ کے قریب پہنچا تو گیٹ کیپر، شادی نے روک کر ایک طرف اشارہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو جنید ہاشمی بلا رہے تھے۔ میں گیا تو انہوں نے دفتر کی طرف اشارہ کر کے کہا: آپ کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ میں سخت گھبرایا۔ ہَیٹ کو ہاتھ میں پکڑے میں اندر گیا۔ سلام کر کے کھڑا رہا۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے دیکھا اور مجھ سے پوچھا: تمہیں حضرت مسیح موعود سے کتنی محبت ہے؟ میں نے کچھ سوچ کر عرض کی: جی اس کا تو اندازہ مشکل ہے۔ آپ نے فرمایا: حضور کو یہ ہَیٹ کا پہننا پسند نہ تھا۔ میں نے وضاحتاً عرض کی: جی میں اس کو عام طور پر نہیں پہنتا۔ بس کبھی دھوپ تیز ہو تو سر پر رکھ لیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ٹوپی سے بھی دھوپ سے بچا جا سکتا ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی نہیں پہنوں گا۔''

ڈاکٹر بُھٹہ کے بیان کردہ ایک اور واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میاں صاحب اپنے شاگردوں کے آرام و آسائش کا کتنا خیال رکھتے تھے، خاص طور پر ان کی بیماری کے دوران۔ وہ کہتے ہیں: ''میں ایک دفعہ بیمار ہوگیا۔ ہوسٹل کے ڈاکٹر سے افاقہ نہ ہوا۔ دو دن بعد مجھے سِک روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ پرنسپل صاحب مجھے دیکھنے آئے۔ پھر ایک سپیشلسٹ کو بلایا گیا۔ تیسرے روز وہی ڈاکٹر صاحب پھر مجھے دیکھنے آئے۔ اُس کے علاج سے میں ٹھیک ہوگیا۔

اچانک میرے والد صاحب مجھے دیکھنے آگئے۔ شاید ان کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ ہم دونوں پرنسپل صاحب سے دفتر میں ملے۔ والد صاحب نے شکریہ ادا کیا اور میرے علاج کے اخراجات کی ادائیگی کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا: نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ کالج کا میڈیکل فنڈ خدا کے فضل سے اچھا سٹرونگ ہے۔ بعد میں جب میں نے کنگ ایڈورڈ کالج میں داخلہ لیا تو میں نے ان سپیشلسٹ ڈاکٹر صاحب کو پہچان لیا۔ وہ ہمارے پروفیسر آف میڈیسن، ڈاکٹر پیرزادہ تھے۔''

تعلیم الاسلام کالج کا ماحول بے حد سادہ تھا اور راقم الحروف کے زمانۂ تعلیم میں بھی طلبہ شلوار قمیص یا کھڑے پاجامے میں کالج آجایا کرتے تھے البتہ لکیر دار پاجامہ جو ایک زمانے میں نائٹ سوٹ کا حصہ سمجھا جاتا تھا میں کالج آنا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بُھٹہ بتاتے ہیں: ''کالج لائف شروع ہوئے ایک دو ماہ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا پاجامہ پہن کر کالج آیا ہے۔ بعد دوپہر فزکس کا پریکٹیکل تھا۔ میں بھی پاجامہ پہن کر چلا گیا۔ خان نصیر خان صاحب دوسرے لڑکوں کو دیکھتے، ہدایات دیتے آہستہ آہستہ میرے پاس آئے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے چٹکی لی اور میرے کان میں کہا: یہ کیا پہن کر آگئے ہو؟ میں نے آہستہ سے جواباً کہا: یہ لڑکا بھی تو پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔ خان صاحب نے کہا: ارے اس کا تو سفید ہے۔ بہت شرمسار ہوا۔ میرا پاجامہ دھاری دار تھا۔''

پروفیسر نصیر احمد خان کی بات چل نکلی ہے تو ڈاکٹر بُھٹہ مزید بتاتے ہیں: ''فرسٹ ایئر کے ان ہی ابتدائی ایام کی بات ہے کہ فزکس کی کلاس میں میں اوپر جا کر بیٹھا تھا۔ ایک لڑکے نے مجھے چھیڑا اور میں نے بھی اس کو کہنی

مار دی۔ خان نصیر خان صاحب نے مجھے دیکھ لیا۔ مجھے بلایا۔ میں آہستہ آہستہ اتر کر کھڑا ہو گیا۔ خان صاحب نے کہا: ادھر آؤ میرے پاس۔ میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی میں نے اپنا ہاتھ اپنے بائیں رخسار پر رکھ لیا۔ خان صاحب فوراً بولے: نہیں نہیں یہ سکول نہیں۔ کالج میں ہم مارتے نہیں۔ میرے ہاتھ کو پکڑ کر انہوں نے نیچے کیا اور کان کی لو کو پکڑ کر آہستہ سے مسلا اور وارننگ دی۔ بعد میں لڑکے مجھے یہ کہہ کر چھیڑتے: کالج میں ہم مارتے نہیں۔ صرف کان کھینچتے ہیں۔''

۱۹۵۳ء کے فسادات نے تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ کے معمولات یکسر بدل کر رکھ دیئے اور پڑھائی کی طرف ان کی توجہ نہ رہی جس کی وجہ سے امتحان میں بہت اچھے نمبروں کی اُمید ختم ہو گئی۔ اسی دور کو یاد کرتے ہوئے ڈاکٹر بھٹہ لکھتے ہیں: ''فسادات ختم ہوئے تو امتحان سر پر تھا۔ ان ہنگاموں نے اچھے نمبروں کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی تھی۔ اب تو پاس ہونا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ مستقبل سے متعلق سارے خواب ٹوٹتے معلوم ہوتے تھے۔ اب امتحان کیا دینا تھا بس لاٹری کھیلنے والی بات تھی۔ حضرت مصلح موعود کی خدمت میں گاہے گاہے میں دعا کے لیے لکھتا رہتا تھا۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں اپنی ساری خامیاں اور خدشات لکھ کر میں نے حضور کی خدمت میں دعا کی درخواست کی۔ امتحان سے چند دن پہلے جوابی پوسٹ کارڈ ملا۔ لکھا تھا: حضور نے دعا کی ہے اور فرمایا ہے: میرا خدا تمہارے ساتھ ہو۔''

فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ میں نے حضور کی قبولیتِ دعا کا معجزہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ''امتحان دیا۔ ریزلٹ آیا تو میں خدا کے فضل سے اپنے ......گروپ میں اول تھا۔ صرف ایک میری ہی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ مجھے دو سال کے لیے سرکاری وظیفہ بھی ملا اور کِنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ بھی۔ حضرت مصلح موعود کے خدا نے مجھے میری امیدوں سے بڑھ کر نواز دیا تھا۔ میری لاج رکھ لی تھی۔''

ڈاکٹر بھٹہ کے بعد اب کچھ باتیں چوہدری حمید نصر اللہ کے بارے میں جن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ چوہدری محمد عبداللہ خان کے صاحبزادے اور چوہدری محمد ظفر اللہ خان کے داماد تھے اور کم و بیش بتیس سال جماعت احمدیہ لاہور کے امیر رہے۔ نفیس انسان تھے اور ماشاء اللہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۲ء میں راولپنڈی میں ہوئی۔ ہوا دراصل یوں کہ میرے ایک احمدی رفیقِ کار، ملک محمود احمد کے والدِ بزرگوار، عبدالجلیل عشرت جو اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر سے بطور اکاؤنٹس آفیسر ریٹائر ہوئے تھے اور مخلص احمدیوں میں شمار ہوتے تھے راولپنڈی میں بظاہر ایک معمولی سے آپریشن کے دوران غیر متوقع طور پر انتقال کر گئے۔ میں ان کی وفات پر تعزیت کے لیے ان کے ہاں بیٹھا تھا کہ حمید نصر اللہ تشریف لے آئے۔ اگرچہ یہ ایک مختصر ملاقات تھی لیکن میں ان کے حسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔ اس کے بعد تو ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اپنے ایک رفیقِ کار، افتخار باجوہ کے ہاں ایک سے زیادہ بار کھانوں پر اور کئی بار خود ان کے اپنے دولت خانہ پر بھی۔ وہ ہمیشہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور میرے ساتھ محبت کا برتاؤ کیا۔

حمید نصر اللہ تعلیم الاسلام کالج، لاہور کے اولڈ بوائے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایف اے کرنے

کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں آئے تھے لیکن ان دو سالوں کی بہت سی خوشگوار یادیں ان کے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھیں جنہیں وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے شیئر کرتے رہتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی کئی مرتبہ اس موضوع پر ان کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا اور آج میں یہی باتیں آپ سے شیئر کرنے جا رہا ہوں۔

وہ بتایا کرتے تھے: قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں کی بات ہے۔ میں اور میرے چھوٹے بھائی، ادریس نصر اللہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایف اے کر رہے تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے اپنے ایک خطبۂ جمعہ میں بعض خوش حال گھرانوں کے احمدی نوجوانوں میں حصولِ تعلیم کے لیے لاہور کے بعض دیگر کالجز کو تعلیم الاسلام کالج پر ترجیح دینے کے میلان کی حوصلہ شکنی فرمائی۔ ہم دونوں نے بھی یہ خطبہ سنا اور ہمیں محسوس ہوا گویا حضور کے مخاطب ہم ہی ہوں چنانچہ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ایف اے کے بعد مزید پڑھائی تعلیم الاسلام کالج میں کریں گے اور یہی ہم نے کیا۔ ہم نے ایف اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ الحمدللہ! ہم میں سے کسی کو بعد میں اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا۔

تعلیم الاسلام کالج میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران موصوف کو صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے علاوہ چوہدری محمد علی، صوفی بشارت الرحمٰن، اخوند عبدالقادر اور کئی دوسرے پروفیسروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ان سب کی شفقت سے وافر حصہ پایا چنانچہ ان کی یادوں کا گلشن ان سب پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اگرچہ یہ تمام بزرگان حمید نصر اللہ کی زندگی میں وفات پا چکے تھے تاہم وہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے تابناک دنوں کو دمِ آخر تک بھلا نہیں پائے۔

وہ اپنے کلاس فیلوز کا ذکر بھی اسی محبت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور بتاتے تھے: تعلیم الاسلام کالج میں میرے کلاس فیلوز میں میرے دو بھائیوں، محمد نصر اللہ اور ادریس نصر اللہ کے علاوہ مرزا خورشید احمد؛ کنور ادریس؛ سی اے رحمٰن؛ سرگودھا کے محمد مشتاق؛ فیض اسلم؛ نواب محمد دین کے بیٹے، محمد خالد؛ عزیز احمد وینس جو بعد میں امریکہ منتقل ہو گئے تھے اور کیپٹن شیر محمد کے صاحبزادے، محمد افضل شامل تھے۔ ہم سب آپس میں گہرے دوست بھی تھے۔

حمید نصر اللہ اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کرتے تھے: ایک بار ایک لڑکا اپنے گھر سے دیسی گھی لے آیا۔ باقی لڑکوں کو کسی طرح اس بات کا پتا چل گیا چنانچہ انہوں نے گھی چرا لیا اور اس کے پراٹھے بنوا کر کھانے لگے۔ اس لڑکے نے پرنسپل کے پاس شکایت کر دی۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو اپنے ذرائع سے حاصل ہونیوالی معلومات کی بنا پر بعض لڑکوں پر شک تھا جن میں سے ایک سی اے رحمٰن بھی تھے۔ ان ہی دنوں ایک بار جب میاں صاحب گھر جانے کے لیے اپنے دفتر سے باہر نکلے تو آپ کی نظر سی اے رحمٰن پر پڑ گئی۔ آپ نے انہیں بلایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور راستہ میں اس چوری کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جس دوران سی اے رحمٰن نے تسلیم کر لیا کہ وہ اس شرارت میں شامل تھے۔ اتنی دیر میں میاں صاحب اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ آپ نے چائے منگوائی اور پھر سی اے رحمٰن سے تقاضا کیا کہ وہ اس شرارت میں ملوث باقی لڑکوں کے نام بھی بتائیں۔ سی اے رحمٰن نے جواب دیا کہ وہ اپنی حد تک تو سچ بولنے پر مجبور تھے لیکن باقی لڑکوں کے

نام بتانے کے ہرگز پابند نہیں ہیں چنانچہ انہوں نے باقیوں کے نام نہیں بتائے جس پر میاں صاحب نے ہمارے پورے گروپ کو جرمانہ کر دیا اور یوں یہ جھگڑا ختم ہوا۔

اس واقعے کے بہت عرصہ بعد ایک بار صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بحیثیت خلیفۃ المسیح الثّالث کراچی تشریف لائے۔ غالباً اس حیثیت میں آپ کا یہ کراچی کا پہلا دورہ تھا۔ جماعت نے آپ کی رہائش کا انتظام کسی کوٹھی میں کر رکھا تھا۔ حمید نصر اللہ بتایا کرتے تھے: میں بھی ان دنوں کراچی میں تھا اور یہ اتفاقِ محض تھا کہ میں نے کراچی کے امیر جماعت، چوہدری احمد مختار اور بعض دیگر عہدیداروں کو اس کوٹھی کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ مجھے حضور کی آمد کا علم نہ تھا چنانچہ جب مجھے بتایا گیا کہ وہ حضور سے ملاقات کے لیے جا رہے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ حضور سے ملاقات ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ مصافحہ ہوگا، رسمی حال احوال پوچھا جائے گا اور پھر مجھے اجازت مل جائے گی لیکن حضور نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اسی دوران آپ نے کراچی کی جماعت کے بعض افراد کو بھی کمرے میں موجود کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ جب عام ملاقات ختم ہوگئی تو حضور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے: میں نے آپ لوگوں کو اس لیے روکا ہے کہ میں آپ کو ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ حمید نصر اللہ کہا کرتے تھے: میں سمجھ نہ سکا کہ حضور اس وقت کون سا واقعہ بیان فرمائیں گے تاہم جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ حضور کا ارادہ گھی کی چوری والا واقعہ بیان کرنے کا ہے۔ میں کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا لیکن حضور نے پورا واقعہ سنانے کے بعد یہ کہہ کر کہ میں اس دن سے جانتا ہوں کہ یہ سب لوگ انتہائی مخلص احمدی ہیں میرا مان رکھ لیا۔ مطیع و فرمانبردار تو میں پہلے دن سے آپ کا تھا، اس دن سے میں آپ کا غلامِ بے دام ہو گیا۔

چوہدری محمد علی کا ذکر آ جاتا تو حمید نصر اللہ کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور وہ کہا کرتے تھے: میں نے چوہدری محمد علی جتنا شفیق شخص اور کوئی نہیں دیکھا۔ اگرچہ میں ان کا براہِ راست شاگرد نہیں رہا تاہم انہوں نے مجھے ہمیشہ اتنا پیار دیا کہ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

وہ بتاتے تھے: چوہدری محمد علی سے ہماری ملاقات تو قادیان کے زمانے سے تھی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جب ہم ڈلہوزی میں تھے تو موصوف تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ کا ایک گروپ لے کر ہائیکنگ کے لیے وہاں آئے۔ انہوں نے پانگی جانا تھا۔ میرے ایک ماموں، منصور سیال بھی اس گروپ میں شامل تھے۔ انہوں نے میرے بڑے بھائی، محمد نصر اللہ کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ محمد نصر اللہ نے والدہ سے اجازت طلب کی تو انہوں نے اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا جس پر چوہدری محمد علی میرے بھائی کو ہمراہ لے کر چلے گئے۔ ان دنوں میرے والدِ بزرگوار ٹاٹا نگر میں ہوتے تھے۔ بھائی کے جانے کے بعد میری والدہ نے سوچا کہ میں نے باپ کی اجازت کے بغیر ہی بیٹے کو ہائیکنگ پر بھجوا دیا ہے لیکن اگر خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو وہ والد صاحب کو کیا جواب دیں گی۔ یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئیں اور اصرار کرنے لگیں کہ محمد نصر اللہ کو واپس بلایا جائے۔ ڈلہوزی کے بعد چوہدری محمد علی اور ان کے ساتھیوں کی اگلی منزل کھجیار تھی۔ اس زمانے میں فون کا آج والا سلسلہ تو تھا نہیں چنانچہ ایک دو آدمیوں کو دوڑایا گیا۔ وہ محمد نصر اللہ کو واپس لے کر آئے تو میری والدہ کو سکون آیا۔

حمید نصر اللہ کو فخر ہے کہ چوہدری محمد علی کے ساتھ اس زمانے میں قائم ہونے والا تعلقِ محبت ساری زندگی قائم رہا۔ جب تعلیم الاسلام کالج قومیا لیا گیا تو موصوف کا تبادلہ ایف سی کالج لاہور میں ہو گیا۔ انہیں رہائش کی دقّت تھی۔ اس وقت چوہدری ظفر اللہ خان زندہ تھے۔ حمید نصر اللہ کی روایت کے مطابق: جب ہمیں پتا چلا تو فوراً انیکسی کا ایک کمرہ درست کروایا گیا اور پیشکش کی گئی کہ چوہدری محمد علی جتنا عرصہ چاہیں یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ وہ اس پیشکش کو قبول کرنے میں ابتداءً متذبذب تھے لیکن اصرار پر وہ ہمارے ہاں منتقل ہونے پر آمادہ ہو گئے اور جتنا عرصہ وہ ایف سی کالج میں رہے ان کا قیام یہیں رہا۔ ہم انہیں صبح کا ناشتہ پیش کرتے اور رات کا کھانا بھی۔ دوپہر کا کھانا وہ کالج سے کھا کر آتے تھے۔ جتنا عرصہ رہے شام کو ان کے ساتھ خوب مجلس جمتی اور گزرے زمانے کی باتیں ہوتی رہتیں۔

ایک بار چوہدری محمد علی کی رقیق القلبی کا ذکر کرتے ہوئے چوہدری حمید نصر اللہ نے مجھے بتایا: میرا ایک کزن منور نصر اللہ جو عمر میں مجھ سے کچھ چھوٹا ہے بھی تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتا اور ہوسٹل میں مقیم تھا۔ ہوسٹل کے اپنے قواعد و ضوابط تھے اور رات کو دیر تک باہر رہنے پر پابندی تھی۔ منور شام کو باہر چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ کسی نے اس کی شکایت کر دی کہ وہ ہر روز سینما دیکھنے جاتا ہے چنانچہ چوہدری محمد علی نے اسے بلایا اور ہوسٹل کے قواعد و ضوابط دوبارہ اس کے گوش گزار کرنے کے بعد بطور سزا اسے ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ وہ رات بھر اندر رہا۔ صبح ہوئی تو چوہدری صاحب نے خود کنڈی کھولی۔ وہ توقع کر رہے تھے کہ منور اس قید سے نجات پانے پر چھلانگیں مارتا ہوا باہر نکلے گا لیکن ادھر تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔ منور نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی اور اس کی طرف سے چوہدری صاحب کے کسی سوال کا جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ قدرتی طور پر تشویش ہوئی کہ خدانخواستہ منور نے اپنے آپ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچا لیا۔ فوراً ایک مستری بلایا گیا جس نے کسی طرح دروازہ توڑا تو منور ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ چوہدری صاحب نے اس سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ وہ ان کے لیے کیوں پریشانی کا باعث بنا تھا۔ اس نے جواباً کہا: ''سر! آپ نے کل میری اس قدر بے عزتی کی ہے کہ میں ساری رات سو نہیں سکا اور مجھ پر ایک ایسا الزام لگا دیا گیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ میں تو اپنے دوستوں کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہا۔ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں فلم دیکھنے کے لیے جاتا ہوں؟ اگر آپ ہر ایرے غیرے کی شکایت پر کان دھرنا شروع کر دیں گے تو پھر ہوسٹل اور اس کالج کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

''اچھا! اگر تم فلم دیکھنے نہیں جاتے تو جاتے کہاں ہو؟'' چوہدری محمد علی نے وضاحت چاہی۔

''آپ کو پتا ہے میں اپنے گھر سے دور ہوں۔ شام کو پریشان ہوتا ہوں تو باہر نکل جاتا ہوں۔ ادھر ادھر گھومتا رہتا ہوں۔ اب میں نے ایک قبرستان تاڑ لیا ہے۔ وہاں جا کر ایک تکیے پر بیٹھا رہتا ہوں۔ مجھے بڑا سکون ملتا ہے وہاں پر۔ بس اتنی سی بات ہے جسے افسانہ بنا دیا گیا ہے۔''

حمید نصر اللہ کے بیان کے مطابق چوہدری صاحب نے یہ بات سنی تو آبدیدہ ہو گئے اور منور سے معذرت کرنے لگے لیکن منور تھا کہ رام ہو ہی نہیں رہا تھا۔ وہ یہی تکرار کئے جا رہا تھا کہ زیادتی کرنے کے بعد

معذرت طلب کرنے کا کیا فائدہ۔ منور کو شعر و شاعری کا بھی ٹھرک تھا۔ اس نے چوہدری صاحب کو اپنے کچھ شعر بھی سنائے جن میں اس واقعے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ بالآخر چوہدری صاحب نے ہوسٹل کے چوکیدار کو بلایا اور اسے کہا: ''آج سے منور کے باہر جانے اور واپس آنے کے اوقات پر پابندی ختم۔ وہ جب جانا چاہے جا سکتا ہے اور جب آنا چاہے آ سکتا ہے، اسے روکنا نہیں ہے۔''

بتایا جاتا ہے کہ منور پر چوہدری صاحب کی محبت کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنی حرکتوں سے توبہ کر لی اور ہوسٹل کے قواعد و ضوابط کی پاسداری کرنے لگا۔

کالج میں قیام کے دوران حمید نصر اللہ کو اخوند عبدالقادر سے انگریزی پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ بتایا کرتے تھے: اخوند صاحب بہت ہی قابل استاد اور انتہائی اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔ انگریزی زبان تو گویا ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ کئی بار کہا کرتے تھے کہ اگر میں کوئی بات کرتے کرتے رک جاتا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ لیا جائے کہ اس سے اگلا لفظ میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی موزوں الفاظ میرے سامنے دست بستہ آ کھڑے ہوتے ہیں اور مجھے ان میں سے کسی مناسب لفظ کے انتخاب میں دیر لگ جاتی ہے۔ شاگردوں سے بہت محبت کرنے والے استاد تھے۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے۔

حمید نصر اللہ بتایا کرتے تھے: مجھے یاد ہے جب بی اے کا داخلہ بھجوانے کا وقت آیا تو کئی لڑکوں کی حاضریاں شارٹ تھیں۔ لڑکے اخوند صاحب کے پاس گئے اور عرض کی کہ ہماری مدد کا کوئی راستہ نکالا جائے۔ اخوند صاحب نے معذرت کی کہ وہ ان کی کسی مدد سے قاصر ہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے لگے ہوئے ''اے'' (برائے ایبسینٹ) کو ''پی'' (برائے پریزنٹ) میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے حاضری رجسٹر منگوا کر ان طلبہ کو دکھایا اور بتایا کہ وہ اس میں کسی قسم کی تحریف کا جرم نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے طلبہ سے اجازت لی اور خود غالباً نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ ایک طالب علم کو شرارت سوجھی چنانچہ اس نے اخوند صاحب کے جاتے ہی اپنے قلم سے بہت سے As کو Ps میں اور کچھ Ps کو As میں بدل دیا جس سے کنفیوژن پیدا ہو گیا اور یقین سے کہنا مشکل ہو گیا کہ کس طالبعلم کی کتنی حاضریاں ہیں۔

اخوند عبدالقادر نے واپسی پر یہ رجسٹر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ شرارت ان ہی لڑکوں کی ہے۔ چاہتے تو ان سب کے خلاف میاں صاحب کے ذریعے تادیبی کارروائی کرا دیتے تاہم انہوں نے طلبہ کو سخت سست کہنے کی بجائے اگلے روز کلاس روم میں آ کر اعلان کیا کہ وہ آج سے حاضری نہیں لیا کریں گے کیونکہ کسی وجہ سے حاضریوں کا سارا ریکارڈ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے حاضری رجسٹر پرے پھینک دیا اور کلاس کو یہ خوشخبری سنائی کہ میرے مضمون میں حاضریوں کے شارٹ ہونے کی وجہ سے کسی کا داخلہ نہیں روکا جائے گا۔

حمید نصر اللہ کو صوفی بشارت الرحمٰن کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔ وہ بتاتے تھے: پہلا دن تھا۔ باقی سب لڑکوں نے شلواریں قمیصیں پہن رکھی تھیں البتہ ایک طالب علم پینٹ قمیص میں ملبوس تھا۔ صوفی صاحب مغربی لباس پسند نہیں فرماتے تھے چنانچہ انہوں نے اس لڑکے کو کھڑا کر کے اس کی سرزنش کی اور کہا کہ ہمارے طلبہ

کو فرنگیوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس طالب علم کو کلاس سے باہر نکال دیا اور وارننگ دی کہ جب تک وہ شلوار قمیص میں کالج نہیں آئے گا، اسے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وہ لڑکا باہر نکل گیا اور پورا سال کلاس میں نہیں آیا۔ جب بی اے کے امتحان کے لیے داخلہ بھجوانے کا وقت آیا تو اس کی حاضری یونیورسٹی کے معیار پر پوری نہ اترتی تھی لیکن صوفی صاحب یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس لڑکے کا سال ضائع ہو جائے۔ الغرض دونوں میں مذاکرات شروع ہو گئے۔ وہ لڑکا اس سے پہلے خان ارجمند خان سے عربی پڑھ چکا تھا اور بی اے کے کورس پر اسے بہت حد تک دسترس حاصل تھی چنانچہ طے یہ ہوا کہ لڑکا صوفی صاحب کو ٹیکسٹ بک کا ایک صفحہ با ترجمہ پڑھ کر سنائے گا تو اس کی ایک حاضری لگا دی جائے گی۔ انہوں نے پہلے دس بارہ صفحے سنے اور مطمئن ہو گئے کہ اس کا کورس پر دسترس کا دعویٰ غلط نہیں۔ پھر وہ کتاب کے پچاسویں صفحے پر چلے گئے اور جب اس نے یہ صفحہ بھی پورے طور پر پڑھ کر اس کا ترجمہ سنا دیا تو صوفی صاحب رام ہو گئے اور انہوں نے حاضریاں پوری کر کے اس کا داخلہ بھجوا دیا۔

عام تاثر یہ تھا کہ صوفی بشارت الرحمٰن کی طبیعت میں غصہ ہے اور وہ اپنے اصولوں پر کسی طور سمجھوتہ نہیں کر سکتے تاہم حمید نصر اللہ کے مشاہدے کے مطابق وہ رقیق القلب تھے اور طلبہ کے انتہائی ہمدرد۔ وہ انہیں اپنے رنگ میں رنگنا تو چاہتے تھے لیکن جہاں محسوس کرتے کہ انہیں ان کی محبت و شفقت کی ضرورت ہے وہ اس معاملے میں بے انتہا فیاضی کا مظاہرہ کرتے۔

جماعت کے اس مخلص خادم سے کالج کے زمانے کا کوئی بہت دلچسپ واقعہ سنانے کی فرمائش کی جاتی تو وہ بتاتے: ایک بار چوہدری اسداللہ خان جو ایک مدت تک جماعت احمدیہ لاہور کے امیر رہے کالج میں مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیے گئے۔ اگر میری یادداشت صحیح کام کر رہی ہے تو انہوں نے صبح کی اسمبلی میں ہمیں خطاب کیا اور جب کسی وجہ سے اپنی تقریر میں کچھ توقف کیا تو ایک لڑکے نے کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ اپنی جوانی میں کلائی پکڑا کرتے تھے اور کوئی مشکل سے ہی اس مقابلے میں آپ سے جیتتا تھا۔ چوہدری صاحب نے اس وقت تو اس لڑکے کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرا دیا لیکن تقریر ختم کرنے کے بعد انہوں نے اپنا کوٹ اتار کر پرے رکھا، بازو اُڑس لیے، اسے آواز دے کر اپنی طرف بلایا اور کہا: آؤ! کلائی پکڑتے ہیں۔ دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ طلبہ اردگرد کھڑے ہو گئے۔ کلائی پکڑی گئی اور اپنی نوجوانی کے باوجود وہ طالب علم چوہدری نصر اللہ خان سے اپنی کلائی نہ چھڑا سکا۔

حمید نصر اللہ یہ بھی بتایا کرتے تھے کہ ایک بار کسی بدخواہ نے ان کے خلاف کالج انتظامیہ کے پاس ایک ایسی بے بنیاد شکایت کر دی جس کے نتیجے میں انہیں اور ادریس نصر اللہ کو کالج سے نکال دیے جانے کا احتمال پیدا ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں: آپ کو پتا ہے اگر کالج سے کسی سٹوڈنٹ کو رسٹیکیٹ کر دیا جائے تو وہ سزا کی مدت کے دوران کسی اور کالج میں بھی داخلہ نہیں لے سکتا۔ ہم گھبرائے ہوئے تھے چنانچہ ہم دونوں قاضی محمد اسلم کے پاس چلے گئے جو اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسل تھے۔ وہ ہم پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے ہماری رام کہانی سنی تو

کچھ کہے بغیر گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو اسے حکم دیا کہ وہ داخلہ فارم لے کر آئے۔ فارم آ گئے تو قاضی صاحب نے کہا: انہیں پُر کرو۔ ہم نے فارم پُر کر دیئے۔ تب انہوں نے ہم سے دوبارہ پوچھا کہ ہمیں رسٹیکیٹ کرنے کا فیصلہ ابھی ہوا تو نہیں ہے اور ہماری تصدیق پر ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ آج سے آپ دونوں کا داخلہ گورنمنٹ کالج میں ہو گیا ہے۔ آپ یہاں کلاسز اٹینڈ کرنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف جب اس شکایت پر انکوائری ہوئی تو اسے بالکل بے بنیاد پایا گیا چنانچہ ہماری پڑھائی تعلیم الاسلام کالج ہی میں جاری رہی۔

موصوف فرماتے تھے: قاضی محمد اسلم کا ذکر آیا ہے تو میں یہ بتاتا چلوں کہ میں نے اس عظیم شخصیت کی ہمیشہ دل سے عزت کی ہے اور جب وہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور آ گئے تو میں ہر تیسرے دن ان سے ملنے کے لیے ان کی کوٹھی جایا کرتا تھا۔ قاضی صاحب مجھے اپنے پاس پا کر بہت خوش ہوتے اور ہماری خوش گپیاں بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتیں۔ قاضی صاحب کی اہلیہ نے ایک بار مجھ سے شکوہ کیا کہ یوں تو قاضی صاحب گھر میں ہمہ وقت خاموش رہتے ہیں لیکن آپ کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتے ہیں۔ میں انہیں اس کی کیا وجہ بتاتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ ملاقات کو مسیحا و خضر کے ساتھ ملاقات سے بہتر قرار دیا کرتے تھے۔

اگرچہ حمید نصر اللہ کی بیان کردہ تعلیم الاسلام کالج میں اپنے قیام کی اور بھی کئی دلچسپ یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں لیکن ان کا بیان کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے اب میں آپ کو کنور ادریس کے پاس لیے چلتا ہوں جو چوہدری عزیز احمد، سیشن جج کے صاحبزادے ہیں اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ کیا آپ کو پتا ہے کہ میں نے پہلی بار ان کا ذکر کب اور کس سے سنا تھا؟

چوہدری محمد علی کے ساتھ میل جول کے ابتدائی دنوں کی بات ہے میں نے محسوس کیا کہ موصوف کی گفتگو میں کالج کے ایک سابق طالب علم، کنور ادریس کا بہت ذکر آتا ہے۔ آہستہ آہستہ عقدہ کھلا کہ وہ کالج کے ان ہونہار طلبہ میں سے تھے جنہوں نے سنٹرل سُپیریئر سروسز آف پاکستان کا امتحان دیا تھا اور بفضلہٖ تعالیٰ ملک کی اعلیٰ ترین سروس یعنی سِول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہوئے تھے اور ان کے بار بار ذکر کا مقصد کالج کے باقی طلبہ کو یہ تحریص دلانا تھا کہ اگر وہ محنت کریں اور اس امتحان کے لیے مطلوبہ تیاری کی طرف توجہ دیں تو ان کے لیے بھی ایک تابناک کیریئر کے راستے کھل سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں ''قریۂ جاوداں'' میں عرض کر چکا ہوں چوہدری محمد علی بتایا کرتے تھے کہ ''ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ کالج کے منتخب ہونہار طلبہ کو مقابلے کے امتحان کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے جن طلبہ کا انتخاب کیا گیا ان میں کنور ادریس بھی شامل تھے جو سائنس پڑھ رہے تھے۔ ہم نے اس امتحان کی ضروریات کے مطابق انہیں سائنس چھوڑنے پر آمادہ کر لیا۔ ان کے والد کو خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہوئے اور مجھ سے لڑنے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے کالج کے مین گیٹ پر مجھے آ لیا۔ وہ انتظامیہ کے اس فیصلے پر سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس تشریف لے

گئے تو میں نے پورا واقعہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے گوش گزار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ چونکہ ہم نے ان طلبہ کا انتخاب حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی ہدایت کے پیشِ نظر کیا ہے لہٰذا اس احتجاج کے باوجود ہم کنور ادریس کو سائنس پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہم نے ان طلبہ پر خاص توجہ دی اور کالج سٹاف کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض دیگر قابل اساتذہ سے بھی ان کی کوچنگ کراتے رہے۔ ہم ان کی انگریزی بہتر بنانے کے لیے ان سے انگریزی اخبارات کے ایڈیٹروں کے نام خطوط لکھوایا کرتے تھے اور کچھ عرصہ تو ہم نے کہہ سن کر کنور ادریس کو سِول اینڈ ملٹری گزٹ کے سٹاف پر بھی رکھوا دیا تھا...... جب اس امتحان کا نتیجہ آیا اور کنور ادریس سِول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہو گئے تو ان کے والد ایک بار پھر میرے پاس آئے اور یہ بات تسلیم کی کہ کنور ادریس کے مضامین کی تبدیلی کے لیے کالج انتظامیہ کا فیصلہ ہر لحاظ سے درست تھا۔ پھر وہ اصرار کے ساتھ مجھے عین اس جگہ پر لے گئے جہاں انہوں نے اس فیصلے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور اپنے اس عمل پر اظہارِ ندامت کیا۔''

کنور ادریس نے سِول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہونے کے بعد اپنی ملازمت کا زمانہ کن حیثیات میں گزارا، اس حوالے سے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا میں چھپا ہوا سیّد قاسم محمود کا یہ نوٹ:

''موصوف ۱۹۳۳ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں تِلونڈی عنایت خان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، عزیز احمد سب جج تھے۔ بعد میں سیشن جج بنے۔ ریٹائر ہونے کے بعد لاہور میں وکالت کرتے رہے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم اے (سیاسیات) کی ڈگری لی۔ سِول سروس آف پاکستان کا مقابلہ جاتی امتحان دیا۔ کامیاب ہوئے۔ ایک سال سِول سروس اکیڈمی میں تربیت حاصل کی۔ پہلی تقرری بطور اسسٹنٹ کمشنر کومیلا (مشرقی پاکستان) میں ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں جیمس کالج، کیمبرج سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں کورس کیا۔ چین اور برطانیہ میں مختلف کورس کیے۔ وطن واپسی پر آپ کو قبائلی علاقے مہمند ایجنسی وغیرہ میں مامور کیا گیا جہاں وہ سات سال تک بطور اسسٹنٹ کمشنر، پولیٹیکل ایجنٹ اور چترال کے نابالغ حکمران، سیف الملک کے مشیرِ اعلیٰ کی حیثیت میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں معدنی ذرائع کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۶۷ء میں کراچی آئے اور حکومتِ سندھ کے محکمہ ایکسائز و ٹیکسیشن کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء کے دوران کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے۔ آٹھ سال تک حکومت سندھ میں مختلف محکموں کے سیکرٹری کے طور پر کام کیا۔ ہوم سیکرٹری، سندھ کے طور پر گورنر جنرل (ر) جہاں زیب، جنرل (ر) اقبال اور جنرل (ر) عباسی کے ساتھ کام کیا۔

۱۹۸۱ء میں آپ کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا جہاں مختلف وفاقی وزارتوں میں ایڈیشنل سیکرٹری کی حیثیت میں کام کرتے رہے۔

۱۹۸۵ء میں پھر کراچی آئے اور پاکستان آٹوموبائل کارپوریشن کے سربراہ بنائے گئے۔ ۱۹۸۸ء میں صوبہ سندھ کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں بینکرز اِکویٹی لمیٹڈ کے چیئر مین مامور ہوئے۔

میاں نواز شریف کی وزارتِ عظمیٰ کے پہلے دور میں وزارتِ پیداوار کے سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن چند

ماہ کے بعد انہیں افسر بکارِ خاص لگا دیا گیا۔

۱۹۹۳ء میں نیشنل اِنوسٹمنٹ ٹرسٹ کا چیئرمین بنا کر کراچی بھیج دیا گیا۔ چند ماہ کے بعد سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنا ذاتی کاروبار کرنے لگے۔ نومبر ۱۹۹۶ء میں جب صدر فاروق لغاری نے بے نظیر بھٹو کی حکومت معزول کی اور مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتیں قائم ہوئیں تو ممتاز علی بھٹو، وزیر اعلیٰ سندھ نے آپ کو اپنی کابینہ میں خزانہ، ریونیو، ایکسائز، ٹیکس اور منصوبہ بندی کا نگران وزیر مقرر کیا۔ آپ اس منصب پر فروری ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات تک فائز رہے۔''

بحیثیت ایک سرکاری افسر کنور ادریس کی شہرت کیسی تھی اس کا اندازہ ان کے ایک رفیق کار، تسنیم نورانی کے اس انٹرویو سے لگایا جا سکتا ہے جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے نومبر ۲۰۱۴ء کے شمارہ میں چھپا ہوا ہے۔ تسنیم نورانی نے اردو ڈائجسٹ کے اس سوال کے جواب میں کہ انہیں سِول سروس کا کون سا افسر سب سے زیادہ پسند ہے کہا تھا: ''ہمارے ایک افسر کنور ادریس ہیں۔ ماشاء اللہ حیات ہیں۔ چیف سیکرٹری سندھ رہے اور ڈان میں بہت لکھتے تھے۔ خاموش، مضبوط کردار کے مالک اور مصنوعی تشہیر سے کوسوں دُور! کچھ افسر اپنی پبلسٹی زیادہ کرتے اور حاکموں سے زیادہ بنا کے رکھتے ہیں لیکن سِول سروس کا سرمایہ کنور ادریس جیسے افسر ہیں۔''

تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر موجود ان کے ۱۰ دسمبر ۲۰۰۵ء کے پیغام سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۴ء کے دوران اس کالج کے طالب علم رہے۔ اگرچہ انہوں نے گریجوایشن کالج کے زمانۂ لاہور میں ہی کر لی تھی تاہم انہیں ڈگری کالج کے ربوہ میں پہلے جلسہ تقسیمِ اسناد کے موقع پر ملی۔ انہیں ستمبر ۱۹۵۷ء میں سِول سروس آف پاکستان میں شمولیت اختیار کرنے سے پہلے تین چار ماہ اس کالج میں پڑھانے کا موقع بھی ملا۔ وہ کہتے ہیں: مختصر ہونے کے باوجود تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے وقت نے میری شخصیت سازی میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں اس دور میں کالج کے پرنسپل، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے پولیٹیکل سائنس پڑھنے والا واحد طالب علم تھا اور یوں مجھے انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی شفقت و محبت سے وافر حصہ پانے کا موقع ملا۔ کنور ادریس اپنے دیگر اساتذہ کا ذکر بھی اسی پیار سے کرتے ہیں البتہ بتاتے ہیں کہ جب وہ ۱۹۵۷ء میں تعلیم الاسلام کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے تو اخوند عبدالقادر ریٹائر ہو چکے تھے جب کہ عباس بن عبدالقادر سرکاری ملازمت قبول کر کے ربوہ سے سندھ تشریف لے جا چکے تھے۔

کنور ادریس کالج یونین کے صدر اور المنار کے حصہ انگریزی کے ایڈیٹر رہے۔ وہ اپنے اس زمانے کے دوستوں میں سے دو کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں: سر افتخار ایاز جو اُن کے ساتھ کالج یونین کے سیکرٹری تھے اور افضل ترکی جنہوں نے افتخار ایاز کے مقابلے میں یہ الیکشن ہارا تھا۔

وہ کہتے ہیں: اگرچہ میں نے اس کالج میں صرف چار ماہ پڑھایا تھا اور وہ بھی نصف صدی پہلے لیکن اب بھی کہیں نہ کہیں مجھے اپنا کوئی نہ کوئی شاگرد مل ہی جاتا ہے۔ مدتِ دراز کے بعد پروفیسر پرویز پروازی کے ساتھ

ٹورنٹو میں ملاقات نے مجھے وہ زمانہ یاد دلا دیا جب وہ میرے عزیز شاگردوں میں شامل تھے۔ بیس سال پہلے کی بات ہوگی، میں ایک بار انگلینڈ گیا تو میرے ایک دانت میں اچانک شدید تکلیف شروع ہوگئی۔ اتوار کا دن تھا اور کسی ڈاکٹر کا ملنا آسان نہ تھا۔ میرے میزبان، سی ایم خالد مجھے ڈاکٹر ولی اللہ کے پاس لے گئے جنہوں نے مجھے نہ صرف اس تکلیف سے نجات دلائی بلکہ مجھ سے فیس بھی نہیں لی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میرے شاگرد رہ چکے ہیں لہٰذا مجھ سے فیس وصول نہیں کر سکتے۔ ایسی بے لوث محبت سعادت مند شاگردوں کے علاوہ اور کہاں سے نہیں مل سکتی ہے؟

کنور ادریس اپنے نوٹ کے آخر میں کہتے ہیں: نیشنلائزیشن کے فیصلے نے تعلیم الاسلام کالج کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں آباد ہو جانے والی تعلیم الاسلام کالج کی بارسوخ الیُومنائی کا فرض ہے کہ وہ جماعت کو اس کی واپسی کی پرزور تحریک چلائیں تا کہ اس ادارے کو ڈاکٹر عبدالسلام کے ٹری ایسٹے سنٹر کی طرح پاکستان میں ایک اعلیٰ درجہ کے سائنسی تحقیقی مرکز میں تبدیل کیا جا سکے۔

وہ آج کل کراچی میں مقیم ہیں چنانچہ جب یہ کتاب لکھنے کا موقع پیدا ہوا تو میں نے نواب مولود احمد خاں، امیر جماعت احمدیہ، کراچی کے ذریعہ ان کا فون نمبر حاصل کیا اور ان سے گزارش کی کہ اگر وہ مجھے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے اپنی دنوں پر ایک نوٹ لکھ کر بھجوا سکیں تو میں اسے ان کی مہربانی سمجھوں گا۔ کنور ادریس نے میری یہ درخواست قبول تو کر لی لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود مجھے ان کی طرف سے کوئی ایسا مواد موصول نہیں ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کی وجہ سے اب ان کے لیے اِن یادوں کو مجتمع کرنا آسان نہیں۔ یوں بھی ان کی صحت کمزوری کی طرف مائل ہے جس کی وجہ سے ہم ان کی کسی تازہ تحریر سے محروم رہے جا رہے ہیں لیکن گھبرایئے نہیں، میں آپ کی ملاقات ایک اور احمدی دوست سے کرا دیتا ہوں جو اَب جسٹس (ر) محمد اسلام بھٹی کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق سارچُور سے ہے جو قادیان سے کم و بیش پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور ان کے خاندان میں احمدیت ان کے نانا، چوہدری غلام غوث کے ذریعے آئی جنہوں نے اپنے کسی خواب کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔

اسلام بھٹی تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ ہیں۔ انہوں نے حکومت مغربی پاکستان کے ماتحت سب جج درجہ چہارم کے طور پر اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ ۱۹۷۴ء کی آئینی ترمیم اور ۱۹۸۲ء کے بدنامِ زمانہ آرڈی نینس کے باوجود ترقی کرتے کرتے لاہور ہائی کورٹ کے جج کے رتبہ تک پہنچے اور انہوں نے حلف بھی وہی اٹھایا جو ہائی کورٹ کے باقی جج اٹھاتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''یہ سب کچھ محض خداوند تعالیٰ کے فضل و احسان، حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث و حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی نظرِ کرم اور بزرگانِ سلسلہ اور والدین کی دعاؤں کے طفیل ممکن ہوا۔''

موصوف سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب موصوف ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو ابتداءً انہیں بہاولپور بنچ پر رکھا گیا۔ میں ان دنوں کمشنر انکم ٹیکس، ملتان کے طور پر تعینات تھا چنانچہ میں اس ترقی پر

مبارکباد دینے کے لیے آپ کے پاس خاص طور پر بہاولپور حاضر ہوا تھا اور ہماری ملاقات سرکٹ ہاؤس یا کسی اور ریسٹ ہاؤس میں جہاں ان دنوں موصوف کا قیام تھا ہوئی۔ اس کے بعد بھی موصوف سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ جب ان کی کتاب ''عدالتِ عالیہ تک کا سفر'' کے نام سے شائع ہوئی تو انہوں نے ازراہِ بندہ پروری اس کا ایک نسخہ اس عاجز کو بھی ارسال فرمایا جس کے لیے میں ان کا تہِ دل سے ممنون ہے۔

اسلام بھٹی اب امریکہ منتقل ہو چکے ہیں لیکن پاکستان آتے رہتے ہیں۔ ۲۰۱۶ء کے آغاز میں ایک جمعہ کے موقع پر آپ کو اچانک کڑک ہاؤس میں پا کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اپنی بیگم کے ہمراہ کینٹ ہی میں ظفر شیخ نامی ایک احمدی دوست کے ہاں مقیم ہیں۔ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا لیکن کچھ ہی دیر بعد انہیں فیصل آباد جانا تھا لہٰذا مختصر سی ملاقات پر قناعت کرنا پڑی۔ اس کے بعد اگلی ملاقات ۲۰۱۷ء کے آغاز میں چوہدری حمید نصر اللہ کے جنازے پر ربوہ میں ہوئی۔

ہمارے اس عزیز دوست نے اپنی آپ بیتی میں جو نیا زمانہ پبلیکیشنز نے آج سے کئی سال پہلے شائع کی تھی تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جب وہ اگست ۱۹۵۲ء میں کالج میں داخلہ کے لیے گئے تو ان کے ایک ماموں، عزیز مسعود بھٹی ان کے ہمراہ تھے۔ موصوف انٹرویو کے لیے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے سامنے پیش ہوئے تو آپ نے بہت ساری باتیں ان کے گاؤں کے متعلق دریافت کیں اور جب اسلام بھٹی نے بتایا کہ وہ پری میڈیکل میں داخلہ لینا چاہیے تو آپ نے کہا کہ یہ مناسب نہ ہوگا اور پھر منور چونڈہ، سعید رحمانی اور عبدالغفور زاہد کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ میں نے کچھ بچوں کو مقابلے کے امتحان کے لیے تیار کرنا ہے اس لیے تمہیں میڈیکل میں داخلہ نہ لینے کی نصیحت کرتا ہوں۔ اسلام بھٹی بتاتے ہیں کہ ان کے لیے دوسری آپشن پری انجینئرنگ کی تھی چنانچہ انہوں نے پری انجینئرنگ گروپ میں داخلہ لے لیا مگر کچھ دنوں کے بعد کیمسٹری چھوڑ دی اور اس کی جگہ عربی رکھ لی۔ اس پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ عربی کا مضمون لینے کا فیصلہ بالکل صحیح ہے۔

اسلام بھٹی لکھتے ہیں کہ ان پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی ''غیر معمولی نوازشات رہی ہیں جن کا سلسلہ کالج میں داخل ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ کالج میں داخلہ کے چند دنوں بعد ہی ہوسٹل میں بھی داخلہ مل گیا۔ کچھ دنوں تک تو میں ڈارمیٹری میں رہا۔ وہاں میرے دوسرے ساتھی سعید احمد خان رحمانی اور عبدالغفور زاہد تھے۔ پھر ہم سب کو الگ الگ کیوبیکلز مل گئے۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ...... چوہدری محمد علی انتہائی مہربان استاد تھے۔ اگرچہ ان سے میں پڑھتا تو نہیں تھا تاہم ان کو اتنا نفیس اور پیار کرنے والی شخصیت پایا کہ میرے پاس بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

میں...... صوفی بشارت الرحمٰن اور چوہدری محمد علی...... کی نوازشوں کا جس قدر اور جس تفصیل سے بھی ذکر کروں وہ کم ہوگا۔ ان لوگوں کا پیار، شفقت، محبت اور رہنمائی مجھے ہمیشہ حاصل رہی اور اس کا زبانی یا تحریری اظہار شاید مجھ سے نہ ہو سکے۔ ان دو کے علاوہ اخوند عبدالقادر ہمارے انگریزی کے استاد تھے۔ میاں عطاء الرحمٰن سے

میں نے فزکس پڑھی۔ خان ارجمند خان اور...... مولانا غلام احمد بدّو ملہوی سے دینیات۔

...... اخوند عبدالقادر بھی خوب شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت سیدھے سادے، بہت مخلص اور بہت اچھے استاد جو میری ہر معاملہ میں رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ جب میں فرسٹ ایئر میں تھا تو اغلباً صوفی بشارت الرحمٰن...... کے مشورے پر میں اخوند عبدالقادر کے پاس حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے انگریزی زبان کے کچھ ناولوں اور دیگر علمی و ادبی کتب کی لسٹ تحریر کروائی۔ ان کی ہدایت کے مطابق میں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی ان کی بتائی ہوئی جملہ کتابیں پڑھ لیں۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ واقعی میں نے ایسا کیا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ کالج کے چاروں سال ان کے پیار اور شفقت کا بہت سا حصہ مجھے ملا۔ عبدالقادر اخوند...... انگریزی بہت تیز بولا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دوسرے لوگ پنجابی میں سوچتے ہیں، پھر اردو میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں اور پھر اسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ڈھالتے ہیں۔ میں انگریزی میں سوچتا ہوں اور انگریزی میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہوں اور اس میں مجھے کبھی دقت نہیں ہوئی۔

میں ابھی سالِ اول کا طالب علم ہی تھا، میرا خیال ہے کہ دو چار ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک دن میں کالج کی گراؤنڈ میں کھڑا تھا اور میں نے سر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ حضرت میاں صاحب کی کار دفتر کے سامنے آ کر رکی۔ میاں صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً بلند آواز سے کہا: اسلام ادھر آؤ! جب میں قریب گیا تو انہوں نے پوچھا کہ سر پر ہاتھ کیوں رکھا ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا: حضور! سر درد ہو رہا ہے۔ فرمانے لگے: سر درد کیوں ہے؟ ساتھ ہی حکم ہوا میرے پیچھے دفتر آؤ۔ میں دفتر میں حاضر ہوا تو جنید ہاشمی...... کو کہا کہ فوراً ڈاکٹر قاضی محمد بشیر (جو اس زمانے میں مشہور آئی سپیشلسٹ تھے) کے نام ایک چٹھی لکھو۔ انہوں نے حضرت میاں صاحب کی جانب سے ایک چٹھی بنا کر میرے حوالے کر دی۔ میرے جیسا طالب علم سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی آنکھوں کا ٹیسٹ کروانے کے لیے قاضی صاحب جیسے مشہور و معروف آئی سپیشلسٹ کے کلینک پر جائے گا۔ یہ تو اس سفیرِ محبت کی ذرّہ نوازی تھی کہ میرے جیسے کو اتنے بڑے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔''

اسلام بھٹی ہمیں مزید بتاتے ہیں کہ ٹیسٹ کے کچھ دنوں بعد جب وہ تجویز کردہ عینک لگائے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ ''تم اب ہوسٹل کی ٹک شاپ سے اتنا دودھ (جو اَب مجھے یاد نہیں) ہر روز پیا کرو اور اتنی سویابین اور اتنے بادام کھایا کرو۔ میں تو حیران ہوں کہ مجھے اس زمانے میں سیروں کے حساب سے بادام اور سویابین جیسی چیزیں آپ کی انتہائی شفقتوں کے نتیجے میں ملنا شروع ہو گئیں۔ اس طرح نہ صرف میرے بلکہ میرے بعض دوستوں کے بھی مزے ہو گئے۔ حضرت میاں صاحب کی شفقت و محبت آہستہ آہستہ میرے لیے بڑھتی ہی گئی۔ حضرت میاں صاحب طلبہ کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کی صحت میں بھی ذاتی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ وہ ایک باپ سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر پیار کرنے والی شخصیت تھے......

لاہور میں کالج کے دو سال انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوئے۔ بہت ساری دوسری

باتوں کے علاوہ جن کا ذکر شاید ضروری نہ ہو، میں کالج میں دینی ماحول اور ڈسپلن کے اعلیٰ معیار کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام نمازیں باجماعت ادا کی جاتی تھیں مگر عشاء کی نماز کے بعد......صوفی بشارت الرحمٰن......کی پندونصائح لاجواب ہوتی تھیں۔ اگرچہ بعض دوستوں کو شکایت تھی کہ وہ کچھ زیادہ ہی سختی کرتے ہیں مگر میری دیانتدارانہ رائے میں وہ سختی اور ان کی وہ نصیحتیں ٹی آئی کالج جیسے ایک دینی اور علمی ادارہ میں زیرِتعلیم نوجوانوں......کی آئندہ زندگیوں میں ان کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دینے کے لیے انتہائی ضروری تھیں اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ کہ میری تربیت ٹی آئی کالج جیسے تعلیمی ادارہ میں ہوئی۔ اپنے اس ادعا کے ثبوت میں میں اس امر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کئی سال بعد جب میرا بڑا بچہ، ناصر اسلام آٹھ نو سال کا تھا اور حضرت میاں صاحب بطور خلیفۃ المسیح الثالث ایبٹ آباد میں قیام پذیر تھے تو بیتُ الذّکر میں نماز پڑھنے کے لیے موجود ہونے پر حضرت صاحب کی نظر مجھ پر پڑی اور حضرت صاحب نے میرے ساتھ میرے بیٹے کو دیکھا تو......ازراہِ شفقت اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور پیار سے اپنی ٹانگوں کے نیچے سے بار بار گزارنے کے بعد فرمایا کہ تم بھی ٹی آئی کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانا اور اپنے باپ کی طرح ترقی کرنا۔ مزید فرمایا کہ تمہارا باپ اتنا لائق نہیں تھا، صرف تعلیم لاسلام کالج میں پڑھنے کی بنا پر اس قابل ہوا کہ جج بن گیا۔ جہاں میرا رؤاں رؤاں اس عظیم ہستی کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا کرتا ہے وہاں مجھے یہ افسوس ہے کہ اس واقعے کے ایک دو سال کے اندر ہی تعلیم الاسلام کالج ہم سے چھین لیا گیا اور اس طرح میرا یہ ارادہ اور میرے بیٹے کی یہ خواہش کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم و تربیت حاصل کر سکے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکی......

۱۹۵۴ء میں تعلیم الاسلام کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہو گیا اور کالج کے ساتھ ہی میرے جیسے بے شمار طالب علم بھی کیونکہ تعلیم کے لیے انہیں صرف تعلیم الاسلام کالج ہی سُوٹ کرتا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی آئندہ تعلیم کا دارومدار ہی تعلیم الاسلام کالج پر تھا کیونکہ کسی دوسرے کالج میں پڑھنے اور خرچ برداشت کرنے کی ان میں سکت ہی نہ تھی۔

ابتدا میں کالج کی عمارت کے ساتھ ساتھ ہوسٹل بھی زیرِ تکمیل تھا۔ خاص طور پر دروازے اور کھڑکیاں کافی دنوں تک نہیں لگی تھیں مگر کوئی کسی قسم کی چوری چکاری نہیں، کوئی شرارت نہیں۔ بس فوراً ہی تعلیم و تربیت کا لاہور والا سلسلہ رواں دواں ہو گیا۔ اساتذہ اور طلبہ اسی طرح کلاسوں میں جُت گئے۔ ہوسٹل میں رہائش اور باجماعت نمازوں کا اہتمام لاہور سے بھی بہتر انداز میں شروع ہو گیا کیونکہ اب ہم لاہور میں نہیں بلکہ ربوہ کے کلّی طور پر دینی ماحول میں رہ رہے تھے اور یہ محض اللہ کا کرم تھا۔

شروع میں میں نے اور سعید رحمانی نے حضرت میاں صاحب سے پولیٹیکل سائنس پڑھنا شروع کی مگر بعد میں کسی کم فہم نے میرے ذہن میں یہ ڈال دیا کہ پولیٹیکل سائنس میں نمبر بہت کم آتے ہیں۔ اس طرح سالِ سوئم کے آخری دنوں میں میں نے اور سعید نے پولیٹیکل سائنس پڑھنا چھوڑ دیا۔ سعید کا تو مجھے یاد نہیں مگر

میں نے مَیتھ اے کورس لے لیا۔ حضور سے پولیٹیکل سائنس پڑھنے کی سعادت سے محروم تو ہوا ہی، مجھے آج تک احساس ہے کہ مَیتھ میں بھی میری کارکردگی چنداں بہتر نہ تھی۔......

میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں تعلیم الاسلام کالج کے میگزین ''المنار'' کے ہر دو سیکشن، اردو اور انگلش کا ایڈیٹر بھی رہا۔ اردو سیکشن میں میرے ساتھ (پروفیسر ڈاکٹر) پرویز پروازی......نائب ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے کے کچھ یادگار شمارے اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ میری ادارت میں چھپنے والے ایک شمارہ میں میری ہی کلاس کے ایک دوست، الیاس بشیر کے جو شاہین تخلص کرتے تھے (جو آج کل شاید ہالینڈ میں رہائش پذیر ہیں) دو شائع شدہ پسندیدہ اشعار مجھے کبھی نہ بھولیں گے:

تو نے چپکے سے مجھ کو سونپ دیئے
مضمحل چاند، مضطرب تارے
اک سسکتا ہوا دلِ ناشاد
اَن گِنت آنسوؤں کے انگارے

......چوہدری محمد علی...... ہمارے انگلش سیکشن کے انچارج تھے اور صوفی بشارت الرحمٰن......اردو سیکشن کے۔ غالباً کچھ عرصے کے لیے......نصیر احمد خان......بھی اردو سیکشن کے انچارج رہے۔ ان ہی دنوں نوائے وقت گروپ کے رسالہ ''قندیل'' اور بعض اردو اور انگریزی اخبارات میں میرے خطوط......بھی شائع ہوتے رہے جن کے بعض شمارے اب بھی میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن جرمنی کی ویب سائٹ پر اسلام بھٹی کا ایک پیغام موجود ہے جس میں کچھ باتیں وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں البتہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی شفقت کے حوالے سے یہ واقعہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''جن دنوں میں سینئر سول جج، سرگودھا ہوا کرتا تھا میں ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا میں نے اپنا مکان تعمیر کیا ہے یا کوئی پلاٹ خریدا ہے؟ سچی بات ہے اس وقت تک میں نے اس موضوع پر سوچا ہی نہ تھا۔ جواب پر آپ نے مجھے محلّہ دارالعلوم غربی میں ایک پلاٹ عنایت فرمایا جس پر میں نے بعد میں مکان تعمیر کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ تعمیر کے دوران اس کی نگرانی آپ کے صاحبزادے مرزا انس احمد کی ذمہ داری رہی۔''

لیجئے جسٹس (ر) محمد اسلام بھٹی کی باتیں تمام ہوئیں۔ آیئے اب ملتے ہیں ان ہی کے ہم جماعت نیول کیپٹن، شمیم احمد خالد ستارۂ امتیاز (ملٹری) سے جن کا تعلق ضلع گجرات کے موضع کالس سے ہے اور جو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی کی یادداشتیں دہراتے ہوئے ذکر کیا کرتے ہیں کہ اس دور میں کالج میں تعلیم کا معیار خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت عمدہ تھا چنانچہ یہ کالج پنجاب کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتا تھا۔ سپورٹس میں بھی کالج کا ایک خاص مقام تھا اور روئنگ میں تو ہمارا کالج

سب سے آگے تھا۔ یہ دور ربوہ میں باسکٹ بال کے فروغ کا ابتدائی زمانہ تھا۔

وہ بتاتے ہیں: صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ماشاء اللہ خوش شکل، باوقار، شفیق اور اچھے منتظم تھے۔ طلبہ میں ان کی بہت عزت تھی، محبت تھی اور خوف بھی تھا۔ اچکن اور شلوار پہنتے اور سر پہ جناح کیپ۔ میرے ساتھ شفقت کا ذاتی سلوک تھا۔ ایک دفعہ دریافت فرمایا: شمیم! کیا تمہیں چینی بہت پسند ہے؟ میں نے خواب میں تمہیں چینی کھاتے دیکھا ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں! میٹھی چیزیں مجھے بہت پسند ہیں۔ ایک دفعہ مجھ سے بے توجہی کے باعث فزکس لیبارٹری کا ایک آلہ ٹوٹ گیا۔ پروفیسر نے تین سو روپے جرمانہ کردیا جو اس آلے کی قیمت کے برابر تھا۔ تین سو روپے ان دنوں بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے پرنسپل صاحب کو معافی کی درخواست لکھی تو انہوں نے کچھ ردّ و کد کے بعد پورا جرمانہ معاف فرمادیا۔

اپنے اساتذہ کرام کا ذکر کرتے ہوئے شمیم خالد بتاتے ہیں: اخوند عبدالقادر جو وائس پرنسپل بھی تھے انگلش پڑھایا کرتے تھے۔ پہناوہ سادہ تھا لیکن انگریزی پر بے پناہ دسترس رکھتے تھے۔ فرماتے: ”جب میں انگلش بول رہا ہوتا ہوں تو خود کو اس فوجی کمانڈر کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کے سامنے ہزاروں کی تعداد میں سپاہی کھڑے ہوں اور وہ جسے چاہے طلب کرسکتا ہو۔ یہی معاملہ میرے سامنے انگریزی زبان کا ہے۔ میاں عطاء الرحمٰن بہت اچھے استاد اور فزکس کے دقیق مسائل سمجھانے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ نصیر احمد خاں خوش شکل، خوش ذوق اور خوش پوش تھے۔ شعر بھی کہتے تھے اور وسیع حلقۂ احباب رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک روسی سائنسدان ایک اور امریکی ڈپلومیٹ کو ربوہ لے آئے اور انہوں نے طلبہ سے خطاب کیا۔ پروفیسر سلطان محمود شاہد سادہ مزاج اور نہایت شفیق استاد تھے۔ جب بھی ملتے محبت کا اظہار فرماتے۔ شیخ محبوب عالم خالد ایم اے اردو تھے۔ جماعت کی لمبی خدمت کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کے پرائیویٹ سیکرٹری اور ناظر بیت المال بھی رہے۔ بہت دعا گو، بزرگ شخصیت تھے۔ کراچی تشریف لاتے تو میرے ہاں قیام فرماتے۔ ذرّہ نواز تھے۔

موصوف چوہدری محمد علی کا ذکر کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں وہ ایک بلند پایہ شاعر تھے جنہیں کالج کے بعد بھی جماعت کی لمبی خدمت کی توفیق ملی۔ مولانا غلام احمد بدّ وملہوی بھی شمیم خالد کو پڑھاتے رہے ہیں۔ واقفِ زندگی تھے۔ کالج میں طلبہ کو قرآن کریم باترجمہ سکھاتے۔ شمیم خالد نے قرآن کریم کے پہلے آٹھ پارے ان ہی سے پڑھے۔

شمیم خالد کو ابھی تک باقی جن اساتذہ کے نام یاد ہیں ان میں انگریزی کے محبوب الٰہی اور ریاضی کے غیر مبائع استاد، محمد یعقوب شامل ہیں۔

ان کے کلاس فیلوز کا ذکر ہو تو شمیم خالد کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آجاتی ہے۔ ان میں سے بہتوں کے نام شمیم خالد کو اب تک یاد ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: ان میں منور چونڈہ تھے جو میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول رہے تھے۔ بہت نرم خُو اور محنتی تھے۔ سعید رحمانی قابل تھے اور سمارٹ بھی۔ بعد میں سِول سروس میں چلے گئے تھے۔ عبدالغفور زاہد بعد میں ڈاکٹر بنے اور زیادہ وقت سرگودھا میں گزارا۔ جمیل الرحمٰن رفیق نے وقف کیا۔

مشرقی افریقہ میں مربی اور جامعہ احمدیہ، ربوہ کے پرنسپل رہے ہیں۔ منور احمد جاوید نے زندگی وقف کی اور برسوں دارالضیافت کی سربراہی کی۔ عبدالحکیم جوزا نے وقف کیا، مربی سلسلہ بنے۔ فوت ہو چکے ہیں۔ عبدالشکور نے کالج چھوڑ کر جامعہ میں داخلہ لے لیا، مربی سلسلہ بنے۔ مغربی افریقہ میں خدمت کا موقع ملا۔ واپسی پر دفتر تحریک جدید میں کام کرتے رہے۔ محمد اسلام بھٹی نے قانون کا پیشہ اختیار کیا۔ ترقی پائی اور لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ امتیاز احمد ڈاکٹر بنے۔ آج کل نیوجرسی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ مقامی جماعت کے صدر رہے۔ رشید احمد بھٹی نے آرٹس میں مہارت حاصل کی اور امریکہ چلے گئے۔ جب میں ۲۰۰۴ء میں آخری بار ان سے ملا وہ فلاڈلفیا کے سیکرٹری مال تھے۔ رشید احمد گلگتی بھی امریکہ میں قیام پذیر ہیں اور مقامی جماعت کے صدر ہیں۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء کے دوران کالج میں پڑھنے والے دیگر طالب علموں میں سے بعض کے ساتھ بھی شمیم خالد کے گہرے مراسم رہے۔ ان کی بات ہو تو وہ سب سے پہلے کنور ادریس کا ذکر کرتے ہیں جو کالج یونین کے صدر تھے اور سیکرٹری ٹو فیڈرل گورنمنٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سالہا سال تک ڈان میں کالم لکھتے رہے۔ بشیر احمد رفیق بھی ان کے ہمعصروں میں سے تھے۔ شمیم خالد بتاتے ہیں: مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے ایک بار خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر معلوماتِ عامہ کے ایک مقابلہ میں حصہ لیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ انگولا کے دارالخلافہ کا نام کیا ہے۔ انہوں نے جواباً کہا: انگولا میں دارالخلافہ ہے ہی نہیں۔ سوال پوچھنے والے نے اس جواب پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا: تم یہ تو کہہ سکتے ہو کہ تمہیں انگولا کے دارالخلافہ کا پتا نہیں لیکن تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ انگولا کا دارالخلافہ ہے ہی نہیں۔ اس پر بشیر رفیق نے جواب دیا: جناب عالی! دارالخلافہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں خلافت ہو۔ مجھے بتایا جائے کہ کیا انگولا میں خلافت ہے؟ ان کی اس بات پر پنڈال میں ایک زبردست قہقہہ پڑا اور ان کا جواب درست تسلیم کرلیا گیا۔ شمیم خالد اپنے ایک دوست، ناصر احمد کا ذکر بھی کرتے ہیں جنہوں نے وقف کیا، کامیاب مربی بنے اور ریٹائرمنٹ کے بعد انگلستان میں قیام پذیر ہوئے۔ ساری عمر ناصر بی اے کہلوائے حالانکہ وہ بی اے پاس نہ تھے۔ پرویز پروازی نے اردو ادب میں کمال حاصل کیا۔ الفضل میں شائع شدہ ان کے مضامین لائقِ مطالعہ ہوتے ہیں۔

شمیم خالد کہتے ہیں: کالج کے کلچر میں احمدیت کا رنگ نمایاں تھا۔ کوئی فتنہ، فساد یا جھگڑا نہ تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے ان چار سالوں میں طلبہ کی بے چینی یا ہڑتال کے باعث ایک دن بھی تعلیمی پروگرام معطّل نہیں ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ میں باہمی اکرام کا رشتہ تھا۔ ہوسٹل میں چوہدری محمد علی نمازِ باجماعت کا التزام کرواتے۔ پڑھائی کے اوقات معیّن تھے۔ قرآن کریم کی ریگولر کلاسز ہوتیں۔ مولانا غلام احمد بدّ وملہی طلبہ کو ان کے رول نمبر سے مخاطب کرتے مثلاً مجھ سے پوچھتے: رول نمبر چھ آج تمہارا دوست رول نمبر چھبیس کیوں کلاس سے غیر حاضر ہے؟

کالج کے عمومی ماحول کا ذکر آجائے تو شمیم خالد بتاتے ہیں: میٹھے گرم دودھ میں تازہ بَن ڈبو کر کھانا میرا فیورٹ مشغلہ تھا۔ گاہے گاہے پچھلے پہر دریا پر جاکر بوٹنگ کرنا اچھا لگتا تھا۔ ربوہ میں کوئی سنیما نہ تھا اور لاہور میں

بھی احمدی طلبہ کے لیے سنیما جانا معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق عام تھا۔ بیشتر طلبہ اپنے نام کے ساتھ تخلص رکھ لیتے خواہ انہوں نے پوری زندگی میں ایک شعر بھی نہ کہا ہو۔ طلبہ کی مذہب سے وابستگی نمایاں تھی۔ بہت سے احمدی طلبہ نے کالج کے زمانے سے پانچوں نمازیں پڑھنا شروع کیں اور پھر ساری عمر کوئی ناغہ نہ کیا۔ لاہور میں بہت سے طلبہ رمضان المبارک میں درس القرآن میں شرکت کے لیے دلّی دروازہ کی احمدیہ بیتُ الذّکر میں جاتے جہاں مولوی عبدالغفور روزانہ ایک پارے کا نہایت عمدہ درس دیا کرتے تھے۔

تعلیم الاسلام کالج کے لاہور سے ربوہ منتقل ہونے کی بات چھڑ جائے تو شمیم خالد کہتے ہیں: ربوہ میں آ کر ہماری دینی مصروفیات بڑھ گئیں۔ ذیلی تنظیموں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ بزرگوں سے ملاقاتوں کا رواج عام تھا۔ نوجوانوں میں کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ کا شوق تھا۔ کئی لڑکے جن میں میں بھی شامل تھا حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ وہ ایک مقدس شخصیت اور صاحبِ کشف و الہام صوفی منش بزرگ تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد کی خدمت میں رسائی بھی آسان تھی۔ بہت سی نمازیں حضرت مصلح موعود کی امامت میں ادا کرنے کا موقعہ ملتا۔ حضور عصر کی نماز کے بعد بیت مبارک میں بیٹھ جاتے اور ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ اس طرح کئی بار حضور کے ملفوظات سے استفادے کا موقع ملا۔

ربوہ میں کالج کی افتتاحی تقریب ۶ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے افتتاح فرمایا۔ شمیم خالد اس تقریب میں شامل تھے۔ حضور کے خطاب کے اہم نکات انہیں ابھی تک نہیں بھولے تاہم یہ خطاب اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لہٰذا اس کی تفصیل چھوڑتے ہوئے وہ اس کانووکیشن کا ذکر شروع کر دیتے ہیں جس میں صدارتی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے جسٹس رستم کیانی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے انداز میں حکمت کی بہت سی باتیں کیں اور حضرت مرزا بشیر احمد کی برتھ کنٹرول کے بارے میں رائے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔

کالج ہی کے زمانے کی بعض اور یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے شمیم خالد بتاتے ہیں: میں زمانۂ لاہور میں سائیکل پر باغبانپورہ سے کالج آتا جاتا تھا۔ ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح کو میں کالج گیا تو مال روڈ سنسان پڑی تھی۔ جی پی او کے نواح میں بعض عمارتوں سے دھوَاں نکل رہا تھا۔ پولیس کے دستے اِدھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ کالج پہنچا تو مین گیٹ بند پایا۔ کچھ طلبہ پریشانی کی حالت میں کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ایک کلاس فیلو، جمال احمد کو راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا گیا ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ جمال خوشگوار شخصیت کے مالک تھے۔ نیک، شریف النفس اور بے ضرر۔ کالج بند کر دیا گیا اور اسی روز شہر میں مارشل لاء لگ گیا۔

وہ مزید بتاتے ہیں: ربوہ کی بات ہے۔ ہوسٹل میں رہائش پذیر چند سینئر طلبہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ کالج تشریف لائیں اور ان سے خطاب فرمائیں۔ حضور نے جواباً کہا کہ میں ایسے ادارے میں نہیں آنا چاہتا جہاں نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیا کمانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگیں اور خدمتِ دین کی طرف پورے طور پر متوجہ نہ ہوں۔ اس پر ان طلبہ کو تشویش ہوئی اور انہوں نے مل کر

زندگی وقف کرنے اور دوسروں کو اس طرف مائل کرنے کی مہم چلائی۔ انہوں نے ہوسٹل والوں کے علاوہ ڈے سکالرز سے بھی رابطہ کیا۔ اس مہم کے نتائج بالآخر کچھ اس طرح سامنے آئے: منور احمد چونڈہ اور سعید رحمانی نے وقف کیا۔ اوّل الذکر نے تعلیم کے بعد کچھ دیر خدمت کی لیکن پھر چل نہ سکے۔ سعید رحمانی نے بھی جلد ہمت ہار دی۔ جمیل الرحمٰن رفیق نے وقف کیا اور اس کا حق بھی خوب ادا کیا۔ عبدالحکیم جوزا نے وقف کیا اور تا ریٹائرمنٹ نبھایا۔ میری اپنی خواہش تھی کہ وقف کروں لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے عملاً ایسا نہ کر سکا۔ پندرہ سالہ نیول سروس کے بعد خود کو وقف کے لیے پیش کیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے ارشاد فرمایا: ''بعد از ریٹائرمنٹ'' چنانچہ تئیس سالہ نیول سروس پر ریٹائر ہو کر مرکز میں بطور واقفِ زندگی رپورٹ کر دی۔ اب بطور واقفِ زندگی تیسویں سال میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور خاتمہ بالخیر کرے۔

کالج میں تفریحی سرگرمیوں کے حوالے سے بات ہو تو شمیم خالد بتاتے ہیں: ۱۹۵۳ء کی بات ہے کالج نے ایک معلوماتی و تفریحی دورہ کا انتظام کیا۔ پروگرام تھا کہ ہمارا گروپ شمالی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کا دو ہفتے کا دورہ کرے گا اور صنعتی اور سیاحتی دلچسپ کے مقامات دیکھے گا۔ ہر طالب علم کو پچاس روپے ادا کرنے تھے جب کہ بقیہ اخراجات کالج کے ذمہ تھے۔ اس رقم میں سفری اخراجات، رہائش اور کھانا سب کچھ شامل تھا۔ اس سفر کے دوران ہم نے کھیوڑہ، اٹک آئل کمپنی، راولپنڈی، نوشہرہ کے فروٹ فارم اور جام جیلی فیکٹری دیکھی۔ پھر درگئی میں ہائیڈرو پاور پلانٹ دیکھا۔ بعد ازاں پشاور گئے اور درہ خیبر کا چکر بھی لگایا۔

وہ کہتے ہیں: جب میں نیوی میں بھرتی ہوا تو کیڈٹس کو اعلیٰ تربیت کے لیے انگلستان کے Britannia Royal Naval College, Dartmouth میں بھجوایا جاتا تھا۔ یہ وہی کالج ہے جہاں جارج پنجم اور جارج ششم، ڈیوک آف ایڈنبرا، پرنس آف ویلز، ڈیوک آف یارک، شہزادہ ولیئم اور بعد میں پرنس چارلس نے تعلیم پائی تھی۔ شمیم خالد کہتے ہیں: خدا تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ ضلع گجرات کے موضع کالس کے بابا میاں خاں احمدی کا پوتا، شمیم احمد خالد بھی اس کالج میں جا پہنچا۔ اس کالج کے اڑھائی سال مسحور کن تھے۔ میں کامن ویلتھ کیڈٹس میں دوم اور پاکستانیوں میں اوّل قرار پایا۔ کمیشن ملا اور بحریہ کی سروس شروع ہو گئی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں حصہ لیا۔ جب انڈین نیوی سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں آبدوز غازی کے افسروں کی اٹیک ٹیم میں شامل تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں صدر کی طرف سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ ملا۔ بعد ازاں آبدوزی بحریہ کی کمان کی۔ پھر ہیڈکوارٹرز میں نیوی کا ڈائریکٹر آف پرسونیل سروسز بنا۔ نیوی والے میری کارکردگی سے بہت خوش تھے چنانچہ صدرِ مملکت کی طرف سے مجھے ستارۂ امتیاز (ملٹری) سے نوازا گیا۔ ایوارڈ کی سائٹیشن کے مطابق یہ ایوارڈ میری بے داغ سروس اور میری پیشہ ورانہ مہارت کے مدنظر عطا کیا گیا تھا۔

تمام تر اعزاز و اکرام کے باوجود جب شمیم خالد کی ترقی کا معاملہ زیرِ غور آیا تو اس رپورٹ کی بنیاد پر کہ یہ افسر ایک پریکٹیسنگ احمدی ہے ان کی ترقی کا معاملہ رد کر دیا گیا تاہم موصوف کو ترقی نہ ملنے کا کوئی افسوس نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ فیصلہ میرے لیے بے حد بابرکت ثابت ہوا کیوں کہ اب میری ریٹائرمنٹ قریب تر ہو گئی تھی چنانچہ

بھی احمدی طلبہ کے لیے سنیما جانا معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ شعر و شاعری کا ذوق عام تھا۔ بیشتر طلبہ اپنے نام کے ساتھ تخلص رکھ لیتے خواہ انہوں نے پوری زندگی میں ایک شعر بھی نہ کہا ہو۔ طلبہ کی مذہب سے وابستگی نمایاں تھی۔ بہت سے احمدی طلبہ نے کالج کے زمانے سے پانچوں نمازیں پڑھنا شروع کیں اور پھر ساری عمر کوئی ناغہ نہ کیا۔ لاہور میں بہت سے طلبہ رمضان المبارک میں درس القرآن میں شرکت کے لیے دلّی دروازہ کی احمدیہ بیت الذکر میں جاتے جہاں مولوی عبدالغفور روزانہ ایک پارے کا نہایت عمدہ درس دیا کرتے تھے۔

تعلیم الاسلام کالج کے لاہور سے ربوہ منتقل ہونے کی بات چھڑ جائے تو شمیم خالد کہتے ہیں: ربوہ میں آ کر ہماری دینی مصروفیات بڑھ گئیں۔ ذیلی تنظیموں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ بزرگوں سے ملاقاتوں کا رواج عام تھا۔ نوجوانوں میں کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کا شوق تھا۔ کئی لڑکے جن میں میں بھی شامل تھا حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ وہ ایک مقدس شخصیت اور صاحبِ کشف و الہام صوفی منش بزرگ تھے۔ حضرت مرزا بشیر احمد کی خدمت میں رسائی بھی آسان تھی۔ بہت سی نمازیں حضرت مصلح موعود کی امامت میں ادا کرنے کا موقعہ ملتا۔ حضور عصر کی نماز کے بعد بیت مبارک میں بیٹھ جاتے اور ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں۔ اس طرح کئی بار حضور کے ملفوظات سے استفادے کا موقع ملا۔

ربوہ میں کالج کی افتتاحی تقریب ۶ دسمبر ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے افتتاح فرمایا۔ شمیم خالد اس تقریب میں شامل تھے۔ حضور کے خطاب کے اہم نکات انہیں ابھی تک نہیں بھولے تاہم یہ خطاب اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لہٰذا اس کی تفصیل چھوڑتے ہوئے وہ اس کانووکیشن کا ذکر شروع کر دیتے ہیں جس میں صدارتی خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے جسٹس رستم کیانی تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے انداز میں حکمت کی بہت سی باتیں کیں اور حضرت مرزا بشیر احمد کی برتھ کنٹرول کے بارے میں رائے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔

کالج ہی کے زمانے کی بعض اور یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے شمیم خالد بتاتے ہیں: میں زمانہ لاہور میں سائیکل پر باغبانپورہ سے کالج آتا جاتا تھا۔ ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح کو میں کالج گیا تو مال روڈ سنسان پڑی تھی۔ جی پی او کے نواح میں بعض عمارتوں سے دھوَاں نکل رہا تھا۔ پولیس کے دستے اِدھر اُدھر نظر آ رہے تھے۔ کالج پہنچا تو مین گیٹ بند پایا۔ کچھ طلبہ پریشانی کی حالت میں کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ایک کلاس فیلو، جمال احمد کو راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا گیا ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ جمال خوشگوار شخصیت کے مالک تھے۔ نیک، شریف النفس اور بے ضرر۔ کالج بند کر دیا گیا اور اسی روز شہر میں مارشل لا لگ گیا۔

وہ مزید بتاتے ہیں: ربوہ کی بات ہے۔ ہوسٹل میں رہائش پذیر چند سینئر طلبہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ کالج تشریف لائیں اور ان سے خطاب فرمائیں۔ حضور نے جواباً کہا کہ میں ایسے ادارے میں نہیں آنا چاہتا جہاں نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیا کمانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگیں اور خدمتِ دین کی طرف پورے طور پر متوجہ نہ ہوں۔ اس پر ان طلبہ کو تشویش ہوئی اور انہوں نے مل کر

زندگی وقف کرنے اور دوسروں کو اس طرف مائل کرنے کی مہم چلائی۔ انہوں نے ہوسٹل والوں کے علاوہ ڈے سکالرز سے بھی رابطہ کیا۔ اس مہم کے نتائج بالآخر کچھ اس طرح سامنے آئے: منور احمد چونڈہ اور سعید رحمانی نے وقف کیا۔ اوّل الذکر نے تعلیم کے بعد کچھ دیر خدمت کی لیکن پھر چل نہ سکے۔ سعید رحمانی نے بھی جلد ہمت ہار دی۔ جمیل الرحمٰن رفیق نے وقف کیا اور اس کا حق بھی خوب ادا کیا۔ عبدالحکیم جوزا نے وقف کیا اور تا ریٹائرمنٹ نبھایا۔ میری اپنی خواہش تھی کہ وقف کروں لیکن گھریلو حالات کی وجہ سے عملاً ایسا نہ کر سکا۔ پندرہ سالہ نیول سروس کے بعد خود کو وقف کے لیے پیش کیا تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ارشاد فرمایا: ''بعد از ریٹائرمنٹ'' چنانچہ تیس سالہ نیول سروس پر ریٹائر ہو کر مرکز میں بطور واقفِ زندگی رپورٹ کر دی۔ اب بطور واقفِ زندگی تیسویں سال میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور خاتمہ بالخیر کرے۔

کالج میں تفریحی سرگرمیوں کے حوالے سے بات ہو تو شمیم خالد بتاتے ہیں: ۱۹۵۳ء کی بات ہے کالج نے ایک معلوماتی و تفریحی دورہ کا انتظام کیا۔ پروگرام تھا کہ ہمارا گروپ شمالی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کا دو ہفتے کا دورہ کرے گا اور صنعتی اور سیاحتی دلچسپ کے مقامات دیکھے گا۔ ہر طالب علم کو پچاس روپے ادا کرنے تھے جب کہ بقیہ اخراجات کالج کے ذمّہ تھے۔ اس رقم میں سفری اخراجات، رہائش اور کھانا سب کچھ شامل تھا۔ اس سفر کے دوران ہم نے کھیوڑہ، اٹک آئل کمپنی، راولپنڈی، نوشہرہ کے فروٹ فارم اور جام جیلی فیکٹری دیکھی۔ پھر درگئی میں ہائیڈرو پاور پلانٹ دیکھا۔ بعد ازاں پشاور گئے اور درہ خیبر کا چکر بھی لگایا۔

وہ کہتے ہیں: جب میں نیوی میں بھرتی ہوا تو کیڈٹس کو اعلیٰ تربیت کے لیے انگلستان کے Britannia Royal Naval College, Dartmouth میں بھجوایا جاتا تھا۔ یہ وہی کالج ہے جہاں جارج پنجم اور جارج ششم، ڈیوک آف ایڈنبرا، پرنس آف ویلز، ڈیوک آف یارک، شہزادہ ولیم اور بعد میں پرنس چارلس نے تعلیم پائی تھی۔ شمیم خالد کہتے ہیں: خدا تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ ضلع گجرات کے موضع کالس کے بابا میاں خاں احمدی کا پوتا، شمیم احمد خالد بھی اس کالج میں جا پہنچا۔ اس کالج کے اڑھائی سال مسحور کن تھے۔ میں کامن ویلتھ کیڈٹس میں دوم اور پاکستانیوں میں اوّل قرار پایا۔ کمیشن ملا اور بحریہ کی سروس شروع ہوگئی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں حصہ لیا۔ جب انڈین نیوی سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں آبدوز غازی کے افسروں کی اٹیک ٹیم میں شامل تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں صدر کی طرف سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ ملا۔ بعد ازاں آبدوزی بحریہ کی کمان کی۔ پھر ہیڈکوارٹرز میں نیوی کا ڈائریکٹر آف پرسونیل سروسز بنا۔ نیوی والے میری کارکردگی سے بہت خوش تھے چنانچہ صدرِ مملکت کی طرف سے مجھے ستارۂ امتیاز (ملٹری) سے نوازا گیا۔ ایوارڈ کی سائٹیشن کے مطابق یہ ایوارڈ میری بے داغ سروس اور میری پیشہ ورانہ مہارت کے مدنظر عطا کیا گیا تھا۔

تمام تر اعزاز و اکرام کے باوجود جب شمیم خالد کی ترقی کا معاملہ زیرِ غور آیا تو اس رپورٹ کی بنیاد پر کہ یہ افسر ایک پریکٹیسنگ احمدی ہے ان کی ترقی کا معاملہ رد کر دیا گیا تاہم موصوف کو ترقی نہ ملنے کا کوئی افسوس نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ فیصلہ میرے لیے بے حد بابرکت ثابت ہوا کیوں کہ اب میری ریٹائرمنٹ قریب تر ہوگئی تھی چنانچہ

میں انچاس سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر ایک سُپر ییئر سروس (یعنی وقف) کے لیے ربوہ حاضر ہو گیا۔ تین سال وکالتِ تبشیر میں کام کیا اور بطور مربی تربیت پائی۔ پھر سات سال بیلجیئم میں بطور مربی و امیر جماعت خدمت کی۔ واپسی پر قریباً بیس سال سے وکالت تبشیر کے شعبہ حقوقِ انسانی میں خدمت کر رہا ہوں۔

اسلام بھٹی اور شمیم خالد، دونوں نے اپنی گفتگو کے دوران تعلیم الاسلام کالج کے ایک طالبِ علم، عبدالغفور زاہد کا ذکر کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر بنے، انہوں نے فوج میں شمولیت اختیار کی اور بطور میجر ریٹائر ہوئے جس کے بعد ان کا زیادہ وقت سرگودھا میں گزرا۔ موصوف کو لِوَر سِیر وسِز کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور بعد از وفات ربوہ کے قطعہ شہداء میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر لگے ہوئے کتبہ میں جماعت کے لیے ان کی بعض قربانیوں اور ان کی پیشہ ورانہ مہارت کا حوالہ موجود ہے لہٰذا اسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

"............

مزار

الحاج ڈاکٹر میجر عبدالغفور صاحب زاہد

سرگودھا

پیدائشی احمدی

وفات: ۲۵ فروری ۱۹۹۳ء

عمر: ۵۷ سال

سلسلہ عالیہ احمدیہ کے دیرینہ اور مخلص خادم تھے۔ خلیفہ وقت کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ مقامی طور پر بھی جماعت کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک میں کافی مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ سرگودھا ریلوے سٹیشن پر فائرنگ کے دوران گولی لگنے سے زخمی ہوئے۔ دعوت اِلی اللہ کے سلسلے میں تین مقدمات قائم ہوئے۔ دو مرتبہ دو ہفتے جیل میں بند رہے۔ اپنے ڈاکٹری کے پیشہ میں بہت نیک نام، ہمدرد معالج کے طور پر پورے ڈویژن میں مشہور تھے جس سے جماعت کی نیک نامی کا باعث بنے۔

خدا کی تجھ پر رحمت ہو محمد کی شفاعت ہو
سدا میری دعا یہ ہے تجھے جنت کی راحت ہو"

الفضل ۶ مارچ ۱۹۹۳ء کے مطابق جماعت کی طرف سے مختلف دیہات میں لگائے جانے والے فری میڈیکل کیمپس کے لیے موصوف اکثر اپنی خدمات پیش کیا کرتے تھے۔

عبدالحلیم صادق جو غفور زاہد کے برادرِ اصغر تھے بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح تعلیم الاسلام کالج کے

طالب علم رہے البتہ ان سالوں کا تعین نہیں ہو سکا جب وہ یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ بی اے کرنے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ان کا شمار لائق طلبہ میں تھا چنانچہ وہ ایف ای ایل کے امتحان میں جُورسپرُوڈَینس کے پرچے میں یونیورسٹی کے جملہ امیدواروں میں اول رہنے پر طلائی تمغے کے مستحق قرار پائے۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے ابتداءً وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ پی سی ایس (جیوڈیشیل) کے امتحان میں شامل ہوئے، کامیاب قرار پائے اور ۵ جولائی ۱۹۶۷ء کو ان کا پہلا تقرر بطور سِول جج، گمبٹ ہوا۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۷ء کو اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ سیشن جج کے عہدے پر ترقی پا چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کچھ عرصہ سرگودھا میں پریکٹس کرتے رہے اور ۲۰ ستمبر ۲۰۰۸ء کو اپنی وفات کے بعد بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

حلیم صادق سے میرا تعارف ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء کے دوران اس وقت ہوا جب میرا تقرر فیصل آباد میں تھا۔ غالباً اس عرصے میں وہ بھی وہیں پوسٹِڈ تھے تاہم اس کے بعد کبھی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے ان کے بارے میں بعض بنیادی معلومات کی ضرورت پیش آئی لیکن ان کا کوئی عزیز رشتے دار ایسا نہ مل سکا جو یہ معلومات مہیا کر سکتا۔ معلوم ہوا ان کے خاندان کے سارے افراد بیرونی ملکوں میں آباد ہو چکے ہیں۔ اللہ بھلا کرے ملک محمد افضل، ریٹائرڈ سیشن جج کا جنہوں نے اپنے کاغذات کی ورق گردانی کے بعد ان کی ایف ای ایل کے امتحان میں نمایاں کامیابی، پی سی ایس (جوڈیشیل) کے امتحان میں شمولیت، پہلی پوسٹنگ اور ریٹائرمنٹ کے بارے میں مندرجہ بالا معلومات فراہم کر دیں۔

غفور زاہد اور حلیم صادق کے بعد اب کچھ ذکر شمیم خالد کے ایک اور کلاس فیلو، سعید رحمانی کا لیکن کیا آپ کو پتا ہے کہ وہ ہیں کون؟

سعید رحمانی جماعت کے ایک معروف بزرگ اور تعلیم الاسلام ہائی سکول، ربوہ کے ایک پرانے استاد، ماسٹر نذیر احمد رحمانی کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کر کے پاس کیا تھا جس کے بعد انہوں نے تعلیم الاسلام کالج سے بی اے اور ایف سی کالج، لاہور سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ وہ کچھ عرصہ تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی پڑھانے پر بھی مامور رہے۔ اسی دوران وہ سنٹرل سُپیر ییئر سروسز آف پاکستان ایگزامینیشن منعقدہ ۱۹۶۰ء کی بنیاد پر پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے لیے منتخب ہو گئے۔ انہوں نے جونیئر کلاس وَن میں ملازمت شروع کی جب کہ ۱۹۹۶ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ ممبر فنانس، پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل کے طور پر گریڈ ۲۱ میں کام کر رہے تھے۔ اپنی پینتیس سالہ ملازمت کے دوران وہ جن دیگر اہم عہدوں پر فائز رہے ان میں ڈائریکٹر جنرل ورکس آڈٹ؛ اکاؤنٹنٹ جنرل، شمال مغربی سرحدی صوبہ؛ ایم ڈی روٹی کارپوریشن اور ممبر ڈائریکٹنگ سٹاف، پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج، لاہور کے عہدے شامل ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد موصوف امریکہ منتقل ہو چکے ہیں اور ریاست فلوریڈا میں مقیم ہیں۔ سوئے اتفاق مجھے ان سے آج تک ملاقات کا موقع نہیں ملا تاہم ایک بار ان کے سکول کے ہم جماعت، پرویز پروازی کی معرفت ان سے بات

ہوئی تو گویا ان سے مستقل رابطہ قائم ہوگیا۔ میرے کئی دوست مثلاً یحییٰ خضر (جو ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس کے ایک سینئر رکن رہے ہیں)؛ جسٹس (ر) محمد اسلام بھٹی؛ پاکستان فارن سروس کے چوہدری رشید احمد؛ ہالینڈ والے سیّد الیاس بشیر؛ حبیب بنک لمیٹڈ والے ناصر احمد خالد اور کینیڈا میں مقیم محمد ہادی مونس ان کے کلاس فیلو یا ہمعصر یا شاگرد رہ چکے ہیں لہٰذا کبھی بات ہو تو موضوع گفتگو کی تلاش میں زیادہ دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

میرے ایک بہت ہی عزیز غیر از جماعت دوست، چوہدری محمد الیاس جو پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس سے گریڈ ۲۲ میں ریٹائر ہونے کے بعد کئی سال تک فیڈرل سروس ٹریبونل کے ممبر رہے ہیں پشاور میں سعید رحمانی کے ماتحت کام کر چکے ہیں اور ان کے مدّاحوں میں شامل ہیں۔ ان سے کبھی اس موضوع پر بات ہو تو وہ اپنے اس منکسرُ المزاج باس کی شفقت و محبت کے نہ ختم ہونے والے واقعات سنانا شروع کر دیتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعید رحمانی اپنے ماتحتوں میں کس درجہ مقبول تھے۔ چوہدری محمد الیاس کے الفاظ میں موصوف انتہائی شریف النفس، سادہ مزاج اور شفیق انسان ہیں جو اپنے دل میں کسی کے لیے کوئی عناد یا بغض نہیں رکھتے۔ دھیمے مزاج کے سعید رحمانی نے اپنے دوستوں پر ہمیشہ اندھا اعتماد کیا اگرچہ انہیں اپنی اس عادت کی وجہ سے بعض دفعہ شدید نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

سعید رحمانی کے حوالے سے فی الحال اتنا ہی۔ اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے حمید احمد خاں سے جو نواب محمد احمد خان کے صاحبزادے اور حضرت نواب مبارکہ بیگم کے پوتے تھے۔ وہ ۵۴-۱۹۵۲ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج لاہور میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) کے طالب علم رہے تاہم یہ مضامین ان کی افتادِ طبع کے مطابق ثابت نہ ہوئے لہٰذا انہوں نے ۱۹۵۴ء میں دوبارہ ایف اے میں داخلہ لیا اور گریجوایشن کر کے یہاں سے فارغ ہوئے۔ انہوں نے نیشنل بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ ۱۹۶۵ء تک برانچ منیجر کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔ اسی دوران وہ یونائیٹڈ کیلیفورنیا بنک، لاس اینجلس میں فارن ایکسچینج کے ایک یک سالہ ٹریننگ کورس کے لیے نامزد ہو گئے جس کی تکمیل پر وہ ایک مختصر عرصے کے لیے کراچی میں نیشنل بنک کے ہیڈ آفس میں رہے لیکن جلد ہی ان کی تعیناتی ہانگ کانگ میں ہوگئی جہاں سے وہ شکاگو اور پھر باہماز چلے گئے۔ ۱۹۷۹ء میں انہوں نے نیشنل بنک کو خیر باد کہہ دیا اور فیوجی بنک آف جاپان میں شمولیت اختیار کر کے شکاگو میں متعین ہو گئے۔ کم وبیش تین سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ بی سی سی آئی کی نظر ان پر پڑ گئی جس نے انہیں میامی میں تعینات کر دیا تاہم اس بنک کے ختم ہونے کے ساتھ ہی حمید احمد خان کا بنکنگ کیریئر بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

میرا خیال ہے ربوہ کا باسی ہونے کے ناطے میں نے حمید احمد خان کو دیکھا تو ضرور ہوگا لیکن میرا ان سے کبھی تعارف نہیں ہوا البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میں نے جنوری ۱۹۵۹ء کے ایک الفضل میں ان کے نکاح کی خبر بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھی تھی۔ یہ نکاح مسماۃ شمیم ناظر بنت چوہدری خوشی محمد ناظر سے ہوا تھا۔ یہ وہی خوشی محمد ناظر تھے جو اخباری اطلاع کے مطابق ریاست کشمیر میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے لیکن میں انہیں بحیثیت شاعر

جانتا تھا کیونکہ ان کی ایک نظم ''جوگی'' یا اس کا کچھ حصہ ہمارے سکول کے نصاب میں شامل تھا۔ مجھے یہ نظم بے حد اچھی لگتی تھی اور میں اسے پڑھتا پڑھتا کسی اور ہی دنیا میں کھو جایا کرتا تھا۔ یہ نظم جو اردو کی شاہکار نظموں میں شمار ہوتی ہے اور اپنی بے ساختگی، نغمگی، موضوع اور زبان کے لحاظ سے حسّاس قاری کے دل و دماغ پر اَنمٹ نقوش چھوڑتی ہے اب بھی بہت پسند کی جاتی ہے۔ نظم پڑھنے کے لائق ہے لیکن اس کی طوالت کے پیش نظر اسے یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! اس کے ابتدائی چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بُقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نُور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار ہوئے، ہر سبز و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے مستانہ وہ تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے گلزار بھی بزمِ سرور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ نشاط سجائی تھی
بَن میں، گلشن میں، آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظر باغِ جہاں اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ

حمید احمد خان کا ایک پیغام تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن جرمنی کی ویب سائٹ پر موجود ہے اور ان کا مندرجہ بالا پروفائل اسی پیغام میں سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے میرا جی چاہا کہ ان سے بات کی جائے لیکن ان کا اتا پتا معلوم نہ تھا۔ پرویز پروازی نے بتایا کہ وہ امریکہ ہوتے ہیں اور ایک نمبر بھی مہیا کر دیا جس پر ان سے بات کا امکان تھا۔ میں نے اس نمبر پر کئی بار فون کیا مگر ہر بار اس پر ٹیپ لگی ملی۔ پیغام اس لیے نہ چھوڑا کہ جب وہ مجھے جانتے ہی نہیں تو خود فون کیوں کریں گے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے حتّٰی کہ اچانک ان کی وفات کی خبر سن لی۔ اللہ تعالیٰ ان سے مغفرت کا سلوک فرمائے۔

اپنے اس مرحوم دوست کے بعد اب ذکر کیا جا رہا ہے جمیل الرحمٰن رفیق حال وکیل التصنیف، تحریک جدید انجمن احمدیہ کا جنہوں نے تعلیم الاسلام کالج سے ۱۹۵۴ء میں ایف ایس سی اور اس کے دو سال بعد بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ بعدۂ انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی اور جامعہ احمدیہ میں تکمیلِ تعلیم کے ساتھ ہی انہیں تنزانیہ بھجوا دیا گیا جہاں وہ دو عشروں سے زائد عرصے تک اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ انہوں نے وہاں کی قومی زبان، سواحیلی پر دسترس حاصل کی اور نہ

صرف اس زبان میں چھپنے والے رسالے ایسٹ افریقن ٹائمز کے ایڈیٹر رہے بلکہ وہ سواحیلی زبان میں شعر بھی کہنے لگے جس پر انہیں اہلِ زبان کی طرف سے دادو تحسین ملتی رہی۔

انہیں سواحیلی زبان میں شعر کہنے کی طرف کیسے توجہ ہوئی، اس سوال کا جواب ان کے اس انٹرویو میں موجود ہے جو روزنامہ الفضل نے ۲۵ فروری ۱۹۸۹ء کو شائع کیا تھا۔ اس انٹرویو میں جمیل رفیق نے بتایا کہ ''میں اپریل ۱۹۶۲ء میں تنزانیہ گیا اور سواحیلی سیکھنی شروع کر دی مگر ابتدا میں ایسی سخت ناکامی ہوئی کہ ایک صاحب نے مجھے کہہ دیا کہ جنہوں نے سواحیلی سیکھنی تھی، انہوں نے سیکھ لی، تم یہ زبان کبھی نہیں سیکھ سکتے۔ آخر اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی۔ اللہ نے رحم فرمایا اور یوں لگا جیسے ذہن سے پردہ سا ہٹ گیا۔ سواحیلی سیکھنے کے بعد میں نے سواحیلی کے جماعتی پرچے...... میں کام شروع کیا۔ اس دوران یہ تجربہ ہوا کہ بعض دفعہ لوگ نظم میں کوئی اعتراض جماعت پر کرتے۔ دل کرتا کہ اس کا جواب نظم میں ہی دیا جائے۔ اس پر شاعری کے اصول و قواعد پڑھے اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیے۔ پھر قلم اٹھایا کہ شعر لکھوں مگر ایک بھی مصرعہ موزوں نہ ہوا۔ آخر کار پھر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور تہجد کی نماز میں دعا کی کہ خدایا تیرے دین کی خاطر شعر کہنا چاہتا ہوں، تو ہی ذہن کو کھول دے چنانچہ صبح دفتر میں جا کر کوشش کی تو خدا تعالیٰ کے فضل سے کامیابی حاصل ہوگئی اور یوں رفتہ رفتہ ایسی مشق ہوگئی کہ افریقی رسالوں میں کلام چھپنا شروع ہو گیا۔''

جمیل رفیق نے بتایا کہ انہوں نے اپنی پہلی نظم حضرت مسیح موعود کی پیشگوئی بابت پنڈت لیکھرام پر لکھی تھی۔ یہ طویل نظم چودہ بند پر مشتمل تھی۔ وہ کہتے ہیں: نظم لکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ کسی صاحبِ علم کو یہ نظم دکھا لینی چاہئے چنانچہ میں نے یہ نظم اس زبان پر دسترس رکھنے والے ایک دوست کو دکھائی تو انہوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ ایک احمدی شاعر کی نظر سے یہ نظم گزری تو اس نے بھی جمیل رفیق کو خراج تحسین پیش کیا۔ موصوف حضرت مسیح موعود کے اکّا دُکّا شعر مثلاً

وہ پیشوا ہمارا جس سے ہے نور سارا
نام اس کا ہے محمدؐ، دِلبر میرا یہی ہے

اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی نظم

نونہالانِ جماعت مجھے کچھ کہنا ہے

کا بھی سواحیلی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

موصوف اپنی سواحیلی نظموں کا مجموعہ Diwani Ya Jamil کے نام سے مرتّب کر چکے ہیں اگرچہ اسے بوجوہ ابھی تک شائع نہیں کیا جا سکا۔ امید ہے کہ باقاعدہ اشاعت پر اسے سواحیلی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

بائیس اکتوبر ۱۹۸۱ء کو نیروبی کے میئر کے دفتر میں ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی جس میں سواحیلی زبان کی ترقی کے لیے جمیل رفیق کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کے اعتراف میں انہیں میئر کی جانب سے

نیروبی کا سب سے بڑا اعزاز یعنی ایک سِوک کریسٹ پیش کی گئی۔ موصوف کے پاس اب بھی نیروبی سے چھپنے والے رسالے ''ٹرُوتھ'' (۱۱ دسمبر ۱۹۸۱ء) کا وہ تراشہ موجود ہے جس میں انہیں یہ ایوارڈ وصول کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر کے نیچے درج عبارت کے مطابق بائیس اکتوبر ۱۹۸۱ء کو نیروبی کے میئر کے دفتر میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں احمدیہ مشن کے انچارج اور امیر جماعت احمدیہ کینیا، مولانا جمیل رفیق کی خدمت میں میئر کی طرف سے نیروبی شہر کا اعلیٰ ترین اعزاز یعنی ایک سِوک کریسٹ پیش کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی سواحیلی زبان کے لیے خدمات کے اعتراف میں دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ جمیل رفیق سواحیلی زبان میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں؛ وہ ایک سواحیلی ماہنامہ کے ایڈیٹر ہیں اور سواحیلی زبان میں شعر بھی کہتے ہیں۔ جمیل رفیق نے میئر کی طرف سے اس عزت افزائی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں قرآنِ کریم کا سواحیلی ترجمہ پیش کیا۔

جمیل رفیق اب تک پچیس کے قریب جماعتی کتب کا سواحیلی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس حوالے سے وہ مرزا مبارک احمد کی کتاب ''یادوں کے دریچے'' کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا مسوّدہ صاحبِ کتاب نے اپنی زندگی میں انہیں سواحیلی زبان میں ترجمے کے لیے ارسال کیا تھا۔ جمیل رفیق کے بیان کے مطابق حضور کی طرف سے اس ترجمے کی اشاعت کی اجازت موصول ہو چکی ہے اور اب جلد ہی یہ کتاب سواحیلی حلقوں تک پہنچ جائے گی۔

اب تک قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ موصوف سواحیلی زبان پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں ایک نیا لفظ متعارف کرانے کی توفیق بھی بخشی ہے اور وہ لفظ ہے ''ہاڈُوبینی''۔ اس سے قبل سواحیلی زبان میں دُوربین اور خُوردبین کے لیے ایک ہی لفظ ''دارُوبینی'' مستعمل تھا جو درست نہ تھا۔ جمیل رفیق نے سواحیلی زبان کی اس کمی کو محسوس کیا اور تنزانیہ کے روزنامہ ''ڈیلی نیوز'' کو ایک خط لکھا جو ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو شائع ہوا اور جسے ایڈیٹر کی طرف Introducing a new word into the Kiswahili کا عنوان دیا گیا۔ اس خط میں تجویز کیا گیا تھا کہ خُوردبین کے لیے سواحیلی زبان میں ''ہاڈُوبینی'' کا لفظ متعارف کرایا جائے۔ جمیل رفیق کا کہنا تھا کہ اگر ان کی یہ تجویز قبول کر لی جائے تو یہ سائنس کے طلبہ پر خصوصاً ایک احسان ہوگا کیونکہ یوں انہیں دو اہم سائنسی آلات یعنی دُوربین اور خُوردبین میں امتیاز کی سہولت حاصل ہو جائے گی۔

جمیل رفیق کی اس تجویز کو قارئین کی اکثریت نے بے حد پسند کیا چنانچہ R. Ngereza نامی ایک قاری نے اسے ایک "excellent suggestion" قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس بات سے قطع نظر کہ یہ لفظ کس نے تجویز کیا ہے ہمیں یہ نیا لفظ اپنی زبان میں فوراً قبول کر لینا چاہئے۔ دارالسّلام کے Khamisin Mubiru نے لکھا کہ سواحیلی زبان میں اس نئے لفظ کے اضافے سے دراصل ہم اپنی قومی زبان کی ایک بڑی خدمت کر رہے ہوں گے۔ دارالسّلام ہی کے A. Mlandula نے اس لفظ کو فوری طور پر سواحیلی زبان میں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جب یہ بحث جاری تھی تو نیشنل سواحیلی کونسل نے ایک پریس نوٹ جاری کیا جس میں جمیل رفیق کی اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وہ اس پر غور کر رہے ہیں اور اس

حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرتے وقت سب لوگوں کی آرا سامنے رکھی جائیں گی۔

اب یہ لفظ باقاعدہ طور پر اس زبان میں شامل کیا جا چکا ہے اور سواحیلی، انگریزی ڈکشنریوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اس حوالے سے جمیل رفیق نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ تنزانیہ سے واپسی پر جب وہ اپنے کسی بچے کا سکول لیونگ سرٹیفیکیٹ لینے اس کے سکول گئے اور کلاس ٹیچر سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ مائیکروسکوپ کو سواحیلی زبان میں کیا کہا جاتا ہے۔ اس کے درست جواب پر جمیل رفیق نے اس سے دریافت کیا کہ کیا اسے اس لفظ کے خالق کے بارے میں کچھ علم ہے؟ اس کی طرف سے اظہارِ لاعلمی پر جمیل رفیق نے بتایا کہ یہ لفظ انہوں نے وضع کیا ہے۔ اس پر وہ ٹیچر اپنی خوش بختی پر رشک کرنے لگی کہ اسے اس عظیم الشان انسان سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج میں ۱۹۵۲ء میں داخلہ لینے والے بعض طلبہ کا ذکرِ خیر ختم کرنے کے بعد اب ہم ۱۹۵۳ء میں آ گئے ہیں۔ اس سال کالج میں داخل ہونے والے طلبہ میں سب سے اہم نام افتخار احمد ایاز کا ہے جو اللہ کے فضل سے اب سر افتخار احمد ایاز کے نام سے معروف ہیں۔ موصوف آسمانِ احمدیت کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے زندگی میں بے شمار کامیابیوں اور اعزازات سے نوازا جن میں سے آخری ملکہ برطانیہ کی طرف سے انہیں ۲۰۱۵ء میں ملنے والا کے بی ای کا خطاب ہے جس کے بعد سے برطانوی حکومت کے قواعد کے تحت وہ اپنے نام کے ساتھ ''سر'' کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ یاد رہے چوہدری ظفر اللہ خان کے بعد افتخار ایاز دوسرے احمدی ہیں جو اس اعزاز کے مستحق قرار پائے ہیں۔

یہ تو ہے آپ کا وہ تعارف جس حوالے سے دنیا آپ کو جانتی ہے لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ افتخار ایاز سے میرا تعارف کیسے ہوا تھا؟

میں اوائل جوانی میں تھا جب ''صالحہ ایاز'' نامی ایک خاتون ہمارے گھر تشریف لایا کرتی تھیں اور دیر تک بلاتکلفانہ تشریف فرما رہتیں۔ مجھے اس خاتون کے ساتھ اپنے خاندان کے تعلقات کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہ تھا چنانچہ ایک بار جب میں نے امی سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا: صالحہ ایاز مختار احمد ایاز نامی ایک بزرگ کی اہلیہ ہیں۔ وہ زیادہ عرصہ تو اپنے شوہر کے ساتھ مشرقی افریقہ میں مقیم رہیں لیکن ۱۹٦۲ء میں مستقل طور پر پاکستان آ گئیں۔ مختار ایاز نے تمہارے دادا کے ذریعے احمدیت قبول کی تھی۔ ان کا تعلق یوں بھی تمہارے دادا کے گاؤں سے متصل قصبہ لُون میانی سے تھا لہٰذا وہ تمہارے دادا کا بہت احترام کرتے تھے۔ صالحہ ایاز اس تعلق سے خوب واقف ہیں اور اسی وجہ سے وہ ہم سے میل جول رکھتی ہیں۔

مجھے ہمیشہ یہ تجسس رہا کہ مختار احمد ایاز کی میرے دادا کے ذریعہ قبولِ احمدیت کا دستاویزی ثبوت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور مجھے اٹھائیس اکتوبر ۱۹٦۹ء کے الفضل میں مختار احمد ایاز کے چھوٹے بھائی، نذیر احمد کا لکھا ہوا ایک مضمون اتفاقاً مل گیا جس میں میرے اس تاثر کی تصدیق کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں: ''ایاز صاحب مرحوم نے احمدیت کو تیرہ چودہ سال کی عمر میں بخوبی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں قادیان جا کر

جلسہ سالانہ دیکھا اور سلسلہ عالیہ کے جیّد علما اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی دلوں میں اتر جانے والی تقاریر کو سنا اور انہی ایام میں حضور کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی۔ مرحوم کی قبولِ احمدیت کا سہرا درحقیقت بابو فخر الدین صاحب مرحوم آف گھوگھیاٹ کے سر ہے کہ ان ہی کی مساعی سے مرحوم احمدی ہوئے تھے۔''

صالحہ ایاز اپنے سب سے چھوٹے بیٹے، ایاز میڈیکل سٹور، رحمت بازار ربوہ والے رشید ایاز کے ہمراہ محلّہ دارالرحمت غربی میں اپنے مکان میں مقیم رہیں۔ انہوں نے ۲٦ جنوری ۱۹۹۱ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

ان کی وفات پر ایک عرصہ بیت چکا تھا۔ موقع ملنے پر میں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہتا تھا لیکن رشید ایاز سے میرا مسلسل رابطہ رہا اور کبھی ربوہ جاتا تو خواہش ہوتی کہ ان سے ضرور ملاقات ہو۔ وہ بھی کبھی کبھار فون کر کے میری اور اہلِ خانہ کی خیریت معلوم کرتے رہتے۔ یہ جون ۲۰۱۵ء کی کوئی تاریخ تھی جب رشید ایاز نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ ان کے بڑے بھائی، ڈاکٹر افتخار احمد ایاز کو ملکہ معظمہ برطانیہ کی طرف سے کے بی ای کا خطاب دیا گیا ہے۔ میں اگرچہ افتخار ایاز سے کبھی ملا نہ تھا لیکن ان کے خاندان کے ساتھ اپنے خاندان کے دیرینہ تعلقات کے پیشِ نظر میں نے فوری طور پر فون پر انہیں مبارکباد پیش کی جسے انہوں نے بصد شکریہ قبول کیا۔ میں نے جب انہیں یاد دلایا کہ ان کے والدِ بزرگوار کو احمدیت کی نعمت میرے دادا کے ذریعے نصیب ہوئی تھی تو انہوں نے اس کی تصدیق کی اور دیر تک اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے رابطے کے اسباب پیدا فرما دیئے ہیں۔

چند روز بعد الفضل (۱۹ جون ۲۰۱۵ء) میں افتخار ایاز کے برادرِ نسبتی، عطاء المجیب راشد کی طرف سے یہ خوشخبری شائع ہوئی تو اس کی مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ بھی پڑھنا چاہیں گے یہ اطلاع:

''احباب جماعت احمدیہ عالمگیر کے لیے یہ بات لائقِ صد شکر اور خوشی کا موجب ہوگی کہ جماعت احمدیہ برطانیہ کے سابق امیر، مکرم ڈاکٹر افتخار احمد ایاز صاحب کو ملکہ معظمہ برطانیہ کی طرف سے کے بی ای کے اعزاز اور سر کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ مورخہ ۱۳ جون ۲۰۱۵ء کو ملکہ معظمہ برطانیہ کی سالگرہ کے موقع پر جن اعزازات کا اعلان ہوا ہے ان میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے محترم ڈاکٹر افتخار احمد ایاز صاحب کو کے بی ای کا ایوارڈ دیا گیا ہے جس کا پورا نام ''نائٹ کمانڈر آف دی ایکسیلنٹ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر'' ہے۔ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کے ایوارڈز میں سے کے بی ای کا ایوارڈ اعلیٰ ترین ایوارڈ ہے۔ اس آرڈر کے تحت دیگر اعزازات ایم بی ای، او بی ای اور سی بی ای ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو قبل ازیں او بی ای کا ایوارڈ مل چکا ہے۔

کے بی ای ایوارڈ کا مطلب ہے کہ آپ کو سر کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ خطاب پورے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے یعنی اب آپ کا نام سر افتخار احمد ایاز لکھا اور پکارا جائے گا...... اللہ تعالیٰ یہ ایوارڈ محترم سر افتخار احمد ایاز صاحب اور ساری جماعت احمدیہ کے لیے بہت مبارک کرے۔''

بعد میں سر افتخار احمد ایاز کا اپنا ایک مضمون الفضل ۱٦ فروری ۲۰۱٦ء میں شائع ہوا جس میں اس اعزاز کی

نوعیت واہمیت واضح کرنے کے بعد اس تقریب جس میں انہیں یہ اعزاز بخشا گیا کا آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے مضمون کا وہ حصہ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کے بی ای کا اعزاز کس اہمیت کا حامل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''شاہی اعزازات میں سب سے اعلیٰ برٹش ایمپائر آرڈر ہے۔ اس کے تحت برٹش فرمانروا کی طرف سے بہادری اور اولوالعزمی پر اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ فوج میں خدمات کے علاوہ سول سوسائٹی کی خدمات یا سائنس یا ٹیکنالوجی میں خاص خدمات پر بھی اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ برٹش ایمپائر آرڈر کنگ جارج پنجم نے ۹ جون ۱۹۱۷ء کو جاری کیا تھا۔ اس کے تحت پانچ ملٹری اور سول اعزازات دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ ترین نائٹ کا اعزاز ہے۔ یہ اعزازات ایم بی ای سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے اوپر او بی ای ہے اور پھر سی بی ای اور پھر کے بی ای...... نائٹ ہڈ کے ساتھ سَر کا خطاب ہے۔ عورتوں کو Dame کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ان اعزازات کے لیے وزیراعظم یا گورنرز کی طرف سے ملکہ کی خدمت میں سفارش پیش کی جاتی ہے۔''

میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ موصوف وقتاً فوقتاً بے شمار غیر سرکاری تنظیموں کے عہدیدار رہے ہیں مثلاً وہ گراس رُوٹ ڈِپلومیٹس اور ہیومن رائٹس کمیٹی انٹرنیشنل کے چیئرمین؛ تنزانیہ کامن ویلتھ سوسائٹی کے فاؤنڈر؛ پیسیفِک پیس فورم اور این آر آئیز ویلفیئر سوسائٹی آف انڈیا کے وائس پریذیڈنٹ؛ یونیورسل کنسلٹنٹس، یُو کے کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر؛ اے بی آئی ریسرچ ایسوسی ایشن کے ڈپٹی گورنر؛ یونیورسل پیس فیڈریشن کے سفیر؛ یو این او کے پروگرام ایجوکیشن فار ہیُومن ڈیویلپمنٹ کے کنسلٹنٹ؛ یو این او کی ہیُومن رائٹس کمیٹی میں مائنارٹی گروپ رائٹس کے ایڈوائزر اور پیسیفِک آئی لینڈز ایسوسی ایشن؛ کامن ویلتھ پارٹنرشپ فار ٹیکنیکل مینجمنٹ؛ کامن ویلتھ ایسوسی ایشن؛ لنڈن ڈِپلومیٹک کور؛ رائل کامن ویلتھ سوسائٹی اور ورلڈ کونسل فار پاورٹی ایلیوی ایشن کے ممبر ہیں تاہم مجھے یہ علم نہ تھا کہ افتخار ایاز نے تعلیم کہاں حاصل کی تھی۔ بعد میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر کنور ادریس کے پیغام سے معلوم ہوا کہ افتخار ایاز نے اپنے زمانۂ تعلیم کا کم از کم کچھ عرصہ اس کالج میں بھی گزارا چنانچہ جس سال کنور ادریس سٹوڈنٹ یونین کے صدر تھے، افتخار ایاز سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔

جب میں نے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو میں نے تعلیم الاسلام کالج کے جن طلبائے قدیم سے ان کے کوائف کے حصول کے لیے رابطہ کیا ان میں افتخار ایاز بھی شامل تھے اور یہ ان کی مہربانی تھی کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انہوں نے میرے ہر سوال کا تفصیلی جواب دیا اور اپنے خط محررہ ۵ ستمبر ۲۰۱۶ء میں جو انہوں نے مجھے بذریعہ ای میل بھجوایا تھا لکھا:

''اس بات کی بہت خوشی ہے کہ آپ کے ساتھ تعارف کی صورت پیدا ہوگئی۔ الحمدللہ۔ آپ کا خاندان ہمارے محسنوں میں سے ہے اور میں ہمیشہ آپ کے خاندان کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ احمدیت ایسی عظیم نعمت ہمیں آپ کے خاندان کے وسیلہ سے نصیب ہوئی اور ہم نے جو کچھ بھی زندگی میں آج تک حاصل کیا ہے وہ

احمدیت اور خلافت احمدیہ کی برکات کے پھل ہیں۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ آخری دم تک خلافت کے ساتھ عشق و وفا کا تعلق نبھانے کی توفیق عطا فرماتا رہے اور انجام نیک ہو۔''

انہوں نے تعلیم الاسلام کالج میں اپنے داخلے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ٹانگانیکا واپسی کا پس منظر واضح کرتے ہوئے لکھا: ''میں نے ۱۹۵۳ء میں ٹانگا شہر، ٹانگانیکا سے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ میرا نتیجہ اچھا تھا۔ انگریزی میں نمبر بہت اچھے تھے اور سکالرشپ ملنے کی امید تھی اور اس کے لیے درخواست بھی دے دی تھی۔ سینئر کیمبرج کے نصاب کے مطابق میرا اردو کا معیار معمولی تھا۔ عربی تو بالکل نہیں آتی تھی۔ میرے والد صاحب کی یہ خواہش تھی کہ تعلیم میں بھی دین کو مقدم رکھا جائے چنانچہ یہ سارے حالات والد صاحب نے حضرت مصلح موعود کو لکھ دیئے اور حضور کا ارشاد آیا کہ میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لوں۔ کالج اُس زمانے میں لاہور میں ڈے اے وی کالج کی پرانی عمارت میں تھا۔ میں جون ۱۹۵۳ء میں ربوہ آیا۔ کچی آبادی تھی۔ حضور سے ملاقات ہوئی اور حضور نے مجھے حضرت مرزا بشیر احمد سے ملنے کو کہا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے ایک تعارفی نوٹ پرنسپل کالج کے نام لکھ کر دیا۔ اس وقت پرنسپل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تھے۔ بہت محبت سے ملے۔ کالج میں چھٹیوں کے دن تھے لیکن میری رہائش کے لیے خصوصی انتظام فرمایا اور پوچھتے رہے کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ اردو تعلیم کے لیے مجھے شیخ محبوب عالم خالد کے سپرد کیا اور وہ مجھے روزانہ وقت دیتے۔ عربی تعلیم کے لیے غالباً خان ارجمند خان تھے۔ وہ روزانہ پڑھاتے۔ ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ اور احادیث بھی سکھاتے۔ پھر کالج شروع ہوا۔ مجھے سیکنڈ ایئر کلاس میں شامل کیا گیا اور اپنی انگریزی کی وجہ سے میں کالج میں بہت جلد معروف ہوگیا بلکہ بعض سینئر طلبہ مجھ سے انگریزی سیکھنے کے لیے آنے لگے۔

میں کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ چوہدری محمد علی ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کا میرے ساتھ بہت شفقت کا سلوک تھا۔ اخوند عبدالقادر انگریزی پڑھاتے تھے۔ انگریزی پر ان کو خاص دسترس تھی اور وہ اس کا ذکر بھی کرتے رہتے تھے۔ اردو اور عربی کے لیے میرے لیے ذاتی ٹیوشن کا انتظام تھا۔ میں کالج کے ماحول سے بہت متاثر ہوا۔ میں نمازوں میں پہلے سے ہی باقاعدہ تھا لیکن یہاں آ کر تہجد میں بھی باقاعدہ ہوگیا اور ترجمہ کے ساتھ روزانہ قرآن کریم پڑھنا معمول ہوگیا۔ کالج کے سٹاف میں بہت سادگی اور ہمدردی تھی۔ طلبہ بھی بہت محنت سے دل لگا کر پڑھتے تھے بلکہ رات دیر تک کلاسیں چل رہی ہوتی تھیں۔ اکثر کتابیں اور لیکچر اردو میں ہوتے تھے اور میرے لیے ان کو اچھی طرح سے سمجھنا مشکل تھا لیکن ہر کام کو دل لگا کر خوبصورتی سے کرنا اور پھر کامیابی کے لیے دعا کرنا میں نے وہاں سے سیکھا۔ ڈسپلن بہت اچھا تھا اور طلبہ کا اطاعت کا جذبہ قابلِ تحسین۔ پرنسپل صاحب کا ہر طالب علم کے ساتھ ایک ذاتی تعلق تھا۔ وہ ہر ایک کی پڑھائی میں دلچسپی لیتے اور بعض دفعہ کلاسیں بھی لیتے۔ میرے ساتھ بہت ہی شفقت کا سلوک تھا۔

۱۹۵۳ء میں جب سٹوڈنٹس یونین کے الیکشن ہوئے تو کنور ادریس اس کے صدر منتخب ہوئے اور میں سیکرٹری۔ یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے کالج کا آل پاکستان انٹر کالجیٹ ڈیکلیمیشن کانٹیسٹ

یکم اور دو فروری ۱۹۵۴ء کو پانچ بجے شام منعقد ہوا۔ یکم فروری کا دن انگریزی اور دو فروری کا دن اردو مقابلوں کے لیے مخصوص تھا۔ انگریزی مقابلہ کے لیے موضوعات یہ تھے:

(1) Neutrality in the present international political situation.

(2) Islam and social equality.

اردو کے موضوعات تھے: ''قومی سالمیت کے لیے اتحاد کی اہمیت'' اور ''ہمارے تعلیمی مسائل اور ان کا حل''۔ خدا کے فضل سے تقریری مقابلوں کا معیار بہت سراہا گیا۔

ہم خود بھی ڈِبیٹس کے لیے مختلف کالجوں میں جاتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کوئٹہ بھی گئے اور ٹرافی لے کر آئے۔ اب تو سنا ہے حالات بہت بدل گئے ہیں لیکن اس زمانے میں کوئٹہ ایک خوبصورت اور پُر امن شہر تھا۔ ہمیں وہاں بہت مزا آیا۔ گجرات اور لائلپور کے کالجوں میں بھی گئے۔ عموماً جہاں جاتے کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کر کے لوٹتے۔ پرنسپل صاحب ہماری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔

ایک اور بات بھی عرض کر دوں۔ پرنسپل صاحب نے باہر سے آنے والے مہمانوں کی میزبانی کی ذمہ داری مجھے سونپ رکھی تھی۔ ایک دفعہ انڈونیشیا سے ہمارے معروف مربی، مولوی شاہ محمد تشریف لائے تو ان کی مہمانداری کے بارے میں مجھے خاص طور پر تاکید کی اور الحمدللہ مجھ سے جو کچھ بن پڑا میں نے ان کے آرام و آسائش کے لیے کیا۔

ہوسٹل کے طلبہ کے لیے جو کھانا بنتا وہ میرے ذوق کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ اس کا علم چوہدری محمد علی کو ہو گیا۔ ایک دن وہ میرے کمرے میں تشریف لائے اور بہت معذرت کی اور شکایت بھی کی کہ میں نے اُنہیں کیوں نہیں بتایا چنانچہ انہوں نے دونوں باورچیوں کو بلایا اور کہا کہ وہ میرے لیے حسبِ پسند الگ کھانا بنایا کریں اور پھر ایسے ہی ہوا۔ وہ کھانا بنا کر میرے کمرے میں لے آتے۔

طلبہ کی آپس میں بہت بے تکلفی تھی۔ چوہدری حمیداللہ، بشیر رفیق اور کئی دیگر احباب جنہوں نے بعد میں دین و دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا وہ اس وقت کے طلبہ میں شامل تھے۔ پرنسپل صاحب آٹھ دس دن کے بعد مجھے دفتر میں بلا کر حال احوال پوچھتے۔ کیا کمال کے تھے وہ لوگ!

ایک دفعہ میرے پیسے آنے میں دیر ہو گئی اور میں ٹک شاپ کا بل ادا نہ کر سکا۔ ٹک شاپ والوں نے دو تین مرتبہ یاددہانی بھی کرائی اور پھر غالباً دفتر میں رپورٹ کر دی۔ جب میرے پیسے آ گئے اور میں بل ادا کرنے گیا تو وہ کہنے لگے کہ آپ کا بل تو ادا ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا کس نے ادا کیا ہے تو انہوں نے بتانے سے معذرت کی۔ بعد میں مجھے پتا چل گیا کہ بل پرنسپل صاحب نے خود ادا کر دیا تھا اور مجھ سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ تعلیم الاسلام کالج میرے لیے تعلیم سے بڑھ کر ایک تربیتی درسگاہ تھی۔ وہاں میری اردو تعلیم میں یہ بھی شامل تھا کہ میں الفضل میں حضور کا خطبۂ جمعہ پڑھ کر سناؤں اور حضرت مسیح موعود کی کتب میں سے بھی کوئی نہ کوئی کتاب زیرِ مطالعہ رکھوں۔

لاہور کالج میں قیام کے دوران ربوہ جانے کا موقع اکثر ملتا رہتا تھا۔ وہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے ملاقات ہوتی اور دیگر بزرگانِ سلسلہ سے بھی۔ اس دوران میں خلافت کے ساتھ تعلق کو بہت تقویت ملی اور یہ تعلق میری زندگی میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ میں خلافت کی اطاعت میں ایک راحت محسوس کرتا اور یقیناً بعد کی زندگی میں جو بھی پھل پائے وہ خلافت کی اطاعت سے ہی پائے۔ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا سبق بھی میں نے پلّے باندھ لیا تھا اور دنیا کے کاموں میں بھی ہمیشہ دین کا مفاد مدِّ نظر رہتا اور اب تک یہی حال ہے۔

کالج میں مجھے قریباً ایک سال ہی ہوا تھا کہ ٹانگانیکا میں تعلیم کے لیے میرا اسکالرشپ منظور ہو گیا اور حضور کی اجازت سے میں واپس آ گیا۔ جب الوداعی ملاقات کے لیے پرنسپل صاحب کو ملنے گیا تو آپ نے پیار سے گلے لگا لیا اور فرمایا: تم سے پیار ڈالا تھا اور تم چھوڑ کر جا رہے ہو۔ فی امان اللہ۔

میں تعلیم الاسلام کالج میں صرف ایک سال ہی رہا لیکن یہ سال میری زندگی کا اہم ترین سال ثابت ہوا کیونکہ یہ کالج میرے لیے تعلیم سے زیادہ تربیتی درسگاہ ثابت ہوا۔''

افتخار ایاز سے ان کے زمانۂ طالبِ علمی کے مشاغل کی بات ہو تو وہ بتاتے ہیں: کچھ مشاغل کا تو آپ نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔ مجھے ڈِبیٹس کا شوق رہا اور الحمدللہ مجھے اپنی عملی زندگی میں اس صلاحیت سے کئی بار فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مجھے زندگی میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ خدمتِ دین کا شوق تھا اور ہے۔ ایک بات شاید آپ کے لیے نئی ہو۔ ٹانگانیکا میں ثانوی تعلیم کے دوران ہائیکس کا خوب شغل رہا۔ ایک ہائیک پچیس میل کی ہوتی تھی۔ جنگلوں میں سے گزرنا اور خود ہی کھانا پکانا ہوتا تھا۔ ایک ہائیک اب تک خاص طور پر یاد ہے جب میرے انگریز سکاؤٹ ماسٹر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر شام کے وقت مجھے جنگل میں کسی جگہ چھوڑ آئے۔ اب مجھے یہ رات وہیں گزارنا تھی اور اگلے دن پیدل پچیس میل چل کر واپس شہر پہنچنا تھا۔ یہ رات میری زندگی کی خوفناک ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ گھُپ اندھیرا تھا چنانچہ میں نے ساری رات ڈرتے ڈرتے گزاری۔ دہشت کے مارے ٹینٹ بھی نہ لگا سکا۔ ایک درخت کے نیچے سہما بیٹھا رہا۔ وہاں درختوں پر اُڑنے والے سانپ ہوتے ہیں۔ اُن کا خوف بھی تھا لیکن خدا کا شکر ہے خیریت رہی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ ان سب دعاؤں کا جو مجھے یاد تھیں رات بھر وِرد کرنے کی توفیق ملتی رہی۔ صبح ہوئی تو جان میں جان آئی۔ سامنے کچھ گھر تھے۔ اُن سے پانی لیا۔ خود ہی پتے اور لکڑیاں جمع کر کے چائے بنائی اور واپسی کا سفر شروع کیا۔

وہ بتاتے ہیں: ۱۹۵۶ء میں جب میں ٹیچرز ٹریننگ کالج کا سٹوڈنٹ تھا میں نے Mount Kilimanjaro سر کیا۔ مجھے یقین ہے بہت سے لوگوں کے لیے یہ نام نیا ہوگا لہٰذا ان کی معلومات کے لیے عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ تنزانیہ کا ایک خاموش آتش فشاں ہے۔ یہ افریقہ کی سب سے بلند چوٹی ہے جو سطحِ سمندر سے ۱۹۳۴۱ فٹ بلند ہے۔ یہ پہاڑ کوہ پیماؤں کے لیے اپنے اندر خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کوہ پیمائی کی بہت سی خوبصورت یادیں قابلِ بیان ہیں لیکن فی الوقت وہ سنانے کا موقع نہیں۔ زندگی رہی تو پھر کسی وقت تفصیل سے سناؤں گا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد افتخار ایاز نے ٹانگانیکا کے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۱ء میں ملک کی آزادی کے وقت وہ محکمہ تعلیم میں ہی کام کر رہے تھے اور برٹش شہریت رکھتے تھے۔ نئی حکومت غیر ملکیوں کو جلد از جلد فارغ کر کے ان کی جگہ مقامی لوگوں کو مقرر کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے ایک پری میچیور ریٹائرمنٹ سکیم بھی تیار کی گئی جس سے غیر ملکیوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ان میں سے بہت سے اپنی ملازمتیں چھوڑ کر برطانیہ، کینیڈا یا کسی اور ملک چلے گئے۔

آزادی کے بعد ملک میں حالات بہتر ہونے کے بجائے بدقسمتی سے بتدریج بگڑنے لگے یہاں تک کہ جان و مال کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا چنانچہ افتخار ایاز ۱۹۶۸ء میں برطانیہ یا کینیڈا منتقل ہونے کے بارے میں سوچنے لگے اور انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خدمت میں رہنمائی کے لیے خط بھی لکھ دیا۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ تنزانیہ ہی میں رہیں اور ممکن ہو تو وہاں کی شہریت لے لیں۔ حضور کے اس ارشاد پر افتخار ایاز نے برٹش شہریت سے دست بردار ہونے کی درخواست دی تو برٹش ایمبیسی کا عملہ ان کے اس فیصلے پر بہت حیران ہوا۔ دوسری طرف جب انہوں نے اپنے افسرانِ بالا کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی کوشش سے انہیں جلد ہی تنزانیہ کی شہریت مل گئی۔ ان دنوں برطانیہ اور تنزانیہ کے تعلقات میں کافی تناؤ تھا۔ برطانیہ جنوبی افریقہ کو اسلحہ سپلائی کر رہا تھا لہٰذا تنزانیہ نے برطانیہ کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر رکھے تھے۔ اس پر برطانیہ نے تنزانیہ میں موجود اپنے افسران کو فوری طور پر واپس بلا لیا جس کی وجہ سے حکومتی دفاتر میں بہت سی سینئر پوسٹس خالی ہو گئیں چنانچہ افتخار ایاز کو کالج آف ایجوکیشن میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ لگا دیا گیا۔ انہوں نے حکامِ بالا کو یاد دلایا کہ ان کے پاس تو یونیورسٹی ڈگری بھی نہیں ہے لہٰذا ان کے مخالفین اس تقرر کو کہیں بھی چیلنج کر سکتے ہیں لیکن محکمے نے انہیں اپنا کام شروع کرنے کی ہدایت کی اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ باقی معاملات سے خود نمٹتے رہیں گے۔ اسی پس منظر میں جلد ہی گورنمنٹ کی طرف سے اِن کے لیے انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سکالرشپ کی کوشش شروع کر دی گئی لیکن اس میں فوری کامیابی نہ ہو سکی۔ ادھر ملکی حالات مزید خراب ہو رہے تھے اور ان کی فیملی کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب افتخار ایاز قادیان گئے جہاں ان دنوں مولانا عبدالرحمٰن جٹ امیر جماعت تھے۔ فجر کی نماز کے بعد افتخار ایاز ان کے ساتھ بہشتی مقبرہ دعا کے لیے جایا کرتے تھے اور واپسی پر وہ مہمان خانہ میں ان کے کمرے میں آ کر کچھ دیر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن افتخار ایاز نے ان سے سکالرشپ کے حصول میں درپیش مشکلات کا ذکر کیا تو انہوں نے دعا کرائی اور ''مبارک ہو'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔ جب افتخار ایاز تنزانیہ واپس آئے تو دو تین ہفتے میں سکالرشپ کی منظوری کی اطلاع آ گئی۔ قبولیتِ دعا کا یہ واضح نشان خلیفۂ وقت کی اطاعت کا ایک شیریں ثمر تھا۔

انہیں نیوکیسل یونیورسٹی میں بی ایڈ جنرل میں داخلہ مل گیا چنانچہ مئی ۱۹۷۳ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ یہ دو سال کا کورس تھا جس کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ افتخار ایاز یونیورسٹی میں اوّل رہے تھے۔ اس بنیاد پر انہیں لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک سال کی کامن ویلتھ فیلوشپ مل گئی چنانچہ انہوں نے

ٹیچنگ آف انگلش ڈپلومہ کورس میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے طور پر کمپیریٹیو ایجوکیشن کا ڈپلومہ بھی کر لیا۔ جب افتخار ایاز تنزانیہ واپس جانے سے پہلے اپنے ہائی کمیشن گئے تو ہائی کمشنر نے انہیں بتایا کہ کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ کو ایک سال کے لیے کامن ویلتھ فیلو کی ضرورت ہے اور اگر وہ چاہیں تو ان کا نام انٹرویو کے لیے بھجوایا جا سکتا ہے۔ افتخار ایاز نے یہ پیشکش بخوشی قبول کر لی اور انٹرویو میں کامیاب بھی ہو گئے۔ انہوں نے انسٹیٹیوٹ میں کام شروع کر دیا۔ اس کام کی تنخواہ نہایت معقول تھی۔ اب انہوں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور ایک سال کے اندر اندر ڈگری حاصل کر لی۔ افتخار ایاز اپنی اس کامیابی کو اطاعتِ خلافت کا ایک اور پھل تصوّر کرتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے آخر میں افتخار ایاز تنزانیہ واپس چلے گئے اور ان کی تقرری یونیورسٹی آف دارالسّلام میں ہوئی۔ اپنے وائس چانسلر کے ساتھ ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ۱۹۸۱ء میں ایک دن وائس چانسلر نے افتخار ایاز کو بتایا کہ یو این او کی فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن تنزانیہ کے شہر اروشہ میں ''رُورل اِنٹیگریٹیڈ ڈیویلپمنٹ فار افریقہ'' کا سنٹر کھولنا چاہتی ہے اور انہیں اس کے لیے سٹاف کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ اس کے لیے ان کی سفارش کرنا چاہتے ہیں۔ یوں افتخار ایاز یو این او کی ملازمت میں آ گئے۔ انہوں نے وہاں تین سال کام کیا۔ یو این او والے ان کے کام سے بہت خوش تھے چنانچہ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے افتخار ایاز کو اپنے ہیڈ کوارٹر، روم میں ملازمت کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ اسی عرصے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اہل و عیال کے لیے انگلستان میں مستقل قیام کی راہ ہموار کر دی چنانچہ اگست ۱۹۸۴ء میں ان کے بچے انگلستان منتقل ہو گئے اور وہ خود بھی اٹلی جانے کے لیے لندن آ مقیم ہوئے۔

وہ ابھی اٹلی کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ انہیں کامن ویلتھ آفس سے اطلاع موصول ہوئی کہ ان کے پاس افتخار ایاز کے لیے Tuvalu میں ایک پوزیشن خالی ہے۔ یاد رہے طوالو بحرالکاہل کے اندر آسٹریلیا اور ہوائی کے تقریباً وسط میں واقع ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو سولہویں صدی عیسوی میں ایک ہسپانوی جہاز ران نے دریافت کیا تھا اور جس نے انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ کے حلقۂ اثر میں شامل ہو کر برطانوی پروٹیکٹوریٹ کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ جزیرہ ابتداءً کچھ عرصہ برٹش ویسٹرن ٹیریٹریز کا حصہ اور بعدہٗ مدتِ دراز تک گلبرٹ اینڈ ایلیس آئی لینڈز کالونی کا حصہ رہا تاوقتیکہ دسمبر ۱۹۷۴ء میں ایک ریفرنڈم کے نتیجے میں گلبرٹ اینڈ ایلیس آئی لینڈز کالونی کا وجود ختم ہو گیا اور اس کے چار سال بعد یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء کو طوالو برٹش کامن ویلتھ کے اندر ایک آزاد ملک بن گیا۔ یہ اقوام متحدہ کا ایک سو نواسی واں ممبر ملک ہے۔ ۲۰۱۲ء کی مردم شماری کے مطابق اس ملک کی آبادی صرف دس ہزار چھ سو چالیس افراد پر مشتمل ہے اور اس کا کُل رقبہ چھبیس مربع کلومیٹر ہے۔

افتخار ایاز نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ تحقیق سے پتا چلا کہ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن جب حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع سے اس کا ذکر ہوا تو حضور نے اس پیشکش میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ چند دن قبل آپ کی خدمت میں کسی نے لکھا تھا کہ یہ جزیرہ سو فیصد عیسائی ہے، آپ وہاں مبشر بھجوائیں۔ حضور نے

افتخار ایاز کو مشورہ دیا کہ آپ کے وہاں جانے کا سبب تو اللہ نے بنایا ہے لٰہذا آپ روم کو چھوڑیں اور مبشر بن کر طوالو جائیں۔ افتخار ایاز کہتے ہیں: میں خلیفہ وقت کے اس فرمان پر عمل کے لیے تیار ہو گیا اور روم جانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ یو این او اور پھر کامن ویلتھ میں ملازمت ملنا اطاعت ہی کا پھل تھا کیونکہ ان عالمی اداروں میں ملازمتوں کے لیے ہر ممبر ملک کے لیے ایک کوٹہ مختص ہوتا ہے۔ اگر میری شہریت برٹش ہوتی تو مجھے ان اداروں میں ملازمت کا ملنا محال تھا لیکن محض تنزانیہ کی شہریت کی وجہ سے یہ مواقع نصیب ہوتے گئے۔

موصوف مارچ ۱۹۸۵ء میں طوالو آ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ ملک ننانوے فیصد عیسائی ہے۔ یہاں کچھ بہائی تو تھے لیکن مسلمان کوئی نہ تھا۔ ملک کا سرکاری مذہب بھی عیسائیت تھا۔ طوالو ایک آزاد ملک تھا لیکن ہیڈ آف سٹیٹ ملکہ برطانیہ تھیں۔ ان کے یہاں پہنچنے کے چند ہی روز بعد چیف سیکرٹری نے انہیں بلایا اور کہا کہ وہ افتخار ایاز کے مذہبی عقائد سے بخوبی آگاہ ہیں لیکن چونکہ طوالو کا سرکاری مذہب عیسائیت ہے اس لیے انہیں یہاں اپنے عقائد کے پرچار کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے افتخار ایاز کو فکر ہوئی کہ آئے تو وہ بطور مبشّر ہیں لیکن یہاں صورتِ حال کچھ اور ہی نظر آ رہی ہے چنانچہ دعا کی طرف توجہ ہوئی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آہستہ آہستہ خود ہی لوگوں کو ان کی طرف متوجّہ کر دیا اور بیعتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ افتخار ایاز وہاں دو سال کے کنٹریکٹ پر گئے تھے۔ جب دو سال پورے ہونے کو آئے تو حضور کی طرف سے انہیں ہدایت موصول ہوئی کہ بیتُ الذکر کے لیے زمین خریدی جائے۔ اس کے لیے انہیں وہاں مزید ٹھہرنے کی ضرورت تھی۔ سرکاری کام جو اُن کے سپرد تھا وہ بہت اچھا ہو رہا تھا اور حکومت بھی چاہتی تھی کہ وہ مزید وہاں ٹھہریں اور اپنا پراجیکٹ مکمل کر کے واپس جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے کنٹریکٹ میں مزید دو سال کی توسیع کر دی جس دوران وہاں بیتُ الذکر اور مشن ہاؤس کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اسی عرصے میں طوالو زبان میں تراجم کا آغاز بھی ہو چکا تھا خاص طور پر قرآن مجید کے ترجمہ کا کام۔ چار سال پورے ہونے کو آ گئے لیکن قرآن مجید کے ترجمہ کا کچھ کام ابھی باقی تھا۔ پارلیمنٹ میں چرچ والوں کے شور کے باوجود حکومت نہیں چاہتی تھی کہ افتخار ایاز واپس جائیں چنانچہ ان کا کنٹریکٹ چار سال سے چھ سال کا ہو گیا جس دوران اللہ کے فضل سے قرآن مجید کا طوالو زبان میں ترجمہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا۔ حضور کی دعاؤں اور رہنمائی سے احمدیت کا پیغام اردگرد کے جزائر تک بھی پہنچ گیا۔ اب ضرورت تھی کہ ان ملکوں میں روابط قائم کئے جائیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ یو این ڈی پی ان کے پراجیکٹ سے بہت متاثر ہوئی اور انہوں نے مزید چار سال کے لیے انہیں اسی ریجن میں کام کرنے کے لیے بطور کنسلٹنٹ رکھ لیا اور یوں انہیں ان جزائر میں آنے جانے اور پیغامِ حق پہنچانے کے مواقع میسر آنے لگے۔

جب یہ معاہدہ ختم ہو گیا اور افتخار ایاز مستقل طور پر لندن واپس آنے لگے تو طوالو کے پرائم منسٹر نے ذاتی طور پر ان کے گھر آ کر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ برطانیہ میں طوالو کے آنریری قونصل کی حیثیت سے کام کریں۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کا خاص فضل اور انعام تھا کہ ایک عیسائی حکومت کا سربراہ ایک احمدی کو اپنے ملک کی نمائندگی کا فریضہ سونپ رہا ہے۔ طوالو کی نمائندگی کا اعزاز ابھی تک قائم ہے۔ پسیفک ریجن کے جزائر میں انہوں

نے جو کام کیا تھا وہ بہت پسند کیا گیا اور ان کے بارے میں کامن ویلتھ کو بہت اچھی رپورٹس موصول ہوئیں جو ہیڈ آف دی کامن ویلتھ، ملکہ الزبتھ کو پیش کی گئیں چنانچہ ۱۹۹۸ء میں انہیں ملکہ کی طرف سے او بی ای یعنی آفیسر آف دی ایکسیلنٹ آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کا اعزاز دیا گیا۔ افتخار ایاز کہا کرتے ہیں: دیکھیے! اطاعتِ خلافت کی برکت نے تنزانیہ میں معمولی حیثیت میں کام کرنے والے ایک احمدی کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی لحاظ سے کس اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا!

یاد رہے کہ جب افتخار ایاز طوالو اور اس کے اردگرد چودہ جزائر میں احمدیت کی تخم ریزی کے بعد واپس برطانیہ آئے تو ۲۲ جون ۱۹۹۲ء کو لندن میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع بھی رونق افروز ہوئے۔ اس تقریب میں افتخار ایاز کی خدمات کو سراہتے ہوئے حضور نے فرمایا:

الحمدللہ! آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں افتخار احمد ایاز کے اعزازی مبشّر سلسلہ کی حیثیت سے خدمات مکمل ہونے پر جو انہوں نے جزائرِ جنوبی بحرالکاہل میں ادا کیں۔ افتخار ایاز اس علاقہ میں اپنے طور پر گئے تھے۔ انہیں وہ خدمت اقوامِ متحدہ میں کام کے سلسلے میں سپرد ہوئی تھی...... خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ان تمام سالوں میں جو خدمات انہوں نے کیں وہ میرے لیے گہری تسلی کا باعث ہوئیں اور جس غیر معمولی خدمت کی انہیں توفیق ملی وہ میری امید سے بڑھ کر تھی۔

حضور نے فرمایا: جب میں نے ان کی تقرری بحیثیت اعزازی مبشّر جزیرہ طوالو میں کی تو...... مجھے قوی امید تھی کہ وہ جزیرہ طوالو میں اچھی خدمت انجام دے سکیں گے مگر مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے اُن خدمات کو وسیع و عریض علاقے میں موجود جزائر تک پھیلانے کی توفیق پا سکیں گے...... طوالو میں افتخار صاحب نے مختلف ذرائع بروئے کار لا کر حیرت انگیز طور پر خدمات سرانجام دیں۔ اس کے علاوہ ان کی بیگم امتہ الباسط ایاز...... نے وہاں کی خواتین اور لڑکیوں کی تربیت اور تعلیم کے سلسلے میں بہت کام کیا اور بہت اچھا مؤثر نمونہ اُن کی زندگیوں کے لیے قائم کیا۔

اس کے بعد حضور نے جنوبی بحرالکاہل کے چھبیس میں سے ان چودہ خودمختار جزائر کے نام بتائے جہاں افتخار ایاز کو پیغامِ احمدیت پہنچانے کا موقع ملا اور اپنے خطاب کے آخر میں فرمایا: میں آپ کو یہ یاددہانی بھی کروادوں کہ اس علاقہ میں زیادہ تر لوگ کیتھولک یا چرچ آف انگلینڈ سے تعلق رکھنے والے ہیں...... بہت کٹر عیسائی ہیں۔ جو مشرقی ممالک میں عیسائی ہیں وہ عموماً زیادہ مخلص اور مضبوط ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں بہ نسبت ان عیسائیوں کے جو مغربی ممالک میں رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں رہنے والے لوگ اپنے عقیدہ میں ایک شدّت رکھتے ہیں جس کی کچھ وجہ احساسِ کمتری بھی ہے کیونکہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنی جلد کی رنگت تو بدل نہیں سکتے مگر ہم وہی عقائد تو اختیار کر سکتے ہیں جو ہمارے حکمرانوں کے ہیں اور یہ احساس ان کے اندر عیسائیت پر یا عقائد پر بہت شدید ہونے کا ایک حصہ ہے...... اس لیے ان ممالک میں...... کامیابی حاصل کرنا...... بہت بڑی کامیابی ہے......

حضور نے فرمایا: میرا دل خداتعالیٰ کی حمد سے بھر جاتا ہے اور میں افتخار ایاز کا بھی مشکور ہوں کیونکہ ان نئے شامل ہونے والے افراد میں اخلاص اور زندگی کا مقصود حاصل کرنے کی روح ...... محسوس ہوتی ہے۔ جس سے اُن جزائر میں پاکیزہ انقلاب پیدا ہونے کے آثار نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ برکات مزید تر عطا فرمائے اور آئندہ ہمیں ان جزائر سے مزید خوشخبریاں عطا فرمائے۔

پھر فرمایا: اس تقریب کے بعد ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ اس قسم کی تقریبات دوسری جماعتوں میں بھی منعقد کی جائیں، انگلستان کی دوسری جماعتوں میں بھی تاکہ افتخار صاحب احمدی نوجوانوں کو بتائیں کہ اُن کے لیے کیا کام ممکن ہیں، دنیا کے مختلف حصوں میں کون کون سے نئے دروازے اُن کے لیے کھل رہے ہیں جہاں ایک مخلص نوجوان نمایاں خدمت کرسکتا ہے اور بہت کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے۔

لندن آنے کے بعد افتخار ایاز کو دینی لحاظ سے بھی ترقی کی کئی منازل طے کرنے کی توفیق ملی چنانچہ وہ قاضی اور قائم مقام صدر کی حیثیت سے خدمت کی توفیق پاتے رہے۔ انصاراللہ کی صدارت اور یوکے کی امارت انہیں نصیب ہوئی۔ مرکزی مجلس اِفتا کے اعزازی رکن رہے اور خدمات کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ چل رہا ہے۔ وہ آج کل طاہر فاؤنڈیشن اور ورلڈ میڈیا فورم کے ڈائریکٹر، ایم ٹی اے بورڈ کے ممبر اور انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت میں کام کررہے ہیں۔

جب افتخار ایاز لندن آئے تو یورپ میں جہاں کہیں بھی جانا ہوتا تھا ویزا لینا پڑتا تھا۔ خلافتِ رابعہ کے دور میں ایک دفعہ حضور کے ارشاد پر ہالینڈ جانا پڑا۔ اس کے لیے ویزا میں چند دن لگ گئے۔ ایک دن حضور نے انہیں دیکھا تو پوچھا: آپ واپس آگئے ہیں؟ جب بتایا گیا کہ وہ تو ابھی جا ہی نہیں پائے تو فرمایا کہ اب لندن میں ہی رہنا ہے تو یہاں کی شہریت لے لیں چنانچہ حضور کے ارشاد کی تعمیل میں انہوں نے یوکے کی شہریت کے لیے درخواست دے دی جو منظور ہوگئی۔

اب اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ امام کا ایک اور نشان ظاہر فرمایا ہے اور انہیں ملکہ برطانیہ کی طرف سے کے بی ای کا اعزاز ملا ہے جس کا خطاب ''سر'' ہے۔

اگرچہ افتخار ایاز گوشہ گمنامی میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں تاہم ان کے بارے میں اخبارات ورسائل کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ روزنامہ الفضل (چودہ اپریل ۱۹۹۰ء) میں مرزا محمد منور کے قلم سے ''جناب افتخار احمد ایاز صاحب'' کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون شائع ہوا جس کے مطابق جن دنوں افتخار ایاز پیشہ معلّمی سے وابستہ تھے، فاضل مضمون نگار نے پہلی بار انہیں دیکھا اور محسوس کیا کہ ''ہر احمدی نوجوان میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانے کی جو بے پناہ خواہش پائی جاتی ہے وہ...... افتخار ایاز میں بھی بتمام وکمال موجود تھی۔ جوں ہی ایک قدم آگے اٹھتا، دوسرا قدم آگے بڑھانے کی خواہش دل میں مچلنے لگتی۔ بزرگوں کی دعائیں اور خدا کا فضل ہمرکاب تھا جو منزل کے بعد اگلی منزل کا اشارہ کرتا اور قدم آگے بڑھ جاتا۔'' یوں ہی آگے بڑھتے بڑھتے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ان کی ملّی خدمات کو ملکہ معظمہ نے قابلِ تحسین گردانا

اور ان کی جماعتی خدمات خلفائے احمدیت کی نگاہ میں مقبول ٹھہریں۔

اردو ہفت روزہ ''نیشن'' نے اپنی چوبیس جولائی ۲۰۱۴ء کی اشاعت میں موصوف کا ایک انٹرویو شائع کیا۔ جب موصوف سے پوچھا گیا کہ وہ اپنی بے حد مصروف پروفیشنل لائف، فیملی لائف اور سوشل لائف میں توازن کیسے رکھ پاتے ہیں تو انہوں نے کہا: ''میں جو کام بھی کرتا ہوں اس کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے میرا اللہ خوش ہو۔ انسانیت کی خدمت ہو یا گھر کا کام یا پروفیشنل لائف میں کوئی کام، میں صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس سے مجھے برکت کے ساتھ ساتھ طاقت بھی ملتی ہے۔ دراصل اگر مرکزی نقطہ قائم ہے تو تمام کام اور معاملات اس کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔''

جب افتخار ایاز سر کے خطاب سے نوازے گئے تو دیگر تقریبات کے علاوہ مجلس انصاراللہ، جرمنی کے زیراہتمام بھی ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس کی تفصیلی رپورٹ مجلس انصاراللہ، جرمنی کے ترجمان ''الناصر'' کے جنوری تا مارچ ۲۰۱۶ء کے شمارہ میں شائع ہوچکی ہے۔

اردو زبان میں شائع ہونے والے ''یوکے ٹائمز'' لندن نے اپنی ۱۶ جون ۲۰۱۶ء کی اشاعت میں افتخار ایاز کا ایک انٹرویو شائع کیا جس میں انہوں نے شکرانِ نعمت کرتے ہوئے اپنے قارئین کو پیغام دیا ہے کہ ''خداتعالیٰ کی اس نعمت، انسانی برادری کو برابری کی بنیاد پر قائم رکھنا ہے، اس کے لیے کوشش کرنی ہے، اس کے مسائل حل کرنے کے لیے صدقِ دل سے کوشاں رہنا ہے۔ دنیا میں انسان کے بنیادی مسائل ستر فیصد تک ایک ہی ہیں۔ انسان کا ایک ہی محور ہونا چاہئے جو خداتعالیٰ ہے۔''

جماعت کے مشہور شاعر، عبدالکریم قدسی افتخار ایاز کی محبت کے اسیر معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم بعنوان ''مردِ قلندر'' (مطبوعہ یُوکے ٹائمز جلد ۷ شمارہ ۳۳) میں موصوف کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

یہ تو امامِ وقت کے بے دام ہیں غلام
ہیں منتظر اشارۂ ابرُو کے صبح و شام
فکرِ نمود کوئی، نہ کوئی آرزوئے نام
وہ تو خلوص و پیار کا اوج و کمال ہیں
وہ عجز و اِنکسار کی اعلیٰ مثال ہیں

پُشتوں سے ہیں وفا کے تقاضوں پہ کاربند
اُن میں ہیں ڈالتے ہیں ستاروں پہ جو کمند
جس بزم میں ہوں بزم وہ ہوتی ہے سربلند
ہر انجمن کا حسن ہیں حسنِ خیال ہیں
وہ عجز و اِنکسار کی اعلیٰ مثال ہیں

ساقی کے ہاتھوں نور کی مے یہ پیئے پیئے
پروانۂ خلافتِ حقّہ جیئے جیئے
اللہ نے بزمِ مہدی کو کیسے دیئے دیئے
ہیں وقف جن کے روز و شب اور ماہ و سال ہیں
وہ عجز و اِنکسار کی اعلیٰ مثال ہیں

عمرِ خضر خدایا انہیں کیجئے عطا
قُدسی بھی کرتا رہتا ہے سجدوں میں یہ دعا
درویش ہیں وہ مردِقلندر ہیں باوفا
خودشنودیٔ امام سے وہ مالا مال ہیں
وہ عجز و اِنکسار کی اعلیٰ مثال ہیں

حضرت حکیم محمد حسین مرہم عیسیٰ، رفیق حضرت مسیح موعود کے ایک صاجزادے، میاں عبدالواسع مقیم برمنگھم جو آدم چغتائی کے قلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں آپ کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آشتی، امن و محبت کی جو پہچان ہیں آپ
جذبۂ مہر و مروّت میں بھی ذیشان ہیں آپ
آپ کا ذہن توانا ہے، تخیّل بیدار
دورِ معراجِ ترقی کے ثناخوان ہیں آپ
ولولے دل میں تو آنکھوں میں اُمنگیں روشن
کتنے اوصافِ حمیدہ کی رگِ جان ہیں آپ
آپ کو چُن کے بنایا گیا شہبازِ ہُنر
دولتِ فکر میں سرشار سے انسان ہیں آپ
یوں ہے چہرے سے عیاں حُسنِ عمل کا پرتو
خدمتِ خلق میں ایثار کا سامان ہیں آپ
ظلمتِ شب کو اُجالوں کی رِدا پیار سے دی
جادۂ صدق و صفا کے بھی نگہبان ہیں آپ
حدِ احساس سے جو دل میں اتر جاتی ہے
بات ہو درد کی، تو درد کا درمان ہیں آپ

گوہرِ عشق سے خالی نہیں ہے آپ کا دل
اس لیے لکھتا ہوں ہم سب کے دل و جان ہیں آپ

افتخار ایاز اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انہیں تقر وتحریر، دونوں ذرائع سے خدمتِ دین کی توفیق مل رہی ہے۔ وہ آیت قرآنی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ٥ کوورِدِزبان بناتے ہوئے بصد عجز وانکسار بیان کرتے ہیں کہ انہیں یواین او کے اداروں، عالمی تنظیموں اور مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں دین کی تعلیمات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے اوران کے مضامین جماعتی اور غیر جماعتی اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں انہوں نے تحدیثِ نعمت کے طور پر مجھے بتایا: خوشی کی تازہ خبر یہ ہے کہ اب مجھے ملکہ برطانیہ کی طرف سے Distinguished Services Medal عطا فرمایا جارہا ہے۔ دنیا میں بارہ ریاستیں ہیں جن کو ملکہ کی realms کہا جاتا ہے۔ یہ میڈل ان realms کی ممتاز خدمات کے صلہ میں دیا جاتا ہے۔ اس عاجز کے لیے یہ ملکہ کی طرف سے چوتھا ایوارڈ ہے۔

ان چار ایوارڈز کی تفصیل بتاتے ہوئے انہوں نے کہا: سب سے پہلا ایوارڈ سکاؤٹس کا ''کوئنز بیج'' تھا جو مجھے ۱۹۵۳ء میں اس وقت ملا تھا جب میں تعلیم الاسلام کالج کا سٹوڈنٹ تھا۔ مجھے یاد ہے یہ بیج گورنر پنجاب نے گورنر ہاؤس میں منعقدہ ایک تقریب میں عطا فرمایا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب گورنر ہاؤس کی طرف سے اس فنکشن کا دعوت نامہ موصول ہوا تو صاجزادہ مرزا ناصر احمد نے مجھے اپنی کار میں وہاں بھجوایا تھا اور میڈل ملنے پر بہت خوش ہوئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۹۸ء میں مجھے او بی ای اور ۲۰۱۵ء میں کے بی ای کا اعزاز ملا اور اب ۲۰۱۶ء میں ڈِسٹنگوِشڈ سروسز میڈل ملا ہے۔ یہ سب احمدیت اور خلافت احمدیہ کے کرشمے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ذرّہ ناچیز کو بامِ ثریا تک پہنچادیا۔ (افتخار ایاز کے انعامات واعزازات کی مکمل فہرست کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ د)

وہ مزید کہتے ہیں: یہ بھی اُسی کا احسان ہے کہ مجھے گزشتہ کئی سالوں سے انتہا پسندی، تشدّد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی ہیُومن رائٹس کونسل میں نمائندگی کی توفیق مل رہی ہے۔ اسی طرح مجھے ان ہزاروں لوگوں جو پرسیکیُوشن اور تشدّد کی وجہ سے پاکستان چھوڑ رہے ہیں اور یواین کی پناہ میں آرہے ہیں کو غیرملکوں میں آباد کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن فار ریفیوجیز کے ساتھ کام کا موقع مل رہا ہے۔ اس کے لیے مجھے ملائشیا، تھائی لینڈ، سری لنکا، فلپائن، کوریا اور کئی دیگر ممالک میں جاکر اسائیلم سیکرز کے لیے کوشش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں اب تک سینکڑوں مصیبت زدہ لوگ کینیڈا، امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں سَیٹل کئے جاچکے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ یہ سب معجزات حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی دعاؤں سے رونما ہورہے ہیں۔

حضور کے ارشاد پر افتخار ایاز کو بہت سے ممالک میں پیس سمپوزیم منعقد کرنے اور کی نوٹ سپیکر کے طور پر شمولیت کا اعزاز بھی حاصل ہورہا ہے۔

وہ کہا کرتے ہیں: خدا کا شکر ہے مجھے کچھ کتابیں بھی لکھنے کی توفیق ملی ہے جن میں سرِ فہرست وقفِ زندگی کی اہمیت اور برکات پر ہے۔ یہ کتاب انگریزی کے علاوہ اردو، فرانسیسی اور عربی میں بھی شائع ہو چکی ہے اور اس کی افادیت کے پیشِ نظر اس کو دنیا کے سارے جامعات میں بھجوانے کا ارشاد ہے۔ اسی طرح خلافت کی اہمیت اور برکات اور واقفین زندگی کے میدانِ عمل میں ایمان افروز واقعات پر آپ کی دو الگ الگ کتابیں بھی چھپ چکی ہیں اور اب اطاعت کی اہمیت اور برکات پر ایک کتاب زیرِ طبع ہے۔

اس کے ساتھ ہی سرافتخار ایاز کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ اب ۱۹۵۳ء میں ہی تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہونے والے ایک اور طالبعلم کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا نام منیر احمد عابد ہے۔ اسے میری کم علمی سمجھ لیجئے کہ میں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر ممتاز طلبہ کے ناموں میں موصوف کا نام دیکھا تو غیر مانوس سا لگا۔ اِدھر اُدھر بہتیرے اولڈ سٹوڈنٹس سے ان کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ یہ تو اللہ بھلا کرے فیروزہ کا جنہوں نے یہ بتا کر کہ جامعہ نصرت میں ماضی کی ریاضی کی ایک لیکچرر، رشیدہ شریف ان ہی منیر عابد سے بیاہی ہوئی ہیں اور یہ دونوں میاں بیوی آج کل آسٹریلیا ہوتے ہیں میرا مسئلہ حل کر دیا۔ انہوں نے ہی ان کا نمبر مہیا کیا اور یوں میری ان سے بات ہوگئی۔ منیر عابد نے جب یہ کہا کہ ہم فون پر نامکمل سی گفتگو کی بجائے ملاقات کیوں نہ کرلیں تو مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ تب انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ چند روز بعد یعنی ستائیس اکتوبر ۲۰۱۶ء کو لاہور پہنچیں گے اور اپنے ایک بھانجے، ڈاکٹر میجر (ر) داؤد احمد کے پاس عسکری ۱۰ میں قیام فرما ہوں گے لہٰذا اگر میں اس موقع پر ان سے وہاں ملاقات کرسکوں تو مزا آ جائے گا۔ میں بڑی بیتابی سے ان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے تاریخ مقررہ آئی تو ان کے لاہور پہنچنے کی خوشخبری ملی اور یوں ہم نے کئی گھنٹے اکٹھے گزار کر ایک دوسرے سے خوب خوب تعارف حاصل کیا۔

منیر عابد جو فی الاصل قادیان کے قریبی گاؤں موضع تلونڈی جھنگلاں کے رہنے والے اور ماسٹر برکت علی کے صاحبزادے ہیں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول، چنیوٹ سے میٹرک کے بعد تعلیم الاسلام کالج سے ۱۹۵۵ء میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ بعدہٗ انہوں نے دیال سنگھ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا اور بی ایس سی وہاں سے کی۔ انہوں نے ایم ایس سی باٹنی کا امتحان سندھ یونیورسٹی، جامشورو سے ۱۹۶۲ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور وہیں بطور ڈیمانسٹریٹر ملازمت اختیار کرلی۔ وہ پلانٹ ٹیکسانومی کے شعبہ میں تخصیص حاصل کرنا چاہتے تھے اور ایسا صرف بیرونِ ملک جا کر ہی ہوسکتا تھا لیکن بیرونِ ملک تعلیم کے لیے انہیں وظیفہ کی ضرورت تھی جو انہیں ملتا نظر نہیں آرہا تھا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں سنگاپور یونیورسٹی کی طرف سے سپیشل پلانٹ ٹیکسانومی کے شعبے میں چھ ماہ کے ایک وظیفہ کی پیشکش ہوئی جس کی مختصر مدت کی وجہ سے باقی لوگوں نے اس میں دلچسپی نہ لی تاہم انہوں نے قبول کرلی اور وہ ۱۹۶۳ء کے آخر میں وہاں چلے گئے۔ ان چھ ماہ کے دوران ان کا ایک ریسرچ پیپر شائع ہوا۔ ان کے ڈائریکٹر، پروفیسر ہمفرے بَرکل ان کے کام سے بے حد مطمئن تھے چنانچہ ان ہی کی سفارش پر اس وظیفہ میں چھ چھ ماہ کی مدت کا تین بار اضافہ ہوا اور یوں انہیں ۱۹۶۵ء تک وہاں رہنے کا

موقع مل گیا۔ ان دو سالوں میں ان کے چار ریسرچ پیپرز شائع ہوئے اور انہوں نے پودوں کی تین نئی اقسام بھی دریافت کیں۔ یہ پودے موجود تو روزِ ازل سے تھے تاہم ان کی بعض دیگر پودوں کے ساتھ گہری ظاہری مشابہت کی وجہ سے انہیں اُس وقت تک الگ کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔ منیر عابد نے لمبے تجربے کے بعد ثابت کیا کہ یہ ایک غلط فہمی ہے، یہ پودے بالکل الگ حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں اسی حیثیت میں پہچانا جانا چاہئے۔

واپسی پر انہیں سندھ یونیورسٹی میں اپنی ترقی کے حوالے سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا وہ اس کوشش میں رہے کہ اگر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئی اور وظیفہ مل جائے تو وہ اس ماحول سے باہر نکل جائیں۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ حکومت ہنگری کی طرف سے ایک وظیفہ کی پیشکش ہوئی۔ اس پیشکش کے لیے متوقع امیدواروں کی تعداد بہت کم تھی چنانچہ ان کا کام بن گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی سے چھٹی لے لی اور وہ اپنے رفقائے کار کی طرف سے الوداعی پارٹیاں بھی کھا چکے تھے کہ ایڈیلیڈ یونیورسٹی، آسٹریلیا کی طرف سے یونیورسٹی ریسرچ گرانٹ کے تحت وہاں آنے کی پیشکش موصول ہوگئی۔ منیر عابد سوچنے لگے کہ انہیں ہنگری جانے کی بجائے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہئے تاہم اس میں کچھ انتظامی دشواریاں حائل تھیں۔ وہ کہتے ہیں: اس پریشانی میں میرا ایک شاگرد جو اُن دنوں رجسٹرار، سندھ یونیورسٹی کے دفتر میں کلرک تھا میرے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ پتا نہیں کیسے لیکن وہ ڈاکٹر رضی الدّین صدّیقی، وائس چانسلر سے ہنگری کی بجائے آسٹریلیا جانے کے لیے میری ایک سال کی چھٹی منظور کرالایا چنانچہ میں مارچ ۱۹۷۱ء میں آسٹریلیا پہنچ گیا۔

منیر عابد کی گفتگو جاری تھی: وہاں مجھے جس پراجیکٹ پر ریسرچ کا موقع ملا اس کے انچارج ایک جرمن Prof. Hans George Eichler تھے۔ اللہ کے فضل سے وہ بھی میرے کام سے بے حد مطمئن تھے۔ ابھی چار ماہ گزرے تھے کہ مجھے سِڈنی یونیورسٹی کی طرف سے ایک پیشکش موصول ہوئی جس کی شرائط موجودہ شرائط سے بہت بہتر تھیں تاہم میں اپنے پروفیسر کو ناراض کر کے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جب میں نے انہیں ساری بات بتائی تو انہوں نے خود پر میرے اعتماد پر خوشی کا اظہار کیا چنانچہ میں نے سِڈنی یونیورسٹی کے پروفیسر کیرولین کو خط لکھ کر اس پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے قبول نہ کرسکنے پر معذرت کردی۔ ان کا مجھے جواب آیا جس میں انہوں نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ میں ایک قابل پروفیسر کی نگرانی میں کام کر رہا ہوں اور لکھا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ کام کر کے یقیناً اطمینان کا ملکہ حاصل رہے گا۔ اسی عرصے میں مجھے آکسفورڈ یونیورسٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے بھی وظائف کی پیشکش ہوئی تاہم میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنی پی ایچ ڈی یہیں رہ کر مکمل کروں گا چنانچہ میں نے اسی یونیورسٹی سے ۱۹۷۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

وہ کہتے ہیں: میں خدائے عزّ وجل کا کس منہ سے شکر ادا کروں کہ تلونڈی جھنگلاں کے رہنے والے ایک سکول ماسٹر کے بیٹے کو اپنی اس ریسرچ کے دوران تین درجن سے زیادہ نئے پودے دریافت کرنے کا موقع ملا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد منیر عابد کا اسی یونیورسٹی میں بطور جونیئر لیکچرر تقرر ہوگیا۔ انہوں نے ربع صدی

یہیں گزار دی اور ۱۹۹۶ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ سینئر باٹنیسٹ' سٹیٹ ہربیریئم، بوٹینیکل گارڈن، ایڈیلیڈ کے طور پر کام کر رہے تھے۔

وہ اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہیں کہ ۱۹۷۸ء میں انہیں حکومتِ آسٹریلیا کی طرف سے پورے ملک کے باٹنیسٹس کے نمائندے کے طور پر ایک سال کے لیے کیو گارڈن، لندن بھجوایا گیا۔ ان کے الفاظ میں: میں آسٹریلیا کی تاریخ میں پہلا پاکستانی اور پہلا احمدی تھا جو اس اعزاز کے لیے چنا گیا۔

ان سے ان کی زندگی کا ماحصل پوچھا جائے تو بتاتے ہیں: اس ربع صدی میں میرے چوالیس ریسرچ پیپرز بین الاقوامی شہرت کے حامل رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور میں نے بے شمار نئے پودے دریافت کئے ہیں لیکن اس کام کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف صاحبانِ علم کو ہی ہو سکتا ہے۔

منیر عابد آسٹریلیا میں جا کر آباد ہونے والے ابتدائی احمدیوں میں سے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب میں یہاں آیا تو ساؤتھ آسٹریلیا میں ڈاکٹر زید بن عبدالقادر (جو پروفیسر عقیل بن عبدالقادر کے بھائی ہیں) کے علاوہ شاید ہی کوئی اور احمدی ہوگا۔ آہستہ آہستہ احمدیوں کا اس طرف رجحان ہوا۔ اب تو یہاں کم و بیش آٹھ نو سو احمدی ہوں گے۔ میں بارہ سال تک اس علاقے کا صدر رہا ہوں۔ محمود احمد بنگالی نے اپنے زمانۂ امارت میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں حدیقۃ الصالحین کا انگریزی زبان میں ترجمہ کروں چنانچہ میں نے اور میری اہلیہ نے تین سال کی محنتِ شاقہ (محنتِ شاقہ اس لیے کہ انگریزی میرا یا میری اہلیہ، کسی کا بھی مضمون نہ تھا) یہ ترجمہ مکمل کر کے امیر صاحب کو پیش کر دیا۔

ہمارے اس دوست نے خدمتِ سلسلہ کو حرزِ جان بنا رکھا ہے اور آج کل وہ آسٹریلیا میں احمدیت کی تاریخ کی تدوین میں ممکن حد تک معاونت کر رہے ہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر یہاں افتخار ایاز اور منیر عابد ہی کے ایک ہم عصر، چوہدری وحید سلیم کا ذکر نہ کیا جائے جنہوں نے الفضل ۱۸ نومبر ۱۹۹۳ء کے مطابق ''۱۹۵۸ء میں بی اے آنرز کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری حاصل'' کی تھی۔ وہ ایک کامیاب وکیل تھے اور جماعت کے لیے ان کی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

وحید سلیم میرے خسر کے دوستوں میں سے تھے اور موصوف کے ساتھ میری واحد ملاقات ان ہی کے ہمراہ نیلا گنبد، لاہور میں موصوف کے دولت خانہ پر ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے ان کے ساتھ ملاقات کا کبھی موقع نہیں ملا اور نہ ہی ان کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تاہم ۱۷ نومبر ۱۹۹۳ء کو ان کی اچانک وفات پر الفضل میں شائع ہونے والی خبر پڑھ کر افسوس ہوا کہ میں کیوں کر ایک ہمہ صفات شخص کے قرب سے محروم رہا تھا۔ الفضل نے آپ کو جماعت کا ''بے حد ذہین، لائق اور جماعتی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہنے'' والا ''نامور ماہرِ قانون'' قرار دیتے ہوئے لکھا تھا:

''۱۹۷۴ء سے لے کر اب تک جماعت احمدیہ کے جتنے بھی اہم کیس ملک کی مختلف عدالتوں میں لڑے گئے ہیں ان میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ روزنامہ الفضل کی بندش کے خلاف ہائی کورٹ میں جو رٹ

دائر کی گئی تھی اس میں بھی محترم چوہدری صاحب موصوف کی قابلِ قدر خدمات سے استفادہ کیا گیا۔ آپ کی یہ نمایاں صفت تھی کہ جماعت کی خدمت کا کوئی مرحلہ سامنے آتا تو باقی سارے کام چھوڑ کر فوراً جماعتی کیس کی تیاری میں لگ جاتے اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیس تیار کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے بلا کا حافظہ دیا تھا۔ محنت کی عادت اس پر مستزاد تھی۔ سینکڑوں قانونی حوالے ان کو ازبر تھے۔ موصوف کی یہ نہایت ہی قابلِ تعریف عادت تھی کہ اہم حوالے کسی کو بتانے میں کبھی بخل نہ کرتے تھے۔''

الفضل ہی کی اطلاع کے مطابق انہوں نے چار پانچ ایسے مشہور کیس کئے تھے جن کے فیصلے بطور نظیر عدالتوں میں پیش کئے جانے لگے۔ اس کے علاوہ وہ ورلڈ بنک کے قانونی مشیر رہے۔ انہوں نے لاہور کی ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کا انتخاب بھی جیتا اور مسلسل کئی سال تک ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی ایگزیکٹو کے ممبر رہے۔ لاہور ہائی کورٹ کی لائبریری اپنی موجودہ ترقی یافتہ شکل میں ان ہی کی محنت کی مرہونِ منت ہے۔ وہ علم کے شیدائی تھے اور ان کا زیادہ تر وقت لائبریری میں گزرتا۔ وہ انسانی حقوق کے ادارے کے سرگرم ممبر بھی تھے اور اس سلسلے میں گزشتہ چند سالوں میں انہوں نے بعض اہم خدمات انجام دی تھیں۔ وہ قضا بورڈ کے رکن تھے اور انہیں قائم مقام صدر قضا بورڈ کے طور پر بھی خدمات انجام بجالانے کا موقع ملا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے اہل و عیال امریکہ منتقل ہو چکے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی اہلیہ، رشیدہ خاتون پاکستان آئیں تو مجھے بھی ان کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا۔ وہ طفیل روڈ، لاہور کینٹ پر اپنے مکان میں (جو وحید سلیم نے تعمیر کیا تھا لیکن افسوس وہ اس میں منتقل ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد وفات پا گئے) ٹھہری ہوئی تھیں۔ موصوفہ نے مرحوم کی جن خوبیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ان میں توکل علی اللہ، محنت، دیانتداری اور جماعت کی بے لوث خدمت کا جذبہ شامل تھا۔ ان کی روایت کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ موصوف کو مشورے کے لیے اکثر ربوہ بلوایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے بھی ایک بار انہیں مشورے کے لیے لندن طلب کیا تھا۔ انہیں سلسلے کے بعض جید علما کا اپنے مقدمات کے سلسلے میں اپنے ہاں آنا بھی یاد ہے۔ وہ بتاتی ہیں: ۱۹۷۴ء کے بعد مرحوم کی تمام تر توجہ جماعتی کیسز پر مرکوز ہو جانے کی وجہ سے پریکٹس پر منفی اثر پڑا۔ میں نے ایک بار انہیں کہا: آپ جو کچھ کر رہے ہیں قابلِ تحسین ہے لیکن دنیا کو بالکل چھوڑ ہی دینا کسی طور پر مناسب نہیں۔ جواباً کہنے لگے: دیکھ لینا۔ خدا اس خدمت کا صلہ کیسے دے گا۔ رشیدہ کہتی ہیں: میں صدقے جاؤں اللہ کی ذات کے جس نے ان کی وفات کے بعد ہمیں اتنا کچھ دیا ہے کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔

وحید سلیم کے ایک عزیز، سیف اللہ وڑائچ ان کی پیشہ ورانہ مہارت کے حوالے سے بتایا کرتے ہیں: ایک بار میں اور گجرات کے محمد اسلم وڑائچ اعتزاز احسن کے ساتھ ہائی کورٹ میں کھڑے تھے۔ وحید سلیم کا وہاں سے گزر ہوا۔ جب وہ چلے گئے تو اعتزاز احسن کہنے لگے: وحید سلیم تو چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ انہیں ہر حوالہ زبانی یاد ہوتا ہے۔ وہ کھڑے کھڑے کیس کا نمبر اور کتاب میں اس کا صفحہ تک بتا دیتے ہیں۔

موصوف کے بعد اسی زمانے کے ایک اور ہونہار طالب علم جن کا تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے منور احمد سعید ہیں جو روشن دین زرگر کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ وہ میری ایک بھانجی، روحی کے سسرالی عزیزوں میں سے ہیں اور مدتِ دراز سے امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول اور اس کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ ان کا شمار کالج کے ہونہار طلبہ میں ہوتا تھا چنانچہ وہ ۱۹۵۵ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور میں جملہ طلبہ میں اول رہے۔ الفضل (۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء) نے ان کی اس کامیابی کی خبر ان الفاظ میں شائع کی:

”تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی نمایاں کامیابی

کالج کے طالب علم منور احمد سعید ایف اے (آرٹس) کے امتحان میں اوّل آئے

ربوہ ۱۲ جولائی۔ یہ خبر نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اِمسال پنجاب کے ثانوی تعلیم کے بورڈ کے زیرِ اہتمام ایف اے (آرٹس) کا جو امتحان ہوا تھا اس میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ایک طالب علم منور احمد سعید...... اول آئے۔ آپ نے ۶۷ھ۴ نمبر حاصل کئے۔ اللہ تعالیٰ یہ کامیابی کالج اور سلسلے کے لیے ہر لحاظ سے مبارک کرے......“

وہ ایف اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے بی اے کیا اور پھر انسٹیٹیوٹ آف پبلک اینڈ بزنس ایڈمنسٹریشن، کراچی سے ایم پی اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی کامیابی سے نوازا اور انہوں نے یونیورسٹی میں اول رہنے کا اعزاز پایا۔ وہ اسی زمانے میں فلبرائٹ سکالرشپ پر امریکہ چلے گئے اور واہرٹن گریجوایٹ سکول میں دو سال گزارنے کے بعد کچھ عرصہ پڑھاتے رہے اور پھر ورلڈ بنک میں ملازم ہو گئے۔ وہ ورلڈ بنک میں انتیس سالہ بے داغ ملازمت کے بعد ۱۹۹۴ء میں بطور سینئر ٹیکنیکل اسسٹینس آفیسر ریٹائر ہوئے۔

وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیاوی ترقیات کے ساتھ جماعت کی خدمت کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے چنانچہ وہ امریکہ میں ملکی سطح پر سیکرٹری تعلیم، سیکرٹری امور عامہ، سیکرٹری فنانس اور سنٹرل آڈیٹر رہے ہیں۔ انہیں ریجنل نائب امیر اور قاضی کے طور پر بھی کام کرنے کا موقع مل چکا ہے اور وہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی قائم کردہ رِبا ریسرچ کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں۔

منور سعید بتاتے ہیں: ملازمت میں آجانے سے میرا پڑھنے لکھنے کا شوق ختم نہیں ہوا بلکہ آپ یقین کریں میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک ایم بی اے کیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ گزشتہ تیس سالوں میں اس شعبے میں ہونے والی تبدیلیوں سے خود کو آگاہ رکھ سکوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو رضاکارانہ بنیاد پر جماعتی کتابوں کے ترجمہ کے لیے وقف کر دیا ہے چنانچہ مجھے ایڈیشنل وکالتِ تصنیف، لندن کے انگلش ٹرانسلیشن سیکشن کے سربراہ کے طور پر خدمت کی توفیق مل رہی ہے۔ اس حیثیت میں ہمیں حضرت مسیح موعود اور خلفائے احمدیت

کی بعض تصانیف بشمول براہینِ احمدیہ حصہ اول تا چہارم کا ترجمہ کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے تاہم وہ وضاحت کرتے ہیں: میری اس بات سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ یہ سارا کام تن تنہا میں نے کیا ہے، ماہرین کی ایک کمیٹی یہ کام کر رہی ہے اور یہ محض اللہ کا احسان ہے کہ میں اس کمیٹی کا سربراہ ہوں۔

اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے میجر جنرل (ر) نصیر احمد سے جو تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹس میں سے پاک فوج میں اس اعلیٰ عہدے پر پہنچنے والے غالباً واحد افسر ہیں۔ موصوف چوہدری محمد عبداللہ، ہیڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل سکول، لاہور کے بھتیجے ہیں۔ ان کا خاندان سیالکوٹ میں آباد تھا لیکن ۱۹۵۳ء کے پُرآشوب ایام میں نصیر چوہدری محمد عبداللہ کے پاس ربوہ منتقل ہو گئے اور انہوں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے ۱۹۵۴ء میں میٹرک پاس کیا اور ضلع جھنگ کے جملہ طلبہ میں اوّل رہے۔ اس کے بعد وہ تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہو گئے اور ۱۹۵۶ء میں ایف ایس سی پاس کی۔ بعدۂ وہ سیالکوٹ منتقل ہو گئے اور مرے کالج سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اب آرمی ہاؤسنگ کالونی، نیشنل پارک روڈ، راولپنڈی میں رہائش پذیر ہیں۔

اگرچہ موصوف کو ربوہ چھوڑے ہوئے ساٹھ سال ہو گئے ہیں مگر اس دور کی بعض خوبصورت یادیں آج بھی ان کے ذہن میں تازہ ہیں۔ انہیں یاد ہے کہ اس زمانے کی پاکستان کرکٹ ٹیم کے ایک نامور کھلاڑی، خان محمد جو سنٹرل ماڈل سکول میں ان کے تایا کے شاگرد رہے تھے ایک بار پشاور سے فیصل آباد جاتے ہوئے صرف ان سے ملاقات کی خاطر ربوہ میں رُکے تھے اور انہوں نے وہ رات ان ہی کے گھر میں گزاری تھی۔ وہ بتاتے ہیں: ہم نے حتی المقدور ان کی مہمان نوازی کی۔ شاید کھیل کود کی کثرت سے ان کے پاؤں پر سوجن تھی چنانچہ ہم رات کا بیشتر حصہ چولہے پر پانی گرم کر کر کے ان کے پاؤں پر ٹکور کرتے رہے۔

نصیر کی شادی نیک محمد غزنوی کی صاحبزادی، رضیہ سے ہوئی تھی۔ الحمدللہ یہ جوڑا خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔

موصوف انتہائی وسیع المطالعہ شخص ہیں اور ان کے پاس اچھی خاصی ذاتی لائبریری بھی ہے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ راقم الحروف کی اب تک آٹھ کتب شائع ہو چکی ہیں تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ یہ کتابیں خریدنا چاہتے ہیں اور اگر میں یہ کتب انہیں بذریعہ وی پی پی بھجوا سکوں تو وہ ممنون ہوں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ فیروز سنز کے شوروم اور گودام واقع مال روڈ، لاہور میں آتشزدگی کی وجہ سے ان کا کتابوں کا سارا سٹاک جل گیا تھا اور میری کتابیں انہوں نے دوبارہ شائع نہیں کیں لہٰذا میرے لیے ان کے حکم کی تعمیل مشکل ہو گی لیکن اگر وہ ان میں سے کسی خاص کتاب کے بارے میں اشتیاق رکھتے ہوں تو میں کہیں نہ کہیں سے حاصل کر کے انہیں بھجوا سکتا ہوں۔ انہوں نے ”ارمغانِ ملتان“ کے بارے میں اپنی دلچسپی ظاہر کی جو میں نے انہیں جلد ہی بھجوا دی۔ الحمدللہ انہوں نے اسے بنظرِ تحسین دیکھا۔

تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور سابق طالب علم جن کا میں بوجوہ آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں محمد ہادی مونس ہیں جو ۱۹۵۴ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور گریجوایشن یہیں سے کی۔ بعد میں انہوں نے سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور سے اساتذہ کا تربیتی کورس مکمل کیا۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول، ربوہ اور حاصل پور اور رحیم یار خان کے بعض سرکاری مدارس؛ جامعہ تعلیم ملیّ، کراچی اور لارنس کالج، گھوڑا گلی میں مجموعی طور پر کئی سال پڑھاتے رہے اور پھر نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت سیرالیون چلے گئے۔ گیارہ سال وہاں رہے اور بعدۂ نائیجیریا منتقل ہوگئے۔ ۱۹۸۵ء میں پاکستان واپس آگئے اور کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز، فیصل آباد میں بطور لیبر ویلفیئر آفیسر کام کرتے رہے۔ انہیں ناصر پبلک سکول اور نصرت جہاں اکیڈمی میں بھی پڑھانے کا موقع ملا لیکن پھر کینیڈا منتقل ہوگئے جہاں وہ پچھلے ایک عشرے سے جامعہ احمدیہ میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

موصوف تعلیم الاسلام کالج کے معروف طلبہ میں سے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے ڈیبیٹر تھے اور اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں یکساں سہولت سے بول لیتے تھے۔ انہیں مختلف کالجز کی سالانہ انٹرکالجیٹ ڈیبیٹس میں کئی بار تعلیم الاسلام کالج کی نمائندگی کا موقع ملا۔ اس حوالے سے انہیں اسلامیہ کالج، لاہور؛ نشتر میڈیکل کالج، ملتان اور پنجاب یونیورسٹی لا کالج، لاہور کے نام ابھی تک یاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں: میں نے کالج میں اپنے قیام کے دوران بہت سے مباحثوں میں حصہ لیا اور کئی دفعہ پوزیشنز بھی حاصل کیں۔

اس زمانے میں پروفیسر نصیر احمد خان کالج یونین کے انچارج تھے۔ موصوف بتاتے ہیں: اپنے کالج کی انٹرکالجیٹ ڈیبیٹ کا ایک موقع تھا۔ مباحثے کے دوسرے روز نصیر خان جُملہ مقررین کو حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے ملاقات کے لیے لے گئے۔ چونکہ میں بھی اپنے کالج کی طرف سے اس مباحثے میں شریک تھا اس لیے میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھا۔ ملاقات ہوئی تو ایک لڑکے نے حضور سے سوال کیا کہ انسان چاند پر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہوجائے گا؟ حضور نے فرمایا کہ قرآن کی رُو سے تو انسان زمین پر پیدا کیا گیا ہے اور زمین پر ہی وفات پائے گا لہٰذا وہ چاند پر پہنچ تو سکتا ہے مگر بادیٔ النظر میں اس کے وہاں رہائش اختیار کرسکنے کے امکانات معدوم نظر آتے ہیں۔

نصیر خان بحیثیت انچارج کالج یونین مقررین کی ٹریننگ اور تیاری کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہادی مونس کو یہ بات ابھی تک نہیں بھولی کہ ایک دفعہ لاہور کے لا کالج کی طرف سے ڈیبیٹ میں شمولیت کا دعوت نامہ موصول ہوا تو موصوف نے انگریزی تقریری مقابلے میں اپنے کالج کی نمائندگی کے لیے انہیں منتخب کیا۔ جب انہوں نے کہا کہ وہ تو خود کو اس مقابلے کے لائق نہیں سمجھتے تو نصیر خان نے کہا: میں اس کی تیاری میں تمہاری رہنمائی کروں گا، تم تقریر تیار کر کے شام کو میرے مکان پر آ کر سنایا کرو چنانچہ ہادی مونس روزانہ انہیں تقریر سناتے اور وہ ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے۔ اس طرح پانچ چھ روز کی محنت سے ان کی تقریر اچھی تیار ہوگئی۔ ہادی مونس بتاتے ہیں: میں نے لا کالج میں بیس مقررین میں سے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ واپسی پر جب میں

خان صاحب سے ملا تو انہوں نے کالج کی کامیاب نمائندگی پر مجھے شاباش دی۔

ہادی مونس نے کالج میں داخلے کے وقت اپنے لیے پری انجینئرنگ گروپ پسند کیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں: فزکس میں طلبہ کی بڑی تعداد کے مدّنظر دو سیکشن بنائے گئے تھے۔ میں پروفیسر عطاالرحمٰن کے سیکشن میں تھا جو اس مضمون کے بہت اچھے استاد تھے اور ایسے طریقے سے پڑھاتے کہ طلبہ کو ہر بات بہ آسانی سمجھ آجاتی۔ کیمسٹری کے استاد پروفیسر حبیب اللہ تھے۔ وہ بھی پرانے اور ماہر استاد تھے مگر میں دسمبر ٹیسٹ میں کیمسٹری میں فیل ہوگیا۔ ساری نالائقی میری اپنی ہی تھی لہٰذا میں آرٹس میں چلا گیا اور کیمسٹری کی جگہ فارسی رکھ لی۔ فارسی کے استاد پروفیسر چوہدری عطاء اللہ تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں نے چونکہ میٹرک تک فارسی نہیں پڑھی لہٰذا میں اپنے طور پر چھٹی جماعت کی فارسی پڑھنا شروع کروں اور آہستہ آہستہ میٹرک تک کے نصاب پر عبور حاصل کرلوں۔ میں نے اس مشورے پر عمل کیا اور کچھ ہی عرصے میں یہ کام مکمل کر کے میں نے ایف اے کے فارسی کے نصاب پر محنت شروع کر دی۔ نتیجتاً میں کلاس کے ساتھ چل پڑا۔ چوہدری عطا اللہ نے ہر قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ ایف اے اور بی اے کی فارسی کی نصابی کتب ''خزینۂ ادب'' اور ''گنجینۂ ادب'' موصوف نے بڑی محبت سے پڑھائیں۔ انہوں نے ہی مجھے علمِ عروض سے روشناس کیا۔ اس طرح میرے شاعری کے ذوق کو مہمیز ملی۔ انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں شاعری کرتا رہوں اور اس میں کمال حاصل کروں۔ ان ہی کی بدولت شعر و شاعری کے ساتھ میری دلچسپی اب تک قائم ہے۔

کالج کے بعض طلبہ اپنے محلّہ میں اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے اور ان کے خلاف شکایتیں کالج تک بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ ہادی مونس بتاتے ہیں: اسی بنا پر کالج میں صوفی بشارت الرحمٰن کی نگرانی میں پراکٹوریل سسٹم قائم کیا گیا اور ربوہ کے ہر محلے میں کالج کے کسی ایک طالب علم کو پراکٹوریل مانیٹر مقرر کیا گیا۔ وہ اس محلّے کے طلبہ کی نگرانی کرتا اور ان کی طرف سے کوئی شکایت پیدا ہوتی تو صوفی صاحب کو رپورٹ کرتا۔ اس طرح شرارتی طلبہ ذرا محتاط ہوگئے۔ میں محلّہ دارالرحمت شرقی کا دو سال تک پراکٹوریل مانیٹر رہا۔

ہادی مونس کا کلام جماعتی اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں: میں سیکنڈ ایئر میں تھا جب میں نے ''تعلیم الاسلام کالج'' کے عنوان سے پچاس سے زیادہ اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی۔ اگرچہ ان اشعار میں شاعرانہ پختگی تو نہ تھی مگر میں نے شوق ہی شوق میں یہ نظم ایک شام کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کردی۔ اس نظم کے مقطع میں میرا تخلص مونس تو موجود تھا مگر میرے نام کا پتا نہیں چلتا تھا۔ نظم میں کالج کی سرگرمیوں کے علاوہ اساتذہ کرام کا بھی ہلکے پھلکے انداز میں ذکر کیا گیا تھا لیکن کسی قسم کی بیہودگی نہ تھی۔ اگلے روز جب میں کالج گیا تو طلبہ کرسیوں پر کھڑے ہوکر یہ نظم پڑھ رہے تھے۔ انہیں تجسس ہو رہا تھا کہ اس نظم کا خالق کون ہے کیونکہ وہ مونس کو عام طور پر نہیں جانتے تھے۔ جب یہ بات اڑتی اڑتی سٹاف روم تک پہنچی تو صوفی بشارت الرحمٰن نے اس کا سخت نوٹس لیا اور شادی سے دریافت کیا کہ یہ شرارت کس کی ہوسکتی ہے۔ اسے علم تھا کہ یہ نظم میں نے یہاں لگائی ہے چنانچہ اس نے صوفی صاحب کو صاف صاف بتا دیا کہ امرِ واقع کیا تھا۔ شادی کی شہادت پر صوفی صاحب نے مجھے

طلب کیا اور اس بارے میں پوچھا۔ غلطی کا اعتراف کرنے پر مجھے کوئی سرزنش نہیں کی گئی البتہ سمجھا دیا گیا کہ کالج کا نوٹس بورڈ اس طرح کی نظمیں لگانے کے لیے نہیں ہوتا۔ پھر صوفی صاحب نے شادی کو ہدایت کی کہ وہ یہ نظم اتار کر انہیں پہنچا دے۔

اس نظم کے کچھ شعر جو مجھے آج بھی یاد ہیں لکھ رہا ہوں:

دیکھئے ٹی آئی کالج کی عمارت شاندار
جس میں ہم آئے ہیں پڑھنے کے لیے لیل و نہار
میاں ناصر ہیں پرنسپل بھی اور کچھ اور بھی
وہ یہاں علم و عمل کے منتظم ہیں زوردار
اے خدا ہمت مسعود عاطف کو دے گفتار کی
بورڈ پر لکھ لکھ کے کر دیتے ہیں ہم کو اشکبار
ایک ابراہیم ناصر اب پروفیسر ہوئے
اب تلک شاگرد ان کے کھا رہے ہیں ان سے مار
سارے نظم و نسق کا ٹھیکہ ہے صوفی صاحب کا
کوئی گڑبڑ ہو نہیں سکتی نہ کوئی انتشار
کوئی بتلا دے عطا رحمٰن کا کوئی بدل
پھر نہیں بھولا جو اُن سے پڑھ لیا ہو ایک بار
عشق کی غزلیں پڑھو اک فارسی استاد سے
کس قدر عمدہ عطاء اللہ کی ہے تدریس یار
اک حبیب استاد ہیں کیمسٹری کے بے مثال
بھول جاتے ہیں مگر ہم فارمولے بار بار
زیرِ سایہ خان صاحب کے رہو گے تم اگر
باسکٹ کا بال کھیلو جاں بناؤ غمگسار
کشتی رانی کے بنوگے چیمپئن تم ایک دن
چھوڑ دو سب پیریڈ، دریا پہ جاؤ بار بار
اک شریف اور اک میاں خورشید بھی کیا خوب ہیں
ہم پہ انگلش کی حقیقت ہوگئی ہے آشکار
اب کہاں جائے گا کوئی اس فضا کو چھوڑ کر
رونقیں ٹی آئی کالج کی میسر بے شمار

ہادی وضاحت کرتے ہیں: یاد رہے کہ مسعود عاطف، ابراہیم ناصر، عطاء اللہ اور میاں خورشید جن کے اسمائے گرامی اس نظم میں استعمال ہوئے ہیں کالج کے اساتذہ میں سے تھے جب کہ ''صوفی صاحب'' سے مراد صوفی بشارت الرحمٰن؛ ''عطارحمٰن'' سے مراد عطاء الرحمٰن؛ ''حبیب'' سے مراد پروفیسر حبیب اللہ خان؛ ''خان صاحب'' سے مراد نصیر احمد خان اور ''شریف'' سے مراد شریف خالد ہیں۔ یہ تمام بزرگان اس دور میں یہاں پڑھایا کرتے تھے۔

اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے سیّد الیاس بشیر احمد سے جو عرصۂ دراز سے نیدرلینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈیم میں مقیم ہیں اور انتہائی نفیس انسان ہیں۔

یہ ۲۰۰۰ء کے موسمِ گرما کی بات ہے۔ میں اور راشدہ جرمنی گئے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس شینگن ویزا تھا لہٰذا یورپ کے اکثر ممالک میں بلا روک ٹوک آ جا سکتے تھے۔ کچھ ملک ہم نے پہلے سے دیکھ رکھے تھے لیکن اس وقت تک ہالینڈ جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ سوچا وہاں سے ہو آئیں لیکن ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو کوئی ایسا شناسا نظر نہ آیا جس کے پاس ہم بے تکلفی سے ایک دو روز قیام کر سکتے۔ بالآخر ایک واقف کار کی معرفت ایک احمدی دوست کے ہاں قیام کا بندوبست ہوگیا جنہوں نے نہ صرف جرمنی سے آنے والی بسوں کے اڈے پر ہمارا استقبال کیا بلکہ دو یا تین دن ہماری پرتپاک مہمان نوازی کا بیڑہ بھی اٹھائے رکھا۔

جرمنی سے چلتے وقت پروفیسر حمید احمد چوہدری سے بھی اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے ایمسٹرڈیم میں مقیم ایک احمدی دوست، الیاس بشیر احمد کو ہماری آمد کی اطلاع کر دی۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا اور ہم پر اپنی نوازشات کی بارش شروع کر دی۔ وہ ایک روز ہمیں اپنی کار میں ہیگ لے کر گئے۔ ان کا بڑا بیٹا دانیال بھی اس سفر میں ہمارے ہمراہ تھا۔ سارا دن وہاں گھومتے رہے، ہم نے عالمی عدالتِ انصاف دیکھی اور ہیگ میں آباد سری نام سے تعلق رکھنے والے ایک دو احمدی دوستوں سے بھی ملاقات کی۔

ایمسٹرڈیم میں ہمارا قیام دو یا شاید تین دن کا تھا۔ اسی دوران ایک جمعہ آ گیا۔ الیاس بشیر احمد ہمیں اپنے ہمراہ بیت الذّکر لے کر گئے۔ اس روز خطبہ بھی انہوں نے ہی دیا تھا۔ یہ خطبہ انگریزی میں تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ سنا لہٰذا کچھ عجیب سا احساس ہوا تاہم میں الیاس بشیر احمد کی فصاحت و بلاغت اور خوبصورت طرزِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

الیاس بشیر احمد کے ساتھ میری یہ پہلی ملاقات تھی جس دوران معلوم ہوا کہ وہ بھی تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ ہیں اور چار سال فضلِ عمر ہوسٹل میں مقیم رہے ہیں۔ وہاں سے بی اے پاس کیا جس کے فوراً بعد انہوں نے پی آئی اے میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کرتے کرتے جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا تقرر بطور جنرل منیجر (بَیلینیکس) ہوا اور تعیناتی ایمسٹرڈیم میں۔ انہوں نے تین سال تک بڑی دیانتداری کے ساتھ مفوّضہ فرائض سرانجام دیئے تاہم اسی دوران ان کے افسرانِ بالا کی طرف سے ان کے عقائد پر کئی طرح کے سوالات اٹھائے جانے لگے اور ان کے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کی جانے لگیں جس کے

نتیجے میں انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے ساتھ مشورے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی اور اسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

وہ کہتے ہیں: جب میں نے ملازمت کو لات ماری تو میرے حالات یکسر بدل گئے اور بیٹھے بٹھائے میرے لیے کئی طرح کی پریشانیاں پیدا ہوگئیں تاہم اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز ہے۔ آہستہ آہستہ میرے تمام مسائل حل ہوگئے۔ بچوں کو ایسے اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جو میری پہنچ سے باہر تھے اور خدا تعالیٰ نے انہیں ایسا روزگار عطا فرما دیا جو میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یہ سب احمدیت کی برکت اور خلیفہ وقت کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

خدا تعالیٰ نے الیاس بشیر احمد کو شیریں بیانی اور اخلاص، ہمدردی خلق، مہمان نوازی اور جماعت کے ساتھ وفاداری کے جذبہ سے سرشار کر رکھا ہے اور وہ اپنے جاننے والوں کے دلوں میں گھر کرنے کے وصف سے خوب واقف ہیں۔

ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے ماہ و سال کی بات ہو تو وہ جذباتی ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: مجھے ستمبر ۱۹۵۵ء کا وہ دن آج بھی یاد ہے جب میرے والدِ گرامی مجھے فضل عمر ہوسٹل میں چھوڑ کر گئے تھے۔ اس سے پہلے میرا سارا وقت گلگت میں گزرا تھا جو سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک خوبصورت جگہ ہے لیکن اب میرا داخلہ تعلیم الاسلام کالج میں ہو چکا تھا اور اب مجھے یہیں رہنا تھا تاہم پُر فضا گلگت کے مقابلے پر بے آب و گیاہ ربوہ کی جُھلسا دینے والی گرمی میں وقت گزارنا ابتداءً مجھے بے حد مشکل محسوس ہوا مگر یہ تو تھا میرا پہلے دن کا تاثر۔ آج جب کہ اس بات پر ساٹھ سال گزر چکے ہیں میرے احساسات بالکل مختلف ہیں۔ کہاں گئے وہ دن؟ میں اکثر سوچتا ہوں۔ کیا وہ دن لوٹ کر نہیں آسکتے؟ میرا ذہن بار بار مجھ سے پوچھتا ہے۔ میں گزرا ہوا وقت واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں ایسا بار بار کرتا۔ سچ پوچھیں تو ان دنوں کے بارے میں سوچ کر کئی دفعہ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ کہاں گئے وہ ساتھی جو ہوسٹل میں میرے ساتھ تھے اور کہاں کھو گئے میرے وہ محترم اساتذہ جنہوں نے مجھے اپنے والدین سے بڑھ کر شفقت دی تھی؟

اس کالج نے الیاس بشیر احمد کو بہت کچھ دیا۔ وہ کہتے ہیں: صاحبزادہ مرزا ناصر احمد جو پرنسپل ہونے کے علاوہ ہمارے پولیٹیکل سائنس کے استاد بھی تھے اور چوہدری محمد علی کی شفقت و محبت کے اتنے واقعات ہیں کہ بیان کرنا شروع کروں تو ختم ہونے میں نہ آئیں۔ جنید ہاشمی جو سپرنٹنڈنٹ ہونے کے علاوہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے گہرے دوست اور مزاج شناس بھی تھے انتہائی دلرُبا شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے اور لڑکوں کے ساتھ رعونت کی بجائے محبت سے پیش آنا ان کا شیوہ تھا۔ میرے مہربانوں میں اور بھی بہت سے لوگ شامل ہیں لیکن کس کس کا نام گنواؤں۔

الیاس بشیر احمد کہتے ہیں: میں اللہ تعالیٰ کے ان افضال کا احاطہ ہی نہیں کر سکتا جن کا میں تعلیم الاسلام کالج کا طالب علم یا ربوہ کا مکین ہونے کے ناطے وارث بنا۔ اس دوران مجھے بارہا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی

زیارت کا موقع ملا، میں نے حضرت مسیح موعود کے بہت سے رفقا کو قریب سے دیکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی براہِ راست شاگردی اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد سے ایک ایسا قرب نصیب ہوا جس پر میری سات پشتیں فخر کر سکتی ہیں۔

موصوف انتہائی وضعدار انسان ہیں۔ ایک دفعہ پاکستان آئے تو عنایت فرمائی اور راولپنڈی میں ہمارے غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے اس سفر میں ان کے دونوں خوبصورت سے بیٹے، یعنی دانیال اور وقار ہمراہ تھے۔ میں ان کے اس دورے میں ان کے ساتھ میجر جنرل (ریٹائرڈ) فضل مقیم کے گھر واقع پنج سڑکی، راولپنڈی گیا تھا۔ یاد رہے کہ جنرل فضل مقیم پاکستانی فوج کے فاؤنڈنگ فادرز میں شمار ہوتے تھے۔ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول کے پہلے کمانڈنٹ؛ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران سابقہ مشرقی پاکستان کے جی او سی؛ پاکستان آرڈیننس فیکٹریز، واہ کینٹ کے چیئرمین اور سعودی عرب میں پاکستان کے سفیر رہے تھے۔ وہ بہت سی کتابوں بشمول ''سٹوری آف پاکستان آرمی'' اور ''پاکستانز کرائسس آف لیڈرشپ'' کے مصنف بھی تھے۔ ان کی ایک بیٹی، ڈاکٹر تسکین فضل الیاس بشیر احمد کے برادرِ نسبتی، ڈاکٹر ہمایوں حسن خان کے ساتھ بیاہی ہوئی ہیں۔ الیاس بشیر احمد کے ساتھ مجھے ڈاکٹر ہمایوں حسن خان کے ساتھ اپنی ملاقات بھی یاد ہے۔

اب تو مدت ہوگئی ہے الیاس بشیر احمد سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن فون یا ای میل پر رابطہ رہتا ہے۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ پر ان کا ایک پیغام موجود ہے جس میں انہوں نے اس کالج میں گزرے ہوئے وقت کی کچھ یادداشتیں قلمبند کی ہیں جنہیں پڑھ کر مجھے تحریک ہوئی کہ میں کیوں نہ ان سے گزارش کروں کہ وہ مجھے یہ حالات قدرے تفصیل سے سنائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری اس درخواست کو درخورِ اعتنا سمجھا اور مجھے کئی اقساط میں اپنی یہ کہانی سنائی۔ مجھے تو یہ کہانی بے حد پسند آئی۔ آپ بھی سنیے۔ میرا خیال ہے آپ بھی اس سے کماحقہٗ لطف اندوز ہوں گے۔

موصوف بتاتے ہیں: میں پندرہ سال کا بھی نہ ہوا تھا جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے دل و دماغ کی کایا پلٹ گئی ہو اور مجھے گمان ہونے لگا جیسے اب میں اپنے فیصلے خود کرنے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں چنانچہ میں نے سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ میری اگلی منزل گورنمنٹ کالج، لاہور ہوگی۔ میں امی کو آپا کہا کرتا تھا۔ میں نے اس فیصلے سے انہیں آگاہ کیا تو انہوں نے اپنے ردّعمل کے اظہار میں کوئی دیر نہیں لگائی۔ ان کا کہنا تھا: اپنے ابا سے بات کرو۔ اس قسم کے سب فیصلے وہی کرتے ہیں۔ کہنے کو تو انہوں نے یہ بات کہہ دی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابا سے بات کون کرے؟ میں بہت رویا دھویا، ضد کی، مچلا لیکن آپا جو اس سے پہلے میری ہر بات بہ آسانی مان لیا کرتی تھیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

وہ کہتے ہیں: میں دیکھ رہا تھا کہ آپا میرے کالج جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ایک نیا چم چم کرتا سیاہ رنگ کا بڑا صندوق بازار سے منگوایا گیا، گھر میں پہلے سے موجود ایک نیا خاکی بستر بند نکالا گیا اور میری ضرورت کی چیزوں کی لسٹ بننے لگی۔ تیاریاں ایسے ہو رہی تھیں گویا کسی دلہن کی رخصتی کا اہتمام کیا جا رہا ہو۔ ایک دن ابا جان نے

مجھے آپا کے سامنے بلایا اور اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: میں نے میاں صاحب (یعنی صاحبزادہ مرزا ناصر احمد) سے تمہارے داخلے کی بات کر لی ہے۔ ہم اگلے ہفتے ربوہ جائیں گے۔ میں نے اباجان کی طرف دیکھنے کی بجائے دکھ بھری نظروں سے آپا کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

الیاس بشیر احمد کی بات جاری تھی: گلگت سے راولپنڈی جہاز اور وہاں سے ربوہ تک چناب ایکسپریس کا سفر گویا حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام والا قصہ تھا۔ یہ قصہ میں بچپن سے سنتا آیا تھا اور آج یہی قصہ حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔ ربوہ میں اباجان کے کسی عزیز یا دوست کے ہاں قیام کی تفصیل اب مجھے بالکل یاد نہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ بیت مبارک کے قریب ہی کوئی گھر تھا جہاں ہم رات رُکے تھے۔ اگلی صبح نمازِ فجر کے لیے بیت مبارک جانا، واپس آ کر ناشتہ کرنا اور پھر دفتر پرائیویٹ سیکرٹری جانا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسی طرح پرائیویٹ سیکرٹری کا اباجان کو اشارے سے اندر جانے کا کہنا اور ہمارا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے کمرے میں داخل ہونا اِس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے اسی طرح ہے جیسے کل کی بات ہو۔ حضور نے جس پیار بھرے انداز میں ''بشیر احمد'' کہہ کر میرے ابا کو مخاطب کیا آج بھی میری سماعت پہ موسیقی سے کم نہیں۔ حضور فلالین کا شب خوابی کا لباس پہنے لیٹے ہوئے تھے۔ غالباً آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ ہم نے مصافحہ کیا اور حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ اباجان سے کیا بات ہوئی، مجھ سے کیا پوچھا، یہ کچھ یاد نہیں۔ میں خود کو ایک طلسماتی دنیا کا حصہ محسوس کر رہا تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ اباجان نے کہا: حضور! الیاس کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں، آپ کے پاس۔ حضور سے اپنی ہوش میں یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد جب بھی اباجان ربوہ آتے تو ان کے ساتھ میں حضور سے ملنے جاتا۔ ان ملاقاتوں کی تفصیل تو یاد نہیں لیکن ان کا سرور آج بھی میری ہستی کو لرزا دیتا ہے۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے

یہاں پہنچ کر الیاس بشیر احمد ایک لمحے کا توقف کرتے ہیں اور پھر مسکرا کر کہتے ہیں: ذہن پھر ایک صاف سلیٹ کی طرح ہو گیا ہے۔ کوئی نقش یاد نہیں رہا اب، کوئی تصویر نہیں ابھرتی۔ یہ کس مشکل میں ڈال دیا آپ نے مجھے۔ آپ کا اصرار اور میری ناطاقتی۔ میری یادوں کا گوشہ وقت کی گرد اور بڑھاپے کے جالوں سے اٹا پڑا ہے۔ ایک تہ سے نکلتا ہوں تو دوسری میں الجھ جاتا ہوں۔ بہر حال حکمِ حاکم۔ اگلا دریچہ وا ہوا۔ اباجان کے ساتھ گول بازار سے نکل کر دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں نظر آئیں۔ تھوڑی سی چڑھائی اور ایک پگڈنڈی سے گزرے۔ پھر اترائی اور سامنے چٹیل میدان۔ بیچوں بیچ ایک ریلوے لائن۔ اتفاق کہیئے کہ ایک ریل بھی اس وقت گزری۔ زندگی کے کچھ آثار نظر آئے ورنہ وہاں تو ہُو کا عالم تھا۔ ریلوے لائن کے پار البتہ ایک وسیع پختہ عمارت نظر آئی۔ ویسے میں ماحول سے بیگانہ صرف اپنے نئے کالے بوٹوں کی درگت پر پریشان تھا جو مٹی میں اٹے، پتھریلی زمین سے لگی خراشوں سے جیسے مجھ سے شکوہ کناں ہوں۔

الیاس بشیر احمد کہتے ہیں: میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اباجان کی آواز گونجی: یہ سامنے تمہارا کالج ہے۔ میاں صاحب نے دن رات ایک کر دیا ہے اسے بنوانے میں۔ میں نے ایک لاتعلق سرد مہری سے صرف ''جی''

کہا۔ کالج میں داخل ہوئے۔ ایک طویل پختہ روش پر چلتے ہوئے ایک آرچ نما گزرگاہ سے غالباً چار یا پانچ سیڑھیاں چڑھ کر ایک کاریڈور تھی۔ پھر فوراً ہی بائیں طرف پہلے کمرہ میں گھسے تو جنید ہاشمی نے پان کی لالی میں ڈوبی ہوئی دلرُبا مسکراہٹ سے اباجان کو خوش آمدید کہا اور ہاتھ ملایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہماری آمد متوقع ہو۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ان کی یہ مسکراہٹ میرے تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی یادوں میں سورج کی پہلی کرن کی طرح جگمگ جگمگ کرتی ہے۔ اباجان سے چند باتوں کے بعد انہوں نے مجھے داخلہ فارم تھما کر اسے پُر کرنے کا کہا۔ میں نے تعمیل کی۔ جنید صاحب نے میرا فارم لیا، دیکھا اور اپنی میز پر پڑے کالے رنگ کے انٹرکام کو اٹھایا اور گویا ہوئے: السّلام علیکم میاں صاحب! ڈاکٹر سیّد بشیر احمد صاحب...... جی گلگت والے...... اپنے بیٹے الیاس کے ساتھ میرے پاس بیٹھے ہیں...... جی میں بھجوا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اباجان کو پرنسپل صاحب کے کمرے میں جانے کا کہا۔

ہمارے یہ دوست صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے اپنی پہلی ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں اور اباجان کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک وسیع کمرہ، بڑی سی میز، اس کے پیچھے کرسی پر ایک بارعب شخص سفید شیروانی میں ملبوس، سر پر ہلکے سرمئی رنگ کی قراقلی ٹوپی، سرخ و سفید چاند سا چہرہ، ہلکی ترشی ہوئی پوری ڈاڑھی، ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ لئے بیٹھا تھا۔ وہ اباجان کی طرف بڑھا، معانقہ کیا اور خیریت دریافت کی۔ پھر بھرپور نظر سے جو میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی مجھے دیکھا اور ہاتھ ملا کر بیٹھنے کو کہا۔ ہم دونوں باپ بیٹا میز کے سامنے پڑی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ موصوف مجھ سے مخاطب ہوئے: کیا داخلہ فارم پُر کر لیا ہے؟ جی، میں نے کہا اور فارم سامنے میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے اسے ایک نظر میں پڑھ لیا۔ میں نے کن اَنکھیوں سے دیکھا، چھوٹا سا دستخط یا اِنیشیئل نظر آیا۔ اباجان کی بھرّائی آواز سنائی دی: اپنا سارا اثاثہ آپ کی امانت میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ پہلے کبھی گھر سے باہر نہیں رہا۔ میاں صاحب کہہ رہے تھے: آپ الیاس کو ہوسٹل لے جائیں۔ چوہدری محمد علی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس کے بعد کیا ہوا، یہ بھی الیاس بشیر احمد ہی کی زبانی سنیے: پرنسپل آفس سے نکلے، جنید ہاشمی سے اجازت لی اور ہوسٹل کا راستہ پوچھا۔ باہر نکلتے ہی بائیں جانب ہوسٹل کی عمارت تھی لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہوسٹل کے سامنے کوئی چہل پہل نہیں ہے۔ کالج کھلنے میں ابھی ایک یا دو دن باقی تھے اور ہوسٹل کے باسی غالباً ابھی آئے نہ تھے۔ مین دروازے پر ہوسٹل کا ایک کارکن، بشیر کھڑا تھا۔ اس نے اباجان سے سلام کے بعد آنے کی غرض و غایت پوچھی، پھر ہاتھ کے اشارے سے چوہدری محمد علی کے دفتر کا بتایا جو اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب کونے پر تھا۔ دروازے کے باہر ہوسٹل کا ایک اور ملازم، حسن دین ایک سٹول پر بیٹھا تھا۔ اس نے چک اٹھا کر اندر جھانکا، کچھ کہا اور ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ایک درمیانے قد کے، چھوٹے چھوٹے خانوں والے براؤن کوٹ، سیاہ پتلون، سفید قمیص اور سرخ پھولوں والی نکٹائی لگائے ایک قدرے جوان، ٹھوڑی پہ بہت چھوٹی سی ڈاڑھی والے شخص نے آگے بڑھ کر اباجان سے مصافحہ کیا۔ بعدۂ انہوں نے میری طرف قدرے گہری نظروں سے دیکھا،

ہاتھ ملایا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ یہ تھے چوہدری محمد علی جنہوں نے ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کا سینٹ لگا رکھا تھا جس کا جھونکا میں نے محسوس کیا۔ اچھا لگا۔ حیرانی ہوئی کہ یہاں بھی لوگ اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ دراصل میں نے اپنے گھر اور معدودے چند دوسرے گھروں کو چھوڑ کر اس کا استعمال بہت کم دیکھا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ تعارفی کلمات کے بعد چوہدری صاحب نے ہوسٹل کے قواعد وضوابط بتائے، اس کی خوبیاں گنوائیں، ہوسٹل کے گزشتہ اور موجودہ باسیوں پر ایک تفصیلی گفتگو کی جسے ابا جان نے تو نہایت انہماک سے سنا لیکن میں جس میں کوئی دلچسپی نہ لے سکا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک فارم دیا جو اسی وقت پُر کر دیا گیا۔ مختصراً یہ کہ داخلہ ہو گیا۔ پھر چوہدری صاحب نے ہمیں ہوسٹل کی سیر کرائی۔ سب سے پہلے کامن روم دکھایا جو اُن کے دفتر کے بالکل سامنے ایک وسیع وعریض ہال تھا جس میں ٹیبل ٹینس وغیرہ سبھی کچھ رکھا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت بیل بوٹے پینٹ سے بنائے گئے تھے جیسے وال پیپر لگایا گیا ہو۔ پھر ایک ڈارمیٹری اور ایک کیوبکل دکھایا۔ ڈائننگ ہال، نماز کا کمرہ اور باتھ رُومز جو بن چکے تھے لیکن جن میں ابھی شاور کونیکشن نہیں لگے تھے بھی دکھائے۔ دراصل کالج ایک سال پہلے ہی ربوہ آیا تھا اور اس میں بہت سی چیزیں مکمل ہونے والی تھیں۔ طے یہ پایا کہ ابا جان مجھے اگلے دن دوپہر بارہ بجے تک ہوسٹل میں چھوڑ جائیں گے کیونکہ اس سے اگلے روز کالج کھلنے والا تھا۔ چوہدری صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ہم واپس گول بازار پہنچے۔ ایک دکان تھی ماڈرن سٹور۔ شاید گول بازار کی سب سے بڑی دکان ہوگی۔ وہاں سے میرے لیے ایک ٹیبل لیمپ خریدا گیا۔ سیاہ رنگ کے پینیدے پر پیلے، سرخ اور ہرے پھولوں کے نقش والا۔ اس ٹیبل لیمپ نے بی اے کا امتحان پاس کرنے تک میرا ساتھ دیا۔

فضلِ عمر ہوسٹل میں اپنے پہلے دن کی داستان سناتے ہوئے الیاس بشیر احمد بتاتے ہیں: اگلے روز سامان تانگے پر لاد کر ابا جان عین بارہ بجے مجھے ہوسٹل لے گئے۔ اس دن وہاں خوب آمد ورفت تھی۔ تانگے پر تانگہ آ رہا تھا اور چھوٹے بڑے ہر شکل وصورت، قد وقامت کے لڑکے آ جا رہے تھے۔ کچھ بہت خوش، بااعتماد، کچھ کے چہروں پر ہوائیاں، بالکل میری طرح۔ چوہدری صاحب نے ابا جان کو بالکل بے فکر رہنے کو کہا اور حسن دین ہمیں لے کر کمرہ نمبر ۵۵ کی طرف چلا گیا۔ کمرہ کھولا۔ اس میں چار چار پائیاں دیواروں کے ساتھ بچھی تھیں جن کے ساتھ ہی ایک ایک الماری، ایک میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ میں شاید اس کمرے کا پہلا باسی تھا۔ حسن دین نے ایک معنی خیز مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور کہا: جو کونہ پسند آئے لے لیں۔ میری لیے سب کونے ایک جیسے تھے۔ ابا جان نے ایک کونہ چُنا اور میرا بستر کھول کر چار پائی پر بچھا دیا۔ حسن دین کمرے کا تالا چابی ہمیں دے کر یہ کہہ کر چلا گیا کہ میس کی گھنٹی بج چکی ہے۔ کھانا کھا لیں دو بجے سے پہلے۔ میرا دل ودماغ تو کہیں اور تھا۔ کمرے سے نکلے۔ ابا جان نے تالا لگایا، چابی مجھے پکڑائی اور ہم دونوں ہوسٹل کے دروازے تک آ گئے۔ ابا جان نے مجھے پیار کیا، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر تانگے کی طرف چل پڑے۔ سارا منظر ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں ایک باپ کا اپنے پیارے بیٹے کو چھوڑنے کا تھا۔ کمی تھی تو صرف ایک اور وہ یہ کہ سارے منظر میں شفیق ماں کہیں نہ تھی۔ ابا جان کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا تو سیڑھیوں پر بیٹھ کر چھوٹے بچوں کی طرح

بلک بلک کر رونے لگا۔ لڑکے دیکھ رہے تھے۔ کچھ نے کوئی توجہ ہی نہ دی، کچھ نے قہقہے لگائے۔ صرف ایک لڑکا جو عمر میں مجھ سے کچھ بڑا ہوگا میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا، ساتھ لے کر ایک طرف گیا، مجھے چپ ہونے کا کہا، پھر کچھ کہے بغیر کامن روم لے گیا اور کہا: چلو پنگ پانگ کھیلتے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا نام ناصر پراچہ ہے اور وہ سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہے۔ جانے کہاں ہوگا وہ اب! مجھے مل جائے تو میں اسے پورے زور سے اپنے ساتھ بھینچ لوں۔ کچھ دیر کھیلنے کے بعد ناصر نے کہا: چلو کھانا کھاتے ہیں اور مجھے میس لے گیا۔

اور اب ملاحظہ فرمایئے ڈائننگ ہال کا منظر۔ راوی الیاس بشیر احمد ہی ہیں۔ کہتے ہیں: یہ ایک ہال نما وسیع کمرہ تھا جس میں کھانے کی میزیں لگی تھیں۔ اردگرد کرسیاں پڑی تھیں۔ کونے میں ایک میز پر دو تین کرسیاں خالی دیکھ کر ناصر نے مجھے اس طرف لے جا کر بیٹھنے کو کہا۔ میز پر میز پوش بچھا تھا جو شاید سفید رنگ کا ہوگا لیکن اس وقت کسی سندھی اجرک کا نمونہ لگ رہا تھا۔ مختلف مقامات شوربے سے داغ داغ، کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ کہیں قہقہوں کی گونج، کہیں روٹی کی پکار۔ ایک میس بوائے ناصر کی طرف لپک کر آیا اور کچھ پوچھا۔ ناصر نے اپنی اور میری طرف اشارہ کر کے کہا: روٹی تازی لیائیں۔ کھانا آیا۔ ایک ایک پلیٹ ہمارے سامنے رکھی گئی جس میں کناروں تک شوربہ، اندر بھی کچھ ہوگا جو میں فوری طور پر سمجھ نہیں سکا۔ ہاں پلیٹ کے ایک طرف ہڈی کی ایک نوک جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ روٹیاں البتہ گرم گرم تازہ تندور سے اتری ہوئی تھیں۔ ناصر مزے سے کھا رہا تھا۔ میں نے بھی کوشش ضرور کی ہوگی لیکن بھنڈیوں کو تیراکی کا مقابلہ کرتے دیکھا اور ہڈی کو گوشت سے بالکل آزاد تو گھر یاد نہ آتا تو کیا ہوتا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ اتنے عرصے میں ناصر کھانا ختم کر چکا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا: کوئی بات نہیں، پہلا دن ہے۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔ پھر وہ میرے ساتھ میرا کمرہ دیکھنے کے لیے آیا۔ وہ دروازہ جسے ہم نے تالا لگایا تھا اب کھلا پڑا تھا۔ کچھ اور مکین آ گئے تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ایک میری عمر کا لڑکا آگے بڑھا اور ہاتھ ملاتے ہوئے صرف اپنا نام بتایا: منیر اور اپنا سامان کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ ناصر رخصت ہوا۔ شام تک ہمارے باقی ساتھی بھی آ گئے۔ محمد بخش اور سلیم۔ میں، منیر اور سلیم قمیص پتلون میں اور محمد بخش شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ ظہر کی نماز ہوئی، پھر عصر کی نماز ہوئی اور ہم کمرے میں واپس آ گئے۔ جھجکتے جھجکتے ایک دوسرے سے کچھ مزید تعارف۔ کامن روم کا چکر۔ مغرب کی نماز...... میس کی گھنٹی وغیرہ وغیرہ۔ یوں یہ دن گزرنے کو آیا۔

الیاس بشیر احمد فضلِ عمر ہوسٹل کے اپنے ابتدائی ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: سلیم کا تعلق وہاڑی سے تھا اور وہ خاصا پُراعتماد نظر آتا تھا۔ وہاڑی کہاں ہے، اس نے تفصیل سے ہمیں بتایا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ سلیم نے بتایا: پتا ہے غسل خانوں میں پانی کا کونیکشن صرف منہ دھونے اور وضو کرنے کا ہے، نہانے کے لیے ٹیوب ویل پر جانا ہوگا۔ میں نے کبھی ٹیوب ویل دیکھا نہ تھا۔ سوچا کوئی حمام قسم کی چیز ہوگی چنانچہ پوچھا: یہ ٹیوب ویل کہاں ہے؟ دُور، پلے گراؤنڈز سے پرے، جواب آیا۔ کیا الگ الگ حمام ہیں وہاں؟ میں نے پوچھا۔ میرے استفسار پر سلیم نے قہقہہ لگایا، منیر اور محمد بخش کو دیکھا اور یہ روح فرسا تصویر کھینچی: حمام کون سے؟ ٹیوب ویل بہت

بڑا ہے۔ایک بڑی سی پائپ سے پانی ایک حوض میں گرتا ہے۔وہیں نہانا ہوگا۔

اس خبر پر کہ الیاس بشیر احمد کو نہانے کے لیے ٹیوب ویل پر جانا ہوگا ان کا ردعمل ملاحظہ ہو۔ بتاتے ہیں: میں تو جیسے لرز گیا یہ سن کر۔ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں دیکھا کہ سارا ہوسٹل، ننگ دھڑنگ ایک حوض میں ڈبکیاں لے رہا ہے۔ میں نے تو ایسا کبھی دیکھا تھا نہ سنا۔ابھی تو میس کے کھانے کا مزا بھی نہ بھولا تھا کہ نہانے کے اس منظر نامے نے دل ودماغ کو چکرا دیا۔ یا اللہ کیسے کٹیں گے یہ دن، یہ ماہ وسال، میں نے سوچا اور کہیں سے یہ مصرع زبان پر وارد ہوا:

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے سِتم ہوئے

یہ تھا فصلِ عمر ہوسٹل میں الیاس بشیر احمد کا پہلا دن لیکن آہستہ آہستہ اُن کا دل یہاں لگنا شروع ہوگیا۔ سچ کہتے ہیں وہ: وقت کہیں تھما ہے کہ اب تھمتا۔ دن گزرتے گئے۔ ماحول مانوس ہوتا گیا۔ دوستیاں بڑھتی گئیں۔ اپنے روم میٹس کے علاوہ کچھ ڈے سکالر کلاس فیلوز کے ساتھ بھی بے تکلفی ہوگئی۔شروع میں ہوسٹل سے کالج، کالج سے ہوسٹل۔ زیادہ سے زیادہ ٹک شاپ کا ایک آدھا چکر۔ یہ تھا معمول ہمارا۔ جمعہ چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ بیت مبارک نماز کے لیے جاتے۔نماز کے بعد دو لوگوں سے خاص طور پر ملتا۔ دونوں عمر میں مجھ سے بڑے تھے لیکن بوڑھے نہیں، بالکل نوجوان تھے۔ دونوں جامعہ احمدیہ میں پڑھتے تھے: سیّد عبدالحیٔ اور محمود میر پوری۔ دونوں سے تعارف ابا جان نے کرایا تھا۔ دونوں کے نام اس لسٹ میں شامل تھے جو مجھے ہوسٹل میں ملنے آ سکتے تھے۔ دونوں سے مجھے بے انتہا پیار ملا، بالکل بڑے بھائیوں جیسی شفقت۔ آج اُنہیں یاد کرتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ہیں۔ انہیں مرحوم کیسے کہوں۔ میرے لیے تو وہ ہر آن زندہ وتابندہ ہیں۔ ایم ٹی اے پاکستان کو حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی رہنمائی میں چار چاند لگا کر کچھ ہی عرصہ ہوا ہم سے رخصت ہوئے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان دونوں نے مجھے سیلونی کی چائے کے لطف سے روشناس کرایا جس کا چائے خانہ سٹیشن کے قریب ہی ایک کچی لیکن صاف ستھری، چھوٹی سی، سبز پردوں والی جھگی جیسی جگہ واقع تھا۔ ویسے ان دونوں کی ''خونِ جگر چائے'' جو وہ اپنے ہوسٹل کے کچے کمروں میں اپنے سٹوو پر بناتے تھے بھی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ دونوں ہی اپنی اپنی ذات میں مسکراہٹیں بانٹنے اور بکھیرنے والے تھے۔ مجھے ان دنوں جامعہ احمدیہ کا تو کچھ علم نہ تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ ان دونوں کے ذریعے مجھے مسعود جہلمی، عبدالوہاب آدم، یحیٰ فضلی، یوسف ایاز جیسی نابغۂ روزگار شخصیات سے ملنے کا موقع ملا جن کی توجہ، جن کا پیار میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ یہ چند نام تو محض اپنی بات کو معتبر بنانے کے لیے لے رہا ہوں ورنہ یہ خزینہ تو میرے لفظوں کی پہنچ سے بہت باہر ہے۔ تعلیم الاسلام کالج کا فرسٹ ایئر کا ایک طالب علم جو ربوہ کا مکین بھی نہ تھا کم ہی جامعہ احمدیہ کے باسیوں کو اتنا ملا ہوگا۔

الیاس بشیر احمد اُس زمانے کی اور بھی بہت سی یادوں کو میرے ساتھ شیئر کرتے ہیں لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر کہنے لگتے ہیں: میری تعلیم الاسلام کالج کی یادیں مواد سے زیادہ تفصیل پر مبنی ہیں۔ ایک کم عمر، نوآموز لاابالی لڑکے سے جو ذہین وفطین بھی نہ ہو آپ کہاں یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ ایک عمر کے بن باس کے بعد وہ آپ کو

اپنے شب وروز کی سرگزشت تفصیل کے ساتھ سنا سکتا ہے۔ مختصراً اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری ذات، میرے محدود علم اور میرے عقیدے کا سارا سفر وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی گمنام بستی میں مجھے ایسے تربیت ہوئی، میں ایسی نامور شخصیتوں سے ملا جن کے بارے میں کہہ سکتا ہوں:

یہ ایک نام نہ ہوتا تو اس اندھیرے میں
نہ جانے کتنی امیدیں، نہ جانے کتنے خیال
یونہی پکارتے تھوڑی سی روشنی کے لیے

وہ اپنے پرانے دوستوں اور مہربانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہیں میں اسلام بھٹی سے ملا۔ یہیں چوہدری حمید، پرویز پروازی اور سعید رحمانی سے ملاقات ہوئی۔ یہیں دو غیر ملکی طلبہ، سعید عبداللہ اور ابوبکر میرے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے اور یہیں میں نے چوہدری محمد علی سے محبت کے نئے اسلوب سیکھے اور پروفیسر سعید اللہ خان کی معصومیت کا مشاہدہ کیا۔ یہاں نہ ہوتا تو میری خان ارجمند خان سے کہاں ملاقات ہونا تھی، مولانا ابوالعطا جالندھری کی رہنمائی کس طرح میسر آتی اور صوفی بشارت الرحمٰن کی پدرانہ سرزنش سے کہاں فیض یاب ہوتا؟ سمجھ نہیں آ رہی کہ کس کس کا نام لوں اور کس کا چھوڑوں؟ یہاں نہ آتا تو رفقائے کرام حضرت مسیح موعود سے کہاں ملتا، کہاں ان کے پُرشفقت مصافحوں سے لطف اندوز ہوتا اور کہاں ان کی بارگاہِ ایزدی میں قبولیت پانے والی دعاؤں کا مصداق بنتا۔

یہاں پہنچ کر الیاس بشیر احمد چند لمحوں کے لیے رُکے اور پھر یوں گویا ہوئے: اب تک میں نے جو نام لیے ہیں خاصے معروف ہیں کیونکہ ان تمام دوستوں کی اپنے اپنے حلقے میں ایک خاص پہچان ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جنہوں نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا میں صومالیہ کے ابوبکر اور سعید عبداللہ کا قدرے تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ ابوبکر مجھ سے کچھ سینئر تھا۔ اس کا سدا مسکراتا چہرہ اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ عام حالات میں وہ انتہائی خوش مزاج تھا اور ہروقت ہنستا رہتا لیکن غصے میں آتا تو گویا پاگل ہوجاتا۔ وہ اس کیفیت میں اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکرانے لگتا لیکن اس کا غصہ پھر بھی ٹھنڈا نہ ہوتا۔ ایک بار تو اس نے اینٹ اٹھا کر اپنے سر پر مار لی لیکن سر کو کوئی نقصان پہنچنے کی بجائے اینٹ ٹوٹ گئی۔ وہ فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ ان دنوں فٹ بال کے میچ اس گراؤنڈ میں ہوا کرتے تھے جو اَب صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کی چاردیواری میں آ چکا ہے۔ لوگ خاص طور پر اس کا کھیل دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ جب وہ اچھل کر فٹ بال کو اپنے ماتھے کے ساتھ اچھالتا تو تماشائی حبّذا! حبّذا! کے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ وہ ایک اچھا ڈِبیٹر اور ہوسٹل کا میس چیمپئن بھی تھا۔ مجھے یاد ہے سالن کی دس پلیٹوں اور بیس چپاتیوں پر ہاتھ صاف کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سعید عبداللہ البتہ ابوبکر سے مختلف تھا۔ وہ دھیمے مزاج کا تھا۔ چھٹیوں میں جب ربوہ میں مقیم غیر ملکی طالب علموں کو کالج کی طرف سے مری بھجوا دیا جاتا سعید عبداللہ کے ساتھ میری خط وکتابت رہتی۔ اس کا خط بے حد خوبصورت تھا اور اس کی تحریر دیکھ کر گمان ہوتا تھا گویا موتیوں کی لڑی پرو دی گئی ہو۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے الیاس بشیر احمد نے اُس میس نائٹ کی کچھ تفصیلات بتائیں جس میں

حضرت مرزا بشیر احمد مہمانِ خصوصی تھے اور الیاس بشیر احمد نے بطور چیف پریفیکٹ خطبۂ استقبالیہ پیش کیا تھا۔ یقیناً آپ کو بھی ان تفصیلات سے دلچسپی ہوگی لہٰذا سنیے کیا کہتے ہیں ہمارے یہ دوست: سال ہوگا ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء۔ فضل عمر ہوسٹل کا اینول ڈِنر تھا جسے کامیاب بنانے کے لیے چوہدری محمد علی جیسے اپنی جان کی بازی لگا بیٹھے تھے۔ خاص اہتمام ہوئے چیف گیسٹ چُننے میں۔ خاص مہمانوں کی لسٹ بنانے میں انہوں نے نہ جانے کتنے آنسو بہائے ہوں گے۔ مجھے بلایا۔ اپنی نہ بھولنے والی مسکراہٹ والے ہونٹوں سے یوں گویا ہوئے: الیاس! پتا ہے نا کہ اس اینول ڈِنر میں چیف گیسٹ حضرت مرزا بشیر احمد ہوں گے۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بھی ساتھ ہوں گے۔ تم نے ویلکم ایڈریس پیش کرنا ہے۔ تیاری کرلو۔ مجھے بھی دکھا دینا۔ میری آنکھوں میں تو جیسے تارے ناچ گئے۔ سارا وجود پسینے میں نہا گیا۔ میں ہی کیوں چوہدری صاحب؟ میں نے پوچھا۔ جواب ملا: یہ چیف پریفیکٹ کا کام ہے اور تم مت بھولو کہ چیف پریفیکٹ تم ہو۔ بس ہری اَپ اینڈ سٹارٹ پرِیپیئرنگ۔ مجھ سے پوچھیں تو کیا میں اور کیا میری تیاری۔ زندگی اک سراب سی لگی۔ لفظوں کی پرچھائیاں جیسے خیالات کی دُھند میں تیر رہی ہوں۔

بالآخر وہ لمحہ آ پہنچا۔ میں نے چوہدری صاحب کے ساتھ ہوسٹل کے صدر دروازے پر حضرت مرزا بشیر احمد کا استقبال کیا۔ چوہدری صاحب ساتھ چلتے جھکے چلے جا رہے تھے۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد اور دوسرے معززین ساتھ تھے۔ ہوسٹل کے بیچوں بیچ صحن میں ایک میز جس کے پیچھے ایک بڑی سی کرسی پر حضرت مرزا بشیر احمد بیٹھے، دائیں طرف صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور بائیں طرف صاحبزادہ مرزا طاہر احمد تشریف فرما ہوئے۔ ہوسٹل کے باسی اور دوسرے مہمان سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

تلاوتِ قرآن اور نظم کے بعد چوہدری صاحب نے بڑی میز کے ساتھ کھڑے ہوکر حضرت میاں صاحب اور مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور میرا نام لے کر کہا کہ حضرت میاں صاحب کی اجازت سے ہمارے چیف پریفیکٹ استقبالیہ ایڈریس پیش کریں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اٹھا، سر پر ٹوپی سیدھی کی اور کاغذ پر لکھے بے جوڑ لفظوں کا اظہار پڑھنا شروع کیا۔ کیا لکھا تھا اور کیسے پڑھا، یہ یاد نہیں۔ آخری لفظ پڑھ کر صدرِ مجلس کو اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ یوں لگا جیسے ایک شفیق باپ، نور کا ہالہ پہنے، مجھے اپنی طرف اشارے سے بلا رہا ہو۔ میں لڑکھڑاتے قدموں آپ کے پاس گیا اور جھک کر مصافحہ کیا۔ آپ نے نہایت شفقت سے میرے کانپتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، میرا نام پوچھا اور کچھ کہا جو میں وفورِ جذبات میں سمجھ ہی نہ سکا۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد پیار سے ملے، ایڈریس کی تعریف کی۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے شاید پہلی بار اپنے مصنوعی غصے میں ایک دلفریب مسکراہٹ کا نور بھر دیا۔ بات آئی گئی ہوگئی جیسے اک عمر بیت گئی:

اب نہ تو ہے نہ وہ میں ہوں نہ وہ ماضی ہے فراز

کالج کی اس سال کی سالانہ رپورٹ میں جو الفضل میں چھپی ہوئی موجود ہے اس فنکشن کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا تھا: ”یوں تو ہوسٹل کا سالانہ فنکشن ہر سال اپنی ذات میں ایک معیاری حیثیت کا حامل ہوا کرتا ہے لیکن اس سال اس کی شان منفردانہ اور نرالی تھی۔ اس میں نہ صرف مقامی معززین شہر اور تحریک و صدر انجمن کے وکلاء اور ناظر صاحبان

و افسرانِ صیغہ جات، سٹاف کالج اور پرنسپل نے شرکت کی اور پرنسپل اور مولوی قدرت اللہ صاحب سنوری نے طلبہ سے خطاب کیا بلکہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم اے سلمہٗ نے بھی از راہِ کرم شمولیت فرمائی اور اپنے دستِ مبارک سے انعامات تقسیم فرمائے اور اجلاس کی صدارت فرمائی۔ نیز طلبہ اور سٹاف کو نہایت قیمتی اور مفید نصائح سے نوازا۔“

الیاس بشیر احمد مزید بتاتے ہیں: ۲۰۰۵ء کے خوفناک زلزلہ جس نے سارے پاکستان کو اپنی لرزہ خیز تباہی کا محور بنایا کے موقع پر ہیومینیٹی فرسٹ جو کسی بھی آسمانی آفت کا شکار ہونے والے افراد کے زخموں پہ مرہم رکھتی ہے کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ ان کی ایک ٹیم بھی زلزلہ زدگان کی مدد کو پہنچی۔ ہمارے ہالینڈ سے ڈاکٹر صلاح الدین لغاری اور ایک نوجوان نومبائع Dr. Abdul Huq Compere بھی وہاں گئے۔ مشن مکمل ہونے پر وہ ربوہ بھی تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالحق کا ربوہ دیکھنے کا شاید یہ پہلا موقع تھا۔ ڈاکٹر لغاری نے انہیں مرکز کی معروف شخصیات جن میں صدر انجمن احمدیہ کے ناظران اور تحریک جدید انجمن احمدیہ کے وکلا شامل تھے سے ملایا۔ بزرگان کی اس فہرست میں چوہدری محمد علی بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق مجھے ہمیشہ بہت پیار سے ملتے ہیں۔ ربوہ سے واپسی پر بھی ملے۔ انہوں نے جو کچھ مجھے بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کی چوہدری محمد علی کے ساتھ ملاقات کے دوران بہت سی باتیں ہوئیں۔ جب چوہدری صاحب کو معلوم ہوا کہ موصوف ہالینڈ سے تعلق رکھتے ہیں تو انہوں نے بڑی محبت سے اس عاجز کا ذکر کیا اور ڈاکٹر عبدالحق سے دریافت کیا کہ کیا وہ مجھے جانتے ہیں۔ جب ڈاکٹر عبدالحق نے تصدیق کی کہ وہ مجھ سے بخوبی واقف ہیں تو چوہدری صاحب نے بہت سی اور باتوں کے علاوہ اس اینول ڈنر کا ذکر بھی چھیڑ دیا اور بتایا کہ اس کے بعد جب بھی ان کی حضرت مرزا بشیر احمد سے ملاقات ہوئی، وہ ضرور اس تقریب کو یاد کرتے اور پھر بڑی محبت سے دریافت فرمایا کرتے: جس لڑکے نے ایڈریس پڑھا تھا وہ آج کل کہاں ہوتا ہے اور کیسا ہے؟

ہمارے یہ دوست بجا طور پر کہتے ہیں: حضرت مرزا بشیر احمد کے پیار کے اس اظہار اور مستقبل کے دو خلفائے احمدیت کی معیت کو خدا کا انعام اور تعلیم الاسلام کالج میں گزرے اپنے سالوں کا ماحصل نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں؟

اس موضوع پر اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے الیاس بشیر احمد کہتے ہیں: باتیں اور بھی بہت سی کرنے والی ہیں لیکن اس کے لیے تو مجھے ایک کتاب لکھنا ہوگی۔ ہاں! میری بات ختم ہونے سے پہلے مجھ سے تھامس مُور کے یہ اشعار ضرور سن لیں:

When, round the bowl of vanished years
We talk with joyous seeming -
With smiles that might as well be tears,
So faint, so sad their beaming;
While memory brings us back again
Each early tie that twined us,

O, sweet's the cup that circles then
To those we've left behind us!
And when in other climes we meet
Some isle or vale enchanting,
Where all looks flowery, wild, and sweet,
And nought but love is wanting;
We think how great had been our bliss
If Heaven had but assign'd us
To live and die in scenes like this,
With some we've left behind us!

الیاس بشیر احمد کی یادداشتیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے ان ہی کے ایک ہم جماعت، ڈاکٹر کریم اللہ زیروی سے جو صوفی خدابخش عبد زیروی کے صاحبزادے ہیں اور آج کل امریکی ریاست نیوجرسی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں تعلیم الاسلام کالج سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور تعلیم الاسلام ہائی سکول، گھٹیالیاں میں ایک سال تک پڑھانے اور بی ایڈ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ یونیورسٹی میں دوم رہے چنانچہ انہیں اگلے ہی سال فارما کالوجی میں پی ایچ ڈی کے لیے ایک امریکن یونیورسٹی سے فُل برائٹ ہیز ایوارڈ اور ریسرچ گرانٹ مل گئی۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد وہ پاکستان اور ایران میں ملازمت کرتے رہے لیکن ۱۹۷۸ء میں مستقل طور پر امریکہ منتقل ہو گئے۔ انہیں امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں کام کا موقع ملا اور خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سے اعزازات سے نوازا۔ ان کے بہت سے مقالہ جات سائنسی تحقیقی مجلّوں میں شائع ہو چکے ہیں اور وہ امریکن ایسوسی ایشن آف کینسر ریسرچ اور امریکن سوسائٹی فار ایڈوانسمنٹ آف سائنس کے ممبر ہیں۔ اب تک اسلامی اور بعض جماعتی موضوعات پر ان کی چھ کتب بھی چھپ چکی ہیں۔ جیسا کہ میں اپنی کتاب ''قریۂ جاوداں'' میں ذکر کر چکا ہوں ''وہ سات سال تک مجلس انصار اللہ امریکہ کے صدر، کم و بیش نو سال تک جماعت احمدیہ امریکہ کے نیشنل ایجوکیشن سیکرٹری اور گیارہ سال تک احمدیہ گزٹ امریکہ کے ایڈیٹر رہے ہیں۔'' وہ آج کل ''مُسلم سَن رائز'' کے سینئر ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اس مجلّے کی اشاعت حضرت مفتی محمد صادق کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ وہ احمدیہ...... سائنٹسٹس ایسوسی ایشن، امریکہ کے صدر اور احمدیہ...... میڈیکل ایسوسی ایشن، امریکہ کے جنرل سیکرٹری رہے ہیں۔ اسی طرح وہ شاہد وائیوا ایگزامینیشن، جامعہ احمدیہ، کینیڈا کے رکن اور ممبر قضا بورڈ بھی ہیں۔

موصوف سے تعلیم الاسلام کالج میں ان کے گزرے ہوئے وقت کی بات ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد سے بات شروع کرتے ہیں جس نے نامساعد حالات کے باوجود انہیں تکمیلِ تعلیم کی توفیق عطا فرمائی اور جب وہ عملی زندگی

میں داخل ہوئے تو ان پر اپنے انعامات کی بارش فرما دی۔ وہ کہتے ہیں: میں چاہوں بھی تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ حضرت مسیح موعود کے الفاظ میں:

میں تھا غریب و بیکس و گمنام و بے ہنر

لیکن اللہ نے مجھے فرش سے عرش پر پہنچا دیا اور مجھے اتنی بھرپور زندگی گزارنے کی توفیق دی چند سال پہلے تک جس کا تصور بھی میرے لیے محال تھا۔

وہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۵۵ء میں وہ میٹرک کے فوراً بعد کراچی چلے گئے تھے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ انہیں کوئی ملازمت مل جائے تاکہ وہ اپنے گھریلو مسائل کے حل میں اپنے والدِ بزرگوار کا ہاتھ بٹا سکیں لیکن وہ اپنے تعلیمی پس منظر میں کسی اعلیٰ ملازمت کی توقع نہ رکھ سکتے تھے چنانچہ انہیں کام ملا بھی تو ایک تعمیراتی کمپنی میں سیکیورٹی گارڈ کا۔ انہیں یہ کام کرتے ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اچانک انہیں اپنی والدہ کی وفات کی اطلاع اور اپنے والد بزرگوار کی طرف سے ربوہ واپس آنے کا حکم موصول ہو گیا جس کی انہوں نے فوراً تعمیل کی۔

کریم اللہ تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس داخلہ فیس کے لیے پوری رقم موجود نہ تھی لہٰذا وہ گھر بیٹھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد کا انتظار کرتے رہے۔ تین مہینے گزرے ہوں گے کہ ان کے والد بزرگوار کو دفتر امانت میں ملازمت مل گئی۔ اس دفتر میں کام کرتے ہوئے ان پر انکشاف ہوا کہ یکصد روپیہ کی ایک رقم جو کسی وقت کریم اللہ کی دادی مرحومہ کی طرف سے جمع کرائی گئی تھی ایک غلط نام کے تحت جمع شدہ دکھائی جا رہی ہے۔ ضروری تحقیقات کے بعد یہ رقم صوفی خدابخش عبد کے نام منتقل ہوئی اور وہاں سے کریم اللہ کے داخلہ فیس کے طور پر استعمال میں آئی۔ یوں وہ کالج پہنچ گئے لیکن اپنے مخدوش مالی حالات کی وجہ سے کتابوں اور کاپیوں کی خریداری سے عاجز تھے۔ وہ بتاتے ہیں: میں نے انٹرمیڈیٹ پری میڈیکل گروپ میں داخلہ تو لے لیا مگر کتابیں اپنے ساتھیوں سے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت تک ربوہ میں بجلی آ چکی تھی مگر ہمارا گھر اس سے محروم تھا لہٰذا مجھے لالٹین کی روشنی میں پڑھنا پڑتا تھا۔ ان حالات میں نتیجہ حسبِ توقع ہی آیا۔ میں ایف ایس سی میں اتنے نمبر حاصل نہ کر سکا کہ میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ بچا تھا کہ میں بی ایس سی کر لوں۔ بیالوجی اور زوآلوجی کے مضامین کا اس کالج میں combination نہیں تھا اور ربوہ سے باہر جا کر پڑھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی چنانچہ مجبوراً مجھے فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ بی ایس سی کرنا پڑی۔

جب کریم اللہ سے پوچھا جائے کہ ان کے زمانے میں کالج کا ماحول کیسا تھا تو وہ کہتے ہیں: ایک دم اچھا۔ ہمارے اساتذہ وقف کے جذبے سے سرشار تھے۔ آپ ان سب کے ناموں سے خوب واقف ہیں لہٰذا انہیں دہرائے بغیر میں یہاں صرف یہ عرض کروں گا کہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد طلبہ کے مسائل کے حل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں خود فیس معافی کے سلسلے میں کئی بار آپ کے گھر پر حاضر ہو کر گزارش کرتا رہا اور آپ نے ہر بار میری درخواست کمال توجہ سے سنی اور ممکن حد تک اعانت بھی کی۔

وہ کہتے ہیں: میرے کلاس فیلوز میں مرزا ادریس احمد، سیّد امین احمد، مولود احمد خاں، مبشر شیخ،

عبدالرشید غالب، عبدالرؤف غنی، منور احمد نمی، حبیب الرحمٰن درد، سلیم صدیقی، لطف الرحمٰن محمود اور انیس احمد شامل ہیں۔

مرزا ادریس احمد صاحبزادہ مرزا منصور احمد کے بیٹے اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے بھائی تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بی ایس سی کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں بطور سائنس ٹیچر کام کرتے رہے اور بعد میں پاکستان چپ بورڈ فیکٹری، جہلم میں رہے۔ اب وفات پا چکے ہیں۔

امین چھوٹی آپا کے بھائی تھے۔ اب وہ بھی وفات پا چکے ہیں۔

مولود احمد خان نواب مسعود احمد خان کے صاحبزادے ہیں اور آج کل امیر جماعت کراچی ہیں۔

مبشر شیخ کے والد جن کا نام غالباً شیخ ضیاء الحق تھا پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے اور حیدر آباد (سندھ) میں کام کر رہے تھے۔ مبشر نے گریجوایشن کے بعد کسی بنک میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۹۳ء میں اسلام آباد میں ہوئی تھی جہاں وہ بنک منیجر تھے۔ تب سے ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔

عبدالرشید غالب کیپٹن نواب دین کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ایگریکلچر ڈیویلپمنٹ بنک آف پاکستان میں ملازم رہے۔ اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

عبدالرؤف غنی تعلیم الاسلام کالج والے عبدالرشید غنی کے چھوٹے بھائی اور میرے سوتیلے ماموں ہیں۔ انہوں نے بعد میں ایم بی بی ایس کر لیا تھا اور کئی سال نائیجیریا گزارنے کے بعد اب مدتِ مدید سے کیلگری میں رہ رہے ہیں۔

منور نمی بی ٹی صاحب کے بیٹے تھے۔ وہ انگلستان چلے گئے تھے اور اپنی زندگی کے آخری سالوں میں گاسگو میں مقیم تھے۔ اب وفات پا چکے ہیں۔

حبیب الرحمٰن درد نامور خادم سلسلہ عبدالرحیم درد کے بیٹے ہیں۔ حبیب بنک میں ہوا کرتے تھے لیکن اب کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔

لطف الرحمٰن محمود پروفیسر عطاء الرحمٰن کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ لمبا عرصہ افریقہ کے بعض جماعتی سکولوں میں پڑھانے کے بعد امریکہ میں آباد گئے تھے۔ حال ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

انیس جو ڈپٹی محمد شریف کے صاحبزادے ہیں آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔

کریم اللہ مزید بتاتے ہیں: تعلیم الاسلام کالج میں میرے ہم عصروں میں صاحبزادہ مرزا انس احمد، وکیل اشاعت، تحریک جدید انجمن احمدیہ؛ شاہد احمد پاشا؛ سیّد مشہود احمد المعروف شُودی اور عبدالباسط شامل ہیں۔ ان میں سے مرزا انس احمد کی ذات تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ شاہد احمد پاشا حضرت نواب محمد عبداللہ خان کے صاحبزادے ہیں۔ شُودی مسز شاہ، پرنسپل، جامعہ نصرت کے صاحبزادے تھے اور عبدالباسط لطیف بھٹے والے کے بیٹے تھے۔ شاعر تھے اور ان کا کلام ''دشتِ سخن'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ہم احمدی بچے ہیں کچھ کر کے دکھا دیں گے

والی مشہور نظم ان ہی کی ہے۔ ٹیکسٹائل انجینئر تھے جو پُر اسرار حالات میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

کریم اللہ زیروی کہتے ہیں: میرے دیگر ہم عصروں میں سعید کا کا جو چوہدری محمد شریف مجاہد بلادِ عربیہ کے داماد اور پلاننگ کمیشن کے ملازم تھے؛ مرزا مبارک احمد کے صاحبزادے مجیب المعروف جیبی جو گول بازار میں ایک ٹریول ایجنسی چلاتے رہے ہیں اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے خاندان کے ایک نوجوان، حفیظ بھی شامل تھے۔

آپ کریم اللہ زیروی کے پاس بیٹھ جائیں تو وہ اپنے زمانے کے تعلیم الاسلام کالج کی اور بھی بہت سی باتیں سناتے ہیں جنہیں آپ تک پہنچانے کے لیے بہت وقت چاہئے لہٰذا ان سے اجازت طلب کرتے ہوئے ہم اب ایک اور دوست کے پاس چلتے ہیں۔

اگر آپ الفضل کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں یا ہفت روزہ ''لاہور'' آپ کی نظر سے گزرتا رہا ہے تو آپ راجہ نصر اللہ خاں کے نام سے ضرور واقف ہوں گے جو خود کو پروفیسر راجہ نصر اللہ خان کہلوانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ ڈلوال ضلع چکوال کے رہنے والے ہیں اور میٹرک تک اپنے قصبے کے ایک قدیمی سکول، بیلجیئم مشن ہائی سکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے۔ وہ پانچ سال یہاں زیرِ تعلیم رہے اور پھر بہاولپور سے بی ایڈ کا امتحان اور گورڈن کالج، راولپنڈی سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ راولاکوٹ اور پشاور کے بعض تعلیمی اداروں میں پڑھایا لیکن پھر لندن چلے گئے جہاں وہ کم و بیش دو سال مقیم رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے سپوکن انگلش کا ایک کورس کیا اور سوشل سیکیورٹی کے محکمہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی عرصے میں ٹائمز آف لنڈن میں چھپا ہوا ایک اشتہار ان کی نظر سے گزرا جس کے ذریعے سعودی عرب میں انگریزی اساتذہ کی بعض اسامیاں مشتہر ہوئی تھیں۔ انہوں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا اور منتخب بھی ہو گئے۔ وہ سعودی عرب کی وزارت المعارف کے تحت جیزان اور دمام نامی دو شہروں میں سولہ سترہ سال ملازمت کرتے رہے تاہم ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپس آ گئے اور ربوہ میں ڈیرہ لگا لیا۔ کچھ عرصہ تک جامعہ احمدیہ میں انگریزی پڑھانے پر مامور رہے لیکن پھر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان کے مضامین علی الخصوص ہفت روزہ ''لاہور'' اور الفضل میں بکثرت شائع ہونے لگے۔ انہوں نے ۱۹۹۶ء میں ربوہ میں ''ہمیون ہاؤس'' نامی ایک پرائیویٹ سکول کی بنیاد رکھی جو اَب تک چل رہا ہے۔

موصوف کو ایف ایس سی پاس کرنے میں ایک سال فالتو لگ گیا جس کے بعد وہ ''راہِ راست'' پر آ گئے اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔ ان کا ایک مضمون پولیٹیکل سائنس تھا جو صاحبزادہ مرزا ناصر احمد خود پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ہم دس بارہ لڑکے ہوا کرتے تھے۔ میاں صاحب اپنے دفتر میں ہی کلاس لیتے تاہم لیکچر شروع کرنے سے پہلے ہمیشہ اپنا گاؤن زیبِ تن کرتے۔ انہیں یہ بھی یاد ہے کہ پرنسپل آفس میں ایک الماری ہوا کرتی تھی جس میں میاں صاحب کی پسندیدہ کتب پڑی رہتی تھی۔ بعض دفعہ میاں صاحب یہ کتب اپنے شاگردوں کو بھی دکھایا کرتے اور انہیں مطالعہ کا شوق دلاتے تھے۔

نصر اللہ کو صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی شفقت و محبت کے کئی واقعات یاد ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب ایف ایس سی کے امتحان میں کیمسٹری کے مضمون میں میری سپلیمنٹری آ گئی تو میں سخت پریشان تھا کہ کہیں دوبارہ

بھی میرے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ میرے والد گرامی کے آپ کے ساتھ قریبی مراسم تھے چنانچہ وہ آپ کے پاس گئے اور اجازت طلب کی کہ میں کالج کا سٹوڈنٹ نہ ہونے کے باوجود کالج کے باضابطہ طلبہ کے ساتھ اس مضمون کے پریکٹیکل کرسکوں۔ میاں صاحب نے بکمالِ مہربانی یہ اجازت مرحمت فرمادی جس کی وجہ سے میری علیمی کمی پوری ہوگئی اور میں اس مضمون میں کامیاب ہوگیا۔

ان کے بڑے بھائی، راجہ بیرم خان نے اُس زمانے میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تھا جب یہ کالج لاہور میں ہوا کرتا تھا تاہم انہوں نے گریجوایشن کالج کی ربوہ منتقلی کے بعد کی۔ وہ کشتی رانی کے اپنے وقت کے نامی کھلاڑی تھے اور کالج کے پرنسپل اور اکثر اساتذہ کو اس بات کا علم تھا چنانچہ وہ نصر اللہ کو اس حوالے سے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

انہیں یہ بات اب تک نہیں بھولی کہ ۱۹۵۶ء کے فتنہ منافقین کے دوران محلّہ دارالصدر غربی کے ایک رہائشی، منیر محمود نے جو چک ۳۷ جنوبی، سرگودھا کے رہنے والے تھے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے باڈی گارڈ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ نصر اللہ اب یہ تو نہیں بتا سکتے کہ منیر نے کتنا عرصہ یہ خدمت سرانجام دی البتہ انہیں یہ یاد ہے کہ وہ کالج میں ہمیشہ آپ کے پیچھے پیچھے رہتے اور خیال رکھتے کہ کوئی آپ کو جسمانی گزند پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔

نصر اللہ کو اپنے کلاس فیلوز میں سے انور حسن، سلیم صدیقی، مبارک راجوری اور انیس کاہلوں کے نام اب تک یاد ہیں۔ انور حسن جنہوں نے بعد میں زندگی وقف کردی تھی اور سلیم صدیقی جو کینیڈا منتقل ہو گئے تھے اب قضائے الٰہی سے وفات پا چکے ہیں۔ رہے مبارک راجوری اور انیس کاہلوں کو راجہ نصر اللہ مدتِ مدید سے اُن سے ملاقات سے محروم ہیں۔

انہیں کالج کے زمانے کا ایک مشاعرہ ابھی تک نہیں بھولا جس میں قتیل شفائی اور کلیم عثمانی بھی شریک ہوئے تھے۔ دونوں شاعر ترنّم سے پڑھتے تھے۔ انہیں قتیل شفائی اور کلیم عثمانی کی پڑھی ہوئی غزلوں سے کچھ شعر یاد رہ گئے ہیں۔ آپ بھی سن لیجئے۔

قتیل شفائی کے اشعار تھے :

ہم ان کے تغافل کو ادا جان رہے ہیں
کچھ لوگ یہی بات برا مان رہے ہیں
اے حضرتِ ناصح ہمیں الزام نہ دیجے
اس عمر میں کچھ آپ بھی نادان رہے ہیں

کلیم عثمانی نے کیا خوب کہا تھا:

زندگی غم کی کڑی دھوپ میں دَم لینے کو
آپ کے سایۂ دیوار تک آ پہنچی ہے
آتشِ غم تو سلگتی ہے مرے سینے میں
آنچ کیوں آپ کے رخسار تک آ پہنچی ہے

اب تک نصر اللہ کی سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر ''جو دل پہ گزرتی ہے'' (ہفت روزہ ''لاہور'' میں ان کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ جس کا پیش لفظ ثاقب زیروی نے لکھا تھا)؛ ''تعمیر و ترقیٔ پاکستان میں جماعت احمدیہ کا مثالی کردار'' یعنی چوہدری ظفر اللہ خان، ڈاکٹر عبدالسلام، ایم ایم احمد، جنزل اختر حسین ملک اور جنزل عبدالعلی ملک کی ملّی خدمات کا تذکرہ؛ انور کاہلوں کی انگریزی کتاب Zafarullah Khan: My Mentor کا اردو ترجمہ بعنوان ''میرے محسن و مربی: ظفر اللہ خان'' اور ''حاصلِ شام و سحر'' یعنی فاضل مصنف کے الفضل میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ شامل ہے۔

موصوف آج کل محلّہ دارالصدر غربی میں مقیم ہیں اور علمی خدمات میں ہمہ تن مشغول۔

اس کتاب میں ایک سے زیادہ جگہوں پر یہ ذکر موجود ہے کہ تعلیم الاسلام کالج میں طلبہ کو بلا امتیازِ مذہب و ملت داخلہ دیا جاتا تھا اور اس بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس حوالے سے بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں تاہم فی الوقت دو ناموں پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ میرا اشارہ ڈاکٹر کنول فیروز اور افتخار احمد شہاب کی طرف ہے۔

دسمبر ۲۰۰۴ء میں ہندوستان میں پٹیالہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شمولیت کے لیے حکومتِ پنجاب کی طرف سے ایک وفد بھجوایا گیا تھا۔ راقم الحروف کو بھی اس وفد میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کانفرنس کی بدولت نہ صرف ہندوستان کے بہت سے ادبا اور صحافیوں سے بلکہ پاکستان سے جانے والے وفد میں شامل بعض افراد سے بھی پہلی بار ملاقات کا موقع ملا۔ ڈاکٹر کنول فیروز ان ہی لوگوں میں شامل تھے۔

ان سے دو چار ملاقاتوں کے بعد انکشاف ہوا کہ وہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں ایف اے کے طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قیام پاکستان کے وقت ان کے والد (جو آرڈیننس ڈپو میں ملازم تھے) اور والدہ (جو لیڈی ہیلتھ وِزِیٹر تھیں)، دونوں کی تعیناتی فیروز پور میں تھی۔ برطانوی حکومت کی طرف سے یہ اختیار ملنے پر کہ سرکاری ملازمین بھارت یا پاکستان، دونوں میں کسی ملک میں بھی ملازمت جاری رکھ سکتے ہیں ان کے والدین نے سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے ساتھ اپنے خاندانی تعلق کی بنا پر پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا اور یوں یہ خاندان ۱۹۴۶ء میں لاہور منتقل ہوگیا جہاں کنول فیروز نے مشن ہائی سکول، رنگ محل میں داخلہ لے لیا۔ بعد میں ان کی والدہ کی تبدیلی لالیاں ہوگئی تو کنول فیروز کو بھی وہاں جانا پڑا۔ میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کا مرحلہ آیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کریں۔ وہ کہتے ہیں: سرگودھا یا فیصل آباد جا کر پڑھنے کی نسبت ربوہ آنا جانا بہت آسان تھا لہٰذا میں نے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں نے ریل کا پاس بنوایا ہوا تھا چنانچہ میں صبح کالج چلا جاتا اور فارغ ہوتے ہی واپس آجاتا۔ اتنے سال گزر گئے ہیں۔ مجھے اس عرصے میں دوبارہ ربوہ جانے کا موقع نہیں ملا نہ اپنے اساتذہ یا ہم جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ ملاقات ہوئی ہے لہٰذا اس دور کی اب کوئی یاد بھی ذہن میں مستحضر نہیں ہے۔

وہ بتاتے ہیں: گھر کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ ایف اے کے بعد پڑھائی جاری رکھ سکوں

جنانچہ میں سرگودھا چلا گیا اور ''پیغامِ قائد'' نامی ایک رسالے میں کام شروع کر دیا۔ میں بعد میں لاہور چلا آیا جہاں کام بھی کرتا رہا اور ساتھ کے ساتھ پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیمی استعداد میں اضافے کے لیے بھی کوشاں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا اور بعد میں شکاگو یونیورسٹی کے کالج آف جرنلزم سے ۱۹۹۹ء میں پی ایچ ڈی بھی کر لی۔

موصوف ماہنامہ ''شاداب'' جو ۱۹۶۹ء سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا لیکن اب ماہنامہ ہے اور قارئین کے ایک وسیع حلقے میں مقبول ہے۔ وِکیپیڈیا پر ڈاکٹر کنول فیروز کے تعارف میں درج ہے کہ شاداب ایک آزاد سوشو پولیٹیکل ادبی میگزین ہے جو اقلیتوں کے مسائل زیرِ بحث لانے میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ وِکیپیڈیا کے مطابق اس رسالے نے بین المذاہب ہم آہنگی کو اپنا مشن بنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر کنول فیروز پنجابی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اب تک ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''شہرِ صلیب و گل'' ان کا پہلا مجموعہ تھا جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد چھپنے والے مجموعوں کے نام ''شاخِ شبِ وصال''، ''شامِ فراتِ دل'' اور ''شفقِ صبحِ غزل'' ہے۔ یہ شعر ان ہی کا ہے:

ڈُبیا چن تے سارے تارے
ہجر دے ساتھی ٹُر گئے سارے

ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ''تمغہ امتیاز'' مل چکا ہے۔

ڈاکٹر کنول فیروز کے بعد اب میں آپ کی ملاقات کرا رہا ہوں افتخار احمد شہاب سے جو ایک مدت تک پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں پڑھانے کے بعد اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ان کے نام سے میرا پہلا تعارف اُس وقت ہوا جب میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں المنار کی تاریخ پر مشتمل ایک مضمون المنار ہی میں اشاعت کے لیے لکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا کہ رسالہ کے انگریزی حصے کے ایڈیٹرز میں موصوف کا نام بھی شامل ہے۔ دوسرا تعارف اس وقت ہوا جب پرویز پروازی کی کتاب موسومہ ''احمدیہ کلچر'' چھپ کر آئی۔ اس کتاب میں تعلیم الاسلام کالج کے بارے میں فاضل مصنف کی یادداشتوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں سٹوڈنٹس یونین کے ایک الیکشن میں صدر کے عہدے کے لیے ''مقابلہ عطاء الکریم اور افتخار شہاب کے مابین ہوا تھا۔ افتخار شہاب چنیوٹ کا بڑا ذہین لڑکا تھا...... مقابلہ بڑا معرکہ کا تھا کیونکہ چنیوٹ اور ربوہ کے امیدواروں میں ٹھن گئی تھی۔ احمدی اور غیر احمدی کا سوال نہ اٹھا نہ اٹھائے جانے کا سوال تھا۔ پرنسپل صاحب بنفسِ نفیس اس مقابلہ کے وقت ہال میں موجود تھے۔ جب معلوم ہوا کہ افتخار کامیاب نہیں ہوا تو پرنسپل صاحب نے ایک نیا عہدہ اسی وقت قائم کیا اور افتخار شہاب کو یونین میں پرنسپل کا نمائندہ مقرر'' کر دیا اور پروٹوکول کے لحاظ سے وہ نمائندوں میں سب سے سینئر قرار دیئے گئے۔''

موصوف کی یہی شہرت تھی جس نے مجھے ان کی تلاش پر مجبور کیا۔ سب سے پہلے تو میری توجہ اپنے دوست، محمد اسرائیل، منیجر، یو بی ایل، چنیوٹ کی طرف گئی جو چنیوٹ ہی کے باسی ہونے کے ناطے وہاں کے

اکثر لوگوں کو پہچانتے ہیں تاہم انہوں نے چند روز کی کوشش کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور اعتراف کر لیا کہ وہ افتخار شہاب کو ڈھونڈنے یا ان کے خاندان کا تعیّن کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس طرف سے مایوسی کے بعد میں نے چنیوٹ ہی سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک اور دوست، عبدالرشید اقبال مقیم ملتان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے ہمت کی، وہ خاص اس مقصد سے چنیوٹ گئے اور انہیں ڈھونڈ نکالا۔ ان ہی کے ذریعے معلوم ہوا کہ موصوف ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر مصطفیٰ ٹاؤن، لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ عبدالرشید اقبال نے ہی مجھے ان کا فون نمبر فراہم کیا اور یوں مجھے ان سے رابطے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ افتخار شہاب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس روز انہیں شدید قسم کا فلُو تھا اور ان کے گلے کی سوزش ان کی آواز سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ تعارف ہوا تو بے حد خوش ہوئے لیکن معذرت کی کہ وہ اپنی علالت کی وجہ سے لمبی بات نہیں کر سکتے۔ طے یہ ہوا کہ ہم پھر کسی روز بات ہی نہیں ملاقات بھی کریں گے۔

میں نے چند روز کے بعد فون کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اگلے روز دوپہر دو بجے ان کے پاس آ سکتا ہوں۔ انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنے گھر کا پتا سمجھایا چنانچہ میں وقتِ مقررہ پر ان کے پاس حاضر ہو گیا۔ میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ان کے پاس بیٹھا رہا جس دوران بہت سی باتیں ہوئیں: چنیوٹ کی باتیں، سیالکوٹ کے قصے، ربوہ کی یادیں، لاہور کی کہانیاں اور لندن کے افسانے...... اس مختصر سے وقت میں انہوں نے اپنی زندگی کی پوری سرگزشت سنا ڈالی۔

افتخار شہاب نے ۱۹۵۳ء میں چنیوٹ کے کسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ان کے والدین چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا گھر سے دور کسی ایسے اچھے تعلیمی ادارہ میں پڑھائی کرے جہاں اس کے معمولات میں دخل اندازی کرنے والا کوئی نہ ہو چنانچہ انہیں مرے کالج، سیالکوٹ جس کی اُس زمانے میں بڑی شہرت تھی میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں چنانچہ داخلہ پری میڈیکل میں ہوا تاہم یہ مضامین ان کی افتادِ طبع کے مطابق نہ تھے۔ وہ تو انگریزی کے رسیا تھے اور انگریزی کتب اور اخبارات و رسائل ان کا اوڑھنا بچھونا تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایف ایس سی کے امتحان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

ان کے زمانۂ طالب علمی میں ڈی ایل سکاٹ جن کا عام گفتگو میں ذکر ''سکاٹ صاحب'' کے طور پر کیا جاتا تھا مرے کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ انہیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کلاس کو My Neighbours کے موضوع پر مضمون لکھنے کو کہا۔ افتخار شہاب کہتے ہیں: یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میرے پڑوسی یورپین ہیں میں نے اس مضمون میں ایک فقرہ لکھا جو کسی فلمی ایکٹریس کے بارے میں تھا اور ایک فلمی رسالہ میں میری نظر سے گزرا تھا لیکن اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مجھے یاد ہو گیا تھا اور آج تک یاد ہے۔ وہ فقرہ تھا:

Willowy, pencil slim, beautiful like a child's dream of cream and pastry, serene and assured like a hostess on a tossing plane.

پرنسپل صاحب نے یہ مضمون پڑھا تو بے حد متاثر ہوئے اور شام کو مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا۔ میں ان

کی کوٹھی پر پہنچا تو ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں پرنسپل صاحب آ گئے اور اس کے کچھ دیر بعد ان کی بیگم بھی تشریف لے آئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور جب ہم چائے سے فارغ ہو گئے تو وہ مجھے باہر لان میں لے گئے۔ وہاں پر اس مضمون کے بارے میں باتیں شروع ہو گئیں۔ انہوں نے مجھ سے دوبار تصدیق چاہی کہ کیا میں نے یہ مضمون خود لکھا تھا اور میرے اقرار پر انہوں نے کہا کہ تم بالکل انگریزوں کی طرح انگریزی لکھتے ہو۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم ڈاکٹری کا ارادہ ترک کردو اور انگریزی میں اعلیٰ تعلیم کو اپنا مطمع نظر بنالو۔ وہ کہتے ہیں: میں ایف ایس سی سے بددل تو پہلے ہی تھا پرنسپل صاحب کی باتوں نے میرے شوق کو مہمیز کیا اور میری پوری توجہ انگریزی کی طرف مبذول ہو گئی۔

ایف ایس سی کے امتحان میں مطلوبہ نمبروں کے ہدف کے حصول میں ناکامی پر افتخار شہاب نے بی اے کرنے کا فیصلہ کرلیا اور تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہو گئے۔ ان کے اختیاری مضامین میں ایک تاریخ تھا تو دوسرا فارسی۔ وہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک یہاں رہے لیکن اس دور کی بعض خوبصورت یادیں آج بھی ان کے دل و دماغ پر حاوی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: مجھے انگریزی پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا چنانچہ میں اپنا تمام وقت اسی کے مطالعہ میں گزار دیتا۔ دوسرے مضامین کے ساتھ میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا جب بی اے کا رزلٹ آیا تو میں بمشکل سیکنڈ ڈویژن لے سکا لیکن انگریزی کے مضمون میں یونیورسٹی بھر میں اول رہا اور وظیفہ کا حقدار قرار پایا۔

اس زمانے کی باتیں سناتے ہوئے افتخار شہاب کہتے ہیں: مجھے حیرت ہوتی ہے ملّا احمدیوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی ہر خرابی کا ذمہ دار انہیں قرار دیتے ہیں لیکن مجھے تو ربوہ میں اپنے دو سالہ قیام کے دوران ان میں ایسی کوئی خرابی نظر نہیں آئی جس کی بنا پر ملّا کی رائے سے اتفاق کرسکوں۔ کہا جاتا ہے احمدی تبلیغ کرتے ہیں اور ہر ایک کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے تو کبھی کسی نے نہیں کہا کہ تم احمدی ہو جاؤ۔ کبھی میرے ساتھ غیر احمدی ہونے کی وجہ سے کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوا بلکہ سچ پوچھیں تو میں اس عرصے میں کالج میگزین کے انگریزی سیکشن کا ایڈیٹر رہا۔ سٹوڈنٹس یونین کا انتخاب ہوا تو میں صدارتی امیدوار تھا۔ یہ درست ہے کہ میں الیکشن نہیں جیت سکا لیکن صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی محبت دیکھیے، انہوں نے مجھے یونین میں اپنا نمائندہ مقرر کردیا اور مجھے یاد ہے اس کا ذکر ربوہ سے چھپنے والے روزنامہ الفضل میں بھی آیا تھا۔

وہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں: طلبہ کے ساتھ ان کا سلوک بے حد مشفقانہ تھا۔

افتخار شہاب کو اخوند عبدالقادر، کنور ادریس اور مرزا خورشید احمد سے انگریزی پڑھنے کا موقع ملا تاہم وہ انگریزی کے استاد کے طور پر سب سے زیادہ اخوند عبدالقادر سے متاثر ہیں اور کہتے ہیں: اخوند صاحب شلوار قمیص اور پگڑی پہنا کرتے تھے مگر وہ جس آسانی اور سہولت کے ساتھ انگریزی بولتے تھے مجھے اس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آئی۔ میں ملک سے باہر بھی رہا ہوں لیکن ان جیسی انگریزی بولنے اور لکھنے والا مجھے اور کوئی نہیں ملا۔

انہیں یہ بات بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں چوہدری ظفراللہ خان نے اپنی بعض کتابیں کالج لائبریری کو عطیہ کی تھیں۔ ان کتابوں میں ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری کا مجموعہ بھی تھا۔ افتخار شہاب نے یہ کتاب اپنے نام جاری کرائی۔ وہ کہتے ہیں: اس وقت تو مجھے اس کی بہت سی باتیں سمجھ نہیں آئیں لیکن پھر بھی میں نے یہ کتاب خوب مزے لے لے کر پڑھی تھی۔

تاریخ کے مضمون کی بات ہو تو وہ بتاتے ہیں: میں اپنی کلاس میں یہ مضمون پڑھنے والا واحد سٹوڈنٹ تھا۔ مرزا مجید احمد جنہیں میاں موجی کہتے تھے میرے استاد تھے تاہم ایک طالب علم کے ساتھ کلاس کیا ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے بعض کتابیں دے دیتے اور بتا دیتے کہ مجھے اس کا کون سا حصہ پڑھنا ہے۔

افتخار شہاب کے زمانے میں المنار انگریزی کے سٹاف ایڈیٹر چوہدری محمد علی تھے۔ افتخار شہاب نے ان سے پڑھا تو نہیں تاہم وہ ان سے بھی بے حد متاثر ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کی انگریزی بہت عمدہ تھی۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ چوہدری محمد علی گفتگو تو اچھی کرتے ہی تھے، لکھتے بھی خوب تھے۔ شیریں دہن تھے اور اپنے ملنے والوں کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔

بی اے کرنے کے بعد افتخار شہاب نے اسلامیہ کالج، لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ حمید احمد خاں ان کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے۔ وہ ان کی محبت کے بھی کئی واقعات بیان کرتے ہیں۔ بتاتے ہیں: ایک بار میں نے اپنی کسی تحریر میں انگریزی کا ایک لفظ استعمال کیا جو حمید احمد خان کے لیے نیا تھا چنانچہ وہ فرمانے لگے: یہ لفظ تو انگریزی زبان میں ہے ہی نہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ میں نے خود یہ لفظ کسی جگہ پڑھا ہے تو انہوں نے حوالہ طلب کیا جو میں فوری طور پر فراہم نہ کرسکا۔ تب انہوں نے ڈکشنری منگوائی لیکن کسی وجہ سے اس وقت ان کی نظر اس لفظ پر نہ پڑ سکی۔ وہ مجھ سے ناراض ہوئے کہ میں بلاوجہ ضد کررہا ہوں اور میری کاپی اٹھا کر دُور پھینک دی۔ انہوں نے غصہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ میں انگریزی میں ایم اے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے عرض کی کہ ٹھیک ہے، میں ایم اے نہ کرسکا تو ریڑھی لگا کر گزارہ کرلوں گا اور اتنا کہہ کر کلاس سے چلا آیا۔ میں سخت آزردہ تھا چنانچہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے میں نے ایک دوست سے کچھ رقم ادھار لی اور لارڈز ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اتفاق سے اسی وقت وہاں کامن ویلتھ ممالک کے طلبہ کا ایک گروپ آ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں انہیں کھانا تو نہیں کھلا سکتا البتہ اگر وہ پسند کریں تو چائے پلا سکتا ہوں۔ انہوں نے میری یہ پیشکش قبول کرلی۔ ان کے ساتھ بڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر میں نے ریگل سینما میں فلم دیکھی اور رات بارہ بجے کے بعد ہوسٹل پہنچا۔

افتخار شہاب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: اب حمید احمد خان کی عظمت دیکھیے۔ اگلی صبح ان کے آدمی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میں حاضر ہوا تو انہوں نے ایک روز پہلے ہونے والی تلخی پر معذرت طلب کی اور بتایا کہ انہوں نے ڈکشنریز اچھی طرح دیکھی ہیں اور یہ لفظ انگریزی زبان میں واقعی موجود ہے۔

وہ بتاتے ہیں: میں ایم اے میں پڑھ رہا تھا کہ لاہور میں تین انگریز پروفیسروں نے مل کر

linguistics and phonetics کا تین چار مہینے کا ایک مختصر سا کورس متعارف کرایا۔ ان پروفیسروں میں سے ایک کا نام Mr. Spenser تھا، دوسرے Mr. Denison اور تیسرے Mr. Bailey تھے۔ میں نے بھی اس کورس میں داخلہ لے لیا۔ میرے باقی تمام ساتھی مختلف کالجوں کے اساتذہ تھے لیکن جب امتحان ہوا تو میں اول رہا۔ اس پر ان کی طرف سے پیشکش ہوئی کہ اگر میں چاہوں تو وہ آکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے میرے وظیفے کا بندوبست کرسکتے ہیں بلکہ انہوں نے ان دونوں یونیورسٹیوں میں میرا داخلہ بھی کرا دیا۔ اس وقت تک میں ایم اے کا امتحان دے چکا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کسی بڑے شہر میں رہ کر پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے اس فیصلے پر بہت حیران ہوئے اور پھر بتانے لگے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کا تعلیم کے شعبے میں کیا مقام ہے لیکن میں اپنی ضد پر قائم رہا چنانچہ انہوں نے میرا داخلہ لندن یونیورسٹی میں کرادیا۔ لنڈن یونیورسٹی سے میں نے ایم اے کیا۔ ایم اے کے تھیسس کو میں نے پنجابی زبان کو معنون کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیڈیکیشن ایک یا حد دوسطروں سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے لیکن میں نے تو آدھا صفحہ لکھ مارا۔ وہ عبارت مجھے اب بھی یاد ہے۔ آپ سننا چاہیں گے:

Dedicated to the Punjabi language which conjures up the aroma of grams and pop corn and to the Punjabi people, especially the villagers who still believe that there are glass roads in England, that the sun never rises in this part of the world, and that the English are the happiest because they speak English.

میرے وائیوا کے لیے ایڈنبرا سے کوئی پروفیسر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے شاید اس تحریر کے ذریعے انگریزوں پر طنز کی ہے لیکن جب بات چیت شروع ہوئی تو وہ میرے تھیسس کے معیار سے مطمئن ہوگیا۔ مجھے ایم اے کی ڈگری مل گئی تو میں نے پی ایچ ڈی کا ارادہ ترک کردیا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ مجھے پی ایچ ڈی کے لیے جو کچھ پڑھایا اور سکھایا جائے گا، مجھے وہ پہلے ہی آتا ہے۔

واپسی پر افتخار شہاب نے کچھ عرصہ اسلامیہ کالج، چنیوٹ میں پڑھایا لیکن جلد ہی پنجاب یونیورسٹی منتقل ہوگئے۔ ان کے پنجاب یونیورسٹی میں تقرر کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں: حمید احمد خان کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں انگلش ڈپارٹمنٹ نے لیکچررز کی کچھ اسامیاں مشتہر کیں لیکن یہ اشتہار میری نظر سے نہیں گزرا حتّٰی کہ درخواستیں جمع کرانے کی آخری تاریخ بھی گزر گئی۔ جب امیدواروں کو انٹرویوز کے لیے طلب کیا گیا تو حمید احمد خان نے اپنے کسی ماتحت سے پوچھا کہ کیا افتخار شہاب نے بھی لیکچرر شپ کے لیے درخواست دی ہے؟ جب انہیں بتایا گیا کہ میری درخواست نہیں آئی تو انہوں نے میرا ایڈریس تلاش کرنے کا حکم دیا اور کہا: میری طرف سے اسے تار دے دیں کہ وہ فوراً لاہور پہنچے۔ اس وقت ان کے پاس پروفیسر اَیرک سپرین بیٹھے تھے۔ انہوں نے تجویز دی کہ وائس چانسلر کی طرف سے تار کا بھجوایا جانا مناسب نہیں ہے لہٰذا وہ یہ تار اپنی طرف سے

دے دیتے ہیں چنانچہ مجھے اَیرک سپرین کی طرف سے تار موصول ہوئی جس پر میں لاہور پہنچا۔ انٹرویو بورڈ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کتنی تنخواہ قبول کرلوں گا تو میں نے چھ سو روپیہ بتائی لیکن جب مجھے تقرری کا خط موصول ہوا تو اس میں میری تنخواہ سات سو روپیہ ماہوار مقرر کی گئی تھی۔ اللہ کے فضل کے بعد یہ حمید احمد خان کی مہربانی تھی جسے میں کبھی نہیں بُھلا سکتا۔

موصوف ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک پنجاب یونیورسٹی میں رہے اور اس عرصے میں دو سال ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے فرائض بھی انجام دیئے۔

افتخار شہاب کا مزید ذکر کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے اب ہم تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور نامور اولڈ بوائے جن کا ذکر ''قریۂ جاوداں'' کے باب بعنوان:

مجھ میں جو کچھ ہے وہ سب ان کے کمالات کا عکس

میں قدرے تفصیل کے ساتھ موجود ہے کی طرف آتے ہیں۔ میری مراد ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی سے ہے جو نہ صرف اس کالج میں پڑھتے رہے بلکہ لمبا عرصہ یہاں تدریس پر بھی مامور رہے۔ صاحبِ طرز ادیب ہیں اور ان کی کم و بیش چودہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ الفضل میں ان کے بکثرت شائع ہونے والے مضامین قارئین کے ایک وسیع حلقے میں بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔

ان کی تصنیفات میں سے ''احمدیہ کلچر'' خاصے کی چیز ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تعلیم الاسلام کالج میں اپنے گزرے ہوئے وقت کا بہت تفصیل کے ساتھ اس دلچسپ انداز میں احاطہ کیا ہے کہ انسان بے ساختہ اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ چونکہ بات تعلیم الاسلام کالج کی ہورہی ہے لہٰذا ناانصافی ہوگی اگر اس حصۂ کتاب کو یہاں نقل نہ کیا جائے جس کے لیے فاضل مصنف سے بذریعہ ای میل اجازت حاصل کرلی گئی ہے۔

موصوف لکھتے ہیں: ''ہم داخلہ کا فارم لے کر حاضر ہوئے۔ پرنسپل صاحب نے کچھ پوچھ کے...... فارم پر کچھ نشان سے بنا دیئے جو ہماری فہم سے بالاتر تھے۔ ہم وہ فارم لے کر کالج کے دفتر میں گئے۔ معلوم ہوا پرنسپل صاحب نے ازراہِ ذرّہ نوازی پوری فیس معاف کردی ہے بلکہ کالج کی جانب سے مبلغ پانچ روپے مہینہ ہمارا وظیفہ بھی مقرر کردیا ہے۔ ہم جو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہورہے تھے کہ خدا معلوم کالج میں داخلے کے لیے کتنے روپے درکار ہوں گے یکا یک ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے۔ نئے داخل ہونے والے لوگوں کو دیکھا۔ کوئی سات سو نمبر لے کر آیا تھا، کوئی ساڑھے سات سو۔ ایک سے ایک نابغہ کالج کے کوریڈور میں محوِ خرام نظر آیا۔ ہمیں ایک اور فکر نے گھیر لیا کہ ان اعلیٰ نمبر یافتہ لوگوں میں ہم کہاں ٹھہر پائیں گے؟ ایسا نہ ہو بیک بنی و دو گوش چلتے کردیئے جائیں۔ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ سکول میں بھی تو ہمارے ساتھ اسی قسم کے ''از قسمِ نابغہ ہائے روزگار'' لوگ تھے۔ وہاں ہم ان سے نہیں دبے تو یہاں ان سے کہاں دب کے رہیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ یونیورسٹی میں کوئی اعلیٰ پوزیشن نہیں آئے گی تو وہ پہلے کب آئی تھی؟

ہم ابھی اپنے پانچ روپے مہینہ کے وظیفہ کی لُم کا ہی سوچ رہے تھے کہ قبلہ جنید ہاشمی مرحوم نے کہ کالج

کے دفتر کے سپر نٹنڈنٹ تھے ہمیں ہاتھ کے اشارہ سے بلایا۔ ہمارا خیال تھا کچھ فرمائیں گے مگر منہ میں پان تھا، فرماتے کیسے؟ ایک فائل ہمارے ہاتھ میں تھمادی اور پان کی پیک کو منہ میں ادھرادھر دوڑاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ یہ کالج کے مجلّہ المنار کی فائل ہے اور یہ کہ ہم پہلے دن سے ہی اس مجلّہ کی مجلسِ ادارت میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔ پرنسپل صاحب کا ارشاد ہے کہ پرچہ معیاری ہونا چاہئے اس لیے محنت سے مرتب کریں۔ مجلسِ ادرات میں اور کون کون ہے؟ فرمایا معلوم ہو جائے گا۔ پچھلا پرچہ دیکھ لیں......

اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ جولڑ کا ملتا وہ ''وظیفہ خوار'' نکلتا۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا

ہم جو اپنے وظیفہ خور ہونے کو بڑا طرۂ امتیاز سمجھے بیٹھے تھے بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کالج ہے یا وظیفہ خوروں کی انجمن؟ معلوم ہوا کہ اس کالج کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ مستحق طلبہ کو وظیفہ دیتا ہے اور اس میں کسی کے رنگ و نسل، عقیدہ و بدعقیدگی، نیکی، بدی، بدعت، غیر بدعت کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ مستحق طلبہ علم سے محروم نہ رہ جائیں......

ہوسٹل میں ایسے لوگوں کی اکثریت پائی جو ہمارے عقیدہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ کوئی کسی سے تعرّض نہیں کرتا تھا البتہ ایک ''تکلیف'' سب کو تھی کہ

آ گیا عین پڑھائی میں اگر وقتِ نماز

تو نماز التزام سے پڑھنا پڑتی تھی۔ ہمارے ایک دوست (جو پیپلز پارٹی کے زمانے میں وزیر ہو گئے تھے) کہا کرتے تھے کہ اقبال خود تو نماز پڑھتا نہیں تھا

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہمارے لیے ایک مصرعہ ایسا کہہ گیا ہے جو سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن کر رہ گیا ہے۔ پڑھیں تو مشکل نہ پڑھیں تو مشکل۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ پڑھیں تو تیمّم کرنا پڑتا ہے۔ نہ پڑھیں تو دکھاوے کے لیے وضو اور وضو کے مرحلہ سے گزر لیے تو دو ٹکریں مار لینے میں کیا حرج ہے؟

کالج میں پہلا دن تو خیریت سے گزرا۔ دوسرے روز قیامت آ گئی۔ کاریڈور میں...... کھڑے تھے کہ ایک بزرگ استاد نے ہمیں گھیر لیا۔ سوال یہ تھا کہ ہم ننگے سر کیوں کھڑے ہیں؟ اب ہمیں اپنی برہنہ سری کا احساس تو تھا لیکن اپنے ''ننگِ سر'' ہونے کا گمان تک نہیں تھا۔ ہم نے ازراہِ تفنّن بڑے ادب سے پوچھ لیا ''جناب آپ کس ''ننگے'' کا ذکر کر رہے ہیں، ننگے کا یا ''ننگ'' کا؟''

اب بھلا وہ آئیں تو جائیں کہاں؟

قبلہ نے ہمیں ''زبان درازی'' کے جرم میں دھر لیا اور سیدھا پرنسپل صاحب کے پاس لے چلے۔ ہماری سٹی گم ہو گئی کہ ابتدائے عشق میں ہی کالج سے نکال دیئے جائیں گے اور سارے ارمان دھرے رہ جائیں گے۔ ہم نے گھگھیا گھگھیا کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی چاہی۔ غضب یہ کیا کہ معافی بھی غالب کے لفظوں میں چاہی کہ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب! یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

قبلہ نے کردہ ناکردہ کی تکرار کو اور غالب کے شعر کو بھی ہمارے نامۂ اعمال میں درج کر لیا اور تیزی سے پرنسپل صاحب کے کمرہ کی جانب بڑھنے لگے۔ اتنے میں ہمارا...... ساتھی آ گیا۔ اس نے قبلہ کو جھک کر سلام کیا اور پوچھا خیریت تو ہے آپ نے اس فتنہ سے اپنے دامن کو آلودہ کیوں کر رکھا ہے؟ اس شخص نے تو عربی بطور لازمی مضمون کے اختیار کی ہے اور...... عربی میں آنرز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ قبلہ نے یہ بات سنی تو ذرا رکے اور پوچھا کہ واقعی آپ نے عربی کا مضمون رکھا ہے۔ ہم نے برملا اس گناہ کا اعتراف کیا تو وہ موم ہو گئے۔ فرمانے لگے: عزیزم! عربی پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔

اس میں دوچار بڑے سخت مقام آتے ہیں

جی درست فرمایا۔ ایک سخت مقام تو آج ہی آ گیا تھا۔ ہمارے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: یہ تو بڑا باتونی طالب علم لگتا ہے۔ ہم نے عرض کی کہ جناب شاعر نے غالباً عربی پڑھنے کے بارے میں کہہ رکھا ہے کہ

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

فرمایا: خوب ہے! خوب ہے! یہ والا شعر ذرا مجھے لکھوا دینا۔ آپ نے قلم نکال کر اپنے ''خطِ بشارت'' میں پورے صفحہ پر پھیلا کر یہ شعر نوٹ کر لیا اور ہمیں اجازت دی۔ اس کے بعد ہم چار سال تک ان کی کلاس میں حاضر رہے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

کا معاملہ رہا۔ نہ وہ اپنی نوک جھونک سے رکے، نہ ہم نے اپنی سنتِ جاریہ سے انحراف کیا تا آنکہ چار سال کے بعد یہ ''تنگِ کلاس'' کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے قصور معاف تو نہیں ہوئے البتہ ان کی سزا میں خاصی تخفیف کر دی گئی یعنی جب کالج کے سٹاف پر آ جانے کے بعد ملاقات ہوتی ازراہِ کرم مسکرا کر ملتے اور ایک آدھ فقرہ بھی چست کرتے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے؟

وہ اپنے اس عقیدہ میں بڑے پختہ تھے کہ جنت کی زبان عربی ہوگی اس لیے ہمیں خشوع و خضوع کے ساتھ یہ زبان سیکھنی چاہئے ورنہ مرنے کے بعد دقّت پیش آئے گی مگر ہمارے اس استفسار کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا کہ جنت میں عربی بولی جائے گی اور آپ عربی پڑھاتے تو ہیں مگر بولتے ہیں نہ بولنا سکھاتے ہیں آپ کی پڑھائی ہوئی عربی کس کام آئے گی؟ زِچ ہو کر فرماتے تھے: یونیورسٹی والوں نے عربی بولنے کو کورس میں شامل ہی نہیں کیا تو اساتذہ عربی کیوں سکھائیں؟ اور ہم اپنی کج بحثی کی رو میں ان سے کہتے تھے کہ اللہ میاں کو جنت کے نصاب میں عربی بولنے کو لازمی قرار دینے سے پیشتر یونیورسٹی والوں سے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ اس پر اور زیادہ زِچ ہوتے اور عربی کے مشکل مشکل الفاظ سے ہمیں ڈراتے تھے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اپنی

''انذاری'' گفتگو میں ''مقاماتِ حریری'' کے فقرے کے فقرے بول جاتے تھے اور سننے والوں کو خاطر خواہ عبرت حاصل ہوتی تھی۔

یہ بزرگ کالج کے سینئر اساتذہ میں سے تھے۔ اپنے مضمون میں تیرے ہوئے...... عربی کے سوا کوئی اور ''گناہِ کبیرہ'' ان سے منسوب نہیں تھا۔ نہایت مخلص، بے ریا، محبت پرور اور متقی آدمی تھے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کی عملی تفسیر!

کالج کی پڑھائی شروع ہوگئی۔ ہم پکے اور کھرے بلکہ (پیش کے ساتھ) کُھرّے ''مستشرق'' تھے۔ اردو، عربی، فارسی کے ساتھ منہ کا ذائقہ خراب کرنے کے لیے پہلے اکنامکس رکھی۔ پھر انٹر کے امتحان سے چند مہینے پہلے تاریخ رکھ لی اور فیل ہوجانے کے امتحان سے بچ گئے ورنہ اکنامکس تو ہمیں لے ڈوبتی۔ ان مضامین کا ایک، ایک کیا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ''شوقِ آوارگی'' کی تسکین کے لیے وافر مواقع میسر تھے۔ جی چاہا تو کلاس میں چلے گئے، نہ چاہا تو نہ گئے البتہ عربی کی کلاس سے غیر حاضری کے لیے ''شرعی'' بہانے تراشنا پڑتے تھے اور یہ بہانے تراشنے کے لیے ہم نے بَابُ الْحِیَلْ کا بالاستعیاب مطالعہ کر رکھا تھا۔

کالج کے دوسرے سینئر استاد فلسفہ کے استاد تھے جن کے باب میں لوگوں نے ہمیں بہت ڈرا رکھا تھا کہ طبیعت کے بہت سخت ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ ''ادب و شعر میں'' فولاد ہے مومن

اردو کے بڑے نغز گو شاعر ہیں۔ ہم نے سوچا شاعر ہیں تو اپنے کلام کے چھپنے پر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔ ان کی ایک غزل ان سے ایک محفلِ خاص میں سنی اور اپنے ذہن میں محفوظ کرلی۔ گھر آ کر وہ غزل کاغذ پر اتاری اور المنار کے اگلے شمارہ میں بڑے طمطراق سے شائع کردی۔ پرچہ کا چھپ کر آنا تھا کہ گویا بھونچال آ گیا۔ سنا کہ قبلہ اپنے تمام تیر و تفنگ سمیت ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کدھر ہے وہ ناہنجار ایڈیٹر جس نے میرا کلامِ بلاغت نظام میری اجازت کے بغیر چھاپ دیا ہے۔

مٹا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

پرنسپل صاحب سے اس دوران آمنا سامنا ہوگیا۔ مسکرا کر فرمایا: کیوں میاں سنا ہے آج کل رُوپوش ہو؟ ہم نے کہا: جی سنا ہے بزرگ میری تلاش میں ہیں۔ فرمایا: تلاش سی تلاش؟ خیر مناؤ۔ ابھی ہم اسی مکالمہ میں ''مبتلا'' تھے کہ وہ بزرگ استاد آ گئے۔ ہمیں پرنسپل صاحب سے محوِ گفتگو دیکھا تو ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ پرنسپل صاحب سے ان کا افسر ماتحت کا نہیں عشق و محبت کا رشتہ تھا۔ پرنسپل صاحب نے ہمیں ان کے سپرد کیا کہ لیجئے آپ کا مجرم حاضر ہے۔ اب ان کی کیا مجال کہ ہمیں کچھ کہیں۔ ان کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ گئی۔ ہم حیران پریشان اور سراسیمہ۔ کالج کا کاریڈور طلبہ سے اَٹا اَٹ بھرا ہوا۔ ہم خاموش کھڑے ہیں اور وہ بزرگ دھاروں رو رہے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ذرا سا ٹھہراؤ پیدا ہو تو فرمایا آپ نے بہت ظلم کیا، بہت ظلم کیا۔ اب خدا کے

لیے آئندہ ایسا ظلم نہ کیجئے گا اور یہ کہہ کر پھر رونے لگے۔ وہ واپس ہوئے تو ہم ان کے پیچھے پیچھے ان کے حجرہ تک ساتھ آئے۔ فرمایا: جایئے میری جان چھوڑ دیجئے۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ یہ شاعرِ بے بدل اپنا کلام سنانے یا چھپوانے کا قائل نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں

اور کُھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

درست ہوگا مگر ان دو چار ملاقاتوں نے کم از کم دو سال کا وقت لیا۔ دو سال کے بعد کالج کے ایک مشاعرہ میں ہماری ایک غزل سن کر پسیجے اور ہمیں از راہِ کرم اپنے احباب کے زمرۂ خاصان میں شمار فرمایا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کلام چھپوانے کی بجائے ہمیں سنا کر نچنت ہو جاتے تھے کہ چلو یہ چیز محفوظ ہوگئی۔ سنا ہے ابھی پچھلے دنوں اور

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

کسی مشاعرہ میں فرمایا: ہمیں شعر یاد نہیں رہتے۔ اس فقیر کا نام لے کر فرمایا کہ وہ ہوتا تو یاد کرواتا کہ اس غزل کا فلاں شعر کیا ہے۔ اب تو ہمارا اپنا یہ حال ہے کہ شعر تو دور کی بات ہے مصرعے تک یاد نہیں رہتے۔ بہ قول شخصے ہمارا حافظہ اب دروغ گو وال ہوکر رہ گیا ہے۔ ''دروغ گورا حافظہ نہ باشد''۔

سائنس ہم نے پڑھی نہیں مگر گاڑھی چھنی تو سائنس کے اساتذہ کے ساتھ۔ نصیر خان صاحب، علی گڑھ کے بانکے سجیلے گریجوایٹ، باسکٹ بال کے کھلاڑی اور کوچ یونین کے انچارج تھے اس لیے ہمیں ان کے سایۂ عاطفت میں آنا پڑا۔ یونین کے مباحثوں میں حصہ لینے کا شوق چرایا۔ کچھ ٹوں ٹاں سکول کے زمانے سے کرلیتے تھے کچھ زمانۂ بیکاری میں اپنے نوجوانوں کی تنظیم میں تقریریں کر چکے تھے اس لیے خیال ہوا کہ یونین میں تقریر کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ مباحثہ کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی نام لکھوا دیا۔ مددگار کارکن نے آ کر کہا: نصیر خان صاحب یاد کر رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے یونین کے دفتر میں گئے۔ ایک نہایت سرخ و سفید وجیہہ صاحب تشریف فرما تھے۔

چُھوٹتے ہی کہنے لگے: آپ کے بارے میں بڑی بڑی بری باتیں سنی ہیں۔ کیا وہ سب ٹھیک ہیں؟ ہم نے کہا: جی اگر بری بری باتیں سنی ہیں تو یقیناً ٹھیک ہوں گی کیونکہ کوئی اچھی بات تو ہمارے ساتھ منسوب نہیں ہوسکتی۔ (زیر اور پیش) دونوں کے ساتھ کُھل گئے۔ فرمایا: آپ کے غزل چھاپ دینے کا معرکہ مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ اب کہئے مباحثوں میں آپ کیا کیجئے گا؟۔ ہم نے کہا: بحث کریں گے اور کیا کریں گے۔ کہنے لگے: اپنی تقریر لکھ کر مجھے دکھا دیجئے۔ اب تقریر تو کرنے کی چیز ہوتی ہے لکھ کر پڑھی تو کیا پڑھی مگر اس سے مفر نہ تھا۔ تقریر لکھی۔ پھر اس کو رٹا لگایا۔ پھر سٹیج پر آئے اور شومیٔ قسمت کہ عین منجدھار میں بھول گئے۔ بڑی تُھڑی تُھڑی ہوئی۔ مخالفین نے خوب لتے لئے مگر نصیر صاحب خوش ہوگئے۔ کہنے لگے جو مقرر بھولتا ہے اس میں اچھا مقرر ہونے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں رٹا لگانے پر اعتراض نہ تھا مگر بعد کو یہ پڑھا کہ چرچل بھی ہر تقریر پہلے لکھتا تھا پھر اسے رٹا لگاتا تھا۔ اس کی جتنی معرکۃ الآراء تقریریں ہیں اور اس نے بہ ظاہر فی البدیہہ کی ہیں ساری کی ساری لکھی ہوئی اور باقاعدہ آئینے کے رُوبرُو کھڑے ہوکر مشق کی ہوئی تقریریں ہیں۔ پہلے

ہی مباحثہ میں ایک ایسے صاحب ہمارے حزبِ مخالف تھے جو تقریر کم کرتے اور ہاتھ زیادہ چلاتے تھے۔ ہم نے ان کی تقریر کے رد میں ان کی تقریر کو معرکۃ الآراء کی بجائے معرکۃ الاعضاء تقریر کہا تو نصیر صاحب نے بہ آواز بلند داد دی اور یونین کا انچارج داد دے تو دوسروں کی کیا مجال ہے کہ داد نہ دیں چنانچہ وہ مباحثہ ہم نے لُوٹ لیا۔ پھر ہمیں باہر کے کالجوں میں مباحثوں میں جانے کی اجازت ملنے لگی اور اس طرح ہمارا باہر کی دنیا کے دانش وروں سے تعارف ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بخدا ہم ایک بے بہا دولت سے محروم رہ جاتے۔ سائنس کے آدمی تھے مگر سائنس والوں کی خشکی اور یبُوست ان میں نہیں تھی۔ ایسی یبُوست کے لیے اور بہت تھے۔

سائنس والوں میں سے پروفیسر حبیب اللہ خان، علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجوایٹ تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں کچھ عرصہ اردو میں کیمسٹری پڑھا بھی چکے تھے۔ یہاں کا لیکچر بھی اردو میں ہونا چاہئے تھا مگر پنجاب یونیورسٹی کا دستور نرالا تھا۔ ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی تھا مگر حبیب اللہ خان صاحب ذرا جو اس باب میں بیٹے ثابت ہوئے ہوں کلاس میں کیمسٹری انگریزی میں پڑھاتے اور سائنسی مضامین پر کتابیں اردو میں لکھتے اور حکومت سے انعامات حاصل کرتے تھے۔ غالباً کالج کے پہلے استاد تھے جنہیں ''خلا کی تسخیر'' اور ''سمندر کے عجائبات'' نامی کتاب لکھنے پر انعام ملا۔

ہمارے کالج میں ایک سے ایک نابغہ استاد بھرا ہوا تھا مگر کالج ربوہ میں منتقل ہوا تو بیالوجی میں سرے سے کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ طلبہ میں سے ذہین فطین طالب علم خود تیاری کرتے اور اپنے ساتھیوں کو بیالوجی پڑھاتے تھے۔ عزیزم ڈاکٹر حمید احمد خان اللہ بخشے اتنا تیز طرار بچہ تھا کہ اپنی کلاس کو پڑھاتا بھی تھا اور اپنی پوزیشن بھی برقرار رکھتا تھا۔ پھر ان کے بعد بعض بی ایس سی پاس اساتذہ بیالوجی پڑھانے لگے۔ کیمسٹری کے استاد برادرم رفیق احمد ثاقب نے خاص طور سے بیالوجی پڑھ پڑھ کر لڑکوں کو بیالوجی پڑھائی تا آنکہ اپنے وقت کے نستعلیق اور وضعدار استاد ڈاکٹر چوہدری نصیر احمد بشیر پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے اور ربوہ کالج میں پڑھانے کے لیے آ گئے۔ اس طرح بیالوجی ڈپارٹمنٹ کی کمی پوری ہوئی۔ پروفیسر نصیر احمد بشیر کی وضعداری کی بات آئی تو یہ بتا دوں کہ وہ ربوہ کے آخری شمال مغربی کونے پر بنی ہوئی ایک ڈھنڈار کوٹھی میں اکیلے رہتے تھے۔ صبح صبح اپنا اکیڈیمک گاؤن زیبِ تن فرماتے، ننھے منے روسی ٹیریئر کتے کی زنجیر پکڑتے اور خراماں خراماں کالج کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔ گاؤن سے نئے نویلے سوٹ کی حفاظت ہو جاتی اور اس کتے کی خاطر خواہ مشی کا انتظام بھی ہو جاتا۔ کالج پہنچتے تو بعض اوقات کتا بھی ہز ماسٹرز وائس کے کتے کی طرح کلاس میں یا لیبارٹری میں ان کے لیکچر کے لیے گوش بر آواز رہتا۔ نصیر احمد بشیر صاحب جلد ہی پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ چلے گئے۔ ان کے بعد سیّد حبیب الرحمٰن آئے۔ پھر زوآلوجی میں ایک اور نابغہ روزگار استاد محمد شریف خان صاحب آ گئے اور یہ حیاتیات کے شعبہ کی ''کمی خون'' کا تدارک ہوا۔

کالج میں انگریزی کے مضمون کی تدریس کے لیے اساتذہ کی ایسی کمی تھی کہ ایک استاد جو بہ ظاہر سیاسیات

کے پرائیویٹ ایم اے تھے سٹاف پر لائے گئے۔ وہ ایف اے کے طلبہ کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ خود کسی کالج میں نہیں پڑھے تھے اس لیے ان کا تلفظ مشہورِ خلائق تھا Charlotte Bronte کا نام ''چارلوٹے برونٹے'' کر کے لیتے تھے۔ ہم مزے لینے کے لیے جان بوجھ کر ان سے یہ نام بار بار پوچھا کرتے تھے۔ پھر ایک سے ایک نابغہ انگریزی کے شعبے میں آ گیا۔ مرزا خورشید احمد تو انگریزی کے آدمی تھے۔ کنور ادریس صاحب پولیٹیکل سائنس میں ایم اے ہونے کے باوجود ان سے بھی زیادہ انگریزی کے آدمی ثابت ہوئے۔ ایسی نستعلیق زبان بولتے اور ایسی خوبی اور خوبصورتی سے بولتے کہ ہم لوگ کتاب دیکھنے کی بجائے ان کا رُوئے مبارک دیکھتے رہتے۔ گویا

ہم ہیں اہلِ کتاب چہروں کے

کہنے کو تو ہم نے ان سے انگریزی پڑھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ہی ہم نے ان سے نہیں پڑھی۔

بس مکتبِ غمِ دل میں سبق لینے کا مضمون رہا

وہ جلدی ہی سی ایس پی کو پیارے ہو گئے۔ ان دنوں اپنی منگیتر ڈاکٹر کے عشق میں

کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا ہے

کی تصویر تھے اور سوز و گداز ان کی باتوں کا جوہر تھا۔ جو بات کہتے سیدھی دل میں ترازو ہو جاتی تھی۔

دیکھنے میں جو خطا لگتا تھا
ہم کو وہ تیر بھی آ لگتا تھا

ان کے کالج سے چلے جانے کے بعد ہم دو چار دوست کافی عرصہ تک کلاس میں نہیں جا سکے۔ یہی سوچتے رہے:

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ڈاکٹر سیّد سلطان محمود شاہد اپنی کیمسٹری کی تدریسی کتابوں کی وجہ سے مشہورِ خلائق تھے۔ ان کا لیکچر تو ہم نے نہیں سنا البتہ ان سے یونین کے سلسلے میں تعلق رہا...... لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تو ہم نے کہا: ایک روایت یہ رہی ہے کہ جو لوگ باہر پی ایچ ڈی کرنے جاتے ہیں وہ یا ولایتی میم ساتھ لاتے ہیں یا گاڑی۔ آپ خالی ہاتھ کاغذ کا ایک پرزہ لے کر چلے آئے ہیں۔ فرمانے لگے یہ کاغذ کا پرزہ بھی تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ان کے اس کہے کی صداقت اس وقت آشکارا ہوئی جب خود اس مرحلہ سے گزرے یا بعد میں ڈاکٹر شریف خان صاحب گزرے۔ پروفیسر شریف خان صاحب جوانی ہی میں بین الاقوامی سائنس ریسرچ جرنلز میں چھپنے لگے تھے۔ نہایت محنتی آدمی ہیں اور ہر وقت اپنے سانپوں، کچھوؤں، مینڈکوں میں گھرے اور چھپکلیوں سے اٹھکیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ امریکہ کے ''رینگنے والے جانوروں کے حلقۂ احباب'' میں بہت نامور ہیں۔ ان کے سینکڑوں ریسرچ پیپرز ان ریسرچ جرنلز میں چھپ چکے ہیں۔ جب ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی میں پیش ہوا تو ان کے ممتحن وہ لوگ تھے جو ان کے ریسرچ پیپرز کا حوالہ دیتے نہ تھکتے تھے مگر جب انہیں ڈگری

دینے کا وقت آیا تو انہیں چپ لگ گئی اور کچھوے کی طرح دم سادھ لیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ چھ سات برس ان کی ڈگری جاری نہ کی گئی۔ ان کا بیٹا عزیزی محمد ظفراللہ ان سے پہلے پی ایچ ڈی ہوگیا۔ باپ کی ڈگری بیٹے کے ڈاکٹر بن جانے کے بعد جاری ہوئی۔ الحمدللہ کہ یونیورسٹی والوں کو خیال آ گیا ورنہ ان کے پوتے کے پی ایچ ڈی ہوجانے پر جاری کرتے تو ان کا کیا بگاڑا جاسکتا تھا......

ہمارے دوست نصیر احمد خان نے روایتِ زمانہ برقرار رکھی۔ ڈرہم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری اور اٹلی سے ایک نئی فوکس ویگن ساتھ لائے ورنہ ہمارے مرزا گیسودراز صاحب کی طرح انہیں بھی سسرالی گاڑی پر اکتفا کرنا پڑتا۔ اب کالج کے سٹاف پر کم ازکم تین پی ایچ ڈی اساتذہ ہوگئے اور یہ ''مفصلات'' کے یعنی آس پاس کے چھوٹے شہروں کے کسی کالج کے لیے بڑا اعزاز تھا۔

کالج کے بزرگ اساتذہ کا بڑا علمی دبدبہ تھا۔ اخوند عبدالقادر انگریزی کے نامی اساتذہ میں سے تھے۔ پروفیسر میاں عطا الرحمٰن کی علمی وجاہت کے آگے بڑے بڑے طبیعیات دانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ پروفیسر بشارت الرحمٰن کی عربی دانی اور پروفیسر چوہدری محمد علی کی فلسفہ رانی کے آگے کوئی دم نہیں مارتا تھا۔ کالج کے دو اساتذہ حسن ظہیر اور کنور ادریس اور طلبہ میں سے رضا علی، سی ایس پی میں چنے گئے اور بڑی نیک نامی پائی۔ طلبہ میں سے اکثر سپیریئر سروس میں آئے۔ فنانس، اکاؤنٹس، ٹیکسیشن، ریلوے، پولیس سروس اور فارن سروس میں تو ہمارے شاگرد بھی پہنچے اور سفیر کے مرتبہ تک ترقی پائی۔ کالج کے طلبہ میں سے کئی عدلیہ میں سیشن جج کے مرتبہ تک پہنچے اور ہمارا ایک کلاس فیلو، یار محمد اسلام بھٹی تو ہائی کورٹ کا جج ہوکر ریٹائر ہوا۔ ہمارے ملک میں امتیاز وتفریق کا دور دورہ نہ ہوتا تو کئی ایسے تھے جو ہائی کورٹ کیا سپریم کورٹ تک پہنچتے۔ ابھی پچھلے دنوں کالج کے زمانے کے ایک پرانے دوست بیرسٹر مبشر لطیف یہاں کینیڈا آئے ہوئے تھے۔ اس وقت لاہور ہائی کورٹ میں ان کے شاگردوں کی معتدبہ تعداد ججی کے مناصب پر سرفراز ہے۔ غرض اس کالج کا دائرۂ فیضان قومی اور بین الاقوامی حلقوں تک ممتد ہے۔ پولیس میں تو ہمارا ایک شاگرد طاہر عارف ماشاءاللہ آئی جی کے مرتبہ تک پہنچا ہوا ہے۔ الحمدللہ اور فوج میں ہمارے شاگرد بریگیڈیئر کے رینک میں ہیں۔ اللّھم زد فزد۔

کالج کا وہ مرتبہ تھا کہ بڑے بڑے عالم، اساتذہ، افسر، جج، ادیب اور شاعر اس کالج کی دعوت پر کھچے چلے آتے تھے اور یہاں آنا اپنے لیے باعثِ افتخار گردانتے تھے۔ اس کالج کی یہ روایت رہی کہ کانووکیشن کے لئے ہمیشہ علمی اور ادبی شخصیتوں کو مدعو کرتا تھا۔ پہلی کانووکیشن جو ربوہ میں ہوئی اس میں میاں افضل حسین، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں انگریزی میں لکھا ہوا خطبہ تھا۔ جب پرنسپل صاحب نے کالج کی روایت کے مطابق اردو میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا تو میاں صاحب نے انگریزی میں چھپا ہوا خطبہ سامنے رکھ لیا مگر خطاب اردو میں فرمایا۔ سننے والوں کو ذرا احساس نہیں ہوا کہ وائس چانسلر کا خطبہ انگریزی میں تھا۔ جب بعد کو وہ خطبہ لوگوں میں انگریزی میں تقسیم ہوا تو لوگ حیرت سے کہنے لگے کہ اتنی جلدی اس خطبے کا انگریزی میں ترجمہ کیسے ہوگیا ہے۔ یہ میاں افضل حسین کی وضعداری تھی۔ آخر میاں افضل حسین پنجاب کے

ایک نامور علمی، سیاسی اور شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ میاں افضل حسین ایک بار پھر فزکس کی پوسٹ گریجوایٹ لیبارٹریز کے افتتاح کے لیے بھی تشریف لائے اور کالج کی قدم بہ قدم ترقی کو اپنی آنکھوں ملاحظہ فرمایا اور خوشنودی کا اظہار کیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے دو چیف جسٹس کالج میں آئے، جسٹس کیانی اور جسٹس منظور قادر۔ ججوں میں سے جسٹس شیخ بشیر احمد، جسٹس سجاد احمد جان اور جسٹس انوارالحق تشریف لائے۔ وائس چانسلر تو اکثر و بیشتر آتے رہے۔ میاں افضل حسین کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی۔

حکام میں سے وزرا سفرا تو آتے ہی رہے ضلعی اور ڈویژن کی سطح کے حکام جو آج کل ربوہ سے کنّی کتراتے ہیں ایک ادنیٰ سے اشارے پر کالج میں آنے کو تیار رہتے تھے اور اس بات کو اپنے لیے فخر گردانتے تھے کہ ہم نے تعلیم الاسلام کالج میں طلبہ کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے۔ یہ اسّی کی دہائی کی بات ہے کہ ایک اسسٹنٹ کمشنر سے ہم نے کہا کہ ہمارے ہاں آؤ۔ کہنے لگا آؤں تو سر کے بل مگر لوگ اُلٹا لٹکا دیں گے۔ (ہم نے دل میں سوچا سر کے بل آنے والے کو لوگ الٹا لٹکائیں گے تو ''سیدھا'' ہوجائے گا)۔ میں نے کہا تمہارا جو کمشنر ہے وہ غریب خانے پر قدم رنجہ فرما چکا ہے، اس کا سر تو سلامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ذرا سے حکام ربوہ آنے سے جھجکنے لگے تھے تو اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ اب ربوہ اور باہر کی دنیا کے درمیان جو پُل کالج کی صورت میں بنا تھا وہ منہدم ہوگیا تھا اور کالج کو قومیانے کا یہی لازمی نتیجہ ہونا تھا۔ باہر کی دنیا میں کالج اور سکول قومیائے گئے تو علم اور طلبائے علم کے مابین مفاہمت کا جو پُل تھا وہ ٹوٹ گیا۔ ایک شخص کی انا پرستی نے ساری قوم کو کس طرح افراتفری کی دلدل میں دھکیل دیا۔ بعض اوقات ایک عاقبت نااندیش حاکم کا ایک فیصلہ کس طرح قوموں کو صدیوں پیچھے لے جاتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں بھی ہمارے ادارہ کا امتیاز قائم رہا۔ جس سال کالج ربوہ آیا ہے اسی سال منور سعید نے ایف اے کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ دو سال بعد حمید احمد خان نے پھر یہ کام کر دکھایا حالانکہ اسے تو بیالوجی پڑھانے کو کوئی استاد بھی میسر نہیں تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج میں ہمارے طلبہ کی تعداد ہمیشہ ہی معتدبہ رہی۔ ہم نے کالج کی تمام علمی اور عملی روایات کو اجاگر ہوتے دیکھا ہے۔ آخر اس کالج کا ماٹو بھی تو ''علم وعمل'' ہی تھا۔ اب پتا نہیں کیا ہوگا، علم و عمل تو رہا نہیں۔ ہم کالج کے قومیائے جانے کے بعد ۱۹۷۵ء میں اسی کالج سے جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں ڈیپُوٹیشن پر گئے تھے۔ واپس آئے تو ان لوگوں نے آنے نہیں دیا اور ہمارے ''وزیر شاگرد'' کی ''سرتوڑ'' کوششوں کے باوجود نہیں آنے دیا۔ (سرتوڑ یوں کہ جس وزیر شاگرد نے ہمارے بارے میں حکم جاری فرمایا تھا کہ انہیں ربوہ کالج میں تعینات کردیا جائے اسے اوپر سے جھاڑ پڑی۔ مجھ سے کہنے لگے ''سر! اب آپ اپنی بات پر اصرار نہ کیجئے گا۔ مجھے تو ایسی جھاڑ پڑی ہے کہ ''سرٹوٹ'' گیا ہے) مگر بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ پروفیسر نصیر خان صاحب کہنے لگے کہ ہمیں اس زمانے کے کالج کے پرنسپل صاحب سے ازرہِ خلق ملاقات ضرور کرنی چاہیے۔ ہم گئے۔ دیکھا کہ پرنسپل کی کرسی پر یعنی اس کرسی پر جس پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد، قاضی محمد اسلم، چوہدری محمد علی جیسے پرنسپل بیٹھ چکے تھے ایک

صاحب تشریف فرما ہیں۔ یوں کہ ٹانگیں میز پر رکھی ہیں اور اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر فرمایا: اچھا تو آپ ہیں پرواز ی صاحب؟ ہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تو فرمانے لگے مگر آپ کی تو اس کالج میں کوئی جگہ نہیں۔ ہم نے کہا ہم اسی کالج سے گئے تھے اس لیے اصولاً اسی کالج کے پرنسپل سے سلامِ رُوستائی کے لیے آئے ہیں۔ کہنے لگے: وہ کیا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا: بس ہوتا ہے۔ قبلہ پرنسپل صاحب نے یہ تک نہیں فرمایا کہ بیٹھ جایئے۔ ہم اس کرسی کی اتنی رسوائی نہ دیکھ پائے اور سلام کر کے باہر آ گئے۔ باقی جو کچھ آپ نے کہا سنا وہ بے معنی باتیں تھیں اس لیے ہم نے لکھنا بھی مناسب نہیں سمجھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہم سرگودھا بورڈ کے سیکرٹری سے ملنے کے لیے گئے۔ چٹ اندر بھجوائی تو سیکرٹری صاحب لپک کر خود دروازہ تک ہمارے استقبال کو آئے۔ بڑی محبت سے اپنے بچھڑے ہوئے دوست کو اندر لے کر گئے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہی پرنسپل صاحب بیٹھے تھے۔ بہت حیران ہوئے کہ میں نے تو اس شخص کو بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا یہ سیکرٹری صاحب اس شخص سے اتنی ملاتفت سے کیوں پیش آ رہے ہیں؟ سیکرٹری صاحب نے جب اپنے مددگار کارکن کو ہمارے لیے اہتمام اور سلیقہ سے چائے لانے کو کہا تو نہ رہ سکے۔ سیکرٹری صاحب سے کہہ ہی بیٹھے کہ جناب میں کب سے یہاں بیٹھا ہوں، آپ نے مجھے تو پانی تک نہ پوچھا، ان کے لیے چائے اور بڑی مفصل چائے لانے کا آرڈر آپ نے دیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ سیکرٹری صاحب ہمارے پرانے دوست تھے۔ انہیں تو آگ لگ گئی۔ کہنے لگے: پرنسپل صاحب آپ بورڈ کی میٹنگ کے لیے بورڈ والوں کے مہمان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میرے پرانے اور ذاتی دوست ہیں۔ ہم لوگ ربوہ بھی جائیں تو کبھی کالج والوں کو تکلیف نہیں دیتے۔ ان کے گھر چلے جاتے ہیں جہاں ہمیں وقت بے وقت کھانا بھی میسر آ جاتا ہے اور چائے بھی مل جاتی ہے۔ اب وہ چار سال کے بعد میرے پاس مجھے ملنے کو آئے ہیں تو میں ان کی اتنی بھی خاطر داری نہ کروں؟

پرنسپل صاحب نے نہایت چھچھوری بات کی تھی۔ سیکرٹری صاحب نے منغّض ہونے کے باوجود ان کی بات ٹال دی مگر پرنسپل صاحب کا اندرونی بُغض کہاں چُھپتا۔ ذرا سی دیر کے بعد ہم سے مخاطب ہوئے اور کہا: ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ربوہ میں میرے خلاف باتیں کرتے پھرتے ہیں۔ ہم نے کہا: جنابِ والا! میرا کیا مرتبہ ہے کہ میں آپ کے خلاف باتیں کروں؟ میں آپ کا ماتحت نہیں، آپ کا رفیقِ کار نہیں، حتّٰی کہ آپ کو جانتا تک نہیں۔ ایک بار کالج کے دفتر میں آپ سے ملنے کو گیا تھا تو آپ نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا تھا اس لیے میں آپ کے خلاف کیا باتیں کروں گا؟ فرمایا: مجھے معتبر لوگوں نے بتایا کہ آپ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے کالج کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ہم نے پولے سے منہ سے جواب دیا: مگر حضورِ والا! یہ بات آپ کے خلاف کیسے ہوئی؟ کمرہ میں جتنے لوگ موجود تھے وہ سب ہنسنے لگے اور پرنسپل صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ تو جناب اگر اداروں کو ایسے ہی نااہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو یہی ہوتا ہے۔ محکمہ تعلیم نے چُن چُن کر ایسے پرنسپل اس کالج میں بھیجے کہ اس کالج کی روایات کو ملیا میٹ کر دیں کہ الامان والحفیظ۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے ہمارا مظفر گڑھ کے زمانے کا رفیقِ کار اور دوست، ایم اے مسعود چوہدری کالج کا پرنسپل بن کر آیا

تو کالج والوں کو کچھ امان ملی۔ تھوڑے عرصے کے لیے ڈاکٹر مظفر عباس بھی آئے۔ اب سنا ہے ہمارے شاگردوں کی نسل کا ایک طالب علم عزیزم مقبول احمد پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہے۔ چنیوٹ کا شریف بچہ ہے اور تعلیم الاسلام کالج کے زینہ سے اوپر گیا ہے مگر اس کے لیے جائے ماندن نہ پائے رفتن کا معاملہ ہے، کس کو خوش رکھے۔ مولویوں کو؟ مگر یہ قوم تو خوش ہونے سے رہی۔ ایک بار ہم کسی کام سے چنیوٹ کے اسسٹنٹ کمشنر سے ملنے کو گئے۔ غالباً جاوید محمود ان کا نام تھا۔ ہم گئے تو اس وقت وہ عدالت کی کرسی پر متمکن تھے۔ ان کی عدالت میں کم و بیش دس بارہ وکلا پیش تھے۔ ہم داخل ہوئے تو سب کے سب ہماری جانب بڑی محبت سے متوجہ ہو گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب عدالت برخواست کر کے اپنے چیمبر میں چلے گئے اور ہمیں باریابی کا شرف بخشا۔ کہنے لگے: یہ چنیوٹ تو آپ کا مخالف شہر ہے مگر یہاں کے وکلا آپ کے بڑے مدّاح لگتے ہیں؟ ہم نے انہیں بتایا کہ جتنے وکلا تھے وہ اتفاق سے سب کے سب ہمارے شاگرد تھے اس لیے انہوں نے استاد کی جانب محبت آمیز التفات دکھایا تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ کہنے لگے: آپ کے شاگرد ہیں یعنی ربوہ کالج میں پڑھے ہوئے ہیں؟ ہم نے انہیں بتایا کہ چنیوٹ شہر کے شرفا اپنے بچوں کو ربوہ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجتے تھے۔ اب بھی بھیجتے ہیں اگرچہ اب وہ مولوی مدن کی سی بات نہیں۔

چنیوٹ میں جو بھی پڑھا لکھا آدمی نظر آئے گا وہ ربوہ کالج کا پڑھا ہوا ہوگا۔ ہمارا کالج شرفا کا کالج تھا اور چنیوٹ شہر میں صرف مولوی ہی نہیں رہتے شریف لوگ بھی رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم کی علی الاعلان پالیسی یہ رہی کہ اس کالج میں کسی احمدی کو نہیں لگایا جائے گا۔ جو ریٹائر ہو جائیں گے ان کی جگہ غیروں سے پُر کی جائے گی۔ جو باہر جائے گا خواہ وہ پی ایچ ڈی کے لیے گیا ہو یا پڑھانے کے لیے، واپسی پر اسے اس کالج میں تعینات نہیں کیا جائے گا۔ مرزا انس احمد جب ایم فِل کر کے آکسفورڈ سے واپس آئے تو اس کالج میں نہیں آئے۔ انہیں حضرت صاحب نے جامعہ میں لگا دیا۔ جب ایسا تعصب پالیسی کا حصہ بن جائے تو اداروں کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے؟ پھر ایسے متعصب اساتذہ خاص طور سے دور دور سے تبادلہ کر کے اس کالج میں لائے جائیں جو اس کالج کی روایات کو مٹانے کے درپے ہوں، طلبہ کی دل آزاری کریں، روایتوں کا مضحکہ اڑائیں۔ آفرین ہے اپنے بچوں پر بھی کہ یہ سب کچھ انگیز کر لیا مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ تعلیم الاسلام کالج میں ہڑتال ہوئی ہے۔ یہ اس کالج کی روایت تھی کہ سارے کالج ہڑتالیوں نے بند کروا دیئے ہوتے تھے مگر تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔ ایک بار میاں عطاالرحمٰن صاحب کی قائمقامی کے زمانے کی بات ہے، افواہ اڑی کہ چنیوٹ کالج میں ہڑتال ہوگئی ہے اور وہ لوگ ربوہ کی جانب بسوں میں بڑھ رہے ہیں کہ اس کالج کو بھی بند کروا دیں۔ ہمارا پیریڈ ہمیشہ سے پہلا پیریڈ ہوتا تھا اور کلاس کیا ہوتی تھی ایک انبوہِ غفیر ہوتا تھا کیونکہ لازمی اردو پڑھانے والا ہمارے علاوہ اور کوئی استاد تھا ہی نہیں۔ میاں عطاالرحمٰن صاحب نے اس خدشہ کا اظہار فرمایا کہ ایسا نہ ہو چنیوٹ والے فسادی آ پہنچیں اور کوئی ناگوار صورت پیدا ہو جائے آپ اپنا لیکچر ذرا لمبا کر دیں۔ ہم نے اپنا پہلا پیریڈ ذرا لمبا کر دیا۔ اتنے میں سیکنڈ ایئر

والے اپنی کلاسوں سے فارغ ہوکر اپنے پیریڈ کے لیے آ پہنچے۔ ہم نے انہیں بھی اندر بلالیا اور ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ ہم نے شاعری کے کسی ''لذیذ'' موضوع پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس روز کچھ زیادہ ہی زورِ بیان اللہ میاں نے دے دیا۔ بچوں کو پتا تک نہیں چلا کہ ایک دو نہیں تین پیریڈ گزر گئے اور ابھی ہمارا موضوعِ سخن تشنہ ہے اور بچے چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر بولتے چلے جائیں۔ جب شادی نے آ کر ہمیں جھڑکا کہ بس کرو جی باقی استاد سٹاف روم میں بیٹھے آپ کو کوس رہے ہیں تو ہم نے کلاس چھوڑی۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ نہ بچوں کو پتا چلا کہ ہماری اس طول کلامی کی لَم کیا تھی نہ ہڑتالیوں کو کالج میں آ کر ہمارے بچوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ ہمارے کالج کی روایتیں تھیں۔ ایک استاد میں اتنا حوصلہ ہوتا تھا کہ وہ پانچ سو لڑکوں کو اپنے لیکچر میں روکے رکھے۔ وہ روکتا تھا، بچے رکتے تھے اور اب کسی ایک طالب علم کو روک کر تو دیکھیے!

بات ہم نے کالج میں پہلے دن سے شروع کی تھی مگر کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کالج میں کچھ دن تو فُولنگ کی ہما ہمی رہی اس کے بعد زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی یعنی کلاسیں، مباحثے، مشاعرے، تقریبات۔ پہلی کانووکیشن کا ذکر تو ہو چکا، یونین کے پہلے مباحثوں کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے انعقاد کے لیے کالج میں ہال تو تھا کوئی نہیں اس لیے لجنہ سے ہال مستعار لیا گیا تھا۔ انٹر کالجیٹ مباحثوں کا نام تو بہت سنا تھا دیکھے یا سنے نہ تھے۔ ربوہ والوں کے لیے ویسے بھی یہ نام عجوبہ تھا۔ خیر مباحثے ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا رہا مگر اصل رونق تو شام کے ڈِنر کی تھی۔ پروفیسر نصیر خان صاحب نے کالج کی چھت پر ایسا الف لیلوی انتظام کر رکھا تھا کہ باید و شاید۔ روشنی کے لیے یوں تو ان کا رخِ زیبا ہی کافی ہوتا مگر فرش پر دسترخوان بچھائے گئے اور قطار در قطار چراغ رکھے گئے۔ یوں بھی منڈیروں پر چراغاں کا سماں تھا۔ ہمیں یاد ہے باہر کے کالجوں کے جو مقرر اس میں شریک ہوئے وہ مدتوں اس الف لیلوی ڈنر کو یاد کرتے رہے۔ پھر پرنسپل صاحب یہ مہربانی فرماتے تھے کہ صبح کا ناشتہ مہمان مقررین کے ساتھ کرتے تھے اور ناشتہ بھی مالیر کوٹلہ کا نوابی ناشتہ ہوتا تھا۔

مالیر کوٹلہ کے نوابی ناشتہ سے یاد آیا کہ ۱۹۶۶ء میں پروفیسر حمید احمد خان، وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی جوہر آباد سے واپسی پر ربوہ رکے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حضرت صاحب نے ازراہِ بندہ پروری مجھے اور چوہدری محمد علی صاحب کو بھی ان کے ساتھ دوپہر کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ وہاں مالیر کوٹلہ والوں کے خاص شاہی ٹکڑے میٹھے کے طور پر موجود تھے۔ ہم لوگ ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔ حمید احمد خان صاحب حضرت صاحب کے بے تکلف دوست تھے۔ کہنے لگے: مرزا صاحب! سنا تھا مغلوں کے دسترخوان پر جنت کی نعمتیں موجود ہوتی تھیں۔ آج دیکھ بھی لیا۔ حضرت صاحب نے فرمایا: لیکن یہ شاہی ٹکڑے میری بیوی نے مالیر کوٹلہ کے نسخہ سے تیار کروائے ہیں۔ ہاں یہ گاجر کا جو مربہ آپ نے کھایا ہے یہ مغلئ نسخہ ہے۔ اس میں میٹھا خالص شہد کی مٹھاس کا ہے۔ حضرت آپا منصورہ بیگم کے ہاں کے شاہی ٹکڑے تو ہم نے پہلے بھی کھائے تھے لیکن اس روز کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلے وہ پرنسپل کی بیگم کے طور پر تیار کرواتی تھیں، اب ان میں خلافت کے مرتبہ کا تبرک بھی شامل تھا......

ہمارے کالج کا تشخص ایک خالص علمی ادارہ کا تھا۔ اس میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ طلبہ کو محض امتحانوں کے لیے تیار نہ کیا جائے بلکہ ان کے ذہنوں میں وسعت پیدا کرنے کے لیے زائد از نصاب سرگرمیاں جاری رکھی جائیں چنانچہ اس مقصد کے لیے یونین اور مجلسِ ارشاد کے علاوہ جو کالج گیر مجالس تھیں ہر مضمون کے طلبہ کی علیحدہ بزمیں موجود تھیں۔ بزمِ اردو اگرچہ اردو پڑھنے والوں کی بزم تھی مگر اس کا دائرہ بھی سارے کالج تک ممتد ہو گیا تھا اور اس کے عہدیداروں میں ایسے طلبہ بھی شامل ہوتے تھے جو اردو کے طالب علم نہیں تھے۔ اردو قومی زبان ہونے کے علاوہ احمدیوں کے لیے مذہبی اہمیت بھی رکھتی تھی اس لیے ۱۹۶۴ء کی پہلی اردو کانفرنس کے موقع پر پرنسپل صاحب نے اس کانفرنس کو یہ نعرہ دیا تھا کہ ''اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں، مذہبی زبان بھی ہے'' اور یہ سلوگن اردو کانفرنس کے پیڈ پر اور ہر چھپے ہوئے پروگرام پر موجود تھا۔ ۱۹۶۷ء کی دوسری کانفرنس کے وقت تو اس کانفرنس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور اس میں سارے پاکستان سے کوئی دو سو سے زائد مندوبین شامل ہوئے۔ پاکستان ریلوے نے مندوبین کے لیے کرایہ میں خاص رعایت کا اعلان کیا۔ کراچی سے ہی جو قافلہ آیا اس میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، شعبہ اردو کے سربراہ، اردو کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے عہدیدار شامل تھے۔ صدر ایوب سے پیغام بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہاں سے پوچھا گیا اور کس کس کے پیغامات پڑھے جائیں گے؟ ہم نے بتایا سرِ فہرست تو حضرت امام جماعت احمدیہ کا پیغام ہے تو انہیں چپ لگ گئی۔ کئی سال بعد میری قدرت اللہ شہاب سے ملاقات ہوئی جو صدر کے سیکرٹری تھے۔ اسلام آباد کی ایک ادبی تنظیم ''دائرہ'' کے اجلاس میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ میرا تعارف ہوا تو چونکے۔ کہنے لگے: آپ اردو کی بہت خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: نہیں میں نہیں میرا ادارہ اس نیک کام پر مستعد ہے مگر صدرِ مملکت تو پیغام بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔ کہنے لگے: اگر آپ ذرا سی عقل سے کام لیتے تو پیغام آ جاتا۔ ہم نے کہا: وہ کون سی عقل کی بات ہے۔ کہنے لگے: آپ سے کس نے کہا تھا کہ امام جماعت احمدیہ کے پیغام کا ضرور ذکر کریں۔ بس اسی بات نے کام خراب کر دیا۔ ہم نے کہا: جناب والا اگر یہی بات ہے تو

این گنا ہیست کہ در شہرِ شما نیز کنم

اور حافظ کا شعر بھی پڑھ دیا:

عقل گرداند کہ دل دربندِ زلفش چوں خوش است
عاقلاں دیوانہ گردند از پۓ زنجیرِ ما

ہمارے لیے یہی بے عقلی بس ہے۔ بعد کو جب شہاب صاحب کی شہاب نامہ پڑھی تو معلوم ہو گیا کہ پیغام کی اس نارسائی میں شہاب صاحب کی اپنی متعصب ذہنیت کارفرما تھی۔ ہمیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

نصیر صاحب یونین کے انچارج تھے تو وہ اس بات کا اہتمام کرتے رہتے تھے کہ مباحثوں میں جج صاحبان ایسے ہوں جو علمی اور ادبی لحاظ سے نمایاں ہوں مثلاً اس وقت میرے سامنے احسان دانش کی خودنوشت، جہانِ دانش کا دوسرا حصہ پڑا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ربوہ کالج کے مباحثہ میں وہ اور پروفیسر وقار عظیم جج

کے طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات تیسرے جج ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عابد احمد علی گورنمنٹ کالج، سرگودھا کے پرنسپل تھے اور ہمارے پرنسپل صاحب کے آکسفورڈ کے زمانے کے ہم عصر تھے۔ اس تعلق کی وجہ سے گورنمنٹ کالج، سرگودھا اور تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں ایک خاص رشتۂ مؤدت قائم ہوگیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار اس کالج کی ہاکی ٹیم ربوہ میچ کھیلنے کے لیے آئی۔ دفتر امورِ عامہ کے پاس جو گراؤنڈ ہے اس میں میچ ہوا۔ ہمارے پرنسپل صاحب نے خاص طور سے یہ اہتمام رکھا کہ اس کالج کی ٹیم کے ساتھ نہایت مربیانہ سلوک روا رکھا جائے۔ اس میچ میں ڈاکٹر عابد احمد علی بھی تشریف لائے تھے۔ ہمارے پرنسپل صاحب بھی ہاکی کا یہ میچ دیکھنے کے لیے آئے حالانکہ انہیں صرف باسکٹ بال کے میچوں میں دلچسپی تھی۔ پھر خان عبدالعلی خان گورنمنٹ کالج، سرگودھا کے پرنسپل بن کر آئے تو وہ بھی آکسفورڈ کے ناتے سے ہاکی کی ٹیم کے ساتھ آئے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے تو ہمارا دانت کاٹی روٹی کا تعلق تھا۔ فرسٹ ایئر میں ہم مباحثہ کے لیے گئے تو جیلانی صاحب نے کہ وہاں کی یونین کے انچارج تھے ہمیں اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا۔ یہاں تک پوچھ لیا کہ بچو تقریریں ٹھیک طور سے رٹی ہوئی ہیں کہ نہیں؟ جیلانی صاحب پرنسپل ہو گئے تو ہمیں اپنے کالج کے مباحثہ میں جج کے طور پر بلایا اور ہمارے تعارف میں خاص طور سے کہا کہ میں اس شخص کو فرسٹ ایئر کے طالب علم کی حیثیت سے جانتا ہوں جب اس نے انٹر کالجیٹ مباحثوں میں پہلی تقریر اسی کالج کے سٹیج پر کی تھی۔ اب میں نے اسے اسی کالج کے مباحثہ میں جج کے طور پر بلایا ہے۔ کیسے مہربان لوگ تھے۔ جیلانی صاحب کا ہمارے کالج کے ساتھ ہی نہیں کالج کے طلبہ اور اساتذہ اور پرنسپل صاحب سے والہانہ تعلق تھا۔ اب ایسی برکھا محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ میں اب بھی سرگودھا میاں عبدالسمیع نون صاحب کو جو کالج کے اولڈ بوائے ہیں، خط لکھتا ہوں تو جیلانی صاحب کو ضرور سلام بھیجتا ہوں اور وہ بھی بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں پیار بھیجتے رہتے ہیں......

پہلے یا دوسرے مباحثہ کے موقع پر مولانا عبدالمجید سالک، شیر محمد اختر (مدیر قندیل) اور مشہور شاعر نازش رضوی جج کے طور پر آئے تھے۔ سالک صاحب کے والد اور دوسرے بھائی احمدی تھے۔ سالک صاحب حضرت صاحب کی بیعت میں نہ تھے مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور ان میں ہم عمری کی وجہ سے خاصا دوستانہ تھا اور دونوں میں بے تکلفی بھی بہت تھی۔ مباحثوں کے بعد حضرت صاحب نے ان حضرات کو کھانے پر بلایا۔ نصیر صاحب نے بعد کو بتایا کہ کھانے کے بعد حضرت صاحب نے سالک صاحب سے فرمائش کی کہ اپنا کلام سنائیں۔ سالک صاحب نے اپنی مشہور غزل

چراغِ زندگی ہو گا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی بادِ بہاراں، ہم نہیں ہوں گے

اپنے مخصوص ترنم میں سنائی۔ نازش صاحب نے بھی کلام سنایا۔ شیر محمد اختر شاعر نہیں تھے محض تخلص رکھنے کے گنہگار تھے اس لیے وہ بچ گئے۔...... اگلے روز ہم نے بزمِ اردو میں سالک صاحب سے اردو کے فکاہی ادب

پر تقریر کروائی۔ تقریر کے بعد میں نے سوال کر دیا کہ آپ کے فکاہیوں کی بڑی شہرت ہے، کوئی فکاہیہ سنائیں۔ فرمانے لگے: فکاہیہ کوئی شعر تو ہوتا نہیں کہ یوں سنایا جائے اور ہر فکاہیہ کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ وہ سامنے نہ ہو تو فکاہیہ میں معنویت پیدا نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ نے کہا کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن جسے قراردادِ پاکستان کہتے ہیں مسلم لیگ کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔ اس موقع پر کانگریس والوں نے راوی کے کنارے ایک اجلاس کر کے اکھنڈ بھارت کی قرارداد منظور کی۔ کہنے لگے: اس اکھنڈ بھارت کی قرارداد کی منظوری کے بعد میں نے فکاہیہ لکھا کہ کانگریس والوں نے راوی کے کنارے اکھنڈ بھارت کی جو قرارداد منظور کی ہے وہ ''دروغ برگردنِ راوی'' ہے۔ سب لوگ اس بے ساختگی پر عش عش کر اٹھے اور کیمسٹری تھیئٹر داد و تحسین کے نعروں سے گونجنے لگا۔

شیر محمد اختر کی ایک بات مجھے نہیں بھولتی۔ کسی مباحثہ میں جج کے طور پر آئے ہوئے تھے۔ مجھے کہنے لگے: یار مجھے کسی دن میاں طاری سے ملواؤ۔ میں نے کہا آپ انہیں جانتے ہیں؟ کہنے لگے: ہاں ہمارے باپ دادا ان کے دادا سے بیعت تھے اور میری امی میاں طاری کی تو بچپن سے عاشق تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ اس لڑکے نے ایک دن خلیفہ بن جانا ہے۔ میں زندہ رہی تو اس کی بیعت کرلوں گی۔ اب وہ تو اس دنیا میں رہیں نہیں۔ جی چاہتا ہے میں ماں کی طرف سے انہیں دیکھ لوں چنانچہ میں انہیں میاں صاحب کے پاس لے گیا اور بتایا کہ اپنی امی کی طرف سے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اگلی بات کہنے کا محل تھا نہ موقع مگر اس مرحومہ کی بات کیسی صحیح نکلی۔ شیر محمد اختر کے باپ دادا تو احمدی تھے مگر انہیں کچھ عرصہ تک جماعتِ لاہور سے تعلق رہا، پھر وہ بھی نہ رہا۔ جماعت کے بارے میں تعصب بھی ان کے اندر نہیں تھا ورنہ جو لوگ جماعت سے دور بھاگے ہیں وہ ''بادشاہ کے وفادار بننے کی نیت سے'' جماعت کی مخالفت بھی بہت کرتے ہیں۔ شرفا ایسی باتوں سے دور بھاگتے ہیں مثلاً یہی شیر محمد اختر تھے، پروفیسر جیلانی کامران تھے۔ عارف عبدالمتین تھے۔ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کی احمدیت کا برملا اعتراف کرتے تھے مگر احمدیت یا بانیٔ سلسلہ کے خلاف ان کی زبان شوخی نہیں دکھاتی تھی......

یادنویسی کی ایک مصیبت یہ ہوتی ہے کہ لکھتے لکھتے، باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں اور ذہن کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ واپس لوٹ کر اپنی طالب علمی کی طرف آ رہے ہیں۔ ایف اے ایف ایس سی کے امتحان میں ہمارے ساتھ سائنس کے بڑے بڑے نابغے تھے۔ وہ تو ایف ایس سی میں اچھے نمبر لے کر انجینئرنگ یا میڈیکل میں چلے گئے۔ ہمارے حریف نابغے جو آرٹس کے امتحان میں شریک تھے پیچھے رہ گئے اور ہم ایف اے کے امتحان میں اپنے کالج میں اول رہے اور وظیفہ پایا۔ اب ہاسٹل میں رہنے کا موقع ملا۔ کیوبکل نمبر ایک ہمارا کمرہ تھا۔ اس زمانے میں ہاسٹل کی کھڑکیوں کی جالیوں پر سبز رنگ کیا گیا تھا کہ دھوپ کی تمازت کم رہے۔ ایک روز ہم لوگ نیاز مرحوم کے کمرہ میں بیٹھے حسبِ معمول سٹڈی کے وقت میں گپ لگا رہے تھے (یا شاید تاش کھیل کر پتے سمیٹ کر بیٹھے تھے) کہ یوں محسوس ہوا کوئی صاحب باہر سے جالی پر آنکھیں ٹکائے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم تو دیکھ نہیں سکتے تھے کون صاحب ہیں اور کس مقصد سے جھانکا تاکی کر رہے ہیں۔ نیاز نے اپنی جاٹوں کی زبان میں کہا: ارے بھئی کون ہو؟ نقلیں کیوں مار رہے ہو؟ باہر سے آواز آئی: مرزا ناصر احمد۔ اب ہمارا تو وہ

حال ہوا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں مگر ہمارے پرنسپل بڑے حوصلہ مند پرنسپل تھے۔ مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس چلے گئے اور کالج میں اس کا کچھ چرچا نہ ہوا کہ پرنسپل صاحب نے کس کمرہ میں کتنے چور پکڑے تھے؟

خدا خدا کر کے ہم تھرڈ ایئر میں پہنچے تو یونین کا الیکشن لڑنے کا خیال آیا کیونکہ سیکرٹری تھرڈ ایئر میں سے اور نائب صدر فورتھ میں سے چنا جاتا تھا۔ صدر پرنسپل صاحب خود ہوتے تھے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یونین کے کسی اجلاس میں انچارج یونین نے کہ ہمارے پروفیسر نصیر احمد خان ہوتے تھے، کسی بات پر ناراض ہو کر یونین کے کسی عہدیدار کو برطرف کر دیا۔ ہم اس زمانے میں نوائے وقت اخبار کے نمائندہ ہوا کرتے تھے۔ ہم نے یہ خبر اخبار کو بھیج دی جو چھپ گئی۔ اب ہماری شامت آ گئی کہ کالج کی خبر باہر کیوں چھپوائی ہے؟ ہم نے بہتیرا کہا کہ یہ کون سی ایسی خفیہ خبر تھی کہ اس کا چھپنا گناہ ہوتا؟ مگر نصیر صاحب آخر نصیر صاحب تھے کسی صورت میں ہمیں معاف کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

پرنسپل صاحب بڑے مزے سے ''صاحبِ یونین'' اور ''مقررِ یونین'' کا تماشہ دیکھتے رہے تا آنکہ اسی مقرر نے تھرڈ ایئر میں پہنچ کر سیکرٹری کے طور پر الیکشن لڑنے کا ارادہ کر لیا۔ خوب زوروں کی کنویسنگ ہوئی۔ خیال تھا کہ شاید ہم جیت ہی جائیں گے مگر عین الیکشن سے دو روز قبل ایک نوٹس نوٹس بورڈ پر آویزاں پایا گیا کہ ہم نے کالج کی ایک خبر نوائے وقت میں چھپوائی تھی اور یہ ناقابلِ معافی جرم ہے اس لیے ہمیں الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ کالج میں سنسنی پھیل گئی۔ پرنسپل صاحب باہر تھے۔ ان کے واپس آنے میں کئی روز کا وقفہ تھا۔ الیکشن دو روز بعد ہونا تھا۔ ہوا اور ہمارے دوست اور پرانے ساتھی مرزا انس احمد بلامقابلہ سیکرٹری بن گئے۔ وہ جو خیال تھا کہ

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پرنسپل صاحب واپس تشریف لائے تو اس سارے حادثے کا انہیں علم ہوا۔ آپ نے یونین کے انچارج صاحب کو اور ہمیں بلا کر ہماری صلح صفائی کروا دی۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

وہ صلح صفائی ایسی دوستی میں بدل گئی جسے پھر کوئی گزند نہیں پہنچا۔

فورتھ ایئر میں ہمارا مقابلہ پھر انس کے ساتھ ہوا۔ اس بار میدان میں ایک تیسرا امیدوار مبشر احمد اختر بھی تھا، میاں غلام محمد اختر کا صاحبزادہ۔ اس کے بارہ میں تو کسی کو گمان تک نہ تھا کہ دریں گرد سوارے باشد۔ وہ اچانک امیدوار بن گیا اور اس وقت تک ڈٹا رہا جب تک الیکشن کے تقریری مقابلہ میں ناکام ہو کر الیکشن کے لیے نااہل قرار نہیں دیا گیا۔ اس وقت اس کے حواریوں نے جن میں ہمارے تقسیم شدہ ووٹر بھی شامل تھے ہمارے حق میں بہت زور لگایا مگر وقت گزر چکا تھا۔ الیکشن ہوا اور بڑے زوروں کا ہوا۔ ہم اپنی روایت کے مطابق ہار گئے۔ ایک یا دو ووٹوں کا فرق تھا۔ دو تین بار گنتی ہوئی کہ گننے میں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو مگر نہیں تھی۔ آخر انس کی کامیابی کا اعلان ہو گیا اور ہم انہیں مبارکباد دینے گئے۔ ہم نے انس سے کہا: اب یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ ہم

آپ کے مخالف ہیں۔ ہم آپ کے سب سے بڑے حمایتی ہیں اور یونین کا سب سے زیادہ کام کریں گے چنانچہ ہم نے اس شکست کا بدلہ یوں لیا کہ اس سال یونین کی سرگرمیوں میں سب سے آگے آگے رہے اور بے شمار مقابلے یونین کے لیے جیتے۔

اس الیکشن سے ایک سال پہلے مقابلہ عطاء الکریم اور افتخار احمد شہاب کے مابین ہوا تھا۔ افتخار شہاب چنیوٹ کا بڑا ذہین لڑکا تھا۔ المنار کے انگریزی حصہ کا غالباً ایڈیٹر بھی تھا۔ مقابلہ بڑا معرکہ کا تھا کیونکہ چنیوٹ اور ربوہ کے امیدواروں میں ٹھن گئی تھی...... جب معلوم ہوا کہ افتخار کامیاب نہیں ہوا تو پرنسپل صاحب نے اسی وقت ایک نیا عہدہ قائم کیا اور افتخار احمد شہاب کو یونین میں ''پرنسپل کا نمائندہ'' مقرر کیا...... اب اسی سنت کی پیروی میں پرنسپل صاحب نے ہمیں یونین میں اپنا نمائندہ مقرر کیا اور ہم ہارنے کے باوجود یونین کی عاملہ کے رکن رہے۔ ان تمام ہزیمتوں کا بدلہ ہم نے اپنے پرانے یار اور حریف سے یوں لیا کہ بی اے کے امتحان میں کالج میں اول رہے اور ان کے تمام حواری ان کے سمیت، امتحان کے میدانِ کارزار میں کھیت رہے۔

کالج میں ہمارا طالب علمی کا دور اس لحاظ سے بڑا شاندار رہا کہ ہم تمام علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑی تندہی سے حصہ لیتے رہے۔ کھیلنے کو باسکٹ بال بھی کھیلا۔ فٹ بال پر بھی مشقِ ستم کرتے رہے۔ بزم اردو کے عہدیدار رہے۔ یونین کے مباحثوں میں بھی شریک ہوتے رہے اور اپنے پراکٹروں سے بھی چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ المنار کی ایڈیٹری بھی چار سال تک نبھائی مگر بہ قول شخصے اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ نیک نامی تو کمائی یا نہیں بدنامی نہیں کمائی، حتّٰی کہ فیل تک نہیں ہوئے بلکہ وظیفے پاتے رہے، پہلے کالج سے پھر یونیورسٹی سے۔ لیکچروں میں باقاعدگی سے نہ جانے کے باوجود کبھی ہمارے لیکچر کم نہیں ہوئے۔ کیوں نہیں ہوئے؟ ہمیں پتا نہیں۔ ہم نے کبھی اپنی حاضری نہیں لگوائی۔ ہماری موجودگی کا اساتذہ کو ویسے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ فتنہ کلاس میں موجود ہے اس لیے وہ تعرّض نہیں کرتے تھے۔ اللہ بخشے مولانا غلام احمد بدّوملہی والے بڑے دبنگ استاد تھے۔ ان کی نگاہ بڑی دُوربین تھی۔ کان اس سے بھی زیادہ حسّاس۔ ایک بار دینیات کی لازمی حاضری والی کلاس میں ہم نے ایک ساتھی کی جگہ یس سر کہہ دیا۔ بغیر نظر اوپر اٹھائے ٹوک دیا کہ رول نمبر تیئس رول نمبر پچپن کی جگہ کیوں بول رہے ہو؟ انہیں طالب علموں کا نام کیا ان کا شجرۂ نسب تک یاد رہتا تھا۔

شجرۂ نسب سے یاد آیا حضرت مولانا ارجمند خان دینیات کے استاد تھے۔ کلاس میں ہم نے کوئی شوخی دکھائی تو فرمانے لگے: میں تمہارے باپ کا بھی استاد ہوں۔ اب اگر تم نے ایسی حرکت کی تو اس کے بھی کان کھینچوں گا، تمہارے بھی۔ ہم نے مزید شوخی کی کہ ہمارے ابا کے کان کھینچنے کے لیے آپ کو بہت اونچی کرسی پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ بڑے مزے سے ہنسے اور فرمایا: اوئے بدتمیزا! کیا میں کرسی پر کھڑا نہیں ہو سکتا؟ اتنا کہہ کر کرسی کی طرف دیکھا اور اس کی ناتوانی اور اپنے تن و توش کا خیال کر کے خود ہی بڑے زور سے ہنسے اور فرمایا: لاحول ولا قوۃ۔ کیا سادہ دل استاد تھے۔ مہربان، شفیق اور دلنواز۔

اردو کے استاد پروفیسر محبوب عالم خالد تھے۔ اب ماشاء اللہ اپنے مرشد کے تتبع میں انجمن کے صدر

ہیں۔ اس زمانے میں صدر کے سیکرٹری ہوئے تو اپنی کلاسیں ہمیں دے گئے کہ لو میاں خود ہی پڑھو اور خود ہی پڑھاؤ۔ اس مشقِ ستم نے ہمیں پڑھانے کا تجربہ مفت میں مہیا کر دیا۔ کلاسیں بھی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اردو کے لازمی مضمون بن جانے کے بعد کی کلاسیں نہیں تھیں کہ کلاس نہ لی جلسۂ عام سے خطاب کر لیا۔ ہال نہیں تھا تو کیمسٹری تھیٹر تھا اَٹا اَٹ بھرا ہوا۔ آواز کی رسائی کے لیے لاؤڈ سپیکر جسے انجمن ترقیٔ اردو والے آلۂ مکبّر الصوت اور ہمارے استاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ آلۂ کریہہ الصّوت کہا کرتے تھے بیچارا فزکس کا لیبارٹری اسسٹنٹ، محمد علی سردیوں میں ٹھٹھرتا کانپتا احمد نگر سے صبح صبح لگانے آیا کرتا تھا اور شاید دس روپے زائد الاؤنس پاتا تھا۔ ہال میں تو عالم ہی اور ہو گیا تھا۔ لاؤڈ سپیکر کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا۔ ہمیں ویسے بھی پکار کر بولنے کی عادت پڑ گئی مگر سب سے بڑا کام تو ہال میں اتنے جمِ غفیر کو قابو میں رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے ہم نے ایک خاموش طریقۂ سرزنش ایجاد کیا تھا۔ جہاں سے شور کا شبہ ہوتا ادھر انگلی اٹھاتے اور شور کرنے والے کو اشارہ کرتے اور ہال سے باہر نکال دیتے۔ ایک سولی بھی ہال میں موجود تھی یعنی سٹیج پر یونین کے صدر کی اونچی کرسی پڑی رہتی تھی۔ جس کو زیادہ زِچ کرنا یا شرمندہ کرنا مقصود ہوتا اسے بلا کر اس کرسی پر بٹھا دیتے اور وہ سارا وقت لوگوں کے تیرِ نگاہ کا مرکز بنا رہتا۔ لڑکوں کی اس سے جان جاتی تھی۔ یہاں کینیڈا میں ایک پرانے ''ٹوٹی'' شاگرد نے پوچھ ہی لیا کہ یہ بتائیں آپ تین سو ساڑھے تین سو لڑکوں میں سے مجرم کو کیسے پہچان لیتے تھے کیونکہ آپ کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ صحیح مجرم یعنی میں ہی پکڑا جاتا تھا۔ ہم نے کہا: میاں! اب تم سے کیا پردہ؟ ہم تو اندازہ سے اس جانب انگلی اٹھا کر ذرا رعب سے کہتے تھے آپ۔ اور وہ ''آپ'' آپ ہی آپ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اگر کوئی کھڑا نہ ہوتا تو دوبارہ ذرا زیادہ زور سے کہتے اور وہ چپکے سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہی جو اصل مجرم ہوتا کیونکہ مجرم کے دل میں چور ہوتا ہے اور انگلی کا اشارہ جو سٹیج سے کیا جا رہا ہو سیدھا مجرم کے سینے پر لگتا تھا۔ وہ حضرت کہنے لگے: ہم خوامخواہ آج تک پریشان ہوتے رہے کہ ان کے پاس کون سا جادو ٹُونا ہے کہ سیدھے سبھاؤ ہمیں کو پہچانتے ہیں۔ آج حقیقت کا پتا چلا ہے تو اپنی بیوقوفی پر حیران ہو رہے ہیں کہ کئی لذیذ لیکچر محض اس اشارۂ عمومی کی بدولت ضائع کر دیئے۔

کالج میں جو مہمان تشریف لاتے رہے ان میں دو ہمیں یاد ہیں۔ ایک تو کوئی روسی سائنس دان تھے جو پاکستان سائنس کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی آئے ہوئے تھے۔ نصیر خان صاحب انہیں اپنے ساتھ لوالائے۔ کیمسٹری تھیٹر میں ہی ان کا لیکچر ہوا۔ ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا مگر آپ نے روسی زبان ہی میں خطاب فرمایا۔ ترجمان ترجمہ کرتا تو سائنس دان صاحب کے چہرے سے صاف لگتا کہ اپنے ترجمان سے بہتر انگریزی سمجھتے ہیں مگر اپنی حکومت کی جانب سے انہیں روسی کے سوا کوئی اور زبان بولنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے ایک امریکن تھے۔ یہ حضرت مسٹر فلنٹ کے نام سے موسوم تھے اور لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے رکن تھے۔ ان کا موضوع تھا جمہوریت۔ جیسے آج کل امریکہ کے پیٹ میں جمہوریت کا مروڑ اٹھا ہوا ہے اس وقت بھی تھا مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔ اس لیکچر کے میزبان پولیٹیکل سائنس سوسائٹی والے تھے۔

کانووکیشن بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کالج والے افسروں کو بلانے کی بجائے علما و فضلا کو بلاتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد، جسٹس کیانی، ڈاکٹر سیّد صفدر حسین، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی، کون سا ایسا ماہرِ تعلیم تھا جو نہ آیا ہو۔ مولانا صلاح الدین احمد تو بزم اردو کی تقریبات میں تشریف لاتے ہی تھے، بزم اردو کی تقریبات میں ان تمام بزرگوں کے علاوہ ماسوا جسٹس کیانی کے، سب ہی تشریف لاتے رہے۔ پھر سرکاری عہدیداروں کا آنا جانا بھی زیادہ تر بزم اردو کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ ہمارے ڈویژن کا ہر کمشنر بزم اردو کے زیرِ اہتمام ربوہ آیا یا بعد کو باسکٹ بال کے ناتے سے۔ ایک کمشنر تھے۔ شیخ محمد حسین ان کا نام تھا۔ قاضی صاحب یعنی پرنسپل قاضی محمد اسلم صاحب کے گورنمنٹ کالج کے زمانے کے شاگرد تھے۔ جب کالج کیمپس میں داخل ہوئے تو موٹر سے اتر گئے۔ کہنے لگے: میں اپنے استاد کے سامنے گاڑی میں بیٹھ کر نہیں جا سکتا۔ شیخ صاحب انگریزی کے آدمی تھے۔ اردو پڑھ تو لیتے تھے مگر زیادہ سمجھ بوجھ انہیں ادب کی نہیں تھی۔ اپنے استاد کی زیارت کے شوق میں ہماری دعوت قبول کر لی تھی۔ ہم نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پہلے سے بھیج دیا تھا کہ جواب لکھوا کر لا سکیں۔ ہم اس زمانے میں پروفیسر نہیں تھے محض لیکچرار تھے اس لیے اپنے عہدے کے اظہار کے لیے اپنے نام کے ساتھ ''استادِ ادبیاتِ اردو'' لکھتے تھے۔ شیخ صاحب اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ ابھی ابھی استادِ ادبیاتِ اردو نے جو کچھ کہا ہے...... سامعین کے کان کھڑے ہوئے مگر لوگ سمجھے ''کتابت (خطابت؟) کی غلطی ہو گئی ہو گی۔ جب کمشنر صاحب نے دو تین بار ادبیاتِ اردو کی بجائے اِدیاتِ اردو فرمایا تو لوگ محظوظ ہونے لگے۔ قبلہ قاضی صاحب نے بڑے پیار سے انہیں سمجھا دیا کہ یہ لفظ اِدیات نہیں اَدبیات ہے۔ شیخ صاحب خود بھی مسکرائے۔ کہنے لگے: اردو کی یہی تو مصیبت ہے کہ ایک لفظ کے ادھر ادھر ہو جانے سے ہی (He) کا شی (She) بن جاتا ہے۔

کمشنروں میں سے سیّد قاسم رضوی نہایت ادب نواز اور ادیب نواز کمشنر تھے۔ ایسی شستہ و رفتہ اردو لکھتے اور بولتے تھے کہ کیا کوئی اردو کا پروفیسر بھی لکھے یا بولے گا۔ سرگودھا میں یومِ غالب کے موقع پر اپنا خطبۂ صدارت غالب کے اسلوب میں خط کی صورت میں لکھا اور پڑھا اور اہلِ ذوق مدتوں اس کو یاد کرتے رہے۔ ڈاکٹر انور سدید، محمد خالد اختر اور مشفق خواجہ کے غالب کے جدید خطوط اس کے بعد کے ہیں۔ یہی قاسم رضوی بزم اردو میں بھی آئے اور دسویں قومی باسکٹ بال ٹورنامنٹ میں ڈویژن کا کمشنر ہونے کے ناتے سے میزبان کی حیثیت سے بھی آئے۔ میں ان دنوں باسکٹ بال کلب کا صدر تھا کیونکہ چودھری محمد علی صاحب پرنسپل کی کرسی پر سرفراز ہو گئے تھے۔ کمشنر صاحب انتظامات کا معاینہ کرتے پھرتے تھے۔ ہم نے جلسہ سالانہ کی طرز پر ہوسٹل کے باہر کچھ عارضی بیوت الخلاء بھی بنوا رکھی تھیں۔ وہاں پہنچے تو کہنے لگے یہ کیا بنا رکھا ہے؟ میں نے کہا: بیت الخلا ہیں۔ ''دستِ مبارک'' سے افتتاح فرمائیں۔ کمشنر صاحب کی ساری کمشنرانہ تمکنت دھری رہ گئی۔ قہقہہ مار کر ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ مدتوں بعد جب وہ ملتان میں کمشنر تھے میں انہیں کسی کام سے ملنے گیا۔ اس وقت بھی وہ افتتاح والا لطیفہ انہیں یاد تھا۔ افسوس کہ بھٹو صاحب کی کینہ توزی کا شکار ہو کر ملازمت سے برطرف کئے

گئے اور جلد ہی فوت ہو گئے اور پاکستان ایک نہایت زِیرک، محنتی اور ذہین افسر سے محروم ہو گیا۔ وفات سے ذرا عرصہ قبل لاہور میں سِول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے کہ ایک روز اچانک ان کی برطرفی کے احکامات جاری ہوئے۔ دو روز بعد ان کی والدہ کی وفات ہو گئی۔ میں اتفاق سے لاہور میں تھا۔ میں تعزیت کے لیے پہنچا۔ دیکھا کہ ڈائریکٹر کے وسیع وعریض بنگلہ میں تن تنہا غمگین بیٹھے ہیں۔ میں گیا تو میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کہنے لگے صبح سے اکیلا بیٹھا ہوں۔ تم پہلے شخص ہو جس نے اس گھر میں جھانک کے دیا ہے۔ خدا جانے امی کے جنازے میں بھی کوئی آئے گا یا نہیں آئے گا۔ میں نے بہت تسلی دی اور سارا دن ان کے ساتھ رہا اور دلداری کرتا تھا۔ شام کو جنازہ اٹھا تو گنتی کے چند لوگ اور سِول سروس اکیڈمی کے عہدیدار جنازے کے ساتھ تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی سناؤنی سنی۔ میں اس وقت کہیں باہر تھا۔ خدا معلوم ان کے جنازے کے ساتھ کون تھا اور کون نہیں تھا۔ دنیادار لوگ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے افسری کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مشاعرے بھی ہمارے کالج کے یادگار ہوتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ معیار بہت بلند ہوتا تھا، کچھ اس وجہ سے کہ پرنسپل صاحب کے علاوہ ان کی بیگم صاحبہ شعروں کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ (آخر کس ماں کی بیٹی تھیں!) ایک مشاعرہ کالج میں ہوتا، ایک پرنسپل کے گھر میں ہوتا۔ ثاقب زیروی پرنسپل صاحب کے ذوق کو خوب پہچانتے تھے۔ کالج والے انہیں کہہ دیتے۔ کالج کی گاڑی شعرا کو لینے چلی جاتی اور شعراء سر کے بل آتے۔ اردو کانفرنس کے مشاعرہ میں صوفی تبسم بھی آئے۔ اس وقت پرنسپل صاحب حضرت صاحب بن چکے تھے۔ جب صوفی صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوا تو مجھے خاص طور سے یاد فرمایا اور تاکید کی کہ صوفی صاحب میرے استاد ہیں۔ ان کا بہت خیال رکھنا۔ صوفی صاحب نے اردو غزل کے علاوہ پنجابی کلام بھی سنایا:

سھاڈے حسن دے چمکدے لیکھاں اُتّے ڈاھڈے غم دیاں سیاہیاں ڈُھل گئیاں
جیہڑیاں حسن ترے چمکائیاں سن اوہ چانیاں راتاں رُل گئیاں

دوسری اردو کانفرنس جو ۱۹۶۷ء میں ہوئی بڑی عظیم الشان کانفرنس تھی۔ سارے پاکستان میں دور ونزدیک اس کا چرچا تھا۔ کانفرنس کے وقت ہال کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ فیصل آباد اور سرگودھا سے تو بے شمار لوگ آتے، کانفرنس سنتے اور واپس چلے جاتے۔ کھانے کا البتہ لنگر جیسا انتظام تھا مگر مینیو لنگر کا نہیں تھا۔ بڑے پُرتکلف کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ دوسرے روز شام کی دعوت تو حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثالث کی جانب سے تھی اور انجمن کے مغربی لان میں جہاں اب گیسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے تھی۔ اس دعوت میں حضرت صاحب مہمانوں سے ذرا پہلے تشریف لائے تھے اور خود مہمانوں کا استقبال کیا تھا۔ مہمانوں میں ان کے پرانے رفقائے کار، ماہرینِ تعلیم اور دوست شامل تھے۔ مجھے یاد ہے ڈاکٹر سیّد نذیر احمد، پرنسپل گورنمنٹ کالج، لاہور تو لپک کر حضرت صاحب کے گلے لگ گئے اور بڑی دیر تک ان سے جدا نہ ہوئے۔ صوفی تبسّم صاحب نے بھی معانقہ کیا۔ عابد علی عابد البتہ لئے دیئے رہے۔ یہ دعوت بڑی بے تکلّفی کے ماحول میں ہوئی مگر کھانا حضرت صاحب کی توقعات کے مطابق تیار نہ کیا گیا تھا اس لیے حضرت صاحب نے گھر سے بھی بہت سی ڈشیں منگوائیں۔ دیر تک

مہمانوں سے گفتگو فرماتے رہے۔ چلتے وقت ڈاکٹر سیّد نذیر احمد نے پھر اسی جوش و جذبہ سے معانقہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب خوب آدمی تھے۔ دیکھنے میں بالکل سادہ مگر علم میں پختہ اور طلبہ میں نہایت مقبول۔

کالج کے مشاعرہ میں رونق بھی اپنے رنگ کی رونق تھی کیونکہ ہمارے مشاعروں میں وہ روایتی ہڑبونگ نہیں مچتی تھی۔ لوگ داد ضرور دیتے تھے مگر بیداد سے مجتنب رہتے تھے اس لیے شعرا یہاں آنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور سارا سال منتظر رہتے تھے کہ کب کالج کے مشاعرہ کی دعوت آئے۔ ایک بار علامہ لطیف انور تشریف لائے۔ ان کی رباعی نے مشاعرہ لوٹ لیا:

دل سے تُو بیشک اتارے گا مجھے
دُور تک لیکن پکارے گا مجھے
مجھ کو ہے اپنے گناہ کا اعتراف
پہلا پتھر کون مارے گا مجھے؟

اتفاق یوں ہوا کہ اگلے سال کے مشاعرے سے پہلے وہ دنیا چھوڑ گئے۔ گلزار ہاشمی آئے اور دو غزلیں اپنے بے پناہ ترنم میں سنائیں۔ ایک کی ردیف یاد ہے: ''وقت ناساز ہے۔'' کچھ غزلیں دردانگیز تھیں، کچھ ان کا ترنم دردانگیز تھا سارا ہال اداس ہو گیا۔ لوگ مشاعرہ کے بعد بھی ان کی غزلیں انہی کے ترنم میں گنگناتے رہے۔ اگلے سال کے مشاعرہ سے پہلے وہ بھی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ شعرا میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ جو شاعر زیادہ پسند کیا جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ کلیم عثمانی کی ایک غزل بہت مشہور ہوئی۔ میں نے کہا: کلیم بھائی! آپ نے مشاعرہ لُوٹ لیا۔ آپ نے فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: ہش۔ ایسی منحوس بات منہ سے نہ نکالو۔ ابھی میں مرنا نہیں چاہتا۔

کالج میں علمی مذاکرے اور کانفرنسیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں مگر ہمارا کالج کھیلوں میں بھی کسی سے ہیٹا نہیں تھا۔ لاہور میں تھا تو روئنگ یعنی کشتی رانی کا چیمپئن تھا۔ ربوہ آیا تو یہ اعزاز ساتھ لایا۔ دریا کا کنارہ وہاں بھی تھا، یہاں بھی تھا۔ پرنسپل صاحب کو آکسفورڈ کے زمانے سے اس کھیل سے دلچسپی تھی۔ لاہور میں کالج کا مقابلہ عام طور سے اسلامیہ کالج سے ہوتا تھا۔ ربوہ آئے تو بھی مقابلہ اسلامیہ کالج ہی سے رہا۔ بڑا جان توڑ مقابلہ ہوتا تھا اور پرنسپل صاحب کو اور کشتی رانی کے پروفیسر انچارج چوہدری محمد علی صاحب کو اس کھیل کھلاڑیوں سے اتنی دلچسپی اور محبت تھی کہ کھلاڑیوں کی نگرانی بھی بہت ہوتی تھی کہ پریکٹس سے غافل نہ ہوں اور خاطر تواضع بھی بہت ہوتی تھی۔ سیروں کے حساب سے دودھ پلایا جاتا تھا، سویابین کا حلوہ اور پتا نہیں کیا کیا انہیں کھلایا بلکہ بہ قول شخصے ''ٹھسایا'' جاتا تھا اور یہ تھا بھی ضروری کیونکہ کشتی کھیلنا بچوں کا کھیل نہیں اور وہ بھی پانی کے بہاؤ کے خلاف۔ مسلسل پریکٹس، اچھی صحت اور مضبوط تن و توش اس کے لیے ضروری تھا۔ صبح وشام ان کھلاڑیوں کو ورزش بھی خوب خوب کروائی جاتی تھی۔ دیکھنے میں دیدارُو جوان لگتے تھے ''سینے گوشت سے لپے ہوئے، ڈنٹر قبضے بنے ہوئے، رانوں کے مچھلے اُلٹے ہوئے، پنڈلیاں کچالوسی بنی ہوئی، اپنے پرائے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔'' یہ جو

میں نے حوالہ درج کر دیا یہ شاہد احمد دہلوی نے دلی کے پہلوانوں کے بارے میں لکھا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا ہمارے روئنگ والوں کا ذکر ہے اس لیے میں نے ان کی کتاب ''اجڑے دیار'' میں سے اچک کر یہاں درج کر دیا۔ اس ساری ٹیم میں ایک نہ ایک نازک اندام کھلاڑی بھی ہوتا تھا جسے کشتی کی پھننگ پر بیٹھ کر کشتی کا رخ سیدھا رکھنا ہوتا تھا۔ اسے سٹیئر کہتے تھے۔ اس نازک اندام کی نازک اندامی کی حفاظت بھی بڑا جی لگا کر کی جاتی تھی کہ کہیں اس کا تن وتوش نہ بڑھ جائے کیونکہ اس کا کام اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ ہلکا پھلکا مگر بازوؤں میں جان والا ہوتا کہ کشتی کو بدراہ ہونے سے بچائے رکھے۔ زور آوروں کا سارا زور کشتی کھینچنے پر مرتکز رہتا تھا اور یہ نازک سا کھلاڑی کشتی کا رخ سیدھا رکھنے پر مستعد رہتا تھا کہ ذرا رخ میں کجی آئی سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اسی کھیل کا ایک کھلاڑی تھا جسے پرنسپل صاحب نے پریکٹس کے وقت کبڈی کا میچ دیکھتے ہوئے دیکھ لیا اور سب کے سامنے اسے بیدوں سے دھرلیا۔ ذرا جو اس نے چوں چرا کی ہو۔ فوراً بھیگی بلی بن کر دریا کی طرف بھاگا۔ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے کہ اس پرنسپل کا کتنا رعب داب ہے کہ کالج کے تن آور کھلاڑیوں کو سرِ عام بید لگا سکتا ہے۔ دراصل یہ سب ہمارے کالج کا فیض تھا دوسرے کالجوں میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ کھلاڑی بعد کو پرنسپل صاحب کا چہیتا کھلاڑی بن گیا اور پرنسپل صاحب اس کی دلداری بھی دوسروں سے بڑھ کر کرتے تھے۔ نازک اندام سٹیئر لڑکوں میں سے ایک ہمارا چہیتا شاگرد تھا نعیم شاہ۔ جرمنی میں تھا۔ ہم سویڈن میں تھے تو ہمارے لیے کتابیں فراہم کرنے کا بیڑا اس نے اٹھا رکھا تھا۔ بس ہم کسی کتاب کے بارے میں کہہ دیتے وہ خبر نہیں کیا کیا جتن کر کے وہ کتاب مہیا کر لیتا۔ فاصلہ، قیمت، نایابی کوئی شے اس کا رستہ نہ روک سکتی۔ پھر بچارے پر برا وقت آن پڑا مگر اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ ایسا بجوگ پڑا کہ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا مگر اس کی جبیں پر شکن نہ آئی۔ اب رفتہ رفتہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو رہا ہے۔ پاکستان سے باقاعدگی کے ساتھ فون کر کے ہماری خیریت دریافت کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ہماری علالت کی خبر سنی تو فون پر دھاڑیں مار مار کر رو دیا۔ ایسے شاگرد کسے نصیب ہوتے ہیں؟ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

کشتی رانی کی چیمپئن شپ ہمارے کالج کے ہاتھوں میں رہی۔ اب پتا نہیں کیا حال ہوگا؟ زوال تو ہمارے یار اسلم صابر کے زمانے ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ جب عربی پڑھانے والے لوگ اس خیال سے کہ ماضی میں عرب جہاز ران سمندروں پر حکمرانی کرتے تھے تو ہم کیوں نہ بمپنگ بوٹنگ کے انچارج بن جائیں کشتی رانی کروانے لگیں تو یہ تو ہونا ہی تھا۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

ہاکی رشید غنی کھلاتے تھے۔ اللہ! غنی حساب پڑھائیں، گاماتھیٹا سکھائیں یا ہاکی کی چالبازیاں سکھائیں؟ فٹ بال البتہ ماسٹر فضل داد صاحب نے ایک عرصے تک خوب خوب کھلایا مگر بوڑھے آدمی تھے۔ جب ان کی ٹانگیں کمان بن گئیں تو اس علّت سے جان چھڑا کر باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کو پریڈ کروانے لگے۔ باسکٹ بال نے کالج کے نام کو چار چاند لگا دیئے۔ پنجاب کی ٹیم کے نوے فیصد کھلاڑی ہمارے کالج کے ہوتے

تھے۔ آرمی، پولیس، حبیب بینک...... یہ سب ٹیمیں ہمارے کھلاڑیوں کے بل بوتے پر چلتی تھیں۔ ربوہ پاکستان میں باسکٹ بال کا سب سے اہم مرکز بن گیا تھا......

کالج قومیا لیا گیا تو بس یوں سمجھ لیجئے صرف ہمارے کالج کا ہی نہیں پاکستان میں تعلیم اور نظام تعلیم کا جنازہ اٹھ گیا۔ ہماری قومی زندگی کا سقوطِ تعلیم کا یہ سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان سے بڑا المیہ ہے۔

کالج قومیایا گیا تو اس وقت حضرت صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جو واقفِ زندگی جہاں کام کر رہا ہے وہیں کام کرتا رہے، جس جس کی ضرورت ہوگی اسے جماعت طلب کر لے گی مگر ایک سانحہ ایسا اچانک ہوا کہ واقفینِ زندگی میں بہت سے لوگوں کو انجمن کو طلب کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ۲۹ مئی کے واقعۂ ربوہ کے بعد حکومت پنجاب کی رگِ انتظامیہ پھڑکی اور اس نے کالج کے سارے سٹاف کو ادھر ادھر تبدیل کر دیا اور اس باب میں مہاراجہ پٹیالہ جیسی حرکتیں بھی کیں مثلاً ایسی جگہوں پر ایسے سینئر سٹاف کو تبدیل کر دیا جہاں اس مضمون کی کلاسیں ہی نہیں تھیں۔ مثلاً پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب جیسے سینئر ترین پروفیسر کو چک نمبر ۱۴۱ ج ب کے انٹرمیڈیٹ کالج میں بھیج دیا جہاں عربی پڑھنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ اسی طرح کسی کو کہیں کسی کو کہیں، بغیر سوچے سمجھے تبدیل کر دیا۔ ہم خدا معلوم کس وجہ سے بچ گئے یعنی سارے سٹاف کا تبادلہ ہو گیا اور ہم ٹی آئی کالج سے منسلک رہے۔ چنیوٹ کالج میں ہمارے ایک جونیئر سے دوست تھے جن کا بیٹا ہمارے کالج میں پڑھتا تھا اور ہمارا شاگرد تھا۔ وہ ٹی آئی کالج کے پرنسپل بنا کر بھیج دیئے گئے۔ اب سٹاف کیا کرتا؟ یا تو چارج چھوڑ دیتا اور نئی جگہوں پر جا کر اپنا چارج لے لیتا یا کالج سے چھٹی لے لیتا چنانچہ سوائے ہمارے سب کالج سے چھٹی لے کر غائب ہو گئے اور ہماری ذمہ داری یہ ٹھہری کہ ہم نئے پرنسپل صاحب کو جو پرنسپلی کا چارج لینے کے لیے بیتاب ہیں باتوں میں لگا کر بہلائے رکھیں اور چارج نہ لینے دیں چنانچہ ہم نے یہی کیا۔ صبح صبح کالج پہنچ جاتے۔ پرنسپل صاحب چنیوٹ سے تشریف لے آتے۔ ہم انہیں سٹاف روم میں بٹھا کر ادھر ادھر کی ہانکتے رہتے۔ کچھ کاغذوں پر ان کے دستخط بھی ہوتے رہتے مگر چارج ہم نے انہیں نہ لینے دیا۔ وہ بَابُ الْحِیَلُ جو ہم نے طالب علمی کے دوران کلاسوں سے غائب ہونے کے لیے پڑھا تھا اب بہت کام آیا تا آنکہ حکومت کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور سارے تبادلے منسوخ ہوئے۔ تب ہماری جان میں جان آئی۔ اس کی سزا ہم نے جاپان سے واپس آنے کے بعد پائی۔ (ہمارے کالج کے سپرنٹنڈنٹ محمود اسلم صاحب ہماری مساعی کے گواہ ہوں گے کہ ہم نے ایک حاضر پرنسپل کو کس طرح غیر حاضر بنائے رکھا تھا)......

اب پیچھے مڑ کر دیکھیں تو میاں عطاء الرحمٰن صاحب اور پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ باقی لوگوں میں سے کوئی ایک آدھ ہی کالج کے سٹاف پر ہوگا۔ نصیر احمد خان، پروفیسر بشارت الرحمٰن، مسعود احمد عاطف، چوہدری عطا اللہ اور جز وقتی استاد پروفیسر ملک مبارک احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرزا مجید احمد صاحب کالج چھوڑ گئے۔ چوہدری حمید اللہ، مرزا خورشید احمد، محمد اسلم شاد منگلا صاحبان کو جماعت نے خدمت کے لیے طلب کر لیا۔ فزکس کے نوجوان اساتذہ اکثر پی ایچ ڈی کر کے باہر کے ملکوں میں بس گئے کہ واپس جا کر کیا کرتے؟ باقی لوگ

ایک ایک کر کے ریٹائر ہوتے گئے۔ اب تو سنا ہے سٹاف کے سب سے آخری ممبر، عزیزی مبارک احمد عابد بھی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ کالج کے در و دیوار رہ گئے ہیں وہ بھی سنا ہے کھنڈر ہو چکے ہیں۔ روح جاتی رہے تو یہی ہوتا ہے:

اُڑ گیا روح کا طائر تو یہ صورت نکلی
اِستخواں رہ گیا انساں کی طرح رکھا ہوا''

ابھی آپ پرویز پروازی کی یادداشتیں ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اب کچھ ذکر لطف الرحمٰن محمود کا جو تعلیم الاسلام کالج کے وائس پرنسپل میاں عطاالرحمٰن کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کن سالوں میں اس کالج کے طالب علم رہے تاہم مجھے یہ ضرور علم ہے کہ وہ اپنے زمانے میں المنار کے ایڈیٹر تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اچھی نثر لکھنے کی صلاحیت سے نوازا تھا۔ میری اپنی نظر سے الفضل میں ان کے چھپے ہوئے بعض مضامین گزرے ہیں جنہیں میں نے ان کی ادبی چاشنی کے پیش نظر بہت دلچسپی سے پڑھا تھا۔ برسبیلِ تزکرہ عرض کرتا ہوں کہ انہوں نے اباجی کی وفات پر بھی الفضل میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے اباجی سے اپنے تعلقات کا پس منظر بیان کرنے کے بعد آپ کی بعض خوبیوں کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ یہ مضمون لطف الرحمٰن محمود کی نثر کے نمونہ کے طور پر ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''محترم مولوی صاحب کے انتقالِ پُرملال کی خبر بڑے رنج والم کے ساتھ سنی گئی ہے۔ آپ ایک ذِی علم شخصیت تھے۔ اس لحاظ سے بھی آپ کی رحلت ایک بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ۔ پھر حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی تفسیر کی ترتیب وتسوید سے متعلق ذمہ داری کے پیشِ نظر بھی آپ کی مفارقت ایک قومی صدمہ ہے۔

خاکسار محترم مولوی صاحب مرحوم سے تقریباً تین سال سے متعارف تھا۔ گزشتہ موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران یہ سرسری تعارف گہرے ذاتی تعلق سے گزر کر بے تکلفی کا رنگ اختیار کر چکا تھا۔ ان موسمی تعطیلات میں روزانہ خلافت لائبریری جانے کا موقع ملتا اور اس طرح تقریباً ہر روز ہی محترم مولوی صاحب سے بھی گفتگو کا شرف حاصل ہوتا رہتا اور بعض اوقات کسی مسئلہ، حوالہ یا کتاب کے سلسلہ میں مشورہ حاصل کرنے کے لیے بھی حاضرِ خدمت ہو جاتا۔ اس تعلق اور ربط کی بنا پر ایک مختصر سے عرصے میں ان کی مقبولِ عام شخصیت کا مطالعہ کرنے کا مجھے موقع میسر آیا۔ محترم مولوی صاحب ان شخصیات میں سے ہیں جن کے کردار، خلوص اور اخلاقِ حمیدہ سے میں بہت متاثر ہوا ہوں اور جن کی صفاتِ حسنہ اپنانے کی تڑپ رکھتا ہوں۔

محترم مولوی صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی سادگی ہے جو ان کی طبیعت، لباس، عادات غرض ساری زندگی پر محیط تھی۔ دورِ حاضر کی مادی چمکار نے انسانی معاشرے سے سادگی کے بابرکت جوہر کو قریباً ناپید کر دیا ہے اور اب لباس، وضع قطع، معاشرت حتّٰی کہ اخلاق اور مراسم میں بھی اکثر تصنّع اور تکلّف جبراً برتا جاتا ہے مگر محترم مولوی مرحوم سادگی کا پیکر تھے۔ ہر ایک سے خلوص اور مروّت سے

پیش آتے۔ انہیں دیکھنے اور ملنے والے جانتے ہیں کہ لباس میں وہ کس قدر سادگی پسند تھے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ خلافت لائبریری میں کتابوں کی تلاش میں گھوم رہے ہیں اور جوتا آتے ہی کمرے میں اتار کر رکھ دیا ہے اور ننگے پاؤں کبھی اس کمرے میں جا رہے ہیں اور کبھی اس کمرے میں۔ کوئی اور تکلّف سے یہ روش اختیار کرے بھی تو شاید طبعِ سلیم پر گراں گزرے مگر مولوی صاحب مغفور کی یہ عادت بہت ہی دلنواز کیفیت کی حامل تھی! کثرتِ کار کو دیکھ کر اگر کبھی ان سے ہمدردی کے پیرائے میں عرض کیا کہ مولوی صاحب! آپ کے ساتھ مدد کے لیے کوئی آدمی ضرور ہونا چاہئے تو اکثر ہنس کر فرماتے: ''بھئی میں اپنے صیغے کا آپ ہی افسر ہوں اور آپ ہی چپراسی'' اور یہ بھی کچھ اس طرز سے کہتے کہ سننے والا خلوص میں شبہ کر ہی نہیں سکتا تھا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ محترم مولوی صاحب کس رنگ میں اپنے فرائضِ منصبی کو سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ ضروری عملہ آئے تو کام کروں۔ آپ کو کام کرنے کا شوق بلکہ جنون تھا۔ آپ کے سپرد زودنویسی کے صیغے کے ساتھ ہی ''تفسیر کبیر'' کے مسوّدات کی ترتیب کا کام بھی تھا اور اس عظیم خدمت کی اہمیت کا آپ کو پورا پورا احساس تھا اور حیران کن حد تک اس میں انہماک تھا جس کا اندازہ ایک معمولی سی مثال سے ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں ربوہ میں منعقد ہونے والے آل پاکستان کبڈی ٹورنامنٹ کے آخری دن ربوہ کے دفاتر میں ساڑھے دس بجے تک تعطیل کر دی گئی تھی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ محترم مولوی صاحب اپنے دفتر کے کمرے میں کتابوں اور فائلوں کے ڈھیر کے درمیان کام میں ہمہ تن مصروف ہیں جب کہ باقی دوسرے دفتر بند ہیں اور ان میں قفل پڑے ہیں۔ میری طبیعت پر اس کا گہرا اثر ہوا کہ کام کی دھن اور اسے سرانجام دینے کا اشتیاق ہو تو ایسا ہو۔

مولوی صاحب مرحوم کی تیسری خصوصیت ان کی علمیّت تھی۔ سلسلے کے لٹریچر اور تاریخ پر آپ کو گہرا عبور حاصل تھا۔ اسی طرح دینی موضوعات کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ جماعتِ احمدیہ کی ان موجود علمی شخصیات میں سے تھے جو تاریخِ احمدیت وغیرہ کے بارے میں ''اتھارٹی'' کہے جا سکتے ہیں۔ چند دنوں کی بات ہے کہ خاکسار کو سیّدنا ومولانا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی ایدہ اللہ تعالےٰ بنصرہ العزیز کی تصانیف سے متعلق ایک مضمون لکھنے کا موقع ملا۔ نظرثانی کے لیے محترم مولوی صاحب کو تکلیف دینا چاہی۔ آپ نے بڑی بشاشت اور محبت کے ساتھ ایک ''طفلِ مکتب'' کے مضمون کا مطالعہ کیا اور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک حضور کی تصانیف کی فہرست کی صحت کا جائزہ لیتے رہے۔ اس دن مجھے محترم مولوی صاحب کی غیر معمولی قوتِ یادداشت اور حضور کے لٹریچر پر عبور کا ازسرِ نو یقین ہوا۔ اس کے علاوہ آپ نے جس محبت انگیز رنگ میں ایک ناتجربہ کار نوجوان کے ادھورے مضمون کو سراہا اور جن پیارے تعریفی کلمات سے میری ہمت افزائی فرمائی وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ان فقرات میں خلوص اور پیار کا جو رس گھلا ہوا تھا وہ بہت کم لوگوں کے اندازِ گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ مطالعہ کی وسعت کے ضمن میں محترم مولوی صاحب کے دو علمی لیکچروں کا ذکر کرنے سے رک نہیں سکتا جو آپ نے اس سال جولائی کے آخر میں تعلیم القرآن کلاس منعقدہ رمضان المبارک میں ''توریت'' اور ''ناسخ ومنسوخ'' کے بارے میں ارشاد فرمائے۔ آپ نے محدود وقت میں ان لیکچروں میں جس طرح معلومات کو سمویا اس سے ہر طالب علم بہت متاثر ہوا۔

محترم مولوی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور اَن تھک کام کرنے والے وجود، بے لوث اور شہرت اور نمود سے دور بھاگنے والے۔ ان کی مصروفیت کی وجہ سے میں ڈرتا تھا کہ یہ کثرتِ کار ان کی صحت پر منفی اثر نہ ڈالے۔ خود متعدد مرتبہ بیان فرمایا: بسا اوقات ایک ایک آیت کے متعلق حوالہ جات وغیرہ کی تلاش میں دس دس دن لگ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کس قدر احتیاط ملحوظِ نظر رکھتے تھے۔

ایک لمبے عرصہ تک آپ کو سلسلہ کی خدمات سرانجام دینے اور حضور ایدہ اللہ الودود کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔ حضور نے اپنی متعدد کتب اور تقاریر کے مسوّدات انہیں لکھوائے۔ الفضل کے عملہ ادارت کے رکن بھی رہے ہیں۔ صیغہ زود نویسی کے تحت آپ نے حضور کا بہت سا کلام آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ آج کل تفسیر کبیر سے متعلق حضور کے مسوّدات، تفسیری حواشی اور نوٹس کو مرتب کر رہے تھے۔ غرض آپ کی گراں قدر خدمات قابلِ تعریف و تقلید ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی خدمتِ قرآن کو قبول فرما کر مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیّین میں بلند مراتب عطا فرمائے اور ان کے لواحقین اور پسماندگان کا دین و دنیا میں حافظ و ناصر اور معین و مددگار ہو۔ خدا کرے جماعت میں ایسی پُر خلوص، انتھک، بے لوث ٹھوس کام کرنے والی علمی شخصیات ہمیشہ بکثرت موجود رہیں۔''

لطف الرحمٰن محمود کا مضمون ختم ہوا۔ اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موصوف تکمیلِ تعلیم کے بعد نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت سیرالیون چلے گئے۔ وہیں میرے بہنوئی محمد ہادی مونس بھی پڑھاتے تھے اور آپی بھی وہیں ہوتی تھیں۔ میرا خیال ہے لطف الرحمٰن محمود کی شادی سیرالیون جانے کے بعد ہوئی چنانچہ جب ان کی بیگم، ضیا کا سیرالیون جانے کا وقت آیا تو ان دنوں آپی پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ اب ان کی واپسی کا سفر قریب تھا لہٰذا ضیا چاہتی تھیں کہ وہ آپی کے ساتھ سفر کریں۔ دراصل ان دنوں پاکستان سے کوئی سیدھی فلائٹ سیرالیون نہیں جاتی تھی اور راستے میں دو تین جگہوں پر قیام کرتے ہوئے فلائٹس بدل بدل کر ہی سیرالیون پہنچا جا سکتا تھا۔ اندریں حالات ضیا کی گھبراہٹ قابلِ فہم تھی۔ مجھے یاد ہے میں ان دونوں کے سفر کی بکنگ کے لیے ان کے ہمراہ کئی مرتبہ فیصل آباد جاتا رہا۔ بعد میں انہوں نے یہ سفر اکٹھے کیا جس سے دونوں کو بہت سہولت رہی۔

میں نے لطف الرحمٰن محمود کو دیکھ تو رکھا تھا اگرچہ میرا ان کے ساتھ ذاتی تعلق کبھی نہیں رہا لیکن ان کے باہر چلے جانے کے بعد ان سے یا ان کی اہلیہ سے کبھی ملاقات نہیں ہو پائی البتہ کچھ عرصہ پہلے جب میں تعلیم الاسلام کالج کے معروف طلبہ کے کوائف اکٹھے کرنے میں مصروف تھا مجھے معلوم ہوا کہ موصوف آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ میں نے کسی طرح ان کا فون نمبر تلاش کر کے بات کرنے کی کوشش کی تو فون ان کی بیگم نے اٹھایا۔ میرے یاد دلانے سے انہیں ساری پرانی باتیں اور سیرالیون میں آپی کی ہمسائیگی میں گزرا ہوا وقت یاد آ گیا اور ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس گفتگو میں ضیا کے بھائی لطیف کا ذکر بھی آیا جو سکول اور کالج میں مجھ سے ایک یا دو سال جونیئر تھے اور جنہوں نے پاک فوج میں کمیشن حاصل کر لیا تھا اور بعد از ریٹائرمنٹ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ اس دوران ان کے والدِ گرامی، رشید احمد خاں کا ذکر بھی آیا جو غالباً ضلع دار نہر ہوا کرتے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ آباد ہو گئے تھے۔

جب میں نے ضیا سے اپنے شوہر کے ساتھ بات کرانے کو کہا تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور فی الوقت ان سے بات کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ جب بھی ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی وہ انہیں میرے فون کے بارے میں بتائیں گی اور ہو سکے تو ان سے بات بھی کروائیں گی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے ایام پر ایک مختصر سا مضمون لکھوا کر بھجوائیں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ان کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے بگڑتے ہی چلی گئی۔ چند دن پہلے جرمنی سے حمید احمد چوہدری کی ایک ای میل سے اندازہ ہوا کہ وہ بہت زیادہ بیمار ہیں اور اب پرویز پروازی کی طرف سے یہ افسوسناک اطلاع ملی ہے کہ وہ ۲۷ مئی ۲۰۱۷ء کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ لطف الرحمٰن محمود کو جنتُ الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اب ذکر کیا جا رہا ہے میاں احسان الحق کا جو ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ایم این اے رہے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے فاؤنڈر ممبرز میں سے تھے اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک نیشنل اسمبلی کے ممبر رہے۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں اس کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اگرچہ وہ احمدی نہ تھے مگر اس دور کو بڑی محبت کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے جب وہ اس ادارہ کے طالب علم تھے۔ انہوں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کے قیام کے موقع پر اس کے مدائرالمہام، پروفیسر حمید احمد چوہدری کے نام مبارکباد کا ایک خط لکھا جو ایسوسی ایشن کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ انہوں نے اس خط میں تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے وقت کو اپنی زندگی کا اہم ترین حصہ قرار دیا ہے۔ یہ خط انگریزی میں ہے اور اس کا آزاد اردو ترجمہ کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

ناسپاسی ہوگی اگر میں تعلیم الاسلام کالج اور اس کے منتظمین کے وہ احسانات یکسر فراموش کر دوں جو انہوں نے میری ذات پر کئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ کسی ادارے کی عظمت کا انحصار اس کی خوبصورت عمارت نہیں بلکہ اس کے سربراہ کی اپنے مقصد کے ساتھ لگن اور اساتذہ کی اس محبت پر ہوتا ہے جو طلبہ کو ایک ایسا ماحول مہیا کرتے ہیں جو اُن کی کیریکٹر بلڈنگ میں ممد ثابت ہو۔

تعلیم الاسلام کالج میں داخلے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ کئی سال گورنمنٹ کالج، لائلپور میں ضائع کرنے کے بعد میں نے ۱۹۵٦ء میں یہاں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت اس ادارے کے سربراہ، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تھے جن کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب سی مقناطیسیت رکھی ہوئی تھی۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو میرے بازو پر ایک بہت بڑا زخم تھا جس کا علاج بے حد توجہ طلب تھا۔ اللہ تعالیٰ صاحبزادہ صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے، انہوں نے میرا خیال اپنے بچوں کی طرح رکھا اور مجھے ہر وہ سہولت بہم پہنچائی جس کی مجھے ضرورت تھی۔ تعلیم الاسلام کالج کالج نہیں بلکہ ایک بڑا سا گھر تھا جس میں ایک دوسرے کے ساتھ اخلاص اور محبت نمایاں تھی۔ یہ صحیح معنوں میں اسلامی ماحول تھا جو مجھے وہاں دیکھنے کو ملا۔ ربوہ اُن دنوں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں ان سہولتوں کا نام ونشان تک نہ تھا جن کا میں لائل پور میں عادی تھا۔ وہاں نہ کوئی ہوٹل تھا نہ سنیما، نہ ہی موسیقی سے دل بہلانے کے مواقع میسر تھے مگر مجھے کبھی بوریت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ

ماحول تعلیم اور کھیل کُود کے لیے بے حد سازگار تھا۔ یہ ماحول مذہبی ہونے کے باوجود غیر مذہبی تھا۔ میرا جماعت احمدیہ سے تعلق نہ تھا اور نہ میں نے آج تک احمدیت قبول کی ہے مگر ربوہ میں قیام کے دوران مجھے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ میں غیر مسلموں میں گھرا ہوا ہوں۔ سچ پوچھیں تو مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ میں زیادہ بہتر لوگوں میں زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے وہاں رہ کر بہت سی ایسی اسلامی اقدار سیکھیں جو میرے کردار کا مستقل حصہ بن گئیں اور جنہوں نے میری زندگی تبدیل کر کے رکھ دی۔

جب میں یونیورسٹی لا کالج میں ایل ایل بی کا امتحان دے رہا تھا تو امیدواروں نے کسی وجہ سے ہڑتال کر دی اور کمرہ امتحان چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ میں واحد امیدوار تھا جو ہال سے باہر نہیں نکلا۔ بعد میں حکومت نے اس معاملے کی تحقیقات کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سربراہی میں ایک کمیشن بنایا جس نے مجھے بھی طلب کیا۔ مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں ہڑتال میں کیوں شامل نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے تکلفی سے انہیں بتا دیا کہ میں نے گریجوایشن تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے کی ہے اور قانون کا احترام اور اولوالامر کی اطاعت میں نے وہیں سے سیکھی ہے۔ مجھے یاد ہے وہ میری اس بات سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

میں تقریباً سات سال تک عملی سیاست میں رہا ہوں۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے فاؤنڈر ممبرز میں سے ہوں اور پھر سات سال ایم این اے بھی رہا ہوں۔ اس حیثیت میں مجھے کوریڈور آف پاور میں گھومنے کا بھی موقع ملتا رہا۔ میں نے پاکستان کی سیاسی اور مذہبی قیادت میں منافقت دیکھی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں: اے کاش! ان لوگوں نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں تعلیم حاصل کی ہوتی اور دیانت و امانت کے بنیادی اصول ہی سیکھ لیے ہوتے۔

میں یہاں اپنے تمام اساتذہ اور کلاس فیلوز کا ذکر ان کا نام لے لے کر کر سکتا تھا لیکن ایسا کرنے سے یہ پیغام بہت طوالت اختیار کر لے گا۔ اگر مجھے صرف ایک استاد اور ایک کلاس فیلو کا نام لینا ہو تو میں علی الترتیب فزکس کے پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن اور شیخوپورہ کے چوہدری بشیر احمد (المعروف ''حاجی'') کا ذکر کروں گا۔ ان دونوں کا نام میں نے ان کی خوبیوں کی بنا پر منتخب کیا ہے۔ چوہدری بشیر احمد نے میری طرح بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور وہ کچھ عرصہ ایم پی اے بھی رہے۔ ان کی ایک حادثے میں وفات تک ہم ایک دوسرے کے بہت دوست رہے تھے۔

میاں احسان الحق نے اپنے پیغام کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے:

"I wish to tell all my friends that they are lucky to have been at T.I.College. Keep the great traditions of the great institution alive and I mean, honesty, integrity, morality, discipline and above all tolerance and respect for dissenting views. All these things were summed up in the motto of the college, which was Ilm-o-Amal"

وہ میرے ایک احمدی دوست، خالد رشید مقیم ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور کے والدِ بزرگوار، سردار محمد کے فرسٹ کزن تھے۔ ایک شادی کے موقع پر خالد رشید (جو خود بھی ٹی آئی کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ ہیں) کے ساتھ ایک اتفاقیہ ملاقات میں گفتگو کے دوران انکشاف ہوا کہ میاں احسان الحق دو تین سال پہلے وفات پا گئے تھے اور یہ کہ وہ چک نمبر ۱۰۳ جے بی، برنالہ ضلع فیصل آباد میں دفن ہیں۔ انہوں نے میری خواہش پر مرحوم کی قبر کی ایک تصویر مہیا کی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے:

یا اللہ　　　　یا محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

میاں احسان الحق

ولد میاں نور محمد

وفات: ۲۷ فروری ۲۰۱۴ء

میاں احسان الحق نے اپنے محولہ بالا پیغام میں اس زمانے کے جن دوستوں کا ذکر کیا ہے ان میں چوہدری بشیر احمد المعروف ''حاجی'' بھی شامل ہیں جو چوہدری انور حسین، امیر جماعت احمدیہ، ضلع شیخوپورہ کے صاحبزادے تھے اور ۱۹۵۰ء کی دہائی میں تعلیم الاسلام کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔

موصوف کے والدِ بزرگوار ایک بڑے زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مخلص احمدی تھے۔ انہوں نے نوعمری میں بیعت کی اور پھر ساری زندگی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ اپنے اخلاص اور خلافت کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کی وجہ سے وہ خلفائے وقت کے چہیتے خدام میں سے تھے چنانچہ ان کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے لندن میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے قبل جماعت کو ان کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

''بہت ہی مخلص اور فدائی انسان تھے اور خدا تعالیٰ نے ان کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ ایسی ہر دلعزیز شخصیت تھی کہ اپنے کیا اور غیر کیا، جو بھی ان کے قریب آتا تھا اس کا دل موہ لیتے تھے اور کسی جگہ میں نے کسی امیر ضلع کو اتنا ہر دلعزیز نہیں دیکھا جتنا چوہدری انور حسین صاحب کو شیخوپورہ ہی میں نہیں اس کے گردوپیش میں بھی دیکھا ہے۔ جب وہاں کبھی میں جاتا تھا تو دعوت دیا کرتے تھے۔ وہاں کے دانشوروں کو، حکومت کے افسر، غیر افسر، وکیل، زمیندار سب کشاں کشاں چلے آتے تھے اور بے حد عزت تھی چوہدری صاحب کی ان کے دلوں میں۔ اپنی ساری برادری پر بہت اثر رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو احمدیت کا سخت مخالف تھا۔...... احمدی کب ہوئے؟ چودہ سال کی عمر میں۔ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں احمدی ہو گئے۔ وہ چھوٹا سا بچہ چودہ سال کا ایسی مصیبت میں مبتلا ہوا کہ قیامت برپا ہو گئی اس خاندان پر۔ دُور دُور سے چوٹی کے ہندوستان کے علماء کو بلایا گیا۔ ان کے ساتھ مجالس لگائی

گئیں کہ اس کو توبہ کرادو۔ جب وہ کامیاب نہیں ہوئیں کوششیں اور چوہدری صاحب ہر ایک کا منہ بند کر دیتے رہے تو پھر پیروں فقیروں کے پاس لے گئے اور کہا اس پر جنتر منتر کرو، کوئی دعائیں پڑھو۔ چوہدری صاحب واقعات سنایا کرتے تھے۔ بعض پیروں نے کہا کہ اس پر کسی کا جادو نہیں چل سکتا، یہ بڑی سخت ہڈی ہے۔ تو اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا۔ بڑی (ـ) کی توفیق ملی اپنے خاندان میں، غیروں میں۔ ہر جگہ احمدیت کے لیے ایک تو غیرت میں ننگی تلوار اور (ـ) کے لحاظ سے ایسا میٹھا رس تھے جو دلوں کی گہرائیوں تک اترتا تھا...... احمدیت کے عاشق، مسیح موعود کے عاشق، خلافت کے عاشق اور ایسی طبیعت مزے کی کہ باتیں کرتے تھے تو پھول جھڑتے تھے۔ لطائف کا بہت پیارا ذوق تھا اور حاضر جوابی تو درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔...... بہت ہی پیارا وجود تھا۔ حضرت مصلح موعود کے بہت پیارے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو بہت پیارے تھے اور مجھے بہت ہی پیارے تھے۔ بہر حال اللہ جو بلانے والا ہے وہ سب سے پیارا ہے۔ اسی پر ہماری جان، ہمارا سب کچھ نثار ہو۔ اسی کے قدموں پہ ہماری روحیں فدا ہوں۔ اللہ چوہدری صاحب کی روح کو بھی غریقِ رحمت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو بھی وہ خوبیاں عطا کرے جن خوبیوں کے وہ علمبردار تھے۔ آمین''

عبدالباسط بٹ جنہوں نے ایک لمبا عرصہ آئی سی آئی کی ملازمت میں گزارا اور شیخوپورہ میں قائد ضلع مجلس خدام الاحمدیہ اور پھر ناظم ضلع مجلس انصاراللہ کے طور پر کام کرتے رہے ہیں نے حضور کے مندرجہ بالا ارشادات اپنے مضمون بعنوان ''محترم چوہدری بشیر احمد صاحب، امیر ضلع شیخوپورہ'' (الفضل ۱۴ مارچ ۲۰۰۵ء) میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا کہ چوہدری صاحب کی خوبیاں چوہدری بشیر احمد صاحب میں بھی آئیں۔ خلافت سے محبت اور نظامِ سلسلہ سے عقیدت تھی۔ تحریکِ جدید اور وقفِ جدید میں ضلع شیخوپورہ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے بعد تمام تنظیموں کے ساتھ ان کے مسائل کے بارہ میں گفتگو کرتے۔ زراعت کا شوقین ہوتا تو سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ فیصلہ جات ہوتے تو فریقین سے از خود سن کر اس پر فیصلہ کرتے۔ اپنی بات نہایت مختصر اور جامع کہتے۔ اگر کوئی کھیل کا شائق ہے ان کو کھیلوں کے بارے میں سنہری اصول بتاتے اور کہتے کہ کھلاڑی اگر یہ اصول اپنائے تو کسی میدان میں مار نہیں کھا سکتا۔ جماعت احمدیہ کے بچوں کو کھیلوں کی طرف راغب کرتے۔ ان کو کھیلوں کا سامان مہیا کرتے اور ان سے کھیلوں کے بارے میں ہر جمعہ کو پوچھتے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ ہمارے بچے مختلف کھیلوں کے انٹرنیشنل کھلاڑی بنیں۔ اپنے گھر میں ٹیبل ٹینس رکھا ہوا تھا۔ وہاں پر جماعت کے بچوں کو بلاتے اور ٹیبل ٹینس کھلاتے۔ احمدی کھلاڑیوں کو ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر نمائندگی دلائی اور ہر لحاظ سے ان کی مدارات کرتے۔ مرکزِ سلسلہ میں مرکزی مجلسِ صحت کے باقاعدہ ممبر تھے اور بار بار ربوہ جا کر کھلاڑیوں کو اپنی قیمتی نصائح اور اپنے تجربے سے مستفیض کیا۔ ربوہ کے کھلاڑیوں کو اپنے گھر آ کر کھیلنے کی دعوت دی اور کھیلوں کے قواعد و ضوابط سمجھائے۔ ربوہ سے آنے والے کھلاڑیوں میں انعامات کے طور پر کھیلوں کا سامان تقسیم کیا۔ بعد میں بیٹھ کر سوشل تعلقات پر سیر حاصل گفتگو کی کہ تمام امور کے ساتھ سوشل تعلقات

بہت لازمی ہیں۔ اپنے فارم میں بچوں کے ساتھ بہت شغف رکھتے۔ سکول کی چھٹی کے وقت ان کے لیے بسکٹ ٹافیاں پاس رکھتے، بچوں کی ضرورت پوچھ کر ان کی ضرورت پوری کرتے اور ایک جمِ غفیر چھٹی کے وقت فارم پر ان کے گرد ہوتا۔ چوہدری صاحب ایک ماہر شکاری تھے اور شکار کا شوق رکھتے تھے اور شکار کے علاقہ جات سے گہری معلومات رکھتے تھے۔ شکار پر سیر حاصل گفتگو کر سکتے تھے۔ آپ ملنسار اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے اور مختلف مکتبۂ فکر کے افراد کے ساتھ ان کی ضرورت کے مطابق گفتگو کرتے اور دل موہ لیتے۔ تمام طرح کے سیاسی افراد ان کو اپنا رہنما سمجھتے تھے اور ہر سیاسی مشکل میں چوہدری صاحب سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کرتے۔ اپنے زرعی فارم پر روزانہ جاتے اور اظہار کرتے کہ وہاں رابطے کی ہر صورت کسی وقت بھی کام دے سکتی ہے اس لیے فارم کی بیٹھک کو اوّلیت دیتے اور ہر روز اس میں ضرور شام کو موجود ہوتے اور ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرتے اور ان کی رہنمائی کرتے۔ زراعت کے بارے میں مشورہ جات دیتے اور اس پر عمل درآمد کا بھی خیال رکھتے۔ ۱۹۷۰ء میں اپنے علاقہ سے ممبر پنجاب اسمبلی منتخب ہوئے۔ اس طرح عوام کی فلاح و بہبود کا ان کو براہِ راست موقع ملا۔ چوہدری صاحب ایک نافع النّاس وجود تھے جس سے تمام لوگ بشمول احبابِ جماعت اور غیر از جماعت برابر مستفیض ہوتے جس کا نظارہ چوہدری صاحب کی وفات پر نظر آیا جب ہر کس و ناکس اپنے پر ہونے والی نیکیوں اور نوازشات کا ذکر کر کے رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایک صاف، بیباک اور باکردار شخص کی جدائی سے ہمارا علاقہ یتیم ہو گیا ہے۔''

میرے بہنوئی، سعید احمد اظہر مربی سلسلہ جو لمبا عرصہ شیخوپورہ میں تعینات رہے چوہدری انور حسین، امیر جماعت ضلع شیخوپورہ اور ان کے صاحبزادے کا بہت محبت سے ذکر کیا کرتے تھے تاہم بدقسمتی سے مجھے بشیر سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا ماسوا ایک بار کے جب وہ تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم تھے۔ میں اس وقت نویں یا دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک بار سعید اظہر ہمارے ہاں آئے اور بتایا کہ وہ بشیر سے ملاقات کے لیے فضل عمر ہوسٹل جا رہے ہیں۔ وہ مجھے بھی ہمراہ لے گئے۔ شام کا وقت تھا اور ہم بڑی دیر تک کالج ٹک شاپ کے صحن میں بیٹھے رہے۔ اس موقع پر ہونے والی گفتگو میں سے تو اب مجھے کوئی بھی بات یاد نہیں البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ انہوں نے ہمیں ''پرتکلف'' چائے پلائی تھی۔

عبدالباسط بتاتے ہیں کہ ان کی موصوف کے ساتھ بہت بے تکلفی تھی اور انہیں ان کی مجلس میں بیٹھنے کا بہت موقع ملتا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: موصوف نے مجھے بتایا کہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں ایک دفعہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے شادی کے ذریعے انہیں اپنی کوٹھی پر طلب کیا۔ وہ حاضر ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کالج کے کچھ اور طلبہ پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ سلام عرض کیا تو حکم ملا کہ ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ میاں صاحب باری باری طلبہ کی جسمانی ساخت دیکھتے رہے اور جب ان کی باری آئی تو کندھے اور گردن کے پٹھے دیکھنے کے بعد ایک مُکا ان کے بازو پر رسیّد کرتے ہوئے فرمایا: ٹھیک ہے۔ کل سے آپ سب لوگ دریا پر کشتی رانی کی ٹریننگ کیا کریں گے۔ ان میں سے ایک غیر ملکی طالب علم نے کہا کہ اس نے بی ایس سی کا امتحان دینا ہے،

پڑھائی بہت سخت ہے اس لیے وہ کشتی رانی میں حصہ نہیں لے سکتا۔ میاں صاحب نے اسی وقت چوہدری محمد علی کو بلایا اور کہا کہ تحریک جدید والوں کو لکھ دیں کہ اس طالب علم کو واپس اپنے ملک بھجوا دیا جائے، اس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ اس کو سمجھایا گیا تو وہ معافی کا طلبگار رہوا۔ بشیر کہتے ہیں: اس کے بعد میں نے عرض کی: سر! مجھے تو تیرنا نہیں آتا، میں کشتی رانی کیسے سیکھ سکوں گا؟ میاں صاحب نے فوراً جنید ہاشمی کو طلب کیا اور اپنے ملاّح کا نام لے کر کہا: اسے بتا دو کہ بشیر وقت سے ایک گھنٹہ قبل دریا پر آیا کرے گا، وہ اسے تیرنا سکھا دے۔ آپ کی یہ شفقت دیکھتے ہوئے سب نے عہد کیا کہ ہم دل و جان سے اس کھیل کو آگے لے کر جائیں گے اور اسی جذبے کے سبب ہم نے یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتی۔

ہمارے یہ دوست مزید بتاتے ہیں: کالج چھوڑنے کے بعد بشیر کا تعلق صاحبزادہ مرزا ناصر احمد سے اور مضبوط ہو گیا اور آپ کے تختِ خلافت پر متمکّن ہونے کے بعد آپ سے رابطہ اور آپ کی اطاعت میں اضافہ ہوا اور وہ خلافت کے احکامات کو ہر کام پر اوّلیت دینے لگے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بطور ممبر پنجاب اسمبلی حصہ لینے کا حکم ملا اور رضامندی پوچھی تو انکار کی جرأت نہ کر سکے۔ آغازِ الیکشن پر ذوالفقار علی بھٹو نے مانانوالہ میں ایک جلسہ عام کا پروگرام بنایا جس پر چوہدری صاحب کو یہ جلسہ کامیاب کرانے کی ہدایت کی گئی۔ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ جلسے کے بعد ہرن مینار میں دعوت کے دوران بھٹو صاحب نے موصوف سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو منتظمین بشیر گجر کو ان کے پاس لے گئے لیکن انہوں نے کہا کہ میں نے مانانوالہ والے بشیر کو بلایا ہے۔ الیکشن میں کامیابی کے بعد آپ کو وزارت کی پیشکش ہوئی جس پر غور و خوض کے بعد یہ پیشکش قبول نہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ بشیر نے یہ حکم بھی بخوشی قبول کیا لیکن حلقے کی خدمت جانفشانی سے جاری رکھی اور لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ ایک صاف ستھرے، باکردار اور ایماندار سیاستدان بن کر ابھرے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے ساتھ قریبی تعلق کچھ تو اپنے والدِ بزرگوار کی وجہ سے بھی تھا لیکن الیکشن اور بعد کے معاملات کی وجہ سے باہمی قربت مزید بڑھ گئی۔ عبدالباسط بتاتے ہیں: بشیر ذکر کیا کرتے تھے کہ انہوں نے ایک بار شیخوپورہ سرگودھا روڈ پر صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی گاڑی کھڑی دیکھی۔ قریب پہنچے تو پتا چلا کہ آپ نے نارنگ منڈی دورہ پر جانا تھا لیکن گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ آپ نے فوری طور اپنی گاڑی پیش کر دی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ ریڈیو بند، ٹیپ بند اور منہ بھی بند۔ یہ بات سن کر میاں صاحب خوب محظوظ ہوئے۔ بشیر نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ نارنگ منڈی سے واپسی پر میاں صاحب کو ربوہ چھوڑ کر آنا ہے اور میاں صاحب سے عرض کی کہ آپ کی گاڑی ٹھیک کروا کر ربوہ پہنچا دی جائے گی۔

عبدالباسط کہتے ہیں: یہ خلافتِ حقّہ کے ساتھ خلوص بھرے تعلق ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے انہیں مجلس تحریک جدید، مرکزی منصوبہ بندی بورڈ اور مرکزی مجلس صحت کا ممبر نامزد کر رکھا تھا۔ موصوف نے اپنی استعداد سے بڑھ کر سلسلے کے ساتھ اپنے نہایت مخلصانہ تعلق کو برقرار رکھا، دربارِ خلافت سے آنے والے ہر حکم کو دل و جان سے قبول کیا اور احبابِ جماعت کو اس پر استوار رکھنے کی سعی کی اور

اس عمل کی نگرانی ذاتی طور پر کی۔

موصوف نے سات اور آٹھ اگست ۲۰۰۴ء کی درمیانی شب سڑک کے ایک حادثے میں وفات پائی۔ وہ اپنے فارم سے کار پر گھر واپس آ رہے تھے کہ شیخوپورہ سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر اُن کی کار ایک ٹرک کے ساتھ جا ٹکرائی جس میں وہ شدید زخمی ہوئے اور ہسپتال پہنچ کر انتقال کر گئے۔ تدفین ربوہ میں عمل میں آئی۔

روزنامہ الفضل (گیارہ اگست ۲۰۰۴ء) کے مطابق ”مرحوم کو کاشتکاری کا شوق تھا...... آپ کے ماڈل فارم کی شہرت دور تک تھی۔ ۱۹۶۶ء میں صدرِ پاکستان جنرل ایوب خان نے ان کے فارم...... کا دورہ کیا۔ آپ ماہر شکاری اور کھیلوں کے دلدادہ تھے۔“

چوہدری بشیر احمد کے بعد اب کچھ ذکر تعلیم الاسلام کالج کے ایک طالبعلم، سلیم اختر صدیقی کا جو تکمیلِ تعلیم کے فوراً بعد ربوہ کی سکونت ترک کر کے انگلستان چلے گئے اور پھر کینیڈا کی خاک کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

سلیم صدیقی کا آبائی وطن جھنگ تھا۔ ان کے نانا میاں محمد صدیق نے احمدیت قبول کی اور اپنی اکلوتی بیٹی جنت بی بی کی شادی جھنگ ہی کے ایک احمدی نوجوان، محمد اقبال سے کر دی جو بی اے کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں بمبئی چلے گئے جہاں ۱۹۴۳ء میں سلیم صدیقی پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ کنبہ کچھ عرصہ جھنگ میں گزار کر ربوہ آ کر آباد ہو گیا جہاں سے ساٹھ کی دہائی میں ان کے والد تلاشِ معاش کے سلسلے میں انگلینڈ جا کر برمنگھم میں رہائش پذیر ہو گئے اور ساری زندگی وہیں گزار کر وہیں دفن ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ربوہ میں ہوا۔

ربوہ میں سلیم صدیقی کی رہائش محلّہ دارالصدر غربی (جسے اب نہ جانے کیوں دارالصدر شمالی کہا جانے لگا ہے) میں ”شوکت منزل“ نامی ایک مکان میں تھی۔ میری چچی، نظیر فاطمہ (جو پروفیسر محمد ابراہیم ناصر کی اہلیہ تھیں اور اس مکان سے زیادہ دور نہیں رہتی تھیں) اور سلیم صدیقی کی والدہ آپس میں سہیلیاں تھیں اور میں جب کبھی چچا ابراہیم کے ہاں جاتا تو موصوفہ کو وہاں پاتا۔ پرانی وضع کی خاتون تھیں اور سفید رنگ کا شٹل کاک برقع پہنتی تھیں۔

سلیم صدیقی تعلیم الاسلام کالج کے ہونہار طلبہ میں سے تھے۔ ان کا ادبی ذوق ان مضامین سے عیاں ہے جو وقتاً فوقتاً کالج کے مجلّہ المنار میں شائع ہوتے رہے چنانچہ جون ۱۹۵۶ء کے شمارے میں ان کا ایک مضمون ”خواب یا حقیقت“ کے عنوان سے چھپا ہوا موجود ہے۔ کسی انگریزی کہانی کا ترجمہ ہے۔ ان کے دیگر اردو مضامین میں ”شاعری“ پر ایک مضمون بھی شامل ہے۔ المنار کے انگریزی حصہ میں ان کی شائع شدہ تحریرات میں سے "Shakespear's Idea of the Origin of Sin" اور "Wordsworth and Nature" شامل ہیں۔ ان کا آخری مضمون جو میری نظر سے گزرا ہے "Peace and Islam" کے موضوع پر ہے۔

المنار میں چھپے ہوئے ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک اس کالج میں پڑھتے رہے۔ وہ بی اے کرنے کے بعد لاہور منتقل ہو گئے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کیا اور کچھ عرصہ ایک مقامی کالج میں پڑھایا لیکن جلد ہی انگلینڈ چلے گئے جہاں انہوں نے ساؤتھمپٹن یونیورسٹی

سے اپنے مضمون میں ایم فِل کیا مگر اپنی فیلڈ میں ملازمت نہ ملنے کے نتیجے میں سوشل سروسز میں کام کرنے لگے۔ کینیڈا کا آب و دانہ ان کو اپنی طرف بلا رہا تھا چنانچہ ایک دن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستے میں کینیڈین ایمبیسی نظر آئی۔ ان کا دوست کہنے لگا کہ بہت لوگ کینیڈا جا رہے ہیں اور سنا ہے کہ اس کا ویزا آسانی سے مل جاتا ہے چنانچہ دوست کے اصرار پر دونوں نے جا کر ویزا کی درخواست دے دی۔ چند دن نہ گزرے تھے کہ انٹرویو کال آ گئی اور ویزا بھی مل گیا۔ یوں وہ ۱۹۷۴ء میں ٹورنٹو چلے گئے۔ اس وقت ٹورنٹو میں محض چند احمدی خاندان تھے جنہوں نے ان کو یہاں کی سوجھ بوجھ دی۔ وہ کسی جگہ اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ان کی اہلیہ نزہت صدیقی بتاتی ہیں: میری کینیڈا آمد کے چند سال بعد تک بھی وہ یہی کام کرتے رہے لیکن پھر انہوں نے ریئل اسٹیٹ کا کام شروع کر دیا جس میں انہیں کامیابی بھی ہوئی لیکن افسوس ۱۹۸۸ء میں انہیں عین جوانی کے عالم میں فالج ہو گیا۔ وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور چھ سال کی طویل بیماری کے بعد وفات پا کر کینیڈا ہی میں دفن ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ سلیم صدیقی کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ وہ عالمی مذاہب، فلسفہ، تاریخ اور معاشرتیات میں دلچسپی رکھتے تھے حالانکہ ان کی با قاعدہ تعلیم معاشیات میں ہوئی تھی۔ اس ہمہ جہت علم نے انہیں وسعتِ نظر دی۔ اس کے علاوہ وہ ترجمے کی خداداد صلاحیت کے مالک تھے اور وہ قلم برداشتہ اردو اور انگریزی زبانوں میں بے حد آسانی سے ترجمہ کرتے چلے جاتے۔

ان کی اہلیہ کا کہنا ہے: ان کا اور میرا ساتھ میرے رب نے صرف تیرہ سال کا رکھا تھا مگر رفاقت کے حساب سے تیرہ صدیاں تھیں ہم نے جن کا ایک ایک پل، اپنی اپنی ذات کا ایک ایک پرت ایک دوسرے سے سانجھا کرنے اور اپنے داخل کو سنوارنے میں گزرا۔ ہم اپنی عائلی زندگی کے ہی نہیں بلکہ اپنے شعور کے سفر کے ہم سفر بھی تھے اور یہ مشکل راستہ ہم نے ایک دوسرے کے سہارے طے کیا۔ ہم ایک دوسرے کے باطن کو پہچاننے لگے۔ اسی پہچان کے حوالے سے میں گواہ ہوں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کی آلائشوں سے پاک تھے۔ اس مادی معاشرے کا باسی ہونے کے باوجود وہ ہر قسم کی لالچ سے مبرّا تھے۔ آسائشوں کی خواہش ان کے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ ایسے نفس مطمئنہ نے جس کے قصے بزرگوں ہی سے منسوب کئے جاتے ہیں انہیں ہر قسم کے حسد، بغض اور بیکار مادی دوڑ سے آزاد کر رکھا تھا۔ زندگی میں جو بھی ملا وہ اس پر قانع ہی نہیں، خوش بھی تھے۔ میں نے اپنے پورے ساتھ میں انہیں جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہیں کی اور وہ ایسی صحبت سے گھبراتے تھے۔ آج کے ماحول میں جہاں ہر سطح پر سیاست سے کام لیا جاتا ہے وہ سیاست جانتے ہی نہ تھے۔ وہ مذہب کے خارجی اصولوں سے زیادہ روحانی پاکیزگی کو معتبر مانتے تھے اور رنگ و نسل و مذہب سے اوپر اٹھ کر اسے پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے اور پاکیزہ روحوں سے محبت کرتے تھے۔ جب میں ان کے پاس کینیڈا آئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے پرس میں کسی کی تصویر رکھی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو ہنس کر کہنے لگے کہ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کے صاحبزادے، عزیز احمد راجیکی ہیں۔ سلیم صاحب

نے ربوہ کا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے: جب میں تعلیم الاسلام کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا اکثر تنہائی اور خاموشی کی تلاش میں رات کو دریا پر چلا جایا کرتا تھا۔ ایک روشن چاندنی رات میں وہاں پہنچا تو یوں لگا کہ ایک ٹیلے پر کوئی موجود ہے۔ میں دریا کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد میں نے واپس آنے کا ارادہ کیا تو خیال آیا کہ کیوں نہ اس ٹیلے کی طرف سے نکلتا چلوں تاکہ پتا چلے کہ وہاں واقعی کوئی ہے یا بس میرا وہم ہے۔ جب پاس پہنچا تو دیکھا ایک شخص سفید کھیس اپنے اوپر ڈالے مراقبے میں ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ کوئی آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ وہ شخص مراقبے سے باہر آیا اور اپنا کھیس اتارا تو میں نے دیکھا کہ وہ عزیز راجیکی ہیں۔ اس سے پہلے میں نے انہیں صرف دور ہی سے دیکھا تھا۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور سلام عرض کیا۔ وہ اس وقت تک گویا اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھے۔ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا: نوجوان! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے وجہ بتائی تو مسکرائے اور ذرا توقف سے فرمایا کہ کبھی میرے پاس آنا۔ اس کے بعد ان سے ایسا قلبی تعلق پیدا ہوا جو آج تک ان کی وفات کے بعد بھی قائم ہے۔

نزہت صدیقی کہتی ہیں: ایک اور واقعہ سنیے جو مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ میں ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو آئی۔ یہاں غضب کی سردی پڑ رہی تھی اور گرم کوٹ، مفلر، ٹوپی اور دستانوں کے بغیر باہر نکلنا ناممکن تھا۔ ایک دن کام کے بعد گھر آئے تو کیا دیکھتی ہوں کہ کوٹ، مفلر، ٹوپی، دستانے سب چیزیں غائب ہیں۔ پورے جسم، سر کے بالوں اور پلکوں پر بھی برف کا پاؤڈر جما ہوا ہے۔ میں ڈر گئی کہ سردی لگ گئی تو کیا ہو گا۔ ان کے جوتے اتارنے سے پہلے ہی تولیہ، کپڑے اور کمبل حاضر کیا اور پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو کہنے لگے: میں اپارٹمنٹ کے سامنے بس سے اترا تو دیکھا کہ بنچ پر ایک بے گھر غریب بغیر مناسب کپڑوں کے پڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ میں نے سوچا اپنا گھر تو قریب ہے میں اسے کوٹ وغیرہ دے کر خود جلدی سے اندر پہنچ جاؤں گا چنانچہ میں نے اپنے کپڑے اسے دے دیئے ہیں۔

ان کی اہلیہ پاکستان میں گورنمنٹ کالج ساہیوال میں اردو کی لیکچرر تھیں۔ شاعری اور ادب ان کا شوق تھا مگر کینیڈا جانے کے بعد ان کی زندگی بدل چکی تھی۔ وہ بتاتی ہیں: یہاں اس وقت لوگ اردو کا نام بھی نہیں جانتے تھے لہٰذا میرے اس میدان میں داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر کینیڈا میں مہنگائی کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کام نہ کرتے ہوں تو معاشی ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور ترکِ وطن کر کے آنے والوں کے لیے تو کوئی اور راستہ بھی نہیں ہوتا مگر میرے مہربان اور عزت کرنے والے شوہر نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔ کہنے لگے: تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہاں آ کر لوگوں کو پیسہ کمانے کے لیے کہاں کہاں کام کرنا پڑتا ہے۔ تم کسی فیکٹری میں کام شروع کرو گی تو مجھے معلوم ہے دو دن میں تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا اور تمہاری ساری تخلیقی صلاحیت جاتی رہے گی۔ میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا۔ تم پڑھنے لکھنے والی خاتون ہو اس لیے اسی کا کوئی راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ راستہ ملنا اتنا آسان نہ تھا مگر کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ سو مجھے بھی معجزانہ طور پر یہ راستہ مل گیا اور میری پوری ملازمت کے دوران ان کی حوصلہ افزائی قدم قدم پر میرے ہمراہ رہی۔

نزہت صدیقی کہتی ہیں: وہ میرے صرف شوہر ہی نہ تھے بلکہ ان محسنوں میں سے تھے جنہوں نے مجھے ایک

بہتر انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے میں مدد دی۔ وہ مجھ کو مجھ سے زیادہ پہچانتے تھے۔ انہیں مجھ پر بھروسہ تھا۔ میں نے اُن کے بعد بھی اسی بھروسے پر زندگی کی ہر مشکل کا سامنا کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کی ان عنایات کی شکر گزار ہوں۔

سلیم صدیقی نے اردو، پنجابی اور ہندی میں شاعری کی۔ ملاحظہ ہوں ان کی ایک اردو غزل کے چند اشعار:

باعثِ گرمیٔ بازار کوئی تو ہوگا
شورِ محشر ہے سرِ دار کوئی تو ہوگا
رقصِ بسمل ہے کہ پائل سی کہیں چھنکی ہے
دُور سے آتی ہے جھنکار کوئی تو ہوگا
شہرِ خوابیدہ میں بیدار کوئی تو ہوگا
ہو نہ ہو صاحبِ اسرار کوئی تو ہوگا
اپنے شانوں پہ اٹھائے لئے پھرتی ہے صبا
نزہتِ گل کا پرستار کوئی تو ہوگا
جسم پابندِ سلاسل ہے مگر پھر بھی سلیم
روح کے کرب کا اظہار کوئی تو ہوگا

کبھی کبھار فارسی میں بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔ ان کا ایک فارسی قطعہ ملاحظہ ہو:

زہرا بمثلِ حسن و جمال محمد است
ہر پسرِ او بہ اوجِ کمال محمد است
شکلِ علی کہ عکسِ جلالِ محمد است
''خاکم نثار کوچۂ آلِ محمد است''

اور آخر میں ان کے پنجابی کلام کا نمونہ:

وڈیاں گلّاں، نِکیاں گلّاں، گلّاں نے بس گلّاں
گلّاں نے کد توڑ چڑھایا، گلّاں نے بس گلّاں
لِیکھاں دی سُولی تے چڑھ گئے کِنّے من دے روگی
کِنّے وانگ فقیراں رُل گئے، کِنّے رُلے وچ تھلّاں
چار دیہاڑے دی ایہہ حیاتی تے چار دِناں دا میلہ
دکھ دا دریا ٹھاٹھاں مارے، سِر توں اُچیاں چھلّاں

سلیم صدیقی کے بعد اب کچھ ذکر بریگیڈیئر (ر) مرزا ارشاد علی کا جو بنیادی طور پر ڈاکٹر ہیں اور پاک فوج کی میڈیکل کور میں طویل خدمت کا اعزاز رکھتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں میرا ان سے پہلا رابطہ کس طرح ہوا تھا؟ دسمبر ۲۰۱۴ء کی بات ہے۔ میری کتاب ''قریۂ جاوداں'' مکمل ہو چکی تھی اور اس کی اشاعت کی تیاری

ہو رہی تھی۔ میں ممالکِ غیر میں مقیم اپنے بہی خواہوں کو اپنے اس منصوبے کی تکمیل کی اطلاع دے رہا تھا کہ مجھے امریکہ سے ایک ای میل موصول ہوئی۔ بھیجنے والے کا نام کچھ غیر مانوس سا تھا تاہم ای میل پڑھی تو اندازہ ہوا کہ یہ تعلیم الاسلام کالج کے ایک سابق طالب علم، بریگیڈیئر مرزا ارشاد علی کی طرف سے ہے جو ایک زمانے میں ربوہ میں پڑھتے رہے ہیں اور اگرچہ ان کا بعد کا وقت آرام و آسائش میں گزرا تاہم وہ اب بھی ربوہ کی جُھلسی ہوئی دوپہروں اور گرم راتوں میں گزرے ہوئے وقت کو اپنی زندگی کا سب سے اہم دور قرار دیتے ہیں۔ اپنی ای میل میں انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ میں نے اپنی کتاب میں ربوہ کے جس دور کا احاطہ کیا ہے وہ خود اس کے عینی شاہد ہیں لہٰذا وہ میری کتاب کی اشاعت کے بڑے شوق سے منتظر ہیں۔

بعد میں ان سے مزید ای میلز کا تبادلہ ہوا تو پتا چلا کہ موصوف ہیُوسٹن، امریکہ میں مقیم ہیں۔

حال ہی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز، یو ایس چیپٹر کی ویب سائٹ پر ممبرز کی پروفائلز میں ارشاد علی کا نام نظر آیا تو یہ ساری باتیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں اور میں سوچنے لگا کہ تعلیم الاسلام کالج کے اس سپُوت کا ذکر اس کتاب میں کیوں نہ کیا جائے۔

مرزا ارشاد علی اپنے آپ کو بے انتہا خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ انہیں ۵۹-۱۹۵۷ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم حاصل کرنے اور ایف ایس سی (پری میڈیکل) کا امتحان اچھے نمبروں پر پاس کرنے کا اعزاز حاصل ہوا جس کے بعد وہ لیاقت میڈیکل کالج، جامشورو چلے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۵ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ان کی عملی زندگی کا زیادہ حصہ فوج میں گزرا جس میں اپنی تعیناتی کے دوران وہ حیدر آباد، راولپنڈی، کھاریاں، سکردو، کوہاٹ اور کراچی میں مقیم رہے۔ نومبر ۱۹۹۳ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ بریگیڈیئر ہو چکے تھے اور ان کا تقرر بطور اسسٹنٹ کمانڈنٹ، آرمڈ فورسز میڈیکل کالج، راولپنڈی تھا۔

اگر ان سے اپنی زندگی کا سب سے یادگار واقعہ سنانے کی فرمائش کی جائے تو وہ بتاتے ہیں: ۱۹۷۱ء کے آخر میں میری ڈیوٹی پاکستان نیوی کے بحری جہاز، پی این ایس خیبر پر سینئر میڈیکل آفیسر کے طور پر تھی۔ جنگ کا دوسرا دن تھا۔ رات کے قریباً ساڑھے آٹھ بجے میں اپنے کیبن میں تھا۔ میرا کیبن جہاز کے بالکل پچھلے حصے میں تھا جہاں پر میرے کیبن کے علاوہ مریضوں کے علاج اور ان کی دوسری ضروریات کا انتظام تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تک نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کیبن سے نکل کر جہاز کے اگلے حصے کی طرف چل پڑا تا کہ عرشے پر جا کر ریڈیو پاکستان سے دس بجے رات کی خبریں سن سکوں۔ عرشے پر پہنچنے کے لیے دو زینے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ پہلا زینہ چڑھنے کے بعد میری ملاقات لیفٹیننٹ ممتاز انور سے ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد میں نے ان کو بتایا کہ میں عرشے پر جا رہا ہوں۔ لیفٹیننٹ ممتاز انور جہاز کے الیکٹریکل افسر تھے۔ ابھی ان سے یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ جہاز پر ایکشن سٹیشن کا سائرن بجنا شروع ہو گیا۔ یہ سائرن دراصل ایمرجنسی صورتِ حال کا اعلان ہوتا ہے اور یہ سائرن بجنے پر ہر شخص کو اپنی اپنی جگہ پہنچ کر ایمرجنسی کے مقابلہ کے

یے تیار رہنا پڑتا ہے۔ سائرن کے چند سیکنڈ کے بعد ہماری اینٹی ایئر کرافٹ گنوں نے فائر شروع کر دیا۔ صرف چار پانچ فائرز کے بعد جہاز کے پچھلے حصے میں اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ پورا جہاز ہل گیا اور جہاز جو ہلکی سپیڈ پر چل رہا تھا ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اس وقت ہمارا جہاز کراچی سے قریباً پچاس میل دور پٹرولنگ ڈیوٹی پر تھا۔ اس دھماکے کے فوراً بعد لیفٹیننٹ ممتاز انور کو فون پر بتایا گیا کہ جہاز کے انجن روم میں آگ لگ گئی ہے چنانچہ وہ فوراً انجن روم کی طرف چلے گئے۔ میرا ایکشن سٹیشن وارڈ روم تھا چنانچہ میں وہاں پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ اور گزرے ہوں گے کہ ہماری اینٹی ایئر کرافٹ گنوں نے پھر فائر شروع کر دیا۔ پانچ چھ فائرز کے بعد جہاز پر ایک اور دھماکہ ہوا جو کہ پہلے والے دھماکے سے قریب تر محسوس ہوتا تھا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی جہاز پر مکمل اندھیرا چھا گیا چنانچہ میں نے جہاز کے وارڈ رُوم سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن پتا چلا کہ دروازہ جو باہر کی طرف کھلتا تھا دھماکے کے زیرِ اثر اندر کی طرف دھنس چکا ہے اور کھل نہیں سکتا۔ وارڈ رُوم کا ایک اور دروازہ بھی تھا لیکن وہ بھی جام ہو چکا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کمرے میں پھنس گیا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا۔ میں نے گھبراہٹ میں باہر والے دروازے کے ساتھ دوبارہ زور آزمائی کی اور دروازے کے کلپس کو اِدھر اُدھر گھمانے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے میں ان میں سے ایک دو کلپس گھمانے میں کامیاب ہو گیا جس سے آخر کار دروازہ کھل گیا۔

باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ جہاز کے اردگرد سطحِ سمندر پر چاروں طرف آگ لگ چکی ہے؛ جہاز کا پچھلا حصہ جہاں میرا کیبن اور مریضوں کی دیکھ بھال کا انتظام تھا سمندر میں ڈوب چکا ہے اور جہاز کا اگلا حصہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہاں مجھے اپنا ایک نرسنگ اسسٹنٹ مل گیا جس کو کچھ زخم آئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ جہاز کے کیپٹن کی طرف سے جہاز کو چھوڑنے کا آرڈر ہو گیا ہے۔ میں ابھی ڈیک پر پہنچا ہی تھا کہ یکا یک ایک اور زبردست دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے نے مجھے اٹھا کر پانچ چھ گز دور پھینک دیا اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں جہاز کے ڈیک پر جا پڑا۔ جب جہاز کا یہ حصہ سمندر میں ڈوب گیا تو پانی کے چھینٹے پڑنے سے مجھے ہوش آ گیا اور میں سمندر میں اتر گیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ جہاز کا تیل بہہ جانے کی وجہ سے سمندر کی سطح پر آگ لگ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے لکڑی کا ایک تختہ میرے ہاتھ لگ گیا جس سے میں جلتے ہوئے تیل کو ہٹا کر اپنا راستہ بناتا گیا۔ اس وقت میرے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی اور وہ یہ کہ مجھے جلدی سے جلدی جہاز سے ممکن حد تک دور جانا ہے۔ میرے اس فیصلے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو خطرہ تھا کہ آگ کی وجہ سے جہاز کے اندر گولہ بارود آگ نہ پکڑ لے جس سے مزید تباہی پھیل سکتی تھی۔ دوسری وجہ میرا یہ علم تھا کہ جب جہاز سمندر میں غرق ہو گا تو اپنے ساتھ اردگرد کی اشیا کو بھی سمندر میں کھینچ لے گا۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میرے لیے یہ مرحلہ آسان فرما دیا۔

اب میں نے دیکھا کہ دو ڈھائی سو گز دور کچھ لوگ کسی چیز کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ میں تیرتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ لوگ دو ناکارہ سے لائف رافٹس (life rafts) کے گرد جمع ہیں۔ جہاز میں اس طرح کی لائف رافٹس ہوتی ہیں اور ایک لائف رافٹ میں سولہ افراد کے لیے جگہ ہوتی ہے۔ اس میں فرسٹ ایڈ

کا سامان، تھوڑا سا ایمرجنسی راشن اور روشنی پیدا کرنے والے فلیئر موجود ہوتے ہیں مگر اس وقت وہاں ان چیزوں میں سے کچھ بھی موجود نہ تھا۔ رافٹس کی چھت پھٹ گئی تھی اور رافٹس خود بھی جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے لہٰذا وہ سولہ افراد کو بھی سہارا دینے کے قابل نہ تھے جب کہ اس وقت ۸۰ کے قریب افراد ان کے گرد جمع تھے اور ان میں سے بہت سے زخمی حالت میں تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے دیکھا کہ جہاز کا پچھلا حصہ مکمل طور پر پانی میں چلا گیا ہے اور اگلا حصہ سیدھا کھڑا ہو گیا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کا اگلا حصہ بھی سمندر میں ڈوب گیا۔ اس سارے عمل میں یعنی پہلے دھماکے سے لے کر جہاز کے مکمل طور پر غرق ہونے میں بمشکل آدھا گھنٹہ لگا ہو گا۔

پہلے تو طے ہوا کہ رافٹس کے اندر زخمیوں کو جگہ دی جائے اور باقی لوگ رافٹس کے اردگرد فلوٹ کرتے رہیں۔ کچھ دیر تو اس پر عمل ہوا مگر پھر وہ افراد جو زخمی ہونے سے محفوظ رہے تھے وہ زخمیوں کو اِدھر اُدھر دھکیل کر خود رافٹس میں بیٹھ گئے۔ میرے پاس ایک لائف جیکٹ تھی جو کہ پھٹ چکی تھی اور اس سے کوئی سپورٹ نہ ملی۔ میں سارا وقت رافٹ کے گرد ایک سلنگ کو پکڑ کر فلوٹ کرتا رہا۔

جہاز پر پہلے دھماکے کے ساتھ ہی جہاز کے عملے نے ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس پر جہاز کے ناکارہ ہونے کی اطلاع دے دی تھی مگر دوسرے دھماکے کے بعد سب کچھ تباہ ہو جانے کی وجہ سے کوئی خبر ہیڈ کوارٹر کو نہ دی جا سکی اور ہیڈ کوارٹر سے رابطہ مکمل طور پر کٹ گیا۔ اس وقت رات کے قریباً ساڑھے دس بج چکے تھے اور امید تھی کہ اگلے دن صبح کے وقت کوئی امداد پہنچ سکے گی۔ اس امید پر لوگوں نے اپنی جانیں بچانے کی کوشش جاری رکھی مگر امداد کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ دوپہر سے کچھ دیر پہلے دور سے ایک تجارتی جہاز نظر آیا۔ ہم نے اس کی توجہ حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بے سود اور وہ آہستہ آہستہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پانی کے اس سفر میں ایک سیلر کو پانی کا ایک چھوٹا سا کین نظر آیا جو دھماکے کی وجہ سے جہاز سے نکل کر سمندر میں جا گرا تھا اور پانی پر تیر رہا تھا۔ وہ اسے پکڑ لایا۔ اب مسئلہ اسے کھولنے کا تھا چنانچہ ہم نے باری باری اپنے دانتوں سے اسے کھولنے کی کوشش کی اور کافی تگ و دو کے بعد اس میں کامیاب ہوئے۔ چند لوگوں نے اس میں سے ایک ایک دو دو گھونٹ پانی پیا۔ یہ عجیب موقع تھا کہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا لیکن لوگ پینے کے پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے۔

اس دوران جو لوگ زخمی تھے وہ آہستہ آہستہ ہمارا ساتھ چھوڑنے لگے۔ ہاں جن لوگوں نے ہمت کی وہ زندہ بچے رہے۔

قریباً عصر کے وقت دیکھا کہ ایک سِویلین جہاز (غالباً پی آئی اے کا فوکر فرینڈ شپ) اس ایریا میں ہمارے اردگرد چکر لگا رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد پاکستان نیوی کی ایک گن بوٹ ہمیں اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے اتنا قریب آ گئی کہ ہم اس پر سوار ہو سکتے تھے۔ اس کے ایک طرف ایک سیڑھی تھی جس سے ہم ایک ایک کر کے اوپر چڑھنے

لگے۔ اس وقت مجھے شدید کمزوری کا احساس ہوا اور میں بوٹ پر پہنچتے ہی اس کے فرش پر لیٹ گیا۔ دوسروں کی بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔ وہاں سے وہ بوٹ کراچی کی طرف روانہ ہوئی۔ بندرگاہ کے نزدیک پہنچنے کے بعد بھی ہمیں بوٹ پر ہی انتظار کرنا پڑا کیونکہ اس وقت ہوائی حملے کا خطرہ تھا۔ بہر حال ہم لوگ رات کے قریباً گیارہ بجے کراچی پہنچ گئے۔ وہاں ایمرجنسی فرسٹ ایڈ، ایمبولینس اور سرجیکل ٹیم موجود تھی مگر ان کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہمارے جہاز کے قریباً دوسو ستر افراد میں سے ہم صرف انچاس افراد ساحل پر پہنچ سکے تھے۔ بعد میں تین اور افراد بھی کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچ گئے۔ یہ لوگ کسی وجہ سے ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ اس طرح کل بچ جانے والوں کی تعداد باون ہو گئی۔ کراچی پہنچ کر محسوس ہوا کہ میرے دونوں کانوں میں ہر وقت گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں۔ ای این ٹی سپیشلسٹ نے بتایا کہ دونوں کانوں کے پردے پھٹ چکے ہیں لیکن امید ظاہر کی کہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ پردے تو ٹھیک ہو گئے مگر قوت سماعت آج تک نارمل نہیں ہو سکی۔ جنگ سے قریباً دو ہفتے پہلے ہمارا سالانہ میڈیکل چیک اَپ ہوا تھا جس میں میرا وزن ۱۶۸ پونڈ تھا۔ واپس آ کر وزن کیا تو ۱۵۲ پونڈ ہو چکا تھا یعنی قریباً بیس گھنٹوں میں ۱۶ پونڈ کم ہو گیا۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اس حادثے میں میرے لیے سب سے خوفناک لمحہ کون سا تھا تو میں کہتا ہوں: جب پہلا دھماکہ ہوا، جہاز میں بجلی بند ہو گئی اور مجھ سے وارڈ روم کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر یہ جہاز ڈوب گیا تو میں بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے سمندر کی گہرائیوں میں دفن ہو جاؤں گا لیکن سچ کہا ہے کسی نے جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

آج جب کہ اس واقعے پر کم وبیش نصف صدی گزرنے کو ہے مجھے لیفٹیننٹ ممتاز انور کے علاوہ اپنا دوست لیفٹیننٹ فضل احمد بھی یاد آ رہا ہے جو جہاز کا الیکٹریکل آفیسر تھا۔ میں نے آخری بار اسے اس وقت ڈیک پر دیکھا تھا جب جہاز میں دوسرا دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔

اس حادثے سے میں نے بہت سی باتیں سیکھی ہیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ حادثے کے دوران جن لوگوں نے شور مچانے اور چیخنے چلانے کی بجائے ضبط وتحمل سے کام لیا ان میں سے اکثریت کی جان بچ گئی جب کہ چیخنے چلانے والوں میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سیلر تھا جو رات بھر تو خاموش رہا لیکن صبح ہوتے ہی بے تحاشہ چیخنے لگا۔ ہم بڑی مشکل سے اسے چپ کراتے لیکن جلد ہی دوبارہ اس پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ دوپہر کے بعد ہم نے اس کی آواز نہیں سنی۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہم نے اس کی نعش سمندر پر تیرتی ہوئی دیکھی تو پتا چلا کہ وہ موت کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔

ایک اور سیلر تھا جو بار بار کہتا تھا کہ اسے زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ میں اسے تسلی دیتا تھا: تاہم وہ شکست خوردہ نظر آ رہا تھا اور وہی ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی لائف جیکٹ اتار کر ایک اور شخص کو دے دی اور دیکھتے ہی دیکھتے خود کو سمندر کی بے رحم لہروں کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے کہاں دیکھنا تھا!

بریگیڈیئر ارشاد کہتے ہیں: ہمیں ریسکیو کرنے کے لیے پاکستان نیوی کی طرف سے جو کشتی بھجوائی گئی

اس کا نام پی این ایس صداقت تھا اور اس کشتی کے سیکنڈ اِن کمانڈ ایک احمدی افسر تھے یعنی کمانڈر (ر) خالد مہار جو اُن دنوں نیوی میں لیفٹیننٹ تھے۔

ارشاد کا بیان ختم ہوا۔ راقم الحروف عرض گزار ہے کہ کمانڈر خالد مہار میرے ایک بزرگ، میجر محمد عبداللہ مہار کے صاحبزادے، انتہائی نفیس الطبع انسان اور میرے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ لاہور کینٹ میں حبیب روڈ پر رہائش پذیر ہیں لہٰذا ان سے کہیں اور ملاقات ہو یا نہ ہو کڑک ہاؤس میں نماز جمعہ پر ضرور علیک سلیک ہو جاتی ہے۔ جب میں نے ان سے امر کی تصدیق چاہی تو انہوں نے کہا: یہ بات درست ہے۔ اگرچہ نیول ہیڈکوارٹرز کو پی این ایس خیبر کے ساتھ اس حادثے کی اطلاع تو مل چکی تھی مگر اس کے ڈوبنے کی اطلاع فوری طور پر نہ ہو سکی۔ جب جہاز سے رابطے میں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی خیریت کے بارے میں فکر ہونے لگی۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے پاکستان نیوی کا ایک مائن سویپر بھی غرقاب ہو چکا تھا۔ اس پر تعینات عملے کی تعداد پینتیس کے قریب تھی۔ یہ جہاز کراچی سے قریباً چالیس ناٹیکل مائلز پر ڈوبا تھا۔ اس کے ڈوبنے کی اطلاع نیول ہیڈکوارٹرز کو مل چکی تھی چنانچہ ہم فوری طور پر اس کے عملے کو ریسکیو کرتے رہے۔ اگلے روز دن کے دس گیارہ بجے جب ہم لوگ پی این ایس خیبر کی تلاش میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے تو اس کے عملے کی تلاش شروع ہوئی تاہم اس وقت تک جہاز ڈوبے کم از کم بارہ گھنٹے ہو چکے تھے اور اس عرصے میں بہت سی قیمتی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ زندہ بچ رہنے والے افراد بھی کسی ایک جگہ نہیں تھے بلکہ سمندر کے ایک وسیع علاقہ پر پھیل چکے تھے۔ انہیں ڈھونڈنے میں بڑا وقت صرف ہو گیا۔ ہم نے یہ کارروائی قریباً دو بجے دوپہر شروع کر کے مغرب کے قریب مکمل کی جس کے بعد ہم عملے کے زندہ بچ رہنے والے افراد کو لے کر کراچی واپس پہنچے۔

بریگیڈیئر ارشاد علی کی زندگی کے اس روح فرسا واقعے کا بیان ختم کرنے سے پہلے راقم الحروف یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہے کہ اس حادثے کے شہداء میں کم از کم ایک احمدی بھی شامل تھے جن کا نام ممتاز انور تھا اور جو اس وقت نیوی میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ اگرچہ ان کی نعش تو سمندر کی بے رحم موجوں نے نگل لی مگر ان کی یادگار ربوہ کے قطعہ شہدا میں نصب ہے جس پر یہ عبارت درج ہے:

"...........

یادگار

الحاج لیفٹیننٹ ممتاز انور صاحب

ستارۂ جرأت PNO 871

ولادت: تیس اگست ۱۹۳۹ء

بیعت: ۱۹۶۱ء

۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو......رات گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر......میزائل بوٹ نے خیبر جہاز کے بوائلر نمبر ۱ کو نشانہ بنایا۔ انجینئر آفیسر لیفٹیننٹ ممتاز نے اپنی

جان کی پروانہ کرتے ہوئے نمبر۲ بوائلر رُوم کا چارج سنبھال لیا۔ اس اثنا میں
دوسرا میزائل بوائلر کے قریب گرا۔ انہوں نے فوراً بوائلر خالی کرنے کا حکم دیا
اور خود بیلج پمپ میں پھنسے دو ساتھیوں کو نکالنے لگے اور ان کی انتھک کوشش
سے دونوں آدمی بچ گئے۔ حکومت نے اس بہادری کے اعتراف میں انہیں
ستارۂ جرأت بعد شہادت عطا کیا۔''

ممتاز انور شہید کے واقعۂ شہادت کی سرکاری طور پر جاری شدہ تفصیل کے مطابق ''۶ دسمبر کو پی این ایس خیبر کو کراچی کی بیرونی ایروچ کے ساتھ ساتھ گشت کرنے کے لیے مامور کیا گیا۔ تقریباً ۱۱:۴۵ بجے رات لیفٹیننٹ ممتاز انور نے جو جہاز کے انجینئر آفیسر تھے ایکشن سٹیشن سے پیغام سنا اور فوری طور پر ڈیمیج کنٹرول ہیڈ کوارٹر میں پہنچے اور مختلف ڈیمیج کنٹرول پارٹیوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران جہاز کے نمبر ایک بوائلر رُوم میں ایک میزائل آ لگا۔

لیفٹیننٹ ممتاز اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے ملحقہ نمبر دو بوائلر رُوم میں پہنچے اور جہاز کی بجلی بحال رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

بوائلر رُوم میں آمد پر انہوں نے مختلف پارٹیوں کا چارج سنبھال لیا اور پاور بحال کرنے کے قریب تھے جب نمبر دو بوائلر کے قریب ایک اور میزائل آ لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر انہوں نے بوائلر رُوم خالی کرنے کا حکم جاری کر دیا لیکن خود دو ساتھیوں کی جانیں بچانے کے لیے نیچے ڈیک میں چلے گئے جو بیلج پمپ کے حصے میں پھنس گئے تھے۔ ان کی بہادرانہ اور انتھک کوششوں کے نتیجے میں مذکورہ دونوں آدمیوں کی جانیں بچ گئیں لیکن اس کارروائی کے دوران لیفٹیننٹ ممتاز خود تھک کر زخموں سے چُور چُور ہو چکے تھے۔ ڈیوٹی کے مقام پر آکسیجن کی کمی اور زہریلی بُو کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ فرائض سے لگن اور crew members کی جانیں بچانے کی کوشش کے اعتراف میں ان کو ستارۂ جرأت (بعد از شہادت) عطا کیا گیا۔''

ممتاز انور اپنے خاندان میں پہلے احمدی تھے تاہم بعد میں ان کے والدِ بزرگوار نے بھی احمدیت قبول کر لی۔

ان کی شہادت کے بعد ان کی اہلیہ نے کسی سکول میں ملازمت اختیار کر لی اور اپنے دونوں بچوں کی بہت عمدہ تربیت کی۔ ان کی بیٹی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنیں جب کہ بیٹے جو اپنے والد کی شہادت کے وقت بمشکل ایک سال کے تھے اب ڈاکٹر مبشر ممتاز، ہارٹ سرجن کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہیں اور وقتاً فوقتاً طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں وقفِ عارضی پر تشریف لاتے رہتے ہیں۔ میری ان سے ملاقات ایسی ہی حالیہ دو وِزِٹس کے دوران ہوئی جب وہ میری ایک بھانجی کے شوہر، ڈاکٹر عبدالقدوس کی معیت میں اسی مشن پر ربوہ آئے ہوئے تھے۔

یہ تو تھا حادثہ پی این ایس خیبر میں شہادت پانے والے ایک احمدی افسر، زندہ بچ رہنے والے ایک احمدی افسر اور ان کی زندگی کا بظاہر سبب بننے والے ایک احمدی افسر کا ذکرِ خیر۔ اب میں آپ سے متعارف کرانا

چاہتا ہوں ڈاکٹر محی الدین مرزا کو جو معروف مربی سلسلہ، گیانی واحد حسین کے فرزند ہیں۔ گیانی واحد حسین کو اللہ تعالیٰ نے خدمتِ سلسلہ کی لمبی توفیق عطا فرمائی لیکن کیا آپ کو علم ہے کہ انہیں ایک ایسی انفرادیت بھی حاصل تھی جو بہت ہی کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں سکھ مذہب قبول کر لیا، انہیں شیر سنگھ کہا جانے لگا، وہ ضروری تعلیم و تربیت کے بعد ''گیانی'' کہلانے کے اہل ہو گئے اور ترن تارن میں سکھ مذہب کے پرچار میں مصروف تھے کہ احمدیت کی طرف راغب ہوئے اور بالآخر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ ایک کامیاب داعی الی اللہ تھے اور پیغامِ حق پہنچانے کا ان کا اپنا انداز تھا۔ میرے بہنوئی سعید احمد اظہر جو لمبا عرصہ شیخوپورہ اور فیصل آباد میں بطور مربی تعینات رہے گیانی واحد حسین کے ساتھ مختلف جلسوں میں جاتے رہتے تھے اور ان کے بعض بہت دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے دو جولائی ۱۹۷۰ء کو وفات پائی اور ربوہ میں دفن ہوئے۔ الفضل نے ان کی وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا:

''گیانی صاحب مرحوم کلانور ضلع گورداسپور کے ایک معروف مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن میں جب کہ آپ کی عمر دس سال تھی آپ سکھ ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے قریباً پندرہ سال سکھ مذہب کا مطالعہ کیا چنانچہ آپ کو سکھ لٹریچر پر خاصا عبور حاصل تھا۔ پچیس سال کی عمر میں آپ نے حضرت ماسٹر عبدالرحمٰن (سابق مہر سنگھ) کی مساعی کے نتیجے میں سکھ مذہب ترک کر کے......سلسلۂ احمدیہ میں شمولیت کی سعادت پائی۔ اس کے بعد آپ نے ساری عمر مربی سلسلہ کی حیثیت سے خدمتِ سلسلہ میں بسر کی اور ایک پُراثر واعظ کی حیثیت سے بہت نام پیدا کیا۔ آپ کو اس عرصے میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں پیغامِ حق پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی، صدہا کامیاب مناظرے کیے اور بے شمار لیکچر دیئے۔''

تفصیلات کے مطابق ان کا مناظرے اور لیکچر کا انداز بالکل منفرد تھا۔ وہ بہت دلچسپ اور پُراثر پنجابی میں تقریر کرتے اور دیہاتیوں تک پیغامِ حق پہنچانے کا خاص ملکہ رکھتے تھے لہٰذا اپنوں اور پرائیوں، سب میں بے پناہ مقبول تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیہی جماعتوں کے احمدیوں کے ساتھ ساتھ بعض غیر از جماعت دوست بھی ان کی تقریر سننے کے لیے کھنچے چلے آتے تھے۔ طبیعت بہت شگفتہ تھی اور بذلہ سنجی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد عیسائیت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور بڑی محنت سے اس پر عبور حاصل کیا۔ انہیں بائبل کے اکثر حوالہ جات اَزبر تھے اور انہوں نے عیسائیت کے رد میں بہت سے اعلیٰ پایہ کے مضامین بھی لکھے۔ پنجابی میں نظمیں بھی کہتے جو بالعموم بہت پسند کی جاتی تھیں۔

ہاں! تو بات ہو رہی تھی ڈاکٹر محی الدین مرزا کی جو ان ہی گیانی واحد حسین کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں اور آج کل کینیڈا کے شہر ایڈمنٹن میں مقیم ہیں۔ وہ تعلیم الاسلام کالج کے لائق اور محنتی طلبہ میں سے تھے۔ اگرچہ ان کا بچپن قادیان اور قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی دور راہوالی میں گزرا تھا تاہم وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے محض احمدیت کی برکت سے میٹرک کا امتحان عمدہ نمبروں پر پاس کر لیا جس کے

بعد ۱۹۵۸ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخل ہوئے۔

وہ بتاتے ہیں: ربوہ کے شب و روز نے حصولِ علم کے میرے شوق کو جلا بخشی۔ میں نے ایف ایس سی تعلیم الاسلام کالج سے کی۔ ان دنوں کالج میں بیالوجی کا باقاعدہ استاد کوئی نہ تھا لیکن ہم نے استاد نہ ہونے کی کبھی شکایت نہیں کی۔ باقی طلبہ نے بھی یہ کمی پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریق ضرور وضع کیا ہوگا لیکن میں گھر میں خوب پڑھائی کیا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں زُوآلوجی میں مینڈک کے سسٹم کو اچھی طرح سمجھنا ضروری تھا۔ میں نے اس فن میں یدطُولیٰ حاصل کرلیا۔ مینڈک پکڑ کر اس کا پیٹ چاک کرنا اور اس کے جسم کے ایک ایک حصے کی شناخت میرے لیے بچوں کا کھیل بن چکا تھا۔ نہ جانے کتنی ہی بار مینڈک کی چیر پھاڑ میں نے اپنے ہاتھ سے کی اور اس سرجری کا تقریباً ماہر ہوگیا۔ جو کچھ دیکھتا ہاتھ سے اس کی ڈرائنگ بناتا۔ اس طرح بفضلہٖ تعالیٰ مجھے اس مضمون میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

محی الدین مرزا اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: یوں تو میرے تمام اساتذہ بہت محنتی اور قابلِ تعظیم تھے تاہم میں سب سے پہلے اپنے پرنسپل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی شفقت کا میں ہمیشہ ہی مُورد رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بعد میں آپ کو خلافت کے مقام پر فائز فرمادیا۔ ایک بار جب میں پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ کے سلسلے میں جرمنی کے شہر ہنوور میں مقیم تھا حضور وہاں تشریف لائے تو ہائی وے پر ایک ریسٹ ایریا میں مجھے آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضور بڑی تفصیل کے ساتھ میری ریسرچ کے بارے میں پوچھتے رہے اور ضروری رہنمائی بھی فرماتے رہے۔ آپ کے علاوہ میں مرزا منظور احمد کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ہمیں کچھ عرصہ زوآلوجی پڑھائی۔ بہت محنتی تھے اور طلبہ کے سوالات کا جواب بے حد تحمّل اور تسلی بخش طریقے سے دیتے تھے۔

محی الدین مرزا ڈاکٹر بننا چاہتے تھے لیکن اپنے مالی حالات سے بھی واقف تھے لہٰذا انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے درخواست دے دی مگر ساتھ ہی ساتھ گورنمنٹ کالج، لاہور میں بی ایس سی (آنرز) کے لیے بھی درخواست جمع کرادی۔ نشتر میڈیکل کالج، ملتان سے داخلے کی اطلاع آ گئی لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے وہ وہاں نہ جاسکے البتہ ۱۹۶۰ء کے اواخر میں گورنمنٹ کالج، لاہور چلے گئے اور آنرز کی تکمیل پر ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی (باٹنی) کا امتحان جملہ طلبہ میں اوّل رہ کر پاس کیا۔

ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کہاں سے کیا تو وہ بتاتے ہیں: اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مجھے اٹامک انرجی سنٹر، لاہور میں ملازمت مل گئی اور وہ بھی بغیر کسی سفارش کے۔ ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی ہمارے چیئرمین تھے۔ وہاں رہ کر میں نہ صرف ریسرچ کے جدید طریقوں سے متعارف ہوا بلکہ مجھے بعض مشہور سائنسدانوں سے ملاقات کا بھی موقع ملا جن میں ڈاکٹر عبدالسلام شامل تھے۔ وہ اباجی مرحوم کو جانتے تھے چنانچہ بہت شفقت سے پیش آئے اور دیر تک نصائح سے نوازتے رہے۔ ان کی ایک نصیحت جو مجھے ہمیشہ یاد رہی یہ تھی کہ ہمیں اپنی ریسرچ میں قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ میں زندگی بھر اس نصیحت پر عمل کرکے فائدہ اٹھاتا رہا ہوں۔ مجھے حال ہی میں کینیڈا میں

منعقد ہونے والے ایک ''قرآن اور سائنس سمپوزیم'' میں بھی ایک مقالہ پیش کرنے کا موقع ملا ہے جسے میں اپنے لیے ایک بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

۱۹۶۶ء میں محی الدین مرزا کو کولمبو پلان کے تحت پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ مل گیا اور یونیورسٹی آف البرٹا، ایڈمنٹن میں داخلہ ملا۔ محنت کی عادت کام آئی اور انہوں نے ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں پی ایچ ڈی مکمل کرلی۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد وہ پاکستان واپس آ گئے۔ اس وقت تک زراعت کا شعبہ اٹامک انرجی سنٹر، لاہور سے لائلپور شفٹ ہو چکا تھا چنانچہ ان کی ملازمت کا باقی عرصہ وہیں گزرا۔

محی الدین مرزا ۱۹۷۴ء میں جرمنی چلے گئے اور مفوضہ ریسرچ کی تکمیل پر کینیڈا منتقل ہوگئے۔ انہوں نے البرٹا صوبے کے ایک چھوٹے سے شہر، برُوکس میں جہاں زراعت کا ایک ریسرچ سنٹر تھا بطور ٹیکنیشن کام شروع کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں آگے بڑھنے کی صلاحیت سے نواز رکھا تھا چنانچہ ۱۹۷۹ء کے جون میں انہوں نے گرین ہاؤس سپیشلسٹ کے طور پر کام شروع کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت میں برکت ڈالی اور آہستہ آہستہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا چنانچہ ۱۹۸۴ء اور پھر ۲۰۰۴ء میں البرٹا گرین ہاؤس گروارز ایسوسی ایشن نے انہیں میریٹوریس سروسز ایوارڈ سے نوازا جو بجائے خود ایک بڑا اعزاز ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ایک ایوارڈ ان کے نام پر جاری کیا گیا جس کا نام ہے ''ڈاکٹر محی الدین مرزا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن''۔ یہی نہیں اس سے اگلے سال البرٹا گرین ہاؤس گروارز ایسوسی ایشن کی طرف سے انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا اور ۲۰۱۴ء میں البرٹا گورنمنٹ نے انہیں ''ایگریکلچرل ہال آف فیم'' میں انڈکٹ کیا۔

اب تک اس نامور سپوتِ احمدیت کے ایک ہزار سے زیادہ ریسرچ پیپرز شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین مرزا کے بارے میں اپنی گفتگو ختم کرنے سے قبل آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ موصوف جماعتی خدمت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں چنانچہ وہ پچھلے کئی سال سے جماعتِ احمدیہ کینیڈا کے نیشنل سیکرٹری زراعت ہیں۔

اب آپ کی ملاقات چوہدری رشید احمد سے کرائی جارہی ہے جو تعلیم الاسلام کالج کے ہونہار طلبہ میں سے تھے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۰ء تک یہاں زیرِ تعلیم رہے۔

موصوف جو اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے طفیل کالج میں ''رشید ہیزلٹ'' کے نام سے معروف تھے مولوی محمد اسماعیل نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے ہیں جن کا تعلق یوں تو گولیکی ضلع گجرات سے تھا اور وہ حضرت قاضی محمد ظہور الدین اکمل کے والدِ بزرگوار، مولوی امام الدین کے شاگردوں میں سے تھے تاہم وہ قیامِ پاکستان کے وقت گورنمنٹ ہائی سکول، ہوشیارپور میں اورینٹل ٹیچر کے طور پر کام کررہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ن م راشد کی جنم بھومی، اکال گڑھ (یعنی علی پور چٹھہ) منتقل ہوگئے۔

رشید نے گورنمنٹ ہائی سکول، اکال گڑھ سے میٹرک کا امتحان بہت عمدہ نمبروں پر پاس کیا چنانچہ انہیں گورنمنٹ کالج، لاہور میں ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) میں داخلہ مل گیا تاہم مزید تعلیم کے لیے ان کی

نظرِ انتخاب تعلیم الاسلام کالج پر پڑی جہاں سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ نتیجہ آیا تو وہ انگریزی کے مضمون میں پنجاب یونیورسٹی کے جملہ طلبہ میں دوم اور وظیفہ کے حقدار قرار پائے تھے چنانچہ وہ انگریزی میں ایم اے کرنے کے لیے دوبارہ گورنمنٹ کالج چلے گئے۔ یہاں خداتعالیٰ نے انہیں ایک اور اعزاز سے نوازا اور وہ فائنل امتحان میں یونیورسٹی میں دوم رہے۔ ایم اے کرنے کے بعد انہیں گورنمنٹ کالج، لاہور اور کچھ عرصہ اسلامیہ کالج، لاہور میں پڑھانے کا موقع ملا۔ اسی دوران وہ ۱۹۶۶ء میں سنٹرل سُپیریئر سروسز آف پاکستان ایگزامینیشن میں شامل ہوئے اور جملہ امیدواروں میں تیسویں نمبر پر رہے۔ انہیں پاکستان فارن سروس کی پیشکش ہوئی جو انہوں نے قبول کر لی اور پھر تمام زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزار دی۔

انہیں اپنی ملازمت کے دوران دنیا کے مختلف ممالک میں کام کرنے کا موقع ملا تاہم بطور سفیر ان کی پہلی تقرری رومانیہ میں ہوئی جہاں وہ بلغاریہ کے لیے بھی پاکستان کے سفیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ بعد میں وہ سینی گال، یونان اور قازقستان میں پاکستان کے سفیر رہے اور اس حیثیت میں مجموعی طور پر کم و بیش تیرہ سال گزارے۔ وہ جون ۲۰۰۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ تب سے اسلام آباد کے سیکٹر ایف ۱۱/۴ کی ۵۶ ویں گلی میں اپنے ذاتی گھر میں مقیم ہیں۔

رشید حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی شفقت کے خاص مُورد رہے ہیں۔ ماہنامہ انصاراللہ (جولائی ۲۰۱۶ء) میں ''حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی مسرور کن یادیں'' کے عنوان سے ان کے ایک مضمون کا ترجمہ طارق حیات کے قلم سے شائع ہے۔ جس میں موصوف لکھتے ہیں:

''میں ۶۰۔۱۹۵۸ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب کے شفقت بھرے محفوظ پروں کے نیچے تھا۔ آپ ہمارے پرنسپل بھی تھے اور میرے پولیٹیکل سائنس کے استاد بھی تھے۔ بعدازاں آپ ہم سب کے روحانی پیشوا، خلیفۃ المسیح الثّالث منتخب ہوگئے۔ معزز قارئین! میں اقرار کروں گا کہ اس دور میں مجھے اس نافلۂ موعود، ابن مصلح موعود کی خداداد صلاحیتوں، پارسائی، حسین ظاہر و باطن کا کماحقہ، ادراک نہ تھا۔ بلاشبہ اس اتقیاء و اصفیاء ایسے چال چلن اور شخصیت نے ہی آپ کو خدا کا پیارا وجود بنا دیا تھا۔ ان مہ و سال میں حضور کے بطور استاد و پرنسپل بے شمار واقعات ہوتے رہے لیکن چند ایسے ہیں کہ گردشِ دوراں بھی ان کی یاد و تر و تازگی محو نہیں کر سکی ہے۔ مجھ پر آپ کا سب سے طاقتور تاثر یہ ہے کہ آپ غیر معمولی صاحبِ بصیرت انسان تھے مثلاً تعلیمی سال کے اختتامی دنوں میں آپ نے ایک شام نہایت سادگی اور بے تکلفی سے فرمایا کہ ''رشید احمد! سالانہ امتحان سر پر ہیں، تم ایک بہت اچھے طالب علم ہو تاہم میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری کمر فرسٹ ڈویژن کی طرف ہے اور منہ سیکنڈ ڈویژن کی طرف ہے۔'' آپ کی اس پیش خبری کا مکمل ظہور نہ صرف میرے بی اے کے نتائج میں سامنے آیا بلکہ ایم اے کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ میری تعلیم الاسلام کالج میں سیکنڈ ڈویژن اور دوسری پوزیشن آئی اور بعدازاں ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے امتحان میں میری دوسری پوزیشن اور سیکنڈ ڈویژن تھی۔ میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے وظیفہ کا حقدار ٹھہرا کہ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی میں ایم اے کر سکوں۔ میں اس وظیفہ ملنے کو اپنے محترم استاد کی پیش گوئی میں مذکور ''فرسٹ ڈویژن'' سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ مزید برآں حضور کی یہ پیش گوئی میرے حق میں تعلیمی اور عملی میدانوں میں بھی عجیب در عجیب رنگ میں پوری ہوتی رہی۔

تعلیم الاسلام کالج کے مؤقر رسالہ ''المنار'' کے انگریزی حصہ کی ادارت کے عرصے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کو بھلا دینا شاید میرے لیے ناممکن ہے کیونکہ اس واقعہ سے میرے محبوب آقا کی خداداد صفتِ عفو کی گہری جھلک ملتی ہے۔ ہوا یوں کہ میں نے ایک اداریہ لکھا جس میں ربوہ شہر میں رہائش کے فوائد اُجاگر کرنے کے لیے بعض مشکلات کا بھی تذکرہ کر دیا مگر بدقسمتی سے میری قلمی و علمی ناتجربہ کاری نے وہ مفہوم پیدا نہ کیا جو مضمون کا اصل مقصود تھا۔ میری شکایت ہوئی اور نتیجتاً میں ایک روز محترم پرنسپل صاحب کی ناراض نگاہوں کا مرکز بنا بیٹھا تھا۔ آپ نے اپنے میز کی دراز سے رسالہ نکالا، میرے سامنے رکھا اور صرف اتنا فرمایا کہ ''دیکھ لو، تم نے کیا لکھا ہے!'' پھر چند منٹ کی اعصاب شکن مکمل خاموشی ہوئی اور میں آپ کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ تب میں ذہنی طور پر اتنا متاثر ہوا کہ کلاس روم جانا چھوڑ دیا حتّٰی کہ پولیٹیکل سائنس کے لیکچرز سے بھی غیر حاضر ہونے لگا۔ میں اپنی مسلسل غیر حاضری کے تیسرے دن، ایک تپتی دوپہر، فضل عمر ہوسٹل کے اپنے اجتماعی کمرے میں چارپائی پر بے سُدھ پڑا تھا، تب اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر میرے طویل القامت، حسین، خوش و خرم پرنسپل صاحب اندر داخل ہوئے۔ آپ نے بُھورے رنگ کی اچکن اور قراقلی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ میں اپنے تخیّل میں آج بھی سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ آپ کی آمد یوں ہوئی تھی کہ گویا کسی فرشتے کا نزول ہے۔ آپ نے مجھے فرمایا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ نہاؤ اور میرے ساتھ کالج چلو۔ قارئین کرام! میرے پرنسپل صاحب تو بہت معاف کرنے والے تھے۔ یوں میں اگلے تمام برسوں میں آپ کی شفقتوں کا مورد بنا رہا۔

پھر مجھے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کی وہ شام نہیں بھولتی جب میں نے اپنے دفتر میں مصروف کار آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری صاحب سے درخواست کی کہ میں حضور سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس مشفق و مہربان انسان نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور کہا ابھی اس دفتر میں ہی کچھ انتظار کر لو کیونکہ ابھی حضور قصرِ خلافت سے نکلیں گے اور اس صحن سے گزر کر دفتر کے سامنے والے دروازے سے داخل ہوں گے اور آپ کو صرف اتنا ہی وقت مل سکتا ہے جتنے وقت میں حضور قصرِ خلافت سے اپنے دفتر داخل ہوں گے۔ میں جذبات سے مغلوب ہو گیا اور طرح طرح کی مسرتوں نے مجھے گھیر لیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے جب دروازہ کھولا تو میں دیوانوں کی طرح دوڑ کر حضور کی طرف بڑھا۔ مجھے آج بھی وہ نظارہ روحانی خوشی دیتا ہے جب بلند قامت، وجیہہ، مجسّم جمال خلیفۃ المسیح براؤن اچکن اور چمکتی سفید پگڑی پہنے تشریف لا رہے تھے۔ صحن کے قریباً وسط میں ہی حضور نے مجھے گلے لگا لیا۔ آپ نے مجھے ساتھ لے جا کر پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''رشید صاحب ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔ بہت اچھے خاندان سے ہیں۔ ان کا فلاں خاندان سے رابطہ کروا دیں۔'' پھر آپ نے مجھے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اور جلسہ سالانہ پر آئے ہوئے احمدیوں کے وفود سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔

حضور سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۰ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ تب حضور نے مغرب کی نماز کی امامت کروائی اور ایک مختصر سی مجلسِ عرفان میں رونق افروز ہوئے۔ اس میں آپ نے دیگر پُرحکمت باتوں کے علاوہ سویابین اور شہد کے فوائد پر مدلل گفتگو فرمائی تھی۔ مجلس عرفان کے بعد آپ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مکرم مرزا انس احمد صاحب کو فرمایا کہ وہ مجھے اوپر کی منزل پر لے چلیں جہاں میں نے دیکھا کہ حضور نے نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی پگڑی اتاری، اپنی اچکن کے بٹن ڈھیلے کئے اور میرے سوال کے جواب میں قومی اسمبلی کی کارروائی نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان فرمائی۔ اس کارروائی کے بعد احمدیوں کو پہلے سے طے شدہ فیصلے کے مطابق غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ پھر حضور نے پیدروآباد، سپین میں بیتِ بشارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کا احوال سنایا۔ اثنائے کلام میں میرے آقا نے خوشی کے جذبات سے مامور ہو کر نہایت سادگی سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ان تقریبات کے اختتام تک حضرت بیگم صاحبہ نے اپنی جیب میں موجود آخری سکہ بھی اہلِ علاقہ کے اس ہجوم میں بانٹ دیا تھا جو خلیفہ اور اس کے وفد کو دیکھنے جمع ہو گیا تھا۔

۱۹۸۲ء کے بعد میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو نہایت تأسف سے بتایا کرتا تھا کہ میرے پاس اپنے پرنسپل، استادِ محترم اور خلیفۃ المسیح کی کوئی بھی تصویر یا یادگار نہیں ہے۔ ۱۹۹۸ء میں میرے محترم کلاس فیلو، مکرم مرزا انس احمد صاحب نے میری محرومی کا احساس کرتے ہوئے مجھے حضور کی وہ مشہور، بھورے رنگ کی اچکن عطا فرمائی جو آپ کالج میں بطور پرنسپل زیبِ تن فرمایا کرتے تھے۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ حضور کو جنت الفردوس میں اپنا خاص الخاص قرب اور بلند ترین درجات عطا فرماتا چلا جائے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے رشید پاکستان فارن سروس کے رکن رہے اور اس حیثیت میں انہیں بہت سے ممالک میں سفارتی فرائض ادا کرنے کا موقع ملا۔ ان کی زندگی دلچسپ واقعات سے عبارت ہے جنہیں وہ بیان کرنا شروع کر دیں تو ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تاہم بوجوہ وہ تمام واقعات فی الوقت ضابطہ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔ ان کی جن ممالک میں تقرری رہی ان میں افغانستان بھی شامل تھا۔ وہ بتایا کرتے ہیں:
ساڑھے پانچ سال الجیریا اور تیونس کے پاکستانی سفارت خانوں میں بطور تھرڈ سیکرٹری اور سیکنڈ سیکرٹری گزارنے کے بعد میرا تبادلہ کابل ہو گیا۔ میں وہاں پہنچا تو سردار داؤد سوویت یونین کی مدد سے ظاہر شاہ کو جلاوطن کر کے خود صدرِ مملکت بن چکا تھا۔ ملک میں سوویت اثر و رسوخ بڑھ رہا تھا چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد سردار داؤد قتل ہو گیا اور کمیونسٹ حکومت افغانستان کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی اور تمام داخلی اور خارجی امور ماسکو کی ہدایات کے تحت سرانجام پانے لگے۔

میں ۱۹۷۴ء میں سیکنڈ سیکرٹری تھا۔ ایک روز حسبِ معمول دفتری کام میں مصروف تھا کہ سوویت ایمبیسی سے ایک فون کال موصول ہوئی جس کے مطابق ان کا سیکنڈ سیکرٹری مجھ سے ملاقات کا خواہشمند تھا۔ میں نے فوراً اپنے منسٹر کو اطلاع دی اور ان کی اجازت سے اگلے روز اسے اپنے دفتر بلا لیا۔ چند منٹوں کی رسمی گفتگو کے بعد سیاسی امور پر بات چیت شروع ہو گئی۔ اس نے کہا کہ پاک افغان سرحدی امور ہمیشہ مشکلات سے دوچار رہے

ہیں اور یہ کہ پشتون قبائل سرحد کے دونوں طرف آباد ہیں لہٰذا جب حکومتوں کے درمیان چپقلش بڑھنے لگتی ہے تو ان کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے حتّٰی کہ وہ آٹا، گھی، نمک اور چائے تک کو ترسنے لگتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ یہ بات عمومی طور پر درست ہے لیکن کاروبار کسی صورت نہیں رکتا۔ پاوندے آتے جاتے رہتے ہیں۔ قبائل بھی اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں اور تجارت بہت حد تک معمول کے مطابق جاری و ساری رہتی ہے۔ روسی سفارت کار نے کہا کہ ان کی رائے میں ان مسائل اور مشکلات کی سب سے بڑی وجہ ڈیورنڈ لائن ہے جو طاقتور برطانوی حکومت نے افغانستان کے کمزور اور لالچی امیر کے ساتھ ساز باز کر کے بنا دی تھی۔ میں نے کہا کہ ۱۸۹۳ء میں افغانستان کمزور نہیں تھا بلکہ اینگلو انڈین وارز میں انگریزوں کو شکست دے چکا تھا۔ ہاں! امیر کے لالچی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ پیسہ لے لیتا تھا اور وعدہ کرتا تھا کہ روس اور برطانیہ کے درمیان توازن رکھے گا۔ روسی سفارت کار نے جلالی انداز میں فرمایا کہ گڑے مردے اکھاڑنے کا کچھ فائدہ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن نے افغانوں کے کلچر اور تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے لہٰذا انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسے دوبارہ کھینچنے کی ضرورت ہے۔

اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یہ ایک بے حد اہم اور نازک معاملہ ہے چنانچہ میں نے اسی وقت ایک تفصیلی نوٹ لکھ کر منسٹر کو پیش کر دیا۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ منسٹر نے مجھے بلایا اور میرے نوٹ پر گفتگو کی اور پھر مجھے ساتھ لے کر سفیر کے پاس چلے گئے۔ سفیر نے یہ نوٹ پڑھا اور کچھ گفتگو کے بعد فیصلہ ہوا کہ ہمارے منسٹر سوویت ایمبیسی کے منسٹر کے پاس جا کر یہ نقطہ اٹھائیں اور انہیں بتائیں کہ ڈیورنڈ لائن تو اسّی سال سے دو ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ بین الاقوامی سرحد ہے۔ افغان حکومت نے تو کبھی اس طرح کی بات نہیں کی، سوویت حکومت کیوں اس معاملہ میں ٹانگ اڑا رہی ہے۔

اگلے روز منسٹر مجھے ساتھ لے کر سوویت سفارت خانہ کے منسٹر سے بات چیت کے لیے سوویت ایمبیسی پہنچے۔ وہاں وہی ساری باتیں دہرائی گئیں جو سوویت سیکنڈ سیکرٹری نے مجھ سے کہی تھیں۔ لُب لُباب یہ تھا کہ ڈِیورنڈ لائن مصنوعی ہے اور اس میں ردوبدل ہونا چاہئے۔ سوویت ایمبیسی نے ہماری خوب مہمان نوازی کی۔ کیسپیئن کی کاویار، چارکول پر بُھنے ہوئے آلو، سینڈوِچز، واڈکا اور فرنچ شرابیں...... غرض وہاں کیا کچھ نہیں تھا لیکن موضوعِ زیرِ بحث نے پورے ماحول کو پراگندہ کر رکھا تھا۔

منسٹر نے واپسی پر سفیر کو ساری روئیداد سنائی اور خدشہ ظاہر کیا کہ شاید روسی پالیسی میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے یا کوئی نئی گریٹ گیم شروع ہونے والی ہے۔ ہم اس بدلتی ہوئی صورتِ حال سے پریشان تو تھے لیکن عملاً کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ طے یہ پایا کہ ہمارے سفیر سوویت سفیر سے مل کر ان امور کی وضاحت طلب کریں گے چنانچہ میٹنگ ہوئی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ بہ الفاظِ دیگر سوویت سیکنڈ سیکرٹری نے جو بات ڈیورنڈ لائن کے متعلق مجھ سے کی تھی سفیر نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ ہمارے سفیر نے فوراً ایک ٹیلیگرام وزیرِاعظم کو بھجوائی جس کا جواب آیا کہ وہ کوسیجن کے ساتھ ملاقات میں یہ مسئلہ اٹھائیں گے۔ اللہ کا شکر

ہے بعد میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے یہ معاملہ اپنی طبعی موت مر گیا۔

جن ممالک میں رشید کی تقرری بطور سفیر رہی ان میں رومانیہ بھی شامل ہے۔ قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ رومانیہ مشرقی یورپ میں واقع ہے اور لمبے عرصے تک یہاں پر اشتراکی نظام رائج رہا۔ رومانیہ پاکستان کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کے صدر نکولائی چاؤ شسکو کئی بار پاکستان کے سرکاری دوروں پر تشریف لاتے رہے تھے۔ اسلام آباد میں شکر پڑیاں پارک پر ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا ایک پودا آج بھی لہلہا رہا ہے اگرچہ انہیں خود آسودۂ خاک ہوئے نہ جانے کتنے برس بیت چکے ہیں۔

رشید بتایا کرتے ہیں: جب میرا تقرر رومانیہ میں ہوا تو چاؤ شسکو ہی اس ملک کے سربراہ تھے۔ پھر وہ اپنے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: وہ دیکھیں۔ میں انہیں اپنے کاغذاتِ تقرر پیش کر رہا ہوں۔ رشید کی رومانیہ میں موجودگی کے دوران ہی وہ انقلابِ عظیم برپا ہوا جس نے چاؤ شسکو کی کھڑی کی ہوئی عمارت کو لمحوں میں دھڑام سے نیچے گرا دیا۔

ہمارے یہ دوست اکثر کہا کرتے ہیں کہ وہ دن قیامت سے کم نہ تھے۔ ملک کا دارالحکومت، بخارسٹ ایک ایسی افراتفری اور بربریت کی لپیٹ میں تھا جس میں سے ہم لوگوں کے زندہ بچ نکلنے کے امکانات معدوم سے معدوم تر ہوتے جا رہے تھے لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کو ہماری حالتِ زار پر رحم آ گیا اور ہم موت کے منہ سے واپس آ گئے۔

اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رشید کہا کرتے ہیں: سوویت یونین کے زوال کے ساتھ دیوارِ برلن بھی گر گئی اور سوویت یونین ٹوٹنے لگا۔ وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کی ریاستیں سوویت دائرہ اثر سے آزاد ہونے لگیں۔ رومانیہ میں بھی نکولائی چاؤ شسکو کی سیکیورٹی فورس اور نیشنل آرمی میں خانہ جنگی شروع ہو گئی چنانچہ کراس فائر کے نتیجے میں ہمارے گھر کی دیواروں پر بھی گولیاں پیوست ہونے لگیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تو محفوظ رکھا لیکن دہشت گرد برطانوی سفیر کے گھر کے تہہ خانے میں داخل ہو گئے۔ لاقانونیت کی اس صورتِ حال سے سب ہی لوگ پریشان تھے خاص طور پر تیسری دنیا کے سفارت کار اور ان کے اہل و عیال۔ اگر کوئی پریشان نہ تھا تو بڑی طاقتوں مثلاً امریکہ، روس اور فرانس کے سفارت کار۔ خبریں مل رہی تھیں کہ کئی یورپی ملکوں کے جہاز بخارسٹ ایئرپورٹ پر اتر کر اپنے سفارت کاروں کو واپس لے جا رہے ہیں۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ خانہ جنگی میں انخلا ایک خاص طریق سے کیا جاتا ہے۔ ہمسایہ ملک بڑے بڑے کانوائز کے ذریعہ اپنے لوگوں کو بحفاظت نکال لیتے ہیں لیکن سفارت کاروں کو ملک چھوڑنے سے پہلے اپنی اپنی حکومتوں سے اجازت لینا پڑتی ہے۔

ہماری ایمبیسی میں ان دنوں صرف دو افسر ہوتے تھے جن میں ایک تو میں خود تھا جب کہ دوسری ایک خاتون فرسٹ سیکرٹری تھیں۔ مختصر سا سفارتی عملہ ان کے علاوہ تھا۔ مل ملا کر کُل بائیس افراد بنتے تھے جن کی مجھے بہت فکر تھی۔ میں نے سوچا کہ ہم واپس پاکستان چلے جاتے ہیں چنانچہ میں نے اپنے فارن آفس کو تار دی اور فون پر بھی گزارش کی کہ ہمیں بخارسٹ چھوڑنے کی اجازت دے دی جائے۔ چند گھنٹوں کے اندر جواب آ گیا

کہ وزیراعظم کے دفتر سے اجازت مل گئی ہے اور ہم لوگ واپس آ سکتے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ بائیس افراد کو وہاں سے نکالا کیسے جائے؟ ہمارے پاس سفیر کی گاڑی کے علاوہ اور کوئی موٹر وہیکل نہیں تھی۔ اگر میں امریکن سفیر سے مدد مانگتا تو ہوسکتا ہے وہ ذاتی مراسم کی بنا پر مجھے اور میرے بیوی بچوں کو کسی یورپین ملک میں ڈمپ کر دیتے۔ روس سے کہتا تو وہ شاید ایک ٹرک دے دیتے جو ہمیں ماسکو کے قریب چھوڑ دیتا اور ہم برف باری میں دب کر مر جاتے۔ فارن ایئرلائنز اپنے اپنے لوگوں کو لے جانے میں مصروف تھیں۔ ایک ایئرلائن لے جانے پر راضی تو ہوئی لیکن پورا جہاز چارٹر کروانا پڑ رہا تھا جس کے لیے سفارت خانے کے پاس رقم نہ تھی۔ توقع کے عین مطابق وزارت خارجہ سے پیغام آ گیا کہ سفارت خانہ کے ''بجٹ'' کو استعمال کر لیا جائے لیکن اس معمولی رقم سے چند ہفتوں کا راشن تو خریدا جا سکتا تھا، ملک چھوڑنے کے انتظامات نہ کیے جا سکتے تھے۔

ہم اسی بے بسی کے عالم میں تھے کہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ء کی شام رومانین ٹی وی نے چاؤ شسکو اور اس کی بیوی کا ملٹری ٹرائل دکھایا جس کے جلد ہی بعد فائرنگ سکواڈ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ یوں لڑائی جھگڑا ختم ہو گیا اور عوام فتح کا جشن منانے کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے۔ تب کہیں ہماری جان میں بھی جان آئی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ خانہ جنگی، علاقائی جنگوں، قدرتی آفات یا سِول وار کی صورت میں چھوٹے ملکوں کے سفارت کار بھیک اور اشرافیہ کے صدقات پر ہی اکتفا کر سکتے ہیں۔

یوں تو چوہدری رشید احمد کی آپ بیتی سننے سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ معاملہ کسی اور وقت پر مؤخر کرتے ہوئے اب کچھ ذکر اعجاز الحق قریشی کا جو مجھ سے تین سال سینئر تھے لیکن ان سے میری جان پہچان کا سلسلہ اسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ وہ بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانات میں بالعموم کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کیا کرتے تھے لہٰذا ان کی شہرت پورے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد ان کا تقرر اسی کالج میں لیکچرر کے طور پر تھا تاہم انہوں نے پراونشل سِول سروس (ایگزیکٹو) کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی پر ان کا تقرر بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، جھنگ ہو گیا۔ اُس زمانے کے ہر پڑھے لکھے نوجوان کی طرح وہ سنٹرل سُپیریئر سروسز آف پاکستان ایگزامینیشن میں بھی شامل ہوئے اور پاکستان ملٹری لینڈز اینڈ کنٹونمنٹس سروس کے لیے منتخب ہوئے۔ انہوں نے تقریباً پینتیس سال اس محکمے میں ملازمت کی اور بطور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کئی سال تک چکلالہ سکیم تھری، راولپنڈی میں مقیم رہے لیکن کچھ عرصے سے انگلستان منتقل ہو چکے ہیں۔

وہ میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ جتنا عرصہ پاکستان میں رہے ان سے گاہے بگاہے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی اور ہمارے پسندیدہ موضوعاتِ گفتگو میں سے ایک تعلیم الاسلام کالج میں گزرا ہوا وقت بھی تھا۔ وہ اکثر اس بات کا ذکر کیا کرتے ہیں کہ کالج میں پڑھائی اور ڈسپلن بہت سخت لیکن ماحول بہت سادہ تھا۔ ابتداءً طلبہ کے لیے کوئی یونیفارم مقرر نہ تھی لیکن بعد میں جب حکومتی احکامات کے تحت یونیفارم مقرر کرنا ضروری ہو گیا تو بجائے پینٹ اور بلیزر کے جو مقابلتاً مہنگا تیار ہوتا آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرز پر طلبہ کے لیے سیاہ گاؤن لازم کر دیا گیا۔ یہ گاؤن پروفیسرز کے گاؤن سے چھوٹا ہوتا تھا جس کے بازو آدھے اور لمبائی گھٹنوں تک تھی۔ گاؤن کے

ساتھ سیاہ رنگ کی جناح کیپ بھی لازمی قرار دی گئی۔ اعجاز الحق میرے اس تاثر کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ کالج کے پروفیسر صاحبان نہایت سادہ طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ اکثر پیدل یا سائیکلوں پر کالج آتے جاتے تھے اور ان میں سے بہت سے واقفِ زندگی تھے۔ ان کی تنخواہ کم تھی مگر اس کے باوجود وہ بڑی محنت اور لگن سے پڑھاتے۔

موصوف بتاتے ہیں: ہمیں فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر میں انگلش ایک دُبلے پتلے لیکچرر پڑھاتے تھے جن کا اصل نام تو چوہدری لطیف تھا مگر طلبہ انہیں ان کے عرف ''بھنڈی صاحب'' سے پکارتے تھے۔ وہ کیمسٹری تھیٹر میں کلاس لیتے جس میں تقریباً ایک سو طلبہ ہوا کرتے تھے مگر اتنا اچھا پڑھاتے کہ سب کچھ ساتھ ہی ساتھ ازبر ہوتا چلا جاتا۔ تھرڈ ایئر میں ہمیں مرزا خورشید احمد پڑھانے لگے۔ وہ جس انداز میں نظم ونثر کی تشریح کرتے وہ کچھ اُن ہی کا حصہ تھا۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی نے انگلش کا سابقہ نصاب تبدیل کر کے ماڈرن انگلش کی نظم ونثر اور فنکشنل انگلش کی کتابیں کورس میں شامل کی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک کتاب ''لِونگ انگلش سٹرکچر'' کے نام سے لگائی گئی تھی۔ انہوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ''آکسفورڈ ایڈوانسڈ لَرنَرز ڈِکشنری'' خریدیں اور انگریزی تلفّظ اس سے سیکھیں۔ ایک دفعہ ایک طالب علم کو لفظ ''پرِیفر'' پڑھنے کو کہا۔ اس نے اس کے آخری آر پر زور دے کر پڑھا تو وہ سخت برہم ہوئے اور پوچھا کہ اس کے پاس کون سی ڈکشنری ہے۔ اس نے پاکستان میں چھپی ہوئی کسی ڈکشنری کا نام لیا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے ''اس ڈکشنری کو تندور میں پھینک دو۔ میں نے تو تمہیں دوسری ڈکشنری خریدنے کو کہا تھا۔''

کالج میں دینیات کی کلاسز کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اعجاز بتایا کرتے ہیں: سیکنڈ ایئر میں مولانا ابوالعطا جالندھری ہمیں دینیات پڑھانے لگے۔ وہ دینی علوم کا بحرِ ذخّار اور بہت اچھے مقرر تھے۔ سورۃ آل عمران کے شروع میں غزوۂ احد کا ذکر آیا تو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ رؤیا جو حضورؐ نے جنگ سے پہلے دیکھی تھی سنائی اور بتایا کہ کس طرح وہ حرف بحرف پوری ہوئی اور آپؐ کی صداقت ثابت ہوئی۔ پھر کلاس سے کہا کہ وہ اس رؤیا کی روشنی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر مضمون لکھ کر لائیں۔ صرف تین چار طلبہ نے ہی یہ مضمون لکھا جس میں میں بھی شامل تھا۔ آپ نے میرے مضمون کو اول قرار دیا۔ چونکہ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ جس کا مضمون بہترین ہوگا اسے ایک روپیہ انعام دیا جائے گا اور اس کا مضمون روزنامہ ''الفضل'' میں چھپوایا جائے گا اس لیے مجھے بطور انعام ایک روپے کا سکہ دیا اور چند روز بعد میرا یہ مضمون الفضل میں بھی شائع ہو گیا۔

صوفی بشارت الرحمٰن کے ذکر پر اعجاز الحق کہتے ہیں: صوفی صاحب ہمیں عربی پڑھاتے تھے اور کیا ہی اچھا پڑھاتے تھے۔ عربی کی کتب قَطفُ الْاَذْھار اور جَوَاہِرُ الْبُحُوْر میں اعراب نہیں ہوتے تھے چنانچہ انہیں پڑھنے کے لیے عربی گرامر سے پوری واقفیت ضروری تھی۔ صوفی صاحب نے سب سے پہلے گرامر کے یہی اصول پڑھائے۔ موصوف ایک علمی شخصیت تھے۔ ان کے مضامین اکثر الفضل میں چھپتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے کالج کے پراکٹر گویا محتسب بھی تھے اور طلبہ کے ڈسپلن کا بہت خیال رکھتے۔ طلبہ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک دفعہ فضلِ عمر ہوسٹل کے سالانہ فنکشن میں ایک ٹیبلو میں ایک طالب علم سویا ہوا دکھایا گیا۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اُٹھا اور دیگر طلبہ

کے پوچھنے پر کہ کیا ہوا ہے بتایا کہ خواب میں صوفی صاحب نے اسے بغیر ٹوپی کے دیکھ لیا تھا۔

چوتھے سال ایک اور لیکچرر، چوہدری سلطان اکبر ہمیں عربی پڑھانے لگے۔ اَذْھَارُ الْاَدَبْ نامی ایک کتاب ہوا کرتی تھی۔ اس کتاب میں عباسی دور کے مشہور شاعر المتنبّی کا ایک مرثیہ جو اس کے کسی نام لیوا نے لکھا تھا بھی شامل تھا۔ اس مرثیہ کا پہلا مشہور شعر یہ تھا:

فُجعَ الْقَرَیْضُ بِخَاتَمِ الشُّعَرَاءِ
وَ غَدِیْرِ رَوْضَتِھَا حَبِیْبِ الطَّائِی

یعنی خاتم الشعرا کی وفات سے شاعری کو شدید نقصان پہنچا ہے کیونکہ حبیب بن اوس الطائی المتنبّی شاعری کے چمن کا حوض یعنی منبع تھا۔ سلطان اکبر نے ہمیں سمجھایا کہ اس شعر میں خاتم الشعرا سے مراد نہایت ہی اعلیٰ درجے کا شاعر ہے ورنہ اس کے بعد تو عربی کے کئی شاعر ہوئے۔ خاتم النبیین کی تفسیر کرتے ہوئے اکثر اس شعر کا حوالہ دیا جاتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ عربی میں خاتَم کا لفظ سب سے اعلیٰ درجہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ان دنوں ٹی آئی کالج کی پورے پنجاب میں بہت شہرت تھی اور دوسرے شہروں سے بھی طلبہ داخل ہونے کے لیے یہاں آتے تھے۔ اعجاز کہتے ہیں: اللہ کے فضل سے میرا شمار کالج کے محنتی اور ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ میں ایف اے کے امتحان میں بورڈ میں دوم آیا تھا جب کہ اسی سال میرے ایک کلاس فیلو، حمید احمد خاں نے پری میڈیکل گروپ میں اول پوزیشن حاصل کی اور ہم دونوں کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اسی طرح میں نے ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے بی اے سالِ اول اور اس سے اگلے سال، سالِ دوم کے امتحان میں یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

اعجاز الحق کہتے ہیں: غالباً ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ایک دن میں کالج سے چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے پرنسپل صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اپنی کوٹھی کے گیٹ پر کسی شخص سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس شخص نے عینک لگا رکھی تھی اور مونچھیں قدرے لمبی تھیں۔ پرنسپل صاحب غالباً اُسے الوداع کہنے کے لیے باہر کھڑے تھے۔ آپ نے مجھے بلایا اور کہا ''اعجاز! ان سے ملو۔ یہ پروفیسر عبدالسّلام ہیں۔'' میں تو انہیں جانتا بھی نہ تھا لیکن پرنسپل صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ ہمارے کالج کا ممتاز اور ذہین سٹوڈنٹ ہے، ہر سال بورڈ اور یونیورسٹی میں فرسٹ پوزیشن لیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسّلام یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگے کہ آئندہ بھی ایسے ہی پوزیشن لیتے رہنا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ ۱۹۶۳ء میں ٹی آئی کالج سٹوڈنٹ کے طور پر میں نے بی اے (آنرز اِن ہسٹری) کے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ایک پروفیسر، ڈاکٹر عباس نے جب روزنامہ پاکستان ٹائمز میں میرا فوٹو دیکھا اور پڑھا کہ یہ لڑکا بی اے (آنرز اِن ہسٹری) میں ٹی آئی کالج سے یونیورسٹی میں اول آیا ہے تو مجھے بلا کر کہا: میں حیران ہوں کہ گورنمنٹ کالج لاہور، اسلامیہ کالج لاہور یا شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی کا کوئی طالب علم اول پوزیشن نہ لے سکا بلکہ بیرونی کالج کے ایک طالب علم نے یہ پوزیشن حاصل کی ہے۔ یاد رہے کہ

میں اس وقت شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کے آخری سال میں تھا اور ڈاکٹر عباس کا سٹوڈنٹ تھا۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دی۔ یوں ہمارے کالج کو اللہ تعالیٰ نے مزید شہرت بخشی۔

بعد میں اعجاز الحق نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر لیا اور ۱۹۸۸ء میں اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور کے ایل ایل بی کے امتحان میں اول پوزیشن لے کر گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔

اس زمانے میں یہ کالج غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے بھی بہت مشہور تھا۔ پاکستان کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور اہم شخصیات کو کالج میں مدعو کیا جاتا جو طلبہ سے خطاب کرتے۔ اعجاز بتاتے ہیں: مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ علّامہ علاؤ الدین صدیقی، صدر شعبہ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی نے ''بانیٔ اسلام کا اُسوۂ حسنہ اور عملی کردار'' کے موضوع پر اور ڈاکٹر عبدالحمید صدر، شعبہ تاریخ، گورنمنٹ کالج، لاہور نے "Genesis of Pakistan" کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ ایک دفعہ بھارت سے آئے ہوئے مشہور ادیب اور اخبار ''ریاست'' کے مدیر، سردار دیوان سنگھ مفتون نے ہمارے کالج کے کیمسٹری تھیٹر میں طلبہ سے ''بھارت میں اردو کا مستقبل'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس کے علاوہ کالج کی سالانہ کانووکیشنوں پر مشاہیر کو بطور چیف گیسٹ بلایا جاتا۔ ان میں ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد کا پُرمغز خطاب مجھے ابھی تک یاد ہے جس کا پہلا فقرہ یوں تھا ''ایک تھکے ہارے مسافر نے نخلستانِ ادب میں ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ باغباں نے اس کے کندھوں پر بارِ گراں رکھ دیا۔'' یاد رہے کہ نخلستانِ ادب سے مراد ہمارا کالج تھا اور باغباں سے مراد پرنسپل صاحب تھے۔ ایم آر کیانی، چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ بھی یہاں تشریف لائے اور طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ عملی زندگی کے سمندر میں بھی اسی طرح محنت اور تندہی سے چپّو چلائیں جس طرح ان کے کالج کی ٹیم ہر سال کشتی رانی کے مقابلہ میں بڑی تندہی سے کشتی کے چپّو چلا کر اول پوزیشن حاصل کرتی ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان بھی ہمارے کالج آئے۔ یوں مشہور شخصیات سے طلبہ کا تعارف بھی ہوتا رہتا اور کالج کو بھی شہرت ملتی اور ضمناً ان کا جماعت احمدیہ اور اس کے مرکز سے تعارف بھی ہو جاتا۔

ہر سال کالج میں مشاعرے کا انعقاد ہوتا جس میں مشہور شعراء شرکت کرتے۔ ایک دفعہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم بھی تشریف لائے اور اپنی مشہور غزل پڑھی جس کا مطلع ہے:

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق، دِل کی وہی تنہائی

طلبہ کو جمہوری طرزِ انتخاب سے متعارف کروانے کے لیے کالج میں سٹوڈنٹ یونین کے عہدیداران یعنی صدر اور سیکرٹری کا انتخاب ان کے اپنے ووٹ سے ہوتا۔ اس کے علاوہ مختلف مضامین کی سوسائٹیاں بھی ہوتی تھیں جن کے صدر، سیکرٹری اور باقی عہدیداران کا انتخاب طلبہ خود کرتے۔

میں پہلے ''المنار'' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر اور بعد میں ایڈیٹر اِن چیف بھی رہا۔ طلبہ کے مضامین کچھ خود درست کرتا اور پھر چوہدری حمید احمد جو اس کے انگریزی حصے کے نگران تھے، سے ٹھیک کرواتا۔ اُس زمانے میں اس رسالہ

کے اردو سیکشن کے مُدیرِ اعلیٰ پہلے میرے کلاس فیلو ارشد ترمذی اور پھر عطاء المجیب راشد رہے۔

مجھے اکتوبر ۱۹۶۴ء سے مارچ ۱۹۶۷ء تک اسی کالج میں بطور لیکچرر انگلش و ہسٹری پڑھانے کا موقع بھی ملا۔ میری بطور لیکچرر انگلش کالج ہذا میں تقرّری کا واقعہ دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ ان دنوں کالج میں انگلش کے لیکچرر کی ایک اسامی خالی تھی اور پرنسپل صاحب انگلش کے لیکچرر کے لیے ایم اے انگلش کی ڈگری رکھنے والے درخواست دہندگان کا انٹرویو لے چکے تھے۔ میں ایک دن آپ سے ملنے گیا اور درخواست کی کہ مجھے بطور لیکچرر ہسٹری کالج میں جگہ دے دیں۔ فرمانے لگے کہ ابھی ہسٹری کے لیکچرر کا تقرر تو نہیں کرنا۔ پھر خود ہی جنید ہاشمی کو بلایا اور کہنے لگے: ''اعجاز کی بطور لیکچرر اِن انگلش تقرری کا لیٹر بنا کر لے آئیں۔'' وہ حیرانی سے بولے کہ اس نے تو ہسٹری میں ایم اے کیا ہوا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: ''آپ دو تین روز مجھ سے ایم اے تھرڈ ڈویژن والوں کے انٹرویو کرواتے رہے ہیں۔ اعجاز ان سب سے اچھی انگلش پڑھائے گا۔'' یوں میری تقرری بطور لیکچرر اِن انگلش ہو گئی چنانچہ میں نے دو تین سال ایف اے کے طلبہ کو انگلش پڑھائی۔ مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو بھی انگریزی پڑھانے کی سعادت حاصل ہے۔ دو سال بعد میں انگلش کے علاوہ ہسٹری بھی پڑھانے لگا۔

۱۹۶۵ء میں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد خلیفۃ المسیح الثّالث منتخب ہو گئے تو پروفیسر قاضی محمد اسلم کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ بہت بڑے عالم اور نہایت ہی مشفق اور مخلص انسان تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہماری جماعت کے ذہین نوجوانوں کو پاکستان کی اعلیٰ سروسز کے مقابلہ کے امتحانات میں حصہ لے کر گورنمنٹ میں جانا چاہئے چنانچہ میں نے ان کے مشورے پر عمل کر کے پہلے مغربی پاکستان کی پراونشل سول سروس (ایگزیکٹو) کا امتحان دیا۔ بعد میں سنٹرل سپیریئر سروس آف پاکستان کا امتحان بھی دیا اور خدا کے فضل سے دونوں میں کامیاب بھی ہوا۔

تعلیم الاسلام کالج کے اس ہونہار طالبِ علم کے ذکرِ خیر کے بعد اب آپ کا تعارف ایک اور اولڈ سٹوڈنٹ سے کرایا جا رہا ہے جو آج کل لیفٹیننٹ کرنل (ر) نصیر الحق کے طور پر پہچانے جاتے ہیں اور کرنل (ر) ظہیر الحق خاں کے صاحبزادے ہیں۔ وہ آج کل عسکری اِلیون، لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۸ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا اور ایف اے کرنے کے بعد ایئر فورس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کا انتخاب بطور جنرل ڈیوٹی پائلٹ ہوا تاہم بعد میں بعض ٹیکنیکل وجوہات کی بنا پر انہیں گراؤنڈ کر دیا گیا اور اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو ایئر فورس کی ملازمت جاری رکھیں اور چاہیں تو آرمی میں چلے جائیں۔ انہوں نے اپنے لیے دوسرا آپشن پسند کیا تاہم جب معاملہ جی ایچ کیو میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کی عمر فوج کے لیے عمر کی زیادہ سے زیادہ حد سے آٹھ ماہ متجاوز ہے لہٰذا انہیں فوج میں نہیں لیا جا سکتا۔ وہ بتاتے ہیں: میں نے اس حوالے سے بہت تگ و دو کی اور اس وقت کے کمانڈر انچیف، جنرل موسیٰ تک سے جا کر ملا۔ انہوں نے میری بات توجہ سے سنی تاہم یہ کہہ کر کہ ''رُولز آر رُولز'' میری مدد سے انکار کر دیا۔ معاملہ دوبارہ ایئر فورس کی طرف رَیفر ہوا تو ایئر چیف، ایئر مارشل اصغر خان نے انہیں عمر میں چھ ماہ کی رعایت دے دی تاہم فوج کا

اعتراض پھر بھی اپنی جگہ قائم رہا۔ جنرل رفیع جو اس زمانے میں صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری تھے نصیر کے والدِ بزرگوار کے جونیئر تھے اور اپنے دل میں ان کے لیے بہت عزت رکھتے تھے۔ انہوں نے نصیر کو مشورہ دیا کہ وہ صدر ایوب سے ملاقات کریں اور اس کا طریقہ یہ سمجھایا کہ جب وہ گاف کھیلنے کے لیے سرکٹ ہاؤس کے سامنے سے گزریں تو نصیر اچانک ان کی گاڑی کے سامنے آ کھڑے ہوں۔ گاڑی رک جائے گی اور وہ پوچھیں گے کہ کیا مسئلہ ہے تو نصیر انہیں پوری بات بتا دیں۔ نصیر کہتے ہیں: میں نے ایسے ہی کیا۔ میں سرکٹ ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہوا لیکن پولیس والے مجھے وہاں کھڑا نہ ہونے دے رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا: بیشک چیک کر لو۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ میں تو صرف صدر کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں ایک ڈرم پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا: اچھا! تم اس کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ میں وہاں جا کھڑا ہوا لیکن جب صدر کی سواری آتے دیکھی تو چھلانگ مار کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گاڑی رک گئی۔ صدر ایوب نے اپنا شیشہ نیچے سرکایا اور پوچھا کہ میں نے اس کی گاڑی کیوں رکوائی ہے۔ جنرل رفیع ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس نوجوان کو جانتا ہوں اور میرے والدِ بزرگوار کا نام لے کر بتایا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میرے والد فوج میں صدر ایوب سے کچھ جونیئر تھے اور صدر انہیں اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ وہ کہنے لگے: فلسطین میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ تمہارے والد کا ٹینٹ ہمارا کیفے بنا رہتا تھا۔ وہ خود تو شراب پیتے تھے نہ سگریٹ لیکن ہمارے ہاں سب چلتا تھا۔ اگلے روز میری فائل پریذیڈنٹ ہاؤس میں منگوائی گئی اور مجھے ایئر فورس میں واپس لینے کا فیصلہ کر لیا گیا تاہم تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے میں بعد میں آرمی میں چلا گیا۔ کئی سال بعد کی بات ہے اس انسٹرکٹر کا جس کی وجہ سے مجھے ایئر فورس میں گراؤنڈ کیا گیا تھا ایک پیغام ملا۔ وہ ان دنوں بہت بیمار تھا اور اس امر پر معافی کا خواستگار کہ اس نے میرے احمدی ہونے کی وجہ سے مجھے گراؤنڈ کرایا تھا۔

نصیر فوج سے بطور لیفٹیننٹ کرنل ریٹائر ہوئے اور تب سے پرائیویٹ سیکٹر میں ملازمت کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ اور اس دور میں فوج میں شمولیت اختیار کرنے والے بہت سے احمدی افسران بوجوہ کسی ایسے عہدے تک نہیں پہنچ پائے جسے اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے بہت اہم سمجھا جا سکے تاہم وہ ان قابلِ فخر احمدیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے کئی ماہ و سال دفاعِ وطن کے لیے قربان کر دیئے اور جن میں سے بعض وطن کے ساتھ وابستگی ہی کی وجہ سے لمبا عرصہ ہندوستانی جیلوں میں سڑتے رہے۔ پاکستان کی آن اور شان کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے بہت سے احمدیوں کے ساتھ نصیر اور ان کے احمدی فوجی رفقائے کار کا نام بھی جماعت اور ملک کی تاریخ میں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔

تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے دنوں کی بات ہو تو نصیر بتاتے ہیں: کالج میں تعلیم کے دوران میرا قیام فضل عمر ہوسٹل میں تھا۔ ہوسٹل کی چھت پر دو کمرے ہوتے تھے۔ ہر کمرے میں چار چار لڑکے تھے۔ میں جس کمرے میں تھا اس میں عاشق سکھیرا، صدیق سندھو اور حنیف بھی مقیم تھے۔ یہ تینوں لڑکے روئنگ ٹیم کے ممبر تھے۔ شاید ان کی صحبت کا اثر تھا یا میرا اپنا شوق کہ میں بھی روئنگ ٹیم میں شامل ہو گیا۔ روئنگ ٹیم کے رکن کے طور پر ہم

صبح منہ اندھیرے اٹھتے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد سائیکلیں پکڑ کر سیدھے دریائے چناب پر پہنچ جاتے اور کم و بیش ایک گھنٹہ پورے زور و شور سے روئنگ کرتے۔ واپس آ کر ٹک شاپ جاتے اور ناشتہ کرتے۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے ٹک شاپ والے یوسف خان کو ہدایت دے رکھی تھی کہ ہماری ہر فرمائش پوری کی جائے لیکن اپنے طور پر آپ نے ہمارے لیے سویابین کا حلوہ تیار کرا رکھا تھا۔ ہم جتنا چاہتے یہ حلوہ کھا سکتے تھے۔ ہمارے لیے دودھ بھی بہ افراط موجود ہوتا تھا۔ کچھ لڑکے دودھ کے بہت شوقین تھے۔ وہ غٹا غٹ دودھ ہی پیتے چلے جاتے لیکن اگر کسی وقت ہمارا دودھ پینے کو جی نہ چاہتا تو ہم اس کے بدلے یوسف خان سے کیک لے لیتے تھے۔ مالٹوں کے موسم میں ہمارے لیے کثیر مقدار میں مالٹے منگوائے جاتے تھے۔ ہم میں سے بعض لڑکے ایک وقت میں بارہ بارہ مالٹے کھا لیتے تھے۔ جب کالج کی طرف سے ہمارا اتنا خیال رکھا جاتا تھا تو ہم بھی کالج کے نام پر اپنی جان لڑانے کے لیے تیار رہتے۔

وہ کہتے ہیں: یہ کھیل کھلاڑیوں کی ہمہ وقت توجہ کا طلبگار تھا لہٰذا یہ کھلاڑی پڑھائی میں بس ایسے ہی تھے۔ ٹورنامنٹ سے پندرہ بیس دن قبل ہماری ٹیم لاہور چلی جاتی۔ چوہدری محمد علی ساتھ ہوتے تھے۔ ہمارا قیام بالعموم جودھامل بلڈنگ میں ہوتا۔ ہم صبح کا ناشتہ گوالمنڈی میں کرتے اور پھر بس پر سوار ہو کر سیدھا دریائے راوی پہنچ جاتے۔ وقفوں وقفوں سے دن کا بیشتر حصہ پریکٹس میں گزر جاتا جس کے بعد ہم شام کو واپس آ جاتے۔ تھکے ہارے ہوتے تھے اس لیے نیند بھی خوب آتی۔

نصیر کو ابھی تک یاد ہے کہ فضل عمر ہوسٹل میں قیام کے دوران وہ ایک بار پڑھائی کے ارادہ سے کرسی پر بیٹھے تو معلوم ہوا کہ پین میں سیاہی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نیچے اترا تا کہ کسی سے دوات لے کر سیاہی بھر لوں۔ نیچے اترا ہی تھا کہ پروفیسر سعید اللہ خان جو کالج میں شماریات پڑھاتے تھے اور ہوسٹل وارڈن بھی تھے سامنے سے آ گئے۔ انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ میں پڑھائی کے وقت گپیں ہانکنے کے لیے کسی دوست کی تلاش میں ہوں مجھے سخت سست کہنا شروع کر دیا اور میری کوئی بات سنے بغیر مجھے چوہدری محمد علی کے پاس لے گئے۔ چوہدری صاحب نے ان کی بات سن کر ٹائپ رائٹر پکڑا اور ایک کاغذ ٹائپ کر کے سعید اللہ خان کو تھما دیا۔ پھر وہ اٹھے اور مجھ سے بغلگیر ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ چوہدری صاحب نے اس کاغذ پر کیا ٹائپ کیا ہے اور وہ روئے کیوں ہیں۔ صبح جب میں کالج گیا تو نوٹس بورڈ پر مجھ پر ڈسپلن کی خلاف ورزی پر سو روپیہ جرمانے کا نوٹس لگا ہوا تھا۔ اس زمانے میں سو روپیہ ایک رقم خطیر رقم تھی بلکہ ہمارے ہوسٹل کے تین سے چار ماہ کے خرچ کے برابر تھی لہٰذا میں یہ نوٹس پڑھ کر سخت پریشان ہوا۔

میں چونکہ روئنگ ٹیم کا ممبر تھا لہٰذا صاحبزادہ مرزا ناصر احمد مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے چنانچہ میں جب آپ سے ملنا چاہتا آپ کے دفتر کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ موصوف آتے اور میری جانب دیکھتے تو کچھ کہے بغیر اشارہ کرتے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے ان کے دفتر چلا جاتا۔ آپ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ فرماتے، اپنا کوٹ یا اچکن اتار کر کِلّی پر لٹکاتے اور پھر ہومیوپیتھک ادویہ کی الماری میں سے کسی شیشی کا منہ کھولتے اور مجھے اپنا

دایاں ہاتھ آگے بڑھانے کو کہتے۔ وہ اس شیشی میں سے دوا کی چند گولیاں میری ہتھیلی پر انڈیل دیتے جنہیں میں منہ میں ڈال کر چوس لیتا۔ اس روز میں پریشانی کے عالم میں آپ کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا کہ آپ تشریف لے آئے۔ شاید آپ نے میری پریشانی میرے چہرے سے بھانپ لی تھی چنانچہ مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ کیا بات ہے۔ میں نے سارا واقعہ بیان کیا اور روہانسی آواز میں کہا کہ میں یہ جرمانہ ادا نہیں کر سکتا خصوصاً جب میرا قصور بھی کوئی نہیں۔ آپ نے فوراً اپنے کلرک کو بلایا اور اسے ایک خط ٹائپ کر کے لانے کو کہا۔ آپ نے اس پر دستخط کئے اور مجھے جانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پتا چلا کہ یہ جرمانہ معافی کا نوٹس تھا۔ میں نے کرسی نوٹس بورڈ کے قریب ہی ڈال لی اور ہر آنے جانے والے لڑکے سے کہتا: یہ نوٹس پڑھو۔ وہ جواب دیتا کہ وہ جرمانہ کا نوٹس پہلے ہی پڑھ چکا ہے۔ تب میں اسے بتاتا کہ نہیں یہ جرمانے کی معافی کا نوٹس ہے، اسے پڑھو۔ ایک بڑی پریشانی سے نجات ملنے پر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی تھی اس کا بیان ممکن نہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) نصیر الحق کا ذکر بس اتنا ہی۔ اب ہم ملاقات کرتے ہیں نور محمد چانڈیہ سے جن کا تعلق ڈیرہ غازی خان کے ایک معزز خاندان سے ہے اور جو کالج میں مجھ سے غالباً دو سال سینئر تھے۔ یوں بھی وہ فضل عمر ہوسٹل میں مقیم تھے لہٰذا میری ان کے ساتھ واجبی سی جان پہچان تو تھی، بے تکلفی ہرگز نہ تھی۔ ان کی ایک ٹانگ میں کوئی خلقی نقص تھا یا یہ معذوری کسی حادثے کا نتیجہ تھی لیکن خدا تعالیٰ نے یہ کمی انہیں اچھی شکل و صورت اور زبردست قوتِ بیان و استدلال عطا کر کے پوری کر دی تھی۔ مجھے یاد ہے وہ انگریزی کے بہت اچھے ڈِبیٹر تھے، انہوں نے کئی بیرونی کالجوں میں تعلیم الاسلام کالج کی نمائندگی کی اور انعامات جیت کر لاتے رہے۔

اس زمانے کے الفضل دیکھے جائیں تو اس کے صفحات پر ان کی کامیابیوں کا ذکر جابجا ملتا ہے چنانچہ الفضل ۱۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کے مطابق انہوں نے تعلیم الاسلام کالج کے زیرِ اہتمام کُل ربوہ انگریزی مباحثہ میں قائدِ ایوان کی حیثیت میں قرارداد "Fruits of labour are sweeter than the gifts of fortune" پیش کی اور دوسرا انعام حاصل کیا۔

۶ فروری ۱۹۶۲ء کے الفضل کے مطابق انہوں نے کالج کے آٹھویں کُل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ میں بطورِ قائد حزبِ اختلاف قرارداد "Men are ruled by women" کی مخالفت کی اور چہارم قرار پائے۔

اسی اخبار کی ۶ مئی ۱۹۶۲ء کی اشاعت کے مطابق کالج یونین کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک انگریزی مباحثے میں جس میں قرارداد زیرِ بحث تھی "The rise in population is a boom for Pakistan" موصوف دوم رہے۔

الفضل ۲۳ مئی ۱۹۶۲ء کے مطابق نور محمد چانڈیہ کالج کے سالانہ انگریزی تقریری مقابلے میں دوم رہے اور سال ۶۲-۱۹۶۱ء کے لیے کالج کے انگریزی کے بہترین مقرر قرار پائے۔

۳۰ جنوری ۱۹۶۳ء کی الفضل کے مطابق وہ نشتر میڈیکل کالج، ملتان اور سنٹرل ٹریننگ کالج، بہاولپور کے انگریزی بین الکلیاتی مباحثوں میں اول رہے۔ وہ گورنمنٹ کالج، ایبٹ آباد کے مباحثہ کے پوزیشن ہولڈرز میں

بھی شامل تھے۔

بحوالہ الفضل ۱۳ مارچ ۱۹۶۳ء کالج کا نواں کُل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ ۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو منعقد ہوا۔ اس مباحثہ میں موصوف قائد حزب اختلاف تھے۔

نور محمد چانڈیہ نے تعلیم الاسلام کالج میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لا کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ الفضل ۹ مارچ ۱۹۶۵ء کی اطلاع کے مطابق انہوں نے تعلیم الاسلام کالج کے گیارہویں کل پاکستان انگریزی بین الکلیاتی مباحثہ میں لا کالج کی نمائندگی کی اور اول انعام کے مستحق قرار پائے۔

ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ اب ان کا شمار لاہور کے اچھے وکلاء میں ہوتا ہے۔ کسی وقت ان کا دفتر اس سڑک پر ہوا کرتا تھا جو میکلوڈ روڈ کو اِی پلومر بلڈنگ کے سامنے مال روڈ سے ملاتی ہے لیکن اب رِیگل سینما کے پاس شفٹ ہو چکے ہیں۔

میرے سکول کے زمانے کے کلاس فیلو اور دوست، میجر (ر) منصور گورایہ کی ان کے ساتھ دوستی تھی اور مجھے یاد ہے کہ جب ۲۰۰۳ء میں میری تبدیلی لاہور ہوئی اور منصور کو اس کی خبر ہوئی تو ایک بار وہ دونوں اکٹھے میرے دفتر میں تشریف لائے اور کچھ دیر بیٹھے اس زمانے کی باتیں کرتے رہے جب ہم سب تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم تھے۔ اس کے بعد ان سے ملاقات کا اتفاق ہی نہیں ہو سکا اگرچہ خوش قسمتی سے حال ہی میں ایک بار ان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ جلد ملاقات کا وعدہ تو کیا ہے، دیکھیں اسے پورا کرنے کا موقع کب ملتا ہے۔

نور محمد چانڈیہ کے علاوہ ان ہی کے زمانے کے ایک اور بہت اچھے ڈِبیٹر سیّد مشہود احمد تھے جو کالج میں شُودی کے نام سے معروف تھے۔ ان کی وفات پر پرویز پروازی نے ایک مضمون لکھا تھا جو اُن کی اطلاع کے مطابق ابھی تک کسی جگہ چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کا مسودہ ملاحظہ فرماتے ہوئے پرویز پروازی نے یہ مضمون مجھے بھجوا دیا جو اُن کی اجازت سے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ''ہمارے وجیہہ وشکیل ہیڈ ماسٹر، حضرت سیّد محمود اللہ شاہ کا سب سے چھوٹا صاحبزادہ، سیّد مشہود احمد جسے سب لوگ پیار سے شُودی کہا کرتے تھے کچھ عرصہ پہلے ایبٹ آباد میں راہیٔ بقا ہوا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

شُودی بھی اپنے والدِ محترم کی طرح نہایت وجیہہ وشکیل شخصیت کا مالک تھا۔ چہرے سے ذہانت پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے اور بول چال کے انداز میں ایک وقار تھا۔ جس محفل میں بھی ہوتا لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے۔ کالج میں تھا تو کالج یونین کے انگریزی مقررین میں ممتاز تھا۔ بین الکلیاتی مباحثوں میں اس نے بہت سے انعامات حاصل کئے تھے۔ بعد کی عملی زندگی میں وہ بینکاری سے متعلق رہا اور سینئر عہدوں تک پہنچا۔

اس کی والدہ، محترمہ فرخندہ اختر انگریزی کی استاد تھیں اور جامعہ نصرت ربوہ کی پرنسپل رہیں۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شروع میں سیّد محمود اللہ شاہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کے دونوں بچے چھوٹے تھے، مریم اور شُودی۔ آپ نے نہایت محنت اور استقلال سے بچوں کی پرورش کی۔ مریم ڈاکٹر بنی اور بیاہ کر انگلستان چلی گئی۔ شُودی

سکول کالج میں نمایاں طالب علم رہا۔ پڑھائی میں عام سا ہو گا، زائد از نصاب سرگرمیوں میں آگے آگے تھا۔ قبلہ سیّد محموداللہ شاہ کی بڑی اولاد میں سیّد داؤد مظفر شاہ اور سیّد مسعود مبارک شاہ تھے۔ سیّد داؤد مظفر شاہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے داماد اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے خسر ہیں۔

شُودی کا خاندانی پس منظر میں نے اس لیے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ اس کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ شُودی نے وجاہت و ذہانت اپنے ابا سے اور انتظامی صلاحیتیں اپنی امی سے حاصل کی تھیں۔ اس کے دادا کی روحانیت اس کی طبیعت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ بظاہر آزاد خیال نظر آتا تھا مگر اندر سے پکا احمدی تھا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے میرے ساتھ فون پر امریکہ سے بات ہو رہی تھی۔ کہنے لگا: ''ہمارا فلاں دوست کہتا ہے تم پیٹ سے احمدی ہو۔'' میں نے کہا ''ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ تمہارا پیٹ اسی لیے تو اتنا بڑھا ہوا ہے۔'' اس گفتگو کے کچھ دن بعد وہ پاکستان چلا گیا اور وہاں سے اس کی سناؤنی آ گئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔ دراصل اس کی شادی ہماری بہن، درِ نجف کے ساتھ ہوئی تھی اور درِ نجف کا تعلق ایک شیعہ خاندان سے تھا مگر ہماری اس بہن نے مسز شاہ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور اپنی بچیوں کی تربیت احمدی بچیوں کی حیثیت سے کی اور سب کو احمدی خاندانوں میں بیاہا۔ فجز اھا اللہ تعالیٰ۔ شُودی کا جنازہ بھی ربوہ لے جا کر پڑھا گیا اور وہیں دفن کیا گیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اُس کے گردے جواب دے گئے تھے مگر وہ ڈایالاسس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس کا ایک داماد بھی گردوں کا سپیشلسٹ ہے۔ وہ بھی اسے سمجھاتا تھا کہ یہ کوئی ایسا مشکل علاج نہیں ہے، آپ کچھ دنوں میں اس کے عادی ہو جائیں گے مگر اس کا جی نہیں ٹھکتا تھا۔ اب پاکستان گیا تھا اور اس کا خیال تھا ربوہ میں ڈاکٹر نُوری سے مشورہ کروں گا مگر مشورے سے قبل ہی اس کا وقت آ گیا۔

کالج میں شُودی کا نام انگریزی لکھنے اور بولنے والے لڑکوں میں نمایاں تھا۔ کالج کی کوئی ہی انگریزی ڈِبیٹ ایسی رہی ہو گی جس میں شُودی نے حصہ نہ لیا ہو اور کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل نہ کی ہو۔ اس وجہ سے اس کی کلاسوں میں حاضری متاثر ہوتی تھی۔ اس کا ازالہ وہ ایسے کرتا تھا کہ امتحانوں میں کبھی فیل نہیں ہوتا تھا۔ کچھ وقت اس نے ایف ایس سی میں شاید ضائع کیا تھا۔ جلد ہی اسے اور مسز شاہ کو سمجھ آ گئی کہ سائنس اس کے بس کا روگ نہیں۔ آرٹس میں وہ اچھا خاصا رواں رہا۔ ایم اے کے لیے سوشل ورک میں گیا اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ جلد ہی اسے بنک میں کام مل گیا۔ غالباً مسلم کمرشل بنک میں تھا کہ قبلہ مشتاق احمد یوسفی معاینہ کے لیے آئے۔ میں نے یوسفی صاحب کو کالج میں آنے کی دعوت دی۔ وہ کچھ متذبذب تھے۔ شُودی نے انہیں بتایا کہ کالج کی بزمِ اردو بہت بڑی ادبی تنظیم کا حکم رکھتی ہے اس لیے اس کی دعوت قبول کر لینی چاہیے۔ خیر یوسفی صاحب تشریف لائے۔ ہم نے کیمسٹری تھیٹر میں ان کے ساتھ تقریب کا اہتمام کیا۔ میں نے ان کی دونوں کتابوں ''چراغ تلے'' اور ''خاکم بدہن'' کو سامنے رکھ کر یوسفی صاحب کا تعارفیہ لکھا۔ اس تعارفیہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں میرا ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ الفاظ یوسفی صاحب ہی کے تھے جنہیں میں نے ان ہی کے اسلوب میں مرتب

کر دیا تھا۔ تقریب شروع ہوئی تو میں نے تعارفیہ پڑھا۔ یوسفی صاحب دم بخود بیٹھے سنتے رہے۔ جب ان کی باری آئی تو فرمانے لگے: میں آنے میں متذبذب تھا مگر اب سوچ رہا ہوں کہ اگر نہ آتا تو اپنے اوپر کتنا ظلم کرتا۔ میں نے اپنے ہی لفظوں میں اپنا اتنا جامع تعارف کبھی نہیں سنا۔ اس کے بعد آپ نے بڑا خوبصورت مختصر خطاب فرمایا۔ جاتے ہوئے کہنے لگے: بھائی آپ جیسے اہلِ ذوق دوست سے رابطہ رہنا چاہیے۔ مدتوں بعد میرے ایک دو عزیز شاگردوں نے مجھے لکھا کہ انہوں نے یو بی ایل میں ملازمت کی درخواست دی ہے اور ان دنوں مشتاق احمد یوسفی یو بی ایل کے صدر ہیں۔ کیا آپ ان سے سفارش کر سکتے ہیں؟ ہم نے سوچا سفارشی خط لکھ دینے میں کیا حرج ہے کام بن گیا تو بچوں کا بھلا ہو جائے گا۔ ہم نے یوسفی صاحب کو خط لکھ دیا اور اس کی نقل بچوں کو بھیج دی۔ دونوں بچوں کو ملازمت مل گئی۔ یوسفی صاحب نے اس تعلق کا اتنا لحاظ رکھا کہ بچوں کو ملازمت دینے کے بعد ہمیں جاپان خط لکھا کہ ''آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی گئی ہے'' حالانکہ ان سے ملاقات ہوئے مدت گزر چکی تھی۔ بات شُودی سے چلی تو یوسفی صاحب تک پہنچ گئی کہ ان کا کالج میں آنا شُودی کی وجہ سے ہوا تھا۔

کالج کے انگریزی مقررین میں شُودی کے ہم عصروں میں بہت سے مقررین شامل تھے جن میں عبداللہ ابوبکر اور سعید عبداللہ جیسے لوگ بھی تھے اگرچہ عبداللہ ابوبکر اور سعید عبداللہ کی اپنی ٹیم تھی۔ وہ کسی دوسرے کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتے تھے۔ صرف شُودی ایسا مقرر تھا جو اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی شامل کیا جا سکتا تھا۔ اتفاق ہے کہ ابوبکر کی دو ٹرافیوں میں شُودی کا حصہ تھا۔ ایک تو وہ معرکۃ الآرا ٹرافی جو لا کالج لاہور سے کالج نے جیتی تھی۔ معرکۃ الآرا اس لیے کہ اس مباحثہ میں امریکن قونصلیٹ کے کوئی صاحب جج تھے۔ جب ابوبکر کا نام پکارا گیا تو وہ اس کی شکل دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر کر بیٹھ گئے اور بڑی بے توجہی اور بے زاری سے تقریر کو سنا۔ اس کے باوجود ابوبکر کی تقریر اتنی اچھی تھی کہ ان کو پہلا انعام مل گیا۔ شُودی کو تیسرا۔ اس طرح ٹرافی کالج کو مل گئی۔ ابوبکر کو اس امریکن کے اس رویّہ پر بہت دکھ تھا۔ انعام لے چکنے کے بعد کھانا تھا۔ کھانے کی میز پر ابوبکر سیدھا ان صاحب کے پاس گیا اور اپنا تعارف کروایا: Hey I am Abdullah Abubakr from USA. وہ صاحب تو کھڑے ہو گئے اور پوچھا Oh! From which State? ابوبکر نے سیدھا سا جواب دیا From United States of Africa, Sir. ان صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ابوبکر نے انتقام لے لیا تھا۔ جب صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کو اس بات کی خبر پہنچی تو فرمانے لگے: یہ ضرور شُودی کی شرارت ہو گی ابوبکر تو شریف آدمی ہے (حالانکہ وہ اتنا شریف بھی نہیں تھا)

اس کی اصل ٹیم محی الدین کے ساتھ تھی جو بعد کو لیفٹیننٹ کرنل ہو کر ریٹائر ہوا اور کچھ عرصہ پہلے کینیڈا میں فوت ہوا۔ محی سانولا سلونا لڑکا تھا۔ شُودی لمبا تڑنگا اور سفید مگر دونوں ساتھ چلتے تو بہت بھلے لگتے۔ مدتوں بعد ایک بار لاہور میں میری کرنل محی الدین سے اچانک لاہور ریلوے سٹیشن پر ملاقات ہو گئی۔ وہ فوجی وردی میں تھا اور کسی کام سے سرکاری طور پر لاہور آیا تھا۔ اسے لینے کو ملٹری کی جیپ آئی ہوئی تھی۔ کہنے لگا اگر کہیں شُودی مل جاتا تو ہم بیٹھ کر کالج کی یادیں تازہ کرتے۔ وہ ملٹری کی جیپ چھوڑ کر میری گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم شُودی کے

بنک چلے گئے۔ اس روز دفتر میں اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھے تو باور آیا کہ وہ واقعی بہت بڑا افسر ہے۔ اس نے سب کام چھوڑ دیئے اور ہمیں لے کر انٹر کانٹینینٹل میں جا بیٹھا۔ کھانا وانا کھلایا۔ کئی گھنٹے تک کالج کے لوگوں کی، ڈِبیٹس کی باتیں ہوتی رہیں۔ نہ شُودی کو اپنے بنک کا خیال آیا نہ محی الدین کو اپنی ڈیوٹی کا اور باہر اس کی فوجی جیپ کھڑی اس کی راہ تکتی رہی۔ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات تھی کیونکہ اس کے بعد محی کینیڈا آ گیا۔ میرے ساتھ اس کی وفات سے قبل اس کی ملاقات ہوگئی شُودی سے نہ ہوسکی۔ امریکہ میں تھا تو شُودی کہتا تھا کینیڈا صرف محی کی قبر پر دعا کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ وہ اس کو نصیب نہ ہوئی۔ اب خدا جانے ہمیں بھی اس کی قبر پر دعا کا موقع نصیب ہوگا یا نہیں؟

ایک بار اسلام آباد میں ہمیں ایک ایسی محفل میں شامل ہونے کا موقع ملا جس میں صدرِ مملکت، وزیر اعظم اور دیگر عظماء شریک تھے۔ دور سے دیکھا کہ شُودی وزیر اعظم سے یوں باتیں کررہا ہے جیسے دونوں ساتھ کے کھیلے ہوں۔ بعد میں اس سے پوچھا: کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ کہنے لگا: میرے بنک کا صدر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا، اس نے مجھے آگے کر دیا۔ اس بات کی تصدیق بعد کو یوں بھی ہوئی کہ میرے دوست انور عزیز جو بھٹو کابینہ میں وزیر رہے تھے ایک بار شُودی کو تلاش کرتے ہوئے ربوہ آئے کہ انہیں بات اوپر اعلیٰ حکام تک پہنچانے والا درکار تھا اور شُودی ان دنوں علیل تھا۔ ربوہ میں آرام کر رہا تھا۔ شُودی نے کبھی ان تعلقات کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ کہتا تھا ہم نے اپنے ماں باپ سے یہی سیکھا ہے کہ دوسروں کے کام آؤ دوسرے تمہارے کام آئیں گے۔

مسز شاہ کو ہمیشہ یہ شکوہ رہتا تھا کہ شُودی کی دوستی اپنی عمر سے بڑے لوگوں کے ساتھ کیوں رہتی ہے۔ کالج میں بھی وہ فرسٹ ایئر میں تھا اس کے دوست سال چہارم کے سینئر لڑکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انگریزی کے ڈِبیٹر سینئر لڑکے تھے اور یونین میں تقریروں کی وجہ سے اس کا اٹھنا بیٹھنا سینئر لڑکوں میں تھا۔ ایک بار مسز شاہ مجھ سے کہنے لگیں: تمہارا اور شُودی کا کیا جوڑ ہے؟ تم اس سے عمر میں اتنے بڑے ہو۔ میں نے کہا ''مسز شاہ! درست ہے۔ میرا اور شُودی کا عمروں کا تفاوت ہے مگر شُودی ذہنی لحاظ سے میرا ہم عمر ہے اسی لیے تو ہماری بے تکلفی ہے۔ خود میرے اکثر دوست مجھ سے عمر میں بہت بڑے ہیں مگر ہم ہم عمروں جیسے بے تکلف ہیں۔ روشن دین تنویر مجھ سے تیس سال بڑے ہیں۔ نسیم سیفی میرے باپ کی عمر کے ہیں۔ پروفیسر نصیر احمد خاں بھی بہت بڑے ہیں۔ مسز شاہ زِچ آ گئیں ''بس کرو اپنا یہ فلسفہ۔ میرے شُودی کو بزرگ نہ بناؤ'' مگر شُودی اپنی عمر سے کہیں آگے تھا۔

اب آ کے اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ اس نے ساری عمر دنیاداری میں کھپا دی۔ مسز شاہ کے اٹھ جانے کے بعد وہ کہا کرتا تھا کہ میرے سر سے دعاؤں کا سائبان اٹھ گیا ہے۔ مجھے کہا کرتا تھا میرے لیے حضرت صاحب کو دعا کے لیے لکھو۔ میں کہتا تھا تم خود کیوں نہیں لکھتے؟ کہتا تھا اردو لکھنے میں حجاب ہے۔ میں نے اسے راضی کیا تھا کہ وہ واپس آ کر اپریشن سے قبل حضور کو دعا کے لیے لکھے گا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر اسے دے اور اس صاف دل اور ہمدرد انسان کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔ آمین''

شُودی کے بعد آیئے آپ کی ملاقات تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور سابق طالب علم سے کراتے ہیں جن کا نام منور احمد ہے لیکن وہ عوام الناس میں لیفٹیننٹ کرنل (ر) رانا منور احمد خان کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ضلع فیصل آباد کے رہنے والے چوہدری عبدالرحیم خان کے فرزند ہیں۔ آج کل عسکری۔۱۰، لاہور میں مقیم ہیں اور ان مخلص احمدیوں میں سے ہیں جو جماعت کے ساتھ اپنے تعلق کو باقی سب امور پر اوّلیت دیتے ہیں۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے پری میڈیکل میں داخلہ لیا تھا جس میں صرف تیرہ طالب علم تھے۔ منور کہتے ہیں: ہماری کلاس کے سبھی طلبہ ماشاء اللہ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ ان میں پروفیسر نصیر احمد خان کے چھوٹے بھائی حمید احمد خان اور منور چونڈہ جو کچھ سال پہلے تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں اول رہے تھے کے بھائی، سعید چونڈہ قابل ذکر ہیں۔ ہمارے استاد بھی بہت ہی اچھے اور قابل تھے اور اپنا کام بے حد محنت سے سرانجام دیتے۔ ان سب کے سرخیل پر خدا کی خاص عنایت تھی۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد جب اپنے دفتر سے نکلتے تو طلبہ بھاگ کر کمروں میں گھس جاتے۔ کوئی بھی آپ کے سامنے کھڑا نہ رہتا۔ یہ سب ان کی بارعب اور پروقار شخصیت کا ہی کمال تھا۔ آپ کو تقریباً ہر طالب علم کا نام بلکہ اس کی ولدیت تک یاد تھی۔

وہ کہتے ہیں: ان دنوں تعلیم الاسلام کالج کا کھیلوں میں بھی خوب نام تھا۔ اگرچہ میں خود تو کشتی رانی ٹیم کا رکن نہ تھا تاہم میرے بعض عزیز دوست اس کھیل سے وابستہ تھے لہٰذا میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کالج کی مضبوط روئنگ ٹیم کی تشکیل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور چوہدری محمد علی کی دن رات کی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔ کالج کی طرف سے ان کھلاڑیوں کے لیے صحت بخش خوراک کا وافر انتظام موجود ہوتا تھا۔ انہیں دودھ، سویابین اور بادام مہیا کئے جاتے اور مالٹے کے موسم میں ان کے سامنے اس پھل کے ڈھیر لگا دیئے جاتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کھلاڑیوں کو کھانے پینے میں کبھی کمی نہیں محسوس ہونے دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کھلاڑی بھی پوری محنت کرتے اور ہر سال ٹرافی جیت کر لاتے۔

کالج میں تعلیم کے دوران منور فضل عمر ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ چوہدری محمد علی ہوا کرتے تھے۔ وہ لمبے عرصے سے یہ ذمہ داری ادا کرتے چلے آ رہے تھے اور بہت ہی کامیاب سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارا ماہانہ بل جس میں کھانا، رہائش، صفائی اور کامن روم فیس شامل تھی کبھی پچیس روپے سے بڑھا ہو۔ عمدہ کھانا، اچھا رہن سہن، صاف ستھرے واش روم، غرض ہمیں بہت ہی اچھا ماحول مہیا تھا۔

منور اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم تین چچیرے بھائی ایک ڈارمیٹری میں قیام پذیر تھے۔ ہمارے سب سے سینئر روم میٹ اسلم بُوسٹر تھے جو فائنل ایئر کے سٹوڈنٹ تھے۔ انہیں کسی دوسرے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا اور ان کی جگہ فرسٹ ایئر کے ایک سٹوڈنٹ کو جو بالکل ہی بچہ تھا ہمارے ساتھ ڈال دینے کے احکامات صادر ہوگئے۔ میرے باقی روم میٹس یعنی شکر اللہ اور ذکر اللہ اور میں نے مل کر اس فیصلے کو بدلوانے کی کوشش کی لیکن ہماری ایک نہ چلی۔ چوہدری محمد علی نے مجھے اپنے دفتر میں بلوایا اور پیار سے منا لیا کہ ہم

اسے اپنے ساتھ رکھ لیں گے۔ یوں وہ لڑکا ہمارے کمرے میں آ گیا۔ اگلے روز جب ہم نے اپنے کمرے کا تالا کھولا تو بُو کے ایک بھبھوکے نے ہمارا استقبال کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کمرے میں کوئی چھپکلی یا چوہا مرا ہوا ہو۔ ہم اس بُو کی وجہ پر غور کر ہی رہے تھے کہ میں بے دھیانی میں اس لڑکے کے بستر پر جا بیٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بستر گیلا ہے۔ رضائی ہٹائی تو پتا چلا کہ بیچارے کا گدا گیلا ہے اور بُو اسی میں سے آ رہی ہے۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ہمیں کافی تشویش ہوئی۔ فیصلہ ہوا کہ فضل عمر ہسپتال سے اس کے لیے دوا لائی جائے۔ ہم نے اس کا بستر اٹھا کر باہر دھوپ میں ڈلوایا اور اس رات اسے اپنے پاس سے بستر مہیا کیا۔ ہم تینوں بھائیوں نے اسے چھوٹے بچے کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کر دیا۔ اسے کسی دوسرے کے ساتھ بازار نہ جانے دیتے، کھانے کے وقت بھی اسے اپنے ساتھ رکھتے اور رات کو سوتے میں اسے دو تین بار پیشاب کے لیے اٹھاتے۔ اس کے بعد وہ جب تک ہوسٹل میں رہا اللہ کی مہربانی سے اس نے کبھی بستر گندہ نہیں کیا۔ چوہدری محمد علی کو اس چیز کا پہلے سے علم تھا چنانچہ انہوں نے ایک بار پھر مجھے بلایا اور بتایا کہ یہ لڑکا یتیم ہے، اس کی والدہ خود اسے ہوسٹل چھوڑنے آئی تھی اور اس نے اس کی پیشاب کی عادت کا ذکر بھی کیا تھا جو وہ ہمیں بتانا بھول گئے تھے۔ یہ لڑکا ہوسٹل میں صرف ایک ہی سال رہا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا اور پھر کالج میں نظر نہیں آیا۔ شاید اس نے پڑھائی چھوڑ دی تھی یا وہ کسی اور کالج میں چلا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس سال ایف ایس سی پری میڈیکل گروپ میں منور سمیت صرف تیرہ طالب علم تھے۔ جب ایف ایس سی کا نتیجہ آیا تو اللہ کے کرم سے حمید احمد خاں لاہور بورڈ میں فرسٹ اور سعید چونڈہ سیکنڈ رہے۔ باقیوں میں سے بھی کچھ طلبہ کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج یا دیگر میڈیکل کالجز میں داخلہ مل گیا۔ جہاں تک منور کا تعلق ہے وہ بی ایس سی کے لیے گورنمنٹ کالج، لائلپور چلے گئے۔

ربوہ میں قیام کے زمانے کی خوشگوار یادوں کا ذکر ہو تو منور بتاتے ہیں: ''ربوہ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ جماعتی خدمت کا بھی کچھ نہ کچھ موقع ملتا رہتا تھا۔ وقارِ عمل تو وہاں کا معمول تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے وقارِ عمل میں بھی شریک ہوا جس میں صاحبزادہ مرزا طاہر احمد شامل تھے۔ میں نے خود انہیں مٹی کی ٹوکریاں ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینکتے دیکھا ہے۔

اس زمانے میں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد افسر جلسہ سالانہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ چھ سات معاون ہوتے تھے جو کالج کے طلبہ میں سے منتخب کئے جاتے تھے۔ ان میں سے تین تو ہم کزن ہوا کرتے تھے۔ ہماری ڈیوٹی ۲۳ دسمبر سے شروع ہوتی اور ۳۱ کو ختم ہوتی تھی۔ ہمارے ناموں کے لیے دسمبر کے شروع سے ہی رسہ کشی شروع ہو جاتی۔ چوہدری محمد علی ہمیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی طرف سے وِیٹو ہو جاتا اور ہم افسر جلسہ سالانہ کے معاونین میں شامل ہو جاتے۔ ہم جلسہ سالانہ کے مختلف شعبوں کی رپورٹیں اکٹھی کرتے تھے۔ ہمیں سائیکلیں مہیا کر دی جاتیں جن سے ہم موبائل ہو جاتے اور بخوشی یہ بھاگ دوڑ کرتے۔ اس طرح ہمیں بہت سارے بزرگوں سے ملاقات اور ان کی دعائیں لینے کا موقع مل جاتا۔

منور نے بی ایس سی کے بعد اپنا کاروبار شروع کیا تاہم ۱۹۶۷ء میں وہ تیرہویں وار کورس کے لیے منتخب ہو گئے۔ انہوں نے ربع صدی سے زیادہ عرصہ فوج کی ملازمت میں گزارا اور ۱۹۹۳ء میں بطور لیفٹیننٹ کرنل ریٹائر ہوئے۔ اگر اُن سے فوجی ملازمت کا سب سے یادگار واقعہ بیان کرنے کی درخواست کی جائے تو وہ فوراً جواب دیتے ہیں: واقعات تو بہت سے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں میری ملازمت کا سب سے یادگار حصہ وہ تھا جب میں بطور کیپٹن سابق مشرقی پاکستان بھجوایا گیا۔ میں نوجوان تھا اور دفاعِ وطن کے جذبے سے سرشار تھا۔ میں نے اسی جذبے سے ۱۹۷۱ء کی جنگ لڑی اور بدقسمتی سے اُن نوے ہزار افراد میں شامل تھا جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہندوستان کی قید میں چلے گئے تھے۔

وہ کہا کرتے ہیں: ہندوستانی قید میں گزرے ہوئے کم و بیش تین سال میری زندگی کا ایک المناک باب ہیں تاہم مجھے خوشی ہے کہ وطنِ عزیز کے دفاع میں مجھے یہ قربانی دینے کا موقع ملا۔ قید میں بیشک کوئی تکلیف نہ ہو، ہوتی قید ہی ہے اور اس اذیت کا اندازہ صرف ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس کیفیت میں سے گزر چکے ہوں۔

اگر ان سے قید کے زمانے کی تفصیلات سنانے کے لیے کہا جائے تو وہ بتاتے ہیں: ڈھاکہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو فال ہوا۔ پہلے دو دن تو وہیں گزرے لیکن ۱۸ دسمبر کو ہمیں ڈھاکہ سے پانا گڑھ منتقل کر دیا گیا جو کلکتہ سے زیادہ دور نہیں اور جہاں انگریز دور کا اسلحے کا ایک ڈپو تھا۔ وہاں سو کے قریب Igloos یعنی وہ گنبد نما عمارتیں جن میں اسلحہ سٹور کیا جاتا ہے بنی ہوئی تھیں۔ ان اِگلوز کو خاردار تاروں سے بند کر کے ہمارے لیے کیمپ تیار کیا گیا تھا۔ ایک ایک اِگلُو میں اسّی اسّی نوّے نوّے افسران ٹھونس دیئے گئے۔ قیدیوں کو باہر نکلنے کی اجازت تھی نہ ایک اِگلُو والا دوسرے اِگلُو والے سے بات کر سکتا تھا۔ اگر کوئی قیدی کسی طرح باہر نکل آتا تو گارڈ فوراً اس پر رائفل تان لیتا اور تحکّمانہ لہجے میں کہتا: اندر چلے جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔ اس وقت تک ہمارا ریکارڈ بھی تیار نہیں کیا گیا تھا۔ کیمپ میں انٹرنیشنل ریڈ کراس کی کوئی رسائی تھی نہ ہمارے قیام کے دوران ان کا کوئی نمائندہ کیمپ میں آیا۔ بعد میں انڈینز نے ہمارے ہی کلیریکل سٹاف کی مدد سے ہماری لسٹیں بنائیں اور میرا خیال ہے یہی لسٹیں ریڈ کراس اور ہمارے جی ایچ کیو کو بھجوائی گئی ہوں گی۔

ان سے سوال کیا جائے کہ وہ پانا گڑھ کیمپ میں کتنا عرصہ رہے تو وہ کہتے ہیں: اب پورے طور پر یاد نہیں۔ ممکن ہے دو ماہ یا اس سے کچھ زیادہ وقت وہاں گزرا ہو۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو فروری ۱۹۷۲ء کی ایک صبح ہندوستانی فوج کا ایک افسر ہاتھ میں ایک لسٹ پکڑے ہمارے اِگلُو میں آیا اور اعلان کیا کہ فلاں فلاں قیدی کو آج کسی دوسرے کیمپ میں شفٹ کیا جائے گا لہٰذا وہ منتقلی کے لیے تیار رہیں۔ ٹرین سیدّھی اِگلُو کے اندر ہی آ گئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔

آپ کو کہاں منتقل کیا گیا؟ اس سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں: ہمیں نہیں بتایا گیا تھا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ٹرین کی کھڑکیاں بند تھیں اور دروازوں پر تالے پڑے تھے۔ کھڑکیاں کھولنے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا ہمیں کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ کون سا شہر ہماری منزل ہے۔ جب گاڑی کسی سٹیشن پر رکتی تو ہم آہستگی سے

کھڑکی کھولنے کی کوشش کرتے لیکن ہندوستانی فوجیوں کے علاوہ جو پلیٹ فارم پر رائفل تانے کھڑے ہوتے اور کچھ نظر نہ آتا لہٰذا فوراً کھڑکی بند کر دیتے۔ راستے میں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ جب ٹرین کو چلتے ہوئے دوسرا دن آ گیا تو بھوک نے ہمیں نڈھال کر دیا اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کھانے پینے کی کوئی شے حاصل کرنے کے لیے ہمارا کون سا حربہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی سوچ بچار میں تھے کہ ایک سٹیشن پر پلیٹ فارم کی دوسری طرف انڈین آرمی کی ایک سپیشل ٹرین آ کر رکی۔ ہمارے گارڈز کہیں ادھر ادھر ہوئے تو ہم نے کھڑکی کھول کر انڈین سپاہیوں کو اشارے سے بتایا کہ ہمارے پاس کچھ سامان قابلِ فروخت ہے۔ سب سے پہلے تو ایک پین فروخت ہوا۔ پھر فِلپس کا ایک ٹرانزسٹر تھا جو کسی اور سپاہی نے لے لیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہمیں پیسے نہیں چاہئیں، ان کے بدلے کھانے کو کچھ لا دو۔ وہ مان گئے اور دونوں چیزیں لے کر چلے گئے۔ جب دیر تک واپس نہ آئے تو ہمارے منہ لٹک گئے کہ چیزیں بھی ہاتھ سے گئیں اور پیٹ پُوجا کا بھی کوئی سامان نہیں ہو سکا تاہم جب ہماری ٹرین چل پڑی تو دیکھا کہ ان میں سے ایک کچھ چیزیں اٹھائے بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے وہ چیزیں چلتی گاڑی میں ہمارے ڈبے میں پھینک دیں اور جلدی جلدی صرف اتنا بتایا کہ سٹیشن سے بس یہی کیک پِیس اور بسکٹ مل سکے ہیں جو وہ لے آیا ہے۔ ہم ان کیک پِیسوں اور بسکٹوں کو منٹوں میں چٹ کر گئے۔

اگر ان سے پوچھا جائے کہ یہ سفر کتنے دن کا تھا تو وہ بتایا کرتے ہیں: خدا خدا کر کے ہمارا یہ سفر تیسرے دن شام کے وقت ''بریلی'' ریلوے سٹیشن پر اختتام پذیر ہوا۔ پلیٹ فارم بالکل خالی کرا لیا گیا تھا۔ ہمیں ٹرکوں میں بٹھا کر بریلی کنٹونمنٹ کی بیرکس میں جو خاردار تاروں سے اچھی طرح محفوظ بنائی گئی تھیں ڈال دیا گیا۔

وہ اس کیمپ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہاں پانا گڑھ والی تنگی اور دِقّت تو نہ تھی لیکن اس کیمپ کی حالت بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ چارپائی کے ساتھ چارپائی پھنسی ہوئی تھی۔ بدنظمی انتہا درجے کی تھی چنانچہ صبح کا ناشتہ گیارہ بارہ بجے ملتا اور دوپہر کا کھانا مغرب کے وقت۔ رہا رات کا کھانا تو اکثر قیدیوں کو کھانے کے لیے سوتے سے جگانا پڑتا تھا۔ یہ کھانا ڈھنگ کا نہیں ہوتا تھا۔ لیٹرینیں زمین میں گڑھے کھود کر بنائی گئی تھیں۔ پردے کے لیے لکڑی کے ڈنڈے گاڑ کر ٹاٹ باندھ بنا دیا گیا تھا لیکن اس ٹاٹ کی چوڑائی دو فٹ سے زیادہ نہ تھی چنانچہ لیٹرین میں بیٹھے ہوئے آدمی کو دور و نزدیک کے تمام لوگ دیکھ سکتے تھے۔

مارچ ۱۹۷۲ء تک ہمارا پاکستان میں اپنے عزیزوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہمیں پوسٹ کارڈ ملنا شروع ہو گئے جن پر ہم خط لکھ کر اپنے گھر کے پتے پر بھیج سکتے تھے۔ یہ ساری ڈاک اکٹھی کر کے شاید واہگہ پہنچائی جاتی تھی۔ اسی طرح واہگہ سے موصول ہونے والی ڈاک انڈیا میں مختلف کیمپوں میں پہنچائی جاتی تھی۔ میرے گھر سے پہلا خط بھی مارچ میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے گھروں سے پارسل آنا شروع ہو گئے جن میں کپڑے، جوتے اور بعض دفعہ کھانے پینے کا کچھ سامان ہوتا تھا۔

پوچھا جائے کہ ان کی قید کا باقی زمانہ بریلی ہی میں گزرا تو منور کہتے ہیں: ہم اس کیمپ میں بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ رہے ہوں گے۔ ایک روز ایک ہندوستانی فوجی افسر نے آ کر اعلان کیا کہ ساٹھ افسران کو ایک اور کیمپ

میں بھجوایا جانا مقصود ہے اور دعوت دی کہ ہم میں سے جو لوگ اکٹھے رہنا چاہتے ہوں اپنے نام دے دیں۔ ہم سات آٹھ قیدی ایک ہی یونٹ سے تھے چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں یہاں سے اکٹھے چلے جانا چاہیے۔ اس فیصلے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کرنل منور کہا کرتے ہیں: ہمارے اس فیصلے کی دو تین وجوہ تھیں۔ ہم توقع کر رہے تھے کہ ممکن ہے سہولیات میں وہ کیمپ اس کیمپ سے بہتر ہو اور اگر بہتر نہ بھی ہوا تو اس جیسا تو ہو گا ہی۔ ہمارا یہ بھی خیال تھا کہ اگر یہ کیمپ پاکستانی بارڈر سے قریب تر ہوا تو قیدیوں کی وطن واپسی شروع ہونے پر ہم پاکستان جانے والے ابتدائی قیدیوں میں سے ہوں گے۔ ہمارا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا۔ ہمیں بریلی سے ٹرکوں کے ذریعے میرٹھ شفٹ کر دیا گیا۔ یہ کیمپ بریلی والے کیمپ سے بدرجہا درجہ بہتر تھا۔ کھانا پینا بھی بہتر تھا اور لیٹرینیں بھی سٹیل کی چادر سے تیار کی گئی تھیں اور پردہ دار تھیں۔

وہ بتاتے ہیں: بعد میں پتا چلا کہ اس کیمپ کو ماڈل کیمپ کا درجہ دیا گیا ہے۔ جو غیر ملکی مہمان دہلی آتا اسے کیمپ وِزِٹ کروانے کے لیے میرٹھ ہی لایا جاتا جس کی وجہ سے وہاں صفائی کا انتظام بہتر اور وہاں کا سٹاف قدرے بااخلاق تھا۔ اس کیمپ میں ہم صرف ساٹھ افسر تھے۔ تیس ایک بیرک میں ہوا کرتے تھے اور تیس دوسری بیرک میں۔

ان سے سوال کیا جائے کہ کیا انہیں کبھی قید کے کسی ضابطے کی خلاف ورزی پر سزا کا مستحق بھی سمجھا گیا تو وہ کہتے ہیں: جیل سے فرار ہونے کی کوشش کسی قیدی کا سب سے سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ میں یا میرا کوئی ساتھی اس جرم میں ملوث نہیں رہا لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم قیدی تھے اور ہماری کوئی بھی بات ہندوستانی فاتحین کو ناگوار گزر سکتی تھی۔ کئی واقعات ہیں لیکن صرف ایک واقعہ عرض کروں گا جس سے آپ قید کی مجموعی فضا کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ارشاد! میں نے کہا۔

کرنل منور کی طرف سے جواب آیا: میں جس بیرک میں مقیم تھا اس کے کمانڈر ہمارے ایک بزرگ، میجر نجم تھے۔ صبح فجر کے وقت ہماری گنتی ہوا کرتی تھی۔ میجر نجم ہمیں ایک لائن میں کھڑا کر کے ہماری گنتی کرتے اور ہندوستانی فوج کا جو افسر ڈیوٹی پر ہوتا اسے ''سب اچھا'' کی رپورٹ دے دیتے۔ ہمارے کیمپ کی گارڈ ڈیوٹی جلدی جلدی بدلتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مرہٹہ یونٹ آئی اور ان کا ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ صبح صبح ہماری گنتی کرنے آ گیا۔ اس نے میجر نجم سے کہا کہ قیدیوں کی گنتی کر کے مجھے رپورٹ کریں۔ میجر نجم سینئر آفیسر تھے۔ انہوں نے اسے کہا: نوجوان! سب قیدی لائن میں کھڑے ہیں۔ تم خود گنتی کیوں نہیں کر لیتے۔ وہ یہ بات سن کر سخت ناراض ہوا اور اس نے کمانڈنگ آفیسر سے شکایت کر دی۔ مجھے یاد ہے یہ جون کا مہینہ تھا۔ ۱۱ بجے دوپہر کیمپ کا کمانڈنگ آفیسر بہت سے فوجیوں کے ساتھ آ گیا۔ ہمیں بیرکوں سے باہر بلوا کر دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔ مشین گنیں ہمارے چاروں طرف لگوا دی گئیں اور حکم دے دیا گیا کہ کوئی قیدی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں۔ کمانڈنگ آفیسر اپنے سپاہیوں سے یہ کہہ کر کہ اگر کوئی قیدی اپنی جگہ سے ہلے تو اسے گولی مار دی جائے خود واپس چلا گیا۔ اس وقت ہمیں قید میں چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اور ہماری قوتِ برداشت تقریباً صفر ہو چکی تھی۔ جون کا مہینہ اور دوپہر کا وقت۔

سورج ہمارے سر پر چمک رہا تھا جس کی وجہ سے ہم جلد ہی پسینے سے شرابور ہو گئے۔ ہمیں ایک گھنٹے تک چلچلاتی دھوپ میں کھڑا رکھا گیا جس کے بعد اپنے کمروں میں جانے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے ساتھ دوسری بیرک میں چار لیفٹیننٹ کرنل قید تھے۔ ان میں سے ایک کا نام رشید قاضی تھا۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہے تھے چنانچہ ہماری سزا ختم ہوئی تو انہوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا: گھبرانا نہیں، دِس اِز پارٹ آف دی گیم۔ ابھی تو پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا کچھ ہونا باقی ہے۔

اس مرحلے پر کرنل منور چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہنے لگے: اس وقت تو ہمارا کسی دوسرے کیمپ سے کوئی رابطہ نہ تھا لہٰذا ہمیں پتا نہ چل سکا کہ باقی قیدیوں پر کیا بیت رہی ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ مختلف جرائم کی سزا میں ان کی مار پیٹ ایک معمول تھا۔ ''سنگین جرائم'' میں ملوث ہونے والوں پر وحشی کتے چھوڑے جاتے جو انہیں بھنبھوڑ کر رکھ دیتے۔ دھوپ میں دیر تک کھڑا رکھنا اور راشن میں تخفیف معمولی سزاؤں میں شمار ہوتی تھی۔

کرنل منور بتاتے ہیں: ہر قیدی کو اس کے رینک کے مطابق جنیوا کنونشن کے تحت الاؤنس ملتا تھا۔ میں اس وقت کیپٹن تھا اور مجھے ہر ماہ بانوے روپے کے کوپن ملتے تھے۔ ہم اس رقم سے کینٹین سے صابن، تیل وغیرہ منگوا سکتے تھے اور اگر پھر بھی کچھ پیسے بچ جاتے تو چائے، کافی یا دودھ کا ڈبہ منگوا لیتے۔ میں ساٹھ افسران کا کیئر ٹیکر تھا چنانچہ میں ہر افسر سے ڈیمانڈ لیتا اور ایک فہرست تیار کرتا۔ کنٹین کنٹریکٹر کیمپ کے اندر ہی آ جاتا، مجھ سے لسٹ لے لیتا اور ایک دو دن میں چیزیں لا کر میرے حوالے کر دیتا۔ میں یہ سامان قیدیوں میں بانٹ دیتا۔ پھر افسر وار اس سامان کی ایک فہرست بنتی اور اس کے اخراجات کا حساب لکھا جاتا۔ یہ ذمہ داری کا کام تھا جس میں میرا بہت سا وقت گزر جاتا۔ میں یہ حساب رکھنے میں بڑی محنت کرتا تھا چنانچہ خدا کا شکر ہے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ کنٹین کنٹریکٹر کو حکم تھا کہ قیدیوں کی ڈیمانڈ پوری نہیں کرنی۔ مثال کے طور پر اگر سگریٹ کی سو ڈبیوں کی ڈیمانڈ ہوتی تو وہ کبھی ساٹھ اور کبھی ستر ڈبیاں لاتا۔ ساری چیزیں ڈیمانڈ سے کم ہوتیں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ قیدیوں کو یکسوئی حاصل نہ ہو پائے اور وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں تاہم کم از کم میں نے دشمن کی یہ سکیم کامیاب نہیں ہونے دی اور ہمارے کیمپ میں اس بنیاد پر کوئی دنگا فساد نہیں ہوا۔ الحمدللہ ایک مختصر عرصے کے علاوہ قید کے پورے زمانے میں میں ہی کینٹین آفیسر رہا اور کسی سے لڑائی نہیں ہوئی۔

اگر کرنل منور سے پوچھا جائے کہ قید کی عمومی زندگی کیسی تھی تو وہ کہتے ہیں: بے حد بے رونق۔ کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا چنانچہ دن گزارنا مشکل ہو جاتا۔ شروع شروع میں قیدیوں نے وقت گزارنے کے لیے تاش پر زور دیا۔ وہ ناشتے کے بعد بیٹھ جاتے اور مغرب تک تاش کھیلتے رہتے لیکن وہ جلد ہی اس کام سے اکتا گئے۔ ان دنوں شطرنج کے عالمی مقابلے ہو رہے تھے۔ انگریزی اخبار میں ہر روز شطرنج کے بارے میں نوٹس چھپا کرتے تھے۔ وہ اخبار لے کر بیٹھ جاتے اور شطرنج کھیلنا شروع کر دیتے۔ میں اکثر اپنے ایک گہرے دوست کے ساتھ جو میری یونٹ کا تھا کھیلا کرتا تھا۔ ہم آپس میں لڑ بھی پڑتے تھے اور ایک آدھ دن کے لیے ہماری بات چیت بھی بند ہو جاتی لیکن اگلے ہی دن دونوں میں سے کوئی ایک کہتا: چل یار صلح کر لیتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں جو ہماری صلح کروائے

گا اور ہماری صلح ہو جاتی۔

پنج وقتہ نماز کی ادائیگی یوں تو ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن مشکل حالات میں خدا کی طرف انسان کی توجہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ ہمارے یہ بھائی قید کے دوران نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے تو وہ کہتے ہیں: الحمدللہ مجھے بچپن ہی سے نماز پڑھنے کی عادت تھی اور قید کے دوران بھی میری یہ عادت قائم رہی لیکن میری بیرک کے تیس افسروں میں سے شاید ہی کوئی اور نماز پڑھتا ہوگا۔ میں برآمدے میں جائے نماز بچھاتا تھا چنانچہ کچھ لوگوں کی نظر مجھ پر پڑتی۔ آہستہ آہستہ کچھ قیدیوں نے میری دیکھا دیکھی نماز پڑھنا شروع کر دی اور یہ اہتمام پوری قید کے دوران قائم رہا۔

کرنل منور کہتے ہیں: میں شطرنج کے ضمن میں اپنے جس عزیز دوست کا پہلے ذکر کر چکا ہوں اس کا نام کیپٹن فاروق تھا۔ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ ایک بار میرے دل میں تحریک پیدا ہوئی کہ اسے نماز کی طرف راغب کروں لیکن میں اسے جب نماز پڑھنے کے لیے کہتا، وہ مرنے مارنے پر اتر آتا اور کہا کرتا تھا: سر! کہاں ہے آپ کا خدا؟ ہم نے تو ضرور کوئی گناہ کیا ہوگا کہ ہندوستان کی قید میں پھنس گئے ہیں لیکن ان چھوٹے چھوٹے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کا کیا قصور ہے جو یہاں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ کیپٹن فاروق تھا بھی بہت جذباتی۔ شروع شروع میں برآمدے میں بیٹھتے تو وہ کہا کرتا تھا: سر! اگر میں ان تاروں میں سر دے ماروں تو کیا ہوگا؟ جواباً میں کہتا: تمہیں معلوم نہیں شمشیر سنگھ مشین گن لیے بیٹھا ہے۔ ایک برسٹ مارے گا تو چھ گولیاں تمہارے جسم میں سے گزر جائیں گی۔ اس پر وہ کہتا: اچھا ہے نا، اس بک بک سے تو میری جان چھوٹ جائے گی۔ وہ تقریباً ہر روز اسی طرح کی گفتگو کرتا جس پر میں پریشان ہو جاتا اور ڈرنے لگتا کہ وہ کہیں کوئی ایسی حرکت کر ہی نہ بیٹھے چنانچہ میں اسے اکیلا نہ چھوڑتا اور ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا۔ یہ خدا کا خاص فضل تھا کہ میری کوشش سے اس کی توجہ ادائیگی نماز کی طرف ہوئی حتٰی کہ قید کے آخری دنوں میں وہ ہمارے کیمپ کا امام الصلوٰۃ تھا۔

کرنل منور بتاتے ہیں کہ قید قیدیوں پر کئی طرح کے نفسیاتی اثرات مرتب کرتی ہے۔ کئی لوگ ڈپریشن میں چلے جاتے ہیں، بعض کو خود کلامی کی عادت ہو جاتی ہے اور بعض مائل بہ خودکشی ہو جاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: ہمارے کیمپ میں قیدیوں کے مُوڈ جلد جلد بدلتے رہتے تھے۔ کسی پر اداسی کا دورہ پڑ جاتا تو کوئی کسی گہری سوچ میں چلا جاتا اور کئی کئی گھنٹے اس کیفیت سے باہر نہیں آتا تھا۔ فاروق ایسے لوگوں کی ٹوہ رکھتا۔ میں اس سے تھوڑا سا سینئر تھا۔ وہ بھاگ کر میرے پاس آتا اور کہتا: سر! فلاں قیدی آج بہت اداس ہے اور فلاں شاک میں ہے۔ چلیں انہیں تسلی دے کر آتے ہیں۔ ہم جاتے، ان افسروں کو دلاسا دیتے اور بتاتے کہ ہماری حکومت ہماری رہائی کے لیے کوشش کر رہی ہے اور ہم بہت جلد پاکستان واپس جانے والے ہیں لہٰذا مایوس اور اس طرح مغموم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اس طرح کی کونسلنگ بالعموم مفید نتائج پیدا کرتی اور ہم انہیں قائل کر لیتے کہ مایوسی کفر ہے اور یہ کہ ہمارے دن جلد ہی بدلنے والے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا کبھی ہندوستانی فوج کا کوئی سینئر افسر بھی کیمپ کے معاینہ پر آیا تو وہ کہتے ہیں: ہاں۔ کم از کم ایک بار۔ میرا خیال ہے ۱۹۷۲ء کی کوئی تاریخ تھی۔ انڈین آرمی کے لیفٹیننٹ جنرل، پری مندرا سنگھ بھگت جنہیں جنگِ عظیم دوم کے دوران سوڈان کے محاذ پر عدیم المثال جرأت کے مظاہرے پر برطانوی حکومت کا بہادری کا سب سے بڑا اعزاز، وکٹوریہ کراس مل چکا تھا اور جو بعد میں ہندوستانی فوج کے وائس چیف بھی رہے ہمارے کیمپ کے معاینے پر تشریف لائے۔

ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں تو سب سے سینئر قیدی، کرنل رشید قاضی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ پارٹیشن سے پہلے جب جنرل بھگت ڈیرہ دُون کینٹ میں کرنل کے طور پر تعینات تھے تو ان کے پڑوس میں کرنل رحیم رہا کرتے تھے جو کرنل رشید قاضی کے بڑے بھائی تھے۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ جب وہ چھوٹے تھے تو وہ جنرل بھگت کے گھر کھیلنے جایا کرتے تھے۔ یہ باتیں سن کر جنرل بھگت بے تکلفی سے کہنے لگے: اچھا! تُو شِیدا ایں۔ کرنل قاضی نے کہا: جناب درست فرماتے ہیں۔ پھر وہ دونوں اپنے اپنے خاندانوں کی باتیں کرنے لگ گئے اور ہم سب مزے سے یہ باتیں سنتے رہے۔ جنرل بھگت جاتے ہوئے کہنے لگے: رشید! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتاؤ۔ اس پر رشید قاضی نے کہا: سر! کیمپ میں اتنی تاریں لگی ہوئی ہیں کہ ہمارے کھیلنے کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی۔ ہو سکے تو کچھ تاریں ہٹوا دیں۔ اسی طرح ہم میں سے اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو اسے ایمبولینس کے ذریعے میرٹھ سی ایم ایچ میں پہنچانے اور علاج کا انتظام ہونا چاہیے۔ بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ جنرل کے ہمارے کیمپ کے اس دورے سے ہمارے حالات پر مثبت اثر ہوا ہے اور کیمپ کے منتظمین ہم سے کسی حد تک نرمی برتنے لگے ہیں۔

جب کچھ خاردار تاریں ہٹائی گئیں تو ہمیں چھوٹی سی گراؤنڈ مل گئی جس میں ہم والی بال یا کرکٹ کھیل سکتے تھے تاہم مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس ان کھیلوں کا ضروری سامان موجود نہ تھا۔ کینٹین کنٹریکٹر سے یہ چیزیں لانے کو کہا تو وہ والی بال اور ٹینس بال تو لے آیا مگر بیٹ کیمپ میں نہیں آنے دیا گیا۔

ہم زندگی میں کئی دفعہ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' والے محاورے کی صداقت آزما چکے تھے۔ اس موقع پر بھی یہی محاورہ ہمارے کام آیا چنانچہ ہم لنگر میں جلانے کے لیے آنے والی لکڑی بنظرِ غائر دیکھنے لگے۔ آخر ہمیں ایک ٹکڑا اس طرح کا مل گیا جسے چھری سے چھیل چھال کر بیٹ کی شکل دی جا سکتی تھی۔ اس کام پر تقریباً ایک ہفتہ لگا۔ بس پھر کیا تھا، صبح کے وقت کرکٹ اور شام کو والی بال سے دل بہلانے لگے۔ خوب تھک ہار کر رات کو لیٹتے تو بہت مزے کی نیند آتی۔

اس سوال کے جواب میں کہ کرنل منور کو پاکستان واپسی کی خوشخبری کب ملی وہ کہتے ہیں: دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ جب ڈھائی سال گزر گئے اور ہماری واپسی کی کوئی امید پیدا نہ ہو سکی تو ہم اداس رہنے لگے۔ کھیل کود میں ہماری دلچسپی ختم ہو گئی چنانچہ کینٹین سے کتابیں لے کر پڑھنا شروع کر دیں اور ناشتے کے بعد یوں لگتا گویا کل سب کا امتحان ہو۔ پھر اچانک خبریں آنا شروع ہوئیں کہ قیدی واپس پاکستان

جا رہے ہیں جس سے سب کے چہروں پر رونق لوٹ آئی۔ پہلے مرچنٹ نیوی کے افسران کا نام آیا۔ پندرہ بیس دن میں یہ لوگ چلے گئے جس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

اگر کرنل منور سے پوچھا جائے کہ وہ پاکستان واپس کب پہنچے تو وہ کہتے ہیں: اکتیس اکتوبر ۱۹۷۳ء صبح دس یا گیارہ بجے ہماری ٹرین اٹاری سٹیشن پر پہنچی۔ میرٹھ سے اٹاری تک دو تین مقامات پر ہمیں اچھا کھانا اور ریفریشمنٹ پیش کی گئی۔ اٹاری سٹیشن پر پہنچ کر ہمیں بتایا گیا کہ سامنے واہگہ ہے، اپنا اپنا سامان اٹھائیں اور چلے جائیں۔ باؤنڈری لائن تک ہم اپنا سامان خود گھسیٹ کر لائے۔ بارڈر کے اس پار ہمارے لوگ ہمیں دیکھ کر بے قرار ہو رہے تھے۔ پانچ سات قدم اندر پاکستان آرمی کے افسران بھی بیٹھے تھے جنہوں نے ہمیں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ ایک بڑے استقبالیے کا انتظام تھا اور لاہور کے کور کمانڈر ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے خود وہاں موجود تھے۔ ضابطے کی کارروائی کے لیے غالباً تین روز تک مجھے لاہور رکنا پڑا جس دوران میں اپنی ایک بھانجی کی شادی میں بھی شامل ہوا۔ تین دن کے بعد گاؤں جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارے گاؤں کا سٹاپ مین فیصل آباد، جھنگ روڈ پر ہے۔ میرا پورا گاؤں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے اسی طرح سے اُمڈ آیا تھا جس طرح انہوں نے مجھے اگست ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے لیے روانہ کیا تھا۔ مجھے کار میں سے اتار لیا گیا اور ایک جلوس کی شکل میں کندھوں پر اٹھا کر گھر پہنچایا گیا۔ اس دن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں، سڑک سے گھر پہنچتے پہنچتے جوان ہو گیا ہوں اور پھر سے ملک کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ کا بہت شکر ہے کہ میں فوج میں ستائیس سالہ ملازمت کے بعد آج بھی زندہ و سلامت ہوں۔

کرنل منور کے بعد آپ سے متعارف کرایا جا رہا ہے ڈاکٹر منیر احمد کو جو ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی، مدرّس تعلیم الاسلام ہائی سکول کے صاحبزادے اور عبدالعزیز بھامبڑی محتسب، ربوہ کے داماد ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۳ء میں بی ایس سی کر کے یہاں سے فارغ ہوئے۔ انہیں فزکس کے مضمون کے ساتھ خاصی دلچسپی تھی چنانچہ وہ بی ایس سی کے امتحان میں اس مضمون میں راولپنڈی ڈویژن کے جملہ طلبہ میں اول رہے اور وظیفہ کے حقدار قرار پائے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم ایس سی کیا اور یونیورسٹی میں تھرڈ رہے۔

وہ بتایا کرتے ہیں: میں نے اپنی ابتدائی تعلیم کے جملہ مراحل تعلیم الاسلام ہائی سکول میں طے کیے۔ تمام اساتذہ اور ہم جماعت ساتھیوں کی یادیں ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں۔ ان ساتھیوں میں ڈاکٹر مرزا مبشر احمد اور امام عطاالمجیب راشد کے نام شامل ہیں۔ میں نے ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا اور اپنے لیے پری انجینئرنگ کے مضامین کا انتخاب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے ایف ایس سی کے امتحان میں اعلیٰ نمبروں کی بنا پر انجینئرنگ یونیورسٹی میں بھی داخلہ مل گیا تھا مگر میں نے تعلیم الاسلام کالج میں ہی بی ایس سی کرنے کو ترجیح دی۔

منیر کہتے ہیں: میں نے کالج میں اپنے قیام کے دوران اپنی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں توازن قائم

رکھا۔ مجھے فٹ بال کا شوق تھا چنانچہ میں مسلسل چار سال تک کالج فٹ بال ٹیم میں کھیلتا رہا۔ پروفیسر رفیق احمد ثاقب ہمارے نگران تھے۔ مجھے کالج کی طرف سے بورڈ اور یونیورسٹی ٹورنامنٹس کھیلنے کا موقع ملا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارا گورنمنٹ کالج جھنگ کی فٹ بال ٹیم سے میچ تھا اور فٹ بال کے شائقین کا بڑا مجمع کھیل دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں موجود تھا۔ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد بھی یہ میچ دیکھنے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں لیفٹ آؤٹ کی پوزیشن میں فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ اس میچ میں جب مجھے فٹ بال کا پاس ملتا تو میاں صاحب اشاروں ہی اشاروں میں میری حوصلہ فرماتے کہ میں تیزی کے ساتھ بال کو باؤنڈری کے ساتھ ساتھ لے جاکر کارنر کے قریب پہنچ کر گول میں کِک کروں۔ وہ بھی کیا دن تھے!

تعلیم الاسلام کالج کی طالب علمی کے دوران انہیں سائنس سوسائٹی کا سیکرٹری رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا اور وہ ایک سال تک یہ فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

وہ کہتے ہیں: ان دنوں کالج کا یونیفارم مقرر ہو چکا تھا اور اسے پہننا لازمی تھا۔ میں اور میرے کچھ ہم جماعت جن میں نصیر اطہر اور خلیل الرحمٰن مرحوم کا نام قابلِ ذکر ہے اکثر گاؤن پہننے کی بجائے کندھوں پر اور ٹوپی ہاتھ میں رکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن صوفی بشارت الرحمٰن نے ہمیں اس حال میں دیکھ لیا تو ہم تینوں کو پکڑ کر اپنی عربی کی کلاس میں لے گئے اور فرمانے لگے کہ پیچھے جا کر بیٹھ جاؤ۔ ۴۵ منٹ کی عربی کی کلاس جب ختم ہوئی تو صوفی صاحب فرمانے لگے: آج اتنا ہی کافی ہے۔ آئندہ گاؤن اور ٹوپی کا صحیح استعمال نہ کیا تو دوبارہ یہی سزا ملے گی۔ اس کے بعد ہم نے ان کی نصیحت پلّے باندھ لی اور گاؤن ٹوپی کا استعمال کالج کے دورانیہ میں پابندی سے کرتے رہے۔

منیر نے ۱۹۶۳ء میں بی ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور سرگودھا ڈویژن میں فزکس میں اول پوزیشن حاصل کی چنانچہ انہیں گورنمنٹ کالج، لاہور اور پنجاب یونیورسٹی دونوں جگہ ایم ایس سی فزکس میں وظیفہ کے ساتھ داخلہ مل گیا۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں ایم ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن تھرڈ کے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

وہ بتاتے ہیں: جب میں ایم ایس سی کا امتحان دے کر لاہور سے ربوہ آیا تو استاذی المکرّم میاں محمد ابراہیم جمونی، ہیڈ ماسٹر، تعلیم الاسلام ہائی سکول نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میرا ایم ایس سی کے امتحان کا نتیجہ نہیں آتا میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں نویں اور دسویں جماعت کو فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے مضامین پڑھا دیا کروں چنانچہ میں چھ ماہ تک یہ مضامین پڑھاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان اور میری خوش قسمتی ہے کہ اس دوران مجھے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو بھی پڑھانے کا شرف حاصل ہوا جس کا اظہار حضور کئی ملاقاتوں میں خود میرے سامنے بھی فرما چکے ہیں۔

اب ایک وسیع میدان ان کے سامنے تھا لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ آگے انہیں کیا کرنا چاہیے۔ انہیں ایک منفرد خیال سوجھا اور انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسّلام سے رابطہ کر کے رہنمائی چاہیے۔ موصوف ان

دنوں حکومتِ پاکستان کے سائنسی مشیر تھے۔ انہوں نے منیر کو بتایا کہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کو نوجوان سائنسدانوں کی سخت ضرورت ہے اور وہ میٹرک سے لے کر ایم ایس سی تک چار فرسٹ ڈویژن کے ساتھ کمیشن میں سائنٹسٹ آف ٹریننگ کے طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے درخواست دی اور وہ جون ۱۹۶۶ء میں اس عہدے کے لیے منتخب ہوگئے۔ ان کا تقرر لاہور میں عمل میں آیا۔ وہ گیارہ سال تک یہاں کام کرتے رہے تاہم ۱۹۷۴ء کی آئینی ترمیم کے بعد جس کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تھا کمیشن کے احمدی افسران کے خلاف تعصّب کی ایک لہر چل نکلی اور انہیں یقین ہوگیا کہ اب پاکستان میں ان کا کوئی مستقبل باقی نہیں رہا چنانچہ وہ کسی بیرونی ملک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع تلاش کرنے لگے۔

وہ ستمبر ۱۹۷۷ء میں کینٹ سٹیٹ یونیورسٹی، کینٹ، اوہائیو کی فیلوشپ پر امریکہ چلے گئے اور ۱۹۸۲ء میں پی ایچ ڈی کر لی۔ خدا کے فضل سے ان کا جی پی اے بہت شاندار رہا۔ اس عرصے میں بعض اور سائنسدانوں کی شراکت کے ساتھ ان کے سات تحقیقی مضامین بین الاقوامی سائنسی مجلوں میں شائع ہوئے۔ انہیں اگلے کئی سال اوہائیو یونیورسٹی ایکسیلریٹر لیبارٹری اور ٹرائی یونیورسٹی میسن فیسلٹی، وینکوور میں پوسٹ ڈاکٹورل کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

۱۹۸۸ء میں انہوں نے اپنے کیریئر میں ایک دُور رس تبدیلی لانے کا ارادہ کیا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ نیوکلیئر سائنس کے اپنے علم کو کینسر ریڈیو تھراپی کے لیے استعمال کریں گے چنانچہ انہوں نے نیویارک کے میموریل سلون کیٹرنگ کینسر سنٹر کے ڈپارٹمنٹ آف ریڈی ایشن آنکالوجی میں دو سالہ فزکس ریذیڈنسی پروگرام مکمل کیا۔ وہ گزشتہ اٹھارہ سال سے ییل، نیوہیون، کنیکٹیکٹ کے سمائلو کینسر ہسپتال میں تھیراپیوٹک ریڈیالوجی کے شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ اسی عرصے میں وہ ییل یونیورسٹی سکول آف میڈیسن میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر اپنا مضمون پڑھاتے بھی رہے ہیں۔

وہ مئی ۲۰۱۴ء میں ریٹائر ہوئے اور آج کل ہارٹ فورٹ، کنیکٹیکٹ میں ہارٹ فورٹ ہاسپٹل میں چیف فزِسِسٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے۔ وہ اسے خدا کے فضل کے بعد اپنے والدِ بزرگوار کی توجہ اور شبانہ روز دعاؤں اور اپنے اساتذہ کرام کی محنت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں: میرے والد سکول ٹیچر تھے۔ انہوں نے میرے اندر حصولِ علم کی تڑپ پیدا کی۔ میری تعمیر و ترقی ان ہی کی مساعی اور دعاؤں کی مرہونِ منت ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ منیر نے ابھی اپنے ایک کلاس فیلو، عطاء المجیب راشد کا ذکر کیا تھا جن کا نام جماعتی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ مولانا ابوالعطا جالندھری کے صاحبزادے اور پچھلے کئی برسوں سے بیت فضل، لندن کے امام ہیں۔ اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے مقرر کے طور پر بھی پہچانے جاتے تھے چنانچہ انہیں کئی بیرونی سکولوں اور کالجوں میں منعقد ہونے والے تقریری مقابلوں یا مباحثوں میں ابتداءً تعلیم الاسلام ہائی سکول اور بعد میں تعلیم الاسلام کالج کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوتا رہا اور کامیابی ہمیشہ ان کے قدم چومتی رہی۔ انہوں نے بی اے کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی

کی طرف سے دو طلائی تمغے اور ایم اے عربی کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ وہ کالج یونین کے صدر اور المنار کے ایڈیٹر بھی رہے۔

انہوں نے ایم اے کا امتحان دیتے ہی اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کردی اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک جامعہ احمدیہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ اسی دوران انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ وہ یونیورسٹی میں اول رہے۔

وہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک بطور نائب امام بیت فضل لندن کے طور پر خدمت بجالاتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں ربوہ واپس آئے تو صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ اسی دوران ۱۹۷۵ء میں ان کا تقرر جاپان میں ہوگیا چنانچہ وہ ٹوکیو پہنچ گئے جہاں انہیں آٹھ سال تک امیر و مربی انچارج کے طور پر خدمت کی توفیق ملی۔ اس عرصے میں انہیں جاپانی زبان میں جماعتی لٹریچر کی وسیع اشاعت، جاپانی زبان میں چھپنے والے رسالہ ''وائس آف اسلام'' کے آغاز؛ ناگویا میں جماعتی مرکز کے لیے عمارت کی خرید اور جاپان میں جلسہ سالانہ کے آغاز کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان ہی کے دور میں جماعت احمدیہ جاپان کا مرکز ٹوکیو سے ناگویا منتقل ہوا۔ جاپان میں قیام کے دوران انہیں جنوبی کوریا میں احمدیہ مشن کے قیام کا جائزہ لینے کی غرض سے متعدد بار وہاں جانے اور جماعت کے بارے میں کورین زبان میں سب سے پہلا تعارفی اشتہار شائع اور تقسیم کرنے کا موقع بھی ملا۔ وہ نومبر ۱۹۸۳ء سے برطانیہ کے مربی انچارج اور امام بیت فضل لندن کے طور پر کام کررہے ہیں۔

انہیں ۱۹۸۴ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی پاکستان سے ہجرت کے بعد حضور کی خصوصی رہنمائی میں مختلف خدمات کا موقع ملتا رہا ہے۔ ایم ٹی اے کے اجرا پر سوال و جواب کے مختلف پروگراموں میں حصہ لینے کی توفیق ملی اور لِقَاء مَعَ الْعَرَب کے پروگراموں میں حضور کی مصاحبت کی سعادت حاصل رہی۔ اس دوران انہوں نے برطانیہ کے طول و عرض میں اردو اور انگریزی میں بکثرت مجالسِ سوال و جواب منعقد کیں؛ مختلف علاقوں میں پیس کانفرنسز میں تقاریر کے بعد حاضرین کے سوالوں کے جوابات دیئے؛ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں احمدیت کو متعارف کرایا؛ مذاہبِ غیر کی بعض کانفرنسوں میں شامل ہوئے؛ جماعتوں کے تعلیمی اور تربیتی نوعیت کے دورے کئے؛ عیسائی پادریوں سے چرچوں میں مباحثات کئے؛ مختلف ٹی وی پروگراموں میں شرکت کی اور بہت سے اخبارات کو انٹرویوز دیئے۔ انہیں متعدد ممالک کے جلسہ ہائے سالانہ میں مرکز کی نمائندگی کا موقع بھی ملتا رہا۔ وہ ساڑھے چار سال جامعہ احمدیہ لندن میں علمُ الکلام کے استاد بھی رہے ہیں۔

وہ ایم ٹی اے کے آغاز سے ہی اس کی انتظامیہ کا حصہ تھے لیکن ان کے پاس کچھ عرصہ چیئرمین دوم کی ذمہ داری بھی رہی۔ بعدازاں مجلسِ انتظامیہ کے ممبر رہے۔ انہیں ۱۹۸۵ء سے افسر جلسہ گاہ کے طور پر کام کرنے کی توفیق اور ہر جلسہ سالانہ پر تقریر کا موقع ملتا رہا ہے۔ انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی جلسہ سالانہ کی تقاریر، حضور کے خطباتِ جمعہ و عیدین، دُروس القرآن اور اردو میں دیگر خطابات کا انگریزی میں رواں ترجمہ کرنے کی

سعادت بھی حاصل ہو رہی ہے۔

انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کے وصال پر سیکرٹری، مجلس انتخابِ خلافت کی اہم اور نازک ذمہ داری ادا کرنے کی توفیق ملی اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے انتخاب کے بعد ایم ٹی اے پر اس بارے میں اعلان کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

عطاء المجیب سے ان کے کالج کے زمانے کی باتیں شروع ہوجائیں تو کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی گفتگو کا آغاز ہمیشہ صاجبزادہ مرزا ناصر احمد کے ذکرِ خیر سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: کالج کے زمانے کی یادوں کا آغاز تو کالج کے ہر دلعزیز اور بزرگ پرنسپل ہی سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شاہانہ وقار عطا فرما رکھا تھا لیکن آپ کی طبیعت میں سادگی اور بے تکلفی بھی نمایاں تھی۔ مجھے اس کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب مجھے زمانۂ طالب علمی ہی میں ایک بار آپ کے ساتھ شکار پر جانے کا موقع ملا۔ آپ کے ساتھ جانے والوں میں مرزا منور احمد، میرے والدِ محترم اور مولانا احمد خان نسیم کے علاوہ چند دیگر احباب بھی تھے۔ جاتے ہوئے ہماری مائیکرو بس احمد نگر کے قریب کیچڑ میں پھنس گئی۔ سب لوگ نیچے اتر گئے اور اسے کیچڑ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ باقی دوستوں کے ساتھ ساتھ صاجبزادہ مرزا ناصر احمد بھی اس کام میں برابر کے شریک ہیں۔ میں اس وقت اوائل عمری میں تھا لیکن یہ نظارہ آج بھی گویا میری نظروں کے سامنے ہے کہ آپ بھی اِدھر اُدھر سے جھاڑیاں، سرکنڈے اور مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اٹھا کر لا رہے ہیں تا کہ انہیں مائیکرو بس کے ٹائروں کے نیچے رکھ کر اسے دلدل سے باہر نکالا جاسکے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا لیکن اس کی یاد میرے دل میں آج بھی تازہ ہے۔ آپ کی سادگی طبع اور انکساری کی بات کرتے ہوئے یاد آ گیا ہے کہ مجھے پچھلے دنوں ایک پرانی تصویر دیکھنے کا موقع ملا جو تعلیم الاسلام کالج کی ربوہ میں تعمیر کے دنوں میں لی گئی تھی۔ اس تصویر میں آپ ایک زیرِ تعمیر برآمدہ کی سیڑھیوں پر بڑی بے تکلفی سے مزدوروں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں۔

کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے طلبہ کے اخلاق کی نگرانی اور ان کی بہبود صاجبزادہ مرزا ناصر احمد کی شخصیت کا خاص وصف تھا۔ عطاء المجیب کہتے ہیں: ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ میں میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تو میری خواہش تھی کہ میں کالج کے ہوسٹل میں رہوں۔ میں بوجوہ اس صورت کو اپنے لیے بہتر سمجھتا تھا لیکن جب یہ بات آپ کے علم میں آئی تو آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور مجھے تاکیداً کہا کہ مجھے گھر میں ہی قیام کرنا چاہیئے۔ اس وقت مجھے آپ کا یہ ارشاد کچھ بوجھل محسوس ہوا اور اس کی کوئی حکمت سمجھ نہ آئی لیکن آپ کا ارشاد تھا لہٰذا تعمیل کی گئی۔ وقت گزرتا گیا اور میں نے خود اپنے تجربے اور مشاہدے سے محسوس کیا کہ گھر کا ماحول ہوسٹل کے ماحول سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ ہوسٹل تو دراصل ان طلبہ کے لیے ہوتا ہے جنہیں گھر کی سہولت میسر نہ ہو اور جن طلبہ کو گھر کی سہولت میسر ہو ان کے لیے بلاوجہ ہوسٹل میں قیام چنداں مفید نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس بارے میں میری بروقت صحیح رہنمائی کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا۔

صاجبزادہ مرزا ناصر احمد کا ذکرِ خیر ہوا اور عطاء المجیب کی باتیں تو

وہ کہے اور سنا کرے کوئی

والا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں: ایک جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کے موقع پر جب مہمانِ خصوصی، مولانا جلال الدین شمس مجھے وہ طلائی میڈل پہنا رہے تھے جو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے عطا ہوئے تھے تو آپ قریب ہی کھڑے تھے۔ آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ ان میڈلوں کو اپنے ابا سے بچا کر رکھنا ورنہ وہ انہیں بھی الفرقان میں لگا دیں گے! اس تبصرہ میں مزاح بھی تھا اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ اباجان کو یہ رسالہ کتنا عزیز تھا۔ یہ آپ کا ذاتی رسالہ تھا اور اس کے تمام اخراجات آپ اپنی جیب سے پورا کرتے تھے۔ میں نے بعد میں جب اباجان سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس سے خوب حظ اٹھایا۔

تعلیم الاسلام کالج کا وسیع و عریض ہال بہت خوبصورت تھا تاہم مخدوش مالی حالات کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کی حالت کافی خستہ ہو چکی تھی۔ ربوہ کی زمین میں کلّر بہت تھا جس کی وجہ سے پلستر جابجا اتر جاتا اور دیواروں پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار بن جاتے۔ اُن دنوں پروفیسر نصیر احمد خان کالج یونین کے انچارج تھے۔ انہوں نے کئی بار پرنسپل صاحب سے صورتِ حال کے ازالے کی درخواست کی مگر مالی مجبوریاں حائل ہو جاتی رہیں۔ ان ہی دنوں ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحب پہلی قطار میں تشریف فرما تھے۔ نصیر خان کی باری آئی تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں اپنی ایک نظم تحت اللّفظ پڑھنا شروع کی۔ اس دوران ایک موقع پر آپ نے پرنسپل صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگلا شعر ہمارے مہربان پرنسپل کی خصوصی توجہ کا طلبگار ہے اور ہال میں کلّر کے نقش و نگار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ شعر پڑھا جس کا صرف متعلقہ مصرع ہی یاد رہ گیا ہے:

ہمارے ''ہال'' پر نظرِ کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مصرع اپنا کام کر گیا اور جلد ہی ہال کا حال ٹھیک ہو گیا!

صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی اپنے طلبہ کے ساتھ محبت کا ذکر آ جائے تو عطاء المجیب بہت سے واقعات سنانے لگتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں: نظم و ضبط قائم رکھنا اور طلبہ سے شفقت ادارے کے سربراہ کا بنیادی فرض ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں آپ کے طرزِ عمل میں بیک وقت کارفرما نظر آتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہماری کلاس کے ایک طالب علم کو کسی غلطی یا شرارت کی بنا پر دس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ بیچارے غریب طالب علم کے لیے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی ناممکن سی بات تھی چنانچہ وہ فوراً درخواست لکھ کر پرنسپل صاحب کے سامنے پیش ہو گیا۔ آپ نے درخواست پر ایک نگاہ ڈالی اور موٹے الفاظ میں o لکھ کر اسے لوٹا دی۔ طالب علم سخت مایوس ہو کر دفتر سے باہر آ گیا۔ وہ اپنی کلاس میں مغموم اور فکرمند بیٹھا تھا کہ کالج کا ایک کارکن آیا اور اسے ایک لفافہ تھما کر چلا گیا۔ اس میں دس روپے کا ایک نوٹ تھا اور ساتھ پرنسپل صاحب کا یہ نوٹ بھی کہ اس رقم سے دفتر میں جا کر جرمانہ کی ادائیگی کر دو۔

یوں تو عطاء المجیب کو اپنے اساتذہ کے کئی دلچسپ واقعات یاد ہیں تاہم انہوں نے مرزا خورشید احمد کے

حوالے سے جو واقعہ سنایا خصوصاً قابلِ بیان ہے۔ موصوف کہتے ہیں: مرزا خورشید احمد بڑے اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر بروقت کلاس میں آتے، کوئی غیر ضروری بات نہ کرتے، آتے ہی تدریس شروع ہو جاتی اور پورا وقت بڑی دلجمعی سے پڑھاتے۔ انگریزی تلفّظ پر خاص زور دیا کرتے تھے۔ ایک روز بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہماری کلاس میں کسی قریبی گاؤں کا ایک طالبِ علم بھی تھا۔ تھا تو بہت محنتی تاہم اس کے اندازِ گفتگو پر دیہاتی رنگ غالب تھا۔ وہ اسے بہتر بنانے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ایک روز مرزا خورشید احمد نے بلیک بورڈ پر یہ انگریزی فقرہ لکھا: ''سگریٹ اِز میڈ آف پیپر اینڈ ٹوبیکو''۔

یہ فقرہ لکھنے کے بعد آپ نے الفاظ کا صحیح تلفّظ بتایا اور پھر ہر طالب علم سے یہ فقرہ بہ آواز بلند دہرانے کو کہا۔ طالب علموں نے باری باری یہ فقرہ دہرانا شروع کیا۔ اگر کسی جگہ کوئی کمی رہ جاتی تو آپ اصلاح کر دیتے۔ جب ہمارے مذکورہ بالا دوست کی باری آئی تو وہ کھڑا ہوا اور بڑے اعتماد اور تیزی سے یہ فقرہ کچھ اس طرح دہرایا:

دی سِر گٹ اِز میڈ آف پیپر اینڈ تبَاخُو

بے تکلفانہ انداز اور یہ تلفّظ سن کر کلاس کشتِ زعفران بن گئی۔ مرزا خورشید احمد جو عام طور پر کلاس میں بے حد سنجیدہ رہتے تھے کو تو اس زور سے ہنسی آئی کہ ضبط سے باہر ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنا رجسٹر اٹھایا اور کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔

عطاء المجیب کو اپنا ایک اور کلاس فیلو بھی یاد ہے جس نے اکنامکس کی پوری کتاب حفظ کر رکھی تھی لیکن نقل راچہ عقل والے محاورے سے لاعلم تھا۔ وہ بتاتے ہیں: اکنامکس کی مشہور ٹیکسٹ بک Essentials of Economics جو پروفیسر ایس ایم اختر کی لکھی ہوئی تھی ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ کلاس میں لیکچر انگریزی میں ہوتا تھا۔ امتحان کا پرچہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپا ہوتا تھا اور اجازت تھی کہ امیدوار کسی بھی زبان میں سوالات کا جواب دے سکتا ہے۔ ہماری کلاس میں صرف پانچ طلبہ ایسے تھے جو انگریزی میں جواب لکھتے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم افریقہ کا رہنے والا تھا، دوسرے کا تعلق بحرین سے تھا اور باقی تین طلبہ مقامی تھے لیکن اپنے شوق سے انگریزی میں جواب لکھا کرتے تھے۔ ان تین میں سے ایک طالب علم ایسا بھی تھا جس کی یوں تو انگریزی کافی کمزور تھی مگر حافظہ بلا کا تھا۔ اس نے انگریزی میں اپنی کمزوری چھپانے کے لیے ساری کی ساری کتاب زبانی رَٹ لی تھی۔ امتحان میں جو بھی سوال آتا، اس کا جواب کتاب کے عین مطابق لکھ آتا۔

کتاب کا ایک چیپٹر سٹیٹ بینک کے فنکشنز کے بارے میں تھا۔ امتحان میں سوال آیا کہ بینکوں کے بینک کے طور پر سٹیٹ بینک کے فرائض کیا ہیں۔ ہمارے اس محنتی دوست نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سٹیٹ بینک پر کتاب کا پورا باب شروع سے لے کر آخر تک من و عن دہرا دیا۔ اس سوال کے نمبر تو اس کو شاید مل گئے ہوں گے لیکن اس کے پاس باقی سوالوں کے جواب کا وقت نہیں بچا تھا۔ خیر یہ تو ہوا لیکن سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے جواب کا آغاز کتاب کے عین مطابق اس فقرے سے کیا تھا کہ:

"As we have already explained in the last Chapter"

صوفی بشارت الرحمٰن کا ذکر آ جائے تو عطاء المجیب ان کی نیکی، تقویٰ و طہارت اور کالج کے قواعد و ضوابط کی پابندی کے حوالے سے کئی واقعات سناتے ہیں۔ کہتے ہیں: ہمارے عربی کے استاد تھے۔ مجھے ان سے کئی سال شرفِ تلمّذ حاصل رہا۔ نصاب کی کتابیں سالہا سال سے ایک ہی ہوتی تھی لیکن وہ ہمیشہ کلاس میں پوری تیاری کے ساتھ آتے اور ایک ایک لفظ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ بڑے بزرگ اور دعا گو انسان تھے۔ ان کی جس خوبی نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان کا تدبّرِ قرآن تھا۔ آیاتِ قرآنیہ کے مشکل مقامات کا حل اور امکانی طور پر پیدا ہونے والے سوالات کو عربی زبان کے قواعد و ضوابط کی روشنی میں طلبہ کو سمجھانا آپ پر ختم تھا۔

عطاء المجیب راشد کی باتیں تمام ہوئیں۔ اب میں آپ کی ملاقات نصیر احمد قاری سے کرانا چاہتا ہوں جو قاری محمد امین، محاسب صدر انجمن احمدیہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں اور آج کل کینیڈا کے شہر مسی ساگا میں مقیم ہیں۔ میں ''قریۂ جاوداں'' میں یہ بات تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ ابتدائے ربوہ میں جب ہماری رہائش کچے کوارٹرز میں تھی قاری محمد امین ہمارے پڑوسی تھے اور ہمارے اہلِ خانہ کا ان کے اہلِ خانہ کے ساتھ بہت میل جول تھا۔ بعد میں تو ان کے ساتھ ایک رشتے داری بھی ہوگئی لیکن اُس وقت بھی ہم ایک ایسے رشتۂ مودّت میں منسلک تھے جس کی مثال آج کل کم کم ملتی ہے۔ نصیر قاری سکول اور کالج میں مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ یوں کہہ لیجئے کہ میں نے ۱۹۶۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو انہوں نے ۱۹۵۹ء میں اور اسی حساب سے وہ ۱۹۶۳ء میں بی ایس سی پاس کرکے اس کالج سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انہوں نے کراچی کے مشہور انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے ایم بی اے کیا اور بینکنگ کا کیریئر اپنا لیا۔ ابتداءً وہ امیریکن ایکسپریس میں کام کرتے رہے اور ۱۹۸۹ء میں جب وہ بینک آف ٹوکیو میں ملازمت کر رہے تھے انہوں نے کینیڈا نقل مکانی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کینیڈا میں ادویات کے ایک بڑے چین سٹور میں اکاؤنٹس کے شعبے میں کام کرتے رہے تاہم ۲۰۱۴ء میں ریٹائر ہوگئے۔ اب وہ سائنسی لٹریچر اور کرنٹ افیئرز کے مطالعہ میں وقت گزارتے ہیں۔

ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے وقت کی بات ہو تو وہ کہتے ہیں: یار! کس دور کی یاد دلادی۔ کالج میں بہت اچھا وقت گزرا۔ پڑھائی تو اپنی جگہ تھی ہی، میں روئنگ ٹیم میں بھی شامل تھا تاہم میرے چھوٹے قد اور دھان پان جسم کی وجہ سے مجھے سٹیئر رکھا گیا تھا۔ یونیورسٹی چیمپئن شپ سے کئی ماہ پہلے ہم صبح صبح دریائے چناب پر پریکٹس کے لیے جایا کرتے تھے۔ واپس آ کر ٹک شاپ میں بیٹھ جاتے۔ کالج کی طرف سے باقی کھلاڑیوں کو سویابین کا حلوہ اور دودھ ملا کرتا تھا تاہم مجھے دودھ پینے یا حلوہ کھانے کی اجازت نہ تھی اور اس کے پس منظر میں یہ خیال کارفرما تھا کہ بطور سٹیئر مجھے وہ جسمانی مشقت نہیں کرنا پڑتی جو باقی کھلاڑی کرتے ہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ ناانصافی سمجھتا تھا۔ دودھ کے بغیر تو میرا گزارہ ہو جاتا تھا البتہ حلوہ مجھے بے حد پسند تھا چنانچہ میں نے ٹک شاپ کے ایک ملازم کو گانٹھ لیا۔ وہ مجھے الگ بٹھا کر حلوہ لا دیتا جسے میں مزے لے لے کر کھاتا۔ مزے کی بات ہے کہ اس سارے عرصے میں میری یہ ''چوری'' پکڑی نہیں گئی۔

وہ بتاتے ہیں: میرے پاس روئنگ کے حوالے سے کوئی قابلِ فخر یادداشت نہیں ہے۔ ہم سالہا سال سے پنجاب یونیورسٹی کے روئنگ چیمپئن چلے آ رہے تھے لیکن بدقسمتی سے اس بار ہمارے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا جس کی وجہ سے ہمارا گزشتہ کئی برسوں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ ہوا یوں کہ ہماری ٹیم کا ایک کھلاڑی میچ کے دوران اچانک بے ہوش ہو گیا جس کی وجہ سے ہمیں کھیل بھول کر اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی جان تو بچ گئی مگر ہم یہ ٹورنامنٹ ہار گئے جس کا ہم سب کو بہت افسوس ہوا۔ سچ پوچھیں تو میرے دل سے یہ صدمہ آج تک نہیں گیا۔

نصیر قاری کے بعد اب تعلیم الاسلام کالج کے جس ذہین و فطین اولڈ بوائے اور ماہرِ معاشیات کا تعارف قارئینِ کرام سے کرایا جا رہا ہے ان کا نام عنایت اللہ منگلا ہے اور ان کا تعلق ضلع سرگودھا کے مشہور چک منگلا سے ہے۔ یاد رہے چک منگلا کے مولوی عزیز الرحمٰن کی قبولِ احمدیت کے بعد منگلا کے بہت سے دوست دائرہ احمدیت میں آ گئے تھے۔ عنایت اللہ منگلا کا خاندان بھی ان میں سے ایک تھا۔

عنایت اللہ منگلا سے میرا تعارف اس زمانے سے ہے جب وہ تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے تھے۔ اگرچہ وہ مجھ سے دو سال سینئر تھے لیکن ان کے دو بہت قریبی عزیز یعنی عزیز منگلا اور اسلم منگلا میرے ہم جماعتوں میں سے تھے اور ان ہی میں سے کسی کے ذریعے میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ وہ ۱۹۵۹ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور اگلے چار سال یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں اکنامکس کے اختیاری مضمون کے ساتھ بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اس کے دو سال بعد پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم اے کر لیا۔ انہوں نے اس امتحان میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی اور وہ یونیورسٹی میں اوّل رہنے پر طلائی تمغہ کے حق دار قرار پائے۔ انہوں نے چند سال بعد میک ماسٹر یونیورسٹی، ہملٹن، کینیڈا سے ایم اے اکنامکس اور ۱۹۷۷ء میں مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی کے کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے فنانشل اکنامکس میں پی ایچ ڈی کی۔

وہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے شعبہ معاشیات میں جونیئر لیکچرر؛ میک ماسٹر یونیورسٹی، ہملٹن میں ٹیچنگ اسسٹنٹ؛ برطانیہ کی ایسیکس یونیورسٹی میں ٹیچنگ فیلو؛ قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد میں لیکچرر اور بعد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر؛ مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی میں فلبرائٹ سکالر؛ یارک یونیورسٹی، ٹورنٹو اور یونیورسٹی آف نیو برنزوِکس میں اسسٹنٹ پروفیسر اور ویسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے ہیں۔ وہ سنگاپور کی نیشنل یونیورسٹی میں وِزیٹنگ سینئر فیلو؛ ہاورتھ کالج آف بزنس میں ڈائریکٹر گریجوایٹ پروگرامز؛ زید یونیورسٹی، دبئی میں فلبرائٹ وِزیٹنگ پروفیسر اور لاہور سکول آف اکنامکس، لاہور میں فلبرائٹ ریسرچ سکالر اور وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے ہیں۔ ۱۹۹۷ء سے وہ ویسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں فنانس اور کمرشل لا کے پروفیسر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اگست ۲۰۱۶ء میں ریٹائر ہونے کے بعد اب وہاں پروفیسر ایمِریٹس ہیں۔

ان کی پبلیکیشنز کی تعداد نصف صد کے قریب ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اعزازات و انعامات سے نوازا

ہے۔جن میں ان کے نزدیک سب سے اہم اعزاز نیشنل روسٹر آف فیکلٹی سپیشلسٹ پروگرام آف دی یو ایس سٹیٹ ڈپارٹمنٹ (فُلبرائٹ کمیشن) پر ان کا تقرر ہے۔ انہیں تین بار فُلبرائٹ ٹیچنگ اینڈ ریسرچ ایوارڈ مل چکا ہے؛ وہ بہت سی ٹیکسٹ بُکس ریویو اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالہ جات کی نگرانی کر چکے ہیں۔ وہ جامعہ احمدیہ، کینیڈا میں لیکچرز دینے کے علاوہ ان کے تھیسس ریویو بورڈ کے رکن بھی ہیں۔

یوں سمجھ لیں کہ تعلیم الاسلام کالج چھوڑنے کے بعد میری ان سے ملاقات کا کوئی موقع ہی نہ پیدا ہوا اگرچہ مجھے یہ علم ضرور ہوتا رہا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد میں پڑھاتے رہے ہیں؛ ان کی شادی پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان کی صاحبزادی سے ہوئی ہے اور یہ کہ وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد بیرونِ ملک آباد ہو چکے ہیں۔ جب میری کتاب ''قریۂ جاوداں'' شائع ہوئی تو انہوں نے کسی جگہ سے اس کا ذکر سنا اور پھر عزیز منگلا سے میرا فون نمبر حاصل کر کے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ اُن دنوں لاہور سکول آف اکنامکس میں اپنے معمول کے مطابق لیکچرز کے لیے آئے ہوئے تھے اور ڈی ایچ اے، لاہور کے ڈیفنس کلب میں مقیم تھے۔ میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا اور پرتکلف میزبانی کے علاوہ دیر تک ان کی دلچسپ باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ سچ پوچھیں تو مجھے ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی داستان پہلی بار ان ہی کے منہ سے سننے کا موقع ملا۔

وہ کہتے ہیں: یوں تو تعلیم الاسلام کالج میں گزرا ہوا میرا ہر لمحہ ہی یادگار ہے لیکن میں یہاں پر صرف دو باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں سے پہلی کا تعلق تعلیم الاسلام کالج میں میرے زمانۂ طالب علمی سے ہے اور دوسرے کا اس کے بعد کے دور سے۔

عنایت اللہ منگلا بتاتے ہیں: ایک بار ہم کلاس میں بیٹھے اپنے پروفیسر، چوہدری حمید اللہ کی آمد کے منتظر تھے کہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے ہمیں فارغ بیٹھے دیکھا تو کلاس کے اندر تشریف لے آئے اور اِدھر اُدھر سے باتیں شروع کر دیں۔ اسی دوران آپ نے طلبہ سے پوچھا کہ وہ دن میں کتنے گھنٹے سوتے ہیں۔ طلبہ کے جوابات سے اندازہ ہوا کہ ہر طالب علم اوسطاً آٹھ سے نو گھنٹے روزانہ سوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر ہر طالب علم اپنی زندگی کا تیسرا حصہ سونے میں گزار دے تو کیا اسے وقت کا بہترین استعمال قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور طلبہ کے ردعمل کا انتظار کئے بغیر ہی واپس تشریف لے گئے۔ باقی طلبہ نے تو میاں صاحب کے اس استدلال کو نہ جانے کیسے لیا مگر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آپ کی بات ہے تو بہت پُرحکمت چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ آئندہ میں چوبیس گھنٹے میں سے چھ گھنٹے سے زیادہ ہرگز نہ سوؤں گا اور یوں بچنے والا وقت پڑھائی، عبادت اور صحبتِ صالحین میں گزارا کروں گا۔ خدا نے مجھے زندگی بھر اس فیصلے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائی اور اس کا شکر ہے کہ میرے اس فیصلے کا میری شخصیت پر بہت مثبت اثر ہوا۔

وہ مزید بتاتے ہیں: میں نہ صرف زمانۂ طالب علمی میں میاں صاحب کی شفقت و محبت کا مورد رہا بلکہ بعد میں بھی آپ کی عنایات سے ہمیشہ وافر حصہ پاتا رہا۔ آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہوگا کہ میری زندگی کا ہر اہم

فیصلہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث ہی نے فرمایا۔ مثلاً میں پنجاب یونیورسٹی گیا تو حضور کے ارشاد پر حالانکہ اس وقت مجھے سٹیٹ بنک آف پاکستان کی طرف سے دوگنی تنخواہ پر ایک ملازمت کی آفر موجود تھی مگر میں نے حضور کی اس خواہش کو مقدم رکھا کہ ہمارے لوگوں کو یونیورسٹیوں میں جانا چاہئے۔ ۱۹۸۱ء میں جب قائداعظم یونیورسٹی چھوڑ کر بیرونِ ملک جانے کا فیصلہ میرے زیرِ غور تھا تو میرے پاس کئی بہتر پیشکشیں موجود تھیں مگر میں حضور کے ارشاد پر کینیڈا چلا گیا۔ جاتے ہوئے حضور نے مجھ سے دریافت فرمایا: تمہارے پاس کم از کم ۹۰ دن کینیڈا میں رہنے کے لیے پیسے تو موجود ہیں نا۔ اللہ کی شان دیکھئے مجھے اکانویں روز ٹورنٹو کی یارک یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں ٹورنٹو جماعت کا سیکرٹری جنرل منتخب ہو گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک بعض اور جماعتی خدمات کا موقع ملا۔ میں احمدیہ گزٹ کا ایڈیٹر رہا، میں نے ممبر بیتُ الذّکر کمیٹی کے طور پر کام کیا اور مجھے قاضی کی حیثیت میں بھی خدمت کی توفیق ملی۔ جلسہ سالانہ کینیڈا میں کئی سال تقاریر کرنے کی سعادت اس پر مستزاد تھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب خلیفۂ وقت کی دعاؤں اور رہنمائی کی بدولت تھا۔

عنایت اللہ منگلا کی بیان کردہ اور بھی بہت سی باتیں آپ تک پہنچائی جا سکتی ہیں تاہم ان کا ذکر کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے کیوں نہ ہم ملک لال خان کے پاس چلیں جو آج کل جماعت احمدیہ، کینیڈا کے امیر اور میرے مہربانوں میں سے ہیں۔

یاد رہے کہ تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم کے دوران احمدیت قبول کرنے والوں میں سے ملک لال خان کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں اسی کالج سے ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور سے بطور سِول انجینئر کامیابی حاصل کی۔ بعدۂ انہوں نے لمبا عرصہ پاکستان ٹیلیگراف اینڈ ٹیلیفون ڈپارٹمنٹ میں گزارا اور پھر کینیڈا منتقل ہو گئے۔ افسوس کہ زمانۂ تعلیم میں تو ان کے ساتھ شناسائی نہ ہو سکی البتہ جیسا کہ اباجی کی وفات پر چچا ابراہیم کے نام ان کے تعزیتی خط سے عیاں ہے، وہ اباجی سے بخوبی متعارف تھے اور خلافت لائبریری میں آتے جاتے ان سے اکتسابِ فیض کرتے رہے تھے۔ میں سروس میں آنے کے بعد ان سے متعارف ہوا اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب میرا تقرر فیصل آباد میں تھا اور موصوف بھی وہیں پوسٹڈ اور پیپلز کالونی میں ایک سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھے میرا ان سے تعلق بڑھا۔

ملک لال خان کا ایک تفصیلی انٹرویو کینیڈا سے چھپنے والے مجلس خدام الاحمدیہ کے ترجمان ''النداء'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اس انٹرویو میں موصوف نے اپنے قبولِ احمدیت کی داستان بیان کی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہیں اپنے بچپن میں جب وہ ضلع حافظ آباد کے ایک گاؤں میں رہا کرتے تھے لوگوں کو احمدیوں کے لیے ''مرزائی'' اور ''قادیانی'' کے الفاظ استعمال کرتے سن کر پہلی بار احساس ہوا کہ یہ طبقہ مسلمانوں سے الگ اور اُن کے لیے ناپسندیدہ حیثیت رکھتا ہے۔ وہ دیواروں پر ان کے یہ مطالبات کہ ''قادیانیوں کو اقلیت قرار دو'' اور ''قادیانیوں کو کلیدی اسامیوں سے الگ کرو'' پڑھا کرتے تھے اور یہی ان کا احمدیت سے ابتدائی (اگرچہ منفی) تعارف تھا تاہم احمدیت کے ساتھ ان کا نسبتاً تفصیلی تعارف ۱۹۵۸ء میں اس وقت ہوا جب وہ نویں جماعت میں حافظ آباد کے

ایک سکول میں داخل ہوئے۔ اس سکول کے ہیڈ ماسٹر، چوہدری بشیر احمد کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ''مرزائی'' ہیں۔ اس زمانے میں ملک لال خان بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے اور اسلامیات کے ایک استاد بھی بکثرت وہاں آیا کرتے تھے۔ اس خیال سے کہ طلبہ چوہدری بشیر احمد کا ''بداثر'' قبول نہ کرنا شروع کر دیں ان کے یہ استاد بورڈنگ ہاؤس میں مقیم طلبہ کو احمدیت کے ''حقیقی چہرے'' سے روشناس کرانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے ملک لال خان کی مذہب میں دلچسپی دیکھ کر انہیں ''محمدیہ پاکٹ بک'' نامی ایک کتاب بھی لا کر دی جو عبداللہ معمار کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے ملک لال خان کے دل میں احمدیت کے خلاف بے پناہ نفرت پیدا ہوگئی اور انہیں یقین ہوگیا کہ نعوذ باللہ یہ جماعت اسلام کے نام پر سیاہ دھبہ ہے اور اس سے اسلام کو واقعتاً شدید خطرہ لاحق ہے۔ ملک لال خان کی رائے میں اس کتاب میں حضرت مسیح موعود کی تحریروں کو اپنے سیاق وسباق سے الگ کر کے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ کم علم لوگوں پر حضور کے دعاوی کے بارے میں مخالفانہ اثر پیدا ہوتا ہے اور یہی کیفیت ان کی بھی تھی۔

موصوف بتاتے ہیں: بورڈنگ ہاؤس میں تین احمدی طلبہ بھی مقیم تھے جو ویسے تو میرے اچھے دوست تھے لیکن جب مذہب کا معاملہ آتا تو مجھے ان سے چھیڑخانی کا موقع مل جاتا۔ غالباً انہیں اپنے عقائد کے بارے میں پورا علم نہ تھا لہٰذا وہ میرے اعتراضات کا جواب نہیں دے پاتے تھے اور ایسی صورتِ حال پیدا ہونے پر کہا کرتے تھے کہ اگر تم ہمارے کسی احمدی عالم سے ملو تو وہ تمہارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے۔ میں انہیں کہا کرتا تھا کہ یہ تو بعد کی باتیں ہیں، تم اس وقت میرے سوالات کا جواب دو تا میں مطمئن ہوسکوں کہ تم سچے ہو ورنہ میں احمدیت کو جھوٹا سمجھنے میں پوری طرح حق بجانب ہوں گا۔ اب مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں ان دنوں مخالفت میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ میں اور میرا ایک دوست آپس میں ایک ڈرامہ رچایا کرتے تھے جس میں میں خود (نعوذ باللہ) مسیح موعود بنتا اور میرا دوست خلیفہ اول۔ پھر میں کہا کرتا: تم لوگوں کو جا کر بتاؤ کہ خدا نے مجھے مسیح موعود بنا کر بھیجا ہے، میرے ماننے میں ہی تمہاری نجات ہے ورنہ تم سب کے لیے بربادی ہے۔ اس ڈرامے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ احمدیت بھی محض ایک ڈرامہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی دوران دسویں کا امتحان ہوا۔ ملک لال خان بورڈ میں سیکنڈ رہے جس پر ان کے والدین چوہدری بشیر احمد کے خاص طور پر ممنون تھے جن کی توجہ کا ان کی اس کامیابی میں بہت دخل تھا چنانچہ جب کالج میں داخلے کا وقت آیا تو ان کے والدین نے ان ہی سے مشورہ کیا۔

چوہدری صاحب کا کہنا تھا کہ عمومی شہرت کے لحاظ سے تو سب سے اچھا کالج گورنمنٹ کالج، لاہور ہے۔ اگر لال خان وہاں جائیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ ان کا کہنا تھا: گورنمنٹ کالج، لائل پور بھی اچھا کالج ہے لیکن اگر آپ لوگ میرا ذاتی مشورہ چاہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ لال خان کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخل کروایا جائے۔ اس کالج کا تعلیمی معیار بھی اچھا ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہاں کا ماحول دینی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو بچے چھوٹی جگہوں سے بڑے شہروں میں جاتے ہیں وہ وہاں کی چمک دمک دیکھ کر اپنا اصل

مقصد بھول جاتے ہیں اور فضول باتوں میں الجھ کر بسا اوقات اپنا مستقبل تاریک کر لیتے ہیں لیکن ربوہ کے پاکیزہ ماحول کی وجہ سے لال خان ان مصیبتوں سے محفوظ رہیں گے۔ والدین چوہدری بشیر احمد کے اس قدر ممنونِ احسان تھے کہ انہوں نے یہ باتیں سننے کے بعد کہا: چوہدری صاحب! یہ آپ ہی کا بیٹا ہے اور آپ جہاں کہیں گے ہم اسے وہیں داخل کروائیں گے۔ یوں فیصلہ ہوگیا کہ مجھے تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ہی داخلہ لینا ہے۔

لال خان کہتے ہیں: میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں وہاں جانے سے انکار کر دیتا تاہم مجھے یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ اگر مجھے دو سال تک قادیانیوں کے درمیان رہنا پڑا تو میرا نہ جانے کیا بنے گا مگر ایک اور خیال سے مجھے قدرے تسلی ہو جاتی اور وہ یہ کہ میں دو سال ان کے اندر رہ کر انہیں قریب سے دیکھ سکوں گا اور سمجھ سکوں گا کہ کیا وہ اسلام کے لیے واقعتاً اتنے ہی خطرناک ہیں جتنے کہ وہ بتائے جاتے ہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اگر اس کے بعد کوئی قادیانی کسی مسلمان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا تو میں اسے کہہ سکوں گا کہ دیکھو! میں دو سال تم میں رہ کر آیا ہوں، مجھ سے تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے اور یہ بات جو تم کہہ رہے ہو درست نہیں، اصل معاملہ یوں ہے۔ یہ سوچ کر میں مطمئن ہوگیا اور میں نے اپنے والدین کا یہ فیصلہ کہ مزید تعلیم تعلیم الاسلام کالج میں حاصل کروں دل سے قبول کر لیا۔

وہ بتاتے ہیں: جب میں وہاں داخلہ لینے کے بعد اپنے والد صاحب کے ہمراہ واپسی کے سفر پر ربوہ سے روانہ ہوا تو پنڈی بھٹیاں سے ایک مولانا بھی اس بس میں سوار ہو گئے اور میرے والد صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گئے۔ جب انہیں پتا چلا کہ ہم لوگ ربوہ سے آ رہے ہیں تو وہ چونک اٹھے اور دریافت کیا کہ ہم ربوہ کس کام کے لیے گئے تھے۔ والد صاحب نے تفصیل بتائی تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ہم مرزائی ہیں؟ والد صاحب نے نفی میں جواب دیا تو وہ بہت حیران ہوئے کہ جب ہم مرزائی بھی نہیں ہیں تو پھر لڑکے کو وہاں کیوں داخل کروایا ہے۔ والد صاحب نے کہا: اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ کہنے لگے: یہ لڑکا وہاں گمراہ ہو جائے گا۔ انہوں نے اس بات پر اتنا زور دیا کہ والد صاحب پریشان ہو گئے اور مولانا سے پوچھنے لگے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ مولانا نے جواباً کہا: یہ کون سی مشکل بات ہے۔ میں ابھی ڈرائیور کو کہہ کر بس رکواتا ہوں۔ آپ دونوں اسی وقت واپسی بس پکڑیں اور یہ کہہ کر ربوہ کالج سے اپنے سرٹیفکیٹ واپس لے لیں کہ ہم لڑکے کو کافروں کے اس کالج میں پڑھا کر گنوانا نہیں چاہتے۔ والد صاحب یہ مشورہ سن کر شش و پنج میں پڑ گئے کہ اب کس منہ سے واپس جا کر داخلہ کینسل کروایا جائے چنانچہ انہوں نے کہا: مولانا: یہ تو میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میں اب اسے اس طرح واپس نہیں لا سکتا۔ کوئی اور طریقہ بتائیں۔ اس پر مولانا کہنے لگے: ایک آسان ترکیب ہے مگر وہ آپ کی نہیں بلکہ اس لڑکے کی کرنے والی ہے اور وہ یہ کہ لڑکا وہاں جا کر اپنے کان اور آنکھیں اس طرح بند رکھے کہ اُن کی ہر بات غلط سمجھ کر نظر انداز کر دے اور جو کچھ وہاں دیکھے اس کے متعلق یقین رکھے کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا: مولانا! یہ کیسے ممکن ہے کہ جو بات غلط نہ ہو یا خلافِ واقعہ نہ ہو میں اسے بھی غلط یا جھوٹ سمجھتا رہوں؟ مولانا نے میری بات سن کر مجھے تو کچھ نہ کہا البتہ والد صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے: ''تُہاڈا اے مُنڈا گیا!'' یعنی آپ

سمجھ لیں کہ آپ کا بیٹا تو ہاتھ سے گیا۔ الغرض میں ٹی آئی کالج ربوہ میں داخل ہو گیا اور فضل عمر ہوسٹل میں رہنے لگا۔

ہوسٹل میں اپنے قیام کی بعض تفصیلات بتاتے ہوئے لال خان کہتے ہیں: غیر احمدی طلبہ نے مجھے امامُ الصلوٰۃ بنا دیا۔ ہم لوگ ایک کمرے میں باجماعت نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر ہم نے وہیں پر جمعہ کی نماز بھی ادا کرنا شروع کر دی لیکن آہستہ آہستہ غیر احمدی طلبہ نے نمازوں اور خصوصاً نمازِ جمعہ پر آنا کم کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر میں بہت دلبر داشتہ ہوا چنانچہ میں نے بیت مبارک میں جمعہ پڑھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی یہ خبر غیر از جماعت طلبہ میں پھیل گئی چنانچہ میرے بعض مقتدیوں نے مجھے طعنہ دیا کہ تم ہمارے کیسے امام ہو، کبھی نماز یہاں پڑھتے ہو اور کبھی احمدیوں کی بیتُ الذکر میں چلے جاتے ہو؟ میں نے انہیں کہا کہ تم لوگ جمعہ میں آتے نہیں ہو اور میں جمعہ چھوڑنا نہیں چاہتا اس لیے میں اگر جمعہ پڑھنے وہاں چلا جاتا ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کہنے لگے: وہ تو کافر ہیں۔ میں نے کہا: سچی بات یہ ہے کہ مجھے وہاں زیادہ مزا آتا ہے۔ پھر ہم میں کون سی ایسی خوبی زیادہ ہے جو اُن میں نہیں۔ آخر ان میں کافروں والی بات ہے کون سی؟ میری باتیں سن کر کہنے لگے: پھر تم نمازیں بھی ان ہی کے پیچھے پڑھا کرو، ہم اپنی نمازیں ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ہوسٹل کے زعیم مجلس خدام الاحمدیہ مجھے ربوہ میں ہونے والی تقریبات کے متعلق اسی طرح اطلاع دیا کرتے تھے جس طرح وہ احمدی طلبہ کو دیتے تھے اور میں اکثر جلسوں میں ان کے ساتھ چلا بھی جاتا تھا۔ دراصل میں نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھے ربوہ کی کوئی اہم تقریب مِس نہیں کرنی چنانچہ میں سب تقریبات میں شامل ہوتا حتّٰی کہ اگر چھٹیوں کے دوران جلسہ سالانہ یا کوئی اجتماع آجاتا تو میں گاؤں سے آکر اس میں شامل ہونے کی کوشش کرتا۔

لال خان کو ربوہ میں قیام کے دوران بعض معروف بزرگانِ سلسلہ کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع بھی ملتا رہا۔ وہ کہتے ہیں: میں حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری کے پاس دعا کے لیے جاتا رہتا تھا۔ ایک بار میں کچھ عرصہ ان کے پاس حاضر نہ ہو سکا تو آپ نے میرے ساتھیوں سے دریافت فرمایا کہ وہ لڑکا کیوں نہیں آرہا؟ میرے متعلق بعض اور باتیں بھی انہوں نے ان لڑکوں سے کہیں۔ بعد میں جب میں نے باقاعدہ بیعت کر لی اور حافظ صاحب سے ملنے گیا تو انکشاف ہوا کہ حافظ صاحب نے میری عدم موجودگی میں باقی لڑکوں کو بتا دیا تھا کہ لال خان ضرور احمدی ہو جائے گا چنانچہ میں نے حافظ صاحب سے پوچھا: آپ کو کیسے پتا تھا کہ میں چشمۂ احمدیت سے ضرور فیضیاب ہوں گا تو فرمانے لگے: برخوردار! ہماری عمر اِن ہی کاموں میں گزر گئی ہے۔ ہم تو چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ کسی کے دل میں کیا ہے چنانچہ ہم نے تمہارے ساتھیوں کو صاف بتا دیا تھا کہ یہ لڑکا ہمیں ملنے آئے یا نہ آئے سلسلۂ احمدیہ میں ضرور شامل ہو جائے گا۔

اگلی کہانی بھی لال خان کی زبانی ہی سنیے۔ وہ کہتے ہیں: میں دل سے تو احمدی ہو چکا تھا اور یقین رکھنے لگا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آخری زمانے میں ظہورِ امام مہدی کے متعلق جو خوشخبری دی تھی وہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے ذریعے پوری ہو چکی ہے، آپ کے سارے دعوے سچے ہیں اور آپ ہی ماموِرِ زمانہ ہیں اور آپ کو سچا نہ ماننے والا اللہ تعالیٰ کی نعمت کو ٹھکرانے والا ہے لیکن مجھے خوف تھا کہ اگر میں نے اعلانیہ بیعت کر لی تو میرے والدین مجھ

سے ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ اسی طرح بہت سے اور خدشات بھی میرے ذہن میں آتے تھے لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ میرے لیے بیعت کرنا ضروری نہیں، میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں دل سے حضور کو سچا مانتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں الفضل پڑھ لیا کروں گا، حسبِ توفیق چندہ دے دیا کروں گا اور جتنے نیک کام حضور بتاتے ہیں وہ بھی کرتا رہوں گا لیکن اعلانیہ بیعت کر کے اپنے لیے مشکلات پیدا نہیں کروں گا۔ یہ سوچ کر میں بیعت نہ کرنے کے اپنے فیصلے پر مطمئن ہو گیا۔

لال خان نے بیعت کرنے کا فیصلہ کب کیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں: اب ہمارے ایف ایس سی کے امتحان ہونے والے تھے اور یہ جو بات کر رہا ہوں اپنے دلی اطمینان کی یہ جنوری یا فروری ۱۹۶۲ء کی ہے۔ میں اس خیال سے مطمئن ہو کر اپنی پڑھائی کی طرف لگ گیا لیکن اگلے چند ہفتوں میں اس قسم کے حالات پیش آئے کہ میرے اندر ایک ہلچل مچ گئی۔ مجھے ہر وقت یہ احساس پریشان رکھنے لگا کہ امامِ زمانہ کو پہچاننے کے بعد اس کی بیعت نہ کرنا انتہائی بُزدلی، بیوقوفی اور منافقت ہے اور اگر خدانخواستہ مجھے اس حالت میں موت آجائے تو خدا تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دوں گا کہ محض ذاتی مفادات کی خاطر خدا کے مامور کی تصدیق سے محروم رہ گیا؟ غرض میں بیعت کے بغیر خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔

اس کے بعد لال خان ربوہ کے محلّہ دارالیمن میں ہونے والے جماعت کے کسی تربیتی اجلاس میں شمولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس تقریب میں مجھے یہ احساس ہوا کہ آج کا یہ سارا پروگرام اللہ تعالیٰ نے صرف مجھے سمجھانے اور میرے انشراحِ صدر کے لیے طے کروایا ہے اور اس کی بنیادی تھیم بھی یہی تھی کہ تنظیم کی کیا اہمیت ہے اور بیعت کرنے والا کس طرح امام کے ساتھ ایک ذاتی تعلق قائم کر لیتا ہے۔ اگر چند لوگ بھی ہیں اور ان کا ایک امام ہے تو وہ ایک جماعت ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر ہزاروں لاکھوں بھی ہیں مگر ان کا کوئی امام نہیں تو وہ ایک ہجوم ہے، جماعت نہیں۔ بیعت کئے بغیر ہم جماعت کا حصہ نہیں بن سکتے۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ خدا نے مجھے اس تقریب میں بُلا کر دراصل یہ سمجھایا ہے کہ امام الزّمان کو پہچاننے کے بعد اپنے موہوم خدشات کی بنیاد پر اس کی بیعت نہ کرنا پرلے درجے کی بُزدلی اور منافقت ہے۔ مجھے دل ہی دل میں سخت شرمندگی ہونے لگی اور میں نے سوچ لیا کہ مجھے فوراً بیعت کر لینی چاہئے چنانچہ رات گئے جلسہ ختم ہونے کے بعد میں سیدھا اپنے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ، چوہدری محمد علی کے پاس جا پہنچا اور کہا کہ میں بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری بات سن کر سناٹے میں آگئے۔ انہیں احمدیت میں میری دلچسپی کا علم تو تھا مگر وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اس طرح اتنی رات گئے ان کے پاس بیعت کے لیے آدھمکوں گا۔ تب انہوں نے پیار سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہارے والدین نے تمہیں پڑھائی کے لیے یہاں بھیج رکھا ہے لہٰذا اس وقت تمہاری توجہ پڑھائی کی طرف ہی رہنی چاہئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ابھی تم چھوٹے ہو، یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے لہٰذا تمہیں اس بارے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے کہا: نہیں میرا یہی فیصلہ ہے۔ آپ مہربانی فرما کر بیعت کے لیے میری مدد کریں۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں کسی طرح بھی ٹلنے والا نہیں تو انہوں نے مجھے بیعت فارم لا دیا۔ تب مجھے سکون

محسوس ہوا۔ یہ چوبیس اپریل ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔

یہ تو تھا ملک لال خان کی قبولِ احمدیت کا واقعہ۔ اب تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور طالب علم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو کسی کاروباری جھگڑے کی نذر ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ میری مراد عبدالرشید شریف سے ہے جو مولوی محمد شریف، مجاہد بلادِ عربیہ کے صاحبزادے اور مولوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری، ربوہ کے بھتیجے تھے۔ وہ تعلیم الاسلام کالج میں مجھ سے سینئر تھے چنانچہ جب میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوا وہ سیکنڈ ایئر میں تھے اور اسی اعتبار سے انہوں نے مجھ سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۶۴ء میں بی اے کر لیا تھا۔ وہ کالج کے لائق طلبہ میں سے تھے اور ۶۴۔۱۹۶۳ء کے دوران کالج یونین کے صدر بھی رہے۔ بعد میں انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا اور بطور اکنامک اِنویسٹیگیٹر حکومتِ پاکستان کی ملازمت اختیار کر لی تاہم آدمی محنتی اور ذہین تھے چنانچہ ۱۹۶۸ء میں پی سی ایس (ایگزیکٹو) کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ اور اعجاز الحق قریشی ربوہ کے وہ دو نوجوان تھے جنہوں نے ایک ہی زمانے میں آگے پیچھے اس امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی اور اس وجہ سے پورے شہر میں ان کی دھوم تھی۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران جڑانوالہ، میانوالی، لائلپور، نارووال، عیسیٰ خیل اور گوجرانوالہ میں بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر اور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر (جنرل) تعینات رہے اور پنجاب سیکرٹریٹ، لاہور میں بھی کام کرتے رہے۔

انہوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ دستی قالینوں کا کاروبار شروع کر رکھا تھا اور اپنے بعض ملازموں کی بددیانتی ان کے علم میں آ گئی تھی۔ انہوں نے ان دھوکہ باز ملازمین کو نقصان پورا کرنے یا پولیس کا سامنا کرنے کو کہہ رکھا تھا۔ ان ہی ملازمین نے عبدالرشید شریف کو ۲۳ نومبر ۱۹۹۸ء کی شام ان کے کاروباری دفتر میں قتل کر دیا۔ روزنامہ جنگ، لاہور (۲۴ نومبر ۱۹۹۸ء) نے اس قتل کی خبر تین کالمی سرخی کے ساتھ بہ ایں الفاظ شائع کی:

’’لاہور (اپنے رپورٹر سے) نولکھا کے علاقہ ٹیگور پارک میں ایڈیشنل سیکرٹری ہیلتھ، اے آر شریف اور ان کے ڈرائیور، خورشید کو ان کے کاروباری دفتر میں قتل کر دیا گیا۔ جی او آر تھری میں رہائش پذیر اے آر شریف نے نِکلسن روڈ پر ٹیگور پارک میں اپنے بیٹے عبدالعزیز کے نام پر قالینوں کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ کل رات ان کا ملازم خورشید جو پبلک ہیلتھ میں ملازم ہے خون میں لَت پَت دفتر کے گیٹ سے باہر نکلا اور گلیوں میں سے بھاگتا ہوا ایک رکشہ سے ٹکرا کر گر گیا۔ لوگوں نے اسے اٹھا کر میو ہسپتال پہنچایا جہاں وہ دم توڑ گیا۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ چند افراد اس کا تعاقب کر رہے تھے جنہوں نے اس پر فائرنگ بھی کی۔ پولیس اطلاع ملنے پر جب ٹیگور پارک پہنچی تو وہاں اے آر شریف بھی خون میں لَت پَت مردہ حالت میں پڑے تھے۔ دفتر کے صحن میں ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتولین نے حملہ آوروں کے مقابلے میں مزاحمت کی۔ باتھ روم کے بیسن میں بھی خون موجود تھا۔ وقوعہ کی رات دفتر کے ساتھ محفلِ سماع تھی۔ شور کی وجہ سے کسی کو فائرنگ کی آواز سنائی نہ دی۔ اے آر شریف کا بیٹا عبدالعزیز ہے جو اِن دنوں کاروبار کے سلسلے میں امریکہ میں ہے۔ پینتیس سالہ خورشید

وحدت کالونی کا رہائشی تھا۔ اس کی ڈیڑھ سال کی ایک بیٹی ہے۔ ڈی آئی جی لاہور رینج، شوکت جاوید نے کہا ہے کہ ایڈیشنل سیکرٹری ہیلتھ، اے آر شریف کا قتل ان کی فیکٹری کے ملازموں نے کیا ہے۔ ایک ملازم کو حراست میں لے لیا گیا ہے جس کے چہرے پر زخم کے نشان ہیں۔ واردات میں چار افراد ملوث ہیں اور سب کا تعلق اسی فیکٹری سے ہے۔ جس ملازم کو حراست میں لیا گیا ملزموں نے اس پر بھی حملہ کیا تھا اور انہوں نے اسے قالین میں لپیٹ کر کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ یہ واردات رات تقریباً نو بجے ہوئی۔ قتل ایک منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ ملزموں نے پستول پہلے ہی لا کر قالین میں چھپا دیئے تھے۔ اے آر شریف کے ایک ملازم، خوشی محمد نے بتایا کہ واردات کے وقت دفتر میں کیشیئر شاہد، ڈرائیور ذوالفقار اور مقتول کا ذاتی ڈرائیور خورشید موجود تھے۔ چوکیدار دل محمد چھٹی پر تھا جب کہ میں شام ساڑھے چھ بجے دفتر سے چلا گیا تھا۔‘‘

الفضل میں ان کے قتل کی خبر ان کے چچا، مولوی محمد صدیق کے قلم سے یکم دسمبر ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں درج ذیل الفاظ میں شائع ہوئی:

’’بے حد غم و اندوہ سے یہ خبر دی جا رہی ہے کہ میرے بھتیجے عزیز عبدالرشید شریف ابن برادرم چوہدری محمد شریف مبشر بلادِ عربیہ و مغربی افریقہ کو لاہور میں مورخہ ۹۸۔۱۱۔۲۳ شام کے وقت شرپسندوں نے گولیوں سے چھلنی کر دیا جس سے عزیز جانبر نہ ہو سکے۔

مرحوم نہایت محنتی، دیانتدار اور سلسلے کے مخلص نوجوان تھے۔ ساری ملازمت کے دوران ہمیشہ عدل و انصاف پر قائم رہے۔ نہایت خوش خلق تھے۔ مرحوم کا جسدِ خاکی مورخہ ۹۸۔۱۱۔۲۶ شام ربوہ لایا گیا اور بعد نماز مغرب بیت المبارک میں صاحبزادہ مرزا مسرور احمد، ناظر اعلیٰ و امیر مقامی نے نمازِ جنازہ پڑھائی جس میں اہلِ ربوہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

قبرستان نمبر ا میں تدفین ہوئی۔ قبر تیار ہونے پر صاحبزادہ مرزا خورشید احمد نے دعا کرائی۔‘‘

رشید شریف ڈاکٹر سعید احمد، چیف میڈیکل آفیسر، ملیریا اِریڈیکشن پروگرام جو سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت گیمبیا میں تعینات رہے کی صاحبزادی، نازلی بیگم سے شادی شدہ تھے جو اَب کینیڈا منتقل ہو چکی ہیں۔

یہ تھا عبدالرشید شریف کا واقعۂ قتل۔ آیئے اب آپ کی ملاقات کرائیں گروپ کیپٹن (ر) تنویر احمد باجوہ سے جو آج کل اولڈ آفیسرز کالونی، لاہور کینٹ میں مقیم ہیں اور تعلیم الاسلام کالج کے ہونہار اولڈ سٹوڈنٹس میں سے ہیں۔ ان کا تعلق یوں تو فیصل آباد سے ہے تاہم ان کا ننھیال ضلع سیالکوٹ میں ہے اور اس حوالے سے ان کی ابتدائی تعلیم قلعہ صوبھا سنگھ میں ہوئی۔ گھٹیالیاں قریب پڑتا تھا چنانچہ آٹھویں میں پہنچے تو انہیں تعلیم الاسلام ہائی سکول گھٹیالیاں میں داخل کرا دیا گیا۔ پھر ان کے نانا، حضرت چوہدری محمد عبداللہ جو حضرت مسیح موعود کے رفیق تھے نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں ربوہ میں تعلیم دلائی جائے چنانچہ وہ انہیں وہاں لے گئے اور تعلیم الاسلام ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔

ربوہ اور یہاں کا سکول، دونوں ان کے لیے نئے تھے چنانچہ ان سے مانوس ہوتے ہوتے انہیں کافی وقت لگ گیا۔ وہ سکول میں اپنا پہلا دن یاد کرتے ہوئے اکثر بتایا کرتے ہیں: اس روز پہلا ہی پیریڈ دینیات کا تھا۔ ماسٹر محمد ابراہیم بھامبڑی یہ پیریڈ لینے کے لیے آئے۔ میں اتفاق سے ان کے سامنے بیٹھا تھا چنانچہ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: باجوہ! قرآنِ مجید میں نباتات کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے؟ میرے لیے یہ ایک مشکل سوال تھا۔ مجھے تو نباتات کے معنی ہی نہ آتے تھے چہ جائیکہ میں ان کے سوال کا جواب دے سکتا چنانچہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ بھامبڑی صاحب نے اپنا سوال دہرایا تو بھی میں خاموش ان کے منہ کی طرف تکتا رہا۔ تب کلاس مانیٹر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا: کھڑے ہوکر ماسٹر صاحب کے سوال کا جواب دو۔ میں نے کھڑے ہونے کی حد تک تو اس حکم کی تعمیل کردی لیکن سوال کا جواب مجھے معلوم ہوتا تو دیتا۔ بھامبڑی صاحب میری کم علمی پر سخت سیخ پا ہوئے اور انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر رسیّد کردیا۔ یہ تھپڑ میرے لیے اتنا اچانک تھا کہ کچھ دیر تک تو مجھے سمجھ ہی نہ آسکی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن جب ذرا ہوش آئی تو تکلیف اور شرمندگی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے فکر ہوئی کہ اگر یہاں کے ٹیچرز اتنے ہی سخت ہیں اور انہوں نے یونہی وقت بے وقت مار پیٹ کرتے رہنا ہے تو میرا کیا بنے گا لیکن آہستہ آہستہ مجھے اندازا ہوا کہ ہمارے اساتذہ کا دل اپنے شاگردوں کے لیے شفقت سے لبریز ہے اور وہ ان کے ساتھ ماں باپ سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ مجھے سکول چھوڑے تقریباً پچپن سال ہو چکے ہیں لیکن بھامبڑی صاحب اب بھی مجھے پہچانتے ہیں اور کبھی آمنا سامنا ہو جائے تو اس محبت سے ملتے ہیں کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے جتنی دعائیں مجھے ان سے ملی ہیں شاید ہی کسی اور نے دی ہوں گی۔

موصوف کہتے ہیں: سکول کا ذکر ہو رہا ہے تو میرا ذہن ماسٹر سعد اللہ خان کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ میرے ایک کلاس فیلو، عبدالسّلام ارشد کے والدِ بزرگوار تھے تاہم ان کے بارے میں اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ بہت ہی محنت سے پڑھاتے اور ہمارا کام چیک کرنے کے لیے کاپیاں گھر لے جاتے تھے۔ مجھے ان سے کچھ دیر ٹیوشن پڑھنے کا بھی موقع ملا ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ بہت محنتی اور با اصول پایا۔ ایک بار ان کے پاس بورڈ کی طرف سے میٹرک کے پرچے مارکنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں کہ کوئی غرض مندان پرچوں کا پیچھا کرتے کرتے ربوہ ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے پھل کا ایک ٹوکرا اٹھایا ہوا تھا جو وہ ماسٹر صاحب کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ اگر ماسٹر صاحب یہ تحفہ قبول کر لیتے تو اسے عرضِ مدعا میں سہولت ہو جاتی لیکن یہاں تو موصوف نے گویا سائل کا منہ ہی بند کر دیا تھا۔ وہ اس سے بار بار کہہ رہے تھے: بھئی میں آپ کو جانتا ہی نہیں تو پھر میں آپ کا یہ تحفہ کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ براہِ مہربانی آپ یہ ٹوکرا اٹھائیں اور یہاں سے چلتے بنیں۔ سائل نے ماسٹر صاحب کی بہت منت سماجت کی لیکن انہوں نے اس کی ایک نہ سنی چنانچہ اسے اپنا سا منہ لے کر واپس جانا پڑا۔ یقیناً انہوں نے بلندی کردار کی ایک ایسی مثال قائم کر دکھائی تھی جو ہمارے رُوبہ زوال معاشرے میں عنقا ہے۔

تنویر باجوہ بتاتے ہیں: میں نے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میرے بزرگان کی خواہش تھی

کہ میں تعلیم الاسلام کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھوں چنانچہ میں نے اپنا داخلہ فارم جمع کرا دیا۔ قواعد کے مطابق انٹرویو کے لیے مجھے اپنے سرپرست کے ہمراہ پرنسپل آفس میں حاضر ہونا چاہئے تھا تاہم میں اپنی سادگی میں ایک دوست کو جو اُن دنوں بارہویں جماعت کا طالب علم تھا بطور سرپرست اپنے ساتھ لے گیا۔ اس روز نہ معلوم کیوں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی جگہ پروفیسر عطاء الرحمٰن انٹرویو لے رہے تھے۔ انہوں نے میرے ''سرپرست'' کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو انہیں اندازہ ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے چنانچہ انہوں نے میرے ''سرپرست'' سے پوچھا کہ وہ میرا سرپرست ہے یا میں اس کا سرپرست ہوں؟ انہوں نے مجھے کالج میں پروویژنل ایڈمشن تو دے دیا لیکن اس کی کنفرمیشن میرے والد بزرگوار کے اجازت نامے سے مشروط کر دی۔ میں نے بعد میں ان سے اجازت نامہ منگوا دیا تو کالج میں میرے داخلے نے حتمی شکل اختیار کر لی۔

ہمارے اس دوست کو میتھ کا مضمون پروفیسر محمد ابراہیم ناصر سے پڑھنے کا موقع ملا۔ بہ الفاظِ تنویر باجوہ وہ اس سے پہلے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں ٹیچر رہے تھے اور ان کی طبیعت میں بظاہر سختی تھی لیکن درحقیقت وہ بے حد پیار کرنے والے شخص تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں بیمار ہو گیا اور ان کے دو ٹیسٹوں میں مسلسل غیر حاضر رہا۔ تیسرے ٹیسٹ میں میرے سارے سوالات ٹھیک تھے لیکن نمبر اس نسبت سے نہیں دیئے گئے تھے۔ جب میں نے یہ تضاد ان کے گوش گزار کیا تو انہوں نے کہا: مجھے علم ہے لیکن چونکہ تم پہلے دو ٹیسٹوں میں غیر حاضر رہے تھے لہٰذا تیسرے ٹیسٹ میں تمہیں سو فیصد نمبر نہیں دیئے جا سکتے۔ اپنے اس فیصلے پر بھی ان کا رویّہ معذرت خواہانہ تھا جو اُن کے عظمتِ کردار کی دلیل تھا۔

ایک بار میرے ایک کزن، مبشر احمد باجوہ جو سکول کے زمانے سے ان کے شاگرد رہے تھے نے چھوٹی مکھی کا کچھ شہد اور چینی (جس کی اس زمانے میں بڑی قلت تھی) مجھے بھجوائی اور کہا کہ میں یہ چیزیں موصوف کے گھر جا کر انہیں پہنچا آؤں۔ میں نے چیزیں انہیں پہنچا دیں۔ چند روز کے بعد ہمارا حساب کا ایک ٹیسٹ تھا جو کسی وجہ سے بہت اچھا نہ ہوا۔ پرچے واپس ملے تو میرے بتیس نمبر تھے۔ کہنے لگے: چاہتا تو ایک دو نمبر مزید دے کر تمہیں پاس بھی کر سکتا تھا مگر تمہارے شہد اور چینی نے میرا ہاتھ روک لیا۔

جب میں ایم ایس سی میں پڑھ رہا تھا تو ایک جمعہ کے روز ربوہ چلا گیا۔ نماز جمعہ میں نے بیتِ مبارک میں ادا کی جس کے بعد دوستوں سے ملتا رہا۔ میں نے دیکھا پروفیسر صاحب ذرا دُور کھڑے ہیں۔ میں ملنے کے لیے آگے بڑھا تو فرمانے لگے: میرا دل چاہتا تھا کہ میں خود تم سے ملوں مگر استاد اور شاگرد کا رشتہ مانع تھا لہٰذا میں انتظار کر رہا تھا کہ تم کب فارغ ہو اور میری طرف آؤ۔

پروفیسر نصیر احمد خان تنویر کے فزکس کے استاد اور باسکٹ بال کے انچارج تھے۔ تنویر بتاتے ہیں: ان کی کوشش تھی کہ میں بھی باسکٹ بال کھیلوں۔ میں نے اپنی طرف سے ان کی خواہش کی تعمیل کی پوری کوشش کی تاہم میں اچھا کھلاڑی نہ بن سکا۔ مجھے یاد ہے میں کالج ٹیم کے ساتھ ایک بار پنجاب یونیورسٹی، لاہور اور ایک بار زرعی کالج، لائلپور گیا تھا تاہم میں ایکسٹرا کھلاڑی تھا لہٰذا میرے کھیلنے کی نوبت نہ آئی تاہم اس کھیل کے ساتھ

نسبت کی وجہ سے مجھے نصیر خان کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا اور میں نے انہیں بہت اصول پسند پایا۔ مجھے یاد ہے فیصل آباد میں ہمارا قیام ایک ہوسٹل میں تھا۔ ہمیں تاکید کی گئی تھی کہ ہم شام کے بعد ہوسٹل میں ہی رہیں اور باہر ہرگز نہ جائیں۔ عام طور پر لڑکوں نے اس ہدایت کی تعمیل کی لیکن کچھ شوخ لڑکوں نے پروا نہ کی اور رات گئے تک باہر رہے۔ کسی نے نصیر خان کو اس بے ضابطگی کی اطلاع دے دی۔ وہ بہت ناراض ہوئے اور ان لڑکوں کو میچ کھلانے سے انکار کردیا۔ بطور سزا ان لڑکوں کو اسی دن بذریعہ ٹرین ربوہ بھجوا دیا گیا۔ ویسے نصیر خان خوش مزاج انسان تھے اور کلاس میں طلبہ کے ساتھ ان کی نوک جھونک جاری رہتی تھی۔

مرزا خورشید احمد کا ذکر ہو تو تنویر بتاتے ہیں: موصوف وقت کے بے حد پابند اور کم گو تھے۔ طلبہ کے ساتھ بے تکلفی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک امتحان کے موقع پر شدید بارش کی وجہ سے مجھے کمرہ امتحان میں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ اس وقت تک پرچہ تقسیم ہو چکا تھا تاہم موصوف لیٹ پہنچنے والے طلبہ کو بھی پرچہ دیئے جا رہے تھے۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ بارش کی رعایت سے انہیں کچھ مزید وقت پرچہ حل کرنے کے لیے دے دیا جائے گا لیکن میاں صاحب نے وقت ختم ہوتے ہی پرچے واپس لے لیے اور طلبہ کے واویلے کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ لیٹ ہونے کے باوجود طلبہ کو کمرہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دینا ہی بہت بڑی فیور ہے کجا یہ کہ ٹائم میں بھی رعایت دی جائے۔

اپنے کلاس فیلوز کی بات ہو تو تنویر باجوہ سب سے پہلے ملک لال خان کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مولانا ابوالعطا جالندھری انہیں دینیات پڑھایا کرتے تھے چنانچہ لال خان جو اس وقت تک احمدی نہ ہوئے تھے ہر قسم کے اعتراضات کرتے رہتے۔ مولانا سے جو بَن پڑتا انہیں جواب دیتے۔ تنویر باجوہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی نوعمری اور کم علمی کی وجہ سے بعض اوقات لال خاں کے سوالات پر الجھن ہوتی مگر مولانا ماتھے پر بل لائے بغیر ان کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کرتے۔ آہستہ آہستہ ملک لال خان مطمئن ہوگئے کہ احمدیت سچی ہے چنانچہ انہوں نے اسے قبول کرلیا اور روحانی ترقی کے کئی مدارج طے کیے۔

تنویر باجوہ مزید بتاتے ہیں: میں فضلِ عمر ہوسٹل میں نہیں رہا اور نہ میں نے فلسفہ پڑھا ہے لہٰذا چوہدری محمد علی سے میرا استاد شاگرد والا رشتہ تو نہ تھا البتہ ان کے علم میں تھا کہ چوہدری اسداللہ خان امیر جماعت، لاہور میرے پھوپھا ہیں چنانچہ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی بہت محبت سے پیش آتے اور حال احوال دریافت کیے بغیر نہ جانے دیتے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ کوئی مسئلہ ہو تو انہیں بتایا جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا کوئی موقع ہی نہیں پیدا ہوا۔

پروفیسر عطاء الرحمٰن کا ذکر آ جائے تو تنویر بتاتے ہیں: وہ اچھے اور قابل اساتذہ میں سے تھے مگر افسوس ہم ان کی عظمت سے پوری طرح باخبر نہ ہو سکے۔ جب میں ایم ایس سی کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور گیا تو پروفیسر نصیر احمد ”ہیٹ“ کا مضمون پڑھاتے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں نے بی ایس سی تعلیم الاسلام کالج سے کی ہے تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بار بار کہتے تھے: تم خوش قسمت ہو اس کالج میں پڑھتے رہے ہو جہاں

پروفیسر عطاء الرحمٰن جیسے لوگ پڑھاتے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ پروفیسر نصیر احمد کسی سٹیج پر موصوف سے پڑھتے رہے تھے اور ان کی قابلیت سے حد درجہ متاثر تھے۔

قاضی محمد اسلم میرے کالج چھوڑنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور میرا ان سے براہِ راست تعارف بھی نہ تھا لیکن ایک موقع پر انہوں نے میری بہت مدد کی۔ قصہ دراصل یوں ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے معمولاتِ زندگی یکسر بدل گئے۔ سیالکوٹ کے علاقے سے سو کے قریب مہمان فیصل آباد ہمارے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ اس مصروفیت میں گورنمنٹ کالج، لاہور کا انٹری ٹیسٹ گزر گیا۔ مجھے پتا چلا تو ملا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق میں نے چوہدری اسداللہ خان سے مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے قاضی اسلم سے کہا چنانچہ قاضی صاحب نے گورنمنٹ کالج میں فزکس کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ، ڈاکٹر طاہر حسین سے معاونت کے لیے کہا۔ موصوف نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے داخل کرلیں گے لیکن اس کے لیے مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے کچھ وقت انتظار کیا لیکن جب کام ہوتا نظر نہ آیا تو میں نے ڈاکٹر طاہر حسین کو فون کر کے یاددہانی کرادی۔ انہوں نے مجھے تو کچھ نہیں کہا البتہ قاضی صاحب کو ربوہ فون کر کے اس بات کی اطلاع دے دی۔ چند روز بعد قاضی محمد اسلم سے ملاقات ہوئی تو وہ فرمانے لگے: طاہر میرا ماتحت رہا ہے لیکن میں نے اسے کبھی فون پر تمہارے لیے نہیں کہا۔ مجھے جب بھی یاددہانی کرانا ہوتی ہے میں لاہور جا کر اس کے دفتر میں اس سے مل کر یاددہانی کراتا ہوں اور تم ہو کہ اسے ڈائریکٹ فون کردیا۔ مجھے قاضی صاحب کی بات سن کر ازحد شرمندگی ہوئی لیکن کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لینا ممکن نہیں تھا۔ میری اس نادانی کے باوجود ڈاکٹر طاہر حسین نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور کچھ دنوں کے بعد مجھے گورنمنٹ کالج میں داخلہ دے دیا۔

ایک بار کسی انگریزی اخبار میں چوہدری ظفراللہ خان کی ایک تصویر شائع ہوئی جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا گویا وہ کسی نوجوان طالبہ سے ہاتھ ملا رہے ہوں۔ اخبار میں اس تصویر کی اشاعت کا مقصد چوہدری صاحب کی کردارکشی کے علاوہ کچھ نہ تھا اور اس حوالے سے اخبار کامیاب بھی رہا چنانچہ ایک دو مواقع پر ان سے اس حوالے سے سوالات بھی پوچھے گئے۔ تنویر کہتے ہیں: ان ہی دنوں کی بات ہے۔ میں لاہور میں پڑھ رہا تھا کہ ایک روز چوہدری اسداللہ خان کے ساتھ مجھے ربوہ جانا پڑا۔ معلوم ہوا کہ تعلیم الاسلام کالج نے چوہدری ظفراللہ خان کو خطاب کے لیے مدعو کر رکھا ہے اور اتفاق سے یہ تقریب اسی روز منعقد ہو رہی ہے۔ میں اپنے دوستوں یعنی جمیل لطیف (جو کابل والے حضرت صاحبزادہ عبداللطیف کے پوتے ہیں) اور داؤد (جو چوہدری شاہنواز کے بھتیجے تھے) کے ہمراہ اس تقریب میں چلا گیا۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک طالب علم نے چوہدری صاحب سے اس امر کی تصدیق چاہی کہ کیا انہوں نے واقعتاً اس لڑکی سے ہاتھ ملایا تھا۔ چوہدری صاحب نے اس افواہ کی تردید کی لیکن سوال کنندہ اخبار میں شائع ہونے والی اس تصویر کے حوالے سے اپنی بات پر مصر رہا جس پر انہوں نے کہا: میں آپ لوگوں کے لیے حَکَم کا درجہ نہیں رکھتا۔ حَکَم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے اور آپ کے بعد حضرت مسیح موعود کی ذات۔ اگر آپ دونوں کے اُسوہ سے غیر محرموں سے مصافحے کا

جواز ملتا ہے تو یہ بات جائز ہے ورنہ ناجائز۔ میرے ہاتھ ملانے یا نہ ملانے سے یہ بات جائز یا ناجائز ثابت نہیں ہوتی۔ اس پر جمیل لطیف کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے کہ آپ کا جواب تسلی بخش معلوم نہیں ہوتا جس پر موصوف نے قدرے برہمی کا اظہار کیا۔

اس تقریب میں چوہدری محمد علی بھی موجود تھے اور وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تقریب ختم ہوئی تو انہوں نے ہم تینوں کو طلب کرلیا اور سمجھانے لگے کہ ہم شاید چوہدری ظفر اللہ خان کے مقام سے پوری طرح واقف نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ربوہ میں خلیفۃ المسیح کے مہمان تھے لہٰذا ان سے اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کسی طور پر مناسب نہ تھی۔ ہم نے چوہدری صاحب سے اپنی غلطی کی معذرت کی اور ان سے اجازت لے کر گول بازار میں خواجہ ریستوران پر جا بیٹھے۔ وہاں چوہدری اسد اللہ خاں پہلے سے تشریف فرما تھے۔ میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا تو موصوف بہت ہنسے اور چوہدری ظفر اللہ خان (جنہیں ان کے خاندان والے ''باباجی'' کہا کرتے تھے) کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے: لوگ ایسے باتیں بنا رہے ہیں۔ باباجی اب اس عمر میں ہیں کہ اگر وہ کسی عورت سے ہاتھ ملا بھی لیں تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔

تنویر باجوہ نے ایم ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں پاکستان ایئرفورس جوائن کرلی اور ٹریننگ کی کامیاب تکمیل کے بعد ۱۹۶۹ء میں بطور پائلٹ آفیسر کمیشن حاصل کرلیا۔ ۱۹۹۶ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ گروپ کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کئی سال تک فوجی فاؤنڈیشن میں جنرل منیجر رہے۔ یاد رہے وہ پاکستان ایئرفورس کے پہلے ریٹائرڈ آفیسر تھے جنہیں فوجی فاؤنڈیشن میں ملازمت کا موقع دیا گیا۔ آج کل وہ انجینئرنگ کی ایک پرائیویٹ فرم میں کام کر رہے ہیں اور خاموشی کے ساتھ جماعت کی خدمت میں بھی مصروف رہتے ہیں۔

اور اب کچھ ذکر محمود مجیب اصغر کا!

محمود مجیب جن کا تعلق بھیرہ سے ہے کالج میں ہم سے ایک سال سینئر لیکن پری انجینئرنگ گروپ میں تھے۔ شروع سے ہی لائق فائق تھے چنانچہ انہیں ایف ایس سی کے امتحان کی بنیاد پر ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور میں داخلہ مل گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسی سال تعلیم الاسلام کالج سے ایف ایس سی کرنے والے چھ اور طالب علم: سلطان محمود باجوہ، لال خان، عبدالسّلام ارشد، بشیر احمد طارق، کریم احمد طاہر اور افضل مبشر بھی ان کے ساتھ ہی انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ ان میں سے سلطان محمود غیر از جماعت تھے اور بعد میں پاکستان ایئرفورس میں چلے گئے جب کہ افضل مبشر کسی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ یوں ان سات طلبہ میں سے ماشاءاللہ چھ انجینئر بن کر نکلے۔

مجیب نے صرف دو سال تعلیم الاسلام کالج میں پڑھا لیکن اس کی خوشگوار یادیں آج بھی ان کے دل میں موجزن ہیں اور وہ ایک سے زیادہ بار ان کا ذکر اپنے مضامین میں کر چکے ہیں جو جماعتی اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کا ایک ایسا ہی مضمون ''تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی چند حسین یادیں'' کے عنوان سے الفضل

میں چھپا ہوا ہے جس میں وہ رقمطراز ہیں کہ ایک بار نوٹس بورڈ پر اچانک یہ نوٹس لگا کہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد فلاں روز فرسٹ ایئر کے طلبہ سے خطاب فرمائیں گے۔ مجیب بتاتے ہیں کہ مقررہ وقت پر جملہ طلبہ ہال میں اکٹھے ہوگئے۔ ایک نہایت پُر وقار اور نورانی چہرے والے وجود ڈائس پر آئے اور تشہّد تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ جب ان سے فرسٹ ایئر والوں کو ویلکم ایڈریس دینے کی فرمائش کی گئی تو فوری طور پر ان کے ذہن میں کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ پھر انہوں نے دعا کی اور یوں جو باتیں ذہن میں آئیں وہ بطور نصیحت انہوں نے ہم تک پہنچائیں۔ یہ تین نصائح تھیں: محنت کی عادت، حسد سے اجتناب اور دعا۔ مجیب کہتے ہیں: ''یہ ایسی باتیں تھیں جو دل کو لگ گئیں اور حقیقت میں ساری زندگی میں کامیابی اور ترقی کا یہی راز ہے۔''

ہمارے یہ دوست تحدیثِ نعمت کے طور پر لکھتے ہیں: ''کالج میں بہترین تربیت، ڈِسپلن، اچھی پڑھائی اور اعلیٰ اخلاقی تربیت ملتی تھی۔ پروفیسر بہت ہمدرد اور شفیق ہوا کرتے تھے۔ ان سب کی محنت اور دعاؤں نے کالج کے معیار کو بڑا بلند کر دیا تھا اور وہاں سے پڑھ کر اکثر طالب علموں نے زندگی میں بڑی کامیابی اور ترقی حاصل کی۔ مجھے ذاتی طور پر شروع میں انگلش میں لیکچرز کی بہت تھوڑی سمجھ آتی تھی۔ غالباً دیہاتی ماحول کا اثر تھا اس لیے میں فرسٹ ایئر میں بیک بینچرز میں سے تھا۔ فرسٹ ایئر کا اِنٹرنل امتحان ہوا اور ساتھ ہی سیکنڈ ایئر کی کلاسیں شروع ہوگئیں۔ ایک روز پروفیسر نصیر احمد خان صاحب نے پہلے غالباً رول نمبر ۱۶ کو سِیٹ پر کھڑا کیا اور بتایا کہ اس کے فزکس میں سب سے کم نمبر آئے ہیں۔ پھر انہوں نے میرا رول نمبر پکار کر مجھے کھڑا کیا۔ میں سخت خوف زدہ تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ شاید فیل ہوگیا ہوں لیکن خان صاحب نے فرمایا: آپ تو چھپے رستم نکلے ہیں۔ آپ فزکس کے مضمون میں اول آئے ہیں۔ اسی طرح کیمسٹری کی کلاس میں پروفیسر ایس ایم شاہد...... نے بتایا کہ میں ان کے مضمون میں بھی فرسٹ آیا ہوں۔ پھر کیا تھا ہم کلاس میں مشہور ہوگئے اور طالب علم پوچھنے لگے: آپ کیسے پڑھتے ہیں؟ کتنا پڑھتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اور میں اندر ہی اندر شرمندہ ہوتا رہتا تھا۔''

موصوف کی ملازمت کا زیادہ حصہ پاکستان میں گزرا۔ ان کی تعیناتی مختلف کمپنیوں میں پاکستان کے مختلف شہروں میں رہی جس کی وجہ سے انہیں مظفرگڑھ، روہیلانوالی، علی پور، گڑھ مہاراجہ، کوٹ اڈو، نارنگ منڈی، مریدکے، خیرپور میرس، حیدرآباد، نواب شاہ، لالہ موسیٰ، میرپور (آزاد کشمیر)، دینہ، راولپنڈی، اسلام آباد، پسنی، لاہور، پشاور، کوہاٹ، بنوں، بروٹھہ، منگلا اور خدا جانے کہاں کہاں رہنے کا موقع ملا۔ میرا خیال ہے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا محاورہ صرف ان ہی کے لیے بنا ہے۔ ان کی ملازمت کا کچھ عرصہ اومان میں بھی گزرا جس کی عوام الناس میں شناخت مسقط کے حوالے سے ہے۔ وہ اومان میں ہائی ویز اینڈ ٹرانسپورٹیشن انجینئرنگ کے شعبے میں بعض پراجیکٹس کے ریذیڈنٹ انجینئر رہے۔

خوش قسمت ہیں کہ انہیں ہر جگہ جماعتی خدمت کا موقع بھی ملتا رہا چنانچہ وہ دو بار امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع مظفرگڑھ اور ایک بار امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع اٹک رہے۔ انہیں مجلس خدام الاحمدیہ اور مجلس انصار اللہ کے تحت بھی بعض ذمہ داریاں پوری کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی ہے۔

وہ جہاں بھی رہے انہیں احمدی ہونے کے ناطے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا رہا اور ایک دو بار تو نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے لیکن اللہ تعالیٰ جلد ہی ان کے لیے متبادل اور بہتر انتظام فرما دیتا رہا۔

غازی بروتھہ ہائیڈرو پاور پراجیکٹ میں اپنی تعیناتی کے دوران انہیں ایک سنگین حادثہ پیش آیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی جان محفوظ رکھی۔ وہ ایک رات راولپنڈی سے بروتھہ جا رہے تھے کہ بروتھہ سے ذرا پہلے جہاں سڑک پُر پیچ تھی بعض شرارتی عناصر نے درخت کاٹ کر سڑک بند کر رکھی تھی اور خود اپنے شکار کی تاک میں چھپے بیٹھے تھے۔ جب مجیب کی موٹر عین اس جگہ پہنچ گئی جہاں یہ عناصر گھات لگائے بیٹھے تھے تو انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا لیکن خدا نے بچانا تھا سو ان کا ڈرائیور رِیوَرس گیئر لگا کر گاڑی کو پوری تیزی سے واپس لے جانے میں کامیاب گیا۔ ان لوگوں نے جو تعداد میں آٹھ یا دس تھے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن نہ معلوم کیوں انہیں فائر کھولنے کی توفیق نہ ملی۔ محمود مجیب اصغر رَبِّ کُلُّ شَیءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِیْ وَانْصُرْنِیْ وَارْحَمْنِیْ کا وِرد کرتے ہوئے جی ٹی روڈ پر اس جگہ پہنچے جہاں پولیس چیک پوسٹ تھی اور موجود اہلکاروں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اطلاع ملنے پر ایک ڈی ایس پی موقع پر پہنچا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سڑک صاف کرائی اور انہیں اپنی حفاظت میں بروتھہ پہنچایا۔

مجیب کا خیال ہے کہ یہ ڈاکہ زنی کی واردات نہ تھی بلکہ احمدیت مخالف عناصر کی طرف سے ان کی جان لینے کی سازش تھی جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے ناکام بنا دیا اور وہ ہر طرح محفوظ و مامون رہے۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد سے محلّہ دارالصدر شمالی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے وقف بعد از ریٹائرمنٹ کی توفیق بھی پائی چنانچہ وہ چھ سال تک نگران تعمیرات وقف جدید انجمن احمدیہ رہے۔ وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ انہیں خلافتِ خامسہ کے انتخاب میں بھی حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔

موصوف ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں چنانچہ الفضل اور جماعتی جرائد میں مضامین کے علاوہ ان کی بعض کتب بھی شائع ہو چکی ہیں اور ایم ٹی اے پر کئی پروگرام نشر ہو چکے ہیں۔

ملک طاہر احمد جو ملک حبیب الرحمٰن، انسپکٹر آف سکولز کے صاحبزادے ہیں بھی اسی زمانے میں تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں ایف ایس سی (پری میڈیکل گروپ) میں داخلہ لیا لیکن وہ سالانہ امتحان میں اتنے نمبر حاصل نہ کر پائے جس کی بنیاد پر انہیں کسی میڈیکل کالج میں داخلہ مل سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بی ایس سی کرنے کے بعد دوبارہ اپنی یہ حسرت پوری کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اس مرحلہ پر بھی ناکامی ہوئی چنانچہ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں بی اے کر لیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ بیکاری میں گزرا لیکن بالآخر قسمت نے یاوری کی اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں انہیں سٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ میں ملازمت مل گئی۔ یہ بنک بعد میں حبیب بنک لمیٹڈ کے ساتھ مدغم ہو گیا۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران سرگودھا، بھلوال اور لاہور میں تعینات رہے۔ ان کی آخری تقرری حبیب بنک کی مین مارکیٹ، گلبرگ برانچ میں تھی جہاں وہ اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ تھے۔ انہوں نے ۲۰۰۱ء میں اپنے ذاتی حالات کی وجہ سے گولڈن ہینڈ شیک لے لیا اور اپنی رہائش کے لیے لاہور کو پسند کیا۔

موصوف مخلص احمدی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک مخلص احمدی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں چنانچہ ان کے بعض مضامین الفضل میں چھپتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی تحقیقی و تخلیقی سرگرمیوں میں ان کی معاونت میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ طبعاً ملنسار ہیں اور معذوری کے باوجود جمعہ کی نماز پر باقاعدگی سے آتے ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب ماشاءاللہ وسیع ہے۔

ربوہ میں قیام کے دوران وہ مجلس خدام الاحمدیہ کے ایک انتہائی فعّال رکن تھے۔ وہ صاحبزادہ مرزا رفیع احمد کے دورِ صدارت میں عبدالعزیز ڈوگر، مہتمم مقامی کی مجلسِ عاملہ میں ناظم عمومی کے علاوہ بعض دیگر ذمہ دار عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اسی طرح انہیں لاہور میں بھی کچھ خدمت کا موقع ملا جس کی تفصیلات وہ فخر و عجز کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے دوستوں کو سناتے رہتے ہیں۔

جب ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے وقت کی بات ہو تو وہ بے حد جذباتی ہو جاتے ہیں۔ یادوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ اُمڈ آتا ہے اور وہ اس موضوع پر گھنٹوں، بے تکان باتیں کر سکتے ہیں۔ وہ بتایا کرتے ہیں: میں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول، شیخوپورہ سے پاس کیا تھا جہاں میرے والدِ بزرگوار اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لوں۔ اُن دِنوں صاحبزادہ مرزا ناصر احمد خود داخلہ کے امیدواروں کے انٹرویو کر رہے تھے۔ دورانِ انٹرویو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون سے مضامین رکھنا چاہتا ہوں۔ میں چونکہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اس لیے عرض کی کہ پری میڈیکل گروپ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے مجھ سے ایک دو معمولی سوال کئے اور پھر والدِ محترم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر اچانک مڑ کر میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ قواعد کے مطابق تم پری میڈیکل گروپ میں داخلہ تو لے سکتے ہو کیونکہ میٹرک میں تمہاری فرسٹ ڈویژن ہے لیکن تم ڈاکٹر بن نہیں سکو گے۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ والدِ محترم کے ساتھ باتیں کرنے لگ گئے لیکن تقدیرِ الٰہی مسکرا مسکرا کر کہہ رہی تھی: تم کو کیا معلوم کہ تم کس ہستی کے سامنے بیٹھے ہو اور اس نے یہ بات کیوں اور کیسے کہی ہے؟ آپ کے منع فرمانے کے باوجود میں نے پری میڈیکل گروپ میں داخلہ لے لیا اور ارادہ کر لیا کہ میں خوب محنت کر کے آپ کی بات غلط ثابت کر دکھاؤں گا لیکن خدائی نوشتے پورے ہو کر رہتے ہیں۔ میں نے پورا زور لگایا لیکن ایف ایس سی میں میرے نمبر اتنے نہ آسکے کہ میں میڈیکل کالج میں جا سکتا۔ اپنی اس ناکامی پر میں نے بی ایس سی میں داخلہ لے لیا اور اگلے دو سال یہ سوچتا رہا کہ میں بی ایس سی کے بعد میڈیکل کالج میں چلا جاؤں گا لیکن جب اس مرحلہ پر بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے یقین ہو گیا کہ صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا یہ ارشاد کہ میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا الٰہی اشارے کے بغیر نہ تھا۔

اُن دِنوں کالج کی یونیفارم سیاہ انڈر گریجوایٹ گاؤن اور اسی رنگ کی جناح کیپ پر مشتمل تھی۔ طلبہ کو اجازت تھی کہ گاؤن کے نیچے شلوار قمیص یا پینٹ، کچھ بھی پہن سکتے ہیں۔ یہ ایک اچھا فیصلہ تھا لیکن وہ سٹوڈنٹ ہی کیا جو انتظامیہ کے فیصلوں پر ناک منہ چڑھائے بغیر عمل کرے چنانچہ ایک آنکھ مچولی تھی جو کالج کے چیف پراکٹر،

صوفی بشارت الرحمٰن اور سٹوڈنٹس میں ہمہ وقت جاری رہتی۔ میں نے کئی مرتبہ یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک سٹوڈنٹ گاؤن یا ٹوپی کے بغیر برآمدہ میں تقریباً بھاگتا ہوا جا رہا ہے اور صوفی بشارت الرحمٰن اُتنی ہی تیزی سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں تا اس لڑکے کی شناخت کر سکیں اور یہ جان سکیں کہ اُس کا نام اور رول نمبر کیا ہے اور وہ کس کلاس کا طالب علم ہے۔ یہ ساری معلومات اس لیے ضروری ہوتیں کیونکہ ان کے بغیر قواعد کی خلاف ورزی کرنے والے اس طالب علم پر جرمانہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان دنوں لڑکے مذاقاً کہا کرتے تھے کہ کالج ہال ان ہی جرمانہ جات سے جمع ہونے والی رقم سے تعمیر ہوا ہے۔

ایک روز ہم لوگ بیالوجی ڈپارٹمنٹ میں برآمدے میں کھڑے غالباً پیریڈ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ ہمیں دُور سے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد آتے دکھائی دیئے۔ میں نے اتفاق سے گاؤن اور ٹوپی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ لڑکوں نے کہا کہ اگر میں اسی کیفیت میں آگے بڑھ کر آپ سے مصافحہ کر دکھاؤں تو وہ ٹک شاپ میں ایک گرینڈ پارٹی دیں گے۔ نوعمری اور ناتجربہ کاری تھی میں ان کی باتوں میں آ گیا اور سوچ لیا کہ میں آپ سے مصافحہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ نکلوں گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مصافحہ کرتے ہی آپ نے میری کلائی مضبوطی کے ساتھ پکڑ لی اور مسکرا کر فرمانے لگے: اب جاتے کدھر ہو؟ پھر آپ دفتر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نوٹس بورڈ کے پاس سے گزرا تو مجھ پر ایک روپیہ جرمانے کا نوٹس آویزاں ہو چکا تھا۔ میں نے کسی لڑکے سے گاؤن اور ٹوپی مانگی، جرمانہ معافی کی درخواست لکھی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ آپ کی طرف سے پہلا سوال یہ تھا کہ میں ٹوپی اور گاؤن کس سے مانگ کر لایا ہوں؟ میں جواباً خاموش رہا؛ اظہارِ ندامت کی ایکٹنگ کی اور پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ فرمایا کہ چودہ آنے ادا کردو، دو آنے میں معاف کر دیتا ہوں۔ چائے پی لینا۔ میں نے گزارش کی کہ چودہ آنے معاف فرما دیں، دو آنے میں ادا کر دوں گا۔ میری یہ درخواست آپ نے بہت ہی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرلی اور یہی حکم درخواست پر لکھ دیا۔ آپ کا یہ محبت بھرا سلوک صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہر سٹوڈنٹ کے ساتھ تھا اور یہ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ آئندہ کے لیے طلبہ محتاط ہو جاتے۔

طاہر پروفیسر سیّد حبیب الرحمٰن سے بیالوجی پڑھتے رہے ہیں۔ وہ احمدی نہیں تھے لیکن برسوں تک کالج میں پڑھاتے رہے۔ طاہر کہتے ہیں: ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا جماعت کے بارے میں کیا خیال ہے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ میں عقائد کی بحث میں الجھے بغیر ایک بات کا بصدقِ دل اعتراف کرتا ہوں کہ میری دانست میں مرزا بشیر الدین محمود احمد میں لیڈر شپ کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے باقی کاموں کو چھوڑتے ہوئے ربوہ کے نام سے ایک نئے شہر کی آبادکاری ہی ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

موصوف کالج کی فٹ بال ٹیم کے کیپٹن رہے اور اس حوالے سے ان کے پاس بعض دلچسپ یادیں موجود ہیں۔ ان کی عملی زندگی بطور بینکر گزری۔ انہیں اس زمانے کے بہت سے واقعات بھی یاد ہیں۔ وہ بتایا کرتے ہیں: ۱۹۷۷ء میں جب فوجی حکومت برسرِ اقتدار آئی تو میں لاہور چھاؤنی میں حبیب بینک کی سرور روڈ برانچ میں

کام کر رہا تھا۔ اس برانچ میں فوج کے بہت سے حاضر سروس اور ریٹائرڈ افسران اور جرنیلوں کے اکاؤنٹس تھے۔ اُن میں ایک بڑا نام لیفٹیننٹ جنرل (ر) محمد اعظم خان کا تھا جو ایوب خان کے دورِ حکومت میں اُس وقت کے مشرقی پاکستان کے ایک ہردلعزیز گورنر کے طور پر شہرت پا چکے تھے۔ طاہر کہتے ہیں: جب میں نے انہیں دیکھا وہ خاصے چاق و چوبند تھے۔ قد درمیانہ، آنکھیں نہایت روشن اور پیشانی پر قریباً دو انچ لمبا اور دو سینٹی میٹر چوڑا نہایت چمکیلا برتھ مارک تھا جو اُن کے مردانہ حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ بے حد نرم خُو، بااخلاق اور منکسر المزاج تھے۔ وہ جب بھی بینک آتے تو سیدھے ہمارے منیجر، سرفراز محمد بھٹی کے پاس چلے جاتے اور وہیں تشریف فرما ہوتے لیکن کام کے سلسلے میں مجھے بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہتا اور یوں اُن سے ملاقات ہو جاتی۔ میں ان دنوں کیولری گراؤنڈ کالونی میں رہتا تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک احمدی، قریشی نورالحسن مقیم تھے۔ وہ وفاقی حکومت سے سیکشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اسلام آباد سے لاہور آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ بیٹے کی چھاؤنی میں سیمنٹ کی ایجنسی تھی۔ اس کے خلاف مارشل لا کے تحت بلیک میں سیمنٹ فروخت کرنے کا کیس درج ہوگیا۔ قریشی نورالحسن کو علم تھا کہ میں جنرل اعظم سے متعارف ہوں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں جنرل اعظم سے کہہ کر لاہور کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، میجر جنرل غلام ربانی کے ذریعے اُن کے بیٹے کا کیس ختم کرادوں۔ میں نے حامی بھر لی اور ایک دن جب جنرل اعظم بینک میں تشریف لائے تو میں نے اپنی درخواست ان کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے جواب دیا کہ کسی وقت میں اور قریشی نورالحسن ان کے گھر واقع سینٹ جان پارک، بالمقابل فورٹریس سٹیڈیم، لاہور چھاؤنی آ جائیں چنانچہ ہم اگلے ہی روز ان کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ انہوں نے ہمارا بہت خوشدلی سے استقبال کیا اور موسم کے مطابق خاطر مدارت بھی فرمائی۔ اس کے بعد انہوں نے قریشی نورالحسن کی بات بہت تحمل سے سُنی اور فرمانے لگے کہ اگر وہ حلفاً کہہ دیں کہ ان کا بیٹا اس معاملہ میں بے قصور ہے تو وہ اس کا کیس ختم کرا دیں گے تاہم قریشی نورالحسن نے کہا کہ احمدی ہونے کے ناطے وہ یہ بات حلفاً نہیں کہہ سکتے۔ اس پر بات ختم ہوگئی اور ہم واپس آ گئے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوتا رہا جنرل اعظم پر اس بات کا گہرا اثر رہا کہ احمدی جھوٹ نہیں بولتے۔

۱۹۸۸ء میں جب طاہر حبیب بینک کی بادامی باغ، لاہور برانچ میں بطور منیجر کام کر رہے تھے گارڈ گروپ آف انڈسٹریز کے اکاؤنٹس اسی برانچ میں تھے جنہیں وہ بڑی تگ و دو کے بعد بی سی سی آئی سے لے کر آئے تھے۔ اس گروپ کے چیف ایگزیکٹو افتخار علی ملک تھے جو لاہور چیمبر آف کامرس کے بہت فعّال رکن تھے۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے محمد علی کلے پاکستان کے دورہ پر آئے۔ افتخار علی ملک نے اُن کے اعزاز میں لاہور کے پرل کانٹینینٹل ہوٹل میں ایک استقبالیہ کا انتظام کیا جس میں طاہر بھی مدعو تھے۔ وہ کہتے ہیں: اس استقبالیہ میں بے شمار لوگ آئے ہوئے تھے اور لاہور کا شاید ہی کوئی بڑا صنعتکار یا تاجر ہوگا جو وہاں موجود نہ ہو۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے محمد علی کلے کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ مختصر سی گفتگو کا بھی موقع ملا۔

طاہر کا ذکر بس اتنا ہی۔ اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے ڈاکٹر مقبول احمد سے جو ملک محمد عبداللہ،

سابق لیکچرر دینیات، تعلیم الاسلام کالج کے صاحبزادے اور ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک ٹی آئی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے بتایا کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا احسان ہے میرا شمار کالج کے لائق طلبہ میں ہوتا تھا اور المنار کے اردو اور انگریزی، دونوں حصوں میں میرے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اسی دور میں کالج کے طلبہ کے درمیان انگریزی مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا جس میں بفضلہٖ تعالیٰ میں اوّل قرار پایا اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ہاتھوں سے انعام بھی وصول پایا۔ وہ مزید کہتے ہیں: کالج میں دینیات کی تعلیم لازمی تھی۔ اس کا سالانہ امتحان نظارت تعلیم لیتی تھی۔ میں اس میں بھی فرسٹ آیا تھا جس کے صلے میں کانووکیشن کے موقع پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور خالدِ احمدیت مولانا جلال الدین شمس کے ہاتھوں مجھے انعام اور سرٹیفکیٹ ملا۔ کالج میں قیام کے دوران کئی مشہور ہستیوں بشمول چوہدری ظفر اللہ خان، مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر زیڈ اے ہاشمی کے خطابات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

مقبول نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم ایس سی (باٹنی) کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران کالج میں بخاری آڈیٹوریم کا افتتاح ہوا جس کے لیے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو دعوت دی گئی تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے مقبول ایوب خان کو ربوہ ریلوے سٹیشن پر دیکھ چکے تھے تاہم اس فنکشن میں انہیں ایوب خان کو قریب سے دیکھنے اور براہِ راست سننے کا یادگار موقع ملا۔

موصوف نے ایم ایس سی کا امتحان ۱۹۶۶ء میں پاس کیا جس کے بعد انہوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت کمیشن کے تحت صرف لاہور میں ایک ادارہ کام کر رہا تھا جو Mother Centre کہلاتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد فیصل آباد میں نوکلیئر انسٹیٹیوٹ فار ایگریکلچر اینڈ بیالوجی (نیاب) کے قیام پر ان کا تبادلہ وہاں ہوگیا اور کمیشن کی طرف سے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی میں ان کی ڈاکٹریٹ کا انتظام بھی ہوگیا۔ وہ زرعی یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مقیم تھے کہ ۱۹۷۴ء کی اینٹی احمدیہ موومنٹ شروع ہوگئی اور شرپسندوں نے احمدی طلبہ کا ہوسٹل میں مزید قیام ناممکن بنا دیا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا سارا سامان کمرے سے باہر نکال کر نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس سامان میں وہ کاغذات بھی شامل تھے جو انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی کی ریسرچ کے حوالے سے جمع کر رکھے تھے۔ احمدیوں کے خلاف اٹھنے والی نفرت کی اس تازہ لہر کے نتیجے میں ان کا پی ایچ ڈی کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ مقبول نے بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی تو کر لی لیکن ڈگری ملنے تک ان کے کئی قیمتی سال ضائع ہو چکے تھے۔ انہیں یہ ڈگری ۱۹۸۹ء میں ملی۔ وہ بتاتے ہیں: عرصۂ دراز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کا نووکیشن منعقد ہوئی تھی چنانچہ میں نے یہ ڈگری صدرِ پاکستان، غلام اسحاق خان کے ہاتھوں وصول کی۔

مقبول نے اپنے محکمہ میں احمدی سرکاری ملازمین کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کی وجہ سے ۵۰ سال کی عمر میں پری میچوٗر ریٹائرمنٹ لے لی اور اسلام آباد میں ڈیرہ لگا لیا۔ وہ آج کل آئی۔۱۰ میں مقیم ہیں اور

اسلام آباد کی جماعت کے سیکرٹری رشتہ ناطہ ہیں۔

ہمارے یہ دوست خوش قسمت ہیں کہ اِنہیں اُس زمانے میں زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جب صاحبزادہ مرزا مسرور احمد بھی وہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مقبول اُس دَور کو افتخار و انبساط کے ملے جلے جذبات سے یاد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں: آپ تعلیم الاسلام کالج میں اباجان کے شاگرد رہے تھے۔ اس لیے مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے تاہم آپ کے ساتھ میرا ذاتی تعلق زرعی یونیورسٹی میں قائم ہوا۔ آپ سیّد قاسم شاہ کے ساتھ بہت دفعہ کمرہ نمبر۱۰، طارق ہال میں میرے پاس تشریف لاتے اور مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی۔ بالعموم میرے کمرے میں چائے وغیرہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ نوش فرماتے۔ ہمارے ایک احمدی دوست، ڈاکٹر افتخار احمد تبسم جو اُن دنوں طارق ہال کے کمرہ نمبر۸ میں مقیم تھے کے ہاں نماز کا اہتمام تھا۔ بعض اوقات آپ نہایت شفقت سے نماز کی امامت کے لیے مجھے آگے کر دیتے۔ نہایت سادہ طبیعت پائی تھی۔ اپنی شادی پر مجھے مدعو کیا۔ ایک بار نیاب آفیسرز کالونی میں میری رہائش پر تشریف لائے اور دوپہر کا کھانا میرے ہمراہ تناول فرمایا۔ ربوہ میں اپنے آفس میں مجھے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ میرے اباجان کا نہایت احترام سے ذکر کرتے اور ہمیشہ انہیں دعا کے لیے پیغام بھجواتے۔ ایک بار اسلام آباد میں ہمارے حلقہ میں تشریف بھی لائے۔ میری والدہ کی وفات پر پہلے بذریعہ فون اور بعد میں اسلام آباد آکر بالمشافہ تعزیت فرمائی۔ جلسہ سالانہ یُوکے ۲۰۱۴ء کے موقع پر مجھے دو دفعہ ملاقات کا شرف بخشا اور دونوں دفعہ اپنے ہمراہ فوٹو کھنچوانے کا موقع عنایت فرمایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب خاکسار ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو مقررہ وقت پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری اشارہ کر رہے تھے کہ باقی بہت سے لوگ ملاقات کے منتظر ہیں لیکن حضور نے ازراہِ شفقت مجھے دس منٹ ملاقات کا موقع دیا۔ یہی نہیں، آپ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت فرمائی کہ وہ میری پاکستان واپسی سے پہلے ایک بار اور ملاقات کے لیے ٹائم دے دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

مقبول اپنی اس خوش قسمتی پر بھی نازاں ہیں کہ اُنہیں نوبل انعام یافتہ سائنسدان، ڈاکٹر عبدالسلام کی معیّت میں ایک بار فیصل آباد سے ربوہ سڑک کے راستے سفر کا موقع مل چکا ہے۔ وہ بتاتے ہیں: ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان تشریف لاتے تو بالعموم نیاب بھی وِزِٹ کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے نیاب کی وِزِٹ مکمل کرنے کے بعد ربوہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ڈائریکٹر، ڈاکٹر امیر محمد خان نے جو بعد میں پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کونسل کے چیئرمین اور صدرِ پاکستان کے مشیر بھی رہے مجھے اور ڈاکٹر محی الدین مرزا کو ساتھ بھجوایا۔ مجھے اب بھی یاد ہے ہم نے یہ سفر نیاب کی گاڑی میں کیا تھا اور اسے شیر افضل خان، ڈرائیور چلا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی گفتگو کا محور ان کی اس دلی خواہش کا مظہر تھا کہ دنیائے اسلام بالعموم اور پاکستان کی حکومت بالخصوص ملک میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے لیے اپنی مساعی میں تیزی پیدا کر سکے۔ مجھے ان کی یہ بات بھی یاد ہے کہ کسی بھی ملک میں سائنسدانوں کی کمیونٹی بے حد چھوٹی ہوتی ہے اور پاکستان میں تو یہ کمیونٹی اور بھی چھوٹی ہے۔ اگر ان میں

سابق لیکچرر دینیات، تعلیم الاسلام کالج کے صاحبزادے اور ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک ٹی آئی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے بتایا کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا احسان ہے میرا شمار کالج کے لائق طلبہ میں ہوتا تھا اور المنار کے اردو اور انگریزی، دونوں حصوں میں میرے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اسی دور میں کالج کے طلبہ کے درمیان انگریزی مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوا جس میں بفضلہٖ تعالیٰ میں اوّل قرار پایا اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے ہاتھوں سے انعام بھی وصول پایا۔ وہ مزید کہتے ہیں: کالج میں دینیات کی تعلیم لازمی تھی۔ اس کا سالانہ امتحان نظارت تعلیم لیتی تھی۔ میں اس میں بھی فرسٹ آیا تھا جس کے صلے میں کانووکیشن کے موقع پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور خالدِ احمدیت مولانا جلال الدین شمس کے ہاتھوں مجھے انعام اور سرٹیفکیٹ ملا۔ کالج میں قیام کے دوران کئی مشہور ہستیوں بشمول چوہدری ظفر اللہ خان، مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر زیڈ اے ہاشمی کے خطابات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

مقبول نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے ایم ایس سی (باٹنی) کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران کالج میں بخاری آڈیٹوریم کا افتتاح ہوا جس کے لیے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو دعوت دی گئی تھی۔ اگرچہ اس سے پہلے مقبول ایوب خان کو ربوہ ریلوے سٹیشن پر دیکھ چکے تھے تاہم اس فنکشن میں انہیں ایوب خان کو قریب سے دیکھنے اور براہِ راست سننے کا یادگار موقع ملا۔

موصوف نے ایم ایس سی کا امتحان ۱۹۶۶ء میں پاس کیا جس کے بعد انہوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس وقت کمیشن کے تحت صرف لاہور میں ایک ادارہ کام کر رہا تھا جو Mother Centre کہلاتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد فیصل آباد میں نوکلیئر انسٹیٹیوٹ فار ایگریکلچر اینڈ بیالوجی (نیاب) کے قیام پر ان کا تبادلہ وہاں ہوگیا اور کمیشن کی طرف سے فیصل آباد کی زرعی یونیورسٹی میں ان کی ڈاکٹریٹ کا انتظام بھی ہوگیا۔ وہ زرعی یونیورسٹی کے ہوسٹل میں مقیم تھے کہ ۱۹۷۴ء کی اینٹی احمدیہ موومنٹ شروع ہوگئی اور شرپسندوں نے احمدی طلبہ کا ہوسٹل میں مزید قیام ناممکن بنا دیا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کا سارا سامان کمرے سے باہر نکال کر نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس سامان میں وہ کاغذات بھی شامل تھے جو انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی کی ریسرچ کے حوالے سے جمع کر رکھے تھے۔ احمدیوں کے خلاف اٹھنے والی نفرت کی اس تازہ لہر کے نتیجے میں ان کا پی ایچ ڈی کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ مقبول نے بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی تو کر لی لیکن ڈگری ملنے تک ان کے کئی قیمتی سال ضائع ہو چکے تھے۔ انہیں یہ ڈگری ۱۹۸۹ء میں ملی۔ وہ بتاتے ہیں: عرصۂ دراز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کا نووکیشن منعقد ہوئی تھی چنانچہ میں نے یہ ڈگری صدرِ پاکستان، غلام اسحاق خان کے ہاتھوں وصول کی۔

مقبول نے اپنے محکمہ میں احمدی سرکاری ملازمین کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کی وجہ سے ۵۰ سال کی عمر میں پری میچوٗر ریٹائرمنٹ لے لی اور اسلام آباد میں ڈیرہ لگا لیا۔ وہ آج کل آئی۔۱۰ میں مقیم ہیں اور

اسلام آباد کی جماعت کے سیکرٹری رشتہ ناطہ ہیں۔

ہمارے یہ دوست خوش قسمت ہیں کہ اِنہیں اُس زمانے میں زرعی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جب صاحبزادہ مرزا مسرور احمد بھی وہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مقبول اُس دَور کو افتخار و انبساط کے ملے جلے جذبات سے یاد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں: آپ تعلیم الاسلام کالج میں ابا جان کے شاگرد رہے تھے۔ اس لیے مجھ پر بھی شفقت فرماتے تھے تاہم آپ کے ساتھ میرا ذاتی تعلق زرعی یونیورسٹی میں قائم ہوا۔ آپ سیّد قاسم شاہ کے ساتھ بہت دفعہ کمرہ نمبر ۱۰، طارق ہال میں میرے پاس تشریف لاتے اور مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی۔ بالعموم میرے کمرے میں چائے وغیرہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ نوش فرماتے۔ ہمارے ایک احمدی دوست، ڈاکٹر افتخار احمد تبسم جو اُن دنوں طارق ہال کے کمرہ نمبر ۸ میں مقیم تھے کے ہاں نماز کا اہتمام تھا۔ بعض اوقات آپ نہایت شفقت سے نماز کی امامت کے لیے مجھے آگے کر دیتے۔ نہایت سادہ طبیعت پائی تھی۔ اپنی شادی پر مجھے مدعو کیا۔ ایک بار نِیاب آفیسرز کالونی میں میری رہائش پر تشریف لائے اور دوپہر کا کھانا میرے ہمراہ تناول فرمایا۔ ربوہ میں اپنے آفس میں مجھے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔ میرے ابا جان کا نہایت احترام سے ذکر کرتے اور ہمیشہ انہیں دعا کے لیے پیغام بھجواتے۔ ایک بار اسلام آباد میں ہمارے حلقہ میں تشریف بھی لائے۔ میری والدہ کی وفات پر پہلے بذریعہ فون اور بعد میں اسلام آباد آ کر بالمشافہ تعزیت فرمائی۔ جلسہ سالانہ یُو کے ۲۰۱۴ء کے موقع پر مجھے دو دفعہ ملاقات کا شرف بخشا اور دونوں دفعہ اپنے ہمراہ فوٹو کھنچوانے کا موقع عنایت فرمایا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب خاکسار ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو مقررہ وقت پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری اشارہ کر رہے تھے کہ باقی بہت سے لوگ ملاقات کے منتظر ہیں لیکن حضور نے ازراہِ شفقت مجھے دس منٹ ملاقات کا موقع دیا۔ یہی نہیں، آپ نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت فرمائی کہ وہ میری پاکستان واپسی سے پہلے ایک بار اور ملاقات کے لیے ٹائم دے دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

مقبول اپنی اس خوش قسمتی پر بھی نازاں ہیں کہ اُنہیں نوبل انعام یافتہ سائنسدان، ڈاکٹر عبدالسّلام کی معیّت میں ایک بار فیصل آباد سے ربوہ سڑک کے راستے سفر کا موقع مل چکا ہے۔ وہ بتاتے ہیں: ڈاکٹر عبدالسّلام پاکستان تشریف لاتے تو بالعموم نِیاب بھی وِزِٹ کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے نِیاب کی وِزِٹ مکمل کرنے کے بعد ربوہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ڈائریکٹر، ڈاکٹر امیر محمد خان نے جو بعد میں پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کونسل کے چیئرمین اور صدرِ پاکستان کے مشیر بھی رہے مجھے اور ڈاکٹر محی الدین مرزا کو ساتھ بھجوایا۔ مجھے اب بھی یاد ہے ہم نے یہ سفر نِیاب کی گاڑی میں کیا تھا اور اسے شیر افضل خان، ڈرائیور چلا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکٹر عبدالسّلام کی گفتگو کا محور ان کی اس دلی خواہش کا مظہر تھا کہ دنیائے اسلام بالعموم اور پاکستان کی حکومت بالخصوص ملک میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے لیے اپنی مساعی میں تیزی پیدا کر سکے۔ مجھے ان کی یہ بات بھی یاد ہے کہ کسی بھی ملک میں سائنسدانوں کی کمیونٹی بے حد چھوٹی ہوتی ہے اور پاکستان میں تو یہ کمیونٹی اور بھی چھوٹی ہے۔ اگر ان میں

اتفاق ہوگا تو وہ بہتر نتائج پیدا کرسکیں گے لیکن اگر ان میں کسی بھی وجہ سے اختلافات ہوں گے تو وہ کبھی مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کرسکیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ماموں، ملک حبیب الرحمٰن، سابق ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہاں تشریف لے جانا تھی چنانچہ ہم انہیں محلّہ دارالبرکات میں ان کے ماموں کے مکان پر چھوڑ کر چلے آئے۔ میں تو دوبارہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے حاضر نہیں ہوسکا البتہ محی الدین مرزا اگلے روز بھی ان سے ملے تھے۔ محی الدین مرزا کی روایت کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے ان سے میری غیر حاضری کے بارے میں خاص طور پر استفسار کیا تھا۔ یہ ان کی اس عاجز پر شفقت تھی ورنہ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

مقبول مزید بتاتے ہیں: میری ہمشیرہ طاہرہ ملک جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بایوکیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھی تھی پی ایچ ڈی کے لیے کیلفورنیا یونیورسٹی گئیں لیکن کسی وجہ سے انہیں ایم فِل کے بعد واپس آنا پڑا۔ کیلیفورنیا میں قیام کے دوران انہوں نے ایک بار مجھ سے ڈاکٹر عبدالسّلام کا پتا حاصل کر کے ایک خط لکھا جس میں اپنا تعارف کرانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود اس خط کے جواب میں انہیں اپنے دستخطوں سے دو کتابیں ارسال کیں۔ ایک کتاب جو اَب ان سے ضائع ہو چکی ہے کے صفحہ اول پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے اس خط کا جواب لکھ کر ان کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ دوسری کتاب کا نام Ideals and Realities ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جو سی ایچ لوئی کا مرتب کردہ ہے۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے اور اس پر ڈاکٹر صاحب کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر پڑھی جاسکتی ہے:

To Tahira Malik

With my best wishes

Sd/-

Abdus Salam

18.10.87

میں نے اس بات کی مزید تصدیق کے لیے طاہرہ ملک کو فون کیا تو انہوں نے بتایا: ہاں! یہ بات درست ہے۔ انہوں نے مجھے Ideals and Realities کے سرورق اور پہلے صفحے کی فوٹو کاپی بھی ارسال کی جہاں ڈاکٹر عبدالسلام کی یہ تحریر پڑھی جاسکتی ہے۔ طاہرہ ملک کے ساتھ میری یہ گفتگو گیارہ اپریل ۲۰۱۷ء کو ہوئی تھی۔ افسوس! وہ اس کے ایک ہفتہ بعد اپنے گھر پر کسی سفاک قاتل کے ظلم وستم کا شکار ہو کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

طاہرہ ملک اور مقبول کا ذکرِ خیر ختم کرنے سے پہلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مقبول کی روایت کے مطابق ایک بار پاکستان میں چین کے سفیر نیاب کی وزٹ کے لیے آئے تو معلوم ہوا کہ ان کا پروگرام ربوہ

جانے کا بھی ہے چنانچہ چوہدری ظہور احمد باجوہ جو اُن دنوں ناظر امورِ عامہ تھے ان کے استقبال کے لیے فیصل آباد ایئرپورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ خیال تھا کہ چینی سفیر پہلے نیاب کا دورہ کریں گے لیکن انہوں نے پہلے ربوہ جانے کو ترجیح دی چنانچہ ڈاکٹر امیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ گئے۔ انہوں نے ربوہ سے واپسی پر میرے سامنے ذکر کیا کہ چینی سفیر ربوہ کے پُرامن اور صاف ستھرے ماحول سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے خوشگوار انداز میں فرمایا کہ میں نے دو جگہوں پر پولیس نہیں دیکھی، ایک چین میں جب کہ دوسری جگہ ربوہ ہے۔ چینی سفیر نے اس امکان کا بھی اظہار کیا کہ ربوہ کے نواحی پہاڑیوں کے نیچے مختلف معدنیات خصوصاً کوئلہ کے ذخائر موجود ہوسکتے ہیں جن پر توجہ دینے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

یاد رہے کہ تاریخِ احمدیت کی جلد ۲۸ مؤلفہ اسفندیار منیب کے مطابق چین کے اِس سفیر کا نام چانگ تنگ تھا اور وہ پاکستان میں اپنے سفارتخانے کے تھرڈ سیکرٹری، چِین سُونگ لُو کی معیت میں سترہ اپریل ۱۹۷۲ء کو ربوہ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی طرف سے قصرِ خلافت کے عقبی لان میں دی جانے والی چائے کی دعوت میں شرکت کی؛ زیرِ تعمیر بیت اقصیٰ دیکھی؛ ایوانِ محمود میں رات کے کھانے کی دعوت میں شامل ہوئے؛ بعض جماعتی دفاتر اور جامعہ احمدیہ کا معاینہ کیا اور اگلے روز حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کے ساتھ الوداعی ملاقات کے بعد واپس لائل پور تشریف لے گئے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں اپنے سکول اور کالج کے ان پانچ ہم جماعتوں کو آپ سے متعارف کرانا چاہتا ہوں جن کا ذکر ''قریۂ جاوداں'' میں سہواً رہ گیا تھا۔ میری مراد محمد نواز، منصور گورایہ، نیاز، عبدالغفور احسان اور انتصار سے ہے جن میں سے ایک اب کاروبار سے منسلک ہیں، دوسرے نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد زراعت کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے، تیسرے بہت سالوں سے امریکہ میں ہیں، چوتھے فوج سے ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں اور پانچویں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

محمد نواز میرے ان دوستوں میں سے تھے جو نویں جماعت میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے اور میٹرک ہم نے ایک ساتھ کیا۔ کالج میں داخل بھی ایک ہی ساتھ ہوئے لیکن انہوں نے اپنے لیے پری میڈیکل گروپ پسند کیا اور راقم آرٹس کی طرف چلا گیا۔ والدین کی شدید خواہش اور اپنی کوشش کے باوجود ڈاکٹری کے شعبے میں نہ جاسکے تو آرٹس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اسی تگ ودو میں اپنے ساتھیوں سے کچھ پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے بی اے ۱۹۶۸ء میں کیا اور پھر ماڈرن موٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی اور ماڈرن شوگر ملز لمیٹڈ، سانگلہ ہل میں کام کرتے رہے لیکن جب یہی مل فوجی فاؤنڈیشن نے خرید لی تو وہ فاؤنڈیشن کی ملازمت میں آ گئے۔ وہ کئی سال تک مشہور تعمیراتی فرم، ایم ایل سی میں بھی ملازم رہے لیکن ۱۹۸۳ء میں غلامی کا جوُا گردن سے اتار کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ نہ جانے کن کن مراحل سے گزرے ہوں گے لیکن بعد میں تین مختلف کمپنیوں کے نام سے کام کرنے لگے جن میں سے سٹیل کرافٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ کا نام زیادہ جانا پہچانا ہے۔

۲۰۰۴ء سے لاہور کے علاقہ ڈیفنس میں رہائش پذیر تھے۔ چوہدری محمد علی کی وفات کے بعد ایک شام

ان کے چاہنے والے نواز ہی کے گھر بیٹھ کران کا ذکر خیر کرتے رہے جس کے بعد کھانا ہوا۔اسی دوران منکشف ہوا کہ موصوف کاروں اور موٹر سائیکلوں میں استعمال ہونے والے بعض پرزہ جات بنایا کرتے تھے اور انہیں اس کام میں اتنی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ ان کا تیار کردہ مال شاذ ہی ریجیکٹ ہوتا۔خدا نے اپنی بے شمار نعمتوں سے نواز رکھا تھا لیکن بڑھاپے کی آمد آمد تھی اس لیے کسی وقت خود کو مضمحل محسوس کرنے لگتے۔ یہ کتاب مکمل ہو چکی تھی کہ ایک شام اُن کے بیٹے، اظفر نواز کی طرف سے ان کی وفات کا پیغام موصول ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

منصور احمد جنہیں ہم شناخت کے لیے بسا اوقات منصور گورایہ بھی کہا کرتے تھے چھٹی جماعت میں ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔سرگودھا کے کسی چک کے رہنے والے اور شیزان والے چوہدری شاہنواز کے دُور کے عزیزوں میں سے ہیں۔ نہ جانے ہم دونوں میں کیا قدرِ مشترک تھی کہ غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ہمارے ورنیکولر فائنل کے امتحان میں ایک پرچہ زراعت کا بھی ہوتا تھا اور اس کے لیے ایک کاپی تیار کرنا پڑتی تھی جس میں مختلف بیجوں، فصلوں اور درختوں کے پتوں اور پھولوں کے نمونہ جات چپکا کران میں سے ہر ایک کے بارے میں تعارفی معلومات درج کی جاتی تھیں۔ ہم یہ کاپی بروقت نہ تیار کر پائے تھے چنانچہ مجھے یاد ہے ہم نے اس امتحان سے فوراً پہلے پورے دو دن ربوہ کے مضافات میں یہ نمونہ جات جمع کرنے میں گزارے۔

میٹرک کرنے کے بعد ہم کالج میں بھی اکٹھے رہے۔ منصور کو باسکٹ بال کا شوق تھا چنانچہ وہ تعلیم الاسلام کالج کی اس ٹیم کے ممبر رہے جس نے غالباً ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتی تھی۔ان کی یادداشت کے مطابق ٹیم کے باقی ارکان میں نصیر بُندہ، مجید، رفیق قمر اور بعض دوسرے لڑکے شامل تھے۔

ہم دونوں نے بی اے ایک ہی سال میں کیا۔ میں تو بعد میں ایم اے کرنے لاہور چلا گیا لیکن منصور نے فوج میں کمیشن حاصل کرلیا۔

انہوں نے آٹھویں وار کورس میں شمولیت اختیار کی اور اگلے تیس سال فوج میں رہنے کے بعد ۱۹۹۳ء میں بطور میجر ریٹائر ہوئے۔ان سے اگر پوچھا جائے کہ کیا انہیں مشرقی پاکستان بھی فوجی خدمت انجام دینے کا موقع ملا تو وہ کہتے ہیں: جب وہاں پر جھگڑے نے سنگین صورت اختیار کرلی تو میرے بہت سے ساتھیوں کو وہاں بھجوایا گیا تاہم نہ جانے کیوں میری باری نہیں آئی۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بڑی پریشانی سے محفوظ رکھنا تھا۔

منصور نے ریٹائرمنٹ کے بعد نہ کوئی ملازمت کی نہ کاروبار اور زراعت سے منسلک رہے۔اب ان کا ایک بیٹا جو ٹیلی کام انجینئر ہے کچھ عرصہ پی ٹی سی ایل میں ملازمت کرنے کے بعد سویڈن جا چکا ہے جب کہ چھوٹا بیٹا نیویارک میں ہے۔ ایک بیٹی ہے جو پیا دیس سدھار چکی ہے اور آج کل دبئی میں مقیم ہے۔ منصور اپنی اہلیہ کے ہمراہ ڈیفنس میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ تنہا تو رہ گئے ہیں لیکن خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ چلتے پھرتے ہیں، انہیں بھوک ٹھیک لگتی ہے اور نیند صحیح آتی ہے۔ میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ اس عمر میں انسان کو اور چاہیے بھی کیا ہوتا ہے۔

ہمارے ایک اور کلاس فیلو نیاز احمد ہیں جو استانی حمیدہ راشدہ کے صاحبزادے اور حضرت صوفی غلام محمد،

رفیق حضرت مسیح موعود کے نواسے ہیں۔ سکول کی بالکل ابتدائی کلاسز سے ہمارے ساتھ رہے، میٹرک ہم نے ایک ساتھ کیا اور پھر تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں داخل ہوگئے۔ گیارہویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے ایمرسن کالج، ملتان میں مائیگریشن کرالی مگر ایف ایس سی کے بعد پڑھائی جاری نہ رکھ سکے۔ جب دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو درمیان میں تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔انہوں نے بی ایس سی ۱۹۶۸ء میں ایس ای کالج، بہاولپور سے کی۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے داؤد گروپ آف انڈسٹریز کے ساتھ ملازمت کا آغاز کیا۔ پھر طویل عرصہ آرکو فارماسیوٹیکلز، Cyanamid (Pakistan) Ltd اور ای آر سکوِب اینڈ سنز کے ساتھ کام کرتے رہے لیکن ۱۹۸۵ء میں نیشنل فوڈز لمیٹڈ میں ملازم ہو گئے اور یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا۔

نیاز ۱۹۸۹ء سے ہیوسٹن، امریکہ منتقل ہو چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: میں نے تو کبھی یہاں آنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا لیکن اتفاق سے لاٹری میں میری بیوی کا ویزا نکل آیا۔ہم اس موقع پر کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا پاکستان میں ترقی کے مواقع کے باوجود ہم امریکہ چلے آئے۔ یہاں میں ایک ٹریول ایجنسی چلا رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کام اچھا ہے اور ہمیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں۔

ان کی شادی ۱۹۸۳ء میں ہوئی تھی۔ان کی دو بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر چکے ہیں۔

نیاز سے رابطہ ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی کہ ان کی ہمشیرہ، بریرہ نے ان کا فون نمبر مہیا کر کے ان سے ٹوٹا ہوا رشتہ بحال کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ میری خوش قسمتی وہ ان ہی دنوں پاکستان آنے کا پروگرام بنا رہے تھے چنانچہ طے یہ ہوا کہ وہ لاہور آ کر مجھے ضرور اطلاع دیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس وقت بے حد محدود تھا اور انہوں نے اگلی صبح لاہور سے روانہ ہو جانا تھا لیکن انہوں نے مہربانی کی اور مجھے فون پر بتایا کہ ہم لاہور کے پرل کانٹینینٹل ہوٹل میں جہاں وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں پہلے سے گئے ہوئے تھے مل سکتے ہیں۔ میں انہیں وہاں سے گھر لایا اور یوں ہمیں کچھ دیر اکٹھے مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔ بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہوئیں۔اس دوران ان سب بزرگان کا ذکرِ خیر بھی ہوتا رہا جو ان کی طرح مجھے بھی بے حد عزیز اور میرے لیے قابلِ تکریم تھے تاہم یہ چند گھنٹے گویا پلک جھپکتے میں گزر گئے جس کے بعد میں ان کی خواہش کے مطابق انہیں علامہ اقبال ٹاؤن میں ان کے ایک دوست کے گھر اس امید پر چھوڑ آیا کہ ہمارا رابطہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ شکر ہے امریکہ واپسی کے بعد وہ اپنا یہ عہد نہیں بھولے اور موقع بموقع فون پر یاد کرتے رہے بلکہ اس کے جلد ہی بعد ایک بار پھر پاکستان آئے تو ملاقات کا موقع فراہم کیا۔ خدا تعالیٰ انہیں اس نیکی کی جزائے خیر عطا فرمائے۔

اور اَب ذکر بریگیڈیئر (ر) عبدالغفور احسان کا جن کا تعلق ڈیرہ غازی خاں سے ہے اور جو ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے۔ اس لحاظ سے وہ میرے ہم جماعت تو ضرور تھے تاہم مضامین کے اختلاف کے سبب ہماری آپس میں بے تکلفی نہ تھی۔ مدتِ دراز کے بعد غالباً ۲۰۱۲ء میں جب میرا تقرر

زعیم اعلیٰ انصار اللہ، حلقہ گلبرگ، لاہور کے طور پر ہوا تو ربوہ میں مجلس انصار اللہ مرکزیہ کی ایک میٹنگ میں چائے کے ایک وقفہ کے دوران میں نے انہیں خواص کی ٹیبل پر بیٹھے دیکھا تو چہرہ کچھ شناسا سا لگا تاہم اس عرصے میں ہم دونوں میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی کہ پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔ حقیقتِ حال کا احساس ہوا تو پتا چلا کہ یہ عبدالغفور زاہد ہی ہیں جو تکمیلِ تعلیم کے بعد فوج میں چلے گئے تھے اور بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ ان دنوں وہ انصار اللہ میں قائد علاقائی تھے۔ اس کے بعد جب بھی ملے بہت محبت کے ساتھ اور زحمت کر کے میری بیٹی کی شادی میں بھی شامل ہوئے۔

جب میں لاہور کینٹ منتقل ہو رہا تھا تو حسنِ اتفاق سے ان کا مکان اور میری مجوزہ رہائش قریب قریب تھی۔ میں خوش تھا کہ ان کا قرب نصیب رہے گا مگر اُس وقت تک وہ کینیڈا شفٹ ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے اور میرے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ پاکستان سے رخصت ہو گئے۔ اب وہ کینیڈا میں ہیں اور اپنے حالات پر مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ خدا ان کا یہ فیصلہ ان کے لیے بابرکت کرے۔

جامکے چیمہ سے تعلق رکھنے والے انتصار میرے ان دوستوں میں سے تھے جو میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلے کے لیے ربوہ آئے تھے۔ ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات گول بازار میں اتفاقاً ہوئی جس کے بعد ہم نے چار سال کالج میں دوستوں کی طرح گزارے۔ ان کے والدِ بزرگوار، اقبال احمد ایاز جو واقفِ زندگی تھے ایک طویل بیماری کے بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو وفات پا گئے تھے جس کے بعد انتصار اپنی والدہ، دو بھائیوں اور ایک بہن سمیت محلّہ دارالصدر غربی میں آ مقیم ہوئے۔ محنتی انسان تھے لیکن گھریلو حالات نے انہیں بی اے کے بعد مزید تعلیم کی اجازت نہ دی چنانچہ وہ ملازمت کے سلسلے میں سندھ چلے گئے۔ اس زمانے میں ان سے خط و کتابت رہتی تھی۔ وہ اپنے حالات سے دل برداشتہ تھے اور بیرونِ ملک جانا چاہتے تھے۔ ایک روز اچانک ان کا خط موصول ہوا جس سے پتا چلا کہ وہ بہت سی مشکلات میں سے گزر کر اٹلی پہنچ چکے ہیں اور اپنے لیے کسی مناسب ذریعۂ معاش کی تلاش میں ہیں۔ بعد میں ان کے دونوں بھائی، دلدار اور زبیر بھی ان سے آن ملے اور انہوں نے ہینڈی کرافٹس کا کاروبار شروع کر دیا۔

مجھے اور میری اہلیہ کو ۲۰۰۰ء میں اٹلی جانا تھا۔ میں نے کسی طرح ان کا نمبر ڈھونڈ نکالا اور اپنے پروگرام سے مطلع کیا تو انہوں نے اصرار کیا کہ ہم روم میں اپنے قیام کے دوران ان ہی کے پاس ٹھہریں۔ ہم نے تین یا چار دن ان کے ہاں قیام کیا جس دوران میں انہوں نے ہمیں روم اور گرد و نواح کے بعض سیاحتی مقامات کی خوب خوب سیر کرائی اور جب وہ اپنی مصروفیت کے سبب خود ہمارا ساتھ نہ دے سکتے دلدار جو اُن دنوں فارغ تھے کو ہمارے ہمراہ بطور گائیڈ بھجوا دیتے۔ اس کے چند سال بعد مجھے اپنے ایک غیر از جماعت دوست کے ہمراہ دوبارہ اٹلی جانے کا موقع ملا تو بھی انہوں نے اپنے پاس ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ ہم بوجوہ ان کی یہ دعوت تو قبول نہ کر سکے البتہ وہ سیر میں ہمارے ہمرکاب رہے اور ایک شام ہمیں ایک انڈین ریسٹوران میں کھانے پر بھی مدعو کیا۔

انتصار کی شادی راہِ مولیٰ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے داؤد جان کی صاحبزادی، امینہ خانم سے

ہوئی تھی۔ یہ وہی داؤد جان ہیں جن کے بہیمانہ قتل کا واقعہ تاریخِ احمدیت جلد ۱۸ مؤلفہ مولانا دوست محمد شاہد میں بہ ایں الفاظ ملتا ہے:

”آپ موضع جاجی ضلع پختیمہ صوبہ کابل کے رہنے والے تھے اور علاقہ کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے خاندان میں اکیلے اور نہایت مخلص احمدی تھے جو تھوڑا ہی عرصہ قبل ربوہ میں آ کر حضرت مصلح موعود کے ہاتھ پر بیعت سے مشرّف ہوئے تھے۔ آپ دسمبر ۱۹۵۵ء کے جلسہ سالانہ ربوہ میں شامل ہوئے اور ربوہ میں...... ایک ماہ تک قیام کیا۔

واپسی پر لوگوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ آپ ربوہ گئے تھے انہیں پکڑ لیا گیا اور علاقہ کے حاکم سے مطالبہ کیا کہ اسے موت کی سزا دو مگر حاکمِ علاقہ شریف انسان تھے۔ اُن کے دل میں رحم تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس کے قتل کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا۔ ہمارے ملک میں مذہبی آزادی ہے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ حاکم اسے مارنے کے لیے تیار نہیں تو انہوں نے قید خانہ پر حملہ کر دیا، اس کے دروازے توڑ دیئے اور داؤد جان کو قید خانہ سے نکال باہر کیا اور دریافت کیا کہ وہ گزشتہ جلسہ سالانہ کے موقع پر ربوہ...... گیا تھا۔ انہوں نے کہا: ہاں میں گیا تھا۔ اس پر انہیں کھلے میدان میں کھڑا کر کے (قتل کر) دیا گیا۔

یہ دردناک واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی البتہ بعض قرائن کی رُو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ فروری ۱۹۵۶ء کے آخری ایام تھے۔“

روشن دین تنویر کے یہ اشعار موصوف ہی کے بارے میں ہیں:

ایک جاں اور بربریت کا ہجُوم
اک شعاعِ نُور ، طوفانِ ظلُوم
اے ستم آراؤں کی بستی سنبھل
تجھ پہ منڈلاتی ہے تقدیرِ سدُوم
محوِ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کا سبق
لیکن ازبر جبر و طُغیاں کے علوم
قتلِ انساں ، خونِ معصومی ہیں کیا
رحمۃٌ لِلعالمینی کے رسوم؟
تیری جانبازی کی اے داؤد جان
پڑ گئی ہے عشق کی دنیا میں دُھوم
رِیت ہے تنویر اہلِ عشق کی
زخم کھا کر تیغ کو لیتے ہیں چُوم

داؤد جان کا ذکرِ خیر فی الحال اتنا ہی۔ اب دوبارہ اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے میں یہ عرض کروں

گا کہ انتصار اور ان کے دونوں بھائی مختصر وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

زبیر جو بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اپنی ایک بھانجی کی شادی کے موقع پر لاہور آئے ہوئے تھے کہ کسی اُچکّے کی طرف سے موبائل فون چھیننے کی کوشش کی مزاحمت پر ۲۳ دسمبر ۲۰۰۵ء کو اپنی ہمشیرہ کے گھر کے سامنے قتل ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر محض سنتالیس برس تھی۔ وہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ قبر پر لگے ہوئے کتبے کے مطابق ''آپ ایک لمبا عرصہ تک صدر جماعت احمدیہ روم رہے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں آپ کے گھر میں ادا کی جاتی تھیں۔''

دلدار جن سے ان کے قیامِ پاکستان کے زمانے میں جب وہ فیصل آباد میں کسی جگہ ملازمت کرتے تھے ہماری بکثرت ملاقات رہتی تھی زبیر کی اچانک وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد ۸ ستمبر ۲۰۰۶ء کو وفات پا گئے۔ ان کی نعش بھی تدفین کے لیے ربوہ لائی گئی۔

رہے انتصار تو وہ بھی اس واقعہ کے بعد زیادہ لمبا عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ بظاہر ان کی صحت اچھی تھی لیکن اچانک ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ ڈائلسس کے سہارے زندہ تھے لیکن یہ سلسلہ آخر کب تک چل سکتا تھا۔ وہ بالآخر زندگی کی بازی ہار گئے اور ان کی نعش تدفین کے لیے ربوہ لائی گئی۔ ان کی قبر پر سنگ مرمر کا سبز کتبہ لگا ہوا ہے۔ کتبے پر یہ سادہ سی تحریر لکھی ہے:

....

ملک انتصار احمد

Malik Intisar Ahmed

S/O

Malik Iqbal Ahmad Khan Ayaz

ITALY

DOB 31-08-1948

DOD 23-04-2016

اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡلَہٗ وَارۡحَمۡہُ وَ نَوِّرۡ مَرۡقَدَہٗ وَ ارۡفَعۡ دَرَجَاتَہٗ وَاَدۡخِلۡہُ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡم •

اب کوئی ایسا بے تکلف دوست باقی نہیں جس کے پاس بیٹھ کر انتصار اور دلدار کی باتیں کی جا سکیں۔ ہاں! انتصار کے ایک ماموں، ناصر جو ٹویوٹا فیصل آباد کے مالکان میں سے ہیں کا دَم غنیمت ہے۔ ان سے کبھی بات ہو تو مرحومین کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے رکھے کہ وہ خود کچھ عرصہ پہلے فالج کے حملے کا شکار ہو گئے تھے تاہم اب بہتر ہیں اور اپنی تمام ضروریات خود پوری کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

یہ تو تھا تعلیم الاسلام کالج میں اپنے بعض سینئر ساتھیوں اور بعض کلاس فیلوز کا ذکرِ خیر۔ اب ملاحظہ فرمائیے بعض ایسے ہونہار طلبہ کا ذکر جو میرے بعد تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے۔

اس کے ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے علم و عرفاں: جلوہ آرائی میں یکتا ہے نگارِ ربوہ

قارئین کرام اب تک یہ جان چکے ہیں کہ میں نے ۱۹۶۵ء میں تعلیم الاسلام کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا جس کے بعد میں مزید تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی چلا گیا۔ ابتدا میں تو کالج آنا جانا لگا رہا لیکن آہستہ آہستہ اس کا جواز ختم ہوتا گیا اور نہ اپنے سے بعد آنے والے طلبہ سے رابطے کی کوئی صورت باقی رہی۔ ۱۹۷۲ء میں کالج نیشنلائز ہو گیا جس کے بعد اس کے حالات بدل گئے اور ۱۹۷۴ء کے تکلیف دہ واقعات کے بعد تو کالج کا وہ نقشہ ہی نہ رہا۔ وہ اساتذہ جن سے میں نے براہِ راست اکتسابِ فیض کیا تھا ریٹائر ہو رہے تھے اور ان میں سے کچھ راہیٔ ملکِ عدم ہو چکے تھے لہٰذا ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب اس کالج کے ساتھ میرا رابطہ بالکل منقطع ہو گیا۔ اس کے باوجود مجھے کالج کے اُن طالب علموں کے بارے میں جنہیں خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عملی زندگی میں نمایاں کامیابیوں سے نوازا تھا مختلف ذرائع سے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ان طلبہ میں سے بعض نے سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان کا امتحان پاس کیا، مختلف سروسز میں آئے اور خاطر خواہ ترقی بھی کی اور بعض نے فوج کو اپنا کیریئر بنانا چاہا لیکن وہ بوجوہ ایک خاص حد سے آگے ترقی نہ کر سکے۔ یہی کچھ ان طلبہ کے ساتھ ہوا جنہوں نے ایئر فورس یا نیوی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ کچھ طلبہ کو خدا نے توفیق دی کہ وہ بعض سائنسی مضامین میں اعلیٰ تعلیم مکمل کریں۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں ہمارے ان دوستوں نے ادب یا شعر کے میدان میں اپنا مقام پیدا کیا۔

میں اپنی خواہش کے باوجود ان سب طلبہ کے بارے میں معلومات یکجا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یقیناً بہت سے ایسے طلبہ بھی ہوں گے جو عملی زندگی میں اپنی عمدہ کارکردگی کے باوجود میرے رابطہ میں نہیں ہیں۔ جن طلبہ سے میرا رابطہ قائم ہو سکا ان میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر محمد ظفر اللہ کا ہے جو آج کل امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ مجھے اب یہ قطعاً یاد نہیں کہ میری ان سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ وہ زمانۂ طالب علمی کے دوران فضلِ عمر ہوسٹل میں مقیم تھے اور جب وہ کالج میں پڑھانے پر مامور ہوئے تو وہ اپنی والدہ کو ربوہ لے آئے اور کرائے کے ایک مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ مجھے اس مکان پر ان کے ساتھ ملنا یاد ہے۔ اس سے پہلے اور بعد کی ملاقاتیں اب ذہن سے محو ہو چکی ہیں لیکن میں ان کی ایک ذہین و فطین طالب علم کی شہرت سے واقف تھا اور اس پس منظر میں ان سے متاثر بھی۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں یونیورسٹی آف لنڈن سے پی ایچ ڈی کی جس کے بعد وہ کچھ عرصہ یُو ایم آئی ایس ٹی، مانچسٹر میں ڈِمانسٹریٹر اور لیبیا کی سبھا اور الفاتح یونیورسٹیوں میں ابتداءً

اسسٹنٹ پروفیسر اور پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے۔ انہیں یونیورسٹی کالج، لندن میں اعزازی طور پر ریسرچ فیلو کی حیثیت میں بھی کام کرنے کا موقع ملا جس کے بعد وہ ۱۹۸۷ء سے امریکہ میں ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں میں وزیٹر، وزیٹنگ ایسوسی ایٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، پارٹ ٹائم انسٹرکٹر اور لیکچرر کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ University of Iowa میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔

میری طرف سے ان کے کیریئر کے بارے میں ایک وضاحت طلب کئے جانے پر ان کی طرف سے موصول ہونے والی ایک ای میل میں اور باتوں کے علاوہ ان کی صحت کے کچھ مسائل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ انہیں اپنے بعض ''دوستوں'' سے شکایت بھی ہے جو اُن کی ریسرچ کو اپنے نام کے ساتھ شائع کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے تھے یہ بیماری صرف پاکستان میں ہے لیکن ان کی ای میل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بیماری کے جراثیم نے پوری دنیا کے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس پوری کی پوری ای میل کا آزاد اردو ترجمہ صرف اس غرض سے پیش کیا جارہا ہے تا کہ قارئین کو ان کے لیے دعا کی تحریک ہو:

میرے زیادہ تر جابز اس امر کے مرہونِ منت رہے کہ کوئی ریسرچر میرے ساتھ مل کر کسی پراجیکٹ پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ ان پراجیکٹس کے لیے محدود فنڈز میسر ہوتے تھے لہٰذا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکتا۔ میں نے پوری زندگی میں صرف ایک ٹینیوئر ٹریک پوزیشن پر کام کیا ہے اور یہ پوزیشن ساؤتھ کیرولینا میں راک ہل کے مقام پر تھی تاہم میں یہ کام بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکا۔ دراصل مجھے اچانک بہت سے ایسے طبی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جن سے مجھے کئی سال پہلے مانچسٹر میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ اندریں حالات میں اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر گھر واپس آ گیا۔ ۱۹۹۵ء میں میرا ایک گردہ فیل ہوگیا جس کے نتیجے میں اگلے سال میرا کِڈنی ٹرانسپلانٹ ہوا۔ جب میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا تو مجھ پر غنودگی طاری رہنے لگی۔ بعد میں مجھے سٹروک بھی ہوگیا لہٰذا میں نے ٹینیوئر ٹریک پوزیشنز کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا اور اپنی تمام تر توجہ ریسرچ پر مبذول کر دی اور خدا کا شکر ہے انٹرنیٹ کی برکت سے میں آج بھی لوگوں کی نگاہوں میں ہوں تاہم مجھے گلہ صرف یہ ہے کہ بعض لوگ میری ریسرچ کی اپنے نام کے ساتھ تشہیر شروع کر دیتے ہیں۔ ایک آدمی نے تو خود کو میرے لکھے ہوئے ایک پیپر کا کوآتھر ظاہر کرنا شروع کر دیا اور ایک نے میری کسی ای میل کی بنیاد پر اپنی طرف سے ایک نیا نظریہ پیش کر دیا تاہم جب اسے یہ خوف محسوس ہوا کہ اس معاملہ میں کہیں مجھے ہی ریفری نہ مقرر کر دیا جائے تو اس نے میرا نام بھی اس میں ڈال دیا۔

تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر اُن کا ایک پیغام موجود ہے جس میں یہ ذکر بھی ہے کہ انہیں ایم ایس سی کرنے کے بعد کچھ عرصہ اسی کالج میں بطور لیکچرر کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ وہ کہتے ہیں: میرے اپنے حالات میٹرک کے بعد مزید تعلیم کے حصول کی اجازت نہیں دیتے تھے اور صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی مہربانی میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو میں شاید کالج جا ہی نہ سکتا۔ میری خوش قسمتی کہ میرے ایک بہی خواہ نے آپ کو ایک خط لکھ ڈالا جس میں میری قابلیت کی تعریف کرتے ہوئے اس اندیشے کا

اظہار کیا گیا تھا کہ غربت کی وجہ سے میں مزید پڑھائی کرنے سے محروم رہ جاؤں گا۔ اس پر آپ نے فوراً جواب دیا: اس بچے کو بھجوا دیں۔ ہم اسے داخلہ دیں گے۔ یوں میں اپنی کُل جمع پونجی جو ۱۴۵ روپے تھی جیب میں ڈال کر کالج میں داخلے کے لیے ربوہ چلا آیا۔ مناسب ٹیوشن فیس اور ہوسٹل کے بہت کم اخراجات کی وجہ سے مجھے اپنی پڑھائی جاری رکھنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں: میں وضاحت کر دوں کہ صرف مناسب ٹیوشن فیس ہی کسی ادارے کا مقام متعین نہیں کرسکتی، دراصل اس ادارے کے اساتذہ اس کا مقام بناتے ہیں۔ مجھے یہاں جو استاد ملے ان کی زندگی کا مقصد طلبہ کی تعلیم و تربیت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ہی مجھے وہ اعتماد بخشا جس کے طفیل میں آج سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کے قابل ہو سکا ہوں۔

وہ کالج کے جن اساتذہ سے بے حد متاثر ہیں ان میں چوہدری محمد علی سرفہرست ہیں۔ وہ اُن کے کئی طرح سے مشفق و مہربان تھے۔ ظفر اللہ کہتے ہیں: وہ کبھی کسی کام کا حکم نہ دیتے نہ کسی کام سے روکتے بلکہ بڑے طریقے سے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ قاضی محمد اسلم جو صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کے بعد کالج کے پرنسپل بنے نے مجھے بالواسطہ طور پر چیزوں کے تجزیہ کا فن سکھایا۔ مرزا انس احمد نے میرے اندر منطق کا شوق پیدا کیا۔ میں نے ان تینوں حضرات سے بہت کچھ سیکھا اور اپنے لاتعداد سوالات کا جواب حاصل کیا۔ میں یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ میں بسا اوقات کلاس میں جانے کی بجائے اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا۔ رشید غنی کو میری اس عادت کا علم ہوگیا تھا چنانچہ جب وہ کلاس میں کوئی نئی چیز پڑھانے لگتے اور میں کلاس میں موجود نہ ہوتا تو بندہ بھجوا کر مجھے بلا لیتے۔ چوہدری حمید احمد نے مجھے المنار کے انگریزی حصہ کا ایڈیٹر مقرر کروایا اور ہمیشہ میری تربیت کا خیال رکھا۔

موصوف پروفیسر نصیر احمد خان کا ذکر بھی بے حد محبت سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں: جب میں کالج میں لیکچرر لگا تو مجھے فزکس بھی پڑھانا پڑتی تھی۔ نصیر خان ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے۔ میں نے پیور میتھ میں ڈگری حاصل کی تھی لہٰذا فزکس کے لیکچرز کی تیاری میں بہت محنت کرنا پڑتی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث جو نہ جانے کیوں مجھ سے اتنا پیار کرتے تھے مجھے ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی دعائیں آج بھی میری حفاظت کر رہی ہیں۔

وہ لاہور میں اپنے اساتذہ کرام میں سے پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالمجید اور گورنمنٹ کالج، لاہور کے پروفیسر لال محمد چاولہ جنہوں نے ان کی تعلیمی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا کا خاص محبت سے ذکر کرتے ہیں۔

ظفر اللہ کہتے ہیں: تکمیلِ تعلیم کے بعد مجھے بہت سی یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا موقع ملا ہے لیکن تعلیم الاسلام کالج والی فضا کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کالج نے سینکڑوں بلکہ ہزاروں طلبہ کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ حصولِ علم بھی عبادت کی ایک شکل ہے اور یہ علم ہی ہے جو انسان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۔ میرے نزدیک تعلیم الاسلام کالج جیسے اداروں کو صرف کالج کہنا زیادتی ہے۔ ایسے ادارے تو عبادت گاہوں کا درجہ رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے تعمیر کرتے

ہیں جو قرآنی تعلیمات پر تدبّر کر کے ویسی ہی زندگی گزارتے ہیں جیسا کہ خالقِ ارض وسما ہم سے چاہتا ہے۔

ڈاکٹر ظفراللہ کے بعد اب کچھ ذکر مبارک احمد عابد کا جو بنیادی طور پر پسرور کے نواحی قصبے، کلاس والا کے رہنے والے ہیں اور ایک مخلص احمدی بزرگ، غلام قادر کے صاحبزادے ہیں۔ خوش قسمت تھے کہ بچپن ہی میں ان کا خاندان ربوہ منتقل ہو گیا اور یوں انہیں اس پاکیزہ ماحول میں پرورش پانے کا موقع ملا جو اس نوخیز بستی کا خاصہ تھا۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں بی اے اور اس کے دو سال بعد اورینٹل کالج، لاہور سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ ابتداءً کچھ عرصہ بابُ العِلم ڈگری کالج، لاہور میں پڑھاتے رہے لیکن ۱۹۷۱ء میں انہیں تعلیم الاسلام کالج میں لیکچررشپ مل گئی اور وہ ۲۰۰۴ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک اسی ادارے سے منسلک رہے۔ خوش قسمت تھے کہ دورانِ ملازمت اپنے بعض باقی رفقا کی طرح مخالفانہ اکھاڑ پچھاڑ کا شکار نہیں ہوئے۔

موصوف کی وجہِ شہرت ان کی شاعری اور ان کا ترنّم ہے۔ مجھے یاد ہے میں غالباً سکول میں تھا جب مجھے بیت مبارک میں منعقد ہونے والے کسی جلسے میں ان کی زبان سے پہلی بار ایک نظم سننے کا موقع ملا اور میں ان کی آواز و انداز سے بہت متاثر ہوا۔ میں تو مدتوں اسے ان کی اپنی نظم سمجھتا رہا لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ نظم کسی اور کی ہے جو غالباً موقع کی مناسبت سے انہوں نے وہاں پڑھ کر سنائی تھی۔ نظم کا مطلع ہے:

مرا بچپن جہاں گزرا وہ بستی چھن گئی کیوں کر
مری بستی مری خوابوں کی بستی بن گئی کیوں کر

اب تک ان کے دو مجموعے ''درد کے شہر میں'' اور ''برگ برگ چاندنی'' کے نام سے چھپ چکے ہیں جب کہ تیسرا مجموعہ ''پلکوں کی دستک'' زیرِ طبع ہے۔ اگر انہیں اپنی کوئی پسندیدہ غزل سنانے کی فرمائش کی جائے تو وہ بالعموم یہ غزل منتخب کرتے ہیں:

میرے دریا بُرد ہوجانے کا غُل تو مچ گیا
گہرے پانی سے تعارف تھا مرا میں بچ گیا
آج ہے کتنا اپاہج درد کا احساس بھی
کانچ پاؤں میں چُبھا پھر بھی نظر میں جچ گیا
ننگے پاؤں سب تھے لرزاں برف کی دیوار پر
میرے ہی دل میں تھا سورج میں ہی تنہا بچ گیا
رنگ یوں بکھرے کہ دیدہ وَر سمٹ کر رہ گئے
جانے کس کس کا لہو ان منظروں میں رَچ گیا
ہر کسی کی پیاس اور پانی کا رشتہ اور ہے
دہر کے اندھے کنوئیں میں گونجتا یہ سچ گیا

لمس، خوشبو، ذائقے، درشن، سماعت سب گئے
ان کو اپنانے کا عابد پھر بھی نہ لالچ گیا

مبارک عابد کی ساری زندگی ربوہ میں گزری ہے لیکن اب ان کے بچے امریکہ اور کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں لہٰذا ان ملکوں کے ساتھ ان کی دلچسپی بھی بڑھ گئی ہے اور وہ اپنا کچھ وقت پاکستان اور کچھ بیرونِ ملک گزارنے لگے ہیں لیکن پاکستان میں ہوں تو درس و تدریس کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اپنے اس دوست کا ذکر فی الحال اتنا ہی۔ آیئے اب بات کرتے ہیں لیفٹیننٹ کرنل (ر) نسیم احمد سیفی کے بارے میں جو مبارک عابد کے کلاس میٹ اور کالج میں مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔ موصوف مربی سلسلہ، مولوی صالح محمد کے صاحبزادے اور نامور خادمِ سلسلہ، مولانا نسیم سیفی کے ماموں زاد بھائی ہیں۔ وہ ۱۹۶۶ء میں بی ایس سی کا امتحان پاس کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔ انہوں نے اس کے فوراً بعد فوج میں کمیشن حاصل کر لیا اور پاکستان ملٹری اکیڈیمی کے تھرڈ گریجوایٹ کورس میں ٹریننگ حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں جب وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے ایک کنسٹرکشن کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی لیکن اب وہ مکمل طور پر ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں اور راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

۱۹۷۱ء میں نسیم سیفی سابقہ مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ ان کی ڈیوٹی جیسور سیکٹر میں تھی اور وہ سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء سے لے کر ۲۲ نومبر ۱۹۷۳ء تک ہندوستان کی قید میں رہے۔ انہیں ابتدائی طور پر پاناگڑھ میں رکھا گیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں: پاناگڑھ میں ہمیں بہت مشکل حالات میں سے گزرنا پڑا۔ ایک شیڈ میں قریباً سو افسروں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ جگہ بہت تنگ تھی اور ہماری کیفیت ان بہت سے جانوروں سے مختلف نہ تھی جنہیں ایک چھوٹے سے باڑے میں بند کر دیا جائے۔ کھانے کا سسٹم بہت خراب تھا چنانچہ صبح دس گیارہ بجے لنگر آتا۔ ہر افسر کے ہاتھ میں دو روٹیاں پکڑا دی جاتیں اور ثابت ماش کا پتلا سا شوربہ اوپر انڈیل دیا جاتا۔ اسی طرح کا کھانا رات کو ملتا۔ حوائجِ ضروریہ سے فراغت کا بھی مناسب انتظام نہ تھا چنانچہ رات کے وقت کیمپ کے اندر ٹین کا ایک خالی کنستر رکھ دیا جاتا۔ قیدی اسی میں پیشاب کرتے۔ صبح یہ کنستر خالی کر دیا جاتا۔ قریباً دو ماہ بعد ہمیں فیض آباد منتقل کر دیا گیا جہاں حالات بہت بہتر تھے۔ ہم قیدی تو تھے ہی لیکن یہاں تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ ہم لوگ ناشتے کے بعد بیٹھ جاتے۔ کوئی بِرج کھیلنے لگتا تو کوئی شطرنج۔ بعض افسر واک کرنے لگ جاتے۔ اسی اثنا میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت ہوتا تھا لہٰذا میں مطالعہ کرنے لگا۔ ہندوستان میں پاکستان کے مقابلہ میں کتابیں سستی تھیں۔ میں نے روسی رائٹرز کی بہت شہرت سن رکھی تھی چنانچہ مجھے یہاں ٹالسٹائی کو بڑی تفصیل کے ساتھ پڑھنے کا موقع ملا۔ فراغت ہوتی تو بِرج کھیل لیتا۔ غرض وقت گزرتا رہا۔ فیض آباد میں قیام کے دوران ہمارے بعض افسران کو ''وار کرائمز'' کے الزام میں ہم سے الگ کر کے کہیں اور منتقل کر دیا گیا۔ خدا بہتر جانتا ہے ان کے ساتھ کیا بیتی۔

اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا ان سے کبھی کوئی ایسی حرکت بھی سرزد ہوئی جس کی بنا پر کیمپ انتظامیہ کی

طرف سے شدید ردعمل کا اظہار ہوا ہو نسیم سیفی کہتے ہیں: ہاں! ایک سے زیادہ بار ایسے ہوا۔ ایک دفعہ انڈین فوج کا میجر کپور قیدیوں کو کوئی بات سمجھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیپٹن منگل بھی تھا۔ میجر کپور کی کسی بات پر میں ہلکا سا مسکرا دیا جسے کیپٹن منگل نے نوٹ کرلیا اور مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میں نے غصے میں اسے شٹ اَپ کال دے دی۔ میری یہ حرکت جیل انتظامیہ کو بہت بُری لگی چنانچہ مجھے آٹھ دن کے لیے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی کے ساتھ پیچھے باندھ دیئے گئے اور میں نے یہ سارا وقت اسی طرح گزارا۔ ہاں! کھانے کے وقت ہاتھ کھول دیئے جاتے تھے۔ یہ تو خیر میری ذاتی بات تھی۔ کسی قیدی سے کوئی خلافِ ضابطہ حرکت سرزد ہوجاتی تو بطور سزا اس کا راشن آدھا کر دیا جاتا اور سنگین جرائم کی سزا تو بے حد کڑی تھی۔

نسیم سیفی سنگین جرائم کی وضاحت کرتے ہوئے بتاتے ہیں: قید سے فرار ہونے کی کوشش کسی قیدی کا سب سے سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے کیمپ میں کچھ افسران نے سرنگ کھود کر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ شروع میں ہی پکڑے گئے۔ دراصل کھدائی کے نتیجے میں نکلنے والی مٹی چھپانے کا کوئی مناسب انتظام نہ ہوسکا تھا اور وہ اسی وجہ سے نظروں میں آ گئے۔ انہیں کئی روز تک دن رات کھڑا رکھا گیا، ان کا راشن آدھا کر دیا گیا اور ایک مہینے کے لیے ان کے کمرے سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ مار پیٹ اس کے علاوہ تھی۔ ایک بار ایس ایس جی کے دو افسران، میجر آصف اور کیپٹن سعید نے کیمپ سے فرار کا ایک انوکھا منصوبہ بنایا اور موسم گرما کی آمد پر جب کمبل باندھ کر سٹور میں رکھ دیئے جاتے تھے انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی مدد سے اپنے آپ کو بستروں کے اندر چھپا لیا اور سٹور تک پہنچ بھی گئے لیکن جب انہیں زمین پر رکھا جا رہا تھا گارڈز کو اندازہ ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ انہیں قید تنہائی میں ڈال کر ان کا کھانا پینا بند کر دیا گیا۔ پھر انہیں کسی اور کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ ان پر بعد میں کیا بیتی، وہ خود ہی بتا سکتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا اُس وقت ان کے والدین زندہ تھے نسیم سیفی بتاتے ہیں: ہاں! دونوں حیات تھے۔ ہمیں ہر ماہ چار یا چھ پوسٹ کارڈز ملا کرتے تھے جو ہم اپنے رشتے داروں کے ساتھ خط و کتابت کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ میں ہر ہفتے اپنی والدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔ واپس آیا تو والدہ نے وہ خط سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے یہ خط ضائع نہیں کئے اور اب بھی گھر میں کہیں پڑے ہیں۔

نسیم سیفی اپنے زمانۂ طالب علمی میں کالج کی ہاکی ٹیم میں شامل تھے۔ ان کے انچارج، انگریزی کے استاد، حمید احمد چوہدری تھے۔ بدقسمتی سے ہاکی ٹیم کو پچھلے کئی سال سے بین الکلیاتی مقابلوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اور ٹرافی بالعموم میانوالی کالج جیتتا تھا۔ ایک بار میانوالی کی ٹیم کے کھلاڑی کسی وجہ سے اپنی انتظامیہ سے ناراض ہوگئے اور یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے ٹورنامنٹ کا بائیکاٹ کردیا۔ نسیم سیفی بتاتے ہیں: میانوالی ٹیم میں بغاوت کی اس خبر سے ہمیں اپنی کامیابی کی کچھ امید بندھنے لگی۔ اتفاق سے ہمارا فائنل اسی ٹیم کے ساتھ ٹھہرا۔ یہ میچ صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر کی گراؤنڈ میں ہوا تھا۔ میچ سے پہلے حمید احمد چوہدری نے اعلان کیا کہ اگر ہم نے یہ میچ جیت لیا تو وہ اس کھلاڑی کو جو جیتنے والا گول کرے گا اپنی جیب سے ایک روپیہ انعام دیں گے۔ میچ

ہوا تو دونوں ٹیموں کا پلڑا تقریباً برابر رہا۔ ایک طرف سے وہ ٹیم گول کرتی تو کچھ دیر میں ہم اسے برابر کر دیتے۔ آخری چند منٹوں میں مجھے ایک گول کرنے کا موقع مل گیا جسے مخالف ٹیم برابر نہ کر سکی۔ یہ میچ ہم نے جیت لیا جس پر ساری ٹیم بے حد خوش تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے حمید احمد چوہدری کو اپنا وعدہ یاد دلایا تو انہوں نے جیب میں سے اپنا بٹوہ نکالا۔ وہ مجھے ایک روپیہ بطور انعام دینا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے ان کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ آ گیا۔ میں نے لپک کر یہ نوٹ چھین لیا۔ وہ مجھے روکتے رہ گئے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی اور پانچ روپے کا نوٹ لے کر دور جا کھڑا ہوا۔ چوہدری حمید احمد کفِ افسوس ملنے کے سوا کسی اور ردِعمل کا اظہار نہ کر سکے۔ میں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ آج ایک روپیہ بلکہ پانچ روپے بھی انتہائی معمولی رقم نظر آتی ہے تاہم آج سے نصف صدی پہلے یہ ایک خطیر رقم تھی۔ یہ رقم ملنے پر ہماری ٹیم بے حد خوش تھی چنانچہ اس شام ہم نے ٹک شاپ میں بیٹھ کر اپنی فتح کا جشن منایا۔

کالج میں قیام کے دوران نسیم سیفی غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیتے تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے چنانچہ وہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے دوران کالج یونین کے سیکرٹری رہے اور اس سے اگلے سال صدر۔ وہ بتاتے ہیں: حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث تختِ خلافت پر متمکّن ہونے کے بعد کالج یونین کی دعوت پر تعلیم الاسلام کالج میں تشریف لائے۔ اس وقت قاضی محمد اسلم پرنسپل تھے۔ فیصلہ یہ ہونا تھا کہ اس فنکشن میں حضور کو ایڈریس پرنسپل کی طرف سے پیش ہو یا صدر کالج یونین کی طرف سے۔ میرا نقطہ نگاہ تھا کہ چونکہ حضور کالج یونین کی دعوت پر تشریف لا رہے ہیں لہٰذا استقبالیہ ایڈریس مجھے پیش کرنا چاہئے۔ اگرچہ پرنسپل صاحب اس سے مختلف رائے رکھتے تھے مگر انہوں نے میری دلجوئی کے لیے میری رائے کا احترام کیا اور یوں اس فنکشن کو کالج یونین کا فنکشن ہی رہنے دیا۔ مجھے یاد ہے اس موقع پر قاضی محمد اسلم نے مجھے ایک نصیحت فرمائی تھی جس پر میں ساری زندگی عمل کر کے اس کے فوائد سے بہرہ ور ہوتا رہا اور وہ نصیحت یہ تھی کہ اپنی بات پر مضبوطی سے قائم رہنا سیکھو لیکن تحمل اور حسنِ اخلاق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنی بات چیت میں اخلاقیات کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف نہ کیا جائے لیکن جہاں تک اپنے مقاصد کا تعلق ہے انہیں کبھی نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔

اس موقع پر ہم لوگ حضور کو ہمراہ لے کر ایک جلوس کی شکل میں کالج ہال میں داخل ہوئے۔ سٹیج پر تین کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ درمیانی کرسی پر حضور تشریف فرما ہوگئے، آپ کے دائیں جانب قاضی محمد اسلم بیٹھے اور بائیں جانب میں بیٹھا۔ ایڈریس پیش کرنے کی سعادت مجھے ہی حاصل ہوئی۔

یہی وہ سال تھا جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی کے بعد روسی وزیر اعظم کوسیچن کی دعوت پر پاکستان کے صدر ایوب خاں اور بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری تاشقند میں ملے تھے اور یہ ملاقات تاشقند ڈیکلریشن پر منتج ہوئی تھی۔ اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ، ذوالفقار علی بھٹو تاشقند سے واپسی پر مستعفی ہو گئے تھے اور انہوں نے صدر ایوب کے خلاف ایک زوردار تحریک چلائی۔ کالجوں کے طلبہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ اگرچہ تعلیم الاسلام کالج میں تو ہڑتال نہیں ہوئی لیکن ملک بھر کے کالج بند پڑے تھے۔

اندریں حالات ہماری یونین کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔ جب آہستہ آہستہ صورتِ حال بہتر ہوئی اور کالج کھلنے لگے تو تعلیم الاسلام کالج کی سالانہ انٹر کالجیئیٹ ڈیبیٹس کا انعقاد ہوا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ۱۹۶۶ء کی فروری تھی۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ان مباحثات میں پہلی تین پوزیشنیں حاصل کرنے والے مقررین کو علی الترتیب گولڈ، سلور اور برونز میڈل دیئے جائیں گے۔ شاید ان مباحثات میں ایک کشش یہ بھی تھی کہ اردو کے سو سے زیادہ اور انگریزی کے نوّے مقرر ربوہ آئے۔ نزدیک کے کالجز کا تو مذکور ہی کیا مجھے یاد ہے کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے بھی ایک ٹیم آئی تھی۔

اردو کے مباحثات کے لیے قرارداد زیرِ بحث تھی: معاہدات مسائل کو سلجھاتے نہیں، الجھاتے ہیں۔ اس مباحثے میں لیڈر آف دی ہاؤس کابل والے حضرت صاحبزادہ عبداللطیف کے پوتے، جمیل لطیف تھے اور لیڈر آف دی اپوزیشن مرزا فرید احمد تھے۔ یہ مباحثہ صبح چار بجے تک چلا۔ مجھے یاد ہے قاضی محمد اسلم مباحثے کے درمیان اٹھ گئے اور گھر میں چند گھنٹے کے آرام کے بعد دوبارہ سٹیج پر آ کر تشریف فرما ہو گئے۔ میں ایک بار کسی ضرورت کے تحت تھوڑی دیر کے لیے اٹھا اور باقی تمام وقت سٹیج پر بیٹھا رہا۔

اگلے روز انگریزی مباحثہ تھا۔ قرارداد زیرِ بحث تھی: روڈ ٹو پیس پاسز تھرُو کشمیر۔ ممکن ہے مجھے غلطی لگ رہی ہو۔ شاید قرارداد کا عنوان تھا: کشمیر اِزا اے ملٹری پرابلم۔ یہ مباحثہ بھی بہت کامیاب رہا۔

نسیم سیفی کو حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی شفقت اور محبت کے کئی واقعات یاد ہیں۔ ایک ایسا ہی واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: اس زمانے میں ربوہ کا ماحول بے حد سادہ تھا اور شادیوں کے موقع پر کسی قسم کی فضول خرچی کا رواج نہ تھا۔ اور تو اور اس وقت تک ربوہ میں تنبو قناتوں والا بھی کوئی نہ تھا چنانچہ بعض لوگ مہمانوں کی نشست کے لیے کرسیاں دفتر پرائیویٹ سیکرٹری سے لایا کرتے تھے۔ اس مباحثے سے اگلے روز میری ایک کزن کی شادی تھی۔ میں کرسیاں لینے کے لیے دفتر پرائیویٹ سیکرٹری گیا تو ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نماز پڑھانے کے لیے بیت مبارک تشریف لے جا چکے تھے۔ ابھی مجھے کرسیاں نہیں ملی تھیں کہ حضور واپس تشریف لے آئے۔ مجھے کھڑے دیکھا تو رک گئے اور فرمانے لگے: تم ابھی تک باہر ہو۔ جیسی تقریریں رات کالج میں ہوئی ہیں اس کے بعد تو اب تک تمہیں اندر ہونا چاہیئے تھا۔ یہ حضور کی شفقت کا ایک انداز تھا اور دراصل اظہارِ پسندیدگی تھا ان گرما گرم تقاریر پر جو اُس روز صبح چار بجے تک ہوتی رہی تھیں۔

ہندوستان کی قید سے آزاد ہونے کے بعد پاکستان پہنچنے کا ذکر ہو تو نسیم سیفی بتاتے ہیں: جب ہم ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر پاکستان واپس آئے تو میرے والدین اور بعض قریبی عزیز واہگہ بارڈر پر میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ باقی قیدیوں کی طرح مجھے دو تین روز تک ڈی بریفنگ کے لیے لاہور میں رکنا پڑا جس کے بعد ہمیں دو ماہ کی چھٹی دے دی گئی۔ مجھے یاد ہے میں اس ریل کار کے ذریعے جو عصر کے قریب لاہور سے سرگودھا جاتی تھی ربوہ کے لیے روانہ ہوا۔ جب گاڑی ربوہ ریلوے سٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کی میں توقع نہ کر سکتا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پلیٹ فارم پر احبابِ جماعت کی

ایک کثیر تعداد میں موجود ہے۔ اگرچہ میں کوئی کارنامہ سرانجام دے کر وطن واپس نہ لوٹا تھا لیکن ایک ہیرو کی طرح اپنا استقبال ہوتا دیکھ کر میرا دل خدا کی حمد سے لبریز ہو گیا جس نے اپنے ماننے والوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ محبت پیدا کر دی ہے۔ اپنا استقبال کرنے والوں سے میرا اور کوئی رشتہ نہ تھا ماسوا اس کے کہ ہم سب ایک ہی مسیح کو ماننے والے تھے اور ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ فلک شگاف استقبالیہ نعروں سے میرا استقبال کیا گیا بلکہ اگر یہ کہوں کہ استقبالیہ ہجوم نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر باہر تانگہ سٹینڈ تک پہنچایا تو بے جا نہ ہوگا۔

لیفٹیننٹ کرنل (ر) نسیم سیفی کا ذکر تمام ہوا۔ اب میں آپ کی ملاقات تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور ہونہار طالب علم سے کرا رہا ہوں جن کا نام تو محمد لطیف ہے لیکن وہ کالج کے زمانے میں لطیف گجراتی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ تکمیل تعلیم کے بعد فوج میں چلے گئے اور بریگیڈیئر کے عہدے تک ترقی پانے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

میرا موصوف کے ساتھ پہلا تعارف آج سے کئی سال پہلے اس وقت ہوا جب میں راولپنڈی میں تعینات تھا اور وہ ٹی آئی کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کے حوالے سے مجھے حمید احمد چوہدری کا کوئی پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ بعد میں ان کے ساتھ کئی حوالوں سے رابطہ رہا اور میں نے انہیں ہمیشہ مخلص و ہمدرد پایا۔ اگر میری طرف سے ان کے ذمہ کوئی کام لگایا گیا تو انہوں نے اس معاملہ میں سرخ روئی کو اپنا مطمع نظر جانا۔

بریگیڈیئر (ر) لطیف جن کا تعلق گجرات کے مردم خیز خطہ سے ہے ایک مخلص احمدی ہیں۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر ان کا ایک پیغام موجود ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۱۹۶۳ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی رہائش فضلِ عمر ہوسٹل میں تھی۔ وہ اپنے اوّلین پرنسپل، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں اور آپ کی شخصیت کو بے حد اِنسپائرنگ قرار دیتے ہیں۔ بقول لطیف آپ کے نورانی چہرے کی زیارت دل کو سکون بخشتی اور آپ کا نرم لہجہ دل میں گھر کر لیتا تھا۔ آپ کے بعد قاضی محمد اسلم پرنسپل مقرر ہوئے۔ لطیف بتاتے ہیں کہ اگرچہ وہ سائنس سٹوڈنٹ ہونے کے ناطے براہِ راست ان کے شاگرد تو نہیں رہے تاہم وہ ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ وہ طلبہ کے سچے خیر خواہ تھے۔ انہیں اب بھی یاد ہے کہ جب ان کی آرمی میں سلیکشن ہوئی تو قاضی صاحب نے اس بات کو بنظرِ تحسین نہیں دیکھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ لطیف سِول سروس کے لیے زیادہ موزوں ہیں لہٰذا انہیں ادھر جانے کی کوشش ہی کرنی چاہیئے تھی۔

لطیف کہتے ہیں: پڑھتا تو میں سائنس تھا لیکن بزمِ ادب کے اجلاسوں اور مشاعروں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتا تھا۔ پرویز پروازی میرے استاد تھے۔ کلاس روم میں ان کے لیکچر اور نجی محافل میں ان کی لچھے دار گفتگو سے جو لطف آتا الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

تعلیم الاسلام کالج کے اس ہونہار طالب علم نے ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ وہ کہتے ہیں: میں اس عرصے میں شیخ محبوب عالم خالد کی سرپرستی میں المنار کے ایڈیٹوریل بورڈ پر اور ہوسٹل میں

چیف پریفیکٹ رہا۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں آرمی میں چلا گیا۔ آرٹلری میں رہا اور بتیس سال فوج میں گزارنے کے بعد ستمبر ۲۰۰۱ء میں ریٹائر ہوا۔ اب راولپنڈی میں مقیم ہوں اور دال روٹی چلانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔

کالج کے زمانے میں لطیف کے اشعار المنار اور ہفت روزہ لاہور میں چھپا کرتے تھے۔ المنار جنوری تا مارچ ۱۹۶۸ء میں چھپی ہوئی ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو:

گو بگو جب حسن کا چرچا نہ تھا
عشق بھی یوں ہر کہیں رُسوا نہ تھا
جب تلک اُس چاند کو دیکھا نہ تھا
میں اندھیری رات سے ڈرتا نہ تھا
آپ کے جانے سے پہلے بزم میں
ایک آنسو شمع کا بہتا نہ تھا
نیند گرچہ کالے کوسوں دُور تھی
چاند ابھی تک بام پر اُبھرا نہ تھا
یوں گماں ہوتا ہے تجھ کو دیکھ کر
میں نے پہلے آدمی دیکھا نہ تھا
آدمی سے آدمی بیزار ہو
آج سے پہلے کبھی ایسا نہ تھا
ہاں کہاں ہم اور کہاں تیری گلی
پر سِوا اس کے کوئی چارہ نہ تھا
یوں گلے لگ کے ملا وہ کل لطیف
جیسے میں نے لوٹ کر آنا نہ تھا

ان کے اپنے بیان کے مطابق غمِ روزگار نے ان کی اس صلاحیت کو زنگ آلود کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فوج میں جانے کے بعد ان کی ذمہ داریاں بالکل بدل گئیں چنانچہ شعر کا ذوق حالات کے جبر کا شکار ہو گیا۔

بریگیڈیئر (ر) لطیف کے بعد اب کچھ باتیں محمد زکریا ورک کے بارے میں جو معروف مربی سلسلہ، ماسٹر محمد ابراہیم خلیل کے صاحبزادے ہیں اور جماعت کے علمی حلقوں میں ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ زکریا ورک کے ننھیال کے ساتھ اپنے ننھیال کے مراسمِ دیرینہ کی وجہ سے میں نے انہیں ہمیشہ اپنا عزیز ہی سمجھا اور ان کی خیر و عافیت کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا۔

موصوف نے ۱۹۶۳ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخلہ لیا تھا لیکن ایف ایس سی کے امتحان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے پر کراچی چلے گئے جہاں سے انہوں نے بی اے اور پھر ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ وہ

۱۹۷۰ء میں پاکستان سے جرمنی اور ۱۹۷۳ء میں کینیڈا منتقل ہو گئے اور گورنمنٹ آف اونٹاریو کی منسٹری آف ہیلتھ کے کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ میں ڈاٹا انالسٹ کے طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ موصوف بتاتے ہیں: میں دو سال تک تعلیم الاسلام کالج، ربوہ میں رہا۔ اس وقت ہمارے پرنسپل صاحبزادہ مرزا ناصر احمد تھے اور وہ تمام اساتذہ جن کے نام آج بھی پرانے طلبہ کی نوکِ زبان پر ہیں ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنے جن کلاس فیلوز یا قدرے سینئر طلبہ کے ساتھ اس کالج میں زندگی کے دو خوشگوار سال گزارے ان میں ہدایت اللہ ہادی، منیر الحق شاہد، رضی اللہ، فلاح الدین شمس، مبارک عابد، محمد عاقل خان، مرزا مغفور احمد، نصیر احمد مہاشہ، منیر احمد باجوہ، جمیل لطیف اور نسیم سیفی کے نام آج بھی میرے ذہن پر نقش ہیں۔

زکریا کالج کے زمانے میں فٹ بال کھیلا کرتے تھے اور کالج ٹیم کے ممبر تھے۔ وہ بتاتے ہیں: اسی زمانے کی بات ہے۔ کالج کی فٹ بال کی تاریخ میں ایک انہونا سا واقعہ رونما ہوا اور وہ تھا ہمارے کالج کی فٹ بال ٹیم کا جھنگ شہر میں کھیلنا اور زونل ٹرافی جیت کر لانا۔ کالج کی باسکٹ بال اور روئنگ کی ٹیموں کا شہرہ تو زباں زدِ عام تھا مگر کالج میں فٹ بال کو ثانوی اہمیت حاصل تھی۔ ان حالات میں ٹیم کا زونل ٹرافی جیت کر لانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

وہ کہتے ہیں: آپ سے کیا پردہ، ہمارے گھر کے حالات بس ایسے ہی تھے۔ جب میری فٹ بال ٹیم کے لیے سلیکشن ہوئی تو بوٹ اور یونیفارم خریدنا ضروری ہو گیا۔ یہ شاید پچیس روپے کا خرچ تھا جو ایک بڑی رقم تھی۔ گھر آیا تو دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرے بڑے بھائی، محمد ادریس مرحوم نے اس رقم کا انتظام کیا۔ ہمارا یونیفارم سیاہ اور سفید رنگ کا تھا۔ سہ پہر کو جب پریکٹس ختم کر لیتے تو ٹک شاپ میں بیٹھ کر دودھ پیا کرتے تھے۔ خدا کے کرم سے ہم طلبہ میں ٹیم سپرٹ بدرجہ اتم موجود تھی چنانچہ جب ہماری ٹیم جھنگ سے ٹرافی جیت کر ربوہ آئی تو ہم نے اسے اٹھا کر گول بازار میں ایک جلوس کی شکل میں چکر لگایا تھا۔

ہماری ٹیم کے کوچ عزیز طاہر تھے جنہوں نے ہماری ٹیم کے چیمپئن شپ جیتنے کا واقعہ الفضل (۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء) میں اپنے ایک مضمون میں بڑی تفصیل کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

''مجھے کالج میں فٹ بال ٹیم کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہوسٹل سے منگوا کر کھاتا۔ ایک حاضری کا خرچ سوا پانچ آنے تھا۔ بی اے آنرز کی کلاس لینے کے بعد سہ پہر فٹ بال گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹہ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کی ٹیمیں پریکٹس کرتی تھیں۔ اس کام میں کالج کے ڈی پی ای وقتاً فوقتاً میری معاونت کرتے۔ جلد ہی مجھے انٹرمیڈیٹ کے لیے فٹ بال زونل ٹورنامنٹ کا شیڈول مل گیا۔ مجھے چونکہ ٹیم کے لیے بعض انتظامات کرنے تھے اس لیے ٹیم کو پروفیسر چوہدری نذیر احمد صاحب (شعبہ تاریخ) کے ہمراہ جھنگ بھیج دیا اور خود ربوہ سے ایک گھنٹہ بعد روانہ ہوا۔ گورنمنٹ کالج، جھنگ کے ہوسٹل میں کھلاڑیوں کی رہائش اور خوراک کا...... انتظام ہو گیا تھا۔ اگلے روز غالباً صبح دس بجے گورنمنٹ کالج، سرگودھا کے ساتھ ہماری ٹیم کا پہلا میچ تھا۔ ہاف ٹائم تک کوئی ٹیم گول نہ کر سکی۔ اچانک میچ روک کر ریفری میری طرف آیا اور کہا کہ گورنمنٹ کالج، سرگودھا کی ٹیم کے پاس کھلاڑیوں کی مصدّقہ فہرست نہیں ہے۔ کیا آپ اس ٹیم کو کھیلنے کی اجازت دیں گے؟ میں نے پوچھا: اس سلسلے

میں قواعد کیا ہیں؟ ریفری نے بتایا کہ قواعد کے مطابق تو وہ ٹیم کھیل نہیں سکتی۔ میں نے جواب دیا کہ پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، قواعد کے مطابق عمل کریں چنانچہ ریفری نے گورنمنٹ کالج، سرگودھا کی ٹیم کے خلاف واک اوور دے دیا۔ اس طرح ہم یہ میچ جیت گئے۔ گورنمنٹ کالج، سرگودھا کی ٹیم اسی روز واپس چلی گئی۔ ان کے پرنسپل نے چیئر مین، لاہور بورڈ سے رابطہ کیا تو ہمارے پرنسپل صاحب نے بتایا کہ میری ٹیم دوبارہ کھیلے گی، میں چیپ وِکٹری کا قائل نہیں ہوں...... چنانچہ اگلے روز مجھے گورنمنٹ کالج، جھنگ کے پرنسپل نے بلایا کہ ربوہ سے آپ کے پرنسپل صاحب کا فون آیا ہے کہ ہماری ٹیم سرگودھا ٹیم کے ساتھ دوبارہ میچ کھیلے گی چنانچہ ہماری ٹیم کے کھلاڑی وقتِ مقررہ پر گراؤنڈ میں پہنچ گئے لیکن سرگودھا ٹیم پھر بھی وہاں نہ پہنچ سکی۔ ایک بار پھر ہماری ٹیم کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

ہمارا اگلا میچ جوہرآباد سے تھا جو ہم نے دو ایک سے جیت لیا۔ اگلے روز ہمارا میچ گورنمنٹ کالج، جھنگ کی ٹیم کے ساتھ تھا۔ یہ میچ بھی ہم نے زیادہ گول کر کے جیت لیا۔ جھنگ کی ٹیم کوئی گول نہ کر سکی۔ آخری روز ہمارا میچ گورنمنٹ کالج، میانوالی کی ٹیم کے خلاف تھا۔ یہ میچ ہماری ٹیم نے ایک چار گولوں سے جیت لیا اور زونل چیمپئن شپ حاصل کر لی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہمارے کالج ٹیم نے زونل ٹرافی جیتی تھی۔ ہماری ٹیم کے کھلاڑیوں کے نام یہ تھے: منیر احمد باجوہ (کیپٹن)، عبدالحلیم ظفر (سویڈن)، اظہر احمد، راجہ عبدالستار، نصیر چیمہ، محمد صدیق، عبدالرشید، نعیم الدین، وسیم، رفیق گھوکھوال، منور احمد، نیاز مصلح (شکاگو۔امریکہ)، عبدالحمید عابد، عصمت اللہ رندھاوا، جمشید احمد، محمد عاقل گول کیپر......اور زکریا ورک......''

زکریا بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کی طرف راغب تھے چنانچہ وہ ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور؛ ہفت روزہ ''لاہور'' لاہور؛ روزنامہ ''حریت'' کراچی اور روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں بچوں کے صفحات پر اور ''المنار'' میں چھپتے رہے اور عرصے تک ''احمدیہ گزٹ'' کینیڈا کے نائب مدیر رہے۔ ان کے مضامین بدر اور الفضل کے علاوہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور اور تہذیب الاخلاق، علی گڑھ میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ وہ سترہ کتابوں کے مؤلف و مصنف و مترجم ہیں اور نیویارک سے شائع ہونے والے آن لائن اخبار ''دی مسلم ٹائمز'' کے ایڈیٹر بھی۔

ان کی کتابوں میں سے ''رموزِ فطرت'' ''مسلمانوں کا نیوٹن'' ''ذکرِ عبدالسلام'' اور ''سلام عبدالسلام'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ چاروں کتابیں نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی اور کارناموں پر چھپے ہوئے مضامین کے مجموعے ہیں۔ ایک کتاب میں ڈاکٹر عبدالسلام کے پی ایچ ڈی تھیسس کا اردو ترجمہ اور آئی سی ٹی، اٹلی کی تاریخ بھی شامل ہے۔ انہوں نے ابن رُشد، ابوریحان البیرونی اور ابنِ سینا کے علاوہ مسلمانوں کے شاندار علمی ماضی اور بعض جماعتی موضوعات پر بھی کتابیں لکھی ہیں جو پاکستان کے علاوہ ہندوستان، انگلستان اور امریکہ سے شائع ہوئی ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ سائنس کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود انہیں سائنس دانوں پر کام کرنے کی تحریک کیسے پیدا ہوئی وہ کہتے ہیں: میں نے یونیورسٹی آف ٹورانٹو کی رابرٹس لائبریری کی ممبرشپ حاصل کی تھی۔

اس زمانے میں کینیڈا کی لائبریریوں میں اردو کتابیں شاذ ہی ملتی تھیں لہٰذا مجھے مجبوراً انگریزی کتب کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ سب سے پہلی کتاب جس نے مجھے متاثر کیا جارج سارٹن کی تصنیف ''انٹروڈکشن ٹُو دی ہسٹری آف سائنس'' تھی جس میں گزشتہ ایک ہزار سالوں میں سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کے کردار کو اجاگر کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے مسلمان سائنسدانوں کے حالات سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے زکریا رازی، ابنِ سینا، ابن ہَیثم جیسے سائنسدانوں کے حالات تفصیل سے پڑھے۔ مجھے سائنسی میگزینز مثلاً ''نیچر'' اور ''نیشنل جیوگرافک'' کے مطالعہ کا جنون ہو گیا۔ ۱۹۸۳ء میں جب میں کنگسٹن آ گیا تو میں نے ڈگلس لائبریری کی ممبرشپ لے لی۔ میں اس لائبریری سے ایک وقت میں سات کتابیں جاری کرا سکتا تھا اور کراتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران جب باقی لوگ ریستورانوں میں جا بیٹھتے تھے میں کتابیں پڑھتا رہتا۔ میرے اس شوق کو مزید جلا بخشنے میں میرے ایک کینیڈین دوست، پیٹر کا خاصا عمل دخل رہا ہے۔ سائنس اس کا بھی پسندیدہ موضوع تھا۔ مجھے اس سے بہت رہنمائی ملی اور وہ میرے انگریزی مضامین ایڈٹ بھی کر دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا یہ شوق پختہ ہو گیا اور مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ میں کچھ علمی کام کر سکوں۔

ذکریا وِرک کے بارے میں فی الحال اتنا ہی۔ اب میں آپ کا تعارف تعلیم الاسلام کالج کے ایک ایسے سابق طالب علم سے کرا رہا ہوں جنہوں نے باسکٹ بال کے کھیل میں بہت نام پیدا کیا اور خدا کے فضل سے پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ میں میجر (ر) شاہد احمد سعدی کا ذکر کر رہا ہوں جو چوہدری فیروز احمد نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے اور تعلیم الاسلام کالج کے ایک دیرینہ کارکن، چوہدری محفوظ الرحمٰن کے بھانجے ہیں اور ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۹ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز پاک فوج سے کیا جس کے لیے وہ ۱۹۷۲ء میں منتخب ہوئے تھے۔ ان کا تعلق نائنتھ گویجوایٹ کورس سے ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب وہ میجر کے عہدے تک ہی پہنچ سکے تھے فوج سے فارغ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی اور تب سے خدمتِ سلسلہ میں مصروف ہیں۔

وہ اپنے زمانۂ طالب علمی سے باسکٹ بال کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے چنانچہ اس زمانے میں انہیں کالج کے علاوہ بورڈ اور یونیورسٹی کی ٹیم میں بھی کھیلنے کا موقع ملا۔ وہ ۱۹۶۸ء کی نیشنل چیمپئن شپ میں حصہ لینے والی سرگودھا ڈویژن کی ٹیم کے رکن تھے اور اسی چیمپئن شپ میں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر ان کا نام کھلاڑیوں کی اس فہرست میں شامل ہوا جس میں سے پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے اراکین کا انتخاب ہونا تھا۔ وہ ۱۹۷۳ء میں پاکستان باسکٹ بال ٹیم میں شامل ہوئے۔ انہیں دس سال تک پاکستان کی طرف سے کھیلنے کا اعزاز حاصل رہا اور اسی عرصے میں وہ ۸۱۔۱۹۸۰ء کے دوران اس ٹیم کے کیپٹن رہے۔

پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے رکن یا کپتان کی حیثیت سے انہیں ملکوں ملکوں گھومنے کا موقع ملا چنانچہ وہ چین، جاپان، شمالی کوریا، فلپائن، تھائی لینڈ، ملائیشیا، ایران، ترکی اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر چکے ہیں۔ ان کے پاس پاکستان اور علی الخصوص ربوہ میں باسکٹ بال کی تاریخ کے حوالے سے بہت سی دلچسپ یادیں ہیں اور اگر وہ کبھی مُوڈ

میں ہوں تو ان سے کوئی نہ کوئی ایسی بات سننے کو ضرور مل جاتی ہے جو دلچسپ بھی ہوتی ہے اور معلومات افزا بھی۔

جب ان سے پوچھا جائے کہ ان کے زمانے میں ربوہ کے اور کون کون سے کھلاڑی پاکستان ٹیم میں شامل رہے تو وہ کہتے ہیں: اس وقت مجھے سارے نام تو یاد نہیں البتہ فوری طور پر عبدالرحیم طارق کا نام ذہن میں آ رہا ہے جو ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے بھائی ہیں۔ حبیب بنک میں ملازم تھے لیکن اب آسٹریلیا جا چکے ہیں۔ وہ پاکستانی ٹیم کے کیپٹن بھی رہے ہیں۔ سیّد بشیر احمد شاہ، مینجر دواخانہ خدمتِ خلق کا بیٹا ظہیر احمد شاہ بھی ٹیم میں رہا ہے۔ وہ آج کل کینیڈا میں ہے۔ اگر مزید کریدا جائے تو وہ کہتے ہیں: دو نام اور بھی ذہن میں آ گئے ہیں۔ سجاد ملک اور اعزاز۔ اول الذکر کینیڈا میں ہے جب کہ مؤخر الذکر جرمنی میں ہے۔

وہ اس پاکستان باسکٹ بال ٹیم میں شامل تھے جس نے ۱۹۷۵ء میں تھائی لینڈ کے دارالحکومت، بنکاک میں منعقد ہونے والی ایشین باسکٹ بال چیمپئن شپ میں حصہ لیا تھا۔ بتاتے ہیں: ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران صاحبزادہ مرزا طاہر احمد پاکستان باسکٹ بال فیڈریشن کے صدر تھے اور یہ چیمپئن شپ اسی دور میں ہوئی تھی۔ اس ٹیم میں فوج سے میرے علاوہ دو اور احمدی کھلاڑیوں کے شامل کرنے اور چوہدری محمد علی کی بطور ٹیم مینجر ہمراہ جانے کی تجویز تھی تاہم جب یہ نام حتمی منظوری کے لیے کھیلوں کی وزارت میں گئے تو انہیں کاٹ دیا گیا۔ ہمارے لیے یہ خبر بڑی تشویش کا باعث بنی چنانچہ ہم نے کسی طرح عزیز احمد تک رسائی حاصل کی جو اُن دنوں وزارتِ خارجہ کے انچارج تھے۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہماری مدد سے معذرت کر لی کہ یہ کام ان کی وزارت سے تعلق نہیں رکھتا چنانچہ چوہدری محمد علی کھیلوں کے وزیر سے ملے۔ اگرچہ میں اس ملاقات میں موجود نہ تھا تاہم میں ہی چوہدری صاحب کو وہاں لے کر گیا تھا اور جتنی دیر ان کی ملاقات جاری رہی میں باہر بیٹھا رہا۔ دونوں کے درمیان بڑی گرما گرم بحث بلکہ تلخ کلامی بھی ہوئی جس دوران محسوس کیا گیا کہ یہ سب کچھ وزیر موصوف کے علم میں تھا اور غالباً ان ہی کے ایما پر ہوا تھا۔ ان کے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل ہو رہی تھی کہ ٹیم کے کھلاڑیوں میں سے تین کھلاڑی اور ٹیم مینجر احمدی ہوں۔ بڑی رد و کد کے بعد انہوں نے ان ناموں کی منظوری دی اور یوں ہم بنکاک پہنچ سکے۔

سعدی مزید بتاتے ہیں: اس موقع پر کھلاڑیوں اور عہدیداران کے کھانے میں شرکاء کی نمائندگی کرتے ہوئے چوہدری محمد علی نے کہا کہ چین کو اس چیمپئن شپ میں شمولیت کی اجازت ملنی چاہئے اور اگر چین کو ایشیا کا حصہ ہونے کے باوجود یہاں پر نمائندگی کا حق نہیں دیا جاتا تو یہ ایشیا کے منہ پر طمانچہ ہوگا۔ مجھے یاد ہے چوہدری صاحب کی اس تقریر کی پریس میں خوب تشہیر ہوئی تھی۔

ترکی کے شہر ازمیر کے ازمیر اتاترک سٹیڈیم میں انتیس ستمبر سے چھ اکتوبر ۱۹۸۰ء تک منعقد ہونے والی ''اسلامک گیمز'' جس میں الجیریا، بحرین، بنگلہ دیش، ملائیشیا، مراکو، شمالی قبرص، سعودی عرب، ترکی اور پاکستان سمیت دس اسلامی ملکوں کے تقریباً سات سو اتھلیٹس نے حصہ لیا تھا ایک بہت بڑا ایونٹ تھا جس میں پاکستان سے بیالیس کھلاڑیوں کا ایک دستہ شامل ہوا تھا۔ ان میں پاکستان باسکٹ بال ٹیم بھی شامل تھی جس کے مینجر

چوہدری محمد علی تھے اور کیپٹن میجر شاہد سعدی۔

وہ بتاتے ہیں: ازمیر میں ہم نے چھ سات میچز کھیلے لیکن کوئی پوزیشن حاصل نہ کر سکے۔ ان گیمز کی ایک یادگار بات آپ کو سنانے لگا ہوں۔ پاکستانی دستے کے وہاں پہنچنے کے بعد جب جھنڈا لہرانے کی تقریب ہوئی تو پاکستانی دستے کے مینجر جو ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر چوہدری صاحب سے تلاوت کرنے کو کہہ دیا۔ آپ نے تلاوت کر دی۔ یہ خبر کسی نے پاکستان پہنچا دی اور رنگ اسے یہ دیا گیا کہ کس طرح مسلمانوں کی ایک سرکاری تقریب میں ایک ''غیر مسلم'' کو تلاوت کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ یہ خبر پاکستانی اخبارات میں شائع ہوئی۔ مجھے علم نہیں کہ اس پر بریگیڈیئر صاحب کی کوئی فہمائش ہوئی یا نہیں لیکن ازمیر سے واپسی پر یہ خبر میں نے خود بھی دیکھی تھی۔

میں نے اس باب میں اب تک پانچ ایسے سابق طلبائے تعلیم الاسلام کالج کا ذکر کیا ہے جو مخلص احمدی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب میں ذکر کرنے جا رہا ہوں تعلیم الاسلام کالج کے ایک غیر از جماعت اولڈ سٹوڈنٹ، ڈاکٹر سعید اے بشیر کا جن سے راقم الحروف براہِ راست متعارف نہیں ہے تاہم ان کے اُس پیغام سے جو تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر موجود ہے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء کے دوران اس کالج میں پڑھتے رہے اور ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد یہاں سے چلے گئے۔ وہ کہتے ہیں: میں کالج کے پینتالیس فیصد غیر از جماعت طلبہ میں سے تھا مگر اس کے باوجود میں نے مرزا ناصر احمد صاحب کی بے پناہ شفقت سے ہمیشہ وافر حصہ پایا۔ جب آپ اپنے گھر سے دفتر آتے تو ہم زوآلوجی کی کلاس شروع ہونے کے انتظار میں برآمدے میں کھڑے ہوتے تھے۔ آپ ہمیشہ مجھے میرا نام لے کر مخاطب کرتے اور حال احوال دریافت فرماتے۔ میرے احمدی ساتھی حیران ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ میں میاں صاحب کو کیسے جانتا ہوں اور وہ مجھ پر اس قدر شفقت کیوں فرماتے ہیں۔ میں انہیں جواب دیا کرتا تھا کہ آپ نے مجھے کالج میں داخلے کے لیے انٹرویو والے دن ہی اپنا بیٹا بنا لیا تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کے دل کے بہت قریب ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیگر اساتذہ کے علاوہ پرویز پروازی اور شریف خاں جیسے استادوں سے بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کالج نے طلبہ کو ان کے مذہب وعقیدہ کی تفریق کے بغیر یکساں پیار دیا۔

وہ کہتے ہیں: میرا تعلق چنیوٹ سے ہے۔ اب امریکہ میں ہوں اور وٹرنری ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس کرتا ہوں تاہم میں ہر سال چنیوٹ جاتا ہوں۔ وہاں سے ایک بار ربوہ بھی ضرور جاتا ہوں لیکن میں یہ دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتا ہوں کہ حالات نے برصغیر کے ایک بے مثال تعلیمی ادارے کا کیا حشر کر دیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا خدانخواستہ میری ماں بحالتِ نزع مجھے مدد کے لیے پکار رہی ہو اور میں اس کے لیے کچھ نہ کر سک رہا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ حکومتِ پاکستان ہوش کے ناخن لے گی اور جلد از جلد اس ادارے کو اس کے مخلص مالکان کو لوٹا دے گی۔

میرے نزدیک سعید اے بشیر کا یہ بیان ایک باضمیر انسان کا بیان ہے جو جماعت سے تعلق نہ رکھنے کے

باوجود حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو آج بھی بے حد اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے اور اس کالج کے بعض قابل اور محبت کرنے والے اساتذہ کو بھی نہیں بھول پایا۔

یہ کتاب لکھتے وقت میں نے ان سے اجازت طلب کی کہ ان کا نام بھی اس ادارے کے قابلِ ذکر طلبہ میں شامل کرسکوں تو انہوں نے بلاتامل یہ اجازت مرحمت فرمادی۔ ملاحظہ ہو ان کی ۷ ستمبر ۲۰۱۶ء کی وہ ای میل جو مجھے اس حوالے سے موصول ہوئی ہے اور جس کا آزاد اردو ترجمہ کچھ یوں کیا جاسکتا ہے:

''بہت شکریہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ آپ کی زیرِ تصنیف کتاب میں میرا ذکر بھی شامل ہو۔ تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے خوبصورت مہ و سال کو یاد کرتا ہوں تو بہت سے چہرے سامنے آنے لگتے ہیں جن میں سے ایک چہرہ آپ کا بھی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس عظیم درسگاہ سے فیضیاب ہوا ہوں لہٰذا اگر آپ میرا نام بھی اس کالج کے مدّاحوں میں شامل کرسکیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

ڈاکٹر سعید اے بشیر کا ذکر تمام ہوا۔ اب میں تعلیم الاسلام کالج کے ایک ایسے سابق طالب علم کو آپ سے متعارف کرا رہا ہوں جنہیں امریکہ میں رہتے ہوئے پنجابی زبان و ادب اور کلچر کی خدمت کا ایک منفرد انداز میں موقع مل رہا ہے۔ میری مراد سفیر الحق رامہ سے ہے جو عبدالحق رامہ، ناظر بیت المال صدر انجمن احمدیہ کے صاحبزادے ہیں اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء کے دوران اس کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ کالج کے اُن ہونہار طلبہ میں سے تھے جو پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کرکٹ کے کھلاڑی اور ایک اچھے ڈِبیٹر کے طور پر شہرت پائی اور بہت سی انٹر کالجیٹ ڈِبیٹس میں اپنے کالج کی نمائندگی کی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد انہوں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور جنوری ۱۹۷۴ء سے مئی ۱۹۷۷ء تک اپنی مادرِ علمی میں انگریزی پڑھانے پر مامور رہے۔ وہ اس زمانے کی یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے بتایا کرتے ہیں: مجھے کرکٹ کا شوق تھا لیکن کالج میں باسکٹ بال کا زور تھا بلکہ سچ پوچھئے تو کرکٹ ٹیم تھی ہی نہیں۔ میں فرسٹ ایئر میں تھا تو یہ ٹیم بنی۔ میں بھی اس میں شامل ہوا لیکن جلد ہی اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور آہستہ آہستہ انتظامیہ نے اسے بھلا ہی دیا تاہم میں اپنا شوق محلے میں کرکٹ کھیل کر پورا کرلیا کرتا تھا۔ میں فضلِ عمر کرکٹ کلب کے بینر تلے کھیلا کرتا تھا۔ وہ کہتے ہیں: یوں تو اس زمانے میں کرکٹ کھیلنے والے بہت سے تھے لیکن مجھے اپنے دو مرحوم دوستوں کا خاص طور پر ذکر کرنا ہے۔ ایک کا نام سردار لطیف احمد تھا اور دوسرے کا النصر۔ النصر بعد میں فوج میں چلے گئے تھے۔ میجر تھے کہ ہیلی کاپٹر کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ لطیف بعد میں امریکہ آگئے تھے۔ وہ بھی ایک ایئر کریش میں وفات پا چکے ہیں۔ ایک اور لڑکا حیٔ تھا جو پنجاب کی انڈر ۱۹ کرکٹ ٹیم میں منتخب ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے کلب کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی اور ہمیں چنیوٹ، جھنگ، فیصل آباد، سرگودھا، لاہور اور گوجرانوالہ حتّٰی کہ راولپنڈی، اسلام آباد اور واہ کینٹ کے مختلف کلبوں سے بھی میچز کے لیے دعوت نامے موصول ہونے لگے۔ کبھی ہم ان کے ہاں جاکر میچ کھیلتے اور کبھی ہم انہیں ربوہ بلالیتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم سال میں تیس سے چالیس میچ ضرور کھیل لیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر

جیتتے بھی تھے۔ میں نے ربوہ میں کرکٹ کی تاریخ پر انگریزی میں ایک مضمون المنار، یو ایس اے کے لیے لکھا تھا جو اس کے پہلے شمارے میں چھپ چکا ہے۔ الحمدللہ کرکٹ کے شائقین اور ربوہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے یہ مضمون پسند کیا ہے۔

یوں تو سفیر کالج کے تمام اساتذہ کا نام ہی بے حد ادب و احترام سے لیتے ہیں تاہم وہ چوہدری محمد علی اور ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کے لیے اپنے دل میں خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: کالج میں میرا تقرر ہوا تو چوہدری محمد علی پرنسپل تھے۔ پہلے تو میں نے انہیں صرف دور سے دیکھا ہوا تھا، اب ان کی قربت نصیب ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کس قدر عظیم انسان ہیں۔ بہت شفیق اور بے حد نستعلیق لیکن بہت اچھے منتظم بھی۔ وہ جو ذمہ داری قبول کرلیتے، اسے بصدقِ دل پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ کالج کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کے عہد میں سوِمنگ، روئنگ، ہائیکنگ اور باسکٹ بال نے کتنی ترقی کی۔ ڈاکٹر سلطان محمود شاہد انتہائی درویش صفت تھے۔ کالج یونین کے انچارج تھے اور میں یونین کا عہدیدار اور ایک اچھا ڈِبیٹر بھی اس لیے ان سے دن رات کا واسطہ تھا۔ کبھی کوئی ایسا موقع پیدا نہیں ہوا جب انہوں نے طلبہ کو ناراض یا مایوس کیا ہو۔ بے حد وسیع القلب تھے اور طلبہ کی ناز برداری سے بھی نہ چوکتے۔

۱۹۷۷ء میں سفیر رامہ کو کویت میں دسمان کے انٹرنیشنل سکول میں سینئر ٹیچر کی ملازمت مل گئی چنانچہ وہ تعلیم الاسلام کالج کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ادھر چلے گئے۔ انہوں نے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ مل کر کویت میں پنجابی ادبی سنگت کی بنیاد رکھی۔ وہ کہتے ہیں: کویت میں قیام کے دوران میرے کئی صحافیوں سے مراسم بن گئے۔ ان میں انگریزی روزنامہ ''عرب ٹائمز'' کے مالک بھی شامل تھے۔ وہ ہماری تحریک پر رضامند ہوگئے کہ ایک اردو روزنامہ جو ''عرب ٹائمز'' ہی کے نام سے شائع ہوگا جاری کرنے میں ہماری ہر طرح سے مدد کریں گے۔ یہ روزنامہ جاری ہو بھی گیا لیکن کویت پر صدام کے حملہ کی وجہ سے سارا نظام درہم برہم ہوگیا چنانچہ میں ۱۹۸۰ء میں وہاں سے امریکہ چلا آیا۔

پاکستان چھوڑنے سے پہلے وہ انگریزی کے علاوہ معاشیات میں بھی ایم اے کرچکے تھے۔ امریکہ پہنچ کر انہوں نے اپنی تعلیمی صلاحیت میں مزید اضافہ کیا اور نہ صرف ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی سے فنانس میں ایم بی اے کیا بلکہ جارج میسن یونیورسٹی سے انفرمیشن سسٹمز میں ایم ایس بھی کرلیا۔ ۱۹۸۸ء سے وہ مشہورِ عالم اے ٹی اینڈ ٹی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

انہیں پنجاب اور پنجابی زبان کے ساتھ محبت ہے۔ وہ ایک سہ ماہی پنجابی مجلّہ ''سانجھ'' کے چیف ایڈیٹر ہیں اور اکیڈمی آف دی پنجاب اِن نارتھ امیریکہ کے کوآرڈی نیٹر بھی۔ یہ غیر مذہبی، غیر سیاسی اور غیر کاروباری ادارہ آج سے قریباً بیس سال پہلے بعض محبانِ پنجابی نے ورجینیا میں قائم کیا تھا اور اس کا مقصد پنجابی زبان، لٹریچر اور کلچر کی اشاعت و تشہیر ہے۔ اس وقت چالیس سے زیادہ ممالک میں اس اکیڈمی کے سات ہزار ممبران موجود ہیں۔ اکیڈمی اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے کانفرنسیں، سیمینار، سٹیج ڈرامے، میوزیکل کنسرٹس،

کوی دربار اور ہندو پاک میں چھپنے والی کتابوں کی نمائشیں منعقد کرتی رہتی ہے اور گزشتہ پانچ سال سے بعض اداروں کی مدد سے ورجینیا میں ایک سالانہ پنجابی میلہ کا بھی اہتمام کرتی ہے جسے دیکھنے کے لیے بارہ سے پندرہ ہزار افراد آتے ہیں۔ اکیڈمی مشرقی ومغربی پنجاب کے پنجابی لکھاریوں اور محبانِ پنجابی سے رابطہ میں رہتی ہے اور پنجابی کا ایک مقبولِ عام ویب پیج بھی چلا رہی ہے۔ پنجابی علم وادب اور کلچر کی ترویج کے حوالے سے سفیر رامے کے اس ادارے کی کوششوں کو سنجیدہ حلقوں کی طرف سے سراہا جا رہا ہے۔

سفیرالحق رامہ کے بعد اب میں ایک ایسے مشفق ومہربان کا ذکر کر رہا ہوں جس کی جماعت کے لیے خدمات کم وبیش پینتالیس برس پر محیط ہیں۔ میرا اشارہ مسعود احمد خالد، ناظر اشاعت، صدر انجمن احمدیہ (جن کا تعلق ضلع سرگودھا کی تحصیل شاہ پور سے ہے) کی طرف ہے۔ وہ ۱۹۶۵ء میں جب راقم اس کالج سے رخصت ہو رہا تھا یہاں داخل ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں ایم اے (عربی) کر کے نکلے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آہستہ آہستہ اپنے لیے کوئی موزوں ذریعہ معاش پیدا کر لیں گے لیکن اسی دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کی سوچ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ ایک دن وہ ربوہ سے اپنے گاؤں جانے کے لیے پیدل لاری اڈے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک سائیکل سوار پیچھے سے آ کر ان کے پاس رک گیا۔ یہ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد تھے جو اُن دنوں وقفِ جدید انجمنِ احمدیہ کے ناظم ارشاد تھے۔ مسعود خالد کا ان کے ساتھ صرف چہرہ شناسی کی حد تک تعارف تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور جب انہیں بتایا گیا کہ وہ ایم اے کے نتیجے کا انتظار کر رہے ہیں تو موصوف نے انہیں اگلے روز اپنے دفتر میں ملنے کو کہا۔

حسبِ ہدایت مسعود خالد ان کے دفتر میں پہنچے جہاں آپ نے ان کے تفصیلی حالات معلوم کیے۔ جب مسعود خالد نے بتایا کہ وہ اپنے لیے کسی مناسب روزگار کی تلاش میں ہیں تو صاحبزادہ صاحب نے کہا: جتنی دیر میں کوئی اور کام ملتا ہے آپ یہاں کام کر لیں۔ چند روز کے بعد انہیں موصوف کی طرف سے اسی مضمون کا ایک خط بھی موصول ہو گیا۔ ان کی طرف سے رہائش اور کھانے کا انتظام کر دیا گیا اور یوں مسعود خالد ربوہ کے ہو کر رہ گئے۔ صاحبزادہ صاحب کو موصوف پر مکمل اعتماد تھا چنانچہ ہر وہ کام جو وہ کسی اور کے سپرد نہیں کرنا چاہتے تھے مسعود خالد کے ذمہ لگایا جانے لگا۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا حتّٰی کہ انہیں اس دفتر میں کام کرتے ہوئے دس سال بیت گئے۔

اسی اثنا میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے اپنے ایک خطبے میں جماعت کے نوجوانوں کو اپنی زندگیاں وقف کرنے کی تحریک فرمائی تو مسعود خالد نے خود کو وقف کے لیے پیش کر دیا۔ وقف قبول ہوا اور ان کی تقرری بطور نائب ناظر تعلیم، صدر انجمن احمدیہ ہو گئی۔

مسعود خالد نے کسی مرحلہ پر نصرت جہاں سکیم کے تحت افریقہ میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔ ایک روز انہیں تحریک جدید کی طرف سے ایک چٹھی موصول ہوئی جس کے مطابق ان کا تقرر سیرالیون کے کسی سکول میں کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے یہ درخواست اس وقت دی تھی جب زندگی کے معاملات ان کے اپنے اختیار میں تھے

لیکن خود کو وقف کے لیے پیش کر دینے کے بعد وہ اپنے طور پر اس پیشکش پر کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی طرف رجوع کیا۔ حضور نے انہیں یہ پیشکش قبول کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ دانہ پانی انہیں سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن لے گیا جہاں انہوں نے جماعت کے ایک سکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔

افریقی ممالک میں ایک آزاد وخود مختار ادارہ ویسٹ افریقن ایگزامینیشن کونسل کے نام سے کام کر رہا ہے۔ مسعود خالد بتاتے ہیں: یہ ادارہ مغربی افریقہ کے سکولوں کے نصاب اور امتحانات کو کنٹرول کرتا ہے۔ ایک بار انہیں اس ادارے کی طرف سے ایک چٹھی موصول ہوئی جس کے تحت انہیں ایگزامینر مقرر کیا گیا تھا۔ انہیں اس پیشکش کو قبول کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ تھی لیکن جب یہ معاملہ ان کے پرنسپل کے علم میں آیا تو اس نے اصرار کیا کہ انہیں یہ پیشکش ضرور قبول کر لینی چاہیے سو انہیں اس پر آمادگی کا اظہار کرنا پڑا۔ بعد میں انہیں عربی کا چیف ایگزامینر مقرر کر دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں بظاہر تو یہ کوئی بڑی بات نہیں لگتی لیکن افریقہ میں اسے ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے چنانچہ مجھے اس موقع پر اپنے رفقا کی جانب سے بکثرت مبارکبادیں موصول ہوئیں۔

موصوف کم وبیش ساڑھے تین سال سیرالیون رہے جس کے بعد وہ ۱۹۸۵ء میں پاکستان واپس آ گئے۔ ان کی تقرری وکالتِ تبشیر میں ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث انہیں بطور مبشر زائر بھجوانا چاہتے تھے لیکن وہاں کے ویزے میں کچھ رکاوٹ درپیش تھی چنانچہ انہیں آئرلینڈ بھجوانے کا فیصلہ ہوا لیکن وہاں کا ویزا بھی نہ مل سکا جس پر انہیں سیکرٹری، آبادی کمیٹی مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ نائب وکیل المال ثالث بھی رہے لیکن ان کی ملازمت کا سب سے لمبا عرصہ جو چودہ پندرہ سال پر محیط تھا بطور ناظر امورِ عامہ گزرا۔

وہ صدر مجلس کارپرداز تھے جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھے اب یاد نہیں کہ اس ملاقات کا پس منظر کیا تھا لیکن میں پہلی ہی ملاقات میں ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو گیا اور پھر جب بھی ربوہ جاتا ان سے ضرور ملتا۔ ان کی محبت تھی کہ ہمیشہ بہت پیار سے پیش آتے اور موسم کے مطابق تواضع بھی کرتے۔ سیّد عبدالحیٔ شاہد کی وفات پر ناظر اشاعت مقرر ہو گئے۔ اس دوران بھی ان سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ ''قریۂ جاوداں'' کی منظوری کا مرحلہ درپیش تھا تو ان کی محبت کی وجہ سے سارے مراحل آسان ہو گئے۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جس کی منظوری میں بہت زیادہ وقت بھی لگ سکتا تھا لیکن ان کی اس عاجز پر شفقت تھی کہ انہوں نے خود اسے پڑھا اور اشاعت کے لیے موزوں سمجھا تاہم کسی حتمی فیصلہ سے پہلے کمیٹی کے باقی دو اراکین کی منظوری بھی ضروری تھی چنانچہ جوں ہی ان کی رائے موصول ہو گئی آپ نے منظوری کا خط جاری کر دیا۔ یہ سارے مراحل تین ماہ سے بھی کم مدت میں طے ہو گئے۔

اگرچہ اس سے پہلے میری سات کتابیں شائع ہو چکی تھیں لیکن یہ ساری کتابیں لاہور کے معروف طباعتی ادارے، فیروز سنز نے شائع کی تھیں۔ یوں میں طباعت کے مختلف مراحل سے روشناس تو تھا لیکن اپنے طور پر کتاب شائع کرنے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ میں یہ کتاب ربوہ سے شائع کرنا چاہتا تھا چنانچہ بٹر پیپر پر اس کی کاپیوں کی تیاری سے لے کر کاغذ کی خرید، ضیاء الاسلام پریس میں اس کی چھپائی اور جلد بندی تک تمام مراحل میں ان کی

رہنمائی میرے شاملِ حال رہی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نافع الناس وجود کی عمر میں بے انتہا برکت دے۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر مسعود خالد کا اردو میں ایک مضمون پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ موصوف کو انتہائی خوبصورت اردو لکھنے پر جو قدرت حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کو ہوگی۔ اُس وقت تک مجھے ان سے تفصیلی تعارف حاصل نہ تھا چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا جماعتی اخبارات و جرائد میں ان کے مضامین آتے رہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بالعموم مضمون نویسی کی طرف رغبت نہیں رکھتے البتہ وہ خطوط شوق سے لکھتے ہیں اور یہ کہ ویب سائٹ پر ان کا مضمون بھی دراصل ایک خط ہے جو انہوں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے مدارُالمہام، چوہدری حمید احمد کا پیغام موصول ہونے پر لکھا تھا۔ تب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون خوش نصیب ہیں جن کے ساتھ ان کی خط و کتابت ہے یا رہی ہے۔ اگرچہ انہوں نے مصلحتاً ناموں کو اخفائے راز میں ہی رکھا تاہم انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ پہلے چوہدری سلیم الدین، ناظر امور عامہ کے ہمراہ اسلام آباد گئے تو ناگاہ انہیں اپنے کالج کے ایک دوست، شوکت اعوان کا خیال آیا جس سے مدتوں سے رابطہ نہ ہو سکا تھا لیکن ان کی معلومات کے مطابق اسے اسلام آباد میں ہونا چاہئے تھا۔ سلیم الدین کی کوشش سے شوکت اعوان کا نمبر مل گیا، ان سے رابطہ ہوا اور پھر انہوں نے شوکت اعوان کے ساتھ کچھ وقت پیر سوہاوہ میں ان کے ایک ریستوران میں گزارا۔ مسعود خالد بتاتے ہیں: واپس پہنچ کر میں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں انہیں ان کی کاروباری کامیابیوں پر مبارکباد دی گئی تھی لیکن کسی وجہ سے میں یہ خط پوسٹ نہ کر پایا۔ میرے اصرار پر کہ اگر یہ خط ان کے پاس محفوظ ہو تو مجھے دے دیں انہوں نے کرمفرمائی کی اور یہ خط میرے حوالے کر دیا۔ اس خط کو ان کے ایک ادبی شاہکار کے طور پر ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''اسلام آباد کا اچانک عزم گورنجِ سفر سے بڑھ کر کچھ نہ تھا لیکن اس میں خوشگواری کا ایک ایسا پہلو نکلا کہ یادگار ہوگیا۔ اسلام آباد قیام کے دوران بے دلی اور بےزاری کی کیفیت وارِدِ حال رہی۔ صبح اس اُداسی کے عالم میں آپ کی یاد نے دل پر دستک دی اور ملاقات کی خوابیدہ تمنّا بیدار ہوئی مگر کوئی وسیلہ نظر نہ آیا۔ دلِ ناصبور بے قابو ہوا۔ وفورِ شوقِ ملاقات اور نارسائی کا حرمان حرفِ مدّعا بن کر رفیقِ شفیق پر عیاں ہوا۔ اس مہربان جو وسیع المشرب اور تعلقاتِ عامہ میں مستعد ہیں، نے رابطے فرمائے اور آپ کا فون نمبر دریافت کر کے آپ سے گفتگو کا موقع بہم کر دیا۔ جزاہُ اللہ احسن الجزا۔

مدتِ مدید گزری آپ سے ملاقات اور نامہ و پیام کا سلسلہ مفقود تھا۔ دل بدگماں ہوا کہ شناسائی کی تجدید کے لیے یادداشتوں کو دہرانے کی ضرورت پڑے گی لیکن آپ نے مجھے شکوک و خدشات کی قید سے یکسر آزاد کر دیا۔ ایسی پذیرائی کی کہ کمال کر دیا۔ طائرِ شوق نے پرِ پرواز کھولا۔ ہم دونوں کشاں کشاں سوئے منزل چل دیئے۔ راستہ کی دلکشی اور خوبصورتی، پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک، قدم بقدم بلندی کا سفر منزل کے حسن و جمال کا پتا دے رہا تھا۔ منظر خوبصورت تر اور فضا خوشگوار تر ہوتی گئی حتّٰی کہ ہم منزل پر جا پہنچے۔

ایک ہمدمِ دیرینہ کی چہرہ نمائی ہوئی۔ رُوبرو ہوئے تو حیرت و خوشی کی انتہا نہ رہی۔ گو کہ یہ طُرفہ تماشا کھلی

آنکھوں کے سامنے برپا تھا لیکن خواب کا گمان ہوتا تھا۔ آپ نے جس گرمجوشی و تپاک اور محبت و اخلاص سے گلے لگایا

مری آرزو سے کم تر، مری تاب سے زیادہ

آپ سے ملے۔ باتیں ہوئیں۔ یادیں دہرائیں اور لذّتیں پائیں۔ کالج کی یادِ ایام بھی عجب دلفریب اور سحر انگیز موضوعِ سخن ہے۔ ذہن کے دریچے کھلتے ہیں تو رنگِ بہار دل پر مستولی ہو جاتا ہے۔ ایک متحرّک فلم کی صورت مہ جبیں چہرے ہویدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے طرب انگیز اور وجد آفرین مناظر رواں ہوتے ہیں کہ نظریں ان سے پیوست ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس شغف اور شوق میں ماسوا کی خبر ہی نہیں رہتی۔ بات چل نکلے تو دور تک جاتی ہے۔ یہ فسانہ چھڑ جائے تو ختم کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ جی کی سیری اور سیرابی نہیں ہوتی بلکہ پیاس اور بھڑک سوا ہو جاتی ہے۔ آپ کے حافظہ میں اُس بھلے وقت کی یادیں اپنی تفاصیل اور جزئیات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ آپ نے بڑے شوق و پیار اور احتیاط و توجہ سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ جب یہ سلسلۂ کلام جاری تھا تو دل لذّتِ سماعت کے وفور سے لبریز ہوگیا اور میں ہمہ تن گوش تھا۔ اس دوران ایک شعر بار بار یاد آیا۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے:

اتنا مانوس ہوں سنّاٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

استاذی المکرّم چوہدری محمد علی نے مصرعہ لگا کر ایک عجب شان کا مضمون باندھا ہے:

تُو اگر بول رہا ہو پیارے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

آپ نے عسیرُ الفرصتی کے باوجود ہمیں بہت وقت دیا بلکہ تقریباً پورا دن ہی صرف فرمایا۔ اس دوران ذکرِ دوستاں سے دل کو گرمایا۔ مہربان اساتذہ کے التفاتِ کریمانہ اور ان کی محبتوں کے تذکرے سن کر ان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ پرانی یادیں موجوں کی طرح ابھرتی اور ڈوبتی رہیں اور بخیہ چاک گریباں کا سامان کرتی رہیں:

لفظ کے پردۂ زرتار میں خُوبانِ خیال
کبھی مستُور کبھی پردہ کشا ہوتے ہیں

ذہن میں من موہنی صورتیں اور ان کی دلآویز باتیں تازہ ہوئیں۔ اس انجمن آرائی کو دیکھ کر دل سے اک ہُوک سی اٹھی:

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

مرے پیارے اور کرمفرما دوست چوہدری سلیم الدین، صاحبِ ذوق، خوش اطوار، یارِ طرح دار ہیں۔ حقِ رفاقت کے تقاضوں سے خوب آشنا اور ان کو نبھانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ کے ساتھ نشست سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ آپ کی تواضع، مدارات اور دلنشیں باتوں سے انہوں نے پورا حظ اور مزہ اٹھایا بالخصوص آپ کی کہانی آپ کی زبانی سن کر اور آپ کی کاوشوں کے ثمرات کو نظارہ کر کے وہ بہت خوش ہوئے۔ واپس آ کر ہم باہم یہی باتیں کرتے رہے۔

ایک مدت آپ مارگلہ کی بلندیوں، اس سبزہ زار اور مرغزار میں جہاں قدرت کی نیرنگیاں اور رنگین کاریاں اور حسنِ فطرت کی رعنائیاں اور گلکاریاں اپنا جوبن دکھاتی ہیں، پھرتے رہے۔ بادِ صبا کی وزیدگی اور نکہتوں کی سحرآفرینی، بلبلوں کی نغمہ خوانی سے لطف اٹھاتے رہے۔ بالآخر آپ کے حسنِ نظر اور ذوقِ لطیف نے وہ گوشۂ چمن چُن لیا جو اس کا دل ہے اور اسے ایک تخت گاہ بنانے کا عزم کرلیا اور حسن کے سحر سے نکل میدانِ عمل میں اترنے کا تہیہ کرلیا۔ پھر کئی سال سوچوں اور مراقبوں اور کاوشوں میں لگا دیئے کہ سردیوں کی چاندنی کی طرح حسنِ فطرت کی یہ جلوہ گاہ جو اَن دیکھی پڑی تھی اس کی جلوہ سامانی اور قدرت نمائی کو مشہود و مشہور کیسے کرنا ہے؟ بالآخر اس جنّت نشان اور اس کی فضائے بسیط کے نظارہ کے لیے آپ نے ایک ایسی منظر گاہ بنادی، ایسی بستی بسائی کہ جہاں اہلِ دل و نظر نظارۂ قدرت کرتے ہیں۔ دنیا کے جھمیلوں میں الجھے ہوئے دماغ اور دنیاوی دھندوں سے تھکے ماندہ جسموں کو آرام اور راحت کی چند ساعتیں میسر ہوتی ہیں۔ ہر طبقہ اپنے مزاج اور افتاد کے موافق ماحول پاکر آرام یافتہ ہوتا ہے، تاحدِ نظر قدرت کی جلوہ آفرینیوں کو دیکھ کر لذت پاتا ہے۔ نوخیز جوانیاں اپنے اپنے رنگ میں صباحتوں اور ملاحتوں کے مزے لُوٹتی ہیں۔ دلکشا مناظر، راحت بخش نسیم و شمیم کے جھونکے، برتنوں کے کھنکھنار کی جلترنگ، ساز و آواز کا آہنگ، روشنیوں کی جگمگاہٹ، قہقہوں کی برسات اور خوشبوؤں کی مہکار۔ غرضیکہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

ایسے ہنگام میں بسا اوقات زبانی اظہارات کی بے باکیوں اور رویّوں کی خرابیوں اور مزاجی سرکشیدگیوں میں طغیان ایک عموم کی صورت رکھتا ہے جو رفتہ رفتہ ایسے پبلک مقامات کو خرابات میں بدل دیتا ہے لیکن آپ نے ماحول کو پُرامن، مہذب اور شائستہ رکھا ہوا ہے۔ آپ کی توجہ اور محنت نے اس میں خوبصورت رنگ بھر دیا ہے۔ ہر طبقہ کو اپنے مزاج اور افتادِ طبع اور ذوق کے مطابق اس میں استراحت اور لذت یابی کے سامان میسر ہیں اور ایسے ماحول کی فراہمی اور دستیابی نے اس تفریح گاہ کو دلکش اور مرجعِ خلائق بنا دیا ہے۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے اور قابلِ داد و ستائش۔ بہرکیف اس گلگشت کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

ہم دونوں سوچتے رہے کہ منظر نامہ تو جادو آفرین ہے مگر اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے جو محنت اور شوق اور تکلیف اور سرگرانی صرف ہوئی ہوگی، اس کو تصور میں لایا جائے تو سوچ کا یہ سفر بھی درماندہ اور تھکا دے گا۔ دامنِ کوہ کی وحشتوں اور تنہائیوں کو رونقوں اور آبادیوں میں مبدّل کرنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ غالب نے خوب کہا ہے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آپ نے پہاڑ کو کاٹ کر جوئے شیر رواں کردکھائی ہے۔ عیش و عشرت کے دلدادہ، لذتوں کے خُوگر، انبساط و التذاذ کے رسیا، موج میلے کے متوالے اب صبح کو شام کرنے کے انتظار میں بے چین ہوتے ہیں کہ کب

شام اُترے اور وہ لذتِ کام و دہن اور نظارگیِ حسن کا سامان بہم پائیں۔

یارِ من! آپ نے جس دانائی اور حکمت اور حسنِ عمل سے اپنی اس دلچسپی اور مشغلہ کو رُوبراہ رکھا ہوا ہے واقعی قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ اس راہ کی مشکلات و مسائل کا آپ نے مختصراً ذکر بھی فرمایا تھا اور آغاز کی دشواریاں اور ناہمواریاں بتائی تھیں۔ ہر مرحلہ حوصلہ شکن اور ہر موڑ اعصاب توڑنے والا تھا مگر آپ کی ہمتِ جواں اور عزمِ بے کراں نے ہر مشکل کا حل نکالا اور جنگل میں منگل کر دکھایا۔ جہاں گیدڑوں اور بندروں کی راجدھانی تھی اس کو مرجعِ خواص بنا دیا۔ جہاں اندھی رات کا جشن برپا رہتا تھا اب روشنیوں کا شہر آباد ہے۔ یاد آیا آپ نے بتایا تھا کہ یہاں پر موجود چائے کے کھوکھا کو درست کر کے جب کام شروع کیا گیا تو آپ نے اپنی پونجی کے بڑے حصہ کو خرچ کر کے ایک جنریٹر خرید کیا اور اس پر تین بڑی روشنیاں نصب کر کے ان کا رُخ اسلام آباد کی طرف کر دیا جو ساری رات ضوفشاں رہتی تھیں۔ ہمیں خیال آیا کہ یہ خدائی تصرف ہے کہ آپ کو یہ توجہ دلائی گئی۔ اس میں یہ اشارہ تھا کہ اب یہاں روشنیوں کا شہر آباد ہونے والا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ یہ سراسر اس کا فضل و احسان ہے۔ ان روشنیوں کا منظر اب اسلام آباد میں مشارالیہ ہے۔

اس ویرانہ کو جہاں دن کو بھی رات کی سیاہی کا گمان ہوتا تھا اب رات کو سپیدۂ سحر طلوع ہوتا دکھائی دیتا ہے اور جہاں دن کو لُٹنے کا خوف دامن گیر ہوتا تھا اب رات کو امن اور آشتی کا راج ہوتا ہے۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے غیر ملکی سفارت کاروں کو دعوت دی اور آپ نے ان کی سیکیورٹی کا خود انتظام کیا۔ ساٹھ سے زائد سفارت کار تشریف فرما ہوئے۔ یہ معجزنما واقعہ ہے۔

آپ کا یہ ریسٹوران، اس کی عمارت، ڈیزائن و تعمیر، تزئین و آرائش اور ترتیب و پیشکش آپ کے تخلیقی مَلکوں اور اعلیٰ استعدادوں کی رہین ہیں۔ یہ تخلیق خدا تعالیٰ کے آپ پر انعامات، خداداد قابلیتوں اور صلاحیتوں کی غمّاز ہے، آپ کی محنتِ شاقہ اور عرق ریزی اور غیر معمولی شوق و دلچسپی کا شاہکار ہے۔ عمارت کا ہر ضلع اور زاویہ، ہر تختہ اور نشست گاہ، فرنیچر کی خوبصورتی اور نفاست، ماحول کی پاکیزگی اور صفائی، خوش پوش نوجوانوں کی حسنِ خدمت، روشنیوں کی تنصیب اور ان کا حسین امتزاج گویا رنگ و نور کا دریا چڑھا ہوا ہے۔ ہر چیز میں قرینہ اور سلیقہ کی جھلک۔ غرضیکہ کیا کہا جائے۔ انگشتِ حیرت بہ دنداں ہے۔ کہانیوں میں پڑھا کرتے تھے کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ آپ کے اس کرشماتی اور طلسماتی جزیرہ کو ایک بار دیکھا تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس بھڑکی ہوئی ہے۔ ایسے پیارے دوست کی کامرانیوں اور شادکامیوں پر دل خوش و خرم، شاداں و فرحاں ہے۔ مبارک صد مبارک۔ آپ کی سرگرمی و جولانی اور ہمت و عزم اور شوق و مسابقت کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ

نقشِ پا میں ہے تپ گرمیِ رفتار ہنوز

آپ نے خالد مسعود کا ذکرِ خیر اور ان کا دلنشیں طرزِ تحریر ملاحظہ فرمایا۔ اب کچھ باتیں تعلیم الاسلام کالج کے ایک ہونہار طالب علم، ڈاکٹر منور احمد انیس کے بارے میں۔

ایک روایت کے مطابق منور احمد انیس جو آج کل ڈاکٹر منور اے انیس کے نام سے موسوم ہیں ۱۹۶۵ء

میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے۔ انہوں نے یہاں سے بی ایس سی کی اور بعد میں ایم ایس سی زوآلوجی کرلیا۔ بعدۂ وہ امریکہ چلے گئے۔ ان کا ارادہ اِنڈیانا یونیورسٹی سے مائیکروبایالوجی میں پی ایچ ڈی کرنے کا تھا مگراسی دوران اِسلامک اِیشوز میں ان کی دلچسپی بڑھ گئی چنانچہ انہوں نے مائیکروبایالوجی میں پی ایچ ڈی کا ارادہ ترک کر کے ان ایشوز سے متعلقہ علوم میں پی ایچ ڈی کی۔

ڈاکٹر منور اے انیس آج کل یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور کے سنٹر فار گلوبل ڈائیلاگ کے ڈائریکٹر ہیں اوران کا تعارف یونیورسٹی کی ویب سائٹ umt.edu.pk>oty>munawar-a-anees پر بہ ایں الفاظ کرایا گیا ہے:

Dr. Munawar A. Anees is a strategic consultant and a globally published creative writer. He holds intensive experience and enduring interest in a wide range of areas such as science and religion, strategic program management, information resource development, media strategy and advisory, and science and ethics policy analysis. Dr. Anees has published over half a dozen books and nearly 350 articles and papers in leading outlets. Nupedia, a precursor to Wikipedia, selected him as Edtitor (Religion). He was an Advisor to the former Deputy Prime Minister of Malaysia, Anwar Ibrahim, and a Special Consultant to the John Templeton Foundation, Philadelphia. Founding Editor-in-Chief of Periodica Islamica, he is currently Director, Center for Global Dialog, University of Management and Technology and an Advisory Editor of Journal of Islamic Philosophy.

جیسا کہ اوپر اشارۃً ذکر ہو چکا ہے وہ ملائشیا کے ڈپٹی پرائم منسٹر اور وزیر خزانہ اور ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۵ء کے دوران ملائشیا کے لیڈر آف دی آپوزیشن، انور ابراہیم کے ذاتی دوستوں میں سے ہیں تاہم جب انور ابراہیم کے دِن پلٹے تو بعض الزامات کے تحت ڈاکٹر منور اے انیس کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں جن کی تفصیلات انٹرنیٹ پر موجود ہیں چنانچہ cambridgecoalition.tripod. com>an نامی ایک ویب سائٹ پر Dr. Munawar Anees' Story کے عنوان سے موصوف نے اپنی کہانی خود بیان کی ہے جس کا ترجمہ کر کے میں اس کا لطف برباد نہیں کرنا چاہتا۔ خود ہی پڑھ لیجئے، موصوف نے کیا لکھا ہے:

A large inscription on the rotunda of the Jefferson Memorial in Washington-- "I have sworn upon the altar of God eternal hostility against

every form of tyranny upon the mind of man"-- impressed me deeply on my first visit of the United States as a student nearly a quarter of a century ago. Recently, with the tears of experience welling in my eyes, I revisited that site. My arbitrary arrest and torture in Malysia had engraved Jefferson's incription on my heart.

As a student I knew of the horrors of the Holocaust and other human tragedies, but merely as a distant thunder. The violation of human rights and crimes against humanity were only an abstract notion.

That was all fated to change with my arrest last year under the..... Internal Security Act..... of Malaysia, which allows for indefinite detention without trial. My crime? I had known Anwar Ibrahim, the Deputy Prime Minister and Finance Minister of Malaysia, as a close personal friend for many years. We shared and strove for a vision of life firmly rooted in human dignity. We struggled for building an intellectual and political milieu for free expression. Together, we subscribed to the idea of economic prosperity, gender and racial equality and a civil society.

Alas, ... Mahathir,..... in order to build his case against Anwar..... himself ordered my arrest.

My kidnapping and detention by the..... Malaysian Special Branch taught me how it feels to be forcibly separated from one's wife and children. How it feels to be searched and seized, disallowed to make phone calls, handcuffed, blindfolded, stripped naked, driven in an animal cage, shaven bald, endlessly interrogated, humiliated, drugged, deprived of sleep, physically abused. What it's like to be threatened, blackmailed, tormented by police lawyers, brutalized to make a totally false confession, hospitalized for a consequent heart ailment, and treated as a psychiatric patient with symptoms of Stockholm syndrome.

Barely surviving on a meager diet of rancid rice and chicken along

with 12 medicines a day, I spent nearly four months handcuffed around the clock to my hospital bed, under the watchful eyes of the prison guards.

Thereafter, my ability to speak, read and write took a considerable time to show signs of recovery. Short-term memory lapses were frequent. I existed in a fluid state in which suicidal tendencies, depression and despair were punctuated by fits of rage and indignation.

Weekly visits of less than an hour by my wife, Nadia, with our young children-- Aisha and Omran-- were my only contact with the outside world and the only inspiration to live on.

..... The Malaysian authorities refused the legal assistance of my choice, coercing me not to mount an appeal against the court verdict and threatening me with greater punishment under new charges if I didn't co-operate.

But, in attempting to scare off and alienate my friends, how terribly mistaken were Malaysian autocrats in aping gross Gestapo tactics. How they underestimated the temper of freedom in so many places around the world, above all among friends in the West.

Floodgates of human compassion were opened when the futurist author Alvin Toffler, who Mahathir asked to advise him on a pet high-technology project, sent a message of protest to the Malaysian leader within 72 hours of my capture. In a major interview with the Western press, Mahathir even felt it necessary to make assurances..... about my well being.

With every passing day, the rising tide of concern for my plight seemed to personify the words of Elie Wiesel: "Take sides. Neutrality helps the oppressor. Never the victim. Never the tormented.

Friends and strangers alike took a stand and support began to mushroom everywhere. Nadia related to me in the hospital how Amnesty

International had declared me a "prisoner of conscience," and how Pen International adopted me as a "writer in prison." Against all odds, two prominent Malaysian lawyers, Manjeet Singh Dhillon and Balwant Singh Siddhu, offered their services unconditionally. To top it all, an international coalition-- Friends of Dr. Anees-- came into existence in defence of my rights. The core group of Naseer Ahmad, Baseer Hai, Safir Rammah, Jamal Mubarak, Anees Ahmad and Naeem Siddiqui mounted a media campaign with phenomenal success.

What touched my heart was that the person, Kamal Mubarak, who set up the Website had never met me in person. From the depths of my confinement, I could see the magic of human compassion had begun to defeat oppression.

The pinnacle was reached after my release in the warm hug laced with watery eyes of an Amnesty friend in Toronto, Margaret John, who witnessed a pledge of solidarity between me and Devan Nair, the former president of Singapore, for we had come to share a similar fate.

ڈاکٹر منور انیس کے بارے میں مزید باتیں کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کچھ دیر پہلے اس مضمون میں چنیوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک غیراز جماعت طالب علم، سعید اے بشیر کا آپ سے تعارف کرایا جاچکا ہے۔ چنیوٹ ربوہ سے محض چھ میل کے فاصلے پر ہے لہٰذا تعلیم الاسلام کالج کی اچھی شہرت کی وجہ سے اس شہر سے بھی بے شمار طلبہ پڑھنے کے لیے یہاں آتے تھے تاہم چونکہ بالعموم ان کا تعلق جماعت سے نہ ہوتا تھا لہٰذا بعد میں وہ اپنی دنیا میں گم ہو کر اہلِ ربوہ کی نظر سے اوجھل ہو جاتے۔

۱۹۹۳ء میں جب میرا تقرر ملتان میں کمشنر انکم ٹیکس کے طور پر ہوا تو میرے دفتر میں ایڈمنسٹریشن کے شعبے کے سپروائزر (آپ آفس سپرنٹنڈنٹ بھی کہہ سکتے ہیں) عبدالرشید اقبال ہوا کرتے تھے۔ ان کا قد دراز، رنگت سفید، جسم قدرے فربہ اور زبان شیریں تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ محسوس کیا کہ وہ انتہائی محنتی اور سنجیدہ لیکن خوش اخلاق، بااصول اور غیر متعصّب انسان ہیں۔ ربوہ کے ساتھ میرا تعلق منکشف ہوا تو ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ چنیوٹ کے رہنے والے ہیں لیکن انہوں نے میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھنے کے بعد اور ایف اے کا امتحان تعلیم الاسلام کالج سے پاس کیا تھا۔ وہ بتایا کرتے تھے: یوں تو میں اسلامیہ ہائی سکول، چنیوٹ میں پڑھتا تھا لیکن میرا ایک لڑکے کے ساتھ جھگڑا ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے یہ سکول چھوڑنا پڑا۔ میرے

والد کا فرنیچر کا کاروبار تھا اور وہ اس زمانے سے جب تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں ہوا کرتا تھا اس کے بعض اساتذہ سے متعارف تھے۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ اساتذہ حیات ہیں۔ والد صاحب نے ان کو اپنی رام کہانی سنائی تو انہوں نے خوشدلی سے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور نہ صرف سکول میں بلکہ سکول ٹائم کے بعد گھروں میں بھی پڑھانے لگے۔ اب مجھے ان اساتذہ کے نام تو یاد نہیں مگر مجھے یہ بات واضح طور پر یاد ہے کہ ان سب کی رہائش ریلوے لائن کے پار کسی محلہ میں تھی جہاں میں ان کے پاس جا کر پڑھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور میری محنت میں برکت ڈال دی اور میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتا رہا تاہم بوجوہ آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اوائل ۱۹۶۹ء میں محکمہ انکم ٹیکس میں لوئر ڈویژن کلرک بھرتی ہوگیا۔

جب رشید اقبال سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ سُپر وائزر کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ میرے ملتان سے آنے کے بعد وہ ترقی پا کر ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہوگئے تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور ملتان ہی میں انکم ٹیکس کی پریکٹس کر رہے ہیں۔

مجھے ملتان سے آئے ہوئے اب بیس سال ہو چکے ہیں لیکن ان کی محبت ہے کہ وہ ہمیشہ اس عاجز سے رابطہ رکھتے ہیں۔ میری بیٹی، قرۃ العین طاہر کی شادی ہوئی تو وہ ملتان سے خاص طور پر تشریف لائے اور بیٹی کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک بار انہوں نے ذکر کیا کہ چنیوٹ کے بہت سے طلبہ جو اُن کی طرح جماعت سے تو تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان لڑکوں میں سے انعام الٰہی سہارن جو ۶۱۔۱۹۵۹ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن میں ڈائریکٹر کے عہدے تک ترقی پا کر وفات پا چکے ہیں۔

چنیوٹ کے محمد حنیف خان انعام الٰہی سہارن کے کلاس فیلو تھے اور وہ اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے دفتر سے ایک ذمہ دار عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

غلام جعفر خان جو ۶۵۔۱۹۶۳ء کے دوران اس کالج کے سٹوڈنٹ تھے قائداعظم یونیورسٹی میں کیمسٹری پڑھاتے رہے لیکن دورانِ ملازمت وفات پا گئے۔

سکندر علی سہارن مرحوم جو ۶۶۔۱۹۶۴ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے بوقتِ ریٹائرمنٹ ڈائریکٹر، پی ٹی سی ایل تھے۔

رشید احمد کھوکھر جو ۶۷۔۱۹۶۵ء کے عرصے میں اس کالج میں زیرِ تعلیم رہے پاکستان سٹیل مِل کارپوریشن میں ایکسیئن کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

محمد سلیم سہارن مرحوم جو سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن میں ڈپٹی سیلز آفیسر ہوا کرتے تھے رشید احمد کھوکھر کے ہم جماعت تھے۔

مقبول احمد خان جو ۶۷۔۱۹۶۵ء کے دوران اس کالج میں پڑھا کرتے تھے اسی کالج میں قریباً دس سال تک پرنسپل رہے۔

مختار احمد خرادی ۶۸۔۱۹۶۶ء کے دوران اس کالج میں پڑھتے رہے۔ وہ بعد میں ڈائریکٹر، سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کے طور پر کراچی سے ریٹائر ہوئے۔

آپ نے عبدالرشید اقبال اور ان کے ذریعے چنیوٹ سے تعلق رکھنے والے بعض قدیم طلبائے تعلیم الاسلام کالج سے تعارف حاصل کیا۔ اب ذکر کیا جا رہا ہے اُس ہونہار طالب علم کا جنہوں نے ۱۹۶۶ء میں اسی کالج میں داخلہ لیا اور ایک دیانتدار اور کامیاب پولیس آفیسر کے طور پر ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے کے بعد اب اسلام آباد میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا اشارہ طاہر عارف کی طرف ہے جو نامور خادمِ سلسلہ مولانا محمد یار عارف کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے یوں تو میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج، سرگودھا میں داخلہ لیا تھا تاہم جلد ہی وہ مائیگریشن کروا کر تعلیم الاسلام کالج میں چلے آئے۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں یہاں سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا اگرچہ ان کی بعد کی تعلیم ربوہ سے باہر ہوئی۔

تعلیم الاسلام کالج میں ان کا قیام بے حد مختصر رہا تاہم وہ اب بھی وہاں گزرے ہوئے وقت کا بڑی چاہت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس دوران ان کا قیام فضلِ عمر ہوسٹل میں تھا۔ وہ المنار کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر اور کالج یونین میں کلاس ریپریزنٹیٹو رہے۔ وہ کالج کے اُس سال کے انگریزی کے بہترین مقرر قرار پائے۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر ان کے یہ الفاظ اس کالج کو ان کی طرف سے بہت بڑا خراجِ عقیدت ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"The greatest impact that my stay in TI College had on me was that it strengthened my personality and self-belief. I owe a lot to my teachers, my fellow students, my friends and to the very environment of TI College."

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والے سنٹرل سُپیریئر سروِسز آف پاکستان ایگزامینیشن کی بنیاد پر پولیس سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا کیریئر بے داغ رہا اور وہ فروری ۲۰۱۲ء میں ڈائریکٹر جنرل، نیشنل پولیس بیؤرو کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اُس وقت تک وہ گریڈ بائیس میں ترقی پا چکے تھے۔

طاہر عارف سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے دور کی بات ہو تو وہ کہتے ہیں: مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ شروع میں مجھے تعلیم الاسلام کالج کا ماحول اجنبی سا لگا۔ دراصل میں نے ساتویں جماعت تک پریزنٹیشن کانونٹ، سرگودھا میں غیر ملکی راہبات سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد ازاں کینٹونمنٹ پبلک سکول، سرگودھا میں پڑھتا رہا تھا۔ یہ سکول بھی انگلش میڈیم اور اس کا تمام سٹاف زنانہ تھا۔ میں اس سکول میں بزمِ اردو

والد کا فرنیچر کا کاروبار تھا اور وہ اس زمانے سے جب تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں ہوا کرتا تھا اس کے بعض اساتذہ سے متعارف تھے۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ اساتذہ حیات ہیں۔ والد صاحب نے ان کو اپنی رام کہانی سنائی تو انہوں نے خوشدلی سے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور نہ صرف سکول میں بلکہ سکول ٹائم کے بعد گھروں میں بھی پڑھانے لگے۔ اب مجھے ان اساتذہ کے نام تو یاد نہیں مگر مجھے یہ بات واضح طور پر یاد ہے کہ ان سب کی رہائش ریلوے لائن کے پار کسی محلّہ میں تھی جہاں میں ان کے پاس جا کر پڑھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور میری محنت میں برکت ڈال دی اور میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتا رہا تاہم بوجوہ آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اوائل ۱۹۶۹ء میں محکمہ انکم ٹیکس میں لوئر ڈویژن کلرک بھرتی ہوگیا۔

جب رشید اقبال سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ سپروائزر کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ میرے ملتان سے آنے کے بعد وہ ترقی پا کر ایڈمنسٹریٹو آفیسر ہوگئے تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور ملتان ہی میں انکم ٹیکس کی پریکٹس کر رہے ہیں۔

مجھے ملتان سے آئے ہوئے اب بیس سال ہو چکے ہیں لیکن ان کی محبت ہے کہ وہ ہمیشہ اس عاجز سے رابطہ رکھتے ہیں۔ میری بیٹی، قرۃ العین طاہر کی شادی ہوئی تو وہ ملتان سے خاص طور پر تشریف لائے اور بیٹی کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک بار انہوں نے ذکر کیا کہ چنیوٹ کے بہت سے طلبہ جو اُن کی طرح جماعت سے تو تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ان لڑکوں میں سے انعام الٰہی سہارن جو ۶۱۔۱۹۵۹ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن میں ڈائریکٹر کے عہدے تک ترقی پا کر وفات پا چکے ہیں۔

چنیوٹ کے محمد حنیف خان انعام الٰہی سہارن کے کلاس فیلو تھے اور وہ اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے دفتر سے ایک ذمہ دار عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

غلام جعفر خان جو ۶۵۔۱۹۶۳ء کے دوران اس کالج کے سٹوڈنٹ تھے قائداعظم یونیورسٹی میں کیمسٹری پڑھاتے رہے لیکن دورانِ ملازمت وفات پا گئے۔

سکندر علی سہارن مرحوم جو ۶۶۔۱۹۶۴ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے بوقتِ ریٹائرمنٹ ڈائریکٹر، پی ٹی سی ایل تھے۔

رشید احمد کھوکھر جو ۶۷۔۱۹۶۵ء کے عرصے میں اس کالج میں زیرِ تعلیم رہے پاکستان سٹیل مل کارپوریشن میں ایکسیئن کے طور پر ریٹائر ہوئے۔

محمد سلیم سہارن مرحوم جو سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن میں ڈپٹی سیلز آفیسر ہوا کرتے تھے رشید احمد کھوکھر کے ہم جماعت تھے۔

مقبول احمد خان جو ۶۷۔۱۹۶۵ء کے دوران اس کالج میں پڑھا کرتے تھے اسی کالج میں قریباً دس سال تک پرنسپل رہے۔

مختار احمد خرادی ۶۸۔۱۹۶۶ء کے دوران اس کالج میں پڑھتے رہے۔ وہ بعد میں ڈائریکٹر، سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کے طور پر کراچی سے ریٹائر ہوئے۔

آپ نے عبدالرشید اقبال اور ان کے ذریعے چنیوٹ سے تعلق رکھنے والے بعض قدیم طلبائے تعلیم الاسلام کالج سے تعارف حاصل کیا۔ اب ذکر کیا جا رہا ہے اُس ہونہار طالب علم کا جنہوں نے ۱۹۶۶ء میں اسی کالج میں داخلہ لیا اور ایک دیانتدار اور کامیاب پولیس آفیسر کے طور پر ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے کے بعد اب اسلام آباد میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا اشارہ طاہر عارف کی طرف ہے جو نامور خادمِ سلسلہ مولانا محمد یار عارف کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے یوں تو میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج، سرگودھا میں داخلہ لیا تھا تاہم جلد ہی وہ مائیگریشن کروا کر تعلیم الاسلام کالج میں چلے آئے۔ انہوں نے ۱۹۶۸ء میں یہاں سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا اگرچہ ان کی بعد کی تعلیم ربوہ سے باہر ہوئی۔

تعلیم الاسلام کالج میں ان کا قیام بے حد مختصر رہا تاہم وہ اب بھی وہاں گزرے ہوئے وقت کا بڑی چاہت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس دوران ان کا قیام فضلِ عمر ہوسٹل میں تھا۔ وہ المنار کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر اور کالج یونین میں کلاس ریپریزنٹیٹو رہے۔ وہ کالج کے اُس سال کے انگریزی کے بہترین مقرر قرار پائے۔ تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، جرمنی کی ویب سائٹ پر ان کے یہ الفاظ اس کالج کو ان کی طرف سے بہت بڑا خراجِ عقیدت ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"The greatest impact that my stay in TI College had on me was that it strengthened my personality and self-belief. I owe a lot to my teachers, my fellow students, my friends and to the very environment of TI College."

انہوں نے ۱۹۷۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والے سنٹرل سُپیریئر سروسز آف پاکستان ایگزامنیشن کی بنیاد پر پولیس سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کا کیریئر بے داغ رہا اور وہ فروری ۲۰۱۲ء میں ڈائریکٹر جنرل، نیشنل پولیس بیؤرو کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اُس وقت تک وہ گریڈ بائیس میں ترقی پا چکے تھے۔

طاہر عارف سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے دور کی بات ہو تو وہ کہتے ہیں: مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ شروع میں مجھے تعلیم الاسلام کالج کا ماحول اجنبی سا لگا۔ دراصل میں نے ساتویں جماعت تک پریزنٹیشن کانونٹ، سرگودھا میں غیر ملکی راہبات سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعدازاں کینٹونمنٹ پبلک سکول، سرگودھا میں پڑھتا رہا تھا۔ یہ سکول بھی انگلش میڈیم اور اس کا تمام سٹاف زنانہ تھا۔ میں اس سکول میں بزمِ اردو

اور انگلش ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا صدر، بہترین مقرر اور آل راؤنڈ بیسٹ طالب علم رہا تھا اور اسی نسبت سے سکول میں ہر دلعزیز تھا لہٰذا جب میں تعلیم الاسلام کالج میں آیا تو شروع شروع میں میری کیفیت

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

والی تھی تاہم میں نے آہستہ آہستہ محسوس کیا کہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ سادہ اور بااخلاق ہیں اگرچہ مجموعی طور پر ماحول شوخ اور وائبرینٹ نہیں۔ جب اس ماحول میں مزید کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا تو زندگی بھر برقرار رہنے والی دوستیاں قائم ہوئیں جو دکھ سکھ میں باعثِ تقویت ثابت ہوئیں۔

وہ کہتے ہیں: اس زمانے کی یادوں میں سے ایک تأثر جو ابھی تک میرے دل و دماغ پر ثبت ہے یہ ہے کہ مددگار کارکن سے لے کر پرنسپل تک، کالج کا ہر کارکن اپنے سابقہ پرنسپل، صاحبزادہ مرزا ناصر احمد جو خلیفۃ المسیح الثّالث منتخب ہونے کے بعد کالج چھوڑ چکے تھے کو ہر بات میں یاد کرتا ہے۔ ان کے چھوڑے ہوئے خلا کو بہت شدت سے محسوس کیا جاتا تھا حتّٰی کہ قاضی محمد اسلم جیسی قابل، عالم، مرنجاں مرنج اور خوبصورت شخصیت سے بھی وہ کمی پوری نہ کر سکی۔ ہم جو بطور پرنسپل حضور کا زمانہ نہ پا سکے تھے یہ باتیں سنتے تو اپنی محرومی پر آزردہ ہو جاتے۔

کالج کا یونیفارم گاؤن اور ٹوپی طاہر عارف لیے ایک نئی چیز تھی۔ ٹوپی سے تو انہیں رغبت پیدا نہ ہو سکی لیکن کالج کا گاؤن انہیں بہت مرغوب تھا۔ وہ بتاتے ہیں: کالج چھوڑنے کے بعد میں نے اپنا گاؤن بطور یادگار سنبھال رکھا تھا لیکن ایک بار میری بہن کو کالے کپڑے کی ضرورت پڑی تو اس نے میری بے خبری میں اس کا ایک بازو کاٹ کر اسے بیکار کر دیا لیکن اب بھی کسی وقت جی چاہتا ہے کہ مجھے یہ گاؤن مل جائے تو اسے پہنا کروں۔

طاہر عارف کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اساتذہ میں سے صوفی بشارت الرحمٰن، چوہدری محمد علی اور پرویز پروازی نے بے حد متاثر کیا۔ اوّل الذّکر دو اصحاب سے تو انہوں نے بطور طالبعلم کوئی نصابی مضمون نہیں پڑھا لیکن پرویز پروازی سے اردو پڑھی۔ وہ کہتے ہیں: ان ہی کی تدریس کا نتیجہ تھا کہ اردو زبان سے کچھ رغبت پیدا ہو گئی ورنہ ابتداءً اردو سے مجھے ایسی دلچسپی نہ تھی۔ میں کیا سبھی طلبہ پروازی صاحب کی کلاس میں بہت شوق سے جاتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اردو پڑھاتے پڑھاتے فلسفہ، تصوف اور اسلامیات بلکہ حالاتِ حاضرہ اور اخلاقیات تک سبھی کچھ پڑھا دیا تھا۔

صوفی بشارت الرحمٰن کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے طاہر عارف کہتے ہیں: وہ ایک بے ریا بزرگ تھے۔ زاہد و عابد اور دل گداز تھے۔ میں ان کی محبت و شفقت کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ وہ ہر جمعرات کو درس یا ٹیوٹوریل لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کے وہ دروس آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ ان کی رہنمائی اور عبادات میں گداز پیدا کرنے کے سلسلے میں ان کے افکار آج بھی میرے لیے اندھیروں میں روشنی کا کام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

چوہدری محمد علی کو یاد کرتے ہوئے تو طاہر عارف آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور بتایا کرتے ہیں: ان سے لمبا عرصہ تعلق رہا۔ زندگی کے نشیب و فراز اور ہم و غم میں ان کی رہنمائی، ہمدردی اور دعا مجھے ہمیشہ حاصل رہی۔ ان

کی ساری زندگی عشق سے معمور رہی۔ عشقِ الٰہی ہو یا عشقِ رسول، عشقِ مسیح موعود ہو یا عشقِ خلافت...... غرضیکہ عشق کی جتنی بھی جہتیں ہیں ان میں آپ کی الگ شان نظر آتی ہے۔ ایسے نادر وجود کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناطے آپ طلبہ کے لیے ماں اور باپ دونوں ہی کا درجہ رکھتے تھے۔ طلبہ اپنے چھوٹے بڑے ذاتی، گھریلو، جذباتی اور مالی مسائل پر آپ سے بے دھڑک گفتگو کر سکتے تھے اور آپ ایک مادرِ مہربان کی طرح سب کچھ اپنے دل میں سمو لیتے اور انہیں تسلی دینے کے بعد ضروری رہنمائی مہیا کرتے۔

موصوف سے اپنی پہلی ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے طاہر عارف کہتے ہیں: میں نومبر کے مہینے میں تعلیم الاسلام کالج میں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی دسمبر ٹیسٹ آ گئے۔ کالج میں دینیات کا مضمون بھی پڑھایا جاتا تھا جو میں نے اس سے پہلے نہیں پڑھا تھا۔ معلوم ہوا کہ منجملہ دیگر نصاب کے حضرت مرزا بشیر احمد کی کتاب ''ہمارا خدا'' بھی کورس میں شامل ہے۔ میں نے اپنے استاد سے ذکر کیا کہ میرے پاس یہ کتاب موجود نہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی کتاب ہوسٹل کے فلاں لڑکے کو دے چکے ہیں، پرچہ دوپہر کے بعد ہے، رات کو وہ پڑھ لے تو صبح میں اس سے لے کر پڑھ سکتا ہوں۔ صبح میں کتاب لینے گیا تو ہوسٹل کے دروازہ پر ایک صاحب کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے ان سے کہا کہ فلاں نمبر کمرہ سے کتاب منگوا دیں تو انہوں نے اس فرمائش کی تعمیل سے معذرت طلب کی۔ اسی پریشانی میں اس لڑکے کے کمرے کی کھڑکی جا کھٹکھٹائی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت چیف پریفیکٹ کسی کو آنے جانے نہیں دے رہے۔ اسی دوران اتفاق سے چنیوٹ کے دو تین لڑکے مل گئے۔ انہیں میری وجہِ پریشانی معلوم ہوئی تو انہوں نے مشورۃً کہا کہ پچھلی سائیڈ جہاں کھانا پکتا ہے سے اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ چوہدری محمد علی کوٹ ٹائی پہنے، کالی عینک لگائے سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے اس طرف سے ہوسٹل میں داخلے کی کوشش پر ہمیں خوب ڈانٹا اور اپنے نام لکھوانے کو کہا۔ میں نے انگریزی میں ان کو بتانے کی کوشش کی کہ مجھے کتاب لینا تھی لہٰذا میں اندر جانا چاہتا تھا اور یہ کہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ موصوف میری جرأت اور انگریزی سے کچھ محظوظ سے ہوئے لیکن نام لکھوانے کے حکم پر قائم رہے۔ میں نے نام عرض کیا۔ پھر والد کا نام دریافت کیا اور سنتے ہی فرمایا: باپ کا مقام دیکھو اور اپنی حرکات دیکھو۔ دراصل انہوں نے مجھے بھی چنیوٹ والے لڑکوں کا ساتھی سمجھ لیا تھا۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی چنانچہ میں سیدھا قاضی محمد اسلم کے پاس گیا اور ان سے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی شکایت کر دی بلکہ غصہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں کیا حق پہنچتا تھا وہ مجھے اس طرح کی بات کہتے۔ میری بات سن کر قاضی صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے: میں انہیں سمجھا دوں گا۔ آپ تو اچھے ہیں نا؟ پھر شاید مجھے ٹھنڈا کرنے کے لیے فرمانے لگے: میں نے آپ کی انگلش ڈیبیٹ سُنی تھی۔ آپ بہت اچھا بولتے ہیں۔ میں خوش ہو کر واپس آ گیا۔

طاہر عارف اعتراف کرتے ہیں کہ اس وقت تک انہیں چوہدری صاحب کے مقام و مرتبہ سے آگاہی حاصل نہ تھی۔ بعد ازاں چوہدری صاحب ان کے والدِ بزرگوار سے کسی جگہ اتفاقیہ ملے تو کہنے لگے: طاہر سے

کہیں مجھے ملا کرے چنانچہ طاہر نے ان سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے ہیں: اس دن سے لے کر وفات تک آپ نے جتنا پیار مجھے دیا بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ چوہدری صاحب کا میری زندگی پر بہت اثر ہے اور میں ان کا ذکر ہمیشہ نم آنکھوں سے کرتا ہوں۔

موصوف بتاتے ہیں: ۱۹۸۳ء میں میرا بہت ہی پیارا چھوٹا بھائی عین جوانی میں کار کے ایک حادثے میں ہم سے جدا ہو گیا۔ میں نے اس کی یاد میں لکھے ہوئے اشعار بعد میں ''روتے روتے'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے۔ ان ہی دنوں مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ، ربوہ کے گیسٹ ہاؤس میں اس کتاب کے حوالے سے ایک نشست ہوئی۔ چوہدری صاحب، پرویز پروازی، یوسف سہیل شوق اور بہت سے دیگر اہلِ دل میری دلداری و غمخواری کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ چوہدری صاحب نے بھی اس مجلس میں ایک مضمون پڑھا۔ آپ نے فرمایا: دونوں بھائی میرے شاگرد رہے ہیں اور دونوں مجھے عزیز ہیں۔ کتاب لکھنے والا اور جس کے متعلق یہ کتاب لکھی گئی ہے دونوں ایک ہی ہیں اور مضمون کا اختتام آپ نے یوں فرمایا:

''دونوں طاہر، دونوں طیّب''

چوہدری محمد علی کے بارے میں اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے طاہر عارف قاضی محمد اسلم کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: آپ کا ملک کے ایجوکیشنسٹس میں ایک خاص مقام تھا۔ آپ کو گورنمنٹ کالج، لاہور کا پرنسپل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے سربراہ بھی رہے۔ کالج کے پرنسپل کے طور پر آپ ایک شفیق باپ کی طرح تھے۔ نماز مغرب کے لیے آپ فضلِ عمر ہوسٹل تشریف لاتے۔ طلبہ سے بڑی شفقت سے ملتے۔ طلبہ آپ کے اردگرد جمع ہو جاتے اور آپ نہایت آسان الفاظ میں کسی موضوع پر عالمانہ اور عارفانہ گفتگو فرمانے لگے۔ بہت ہی عالم، فاضل اور نکتہ رس تھے۔ ایک بار جب وہ حضرت مسیح موعود کی کسی کتاب کا ترجمہ کر رہے تھے لڑکوں سے پوچھنے لگے کہ گلدستہ کو انگریزی میں کیا لکھیں گے۔ لڑکوں نے Bunch of flower یا بعض اور تجاویز دیں۔ میں نے عرض کیا: ''بُکے''۔ فرمایا بُکے بھی ٹھیک ہے لیکن اس سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پھر کہنے لگے: حضور کی تحریر کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں، بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر مجھے فرمایا کہ آپ کے ابا جان نے مولوی فاضل پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں نوکری شروع کی تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ بچوں کے ساتھ کلاس میں زیادہ سختی نہیں کرنی چاہیئے۔

طاہر عارف کو یاد ہے کہ ایک بار وہ لائبریری میں بیٹھے پاکستان ٹائمز پڑھ رہے تھے کہ اچانک قاضی صاحب تشریف لے آئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایڈیٹر کے نام خط لکھا کریں۔ قاضی صاحب نے وعدہ فرمایا کہ ان کا ایک خط چھپنے پر وہ انہیں دس روپیہ دیا کریں گے۔ وہ کہتے ہیں: میرے خط چھپنے شروع ہو گئے اور میری اس پریکٹس کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے سنٹرل سپیریئر سروسز ایگزامینیشن میں ہوا۔ میں نے حالاتِ حاضرہ پر بہت سے خطوط لکھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے مجھے تیاری میں بہت مدد ملی۔ خدا تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ہمارے اس دوست کو کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے کا موقع ملا۔ بیسٹ انگلش ڈیبیٹر ہونے کے ناطے انہیں کالج کلر عطا ہوا۔ انہوں نے کئی مقامی اور بین الکلیاتی مباحثے جیتے لیکن ان کے نزدیک ان کی زندگی کا سب سے یادگار لمحہ وہ تھا جب ۱۹۸۸ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے پہلے یورپین اجتماع انصاراللہ کے موقع پر انگریزی تقریر کے لیے ان کا نام منظور فرمایا۔ وہ کہتے ہیں: میں نے عرض کی کہ میں تو ابھی خدّام میں ہوں تو نہایت شفقت سے فرمایا: مجھے معلوم ہے۔ میں نے آپ کی انگریزی تقریر سنی ہوئی ہے۔ یہ سب اسی تربیت کا فیضان تھا جو مجھے تعلیم الاسلام کالج میں ملی تھی۔

وہ اس بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ تعلیم الاسلام کالج کے ذریعے ان کا پاکستان اور بیرونِ پاکستان سے آئے ہوئے طالب علموں سے باہمی اخوت کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو آج تک قائم ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے طاہر عارف کی اردو شاعری کا ایک مجموعہ ''روتے روتے'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کی پنجابی شاعری کا ایک مجموعہ ''اڈھی گل'' کے نام سے چھپا ہے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور تعلیمات کے حوالے سے انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب بھی لکھی ہے جب کہ ان کا اردو اور پنجابی کا ایک ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے۔

وہ بتاتے ہیں: میں ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ آپ کے بعض اشعار ایسے ہیں جو مجھے زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ پھر آپ نے اپنے بک شیلف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: وہ دیکھیں! آپ کی کتاب آج بھی میرے سامنے پڑی ہے۔

ابھی آپ طاہر عارف کا ذکرِ خیر ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آیئے اب ملاقات کرتے ہیں طارق پرویز سے جو بی ٹی صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ وہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں زیرِ تعلیم رہے اور یہاں سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ وہ باسکٹ بال کے عمدہ کھلاڑی، ایک اچھے ڈیبیٹر اور کالج یونین کے صدر تھے۔ انہوں نے اس کالج میں بھرپور وقت گزارا اور تکمیلِ تعلیم کے ساتھ ہی ایئر فورس میں جنرل ڈیوٹی پائلٹ منتخب ہو کر ٹریننگ کے لیے پی اے ایف اکیڈمی، رسالپور چلے گئے۔ وہ ۱۹۸۵ء میں ونگ کمانڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے جس کے بعد جلد ہی بعد انہوں نے پی آئی اے میں بطور کمرشل پائلٹ ملازمت اختیار کر لی۔ وہ تقریباً اکیس سال پی آئی اے کے ساتھ منسلک رہے لیکن اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

اگرچہ میں نے طارق پرویز کو ربوہ کے زمانے میں دیکھ تو رکھا تھا مگر اُن سے براہِ راست تعارف کا کبھی موقع پیدا نہ ہوا تھا۔ بعد میں ان کی شادی میجر عبدالحمید مربی جاپان و امریکہ کی صاحبزادی، فوزیہ سے ہوئی۔ میجر عبدالحمید کی اہلیہ کے ساتھ مرے ننھیال کے خاندانی مراسم تھے اور ہم انہیں ''آپا سکینہ'' کہا کرتے تھے۔ ان کا بیٹا خالق میرا کلاس فیلو تھا اور باقی سب بچوں کے ساتھ بھی میری شناسائی تھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں جب طارق پرویز پی آئی اے سے منسلک ہو چکے تھے اور میری تعیناتی راولپنڈی میں تھی وہ عسکری وَن میں مقیم تھے اور

یہی وہ موقع تھا جب میری ان سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا جس کی وجہ سے ان کے ساتھ ایک دیرپا تعلق قائم ہوگیا۔

موصوف آج کل فضائیہ، اسلام آباد میں اپنے ذاتی گھر میں مقیم ہیں۔ بیٹے برسرِ روزگار ہو چکے ہیں، بیٹی کی شادی کر چکے ہیں اور بظاہر ایک مطمئن و مسرور زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: اپریل ۱۹۶۳ء کی ایک شام میری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ میرے بڑے بھائی، حامد گول بازار سے ایک اخبار لے کر آئے جس میں میٹرک کا نتیجہ شائع ہوا تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان دے رکھا تھا چنانچہ جب میرا نتیجہ دیکھا گیا تو میں نہ صرف کامیاب ہوا تھا بلکہ پورے بورڈ میں میری تیسری پوزیشن تھی۔ اس غیر متوقع نتیجے کے بعد گھر کے ہر فرد کی توجہ مجھ پر مرتکز ہوگئی اور مجھے گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل کرانے اور ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ ہوگیا۔ اس فیصلے کے دو حصے تھے: پہلا حصہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلے سے متعلق تھا جب کہ دوسرا حصہ ڈاکٹر بننے سے تعلق رکھتا تھا۔ فیصلے کے پہلے حصہ پر تو جلد ہی عملدرآمد ہوگیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور اور اس کے عظیم اساتذہ کی تربیت نے میرے مستقبل کی بنیادیں سنواریں اور میری سوچ کو نئی راہیں دکھائیں تاہم اہلِ خانہ کی خواہش کا دوسرا حصہ پورا نہ ہو سکا کیونکہ میرا طبعی رجحان ہوائی جہازوں کی طرف تھا۔ فضاؤں میں راج کرتے پاک فضائیہ کے لڑاکا طیارے مجھے ہمیشہ کسی تصوراتی دنیا میں لے جاتے تھے اگرچہ اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ یہ تصورات اور خیالات ایک دن حقیقت کا روپ بھی دھار سکتے ہیں۔

طارق بتاتے ہیں: ایف ایس سی کے سالانہ امتحانات کے دنوں میں جب ایک طالب علم کو کتابوں میں غرق ہوا رہنا چاہئے میں ایئر فورس میں سلیکشن کے لیے آئی ایس ایس بی کے چکر لگا رہا تھا۔ جب نتیجہ آیا تو میرا معاملہ چھ ماہ کے لیے مؤخر کر دیا گیا۔ اس دوران مجھے خیال آیا کہ مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اور جب تک ایئر فورس میں میری سیلیکشن کا معاملہ حتمی صورت اختیار نہیں کرتا مجھے پڑھائی جاری رکھنی چاہئے چنانچہ میں نے ٹی آئی کالج میں بی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں میرا کُل قیام سوا یا ڈیڑھ سال سے زیادہ نہیں رہا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اس درسگاہ میں داخل نہ ہوتا تو بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاتا۔ اس کالج کے بے نفس اساتذہ، یہاں کا تعلیمی اور ادبی ماحول اور کھیلوں میں اس کا ایک خاص مقام...... میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے اس عظیم درسگاہ میں پڑھنے کا موقع ملا۔

وہ کہتے ہیں: ٹی آئی کالج میں یہ مختصر سا زمانہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میرا روزمرہ کا شیڈول بہت سخت تھا۔ صبح کے وقت لیکچرز، دوپہر کے وقت پریکٹیکلز اور شام کو باسکٹ بال کی باقاعدہ پریکٹس۔ یوں دن میں تین چار دفعہ پیدل کالج آنا اور واپس جانا پڑتا تھا مگر نوجوانی کا زمانہ تھا لہٰذا کبھی کوئی مشکل محسوس نہیں ہوئی۔

طارق تعلیم الاسلام کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے رکن رہے ہیں۔ چوہدری محمد علی کی زیرِ نگرانی صبح و شام کی مسلسل پریکٹس نے انہیں بہت جلد ایک اچھا کھلاڑی بنا دیا اور ان کی ٹیم پنجاب یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتنے میں

کامیاب رہی۔ وہ بتاتے ہیں: اس سے پہلے اس کالج نے باسکٹ بال کے بہت سے معروف کھلاڑی پیدا کیے تھے مگر سب سے مشہور ٹیم جس نے اس سے پہلے پنجاب یونیورسٹی چیمپئن شپ جیتی تھی لطیف جھمٹ، مجید، نصیر بُندہ، خالد تاج اور سراج قریشی وغیرہ پر مشتمل تھی۔ یہ سب دوست اپنے اپنے فن میں یکتا تھے اور بہت خوب کھیلتے تھے۔ ہماری ٹیم میں میرے علاوہ عاقل المعروف پپّی، کلیم اللہ، شاہد سعدی اور طاہر قریشی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ چیمپئن شپ کے جیتنے کے بعد جب ربوہ میں سالانہ آل پاکستان ناصر باسکٹ بال ٹورنامنٹ ہوا تو ہماری ٹیم کو کالج سیکشن میں کھیلنے کی بجائے کلب سیکشن میں حصہ لینے کی تجویز آئی جو بحث مباحثہ کے بعد منظور کر لی گئی۔ اس ٹیم میں میرے علاوہ کلیم اللہ، عاقل، نصیر بُندہ اور مجید کو شامل کیا گیا۔ بعد میں شاہد سعدی بھی اس ٹیم کا حصہ بنے۔ یہ ٹیم سیمی فائنل تک پہنچی جہاں اس کا مقابلہ پاکستان پولیس کی مضبوط ٹیم سے ہوا۔ یہ گویا مولے کا شہباز سے مقابلہ تھا۔ میں نے چوہدری محمد علی سے درخواست کی کہ اس مقابلہ کے لیے مجید کی جگہ شاہد سعدی کو ان کے ساتھ گارڈ کی پوزیشن پر کھیلنے کی اجازت دیں۔ مجید کا جسم اس وقت تک بھاری ہو چکا تھا اور ان میں گذشتہ وقتوں والی پُھرتی باقی نہ رہی تھی جب کہ سعدی پھرتیلے اور فِٹ تھے تاہم بوجوہ ان کی تجویز کو قابلِ عمل نہ سمجھا گیا اور میچ شروع ہوگیا۔ طارق بتاتے ہیں: حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث اس میچ میں مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ میچ اس لیے بھی یادگار رہا کہ پورے مقابلے کے دوران پولیس کی ٹیم ہم سے کہیں زیادہ پریشان نظر آئی کیونکہ ان کی توقع کے برعکس یہ ایک بہت ہی کانٹے دار مقابلہ ثابت ہو رہا تھا اور کسی بھی مرحلے پر یہ محسوس نہیں کیا گیا کہ پولیس کی ٹیم ہمیں روندتی ہوئی میچ جیت جائے گی۔ میچ کے دوسرے ہاف میں مجید کی جگہ سعدی کو ڈالا گیا مگر ہم یہ میچ ہار گئے۔ آخری سکور غالباً ۶۰-۶۲ تھا۔ ہم بیشک ہار گئے تھے لیکن اس میچ نے ہمارے کالج کی عزت و وقار میں بہت اضافہ کیا۔ پولیس ٹیم کے ایک سینئر رکن، ایلبن نے میچ کے بعد مجھے گلے لگا لیا اور کہا: اوئے منڈیو! اج تے تُسی ساڈا تراہ ای کڈ چھڈیا سی یعنی آج تو تم لوگوں نے ہمیں فکر میں ڈال دیا تھا کہ اگر ہم اس ٹیم کے ہاتھوں ہار گئے تو گھر کیا منہ لے کر جائیں گے۔

اس کے بعد طارق کا ترقی کا سفر جاری رہا۔ وہ بتاتے ہیں: یونیورسٹی کی چیمپئن شپ جیتنے کے بعد ہمارے کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے دولڑکے پنجاب یونیورسٹی ٹیم کے لیے سیلیکٹ ہوئے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ یونیورسٹی سیلیکشن کے بعد مجھے پنجاب ٹیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ چوہدری محمد علی کا ارشاد تھا کہ اب مجھے پاکستان ٹیم میں سیلیکشن کی تیاری کرنی چاہئے کیونکہ ان کی طرف سے میرا نام بھجوا دیا گیا ہے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ دراصل ۱۹۶۸ء کے شروع میں ہی مجھے ایئر فورس کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا اور یوں میں بی ایس سی کا فائنل امتحان دیتا ہوا ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو رسالپور اکیڈمی پہنچ گیا۔

طارق تعلیم الاسلام کالج سٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: جب میں کالج میں داخل ہوا تو اسلامیہ کالج، لاہور کے سالانہ مباحثوں کا دعوت نامہ آیا ہوا تھا۔ کالج یونین کے انچارج ڈاکٹر سلطان محمود شاہد نے اس مباحثے کے لیے میرا اور میرے بڑے بھائی، جاوید گوگا کا نام منتخب کیا۔ اسلامیہ کالج

کے اس مباحثے میں حصہ لینا بہت جان جوکھوں کا کام تھا کیونکہ ہمارے کالج کے ساتھ اس کالج کی ”محبت“ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھی۔ بہر حال ہم دونوں بھائی اس مباحثے کے لیے لاہور گئے۔ اس مباحثے کے جج صاحبان میں اعجاز بٹالوی اور یُو این او میں پاکستانی مندوب، سیّد امجد علی شامل تھے۔ پہلے میرا نام پکارا گیا جو کالج کے تعارف کے ساتھ ہی ایک ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ میں اس بے ہنگم شور میں چلتا ہوا ڈائس پر پہنچا اور تقریر شروع کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریر شروع ہوتے ہی مخالفانہ نعروں کا شور کم ہوتا گیا اور تقریر کا اختتام زوردار تالیوں کی گونج میں ہوا۔ جب جاوید کی باری آئی تو غالباً پہلی تقریر کے زیر اثر انہیں اتنی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے بھی سامعین کو بہت متاثر کیا۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو میری پہلی پوزیشن اور جاوید کی تیسری پوزیشن کے ساتھ ٹرافی ٹی آئی کالج ربوہ کے حصے میں آئی۔ ہمارے لیے یہ ذاتی خوشی کا موقع تو تھا ہی، ہمیں فخر تھا کہ ہم جماعت اور کالج کی عزت میں اضافہ کا باعث بنے ہیں۔ مہمانِ خصوصی، سیّد امجد علی نے ٹرافی دینے کے بعد ہماری تقاریر پر خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں اپنی جیب سے سو روپے کا انعام دیا۔ اس زمانے میں سو روپیہ بہت بڑی رقم تھی۔ مباحثے کے بعد دعوت میں ان سے ملاقات ہوئی اور انہیں پتا چلا کہ ٹرافی جیتنے والے یہ دونوں مقرر آپس میں سگے بھائی ہیں تو انہوں نے اور بھی شفقت کا اظہار فرمایا۔

موصوف قاضی محمد اسلم کی شفقت و محبت اور بعض سینئر اساتذہ کے اخلاص و محبت کے کئی واقعات بھی سناتے ہیں لیکن وہ ان شاء اللہ پھر کسی وقت سہی کیوں کہ فی الوقت میں آپ کی ملاقات ڈاکٹر ملک مجیب الرحمٰن سے کرانا چاہتا ہوں جو ربوہ میں استانیوں والی گلی میں پیدا ہوئے، اسی شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن بعد میں انجینئر بنے اور انجینئر بھی ایسے کہ ناسا والوں نے ان کی خدمات مستعار لینے میں کوئی انقباض محسوس نہیں کیا۔

میں ربوہ میں اپنے قیام کے زمانے میں ایک طویل القامت گورے چٹے لڑکے کو اکثر اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے کتنا چھوٹا یا سکول میں کتنا پیچھے ہے۔ نہ کبھی اس تجسس کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی اس سے گفتگو کا کوئی موقع پیدا ہوا تاہم مجھے یہ علم تھا کہ وہ ملک سیف الرحمٰن، مفتیٔ سلسلہ کا بیٹا ہے۔

مدتیں گزر گئیں۔ میرے ذہن سے اس بچے کی شکل بھی محو ہو چکی تھی کہ فروری ۲۰۱۵ء کے الفضل میں اس کا ایک مضمون بعنوان ”میری زندگی خدا تعالیٰ کے فضلوں اور رحمتوں سے پُر ہے“ میری نظر سے گزرا۔ اسے پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکا ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اب ماشاء اللہ ناسا میں کام کر رہا ہے اور خدا تعالیٰ نے اسے بہت عزت و تکریم سے نوازا ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر میرے دل سے اس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا نکلی۔

جب یہ کتاب لکھتے ہوئے ڈاکٹر کریم اللہ زیروی سے رابطہ ہوا تو انہوں نے تجویز دی کہ اگر میں تعلیم الاسلام کالج کے ان اولڈ سٹوڈنٹس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی عملی زندگیوں میں قابلِ ذکر کامیابیوں سے نوازا ہے تو ان میں ڈاکٹر مجیب الرحمٰن جو اُن کے برادرِ نسبتی ہیں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ انہوں نے مجھے نہ صرف مجیب کی کامیابیوں کی داستان مختصر طور پر لکھ بھیجی بلکہ ان کی ایک تازہ ترین

فوٹو بھی ارسال کر دی جسے پہچاننے میں مجھے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔

مجیب جو اپنے والدین کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ سٹوڈنٹ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں اس کالج میں داخلہ لیا اور دو سال بعد سرگودھا بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن سے ایف ایس سی کا امتحان بورڈ میں اول رہ کر پاس کیا۔ وہ نیشنل ٹیلنٹ سکالرشپ کے حقدار تھے لیکن انہوں نے سہگل فاؤنڈیشن سے وظیفہ کو محض اس لیے ترجیح دی کہ اس کی مالیت اولی الذکر وظیفے سے کچھ زیادہ تھی۔ سہگل فاؤنڈیشن کے وظیفے کے لیے انہیں ایک انٹرویو بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑا جس کے ایک رکن نے ان سے سوال کیا کہ احمدی ہونے کے باوجود انہوں نے فرنچ کٹ ڈاڑھی کیوں نہیں رکھی ہوئی؟ مجیب نے جواباً کہا کہ احمدی ہونے کے لیے اس قسم کی ڈاڑھی شرط تو نہیں۔ تب اس نے کہا کہ ایم ایم احمد نے تو ایسی ہی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر بورڈ کے دوسرے رکن نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا: امیدوار ٹھیک کر رہا ہے۔ ان کے امام، مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ڈاڑھی پوری ہے۔

ہمارے یہ دوست مزید بتاتے ہیں: خوش قسمتی سے مجھے جماعت کی طرف سے خلافت جوبلی سکالرشپ بھی ملنا شروع ہو گیا جس کی اس وقت مالیت ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ان وظائف سے مجھے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور میں تعلیم حاصل کرنے میں بہت سہولت حاصل ہو گئی۔ میں نے ۱۹۷۳ء میں مکینیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی جس کے بعد میں مزید تعلیم کے لیے پہلوی یونیورسٹی، شیراز چلا گیا۔ اگلے ہی سال مجھے کینیڈا جانے کا موقع ملا اور میں نے یونیورسٹی آف ٹورانٹو سے انرجی سسٹمز میں تخصیص کے ساتھ ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کر لی۔ بعد میں مجھے امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے ایروسپیس انجینئرنگ میں ریسرچ فیلوشپ مل گئی اور میں خدا کے فضل سے ۱۹۷۸ء میں پی ایچ ڈی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس عرصے میں مجھے کم و بیش چھ مہینے امپیریل کالج لندن میں بھی وقت گزارنے کا موقع ملا۔

بتایا جاتا ہے کہ مجیب بچپن سے ناسا میں کام کرنے کے آرزومند تھے۔ اللہ نے یہ خواہش پوری کر دی چنانچہ پی ایچ ڈی کرتے ہی انہیں ناسا کے لینگلے ریسرچ سنٹر میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر ملازمت کی پیشکش ہوگئی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ کچھ سالوں بعد انہوں نے ایروسپیس کے شعبے میں ایک کنسلٹنگ کمپنی قائم کر لی اور وہ امریکہ کی بڑی بڑی ایروسپیس کارپوریشنوں کو پیش آمدہ مسائل پر ماہرانہ مشوروں سے نوازنے لگے۔

بعد میں مجیب نے ناسا میں ملازمت اختیار کر لی اور آج کل وہ اس کے سینئر سائنٹسٹ فار ایئر ڈائی نیمکس کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہ امیریکن انسٹیٹیوٹ آف ایروناٹکس اینڈ ایسٹروناٹکس، امیریکن فزیکل سوسائٹی اور امیریکن سوسائٹی آف مکینیکل انجینئرز کے فیلو ہیں اور انہیں ناسا کی طرف سے کئی ایوارڈز مل چکے ہیں جن میں ناسا ایکسپشنل سروس میڈل بھی شامل ہے۔

مجیب کے بعد اب کچھ ذکر ڈاکٹر نعیم احمد طاہر کا لیکن ان سے بھی پہلے ان کے جدِ امجد، صوفی محمد ابراہیم کا ذکرِ خیر۔

جب میں پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپریل ۱۹۵۶ء کی کسی تاریخ کو تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پہنچا تو اسمبلی میں ایک نورانی بزرگ کو خطاب کرتے ہوئے سننے کا موقع ملا۔ یہ صوفی محمد ابراہیم تھے جو سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اگر چہ ہمارے ہائی سکول پہنچنے کے بعد دو تین ماہ کے اندر اندر نہ صرف وہ خود بلکہ ماسٹر نذیر احمد رحمانی، ماسٹر اللہ بخش زراعتی اور صوفی غلام محمد بھی ریٹائر ہو گئے لیکن ان سب کے متبسّم چہرے آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم طاہر ان ہی صوفی محمد ابراہیم کے پوتے اور طاہر محمود نامی ایک بزرگ کے فرزند ہیں۔ وہ تعلیم الاسلام کالج کے ان ہونہار طالب علموں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سائنس کے شعبہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء کے دوران اس کالج کے طالب علم رہے۔ وہ بتاتے ہیں: پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو تعلیم الاسلام کالج میں مجھے اپنا سب سے یادگار زمانہ وہ محسوس ہوتا ہے جب میں وہاں پر فزکس میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ اس وقت فزکس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ڈاکٹر نصیر احمد خان تھے۔ مجھے یاد ہے ڈاکٹر عبدالسّلام کو ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی اور وہ میری وہاں موجودگی کے دوران کم از کم دو بار ہمارے ہاں تشریف لا کر طلبہ کو اس فیلڈ میں ترقی کی ضرورت کا احساس دلاتے رہے۔

وہ مزید بتاتے ہیں: ۱۹۷۳ء میں ہمارا ایم ایس سی کا ریزلٹ آیا۔ ہم سات لڑکے اس امتحان میں شامل ہوئے تھے اور بفضلہٖ تعالیٰ سبھی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں یونیورسٹی میں اوّل رہا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے مجھے ابتداءً اپنے ہی کالج میں ریسرچ فیلو مقرر کیا لیکن کچھ عرصہ بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ بھجوا دیا۔ میں نے تھیوریٹیکل پلازما فزکس میں یونیورسٹی آف گلاسگو سے پی ایچ ڈی کی جس کے بعد میں وہیں ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرتا رہا۔ ۱۹۸۱ء میں جرمنی چلا گیا اور مختلف یونیورسٹیوں اور ریسرچ سنٹرز میں پلازما فزکس میں ریسرچ سائنٹسٹ کے طور پر کام کرنے لگا۔ آج کل میں Darmstadt کے ایک گورنمنٹ فنڈڈ ریسرچ سنٹر Gesellschaft Fuer Schwerionenforschung میں سینئر سائنٹسٹ کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

کیا یہ بات قابلِ فخر نہیں کہ اس وقت تک مختلف انٹرنیشنل سائنٹیفک جرنلز میں ان کے دو سو سے زیادہ سائنٹیفک آرٹیکلز شائع ہو چکے ہیں؟

عیدالاضحیٰ ۲۰۱۵ء کے موقع پر جو ۱۳ ستمبر کو ہوئی میں ربوہ جانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ جرمنی سے حمید احمد چوہدری کی ایک ای میل موصول ہوئی جس میں نعیم طاہر کے والدِ بزرگوار کی افسوسناک وفات کی اطلاع تھی۔ یہ وفات ربوہ میں ہوئی تھی اور میرا خیال تھا کہ نعیم طاہر اس موقع پر ضرور وہاں موجود ہوں گے چنانچہ میں نے انہیں فوری طور پر ایک ای میل ارسال کی جس کے ذریعے ان سے درخواست کی کہ اگر وہ مجھے اپنا ربوہ کا پتا بھیج دیں تو میں تعزیت کے لیے ان کے پاس حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اس ای میل کا جواب مجھے دو تین روز بعد ملا۔ نعیم طاہر نے میرے تعزیتی پیغام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کسی وجہ سے اپنے والدِ بزرگوار کی وفات کے موقع پر ربوہ

نہیں پہنچ سکے۔ افسوس ہوا کہ ان سے ملاقات کا موقع پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دیکھیں اب ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوتی ہے۔

نعیم طاہر کے بعد اب کچھ باتیں عرفان احمد خان کے بارے میں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ نے ان کا نام سن رکھا ہوگا لیکن اگر نہیں سنا تو میں عرض کئے دیتا ہوں کہ وہ مسعود احمد خان دہلوی، ایڈیٹر الفضل کے صاحبزادے اور حضرت آسان دہلوی، رفیق حضرت مسیح موعود کے پوتے ہیں اور سالوں پہلے انجمن کوارٹرز میں ہمارے پڑوسی ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے لیکن گریجوایشن کے جلد ہی بعد جرمنی چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابتداءً ہوٹل مینجمنٹ کے شعبے سے متعلق تھے، پھر کسی بنک میں کام کیا لیکن بالآخر ٹیکسٹائلز کا کاروبار کرنے لگے اور اب بھی ان کا ذریعہ معاش یہی کاروبار ہے۔

جیسا کہ اشارۃً ذکر ہو چکا ہے ان سے ہماری یاد اللہ تو بہت پرانی ہے لیکن وہ جب سے جرمنی گئے تھے ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ۲۰۱۶ء میں ایک بار پاکستان آئے تو ہمارا رابطہ ہوا۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران انہوں نے راقم کو نوازا اور غریب خانے پر تشریف لائے۔ ان سے مل کر ان کے والدِ بزرگوار یاد آ گئے جو اس عاجز پر بے انتہا شفقت فرمایا کرتے تھے۔

عرفان نے ادبی ذوق ورثے میں پایا ہے چنانچہ انہوں نے جرمنی میں قدم جماتے ہی اردو جرمن کلچرل سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور مشاعروں اور مختلف ادبی تقریبات کا اہتمام کرنے لگے۔ ان تقریبات کا آغاز مسعود دہلوی کے اُن ادبی مقالوں سے ہوا جو وہ پروفیسر فتح محمد ملک اور گوئٹے یونیورسٹی میں مشرقی ادب کے پروفیسر Dr. Pande کی صدارت میں پڑھا کرتے تھے۔ سوسائٹی نے کئی ادبی مشاہیر بشمول حبیب جالب، ناصر کاظمی اور احسان دانش کی یاد میں تقریبات منعقد کیں؛ قراردادِ پاکستان کی گولڈن جوبلی منائی جس کے خاص مہمانوں میں الطاف گوہر اور جمیل الدین عالی شامل تھے؛ جرمنی میں سفیرِ پاکستان، حنیف گُل کی صدارت میں ''آزادی کے پچاس سال'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا جس میں احمد فراز اور انتظار حسین جیسے مشاہیر بھی مدعو تھے؛ سلام میموریئل میٹنگ منعقد کی؛ قائداعظم کا پچاسواں یومِ وفات منایا اور بعض دیگر مواقع پر آئی اے رحمٰن اور جنرل اسد دُرّانی کی تقاریر کروائیں۔ سوسائٹی نے چوہدری محمد علی اور ثاقب زیروی کی یاد میں تقاریب بھی منعقد کیں اور بعض اردو شعرا کے مجموعہ ہائے کلام کی تقریباتِ رونمائی کا اہتمام کیا۔

موصوف گزشتہ پندرہ سال سے لندن کے اخبار ''دی نیشن'' میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ روزنامہ آزاد (لندن) اور ہفت روزہ پاکستان (لندن) میں کالم لکھتے رہے ہیں۔ وہ جرمنی کے صحافتی حلقوں میں ایک خاص پہچان رکھتے ہیں چنانچہ ۱۹۹۴ء میں جرمنی کے صدر Herman Herzog کے دورۂ پاکستان میں وہ ان کی پریس ٹیم میں شامل تھے۔ اسی طرح وہ نوبل پیس کمیٹی کی طرف سے اس فنکشن میں بھی مدعو تھے جس میں ملالہ یوسف زئی کو نوبل انعام عطا کیا گیا۔

عرفان ایک مخلص احمدی ہیں۔ انہوں نے کئی سال تک جماعت احمدیہ جرمنی کے سیکرٹری تحریکِ جدید اور سیکرٹری صد سالہ جوبلی فنڈ کے طور پر کام کیا ہے۔ وہ لمبا عرصہ اخبار احمدیہ، جرمنی کے ایڈیٹر رہے ہیں اور انہیں احمدی اسائیلم سِیکرز کی ٹھوس مدد کا موقع بھی ملتا رہا ہے۔ وہ جرمنی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے بانیوں میں سے ہیں۔

وہ کہا کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے احمدی اسائیلم سِیکرز کے لیے مجھے جو کچھ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اس کی تفصیل ایک الگ کتاب کی متقاضی ہے اور اگر آپ اس موضوع پر میری باتیں سننا چاہیں تو اس کے لیے بہت وقت درکار ہوگا لہٰذا آیئے فی الحال اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے آپ کی ملاقات ڈاکٹر مظفر احمد سے کرائی جائے لیکن کیا آپ کو پتا ہے میری موصوف سے پہلی ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی تھی؟

راقم الحروف ۲۰۱۴ء میں گلبرگ سے لاہور کینٹ منتقل ہوا تو کڑک ہاؤس میں نمازِ جمعہ پر جن دوستوں سے پہلی بار تعارف ہوا ان میں ملنسار و خوش اطوار مظفر احمد نامی ایک دراز قد، بے ریش بزرگ بھی شامل تھے۔ جب ملتے اس محبت سے کہ دل باغ باغ ہو جاتا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی باتیں سنی جائیں لیکن یہ موقع پیدا ہی نہ ہوا تاوقتیکہ حال ہی میں جرمنی سے حمید احمد چوہدری لاہور تشریف لائے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ وہ کیولری گراؤنڈ میں ڈاکٹر مظفر احمد کے مکان پر مقیم ہیں اور یہ کہ اگر میں ان کی زیارت سے فیضیاب ہونا چاہوں تو مجھے ڈاکٹر صاحب کے ہاں آنا پڑے گا۔ مجھے شک گزرا کہ ڈاکٹر مظفر احمد غالباً وہی بزرگ ہیں جن سے ملاقات کی مجھے عرصے سے خواہش ہے تاہم تصدیق اس وقت ہوئی جب حمید احمد چوہدری نے گھر کا پتا سمجھانے کے لیے فون ان کے حوالے کر دیا۔ ان کے ساتھ یہ ملاقات ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہی اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مزید ملاقاتوں کا رستہ کھل گیا۔

ڈاکٹر مظفر احمد جو چوہدری رحمت خاں، مربی انگلستان کے پوتے اور چوہدری نذیر احمد کے صاحبزادے ہیں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ ان کی دلچسپی سائنس کے ساتھ تھی چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے باٹنی میں ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا اور تین سال کے لیے اپنی خدمات حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضور کے ارشاد پر انہیں نصرت جہاں سکیم کے تحت سیرالیون میں Nassingbi کے مقام پر نصرت جہاں احمدیہ سیکنڈری سکول میں تعینات کر دیا گیا جہاں انہیں اپنی معمول کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مقامی بزنس کمیونٹی کے تعاون سے سکول میں سائنس بلاک تعمیر کرانے کا موقع بھی ملا۔ اس دوران وہ اعلیٰ تعلیم کے مواقع کی تلاش میں رہے چنانچہ انہیں کوئنز یونیورسٹی، بلفاسٹ اور لیڈز یونیورسٹی کی طرف سے علی الترتیب یک سالہ ماسٹرز اور دو سالہ ایم فِل کی آفرز ہوئیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وقف کی تکمیل کے بعد انگلستان چلے گئے اور ڈاکٹر عبدالسلام سے ملاقات کر کے اس بارے میں حتمی فیصلے کے لیے رہنمائی چاہی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں کوئنز یونیورسٹی کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا کیونکہ اس کورس کے پورے اخراجات کی ذمہ داری یونیورسٹی نے خود اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے یہ

مشورہ قبول کر لیا۔ ماسٹرز مکمل کرتے ہی اسی یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی۔ اب مسئلہ اخراجات کا تھا۔ انہوں نے چوہدری ظفر اللہ خان کے قائم کردہ ساؤتھ فیلڈ ٹرسٹ کو مالی مدد کے لیے درخواست کی جو قبول کر لی گئی تاہم اسی اثنا میں یونیورسٹی نے خود ان کے جملہ اخراجات برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ انہوں نے ساؤتھ فیلڈ ٹرسٹ کی پیشکش سے استفادے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ وہ یہ بات فخر سے بیان کرتے ہیں کہ انہیں اپنا پی ایچ ڈی کا تھیسس عالمی شہرت یافتہ اور خطاب یافتہ پروفیسر سی ٹی اِنگولڈ کے سامنے ڈِیفنڈ کرنے کا موقع ملا۔

پاکستان واپسی پر انہوں نے پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل میں سینئر سائنٹیفک آفیسر کے طور پر شمولیت اختیار کر لی۔ اس دوران انہیں انسٹیٹیوٹ آف فزیکل اینڈ کیمیکل ریسرچ، واکو، جاپان میں ایک سال کے لیے پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ کا موقع بھی ملا۔ قریباً ایک عشرہ ریسرچ کونسل میں گزارنے کے بعد جب وہ ہیڈ، ایپلائیڈ مائیکرو بیالوجی کے طور پر کام کر رہے تھے انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں پر ان کے ترقی کے امکانات معدوم ہیں چنانچہ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے پرائیویٹ سیکٹر میں منتقلی کا فیصلہ کر لیا اور وہ سرکاری ملازمت تیاگ کر اینگرو کیمیکلز سے وابستہ ہو گئے۔ وہ ۲۰۱۱ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک وہیں رہے۔ اس عرصے میں انہیں ایڈوائزر ٹیکنیکل سروسز؛ سینئر ایڈوائزر نیو پراڈکٹس، ہیڈ ایگری بزنس؛ سینئر ایڈوائزر آر اینڈ ڈی اینڈ سِیڈ پروڈکشن اور ہیڈ ٹیکنیکل سروسز کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔

کیا یہ کم ہے کہ ان کی میجر پبلیکیشنز کی تعداد کم و بیش ایک درجن ہے؟

مظفر احمد کے بعد آپ کا تعارف تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور قابلِ فخر اولڈ سٹوڈنٹ، ڈاکٹر مبشر احمد سولنگی سے کرایا جا رہا ہے جو نذیر احمد سولنگی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور انجمن کوارٹرز میں ہمارے محلہ دار اور مربی اطفال، ماسٹر حمید احمد سنیاسی کے بھانجے ہیں۔ نذیر سولنگی قیامِ پاکستان سے بھی پہلے، ۱۹۴۶ء میں کویت گئے اور کویت آئل کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ تقریباً ربع صدی وہاں مقیم رہے اور کویت کے پہلے امیر جماعت ہونے کا اعزاز پایا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ سال اومان میں بھی گزارے۔ اسی دوران انہوں نے ربوہ کے محلہ دارالرحمت وسطی میں اپنا گھر تعمیر کر لیا تھا جو ''سولنگی منزل'' کے نام سے معروف تھا۔ انہوں نے ۱۵ دسمبر ۱۹۹۲ء کو وفات پائی اور قطعہ شہدا، ربوہ میں دفن ہوئے۔

مبشر جن کی سکولنگ ایبٹ آباد میں ہوئی تھی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے۔ بی ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے اور انہوں نے ۱۹۷۱ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے زوآلوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اگرچہ انہیں ۱۹۷۴ء میں ٹیکساس اے اینڈ ایم یونیورسٹی، ٹیکساس سے فِشریز کے شعبے میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تاہم انہوں نے پی ایچ ڈی یونیورسٹی آف سَدرن مِسی سی پی سے ۱۹۸۰ء میں کی۔ ان کی تحقیق کا میدان میرِین بیالوجی تھا۔

اب آپ سے کیا پردہ، میں نذیر سولنگی سے تو مدتِ دراز سے متعارف تھا اور مبشر کے ایک بھائی مبارک سولنگی

(جو صدرِ عمومی کے دفتر میں کام کرتے ہیں) سے ایک بار اتفاقاً مل چکا تھا تاہم مبشر کا نام میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ایک دوست نے ان کا ذکر کیا تو میں نے مبارک سے ان کا ای میل ایڈریس حاصل کیا۔ رابطہ ہوا تو خوش اخلاقی سے پیش آئے اور میرے کسی سوال کے جواب میں پس وپیش نہیں کیا۔

ان ڈھائی سالوں کے علاوہ جب مبشر کویت انسٹیٹیوٹ فار سائینٹیفک ریسرچ میں ریسرچ اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے (اور یہ ان کے پی ایچ ڈی کرنے سے پہلے کی باتیں ہیں) موصوف پچھلے چالیس سال سے امریکہ میں ہیں اور مختلف سائنسی اداروں اور یونیورسٹیوں میں ریسرچ اسسٹنٹ، ریسرچ ایسوسی ایٹ، سٹاف سائنٹسٹ، کوآرڈی نیٹر، صدر اور ایڈجنکٹ پروفیسر رہ چکے ہیں۔ میں ان تمام اداروں کے نام سنا سنا کر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ بات آپ کے علم میں ضرور لانا چاہتا ہوں کہ وہ ۱۹۸۴ء سے انسٹیٹیوٹ فار میرِین میمل سٹڈیز، مسی سی پی کے صدر ہیں۔ اس انسٹیٹیوٹ کی ویب سائٹ دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ مبشر سولنگی کا یہ ادارہ میرِین بیالوجی کے شعبے میں کیا خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

انسٹیٹیوٹ کی ویب سائٹ پر مبشر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

Dr. Solangi is the President and Executive Director of the Institute for Marine Mammal Studies. He founded the organization in 1984 to promote marine research, conservation and education. Dr. Solangi received his Ph.D in marine biology from the University of Southern Mississippi in 1980. He has conducted pioneering research on dolphins both in the wild and under human care. His research experience includes work in pathobiology, disease diagnoses and control, aquaculture, water-quality management, marine ecology, and marine mammal behavior, husbandry and verterinary care. In addition, Dr. Solangi serves as adjunct faculty at multiple universities and accordingly has supervised graduate students conducting research on marine mammals. His professional associations include membership in the International Association of Aquatic Animal Medicine, Society for Marine Mammalogy, and the International Marine Animal Trainers Association.

اب تک مبشر کے کم وبیش چالیس تحقیقی مضامین مؤقر سائنسی جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مبشر تعلیم الاسلام کالج کے زمانۂ طالب علمی میں ہاکی کھیلا کرتے تھے؛ وہ سائنس کلب کے ممبر تھے اور اچھے ڈِبیٹر بھی تھے۔ وہ ایک مخلص احمدی ہیں اور مختلف جماعتی عہدوں پر کام بھی کر چکے ہیں۔

اگرچہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں کسی پاکستانی کے لیے اپنے نام کا لوہا منوانا آسان کام نہیں مگر ایک بے وسیلہ شخص کا پاکستان میں اپنے لیے عزت کا مقام پیدا کرنا شاید اس سے بھی مشکل ہے۔ اس حوالے سے فوری طور پر میرے ذہن میں مرحوم دوست محمد اکرام کا نام آ رہا ہے جو چوہدری محمد اسحاق، سیکرٹری آبادی کمیٹی، تحریک جدید انجمن احمدیہ کے فرزند تھے۔ وہ کالج میں ہم سے کافی جونیئر تھے کیونکہ انہوں نے بی اے کا امتحان ۱۹۷۱ء میں پاس کیا تھا جب کہ ہم اس مرحلے سے کئی سال پہلے گزر چکے تھے۔ بعد میں وہ ایف سی کالج، لاہور چلے گئے اور معاشیات میں ایم اے کر کے سٹیٹ لائف میں ملازمت اختیار کر لی تاہم ۱۹۷۶ء میں وہ ایمپلائز اولڈ ایج بینیفِٹس کارپوریشن میں چلے گئے اور جونیئر آفیسر کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اپنی وفات کے وقت وہ اسی محکمہ میں ڈائریکٹر کے طور پر گوجرانوالہ میں تعینات تھے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں کچھ عرصہ میری تقرری فیصل آباد میں رہی۔ ابتداءً میرا دفتر پیپلز کالونی میں کرائے کی ایک کوٹھی میں تھا لیکن بعد میں الائیڈ ہسپتال کے سامنے سرکاری عمارت میں منتقل ہوگیا۔ یہ بات ۱۹۸۷ء کی ہے۔ ہمارے ساتھ ہی لیبر والوں کا دفتر تھا۔ سید ارشاد علی (جنہوں نے بیت النور، لاہور پر دہشت گردوں کے حملے کے دوران اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا) ان دنوں اسی دفتر میں کام کر رہے تھے۔ اکرام کی ان کے ساتھ بھی ملاقات تھی اور وہ دونوں اکٹھے مجھ سے ملنے کے لیے میرے دفتر آیا کرتے تھے۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اکرام کو دل کا پہلا حملہ ہوا۔ وہ فضلِ عمر ہسپتال میں داخل تھے۔ مجھے خبر ہوئی تو میں ان کی مزاج پرسی کے لیے خاص طور پر حاضر ہوا تاہم وہ غنودگی میں تھے۔ بعد میں کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن ان سے آخری رابطہ ۲۰۰۴ء میں ہوا جب وہ اپنے ہارٹ بائی پاس کے سلسلے میں ڈاکٹرز ہاسپٹل، لاہور میں داخل تھے۔ اُن کے فون سے معلوم ہوا کہ ان کا بائی پاس ہونے والا ہے اور وہ اپنے بل میں مناسب تخفیف کے لیے میری اعانت کے طلبگار ہیں۔ سچی بات ہے اس وقت تک میرا ڈاکٹرز ہاسپٹل کے کسی ڈاکٹر کے ساتھ کوئی ذاتی رابطہ نہ تھا لہٰذا اپنی کوشش کے باوجود میں ان کی کوئی مدد نہ کر پایا۔ اس کے جلد ہی بعد پتا چلا کہ وہ آپریشن کے دوران بیہوشی میں چلے گئے تھے اور تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اسی کیفیت میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ان کی اہلیہ، نعیمہ تعلیم الاسلام کالج کے ایک کارکن محمد احمد بوبک مقیم فیکٹری ایریا، ربوہ کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں۔ مدتوں بعد ان سے سرگودھا میں رابطہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے چاروں بچے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرونِ ملک جا چکے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی، نُدرت حریم نے اکنامکس میں ایم اے کر رکھا ہے اور شادی کے بعد آج کل آسٹریلیا میں ہے جب کہ چھوٹی بیٹی، ڈاکٹر امتہ المتین جو کِنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی گریجوایٹ ہے اپنے میاں کے ہمراہ امریکہ مقیم ہے۔ بڑا بیٹا، بلال الیکٹریکل انجینئر ہے اور چھوٹا بیٹا، مصدّق مکینیکل انجینئر۔ دونوں بیٹے دبئی میں برسرِ روزگار ہیں۔

نعیمہ کے لیے اب پاکستان میں کوئی کشش باقی نہیں چنانچہ وہ اپنا زیادہ وقت بیٹوں کے پاس دبئی میں گزارتی ہیں لیکن جب یہاں آئیں تو سرگودھا میں قیام کرتی ہیں۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ان کا اپنا گھر ہے اور میاں

بھی یہیں دفن ہیں لہٰذا ان کا زیادہ قیام اسی شہر میں رہتا ہے۔ ان کے میاں کا ذکر آ جائے تو وہ آزردہ ہو جاتی ہیں اور اکثر کہا کرتی ہیں: ان کی ایک خوبی کا ذکر کیے بنا نہیں رہ سکتی اور وہ تھی ان کی فرض شناسی اور دیانتداری۔ وہ ایک ایسے محکمہ میں تھے جہاں بددیانتی سکّہ رائج الوقت سمجھی جاتی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو رزقِ حرام سے بچایا جس کا ایک انعام انہیں اچھی، تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی اولاد کی شکل میں ملا ہے۔

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اکرام کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے میں اپنے ایک اور مرحوم دوست کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ضلع چکوال کے رہائشی، ایک مخلص احمدی خاندان کے فرد، محکمہ ریلوے کے ایک اعلیٰ افسر اور بہت اچھے انسان تھے۔ میرا اشارہ ڈلوال کے رہنے والے راجہ ناصر احمد (جو راجہ فضل داد نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے تھے) کی طرف ہے۔

ان سے میری پہلی ملاقات میری راولپنڈی تعیناتی کے دوران نہ جانے کیسے ہوئی لیکن اتنا یاد ہے کہ میں ایک بار ان سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر گیا تھا جو راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے بالمقابل ریلوے ہی کی کسی عمارت میں تھا۔ دراصل میں اپنے بچپن میں جب بھی مال گاڑی کو گزرتا دیکھتا تو مجھے اس کے آخر میں لگا ہوا گارڈ کا ڈبہ اور بسا اوقات ہینڈل پکڑ کر اپنے کیبن سے باہر "صحن" میں کھڑا گارڈ بہت فیسینیٹ کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا جی مچل جاتا اور میرے اندر یہ خواہش بیدار ہونے لگتی کہ اگر مجھے مال گاڑی میں سفر کا موقع مل سکے تو مزا ہی آ جائے۔ اگرچہ بعد میں یہ خواہش زندگی کے زیادہ اہم مسائل کے نیچے دب کر رہ گئی لیکن ناصر سے ملاقات ہوئی تو اس نے پھر سر اٹھا لیا اور ان سے ان کے دفتر میں پہلی ملاقات کے دوران یہی مسئلہ زیرِ بحث رہا۔

ناصر نے میری یہ بات بہت توجہ اور قدرے حیرت کے ساتھ سنی اور پھر کہا کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بعدہٗ ہم نے ایک قدرے ویران ریلوے سٹیشن کا انتخاب کیا جو راولپنڈی کوہاٹ سیکشن پر سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع تھا اور پروگرام یہ ٹھہرا کہ ہم رات وہاں قیام کے بعد اگلے روز ادھر سے آنے والی کسی ٹرین کے ذریعے واپس آ جائیں گے۔ میرے دو غیر از جماعت دوست، آفتاب احمد اور سجاد حیدر بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے لیکن جب اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت آئی تو ہمیں طرح طرح کے واہموں نے گھیر لیا مثلاً یہ کہ اگر اس ویرانے میں رات کے وقت ڈاکوؤں نے ہم پر ہلّہ بول دیا تو ہمارا کیا بنے گا یا اگر رات کے وقت ہم میں سے کسی کو اچانک کسی شدید بیماری نے آ لیا تو ہم ایک مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے۔ غرض ناصر کی طرف سے پورے انتظامات کی یقین دہانی کے باوجود یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ پھر طے ہوا کہ ہم کسی ایسی جگہ جائیں جہاں سے دن کی روشنی میں واپسی ممکن ہو سکے لیکن

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

کے چکر میں اس پروگرام کو بھی حتمی شکل نہ دی جا سکی۔

اس کے بعد بھی ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن پھر وہ غائب سے ہو گئے۔ طویل عرصے کے بعد ان کی امریکہ سے آنے والی ایک ای میل سے پتا چلا کہ ان کی ایک ہمشیرہ پہلے سے امریکہ میں تھیں چنانچہ ان کے توسط

سے وہ بھی وہیں جا چکے ہیں۔ پھر ان سے مستقل رابطہ رہا کہ وہ تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سرگرم رکن بلکہ اس کے جنرل سیکرٹری تھے تاہم یہ کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کسی جان لیوا بیماری میں مبتلا ہیں لہٰذا جب اچانک یہ سنا کہ وہ ۷ فروری ۲۰۱۶ء کو وفات پا گئے ہیں تو شدید صدمہ ہوا۔ مجھے کچھ اور تو سمجھ نہ آئی البتہ میں نے ان کے بڑے بھائی، راجہ نصر اللہ کو ربوہ میں فون کر کے تعزیت کی اور ان کی بیماری کی تفصیلات معلوم کیں۔

ان کی نمازِ جنازہ امریکہ ہی میں ادا کی گئی اور بالٹی مور میں تدفین عمل میں آئی۔

راجہ نصر اللہ خاں نے الفضل ۲۰ جولائی ۲۰۱۶ء میں اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے کہ مرحوم ۱۱ جون ۱۹۵۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں "ہمارے والد محترم نے اغلباً ۱۹۵۴ء میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے محلّہ دارالصدر غربی میں مکان تعمیر کرا لیا تھا۔ ناصر احمد خان کو فضل عمر (انگلش میڈیم) سکول میں داخل کرایا گیا جہاں اس نے عمدہ ماحول میں کامیابی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور تعلیمی مراحل طے کرتا ہوا تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا طالب علم بن گیا۔" انہوں نے ۱۹۶۷ء میں کالج میں داخلہ لیا اور بی ایس سی کر کے وہاں سے نکلے۔ یہاں ان کی علمی و ادبی صلاحیتیں نکھریں اور انہیں المنار کے اردو سیکشن کی مجلسِ ادارت میں شامل کیا گیا۔ بعد میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم ایس سی فزکس کیا اور اپنا کیریئر گورنمنٹ کالج، کٹاس سے شروع کیا۔ وہ گورڈن کالج، راولپنڈی میں بھی لیکچرر رہے تاہم ۱۹۷۹ء میں سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد پاکستان ریلوے کمرشل سروس میں چلے گئے۔ ریلوے میں انہوں نے مختلف اوقات میں ڈویژنل ٹرانسپورٹیشن آفیسر؛ ڈویژنل کمرشل آفیسر؛ ڈویژنل پرسانل آفیسر اور ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ کے طور پر کام کیا اور پانچ سال تک ریلوے کی مرکزی وزارت میں جوائنٹ ڈائریکٹر بھی رہے لیکن امریکہ کی کشش نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور ایک روز وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں جا آباد ہوئے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ انہوں نے امریکہ میں اپنے لیے کیا ذریعہ معاش اختیار کیا لیکن انہوں نے تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، امریکن چیپٹر کے ساتھ رابطہ خوب برقرار رکھا۔

نہ جانے انہیں کتنا عرصہ امریکی طرزِ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا کہ اچانک اللہ کی طرف سے بلاوا آ گیا

بلانے والا ہے سب سے پیارا اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ راجہ ناصر احمد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اب کچھ ذکر تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور ہونہار طالب علم، ڈاکٹر قمر احمد شمس کا جو آج کل ناسا کے لینگلے ریسرچ سنٹر میں کام کر رہے ہیں لیکن اپنی بھاری سائنسی اور تحقیقی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی خدمت کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

قمر احمد شمس جن کا خاندان تقسیم ہند سے پہلے قادیان کے قریبی موضع کھارا میں مقیم تھا ملک محمد خورشید فضل کریم نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان لودھراں سے پاس کیا جس کے

بعد وہ مزید تعلیم کے لیے ربوہ منتقل ہوگئے۔ وہ ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے۔ اس کالج میں گزرے ہوئے ان سات سالوں کو وہ اپنی زندگی کا سب سے قیمتی دور قرار دیتے ہیں اور اس کی دلچسپ یادیں آج بھی ان کے ذہن میں تازہ ہیں۔ وہ بتایا کرتے ہیں: تعلیم الاسلام کالج میں داخلے کے لیے میرا انٹرویو میاں عطاالرحمٰن نے لیا تھا۔ بعض اور باتوں کے علاوہ انہوں نے مجھے دعائے قنوت اور آیت الکرسی سنانے کو کہا۔ دعائے قنوت مجھے اچھی طرح یاد نہ تھی چنانچہ آپ نے میرے داخلہ فارم پر تحریر فرمایا کہ میں دو ہفتے کے اندر اندر جنید ہاشمی کو دعائے قنوت سنانے کے بعد داخلہ کی فیس جمع کرا سکتا ہوں۔ جب کلاسیں شروع ہوئیں تو یہی میاں عطاالرحمٰن ہمیں فزکس پڑھانے پر مامور ہوئے۔ پہلے روز حاضری کے بعد بلیک بورڈ پر ادعیۃ الرسول میں سے نفع بخش علم کے حصول، کشائشِ رزق اور بحالیٔ صحت کی دعائیں اور ان کا ترجمہ لکھا اور فرمایا کہ کل سب یہ دعائیں یاد کر کے آئیں اور پھر بلا ناغہ انہیں پڑھا کریں۔ اس چھوٹے سے واقعے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے کالج کا ماحول کیسا تھا اور اس میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ طلبہ کی کردار سازی پر کس قدر توجہ دی جاتی تھی۔

موصوف کو اب تک یاد ہے کہ کالج کے تمام پروفیسرز بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ وہ بتایا کرتے ہیں: دینیات کی کلاس غلام احمد بدّو ملہوی لیا کرتے تھے جو ہمارے لیے بے حد سودمند ثابت ہوئی۔ ہفتہ بھر کی کلاسز کے بعد جمعہ کا انتظار رہتا جب بیت مبارک میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا خطبہ سننے اور نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع ملتا۔ فضل عمر ہوسٹل میں نماز عشا کے بعد حدیث کا درس ہوتا۔ خدام الاحمدیہ کے اجتماعات اور جلسہ سالانہ پر ڈیوٹی کے مواقع بھی ملتے رہے۔ ان ڈیوٹیز کا فائدہ یہ ہوتا کہ بزرگان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا جو عملی زندگی میں اب تک کام آ رہا ہے۔ ناظم صاحب ڈیوٹی شروع ہونے سے پہلے اپنی ڈیوٹی میں سرخ رُو ہونے کے لیے دعا کی طرف توجہ دلاتے جس سے ہر کام میں برکت پیدا ہو جاتی اور بعض وقتی پریشانیوں سے قطع نظر کوئی بڑی کوتاہی سرزد نہ ہوتی۔

ایم ایس سی کے بعد موصوف کو اپنی مادرِ علمی میں پڑھانے کا موقع بھی ملا لیکن کچھ عرصہ بعد ان کی تبدیلی گورنمنٹ کالج، لیاقت آباد میں ہوگئی۔ پروفیسر نصیر احمد خان طلبہ کو ہمیشہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی تلقین کرتے اور اس کے لیے ضروری حوصلہ افزائی فرماتے۔ قمر شمس بتاتے ہیں: میرے ایک سینئر، ڈاکٹر مرزا محمد لقمان جو اُن دنوں ربوہ میں پروفیسر تھے نے امریکی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے معلومات جمع کر رکھی تھیں۔ مجھے ان ہی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ان یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے بنیادی شرائط کیا ہیں چنانچہ میں نے ان ہی کے مشورے پر ۱۹۸۲ء میں ویسٹ ورجینیا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

وہ مزید بتاتے ہیں: میں نے ۱۹۸۸ء میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی مکمل کی اور پھر وہیں ایک سال سُپر کنڈکٹیویٹی میں ریسرچ کا تجربہ حاصل کیا۔ مجھے ایک اور یونیورسٹی میں بھی کچھ عرصہ ریسرچ کا موقع ملا جس کے بعد میں نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ناسا لینگلے ریسرچ سنٹر میں کام شروع کر دیا۔ یہاں میرا پہلا پراجیکٹ سپیس شٹل اور راکٹوں میں استعمال ہونے والے مائع ایندھن کے لیے سنسرز کی تیاری تھا۔ آج کل

بطور سینئر ریسرچ انجینئر میرا کام ایسے سینسرز کی تیاری ہے جو ایروسپیس ایپلیکیشنز کے لیے استعمال کیے جا سکیں۔ اس ملازمت کے دوران میں نے مختلف قسم کی لیبارٹریز قائم کی ہیں جہاں یہ سینسرز ٹیسٹ کیے جا سکتے ہیں۔

ان سینسرز کی تفصیل میں جائے بغیر جنہیں مکمل کر کے لیبارٹری میں ٹیسٹ کیا جا چکا ہے اور جنہیں آج کل امریکہ کی کئی کمپنیاں استعمال کر رہی ہیں قمر شمس کے تیار کردہ باقی سینسرز پر تحقیق جاری ہے۔ ان میں سے بعض پر لیبارٹری اور فیلڈ ٹیسٹ مکمل ہو چکے ہیں اور ان کے استعمال کا اگلا مرحلہ زیادہ دور نہیں۔

قمر شمس خوش قسمت ہیں کہ انہیں جماعتی خدمت کا موقع بھی ملتا رہا ہے چنانچہ وہ پانچ سال تک صدر، مجلس خدام الاحمدیہ امریکہ کے علاوہ کچھ عرصے کے لیے سیکرٹری ایم ٹی اے بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر قمر شمس کے بعد آیئے آپ کی ملاقات کرائیں ڈاکٹر عبدالکریم خالد سے جو ایک معروف ادیب وشاعر ہونے کے علاوہ آج کل اِمپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ وہ عبدالقادر نامی ایک بزرگ کی اولاد اور عبدالستار نامی ایک بزرگ کے داماد ہیں۔ یاد رہے کہ یہ دونوں بزرگان کسی زمانے میں ربوہ کے معروف خیاطوں میں سے تھے اور آپس میں سگے بھائی تھے۔

میری بدقسمتی کہ میں موصوف سے متعارف تو ہوا لیکن اس وقت جب میں تکمیلِ ملازمت کے بعد پنجاب پبلک سروس کمیشن میں ممبر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت تک نہ موصوف سے تعارف حاصل تھا نہ عبدالکریم قدسی سے لیکن جب ایک بار پرویز پروازی نے میری کسی بات پر مجھے ٹوکتے ہوئے کہا: ”یار! عبدالکریم خالد اور صاحب ہیں اور عبدالکریم قدسی اور“ تو مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہوا اور میں نے نہ صرف عبدالکریم قدسی سے فون پر گفتگو کر کے ذاتی تعارف حاصل کیا بلکہ عبدالکریم خالد سے ملاقات کے لیے ان کے گھر جا پہنچا۔ ابھی وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر نہ ہوئے تھے اور وحدت کالونی کے عقب میں اپنی سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ جب انہوں نے اپنے والد بزرگوار اور خسر محترم کا ذکر کیا تو میں نے انہیں بتایا کہ میری ان دونوں بزرگان سے بکثرت ملاقات رہی ہے البتہ شومیٔ قسمت ان سے پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔ بہت خوش دلی سے پیش آئے تاہم مجھے ان کی شخصیت کے جس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی شرافت اور نجابت ہے۔

اس کے بعد میرا موصوف سے مستقل رابطہ رہا۔ ”قریۂ جاوداں“ شائع ہوئی اور میں نے اس کا ایک نسخہ ان کی نذر کیا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے مطالعے کے بعد اس کتاب پر الفضل کے لیے تبصرہ لکھیں گے۔ انہوں نے جلد ہی تبصرہ لکھ کر الفضل کو بھجوا دیا جو اس کے ڈیڑھ صفحات پر شائع ہوا۔ یہ ایک شگفتہ ادبی تحریر تھی جسے قارئین نے بے حد پسند کیا جس کا اندازہ قارئینِ الفضل کی ان بہت سی فون کالز سے ہوا جو انہوں نے مجھے کی تھیں اور جن میں انہوں نے اس تبصرے کے ادبی محاسن کی تعریف کی تھی۔

عبدالکریم خالد کی ساری تعلیم ربوہ کی ہے۔ ۱۹۶۸ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد وہ تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں ایم اے (عربی) کا امتحان پاس کر کے فارغ التحصیل

ہوئے۔ بعد میں ایم اے اردو بھی کرلیا اور پھر پی ایچ ڈی بھی۔ وہ گورنمنٹ ایف سی کالج، لاہور میں لیکچرر اور لورنمنٹ گورڈن کالج، راولپنڈی؛ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، لاہور؛ گورنمنٹ کالج، فیصل آباد؛ گورنمنٹ کالج آف سائنس، لاہور اور یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی تدریسی مصروفیات کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری ہے۔ اس وقت تک ان کے بے شمار ادبی و تحقیقی مضامین مختلف جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور وہ کم وبیش دو درجن کتب کے دیباچے بھی تحریر کر چکے ہیں۔ وہ فی الوقت پی ایچ ڈی کے پانچ مقالوں کی نگرانی کر رہے ہیں جو بجائے خود ایک بڑا اعزاز ہے۔

جب ان سے تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے شب و روز کی بات ہو تو وہ کہا کرتے ہیں: میٹرک میں اچھے نمبروں پر کامیابی نے مجھے اس سطح پر پہنچا دیا تھا کہ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں خود کو ڈاکٹر کے رُوپ میں دیکھنا شروع کر دیا چنانچہ میں ایف ایس سی (پری میڈیکل) میں داخلے کا خواہشمند تھا لیکن انٹرویو بورڈ نے جو چوہدری محمد علی اور چوہدری حمید اللہ پر مشتمل تھا مجھے پری میڈیکل کی بجائے آرٹس میں شماریات، اکنامکس اور عربی کے مضامین کے ساتھ داخلہ دینا منظور کیا۔ مجھے دھچکا سا لگا لیکن میں کر کیا سکتا تھا۔ میں نے اس وقت یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ مضامین سے کیا ہوتا ہے، سائنس نہ سہی آرٹس میں سہی، کالج میں داخلہ تو مل ہی رہا ہے نا۔

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے وہ بتاتے ہیں: کالج کا ایک عجیب گلیمر ذہن پر سوار تھا۔ یہاں جسمانی سزا کا کوئی تصور نہ تھا اور میں خوش تھا کہ ماسٹر غلام رسول کی مار سے تو جان چھوٹی جو الجبرا یاد نہ کرنے پر مجھے بالوں سے پکڑ کر پچھلی سیٹ سے کھینچتے ہوئے آگے لاتے تھے اور خوب اچھی طرح جھونا دیتے تھے اور قبلہ ماسٹر ہارون کے ڈنڈے سے نجات ملی جو شدید سردیوں میں دیر سے آنے پر میرے ٹھٹھرتے ہاتھ پر زور آزمائی کرتے تھے۔ میرے سائنس کے ایک استاد تھے ماسٹر سعادت۔ وہ پیٹ میں اس زور سے چٹکی لیتے تھے کہ آدھی جان نکال لیتے تھے۔ میں تواتر سے ان سزاؤں کو جھیل کر خاصا ڈھیٹ ہو چکا تھا۔ کالج میں آ کر ایک آزاد فضا کا احساس ہوا۔ پابندیاں یہاں بھی تھیں لیکن سکول کے مقابلے میں یہاں آزادی سے سانس لے سکتا تھا اور گاؤن پہن کر احساسِ تفاخر کے ساتھ گھوم پھر سکتا تھا۔

جب عبدالکریم خالد سے ان کے کالج کے اساتذہ کے بارے میں بات ہو تو وہ کہا کرتے ہیں: شماریات پڑھانے پر پروفیسر سعید اللہ خان مامور تھے جن کی شہرت اُن کے مرغی خانے کے حوالے سے زیادہ تھی۔ نہایت سادہ اور منکسر المزاج لیکن اپنے مضمون کے ماہر تھے۔ بعض اوقات مرغیوں کو دانا دُنکا ڈال کر سیدھے کلاس لینے پہنچ جاتے تھے۔ وہ کالج کی چھت پر کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے میں کلاس لیتے تھے، دلجمعی سے پڑھاتے لیکن کیا کیا جائے کہ میرے لیے شماریات کبھی دلچسپی کا مضمون نہیں بن سکا۔ اصل میں اعداد و شمار سے میری جان جاتی تھی۔ میں زندگی بھر خود کو ریاضیاتی اصولوں اور اعداد و شمار کے تابع نہیں کر سکا چنانچہ میں شماریات کے مضمون میں کورے کا کورا رہا۔ اس بارے میں کچھ سیکھنے کی مجھ میں استعداد ہی نہ تھی لیکن

امتحان میں نہ جانے کیسے پاس ہو گیا۔ اکنامکس کے استاد محمد سرور تھے۔ نئے نئے ایم اے کر کے آئے تھے۔ کلاس میں آتے ہی حاضری لیتے اور رجسٹر بند کر کے ایک تواتر سے پڑھانا شروع کر دیتے۔ لیکچر انہیں اَزبر ہوتا۔ طلب، رسد اور افادہ کا موضوع انہوں نے ایسا جم کر پڑھایا کہ آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ پڑھاتے ہوئے ان کے ہونٹ اتنے خشک ہو جاتے کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش وہ ایک بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر لیں لیکن انہوں نے میری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دی۔ انگریزی کے استاد پروفیسر محمد شریف خالد اپنی وضع قطع اور رنگ ڈھنگ کے نرالے استاد تھے۔ انتہائی سادہ اور متواضع انسان تھے۔ میرے جیسے طالب علموں کا لحاظ کر کے وہ نہایت سادہ زبان میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ یہ انگریزی کیا تھی پنجابی، اردو اور کچھ کچھ انگریزی کا ایک ملغوبہ۔ ان کی کلاس میں خوب دل لگتا تھا۔ لطائف و ظرائف سے بھی تواضع کرتے تھے۔ سیکنڈ ایئر میں مرزا خورشید احمد انگریزی پڑھانے آئے۔ ان کی کلاس میں انگریزی کے علاوہ کسی دوسری زبان کا پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا۔ کتاب ہاتھ میں لیتے اور ٹہلتے ہوئے نہایت صاف، شُستہ اور پانی سی انگریزی زبان بولتے چلے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے پہلے روز کلاس میں آتے ہی سب طالب علموں سے جو براہِ راست مکالمہ کیا وہ آکسفورڈ کی چھپی ہوئی ''ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری'' خریدنے کے بارے میں تھا سو ہم نے اسی روز مون لائٹ جنرل سٹور سے وہ ڈکشنری خرید لی اور آج تک ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مرزا خورشید احمد کا لیکچر کسی سیلابِ تُند کی طرح ہمارے سر سے گزر جاتا تھا اور ہم ان کی انگریزی میں ڈُبکیاں کھاتے رہ جاتے۔ عربی کا مضمون پروفیسر محمد اسلم صابر سے پڑھا۔ یوں تو میرے سارے اساتذہ ہی شریف النفس، متواضع اور شفقت کا سلوک کرنے والے تھے لیکن اسلم صابر اپنے نام کی طرح ان صفات کی کہیں بڑھ کر زندہ اور بلیغ مثال تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ پڑھاتے بھی اس انداز میں تھے کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا جاتا۔

ڈاکٹر عبدالکریم کے ساتھ گفتگو میں ایک بار پرویز پروازی کا ذکر آ گیا تو انہوں نے بتایا: اردو کی کلاس کالج کے وسیع و عریض ہال میں ہوتی جہاں انٹر کے تمام سیکشنوں کے طلبہ جمع ہو کر ان کا فصیح و بلیغ لیکچر سنتے تھے۔ موصوف شیروانی میں ملبوس ٹھیک وقت پر سٹیج کے بغلی دروازے سے داخل ہوتے۔ انہیں دیکھتے ہی ہم سب احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ سیدھے روسٹرم پر تشریف لاتے جہاں مائیک رکھا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہتے اور جب چھوٹی چھوٹی آوازیں آنا بند ہو جاتیں اور ایک گھمبیر خاموشی طاری ہو جاتی تو ان کی آواز اس سکوت کو توڑتی۔ نہایت آہستگی اور دھیرج سے لیکچر کا آغاز کرتے۔ دھیرے دھیرے آواز بلند ہوتی جاتی۔ شاعری ہو یا نثر، وہ ہر پہلو سے سبق کی تشریح و توضیح کرتے۔ ان کے پڑھانے کا انداز خوب تھا اور آواز کے زیر و بم میں عجب کیفیت تھی جو طالب علموں پر سحر طاری کر دیتی۔ عجیب جادو تھا جو سر چڑھ کر بولتا تھا۔

عبدالکریم خالد نے مزید بتایا کہ ان کے دور میں بھی بزمِ اردو کے نگران وہی تھے۔ وہ کہتے ہیں: ہر سال بزم اردو کے عہدیداروں کا چناؤ عمل میں آتا۔ میں انٹر کے دوسرے سال میں تھا کہ صدر کے عہدے کا

الیکشن ہوا۔ میرے مقابل پر عرفان احمد خان تھے جو مسعود دہلوی کے صاحبزادے ہیں اور پرویز پروازی کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے جیتنے کے امکانات زیادہ تھے لیکن انتخاب ہوا تو میرے حق میں زیادہ ہاتھ کھڑے ہوئے چنانچہ ۷۰۔۱۹۶۹ء کے دورانیے میں میں بزمِ اردو کا صدر رہا۔

اپنے دورِ صدارت کی یادداشتیں تازہ کرتے ہوئے عبدالکریم خالد نے بتایا: اس عرصے میں کالج میں کئی تقاریب منعقد ہوئیں مگر ایک تقریب یادگار تھی جس میں پروفیسر حمید احمد خان مہمانِ خصوصی کے طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے۔ سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بھی آئے۔ اس موقع پر چوہدری محمد علی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کے حوالے سے معرکے کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ مجھے کرسیٔ صدارت پر بٹھایا گیا۔ میں نے اپنے والد کے ماموں، مولانا محمد اسماعیل منیر کی پرانی شیروانی پہن کر اور سر پر اسی قبیل کی ٹوپی رکھ کر اس اجلاس کی صدارت کی۔ اسی سال میں کالج میگزین ''المنار'' کے شعبۂ ادارت میں معاون مدیر کے طور پر شامل ہوا۔ ''المنار'' سے میری وابستگی چھ برس تک رہی۔ ایم اے (عربی) میں تھا تو مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ کالج یونین میں بھی عہدیدار رہے موصوف نے بتایا: جی ہاں! میں کالج یونین کا سیکرٹری رہا ہوں اور یوں مجھے کالج سٹیج پر پیلا ریشمی گاؤن پہن کر بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ اس دوران میں مجھے ملک کے مختلف بین الکلیاتی مباحثوں میں کالج کی نمائندگی کر کے انعامات، ٹرافیاں اور میڈلز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ کالج کی طرف سے سپیشل سرٹیفکیٹ آف میرٹ اور سب سے بڑا اعزاز رول آف آنر حاصل کرنے کی توفیق بھی پائی۔

عبدالکریم خالد کو احساس ہے کہ زمانۂ تعلیم اور عملی زندگی میں ان کی کامیابیوں کے پیچھے ان کے والدین اور دیگر خاندانی بزرگوں اور اساتذہ کی دعاؤں اور شفقت کا بہت ہاتھ ہے چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں: میری ان ساری اچیومنٹس کے پس پردہ میرے والدین خصوصاً دادی جان مرحومہ کی دعائیں اور استاذی المحترم، جناب پرویز پروازی کی سرپرستی اور خصوصی رہنمائی قوتِ محرّکہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ میں انٹر میں تھا تو ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر شدید بیمار ہو گیا اور چند ہی دنوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اس موقع پر میرے دوست تو مزاج پرسی کے لیے آتے ہی رہے لیکن اساتذہ میں جناب پروازی واحد شخصیت تھے جو بنفسِ نفیس عیادت کے لیے میرے گھر تشریف لائے۔ ان کا برتاؤ مجھ سے ہمیشہ مشفقانہ رہا اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔

موصوف بتاتے ہیں: ۲۰۰۸ء میں میں ایک سرکاری دورے پر کینیڈا گیا تو پرویز پروازی کے ساتھ خوب نشست رہی۔ اس سے پہلے لندن کے خلافت جوبلی مشاعرے میں ان کے نیاز حاصل رہے۔ پاکستان میں رہ کر مجھے تعلیمی اور علمی و ادبی حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس میں موصوف کے سکھائے ہوئے رموزِ حیات کا بہت بڑا دخل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۰ء میں وہ مجھ سمیت اپنے چند شاگردوں کو لاہور لے کر آئے اور یہاں کے جیّد ادبا سے ملوایا۔ ان میں میرزا ادیب، احسان دانش، سیّد وقار عظیم، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی

اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، علامہ علاؤ الدین صدیقی شامل تھے۔ ان شخصیات سے موصوف کے گہرے مراسم تھے اور انہوں نے نہایت محبت سے ہمیں خوش آمدید کہا۔

آپ کے پاس عبدالکریم خالد کی باتیں سننے کے لیے وقت کی کمی نہ ہو تو آپ کو ان سے بعض بہت دلچسپ باتیں سننے کو ملیں گی۔ وہ بتایا کرتے ہیں: بی اے کا امتحان دے کر میں ۱۹۷۲ء میں اپنے ایک دوست، عبدالباری قیوم کے ہمراہ میرپور خاص چلا گیا جہاں مجھے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صدیقی کی نمک کی ایک جھیل پر مزدوروں کے کام کی نگرانی کے ساتھ منشی گیری کا فریضہ بھی ادا کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا جس سے میں خوش نہ تھا۔ ایک روز مجھے صوفی بشارت الرحمٰن کا ایک خط موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ میں بی اے میں سوائے انگریزی کے تمام مضامین میں پاس ہو گیا ہوں اور اب انگریزی کی تیاری کے ساتھ ساتھ مجھے ایم اے عربی میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ میں اس صحرائی زندگی سے ویسے ہی اُکتا چکا تھا چنانچہ میں فوراً ہی یہ کام چھوڑ کر ربوہ پہنچ گیا۔

موصوف سے پوچھا جائے کہ ان کا ایم اے عربی میں داخلے کا تجربہ کیسا رہا تو وہ مسکرا کر جواب دیتے ہیں: ایک دم اچھا۔ ایم اے میں داخلہ اور دو سال کے لیے مزید تعلیم الاسلام کالج سے وابستگی میری زندگی کا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ یہاں میرے اساتذہ میں صوفی بشارت الرحمٰن، چوہدری سلطان اکبر، محمد اسلم صابر اور محمد اسلم شاد منگلا شامل تھے۔ جامعہ احمدیہ کے جیّد استاد اور عربی کے متبحّر عالم، ملک مبارک احمد کنٹریکٹ پر پڑھاتے تھے۔ ان اساتذہ کے عالمانہ اور فاضلانہ لیکچرز مجھے آج بھی یاد ہیں۔ صوفی بشارت الرحمٰن کی پڑھائی ہوئی تفسیرِ بیضاوی اور اس میں تفسیرِ کبیر سے استفادے کی صورتیں! کیا خوب انداز تھا صوفی صاحب کے پڑھانے کا۔ ملک مبارک احمد سے رسالۃُ الصحابہ پڑھا۔ چوہدری سلطان اکبر نے تاریخِ ادبِ عربی پڑھائی اور محمد اسلم صابر سے کتاب الحماسۃ، لُطفی المنفلوطی اور طٰہٰ حسین پڑھے۔ اس زمانے میں ایم اے عربی کے لیے اردو میں مقالہ لکھا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے ''حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حیات و خدمات'' کے موضوع پر مقالہ لکھا اور اورینٹل کالج میں آ کر زبانی امتحان دیا۔ میرے کلاس فیلوز میں لئیق احمد عابد، محمد ایوب اقبال اور مبشر احمد شامل تھے۔ باقی خواتین تھیں جن کی موجودگی کا احساس تو ہوتا تھا لیکن نام پتا جاننے کی ہمّت نہ تھی۔

ایک بار میں نے عبدالکریم خالد سے گزارش کی کہ وہ اپنے تحریر و تقریر کے شوق اور اس کی آبیاری کی داستان سنائیں تو انہوں نے بتایا: کالج کی زندگی میں ہم نصابی سرگرمیوں کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ مجھے سکول کے زمانے ہی سے تحریر و تقریر کا شوق تھا۔ میری پہلی تحریر میرے ایک استاد جن کا نام عبدالرشید تھا نے ماہنامہ تشحیذ الاذہان میں چھاپی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس تحریر کو پڑھ کر خوشی سے پُھولا نہ سماتا تھا۔ میری پہلی تقریر بھی تعلیم الاسلام ہائی سکول کے سٹیج پر ہوئی۔ یہ ایک تقریری مقابلہ تھا۔ پرویز پروازی اس موقع پر موجود تھے۔ گھر لوٹتے ہوئے میں پیدل ان کے ساتھ ہو لیا تو انہوں نے میرے جوشِ خطابت کی بہت تعریف کی۔ اطفال اور خدام کے علمی مقابلوں میں شرکت کی وجہ سے میں نے تقریر کرنا سیکھ لیا اور کالج کے دوران میں مختلف بین الکلیاتی مباحثوں میں حصہ لے کر اس فن میں مزید مہارت حاصل کر لی۔ بہت بعد میں یہ نکتہ مجھے احمد عقیل روبی

نے سمجھایا کہ ایسے الفاظ جن کی ادائیگی میں پُھونک کی صورت بنتی ہو انہیں مائیک سے ہٹ کر ادا کرنا چاہئے۔ اللہ کے فضل وکرم سے مجھے اردو مباحثوں اور سیرت کانفرنسوں میں بہت کامیابیاں ملیں۔ کئی دفعہ لئیق عابد کے ساتھ مل کر کالج کے لیے ٹرافیاں جیتیں۔ میرے دیگر ساتھیوں میں زبیدالرحمٰن ہاشمی، بلال عطا اور محبوب جنود بھی شامل رہے۔ ہم جب بھی کوئی مقابلہ جیت کر آتے تو الفضل میں اس کی خبر چھپتی اور یوں کالج سے باہر کے حلقوں میں بھی جان پہچان بن گئی۔ ''المنار'' کی ادارت میرا بہت بڑا اعزاز ہے۔ ''المنار'' کے جن نگران اساتذہ کی رہنمائی میں مجھے کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ان میں پروفیسر رفیق احمد ثاقب، پروفیسر مبارک احمد عابد اور پروفیسر سعود احمد خان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر منور شمیم خالد برسر تھے چنانچہ مالی معاملات میں ان سے رابطہ رہتا تھا۔ کالج یونین کی سرگرمیوں کے انچارج ڈاکٹر سلطان محمود شاہد تھے۔ ان کا محبت بھرا انداز اور ''بلیا'' کہہ کر بلانا مجھے آج تک نہیں بھولتا۔

جب ان سے پوچھا جائے کہ کیا ان کے زمانے میں بھی کالج یونین کے الیکشنز زوروشور سے ہوتے تھے تو وہ بتاتے ہیں: کالج یونین کے الیکشن خوب دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ امیدواروں کو اپنی انتخابی مہم چلانے کی اجازت تھی۔ وہ ایک خاص سائز کے اشتہار بھی چھپوا کر بانٹ سکتے تھے چنانچہ الیکشن سے چند ہفتے پہلے یہ مہم جاری رہتی۔ امیدواروں کے سپورٹرز اپنے سینے پر امیدوار کے کارڈ سجائے کالج کے برآمدوں میں گھومتے اور ووٹ طلب کرتے نظر آتے۔ ان دنوں کالج کینٹین میں بھی رونق بڑھ جاتی۔

وہ بتاتے ہیں: مجھے یاد ہے کہ ایک دو الیکشنوں میں میں نے بھی اپنے امیدواروں کے حق میں رات دن ایک کردیا تھا۔ ایک الیکشن میں طاہر مجید جو آج کل جرمنی میں مقیم ہیں، صدر کے عہدے کے امیدوار تھے۔ طاہر مجید میرے ہمسائے بھی تھے اس لیے میں ان کے لیے خاصا سرگرم رہا اور وہ صدر منتخب بھی ہو گئے۔ ایک الیکشن میں حافظ عباس علی عاصم (عاصم صحرائی) صدارت کے امیدوار تھے۔ حافظ صاحب شاعر کی حیثیت سے کالج میں مشہور تھے، کالج میگزین میں ان کی غزلیں چھپتی تھیں اور وہ المنار کے مدیر بھی تھے۔ ان کے مدمقابل وسیم احمد (جو آج کل لندن میں مقیم ہیں اور اہم جماعتی عہدوں پر خدمت کی توفیق پا رہے ہیں) بھی اپنا ایک حلقہ احباب رکھتے تھے۔ وہ کالج لائبریرین، چوہدری محفوظ الرحمٰن کے صاحبزادے تھے۔ ان دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم رات رات گئے تک عاصم صحرائی کی سپورٹ میں ربوہ کے گلی محلوں کا طواف کرتے اور طلبہ کے گھروں پر دستکیں دیا کرتے تھے۔ گھر گھر پہنچ کر ووٹ مانگنے کی روایت کالج یونین کے انتخابات کے کلچر میں شامل تھی لیکن اس سارے عمل میں اخلاقی قدروں کا لحاظ مقدّم تھا اور پیار محبت کی فضا میں یہ سارا کام سرانجام پاتا تھا۔ مدِ مقابل کی زبردست مہم اور پبلک ریلیشنگ کے باوجود عاصم صحرائی یہ الیکشن جیت گئے۔

ان سے اگر تعلیم الاسلام کالج کی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنانے کو کہا جائے تو وہ جواباً کہتے ہیں: تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے چھ برسوں کا ایک ایک لمحہ میرے دل میں زندہ ہے۔ اَن گنت واقعات ہیں، کسے چھوڑوں اور کسے بیان کروں؟ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صدسالہ برسی منائی گئی۔ جناب پرویز پروازی

کے خلّاق ذہن نے اس موقع پر ایک خوبصورت پروگرام تشکیل دیا اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا ''دلّی کا یادگار مشاعرہ'' سٹیج کرنے کی صورت نکالی جس میں مختلف شاعروں کے کردار طلبہ نے ادا کیے۔ اب مجھے سارے کردار تو یاد نہیں رہے لیکن اتنا یاد ہے کہ غالب کے کردار کے لیے ہمارے دوست منور انیس کو منتخب کیا گیا تھا جس نے غالب کی مخصوص ٹوپی اور لباس پہن کر بڑی خوبصورتی سے یہ کردار ادا کیا تھا۔ میں نے خود کو مرزا محمد رفیع سودا کے کردار میں فِٹ کرنے کی کوشش کی۔ استاذی المکرّم کی ہدایات کی روشنی میں سودا کی مشہور غزل پڑھنے کی ریہرسل کی میں کئی روز تک آئینہ سامنے رکھ کر کرتا رہا۔ سٹیج پر رونمائی ہوئی تو ''لانا میرا قلم دان'' والے غنچہ بھی میرے ساتھ تھے اور میں نے سودا ہی کے لہجے میں (استاد محترم نے کہا تو ویسا ہی ہوگا) یہ غزل پڑھی:

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے دَر اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

میں نے یہ کردار ادا کرنے سے پہلے سودا کی شخصیت کا بھی تھوڑا بہت مطالعہ کرلیا تھا اور اپنی بساط کے مطابق ایک خود پسند اور احساس برتری میں مبتلا شاعر کے نقوش اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی البتہ غزل کے مزاج کے مطابق شکستہ دلی کا احساس بھی ضروری تھا۔ استاذی المکرّم نے اس یادگار مشاعرے میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں بھی کی تھیں مثلاً مشاعرے کا آغاز عبدالرحمٰن جامی کی اس نعت سے کرایا:

نسیما جانبِ بطحا گزر کُن
ز احوالم محمدؐ را خبر کُن

نعت پڑھنے والے طالب علم کا نام ذہن میں نہیں آرہا لیکن اس کے سحر انگیز لحن نے سماں باندھ دیا۔ مشاعرے کے سنجیدہ ماحول میں ایک سور خود پٹھان کے وُرود نے دلچسپی پیدا کی۔ مشاعرے میں شریک سارے ہی شاعر پٹھان کا ادھار کھائے بیٹھے تھے چنانچہ پٹھان کو دیکھ منہ چھپانے لگے۔ پٹھان سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہیں اس کی مضحکہ خیز شاعری سننا پڑتی ہے۔

عبدالکریم خالد کہتے ہیں: تعلیم الاسلام کالج کے سٹیج پر شاید یہ پہلا کھیل تھا جسے کاسٹیوُمز وغیرہ کے تکلّفات کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور دلّی کے یادگار مشاعرے کو اس کی تمام تر تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے تناظر میں ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے بعد اب آپ کی ملاقات کرائی جارہی ہے ڈاکٹر عبدالباری ملک سے جو کینیا میں پیدا ہوئے، ربوہ میں پروان چڑھے لیکن مدتِ دراز سے انگلستان میں مقیم ہیں اور اپنی رفاہی خدمات کی وجہ سے پورے برطانیہ میں پہچانے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے باری ملک پیدا تو کینیا کے شہر کسومو میں ہوئے لیکن دس سال کے تھے جب ان

کے والدین ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور انہیں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں داخل کرادیا۔ وہ بعد میں تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے لیکن گریجوایشن کے فوراً بعد ۱۹۷۵ء میں انگلستان منتقل ہوگئے اور تب سے بریڈفورڈ میں مقیم ہیں۔

موصوف ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں اور اس دور کی کئی خوبصورت یادیں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شیئر کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اس دور کے تمام معروف اساتذہ سے شرفِ تلمّذ حاصل رہا ہے لیکن وہ چوہدری محمد علی اور پرویز پروازی کا ذکر خاص محبت سے کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر خداتعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ کالج میں اپنے قیام کے دوران انہیں چوہدری محمد علی کی خصوصی شفقت اور مسلسل رہنمائی حاصل رہی اور ان کی دعاؤں سے متمتع ہونے کا موقع ملتا رہا۔ بقول باری ملک: چوہدری محمد علی کو حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث سے انتہا درجے کا عشق تھا اور آپ ان خوش قسمت افراد میں سے تھے جنہیں ایک لمبا عرصہ حضور کی قربت اور شفقت نصیب رہی اور حضور کے بعض بیرونِ ملک دوروں میں آپ کے قافلہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل رہا۔ آپ اپنی اکثر کلاسوں میں حضور کی شفقت اور روحانی بصیرت کے واقعات بڑے جذباتی انداز میں سناتے اور جب ہمارا کوئی ساتھی آپ سے حضور کے متعلق کوئی سوال کر دیتا تو آپ ان حسین یادوں میں ڈوب کر بسا اوقات لیکچر دینا بھی بھول جاتے۔

پرویز پروازی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے وہ بے حد جذباتی ہوجاتے ہیں اور بتاتے ہیں: انہوں نے ہفتہ میں ایک دن سوال و جواب کے لیے رکھا ہوتا تھا۔ اس روز کلاس کھچا کھچ بھری ہوتی۔ کلاس کے آغاز میں وہ ایک طرف سے دوسری طرف تک بڑے غور سے ہر طالب علم پر گہری نگاہ ڈالتے۔ اس کے بعد دلچسپ سوال و جواب کا آغاز ہوتا۔ پروازی صاحب ماشاءاللہ بہت حاضر جواب ہیں، مشکل سے مشکل اور ٹیڑھے سے ٹیڑھے سوال کا جواب بھی اس خوبصورتی سے دیتے کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی۔

باری ملک تعلیم الاسلام کالج کی اس تابندہ روایت کے خاص طور پر مدّاح ہیں کہ وہاں ہڑتال کا رواج نہ تھا۔ ہڑتال کا تصور جماعتی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتا چنانچہ وہ بتاتے ہیں: اس زمانے میں پاکستان میں جمہوریت نئی نئی آئی تھی اور ملک کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یونینز سر اٹھا رہی تھیں۔ بہت سے شہروں میں جاوید ہاشمی اور لیاقت بلوچ جیسے طالب علم رہنماؤں نے جمعیت طلبہ اسلام جیسی تنظیموں کے ذریعے ہنگامے کھڑے کر رکھے تھے اور نوجوان مر رہے تھے۔ تعلیم الاسلام کالج میں بھی طلبہ کی یونین تھی اور اس کے انتخابات بھی ہوتے تھے لیکن ہر چیز میں ڈِسپلن تھا اور کسی قسم کی بدانتظامی یا ہنگامے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ امیدواروں کو کنویسنگ کی اجازت تو تھی لیکن ہر چیز پُرامن طریق سے ہوتی۔ یہ سب ہمارے اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ایک بار ہماری کلاس کے بعض طلبہ نے کالج میں سیاست چمکانے کی کوشش کی لیکن ہمارے اپنے ہی ساتھیوں نے اسے سختی سے رد کردیا۔

کالج میں تعلیم کے دوران باری ملک مجلس خدام الاحمدیہ کے سرگرم کارکن رہے چنانچہ وہ بتاتے

ہیں: ۱۹۷۳ء کے شدید سیلاب کے دوران ایک بار ہمیں آدھی رات کے وقت ہدایت ملی کہ سردار ملاح سے کشتیاں لے کر محلّہ دارالیمن میں سیلاب میں گھرے ہوئے افراد کو نکالنے کے لیے پہنچا جائے۔ ہدایت کی تعمیل میں میرے سمیت کچھ خدام دریائے چناب سے کشتیاں لے کر محلّہ دارالیمن پہنچے اور گھروں میں پھنسے ہوئے افراد کو نکالنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں دارالضیافت سے کھانا بھی پہنچ گیا جو ہم محصور افراد کو پہنچاتے رہے۔ صبح ہمیں حکم ہوا کہ دو ٹیمیں کشتیاں لے کر قریبی دیہات میں پھنسے ہوئے سیلاب زدگان کو کھانا اور ہومیوپیتھی ادویات پہنچائیں چنانچہ ہم کئی روز تک دُور دُور کے دیہات میں جاکر دوائیں اور خوراک پہنچاتے رہے۔ واپسی نمازِ مغرب کے بعد اندھیرا ہونے پر ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے باری ملک کو ایک منفرد رنگ میں معاشرے کی خدمت کی توفیق بخشی ہے۔ وہ بتاتے ہیں: ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ مجھے جوڑوں میں درد کی تکلیف ہوگئی اور اس نے ناقابلِ برداشت صورت اختیار کرلی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ اگر میں اپنے بعض جوڑ بذریعہ آپریشن تبدیل کرالوں تو مجھے اس مرض سے نجات مل سکتی ہے۔ میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع سے مشورہ کیا اور اپنا آپریشن کرالیا جس کے نتیجے میں مجھے ایک خاص قسم کی جسمانی معذوری لاحق ہوگئی تاہم میں اپنے روزمرہ کے کام کاج کرتا رہا اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

باری ملک مزید بتاتے ہیں: اپنی اس تکلیف کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ معذوروں کی زندگی کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہوگی اور ان کی بحالی کے لیے کوشش کی کتنی ضرورت ہے چنانچہ میں نے BARNARDOS کے ساتھ کام کرنا شروع کردیا جو معذور بچوں کی بحالی کا ایک مشہور ادارہ ہے۔ میں نے بعد میں Asian Disability Awareness Action in Breadford کے نام سے اپنا ایک ادارہ بنالیا جو علی الخصوص بریڈفورڈ کی سیاہ فام آبادی اور مہاجرین اور اقلیتوں کے معذور افراد کی بہبود کے لیے کام کررہا ہے۔ وہ Disability Rights Commission (جس کے دائرہ کار میں پورا انگلستان شامل ہے)؛ لارڈ چانسلرز ایڈوائزری کمیٹی اور بریڈفورڈ کی Minorities Police Liaison Committee کے ممبر اور جسٹس آف پیس بھی ہیں اور انہیں معذور افراد کے حقوق پر اردو میں پہلی کتاب لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

موصوف کو ان کی خدمات کے پیشِ نظر متعدد اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جن میں یونیورسٹی آف بریڈفورڈ کی طرف سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری؛ بریڈفورڈ میٹروپولیٹن کونسل کی طرف سے کمیونٹی ہارمنی ایوارڈ؛ ملکہ برطانیہ کی طرف سے ایم بی ای کا خطاب اور ہاؤس آف لارڈز میں ملنے والا برٹش کمیونٹی آنرز ایوارڈ شامل ہے۔ انہیں چرچل فیلو آف ۲۰۰۳ء ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوچکا ہے اور اس حیثیت میں وہ ''وِنسٹن چرچل میڈِیلین'' کے حقدار قرار پاچکے ہیں جو انہیں ڈیوک آف کینٹ کے ہاتھوں ملا تھا۔ پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کے متعدد انٹرویوز نشر ہوچکے ہیں؛ وہ نیشنل پولیس ٹریننگ سنٹر میں سینئر پولیس آفیسرز کے لیے سینئر لیڈرشپ ڈیویلپمنٹ پروگرامز

میں شامل رہ چکے ہیں اور ان کے کئی مضامین بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

باری ملک کی جماعتی خدمات کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ وہ برسوں جماعت احمدیہ بریڈفورڈ کے صدر رہے ہیں۔ اس حیثیت میں انہیں بیت المہدی کی تعمیر کے لیے عطیات کی شکل میں تیس لاکھ برطانوی پاؤنڈز جمع کرنے کی توفیق ملی۔ وہ مجلس خدام الاحمدیہ نارتھ اینڈ سکاٹ لینڈ کے کئی سال تک ریجنل صدر رہے ہیں۔ انہیں پچھلے دس سال سے حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے مختلف سفروں میں ساتھ رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں ایڈنگھم میں مجلس خدام الاحمدیہ کے تحت ہونے والی اُس نیشنل چیریٹی واک کے منتظمِ اعلیٰ تھے جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع اور بعض برطانوی وزراء نے شرکت کی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً چیریٹی واکس کا اہتمام کرتے رہتے ہیں جن کے ذریعے ہزاروں پاؤنڈ جمع ہو کر فلاحی کاموں پر خرچ ہوتے ہیں۔ ان کی ان خدمات کی وجہ سے پرنسیس رائل کی طرف سے انہیں ایک خصوصی سرٹیفکیٹ بھی مل چکا ہے۔

موصوف بتاتے ہیں کہ ڈیلی میل سے منسلک معروف برطانوی صحافی، Dame Ann Lesile اور بی بی سی کے Geroge Alagiah نے ان کے لیے ایسے کلماتِ تحسین استعمال کئے ہیں جن پر وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالباری ملک کا تعارف تو ہو گیا، کیا آپ نے تعلیم الاسلام کالج کے سابق طالب علم، ڈاکٹر محمد اسلم ناصر کا نام بھی سن رکھا ہے؟ اسلم ناصر جو انجمن کوارٹرز میں ہمارے پڑوسی، محمد اسحٰق انور کے صاحبزادے اور مولانا محمد اسماعیل منیر کے بھتیجے ہیں ۱۹۶۹ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ان کا پسندیدہ مضمون مَیتھ تھا چنانچہ بعد میں انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے مَیتھ میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ موصوف نے اپنے کیریئر کا آغاز سرسید کالج، راولپنڈی میں لیکچررشپ سے کیا اور بعد میں تعلیم الاسلام کالج اور جامعہ نصرت میں تدریس پر مامور رہے۔ انہوں نے نصرت جہاں لیپ فارورڈ پروگرام کے تحت تین سال تک غانا کے مختلف احمدیہ سکولوں میں بھی پڑھایا اور بعدۂ نیوزی لینڈ کی یونیورسٹی آف اوٹیگو سے پی ایچ ڈی کر لی۔

یوں تو موصوف کو آسٹریلیا، امریکہ، برطانیہ اور جرمنی میں انفریمیشن ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے تاہم ان کی عملی زندگی کا زیادہ حصہ نیروبی (کینیا)، نیوکیسل (آسٹریلیا)، فجی آئی لینڈ؛ کوالالمپور (ملائشیا) اور موروگورو (تنزانیہ) کی یونیورسٹیوں میں تدریس میں گزارا ہے۔ آج کل وہ پاپانیوگنی کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔

اگرچہ اسلم ناصر ہمارے پڑوس میں پیدا ہوئے تھے تاہم ان کا خاندان میرے بچپن ہی میں ہمارے محلے سے نقلِ مکانی کر گیا تھا لہٰذا میرا ان سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ موصوف آسٹریلیا میں تھے جب مجھے ان کا کسی طرح پتا چلا۔ میں نے انہیں ای میل کی تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔ وہ میرے ''شوقِ آوارگی'' سے آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے پیشکش کی کہ اگر میں پسند کروں تو ہم اکٹھے بنگلہ دیش کی سیر کے لیے جا سکتے ہیں۔ ابھی اس

تجویز پر غور ہو ہی رہا تھا کہ ان کا دانہ پانی انہیں کھینچ کر موروگورو لے گیا اور یوں یہ پروگرام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

اسلم ناصر بہت بھلے اور صاف گو انسان ہیں۔ وہ ہر وقت باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نظر آتے ہیں جس نے انتہائی نامساعد حالات میں انہیں تکمیلِ تعلیم کی توفیق عطا فرمائی اور پھر ایک ایسے راستے پر گامزن کر دیا جو انہیں کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف لے گیا۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر نے ضلع میرپور خاص میں نورنگر فارم کے ایک پسماندہ سکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کرنے والے بچے کو جو اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے ربوہ ریلوے سٹیشن پر قُلی سے لے کر دفتر نصرت جہاں سکیم میں چپراسی کے طور پر کام کر چکا تھا اور اجرت پر لوگوں کی چارپائیاں بھی بنتا رہا تھا آہستہ آہستہ ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

انہیں مختلف جماعتی خدمات کی توفیق مل چکی ہے چنانچہ وہ صدر مجلس خدام الاحمدیہ، فجی؛ صدر، مجلس انصاراللہ، آسٹریلیا اور امیر، جماعت احمدیہ نیوزی لینڈ کے طور پر کام کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم ناصر کا ذکر بس اتنا ہی۔ اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے عبدالرحیم طارق سے۔ اگر آپ اس نام سے واقف نہیں تو باسکٹ بال کے کسی پرانے کھلاڑی یا باسکٹ بال فیڈریشن کے کسی عہدیدار سے پوچھ لیجئے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ عبدالرحیم طارق پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے کپتان رہے ہیں اور انہیں بین الاقوامی سطح پر کھیلوں کے کئی مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کا موقع مل چکا ہے۔

عبدالرحیم طارق ڈاکٹر عبدالکریم خالد کے چھوٹے بھائی ہیں جو تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہوئے تھے۔ میٹرک میں ان کے نمبر اچھے تھے اور وہ ایف ایس سی میں داخلہ کے خواہشمند تھے چنانچہ جب وہ انٹرویو کے لیے پیش ہوئے تو چوہدری محمد علی نے بحیثیت پرنسپل ان سے کہا کہ وہ انہیں صرف اس شرط پر ایف ایس سی میں داخلہ دیں گے کہ وہ درخواست فارم میں کرکٹ کی بجائے باسکٹ بال کو اپنی پسندیدہ کھیل کے طور پر درج کریں۔ اگرچہ درخواست دہندہ کی دلچسپی کرکٹ کے ساتھ تھی مگر انہوں نے موصوف کی خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور یوں وہ ایف ایس سی میں داخل ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں: ابھی کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ ایک دن میں نے کالج نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا دیکھا جس میں میرے سمیت بعض لڑکوں کو شام کے وقت باسکٹ بال گراؤنڈ میں پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں نے اس نوٹس کی پروا نہیں کی جس پر اگلے روز ایک اور نوٹس لگ گیا جس کے تحت مجھے باسکٹ بال گراؤنڈ میں نہ پہنچنے کی پاداش میں کچھ جرمانہ کیا گیا تھا۔ میں اس معاملہ میں خود کو بے قصور سمجھتا تھا لہٰذا میں جرمانہ معافی کی درخواست لکھ کر چوہدری محمد علی کے سامنے پیش ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں جرمانہ معاف کر دوں گا بشرطیکہ تم تحریراً یہ وعدہ بھی کرو کہ آئندہ سے تم شام کو باسکٹ بال گراؤنڈ میں ضرور آیا کرو گے۔ یوں جرمانہ تو معاف ہو گیا لیکن میرا اور باسکٹ بال کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ وہ بتاتے ہیں: میں نے کسی نہ کسی طرح ایف ایس سی تو کر لی لیکن میرے نمبر اتنے نہ آ سکے کہ اپنی پسند کا کیریئر اپنا سکتا چنانچہ میں نے مجبوراً بی ایس سی میں داخلہ لے

لیا مگر باسکٹ بال کے کھیل میں ہمہ وقت مصروفیت کی وجہ سے میں ڈگری کے حصول میں ناکام رہا۔

اس عرصے میں عبدالرحیم طارق باسکٹ بال کے کھیل میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے چنانچہ ۱۹۷۶ء میں حبیب بینک نے انہیں ملازمت کی پیشکش کی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ انہوں نے آفیسر گریڈ تھری کے طور پر بنک جوائن کیا اور بنک ملازمت کے دوران پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کرلیا۔ ۲۰۰۱ء میں جب انہوں نے بنک کی گولڈن ہینڈ شیک سکیم کے تحت ریٹائرمنٹ لی تو وہ حبیب بنک کی سرور روڈ برانچ میں آفیسر گریڈ وَن کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ شارجہ میں گزارا لیکن اب وہ بچوں سمیت آسٹریلیا منتقل ہوچکے ہیں اور ملبورن میں مقیم ہیں۔

مجھے عبدالرحیم طارق سے کبھی ملاقات کا موقع نہ ملا تھا لیکن جب مجھے کھیل کے میدان میں ان کی شہرت کا علم ہوا اور میرے اندر ان سے ملاقات کی خواہش بیدار ہوئی تو وہ آسٹریلیا جاچکے تھے۔ عبدالکریم خالد نے ان کا نمبر فراہم کیا تو وَٹس اَیپ کی مہربانی سے ان سے اسی وقت بات ہوگئی اور یوں ہمارا ان کے ساتھ مستقل رابطہ قائم ہوگیا۔ میری خواہش تھی کہ میں کھیل کے میدان میں ان کی کامیابیوں کی داستان ان ہی کی زبان سے سنتا لیکن ان کی مصروفیت ہمیشہ آڑے آجاتی رہی۔ جب میری طرف سے اصرار بڑھا تو انہوں نے بتایا کہ آسٹریلیا پہنچنے کے بعد ایم ٹی اے کے لیے ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا ہے، جب وہ آن ایئر جائے تو میں اسے سن لوں۔ خدا بہتر جانتا ہے وہ انٹرویو نشر ہوا یا نہیں اور اس میں انہوں نے کیا کہا اور کیا نہیں کہا لیکن کھیل کے میدان میں ان کی کامیابیوں کی ایک فہرست سے جو انہوں نے مجھے ارسال کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کالج، بورڈ اور یونیورسٹی کی سطح پر کھیلنے کے بعد وہ ۱۹۷۶ء میں پاکستان باسکٹ بال ٹیم کے لیے منتخب ہوگئے اور اس حیثیت میں انہیں چین، ملائشیا اور ہانگ کانگ میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اس سے اگلے سال وہ اس پاکستانی ٹیم میں شامل تھے جس نے بنکاک میں ہونے والی ایشیئن باسکٹ بال چیمپئن شپ میں حصہ لیا تھا جب کہ دو سال بعد انہوں نے جاپان میں منعقد ہونے والی ایشیئن باسکٹ بال چیمپئن شپ میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر مزید فضل فرمایا اور وہ ۱۹۸۰ء میں کلکتہ میں ہونے والی ایشیئن باسکٹ بال چیمپئن شپ میں حصہ لینے والی پاکستانی ٹیم کے کیپٹن مقرر ہوئے۔ انہوں نے پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی کی حیثیت سے اسلامک گیمز، ازمیر (۱۹۸۲ء)؛ قائداعظم انٹرنیشنل باسکٹ بال ٹورنامنٹ، لاہور (۱۹۸۵ء) اور سارک گیمز، پاکستان (۱۹۸۸ء) میں بھی حصہ لیا۔ وہ ۹۸-۱۹۹۴ء کے دوران حبیب بینک کی اس ٹیم کے کپتان بھی رہے جس نے مسلسل تین سال تک نیشنل چیمپئن شپ جیتی تھی۔

وہ اپنی گفتگو کے دوران اپنی کھیل کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات بھی سناتے ہیں تاہم احمدی ہونے کے ناطے بعض جگہوں پر احمدی دوستوں کی طرف سے ملنے والی محبت کا اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: ہم اسلامک گیمز کے لیے ازمیر میں تھے کہ ایک روز مجھے غیر متوقع طور پر ڈاکٹر جلال شمس کا فون آگیا جو اُن دنوں وہاں ترکی زبان میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ

میرے ربوہ کے زمانے سے واقف تھے اور انہوں نے کسی اخبار میں میرا نام پڑھ کر مجھے ڈھونڈ نکالا تھا۔ انہوں نے پُرزور دعوت دی کہ ازمیر سے واپسی پر ہم ان کے پاس رُکیں۔ میں نے اپنے مینجر، چوہدری محمد علی سے بات کی تو انہوں نے یہ دعوت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ ہم استنبول پہنچے تو وہ خود، ان کے ایک کزن، ڈاکٹر احتشام اور دو چار دوست ہمارے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے ہمارے لیے ایک کوسٹر بک کرا رکھی ہے۔ انہوں نے ہمیں نیلی مسجد اور باسفورس کے پُل سمیت شہر کے چیدہ چیدہ مقامات دکھائے اور پاکستان واپسی کے لیے وقت مقررہ پر ایئرپورٹ پہنچایا تاہم ہماری اس وِزِٹ کا حاصل توپ کاپی کی سیر تھا۔ یہی وہ عجائب گھر ہے جس میں دیگر بے شمار نوادرات کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض تبرکات بھی زیرِنمائش ہیں۔ جب چوہدری محمد علی کو معلوم ہوا کہ اب ہم وہ حصہ دیکھنے جا رہے ہیں جہاں یہ تبرکات زیرِنمائش ہیں تو انہوں نے اپنا جوتا باہر ہی اتار دیا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہاں لوگ عام طور پر جوتوں سمیت ہی اندر چلے جاتے ہیں تو انہوں نے جواباً کہا: لوگ جو مرضی کرتے رہیں لیکن میں تو اس بے ادبی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

ہم سب نے یہ تبرکات یکساں عقیدت و احترام کے ساتھ دیکھے لیکن چوہدری محمد علی کی کیفیت تو سب سے مختلف تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ یہ ایک عجیب منظر تھا جسے وہاں موجود لوگوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ حیران تھے کہ موصوف کیوں یوں زاروقطار روئے چلے جا رہے ہیں لیکن جب انہیں پتا چلا کہ معاملہ فی الاصل کیا ہے تو وہ حُبِّ رسول کے اس دلکش مظاہرے سے بے حد متاثر ہوئے اور اب کوئی آنکھ ایسی نہ رہی تھی جو اشکبار نہ ہو۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے عبدالرحیم طارق نے ایشین باسکٹ بال چیمپئن شپ منعقدہ ۱۹۸۰ء میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی تھی۔ گیمز کے دوران ایک جمعہ آگیا چنانچہ وہ اور ٹیم کے دوسرے دو احمدی کھلاڑی یعنی سیّد ظہیر احمد اور شاہد سعدی پوچھتے پوچھاتے احمدیہ بیت الذکر پہنچ گئے۔ انہوں نے کلکتہ کے امیر جماعت سے اپنا تعارف کرایا تو امیر صاحب نے لاؤڈ سپیکر پر ان کھلاڑیوں کی بیت الذکر میں موجودگی کا اعلان کردیا۔ نمازیوں نے اس اعلان کو حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سنا اور جب جمعہ ختم ہوگیا تو انہوں نے بصد اشتیاق ان سے فرداً فرداً شرفِ مصافحہ حاصل کیا اور حال احوال دریافت کرتے رہے۔ نمازیوں میں سیٹھ محمد صدیق بانی آف چنیوٹ جنہوں نے بیت اقصیٰ، ربوہ کی تعمیر کا جملہ خرچ برداشت کیا تھا بھی شامل تھے۔ انہوں نے بعد میں جماعت احمدیہ کلکتہ کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں بہت سے احباب شامل ہوئے۔ یہ دعوت مشن ہاؤس میں ہوئی۔

عبدالرحیم طارق کہتے ہیں: میرا تو احمدیت کی صداقت پر ایمان اتنا ہی مضبوط ہے جتنا اس بات پر کہ سورج مشرق سے طلوع ہوکر مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ میں شارجہ میں تھا جب ایک دوست نے تجویز کیا کہ ہمیں عمرہ کے لیے جانا چاہئے۔ میرے پاسپورٹ پر احمدی ہونے کا ذکر تھا اس لیے میں متذبذب تھا کہ خوامخواہ

اپنے آپ کو کسی مشکل میں ہی نہ پھنسالوں لیکن دوست نے اطمینان دلایا کہ یہاں سے سعودی عرب کے ویزے کے حصول میں وہ مشکلات حائل نہیں ہیں جن کا پاکستان میں احمدیوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خیر ہم نے ایجنٹ سے بات کی۔ اس نے ہمیں ہر طرح سے تسلی دلائی اور ایک ہفتے کے اندر اندر ویزا لگوا کر ہمارے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے۔ ان ویزوں کے مطابق ہم بائی روڈ سعودی عرب میں داخل ہونے کے مجاز تھے۔ آپ کو تو علم ہوگا بارڈر پر پہنچ کر بس ڈرائیور ساری سواریوں کے پاسپورٹ اکٹھے کر لیتا ہے اور امیگریشن والوں سے دخول کی مہر لگوا لیتا ہے۔ ڈرائیور واپس آیا تو اس کے پاس میرے علاوہ سب کے پاسپورٹ موجود تھے۔ اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا اور پھر کہا: امیگریشن والے تمہیں بلا رہے ہیں۔ میں یہ بات سن کر سخت گھبرایا اور سوچنے لگا کہ مجھے سعودی عرب میں داخلے سے انکار کر دیا جائے گا یا عین ممکن ہے مجھے گرفتار ہی کر لیا جائے۔ خیر میں دل ہی دل میں دعا کرتا ہوا امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک ڈاڑھی والا اہلکار بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک بار تو میری جان ہی نکل گئی اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا: اب گئے۔ اس نے ایک نظر میرے پاسپورٹ پر ڈالی اور پھر میرا چہرہ دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کر سکتا اس کے کسی سینئر نے اسے بلا لیا چنانچہ وہ اپنا کام چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک واپس نہیں آیا جس دوران میں اس مصیبت کے ٹلنے کے لیے دعا میں مصروف رہا۔ نہ جانے وہ قبولیتِ دعا کی کون سی گھڑی تھی کہ اس کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہونے لگی اور بالآخر ایک اور اہلکار کام کو نمٹانے کے لیے اس کی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا: یہ تمہارا پاسپورٹ ہے؟ اور پھر کچھ کہے سنے بغیر دخول کی مہر لگا کر میرے حوالے کر دیا۔ ہم دونوں اللہ کے فضل سے سعودی عرب میں داخل ہو گئے اور مکہ اور مدینہ میں مقررہ قیام اور عمرہ کی ادائی کے بعد واپس آئے۔

عبدالرحیم طارق نے چوہدری محمد علی کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہے اور بہت سے سفر اکٹھے کئے ہیں۔ ان کے پاس اس حوالے سے بھی یادوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی پاکستان سے انگلستان روانگی کے حوالے سے بھی ایک خدمت کا موقع مل چکا ہے جس کی تفصیل ''کراچی تاریخِ احمدیت'' کے صفحات ۵۶۵ سے ۵۶۷ پر بیان کی گئی ہے۔

اگر آپ کو اس خدمت کی تفصیلات سے دلچسپی ہے تو ''کراچی تاریخِ احمدیت'' ملاحظہ فرمایئے لیکن جتنی دیر میں آپ یہ کتاب تلاش کرتے ہیں کیوں نہ میں آپ کی ملاقات ڈاکٹر سہیل مختار سے کرا دوں جنہوں نے ۱۹۷۱ء میں سنٹرل ماڈل سکول، سمن آباد سے میٹرک کرنے کے بعد یوں تو ایف سی کالج، لاہور میں ایف ایس سی (پری انجینئرنگ گروپ) میں داخلہ لیا تھا اور ان کے پہلے سال کا بیشتر حصہ یہی مضامین پڑھتے گزرا تھا لیکن اچانک ان کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ انہیں انجینئر کی بجائے ڈاکٹر بننا چاہئے۔ وہ بتاتے ہیں: ایک بار مجھے اپنے والدِ بزرگوار کو ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ ان کے ساتھ والے بیڈ پر ایک مریض پڑا تھا جو شدید درد کی وجہ سے چیخیں مار رہا تھا۔ اس کی آہ و زاری سن کر دو ڈاکٹر آئے اور انہوں نے اسے ایک انجکشن دیا۔ وہ زمانہ اور تھا چنانچہ وہ دونوں اس وقت تک اس کے پاس بیٹھے رہے جب تک مریض کا درد تھم نہیں گیا اور اسے تسلی دیتے

رہے۔ جب مریض کا درد ختم ہو گیا تو اس نے ان ڈاکٹروں کو بہ آواز بلند دعائیں دینا شروع کیں۔ سہیل کہتے ہیں: یہ منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ زندگی تو وہی ہے جس میں انسان کسی کے دکھ درد کا مداوا کر سکے اور اس کے لیے ڈاکٹری کے پیشے سے بڑھ کر محترم پیشہ کوئی نہیں۔ وہ بتاتے ہیں: اپنے والدِ بزرگوار اور بعض بہی خواہوں کے سمجھانے کے باوجود میں اس مضمون کی ایک درخواست لے کر اپنے پرنسپل، انوار شوکت کے پاس پہنچ گیا جنہوں نے میری درخواست یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ سال کا بیشتر حصہ گزر چکا ہے اور اب تبدیل شدہ مضمون کے ساتھ میری کامیابی کے امکانات معدوم ہیں۔ ان ہی دنوں اتفاق سے ان کی ملاقات ان کے ایک دُور کے عزیز اور تعلیم الاسلام کالج میں شماریات کے استاد، سعید اللہ خان سے ہو گئی جنہوں نے ان کی رام کہانی سن کر ان کی مدد کا وعدہ کیا اور ربوہ پہنچ کر اپنے پرنسپل، چوہدری محمد علی سے بات کر کے تعلیم الاسلام کالج میں مائیگریشن کا عندیہ دے دیا۔ یوں سہیل ایف سی کالج، ربوہ منتقل ہو گئے، فضل عمر ہوسٹل میں ڈیرہ لگا لیا؛ دن رات محنت کی اور ایف ایس سی پری میڈیکل گروپ میں پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا۔ انہوں نے بعد میں دوبارہ ایف سی کالج میں مائیگریشن کرا لی اور وہاں سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۸۱ء میں قائداعظم میڈیکل کالج، بہاولپور سے ایم بی بی ایس کر لیا۔

ڈاکٹر سہیل آنکھوں کے شعبے میں تخصیص حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ان دنوں گنگارام ہسپتال کا آنکھوں کا شعبہ آنکھوں کے امراض کے لیے لاہور میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا تھا اور لطیف آئی ہسپتال والے ڈاکٹر لطیف چوہدری اس کے انچارج تھے۔ ڈاکٹر سہیل نے ان کے پاس ہاؤس جاب شروع کر دیا اور پھر ملازمت کا آغاز بھی اسی ہسپتال سے کیا۔ وہ شام کے وقت موصوف کے کلینک پر بھی بیٹھنے لگے تاہم اچانک ان کی گوجرانوالہ تبدیلی نے امراضِ چشم میں مہارت کے حصول کے ان کے سارے خواب چکنا چور کر دیئے اور وہ اتنے بددل ہو گئے کہ انہوں نے ملازمت ترک کرنے کی ٹھان لی اور ۱۹۸۴ء میں عملاً اس سے مستعفی بھی ہو گئے البتہ وہ اسی عرصے میں سمن آباد میں اپنا پرائیویٹ کلینک قائم کر چکے تھے جسے وہ ۲۰۰۶ء تک چلاتے رہے۔

سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر بیرونِ ملک سے سٹیریلائزڈ بینڈیج امپورٹ کی۔ انہیں اس کاروبار میں خاصا فائدہ ہوا۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر محمد زبیر، کارڈیالوجسٹ نے ان کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا کہ سرکاری ہسپتالوں میں استعمال ہونے والے ہائیڈرالک بیڈز جو بڑے مہنگے داموں امپورٹ ہو رہے تھے اگر ملک میں تیار ہو سکتے ہوں تو یہ اقدام بنانے والوں کے لیے سُودمند ہونے کے علاوہ ملک کے لیے زرِمبادلے کی بچت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بتاتے ہیں: میں فارغ تو تھا میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور دو ماہ کے اندر اندر ایک بیڈ بنا کر ڈاکٹر صاحب کو پیش کر دیا۔ انہوں نے اسے پندرہ بیس دن آزمانے کے بعد میرا یہ نمونہ پاس کر دیا اور مجھے پچاس بیڈز کا آرڈر کر دیا جو میں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی امپورٹ پرائس کے مقابلے میں صرف سینتیس ہزار روپے فی بیڈ سپلائی کیا۔

یہ ڈاکٹر سہیل کا مینوفیکچرنگ کے شعبہ میں پہلا قدم تھا۔ وہ کہتے ہیں: الحمدللہ میرے ادارے،

احمد میڈیکس نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی اور آج ہماری تیار کردہ مصنوعات نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بعض غیر ممالک میں بھی بے حد پسند کی جارہی ہیں۔

’’آپ بناتے کیا ہیں؟‘‘ ایک بار میں نے ان سے سوال کیا۔

انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کے مطابق ان کی کمپنی کا ماٹو ہے Shaping up a secure future ان کا دعویٰ ہے کہ We design comfort on wheels چنانچہ وہ نہ صرف ہر طرح کی ایمبولینسز (جن میں ریسکیو کارڈیئک ایمبولینسز، ایڈوانس لائف سپورٹ ایمبولینسز اور بیسک لائف سپورٹ ایمبولینسز شامل ہیں) بلکہ ان میں استعمال ہونے والا ساز وسامان بھی تیار یا مہیا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ موبائل ہیلتھ کیئر یونٹس؛ موبائل آئی کلینکس؛ موبائل آپریشن تھیئٹر، موبائل میڈیکل او پی ڈی اینڈ جنرل ایگزامینیشن؛ موبائل ڈائیگناسٹک یونٹس اینڈ لیبز؛ موبائل آئی سی یو وارڈز؛ فائر فائٹنگ وہیکلز؛ ڈزاسٹر رسپانس وہیکلز؛ موبائل کمانڈ اینڈ کنٹرول سنٹرز؛ میڈیا والوں کے لیے ڈیجیٹل سیٹلائٹ نیوز گیدرنگ اینڈ آؤٹ ڈور براڈ کاسٹنگ وینز؛ موبائل کورٹس آف جسٹس اور لگژری ٹریولنگ کے لیے موٹر ہومز بناتے ہیں۔

اپنے اس کاروبار کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا: ہمارے کام کی نوعیت اور اس کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ اب تک ہماری تیار کردہ چار ہزار سے زیادہ ایمبولینسز اندرون و بیرون ملک لوگوں کی جانیں بچانے میں مصروف ہیں۔ حکومتِ پنجاب کے ریسکیو ۱۱۲۲ کے پاس موجود تمام ایمبولینسز اور متعلقہ ساز وسامان ہمارا تیار کردہ یا فراہم کردہ ہے۔ اسی طرح پنجاب کے تمام اضلاع میں جہاں جہاں ہسپتال اَپ گریڈ کئے جارہے ہیں ہمارا تیار کردہ ساز وسامان ہی استعمال ہو رہا ہے۔ فوج کی بعض ضروریات بھی ہم پوری کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہماری مصنوعات معیاری ہیں اور ان کے متعلق بالعموم کسی قسم کی شکایت نہیں ملتی۔ ہاں! کوئی شکایت ہو تو ہم اسے دور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل نے اپنے کام کا آغاز علامہ اقبال ٹاؤن میں کرائے کی ایک چھوٹی سی جگہ سے کیا تھا لیکن اب ان کا کارخانہ قائداعظم انڈسٹریل اسٹیٹ، کوٹ لکھپت میں دو ایکڑ زمین پر محیط ہے اور ڈیڑھ سو سے زیادہ کارکن (جن میں کچھ کوالیفائیڈ انجینئرز بھی ہیں) ان کے پاس کام کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اللہ نے میرے کام میں بہت برکت دی ہے اور اب یہ جگہ بھی مجھے چھوٹی محسوس ہونے لگی ہے۔ دعا کریں خدا تعالیٰ اس سے بہتر اور وسیع جگہ کا کوئی انتظام کردے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ڈاکٹر سہیل کا تعلق ایک مخلص احمدی خاندان سے ہے۔ ان کے والدِ بزرگوار، شیخ مختار احمد ڈویژنل اکاؤنٹس آفیسر ہوا کرتے تھے۔ جن دنوں ڈاکٹر سہیل میڈیکل کے شعبے سے منسلک تھے وہ ایف آر سی ایس کرنے کے لیے انگلینڈ جانا چاہتے تھے۔ انگلینڈ میں ان کا داخلہ بھی ہو چکا تھا لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کے والدِ بزرگوار کو ان کا ملک سے باہر جانا پسند نہیں ہے انہوں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ان کی وفات تک ان کی خدمت کو ہی اپنا دین وایمان سمجھے رکھا۔ کیا معلوم اللہ کو ان کی یہی

ادا پسند آ گئی ہو۔

انہوں نے جماعتی خدمت کو بھی حرزِ جان بنا رکھا ہے چنانچہ وہ لاہور کی مرکزی مجلس عاملہ میں سیکرٹری صنعت وتجارت اور اپنے حلقہ کے نائب صدر ہیں۔ ان کا یہ انکشاف میرے لیے بے حد حیران کن تھا کہ وہ جماعتی ضروریات کے تحت طلب کئے جانے والے سامان کی قیمت وصول نہیں کرتے بلکہ وہ یہ سامان ہدیۃً فراہم کرنے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ شاید یہ ان کی اسی نیک نیتی کا ثمر ہے کہ ان کا کاروبار ترقی کی ایسی شاہراہ پر گامزن ہے جس پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تک ان کی مصنوعات افغانستان، ویت نام، یو اے ای، قطر، عمان، کویت، سعودی عرب، سوڈان، نائیجیریا، کینیا، آئیوری کوسٹ، صومالیہ، یوگینڈا اور بورکینا فاسو جا رہی ہیں۔ انہیں ۲۰۱۰ء سے لے کر ۲۰۱۶ء تک الا ماشاء اللہ ہر سال ’’بزنس مین آف دی یئیر ایوارڈ‘‘ ’’بزنس ایکسیلنس اچیومنٹ ایوارڈ‘‘ یا ’’ایکسیلنٹ کوالٹی فیبریکیشن ایوارڈ‘‘ یا ’’برانڈ آف دی یئیر ایوارڈ‘‘ ملتا رہا ہے جو اُن کی کاروباری صلاحیتوں کا مظہر ہے۔

اب آپ کا تعارف کرایا جا رہا ہے ڈاکٹر محمد ادریس منیر سے جو مولانا محمد اسماعیل منیر کے صاحبزادے ہیں اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ بعدۂ انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی سے بائیولوجیکل سائنسز میں ایم ایس سی کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے گلاسگو یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۸۳ء میں پی ایچ ڈی کر لی۔ ازاں بعد پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ کے لیے بے لَر کالج آف میڈیسن، ٹیکساس سے منسلک ہوگئے اور پھر کیلیفورنیا کی ایک بائیوٹیک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کمپنی کے ساتھ وابستگی نے ان کی خوابیدہ کاروباری صلاحیتوں کو بیدار کرنا شروع کیا چنانچہ انہوں نے ملازمت ترک کر کے اپنے کاروبار کی ٹھان لی اور خدا نے اپنے فضل سے ان کے ارادوں میں خوب برکت بھی ڈالی۔

۱۹۹۴ء میں انہوں نے ویڈیو ڈسٹری بیوشن کے شعبے میں کام شروع کیا۔ وہ بتاتے ہیں: ہم ابتدا میں سیٹلائٹ کمیونیکیشن استعمال کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہم آئی پی ٹیکنالوجی استعمال کرنے لگے ہیں۔ آغازِ کار میں ہم صرف افریقہ کے ویڈیو چینلز نشر کیا کرتے تھے لیکن بعد میں ہم نے نیٹ ورکنگ پراڈکٹس تیار کرنا شروع کر دیئے۔ یاد رہے آغازِ کار سے ہی یہ سارا کام ’’سکائی لائٹ نیٹ ورکس‘‘ کے نام سے کیا جا رہا ہے۔

الیاس منیر بتاتے ہیں: پہلے ہم سارا کام چین میں کرا کے امریکہ میں مارکیٹ کیا کرتے تھے لیکن پھر مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ میں ربوہ جس نے تعلیم و تربیت اور شخصیت سازی کی شکل میں مجھے بہت کچھ دیا ہے کو اپنا قرض کس طرح ادا کر سکتا ہوں چنانچہ میں نے سکائی لائٹ نیٹ ورکس کے نام سے ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی بنا کر ربوہ میں احمدی نوجوانوں کو آئی ٹی کے مختلف شعبوں میں تربیت دینا شروع کی۔ اِس وقت وہاں پر کم از کم ایک سو احمدی نوجوان اکاؤنٹنگ، ایچ آر، ویب اور ایپلیکیشنز ڈیولپمنٹ، آئی ٹی آپریشنز اور سیلز اینڈ آن لائن مارکیٹنگ کے شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل سے اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارا تربیت

یافتہ سٹاف ایک سے زیادہ ملکوں میں پھیلا ہوا ہمارا کاروبار بخوبی ہینڈل کرسکتا ہے۔ چونکہ ہمارے کلائنٹس میں سے زیادہ کا تعلق امریکہ سے ہے لہٰذا ربوہ میں موجود ہماری تربیت یافتہ آن لائن مارکیٹنگ، سیلز اور کسٹمر سپورٹ ٹیمز اس پورے کام کو بہت اچھے طریقے سے سرانجام دے رہی ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ گزشتہ سات آٹھ سالوں میں ہمارے ادارے سے تربیت پانے والے بے شمار احمدی نوجوان دنیا کے مختلف حصوں میں اعلیٰ تعلیم یا بہتر کاروباری مواقع کے حصول میں کامیاب ہوچکے ہیں۔

وہ تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے زمانے کو اپنی زندگی کا سب سے سنہری دور قرار دیتے ہوئے کہا کرتے ہیں: ''کیا خوب تھا ہمارا کالج اور کتنے محبت کرنے والے تھے اس کے اساتذہ! یوں تو کوئی استاد بھی اپنی لیاقت، اعلیٰ طرزِ تدریس، طلبہ کے ساتھ ہمدردی ومحبت اور ان کے بہتر مستقبل کے لیے دعائیں کرنے میں کسی دوسرے سے پیچھے نہ تھا مگر میں ڈاکٹر سلطان محمود شاہد کو کبھی نہیں بھلا سکتا جو ہمیں کیمسٹری پڑھایا کرتے تھے اور جن کے ساتھ کالج چھوڑنے کے بعد بھی تعلق رہا۔ مجھے یاد ہے مجھے پی ایچ ڈی میں داخلہ تو مل گیا لیکن پیش آمدہ اخراجات کے لیے وسائل مفقود تھے۔ والدِ محترم کا ارشاد تھا کہ میں اس بارے میں اپنے اساتذہ سے مشورہ کروں اور دیکھوں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس چلا گیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے انہوں نے بڑی محبت سے میرا مسئلہ سنا اور کہا: تم نے حضرت مسیح موعود کے وہ اشعار نہیں سنے:

بارگاہِ ایزدی سے تُو نہ یوں مایوس ہو
مشکلیں کیا چیز ہیں مشکل کشا کے سامنے
حاجتیں پوری کریں گے کیا تری عاجز بشر
کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے

پھر کہنے لگے: زندگی میں ایسے مواقع کم ملتے ہیں لہٰذا اسے ضائع نہیں کرنا۔ تم یہ آفر قبول کرلو۔ دیکھنا تمہاری مدد کے لیے غیب سے راستے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

وہ اس بات میں یقینِ کامل رکھتے ہیں کہ انہیں یہ ساری کامیابیاں اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد اپنے والدین کی دعاؤں، اساتذہ کرام کی محنت اور خلافت کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر ادریس منیر کا ذکر بس اتنا ہی۔ اب آپ کی ملاقات کرائی جارہی ہے فہیم الدین، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے جن کا تعلق چنیوٹ سے ہے اور جو چوہدری علم دین نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے ہیں۔ وہ میرے ایک دوست قمر رشید، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ماموں ہیں اور میرا ان سے پہلا تعارف ان ہی کے دفتر واقع ماڈل ٹاؤن، لاہور میں اس وقت ہوا تھا جب فہیم الدین اسی دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے انہیں بہت ملنسار اور ہنس مکھ پایا اور ان کی یہی خوبی ہمارے درمیان دیرپا تعلق کی بنیاد بنی۔

موصوف ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے طالب علم رہے ہیں جس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج، لاہور چلے گئے۔ بی ایس سی کرنے کے بعد انہوں نے حبیب عالم اینڈ کمپنی، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس،

فیصل آباد کے ساتھ آرٹیکل شپ شروع کی لیکن جلد ہی ان کے ساتھیوں پر ان کا احمدی ہونا کُھل گیا جس کی وجہ سے انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ایک بار تو اللہ تعالیٰ نے ہاتھ رکھ کر انہیں جسمانی گزند سے محفوظ رکھا۔ جماعتی مخالفت کے پیشِ نظر انہوں نے اس فرم کے کرتا دھرتا سے درخواست کی کہ وہ انہیں این او سی جاری کردیں تاکہ وہ یہ فرم چھوڑ کر کوئی اور فرم جوائن کرسکیں تاہم حبیب عالم اس بات پر آمادہ نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھلے باقی سب لوگ این او سی لے کر چلے جائیں وہ انہیں کسی صورت نہیں چھوڑیں گے لیکن فہیم الدین کے مسلسل اصرار اور بعض دوستوں کے دباؤ کے نتیجے میں وہ بالآخر انہیں این او سی جاری کرنے پر رضامند ہوگئے اور یوں فہیم الدین قدیر اینڈ کمپنی، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس، لاہور میں چلے آئے اور اپنا آرٹیکل شپ کا پیریڈ مکمل کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن گئے۔ موصوف نے ملازمت بھی کی ہے لیکن آج کل وہ بطور کنسلٹنٹ کام کررہے ہیں۔

فہیم الدین مخلص احمدیوں میں سے ہیں جو جماعت کی خدمت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں چنانچہ وہ انصار اللہ میں بعض اعلیٰ ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں۔ آج کل وہ ممبر قضا بورڈ مرافعہ عالیہ کے فرائض ادا کررہے ہیں۔

وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں اور اب تو یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ ان کا ایک قدم اسلام آباد میں ہوتا ہے تو دوسرا لندن یا ٹورنٹو میں۔ میری خواہش تھی کہ وہ قارئین کو بھی اپنے تجربات میں شریک کرتے مگر ان کی مصروفیت کے سبب یہ ممکن نہیں ہوسکا لہٰذا اس محرومی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے اب آپ کی ملاقات کرائی جارہی ہے تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور معروف سابق طالب علم، ڈاکٹر ظہیر احمد باجوہ سے۔ امریکہ میں بسنے والے احمدی ان کے نام بلکہ کام سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ ممتاز خادمِ سلسلہ، چوہدری ظہور احمد باجوہ کے صاحبزادے ہیں اور سچ پوچھیں تو ظہیر باجوہ سے میری شناسائی کا وسیلہ بھی ان کے والدِ بزرگوار ہی تھے۔ آپ اس کی تفصیل جاننا چاہیں گے؟

ربوہ کے محلّہ دارالصدر شمالی کے ابتدائی آباد کاروں میں سے ایک میرے چچا، پروفیسر محمد ابراہیم ناصر بھی تھے۔ ان کا ایک بیٹا میرا ہم جماعت تھا اور میں ان کے گھر بکثرت آیا جایا کرتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس گھر کے سامنے ایک کوٹھی تعمیر ہوئی جو معلوم ہوا لندن مشن کے انچارج، ظہور باجوہ بنوا رہے ہیں۔ میری اور ان کی عمروں کا تفاوت بے تکلفی کی راہ میں روک تھا لیکن بیت انوار میں نماز کی ادائی کے دوران ہمارا آمنا سامنا ضرور ہوجاتا تا چنانچہ ہم ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔

سنٹرل سپیریئر سروسز آف پاکستان کا امتحان پاس کرنے اور ابتدائی تربیت مکمل کرنے کے بعد جب ۱۹۷۲ء میں میرا تقرر فیصل آباد میں ہوا تو ایک روز چوہدری صلاح الدین، مشیر قانونی صدر انجمن احمدیہ اور ظہور باجوہ دونوں مجھ سے ملاقات کی غرض سے میرے دفتر واقع پیپلز کالونی فیصل آباد میں تشریف لائے۔ میں ان دونوں بزرگان کو پہچانتا تو تھا لیکن ان سے دوستانہ ماحول میں میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ کچھ دیر میرے

پاس بیٹھے اور پھر تشریف لے گئے لیکن اس ایک ملاقات نے کئی اور ملاقاتوں کا راستہ کھول دیا اور اس روز قائم ہونے والا ذاتی تعلق ان دونوں بزرگان کی زندگی تک قائم رہا۔

ظہیر باجوہ ان ہی ظہور باجوہ کے صاحبزادے ہیں۔ یوں سمجھ لیں میری اور ان کی عمر میں کم وبیش دس سال کا فرق ضرور ہوگا لہٰذا ہمارے درمیان دوستی کا تو کوئی امکان نہ تھا البتہ واجبی سی جان پہچان ضرور تھی چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب وہ ایم بی اے کر رہے تھے تو انہوں نے انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن، ملتان میں اپنے ایک استاد، طاہر لطیف شیخ کا ذکر کیا جن کا تعلق ہمارے محکمہ سے تھا، جو مجھ سے ایک سال سینئر تھے اور انسٹیٹیوٹ میں غالباً ٹیکس لاز پڑھاتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے ساتھ کبھی اٹھنے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا لیکن جب کسی دوست نے ذکر کیا کہ وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد امریکہ میں بطور واقفِ زندگی وقت گزار رہے ہیں تو مجھے ان کے بارے میں مزید کچھ جاننے کا اشتیاق ہوا اور یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے میری ہر ای میل کا فوری جواب دے کر میری تشنگی دُور کر دی۔

موصوف کے والدِ بزرگوار کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنیں تاہم میٹرک کے امتحان میں کم نمبروں کی وجہ سے انہیں کالج میں پری میڈیکل میں داخلہ نہ مل سکا اور انہیں آرٹس کے مضامین پڑھنے پڑے۔ ۱۹۷۷ء میں تعلیم الاسلام کالج سے ایف اے کے بعد وہ اپنی اگلی تعلیم کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک دن ڈاکٹر عنایت اللہ منگلا اتفاقاً ان کے گھر آ نکلے اور جب یہ موضوع زیرِ بحث آیا تو انہوں نے موصوف کو بی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ بات ان کے دل کو لگی چنانچہ انہوں نے ہیلے کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت میرٹ لسٹ میں ان کا نام آخر پر تھا لیکن بی کام کے مضامین ان کے مزاج سے اس حد تک مطابقت رکھتے تھے کہ انہوں نے فائنل امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ انہیں اس نتیجے کی بنیاد پر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان میں ایم بی اے میں داخلہ مل گیا۔ اس موقع پر چوہدری محمد علی کی رہنمائی ان کے شاملِ حال رہی اور ان ہی کے مشورے پر انہوں نے ایم بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ ایم بی اے پروگرام میں کل سینتیس طلبہ تھے اور داخلے کے وقت ظہیر کا نام میرٹ لسٹ میں سب سے آخر پر تھا لیکن وہ خدا کے فضل سے فائنل امتحان میں یونیورسٹی میں اول رہے اور یوں ان کے لیے مزید ترقیات کا راستہ ہموار ہوتا گیا۔

ظہیر باجوہ کو اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے بچپن میں ایک بار حضرت نواب مبارکہ بیگم نے انہیں وقف کی تحریک کی تھی۔ جب وہ ایم بی اے کے دوسرے سیمسٹر میں تھے تو صاحبزادہ مرزا غلام احمد نے انہیں وقف کے متعلق یاددہانی کروائی چنانچہ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی خدمت میں خود کو وقف کے لیے پیش کر دیا۔ حضور نے اس بات پر خوشی کا اظہار فرمایا کہ جو کام ان کے والدِ مرحوم نے چالیس سال قبل شروع کیا تھا، وہ اسے مزید آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور انہیں ایم بی اے مکمل کرنے کی ہدایت کی۔

ایم بی اے مکمل کر کے ظہیر باجوہ ربوہ چلے گئے اور ان کا تقرر وکالتِ مال ثالث میں ہوا۔ اس دوران انہیں بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے سکالرشپ کی پیشکش ہوئی جس پر حضور نے انہیں بیرونِ ملک جانے کی

منظوری عنایت فرمادی چنانچہ وہ ۱۹۸۶ء میں وکالتِ مال ثالث سے پانچ سال کی رخصت پر امریکہ چلے گئے اور یونیورسٹی آف ویسٹرن مشی گن میں ایم بی اے (فنانس) میں داخلہ لے لیا۔ یہ ڈگری مکمل کرنے کے بعد انہوں نے سَین ڈیاگو یونیورسٹی، کیلی فورنیا سے فنانس میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔ تعلیم مکمل ہونے پر انہوں نے حضور کی خدمت میں اپنے حالات لکھے تو انہیں صاحبزادہ مرزا مظفر احمد امیر جماعت احمدیہ، امریکہ سے ملاقات کا حکم ہوا۔ انہوں نے واشنگٹن ڈی سی میں صاحبزادہ صاحب سے ملاقات کی چنانچہ ان کو بطور واقفِ زندگی یہاں تعینات کر دیا گیا اور وہ تب سے کسی نہ کسی شکل میں جماعت کی خدمت میں مصروف ہیں۔

موصوف ایک منکسر المزاج انسان ہیں جس کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا لفظ استعمال نہیں کرتے حالانکہ ہمارے ماحول میں تو لوگ خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کے لیے جعلی ڈگریوں کا سہارا لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ میں نے جب بھی ان سے کسی مسئلے کی وضاحت طلب کی یا کسی قسم کی معلومات مہیا کرنے کی درخواست کی انہوں نے فی الفور اس طرف توجہ کی اور یہ ان کی ایک ایسی خوبی ہے جو آج کل کم لوگوں میں ملتی ہے۔

ظہیر باجوہ کے بعد لگے ہاتھوں ڈاکٹر سہیل خان سے بھی مل لیجئے اگرچہ آج تک مجھے خود بھی ان سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ سچ پوچھیں تو میں ان کے نام سے بھی واقف نہ تھا لیکن اللہ بھلا کرے حمید احمد چوہدری کا جنہوں نے جرمنی میں تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ کر اس کی ایک ویب سائٹ بنائی اور کوشش کر کے اس کالج کے بعض ممتاز اولڈ بوائز کے کوائف اکٹھے کئے۔ میں نے ڈاکٹر سہیل خان کا نام پہلی بار اسی ویب سائٹ پر پڑھا تاہم وہاں سے ان کا کوئی اتا پتا نہ معلوم ہو رہا تھا۔ صرف یہی اندازہ ہوا کہ وہ ہالینڈ میں مقیم ہیں اور نیوٹریشن اور ہیلتھ ان کی دلچسپی کے شعبے ہیں۔

اگر مجھے اتفاق سے ہالینڈ میں کوئی کام پڑ جائے تو میرا دھیان سب سے پہلے برادرم الیاس بشیر کی طرف جاتا ہے جو میرے محسن اور محبِ خاص ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ڈاکٹر سہیل خان کا کونٹیکٹ ڈھونڈ کر دیں۔ انہوں نے مہربانی فرمائی اور چند ہی روز میں مجھے ان کا موبائل نمبر ارسال کر دیا۔

اللہ بھلا کرے وَٹس اَیپ والوں کا۔ انہوں نے نہ جانے کس مقصد کے تحت لیکن دنیا کے کونے کونے میں بکھرے ہوئے دوستوں کے درمیان رابطہ بے حد آسان بنا دیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سہیل خان کو میسج کیا تو انہوں نے فوراً جواب دیا اور بتایا کہ وہ فی الفور تو اپنے بارے میں معلومات مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، اس کے لیے مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ شکر ہے کہ کچھ ہی انتظار کے بعد انہوں نے مجھے ایک تفصیلی ای میل ارسال کی جس میں وہ لکھتے ہیں: میں نے اپنی زندگی کے سب سے قیمتی ماہ وسال ربوہ میں گزارے ہیں۔ میرا سارا بچپن اور کالج کا پورا زمانہ وہیں گزرا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم الاسلام کالج ہی تھا جس نے میری شخصیت کی تعمیر کی اور میرے مستقبل کو درخشاں بنایا۔ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک میں تقریباً پانچ سال اس کالج میں رہا اور بی ایس سی کرنے کے بعد ہالینڈ آ گیا جہاں میں نے ایم ایس سی اور پھر پی ایچ ڈی کر لی۔ اس کے بعد میں اپنے

شعبے میں تخصیص کے حصول کے لیے جنوبی افریقہ، تائیوان اور امریکہ میں بھی رہا۔ اب میں میڈیکل نیوٹریشنسٹ / کلینیکل ڈائی ٹیشیئن کے طور پر ہالینڈ کے تین بڑے شہروں یعنی ہیگ، روٹرڈیم اور ایمسٹرڈیم میں پرائیویٹ پریکٹس کر رہا ہوں۔ یہاں پر میرے چودہ کلینکس اور ایک ڈائٹ ریسٹورانٹ ہے۔ بظاہر یہ سارا کام چلانا مشکل نظر آتا ہے لیکن تجربے نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ ہر اس آدمی کے لیے جو اپنے وقت کا بہترین استعمال سیکھ لیتا ہے کوئی چیز مشکل یا ناممکن نہیں رہتی۔ خدا کے فضل سے میں ہفتے میں چھ دن کام کرتا ہوں، روزانہ مریضوں کو دیکھتا ہوں، حسبِ ضرورت سیمینارز منعقد کرتا رہتا ہوں اور کتابیں لکھتا ہوں لیکن مجھے کبھی وقت کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی۔

وہ مزید کہتے ہیں: میں تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میری محنت کا ثمر عطا فرمایا ہے چنانچہ مجھے کچھ عرصے سے ایگریکلچر یونیورسٹی، فیصل آباد میں بطور وِزِیٹنگ پروفیسر بلایا جا رہا ہے۔ دو سال پہلے ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر، ہز ایکسی لینسی معظم احمد خان نے ہالینڈ کی پاکستانی کمیونٹی کی طرف سے محبت کے اظہار کے طور پر مجھے ''لائف اچیومنٹ ایوارڈ'' سے نوازا تھا۔ میں ان سب باتوں کو اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔ یہ سب کچھ احمدیت کی برکت، تعلیم الاسلام کالج میں گزرے ہوئے دنوں اور میرے اساتذہ کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ خدا ان سب کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔

ڈاکٹر سہیل خان کا مرکزِ سلسلہ سے رابطہ قائم ہے۔ دو سال پہلے وہ یہاں آئے تو احمدیہ میڈیکل ایسوسی ایشن پاکستان اور شعبہ میڈیسن فضل عمر ہسپتال، ربوہ کے تعاون سے دفتر انصاراللہ مرکزیہ میں ''صحت پر غذا کے اثرات'' کے عنوان پر ان کے ایک معلوماتی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس لیکچر کا خلاصہ الفضل ۸ جولائی ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکا ہے اور اس کا مطالعہ ہمارے قارئین کی معلوماتِ عامہ میں اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔

اس وقت تک ڈاکٹر سہیل خان کی تین کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک اردو میں ہے اور اس کا نام ہے: ''صحت ہی زندگی ہے''۔ ایک کتاب انگریزی میں ہے اور اس کا نام ہے ''نیوٹریشن اینڈ ہیلتھ فار ساؤتھ ایشئینز'' جب کہ تیسری کتاب جو اسی موضوع پر ہے ڈچ زبان میں شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر سہیل خان کا ذکر ختم کرتے ہوئے اب آپ سے متعارف کرایا جا رہا ہے ڈاکٹر اعجاز اے رؤف کو لیکن کیا آپ کو پتا ہے کہ میں خود ان سے کیسے متعارف ہوا تھا؟

جب میں نے کینیڈا میں برسوں سے مقیم یارِ دیرینہ، ہدایت اللہ ہادی سے درخواست کی کہ وہ تعلیم الاسلام کالج کے سابق طلبہ میں سے اپنی عملی زندگی میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے والے کینیڈا میں آباد کچھ دوستوں کی نشاندہی کریں تو انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر اعجاز اے رؤف کا ذکر کیا جو تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کینیڈا چیپٹر کے صدر بھی رہے ہیں۔ یوں میرا رابطہ اعجاز رؤف سے ہوا جنہوں نے بتایا کہ وہ فی الوقت اپنے کسی کاروباری دورے پر چین میں ہیں اور واپس کینیڈا پہنچ کر میرے سوالات کا جواب دے سکیں گے۔ خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور کینیڈا پہنچتے ہی مجھے اپنی بخیریت وطن واپسی کی اطلاع دی۔

موصوف کا تعلق گھوکھووال ضلع فیصل آباد سے ہے۔ ان کے خاندان میں احمدیت حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ

کے زمانے میں آئی جب ان کے دادا، اللہ دتا سوڈھی کو اللہ تعالیٰ نے بیعت کی توفیق بخشی۔ ان کے والد یوں تو فوج میں تھے لیکن انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ وقت گیمبیا کے کسی جماعتی ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بطور واقفِ زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے۔

اعجاز اے رؤف سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ان کا سکول کا زمانہ سیالکوٹ میں گزرا اور انہوں نے ایف ایس سی مرے کالج سے کی تاہم وہ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے۔ انہوں نے بی ایس سی میں داخلہ لیا تھا اور میتھ، فزکس اور کیمسٹری کے ساتھ یہ امتحان پاس کیا۔ ان کے اساتذہ میں قمر شمس، ملک حبیب، مبارک انصاری، عبدالرشید غنی اور حمید احمد نام کے ایک غیر از جماعت استاد شامل تھے۔

وہ بتاتے ہیں: فزکس کی کچھ کلاسز اور پریکٹیکلز نیو کیمپس میں ہوا کرتے تھے۔ چونکہ اس وقت تک کالج نیشنلائز ہو چکا تھا اس لیے ماحول پڑھائی کے لیے زیادہ سازگار نہیں تھا مگر ہمارے اساتذہ پھر بھی ہمت افزائی کرتے اور محنت کی تلقین کرتے۔ تعلیم الاسلام کالج سے فارغ التحصیل ہو کر میں پنجاب یونیورسٹی چلا گیا جہاں پر میں نے ایم ایس سی میں دوسری پوزیشن اور ایم فل میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اللہ نے فضل کیا اور مجھے اپنے نتائج کی بنیاد پر کیمبرج یونیورسٹی میں فزکس میں پی ایچ ڈی کرنے کا موقع مل گیا چنانچہ میں ۱۹۸۷ء کے دسمبر میں انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے ۱۹۹۱ء میں پی ایچ ڈی کی جس کے بعد پوسٹ ڈاکٹورل فیلوشپ پر کینیڈا چلا آیا اور تب سے یہیں مقیم ہوں سوائے ان تین سالوں کے جو میں نے امریکہ میں گزارے تھے۔

اعجاز رؤف کا پیشہ ورانہ کیریئر بے حد تابناک ہے۔ وہ اب تک گیونڈش لیبارٹری ریسرچ ایوارڈ، ہیوز ہال ریسرچ ایوارڈ، لنڈگرن ریسرچ ایوارڈ اور انٹیریو سسٹین ایبل انرجی ایسوسی ایشن کے اَربن کمیونٹی پاور ایوارڈ کے علاوہ بھی کئی اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔ وہ بہت سے معروف پینلز، کونسلز اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر بھی ہیں۔

انہیں ریسرچ کا وسیع تجربہ حاصل ہے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں ڈیمانسٹریٹر؛ کوئنز یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ؛ یونیوسٹی آف البرٹا میں وِزِیٹنگ سائنٹسٹ؛ کام سیٹس میں پروفیسر؛ یونیورسٹی (فارن فیکلٹی) آف ٹورنٹو میں سَیشنل لیکچرر؛ یارک یونیورسٹی میں ایڈجنکٹ پروفیسر؛ یونیورسٹی آف الینوائز میں ریسرچ اسسٹنٹ پروفیسر اور غانا کی یونیورسٹی آف انرجی اینڈ نیچرل ریسورسز میں وزیٹنگ پروفیسر اور بہت سی کارپوریشنوں میں مختلف حیثیتوں میں کام کر چکے ہیں۔

ان کی پبلیکیشنز کی فہرست ماشاء اللہ خاصی طویل ہے۔

وہ کئی سال تک جامعہ احمدیہ، کینیڈا کے ساتھ منسلک رہے ہیں اور حکومتِ کینیڈا کے ساتھ جامعہ احمدیہ کی منظور شدہ تعلیمی ادارے کے طور پر رجسٹریشن کرانے کی کامیاب سعی میں ان کا بہت کردار تھا۔ انہیں ۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۳ء تک کینیڈا کے نیشنل سیکرٹری تعلیم کے طور پر خدمت کی سعادت بھی حاصل ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز رؤف کا ذکر تمام ہوا۔ اب میں آپ کو خالدِ احمدیت، مولانا ابوالعطاء جالندھری کے پوتے؛ عطاء الکریم شاہد کے صاحبزادے اور عطاء المجیب راشد کے بھتیجے، ڈاکٹر عطاالحبیب خالد کے پاس لیے چلتا ہوں جنہیں میں نے شاید اس زمانے میں دیکھا ہوگا جب وہ ''روٹی'' کو ''چوچی'' کہنے کی عمر میں تھے۔ دراصل ان کے والدِ بزرگوار انجمن کوارٹرز میں میرے بہنوئی قریشی سعید احمد اظہر کے پڑوسی تھے اور ان دونوں صاحبان کے بچوں کا آپس میں میل جول تھا۔ میں چونکہ سعید اظہر کے ہاں بکثرت جایا کرتا تھا لہٰذا آتے جاتے کہیں نہ کہیں عطاء الکریم شاہد سے بھی ٹاکرا ہو جاتا اور ان کے بچوں سے بھی لیکن سچ پوچھیں تو اس زمانے کی کوئی واضح تصویر میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر غلام احمد فرخ نے ان کا خاندانی حوالہ دے کر میرے لیے ان کے ساتھ رابطہ آسان بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک تعلیم الاسلام کالج میں پڑھتے رہے ہیں اور بی ایس سی کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۸۸ء میں فزکس میں ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی سے ایکسپیریمنٹل سیمی کنڈکٹر فزکس میں ایم ایس سی اور کِنگز کالج، لندن سے الیکٹرانک انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی۔ انہیں تعلیم الاسلام کالج؛ قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد؛ کِنگز کالج؛ یونیورسٹی آف گلاسگو اور فرانس کی ایک یونیورسٹی میں پڑھانے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ کِنگز کالج میں ریسرچ ایسوسی ایٹ رہنے کے علاوہ جے کے مائیکرو ٹیکنالوجی لمیٹڈ کے ریسرچ انجینئر؛ View Wave Technology Ltd. کے پراجیکٹ منیجر اور ۲۰۰۴ء سے یونیورسٹی آف گلاسگو میں ریسرچ فیلو ہیں۔

اب میں آپ کا تعارف ڈاکٹر محمد ظفر اللہ خان سے کرا رہا ہوں جو حساب دان، ڈاکٹر محمد ظفر اللہ سے مختلف اور ڈاکٹر محمد شریف خان، پروفیسر تعلیم الاسلام کالج کے صاحبزادے ہیں۔ وہ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج میں ایف ایس سی کے طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے بی ایس سی کا امتحان تو پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا لیکن ایم ایس سی پنجاب یونیورسٹی سے کی۔ ان کی ڈگری بائیوکیمسٹری اور مالیکیولر بائیالوجی میں تھی۔ بعد میں انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی سے ایم فِل اور پھر اپنے والدِ بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یونیورسٹی آف کیل، جرمنی کے انسٹیٹیوٹ آف زُوآلوجی سے نیوروسائنس میں پی ایچ ڈی کر لی۔ یہ نومبر ۱۹۹۹ء کی بات ہے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۸ء کے دوران پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر تحقیق میں مصروف رہے اور پھر دو سال تک ڈریکسل یونیورسٹی آف میڈیسن میں ریسرچ اسسٹنٹ پروفیسر اور ایک سال تک یونیورسٹی آف پینسلوینیا میں سینئر ریسرچ سائنٹسٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ وہ گزشتہ تین سال سے نارتھ ورجینیا کمیونٹی کالج کی ایڈجنکٹ فیکلٹی میں شامل ہیں۔ ہم جیسے عربی فارسی پڑھنے والوں کا ان کی فنی مہارت کی تفصیل میں نہ جانا ہی بہتر ہے۔ مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کم و بیش آٹھ تحقیقی مقالے، کچھ ریویو آرٹیکلز اور ایک بک چیپٹر بھی شائع ہو چکا ہے لیکن طبیعت میں انکسار ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں: میری یہ حیثیت کہاں کہ امریکہ جیسے معاشرے میں جہاں ریسرچ کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے میں کسی نمایاں مقام کا

حامل گردانا جاؤں۔

ڈاکٹر محمد ظفر اللہ خان کا ذکر تمام ہوا۔ اب آپ کی ملاقات تعلیم الاسلام کالج کے جس ہونہار طالب علم سے کرائی جا رہی ہے ان کا نام مرزا نصیر احمد ہے اور وہ مرزا خورشید احمد، ناظر اعلیٰ کے صاحبزادے ہیں۔ موصوف واقفِ زندگی ہیں اور آج کل بطور نائب ناظر تعلیم، صدر انجمن احمدیہ کام کر رہے ہیں۔ وہ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے جہاں سے بی ایس سی کرنے کے بعد انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے جیوفزکس میں ایم ایس سی کیا۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کی، ۲۰۰۱ء میں انہوں نے جاپان کی Sapporo Hokkaido University سے اَرتھ سائنسز میں پی ایچ ڈی کر لی۔ موصوف ایک قابل جیوفزِسٹ کی شہرت رکھتے ہیں اور بنکاک کی Citulalongorn University میں وِیزِیٹنگ سکالر اور لینڈ مارک گرافکس کے ساتھ سافٹ ویئر ٹیسٹنگ انیلسٹ اور جیوسائنس کنسلٹنٹ کے طور پر قطر اور نائیجیریا میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ ان کے بعض تحقیقی مقالہ جات سائنسی رسالہ جات میں شائع ہو چکے ہیں؛ وہ بہت سی کانفرنسوں میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں اور کئی جیوسائنس پراجیکٹس پر کام کر چکے ہیں۔ آج کل وہ نصرت جہاں کالج، ربوہ کے عبدالسلام سکول آف سائنسز کی ارتھ سائنس ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کے طور پر بھی کام کر رہے ہیں۔

قارئین کرام نے ابھی تک زیادہ تر ایسے احمدی دوستوں کا ذکر پڑھا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے سائنس کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے لہٰذا محاورۃً منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اب آپ کا تعارف ایک ایسے دوست سے کرایا جا رہا ہے جنہیں آپ نے ایم ٹی اے پر بارہا دیکھا ہوگا اور جن کے بعض اشعار شاید آپ کو پسند بھی آئے ہوں۔

مبارک صدیقی جو اباجی کے تایازاد بھائی، حضرت حکیم محمد صدیق، رفیق حضرت مسیح موعود کے پوتے؛ مجاہدِ اٹلی، عثمان صدیقی کے بھتیجے؛ اپنی زندگی کے آخری ایام جوہر ٹاؤن، لاہور میں گزارنے والے بشیر صدیقی کے صاحبزادے اور جماعتِ احمدیہ کے معروف شعراء میں شامل ہیں عرصۂ دراز سے انگلستان میں مقیم ہیں اور اپنے رنگ میں جماعتی خدمت میں مصروف ہیں۔ مشاعروں میں ان کا کلام شوق سے سنا جاتا ہے اور انہیں ایک سے زیادہ بار حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی موجودگی میں بھی اشعار سنانے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔

یوں تو مبارک صدیقی نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کے بہت سے اشعار قارئین کے ایک وسیع حلقہ میں پسند کئے جا رہے ہیں تاہم ان کی اپنی سب سے پسندیدہ نظم یہ حمد ہے:

اُس سے مانگ کے دیکھ کبھی اے مُورکھ سے انسان
جو کہ جل تھل کر سکتا ہے پیاس کے ریگستان
جس خورشید کو دیکھ کے پگھلیں برف کے بلتستان
جس کا وصل مٹا دیتا ہے ہجر کے راجھستان

ساری دنیا چھوڑ چھاڑ کے اس سے جا کے مل
رو رو اپنا حال سنا اور رکھ قدموں میں دل
پاؤں اس کے پڑ کے کہنا اے نُوروں کے نُور
جس نے کاٹے کشت ہزاروں میں ہوں وہ مزدور
گرتے پڑتے آیا ہوں میں گھائل چُور و چُور
کر دے گُھپ اندھیرے مجھ سے میلوں، صدیوں دُور
بخش دے مجھ کو دیکھ نہ میرا نامۂ اعمال
میرے ہاتھ نہ پلّے کچھ بھی ایسا ہوں کنگال
دُکھ کے ببّر شیر ہیں پیچھے بن جا میری ڈھال
پھر نہ دنیا مُڑ کے دیکھوں ایک نظر وہ ڈال
تیرے ہاتھ میں بخشش کے ہیں اربوں بحرِ ہند
رحمت کا اک چھِڑک وہ قطرہ جی اُٹھے یہ جند

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خواب سراب'' کے نام سے شائع ہوا تو انہوں نے اس کا ایک نسخہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی خدمت میں بھی پیش کیا جسے حضور نے مجموعی طور پر پسند فرمایا اور اپنے خط مرقومہ سترہ اپریل ۲۰۰۱ء میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے لکھا: ''آپ کا خط اور کتاب 'خواب سراب' ملی۔ آپ کا کلام جستہ جستہ میں نے پڑھا ہے۔ شاید ہی کوئی شعر ہو جو میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ میں اس کو پڑھ کر بہت ہی محظوظ ہوا ہوں۔ آپ کے بہت سے شعروں نے ایسی شمعیں جلا رکھی ہیں کہ میرے دل کے بجھے ہوئے دیئے بھی ان سے روشن ہوگئے اور بہت سے شعروں نے میری عمرِ رفتہ کو آواز دی جس کا ساز آپ کی نظموں نے چھیڑا۔ الغرض، بہت ہی پُر لطف کلام ہے۔ ماشاءاللہ۔''

مبارک صدیقی ہمارے ان دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے گریجوایشن تعلیم الاسلام کالج سے کی اور بعد میں اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ وہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک تعلیم الاسلام کالج کے طالب علم رہے۔

موصوف نے پاکستان میں احمدیوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے پیشِ نظر ۱۹۸۹ء میں ترکِ وطن کا فیصلہ کیا چنانچہ تیرہ احمدی افراد پر مشتمل ایک قافلے میں کسی ایجنٹ کی معرفت جرمنی کے لیے روانہ ہوئے لیکن شام میں پکڑے گئے اور انہیں بہت دنوں تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ بالآخر اللہ نے ان کی سن لی، وہ رہا ہوئے اور پاکستان واپس بھجوا دیئے گئے۔ انہوں نے یہاں آکر اس سفر کے حالات ''دوزخ سے جنت تک'' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں لکھے۔ اس عنوان میں ''دوزخ'' سے مراد ملک شام ہے جہاں انہیں کسی جرم کے بغیر ناقابلِ بیان اذیت سے گزرنا پڑا اور ''جنت'' سے مراد ان کا اپنا وطن پاکستان ہے جہاں

دیکھا جائے تو ہر راحت نصیب ہے۔

ہمارے یہ دوست آج کل تعلیم الاسلام کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، یو کے چیپٹر کے صدر ہیں۔ جب ان سے اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ سنانے کی فرمائش کی جائے تو وہ کہتے ہیں: یوں تو بہت سے واقعات ہیں جن کی اپنے اپنے سیاق و سباق میں بہت اہمیت ہے لیکن عبدالستار ایدھی کی مجھ سے ملاقات کی غرض سے میرے گھر اچانک آمد ایک ایسا واقعہ ہے جسے میں فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ عبدالستار ایدھی انسانیت کے بہت بڑے محسن تھے اور مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر مصیبت زدگان کی مدد زندگی بھر ان کا چلن رہا۔ انہوں نے ان بچوں کی بھی کفالت کی جنہیں ولدُ الزّنا گردان کر گردن زدنی کا مستحق قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور تو اور انہوں نے بیمار اور زخمی جانوروں کے لیے بھی پناہ گاہیں تعمیر کیں۔

مبارک صدیقی علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور میں واقع اپنے گھر میں عبدالستار ایدھی کی آمد کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتے ہیں: یہ ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ ایک روز نمازِ فجر کے بعد جب صبح کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا اچانک ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ ابا جی نے دروازہ کھولا۔ باہر کسی اجنبی سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی دیر بعد ابا جی حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ واپس آئے اور کہنے لگے کہ عبدالستار ایدھی تشریف لائے ہیں اور کہتے ہیں کہ مبارک صدیقی سے ملنا ہے۔ مجھ جیسے گمنام و بے ہنر کے لیے یہ ایک بے حد غیر متوقع بات تھی لیکن میں اپنی حیرت پر قابو پاتا ہوا باہر نکلا۔ بہت محبت سے ملے۔ ہم نے انہیں اندر بٹھایا۔ کہنے لگے: آپ کی کتاب ''دوزخ سے جنت تک'' کسی دوست نے تحفے میں دی تھی۔ میں پڑھ نہیں سکتا اس لیے عادت کے مطابق کتاب ایک طرف رکھ دی۔ گھر میں کسی اور نے یہ کتاب پڑھی اور پھر جستہ جستہ مجھے پڑھ کر سنائی۔ اس کتاب کی بعض باتیں دل کو ایسے لگیں کہ میں نے اسی وقت آپ سے ملاقات کا ارادہ کر لیا جو آج پورا ہو گیا ہے۔ غالباً ایک گھنٹہ ہمارے گھر تشریف فرما رہے۔ بکمالِ مہربانی ناشتہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔

''دوزخ سے جنت تک'' کے مصنف بتاتے ہیں: کوئی ایک مہینے بعد حیرت انگیز طور پر دوبارہ اسی طرح نمازِ فجر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دستک دینے والی ہستی بھی وہی تھی۔ اب سورج طلوع ہو چکا تھا چنانچہ انہیں دیکھ کر کئی راہگیر رک گئے اور ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک اخباری نمائندہ بھی ہمارے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور بار بار دروازہ پیٹنے لگا۔ اس وقت مجھے جو خوشی تھی میں الفاظ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ ہم نے ناشتہ تیار کیا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کی محبت و عنایت اور شفقت کا معترف ہوں لیکن ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ بعد میں آپ کو یا آپ کی شہرت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور وہ یہ کہ میرا مسلک آپ کے مسلک سے جدا ہے۔ میری بات سن کر مسکرائے، اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے کہ میں ایسی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ پھر فرمانے لگے: میرا کام، میرا مشن، میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف انسانیت کی خدمت ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ اگر سڑک پر کوئی زخمی پڑا ہو تو کیا میں اس سے یہ

پوچھوں کہ تمہارا مذہب یا مسلک کیا ہے یا اسے ہسپتال پہنچاؤں۔ پھر انہوں نے ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ اگر تم سے بھی کوئی بھوکا کھانا مانگے یا بے امان پناہ کی درخواست کرے یا مشکل میں گرفتار شخص مدد طلب کرے تو کبھی اس سے اس کا مذہب یا مسلک نہ پوچھنا۔

عبدالستار ایدھی اس کے بعد بھی دو یا تین مرتبہ مبارک صدیقی کے گھر آئے لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ مبارک صدیقی کی شاعری ہو یا عبدالستار ایدھی کی خدماتِ انسانیہ، یہ باتیں تو کبھی ختم نہ ہونے والی ہیں لہٰذا ان ملاقاتوں کی تفصیل چھوڑتے ہوئے اب میں ایک اور دوست کا ذکرِ خیر کرنا چاہتا ہوں جن کا نام صلاح الدین تھا اور جو مولانا امام الدّین، مربی سلسلہ متعیّنہ انڈونیشیا کے صاحبزادے تھے۔

ڈاکٹر احسان اللہ ہاشمی کی روایت کے مطابق انہوں نے ۱۹۷۵ء میں تعلیم الاسلام کالج سے بی ایس سی اور گورنمنٹ کالج، لاہور سے زوآلوجی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد انگلستان کی کسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور پھر پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ کے لیے امریکہ چلے گئے جہاں وہ دمِ آخر تک مقیم رہے۔

اگرچہ میں نے ڈاکٹر صلاح الدین کو اُس وقت دیکھا تھا جب وہ تحریکِ جدید کوارٹرز میں مقیم تھے اور غالباً سکول میں پڑھتے ہوئے لیکن میرا ان سے براہِ راست تعارف یا رابطہ نہ تھا لہٰذا چند ماہ پہلے ڈاکٹر محمد شریف خان کے ذریعہ ان کا فون نمبر حاصل کر کے میں نے ان سے اپنے تعلیمی کیریئر اور عملی زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا مگر ایک دو یاددہانیوں کے باوجود اس معاملہ میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اب میں انہیں نئے سرے سے یاددہانی کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ان کی اچانک وفات کی خبر سن لی۔ سنا ہے دل کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ ہسپتال بھی نہ پہنچائے جا سکے۔

ان کے دوست احباب بتاتے ہیں کہ وہ اپنی ضعیف والدہ کی خدمت اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے تھے۔ مخلص احمدی تھے چنانچہ گزشتہ کئی سال سے جلسہ سالانہ امریکہ کے موقع پر لنگر خانہ ان ہی کی نگرانی میں کام کرتا تھا اور وہ جماعتی اخراجات میں وہی کفایت ملحوظ رکھتے جو ایک سگھڑ خاتون اپنے گھریلو اخراجات میں مدنظر رکھتی ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

اب تک صرف اُن دوستوں کا ذکرِ خیر کیا جا رہا تھا جنہیں تعلیم الاسلام کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے شعبوں میں قدرے نمایاں کارکردگی کی توفیق عطا فرمائی۔ اب ذکر کرنا مقصود ہے اُس ادارے کا جس کی بنیاد حضرت مسیح موعود کے مقدس ہاتھوں سے انیسویں صدی کے آخر میں رکھی گئی۔ یہ ادارہ جو اَب جامعہ احمدیہ کہلاتا ہے اور دنیا کے مختلف ملکوں میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے ایسے مجاہدین کی تیاری میں مصروف ہے جو احمدیت کا پیغام اکنافِ عالم میں پہنچا سکیں۔

اس سے پہلے کہ تقسیمِ برصغیر پاک و ہند کے نتیجے میں اس ادارے کو پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس کی تاریخ بیان کر دی جائے۔

جامعہ احمدیہ اور بعض واقفینِ زندگی

میں سچ کہہ دوں کہ جس نے اِک جہاں کا رنگ بدلا تھا: یہاں کی خاک میں پنہاں وہی سوزِ جلالی ہے

حضرت مسیح موعود کو اللہ تعالیٰ نے بار بار الہاماً خبر دی تھی کہ وہ آپ کو بہت عظمت عطا فرمائے گا اور آپ کی محبت دلوں میں بٹھائے گا اور آپ کے سلسلے کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر آپ کے فرقہ کو غالب کرے گا۔ آپ کو بتایا گیا تھا کہ آپ کے فرقے کے لوگ علم اور معرفت میں اس قدر کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پُھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جاوے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہونے سے پہلے بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور اِبتلا آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اٹھا دے گا اور اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ خدا نے آپ کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔

اس عظیم الشان خوشخبری کو پورا ہوتا دیکھنے کے لیے آپ نے یہ مناسب دیکھا کہ بالفعل قادیان میں ایک مڈل سکول قائم کیا جائے اور علاوہ تعلیم انگریزی کے ایک حصہ تعلیم کا وہ کتابیں رکھی جائیں کہ جو آپ کی طرف سے اس غرض سے تالیف ہوں گی کہ مخالفوں کے تمام اعتراضات کا جواب دے کر بچوں کو دینِ حق کی خوبیاں سکھلائی جائیں اور مخالفوں کے عقیدوں کا بے اصل اور باطل ہونا سمجھایا جائے۔ آپ کا خیال تھا کہ اس طریق سے ذُرّیت نہ صرف مخالفوں کے حملوں سے محفوظ رہے گی بلکہ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ حق کے طالب سچ کی روشنی دینِ حق میں پا کر باپوں اور بیٹوں اور بھائیوں کو دینِ حق کے لیے چھوڑ دیں گے۔

تاریخِ احمدیت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضور کی اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے، مدرسہ کے انتظامی امور طے کرنے اور قواعد وضوابط کی تشکیل کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر حضرت حکیم مولوی نورالدین تھے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں مدرسہ کا افتتاح ۳ جنوری ۱۸۹۸ء کو ہوا اور کسی موزوں عمارت کی عدم موجودگی میں اس کا آغاز مہمان خانہ میں کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حضرت نواب محمد علی مالیرکوٹلہ سے ہجرت کر کے قادیان تشریف لے آئے تو حضرت مسیح موعود نے مدرسہ کا جملہ انتظام ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے یہ قومی خدمت نہایت ذوق وشوق سے انجام دی چنانچہ یہ مدرسہ جس کا آغاز پرائمری سے ہوا تھا اسی سال مڈل، ۱۹۰۰ء میں ہائی سکول اور اس کے تین سال بعد کالج کے درجہ تک پہنچ گیا۔

گیارہ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو حضرت مولوی عبدالکریم سیالکوٹی اور ان کے دو ماہ بعد یعنی ۳ دسمبر ۱۹۰۵ء کو

حضرت مولوی برہان الدّین جہلمی کی وفات ہوگئی۔ ہر دو رفقا حضرت مسیح موعود کے نزدیک ایک خاص مقام کے حامل تھے چنانچہ آپ نے حضرت مولوی عبدالکریم کی وفات پر فرمایا کہ: ''وہ سلسلہ کی محبت میں بالکل محو تھے......ان کو ہمارے ساتھ ایک پورا اتحاد اور پوری موافقت حاصل تھی......ان کا خاتمہ قابلِ رشک ہوا کیوں کہ ان کے ساتھ دنیا کی ملونی نہ تھی۔'' اسی طرح حضرت مولوی برہان الدّین جہلمی کے متعلق فرمایا: ''ان کی طبیعت میں حق کے لیے ایک سوزش اور جلن تھی۔ مجھ سے قرآن شریف پڑھا۔ بائیس برس سے میرے پاس آتے جاتے تھے......میرے ساتھ بڑی محبت رکھتے تھے۔''

ان دونوں بزرگوں کی وفات سے جماعت میں جو خلا پیدا ہوا اس سے حضرت اقدس کو بہت تشویش ہوئی اور حضور کا ذہن خدائی تصرف کے تحت اس طرف منتقل ہوا کہ جماعت میں قادرالکلام اور دین کی خدمت کرنے والے علماء پیدا کرنے کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہئے چنانچہ حضور نے اپنے رفقا سے مشورے کے بعد اس مدرسہ کے اندر دینیات کی ایک شاخ کھولنے کا فیصلہ کرلیا۔ شاخِ دینیات جنوری ۱۹۰۶ء میں کھل گئی اور اسی شاخ کے قیام سے مدرسہ احمدیہ کی بنیاد پڑی۔

۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو حضرت مسیح موعود رحلت فرما گئے اور اس سے اگلے ہی روز حضرت حکیم مولوی نورالدین قدرتِ ثانیہ کے پہلے مظہر کے طور پر منتخب ہوئے۔ آپ نے اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں ہی اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ چونکہ حضرت مسیح موعود کی شدید خواہش ایک دینی مدرسہ کے قیام کی تھی لہٰذا مدرسہ تعلیم الاسلام کے علاوہ الگ انتظام کے تحت ایک مدرسہ دینی علوم کے لیے بھی قائم کیا جائے۔ اگرچہ بعض احباب کی طرف سے اس تجویز کی مخالفت ہوئی مگر بالآخر یکم مارچ ۱۹۰۹ء کو یہ مدرسہ قائم ہوگیا اور حضرت مولوی شیر علی کی تجویز پر اس کا نام ''مدرسہ احمدیہ'' قرار پایا۔ اس کے اوّلین ہیڈ ماسٹر حضرت سیّد محمد سرور شاہ مقرر ہوئے۔

اس مدرسہ کو کئی طرح کے انتظامی مسائل درپیش تھے چنانچہ صاحبزادہ مرزا بشیرالدین محمود احمد کل وقتی ''افسرِ مدرسہ احمدیہ'' مقرر ہوئے۔ آپ نے ستمبر ۱۹۱۰ء سے مارچ ۱۹۱۴ء تک یہ ذمہ داری نبھائی۔ مولانا دوست محمد شاہد مؤلف ''تاریخِ احمدیت'' کے الفاظ میں ''آپ کا دور مدرسہ احمدیہ کی تاریخ میں ایک سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔ آپ سے قبل مدرسہ ناقص حالت میں تھا مگر آپ کے آتے ہی اس کی قسمت جاگ اٹھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی کایا پلٹ گئی۔'' مارچ ۱۹۱۴ء میں جب آپ مسندِ خلافت پر متمکّن ہوئے تو مدرسہ کا انتظام حضرت مرزا بشیر احمد نے سنبھال لیا اور ۱۹۱۹ء تک اسے بخوبی سرانجام دیتے رہے۔

۲۰ مئی ۱۹۲۸ء کو ''جامعہ احمدیہ'' کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کیا گیا۔ صدر انجمن احمدیہ کے وضع کردہ قواعد کے مطابق جامعہ میں داخلہ کے لیے مولوی فاضل پاس ہونے کی شرط لگا دی گئی جو مدرسہ احمدیہ کے طلبہ کے لیے گویا آخری امتحان تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے جامعہ احمدیہ کے افتتاح کے موقع پر فرمایا: ''جامعہ کے طلبہ کو ایک ہی مقصد اپنی زندگی کا قرار دینا چاہئے اور وہ (پیغامِ حق) ہے۔ خواہ عمل کے کسی میدان میں جائیں، کوئی کام کریں، اپنے حلقہ میں (پیغامِ حق) کو نہ بھولیں۔''

۱۹۴۷ء کی موسمی تعطیلات تک جامعہ احمدیہ اور مدرسہ احمدیہ قادیان میں بخیر وخوبی جاری رہے مگر تعطیلات کے بعد بیشتر طلبہ فسادات کی وجہ سے گھروں سے واپس نہ آسکے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی قادیان سے لاہور ہجرت کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو قادیان میں باقی رہ جانے والے جامعہ احمدیہ اور مدرسہ احمدیہ کے اساتذہ وطلبہ لاہور آ گئے اور اسی مہینے کی ۱۳ تاریخ کو یہ دونوں ادارے وہاں جاری کر دیئے گئے۔ لاہور میں جگہ کی تنگی کے باعث جلد ہی یہ ادارے چنیوٹ منتقل کر دیئے گئے مگر وہاں بھی ان کے لیے مناسب عمارت میسر نہ آسکی چنانچہ جلد ہی دونوں اداروں کو مدغم کر کے احمد نگر منتقل کر دیا گیا اور مولانا ابوالعطاء جالندھری اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

جیسا کہ ''قریۂ جاوداں'' میں ذکر ہو چکا ہے قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر قریباً ڈھائی سال تھی اس لیے میں ذاتی طور پر ان میں سے کسی واقعے کا بھی شاہد نہیں تاہم جامعہ احمدیہ کے اُس زمانے کے بہت سے طالب علم میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ ان میں سے مولانا محمد اجمل شاہد، سیّد کمال یوسف، حکیم نذیر احمد ریحان، عبدالباسط شاہد، عبدالسّلام ظافر، محمد اکبر افضل، منیرالدین احمد، میر غلام احمد نسیم، جمیل الرحمٰن رفیق، لئیق احمد طاہر، عزیز الرحمٰن خالد، ڈاکٹر محمد جلال شمس اور منصور احمد عمر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میں نے میر غلام احمد نسیم اور منیرالدین احمد کے علاوہ کہ ان کی بعض تصنیفات میں جامعہ کے کچھ حالات پہلے سے چھپے ہوئے موجود ہیں باقی تمام دوستوں سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے زمانے کے جامعہ کے حالات سنائیں۔ ان میں سے اکثر نے زبانی مجھے اپنے اپنے زمانے کے بعض دلچسپ واقعات سنائے اور چند دوستوں نے اس دور کے کچھ حالات لکھ کر بھجوائے۔

یہ درست ہے کہ میں کبھی جامعہ احمدیہ کا طالب علم نہیں رہا لیکن ربوہ کا مستقل باسی ہونے کے ناتے میں اس کے بہت سے اساتذہ علی الخصوص سیّد میر داوٗد احمد، سیّد میر محمود احمد ناصر، مرزا رفیع احمد، مولانا ابوالعطا جالندھری، مولوی عبداللطیف بہاولپوری، قاضی محمد نذیر لائلپوری، صاحبزادہ ابوالحسن قدسی، خان ارجمند خان، مولوی ظہور حسین، ماسٹر غلام حیدر، مولوی عطاء الرحمٰن طالب، ملک سیف الرحمٰن، ڈاکٹر نذیر احمد ریاض، مولوی ابوالمنیر نورالحق، مولانا محمد احمد جلیل، مولانا غلام باری سیف، حکیم خورشید احمد شاد، پیر معین الدین، قریشی نورالحق تنویر، مولانا محمد احمد ثاقب، شیخ نور احمد منیر، ملک مبارک احمد، چوہدری محمد شریف، قریشی مقبول احمد، عبدالرزاق پی ٹی آئی اور بعض دیگر دوستوں سے متعارف تھا۔ اگرچہ میں ان میں سے کسی کے ساتھ دوستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن اباجی کے ساتھ ان کے تعلقات کی وجہ سے میں ان کے متعلق کچھ ایسی باتوں سے بھی واقف تھا جو شاید ان کے بعض قریبی دوست بھی نہ جانتے ہوں۔ اب ان میں سے اکثر بزرگان وفات پا چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔ جو باقی ہیں خدا تعالیٰ انہیں کام والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔

میں یہ ذکر کئے بنا بھی نہیں رہ سکتا کہ میرے بہت سے عزیز جامعہ احمدیہ سے فارغ التحصیل تھے۔ دُور کیا جانا اباجی مدرسہ احمدیہ میں پڑھتے رہے تھے اور انہوں نے ۱۹۲۹ء میں یہیں سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا

تھا۔ چچا ابراہیم اور کرم الٰہی ظفر جو میری تایازاد ہمشیرہ کے شوہر تھے جامعہ کے باضابطہ طالب علم تو نہ رہے تھے مگر اُنہیں علی الترتیب ہنگری اور سپین میں جماعت احمدیہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ میرے بہنوئی، قریشی سعید احمد اظہر جامعہ احمدیہ کے سابق طالب علم تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ میں گزرے ہوئے وقت یا عملی زندگی کے تجربات کے متعلق بات ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ ایک مربی کو اپنا تربیتی عرصہ مکمل کرنے کے بعد میدانِ عمل میں کس طرح کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

یہاں یوں ہی ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ جن دنوں جامعہ احمدیہ ربوہ کی پختہ عمارت (جو اَب جامعہ احمدیہ سینئر کے نام سے موسوم ہے) زیرِ تعمیر تھی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ہم چھٹی کے وقت سکول سے نکلتے تو اس زیرِ تعمیر عمارت کے پاس سے گزرتے۔ گرمیوں میں ربوہ کی دھوپ ناقابلِ برداشت ہوتی چنانچہ ہم کئی بار ستانے کی خاطر اس عمارت میں بیٹھ جاتے۔ بعض دفعہ تو وہیں سکول کا کام شروع کر دیتے اور پھر آرام کے بعد اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوتے۔ یہ ایک دلچسپ دور تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری اس زمانے کی یادیں جامعہ کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے عرض کروں گا کہ اجمل شاہد جو حضرت منشی سربلند خان، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور سلسلے کے پرانے خدّام میں سے ہیں قیامِ پاکستان کے وقت مدرسہ احمدیہ سے فراغت کے بعد جامعہ میں داخلے کی تیاری کر رہے تھے۔ یوں انہیں قادیان، لاہور، چنیوٹ اور پھر احمد نگر میں جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ ۱۹۵۲ء میں یہاں سے فارغ ہوئے اور اس طرح انہیں جامعہ کا وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

جامعہ سے فراغت کے بعد انہوں نے ایک طویل عرصہ سابقہ مشرقی پاکستان، پشاور اور کراچی میں بطور مربی گزارا۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں نائیجیریا بھجوایا گیا جہاں وہ لمبا عرصہ مشنری انچارج اور امیر جماعت احمدیہ، نائیجیریا کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پچھلے کئی سال سے وہ امریکہ میں ہیں۔ موصوف جامعہ کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ اب جامعہ احمدیہ، ربوہ کے لیے دو نہایت وسیع و عریض عمارات تعمیر ہو چکی ہیں جن میں سے ایک جامعہ کی جونیئر کلاسز کے لیے مختص ہے تو دوسری سینئر کلاسز کے لیے۔ وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اب تو دنیا کے مختلف ممالک میں اسی نام کے کئی ادارے قائم ہو چکے ہیں جہاں ان علاقوں کے طلبہ داخل ہو کر علومِ دین سیکھ رہے ہیں تاہم پاکستان میں اس کا آغاز انتہائی غریبانہ تھا اور اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی یہاں کے دیہاتی سرکاری سکولوں کی ہوتی ہے بلکہ شاید اس سے بھی بدتر۔ تعلیم کے لیے ضروری لوازمات یعنی پڑھنے کے لیے کتب اور بیٹھنے کے لیے فرنیچر تک مفقود تھا اور کھانے کے لیے محض قُوتِ لایمُوت میسر تھی۔

وہ بتاتے ہیں: یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں جامعہ ربوہ کے دائیں بائیں دو مختلف مقامات پر رہا۔ ابتداءً لاہور میں شروع ہونے کے بعد جلد ہی چنیوٹ منتقل ہو گیا کیونکہ وہاں کچھ متروکہ جائیداد دستیاب

تھی لیکن گڑھا محلّہ کی یہ عمارات بعض رہائشی مکانات پر مشتمل تھیں اور کسی تعلیمی ادارے کے لیے ہرگز موزوں نہ تھیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہائش پذیر تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قلت تھی۔ آپ یقین کریں کہ اس زمانے میں ہر طالب علم کو ایک وقت میں صرف ایک روٹی ملا کرتی تھی لیکن آٹے میں مٹی کی آمیزش کی وجہ سے اسے بھی چبانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہم اسے بالعموم نِگلا کرتے تھے۔ ایک روٹی سے بھوک پوری طرح نہ مٹتی چنانچہ ہم مُولیاں اور گاجریں کھا کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔

چنیوٹ میں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہا کرتے ہیں: وہاں پر جامعہ کا آغاز ایک بہت ہی مختلف ماحول میں ہوا تھا۔ چنیوٹ کے لوگ اپنی زبان، کلچر اور رہن سہن میں قادیان کے کلچر سے بالکل مختلف تھے لہٰذا کئی دفعہ ہمارا جی چاہتا کہ ہم شہر اور اردگرد کی دیہاتی زندگی دیکھیں چنانچہ ہم بعض اوقات شام کے وقت مختلف جہات میں نکل جاتے۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ایک حویلی میں سے دھوَاں نکل رہا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہاں گڑ بن رہا ہوگا چنانچہ ہم اس طرف چل پڑے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کا نام عبداللہ گجراتی تھا۔ اس نے ہمیں خبردار کیا کہ ایسی جگہوں پر عام طور پر کتے ضرور ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی کتا حملہ آور ہو جائے تو اس سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے ہمیں اسی جگہ بیٹھ جانا چاہیے، کتا حملہ نہیں کرے گا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے جب ہم حویلی کے قریب پہنچے تو ایک کتا اچانک ہماری طرف لپکا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا نشانہ عبداللہ ہی بنا۔ اب عبداللہ نے دوڑ لگا دی اور کتا اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہم کھڑے چلاّ رہے تھے: ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' لیکن وہ بجائے بیٹھنے کے بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا اور کتا تھا کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہم نے پریشانی میں حویلی کے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا چنانچہ ایک نوجوان نے کسی طرح اس کتے کو قابو کیا اور یوں عبداللہ کی جان چھوٹی۔ جب حالات معمول پر آئے تو ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ کتے کے حملے کے وقت بیٹھنے کی بجائے بھاگ کیوں کھڑا ہوا تھا تو اس نے برجستہ کہا: خدا کی قسم! بدحواسی میں مجھے آپ کی بات ہی سمجھ نہیں آئی نہ یہ یاد آیا کہ ایسے موقع پر بیٹھ جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کئی دن تک طلبہ کے درمیان ہنسی مذاق کا موضوع بنا رہا۔

چند ماہ چنیوٹ میں گزارنے کے بعد جامعہ کو احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اجمل شاہد کہتے ہیں: مجھے یاد ہے ایک روز ہمارے پرنسپل، مولانا ابوالعطا جالندھری نے صبح کی اسمبلی میں ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جامعہ کو چنیوٹ سے احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے وہاں پر ضروری عمارات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ وہاں پر طلبہ کو رہائش کی قدرے بہتر سہولتیں حاصل ہوں گی اور امید ظاہر کی کہ وہ احمد نگر کی کھلی آب و ہوا کو پسند کریں گے۔

موصوف اس سفر کی داستان سناتے ہوئے کہتے ہیں: اس وقت تک کم از کم میں نے احمد نگر نہیں دیکھا تھا لہٰذا میرے لیے یہ تصور کرنا آسان نہ تھا کہ وہاں منتقل ہونے میں طلبہ کے لیے کیا فوائد مضمر ہیں تاہم انتظامیہ کے حکم کے تحت جامعہ کے تمام طلبہ چنیوٹ سے پیدل احمد نگر کے لیے روانہ ہو گئے جو وہاں سے کم و بیش دس میل

تا۔ چچا ابراہیم اور کرم الٰہی ظفر جو میری تایازاد ہمشیرہ کے شوہر تھے جامعہ کے باضابطہ طالب علم تو نہ رہے تھے مگر اُنہیں علی الترتیب ہنگری اور سپین میں جماعت احمدیہ کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ میرے بہنوئی، قریشی سعید احمد اظہر جامعہ احمدیہ کے سابق طالب علم تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ میں گزرے ہوئے وقت یا عملی زندگی کے تجربات کے متعلق بات ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ ایک مربی کو اپنا تربیتی عرصہ مکمل کرنے کے بعد میدانِ عمل میں کس طرح کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

یہاں یوں ہی ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ جن دنوں جامعہ احمدیہ ربوہ کی پختہ عمارت (جو اَب جامعہ احمدیہ سینئر کے نام سے موسوم ہے) زیرِ تعمیر تھی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ہم چھٹی کے وقت سکول سے نکلتے تو اس زیرِ تعمیر عمارت کے پاس سے گزرتے۔ گرمیوں میں ربوہ کی دھوپ ناقابلِ برداشت ہوتی چنانچہ ہم کئی بار ستانے کی خاطر اس عمارت میں بیٹھ جاتے۔ بعض دفعہ تو وہیں سکول کا کام شروع کر دیتے اور پھر آرام کے بعد اپنے گھروں کے لیے روانہ ہوتے۔ یہ ایک دلچسپ دور تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میری اس زمانے کی یادیں جامعہ کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔

اب میں اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے عرض کروں گا کہ اجمل شاہد جو حضرت منشی سربلند خان، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور سلسلے کے پرانے خدّام میں سے ہیں قیامِ پاکستان کے وقت مدرسہ احمدیہ سے فراغت کے بعد جامعہ میں داخلے کی تیاری کر رہے تھے۔ یوں انہیں قادیان، لاہور، چنیوٹ اور پھر احمد نگر میں جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ ۱۹۵۲ء میں یہاں سے فارغ ہوئے اور اس طرح انہیں جامعہ کا وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

جامعہ سے فراغت کے بعد انہوں نے ایک طویل عرصہ سابقہ مشرقی پاکستان، پشاور اور کراچی میں بطور مربی گزارا۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں نائیجیریا بھجوایا گیا جہاں وہ لمبا عرصہ مشنری انچارج اور امیر جماعت احمدیہ، نائیجیریا کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پچھلے کئی سال سے وہ امریکہ میں ہیں۔ موصوف جامعہ کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اب جامعہ احمدیہ، ربوہ کے لیے دو نہایت وسیع وعریض عمارات تعمیر ہو چکی ہیں جن میں سے ایک جامعہ کی جونیئر کلاسز کے لیے مختص ہے تو دوسری سینئر کلاسز کے لیے۔ وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کرتے ہیں کہ اب تو دنیا کے مختلف ممالک میں اسی نام کے کئی ادارے قائم ہو چکے ہیں جہاں ان علاقوں کے طلبہ داخل ہو کر علومِ دین سیکھ رہے ہیں تاہم پاکستان میں اس کا آغاز انتہائی غریبانہ تھا اور اس کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی یہاں کے دیہاتی سرکاری سکولوں کی ہوتی ہے بلکہ شاید اس سے بھی بدتر۔ تعلیم کے لیے ضروری لوازمات یعنی پڑھنے کے لیے کتب اور بیٹھنے کے لیے فرنیچر تک مفقود تھا اور کھانے کے لیے محض قُوتِ لایموت میسر تھی۔

وہ بتاتے ہیں: یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں جامعہ ربوہ کے دائیں بائیں دو مختلف مقامات پر رہا۔ ابتداءً لاہور میں شروع ہونے کے بعد جلد ہی چنیوٹ منتقل ہو گیا کیونکہ وہاں کچھ متروکہ جائیداد دستیاب

تھی لیکن گڑھا محلّہ کی یہ عمارات بعض رہائشی مکانات پر مشتمل تھیں اور کسی تعلیمی ادارے کے لیے ہرگز موزوں نہ تھیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں طلبہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہائش پذیر تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قلت تھی۔ آپ یقین کریں کہ اس زمانے میں ہر طالب علم کو ایک وقت میں صرف ایک روٹی ملا کرتی تھی لیکن آٹے میں مٹی کی آمیزش کی وجہ سے اسے بھی چبانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہم اسے بالعموم نگلا کرتے تھے۔ ایک روٹی سے بھوک پوری طرح نہ مٹتی چنانچہ ہم مُولیاں اور گاجریں کھا کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔

چنیوٹ میں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہا کرتے ہیں: وہاں پر جامعہ کا آغاز ایک بہت ہی مختلف ماحول میں ہوا تھا۔ چنیوٹ کے لوگ اپنی زبان، کلچر اور رہن سہن میں قادیان کے کلچر سے بالکل مختلف تھے لہٰذا کئی دفعہ ہمارا جی چاہتا کہ ہم شہر اور اردگرد کی دیہاتی زندگی دیکھیں چنانچہ ہم بعض اوقات شام کے وقت مختلف جہات میں نکل جاتے۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ایک حویلی میں سے دھؤاں نکل رہا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہاں گڑ بن رہا ہوگا چنانچہ ہم اس طرف چل پڑے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کا نام عبداللہ گجراتی تھا۔ اس نے ہمیں خبردار کیا کہ ایسی جگہوں پر عام طور پر کتے ضرور ہوتے ہیں لہٰذا اگر کوئی کتا حملہ آور ہو جائے تو اس سے ڈر کر بھاگنے کی بجائے ہمیں اسی جگہ بیٹھ جانا چاہیے، کتا حملہ نہیں کرے گا۔ یوں ہی باتیں کرتے کرتے جب ہم حویلی کے قریب پہنچے تو ایک کتا اچانک ہماری طرف لپکا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا نشانہ عبداللہ ہی بنا۔ اب عبداللہ نے دوڑ لگا دی اور کتا اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہم کھڑے چلاّ رہے تھے: ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' ''عبداللہ بیٹھ جاؤ!'' لیکن وہ بجائے بیٹھنے کے بھاگتا ہی چلا جا رہا تھا اور کتا تھا کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہم نے پریشانی میں حویلی کے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا چنانچہ ایک نوجوان نے کسی طرح اس کتے کو قابو کیا اور یوں عبداللہ کی جان چھوٹی۔ جب حالات معمول پر آئے تو ہم نے اس سے پوچھا کہ وہ کتے کے حملے کے وقت بیٹھنے کی بجائے بھاگ کیوں کھڑا ہوا تھا تو اس نے برجستہ کہا: خدا کی قسم! بدحواسی میں مجھے آپ کی بات ہی سمجھ نہیں آئی نہ یہ یاد آیا کہ ایسے موقع پر بیٹھ جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کئی دن تک طلبہ کے درمیان ہنسی مذاق کا موضوع بنا رہا۔

چند ماہ چنیوٹ میں گزارنے کے بعد جامعہ کو احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اجمل شاہد کہتے ہیں: مجھے یاد ہے ایک روز ہمارے پرنسپل، مولانا ابوالعطا جالندھری نے صبح کی اسمبلی میں ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جامعہ کو چنیوٹ سے احمد نگر منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے وہاں پر ضروری عمارات حاصل کر لی گئی ہیں۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ وہاں پر طلبہ کو رہائش کی قدرے بہتر سہولتیں حاصل ہوں گی اور امید ظاہر کی کہ وہ احمد نگر کی کھلی آب و ہوا کو پسند کریں گے۔

موصوف اس سفر کی داستان سناتے ہوئے کہتے ہیں: اس وقت تک کم از کم میں نے احمد نگر نہیں دیکھا تھا لہٰذا میرے لیے یہ تصور کرنا آسان نہ تھا کہ وہاں منتقل ہونے میں طلبہ کے لیے کیا فوائد مضمر ہیں تاہم انتظامیہ کے حکم کے تحت جامعہ کے تمام طلبہ چنیوٹ سے پیدل احمد نگر کے لیے روانہ ہو گئے جو وہاں سے کم وبیش دس میل

کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک طویل سفر تھا تاہم اس وقت جوانی کا عالم تھا لہٰذا ہم ہنستے کھیلتے، پیدل منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ رہا ہمارا سامان تو وہ حسبِ وعدہ کسی سواری کے ذریعے الگ سے وہاں پہنچا۔

وہ کہتے ہیں: اس بات پر پینسٹھ سال گزر رہے ہیں اور اس عرصے میں علاقے کا نقشہ بدل چکا ہے تاہم اس زمانے میں اس راستے پر آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ دریائے چناب کا دوسرا پل عبور کیا تو وہ صحرا شروع ہو گیا جہاں بعد میں مرکزِ احمدیت آباد ہوا۔ سڑک کے دونوں طرف وادیٔ غیر ذی زرع میں شورے کی اک چادر بچھی ہوئی تھی اور سبزہ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ شومیٔ قسمت، راستے میں ہمیں سرخ آندھی نے آلیا۔ یہ گرد وغبار کا ایک نہ تھمنے والا طوفان تھا جو نہ جانے کتنی دیر چلتا رہا۔ ہمارا منہ، سر اور آنکھیں مٹی سے بھر گئیں۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم نے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں لیکن آندھی اتنی تیز تھی کہ بہت سے طلبہ کی ٹوپیاں اُڑ گئیں اور وہ ننگے سر احمد نگر پہنچے۔ ہم لوگ پیدل اتنے لمبے سفر کے عادی نہ تھے لہٰذا احمد نگر پہنچتے پہنچتے ہم شدید تھک گئے۔ ہماری بھوک بھی جوبن پر تھی۔ انتظامیہ کو ہماری کیفیت کا اندازہ تھا چنانچہ اس شام کھانا وافر مقدار میں تیار کرایا گیا تھا اور اجازت دی گئی کہ ہر آدمی اپنی بھوک کے مطابق جتنا جی چاہے کھانا کھا سکتا ہے۔ عرصۂ دراز کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

اس سوال کے جواب میں کہ احمد نگر میں منتقلی سے طلبہ کو اپنے حالات میں کیا تبدیلی محسوس ہوئی اجمل شاہد بتاتے ہیں: اگرچہ احمد نگر میں رہائشی سہولتیں قدرے بہتر تھیں مگر کھانے پینے کی اشیاء کی قلت بدستور رہی۔ اُن دنوں دریائے چناب کے اردگرد جنگلی کبوتر بکثرت پائے جاتے تھے۔ بعض طلبہ نے اپنی بھوک مٹانے کے لیے انہیں شکار کرنا شروع کر دیا۔ یہ کبوتر رات دریائے چناب کے پُل میں گزارتے تھے۔ جامعہ کے ایک طالب علم جو نظام الدین مہمان کہلاتے تھے اور جن کا تعلق کشمیر سے تھا کو اس پُل پر چڑھنے کا فن خوب آتا تھا۔ ہم ہر ہفتہ دس دن کے بعد دریا پر چلے جاتے، وہ اپنی شلوار کے پائینچے کسی رسی سے باندھ کر اوپر چڑھ جاتے اور کبوتر پکڑ پکڑ کر شلوار میں ڈالتے جاتے۔ رات کے وقت جب کبوتر سوئے ہوتے نظام الدین انہیں بہ آسانی دبوچ لیتے اور شلوار کے اندر ڈال کر نیچے اتر آتے۔ پھر وہ کبوتروں کو ذبح کرتے۔ خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اس بیابان میں ہمارے لیے یہ من وسلویٰ اتارا ہے لہٰذا ہمیں اس نعمت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اجمل شاہد بتاتے ہیں: ہوسٹل میں طلبہ کی شرارتیں جاری رہتیں۔ ایک دفعہ کوئی شخص شہد بیچنے کے لیے آیا تو ایک طالب علم نے خرید لیا۔ یہ بات کچھ طلبہ کے علم میں آ گئی اور وہ چوری چوری یہ شہد کھانے میں کامیاب ہو گئے لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ شرارت کے سرغنہ کو یہ چوری راس نہ آئی۔ شاید اس نے کچھ زیادہ ہی شہد کھا لیا تھا۔ اس پر اسہال کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ اسے جان کے لالے پڑ گئے۔ جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو طلبہ نے اس کا خوب خوب مذاق اڑایا۔

اُس زمانے کو یاد کرتے ہوئے اجمل شاہد کہا کرتے ہیں: اُن دنوں بجلی کا تو تصور ہی نہ تھا چنانچہ موسم کی

شدت کی وجہ سے کمروں میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ سڑک کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں کلاسز منعقد ہوں۔ طلبہ کے بیٹھنے کے لیے ارضُ اللہ بہت وسیع تھی۔ ہم نے ان ہی مشکل حالات میں مولوی فاضل کا امتحان دیا۔

مقامی لوگوں کے ساتھ جامعہ کے طلبہ کے روابط کا ذکر ہو تو اجمل شاہد برجستہ جواب دیتے ہیں: شروع میں مقامی لوگ جن کو ہم ''جانگلی'' کہتے تھے ہمیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ ہمیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھتے تھے جو نہ جانے کس مقصد سے ان کے گاؤں میں آ براجمان ہوئی تھی۔ وہ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ جب بعض طلبہ نے اپنی اپنی پسندیدہ ''ماسیوں'' سے دودھ، دہی، مکھن وغیرہ خریدنا شروع کر دیا تو وہ لسّی مفت دینے لگیں۔ اس طرح کے روابط سے آہستہ آہستہ مقامی لوگوں اور مہاجرین میں دُوری ختم ہوتی گئی۔

ربوہ کے لیے حکومت سے زمین خریدنے کی بات ہو تو موصوف بتاتے ہیں: ابھی احمد نگر میں چند ہی ماہ گزرے تھے کہ جماعت کے مرکز کے لیے ربوہ والی زمین خرید لی گئی۔ اس زمانے میں یہ جگہ بالکل ویران تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا تاحدِ نگاہ سفید نمک کی ایک دبیز چادر بچھی ہوئی ہے۔ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ایک دفعہ ہم نے اس جگہ کا جائزہ لینے کا پروگرام بنایا۔ مجھے یاد ہے ہمارے پاؤں کلّر میں دھنس رہے تھے چنانچہ ہم بمشکل ریلوے لائن تک پہنچے اور پھر اسی پر چلتے چلتے احمد نگر واپس آئے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی بھی کبھی جامعہ کے معاینہ کے لیے تشریف لائے تھے اجمل شاہد ایک منٹ کے توقّف کے بعد کہتے ہیں: ہاں! آپ ہمارے احمد نگر منتقل ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک بار جامعہ آئے تھے۔ آپ نے طلبہ سے خطاب کیا جس دوران آپ نے انہیں بعد میں ربوہ آ کر آباد ہونے والے احمدیوں کا ''ہراول دستہ'' قرار دیا۔ آپ نے واقفِ زندگی طلبہ کو حضرت اسماعیل کی اس اولاد سے تشبیہہ دی جس نے مکہ شریف کی وادیٔ غیر ذی زرع کو آباد کیا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے احمد نگر میں احمدیہ بیتُ الذّکر کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ سنگِ بنیاد مولانا ابوالعطا جالندھری نے رکھا تھا تاہم حضور نے اس نامکمل بیتُ الذّکر میں مغرب کی نماز پڑھا کر گویا اس کا افتتاح فرما دیا۔ جامعہ کی احمد نگر سے ربوہ منتقلی کے بعد بھی حضور ایک بار جامعہ میں آئے تھے۔

اجمل شاہد بتاتے ہیں: ربوہ کی آبادی دفاتر کے عارضی خیموں سے شروع ہوئی تھی۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں وہاں پہلے جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تو اس کے لیے عارضی بیرکیں تعمیر ہوئیں۔ جلسہ کے بعد ان ہی تعمیرات کو رہائشی مقاصد اور دفاتر کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ حضور ربوہ کی جلد آبادکاری کے پیشِ نظر یہاں تعلیمی اداروں کا فوری اجرا چاہتے تھے چنانچہ لنگر خانے کے لیے تعمیر کی گئی ایک ایسی ہی عمارت میں جامعہ کو منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور جامعہ کی کلاسز اس لنگر خانے کے ایک حصہ میں شروع ہو گئیں۔ عمارت کا کچھ حصہ طلبہ کی رہائش کے لیے مختص کر دیا گیا۔ یہ عمارت بارشوں کے موسم میں ٹپکتی تھی اور آندھی کی شدت کا مقابلہ کرنے کی

صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ اس زمانے میں سرخ اور سیاہ آندھیاں بکثرت چلتی تھیں۔ یہ اپنے ساتھ ریت اور کلّر اڑا کر کمروں میں مٹی کی ایک تہ جما دیتی تھیں جو کئی دنوں کی جھاڑ پونچھ سے صاف ہوتی۔ بجلی اور پانی کی مشکلات بھی تھیں۔ گرمیوں میں کلاسز کھلے برآمدوں میں منعقد ہوتی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حضور ایک دفعہ جامعہ میں تشریف لائے اور طلبہ کی مشکلات کا جائزہ لیا۔

ہمارے یہ دوست مزید بتاتے ہیں: حضور جامعہ کی حالت بہتر بنانے کے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے دو مواقع پر آپ نے طلبہ کو قصرِ خلافت میں طلب فرمایا۔ پہلی ملاقات میں آپ نے طلبہ سے فرداً فرداً تعارف حاصل کیا اور بتایا کہ اب جامعہ کو جامعۃ المبشرین کا نام دے دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے لحاظ سے کورس میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہے۔ اس زمانے میں کمیونزم اپنے عروج پر تھا اس لیے کورس میں اس مضمون کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا تھا تا کہ جماعت کے علماء کو اسلامی نظامِ اقتصاد سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے۔ اسی طرح طبِ یونانی کا مضمون بھی غالباً پہلی بار رائج کیا گیا تھا۔ حضور چاہتے تھے کہ طلبہ اپنی عملی زندگی میں اس سے استفادہ کریں۔ مجھے یاد ہے کمیونزم کا مضمون مولانا غلام باری سیف اور طب کا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد ریاض پڑھایا کرتے تھے۔

اُن دنوں جامعہ میں پڑھانے والے اساتذہ کا ذکر چھڑ جائے تو اجمل شاہد بعض دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہمارے اساتذہ میں سے ایک شیخ عبدالخالق تھے جو عیسائیت کا مضمون پڑھاتے تھے۔ وہ دائرۂ احمدیت میں داخل ہونے سے پہلے پادری تھے اور انہیں بائبل پر عبور حاصل تھا۔ وہ بتاتے ہیں: ہم خان ارجمند خان سے بھی پڑھتے رہے ہیں۔ وہ روایتی افغان تھے۔ طبیعت میں سختی تھی لیکن طلبہ کے بہت ہمدرد تھے اور ان کے دکھ سکھ میں انہیں حوصلہ دیتے تھے۔ وہ انگریزی زبان سے بالکل نابلد تھے چنانچہ مشہور تھا کہ ایک بار انہوں نے کسی طالب علم سے پوچھا کہ تم فیل کیوں ہو گئے ہو؟ اس نے جواباً کہا: یوں تو میں سب مضامین میں پاس ہوں لیکن بدقسمتی سے ایگریگیٹ میں رہ گیا ہوں۔ اس پر خان صاحب نے بیساختہ کہا: او کمبخت تو نے اتنا مشکل مضمون لیا کیوں تھا؟ کمبخت کا لفظ خان صاحب کا تکیہ کلام تھا لیکن اس میں بھی ان کی محبت کا رنگ جھلکتا تھا۔

اجمل شاہد کے پاس وقت ہوگا تو وہ آپ کو یہ بھی ضرور بتائیں گے کہ اس دور کے اساتذہ میں سے ایک مولوی عطاالرحمٰن طالب بھی تھے جنہیں استاد ابن الاستاد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ انہیں صرف ونحو پڑھاتے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر تھا:

سنتے ہیں بلبل کو اس کا آشیاں مل جائے گا
قادیاں والوں کو ان کا قادیاں مل جائے گا

بروایت اجمل شاہد ایک طالب علم نے جو خود بھی شعر کہنے کی مشق کیا کرتا تھا ایک مجلس میں یہ کہہ دیا کہ اس نظم کا وزن درست نہیں۔ کسی نے یہ بات عطاالرحمٰن طالب تک پہنچا دی چنانچہ انہوں نے پوری ایک گھنٹی اسی موضوع پر گفتگو میں گزار دی اور واضح کیا کہ اس نظم کا وزن ہر لحاظ سے صحیح اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کے

مطابق ہے۔ انہوں نے اس شدت سے اپنے شاگرد کے احمقانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویّہ کا محاسبہ کیا کہ وہ بولنے کے لائق بھی نہ رہا اور اس نے یہ سارا لیکچر سر جھکا کر انتہائی شرمندگی کے عالم میں سُنا۔ یوں لگتا تھا گویا اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

کھیلوں کا ذکر آ جائے تو اجمل شاہد بتاتے ہیں: قادیان کے زمانے میں جامعہ کی والی بال ٹیم کی بہت شہرت تھی چنانچہ جامعہ کے احمد نگر اور پھر ربوہ منتقل ہونے کے بعد اسی کھیل کی طرف توجہ دی گئی۔ شام کو طلبہ بہت شوق سے والی بال کھیلتے۔ خدام الاحمدیہ کے اجتماعات میں جامعہ کی ٹیم اکثر وبیشتر اوّل رہتی۔ سال میں ایک دو دفعہ جامعہ کے طلبہ کی ٹیمیں باہمی میچز بھی کھیلتیں۔

طلبہ کی تفریحی سرگرمیوں کا ذکر آ جائے تو اجمل شاہد بتاتے ہیں: ربوہ میں پکنک کی ایک ہی جگہ تھی اور وہ تھی دریائے چناب کا کنارہ۔ گرمیوں میں عام طور پر ہر ماہ ایک پکنک دریا پر منائی جاتی تھی۔ وہاں ورزشی مقابلہ جات کے علاوہ نظموں اور لطائف کا ہلکا پھلکا پروگرام بھی ہوتا۔ بعض اوقات پکنک رات کے وقت دریا کے اندر کسی جزیرہ پر منائی جاتی۔ یہ تجربہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا۔ رات کو بڑے کچھوے جن کو پریت کہا جاتا تھا کنارے پر آ جاتے۔ ان سے الٹ پلٹ کر کھیلنا طلبہ کا مرغوب مشغلہ تھا۔ بعد میں لوگوں نے انہیں پکڑ کر کھانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں یہ جنس آہستہ آہستہ نایاب ہوتی گئی۔

جب اجمل شاہد سے پوچھا جائے کہ کیا جامعہ کے طلبہ رفاہی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے تو وہ کہتے ہیں: رفاہی اور جماعتی کاموں کے لیے جامعہ کے طلبہ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ گرمیوں میں جب چناب کا سیلابی پانی ربوہ کے نواحی دیہات کے لیے خطرہ بن جاتا تو سیلاب میں گھرے ہوئے افراد اور ان کے سامان کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنے میں ربوہ کے دیگر خدام کے ساتھ جامعہ کے طلبہ بھی دن رات ایک کر دیتے۔ اسی طرح جب فرقان فورس کا قیام عمل میں آیا تو طلبہ نے اس میں بھرپور شرکت کی اور مجھے بھی اس خدمت کا اعزاز حاصل ہے۔

اس سے پہلے کہ میں فرقان فورس میں اجمل شاہد کی شمولیت اور ان کی زبانی اس زمانے کے کچھ حالات بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے قارئین کی معلومات کے لیے یہ وضاحت کر دی جائے کہ فرقان فورس سے مراد ہے کیا؟ اس حوالے سے تاریخِ احمدیت جلد پنجم مؤلفہ مولانا دوست محمد شاہد کے یہ اقتباسات پڑھنے کے لائق ہیں جن کے مطابق حکومتِ پاکستان کے بعض فوجی افسروں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے محاذِ جموں کے لیے ایک پلاٹون بھجوانے کی خواہش کی جس پر حضور نے مرزا مبارک احمد کی کمان میں ”چالیس پچاس احمدی جوان بھجوائے جو ڈپٹی کمشنر صاحب سیالکوٹ کے ایما پر جموں سرحد پر واقع گاؤں معراجکے میں متعین کئے گئے جہاں بھارتی فوج کی بمباری اور گولہ باری اکثر اوقات جاری رہتی تھی اور پے در پے ہوائی حملے ہوتے رہتے تھے۔ کمپنی کے بہادر سپاہی دن کو اپنے دفاعی مورچوں میں ڈٹے رہتے اور رات کو پٹرولنگ کے ذریعے سے دشمن کی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس محاذ پر دو احمدی نوجوانوں نے دفاعِ وطن کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ یہ کمپنی ابھی معراجکے ہی میں نبرد آزما تھی کہ حکومت پاکستان کی طرف سے ایک رضاکار بٹالین کے قیام

کا منشا ظاہر ہوا جس پر سیّدنا المصلح الموعود نے جماعتِ احمدیہ میں ...... اللہ کی راہ میں جان لٹانے کی ایسی زبردست روح پھونک دی کہ احمدی جوان ملک کے چاروں طرف سے لبیک کہتے ہوئے رتن باغ، لاہور میں پہنچنے شروع ہوگئے اور جون ۱۹۴۸ء میں فرقان بٹالین معرضِ وجود میں آگئی اور معراجکے میں متعین سپاہی اس بٹالین میں منتقل کرکے سرائے عالمگیر کے قریب سوہن گاؤں سے متصل بھجوادیئے گئے جہاں نہر کے کنارے بٹالین کا فوجی کیمپ قائم کیا گیا۔ حضور نے اس بٹالین میں رضا کار بھجوانے اور دوسرے ضروری انتظامات کرنے کا کام ایک کمیٹی کے سپرد فرمایا جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی: حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ......، مولوی عبدالرحیم صاحب درد......، سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب......، مولوی عبدالمغنی خاں صاحب......

فرقان بٹالین جون ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۵۰ء تک قائم رہی جس کی قیادت کے فرائض شروع میں (کرنل) سردار محمد حیات صاحب قیصرانی نے، بعدازاں کرنل صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب نے انجام دیئے۔ فورس کی ٹریننگ اور اسلحہ بندی کے لیے صرف ایک ماہ کا عرصہ کافی سمجھا گیا۔ ٹریننگ پروگرام تیار کئے گئے اور رضا کاروں کو جلدی جلدی...... ہتھیاروں کے استعمال، میدانِ جنگ کی سوجھ بوجھ (فیلڈ کرافٹ)، پٹرولنگ وغیرہ کی ٹریننگ دے دی گئی۔ بریگیڈیئر کے ایم شیخ عموماً اس فورس کا معائنہ کرتے اور ہر بار اس کی ٹریننگ کی رفتار اور نوجوانوں کے شوق سے نہایت مطمئن ہوکر لوٹتے تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۴۸ء کو بٹالین محاذِ جنگ باغ سر (بربط) کی طرف روانہ ہوئی۔ زبردست بارشوں کی وجہ سے راستے مسدود ہوکر بہہ گئے تھے۔ ان حالات میں آگے بڑھنا بلاوجہ خطرات مول لینے کے مترادف تھا اس لیے بٹالین نے رات کو سیکٹر ہیڈ کوارٹر پر قیام کیا...... آدھی رات کے بعد فضا توپ کے گولوں سے گونج اٹھی۔ اگلے روز اس امر کا انکشاف ہوا کہ ہندوستانیوں کو بٹالین کے آگے بڑھنے کی کسی طرح اطلاع مل گئی تھی اور یہ گولہ باری ان ہی کے آگے بڑھنے والے راستوں پر کی گئی تھی۔ اس واقعے سے ہر کمانڈر کو یقین ہوگیا کہ خبروں کے نکل جانے کے سلسلے میں کڑے انتظامات کرنے چاہئیں تا ہندوستانیوں کو ہماری خبریں نہ مل سکیں۔ اگلی رات فرقان بٹالین نے اپنے مورچے سنبھال لئے اور بٹالین پانچ کمپنیوں میں تقسیم کردی گئی (۱) نصرت کمپنی (۲) برکت کمپنی (۳) تنویر کمپنی (۴) شوکت کمپنی (۵) عظمت کمپنی...... صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی غیر مملوکہ علاقہ (نومینز لینڈ) پر پورا تسلط جما چکے تھے اور ان کے شبانہ پٹرول فرقان بٹالین کے اگلے مورچوں تک بلا روک ٹوک پہنچتے تھے اور ان کے جاسوس ان مورچوں کے عقبی دیہات میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے اور مقامی باشندں سے اہم خبریں ہندوستانیوں کو پہنچایا کرتے تھے۔ فرقان بٹالین کے اپنی پوزیشن لے لینے پر ہندوستانی سپاہیوں نے مسلسل ہوائی اور برّی حملے کئے تا نئی بٹالین کو پسپا کردیا جائے۔ فرقان بٹالین کے جوان اگرچہ آزمودہ کار نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہندوستانی چوکیوں پر پے در پے حملے کئے اور ان کے جاسوسوں کا صفایا کرکے بھارتی سپاہیوں کو اپنے مورچوں میں محصور ہوجانے پر مجبور کردیا۔

سیکٹر ہیڈ کوارٹر نے یہ خوشگوار تبدیلی دیکھتے ہوئے ہندوستانیوں کو ان کے محفوظ مقامات سے پیچھے دھکیلنے

کے لیے ایک حملے کی تیاری شروع کردی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں ہراس پیدا کرکے ان کے حوصلوں کو توڑ دیا جائے تاکہ...... جب وسیع حملہ شروع ہو اس وقت ہمارا کام زیادہ سہل ہو۔

فورس کے جوان نہ صرف وادی سعد آباد میں اپنی جنگی کارروائیاں آزادانہ کرتے تھے بلکہ وہ ہندوستانیوں کی حفاظتی چوکیوں کے عقب تک بھی چلے جایا کرتے تھے۔ انہوں نے بھارتی سپاہیوں سے متعلق ضروری معلومات حاصل کرلیں۔ اب پوری فوج حملہ کے لیے بالکل تیار تھی مگر افسوس یُو این او کی مداخلت کے نتیجے میں جنگ بند کردی گئی لہٰذا فرقان فورس نے بدلے ہوئے حالات میں اپنی ذمہ داریوں کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور ہندوستانی خطۂ دفاع کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر اپنی مضبوط چوکیوں کا سلسلہ قائم کرنا شروع کردیا۔ بھارتی سپاہیوں پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ انہوں نے فورس کی چوکیوں پر توپوں اور ہوائی جہازوں سے زبردست بمباری شروع کردی مگر ہندوستانی اپنی تعداد اور طاقت کی برتری کے باوجود اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس نہ لے سکے اور مجاہدوں نے وادی سعد آباد کو ہندوستانیوں پر بند کردیا اور اس پانچ میل لمبی دو میل چوڑی وادی پر قبضہ کرکے پاکستانی علاقہ میں شامل کرلیا۔ یہ وادی اس علاقہ کی زرخیز ترین وادی ہے جس میں اب سینکڑوں مہاجر خاندان بس رہے ہیں۔

فرقان بٹالین کے لیے نقل وحمل کے وسائل دردِسر بنے ہوئے تھے۔ مسلسل ہوائی حملوں کی وجہ سے تمام رسد رات کے وقت پہنچائی جاتی تھی۔ اندھیری راتیں، بارش، کیچڑ، تنگ پگڈنڈیاں فوج کے لیے مشکلات کا باعث بن رہی تھیں اور اس وجہ سے اکثر اوقات جوانوں کو بروقت راشن نہ پہنچنے کی وجہ سے قلیل مقدار پر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا مگر اس ماحول میں بھی جوانوں کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا......

میدانِ جنگ میں حضرت سیّدنا المصلح الموعود...... بھی تشریف لے گئے۔ حضور کی تشریف آوری سے احمدی نوجوانوں میں نیا جوش، نئی امنگ اور نیا ولولہ پیدا ہوگیا......

فرقان بٹالین کے مجاہد عام طور پر چار اقسام پر مشتمل تھے:

اول: پاکستانی فوج کے اعلیٰ افسر جن میں کرنل سردار محمد حیات صاحب قیصرانی سب سے ممتاز ہیں۔ محاذ جنگ میں بٹالین کے سب سے پہلے کمانڈر آپ ہی تھے اور اس کے تنظیمی اور دفاعی کارناموں میں آپ کی مجاہدانہ کوششوں کا بھاری دخل ہے۔ آپ کے علاوہ میجر وقیع الزمان صاحب (سیکنڈ اِن کمانڈ)، میجر حمید احمد صاحب کلیم، میجر عبدالحمید صاحب، میجر عبداللہ مہار صاحب اور کیپٹن نعمت اللہ صاحب شریف نے مختلف کمپنیوں کی خوش اسلوبی سے کمان کی اور میجر وقیع الزمان صاحب فرقان کیمپ کے نوجوانوں کو ٹریننگ بھی دیتے رہے۔

دوم: مستقل عملہ جس میں معراجکے میں کام کرنے والے مجاہد بھی شامل تھے۔

سوم: بٹالین کا تیسرا طبقہ ان افسروں کا تھا جو رضا کار کی حیثیت سے جنگ کشمیر میں حصہ لے رہے تھے۔

چہارم: چوتھے نمبر پر (مگر تعداد کے لحاظ سے سب سے اول نمبر پر) ایثار پیشہ رضا کار تھے جن کی مجموعی تعداد آخر میں قریباً تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان رضا کاروں میں خاندان حضرت مسیح موعود کے افراد،

مربیان احمدیت، جامعہ احمدیہ، مدرسہ احمدیہ، تعلیم الاسلام ہائی سکول، تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ وطلبہ، ڈاکٹر، زمیندار، دکاندار، کلرک، غرضیکہ ہر حلقہ کے احمدی شامل تھے۔......

حکومت پاکستان نے فوری تصفیے اور اقوام متحدہ کے نمائندں کے کام میں مکمل تعاون کے پیش نظر بالآخر فیصلہ کیا کہ تمام رضا کار سپاہیوں کو آزاد کشمیر کے محاذ سے واپس بلالیا جائے چنانچہ......۱۵جون ۱۹۵۰ء کو فرقان بٹالین کی سبکدوشی کے احکام جاری کئے گئے اور ۱۷جون ۱۹۵۰ء کو فرقان کیمپ متصل سرائے عالمگیر میں ایک خصوصی تقریب کے ذریعے اس کی سبکدوشی عمل میں آئی۔ پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف (جنرل ڈگلس گریسی) چونکہ باہر دورہ پر تھے اس لیے انہوں نے ایک...... پیغام بھجوایا جسے پاکستانی فوج کے بریگیڈیئر شیخ نے پریڈ کے معاینہ اور مارچ پاسٹ کے وقت سلامی لینے کے بعد پڑھ کر سنایا۔ اس موقع پر حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر کے بعض اعلیٰ سول اور فوجی افسر بھی تشریف فرما تھے۔......

فرقان بٹالین کے جوان سبکدوشی کے بعد سرائے عالمگیر سے بذریعہ سپیشل ٹرین ۲۰ جون ۱۹۵۰ء کو ساڑھے نو بجے ربوہ پہنچے۔ سٹیشن پر ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا اور کرنل صاحبزادہ مبارک احمد صاحب اور دوسرے تمام مجاہدوں کو پھولوں کے ہار پہنائے اور ان پر پھول نچھاور کئے گئے۔

بٹالین کے تمام مجاہد پلیٹ فارم پر ترتیب وار ایستادہ ہوئے۔ ان کے وردِ زبان وہی مسنون دعائیں تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سے واپسی کے وقت پڑھا کرتے تھے چنانچہ سب مجاہد بہ آواز بلند دعا پڑھنے میں مصروف تھے آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔ انہوں نے صحابہ کرام کی اتباع میں نہایت جوش کے ساتھ یہ شعر بھی پڑھا:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

یعنی ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہے کہ آخر دم تک دشمن کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔

اسی روز شام کو چھ بجے مجاہدین کے اعزاز میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں...... حضرت صاحبزادہ مرزا عزیز احمد صاحب (ناظر اعلیٰ) نے سلامی لی۔ مولوی عبدالرحیم صاحب درد نے کمانڈر انچیف پاکستان کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ازاں بعد حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب فاتح الدین نے ایک مختصر لیکن پُر معارف تقریر فرمائی جس میں فرقان بٹالین کی تاریخ، مجاہدین کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ خدائی تائید ونصرت کے ایمان افروز واقعات بھی بیان فرمائے جن سے نہ صرف بٹالین کے جوانوں نے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ خداتعالیٰ کے فرشتے ان کی مدد اور حفاظت پر مامور ہیں چنانچہ مجاہدین بعض انتہائی شدید قسم کے خطرات میں سے محفوظ بچ نکلتے رہے اور بعض اوقات دشمن کے گولے اور بم نشانے پر لگنے کے باوجود کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ حضرت صاحبزادہ صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ

اعلان فرمایا:

''ہم نے کشمیر میں (اپنی جانیں دی ہیں۔) جگہ جگہ ان کے خون کے دھبوں کے نشان چھوڑے ہیں۔ ہمارے لیے کشمیر کی سرزمین اب مقدس جگہ بن چکی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جب تک ہم کشمیر کو پاکستان کا حصہ نہ بنالیں اپنی کوششوں میں کسی قسم کی کوتاہی نہ آنے دیں۔''

یہ ساری باتیں تو خیر تاریخ کا حصہ ہیں۔ جہاں تک اجمل شاہد کی اپنی یادداشت کا تعلق ہے اس کے مطابق ۱۹۴۸ء میں گرمیوں کی تعطیلات سے کچھ روز پہلے جامعہ کے طلبہ کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا جسے مرکز سے آنے والے ایک تین رُکنی وفد نے خطاب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جماعت کی طرف سے کشمیر کے محاذ پر فرقان فورس کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ جس میں جماعت کے رضا کار عسکری تربیت حاصل کرنے کے بعد ملکی دفاع کے لیے کام کریں گے لہٰذا طلبہ گرمیوں کی تعطیلات میں اپنے اپنے گھروں میں جانے کی بجائے اس فورس میں شمولیت کے لیے اپنے نام پیش کریں۔ یہ تحریک اس قدر مؤثر تھی کہ آدھے سے زیادہ طلبہ نے اسی وقت اس کے لیے اپنے نام پیش کردیئے۔ محاذ سے واپس آکر انہوں نے اپنے حیرت انگیز تاثرات بیان کئے چنانچہ جب دوبارہ اس کی تحریک کی گئی تو اجمل شاہد نے بھی اپنا نام پیش کردیا اور اس طرح انہیں بھی دشمن کے خلاف نبردآزما ہونے کی سعادت نصیب ہوئی اور یہاں سے حاصل ہونے والے تجربات ان کی آئندہ زندگی میں بے حد مفید ثابت ہوئے۔

وہ بتاتے ہیں: سرائے عالمگیر کے مقام پر نہر اپر جہلم کے کنارے ایک تربیتی کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ یہاں پر ایک مختصر ٹریننگ کے بعد رضا کاروں کو بذریعہ ٹرک بھمبر بھجوا دیا جاتا جہاں سے تقریباً بیس میل کا سفر پیدل طے کر کے محاذ پر پہنچا جا سکتا تھا۔ موسمِ گرما میں پہاڑی علاقہ کے نشیب وفراز کا یہ سفر یوں بھی کافی مشکل تھا لیکن کمر پر لدا ہوا کم وبیش بیس سیر کا پٹھو اسے اور بھی مشکل بنا دیتا تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ یہ سفر جو بھمبر سے صبح آٹھ بجے شروع ہوا تھا مسلسل بارہ گھنٹے جاری رہا۔ تقریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا پہلا پڑاؤ ''سَکّا تلا'' نامی ایک مقام پر ہوا۔ یہاں پر حوائج ضروریہ سے فراغت، رُوکھا سوکھا لنچ کھانے اور نمازِ ظہر وعصر کی ادائیگی کے بعد ہمارا اگلا سفر شروع ہوا۔ یہاں تک کا سفر خشک اور چھوٹی پہاڑیوں کا تھا۔ اس کے بعد کے علاقہ میں گھنے جنگلات تھے۔ ان جنگلات کے درمیان ہمیں اونچی نیچی پگڈنڈی پر ایک قطار کی صورت میں چلنا تھا۔ راستہ میں بعض جگہ برساتی نالے بھی آتے تھے۔ زیادہ بارش کی صورت میں ان میں بہت تیز پانی آجاتا۔ چونکہ اس زمانے میں محاذ پر رسد کے لیے زیادہ تر گدھے استعمال ہوتے تھے لہٰذا ایسے مقامات سے گزرتے ہوئے اکثر گدھے گرجاتے اور رسد گیلی ہوجاتی جسے بعد میں اسی حالت میں استعمال کرنا پڑتا۔

اجمل شاہد کو اب تک یاد ہے کہ جب وہ منزلِ مقصود یعنی محاذ پر پہنچے تو ڈیوٹی پر موجود مجاہدین نمازِ عشاء سے فارغ ہوچکے تھے۔ وہ سارے دن کے مشکل اور کٹھن سفر سے بے حد تھک چکے تھے چنانچہ کھانے اور نماز کی ادائیگی کے بعد وہیں ڈھیر ہوگئے۔ فجر کی نماز کے لیے بمشکل آنکھ کھل سکی۔

جب رضا کار محاذ پر پہنچتے تو انہیں کمپنیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اجمل شاہد کہتے ہیں کہ جب یہ تقسیم عمل میں آئی تو میرا قرعہ فال ''نصرت کمپنی'' کے نام پڑا۔ اس کمپنی کا ایک حوالدار ہم رضا کاروں کو اس کمپنی کے ہیڈ کوارٹر میں لے گیا جہاں کمپنی کے انچارج جمعدار نے ہمیں خوش آمدید کہا اور مختصر طور پر ہمارے فرائض سمجھائے، ہمیں بنکرز الاٹ کئے اور حوالدار سے کہا کہ ہماری چائے سے تواضع کی جائے۔ مجھے آج تک یہ بات نہیں بھولی کہ وہ چائے بہت تیز تھی۔ ہم ایسی چائے کے عادی نہ تھے لہٰذا اسے پینے میں متردّد تھے۔ جمعدار نے ہمیں دیکھتے ہوئے دُور ہی سے کہا: یہ فوجی چائے ہے۔ اس کے پینے کے بغیر آپ لوگ فوجی ڈیوٹی سرانجام نہ دے سکیں گے چنانچہ ہم نے پہلی مرتبہ یہ چائے ایک فوجی حکم سمجھ کر بمشکل گلے سے اتاری لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہم اس کے اس قدر عادی ہو گئے کہ کوئی اور چائے ہمیں بھاتی ہی نہ تھی۔

اجمل شاہد جن ایام میں محاذ پر پہنچے سیز فائر ہو چکا تھا تاہم ان مجاہدین نے جو حالتِ جنگ میں یہاں خدمت سرانجام دے چکے تھے انہیں بتایا کہ محاذ پر ہر وقت گولہ باری اور فضائی حملے ہوتے رہتے تھے اور جب بھی ایسی صورت حال ہوتی انہیں بنکرز میں پناہ لینا پڑتی تھی۔ بنکرز درحقیقت زمیں دوز پناہ گاہیں تھیں۔ بنکرز زمین کھود کر مناسب جگہ پر بنائے گئے تھے۔ ان کی چھت موٹی لکڑی اور گھاس پھونس سے بنی ہوئی تھی۔ رات سونے کے لیے یہی بنکرز استعمال ہوتے تھے۔ شدید بارش میں پانی بسا اوقات بنکرز کے اندر آ جاتا لیکن دن کے تھکے ہارے مجاہدین ان موسمی اثرات سے بے نیاز دبکے پڑے رہتے اور بہرطور اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے۔

اجمل شاہد کہتے ہیں: ہمارے وہاں پہنچنے تک حالات بدل چکے تھے لیکن غیر متوقع صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے ہمیں ہر وقت چوکس رہنا پڑتا تھا۔ جنگ ہو یا امن ایک فوجی کی زندگی بہت مصروف ہوتی ہے چنانچہ صبح سے لے کر رات تک ہمارے معمولاتِ زندگی بھی انتہائی مصروف تھے خاص طور پر فزیکل ٹریننگ کے لیے علی الصبح بروقت حاضر ہونا لازمی تھا۔ یہ تقریباً دو گھنٹے کی تھکا دینے والی مشق ہوتی۔ انسٹرکٹر مختلف مشقیں باری باری کرواتا اور ہماری معمولی سی کوتاہی بھی برداشت نہ کرتا۔ ہمیں شروع میں یہ کام بہت مشکل محسوس ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ہم اس کے عادی ہو گئے۔

صبح و شام ایک تقریب رائفل میں بُلٹ بھرنے اور نکالنے کی ہوتی تھی تاکہ غلطی سے کوئی گولی چیمبر میں رُکی رہ کر کسی نقصان کا باعث نہ بن سکے۔ شام کے وقت رائفل کو لوڈ کیا جاتا اور صبح اسے اَن لوڈ کرنا ہوتا تھا۔ اس امر کا جائزہ لینے کے لیے کہ گولی غلطی سے نالی کے اندر تو نہیں رہ گئی رائفل کا منہ اوپر اٹھا کر ٹرِگر دبایا جاتا تھا۔ اس سے یقین ہو جاتا کہ نالی میں گولی موجود نہیں ہے لیکن نوآموز مجاہدین کئی دفعہ بھول جاتے یا تساہل سے کام لیتے۔ اجمل شاہد بتاتے ہیں: ہم ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ کر یہ عمل کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے بیٹھے مجاہد کی رائفل میں گولی موجود تھی اور رائفل کی نالی کا رخ اوپر ہونے کی بجائے ترچھا سا تھا۔ اس نے جوں ہی ٹرِگر دبایا گولی میرے کان کے پاس سے شاں کر کے گزر گئی۔ اگرچہ میں ایک خوفناک حادثے سے بچ گیا تھا مگر مجھ پر اس کی دہشت کئی دن تک طاری رہی۔ جس مجاہد سے یہ غلطی ہوئی تھی اسے اس کی سزا دی گئی۔

اجمل شاہد مزید کہتے ہیں: ہمارے دیگر فرائض میں رات کا پہرہ بھی شامل تھا۔ رات کی تاریکی میں تن تنہا یہ ڈیوٹی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ہمیں رائفل کا رخ دشمن کی طرف رکھنا ہوتا تھا۔ اگر معاینہ ٹیم کسی مجاہد کا رائفل کے بارے میں تغافل پکڑ لیتی تو یہ ایک سنگین جرم متصوّر ہوتا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دورانِ ڈیوٹی مجھے تھکاوٹ محسوس ہوئی تو میں نے ایک پتھر کا سہارا لے لیا۔ چاندنی رات تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی چنانچہ میں رائفل کو مضبوطی سے پکڑ کر ایک پتھر پر نیم دراز ہو گیا۔ ان حالات میں نیند آ جانا قدرتی امر تھا۔ اسی اثنا میں معاینہ ٹیم وہاں آ گئی اور انہوں نے مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ہڑبڑا کر اونچی آواز میں ''ہالٹ!'' ''ہالٹ!'' کا شور مچایا جس سے وہ ڈر گئے کہ میں گھبراہٹ میں گولی ہی نہ چلا دوں۔ بعد میں مجھے اس کوتاہی کی سزا بھگتنا پڑی۔

جب محاذِ جنگ پر کھانے پینے کی سہولتوں کے بارے میں پوچھا جائے تو اجمل شاہد مسکراتے ہوئے جواب دیتے ہیں: سیز فائر کے بعد اگرچہ محاذ پر رسد اور سامانِ خورونوش کی فراہمی پہلے سے بہتر ہو چکی تھی تاہم اب بھی یہ ہماری ضرورت کے مطابق نہ تھی چنانچہ دیہات سے آنے والے رضا کاروں کو علی الخصوص کھانے کی کمی کی شکایت رہتی۔ ہفتہ میں ایک دن ہماری ڈیوٹی لنگر پر ہوتی تھی۔ روٹی پکوانے کے لیے سب کام خود کرنا پڑتا تھا البتہ سالن بڑے لنگر سے آتا تھا جسے ہم تقسیم کر لیتے تھے۔ روٹی پکانے کا تجربہ بڑا عجیب تھا۔ آٹا چونکہ گدھوں پر لَد کر آتا تھا لہٰذا گیلا ہو جاتا۔ نتیجتاً اس میں سفید سُونڈیاں پیدا ہو جاتیں۔ اسی آٹے سے روٹیاں پکائی جاتی تھیں۔ پکانے کے بعد روٹی اچھی طرح جھاڑی جاتی تاکہ سُونڈیاں ممکنہ حد تک اتر جائیں۔ اضطراری حالات میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا۔ حالات میں بہتری کے باوجود ہر جوان کو صرف ایک روٹی ملتی تھی۔ جہاں تک چائے کا تعلق ہے آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جو گڑ رسد میں آتا تھا گیلا ہو کر بوری کے ساتھ چمٹ جاتا چنانچہ بوری دیگ میں ڈبو کر چائے بنا لی جاتی۔ ان حالات کا نقشہ جامعہ احمدیہ کے ہمارے ایک ساتھی عبدالسّلام ظافر نے اپنی ایک مزاحیہ نظم میں کھینچا تھا جس میں محاذِ کشمیر کے مختلف کرداروں کا بھی ذکر تھا لہٰذا اس نظم سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے سب سے پہلے ان کرداروں کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔

وہ کہتے ہیں: نظم کے پہلے بند میں ''عالم کباب'' کا کوڈ ورڈ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد اُس وقت میجر اور بعد میں کرنل حیات قیصرانی ہیں۔ دوسرے بند میں صدر دین، کوارٹر ماسٹر کے لیے ''صدرُو'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ تیسرے بند میں ''حنیف'' نامی ایک رضا کار کا ذکر ہے جو روٹی کی تقسیم پر مامور تھا اور ''ہیرو'' کے نام سے معروف تھا۔ آخری بند میں ''تارا'' کا لفظ ''تارا سنگھ'' کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ہندوستانی فوجی کا علامتی نام ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے اس نظم کا وہ حصہ جو میری یادداشت میں محفوظ ہے:

روٹی ولّوں ہویا جواب
ایتھے سِگٹ نہ پیئو جناب
حکم سناوے ''عالم کباب''

ساڈے تے بھج گئے ٹھّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

راشن ''صدرُو'' دے ڈِھڈ چ پَیندا
دھرنا مار لنگر تے بَیندا
سارا لشکر ایہو ای کہندا
صدرُو نوں رب چکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

آندر پڑھدی قُل شریف
روٹی لے کے نہ آیا ''حنیف''
سکھ تے کھاندے کھنڈ، رغیف
اسی کھا کھا تکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

ظافر ایتھے کوئی نہیں چارا
فضل کرُو ساڈا رب پیارا
راشن لے کے بیٹھا ''تارا''
سامنی پہاڑی اُتّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے
یارو مرگئے بُھکّے، لڑائیاں کیہہ لڑیئے

اس نظم کے حوالے سے یہاں شاید اس وضاحت کی ضرورت بھی ہو کہ اس کے تیسرے بند میں استعمال شدہ لفظ ''رغیف'' عربی زبان میں پراٹھے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اجمل شاہد کی بات جاری تھی: ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا ان نامساعد حالات کا جن کا فرقان فورس کے مجاہدین کو سامنا تھا تاہم باوجود تنگی ترشی کے مجاہدین میں غیر معمولی جوش و جذبہ تھا۔ انہوں نے نہ صرف نازک حالات میں ملک کا دفاع کیا بلکہ دشمن کو پسپا کر کے کئی مربع میل کا رقبہ پاکستان کے لیے حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقان فورس کو ختم کرتے ہوئے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔

فرقان فورس کو محاذِ کشمیر کے جس علاقے کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ باغ سر کہلاتا تھا۔ اسے کوڈ ورڈز میں ''بربط'' کا نام دیا گیا تھا۔ اس محاذ پر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور مرزا مبارک احمد فرقان فورس کے

منتظمِ اعلیٰ کے طور پر ایک سے زیادہ بار تشریف لائے۔ ایک موقع پر ثاقب زیروی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے جوش و خروش اور وادی کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم (ضمیمہ ح) ترنّم سے سنائی جس کا ایک بند یہ تھا:

اِک طُرفہ خوشی چھن جانے پر بے تاب ہے دل، رنجُور ہوں میں
گو حسن کے طوفاں خواب ہوئے، اک پاک نشہ میں چُور ہوں میں
دیکھا ہے جو دل کی آنکھوں سے، کہنے کے لیے مجبور ہوں میں
بربط کے نظارے اُف توبہ، افسوس کہ اُن سے دُور ہوں میں''

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ثاقب زیروی نے اپنی خود نوشت میں کشمیر کے محاذ پر علی الترتیب صاحبزادہ مرزا ناصر احمد اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی معیت میں دوروں کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ و۔

ابھی تک آپ اجمل شاہد سے ان کے زمانۂ طالبِ علمی کی باتیں سن رہے تھے۔ اب آپ کی ملاقات حکیم نذیر احمد ریحان مقیم محلّہ دارالرحمت غربی ربوہ سے کرائی جا رہی ہے جنہیں جماعت کی طویل خدمت کا اعزاز حاصل ہے۔ یاد رہے کہ جامعہ احمدیہ سے فارغ ہوتے ہی انہیں کچھ عرصہ ربوہ اور بہاولپور میں کام کرنے کا موقع ملا جس کے بعد ان کی تقرری نواب شاہ میں ہوگئی۔ اس وقت تک غلام احمد فرخ واحد مربی سلسلہ تھے جو سندھی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ نذیر ریحان نے بھی نواب شاہ میں اپنی تقرری کے دوران اس زبان میں مہارت حاصل کر لی جس کی وجہ سے انہیں مقامی رابطوں میں بہت سہولت ہوگئی۔ ان کی اسی مہارت کے پیشِ نظر انہیں اٹھارہ سال تک نواب شاہ سے تبدیل نہیں کیا گیا۔ بعد میں وہ حیدرآباد، خیرپور، سکھر اور ملتان میں تعینات رہے۔ اب مدتِ دراز سے ربوہ میں ہیں۔ انہوں نے سترہ سال تک وقفِ جدید کے مدرسۃ الظفر میں پڑھایا ہے اور آج بھی حسبِ توفیق خدمتِ سلسلہ میں مگن ہیں۔

موصوف نے ۱۹۵۵ء میں جامعہ احمدیہ سے شاہد کا امتحان پاس کیا تھا۔ جب ان سے جامعہ میں گزرے ہوئے وقت کی یادیں تازہ کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ اسے ایک خوبصورت خواب سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپریل ۱۹۴۷ء میں مدرسۂ احمدیہ، قادیان میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت انہیں جن اساتذۂ کرام سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ان مولوی میں شریف احمد امینی، مولوی حفیظ بقاپوری، مولوی محمود سکندر، مولوی عبدالرحمٰن جٹ اور ماسٹر غلام حیدر شامل ہیں۔ ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا اور افراتفری کے اس دور میں تمام معمولاتِ زندگی اُلٹ پلٹ کر رہ گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد وہ اپنی ہمشیرہ کو چھوڑنے کے لیے سندھ گئے ہوئے تھے کہ انہیں اپنے والدِ محترم کی طرف سے ایک خط ملا جس کے ذریعے انہیں چنیوٹ میں جامعہ کے قیام کی اطلاع دیتے ہوئے فوری طور پر لاہور پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی چنانچہ وہ سندھ سے لاہور پہنچے جہاں سرائے سلطان میں لاری اڈے پر ان کے والد نے ان کا استقبال کیا اور اسی وقت انہیں چنیوٹ روانہ کر دیا۔

چنیوٹ میں جامعہ متروکہ جائیداد میں قائم تھا جو محلّہ گڑھا میں واقع تھی۔ وہ ان مشکل دنوں کا ذکر مسکراتے ہوئے کرتے ہیں اور بعض ایسی تفصیلات بیان کرتے ہیں جن پر اب یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بتاتے ہیں: غربت کا زمانہ تھا اور ہمارے ہوسٹل میں کوئی تربیت یافتہ باورچی موجود نہ تھا چنانچہ ہم جلی ہوئی اور بسا اوقات کچی روٹی کھانے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ سالن کے نام پر ہمیں کالی گاجر کا پتلا سا شوربہ ملتا اور کبھی دال پکتی۔ گوشت تو گویا شجرِ ممنوعہ تھا۔ چاول پکتے تو اس قابل نہ ہوتے کہ انہیں کھایا جا سکے۔ ایک بار چاول اتنے کچے رہ گئے تھے کہ ہم نے کہیں سے دیگچی مانگ کر انہیں دوبارہ ابالا اور گھوٹ کر اس کی نمکین فرنی سی بنا کر کھائی۔

نذیر ریحان کہتے ہیں: جامعہ کی چنیوٹ سے احمد نگر منتقلی سے ہمیں اپنے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ گڑھا محلّہ کے وہ مکانات جن میں جامعہ اور ہوسٹل تھا ہندوؤں کے بنے ہوئے تھے۔ یہ مکانات چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک کمروں پر مشتمل تھے اور ان میں صحن نہ ہونے کے برابر تھا۔ احمد نگر میں جماعت نے جامعہ کے لیے جو مکانات حاصل کئے وہ غیر مسلم تارکینِ وطن کی حویلیاں تھیں جن کے کمرے بڑے اور بہتر تھے تاہم ان حویلیوں سے ان حویلیوں کی طرف تصوّر نہیں جانا چاہئے جو ہندو اور سکھ امراء نے بڑے شہروں میں اپنے آرام و آسائش کے لیے بنا رکھی تھیں اور جو اب تک کسی نہ کسی شکل میں قائم اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ یہ حویلیاں جن کی چھتیں گھن لگی لکڑی کی تھیں درمیانے درجہ کے زمینداروں کی تھیں۔ وہاں بھی ہمارا رہن سہن بالعموم چنیوٹ جیسا ہی رہا۔

موصوف بتاتے ہیں: اُن دنوں احمد نگر میں دو مسجدیں تھیں۔ پہلے ہم ان ہی میں سے ایک میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ قادیان ہی کی طرح وہاں نمازوں کی حاضری لگتی اور غیر حاضری پر تادیبی کارروائی ہوتی۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں اس مسجد میں نماز کی ادائیگی سے روک دیا گیا چنانچہ گاؤں کی دوسری مسجد میں نماز کی ادائیگی شروع کی گئی مگر جلد ہی اس کے منتظمین نے بھی معذرت کر لی۔ اس پر احمد نگر میں آ کر آباد ہونے والے احمدی مہاجرین اور طلبہ جامعہ نے مل کر گاؤں کے وسط میں خالی جگہ پر ایک کچی بیت الذکر تعمیر کر لی اور اس میں نمازیں پڑھنے لگے۔ جہاں تک ہمارے رہن سہن کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم پرالی پر سوتے تھے اور ہمارے پاس کپڑے بھی واجبی سے ہوتے جنہیں ہم خود دھوتے۔ استری کا کوئی تصور نہ تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ جامعہ کے طلبہ اپنے اخراجات کس طرح پورے کیا کرتے تھے نذیر ریحان کہتے ہیں: ہمارا وظیفہ دس یا بارہ روپے ماہوار تھا جس میں سے ہمارے رہن سہن کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔ ہمیں رقم نقد نہیں ملتی تھی۔ جمعہ کے دن سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل، چوہدری غلام حیدر ہوسٹل میں تشریف فرما ہوتے۔ لڑکے اپنی ضرورت کے مطابق ان سے پرچی لینے کے لیے قطار میں کھڑے ہو جاتے۔ اگر کسی لڑکے کو کپڑے دھونے کے لیے صابن کی ضرورت ہوتی تو اسے دو آنے کی پرچی دوکاندار کے نام دی جاتی۔ یہ پرچی متعلقہ دوکاندار کو دے کر صابن حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اگر نہانے کے لیے صابن کی ضرورت ہوتی یا سٹیشنری درکار ہوتی تو اس کے لیے بھی دوکاندار کے نام پرچی دی جاتی۔ مہینے بعد دوکاندار کو حساب کر کے جامعہ کی طرف

سے پیسے ادا کر دیئے جاتے اور یہ رقم متعلقہ لڑکوں کے وظیفہ میں سے وضع کر لی جاتی۔ اس زمانے کے حالات کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ اگر کبھی کہا جاتا کہ سرسوں کے تیل کے لیے پرچی مانگی جاتی تو سپرنٹنڈنٹ صاحب فوراً اپنے سر سے پگڑی اتار کر کہتے: دیکھو میں نے کبھی سر کو تیل نہیں لگایا۔ تم نے تیل لگا کر کیا کرنا ہے؟ ہوسٹل میں لڑکوں کے اخراجات کے حساب کتاب کے لیے ایک عمر رسیدہ بزرگ، منشی عبدالخالق جو قادیان کے زمانے سے یہ کام کرتے چلے آ رہے تھے موجود تھے۔

لڑکوں کی شرارتوں کا ذکر ہو تو نذیر ریحان بتاتے ہیں: لڑکے تو لڑکے ہی ہوتے ہیں خواہ وہ جامعہ ہی کے طالبِ علم کیوں نہ ہوں۔ ایک دن حافظ شفیق احمد ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر سوئے ہوئے تھے۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں نے دوستوں سے کہا: آؤ! حافظ صاحب کا جنازہ پڑھ لیں چنانچہ میں آگے کھڑا ہو گیا اور چند لڑکے میرے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اتنی دیر میں حافظ صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے یہ منظر دیکھا تو برا مان گئے اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شکایت کر دی۔ رات کو حاضری کے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب نے پوچھا کہ کون کون سا لڑکا حافظ صاحب کے جنازے والی شرارت میں شامل تھا۔ لڑکے آگے آ گئے۔ انہوں نے سب کو سزا دی۔ یاد رہے حافظ شفیق احمد ان دنوں حافظ کلاس کے انچارج تھے۔

نذیر ریحان کی گفتگو جاری تھی: احمد نگر کا ماحول خالصتاً دیہاتی تھا۔ جامعہ یا ہوسٹل میں بیت الخلاء موجود نہ تھا اور حاجت کے لیے باہر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ طہارت واپس ہوسٹل آ کر طہارت خانے میں کی جاتی جہاں طہارت کے لیے لوٹے کی بجائے لوہے کا ایک ڈبہ پڑا ہوتا تھا۔ یار لوگوں نے اس ڈبے کا نام پی ڈبلیو ڈی رکھا ہوا تھا جو ”پیشاب والے ڈبے“ کا مخفف تھا۔ کسی منچلے نے ایک بار پسی ہوئی سرخ مرچیں اس ڈبے میں ڈال دیں چنانچہ جو بھی طہارت کے لیے جاتا اپنی سرین کھجاتا ہوا واپس آتا۔ فوری طور پر تو کچھ نہ پتا چلا کہ یہ شرارت کس نے کی ہے لیکن عرصہ گزر جانے کے بعد ایک لڑکے نے باتوں باتوں میں اعتراف کر لیا کہ ڈبے میں مرچیں اُسی نے ڈالی تھیں۔

وہ مزید بتاتے ہیں: پہلے پہل مدرسۂ احمدیہ اور جامعہ احمدیہ الگ الگ تھا لیکن احمد نگر کے زمانے میں ان دونوں کو اکٹھا کر دیا گیا۔ ہوسٹل کے زیادہ بڑے کمروں میں تو آٹھ سے بھی زیادہ طلبہ مقیم تھے مگر عام طور پر ہر کمرے میں آٹھ آٹھ لڑکے رہائش پذیر تھے۔ شروع میں میس کی سہولت میسر نہ تھی اور ہم تندور سے روٹی خرید کر اور خود سالن بنا کر گزارا کیا کرتے تھے لیکن جب میس بنا تو اس میں وقتاً فوقتاً مختلف باورچی کام کرنے لگے۔ ایک باورچی کا نام محمد علی تھا۔ مجھے یاد ہے ہم لائن میں کھڑے ہو کر کھانا لیا کرتے تھے۔ چونکہ کھانے کا کمرہ مخصوص نہ تھا اس لیے ہم کھانا لے کر کمروں میں آ جاتے اور بستر پر بیٹھ کر کھا لیتے۔ باورچی کی طرف سے فراہم کردہ سالن مقدار میں بالعموم اِتنا ہی ہوتا جس سے ایک فرد بمشکل روٹی کھا سکے۔ بعض افراد کو یوں بھی زیادہ سالن کھانے کی عادت ہوتی ہے لہٰذا وہ مزید سالن لینے کے لیے محمد علی کے پاس چلے جاتے۔ وہ اُن کے اس مطالبے پر اُنہیں گھورتا اور کبھی غصے میں ہوتا تو جلی کٹی سنانے سے بھی باز نہ آتا۔ میرا دل باورچی کے ہاتھوں طلبہ کے ساتھ اس ناروا سلوک پر کڑھتا تھا۔ اگرچہ میں ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا تاہم اپنی حد تک میں نے

پنے دل کو سمجھا لیا کہ میں کبھی بھی سپلیمنٹری مانگ کر شرمندہ نہیں ہوں گا۔ تب سے میری یہ عادت بن گئی ہے کہ پہلی بار جتنا سالن پلیٹ میں ڈال لوں اُسی میں گزارا کرتا ہوں حتّٰی کہ میں نے اپنے گھر میں بھی کبھی دوسری بار سالن نہیں لیا۔

موصوف کہتے ہیں: ان باتوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہوسٹل میں زندگی کچھ ایسی آرام دہ تو نہ تھی تاہم طلبہ ذہنی طور پر مطمئن و مسرور تھے کہ انہیں ایک ایسے ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے جس کے فارغ التحصیل اپنی زندگیاں خدمتِ دین میں گزاریں گے۔

جب ان سے ان کے اساتذہ کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ بتاتے ہیں: احمد نگر میں ہمیں جن اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا ان میں مولانا ابوالعطا جالندھری (پرنسپل)، قاضی محمد نذیر لائلپوری مولانا ظفر محمد ظفر، خان ارجمند خان، مولوی ظہور حسین مجاہد بخارا، ماسٹر غلام حیدر، مولوی عطاء الرحمٰن طالب، مولوی محمد حسین تحسین اور صاحبزادہ ابوالحسن قدسی شامل ہیں۔ یہ سب علماء جماعت میں ایک عالی مقام رکھتے تھے اور ان میں سے کسی کی ذات بھی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

اپنے بعض اساتذہ کا تفصیلی ذکرِ خیر کرتے ہوئے نذیر ریحان بتاتے ہیں: ظفر محمد ظفر بڑے عالم اور عربی، اردو اور فارسی کے بہت عمدہ شاعر تھے۔ انہیں ان زبانوں کے اساتذہ کے بے شمار اشعار یاد تھے چنانچہ جب وہ کلاس میں کسی موضوع پر لیکچر دیتے تو موقع کی مناسبت سے عربی کا کوئی شعر سناتے اور پھر اسی مفہوم کا اردو کا کوئی شعر بھی پیش کر دیتے۔ یہی نہیں بالعموم اسی موضوع پر انہیں فارسی کا بھی کوئی شعر یاد ہوتا جو وہ کلاس کو سنا کر ہم ایسے طالب علموں کو حیران کر دیتے۔

ان کے متعلق مشہور تھا کہ ایک بار ان کی کسی فروگزاشت پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ان سے کچھ ناراض ہوگئے۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی صفائی میں ایک نظم کہی جو ہم طلبہ میں زبان زدِ عام تھی۔ یہ نظم کلامِ ظفر میں ''عزمِ وفا'' کے نام سے شامل ہے اور کچھ اس طرح ہے:

یہ ممکن ہے کہ اس اُلٹے زمانے میں کوئی مجنوں
بگڑ کر اپنی لیلیٰ سے کبھی بیزار ہو جائے
یہ ممکن ہے کوئی بلبل خلاف اپنی طبیعت کے
گلوں سے دشمنی رکھ کر نثارِ خار ہو جائے
یہ ممکن ہے طوافِ شمعِ تاباں چھوڑ پروانہ
اسیرِ زلفِ لیلائے شبانِ تار ہو جائے
یہ ممکن ہے کہ ماہی مسکنِ آبی سے گھبرا کر
شہیدِ جستجوئے رفعتِ کوہسار ہو جائے
یہ ممکن ہے کہ پانی چھوڑ کر اپنی بُرودت کو
حرارت میں بدل جائے، سراسر نار ہو جائے

یہ ممکن ہے کوئی نوشیرواں سا حاکمِ عادل
عدالت چھوڑ دے اور ظلم میں سرشار ہو جائے
یہ ممکن ہے کوئی ہٹلر عدوِ جرمنی بن کر
کسی انگریز دشمن کا علمبردار ہو جائے
یہ ممکن ہے کوئی محمود شانِ بے نیازی میں
ایازِ باوفا سے برسرِ پیکار ہو جائے
غرض سب کچھ یہ ممکن ہے مگر یہ ہو نہیں سکتا
کہ احمد کی جماعت کا ظفر غدّار ہوجائے

یہ ہجرت کا ابتدائی زمانہ تھا اور ابھی تک مہاجرین اپنے وطن سے جدائی کے غم سے باہر نہیں آسکے تھے۔ قادیان سے مفارقت کا دھچکا احمدیوں کے لیے ایک ایسا صدمہ تھا جس کی جماعت احمدیہ کی تاریخ میں پہلے کوئی نظیر نہ ملتی تھی۔ دیارِ حبیب کی گلیاں ہر دم ان کی نظروں میں رہتیں۔ شعراء اس غم کا اظہار اپنی نظموں میں کر رہے تھے۔ نذیر ریحان کی روایت کے مطابق ظفر محمد ظفر نے بھی اس حوالے سے ایک نظم کہی تھی جس کا یہ شعر خوب مشہور ہوا:

وہ سمجھا ہم پراگندہ ہوئے ہیں
مرے نزدیک ہم پھیلے جہاں میں

اس شعر میں ظفر محمد ظفر نے ہجرت کے ایک بالکل انوکھے پہلو کی نشاندہی کی تھی۔

خان ارجمند خان کا ذکر ہو تو نذیر ریحان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تبسم پھیل جاتا ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ موصوف بہت محبت کرنے والے انسان تھے تاہم ان کی طبیعت میں سختی تھی۔ ان کا ایک شاگرد، مکرّم لیکچر کے دوران کھڑکی میں سے باہر دیکھے جا رہا تھا۔ استاد محترم نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ باہر کیوں دیکھ رہا تھا جس پر مکرّم نے یہ بات درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مولوی صاحب کو اس کا یہ جھوٹ سخت ناگوار گزرا چنانچہ وہ اس پر پل پڑے۔ ساتھ ہی ساتھ کہے جا رہے تھے کہ ایک تو باہر دیکھتا ہے اور پھر جھوٹ بھی بولتا ہے۔

قاضی محمد نذیر لائلپوری کا ذکر کرتے ہوئے نذیر ریحان کہتے ہیں: ان کی یہ بات مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ یوں تو وہ فاضلِ اجل تھے اور شاید ہی کوئی ایسا سوال ہوتا ہوگا جس کا وہ فوراً جواب نہ دے سکے ہوں لیکن اگر وہ بوجوہ کسی طالب علم کی تسلی نہ کر سکتے تو بعد میں بھی جواب سوچتے رہتے اور جوں ہی انہیں کوئی تسلی بخش جواب سُوجھتا، خواہ رات کے بارہ ہی کیوں نہ بج چکے ہوتے، وہ آ کر اس طالب علم کو سوئے سے جگا دیتے اور اسے بتاتے کہ اس کے سوال کا جواب یہ ہے۔

نذیر ریحان احمد نگر کی عمومی مذہبی فضا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں: یہاں کچھ آبادی شیعہ مسلک سے

تعلق رکھتی تھی اور وہ اپنی مجالس کے لیے وقتاً فوقتاً ذاکرین کو باہر سے بلواتے رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بشیر ٹیکسلا والے اور اسماعیل گوجرہ والے کو احمد نگر بلوایا اور اس مجلس میں جامعہ کے طلبہ کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی۔ موصوف کے بیان کے مطابق جامعہ کے طلبہ مولانا ابوالعطا جالندھری اور قاضی محمد نذیر لائلپوری کی سرکردگی میں وہاں حاضر ہوگئے۔ دورانِ تقریر ایک شیعہ عالم نے احمدیوں کو مناظرے کا چیلنج دیا جسے مولانا ابوالعطا جالندھری نے اسی وقت مائیک پر آ کر قبول کرلیا مگر کسی وجہ سے بعد میں یہ مناظرہ نہ ہو سکا۔ شیعہ حضرات کے اس جلسے کے بعد ہم نے ایک جلسہ کیا جس میں اسماعیل گوجرہ والے کو بھی مدعو کیا گیا۔ جلسہ سے پہلے مولانا ابوالعطا جالندھری نے قاضی محمد نذیر لائلپوری سے کہا: قاضی صاحب! آج مزا آ جانا چاہئے۔ قاضی صاحب نے جواباً کہا: اگر میں چل پڑا تو ان شاء اللہ سب کو مزا آ جائے گا۔ جلسہ شروع ہوا تو قاضی صاحب نے اسماعیل گوجرہ والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر نعوذ باللہ پہلے تینوں خلفائے راشدین برحق نہ تھے تو ان کے زمانے کی جنگوں کو جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا نہ ان جنگوں سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ شیعہ عالم نے کہا یہ بات درست ہے۔ اس پر قاضی محمد نذیر لائلپوری نے کہا کہ حضرت عمر کے زمانے میں ایران فتح ہوا اور بعض خواتین مالِ غنیمت میں عرب پہنچیں تو کیا نعوذ باللہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان سے چلنے والی نسل پر انگلیاں اٹھائی جائیں؟ یہ بات سن کر شیعہ عالم کانپنے لگا اور اس نے کہا کہ وہ اس کا جواب اپنے جلسے میں دے گا۔ ان کے اگلے جلسے میں ہم سب لوگ اس توقع کے ساتھ شامل ہوئے کہ اس سوال کا کوئی نہ کوئی جواب دیا جائے گا مگر اسماعیل گوجرہ والے نے اس موضوع پر مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی۔

ماسٹر غلام حیدر کا ذکر ہو تو نذیر ریحان بتاتے ہیں: ''موصوف قادیان کے زمانے سے ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ اور انگریزی کے استاد تھے۔ مجھے یاد ہے فجر کی نِدا سے پہلے ایک گھنٹی بجا کرتی تھی جس پر لڑکے اٹھ کر نماز کی تیاری شروع کر دیتے اور وضو کے بعد قطار بنا کر بیت الذکر روانگی کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس موقع پر ہماری حاضری لگتی۔ اسی اثنا میں نِدا ہو جاتی اور ہم بیت الذکر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ نماز ختم ہونے کے بعد ہم پھر قطار بنا کر مدرسہ واپس پہنچتے اور دوبارہ حاضری ہوتی۔ اگر کوئی لڑکا نماز سے غیر حاضر پایا جاتا یا دن کے دوران کسی اور قابلِ اعتراض حرکت کا مرتکب پایا جاتا تو عشاء کی نماز کے بعد اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی۔ اس دوران بعض لڑکے خوف یا اپنی چالاکی کی وجہ سے ان کے اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے تو ماسٹر غلام حیدر سخت ناراض ہوتے اور اسے اپنے دفتر میں پیش ہونے کا حکم صادر فرماتے۔ انہوں نے دفتر میں دو ڈانگیں رکھی ہوئی تھیں۔ جب لڑکا ان کے سامنے پیش ہوتا تو وہ کہا کرتے: ان میں سے ایک ڈانگ میں پکڑ لیتا ہوں اور دوسری تم پکڑ لو۔ پھر ہم مقابلہ کر لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون جیتتا ہے۔ اب کون سا لڑکا تھا جو اُن کے ساتھ گتکا کھیل سکتا چنانچہ وہ آئندہ کبھی ان کی طرف سے سزا میں روک بننے کی کوشش نہ کرتا۔

نذیر ریحان اس تاثر کی تردید کرتے ہیں کہ ماسٹر غلام حیدر سخت گیر تھے۔ وہ کہتے ہیں: ممکن ہے یہ بات کسی حد تک درست بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ ایک بار زمانۂ احمد نگر

میں پرنسپل نے تعطیلات سے پہلے مجھے کچھ عناوین مضمون لکھنے کے لیے دیئے۔ چھٹیاں تھیں لہٰذا میں اس معاملے کو آج سے کل پر ڈالتا گیا حتّٰی کہ تعطیلات ختم ہوگئیں۔ پرنسپل نے میری اس نااہلی پر مجھے جرمانہ کیا جو میرے وظیفے کی رقم کے تقریباً برابر تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر میں یہ جرمانہ ادا کر دوں تو باقی اخراجات کیسے پورے کروں؟ ان ہی دنوں میں نے کسی سے سنا کہ انجمن کے قواعد کے مطابق افسرِ صیغہ کسی کارکن پر اس کے گزارا الاؤنس کے تیسرے حصے سے زیادہ جرمانہ نہیں کر سکتا۔ میں ماسٹر غلام حیدر کے پاس گیا اور انہیں اپنی بپتا سنائی۔ ان کا مشورہ تھا کہ مجھے پرنسپل سے مل کر جرمانے کی معافی کی درخواست کرنی چاہئے۔ مجھے نہ جانے کیا سوجھی میں نے جواباً کہا کہ میں پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کرلوں گا لیکن پرنسپل سے معافی نہیں مانگوں گا۔ ماسٹر صاحب نے میری بات سن کر کہا: تم فکر نہ کرو۔ میں خود بات کرلوں گا اور واقعی انہوں نے ازخود پرنسپل سے بات کی چنانچہ بعد میں مجھ سے جرمانے کی وصولی پر اصرار نہیں کیا گیا۔

اپنے اس استاد کے جذبۂ ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے نذیر ریحان بتاتے ہیں: احمد نگر کے زمانے ہی کی بات ہے۔ ہوسٹل کے کچن میں استعمال کے لیے لکڑی آتی تو اسے کلہاڑی سے پھاڑنا پڑتا تھا۔ میں نے بارہا دیکھا کہ ماسٹر صاحب کفایت کے نکتہ نگاہ سے یہ لکڑی خود پھاڑ رہے ہیں حالانکہ کوئی اور ہوتا تو اس مقصد کے لیے کسی مزدور کی خدمات حاصل کرتا۔ دو تین بار مجھے بھی ان کی مدد کا موقع ملا۔

نذیر ریحان اپنے استاد، مولوی محمد شہزادہ خان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کے کچھ حالات جو ایک بار ان کے بیٹے، محمد شفیع خان کے قلم سے الفضل میں شائع ہوئے تھے میری نظر سے گزر چکے ہیں اور کہتے ہیں: اگر مجھے اس مضمون کا خلاصہ بیان کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ محمد شہزادہ خان افغانستان کے صوبہ ننگرہار میں قصبہ بڑوکلاں میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی تعلیم کا شوق تھا چنانچہ حصولِ علم کے لیے کوہاٹ آ گئے جہاں انہیں مولوی احمد گل (جو اُس وقت تک غیر احمدی تھے) نے اپنی سپردگی میں لے لیا۔ مولوی احمد گل انہیں لے کر اپنے استاد حافظ حنیف اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعد میں یہ دونوں بزرگ مشرف بہ احمدیت ہو گئے جس کے بعد محمد شہزادہ خان نے بھی ۱۹۱۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ انہوں نے قادیان میں رہ کر مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور زندگی وقف کر کے ساری عمر حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ارشاد کے مطابق سلسلے کی خدمت میں گزار دی۔ ابتداءً مربی صوبہ سرحد مقرر ہوئے اور بعد میں مدرسہ احمدیہ میں پڑھانے لگے۔

ان کے بیٹے بیان کرتے ہیں کہ قادیان آنے کے بعد پھر کبھی اپنے وطن جانے کی خواہش نہ کی۔ جب بچے ان سے پوچھتے کہ کیا ان کا دل وطن جانے کو نہیں چاہتا تو وہ جواب دیتے کہ اب قادیان ہی ہمارا وطن ہے۔ اس سے اچھا وطن اور کون سا ہو سکتا ہے جس میں چاروں طرف خدا کا نور نظر آتا ہے اور ہم ہر وقت روحانی فیوض سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ وہ انتہائی نیک اور تقویٰ کی باریک راہوں کا خیال رکھنے والے تھے۔ موصوف حضرت میر محمد اسحاق اور حضرت حافظ روشن علی کے شاگردِ خاص تھے اور انہیں ایک لمبا عرصہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل

اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی خدمت میں حاضر رہنے کا شرف بھی حاصل رہا۔

نذیر ریحان اپنے بعض اساتذہ کے ذکرِ خیر کے بعد بتاتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب جہادِ کشمیر میں افواجِ پاکستان کی مدد کے لیے فرقان فورس قائم کی گئی تو وہ بھی جامعہ کے ان طلبہ میں شامل تھے جنہیں اس خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں: مجھے یاد ہے ہم لوگوں کو احمد نگر سے لاہور لے جایا گیا۔ لاہور میں لنڈے کی وردیوں کا انتظام جماعتی طور پر کیا گیا تھا۔ ہم نے وہ وردیاں پہنیں اور ایک پسنجر ٹرین پر بیٹھ کر سرائے عالمگیر کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ وردیاں کس قسم کی تھیں اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب ہم محاذ پر پہنچے اور ایک پہاڑی پر چڑھنے لگے تو زور لگنے پر میری پتلون پیچھے سے پھٹ گئی۔ غنیمت ہے میں نے نیچے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ محاذ پر باقی وقت مجھے اسی پھٹی ہوئی پتلون کے ساتھ گزارنا پڑا۔

سرائے عالمگیر کے سٹیشن پر اتر کر ہم پیدل سوہن گاؤں کے قریب اپنے کیمپ میں پہنچے۔ میجر (بعد میں کرنل) حیات قیصرانی ہمارے بٹالین کمانڈر تھے اور وہی ہماری ٹریننگ کے ذمہ دار تھے۔ وہاں ہمیں رائفلیں مہیا کی گئیں اور اسے چلانے کی ضروری ٹریننگ بھی دی گئی۔ ٹریننگ کی تکمیل پر ہمیں جہلم چھاؤنی کی فائرنگ رینج میں لے جایا گیا۔ اب ہماری ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی اس ہدایت پر کہ کم عمر لڑکوں کو محاذ پر نہ بھجوایا جائے میرے سمیت کچھ رضا کاروں کو کیمپ میں ہی روک لیا گیا جب کہ ہمارے باقی ساتھی محاذ پر چلے گئے۔ اسی اثنا میں جماعت کی کوشش سے کھاریاں اور خانیوال سے کچھ مزید احمدی رضا کار وہاں پہنچ گئے اور دوبارہ پندرہ روزہ ٹریننگ شروع ہو گئی۔ ہمیں ٹریننگ دینے کے لیے پاکستانی فوج کے چار اہلکار آئے تھے جن میں سے دو کے نام اتفاقاً مجھے یاد رہ گئے ہیں یعنی زمرّد خان اور بابو خان۔ ان کا آرڈر دینے کا انداز بڑا دلچسپ تھا مثلاً وہ ہمیں پیش قدمی کے لیے تیاری کا حکم دیتے تو کہتے ''پرپٹو ایڈوانس'' اور پریڈ کے دوران منہ پیچھے کی طرف کر کے کھڑے ہونے کا حکم دیتے تو ''اباؤٹرن'' کہتے۔ اس وقت تو ہمیں سمجھ نہیں تھی لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ الفاظ ''پرپیئر ٹُو ایڈوانس'' اور ''اباوٗٹ ٹرن'' کی بگڑی ہوئی شکل ہیں۔

اس ٹریننگ کے اختتام پر ہمیں پھر فائرنگ رینج پر لے جایا گیا۔ مجھے یاد ہے میرا اسکور پچیس میں سے بیس نشانوں کا تھا جب کہ مولوی محمد یار عارف کے ایک بھائی، عبدالخالق کا سکور سو فیصد رہا۔ ہمارے ٹرینر اس بات پر حیران تھے کہ فوج کے باقاعدہ سپاہی لمبی ٹریننگ کے بعد بھی عام طور پر نشانہ بازی میں وہ مہارت حاصل نہیں کر پاتے جو ہم نے پندرہ دن کی ٹریننگ میں حاصل کر لی تھی۔

ٹریننگ کی کامیاب تکمیل کے بعد محاذِ جنگ کے لیے اپنی روانگی کا حال سناتے ہوئے نذیر ریحان بتاتے ہیں: ہم بھمبر سے باغ سر لے جائے گئے۔ اس محاذ کو ان دنوں کوڈ ورڈز میں ''بربط'' کا نام دیا گیا تھا۔ بھمبر سے آگے ''سُگا تلا'' میں ہمارا رِیئر کیمپ تھا اور محاذ کی لمبائی کوئی دو ڈھائی میل تھی جہاں فرقان بٹالین کے رضا کار ڈیوٹی پر تھے۔ وہاں کچھ درّے تھے جن کی حفاظت کے لیے رضا کاروں کی ڈیوٹی رات کو تین تین گھنٹے کے لیے لگتی تھی۔ الحمدللہ میں یہ ڈیوٹی بھی دیتا رہا ہوں۔ ایک رات ایک درّے پر ہمارے رضا کاروں،

عبدالمالک اور میرے ایک بھتیجے مسعود کی ڈیوٹی تھی۔ انہوں نے شرارتاً خود ہی ایک گرنیڈ پھینک کر اس کے ردِعمل کے طور پر فائرنگ شروع کر دی۔ جب باقی رضا کاروں نے گرنیڈ پھٹنے کی آواز سنی تو انہوں نے بھی اسے دشمن کی کارروائی سمجھ کر فائرنگ شروع کر دی۔ میجر حیات قیصرانی نے یہ آوازیں سنیں تو انہوں نے پورے محاذ کا چکر لگایا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ سب کچھ شرارتاً ہوا ہے چنانچہ انہوں نے ہمیں خوب ڈانٹ پلائی۔ ممکن ہے اس کے سرغنہ کو کوئی سزا بھی دی گئی ہو۔

نذیر ریحان اعتراف کرتے ہیں کہ بُعدِ زمانی کی وجہ سے وہ وہاں کے اکثر حالات بھول چکے ہیں تاہم انہیں یہ یاد ہے کہ جن رضا کاروں نے شروع میں ایم ٹی یعنی موٹر ٹرانسپورٹ کے شعبے میں خدمت کے لیے خود کو پیش کیا تھا بعد میں بہت پچھتائے کیوں کہ وہاں موٹر ٹرانسپورٹ کا کوئی تصور ہی نہ تھا اور سامان کی ساری نقل و حمل گدھوں پر ہوتی تھی یعنی موٹر ٹرانسپورٹ کی بجائے ان کا واسطہ اینیمل ٹرانسپورٹ سے آن پڑا تھا۔ بھمبر سے سامان آگے پہنچانے کی ساری کارروائی رات کے وقت کی جاتی تھی کیوں کہ دن کے وقت وہ علاقہ دشمن کی گولیوں کی زد میں رہتا تھا۔ نالے کا پانی بسا اوقات بہت تیز ہوتا جس کی وجہ سے سامان تو سامان بعض دفعہ گدھے بھی پانی کے ساتھ بہہ جاتے۔

انہیں یہ بھی یاد ہے کہ محاذ پر کھانے پینے کی بہت دقّت تھی۔ گوشت تو خیر سے ان کے لیے شجرِ ممنوعہ تھا ہی، دال کے نام پر بھی انہیں ابلا ہوا پانی ہی ملتا تھا۔ ایک دفعہ نعمت اللہ شریف، کمپنی کمانڈر محاذ پر آ گئے اور رضا کاروں سے پوچھنے لگے کہ کھانے کا کیا حال ہے۔ باقی سب لوگ تو خاموش رہے لیکن رلیو کے کا نذیر (جو جامعہ کا سٹوڈنٹ نہیں تھا) خاموش نہ رہ سکا اور کہنے لگا: سر! دال میں دال کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کا ضرور کچھ کیجئے گا۔

وہ کہتے ہیں: میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا لہٰذا جماعتی فیصلے کے تحت میں تین مہینے کے بعد واپس آ گیا۔

انہیں فرقان فورس میں جامعہ احمدیہ کے رضا کاروں میں سے صرف برکت اللہ محمود، سعید اظہر، سیّد کمال یوسف، مجید ہاتو اور شیخ رشید احمد کے نام ہی مستحضر رہ سکے ہیں۔

نذیر ریحان بتاتے ہیں: شاہد کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعہ کے باقی طلبہ کی طرح میں نے بھی ایک سال طب پڑھی تھی جو ڈاکٹر نذیر احمد ریاض مصنف ''سیرتِ حضرت مولانا شیر علی'' پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے اور میرے ہم جماعت، محمد اسلم فاروقی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے حکم پر طبّیہ کالج، انجمن حمایتِ اسلام، لاہور میں داخلہ لے لیا اور چار سال کا کورس مکمل کیا جس کی تکمیل پر ہمیں زُبدۃ الحکما کی ڈگری ملی۔ طبّیہ کالج میں قیام کا زمانہ یاد کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ اسلم فاروقی ان سے کچھ عرصہ پہلے طبّیہ کالج جا چکے تھے جب کہ وہ خود بعد میں وہاں پہنچے نیز یہ کہ وہ ایک سال کالج کے رسالہ ''طبّیہ کالج میگزین'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور ایک سال اس کے ایڈیٹر رہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ جامعہ ایسے تعلیمی اداروں کی پابندیاں برداشت کرنا ہر کس و ناکس کا کام

نہیں، کیا وہاں سے بھی کچھ لوگ اپنا دامن چھڑا کر چلے گئے نذیر ریحان نے بتایا کہ قادیان میں ان کی کلاس میں کم وبیش ساٹھ سے پینسٹھ طالب علم تھے جو پاکستان میں آ کر پچیس رہ گئے لیکن ان میں سے بھی شاہد کا امتحان صرف پانچ لوگوں نے پاس کیا جن میں موصوف کے علاوہ مقبول احمد ذبیح، عبدالحکیم اکمل، سیّد کمال یوسف، عبدالباسط اور حافظ محمد سلیمان شامل تھے۔ یاد رہے کہ حافظ محمد سلیمان پہلے راولپنڈی میں مولوی غلام اللہ کے مدرسے میں پڑھتے رہے تھے تاہم انہوں نے احمدیت قبول کر لی اور وہ یہ مدرسہ چھوڑ کر مرکز میں آ گئے تھے۔ جامعہ احمدیہ میں تکمیلِ تعلیم کے بعد انہوں نے ایک کامیاب مربی کے طور پر وقت گزارا۔

ہمارے اس بزرگ دوست کا مشاہدہ ہے کہ وہ طالب علم جنہوں نے اس ادارے کی پابندیوں کو خوشی سے اپنے اوپر لاگو کیا بعد میں کامیاب مربی بنے لیکن وہ طلبہ جنہیں کسی وجہ سے اس ماحول سے اختلاف رہا بعد میں وقف سے فارغ ہو گئے اور بعض تو جماعت سے بھی دُور ہو گئے۔

نذیر ریحان کے بعد آپ کا تعارف ان ہی کے ایک ہم جماعت، عبدالباسط شاہد سے کرایا جا رہا ہے جنہیں نذیر ریحان کی طرح سلسلے کی طویل خدمت کا اعزاز حاصل ہے۔ انہیں ایک لمبا عرصہ تک کراچی، ملتان اور جہلم میں بطور مربی کام کرنے کا موقع ملا اور پھر پندرہ سال تک تنزانیہ، کینیا، زیمبیا، زمبابوے اور ملاوی میں گرانقدر خدمات کی سعادت حاصل ہوئی۔ ملازمت کے آخری سالوں میں وہ فضل عمر فاؤنڈیشن میں کام کر رہے تھے کہ اپنی اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے انہیں خود درخواست کر کے وقف سے فراغت حاصل کرنا پڑی۔ وہ پچھلے تیرہ چودہ سال سے انگلستان میں ہیں اور اس بات پر نازاں ہیں کہ حضرت مصلح موعود کے وقفِ زندگی کے متعلق ارشادات اور اپنے بزرگ والدین کی حوصلہ افزائی سے انہیں نہ صرف زندگی وقف کرنے کی توفیق حاصل ہوئی بلکہ اس عہد کو نباہنے کا موقع بھی ملا۔

وہ بتاتے ہیں: میں نے ۱۹۴۷ء میں مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لیا تھا لیکن ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ موسمِ گرما کی تعطیلات ہو گئیں۔ اسی عرصے میں مملکت خداداد پاکستان معرضِ وجود میں آ گئی چنانچہ موسمی رخصتوں کے بعد جب مدرسہ کھلنے کا وقت آیا تو ہم پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اس نازک موقع پر حضرت مصلح موعود نے تمام تر بے سروسامانی کے باوجود اپنی خداداد اولوالعزمی سے کام لیتے ہوئے جماعت کے شیرازہ کو بکھرنے سے محفوظ رکھا اور وہ تمام تعلیمی ادارے جو جماعت کے زیرِ انتظام قادیان میں چل رہے تھے انہیں فوری طور پر مناسب جگہوں پر جاری کرا دیا۔ جامعہ بھی ان میں سے ایک تھا چنانچہ لاہور میں سنت نگر کی ایک متروکہ عمارت میں اس ادارے نے کام شروع کر دیا تاہم اس وقت بے سروسامانی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ صرف ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جنہوں نے وہ دور دیکھ رکھا ہے۔ آپ یقین کریں کہ اس زمانے میں اس ادارے کا کُل فرنیچر ایک خستہ سی چٹائی اور ایک کرسی (جو شاید لُوٹنے والوں کو بیکار لگی تھی) پر مشتمل تھا۔ ہمارے اساتذہ میں سے کچھ تو ابھی قادیان میں تھے اور کچھ پاکستان میں اپنے قدم جمانے کی کوشش میں تھے چنانچہ کُل سٹاف صرف حافظ مبارک احمد پر مشتمل تھا اور سب کلاسوں کے ملا کر کوئی دس طالب علم تھے جو اس چٹائی پر بیٹھ کر موصوف کے علم و فضل سے

استفادہ کرتے تھے۔ پاکستان آمد پر مولانا ابوالعطا جالندھری نے اس بے سامان جامعہ کے پرنسپل کا چارج لیا۔

جامعہ کی لاہور سے چنیوٹ منتقلی کا ذکر ہو تو باسط بتاتے ہیں: یہاں بھی جو عمارت اس مقصد کے لیے دستیاب ہو سکی ہماری ضروریات کے لیے کافی نہ تھی۔ یاد رہے کہ قادیان میں مدرسہ احمدیہ کی پہلی جماعت میں ساٹھ سے زیادہ طالب علم ہوا کرتے تھے لیکن تقسیم کے بعد چنیوٹ میں ان میں سے صرف سترہ طالب علم جمع ہو سکے۔ طلبہ کی اتنی تھوڑی تعداد کے باوجود وہاں کی عمارتیں ہماری ضروریات کی کفالت نہ کر سکیں چنانچہ جلد ہی جامعہ کو احمد نگر منتقل کرنا پڑا۔ اگرچہ احمد نگر میں اس مقصد کے لیے حاصل کی جانے والی عمارت قدرے بہتر تھی تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی رہائشی عمارت نہ تھی بلکہ ایک اصطبل تھا جہاں اس کے اصل مالکان ڈھور ڈنگر باندھتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس کے فرش گوبر سے اٹے پڑے تھے۔ وقارِ عمل کے ذریعے اس کی ممکنہ صفائی کی گئی اور پھر ایک لمبے سے برآمدے میں چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کر کے کلاس روم بنائے گئے اور اسی عمارت کے ایک حصے کو ہوسٹل کا درجہ دے دیا گیا۔

احمد نگر میں زمانۂ طالب علمی کی بات ہو تو باسط کہتے ہیں: اگرچہ یہ انتہائی کسمپرسی کا دور تھا لیکن ہم مایوس ہونے کی بجائے اس صورتِ حال سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی نہ ختم ہونے والی شرارتیں نِت نئی شکلیں اختیار کرتی رہتی تھیں چنانچہ بعض طالب علم نظر بچا کر چپکے سے ایک کلاس سے دوسری کلاس میں کنکر یا کاغذ کے گولے پھینک دیتے۔ یہ روز کا معمول تھا چنانچہ کچھ دیر شکایت اور جواب طلبی کا سلسلہ چلتا اور پھر پڑھائی شروع ہو جاتی۔ ایک دفعہ ہمارے ایک کلاس فیلو، عبدالحکیم اکمل نے جو بعد میں ہالینڈ میں مربی انچارج رہے اور اب وفات پا چکے ہیں شرارت سے ایک کنکر اپنی انگلیوں میں پھنسا کر دوسری کلاس کی طرف اچھال دیا۔ یہ کنکر شاید کسی کو لگ گیا تھا چنانچہ شور مچ گیا۔ اس وقت ہمیں صاحبزادہ ابوالحسن قدسی پڑھا رہے تھے۔ موصوف بہت کم گو تھے اور نرم خُو بھی لیکن بعض دفعہ انہیں غصہ آ جاتا تھا۔ اتفاق سے انہوں نے اکمل کو یہ شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیا جب کہ اکمل سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے اور کسی کو پتا نہیں چلنے دیا کہ یہ کام ان کا ہے۔ قدسی صاحب نے انہیں آگے آنے کو کہا۔ کلاس چٹائی پر بیٹھی تھی اور اسی چٹائی کے ایک کونے پر استادِ محترم بھی تشریف فرما تھے۔ اکمل نہایت سنجیدگی سے آلتی پالتی مار کر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ قدسی صاحب ان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمانے لگے: اوئے اس کو دیکھو۔ دیکھنے میں کتنا مرحوم و مغفور نظر آتا ہے لیکن شرارتیں کیسی کرتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اکمل کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ان پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ساتھ ساتھ کہتے جا رہے تھے: اس مرحوم و مغفور کو دیکھو تو سہی، اس کا دماغ شیطان کا چرخہ ہے۔ قدسی صاحب نے انہیں اس قدر مارا کہ وہ مار نہ صرف اکمل کو خود زندگی بھر یاد رہی بلکہ ان کے کلاس فیلوز بھی آج تک اسے نہیں بھلا سکے۔ قدسی صاحب کا یہ فقرہ کہ ''دیکھنے میں کتنا مرحوم و مغفور لگتا ہے'' مدتوں اکمل کے ساتھ چپکا رہا۔

احمد نگر کے زمانے میں کھانے پینے کی سہولتوں کا ذکر ہو تو باسط بتاتے ہیں: شروع شروع میں احمد نگر میں

کھانے پینے کی اشیاء کی قدرے فراوانی تھی مگر آہستہ آہستہ (شاید ملک بھر میں مجموعی صورتِ حال ہی ایسی ہو) گندم کی قلت ہوگئی اور ہمیں کھانے میں دو روٹیوں کی بجائے ایک روٹی ملنے لگی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ہمارے لیے صبح وشام چاول پکنے لگے۔ پھر ہم باسمتی چاول سے موٹے چاول پر آ گئے اور ایک مرحلے پر وہ بھی نایاب ہو گئے۔ مجھے وہ دن ابھی تک نہیں بھولے جب ہوسٹل میں آٹا میسر تھا نہ چاول لیکن پیٹ کا جہنم تو کسی صورت بھرنا تھا چنانچہ اس کے لیے ایک منفرد تجویز سوچی گئی۔ اس زمانے میں گاجر اور گڑ بہت سستا تھا چنانچہ ان دونوں کو ملا کر ایک حلوہ نما چیز تیار کی جانے لگی۔ یوں تو گاجر کا حلوہ ایک انتہائی مزیدار چیز ہے مگر یہ سیاہی رنگ ملغوبہ دیکھ کر اسے کھانے سے پہلے ہی سیری ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی انسان ہر وقت میٹھا نہیں کھا سکتا اور اس کی روٹی اور سالن (خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو) کی طلب کو کوئی اور چیز ختم نہیں کر سکتی لہٰذا ہمیں بڑی پریشانی ہوتی تاہم مرتا کیا نہ کرتا، ہمیں کئی کئی دن تک اسی حلوے پر قناعت کرنا پڑتی۔

وہ مزید بتایا کرتے ہیں: اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے ہمیں چائے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن ہوسٹل کی طرف سے اس کی وقت بے وقت فراہمی کا کوئی انتظام نہ تھا چنانچہ جب اس کی طلب بڑھ جاتی تو اولاً دو چار لڑکے مل کر دو آنے جمع کرتے۔ مالی تنگی کا یہ عالم تھا کہ دو آنے بھی آسانی سے جمع نہ ہو پاتے۔ ان پیسوں میں سے ایک آنے کا دودھ، دو پیسے کی پتّی اور دو پیسے کا گُڑ منگوایا جاتا۔ سامان آ جاتا تو چائے تیار کرنے کا مرحلہ آتا۔ ہم بعض دفعہ تو ٹین کے ایک ڈبہ میں پانی، دودھ، گڑ اور پتّی اکٹھی ڈال کر تندور میں رکھ دیتے۔ کچھ ہی دیر میں پانی کھولنے لگتا اور چائے تیار ہو جاتی۔ اگر کسی وقت تندور گرم نہ ملتا تو چائے تیار کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ ہم میں سے کچھ طالب علموں کے پاس شیشے کے لیمپ تھے۔ انہوں نے لوہے کے سٹینڈ بنوا رکھے تھے۔ یہ سٹینڈ لیمپ پر رکھ کر اس پر چائے کی کیتلی رکھ دی جاتی۔ لیمپ کے شعلے کی حرارت پانی ابلنے کے لیے ناکافی ہوتی لہٰذا چائے بننے میں بہت دیر لگتی اور بالآخر جو مشروب تیار ہوتا اسے چائے کہنا چائے کی توہین تھی لیکن ہم مجبوراً اسی مشروب کو چائے سمجھ کر پی جاتے۔

احمدیوں کے مروّج کلچر اور احمد نگر کے مقامی کلچر کا فرق واضح کرتے ہوئے باسط کہتے ہیں: احمد نگر میں ٹھیٹھ پنجابی بلکہ جانگلی زبان بولی جاتی تھی جب کہ ہماری زبان پنجابی، اردو اور انگریزی کا ملغوبہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت دفعہ ہماری باتیں مقامی لوگوں کی سمجھ میں نہ آتیں اور بعض دفعہ ہم ان کی بات سمجھ نہ پاتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ہمارے ایک ساتھی نے کچھ کبوتر شکار کیے۔ ہمارے پاس کوئی دیگچی نہ تھی جس میں انہیں پکایا جا سکے چنانچہ ہم نے بعض مقامی لوگوں سے ''دیگچی'' یا ''پتیلی'' یا ''ہنڈیا'' کی فرمائش کی مگر وہ ہماری بات سمجھنے سے قاصر رہے حتّٰی کہ جب ہم نے ان کے پاس موجود ایک ہنڈیا کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ہمیں تو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ آپ لوگ ''کُنّی'' کے متلاشی ہیں۔ اُس روز ہمیں پتا چلا کہ ہنڈیا کو مقامی زبان میں کُنّی کہا جاتا ہے۔

باسط اپنے اساتذہ کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جامعہ میں قیام کے دوران انہیں

جن اساتذہ سے براہِ راست فیض یاب ہونے کا موقع ملا اس کی فہرست خاصی طویل ہے۔ یہ سبھی استاد بہت قابل، اپنے اپنے مضامین کے ماہر، شاگردوں سے محبت کرنے والے اور ان کی ضروریات و جذبات کا خیال رکھنے والے تھے تاہم وہ مولانا ابوالعطا جالندھری سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مولانا اپنے طالب علموں سے ذاتی تعلق رکھتے اور وقتاً فوقتاً ان کے حالات کا جائزہ لے کر ان کی ہر جائز ضرورت پوری کرنے میں کوشاں رہتے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی ان کا معمول تھا۔ مجھے یاد ہے جامعہ میں کوئی تقریب تھی۔ مولانا نے اس کی رُوداد لکھنے پر میری ڈیوٹی لگائی۔ میں نے تقریب میں بیٹھ کر ضروری نوٹس لیے اور پھر رپورٹ مرتّب کر کے مولانا کو پیش کر دی۔ الحمدللہ انہوں نے اسے پسند کیا لیکن دریافت فرمایا کہ میں نے اس کے نیچے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ میں نے عرض کی: مجھے معلوم نہیں کہ یہ رپورٹ الفضل کو بھجوائی جانی ہے یا کسی دفتری اتھارٹی کو لہٰذا یہ رپورٹ آپ ہی کے دستخط سے جانی چاہیے تاہم انہوں نے اپنے قلم سے اُس رپورٹ کے نیچے میرا نام لکھا اور اس کے نیچے ''سیکرٹری جامعہ احمدیہ'' کے الفاظ کا اضافہ کر دیا حالانکہ اس زمانے میں ''سیکرٹری جامعہ احمدیہ'' کا کوئی عہدہ تھا ہی نہیں۔ یہ رپورٹ بعد میں الفضل میں شائع ہوگئی۔ مجھے اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی اور میرے کئی دوستوں نے مجھے مبارکباد بھی دی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مولانا کی شفقتِ بے پایاں ہی کا نتیجہ تھا۔

صرف یہی نہیں باسط کو مولانا کی شفقت کے اور بھی بہت سے واقعات یاد ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں: مولانا نے جامعہ میں قائم ہونے والے اس تعلق کا ہمیشہ احترام کیا۔ جب میری پوسٹنگ تنزانیہ میں ہوئی تو میں ان سے الوداعی ملاقات کے لیے الفرقان کے دفتر میں حاضر ہوا۔ موصوف نے میری تقرری پر مجھے مبارکباد دی اور بعض قیمتی مشوروں سے نوازا۔ جب میں اٹھنے لگا تو وہ پوچھنے لگے: بھئی آپ اتنی دور جا رہے ہیں۔ آپ کی کوئی الوداعی دعوت بھی ہوئی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو مولانا نے اسی وقت اپنے بیٹے عطاء الکریم شاہد کو آواز دی جو اتفاقاً قریب تھے اور انہیں چند نام لکھواتے ہوئے کہا کہ ان سب دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا جائے جو میرے اعزاز میں ہوگا۔ میری طرف سے معذرت کے باوجود انہوں نے اپنے گھر پر میرے لیے اس دعوت کا اہتمام کیا جس میں ربوہ کی چُنیدہ شخصیات شامل ہوئیں۔ موصوف کی یہ دعوت اس عاجز کے لیے ان کی محبت کی آئینہ دار تھی۔ اسی طرح کا واقعہ میری کینیا روانگی کے وقت ہوا لیکن جب میری زیمبیا کے لیے تقرری ہوئی تو میں نے ارادتاً اس کا ذکر مولانا کے سامنے نہیں کیا۔ میں ڈرتا تھا کہ اس بار پھر انہیں میرے لیے اس طرح کی کسی تقریب کا انعقاد نہ کرنا پڑے۔ ہم نمازِ فجر کے بعد سیر اکٹھے کیا کرتے تھے۔ جس روز میری ربوہ سے روانگی تھی اس روز بھی ہم نے اکٹھے سیر کی۔ ساتھ کچھ اور احباب بھی تھے۔ رخصت ہوتے ہوئے میں نے ان کو اپنی روانگی کا پروگرام بتایا اور دعا کی درخواست کی۔ مولانا سخت ناراض ہوئے کہ میں نے ان سے اس بات کا ذکر پہلے کیوں نہیں کیا تھا اور بہ اصرار کہا کہ وہ مجھے چائے پلائے بغیر نہ جانے دیں گے۔ یوں ہم سب دوست جو اکٹھے سیر کر رہے تھے مولانا کے گھر گئے اور ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔

باسط بتاتے ہیں کہ جب مولانا مجلس انصاراللہ مرکزیہ میں نائب صدر تھے وہ ربوہ سے باہر تربیتی

پروگراموں کے لیے جاتے ہوئے کئی بار انہیں بھی ہمراہ لے جاتے حالانکہ وہ اس وقت نوآموز تھے۔ بہ الفاظِ باسط: جب حاضرین سے تعارف کا موقع آتا تو اکثر فرمایا کرتے: عبدالباسط بولتے کم ہیں لیکن جتنا بولتے ہیں بہت اچھا بولتے ہیں۔ باسط کہتے ہیں: ربوہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک سے بڑھ کر ایک عالم موجود تھا۔ ایسے میں مجھ ایسے کم علم کو اپنے ہمراہ لے جانے میں مجھے ایک ہی مصلحت نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ مجھے وہ تجربہ حاصل ہو سکتا جو ایک کامیاب مربی کے لیے ضروری ہے۔

جامعہ احمدیہ سے فارغ ہونے کے بعد جب باسط کے جامعۃ المبشرین میں داخلے کا وقت آیا تو حسنِ اتفاق سے مولانا ہی اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس طرح وہ مولانا کے ساتھ ہی احمد نگر سے ربوہ آ گئے۔ ربوہ میں جامعۃ المبشرین کو جلسہ سالانہ کے لنگر خانہ والی کچی عمارت الاٹ ہوئی۔ اس عمارت کے صحن میں تندور لگے ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے کئی حادثے اور لطیفے جنم لیتے رہتے تھے۔ جیسا کہ باسط اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل انٹرنیشنل (۷ مئی ۲۰۰۴ء) میں لکھتے ہیں تمام تر مسائل کے باوجود: ''جامعہ احمدیہ کے اساتذہ اور طالب علم اس اعزاز و سہولت پر خوش ہو گئے کہ بالآخر ہم مرکز میں پہنچ گئے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے کچھ کتب، کچھ چارپائیاں اور بستر بھی میسر آ چکے تھے مگر ان کو رکھنے کے لیے جگہ بنانے میں ہر طالب علم نے اینٹوں، روڑوں اور پتھروں کی مدد سے میز اور کرسیاں ایجاد کیں مگر بارش ہو جانے کی صورت میں...... کمرے اس کثرت سے ٹپکتے تھے کہ چھت کی مٹی سے بچنے کے لیے باہر بارش میں بھیگنا بہتر لگتا تھا اور کتابوں وغیرہ کو...... محفوظ کرنے کے لیے پانی رکھنے کی لوہے کی ٹینکیوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔''

باسط کو اپنے بچپن میں گوہد پور میں اہل حدیث کے ساتھ ایک ایسے مناظرے میں شمولیت کا موقع بھی مل چکا ہے جس میں جماعت کی طرف سے مولانا ابوالعطا جالندھری کو مناظر نامزد کیا گیا تھا۔ مناظرے کی ایک شرط یہ تھی کہ اطراف کے مناظر مولوی فاضل پاس ہوں گے۔ اہلِ حدیث کی طرف سے عبداللہ معمار آئے ہوئے تھے جو مولوی فاضل نہ تھے۔ مولانا نے اعتراض کیا کہ چونکہ عبداللہ معمار شرائطِ مناظرہ پر پورا نہیں اترتے لہٰذا یہ مناظرہ نہیں ہو سکتا۔ عبداللہ معمار نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان پاس نہیں کیا دعویٰ کیا کہ وہ کئی کتب کے مصنف ہیں اور مولوی فاضل کے طلبہ کو پڑھاتے ہیں لہٰذا شرائطِ مناظرہ پر پورا اترتے ہیں۔ اسی اثنا میں عبداللہ معمار کے ایک منحنی سے ساتھی نے اٹھ کر اعلان کیا کہ وہ ان کا شاگرد ہے اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کر چکا ہے لہٰذا عبداللہ معمار اس مناظرے میں حصہ لینے کے اہل ہیں۔ اس کے باوجود مولانا ابوالعطا جالندھری اپنی بات پر قائم رہے کہ چونکہ عبداللہ معمار خود مولوی فاضل نہیں ہیں لہٰذا یہ مناظرہ نہیں ہو سکتا۔ جب دوسری طرف سے مولانا کی بطور مناظر اہلیت کو چیلنج کیا گیا تو موصوف نے بتایا کہ وہ مولوی فاضل ہیں اور پھر اپنا میڈل مجمع کو دکھاتے ہوئے بتایا کہ وہ اس امتحان میں یونیورسٹی میں اوّل رہے تھے۔ انہوں نے مزید کہا: صرف یہی نہیں، مولوی فاضل پاس نوجوانوں کی ایک جماعت میرے ساتھ ہے اور آپ چاہتے ہیں تو خود دیکھ لیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اشارہ کیا تو بہت سے افراد جو قادیان سے ان کے ہمراہ گوہد پور

گئے ہوئے تھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور شہادت دی کہ وہ سبھی خدا کے فضل سے مولوی فاضل پاس ہیں۔

اب باسط کو یاد نہیں کہ کس طرح لیکن بعد میں یہ مناظرہ ہوا۔ وہ کہتے ہیں: میرا تاثر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احمدیوں کو علمی اور اخلاقی، ہر لحاظ سے فتح عطا فرمائی۔

مولانا ابوالعطا جالندھری کے علاوہ باسط کے ایک اور پسندیدہ استاد قاضی محمد نذیر لائلپوری ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ غیر معمولی قوتِ استدلال سے متصف تھے۔ وہ بہت بڑے عالم، مقرر اور مناظر تھے۔ اختلافی مسائل ان کا خصوصی موضوع تھا چنانچہ ان کے شاگرد جب کبھی پڑھنے کے موڈ میں نہ ہوتے تو وہ طے کر لیتے کہ آج کلاس میں جاتے ہی فلاں اختلافی مسئلہ پر فلاں سوال پیش کر دیا جائے گا۔ کلاس شروع ہوتی تو ایک لڑکا کھڑا ہو کر اپنا سوال پیش کر دیتا۔ بس پھر کیا تھا، موصوف اس مسئلے کا بخیہ ادھیڑنے میں مصروف ہو جاتے اور بسا اوقات یہ سلسلہ پیریڈ ختم ہونے پر بھی ختم نہ ہوتا۔

ایک جلسہ سالانہ پر انہوں نے ختم نبوت کے موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ ان دنوں یہ موضوع ان کے ذہن پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ ربوہ سے احمد نگر جاتے ہوئے انہیں جامعہ احمدیہ کا جو لڑکا بھی راستے میں مل جاتا وہ اپنے سائیکل سے اتر کر اس کے ساتھ پیدل چل پڑتے اور سارا راستہ اسی موضوع پر باتیں کرتے چلے جاتے۔ وہ اپنی گفتگو میں اس قدر منہمک ہوتے کہ باقی فاصلہ پیدل ہی طے کر لیتے۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے باسط کہتے ہیں: مشکلات کے باوجود ہمارے اساتذہ جذبہ وقف سے سرشار تھے۔ وہ ہماری تعلیم و تربیت میں پوری توجہ اور دلجمعی سے ماں باپ کی سی محبت و شفقت سے مصروف رہتے اور طالب علم بھی خدمتِ دین کی سعادت حاصل کرنے کی امید میں پوری بشاشت سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہتے۔ ہر طالبِ علم نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق ان سے استفادہ کیا۔

آپ نے جامعہ احمدیہ اور اس کے اساتذہ کے بارے میں عبدالباسط کی یادداشتیں ملاحظہ فرمائیں۔ اب میں آپ کو عبدالسلام ظافر کے پاس لیے چلتا ہوں جو عبدالباسط کے برادرِ نسبتی ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ کے اولڈ سٹوڈنٹ بھی ہیں۔ اگرچہ وہ کسی وجہ سے جامعہ کے آخری امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے اور یوں ان کا راستہ اپنے باقی ساتھیوں سے جدا ہو گیا تاہم انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جماعت کی خدمت میں ہی بسر کیا۔

عبدالسلام ظافر مقیم انگلستان جن کا تعلق ضلع گورداسپور کے ایک قصبے، بیّے ہالی سے ہے نے ۱۹۴۲ء میں مدرسہ احمدیہ قادیان میں داخلہ لیا تھا۔ وہ لاہور، چنیوٹ اور احمد نگر میں جامعہ میں پڑھتے رہے تاہم مولوی فاضل کے امتحان میں ناکامی پر وہ لاہور منتقل ہو گئے اور تدریس کا شعبہ اختیار کر لیا۔ بعد میں انہوں نے اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کیا اور لمبا عرصہ سیرالیون کے جماعتی سکولوں میں پڑھاتے رہے۔ انہیں پچیس سال اس خدمت کا موقع ملا۔ واپسی پر وہ وکالتِ تبشیر، تحریک جدید انجمن احمدیہ اور نصرت جہاں اکیڈمی میں بھی کام کرتے رہے لیکن ۲۰۰۴ء سے انگلستان منتقل ہو چکے ہیں۔

ان کی ایک کتاب جس میں ان کے مختصر حالاتِ زندگی اور کلام شامل ہے ''شمعِ فروزاں'' کے نام سے

شائع ہوچکی ہے۔اس کتاب میں وہ جامعہ احمدیہ میں گزرے ہوئے وقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پارٹیشن کے بعد پریم نگر، لاہور میں ایک چھوٹے سے مکان میں مدرسہ احمدیہ اور جامعہ کا پھر اجرا ہوا۔ آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے طلبہ آنا شروع ہوگئے۔ چند اساتذہ، مولوی عبداللطیف بہاولپوری، صاحبزادہ ابوالحسن قدسی اور مولانا حکیم محمد اسماعیل نے کلاسز لینی شروع کردیں۔ کچھ طلبہ نے جسونت بلڈنگ جو جودھامل بلڈنگ اور رتن باغ کے قریب تھی کے تہ خانہ میں رہائش رکھی۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد پتا چلا کہ چنیوٹ کے گڑھے محلّہ میں کوئی منصب صاحب کی کوٹھی تھی وہ جامعہ کے لیے الاٹ ہوگئی ہے چنانچہ لاہور سے چنیوٹ جانے کا فیصلہ ہوا۔ اگلے روز بستر بوریا باندھ کر سب تیار ہوگئے۔ ان دنوں ٹرانسپورٹ کا بہت ہی بُرا حال تھا۔ لاہور سے چنیوٹ آنے تک کئی گھنٹے لگ گئے۔ آخر منصب صاحب کی کوٹھی پہنچ گئے۔ اوپر والی منزل پر بڑا کمرہ تھا۔ سب اپنے اپنے بندھے ہوئے بستروں پر بیٹھ گئے۔ کٹھن سفر کی تکان پھر گرد وغبار سے اَٹے ہوئے سبھی چُپ چاپ خاموش سہمے بیٹھے تھے کہ عبداللطیف انور اچانک بولے: آہا! آہا! آج حضرت مسیح موعود کا الہام اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا دیکھ لیا ہے۔ سبھی حیرت سے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے پوچھا کون سا الہام؟ کہنے لگے آپ نے وہ درِثمین میں فرمایا ہے:

گڑھے میں تُو نے سب دشمن اُتارے
ہمارے کر دیئے اونچے منارے

سُن کے سب جو چپ چاپ اداس بیٹھے تھے کشتِ زعفران کی طرح کھلکھلا اُٹھے۔ مؤثر انداز میں کلاسز شروع ہوگئیں۔ جیسے بھی حالات تھے پڑھائی سنجیدگی سے ہوتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد احمد نگر میں جامعہ کے لیے معقول جگہ مل گئی۔ کلاس رومز، طلبہ کا ہوسٹل اور اساتذہ کرام کی رہائش کا بھی تسلّی بخش انتظام ہوگیا۔ سپورٹس کے لیے فٹ بال، ہاکی، کبڈی اور والی بال کے میدان طلبہ نے تیار کرلیے۔ کبھی کبھی فٹ بال اور ہاکی کی ٹیموں میں کھیل کے میدان میں تیاری کے سلسلے میں تکرار اور جھگڑے کی صورت ہوجایا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہاکی کے کھلاڑیوں نے ہاکی کے لیے فیلڈ تیار کی۔ فٹ بال کے ایک دو کھلاڑیوں نے رات کو اسے خراب کر دیا۔ ہاکی کے کھلاڑی بہت برہم ہوئے۔ آپس میں تکرار اور جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی۔

محترم پرنسپل مولانا ابوالعطا نے خاکسار کو بلا کر فرمایا: ظافر! تم فٹ بال کے کیپٹن بن جاؤ۔ آپ نے غالباً اس خیال سے خاکسار کو یہ اعزاز بخشنے کا فیصلہ فرمایا کہ خاکسار کا طلبہ پر اچھا اثر تھا۔ سبھی احترام کرتے تھے۔ خاکسار نے عرض کیا کہ عاجز والی بال اور ہاکی کا کھلاڑی ہے۔ فٹ بال میری گیم نہیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم فٹ بال کے کیپٹن ہو۔ خاکسار نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد لالیاں میں علاقہ بھر کی ٹیموں کا ٹورنامنٹ تھا۔ جامعہ کو بھی شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ ٹیمیں تیار ہوگئیں۔ ٹورنامنٹ میں...... حصہ لینے کی اجازت مل گئی۔ لالیاں پہنچ گئے۔

ہمارا پہلا فٹ بال کا میچ تھا۔ مدِّ مقابل ایک کمزور سی ٹیم تھی۔ ہمارے کھلاڑیوں نے آپس میں مشورہ کیا

کہ ظافر بیشک اچھا فٹ بالر نہیں ہے آخر ہے تو ہمارا کیپٹن، اسے میچ میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے گول کیپر بنایا جائے۔ مجھے کہنے لگے کہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہمارے کیپٹن ہیں اور کسی میچ میں بھی حصہ نہ لیں۔ آج کے میچ میں ہمارے مدِّ مقابل نہایت ہی نکمّی اور کمزور ٹیم ہے۔ آپ گول کیپر ہوں گے۔ بس گول میں کھڑے رہیں۔ تسلی رکھیں آپ تک بال پہنچنے نہیں پائے گی۔ ان کے اصرار پر مجھے یہ کٹھن پوسٹ قبول کرنی پڑی۔ واقعی بال مجھ تک نہ پہنچی۔ پہلے ہاف میں ہماری ٹیم نے تین گول مخالف ٹیم پر کردیئے۔ ریفری صاحب نے سیٹی بجا کر دوسرے ہاف کا میچ شروع کروادیا۔ مخالف ٹیم کا سنٹر فارورڈ اچانک تیزی سے بال نکال کر ہماری سائیڈ کے پینلٹی ایریئے میں عین گول کے سامنے پہنچ گیا۔ خاکسار گول کے درمیان میں بے خبری کے عالم میں کھڑا تھا کہ سامنے سے زبردست کِک ہوئی اور بال سیدھا میرے سینے پہ پوری شدت سے ٹکرایا اور اُسی تیزی سے واپس لوٹا۔ خاکسار دھڑام سے نیچے گر گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور شاید کچھ لمحات کی بے ہوشی بھی ہوگئی ہو۔ جب ذرا ہوش آئی تو دیکھا کہ تماش بین نعروں اور تالیوں سے دادِ تحسین دے رہے ہیں۔ واہ واہ! خوب! کیسی زبردست کِک کو سینے پہ لے کے گول بچالیا۔ اُن سادہ مزاجوں کو کیا خبر کہ اس عاجز پہ کیا بیتی۔ ہماری ٹیم سیمی فائنل ہار گئی۔ اگلے روز فائنل میچ تھا۔ ایک فاتح ٹیم کے تین نمائندے آئے اور کچھ وقت تک ہمارے سینئر کھلاڑیوں کے ساتھ لمبی بات چیت کرتے رہے اور چلے گئے۔ میں نے اپنے کھلاڑیوں سے کہا کہ میں آپ کا کپتان ہوں۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا کیا بات چیت ہوئی۔ بولے: وہ یہ بتانے آئے تھے کہ ان کا فائنل میچ ایک سخت ٹیم سے پڑ گیا ہے۔ ہمیں اپنے گول کیپر پر بھروسہ نہیں۔ اگر آپ لوگ اپنا گول کیپر جس نے پہلا میچ کھیلا تھا ہمیں دے دیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کو کہہ دیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اس طرح دوسری ٹیم کو اعتراض ہوگا۔

احمد نگر کے ابتدائی دور کا یہ ناقابلِ فراموش حادثہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اس لیے میں لکھنے سے رک نہیں سکا۔''

جامعہ میں موصوف کے اساتذہ میں سے ایک مولوی ظہور حسین مجاہد بخارا بھی تھے جنہیں روس کے سفر کے دوران بخارا میں قید و بند کی شدید صعوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ وہ ایک شفیق استاد تھے جو ظافر سے بہت محبت رکھتے تھے۔ برلن میں بیتِ خدیجہ کا افتتاح ہوا تو ظافر کو اپنے اس استاد کی یاد آ گئی اور انہوں نے برجستہ کہا:

وہ جو آہِ غریباں مرے دوستو
کل بخارا کے زنداں سے ٹکرائی تھی
پھول جھڑیوں کی صورت ہوئی ضُوفشاں
حق پرستوں کی نصرت کا زندہ نشاں
آخرِ کار دیوارِ برلن گری
درسِ توحید کے در کھلے چار سُو

پھر خدیجہ کی ...... کے مینار سے
گونجتی ہے صدا اللہ ھُو اللہ ھُو

فرقان فورس کا ذکر کرتے ہوئے موصوف اپنی زیرِنظر کتاب میں لکھتے ہیں: ’’جون ۱۹۴۸ء میں فرقان فورس کا قیام عمل میں آیا۔ جامعہ کے طلبہ نے بھی اپنی خدمات پیش کردیں۔ لاہور میں بھرتی ہوئی۔ پھر سرائے عالمگیر میں ٹریننگ حاصل کی اور کشمیر روانہ ہوگئے۔ ہراول دستہ کیپٹن عبداللہ مہار کی کمان میں بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ صوبیدار عبدالوہاب اور دوسرے ایکس سروس جوان تھے۔ نئے رنگروٹ ہم تین تھے: خاکسار عبدالسّلام ظافر، محمد احمد حیدر آبادی اور میاں سعید درد۔ باقی بٹالین کے جوان دو دن کے بعد محاذ پر پہنچے۔

خاکسار کی حدیث میں کمپارٹمنٹ آ گئی تھی اس لیے ۲۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو خاکسار اور کچھ دوسرے مجاہدین جن کا وقف تھوڑے وقت کے لیے تھا محترم کیپٹن حمید احمد کلیم کے ساتھ واپس آ گئے۔ محاذ پر مختصر عرصے کا قیام بھی بہت مفید ثابت ہوا۔ میدان کارزار میں فرنٹ پر وقت گزرا اور عملی رنگ میں فوجی ٹریننگ کا اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا۔‘‘

ظافر سے بات ہو تو وہ اپنے زمانۂ طالبِ علمی کے بعض دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جوانی کے دن تھے اور لاابالی پن زوروں پر تھا۔ میں خود بھی تُک بندی کر لیتا تھا۔ ہمارے کچھ ساتھیوں کو بھی یہ ٹھرک تھا۔ میں درجہ رابعہ میں تھا جب ہمیں طرح مصرع پر مشترکہ طبع آزمائی کا موقع ملا۔ اس غور و فکر کا جو نتیجہ نکلا اس کا ذکر بھی ’’شمعِ فروزاں‘‘ میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے یہ چند اشعار:

ان کے چہرے پر ہے پاؤڈر کی بہار
لگ رہا ہے یاں بھی ڈاڑھی کو خضاب
تھا تو بوڑھا پر ترا رُخ دیکھ کر
پھر دوبارہ لوٹ آیا ہے شباب
یار کے ہاتھوں کا کڑوا ایلوا
ہم غٹاغٹ پی گئے مثلِ شراب
اپنی ناکامی پہ ہوں حیران میں
یاد آجاتا ہے دریائے چناب
جب وہ غصے میں ہیں لیکچر پھینکتے
مثل پروانوں کے اُڑتا ہے لُعاب

موصوف اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ اگرچہ وہ بطور مربی تو جماعت کی خدمت انجام نہ دے سکے تاہم جامعہ احمدیہ کی تربیت اور بعد میں افریقہ میں جماعتی خدمت میں گزرنے والے وقت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت نوازا چنانچہ جامعہ احمدیہ انگلستان کے قیام پر وہ اوّلاً اس میں استاد اور ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ

مقرر ہوئے اور پھر بطور پرنسپل بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں یہ سب کچھ احمد نگر کے جامعہ میں گزرے ہوئے وقت کی برکت سے ہی حاصل ہوا۔ جامعہ احمدیہ انگلستان میں گزرے ہوئے دنوں کی کچھ تفصیل محولہ بالا کتاب میں بھی موجود ہے۔ آپ پڑھنا چاہیں گے یہ تفصیل؟

’’یکم اکتوبر ۲۰۰۵ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے جامعہ احمدیہ یو کے کا افتتاح فرمایا۔ مُمہِدی کلاس میں انتیس طلبہ داخل ہوئے جو یو کے، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیئم، سویڈن اور ناروے سے تھے۔

خاکسار کو سپرنٹنڈنٹ جامعہ اور طلبہ کو اردو پڑھانے کے فرائض سونپے گئے۔ خاکسار باقاعدہ روزانہ نمازِ فجر سے ایک گھنٹہ قبل سیّدنا حضرت مسیح موعود کا عربی قصیدہ بلند آواز میں پڑھتے ہوئے طلبہ کو نمازِ تہجد کے لیے بیدار کرتا۔ ماشاء اللہ سبھی بچے تہجد پڑھتے۔ نمازِ فجر کے بعد قرآن کریم کا درس ہوتا۔ پھر بچے قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ گویا نمازِ تہجد کے ساتھ ہی طلبہ دن کا آغاز کرتے۔ سات بج کر پینتیس منٹ پر تمام طلبہ ناشتے کے لیے یونیفارم میں آ جاتے۔ آٹھ بجے اسمبلی ہوتی اور تدریسی کام شروع ہو جاتا۔ گیارہ بج کر دس منٹ سے گیارہ تیس تک ریفریشمنٹ کے لیے وقفہ ہوتا۔ پھر دو بجے تک تدریس کا کام جاری رہتا۔ پھر نمازِ ظہر ادا کی جاتی...... عصر کی نماز کے بعد بچے کھیل کے میدان میں سپورٹس کے لیے چلے جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد طلبہ اپنا اپنا مطالعہ کرتے۔ شام کے کھانے کے بعد نمازِ عشاء ادا کی جاتی اور آٹھ بج کر پندرہ منٹ سے دس بج کر تیس منٹ تک سٹڈی ٹائم ہوتا۔ خاکسار سٹڈی ٹائم میں بچوں کے ساتھ ہوتا۔ دس بج کر پنتالیس منٹ پر لائٹس آف کر دی جاتیں۔ جمعۃ المبارک کو سارے طلبہ بیت الفتوح میں پیارے آقا...... کا روح پرور خطبہ سنتے اور آپ کی اقتدا میں نمازِ جمعہ ادا کرتے۔ جمعۃ المبارک کے علاوہ باقی دنوں میں باری باری تین تین طلبہ پیارے آقا کی ملاقات کے لیے حاضرِ خدمت ہوتے۔

اگست ۲۰۰۶ء میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے خاکسار کو جامعہ کا پرنسپل مقرر فرما دیا۔ نئے آنے والے طلبہ کے لیے گو دوسرا تعمیراتی مرحلہ ۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء کو شروع ہو چکا تھا اور کام بھی تیزی سے ہو رہا تھا مگر مکمل نہ ہو سکا۔ نئے داخلہ جات ہو گئے اور نئی مُمہِدی کلاس کے طلبہ آ گئے۔ انہیں کچھ عرصے کے لیے بیتُ الفتوح میں رکھا گیا۔ روزانہ جامعہ کی وَین بچوں کو بیتُ الفتوح سے لے آتی اور شام کو بیتُ الفتوح چھوڑ آتی۔

اکتوبر کے آخر میں تعمیر کا کام مکمل ہو گیا۔ دوسرے تعمیری مرحلے میں محمود بلاک اور بفضلہٖ تعالیٰ بیت الکریم کی بھی تعمیر مکمل ہو گئی اور حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ۳ دسمبر ۲۰۰۶ء کو نئے بلاک اور بیت الکریم کا افتتاح فرما دیا۔ نئی کلاس کے آتے ہی اساتذہ کی قلت کا شدت سے احساس ہوا۔ مرکز کو اساتذہ کے لیے لکھا گیا تھا مگر فوری طور پر تو وہاں سے اساتذہ نہیں آ سکتے تھے۔ پیارے آقا کی خدمتِ اقدس میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ حضورِ انور نے فرمایا ہمارے علماء جامعہ میں وقت دیں۔ امام صاحب ہیں اور نصیر قمر ہیں۔ ان سے مدد لیں۔ بہت حوصلہ ہوا۔ عطاء المجیب راشد اور نصیر احمد قمر کی خدمت میں لکھا گیا اور انہیں حضورِ انور کے ارشاد سے آگاہ کیا گیا۔ آپ نے اگلے ہی روز جامعہ میں جُزوقتی کام شروع کر دیا۔ پھر عبدالباسط شاہد

کی منظوری بھی حضورِ انور نے عطا فرما دی۔ کچھ عرصہ بعد منور احمد خورشید کی بھی منظوری لے لی گئی۔ اقبال احمد نجم لائبریری کے انچارج تھے۔ فضل احمد ڈوگر بطور اسسٹنٹ لائبریرین آ گئے تو نجم صاحب کی بھی حضورِ انور نے جامعہ میں ہمہ وقتی تدریس کے لیے منظوری دے دی۔ کافی حد تک سٹاف کا مسئلہ حل ہوگیا۔

پھر اگلی کلاسز تک پاکستان سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عطاء المومن زاہد، وسیم احمد فضل، حافظ اعجاز احمد اور محمد احمد نعیم بھی تشریف لے آئے اور پھر کچھ عرصے کے بعد ظہیر احمد خان بھی سٹاف میں شامل ہو گئے اور بفضلِ خدا تعلیم و تدریس اور تربیت کے کام تسلی بخش طریق پر ہوتے چلے گئے۔

ہر آن پیارے آقا کی براہِ راست نگرانی، مشفقانہ توجہ، رہنمائی اور دعائیں میسر رہیں۔ طلبہ کا پیارے آقا کے ساتھ باقاعدہ ملاقاتوں کا سلسلہ، کم از کم ایک نماز کی باقاعدہ باری باری بیت فضل میں حضورِ انور کی اقتدا میں ادائیگی اور ہر طالب علم کا خلیفۂ وقت کے ساتھ ذاتی رابطہ ان کی تربیت اور روحانی ترقی کے لیے مشعلِ راہ بنا رہا......

جب کبھی بھی کوئی بچہ بیمار ہو جاتا اور ہسپتال میں داخل ہو جاتا حضورِ انور اس کے لیے خاص ہدایات فرماتے، اس کے کھانے اور پرہیز وغیرہ کے متعلق تاکید فرماتے اور اس کی شفایابی کے لیے خصوصی دعا کرتے۔

جامعہ احمدیہ یوکے کے ابتدائی ایّام میں خدمات سرانجام دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مشکل اور کٹھن وقت بھی آئے۔ ہمیشہ پیارے اور مشفق آقا کی خدمتِ اقدس میں رہنمائی اور دعا کے لیے استدعا کی۔ مشکلیں آسان ہوتی گئیں اور راستے کھلتے اور ہموار ہوتے چلے گئے اور جہاں بھی اس معاملہ میں کوتاہی اور غفلت ہوئی پیار اور شفقت میں ملفوف سرزنش بھی ہوئی جو اصلاحِ نفس کا ذریعہ بنی۔ بہت کچھ سیکھا بہت کچھ پایا۔‘‘

عبدالسّلام ظافر کی یادداشتیں تمام ہوئیں۔ اب میں ذکر کرنے جا رہا ہوں مولوی محمد اکبر افضل کا جن کا تعلق بنیادی طور پر قلعہ کالروالا تحصیل پسرور سے ہے اور آج کل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ موصوف جامعہ احمدیہ کے ان فارغ التحصیل طلبہ میں سے ہیں جنہوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۹ء میں یہاں داخلہ لیا تھا۔ وہ سراج الدین نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے اور لمبا عرصہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرنے والے، مولوی عبدالرحمٰن انور کے داماد ہیں۔ وہ پارٹیشن سے پہلے تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہے تھے لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا تو وہ قلعہ کالروالا جا پہنچے اور مڈل کا امتحان قریبی قصبے کلاس والا سے پاس کیا۔ ان کے ایک عزیز، قریشی محمد نذیر ملتانی ان دنوں احمد نگر میں مقیم تھے چنانچہ اکبر افضل چھٹیاں گزارنے ان کے پاس آ گئے۔ اگرچہ قلعہ کالروالا بھی کوئی بارونق قصبہ نہ تھا لیکن احمد نگر ایک بہت ہی چھوٹا گاؤں تھا جہاں اکبر افضل کا دل نہ لگا۔ وہ گھر لوٹنے کی عجلت میں تھے لیکن محمد نذیر ملتانی کی خواہش تھی کہ وہ گھر واپس جانے کی بجائے جامعہ احمدیہ میں داخلہ لے لیں۔ بالآخر ان کا اصرار غالب رہا اور اکبر افضل جامعہ میں داخل ہو گئے۔ چونکہ ان کے میزبان ان دنوں اسی ادارے میں پڑھاتے تھے لہٰذا اکبر افضل کو نہ صرف داخلے میں سہولت ہوگئی بلکہ رہائش کا مسئلہ بھی بہ آسانی حل ہوگیا۔

اکبر افضل نے بعد میں شاہد کا امتحان پاس کرلیا اور ان کا تقرر بطور مربی چکوال، کوہاٹ، بہاولپور،

گجرات، کنری اور سکھر میں رہا تاہم ۱۹۶۸ء میں یہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا۔ وہ عرصۂ دراز سے راولپنڈی میں مقیم ہیں اور پرنٹنگ کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ طبعاً ملنسار ہیں اور جماعت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

ان کے ساتھ میری پہلی ملاقات لیاقت مارکیٹ، راولپنڈی میں واقع کاروان آرٹ پریس کے مالک، ملک عبدالحفیظ کے توسّط سے ان ہی کے پریس پر ہوئی تھی۔ اکبر افضل چونکہ اباجی سے بہت اچھی طرح متعارف تھے اور میں ان کے خسر کو بخوبی پہچانتا تھا لہٰذا ہمیں ایک دوسرے کے قریب آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کے ساتھ اکثر بیتِ نور، مری روڈ پر ملاقات ہو جاتی اور وہ اس عاجز کے ساتھ ہمیشہ محبت کا اظہار فرماتے۔

موصوف کے ساتھ جامعہ میں گزرے ہوئے وقت پر بات ہو تو وہ بتایا کرتے ہیں: ۱۹۴۹ء کے آخر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ربوہ میں بیت مبارک کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ہمیں اس تقریب میں شامل ہونے کی ہدایت تھی چنانچہ مجھے فخر ہے کہ میں بھی اس ہجومِ عاشقان میں شامل تھا جنہیں بیت مبارک کی بنیاد رکھتے وقت ابراہیمی دعاؤں میں شمولیت کا موقع ملا۔ اس موقع پر دور و نزدیک سے بہت سے احمدی احباب ربوہ پہنچے ہوئے تھے اور جنگل میں منگل والا منظر پیش ہو رہا تھا۔ مجھے اس تقریب کی کوئی اور خاص بات تو یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ صدر انجمن احمدیہ نے وہ دعائیں جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام نے بیتُ اللہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت مانگی تھیں ایک کاغذ پر طبع کرا کے حاضرین میں تقسیم کر رکھی تھیں چنانچہ وہ حضور کے ساتھ یک زبان ہو کر یہ دعائیں بہ آوازِ بلند پڑھتے جاتے تھے۔

ہمارے اس دوست کو اس دور کی جو باتیں اب تک نہیں بھولیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ جامعہ کے طلبہ پیدل احمد نگر سے ربوہ جا کر بیت مبارک میں نمازِ جمعہ ادا کرتے تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ایک مرتبہ ہم پانچ چھ لڑکے جمعہ پڑھنے جا رہے تھے تو پیچھے سے آنے والی ایک کار ہمارے پاس پہنچ کر اچانک رک گئی۔ کار میں سوار ایک معزز شخص نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم نے جواباً اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ ہم جمعہ پڑھنے کے لیے ربوہ جا رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ہمیں اپنی کار میں بٹھا لیا۔ اپنی ہوش میں کار پر اکبر افضل کا یہ پہلا سفر تھا اور غالباً یہی کیفیت باقی لڑکوں کی تھی چنانچہ یہ مختصر سا سفر انہیں آج تک یاد ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ تو ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ہمیں اپنی کار پر لفٹ دینے والے صاحب ملک صاحب خان نون تھے۔ اب سوچتا ہوں تو ان کے حسنِ اخلاق پر طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔ ایک ذمہ دار سرکاری افسر، بڑے زمیندار اور عالی نسب انسان کی طرف سے اُن بچوں کے ساتھ جنہیں وہ پہچانتے بھی نہ تھے اس قدر شفقت آمیز سلوک کی مثال بہت کم نظر نہیں آتی ہے۔

اکبر افضل مزید بتاتے ہیں: جامعہ کے طلبہ کو ان کے پرنسپل کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ جمعہ کے دن سب سے پہلی صف میں بیٹھا کریں چنانچہ ہم ان کے حکم کی تعمیل میں ہمیشہ وقت مقررہ سے بہت پہلے بیتُ الذّکر پہنچ کر پہلی صف میں بیٹھا کرتے تھے۔

وہ احمد نگر ہی میں تھے جب انہیں خبر ملی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سرگودھا میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے والے ہیں۔ حضور نے یہ خطاب ملک صاحب خان نون کی دعوت پر بیت مبارک کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب کے کچھ ہی دنوں بعد سرگودھا کے کمپنی باغ میں فرمایا تھا۔ لوگوں کا ایک جمِ غفیر یہ خطاب سننے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اکبر افضل بھی اس جمِ غفیر میں شامل تھے۔

اس کے قریباً ایک سال بعد اسی طرح کا ایک جلسہ بیت احمدیہ، بھیرہ میں ہوا۔ اکبر افضل کی روایت کے مطابق وہ بھی جامعہ کے باقی طلبہ کے ساتھ حاضرین میں موجود تھے۔ یہ جلسہ بیت احمدیہ کے اندر ہوا تھا اور سرگودھا جتنا بڑا نہ تھا۔ حضور نے جو خطاب فرمایا اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن انہیں اس کا صرف ایک حصہ یاد رہ گیا ہے جس کا تعلق اس بات سے تھا کہ حضور عرصۂ دراز سے بھیرہ آنے کی خواہش رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی حرم، صاحبزادی امۃ الحئی بنت حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں بھیرہ ضرور دکھائیں گے تاہم ۱۹۲۴ء میں ان کی وفات کی وجہ سے یہ وعدہ پورا نہ کیا جاسکا۔ آج حضور کی بھیرہ کی وزٹ کا ایک مقصد اس وعدے کا ایفا بھی تھا۔

اکبر افضل بتاتے ہیں: استاذی المکرّم خان ارجمند خان بہت قابل اور ذہین انسان تھے لیکن انگریزی زبان سے بالکل لابلد تھے۔ ان کی اس کمزوری کی وجہ سے بعض دفعہ محفل بیٹھے بٹھائے کشتِ زعفران بن جاتی۔ وہ حیران ہوتے کہ بظاہر تو ہنسنے والی کوئی بات نہیں ہوئی اور معاملہ

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

والی صورت اختیار کر لیتا۔

وہ کہتے ہیں: جب ہم جامعہ کے تیسرے سال کا امتحان دے رہے تھے تو ہم نے اپنے پرنسپل سے گزارش کی کہ وہ ہمیں چوتھی جماعت کا امتحان بھی ساتھ ہی دینے کی اجازت دے دیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ اگر ہم تیسری جماعت میں کم از کم ستر فیصد نمبر حاصل کرلیں تو ہمیں چوتھی جماعت کے امتحان کی اجازت دے دی جائے گی۔ ہم چار طالب علموں یعنی میں، احمد صادق بنگالی، اقبال احمد غضنفر اور بشیر احمد قمر نے پچھتر فیصد نمبر حاصل کر لیے۔ یوں ہمیں اسی سال چوتھی جماعت کا امتحان دینے کی اجازت بھی مل گئی۔ ہم نے اللہ کے فضل سے اس امتحان میں پچاس فیصد سے زیادہ نمبر لے لئے اور یوں ایک سال میں دو جماعتیں پاس کر کے پانچویں جماعت یعنی درجہ اُولیٰ میں چلے گئے۔ اس کے بعد ہم پندرہ لڑکے مولوی فاضل کے امتحان کے لیے تیار ہوئے۔ ہم نے ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے یہ امتحان دیا اور سب کامیاب ہوئے۔ مولوی فاضل پاس کرنے کے بعد ہمیں جامعۃ المبشرین میں بھجوایا دیا گیا۔ ہماری کلاسیں سیٹھ اللہ جوایا کی کوٹھی میں ہوتی تھیں جو موجودہ جامعہ احمدیہ سینئر کے سامنے دارالفضل میں تھی۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے یہاں سے شاہد کلاس پاس کی۔

اکبر افضل کو یہ بھی یاد ہے کہ ایک دفعہ طلبہ جامعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی معیت میں دریائے چناب پر ایک پکنک میں شامل ہوئے تھے۔ عثمان چینی بھی وہاں موجود تھے۔ اکبر افضل نے حضور کی اجازت سے چینیوں

کا ایک لطیفہ سنایا جس سے حضور محظوظ ہوئے۔

وہ بتاتے ہیں: جب ہم نے شاہد کلاس پاس کرلی تو ہماری ڈیوٹی دفتر اصلاح وارشاد میں لگ گئی۔ اسی دوران ایک بار حضرت مولوی محمد حسین، سبز پگڑی والوں کے ساتھ مجھے اور عبدالباسط شاہد کو چک ٹی ڈی اے ۲ میں بھجوایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں پر بیت الذّکر تعمیر کرائیں اور نماز شروع کروا کر آئیں چنانچہ ہم تینوں وہاں گئے اور پندرہ دن کے اندر اندر بیت الذّکر تعمیر کرانے کے بعد نماز شروع کروا کر ربوہ واپس آ گئے۔ اس سے کچھ پہلے یا فوراً بعد ہمیں چرگاہ متصل بھیرہ جانا پڑا۔ دراصل وہاں ایک دوست نے احمدیت قبول کرلی تھی جس پر گاؤں والوں نے ان کا ناطقہ بند کر دیا اور مناظرے کا چیلنج دیا چنانچہ دفتر کی طرف سے قاضی محمد نذیر لائلپوری اور مولوی غلام احمد بدوملہوی کو وہاں بھجوایا گیا۔ اُن کے ساتھ میں اور عبدالباسط شاہد بھی گئے تھے۔ غیر احمدیوں کی طرف سے مولوی لال حسین اختر اور محمد حیات کھودا آئے تھے لیکن جب شرائطِ مناظرہ طے کرنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے لیت ولعل سے کام لیا اور یوں یہ مجلس مناظرے کے بغیر ہی برخواست ہوگئی۔

اکبر افضل کو یاد ہے کہ اس زمانے کے جامعہ کے نمایاں طالب علموں میں دوست محمد شاہد، محمد اسماعیل منیر، نصیر احمد ناصر، عبدالحمید ڈاڈھا، لطیف اکبر اور غلام رسول پینتیس شامل تھے۔

اور اب جامعہ احمدیہ کے حوالے سے کچھ باتیں منیر الدین احمد کی زبانی جو ۱۹۵۱ء میں جامعہ میں داخل ہوئے اور تکمیلِ تعلیم کے بعد جرمنی میں بطور مربی تعینات ہوئے۔ انہوں نے اپنے حالاتِ زندگی ''ڈھلتے سائے'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر رکھے ہیں جس میں انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے کچھ واقعات بہت تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ ان تفصیلات میں ان کے بہت سے اساتذۂ کرام، ہم جماعتوں اور جامعہ کے غیر ملکی طلبہ کا ذکر موجود ہے لہٰذا غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے ان کی باقی تحریر ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

احمد نگر ربوہ کے نواح میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور فاضل مصنف کے الفاظ میں ''جامعہ احمدیہ اسی گاؤں میں پایا جاتا تھا جس کے لیے ہندوؤں کی ایک متروکہ عمارت حاصل کر لی گئی تھی۔ اسی گاؤں میں ایک دوسری زیادہ وسیع عمارت میں جس میں رہائشی کمروں کے علاوہ اصطبل بھی پایا جاتا تھا جامعہ احمدیہ کا ہوسٹل بنا ہوا تھا مگر مجھے ابتدائی دنوں میں وہاں پر کمرہ نہ مل سکا اس لیے میرا قیام ماموں احمد خان نسیم کے گھر پر ربوہ میں تھا......

جامعہ احمدیہ میں اس زمانے میں پچاس کے لگ بھگ طالب علم پڑھتے تھے۔ ہماری کلاس دوسری تھی، جس میں داخلے کے لیے میٹرک پاس ہونا لازمی قرار پایا تھا...... وگرنہ اس سے قبل قادیان کے زمانے میں پرائمری یا مڈل پاس طالب علموں کو داخلہ مل جاتا تھا۔ سارا کورس عربی زبان اور دینی تعلیم کا تھا البتہ ماسٹر غلام حیدر انگریزی پڑھانے پر مامور تھے...... میرے زمانے میں جامعہ کی کُل چار کلاسیں ہوتی تھیں اور آخری کلاس کو پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دینا ہوتا تھا۔ جامعہ کا ریکارڈ غیر معمولی طور پر اچھا تھا اور نہ صرف یہ کہ عام طور سے سو فیصد طالب علم پاس ہو جاتے تھے اکثر اسی ادارے کے طالب علم یونیورسٹی کے امتحان میں

اوّل آتے تھے۔......

جامعہ کے پرنسپل...... مولانا ابوالعطا جالندھری تھے جو کامیاب مقرّر اور مناظر تھے۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں فلسطین اور شام...... رہ چکے تھے اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ وہ اکثر صبح حاضری کی اسمبلی میں عربی زبان میں تقریر کرتے تھے...... پھر وہ طالب علموں کو فی البدیہہ تقریر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ گاہے بگاہے اس اسمبلی کی کارروائی میں آدھا دن گزر جاتا تھا اور پچھلے پہر کی چھٹی دے دی جاتی تھی۔

میں درجہ ثالثہ میں تھا جب...... مولانا ابوالعطا جالندھری کو جامعۃ المبشرین کا پرنسپل بنا کر ربوہ منتقل کر دیا گیا۔ ان کی جگہ پر مولوی ظہور حسین کو...... پرنسپل بنایا گیا...... موصوف علم الصرف (عربی گرائمر) کے استاد تھے ...... پھر ان کی جگہ پر قاضی محمد نذیر لائلپوری ...... کو پرنسپل لگایا گیا۔ ان کو تحقیق کا شوق تھا اور تقریر کرنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے......

ادب کے استاد...... ظفر محمد ظفر تھے جو خود بھی اردو، عربی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان کو ابُو تمام کی کتاب حماسہ اور المتنبّی کا دیوان قریب قریب حفظ تھا۔ کسی قصیدے کا ایک مصرع ان کے سامنے پڑھ دیا جاتا تو وہ سارا قصیدہ حافظے سے سنا دیتے تھے۔

قریشی محمد نذیر ملتانی حدیث اور تفسیر القرآن کے استاد تھے۔ اپنی جوانی کے دنوں میں زبردست مناظر ہوا کرتے تھے۔...... طبیعت کے مسکین اور صاف دل انسان تھے...... پڑھاتے بہت شوق سے تھے۔ علمِ کلام پر ان کو اچھا عبور حاصل تھا۔

...... صاجبزادہ ابوالحسن قدسی ہمیں نثر اور نحو پڑھاتے تھے۔...... آپ صاجبزادہ عبداللطیف...... کے فرزند تھے جن کو احمدیت اختیار کرنے کے الزام پر علماءِ افغانستان کے فتوے کے تحت سنگسار کر دیا گیا تھا۔ آپ کی بیوی اور بچوں کو بہت برسوں تک قید و بند میں رہنے کے بعد قادیان آنے کی اجازت ملی تھی...... صاجبزادہ ابوالحسن قدسی فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے چنانچہ ایران کے شاہ رضا پہلوی کے پاکستان آنے پر نوائے وقت نے آپ کی نظم کو پہلے صفحہ پر شائع کیا تھا۔ موصوف خاموش طبع انسان تھے۔

جامعہ کے طالب علم واقفِ زندگی تھے اور ان کو صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا البتہ جب میں جامعہ میں داخل ہوا تو کسی کو نقد رقم نہیں ملتی تھی۔ ہوسٹل کے اخراجات وظیفے سے کٹ جاتے تھے۔ باقی ماندہ رقم پرچی کی صورت میں ملتی تھی جس سے مقامی دکانوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کی جاسکتی تھیں البتہ پرچی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ جمعہ کے روز سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل ماسٹر غلام حیدر پرچیاں جاری کرتے تھے اور صرف استثنائی صورتوں میں کسی کو نقد رقم دی جاتی تھی۔ یہ کام ان کے کلرک عبدالخالق کے ذمے تھا......

ہوسٹل میں چالیس کے لگ بھگ طالب علم مقیم تھے۔ سنگل رُوم دو یا تین سے زیادہ نہ تھے اور ان میں اکثر غیر ملکی طالب علم رہتے تھے۔ ڈبل روم بھی اس سے زیادہ نہ تھے۔ باقی ماندہ کمرے بڑے تھے جن میں پانچ سے دس تک کی تعداد میں طالب علم رہتے تھے۔ میرے ساتھ ایک چینی طالب علم عثمان چو چنگ شی کمرہ حاصل

کرنے کے لیے آیا تھا اور ہمیں اکٹھے ایک کمرہ ملا تھا جس میں ہم ایک سال تک رُوم میٹ رہے۔ عثمان عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا...... اس کا تعلق چینی مسلمانوں کے ایک گروپ سے تھا جو چیانگ کائی شیک کی فوج میں افسر تھے۔ جب چین پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا تو مسلمان افسروں کے گروپ نے کسی مسلمان ملک میں پناہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح یہ لوگ پاکستان میں پہنچے۔ چند ماہ کے بعد اس گروپ کا ایک حصہ فارموسا اور دوسرا گروپ سعودی عرب چلا گیا۔ صرف تین ربوہ میں مقیم رہے جن میں سے عثمان چو پہلا چینی طالب علم تھا جس نے ایک ڈیڑھ سال تک اردو اور انگریزی سیکھنے کے بعد عربی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا...... عثمان حد درجہ محنتی اور دیانت دار انسان تھا مگر...... زبان سیکھنا اور درست تلفظ اپنانا اس کے لیے دشوار تھا۔ غیر ملکیوں کو کلاس میں اردو اور عربی پڑھائی جاتی تھی مگر چونکہ جامعہ کے طالب علم عام طور سے آپس میں پنجابی بولتے تھے، ان کا واسطہ ایک تیسری زبان سے پڑتا تھا جس سے ان کو بچ کر رہنے کی ہدایت تھی......

عثمان چو بہت دیندار تھا اور نماز روزے کی پابندی کرتا تھا۔ باقاعدگی سے تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا اور نفل ادا کرنے کے بعد فجر...... تک قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ کلاس میں جانے سے پہلے اور وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد سارا وقت اپنا سبق دہرانے میں مصروف رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی وقت ضائع کرتے ہوئے نہ دیکھا۔ وہ ہمہ وقت پڑھنے لکھنے میں یا عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ دوسرے طالب علموں کے برعکس اسے کھیل کود میں کوئی دلچسپی نہ تھی تاہم اس کو چینی کھیل آتے تھے...... عثمان کو کنفوشس میں بہت دلچسپی تھی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اپنے وقت کا پیغمبر تھا چنانچہ وہ اس کی روایات کا مجھے ترجمہ سنایا کرتا تھا۔ اسے تقریر کرنے کا شوق تھا۔ تقریروں...... کو تیار کرنے پر وہ بہت محنت کرتا تھا۔

ایک سال کے بعد اسی کمرے میں دوسرا چینی ابراہیم ما میرا روم میٹ بنا تو میری فرمائش پر وہ مجھے چینی فلاسفر، لاؤتزے کی تحریریں...... ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں تیسرا چینی ادریس رہتا تھا جس کو ماؤزے تنگ کی شاعری میں دلچسپی تھی۔ جب تک ہم اس ہوسٹل میں مقیم رہے وہ مجھے اس کی نظمیں پڑھ کر سناتا رہا......

چینیوں سے بڑھ کر میری دوستی رضوان عبداللہ کے ساتھ تھی جو سوڈان کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع ذہین نوجوان تھا اور میرا ہم عمر تھا۔ اسے اردو بولنے کا شوق تھا چنانچہ میں اسے اردو کی مشق کراتا تھا اور خود اس سے عربی سیکھتا تھا...... یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا۔ پھر جامعہ کی سالانہ پکنک کے دوران رضوان دریائے چناب میں ڈوب گیا......

میں جامعہ احمدیہ کے دوسرے سال میں تھا جب میں نے ایک پندرہ روزہ قلمی رسالہ ''مجموعہ'' نکالنا شروع کیا جس کے پہلے تین یا چار شمارے بلیک بورڈ پر چسپاں کئے جاتے رہے۔ اس کے بعد آٹھ اور آگے چل کر سولہ صفحات پر مشتمل مجلّہ دو سال تک شائع ہوتا رہا جس کا واحد نسخہ جامعہ کی لائبریری میں پڑھنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ جب مولوی ظہور حسین جامعہ احمدیہ کے پرنسپل بنے تو انہوں نے رسالے کو جامعہ کی طرف سے چھاپنے

کی خواہش کا اظہار کیا...... مگر اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔......

احمد نگر کے باسیوں کے ساتھ جامعہ کے طالب علموں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہمیں ان کے میلوں ٹھیلوں یا قرب و جوار کے فقیروں کے مزاروں پر منائے جانے والے عرسوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم لوگ ہاکی، فٹ بال یا والی بال کھیلتے تھے جو گاؤں کے لوگوں کے لیے بدیسی کھیل تھے۔ لے دے کے کبڈی ایک ایسا کھیل تھا جس میں جامعہ کے طالب علموں کا مقابلہ گاؤں کے کھلاڑیوں کے ساتھ ہوسکتا تھا مگر دیہاتی جن دنوں میں کبڈی کھیلتے تھے ان دنوں میں ہمارے سالانہ امتحانات سر پر کھڑے ہوتے تھے اس لیے ہم ان کی کھیلوں میں شرکت نہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف جامعہ کے پروگراموں اور علمی بحثوں میں دیہاتیوں کو بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ اس طرح اس گاؤں میں دو متوازی دنیائیں آباد تھیں جن کا آپس میں تعلق بے حد محدود تھا......

جامعہ کا ماحول عام طور سے پڑھنے لکھنے کے لیے بہت ساز گار تھا۔ احمد نگر میں ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے والے لہو ولعب سرے سے پائے ہی نہیں جاتے تھے۔...... مولوی ظفر محمد ظفر کے طفیل شاعری کا تھوڑا بہت چرچا تھا اور کچھ طالب علم تک بازی کرتے تھے۔

احمد نگر کی زمین بہت زرخیز ہے جس کے سبب گاؤں کے اردگرد ہر طرف سرسبزی پائی جاتی تھی۔ پانی کی فراوانی تھی۔ قریب سے گزرنے والی نہر کے علاوہ دو تین رہٹ والے کنوئیں کافی مقدار میں پانی پینے اور کھیتوں میں لگانے کے لیے مہیا کرتے تھے۔ طالب علم فالتو اوقات میں اپنا سبق دہرانے کے لیے یا اپنی تقریروں کی مشق کرنے کے لیے کھیتوں میں نکل جاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد فٹ بال کھیلا جاتا تھا۔ ہوسٹل کے صحن میں والی بال کا نیٹ لگا ہوا تھا جس کا وقت اور بے وقت خوب استعمال ہوتا تھا۔ اسی صحن میں گرمیوں کی راتوں میں طالب علم سوتے تھے۔ نماز کے اوقات پر (نِدا) کے بعد گھنٹی بجتی تھی اور ہر کوئی نماز کی ادائیگی کے لیے (بیتُ الذّکر) کی طرف چل دیتا تھا جہاں پر باقاعدہ حاضری لگتی تھی۔ نمازِ فجر کے بعد درس القرآن ہوتا تھا اور نمازِ عصر کے بعد حدیث کا درس دیا جاتا تھا۔ ہوسٹل میں چونکہ کوئی میس نہیں تھا اس لیے کھانا طالب علم اپنے اپنے کمروں میں کھاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہمیں کبھی پھل یا دودھ اور دہی کھانے کو ملے ہوں البتہ سال میں ایک بار گنے کے ایک پورے کھیت کی فصل خرید لی جاتی تھی اور جامعہ کے طالب علم اور سٹاف کے ممبر وہاں پر گنے چوسنے کے لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر سال ایک یا دو بار آؤٹنگ کا پروگرام بنتا تھا جو عام طور سے نہر پر منائی جاتی تھی جہاں پر پیراکی کے مقابلے ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر بیت بازی یا فی البدیہہ تقریری مقابلے بھی رکھے جاتے تھے۔ صرف ایک بار دریائے چناب پر ہم آؤٹنگ کے لیے گئے تھے جس کے دوران میرا عزیز افریقی دوست رضوان عبداللہ ڈوب کر مر گیا تھا۔......

غیر ملکی طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد اس زمانے میں جامعہ میں پڑھتی تھی۔ سری لنکا کا ایک طالب علم عبدالرحمٰن بہت بچپن میں قادیان بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے پتا نہیں ہے کہ اس کو اپنی مادری زبان آتی تھی یا نہیں، پنجابی وہ ٹھیٹھ بولتا تھا۔ اس کا ایک ہم وطن پڑھنے لکھنے میں تو پھسڈّی تھا مگر گتکے کا استاد تھا۔ اس کو جسم

کے ایک حصے میں پسینہ آتا تھا جب کہ دوسرا نصف بالکل خشک رہتا تھا۔ ایک وہی اعجوبہ نہیں تھا، میرے دوست قاضی نعیم الدین احمد کا دل دائیں جانب تھا اور شاید اس کا پورا اندرونی نظام دوسروں کے الٹ تھا۔......

حیدر آباد دکن کے ایک احمدی خاندان کے پانچ بچے تعلیم کے سلسلے میں بہت بچپن میں قادیان بھیج دیئے گئے تھے۔ وہ تقسیم ملک کے وقت جامعہ کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی لوٹ کر اپنے وطن نہ جا سکا...... چار لڑکے بنگال کے رہنے والے تھے جن میں سے عبدالعزیز میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ بے حد محنتی طالب علم تھا جو دن کا ایک ایک لمحہ پڑھنے لکھنے میں لگا دیتا تھا۔ اس کو مرگی کا مرض لاحق تھا جس کے سبب وہ آئے دن بے ہوش ہو کر گر جاتا تھا۔ اس نے اپنا کامیاب علاج محض اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر کیا۔ وہ اس طرح کہ جوں ہی اس کو احساس ہو جاتا تھا کہ دورہ پڑنے والا ہے وہ فوراً زمین پر لیٹ جاتا تھا خواہ وہ اس وقت کسی گلی کوچے میں ہی کیوں نہ جا رہا ہو۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کی طبیعت سنبھل جاتی تھی اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا......

ایک رات موسلا دھار بارش ہوئی جس کے سبب گاؤں کے کئی کوٹھے گر گئے۔ ان میں سے ایک کوٹھا ہوسٹل کے ہمسائے میں تھا۔ زخمیوں کی آہ و زاری سن کر طالب علموں کی ایک پوری جماعت کمک کی خاطر وہاں پر پہنچ گئی۔ پتا چلا کہ اس مکان کے باسیوں میں سے ایک شخص بہت بری طرح زخمی ہوا تھا اور اس کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ احمد نگر میں اس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ قریب ترین رہنے والا ڈاکٹر ربوہ میں رہتا تھا مگر زخمی کو وہاں تک پہنچانا ممکن نہ تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ کوئی شخص ڈاکٹر کو لانے کے لیے ربوہ جائے۔ اس مقصد کے لیے سائیکل درکار تھی جو...... میرے کمرے میں تھی۔ میں اور میرا رُوم میٹ عثمان چینی اس سارے معاملے سے بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے اور ہم نے حسبِ عادت دروازے کی اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر عثمان بیدار ہو گیا۔...... اس نے دروازہ کھول کر...... سائیکل لے جانے کی اجازت دے دی جس پر دو لڑکے سوار ہو کر ربوہ گئے اور وہاں سے ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو لائے اور پھر واپس چھوڑنے گئے۔......''

فاضل مصنف بتاتے ہیں کہ ''جب راتوں کو ربوہ کی سرحدوں پر حفاظتی دستے پہرہ دیتے تو وہاں پر ہماری ڈیوٹی بھی لگتی تھی۔ ہر گروپ کے سپرد ایک سوگز کا علاقہ ہوتا تھا جس کی دیکھ بھال رات پڑنے سے صبح سورج نکلنے تک کرنی ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھی بے شمار راتیں لاٹھی اٹھائے پہرہ دیتے ہوئے گزاری تھیں۔

احمد نگر کی زرخیزی کے مقابلے میں ربوہ ایک بے آب و گیاہ جگہ تھی مگر ہم طالب علموں کو بے شمار چیزیں ربوہ کی طرف کھینچتی تھیں۔ یوں بھی ہم کو آئے دن ربوہ جانا پڑتا تھا بالخصوص نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے احمد نگر کے سارے احمدی ربوہ جاتے تھے جس کے بعد مجھے اپنے ادیب دوستوں سے ملنا ہوتا تھا۔''

اس پس منظر میں جامعہ احمدیہ کے ربوہ منتقل ہونے پر مصنف کی خوشی قابلِ فہم ہے چنانچہ وہ رقمطراز ہیں: ''جامعہ کو ربوہ میں جو عمارت ملی وہ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی جس کے صحن میں گھاس کا ایک تنکا تک نہ

اگتا تھا۔ ایک ہینڈ پمپ موجود تھا مگر اس میں سے نکلنے والا پانی بے حد کھارا تھا جو اس قابل نہ تھا کہ پیا جا سکے کیونکہ اس میں سے ہمس آتی تھی......ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں ہر طرف ڈھول اڑ رہی تھی حتّٰی کہ کمروں کا فرش تک شورزدہ مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں اس وقت احمد نگر بہت یاد آیا جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں ہم لوگ گھومتے پھرتے تھے اور رہٹ والے کنویں پر جا کر ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے نہایا کرتے تھے مگر اب واپسی کے راستے بند تھے۔

میں اس وقت جامعہ کے درجہ رابعہ کا طالب علم تھا اور مولوی فاضل کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کو امتحان کا داخلہ بھیجا جا چکا تھا۔ کلاسیں بند تھیں کیونکہ کورس کی پڑھائی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ طالب علموں کو اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ مجھے اپنے ایک ہم جماعت مرزا اسلیم اختر کے ساتھ ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا کہ مل کر امتحان کی تیاری کی جائے۔ میری خواہش تھی کہ ہم ربوہ کے ہوسٹل سے باہر قصبے میں کوئی چھوٹا موٹا مکان یا کمرہ تلاش کر لیں جہاں پر ہمیں طالب علموں کی گھما گھمی سے ہٹ کر سکون کے ساتھ پڑھنے کا موقع مل سکے۔''

فاضل مصنف بتاتے ہیں کہ جب وہ مولوی فاضل کا امتحان دے چکے تو انہیں ''انجمن تحریک جدید کی طرف سے جامعۃ المبشرین جوائن کرنے کا حکم نامہ ملا۔ یہ ادارہ (داعیان الی اللہ) کو تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ کورس دو برسوں کا تھا مگر ایک تیسرا سال طب سیکھنے کے لیے مختص کر دیا گیا تھا۔ داخلے کی شرط یہ تھی کہ امیدوار نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا ہو یا بی اے کی ڈگری رکھتا ہو۔ اتفاق ایسا تھا کہ ہماری کلاس میں میرے اور محمد ارشاد بشیر کے ساتھ ایک تیسرے شخص کو داخلہ ملا تھا جو گوجرانوالہ سے بی اے کر کے آیا تھا۔ اس کا نام میری طرح منیر الدین احمد تھا۔ ہم سے اوپر والی کلاس میں سات یا آٹھ طالب علم تھے۔ گویا اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد استادوں جتنی تھی البتہ غیر ملکی طالب علموں کی ایک کلاس بھی اس ادارے سے ملحق تھی جس کو ایک ریٹائرڈ شدہ ہائی سکول ٹیچر پڑھاتا تھا۔ اس کا کام ان کو اردو زبان سکھانا اور جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر سے واقف کرانا تھا۔ دوسرے استادان کو عربی پڑھاتے اور دینی مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔......

وائس پرنسپل ملک سیف الرحمٰن تھے جو اس زمانے میں جماعت احمدیہ کے مفتی تھے اور ہمیں فقہ پڑھاتے تھے۔ وہ نوجوانی میں دینی تعلیم کسی مدرسے میں حاصل کرنے کے بعد خود سلسلۂ احمدیہ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کو تحقیق کا شوق تھا چنانچہ انہوں نے ایک زمانے میں ایک مجلس بنام ''ادارہ تالیف و ترجمہ'' بنائی تھی جس کے اراکین میں مصنف کے علاوہ ملک سیف الرحمٰن، سیّد عبدالحئی شاہد، سیّد کمال یوسف اور مرزا حنیف احمد شامل تھے۔ فاضل مصنف بتاتے ہیں کہ ''اس ادارے کی طرف سے صرف ایک کتاب چھپ سکی جو ملک صاحب کی لکھی ہوئی تھی اور نماز کے بارے میں تھی۔''

منیر الدین احمد مزید لکھتے ہیں کہ ''غلام باری سیف......ہمیں اشتراکیت پر لیکچر دیتے تھے۔ ان کا شمار بھی جماعتِ احمدیہ کے جیّد عالموں اور مقرّروں میں ہوتا تھا۔ وہ برسوں تک رسالہ خالد کے مدیر رہ چکے تھے۔......

مولوی ابوالمنیر نورالحق...... تفسیر القرآن کے استاد تھے۔......خورشید احمد شاد استاد الحدیث تھے۔ وہ طالب علموں کے ساتھ دوستانہ ملاپ رکھتے تھے......وہ مولانا ابوالعطا جالندھری کے داماد تھے اور عام طور سے بہت ذہین و فطین انسان گنے جاتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں......مولانا محمد احمد ثاقب، مولوی محمد اسماعیل اور......مولانا محمد احمد جلیل تھے۔ آخرالذکر آگے چل کر مفتیٔ سلسلہ بنے۔......

جامعۃ المبشرین کی عمارت ایک دو سال پہلے تعمیر ہوئی تھی مگر ہوسٹل بدستور انجمن تحریکِ جدید کے سابقہ دفتر کی کچی عمارت میں تھا۔''

اس سے قبل فاضل مصنف اپنے انتظام کے تحت رہائش پذیر تھے۔ وہ بتاتے ہیں: ''آخر کار مجھے ہوسٹل میں کمرہ مل گیا جہاں...... یہ پابندی نہ تھی کہ رات کو فلاں وقت تک سب طالب علموں کو ہوسٹل میں پہنچنا ہوگا۔ ہوسٹل کا دروازہ دن رات کھلا رہتا تھا۔ اگر کسی کا جی چاہے تو وہ رات ہوسٹل سے باہر گزار سکتا تھا۔ اس سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی تھی مگر دوسری طرف اس عمارت میں بجلی نہ تھی جس کے سبب گرمیوں میں برقی پنکھا تک نہ لگایا جا سکتا تھا اور رات کو پڑھنے کے لیے مٹی کے تیل کا لیمپ جلانا پڑتا تھا۔......

ہمارے ہوسٹل میں مقیم غیر ملکی طالب علموں کی تعداد پاکستانیوں کے لگ بھگ تھی۔...... قادیان کے زمانے میں مجھے بہت سے انڈونیشین طالب علموں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ربوہ میں بھی اس ملک کے طالب علم موجود تھے مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی۔ یہاں پر یورپین اور افریقن طالب علموں کی بھرمار تھی۔ میں خاص طور پر دو جرمن نوجوانوں کا ذکر کروں گا جن کے ساتھ مجھے آگے چل کر جرمنی میں بھی واسطہ پڑا۔ پہلے نمبر پر عبدالشکور کنزے تھا۔...... دوسرے نمبر پر وتلف خالد تھا جو بارہ تیرہ سال کی عمر میں برلن کی لاہوری احمدی جماعت کی (بیت الذّکر) میں جانے لگ گیا تھا۔ جب وہ سترہ برس کا ہوا تو تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں ملازم ہو گیا جس کا ایک ذیلی آفس کویت میں تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے وہاں پر بھیج دیا جائے کیونکہ اس کو امید تھی کہ وہاں پر عربی سیکھنے کے علاوہ اسلام کی تعلیم بھی حاصل کر سکے گا مگر وہاں پر ایسا کوئی انتظام نہ تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات کویت میں مقیم ایک پاکستانی احمدی سے ہو گئی جس نے اسے ربوہ بھجوا دیا۔ جس روز خالد ربوہ پہنچا اور اس کو ہمارے ہوسٹل میں رہائش کی خاطر لایا گیا اس وقت میں وہاں پر موجود تھا اور اس کو خوش آمدید کہنے والوں میں شامل تھا۔ خالد چھوٹے قد کا سرخ و سفید رنگ کا چلتا پھرتا سا گڈا تھا۔ اس نے سر پر سرخ طربوش پہن رکھی تھی اور ایک نامانوس لہجے میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر وہ اردو بھی اسی لہجے میں بولنے لگا۔ یوں تو وہ بے حد زندہ دل تھا اور جب ہنسنے پہ آتا تھا تو اس کو روکنا مشکل ہو جاتا تھا بس اس میں یہ خامی تھی کہ وہ کسی قسم کے کھیل میں حصہ نہ لیتا تھا۔ ہوسٹل کے صحن میں جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے عصر اور مغرب کی نمازوں کے مابین ڈیک ٹینس (جس کا دوسرا نام رِنگ ٹینس ہے) کھیلی جاتی تھی، میں شامل نہ ہوتا تھا۔...... خالد دو برس تک ربوہ میں مقیم رہا اور جب وہ جرمنی لوٹنے کے لیے چناب ایکسپریس پر چڑھا تو میں مشایعت کی خاطر اس کے ساتھ لائل پور تک گیا تھا۔

ادریس چینی جو مجھے احمد نگر کے زمانے میں ماؤزے تنگ کی نظمیں ترجمہ کر کے سنایا کرتا تھا وہ بھی اسی ہوسٹل میں مقیم تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر یہ تبدیلی آئی تھی کہ اب وہ عربی اور اردو سیکھنے کی بجائے سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ''پاکستان ٹائمز'' کو پہلی سطر سے شروع کر کے آخری سطر تک بلند آواز میں پڑھتا تھا جیسے وہ انگریزی زبان میں خبریں نشر کر رہا ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ چین واپس جا کر ریڈیو میں کام کرنا چاہتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ کمیونزم کے خلاف زہر اگلا کرتا تھا مگر اب وہ کمیونسٹ نظام کے گُن گاتا پھرتا تھا۔ جب ہنگری نے انٹرنیشنل فٹ بال چیمپئن شپ جیتی تو ادریس خوشی کے مارے پھولے نہ سماتا تھا۔ وہ ہر کسی کو کہتا پھرتا تھا: تم دیکھ لو گے کہ کمیونسٹ ممالک مغربی یورپ اور امریکہ کو ہر میدان میں ہرا دیں گے۔ پہلے بھی ماؤزے تنگ بطور شاعر اس کا ہیرو ہوا کرتا تھا، اب وہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی تعریف کے پُل باندھنے لگا تھا۔ کسی نے لکھ دیا کہ ادریس چینی جامعۃ المبشرین میں کمیونزم کا پرچار کرتا پھرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ کمیونسٹ چین کا ایجنٹ ہو۔ مولانا ابوالعطا کو حکم جاری ہوا کہ ایک انکوائری کمیشن بٹھایا جائے جو اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے...... کمیشن اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہ کر سکا مگر اس کی بریّت اوّل درجہ کی نہ تھی۔ ادریس نے اس دوران میں پوری سنجیدگی کے ساتھ چین واپس لوٹنے کی تیاری شروع کر دی مگر اس سے بھی پہلے ابراہیم ما چین واپس گیا۔ اس نے وہاں سے ادریس کو لکھا کہ حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں اس لیے تم بھی واپس آ سکتے ہو۔ بہت برسوں کے بعد ڈاکٹر زین العابدین نے جو جدّہ سے مسلم اقلیتوں کے بارے میں ایک مجلّہ نکالتے تھے، مجھے ابراہیم کے بارے میں بتایا کہ وہ پیکنگ میں اسلامی سنٹر کا نائب صدر ہے۔ اس کے متعدد مضامین چین کے مسلمانوں کے بارے میں ان کے مجلّے میں چھپے تھے۔ ادریس کے بارے میں یہ سننے میں آیا کہ اس کو کسی وجہ سے موت کی سزا دے دی گئی تھی۔

افریقن طالب علم زیادہ مہذب اور خوش خلق تھے۔ تنزانیا کا رہنے والا عُمَری عُبَیدی ربوہ آنے سے پہلے اپنے وطن میں بطور سواحیلی شاعر کے نام پیدا کر چکا تھا۔ اس کے دوستوں میں جولیس نیے رے رے شامل تھا جو اپنے ملک کا پہلا صدر بنا۔ عمری عبیدی کو اس نے وطن واپس لوٹنے پر پہلے دارالسلام کا میئر بنایا، پھر اپنی کابینہ میں وزارتِ قانون کا قلم دان اس کے حوالے کر دیا۔ جامعۃ المبشرین میں قیام کے دوران عمری عبیدی اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ پڑھنے میں یا عبادت میں گزارتا تھا......

میرے جونیئر دوستوں میں گھانا کا رہنے والا عبدالوہاب بن آدم شامل تھا۔ وہ بھی بے حد محنتی اور لائق و فائق لڑکا تھا۔ وہ بہت نوعمری میں پاکستان آیا تھا۔ اردو سیکھنے کے بعد اس نے جامعہ احمدیہ کی ریگولر تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ پھر جامعۃ المبشرین سے ڈگری شاہد حاصل کی اور گھانا بھیجا گیا......

ان دنوں ربوہ میں کئی غیر ملکیوں کی شادیاں پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ رشید نامی سیاہ فام امریکن کی شادی مولوی محمد ابراہیم خلیل کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اسی طرح شام کے رہنے والے سلیم الجابی کی شادی مولوی عبدالواحد سماٹری کی سالی کے ساتھ ہوئی تھی۔ برسوں کے بعد میں ایک بار دمشق گیا تو سلیم نے مجھے اپنے

گھر پر دعوتِ طعام دی تھی جہاں پر میری ملاقات اس کے بیٹوں کے ساتھ ہوئی۔ شادی ہونے سے پہلے سلیم......لاؤڈ اسپیکر پر بڑی لمبی (نِدا) دیا کرتا تھا۔ اس کا اپنا مخصوص اسٹائل تھا جس کی نقل کسی سے نہ ہو سکی۔

بشیر احمد آرچرڈ سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا جس کو میں تقسیم ملک سے قبل کے دنوں سے جانتا تھا......

ہوسٹل میں سال کے خاتمے پر طالب علم ایک محفل منایا کرتے تھے جس میں قسم قسم کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ ایک ایسی تقریب کے موقعے پر وہ میرے پاس یہ بتانے کے لیے آیا کہ وہ بھی کچھ کرتب جانتا ہے اور اگر اس کو اجازت ملے تو وہ پیش کر سکتا ہے۔ وہ حافظے میں وسعت کے سلسلے میں بہت سی مشقیں جانتا تھا جن کے توسط سے وہ ایک بار اپنے سامنے پیش کئے جانے والے ہندسوں کی لڑی کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتا تھا اور اس کو عین اسی ترتیب سے پیش کر سکتا تھا۔ اس کو جماعت احمدیہ کا (مربی) بنا کر اسکاٹ لینڈ بھیجا گیا تھا جہاں پر وہ اپنی وفات تک نصف صدی سے زیادہ عرصہ مصروفِ عمل رہا۔ میرے عرب دوست محمود شبوطی کی شادی سیّد بشیر احمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ وہ عدن کے ایک تاجر کا بیٹا تھا اور ہر سال چھٹیوں میں وطن جاتا تھا۔ واپسی پر اس کا سوٹ کیس تحفوں سے بھرا ہوتا تھا۔ وہ بہت بیبا آدمی تھا......

طالب علموں کو سیاسیات میں عام طور سے دلچسپی نہیں تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی پاکستان میں وَن یُونٹ بنایا گیا تھا جس پر ہمارے بنگالی دوستوں کو سخت اعتراض تھا...... ہوسٹل میں اردو کے دو اخبار آتے تھے جو ڈائننگ روم میں رکھے جاتے تھے اس لیے بنگالیوں اور پنجابیوں کے درمیان بحثیں وہیں پر ہوتی تھیں......''

آپ نے منیر الدین احمد کی خودنوشت میں سے جامعہ احمدیہ سے متعلق بعض اقتباسات پڑھتے ہوئے ضرور نوٹ فرمایا ہوگا کہ ان کے ایک غیر ملکی ساتھی ایک پکنک کے دوران دریائے چناب میں ڈوب کر وفات پا گئے تھے۔ ان کا نام رضوان عبداللہ تھا اور وہ جامعہ احمدیہ میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے آئے ہوئے حبشہ کے ایک طالب علم تھے۔

چھبیس اگست ۱۹۵۳ء کو وہ جامعہ کے باقی طلباء اور اساتذہ کے ہمراہ پکنک کے لیے دریا پر گئے اور دن بھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ علمی مقابلوں اور کھیل کود میں مصروف رہے تاہم عصر کی نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے وہ دریا میں ڈوب گئے۔ رضوان عبداللہ کی اچانک وفات ان کے والدین کے لیے جتنا بڑا سانحہ ہو سکتی تھی اس بارے میں کچھ کہنے کی چنداں حاجت نہیں لیکن اہلِ ربوہ کے لیے بھی یہ وفات کسی بڑے صدمہ سے کم نہ تھی اور ہر چھوٹے بڑے شخص نے اس دکھ کو محسوس کیا۔ میں اس وقت اگرچہ بہت چھوٹا تھا تاہم ہمارے گھر میں جس طرح اس افسوسناک واقعے کا ذکر ہوا اس کا میرے دل پر ایک لمبا عرصہ اثر رہا۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہ تھا لیکن اب بھی میں جب بہشتی مقبرے جاتا ہوں مجھے رضوان عبداللہ یاد آ جاتے ہیں اور میں کوشش کر کے ان کی قبر پر دعا کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔

اس موقع پر حضرت مرزا بشیر احمد نے ''رضوان عبداللہ کی المناک وفات'' کے عنوان سے الفضل (یکم ستمبر ۱۹۵۳ء) میں ایک مضمون لکھا جس میں اس حادثے کی بعض ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں لہٰذا اسے

افادۂ قارئین کے لیے ذیل میں نقل کیا جارہا ہے:

''کل شام کو نمازِ عصر کے وقت رضوان عبداللہ جو حبشہ سے آیا ہوا ایک طالب علم تھا اور جامعہ احمدیہ کی مولوی فاضل کلاس میں تعلیم پاتا تھا دریائے چناب میں ڈوب کر فوت ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ٥

رضوان جو کئی ہزار میل کی مسافت طے کر کے علمِ دین کی تحصیل کی غرض سے ربوہ آیا ہوا تھا اور جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے اپنے والدین کا سب سے بڑا بچہ تھا ایک بہت ہی شریف اور ہونہار اور دیندار لڑکا تھا جس کی عمر ابھی بمشکل سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ شروع شروع میں پاکستان پہنچا تو اس وقت میرا دفتر لاہور میں ہوتا تھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کہیں باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے چنانچہ رضوان مرحوم سب سے پہلے لاہور میں مجھے ملا اور عربی زبان میں باتیں کرتا رہا اور پھر ہم نے اسے ربوہ بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ اُس وقت سے میری طبیعت پر رضوان کی شرافت کا خاص اثر تھا۔ کم گو، شریف مزاج، بے شر، مخلص، دینی جذبات سے معمور اور ہونہار...... یہ وہ اثر ہے جو ہر وہ شخص جو رضوان سے ملا اس کے متعلق قائم کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اس کے والدین کو جنہوں نے اسے کِن امنگوں اور امیدوں کے ساتھ ربوہ بھجوایا تھا صبرِ جمیل اور ثوابِ عظیم سے نوازے۔ آمین یا ارحمُ الرّاحمین۔

معلوم ہوا ہے کہ رضوان مرحوم جامعہ احمدیہ کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک پارٹی کے ساتھ تفریح کی غرض سے دریائے چناب پر گیا تھا اور سارا دن اپنے ہم مکتبوں اور اساتذہ کے ساتھ خوش خوش رہا اور جب عصر کی نماز کے لیے وضو کرنے کی غرض سے وہ دریا کے کنارے پر گیا تو جب وہ قریباً اپنا وضو مکمل کر چکا تھا اور صرف ایک پاؤں دھونے والا باقی تھا کہ گیلا پاؤں پھسل جانے سے وہ دریا میں گر گیا اور چونکہ سُوئے اتفاق سے اس جگہ پانی بہت گہرا تھا اور رضوان تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے بچانے والوں کی کوشش کے باوجود بچایا نہیں جا سکا اور وہ دریا کی تہ میں بیٹھ گیا جہاں سے قریباً دو گھنٹے کی مسلسل تلاش اور کوشش کے بعد اس کی نعش نکالی گئی۔

جب اس کے ڈوبنے کی اطلاع ربوہ میں پہنچی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ ڈوبنے پر اتنا وقت گزر چکا ہے تو باوجود زندگی سے بظاہر ناامید ہو جانے کے ربوہ سے بہت سے دوست امداد کے لیے بھجوائے گئے تا اگر رضوان مرحوم کو بچایا نہیں جا سکا تو کم از کم اس کی نعش ہی مل جائے اور ہم ایک دُور سے آئے ہوئے بچے پر نمازِ جنازہ ادا کر کے اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کر سکیں اور میں نے اس کے لیے بڑی دعا بھی کی کہ اس کی نعش مل جائے اور احتیاطاً ایک موٹر بھی شورکوٹ جھنگ کی طرف روانہ کرنے کے لیے تیار کر لی تا اگر نعش یہاں نہیں مل سکی تو وہاں ہی مل جائے جہاں چناب اور جہلم ملتے ہیں اور ڈوبنے والے کی نعش کچھ وقت کے بعد اوپر آ جایا کرتی ہے مگر الحمدللہ کہ مغرب کے قریب نعش مل گئی اور ہم اس مرحوم بچے کو پولیس کی رسمی کارروائی پوری ہونے کے بعد نصف شب کے قریب دفنا سکے۔ دفنانے میں جلدی اس لیے کی گئی کہ جسم کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر کی رائے تھی کہ بلا توقف دفنا دینا چاہیے۔

مرحوم چونکہ ابھی بچہ تھا اور غیر موصی تھا اس لیے ہم اسے اپنے اختیار سے مقبرہ موصیان ربوہ میں دفن نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ حضرت مسیح موعود اور حضرت خلیفہ اول اور حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے عہد میں ایسی مثالیں موجود تھیں کہ خاص حالات میں بچوں کو اور غیر موصیوں کو بہشتی مقبرے میں دفن ہونے کی اجازت دی گئی تھی اس لیے مرحوم رضوان کو عام قبرستان میں امانتاً تابوت کے اندر دفن کیا گیا اور حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں اجازت کے لیے ایکسپریس تار دے دی گئی جس کے جواب کا انتظار ہے۔ مرحوم کے والدین کو بھی وکالتِ تحریک جدید کی طرف سے جس کی نگرانی میں یہ بچہ تھا اطلاع اور ہمدردی کی تار دی گئی ہے مگر ان کے صدمہ کی گہرائی کو صرف ہمارا خدا ہی جان سکتا ہے جس نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے فطرتِ انسانی میں جذبات کا خمیر دیا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ڈوب کر مرنے والا اور کسی دیوار یا مکان کے نیچے آ کر مرنے والا اور بچہ کی ولادت کے وقت اچانک فوت ہونے والی عورت اور اسی قسم کے بعض دوسرے فوت ہونے والے لوگ شہید ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں شہادت کی اصل حقیقت کو تو صرف خدا ہی جانتا ہے (کیوں کہ شہادت کے اصطلاحی معنے خدا کے رستے میں جان دینے کے ہیں) لیکن بعض بزرگوں نے اس جگہ شہید کے معنی مشہود کے کئے ہیں اور مراد یہ لیا ہے کہ چونکہ اس قسم کی اچانک موتوں پر دنیا کی نظریں مرنے والے اور اس کے اقربا کی طرف بے اختیار اور بار بار اٹھتی ہیں اس لیے ایسا شخص شہید بمعنی مشہود ہوتا ہے۔ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ خاکسار خیال کرتا ہے کہ اچانک وفات کا یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مرنے والے کے نیک اعمال کا سلسلہ اچانک کٹ جاتا ہے اور اسے قربِ موت کے وقت کی خاص دعاؤں کا بھی موقع نہیں ملتا اور دوسری طرف ایسی موت کا اس کے عزیزوں کو بھی خاص صدمہ ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے خاص دعائیں کرتے ہیں اس لیے ہمارے رحیم و کریم آقا کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ایسے حالات میں فوت ہونے والوں اور فوت ہونے والیوں کو شہادت کا مرتبہ عطا کر دیتا ہو۔ وَ رَبُّنَا وَسِیْعُ الرَّحْمَةِ ذُوْا فَضْلٍ عَظِیْمٍ اور جن لوگوں کو شہید کہا گیا ہے ان کا مومن ہونا اور نیک اعمال پر قائم ہونا تو بہر حال لازمی اور ضروری شرط ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بالآخر دعا ہے کہ رضوان مرحوم کو (جو ہم سے اس طرح اچانک طور پر رخصت ہوگیا اور جو گویا نماز کی حالت میں فوت ہوا کیوں کہ وضو نماز کی تیاری کا حصہ ہے) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے نوازے۔ اس کے صدمہ رسیّدہ والدین اور دیگر عزیزوں کو صبرِ جمیل اور ثوابِ عظیم سے حصہ وافر عطا کرے، اس کے ہم وطنوں کو اس کے اجر اور ہونے والی خدمات کے نتائج سے محروم نہ فرمائے اور ربوہ کے دیگر غیر ملکی طلبہ کا دین و دنیا میں حافظ و ناصر ہو۔ آمین۔''

اس موقع پر بعض احمدی شعراء نے رضوان عبداللہ کو بزبانِ شعر خراجِ عقیدت پیش کیا چنانچہ عبدالمنان ناہید نے کہا:

وطنِ حبشہ تری کر نہ سکا سقائی
تشنگی علم کی ربوہ میں تجھے لے آئی
اب کہاں لے کے تجھے عزمِ جواں جاتا ہے
دُور افتادہ مسافر تُو کہاں جاتا ہے
کٹ گئی عین بہاراں میں جوانی تیری
خون کے آنسو رلائے گی کہانی تیری
غم اٹھا لے گا ترے والدِ مہجور کا دل
خوں نہ ہو جائے گا کیا مادرِ مجبور کا دل
اب ذرا بھیج صبا خُلد کے ایوانوں سے
اُمِ رضواں سے مرا جا کے یہ پیغام کہے
''ہے یہی تیرے مقدّر کی فلک پیمائی
تیرے نوعمر مجاہد نے ...... پائی''
چشمِ مہجور ترے غم میں برستی ہی رہی
ارضِ حبشہ ترے قدموں کو ترستی ہی رہی
موت سی چیز تھی کیا تیرے وطن میں نایاب
نیلِ ارزق ہے کہاں اور کہاں آبِ چناب
سینۂ عشق میں ہُوک اٹھتی ہے پیارے رضواں
ہم تجھے بھول نہیں سکتے ہمارے رضواں

رضوان عبداللہ کی یاد میں حضرت مرزا بشیر احمد کے مضمون کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی الفضل میں شائع ہوئے جن میں سے ایک مرزا حنیف احمد کا ہے جو ۱۳ستمبر ۱۹۵۳ء کے الفضل میں شائع ہوا۔ موصوف لکھتے ہیں:

''زندہ قومیں اپنی تاریخ میں اپنے اولوالعزم اور بہادر افراد کی قومی خدمتوں کو سنہری حروف سے تحریر کرتی ہیں کیونکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ قومی برتری اور عزتِ نفس کے قیام کا سرمایہ ہوتی ہیں اور قوم کی خاطر قربانی کا ایک طویل تسلسل قائم رکھتی ہیں۔

ہمارے غیر ملکی بھائی، رضوان عبداللہ کا نماز کی تیاری میں وضو کرتے ہوئے غریب الوطنی میں غرقِ آب ہو جانا بھی ایک ایسا واقعہ ہے جو احمدیت کی تاریخ میں محفوظ رہے گا۔ ہمارے بھائی رضوان کا میدانِ عمل روحانیت تھا اور روحانی فرائض کی انجام دہی میں جان دے دینا دنیوی اغراض و مقاصد کی خاطر جان دینے کی نسبت بہت زیادہ ستائش اور آفرین کے قابل ہے کیونکہ مقصدِ حیات یہی ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے۔

انسانی معاشرے میں مختلف شعبوں کی انجام دہی کے لیے خدا تعالیٰ نے انسانوں میں مختلف صفات

ودیعت کی ہیں۔ کچھ افراد غور و فکر کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کچھ عملی رنگ میں رنگین؛ کچھ سنجیدہ اور باوقار ہوتے ہیں اور کچھ اپنا وقت ہنسی اور مذاق میں گزارنے والے۔ اسی طرح ہم جس قدر بھی جزئیاتِ زندگی پر غور کرتے جائیں گے ہمیں متضاد اجزا کا وجود نظر آئے گا۔ ان میں ایک لطیف در لطیف نسبت ہوتی ہے جو کہ ایک دوسرے کو زنجیر کی کڑیوں کی طرح سہارا دیئے ہوئے ہوتی ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد اپنے آپ کو اپنی کوتاہیوں سے منفی رنگ میں رنگین کر لیتے ہیں اور اپنے اندر تاریکی پیدا کر کے دوسروں کے لیے تاریکی اور روشنی میں امتیاز کرنے کا حل پیش کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جو اپنی کوششوں اور خدا کے فضل سے خود کو مثبت رنگ کی طرف کھینچ لاتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے زندگی میں عملی اور ٹھوس قسم کے کام کرنے ہیں اور کسی نہ کسی مخصوص شعبے کی ارتقائی منازل ان سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر میں جب کبھی بھی رضوان سے ملا ہوں، میں نے جب بھی اس سے گفتگو کی ہے ہمیشہ میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس نوجوان کا شمار مؤخر الذکر زمرے میں ہے۔ رضوان کی سنجیدہ طرزِ گفتگو، اس کا باوقار تبسم، اس کی باوقار چال اور صاف ستھرے کپڑے اور پھر ان تمام پر ایک پُرخلوص مذہبی رنگ کا چھایا ہوا ہونا رضوان کے آئندہ ہونے والے کارہائے نمایاں اور اس سے وابستہ دینی خدمتوں کی غمازی کرتا تھا۔

اس کا تعلیم میں شغف اور ادبی میلان اس بات کا شاہد تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے زندگی دیتا تو وہ معاشرے میں ایک نفع بخش ہستی کا اضافہ کرتا۔ اس ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں (جب سے کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر ہمارے پاس آ گیا تھا) کسی نے اسے کسی سے کبھی لڑتے ہوئے یا کسی سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔

ایک دُور دراز ملک سے اپنے بچے کو اجنبی (خواہ وہ صرف تمدّنی لحاظ سے ہی کیوں نہ ہوں) لوگوں میں بھیج دینا ایک معیاری پختگیٔ ایمان اور جذبات پر ضبط کی قدرت کا آئینہ دار ہے اور پھر اس پر اس قسم کے حوادث کا ظہور بہت اندوہناک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

رضوان جیسے بچے کو کھو دینے پر درد و غم کا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ ہمیں رضوان کے والدین سے ہمدردی ہے۔ خدا اُنہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے اور خدا کی راہ میں مزید قربانیوں کی توفیق دے۔ کوئی عجب نہیں کہ رضوان کی قربانی اس کے گھر بلکہ اس کے خاندان یا اس سے بھی بڑھ کر اس کے ملک کی سرفرازی کا باعث ہو۔''

ایک اور مضمون جو مرحوم کے ایک دوست اور جمیل الرحمٰن رفیق، وکیل التصنیف تحریک جدید کے بھائی، حفیظ الرحمٰن کا لکھا ہوا ہے اور الفضل ۱۷ستمبر ۱۹۵۳ء میں شائع شدہ ہے بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''دسمبر کی ایک سرد رات تھی۔ میں اپنے بستر میں پڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک دوسرا بستر تھا جس پر سوڈان کے طالب علم ابراہیم عباس جو کہ دینی تعلیم کے لیے سوڈان سے ربوہ آئے ہوئے تھے سونے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میری آنکھ لگنے کو تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ابراہیم عباس جلدی سے اٹھے اور دروازہ کی کنڈی کھول دی۔ لمحہ بھر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ابراہیم عباس کے ساتھ ایک خوبصورت، صحت مند، ہونہار لڑکا اندر

داخل ہوا۔ ان کے پیچھے ایک قلی سامان اٹھائے تھا۔ لڑکے کے چہرے پر سفر کے آثار تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ زیادہ تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ یہ رضوان عبداللہ محمد تھے جن کی آمد کے ہم دو ماہ سے منتظر تھے۔ ابراہیم عباس ان کو سوڈان سے جانتے تھے کیونکہ رضوان عبداللہ قریباً چار سال سوڈان میں اپنے دادا کے پاس رہے تھے۔ ''ان کا نام حفیظ الرحمٰن ہے'' ابراہیم عباس نے رسمی طور پر میرے نام سے انہیں متعارف کروایا۔ رضوان عبداللہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہی تعارف بہت کافی سمجھا گیا۔ رضوان عبداللہ بھی دینی تعلیم کے لیے ربوہ آئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ربوہ میں قریباً چھ سال رہ کر جامعہ کا کورس مکمل کریں اور پھر حبشہ کے ملک میں جا کر پیغامِ حق پہنچائیں۔

ان کا سامان مناسب جگہ پر رکھا گیا اور ایک بستر ان کے لیے بچھایا گیا مگر رضوان عبداللہ بہت دیر سے سوئے۔ وہ بہت دیر تک حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے متعلق بہت سی باتیں پوچھتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ رات جلد گزر جائے اور وہ صبح حضور سے ملاقات کا شرف حاصل کرسکیں۔ وہ رات گزر گئی اور اس کے بعد وہ ایک سال تک میرے ساتھ رہے۔ میں انہیں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور ہم بالکل بھائیوں کی طرح بے تکلف تھے۔ ایک سال کے بعد وہ غیر ملکی طلبہ کے ہوسٹل میں بھیج دیئے گئے۔ انسانی دل کمزور ہوتا ہے۔ مجھے ان کے علیحدہ ہونے سے غم ہوا حالانکہ صرف چند فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر کیا علم تھا کہ مستقبل اس سے بھی زیادہ غمگین ہے۔

ربوہ کے قریباً شمال میں صرف دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہے جسے احمد نگر کہتے ہیں۔ ربوہ میں مکانات اور بڑی عمارات کی کمی کی وجہ سے جامعہ احمدیہ...... عارضی طور پر احمد نگر میں قائم کیا گیا تھا۔ وہاں سے چار سال کی تعلیم کے بعد طلبہ ربوہ کے بڑے کالج، جامعۃ المبشرین میں مزید دو سال تعلیم پاتے ہیں۔ رضوان عبداللہ بھی جامعہ احمدیہ میں داخل ہوگئے۔ وہ ہر روز ربوہ سے سائیکل پر احمد نگر جایا کرتے تھے۔ ربوہ میں چند ماہ کے قیام کے بعد اپنی تعلیم سے زیادہ قریب ہونے کے لیے احمد نگر کے جامعہ احمدیہ ہوسٹل میں رہائش اختیار کرلی۔ وہ محنت سے وہاں پڑھتے رہے اور بعض انعامی مقابلوں میں انعامات بھی جیتے۔ احمد نگر کے قیام کے دوران میں وہ ہفتہ میں ایک دو بار ربوہ ضرور آتے۔ ہر جمعہ کو حضور کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرتے۔ جب کبھی مربیان غیر ملک سے ربوہ واپس آتے یا ربوہ سے کسی اور ملک کو...... جاتے تو رضوان عبداللہ دینی محبت کے جذبہ سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ ربوہ پہنچتے تا اللہ تعالیٰ کے مسیح کے سپاہیوں کو اس مقدس سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھ کر روحانی خوشی حاصل کریں۔

وقت گزرتا گیا۔ انسان کی رفتارِ نبض چلتی چلتی رک جاتی ہے مگر وقت کی رفتار کبھی نہیں سکون لیتی۔ قریباً تین سال گزر گئے۔ رضوان اب جامعہ احمدیہ کے آخری سال میں تھے۔ تعلیم میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے ملاقات کم ہوتی تھی۔ ابھی چند روز پہلے عصر کے بعد میں اپنے گھر سے بعض دوستوں کو ملنے کی غرض سے باہر نکلا تو ایک گھبرائے ہوئے چہرے پر نظر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا: ''رضوان دریا میں ڈوب گیا۔'' میں اچانک ایسی بُری خبر سننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ پاگلوں کی طرح دریا کی طرف بھاگا۔ دریا قریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرے پہنچنے کے کچھ عرصے کے بعد رضوان کو دریا کی سطح سے نکال لیا گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی خدا کے حضور گر گیا

اور اس کی زندگی کے لیے چلّایا مگر افسوس کہ وقت گزر چکا تھا۔ وہ تو ڈیڑھ گھنٹہ سے زائد پانی میں پڑا رہا تھا۔ کئی ٹن پانی اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ میں کچھ نہ کرسکتا تھا۔ آہ! میں نے اپنا محبوب بھائی کھو دیا۔

وہ میرے ساتھ ایک سال رہا۔ خدا کے دین کے لیے اس کے اندر بے پناہ جذبہ تھا۔ بات بہت کم کرتا تھا۔ ذہین تھا۔ حضرت مسیح موعود کے عربی قصائد پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ہر آدمی جو اس سے ملا وہ اس کی ان خصوصیات کا گواہ ہے۔ وہ تعلیم کے لیے ہزارہا میل سے ربوہ آیا۔ خدا تعالیٰ کی محبت سے بھرپور روح کے ساتھ اس نے حصولِ تعلیم میں سعی کی مگر نتائج سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے اسے بلا لیا۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اسی پہ اے دل تُو جاں فدا کر

اے ہمارے آسمانی آقا! ہر ایک چیز تیری ہے جو دنیا میں امانت کے طور پر رکھی گئی ہے۔ رضوان نے تیرے لیے زندگی وقف کی اور تیری راہ میں فوت ہوا۔ اے ارحمُ الرّحمین! اسے اپنے قرب میں جگہ دے۔ اس کے والدین کو مکمل صبر عطا فرما۔ موت تو زندگی کا ایک حادثہ ہے، زندگی کا اختتام نہیں۔ زندگی جاری ہے پہلے اس فانی جہان میں تھی، اب اس لافانی جہان میں ہے مگر مبارک ہیں ایسے لوگ جو لامحدود زندگی کے پہلے امتحان میں کامیابی حاصل کریں۔ مبارک ہیں وہ والدین جنہوں نے اپنے بچے کو خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانی کے لیے وقف کر دیا اور ہمیشہ کی زندگی میں اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کیا۔

رضوان کی نعش کو ربوہ میں لایا گیا۔ رات کے دس بجے کے قریب اس زمین پر اسے آخری غسل دیا گیا۔ سفید لٹھے کا نیا لباس پہنایا گیا۔ جنازہ اٹھایا گیا۔ سینکڑوں لوگ اردگرد تھے۔ پندرہ سے زائد ملکوں کے نمائندہ طلبہ پُرنم آنکھوں اور غمگین دلوں کے ساتھ اردگرد خاموشی سے چل رہے تھے۔ میں نے راستے میں اپنے بھائی کو آخری بار کندھا دیا۔

رات نصف کے قریب گزر چکی تھی جب کہ ہم اپنے اس پیارے بھائی کو سپردِ خاک کر کے اور اس کے درجات کی بلندی کے لیے دعائیں کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

رضوان عبداللہ ۱۹۳۵ء میں حبشہ میں پیدا ہوئے؛ ۱۹۴۴ء میں حبشہ سے سوڈان اپنے دادا کے پاس چلے گئے؛ ۱۹۴۸ء میں واپس حبشہ اپنے والدین کے پاس گئے؛ ۱۹۵۰ء میں پاکستان ربوہ بغرضِ تعلیم تشریف لائے اور چھبیس اگست ۱۹۵۳ء بروز بدھ پاکستان میں ربوہ کے مقام پر ڈوبنے کے حادثے سے فوت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

اس مضمون کے بعد ۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء کے الفضل میں مولانا ابوالعطا جالندھری کے قلم سے ''السید رضوان عبداللہ کی افسوسناک وفات: مرحوم کا عربی مضمون اور اس کا ترجمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں موصوف لکھتے ہیں:

''قریباً ساڑھے تین سال گزرے کہ یہ نوجوان ربوہ میں وارد ہوا اور اس عرصے میں سرسری طور پر اردو جاننے کے بعد جامعہ احمدیہ میں داخل رہا۔ نہایت ہونہار، زیرک اور شریف و محنتی نوجوان تھا۔ اتنے قلیل عرصے

ہیں اس نے کافی حد تک اردو زبان بھی سیکھ لی تھی اور اب اس سال وہ مولوی فاضل کا امتحان دینے والا تھا۔

چونکہ اس کی مادری زبان عربی تھی اس لیے اس کے ساتھ جامعہ احمدیہ کی تعلیم کے عرصے میں مجھے اس وجہ سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ میں نے اس کے غیر ملکی ہونے کے باعث اس کی سہولت کا خاص خیال رکھا اور ایک عرصہ تک اسے اپنے مکان میں اپنے پاس بھی رکھا۔ نہایت متدیّن اور بااخلاق نوجوان تھا۔ بات کرتے وقت عام طور پر اس کے چہرہ پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ اسے علمی ترقی کا خاص شوق تھا۔ غرض جس پہلو سے دیکھا جائے عزیز رضوان کی وفات رنجدہ والم انگیز ہے۔

گزشتہ سال موسمِ گرما جب کہ اساتذہ اور طلبہ جامعہ احمدیہ نے تجویز کی کہ کل دریائے چناب پر سیر وتفریح کے لیے بطور ٹرپ جانا چاہئے میں نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا مگر رات میں نے خواب میں دیکھا کہ طلبہ اور بعض اساتذہ جامعہ احمدیہ دریائے چناب پر ٹرپ کے لیے گئے ہیں اور ایک طالب علم (غالباً غیر ملکی طالب علم) دریا میں ڈوب گیا ہے چنانچہ صبح میں نے دریا پر جانے کے پروگرام کو منسوخ کر دیا اور اس خواب کا بھی طلبہ سے ذکر کر دیا۔ بعض اساتذہ کو بھی بتا دیا۔ اب یہ خواب ذہن سے بالکل اتر چکی تھی لیکن چھبیس اگست کی رات کو عزیز رضوان کی وفات کی خبر پا کر جب میں ایک طالب علم کے ہمراہ ربوہ جا رہا تھا تو عزیز بشیر احمد قمر نے مجھے بتایا کہ بعض طلبہ آپ کے اس خواب کا آج ذکر کر رہے ہیں۔ اس پر وہ خواب مجھے بھی یاد آ گئی اور عجیب بات ہے کہ گزشتہ سال جن استاد صاحب کو میں نے طلبہ کے ساتھ خواب میں دیکھا تھا وہی اس موقع پر ان کے ساتھ تھے۔

اواخر جون ۱۹۵۳ء میں مجھے جامعۃ المبشرین ربوہ کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ان دنوں جامعہ احمدیہ میں تعطیلات تھیں۔ جامعہ احمدیہ کے بنگال، سیلون، کشمیر، چین وغیرہ کے چند طلبہ جو تعطیلات میں گھروں کو نہ جا سکے تھے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ابھی میں جامعہ احمدیہ کا چارج نہ دے چکا تھا۔ ان چند طلبہ کی ایک دعوت پر ہم ان کے ساتھ ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ عزیز رضوان مرحوم بھی شامل تھا۔ میں نے چاہا گرمی کی شدت ہے اور ان طلبہ کو یہ احساس ہوگا کہ ہمارے ماں باپ قریب ہوتے تو ہم بھی تعطیلات میں ان کے پاس جاتے اس لیے ان کو کسی قریب کے اچھی آب وہوا والے مقام پر ضرور بھجوانا چاہئے۔ رضوان مرحوم کو ان طلبہ سے علیحدہ ہو کر ایبٹ آباد جانے کی پہلے سے پیشکش ایک اور جگہ سے ہو چکی تھی مگر اپنے اور طالب علم ساتھیوں کی رفاقت کو ترجیح دیتے ہوئے مرحوم نے یہی پسند کیا کہ وہ بھی تعطیلات کا ایک حصہ کلر کہار ضلع جہلم کے مقام پر ہی گزارے گا تا کہ اس عرصے میں اس کی تعلیمی ترقی کا سلسلہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جاری رہے۔

مرحوم رضوان کو تحریر کی طرف بھی توجہ تھی۔ رسالہ الفرقان میں ایک عربی حصہ بھی ہوتا ہے۔ ماہ جنوری ۱۹۵۳ء کے رسالہ میں مرحوم کا...... مختصر مگر نہایت پُر مغز مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس ہونہار نوجوان کی پہلی اور آخری تحریری کوشش کے ریکارڈ کے طور پر میں اس مقالہ...... کا ترجمہ...... شائع کرتا ہوں:

''ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ بڑائی حاصل کرنے والے بہت ہیں۔ بعض کی بڑائی علومِ عربیہ میں تفوّق سے ظاہر ہوتی ہے اور کچھ اپنی بہادری کے باعث یا حکمت و دانائی کے باعث بڑے قرار

پاتے ہیں اور بعض کی شہرت کا موجب ان کی تصنیفات ہوتی ہیں۔ ہم ان تمام لوگوں کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا آدمی ہے۔ اس نے علمِ طب میں عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور وہ کتنا مضبوط آدمی ہے کہ اس نے اکیلے ہو کر دو کا مقابلہ کیا اور انہیں گرا لیا۔ ہم اسی طرح بڑے لوگوں کی بڑائی اور عظمت کا حساب لگاتے ہیں اور بڑے لوگ اپنی تعداد میں بے شمار ہیں۔

خدائے احکم الحاکمین نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط لفظ خاتم النبیین ان تمام اوصاف کا جامع وصف ہے جو ہم نے اہلِ عظمت کے سلسلے میں ذکر کیے ہیں۔ یہ تمام اوصاف انبیائے کرام میں بدرجہ غایت پائے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین اور افضل المرسلین ہونے سے لازم آتا ہے کہ آپ ان تمام صفات میں تمام نبیوں سے بڑھ کر ہوں۔ پس یہ کہنا بجا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے بہادر ہیں اس لیے آپ خاتم النبیین ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ دانا اور حکیم ہیں اس لیے آپ خاتم النبیین ہیں۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ خاتم النبیین عظماء اور بڑوں کے تمام صفات نیز محاسن اخلاق پر جامع ہے اس لیے خاتم النبیین کا افضل الرسل ہونا لازمی ہے۔ بھلا آپ کیوں سب سے افضل نہ ہوتے جب کہ آپ سب لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اور ساری زمین آپ کے لیے مسجد قرار دی گئی ہے جس کے چپّہ چپّہ پر مومن سجدہ کرتے ہیں۔ پھر آپ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا دائمی معجزہ دیا ہے جس کے سایہ میں تمام اہلِ ادیان کو پناہ لینی پڑے گی۔

تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اعمال اور اپنے بے شمار کارناموں میں واقعی خاتم النبیین تھے۔ اس کی تفصیل قرآن مجید سے معلوم ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے آپ کے اوصاف کو بہترین رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ قرآن مجید یقیناً وہ ابدی معجزہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ظاہر ہوا۔ قرآن ایک نور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک نور ہیں جو اپنے ماننے والوں کو ہمیشہ راہِ حق کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں حق تک پہنچاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام صفاتِ کمال پوری ہو چکی ہیں اور ہر زمانے کی روحانی نعمتوں کا آپ پر خاتمہ ہے۔''

عزیزم مرحوم رضوان کے اس مضمون کا لفظ لفظ اس کی محبتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ دار ہے۔ اس لحاظ سے مرحوم کی...... موت ایک قومی صدمہ ہے۔ کتنا دردناک وہ منظر تھا کہ جب چھبیس/ستائیس اگست کی درمیانی شب عزیز رضوان بیت مبارک ربوہ کے پاس بے حس وحرکت چارپائی پر پڑا تھا اور ایک جمِ غفیر نے درد بھرے دلوں اور نمناک آنکھوں کے ساتھ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی امامت میں مرحوم کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ آخر آدھی رات کے قریب عزیز کو قبرستان میں سپرد خاک کرتے ہوئے...... ہم سب اندوہناک حالت میں گھروں کو واپس ہوئے اور یہ تصور کر رہے تھے کہ مرحوم کے والدین کو کتنا شدید صدمہ ہوگا۔ ہر دل ان کے لیے دعا گو تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حادثۂ وفات سے ایک دن پہلے کی بات ہے کہ عزیز رضوان جامعۃ المبشرین میں میرے کمرہ میں گیا۔ میں کسی کام کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔ عزیز موصوف انتظار کے بعد میری میز پر حسبِ ذیل تحریر چھوڑ گئے:

''میں یہاں حاضر ہوا تھا۔ آپ موجود نہ تھے۔ میں رسالہ المصوّر (مصری رسالہ) لے جا رہا ہوں۔ استاذ بسیونی کا مصر سے خط آیا ہے۔ وہ بعض کتابیں طلب کرتے ہیں۔ رضوان عبداللہ''

افسوس کہ آج یہ تحریر میرے سامنے ہے مگر مجھے اس کے بعد عزیز رضوان سے زندگی میں ملنے کا موقع نہیں ہوا۔ غالبًا یہ اس کی آخری تحریر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز مرحوم کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے اور اس کے والدین اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔''

مندرجہ بالا مضمون نگاروں کے علاوہ جن احمدی شعراء نے رضوان عبداللہ کی یاد میں نظمیں کہیں ان میں کیپٹن ملک خادم حسین مصنف کتاب ''ربوہ'' بھی شامل تھے جنہوں نے اس موقع پر اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا:

خدا کے دین کا تھا اک جواں رضوان عبداللہ
ہوا ہے آج دنیا سے نہاں رضوان عبداللہ
سعادت جانے والے کی بھی دیکھیں دیکھنے والے
لگا کرنے وضو سُن کر (نِدا) رضوان عبداللہ
یکا یک برلبِ دریا وہ پھسلا، موج نے گھیرا
نہیں کچھ کرسکا منہ سے بیاں رضوان عبداللہ
جوانی کی بہاروں میں پیا جامِ ...... یوں
کہ ظاہر میں ہوا نذرِ خزاں رضوان عبداللہ
چلا حبشہ سے ربوہ کو، گیا ربوہ سے جنت میں
کہاں سے ہو کے جا پہنچا کہاں رضوان عبداللہ
امامِ پاک کے قدموں میں آیا، منزلت پائی
ہوا مقصد میں اپنے کامراں رضوان عبداللہ
بنا ہے مرغِ بسمل احمدیت کا نشاں خادم
شہیدِ علم، شانِ عاشقاں، رضوان عبداللہ

رضوان عبداللہ کے متعلق بزرگانِ جماعت کے نثری اور شعری تاثرات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اب ہم میر غلام احمد نسیم کے ساتھ ملاقات کر رہے ہیں جو پرانے مربیان میں سے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء میں جامعہ احمدیہ سے شاہد کا امتحان پاس کیا جس کے بعد وہ لمبا عرصہ ممالکِ غیر بشمول سیرالیون، گی آنا، سورینام اور زیمبیا میں احمدیت کا پیغام پہنچانے میں مصروف رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ انہوں نے ''یادِ ایام'' کے نام سے اپنے حالاتِ زندگی بیان کئے ہیں جس کا ایک حصہ جامعہ احمدیہ میں ان کے گزرے

ہوئے دنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بہت سی باتیں تو وہ ہیں جن کا مختلف حوالوں سے اس باب میں پہلے ہی ذکر آ چکا ہے لہٰذا یہاں پر اُن کے اساتذہ کے بارے میں اُن کے تاثرات کی نقل پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔

موصوف لکھتے ہیں کہ جامعہ میں ان کی تعلیم و تربیت کا دورانیہ قریباً نو سال پر محیط تھا۔ اس عرصے میں انہیں جن اساتذہ سے تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ان میں مولانا ابوالعطا جالندھری، خان ارجمند خان، صاحبزادہ ابوالحسن قدسی، مولوی ظہور حسین، ماسٹر غلام حیدر، قریشی محمد نذیر ملتانی، مولوی عطاء الرحمٰن طالب، قاضی محمد نذیر لائلپوری، ظفر محمد ظفر اور ملک سیف الرحمٰن شامل ہیں۔ وہ مولانا ابوالعطا جالندھری کا قدرے تفصیلی ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''مولانا...... کی شخصیت قد و قامت کے لحاظ سے منفرد تھی۔ چہرا ابھرا ابھرا سرخ اور اس پر شرعی ڈاڑھی ان کی انفرادیت کو اور بھی نمایاں کرتی تھی۔ قمیص شلوار اور اچکن اور پگڑی ان کی شخصیت کو خوب نکھارتی۔ پرنسپل ہونے کی حیثیت سے کلاسوں کا معائنہ کرتے اور اگر کسی دن کسی کلاس کا پیریڈ خالی ہوتا تو وہ کلاس میں آتے، تھوڑی دیر درس دیتے، پڑھائی کے سلسلے میں سوال کرتے، مفید مشورے دیتے اور کلاس کو نصائح کرتے۔ صبح کی اسمبلی میں اکثر حاضر ہوتے۔ طلبہ کی رول کال یعنی حاضری کے بعد کسی طالب علم کو بلاتے اور تقریر کرنے کا ارشاد فرماتے۔ خود مناظر اور مقرر تھے اور فی البدیہہ تقریر کرنے کا ملکہ انہیں حاصل تھا۔ طلبہ سے یہی توقع کرتے تھے کہ ان میں سے بھی ہر ایک کو تقریر کرنے کا ایسا ملکہ حاصل ہوتا اگر کوئی ایسا موقع آ جائے کہ تقریر تیار کرنے کا موقع نہ ملے تو بھی وہ تقریر کر سکے اور موقع کے مطابق موضوع اس کے ذہن میں مستحضر ہو جائے۔ عموماً سینئر کلاسوں میں سے کسی طالب علم کو طلب کرتے کہ اسمبلی میں خطاب کرے اور پھر اس کی تقریر کے فوراً بعد اسمبلی میں ہی تقریر کے بارے میں اپنی رائے دیتے کہ آیا وہ معیاری تھی یا نہیں اور اگر نہیں تھی تو کیوں نہیں تھی۔''

میر غلام احمد نسیم مولانا کی بعض دیگر خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا ''خود اسلامی شعائر کے پابند تھے۔ دوسروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے خصوصاً اپنے شاگردوں کو ظاہری معاملات میں بھی ایک نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ لباس اور ظاہری رکھ رکھاؤ کے بارہ میں نصیحت فرماتے رہتے تھے۔ سر کے بال لمبے...... رکھنے اور ڈاڑھی ترشوانے یا منڈوانے کے خلاف تھے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں فرنچ کٹ ڈاڑھی یعنی صرف ٹھوڑی پر ڈاڑھی رکھنے کا رواج تھا۔ چہرے کے باقی حصہ پر شیو کر دی جاتی تھی۔ ہم جامعۃ المبشرین میں زیرِ تعلیم تھے کہ ایک مرتبہ مولانا نے جمعرات کے روز صبح اسمبلی کی حاضری کے بعد اعلان کیا کہ کل جمعہ کے روز جامعہ کی چھٹی ہے۔ پرسوں ہفتے کی صبح کو میں ہر طالب علم کے چہرے پر ڈاڑھی دیکھنا چاہتا ہوں، کوئی بھی شیو نہ کرے۔...... ایک طالب علم نے ارشاد کی تعمیل نہیں کی۔ جب آپ نے اس سے باز پرس کی تو اس نے اپنی ٹھوڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ دیکھیں ڈاڑھی رکھی ہوئی تو ہے۔ اس پر آپ نے کلرک سے فرمایا: جاؤ لائبریری سے منجد لاؤ۔ جب وہ لایا تو اس سے فرمایا: لفظ ''اَللِّحیَۃُ'' نکال کر دیکھو اس کے کیا معانی ہیں۔ اس پر اس طالب علم نے کہا: ''مولانا معاف کیجئے۔ آج تک تو ہم قرآن و حدیث کو مذہبی اور دینی کتب سمجھتے تھے، یہ

منجد کب سے دینی کتب میں شامل ہوئی ہے؟ طالب علم کے اس استفسار پر اس وقت تو آپ نے برا منایا لیکن کچھ دیر بعد اسے دفتر میں بلا کر فرمایا کہ میں تمہارے استفسار سے محظوظ ہوا ہوں تاہم یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے شاگردوں کو ظاہری معاملات میں بھی نمونہ بننے کی تلقین اور نصیحت کرتے رہیں۔''

خان ارجمند خان کا ذکر کرتے ہوئے میر غلام احمد نسیم لکھتے ہیں کہ وہ ''ہمیں حدیث پڑھاتے تھے۔ آپ بڑے وجیہہ، بارعب اور دبدبہ والے استاد تھے۔ شاگردوں کو ان کے سامنے بات کرنے کا حوصلہ کم ہی ہوتا تھا۔ تدریس کا حق ادا کرنا ان پر ختم تھا۔ مسئلہ کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لیے ہر ممکن دلیل دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ حدیث میں کوئی فقہ کا مسئلہ آجاتا تو اسے مثالیں دے دے کر خوب سمجھاتے اور کوشش فرماتے کہ ہر طالب علم اسے کلاس ہی میں سمجھ لے بلکہ ازبر کرلے۔ اگر دیکھتے کہ کوئی طالب علم پوری طرح متوجہ نہیں یا دلچسپی سے نہیں سن رہا تو اس سے مخاطب ہوتے اور اس پر اپنی نظریں جما کر پورے جوش اور ولولے سے سارا مضمون ایک مرتبہ پھر دہراتے اور ایسی صورت پیش آنے پر ان کا سرخ وسفید چہرہ اور بھی سرخ ہوجاتا۔

پروفیسر ہونے کے علاوہ وہ ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی کچھ عرصہ رہے۔ فجر کی نماز کے لیے روزانہ ہوسٹل کے طلبہ کو بیدار کرتے۔ ان کی گرج دار آواز سے طلبہ جلد بیدار ہوکر نماز ادا کرنے کے لیے چل پڑتے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوچکا ہے میر غلام احمد نسیم کے اساتذہ میں سے ایک صاحبزادہ ابوالحسن قدسی بھی تھے جو انہیں عربی ادب کی ابتدائی کتب پڑھاتے تھے۔ فاضل مصنف کے الفاظ میں ''ان کا ادبی ذوق اچھا تھا۔ آپ کم گو تھے۔ طبیعت میں شرمیلا پن تھا۔ بہت کم ہنستے تھے۔ مسکراتے وقت بھی ہاتھ کی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتے تھے۔ سبق پوری دلچسپی سے پڑھاتے، کسی طالب علم کی شرارت سے بہت ناراض ہوتے۔

آپ حضرت سیّد عبداللطیف رئیس علاقہ خوست، افغانستان کے چھوٹے فرزند تھے۔ جب جماعت احمدیہ میں شمولیت کی وجہ سے سیّد عبداللطیف سنگسار ہوئے تو اس وقت قدسی صاحب کی عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ بظاہر اس حادثے کا اثر زندگی بھر ان کی طبیعت پر رہا۔ شاید ان کی کم گوئی اور کم آمیزی کی وجہ بھی اسی حادثے کا اثر ہو تاہم آپ بڑی گہری سوچ کے مالک تھے۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے اشعار اردو روزناموں کی زینت بنتے رہتے تھے۔ ان میں سوزوغم کی چاشنی بہت نمایاں ہوتی تھی۔ ہم تعلیم کی تکمیل کے بعد کارزارِ حیات سے نبردآزما تھے اور وہ تدریس سے ریٹائر تھے۔ کبھی کبھار جب برسرِ راہ ملاقات ہوتی تو بڑے تپاک سے ملتے۔ خیر خیریت کے جملوں کے بعد گویا ہوتے: چند دنوں سے طبیعت ناساز ہے، صحت ہونے پر بھرپور طریق سے کام شروع کروں گا۔ کام سے غالباً ان کی مراد لکھنے لکھانے کا کام ہوتا تھا۔''

میر غلام احمد نسیم اپنے استاد مولوی ظہور حسین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''تدریس کے فرائض کے ساتھ ساتھ ہوسٹل میں قیام پذیر طلبہ کی تربیت کے نگران بھی تھے۔ اس جہت سے ہمارا ان سے واسطہ پڑنا قدرتی

امر تھا۔ وہ قریباً ہر روز صبح ومساء ہوسٹل تشریف لاتے، طلبہ کو بیت الذّکر میں نماز پڑھنے کے لیے جانے کی تلقین کرتے حتّٰی کہ جب انہیں اندازہ ہوجاتا کہ طلبہ بیت الذّکر کی طرف روانہ ہوچکے ہیں تو وہ خود ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوتے۔...... موصوف کی شہرت ایک استاد ہونے سے زیادہ مجاہدِ بخارا ہونے کی تھی چنانچہ ہم استاد اور پھر مجاہدِ بخارا ہونے کے لحاظ سے ان کی تعظیم وتکریم کرتے تو خصوصیت سے یہ بات مدنظر رہتی کہ انہیں وہاں کیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ہماری کلاس کو صرف ونحو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مضمون ہمارے لیے قریباً نیا تھا۔ مولوی صاحب عربی صرف کی ابتدائی کوئی گردان ہمیں زبانی یاد کرنے کا ارشاد فرماتے اور اگلے روز کلاس میں سنانے کے لیے کہتے۔ اگلے روز اگر کوئی طالب علم پوری نہ سنا سکتا یا سنانے میں مشکل محسوس کرتا تو فرماتے: ''نالائق! کل ضرور یاد کر کے آنا۔'' اسی طرح کلاس میں اگر کوئی طالب علم سبق کی طرف پوری توجہ نہ دیتا تو فرماتے: ''نالائق! کتاب پر نظر رکھو اور توجہ سے سنو۔'' اس سے زیادہ میں نے کلاس میں ان سے ڈانٹ ڈپٹ نہ سنی اور نہ دیکھی۔

کلاس میں اگر کوئی طالب علم بخارا کے بارے میں دریافت کرتا تو مختصر طور پر بعض واقعات کا ذکر کرتے اور آخر میں فرماتے کہ آپ بھی اس میدان کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ عملی میدان میں کسی وقت بھی مشکل حالات پیدا ہوسکتے ہیں لہٰذا ذہنی طور پر مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔...... موصوف کی جامعہ احمدیہ میں تدریس جاری تھی کہ ہماری کلاس جامعۃ المبشرین میں چلی گئی اور وہاں سے تعلّم کی ۱۹۵۷ء میں تکمیل کے بعد مجھے میدانِ عمل میں مختلف ممالک میں جاتے رہنے کی وجہ سے ملاقات کم سے کم تر رہی۔ آخری بار زیمبیا سے ۱۹۷۹ء کے آخر میں واپسی پر چند بار زیارت نصیب ہوئی۔ یہ ۱۹۸۰ء و ۱۹۸۱ء کا زمانہ تھا۔ موصوف کافی ضعیف ہوچکے تھے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد بیتِ اقصیٰ بذریعہ تانگہ تشریف لاتے اور وہاں ملاقات ہوجاتی۔''

میر غلام احمد نسیم کو ماسٹر غلام حیدر کی شاگردی کا شرف بھی حاصل تھا۔ وہ ان کا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں: ''طویل القامت، نکھرتا ہوا سفیدی مائل چہرہ، شلوار قمیص میں ملبوس، سر پر دستار، چال ڈھال متوازن، آواز تحکّمانہ لیکن نصیحت آموز، چہرے پر اکثر مسکراہٹ سجائے، یہ تھے ہماری دینی تعلیم کے آغاز کے وقت کے اور ہوسٹل مدرسہ وجامعہ احمدیہ میں ہمارے قیام کے وقت کے سپرنٹنڈنٹ، ماسٹر غلام حیدر۔ آپ انگریزی زبان کے استاد بھی تھے۔ ہوسٹل میں قیام پذیر طلبہ کے قیام وطعام کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی یا یوں سمجھیں کہ وہ اسے بھی اپنی ذمہ داری تصور کرتے تھے۔ طلبہ کی باجماعت نمازوں میں شمولیت کو یقینی بنانے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔

مدرسہ اور جامعہ کی بیشتر جماعتوں کو انگریزی زبان کی تدریس بھی ان کے ذمہ تھی۔...... گھنٹی بجتے ہی کلاس میں آتے۔ نصاب کے مطابق پڑھاتے۔ طلبہ کی توجہ پڑھائی کی طرف قائم رکھنے کے لیے نصابی کتاب پر نظر کے ساتھ ساتھ طلبہ پر بھی نظر رہتی۔ ہماری کلاس کے کمرہ پر کلاک لگا ہوا تھا جو ہر گھنٹے کے پورا ہونے پر بجتا تھا۔ گھڑیال کی اس آواز پر بسا اوقات شعوری طور پر طلبہ کو وقت کی قدر کرنے کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہ شعر پڑھتے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی''

فاضل مصنف کے ایک اور استاد قریشی محمد نذیر ملتانی تھے جو ''مدرسہ کی ابتدائی جماعتوں کو حدیث پڑھاتے تھے۔...... حدیث شریف کی ابتدائی کتب نصاب میں شامل تھیں۔ ابتدائی کتب سے مراد انتخابات پر مشتمل کتب جیسے ریاض الصالحین وغیرہ ہیں۔ آپ بڑی توجہ سے پڑھاتے۔ دورانِ تدریس اگر کوئی مسئلہ واضح نہ ہوتا یا وہ سمجھتے کہ طلبہ پوری طرح سمجھ نہیں پائے تو اگلے روز مسئلہ کی وضاحت کرتے اور ساتھ ہی اپنے حافظہ کا ذکر شکایت کے رنگ میں کرتے کہ بسا اوقات بات ذہن میں موجود ہوتی ہے لیکن فوری طور پر مستحضر نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ بتاتے کہ کسی حادثے میں زخمی ہوئے تھے۔ صحت یاب ہو گئے لیکن حافظہ پر معمولی سا اثر باقی رہا۔

آپ کافی زندہ دل تھے۔ طلبہ میں گھل مل جاتے۔ کچھ عرصہ ہمارے ہوسٹل کے ٹیوٹر بھی رہے۔ طلبہ کی تربیت کا خاص خیال رکھتے۔ تقسیم برصغیر کے خون آشام واقعات سے گزرے تھے اور ان واقعات کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مدرسہ اور جامعہ کے اکثر طلبہ کی تعداد بھی نقل مکانی کر کے آنے والوں کی تھی۔ اکثر ضروریاتِ زندگی کی کمی یا عدم دستیابی کا شکار تھے۔ آپ کو اس بات کا شدید احساس تھا لہٰذا طلبہ سے بسا اوقات انفرادی طور پر دریافت فرماتے کہ کسی ایسی چیز کی ضرورت تو نہیں جس کے بغیر گزارہ مشکل ہو۔ اگر ایسا ہے تو بتاؤ تا انتظامیہ کو آگاہ کیا جا سکے۔''

مولوی عطاء الرحمٰن طالب کا ذکر کرتے ہوئے میر غلام احمد نسیم لکھتے ہیں: موصوف'' کے سپرد عربی گرائمر یعنی صرف اور نحو کی تدریس ہوتی تھی۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں صرف و نحو عربی ادب کے ساتھ نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ الگ ایک مضمون کی حیثیت کے تدریس ہوتی تھی۔...... نصابِ نحو کی کتاب کا نام اَلْفِیَہ تھا۔ یہ کتاب منظوم تھی اور نحو کے قریباً تمام قواعد کو ایک ہزار عربی زبان کے اشعار کا جامہ پہنایا گیا تھا اور نحو کی مشکل ترین کتاب سمجھی جاتی تھی۔ آپ جب تدریس کی غرض سے کلاس میں آتے تو مکمل خاموشی چھا جاتی۔ تمام طلبہ کتاب کھول کر ہمہ تن پڑھائی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ پڑھائی شروع ہو جاتی۔ آپ اپنی کتاب کھول لیتے اور آپ کی توجہ بظاہر کتاب پر مرکوز ہوتی اور نظریں بھی کتاب پر جمی ہوتیں لیکن اگر کوئی طالب علم غیر شائستہ حرکت کرتا تو فوراً اُسے اس کا نام لے کر مخاطب کرتے۔ پوری کلاس حیران رہ جاتی کہ آپ کی نظریں تو کتاب پر تھیں طالب علم کی حرکت یا سبق کی طرف عدمِ توجہی کا آپ کو کیسے علم ہو گیا۔ اکثر کلاس پر اس انداز سے نظر ڈالتے کہ کوئی بھی بولنے کی جرأت نہ کرتا۔

وہ تقسیم برصغیر کے خون آشام حالات سے متاثر تھے۔ احمد نگر...... میں نو تعمیر کردہ بیت کے صحن کے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ ان کی قیام گاہ تھا۔ کمرہ کی حالت خستہ تھی۔ ناپختہ اینٹوں کی دیواریں اور کانوں کی چھت تھی۔ چھت کی اونچائی بھی معیاری نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انسانی رہائش کے لیے تعمیر نہیں ہوا تھا بلکہ جانوروں کی سردیوں کی پناہ گاہ کے لیے بنایا گیا ہو گا اور ان کے لیے ہی استعمال ہوتا ہو گا۔

آپ اسی بیت میں باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز ادا کرتے۔ ایک مرتبہ مؤذن اقامت کہتے ہوئے درمیان میں بھول گیا۔ اس نے دوبارہ اقامت کہی اور پھر بھول گیا۔ اس پر کسی اور مقتدی نے اقامت کہی اور نماز ادا ہوئی۔ نماز کے بعد آپ نے مؤذن کو جس کا نام فرمان علی تھا مخاطب کر کے پوچھا: فرمان علی! آج کیا ہوا تم اقامت ہی بھول گئے جب کہ روزانہ پانچ وقت سال ہا سال کہتے آئے ہو۔ ان کے اس استفسار پر فرمان علی گویا ہوا: مولوی صاحب یہ تو اقامت کی بھول تھی جو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ پٹواری نے کسی دستاویز پر مجھے دستخط کرنے کے لیے کہا تو میں اپنا نام ہی بھول گیا اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں۔ مؤذن کی یہ دلچسپ بات آپ اکثر مزے لے لے کر سنایا کرتے اور ساتھ ہی مسکراتے یا تھوڑا بہت ہنس لیا کرتے۔ آپ نے نہایت باوقار طبیعت پائی تھی۔ تصوّف کی اصطلاح کے مطابق کم گو اور کم آمیز تھے۔ فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی انہیں گوارا نہ تھی۔''

قاضی محمد نذیر لائلپوری کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ وہ ''ہمیں منطق اور فلسفہ پڑھایا کرتے تھے۔ وہ طلبہ سے بالکل گھل مل جایا کرتے تھے اور بڑے دوستانہ رنگ میں شاگردوں کے سوالات کے جوابات دیا کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ طلبہ کی تسلی ہو جائے اور اگر کسی روز جواب میں تشنگی محسوس کرتے تو گھر جا کر مزید مطالعہ اور تحقیق کرتے اور اگلے روز کلاس میں تشریف لا کر اس کا نچوڑ پیش کر کے طلبہ کی پوری تسلی کرا دیتے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ اپنے شاگردوں کو پوری طرح دلائل سے لیس کر کے میدان میں بھجوائیں تا کہ وہ جرأت اور دلیری سے ہر مشکل سوال کا جواب دے سکیں اور جو تدریس کے لیے منتخب ہوں ان کی علمی بنیاد بھی ٹھوس دلائل پر استوار ہو تا وہ اپنے شاگردوں کی تسلّی اور تشفّی کرا سکیں۔''

میر غلام احمد نسیم کے الفاظ میں وہ ایک ''اچھے مناظر اور حاضر دماغ تھے۔ علوم میں سے انہیں منطق اور فلسفہ میں خاصا درک حاصل تھا۔ منطق کے اسباق کو مثالیں دے دے کر طلبہ کو ذہن نشین کرواتے۔ کلاس میں آتے تو سپاری یا کوئی دوسری چیز چبا رہے ہوتے اور ختم ہونے پر ڈبیہ کھول کر منہ میں ڈالتے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر بعض طلبہ ہنس پڑتے تو بڑے تحمل سے فرماتے: انجن کو چلنے کے لیے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ایندھن نہ ڈالا جائے انجن رواں دواں نہیں رہ سکتا۔

مناظروں میں خاصا ملکہ رکھتے تھے۔ جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے حاضر دماغی سے کام لیتے......''

میر غلام احمد نسیم معروف ایرانی شاعرہ، قرۃ العین طاہرہ کی ایک مشہور فارسی غزل کے پہلے شعر:

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو
شرح دہم، غم ترا، نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس مشہور غزل کی غنائیت اس قدر دلکش ہے کہ ایک مرتبہ سن لیں تو دل چاہتا ہے کہ بار بار سنی جائے اور اگر ممکن ہو تو خود گنگنائی جائے'' اور بتاتے ہیں کہ انہوں نے پہلی بار یہ شعر جامعہ کے

عربی ادب کے استاد، ظفر محمد ظفر سے سنا تھا جو ''نہایت ہی لطیف سخن فہمی کا ذوق رکھتے تھے۔ دورانِ تدریس کبھی کبھی کسی نہایت ہی عمدہ غزل یا نظم کا ذکر کرتے اور ساتھ ہی اس غزل یا نظم کا کوئی عمدہ سا شعر سناتے اور اگر زیادہ شعر یاد ہوتے تو بھی سنانے سے گریز نہ کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز کلاس میں ادب عربی کی مشہور کتاب متنبّی پڑھاتے ہوئے کسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے قرۃ العین طاہرہ کی اس غزل کے اشعار سنائے تھے اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس معروف شاعرہ نے کس کے فراق یا فراق کا تصور کرتے ہوئے یہ غزل لکھی تھی۔ مولانا صرف شعری ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے اور بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ کسی شاعر کا جب ذکر کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ بے لاگ تبصرہ شاعر کی شاعری تک محدود ہے، اس کی ذات یا اس کے اعتقادات سے کوئی غرض نہ ہوتی، صرف یہ ذکر ہوتا کہ وہ کس پایہ کا شاعر ہے۔

ہمارے عربی فاضل کے نصابِ عربی ادب میں حماسہ اور متنّبی، دونوں کتابیں شامل تھیں۔ حماسہ تو زمانۂ جاہلیت وغیرہ میں متعدد شاعروں کی مختلف اوقات اور مواقع پر تحریر کردہ نظموں پر مشتمل ہے۔......اس کتاب میں بہادری خصوصاً جنگوں میں بہادری دکھانے پر مشتمل نظمیں زیادہ ہیں اور عشق ومحبت پر مشتمل بہت کم نظمیں ہیں اور غنائیت کسی کسی میں ملتی ہے۔ اسی طرح فلسفہ بھی بہت شاذ ہے جب کہ متنّبی ایک ہی شاعر کے شعروں کا دیوان ہے۔ اس میں ادبی چاشنی اور رومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مولانا...... جب متنّبی پڑھاتے تو بسا اوقات اس مشہور ومعروف شاعر کا مقابلہ علامہ اقبال سے فرماتے اور کہتے کہ جس طرح علامہ اقبال آج کے دور میں ہمہ جہتی کا شاعر ہے، اسے سب ہی پسند کرتے ہیں بالکل اسی طرح متنّبی بھی اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر تھا اور سب اسے پسند کرتے تھے حتّٰی کہ عربی ادب میں آج تک اس نوعیت اور انداز کا شاعر اس کے مقابل کا کوئی سامنے نہیں آیا۔''

ظفر محمد ظفر کے بعد میر غلام احمد نسیم ملک سیف الرحمٰن سے اپنے ابتدائی تعارف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کچھ عرصے کے بعد ایک دبلے لیکن طویل قامت شخص، رنگ نکھرتا ہوا، ڈاڑھی خشخشی، پُروقار دھیمی چال چلتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ جملہ طلبہ اس نئے آنے والے استاد کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ ''تشریف رکھئے'' کی دھیمی آواز کانوں سے بمشکل ٹکرائی۔ گفتگو کا آغاز ہونے پر معلوم ہوا کہ ان کے ذمہ ادارے نے ''علمِ صرف'' کی تدریس کی ہے اور کہ ''علمِ صرف'' کا تعلق عربی زبان کی گردانوں اور صیغہ ہائے گونا گوں سے ہوتا ہے۔ آغازِ تدریس میں ہی ارشاد ہوا: صرف کی گردانیں یاد کرنی پڑتی ہیں۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ گردانیں کامل اساتذہ کی نگرانی میں یاد کی ہیں اور کبھی کبھی موسم گرما کی شدت میں بیلوں سے چلنے والے کنوئیں کی ''ٹِنڈ'' کے نیچے بیٹھ کر یاد کی ہیں۔ تدریسِ علمِ صرف کی گھنٹی ختم ہوئی۔ معلّم عِلم اسی پُروقار انداز اور دھیمی چال کے ساتھ کلاس روم سے چلے گئے۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات ملک سیف الرحمٰن سے جو آگے چل کر محنت، کام میں لگن، بے لاگ خدمت، فرائض کی ادائیگی کے اعتبار سے جماعت میں انمٹ نقوش چھوڑ گئے......

ملک سیف الرحمٰن نے چند دن پڑھانے کے بعد کلاس میں آنا چھوڑ دیا۔ معلوم ہوا کہ جماعت نے ایک نیا کالج ''جامعۃ المبشرین'' کے نام سے جاری کیا ہے اور وہ اس میں پڑھانے پر متعین ہوئے ہیں۔ جامعہ احمدیہ سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعۃ المبشرین میں داخل ہوئے تو ملک صاحب سے ملاقات ہوئی لیکن بطور مدرس علمِ صرف کے نہیں بلکہ فقہ اور تصوّف کے مدرس کے طور پر۔ ہم اس وقت عمر کے اس حصہ میں سے گزر رہے تھے کہ جس عمر میں عموماً ہر طالب علم کو کسی نہ کسی آئیڈیل کی تلاش ہوتی ہے۔ آئیڈیل کی تلاش کے مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہم نے جس مقصد کے لیے زندگی کی راہ متعین کی تھی اس کا مطلب صرف علم میں ترقی کرنے کے لیے کسی نمونہ کی تلاش تھی اور اس کے لیے اساتذہ میں سے ہی کوئی ہوسکتا تھا۔ ہماری نظرِ انتخاب نے انہیں منتخب کیا اور ان کے طور طریقے خصوصاً مطالعہ وغیرہ اپنانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوگئے۔

تعلیم سے فراغت ہوگئی۔ میدانِ عمل شروع ہوگیا۔ بیرون پاکستان خدمت کرنا نصیب میں لکھا تھا۔ تین چار سال بعد واپسی ہوتی۔ ملاقات ہو جاتی بلکہ دعوت پر گھر بلاتے۔ پھر روانگی ہو جاتی۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ ۱۹۷۹ء میں زیمبیا سے واپسی پر جامعہ میں تعیناتی ہوگئی۔ اس وقت ملک صاحب جامعہ احمدیہ کے پرنسپل تھے۔ تدریسی فرائض کے علاوہ جامعہ کے احاطہ کی باغبانی......بھی حصہ میں آئی۔ جامعہ کی موجود ٹک شاپ کی جانبِ شمال ایک کیاری میں کماد کی فصل تھی۔ ایک روز تقریباً تین یا چار بجے بعد دوپہر مالی بھاگا بھاگا آیا کہ طلبہ نے فصل تلف کر دی ہے اور کیاری میں بیٹھے گنے چُوس رہے ہیں۔ آ کر دیکھا تو واقعی فصل ختم ہونے کے قریب تھی۔ چند پودے کھڑے تھے۔ مالی سے کہا کہ یہ بھی کاٹ دو۔ کچھ تم لے جاؤ اور چند ایک ملک صاحب کے گھر پر انہیں دے دو۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح انہیں علم ہو جائے گا کہ کماد کی کیاری ختم ہوگئی ہے لیکن انہوں نے گنے واپس کر دیئے۔ کیوں واپس کئے؟ اس سوال کا جواب ہم سب پر چھوڑ دیا۔''

اب تک مولانا محمد اجمل شاہد، حکیم نذیر احمد ریحان، مولوی عبدالباسط شاہد، عبدالسّلام ظافر، منیر الدین احمد اور میر غلام احمد نسیم کی بتائی ہوئی جامعہ احمدیہ کی بعض پرانی باتیں آپ کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اب آپ کا تعارف جمیل الرحمٰن رفیق، وکیل التصنیف، تحریک جدید سے کرایا جارہا ہے جو پرانے واقفینِ زندگی اور سلسلے کے نامور خدام میں سے ہیں۔ انہیں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۸ء تک چھبیس سال مشرقی افریقہ کے دو ممالک یعنی تنزانیہ اور کینیا میں خدمتِ دین کا موقع مل چکا ہے اور وہ ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۵ء کے دوران جامعہ احمدیہ کے پرنسپل بھی رہے ہیں۔

میری ان سے پہلی ملاقات ان دنوں ہوئی جب میں اپنی کتاب ''ارمغانِ ملتان'' لکھ رہا تھا اور عربی زبان کے بعض کتبوں کی تفہیم کے لیے ان کی مدد کا خواہاں تھا۔ میں نے اپنے بھانجے، اسامہ اظہر کو فون کر کے ان سے وقت لینے کی درخواست کی جو انہوں نے عنایت فرمادیا۔ میں لاہور سے ربوہ آیا اور جامعہ احمدیہ میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ موصوف سے تعارف ہوا۔ بے حد محبت سے پیش آئے۔ موسم کے مطابق تواضع بھی کی اور پھر کتبے پڑھ کر نہ صرف ان کے اعراب میں بعض اغلاط کی نشاندہی کی بلکہ ان کا ترجمہ بھی مجھے سمجھایا۔

یوں ہی یاد آ گیا ہے ان میں سے ایک کتبہ خان بہادر مخدوم بہاول بخش سجادہ نشین حضرت بہاؤ الدین زکریا کی قبر پر لگا ہوا ہے اور اس کی عبارت یہ ہے:

رَئِیْسُ الْمَخَادِیْمِ مَخْدُوْمُنَا
بِاَخْلَاقِهٖ كَانَ بَرًّا كَرِيْمًا
قَضٰى نَحْبَهٗ وَانْقَضٰى عَهْدَهٗ
فَاَدْخِلْهُ يَا رَبِّ خُلْدًا نَعِيْمًا
سَئَلْنَا لِتَارِيْخِهٖ هَاتِفًا
سَمِعْنَا وَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

جب میری توجہ کتاب زیرنظر کی تصنیف پر مبذول ہوئی تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے جامعہ احمدیہ میں اپنی تعلیم کے زمانے کے کچھ حالات سنائیں۔ ان کی عدیم الفرصتی آڑے آتی رہی لیکن میرا اصرار برابر جاری رہا۔ بالآخر یہ موقع آ ہی گیا اور ان سے کئی بار فون پر اس موضوع پر بات ہوئی۔ جو کچھ انہوں نے بتایا اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

میں نے ۱۹۵۶ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں سِول انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن حضرت مصلح موعود کے بعض خطبات کی وجہ سے میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ مجھے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کرنی چاہئے چنانچہ میں نے کچھ سوچ بچار کے بعد ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو اپنی خدمات حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی خدمت میں پیش کر دیں۔ میں نے اپنے اس فیصلے کے ''اعلان'' کے لیے یہ دن اس کے تقدّس کے پیشِ نظر چُنا تھا کیونکہ یہی وہ مبارک دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود کو فرزندِ موعود کی خوشخبری دی تھی۔ حضور نے ازراہِ مہربانی میرا وقف قبول فرمالیا اور بی ایس سی کا امتحان دینے کے بعد جامعہ میں رپورٹ کرنے کی ہدایت جاری فرمائی چنانچہ میں اسی سال جامعۃ المبشرین کے درجہ اُولیٰ میں داخل ہوگیا۔ اس وقت مولانا ابوالعطا جالندھری ہمارے پرنسپل تھے اور کلاس میں ہم کل تین طلبہ تھے۔ باقی دو طلبہ عبدالحکیم جوزا اور ناصر احمد تھے۔

جب ہم دوسرے سال میں پہنچے تو جامعۃ المبشرین اور جامعہ احمدیہ کا ادغام ہوگیا اور سیّد میر داؤد احمد جامعہ کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مروّجہ قواعد کے مطابق جامعہ احمدیہ سے جامعۃ المبشرین میں آنے والے طلبہ مولوی فاضل کا امتحان پاس کر چکے ہوتے تھے اور جامعۃ المبشرین کے درجہ ثالثہ میں لئے جاتے تھے جہاں وہ شاہد کا نصاب مکمل کرنے کے بعد وکالتِ تعلیم کی طرف سے لیے جانے والے امتحان میں بیٹھتے اور شاہد کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اندرون و بیرون پاکستان خدمتِ دین کا فریضہ انجام دیتے۔ اس دستور کے مطابق جب غالباً سات لڑکوں کا ایک بیچ جامعہ احمدیہ سے فارغ ہوکر آیا تو میر داؤد احمد کے ایک فیصلہ کے تحت مجھے اور میرے کلاس فیلوز کو درجہ ثانیہ کی

بجائے سیدھا درجہ ثالثہ میں پروموٹ کر دیا گیا۔ میں نے میر صاحب سے درخواست کی کہ ہم تینوں کو درجہ ثانیہ میں ہی رکھا جائے کیونکہ ہم مولوی فاضل پاس طلبہ کے ساتھ اچھی طرح نہ چل سکیں گے مگر انہوں نے مولانا غلام باری سیف سے مشورے کے بعد اپنا فیصلہ قائم رکھا۔ اس طرح ہم تینوں درجہ ثالثہ میں ہو گئے۔ درجہ ثالثہ اس وقت سب سے بڑی کلاس تھی اور اس میں ہم تینوں کے علاوہ عبدالہادی ناصر، رحمت علی، سیّد داؤد انور اور راڈن انور بھی شامل تھے۔

جب ان سے جامعہ میں گزرے ہوئے دنوں کے واقعات سنانے کی فرمائش کی جائے تو وہ ایک لمحہ توقف کرتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں: جن دنوں میں جامعۃ المبشرین میں درجہ اُولیٰ کا طالب علم تھا سننے میں آیا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ہمارے پرنسپل سے کہا ہے کہ عرصہ ہوا جامعہ نے دریا پر ٹرپ نہیں کی چنانچہ حضور کے منشا کے مطابق جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے دریائے چناب پر ایک پکنک منائی جس میں حضور بھی ازراہِ شفقت شامل ہوئے۔

یہ پکنک دریائے چناب کے ریلوے پُل سے ذرا ہٹ کے اس جگہ جہاں بعض پرانے سایہ دار درخت لگے ہیں اور جہاں اب ٹُورازم ڈیویلپمنٹ کارپوریشن نے ایک ریسٹورانٹ اور پارک بنا رکھا ہے منائی گئی۔ اس کے لیے خاص اہتمام کیا گیا تھا اور چونکہ حضور کی تشریف آوری بھی متوقع تھی لہٰذا مقامِ پکنک کو قنات لگا کر چاروں طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ دریا کی سیر کے لیے جامعہ نے ایک موٹر بوٹ کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ یہ بوٹ مجلس خدام الاحمدیہ کی ملکیت تھی اور ان سے مستعار لی گئی تھی۔ پروگرام کے مطابق حضور بوٹ میں تشریف فرما ہوئے اور یہ کچھ دُور تک گئی بھی لیکن پھر کسی فنی خرابی کی وجہ سے اسے راستے سے ہی واپس لانا پڑا۔

ظاہر ہے جامعہ کے طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی اور حضور کے ساتھ بھی حفاظتی عملے کے علاوہ کسی بڑی تعداد میں لوگ نہ تھے لہٰذا اس پکنک کا رنگ ایک نجی محفل کا سا ہوگیا۔ حضور درمیان میں رونق افروز ہوئے۔ گویا آپ شمعِ محفل تھے جس کے گرد جامعہ کے جملہ طلبہ ایک ہالے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی اور لطائف بھی سنائے گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے میرے ایک کلاس فیلو محمد اکبر افضل تھے۔ یہ وہی اکبر افضل ہیں جو بعد میں مولوی عبدالرحمٰن انور کے داماد بنے اور آج کل راولپنڈی میں ہیں۔ انہوں نے حضور سے ایک لطیفہ سنانے کی اجازت مانگی اور اجازت مل جانے پر یوں گویا ہوئے: چینی خاندان میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائش کے چند روز بعد اس کا نام رکھنے کی تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں تمام رشتہ داران شامل ہوتے ہیں اور خوب رونق ہوتی ہے۔ اس موقع پر ایک الاؤ روشن کیا جاتا ہے اور لوہے کی ایک سیخ اس میں گرم کی جاتی ہے۔ جب یہ سیخ تپ کر سرخ ہو جاتی ہے تو اسے قریب رکھی ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی میں ڈبویا جاتا ہے۔ اس وقت شُوں، شاں قسم کی جو آواز پیدا ہوتی ہے وہی نومولود کا نام سمجھ لیا جاتا ہے اور زندگی بھر اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

بعض دیگر طلبہ نے بھی کچھ لطائف سنائے جس کے بعد عثمان چینی نے حضور سے ایک کھیل دکھانے کی اجازت طلب کی۔ حضور کی طرف سے رضامندی کے اظہار پر انہوں نے اپنی جیب سے سرخ رنگ کا ایک پھُندنا نکالا اور اسے ہوا میں اچھالا اور پھر بکمال مہارت اسے بڑی دیر تک زمین پر گرنے نہیں دیا۔ وہ کبھی اسے اپنے

ماتھے پر روک کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیتے اور کبھی اپنے ٹخنے پر روک لیتے۔ بعض اوقات وہ اسے گھٹنے پر لے لیتے اور جب وہ دوبارہ نیچے گرنے لگتا تو اسے اپنے ہاتھ پر روک لیتے۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ کھیل تھا جو نہ جانے کتنی دیر تک جاری رہا۔ عثمان چینی اس سے ملتا جلتا ایک کھیل شٹل کاک کے ساتھ بھی پیش کیا کرتے تھے لیکن پھُندنے کے ساتھ اس قسم کا یہ مظاہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

حضور نے یہ کھیل انتہائی دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ فرمایا۔ اس سے پہلے اکبر افضل چینیوں کے بارے میں ایک لطیفہ سنا چکے تھے چنانچہ آپ نے غالباً عثمان چینی کی دلداری کے لیے اکبر افضل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم نے چینیوں کا لطیفہ تو سنایا ہے لیکن یہ کھیل بھی کھیل کر دکھاؤ تو مانیں۔

اب عثمان چینی حضور کے سامنے باجا بجانے کی اجازت کے طلبگار ہوئے۔ حضور بھی اس وقت تفریح کے مُوڈ میں تھے چنانچہ آپ نے یہ فرما کر اجازت دے دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دَف سنی تھی۔ تب عثمان چینی نے اپنی جیب میں سے ایک باجا نکالا اور لگے اسے بجانے۔ ہمیں اس روز پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے موصوف کو یہ صلاحیت بھی بخش رکھی ہے چنانچہ وہ کچھ دیر تک باجے پر مختلف سُریں الاپتے رہے۔ حضور بھی اس سے محظوظ ہوئے اور ہم طالب علم بھی۔

اس دوران شام کا اندھیرا چھانے لگا تھا اور واپسی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ حضور نے دعا کرائی جس کے بعد آپ اپنی کار میں واپس قصرِ خلافت تشریف لے گئے۔ حضور کی روانگی کے بعد ہم نے سامان اکٹھا کیا اور اسے ربوہ بھجوانے کا انتظام کیا اور پھر اپنے گھروں کو واپس آئے۔ الحمدللہ یہ پکنک بہت دلچسپ رہی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھا۔ اتنا زمانہ گزر چکا ہے لیکن اس پکنک کی خوبصورت یادیں آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔

جمیل رفیق ایک اور پکنک کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے میر داؤد احمد کے زمانے میں بُرج کی نہر پر منائی تھی۔ وہ کہتے ہیں: مجھے یاد ہے طلبہ بذریعہ ٹرین وہاں گئے جب کہ میر صاحب بعد میں وہاں پہنچے تھے۔ آپ کو تو پتا ہے بُرج کی پکنک نہر میں تیراکی کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی چنانچہ وہاں پہنچتے ہی لڑکوں نے لنگوٹ کس لیے۔ جنہیں تیراکی آتی تھی وہ نہر کے پُل پر سے چھلانگیں لگانے لگے۔ میں تیراکی سے بالکل نابلد تھا لیکن جب میں نے اپنے ساتھیوں کو پُل سے چھلانگیں مارتے ہوئے دیکھا تو میرا دل بھی مچل اٹھا چنانچہ میں نے اپنے دوست، فاروق بنگالی جو بہت اچھا تیراک تھا سے کہا کہ اگر وہ میری مدد کا وعدہ کرے تو میں بھی اس تفریح سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ طے یہ ہوا کہ ہم دونوں ہاتھ پکڑ کر پُل سے چھلانگ لگائیں گے؛ نہر میں کودتے ہی میں اس کا ہاتھ چھوڑ دوں گا؛ چاہے جو بھی صورتِ حال ہو میں اسے مدد کے لیے نہیں پکاروں گا لیکن مجھے مشکل میں پا کر وہ میری مدد کا پابند ہوگا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار بہتے پانی میں چھلانگ لگائی تھی اس لیے سینے پر ہلکی سی چوٹ بھی محسوس ہوئی لیکن زیادہ مشکل اس وقت پیش آئی جب میں منجھدار میں پھنس گیا۔ میں گھبرایا تو بہت لیکن فاروق کے ساتھ اپنے عہد کے ہاتھوں مجبور تھا لہٰذا خاموش رہا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا چنانچہ وہ میری مدد کو لپکا

لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پانی کی ایک تیز لہر نے خود ہی مجھے منجھدار سے باہر نکال پھینکا اور جب میں ذرا سنبھلا تو خود کو کنارے پر پایا۔ ہوش و حواس درست ہوئے تو دل ایک بار پھر تیراکی کو مچلا۔ اس بار بھی خاصی مشکل پیش آئی اور مجھے باہر نکالنے کے لیے فاروق کو بہت زور لگانا پڑا۔ ہم دونوں باہر نکلے تو مکمل طور پر تھک چکے تھے۔ کچھ دیر گزر گئی تو مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے فاروق سے کہا: ہمارا دین طاق کو جُفت پر اہمیت دیتا ہے لہٰذا کیوں نہ ایک بار پھر ہم چھلانگ ماریں تاہم فاروق کے تو پہلے ہی چھکّے چھوٹ چکے تھے اس لیے وہ آمادہ نہ ہوا۔

جب میر صاحب بُرج پہنچے تو لڑکوں نے انہیں یہ واقعہ سنایا۔ اس پر انہوں نے میری سرزنش کرنے کی بجائے فرمایا: تیراکی سیکھی تو اسی طرح جاتی ہے۔

یوں ہی ذکر کر رہا ہوں کہ میں نے تیراکی بہت عرصے کے بعد دارالسّلام (تنزانیہ) جا کر سیکھی جہاں خدا نے اپنے فضل سے مجھے ہائی ٹائڈ کے دوران بھی سمندر کی لہروں سے کھیلنے کی توفیق عطا فرمائی۔

موصوف کو ربوہ سے دلی عقیدت ہے چنانچہ بات بیٹھک جامعہ میں بیتے دنوں کی ہو رہی ہو وہ اس بات کا ذکر کیے بنا نہیں رہ سکتے کہ انہیں ربوہ میں منعقد ہونے والے پہلے جلسہ سالانہ میں شمولیت کا موقع ملا؛ وہ فرقان فورس کی سبکدوشی کے بعد اس کے رضا کاروں کے ربوہ پہنچنے پر ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھے اور انہیں بیتِ مبارک میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی اقتدا میں کئی نمازیں پڑھنے کا موقع بھی ملا۔

وہ اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ربوہ میں منعقد ہونے والے پہلے جلسہ سالانہ میں شمولیت کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کے اپنے الفاظ میں: میں ان دنوں گورنمنٹ ہائی سکول، سرگودھا میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے یاد ہے ہم تمام گھر والے بڑے شوق سے بذریعہ ٹرین سرگودھا سے ربوہ پہنچے تھے۔ اُس وقت ربوہ فلیگ سٹیشن تھا۔ پورے تین مربع میل میں گھاس کا نام و نشان ندارد۔ شور کی وجہ سے زمین پاپڑ کی طرح تھی۔ چلتے تو کُرکُر کی آواز آتی اور پاؤں زمین میں دھنستے۔ پینے کا پانی چنیوٹ سے ٹینکرز کے ذریعہ لایا گیا۔ بلا کی گرمی تھی۔ مجھے اس تاریخی جلسے میں دو دن شامل ہونے کا موقع میسر آیا۔

ان کے بھائی، حفیظ الرحمٰن نے قادیان میں زندگی وقف کی تھی۔ انہوں نے میٹرک کرنے کے بعد رسول انجینئرنگ سکول سے ڈرافٹسمین کا کورس کیا تھا۔ یہ بات حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے علم میں تھی چنانچہ ربوہ کی بنیاد رکھنے کے بعد حضور نے فرمایا کہ حفیظ الرحمٰن نے اب تک رسول سے ڈپلوما کر لیا ہوگا، انہیں ربوہ بلا لیا جائے چنانچہ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں وہ ۱۴ جولائی ۱۹۴۹ء کو ربوہ حاضر ہو گئے۔ بیتِ مبارک اور صدر انجمن احمدیہ و تحریک جدید کے دفاتر کی پختہ عمارات کے نقشہ جات تیار کرنا ان کے ذمہ لگایا گیا۔ انہوں نے سب سے پہلا نقشہ بیتِ مبارک کا تیار کیا۔ یہ نقشہ انہوں نے دفترِ تعمیر کے ایک کچے کمرے میں رات کے وقت گیس کی روشنی میں قاضی عبدالرحیم بھٹی کی ہدایت کے مطابق تیار کیا تھا۔ چونکہ نقشہ جلد ہی کمیٹی میں پیش ہونا تھا اس لیے رات کے وقت کام کیا گیا اور پھر یہ نقشہ کمیٹی کی منظوری کے لیے بھجوایا گیا۔

موصوف بتاتے ہیں: جہاں تک مجھے یاد ہے ابھی بیتِ مبارک کی تعمیر پوری طرح مکمل نہیں ہوئی تھی کہ

حضور نے اس میں ایک جمعہ کی نماز پڑھائی۔ نمازیوں کی تعداد زیادہ تھی اور بیت کے اندر جگہ کم تھی لہٰذا حضور نے فرمایا کہ نمازی ایک دوسرے کی کمر پر سجدہ کرلیں چنانچہ صفیں قریب قریب بنائی گئیں اور نمازیوں نے اگلی صف کے احباب کی کمر پر سجدہ کیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس طرح نماز ادا کی تھی۔

ان کی یادداشت کے مطابق جب بیتِ مبارک تعمیر ہوئی تو اس کی محراب میں دروازہ نہیں تھا۔ بیت میں حضور کے داخلے اور واپسی کے لیے محراب کے دائیں جانب ایک دروازہ رکھا گیا تھا جو اَب بھی موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں: مجھے کئی بار جمعہ کے روز اس دروازے کے قریب بیٹھنے کا موقع ملا۔ ایک روز امریکہ سے کوئی احمدی دوست آئے ہوئے تھے۔ وہ بھی دروازے کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنا رومال بیت کے اندر دروازے کے آگے بچھا دیا۔ جب حضور تشریف لائے تو اس رُومال پر قدم رکھ کر داخل ہوئے۔ بعد میں اس دوست نے اپنا رومال اٹھا لیا اور میرا خیال ہے اسے ہی سر پر باندھ کر نماز پڑھی۔ محراب میں دروازہ بعد میں بنایا گیا۔

جب حضور قصرِ خلافت سے نکل کر بیت مبارک تشریف لاتے تو اس کی غربی دیوار کی تمام کھڑکیاں حفاظت کے خیال سے بند کردی جاتیں۔ حضور بیت میں داخل ہوجاتے تو کھڑکیاں کھول دی جاتیں۔ اسی طرح جب حضور نماز کے بعد واپس تشریف لے جاتے تو کھڑکیاں بند کردی جاتیں اور جب قصرِ خلافت میں داخل ہوجاتے تو کھول دی جاتیں۔ ایک بار یوں ہوا کہ حضور نمازِ عصر پڑھا کر تشریف لے جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو حسبِ دستور کھڑکیاں بند کی جانے لگیں۔ کھڑکیاں بند کرنے پر کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ حضور نے دریافت فرمایا: یہ کیسی آواز ہے؟ عرض کیا گیا کہ کھڑکیاں بند کی جارہی ہیں۔ پوچھا: کیوں بند کی جارہی ہیں؟ عرض کیا گیا: حفاظت کے خیال سے۔ فرمایا: کھڑکیاں کھول دو چنانچہ تمام کھڑکیاں کھول دی گئیں اور حضور کو اطلاع دی گئی۔ پھر حضور تشریف لے گئے لیکن اس کے بعد یہ انتظام کیا گیا کہ نمازوں کے وقت ہر کھڑکی کے آگے ایک خادم ڈیوٹی پر کھڑا رہتا۔

فرقان بٹالین کے محاذِ کشمیر پر کارہائے نمایاں تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ جب حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ رضا کاروں کو محاذ سے واپس بلالیا جائے تو فرقان بٹالین کو بھی عزت واحترام سے سبکدوش کردیا گیا۔ مجاہدین سپیشل ٹرین کے ذریعے ربوہ پہنچے جہاں اُن کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ میں اُن دنوں تعلیم الاسلام ہائی سکول، چنیوٹ میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ اس موقع پر ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی جس میں ثاقب زیروی نے خوش الحانی سے اپنی ایک نظم پڑھی۔ اس نظم میں سے ایک مصرعہ اب بھی مجھے یاد ہے اور وہ یہ تھا:

بربط کے نظارے اُف توبہ افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

آغازِ ربوہ کے زمانے کی کچھ یادیں تازہ کرنے کے بعد جمیل رفیق دوبارہ جامعہ میں اپنے دورِ تعلّم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ایک بار مولانا ابوالعطا جالندھری نے لیکچر کے دوران فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مریم علیہا السّلام کے ہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت کی پیش خبری کا دو مقامات پر ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ مریم میں فرماتا ہے: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ٥ یعنی ہم نے حضرت مریم علیہا السّلام کی طرف کلام کرنے والے فرشتے یعنی حضرت جبرائیل کو بھیجا اور وہ اُن کے سامنے ایک تندرست بشر کی شکل میں

ظاہر ہوئے اور جیسا کہ اگلی آیات میں ذکر ہے حضرت مریم علیہا السّلام کو بِن باپ کے ایک بیٹے کی خبر دی۔ دوسری جگہ یعنی سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے کہ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۙ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ٥ یعنی جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم! اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعے ایک لڑکے کی بشارت دیتا ہے۔ اس لڑکے کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا جو اس دنیا اور آخرت میں صاحبِ منزلت اور خدا کے مقرّبوں میں سے ہوگا۔ پہلی آیت میں ایک فرشتے کا ذکر ہے جب کہ دوسری جگہ فرشتوں کا ذکر ہے۔ مولانا کا سوال یہ تھا کہ ان دونوں آیات میں بظاہر نظر آنے والے تضاد کو کیسے حل کیا جائے؟ انہوں نے ہدایت کی کہ اگلے روز طلبہ اس مسئلے پر ایک مضمون لکھ کر لائیں۔

جمیل رفیق کہتے ہیں کہ انہوں نے تفسیر کبیر کی مدد سے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا جو بعد میں کسی جماعتی اخبار یا رسالہ میں چھپ بھی گیا تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ حضرت مریم علیہا السّلام کو خبر پہنچانے کے لیے گئی تو فرشتوں کی ایک جماعت تھی لیکن جس طرح ہمارے ماحول میں کسی سرکاری وفد کی سربراہی اس کا لیڈر کررہا ہوتا ہے اور وہی پورے وفد کی ترجمانی کرتا ہے بالکل اسی طرح فرشتوں کے اس وفد کی ترجمانی حضرت جبرائیل فرمارہے تھے اور وہی شکلِ انسانی میں متمثّل ہوکر حضرت مریم علیہا السّلام کے سامنے آئے تھے۔

موصوف بتاتے ہیں: میں درجہ ثالثہ میں تھا۔ جلسہ سالانہ کے فوراً بعد میر داؤد احمد نے طلبہ کو بتایا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے جو جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے ان سے ایک بات کہی ہے جسے سن کر وہ سخت شرمندہ ہوئے ہیں۔ چوہدری صاحب موصوف کا اشارہ طلبہ جامعہ احمدیہ کے پست تعلیمی معیار کی طرف تھا۔ اپنی اس گفتگو کے دوران چوہدری صاحب نے Cantwell Smith نامی ایک مستشرق کے اس اعتراض کا ذکر کیا تھا کہ اب جب کہ عقلِ انسانی ارتقا کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی ہے وحی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے میر داؤد احمد کو بتایا تھا کہ امریکہ میں ہمارے مربی، ڈاکٹر خلیل احمد ناصر اس اعتراض کا جواب لکھ رہے ہیں تاہم موصوف کی رائے میں اس اعتراض پر ہر سطح پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ میر داؤد احمد نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ جلد ہی اس موضوع پر ایک سیمینار منعقد کرائیں گے جس میں جامعہ کے طلبہ پریزنٹیشنز دیں گے اور چوہدری صاحب کو بطور مہمانِ خاص بلایا جائے گا۔ غالباً اس سیمینار کے انعقاد سے میر داؤد احمد چوہدری ظفر اللہ خان کا یہ تاثر زائل کرنا چاہتے تھے کہ طلبائے جامعہ کا تعلیمی معیار بہت بلند نہیں۔

میر داؤد احمد نے میرے علاوہ بعض اور طلبہ کو بھی اس موضوع پر مضمون لکھنے کو کہا جن میں سے مجھے مسعود جہلمی، عبدالوہاب بن آدم اور قاضی نعیم الدین کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ میر صاحب اس سیمینار کے متعلق اتنے سنجیدہ تھے کہ انہوں نے سیمینار سے پہلے ہم چاروں کو اپنے گھر بلا کر ہم سے باری باری ہمارے مقالے سنے اور ان میں بہتری کے لیے مناسب مشورے دیئے اور بالآخر انہیں اس سیمینار میں پیش کئے جانے کے لیے منظور کرلیا۔

یہ سیمینار ہوا اور اس میں ربوہ میں موجودہ جملہ علمائے کرام اور چیدہ بزرگان کو مدعو کیا گیا۔ علماء میں مولانا ابوالعطا جالندھری، مولانا جلال الدین شمس اور قاضی محمد نذیر لائلپوری شامل تھے۔ میر صاحب کی دعوت پر

چوہدری ظفراللہ خاں نے بھی اس سیمینار کو رونق بخشی۔

طلبہ نے اپنے اپنے مقالے پیش کئے جس کے بعد موجود علماء میں سے بعض کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تاہم میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جس کا حوالہ ہمارے مقالہ جات میں پہلے سے موجود نہ تھا۔

چوہدری صاحب نے اپنے خطاب میں اس سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالوں کے معیار کی تعریف کی۔ انہوں نے جن مقالوں کو خاص طور پر سراہا ان میں میرا اور مسعود جہلمی کا مقالہ شامل تھا۔

الفضل میں اس سیمینار کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی اور بعد میں میرا مقالہ الفضل کے علاوہ بدر میں بھی چھپا۔

ملک مبارک احمد نے جو ہمارے عربی کے استاد تھے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس مضمون کا عربی ترجمہ کر کے انہیں دوں۔ یہ ترجمہ بعد میں ''البشریٰ'' میں ''ضُرُوْرَۃُ اِسْتِمْرَارُ الْوَحِی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

جمیل رفیق مزید بتاتے ہیں: یہ اُس زمانے کی بات ہے جب چک منگلا سے حافظ عزیز الرحمٰن اور بعض دوسرے افراد نئے نئے احمدی ہوئے تھے اور ان کی طبیعت میں احمدیت کی نشر و اشاعت کے لیے بہت جوش تھا۔ احمدی احباب بھی وہاں جاتے رہتے تھے چنانچہ ایک بار جامعہ کے بعض طلبہ (جن میں میں بھی شامل تھا) اور کچھ اساتذہ چک منگلا کی سیر کے لیے گئے تھے۔ مجھے یاد ہے ہم سوہاگہ ریلوے سٹیشن پر اترے تھے جہاں منگلا کے احباب جماعت ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ وہ اپنے ہمراہ ایک گھوڑی بھی لائے ہوئے تھے۔ مولانا غلام باری سیف تو اس گھوڑی پر سوار ہو گئے اور باقی لوگ پیدل گاؤں پہنچے۔ وہاں ایک چھوٹا سا جلسہ ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم چک منگلا کی مشہور دینی شخصیت، پیر منورالدین سے ملاقات کے لیے ان کے ڈیرے پر گئے۔ یاد رہے حافظ عزیز الرحمٰن منگلا فی الاصل ان ہی پیر منورالدین کے خلیفہ تھے لیکن اس وقت تک احمدی ہو چکے تھے۔ یہ ملاقات خاصی دلچسپ رہی اور وفاتِ مسیح کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔

جامعہ میں تعلیم کے دوران طلبہ کو ہائیکنگ پر بھی لے جایا جاتا تھا چنانچہ ایک بار میر صاحب نے انہیں سوات بھجوایا تاہم بوقتِ رخصت بتا دیا کہ واپسی پر انہیں اس سفر کا حال ایک مضمون کی شکل میں لکھنا ہوگا اور بہترین مضمون نگار کو انعام دیا جائے گا۔ جمیل رفیق کہتے ہیں: اس سفر میں جامعہ کے اساتذہ میں سے مولانا غلام باری سیف، قریشی مقبول احمد اور مولانا نسیم سیفی کے والدِ بزرگوار، ماسٹر عطا محمد ہماری نگرانی اور رہنمائی کے لیے ساتھ گئے تھے۔

ماسٹر عطا محمد اس گروپ میں سب سے عمر رسیدہ لیکن دل کے جوان تھے۔ مجھے یاد ہے ہم غالباً مینگورہ سے خوازہ خیلہ پیدل جا رہے تھے لیکن چاہتے تھا کہ ماسٹر صاحب اپنے بڑھاپے کے پیش نظر یہ سفر بس یا وین پر کریں۔ ماسٹر صاحب کو ہمارے ''ارادوں'' کا علم ہوا تو اصرار کرنے لگے کہ وہ بہرصورت یہ سفر باقی گروپ کے ساتھ پیدل ہی کریں گے اور انہوں نے ایسا کر بھی دکھایا۔

وہ شاعر تھے چنانچہ جہاں ان کی طبیعت لہراتی وہ فی البدیہہ شعر کہتے چلے جاتے۔ وہ یہ اشعار ہمیں بھی ساتھ ساتھ سناتے جاتے تھے۔ اب وہ سارے شعر تو یاد نہیں رہے البتہ خوازہ خیلہ پہنچ کر انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

خوازہ خیلہ کے آب کی باتیں
ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں

اس تفریحی سفر کے دوران ہم پشاور بھی گئے اور درّہ خیبر دیکھا۔ ماسٹر صاحب نے اس سفر میں حاصل ہونے والے تجربات کے مدنظر یہ اشعار کہے:

اے پیشاور کی گرم ہوا
جا کہیو ربوہ والوں سے
خیبر پہ جو کچھ خرچ ہوا
وہ پیسے سارے حرام گئے

جمیل رفیق کو اس سفر کی بعض باتیں آج تک نہیں بھولیں۔ وہ کہتے ہیں: بحرین میں ہم نے ایک بکرا خریدا جو شاید پانچ روپے میں ملا تھا۔ ہم نے یہ بکرا ذبح کر کے پکایا اور اس سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ انہیں یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار جب وہ سیدو شریف میں گھوم رہے تھے والیٔ سوات کی سواری سفید محل سے برآمد ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ والی کی کار سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک بھکاری کے پاس رکی ہے اور والی نے بھکاری کو اپنے پاس بلا کر کوئی چیز دی ہے۔ انہیں تجسس ہوا چنانچہ جب والی کی سواری آگے بڑھ گئی تو وہ اس بھکاری کے پاس گئے اور پوچھا کہ اسے والی نے کیا دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے پانچ روپے عطا ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں پانچ روپے ایک خطیر رقم تھی اور جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے اس میں ایک بکرا خریدا جا سکتا تھا لہٰذا وہ والی کی دریا دلی سے بہت متاثر ہوئے۔

ربوہ پہنچ کر ان میں سے ہر ایک نے اس سفر کا حال ایک مضمون کی شکل میں بیان کیا۔ بقول جمیل رفیق پرنسپل صاحب نے یہ تمام مضامین پڑھے اور اعلان کیا کہ اگرچہ ان مضامین میں سے ایک مضمون بھی بہت اعلیٰ معیار کا نہیں ہے تاہم ان میں سے بہترین مضامین مسعود جہلمی اور جمیل رفیق کے ہیں اور ہم دونوں کو دس دس روپے بطور انعام دیئے۔ ملک سیف الرحمٰن نے مجھ سے میرا مضمون لے لیا۔ یہی مضمون بعد میں ان کی بیگم، امتہ الرشید شوکت نے رسالہ مصباح میں شائع کر دیا۔

جب درجہ ثالثہ کا سالانہ امتحان ہوا تو جمیل رفیق کے علاوہ کوئی طالب علم پاس نہ ہو سکا۔ یوں تنہا وہی وہ طالب علم تھے جو درجہ رابعہ میں ترقی پا سکے۔ اس طرح درجہ رابعہ سے لے کر درجہ سادسہ تک پوری کلاس صرف ایک طالب علم پر مشتمل رہی اور ۱۹۶۱ء میں ان کے علاوہ اور کوئی طالب علم جامعہ سے شاہد بن کر نہیں نکلا۔

جمیل رفیق کہتے ہیں: اسی زمانے میں ایک مجلسِ مشاورت منعقدہ ہوئی۔ حضرت مرزا بشیر احمد اس کی صدارت فرما رہے تھے اور میں بطور رضا کار وہاں ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ موضوع زیر بحث تھا: جامعہ میں طلبہ کی کم ہوتی ہوئی تعداد اور کہا جا رہا تھا کہ جماعتوں کو اس طرف خاص توجہ دینی چاہئے تا کہ ہمارے اس ادارے کو اپنے مقاصد کے حصول میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ طلبہ کی تعداد کی کمی کے حوالے سے یہ بات خاص طور پر کہی گئی کہ فی الوقت

جامعہ کی فائنل کلاس میں صرف ایک طالب علم ہے۔ یقیناً مقرر کا اشارہ میری طرف ہی تھا۔

اس زمانے میں رواج تھا کہ جامعہ میں تعلیم مکمل کر لینے کے بعد صدر انجمن احمدیہ اور تحریک جدید کے نمائندوں پر مشتمل ایک بورڈ جملہ شاہدین کا انٹرویو لیتا۔ اس انٹرویو کی بنیاد پر آدھے مربیان صدر انجمن اور آدھے تحریک جدید لے لیتی۔ صدر انجمن کو ملنے والے مربیان کو اپنا سارا وقت پاکستان میں گزارنا ہوتا تھا جب کہ تحریک جدید کو ایلوکیٹ ہونے والے مربیان بیرونِ پاکستان خدمت انجام دیتے تھے۔ مشاورت میں ایک مقرر کہہ رہے تھے کہ اگر سال میں جامعہ سے ایک ہی طالب علم فارغ التحصیل ہوگا تو اس کی تقسیم کس طرح ہوگی۔ کیا اسے صدر انجمن اور تحریک جدید میں آدھا آدھا کر کے بانٹ دیا جائے گا؟ مجھے یاد ہے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد، ناظم وقف جدید بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ آپ نے یہ بات سنی تو اٹھ کر کہا: میری گزارش ہے کہ اس مربی کے دو ٹکڑے کرنے کی بجائے تین ٹکڑے کیے جائیں کیونکہ ایک ٹکڑا وقفِ جدید کو بھی چاہیے۔ صاحبزادہ صاحب موصوف کے صورتِ حال پر اس تبصرے نے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔

مصنف کتابِ ہٰذا کی نظر سے الفضل ۲ جولائی ۱۹۴۹ء میں ''جامعہ احمدیہ میں سٹوڈنٹ یونین کا قیام'' کے عنوان سے ایک تفصیلی خبر گزر چکی ہے جس کے مطابق ''طلبہ جامعہ احمدیہ کی فلاح و بہبود اور انتظامی امور میں دسترس حاصل کرنے کے لیے جہاں کئی اور مفید تجاویز عمل میں لائی جا رہی ہیں وہاں ایک نہایت مفید تجویز طلبہ کی یونین کا قیام ہے جو اساتذہ و طلبہ کے تعاون و اتحاد سے بنائی گئی ہے۔ جناب صاحبزادہ میاں عبدالمنان صاحب عمر، ایم اے یونین کے پریذیڈنٹ ہیں۔ آپ کی نگرانی میں ہر جماعت سے ایک نمائندہ منتخب کر کے یونین کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل کی گئی۔ چونکہ مدرسہ احمدیہ بھی دو سال سے جامعہ احمدیہ کے ساتھ ملحق ہے لہٰذا تمام طلبہ مدرسہ احمدیہ بھی اس کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ مورخہ ۲۳ جون ۱۹۴۹ء کو اس یونین کا افتتاحی اجلاس ہوا۔''

راقم نے جمیل رفیق سے پوچھا کہ کیا جامعہ میں سٹوڈنٹس یونین اب بھی فعّال ہے تو انہوں نے بتایا: اب اسے مجلسِ علمی کا نام دیا جا چکا ہے، اس کا نگران جامعہ کا کوئی پروفیسر ہوتا ہے جب کہ سیکرٹری طلبہ میں سے لیا جاتا ہے تاہم عام کالجوں کے برعکس جہاں یونین کے عہدیداران طلبہ کے ووٹ سے چُنے جاتے ہیں جامعہ میں الیکشن نہیں ہوتا بلکہ عہدیداران نامزد کئے جاتے ہیں۔ مجلسِ علمی اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت اچھا کام کر رہی ہے۔

جمیل رفیق کے پاس اپنے زمانۂ تعلیم کی اور بھی بہت سی خوبصورت یادیں ہیں تاہم اُن کا بیان کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے اب ایک اور سینئر مربی، لئیق احمد طاہر جو حضرت شیخ فضل احمد بٹالوی، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے ہیں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں شاہد کی ڈگری حاصل کی۔ وہ نائب امام بیتِ فضل، لندن اور واشنگٹن میں بطور مربی کام کر چکے ہیں۔ انہیں وکالتِ تصنیف اور جامعہ احمدیہ میں بھی خدمت کا موقع مل چکا ہے۔ اس وقت وہ انگلستان میں بطور ریجنل مشنری تعینات ہیں۔

وہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک چھ سال کا عرصہ جامعہ احمدیہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہ اپنی اس زمانے کی یادداشتیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں خدا تعالیٰ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا جس

کی خاص عنایت سے مجھے جامعہ احمدیہ میں داخلے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مجھے سیّد میر داؤد احمد نے انٹرویو کے لیے اپنے دفتر میں بلایا۔ میں اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ حاضر ہوا تو آپ نے تلاوتِ قرآن کریم کا امتحان لیا۔ کچھ آیات کا ترجمہ پوچھا جس کا میں نے تھوڑا بہت جواب دیا۔ آپ نے مجھے درجۂ پنجم کی بجائے درجہ مُمہّدی میں داخل کر لیا۔ یوں میرا ایک سال تو بچ گیا لیکن عربی گرامر وغیرہ میں آخر تک کمزوری کا احساس باقی رہا۔ میر داؤد احمد آتے جاتے پوچھتے کہ پڑھائی کیسی جا رہی ہے تو میں یہی عرض کرتا کہ صرف و نحو کے سوا باقی مضامین میں ٹھیک ہوں۔ صرف و نحو کے سیکھنے میں جو کمی رہ گئی تھی اس کا ازالہ اللہ تعالیٰ نے ۱۹۷۲ء میں یوں فرما دیا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے اپنے الطافِ خسروانہ سے میری شادی اس مضمون کے استاد، مولوی ابوالمنیر نورالحق کی دخترِ نیک اختر، امۃُ النور کے ساتھ کروادی۔

ہماری کلاس میں چھبیس طلبہ تھے۔ جامعہ کی سخت تدریس اور ڈِسپلن میں سے گزرنا بڑے دل گردہ کا کام تھا جس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ پچھلی کلاسوں میں رہ گئے، کچھ دل چھوڑ گئے اور درجہ رابعہ میں ہم صرف چار طلبہ پاس ہوئے یعنی بشیر اختر آف ترگڑی، عزیز محمد اطہر آف بستی رنداں، نصر اللہ خان ناصر آف سدّوکی اور یہ عاجز۔ درجہ خامسہ میں ہمارے ساتھ اوپر کی کلاس سے رہ جانے والے دو طلبہ شامل ہوگئے یعنی عطاء الکریم شاہد اور قریشی مبارک احمد آف سکھر۔ بعد میں ان سب کو خدا تعالیٰ نے خدمت کے بڑے اعزاز سے نوازا۔

ہماری ابتدائی کلاس میں محی الدین انڈونیشین بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ ہائی سکول میں مجھ سے دو تین سال سینئر تھے۔ پھر جامعہ میں درجہ مُمہّدی میں میرے ہم جماعت ہوئے۔ دراصل وہ جس کلاس میں جاتے اس سے محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ ایسے چمٹتے کہ جدا ہونے کا نام نہ لیتے۔ چار پانچ سال کے بعد وہ مجھ سے تین سال پیچھے رہ چکے تھے۔ میر داؤد احمد بڑے نبض شناس تھے چنانچہ انہوں نے ان کے لیے ایک رعایتی شارٹ کورس مقرر کر کے جامعہ سے پاس کرا دیا۔ وہ بعد میں انڈونیشیا تشریف لے گئے اور خدا تعالیٰ نے انہیں خاصی خدمت کی توفیق بخشی۔ چند سال ہوئے راہیٔ ملکِ عدم ہوئے ہیں۔

بشیر اختر اور نصر اللہ خان ناصر نے میٹرک میں اعلیٰ نمبر حاصل کئے تھے۔ انہیں وظیفہ مل سکتا تھا اور وہ چاہتے تو کسی کالج میں داخل ہو کر دنیاوی تعلیم حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ابدی روحانی لذتیں سمیٹنے کے لیے جامعہ میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بشیر اختر کینیا گئے اور سواحیلی زبان میں بڑا ملکہ حاصل کیا۔ مربی انچارج تنزانیہ کے طور پر خوب خدمت کی توفیق پائی۔ رہے نصر اللہ ناصر تو انہوں نے سیالکوٹ، جھنگ اور اصلاح وارشاد مقامی میں بڑی وفا کے ساتھ خدمت کی۔

عزیز اطہر کا حافظہ غضب کا تھا۔ انہیں لیکچر سنتے ہی یاد ہو جاتا چنانچہ وہ رات کا بہت سا حصہ دعاؤں اور نوافل میں گزارتے۔ ان کا ایک لطیفہ مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ زمانہ بڑی غربت کا تھا۔ طلبہ کا وظیفہ بہت محدود تھا۔ جو طلبہ تو ربوہ میں اپنے گھروں میں رہتے تھے نسبتاً آرام میں تھے لیکن ہوسٹل میں رہنے والے یا کرایہ پر

مکان لے کر رہنے والے اکثر طلبہ جنہیں اپنے گھروں سے کوئی رقم نہیں ملتی تھی بہت تنگی میں گزارا کرتے تھے۔ بعض صورتوں میں دو دو تین تین طلبہ مل کر رہتے اور بچت کے لیے چنیوٹ کی سبزی منڈی سے خریداری کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب عزیز اطہر چنیوٹ جا رہے تھے تو ہمارے بزرگ عیال دار استاد، ملک مبارک احمد نے جو ہمیں حدیث پڑھاتے تھے اور فاضلِ اجل تھے انہیں آٹھ آنے دیئے اور فرمایا کہ وہ اس رقم سے آتے ہوئے ان کے لیے آلو خریدتے لائیں۔ عزیز اطہر نے ان کے بڑے کنبے کے خیال سے جن آلوؤں کا انتخاب کیا وہ اپنے سائز میں کابلی چنے کے برابر تھے یعنی آلو نہیں بلکہ آلوؤں کے ناقص سے بیج تھے۔ انہیں یہ بیج آٹھ آنے میں پانچ سیر مل گئے تھے۔ اگلے دن کلاس میں ان کی شامت آ گئی۔ حافظ صاحب بار بار کہتے: باقی باتیں چھوڑو۔ صرف یہ بتاؤ کہ یہ آلو چھیلنے کیسے ہیں۔

ہمارے ایک کلاس فیلو عبدالوہاب صابر تھے۔ ہم درجہ ثالثہ تک اکٹھے رہے۔ میں ان سے مُمہدی میں عربی پڑھا کرتا تھا۔ ان کا قیام محمد حسین کاشمیری، سیکیورٹی گارڈ، خزانہ صدر انجمن کے کچے مکان میں تھا۔ ہم آدھی رات تک اکٹھے پڑھتے جس کے بعد وہ مجھے ریلوے لائن تک چھوڑنے آتے۔ وہاں سے ہمارا گھر زیادہ دور تو نہ تھا لیکن راستہ ویران تھا لہٰذا اندھیری رات میں تین چار سو قدم اکیلے چل کر گھر تک پہنچنے میں پِتّہ پانی ہو جاتا تھا۔ یہی عبدالوہاب صابر (جو بعد میں عبدالوہاب احمد کہلانے لگے تھے) اور راقم ایک سالانہ امتحان سے پہلے حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کے پاس دعا کی درخواست کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مولانا نے حسبِ دستور اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور پھر فرمایا: کچھ روشنی اور کچھ اندھیرا دیکھا ہے۔ جب نتیجہ نکلا تو میں جو عبدالوہاب صابر سے پڑھا کرتا تھا پاس ہو گیا لیکن خود ان کی اپنی انگریزی زبان میں کمپارٹمنٹ آ گئی اور یوں خدا کی بات پوری ہوئی۔

مجھے جامعہ احمدیہ میں جن اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ فوری طور پر ان میں سے میر داؤد احمد، سیّد سمیع اللہ شاہ، ماسٹر عطا محمد، پیر معین الدین، قریشی نور الحق تنویر، مولانا محمد احمد ثاقب، شیخ نور احمد منیر، ملک سیف الرحمٰن، مولانا محمد احمد جلیل، میجر محمد اسماعیل، معلّمو یوسف، سیّد میر محمود احمد، مرزا رفیع احمد، ملک مبارک احمد، چوہدری محمد شریف، مولوی عبداللطیف بہاولپوری، مولوی ابوالمنیر نور الحق، حکیم محمد اسماعیل اور عبدالرزاق پی ٹی آئی کے اسمائے گرامی یاد آ رہے ہیں۔

ہمارے یہ سبھی اساتذہ بے مثل خوبیوں کے حامل تھے۔ سیّد سمیع اللہ شاہ ہمیں انگریزی پڑھاتے اور انگریزی میں تقریروں کی مشق کرایا کرتے تھے۔ ملہم تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات لوٹا ہاتھ میں ہوتا ہے کہ الہام ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ اپنے لیکچر کے دوران حضرت مسیح موعود کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ زمانے کی حالت دیکھ کر حضور راتوں کو بعض اوقات لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ یہ بیان کرتے ہوئے آپ سب طلبہ کے سامنے لوٹ پوٹ ہونے لگے اور فرمایا: یہ حال ہوا کرتا تھا حضور کا۔

ماسٹر عطا محمد اساتذہ میں سب سے زیادہ معمّر تھے اور غیر ملکی طلبہ کو اردو پڑھاتے تھے۔ غیر ملکی طلبہ کو اردو

زبان سکھانا آپ پر ختم تھا۔ اردو زبان کی استعداد بڑھانے کے لیے آپ تصویری زبان استعمال فرماتے مثلاً طلبہ کو بتانا ہو کہ لڈو کیا ہے تو وہ لڈو خرید کر لے آتے اور طلبہ کو نہ صرف لڈو دکھاتے بلکہ کھلاتے بھی۔ یوں کلاس ختم ہونے تک طلبہ کو لڈو سے مکمل تعارف ہو جاتا تھا۔ غرض آپ کبھی کلاس میں تربوز لاتے، کبھی مالٹے اور کبھی کھجور۔ ہم اس کلاس پر رشک کرتے کہ اگر ہم بھی غیر ملکی ہوتے تو ان چیزوں سے نوازے جاتے۔

پیر معین الدین جو حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے داماد تھے ایم ایس سی پاس تھے اور ان کی خدمات فضلِ عمر ریسرچ انسٹیٹیوٹ بند ہونے کے بعد جامعہ کو منتقل کی گئی تھیں۔ بڑی جماعتوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت خاموش طبع اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ قرآن کریم سے عشق تھا اور اس میدان میں آپ کو خدمت کی بھی توفیق ملی۔

قریشی نور الحق تنویر مصر سے ماسٹرز کر کے آئے تھے۔ بہت حلیم اور محبت کرنے والے استاد تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی کسی طالب علم سے ناراض ہوئے ہوں۔ ہم نے ان سے بہت استفادہ کیا۔ طلبہ سے ان کا محبت بھرا سلوک ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ عربی کی تقریروں کی تیاری میں ہمیشہ میری مدد کرتے جس کے نتیجے میں خاکسار آخری چار پانچ سالوں میں جامعہ کے سالانہ تقریری مقابلوں میں ہمیشہ اول آتا رہا۔

ہمارے درجہ اولیٰ و ثانیہ میں فقہ کے استاد مولانا محمد احمد ثاقب تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ایک حکم کے تحت آپ کو فقہ میں تخصّص کروائی گئی تھی۔ اپنے مضمون پر خوب حاوی تھے۔ نازک مسائل کو نوجوان طلبہ کے سامنے احتیاط اور عمدگی سے بیان فرماتے۔

ہمیں مولانا کے علاوہ ملک سیف الرحمٰن سے بھی فقہ پڑھنے کا موقع ملا۔ بتایا کرتے تھے کہ وہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ احرار کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ان کے سٹیج سے نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں احرار کا ایک جلسہ قادیان میں ریتی چھلہ میں ہوا۔ وہ اس میں بھی شریک تھے۔ فرماتے تھے: میں تجسس کی وجہ سے قادیان کے احمدیہ محلّہ میں گھومتا رہا اور لوگوں کی نیکی اور تقویٰ دیکھ کر گھائل ہو گیا۔ بعد میں کسی وجہ سے آپ کی آواز متاثر ہو گئی۔ میر داؤد احمد کی وفات پر آپ جامعہ کے پرنسپل بنے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ بہت باوقار سفید لباس میں ملبوس ہوتے۔ غریب پرور تھے اور طلبہ کی مالی اعانت کرتے رہتے تھے۔

شیخ نور احمد منیر چھوٹی کلاسوں کو حدیث پڑھاتے تھے۔ جہیر الصّوت لیکن بہت نرم خُو تھے۔ لبنان میں مربی سلسلہ رہے۔ مجھے یاد ہے ان کا گھر بیتِ قمر کے قریب تھا۔ وہ نماز مغرب کے بعد حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ پوری حدیث راوی سمیت یاد کر کے آتے اور عربی میں پیش کر کے تشریح فرمایا کرتے تھے۔

مولانا محمد احمد جلیل بڑی کلاسوں کو حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ بہت متحمل تھے۔ خوب تیاری کر کے کلاس میں آتے۔ خوش گفتار اور خوش لباس تھے۔ اساتذہ و طلبہ کی فرمائش پر عمدہ لطیفے بھی سنایا کرتے تھے۔ بعد میں ایم ٹی اے پر درس دیتے رہے۔

میجر محمد اسماعیل اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ اہلِ زبان تھے لہٰذا بڑی شستہ اردو بولتے تھے۔ انتہائی وضع دار اور نفیس الطبع بزرگ تھے۔ فوجی ہونے کی وجہ سے طلبہ میں اعلیٰ ڈسپلن دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں وہ ان دنوں جامعہ نصرت میں بھی پڑھایا کرتے تھے۔

معلّمُو یوسف سواحیلی زبان کے استاد تھے۔ آپ عمر بھر تنزانیہ میں رہے لیکن بعد میں ربوہ منتقل ہوگئے۔ ہم نے ان سے شاہد کلاس میں پانچ چھ ماہ تک سواحیلی پڑھی اور یہ ان ہی کا کمال تھا کہ ہم ٹوٹی پھوٹی سواحیلی بولنے لگے تھے۔ وہ بڑھاپے کے باوجود بہت خوش لباس اور سلیقہ مند تھے اور بالعموم سوٹ اور نکٹائی میں ملبوس رہتے۔

سیّد میر محمود احمد منطق اور موازنہ مذاہب پڑھاتے تھے۔ بہت محنتی تھے اور طلبہ کو علمی اور روحانی اعتبار سے بلند مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔

مرزا رفیع احمد تفسیر کے استاد تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ طلبہ کے دل میں قرآن کریم کی محبت پیدا ہو اور خداتعالیٰ ان کی یہ خواہش بالعموم پوری فرما دیتا۔

ملک مبارک احمد انشا اور بلاغت کے استاد تھے۔ چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی۔ ہم نے انہیں لائبریری میں ہمیشہ انگریزی اخبار کا مطالعہ کرتے دیکھا۔ طلبہ انہیں ناراض نہیں ہونے دیتے تھے اور ان کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھے ورنہ وہ امتحان میں ان کے ساتھ حساب بے باق کر دیا کرتے تھے۔ شام سے عربی زبان میں تخصیص حاصل کر رکھی تھی۔ عربی کا خط بہت خوبصورت تھا۔ ایک بار عربی کے سالانہ تقریری مقابلے میں ایک منصف، قاضی محمد نذیر لائلپوری کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا: هُوَ نَذِيرٌ لَا نَظِيرٌ لَهٗ یعنی آپ ایسے نذیر ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ہمارے باقی اساتذہ میں چوہدری محمد شریف (جو مولوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری کے بھائی تھے اور جنہیں ایک لمبا عرصہ بلادِ عربیہ میں احمدیت کا پیغام پہنچانے کا موقع مل چکا تھا)؛ مولوی عبداللطیف بہاولپوری (جو سلسلے کے ایک جیّد عالم، دعا گو بزرگ اور صاحبِ الہام وکشف تھے اور جنہوں نے ''تذکرہ'' کی تدوین کے سلسلے میں بہت محنت سے کام کیا) اور مولوی ابوالمنیر نورالحق (جنہیں تفسیر صغیر و تفسیر کبیر کے حوالے سے لمبا عرصہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی معاونت کا موقع مل چکا تھا اور جو کئی سال تک ادارۃ المصنفین کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے) شامل تھے۔

جسمانی ورزش اور کھیلوں کے نگران عبدالرزاق پی ٹی آئی تھے۔ مجھے درجہ اولیٰ میں ان سے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ پھر میر داؤد احمد انہیں دوسری فیلڈ میں لے گئے۔ صبح کی حاضری، شام کی کھیلیں، جامعہ اور جلسہ سالانہ کی تعمیرات میں انہیں خوب خدمت کی توفیق ملی۔ محنتی انسان تھے۔ ۱۹۷۴ء میں بعض خدشات کی وجہ سے ربوہ کے خالی پلاٹس پر فوری تعمیر کا حکم ہوا تو انہوں نے اپنے مکان کے لیے سیمنٹ کے بلاکس خود تیار کیے۔

۱۹۶۳ء میں جامعہ کی نئی بلڈنگ بن گئی اور پرانا جامعہ ہوسٹل بنا دیا گیا۔ حضرت مرزا بشیر احمد اس کے

افتتاح کے لیے تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے اس موقع پر تین ٹانگ کی دوڑ میں مجھے آپ کے ہاتھوں سے انعام وصول کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

ہمارے زمانے میں ہائیکنگ جسمانی تربیت کا ایک لازمی حصہ تھی۔ آٹھ دس دن پہاڑوں پر پیدل چلنا ہوتا تھا۔ الحمدللہ مجھے کاغان ویلی، سِیرن ولی، نیلم ویلی اور مری سے ٹھنڈیانی تک پیدل سفر کے مواقع ملے۔ ہمارے بزرگ اساتذہ میں سے مولانا غلام باری سیف، سیّد میر محمود احمد اور عبدالرزاق ہمارے نگران ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں دو تین واقعات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

ایک دفعہ ہم مری سے ایبٹ آباد کے راستے پیدل ٹھنڈیانی پہنچے۔ وہاں رات بھر شدید گرج چمک کے ساتھ بارش ہوتی رہی حتّٰی کہ ایک بار ہمارے گیسٹ ہاؤس کے اس کمرہ پر جس میں چوکیدار سوتا تھا شدید کڑک کے ساتھ بجلی گری اور کمرے کی چھت پھٹ گئی۔ صبح کے وقت ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھنے میں آیا اور یہ کہاوت سچ ثابت ہوئی کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ معلوم ہوا کہ بجلی گرنے سے ذرا پہلے چوکیدار اپنی کسی ضرورت کے تحت کمرے سے نکل کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ اگر وہ کمرے میں لیٹا ہوتا تو یقیناً لقمۂ اجل بن جاتا لیکن خدا نے اسے بچانا تھا سو بچا لیا۔

سِیرن وَیلی پاکستان کی خوبصورت ترین وادیوں میں سے ہے۔ اس ویلی میں ایک مقام ''شہید پانی'' کے نام سے معروف ہے۔ شہید پانی میں قیام کے دوران نصف شب کے بعد کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم چونکہ اس جگہ اجنبی تھے اور شنید تھی کہ یہاں سیاح لوٹ لئے جاتے ہیں لہٰذا ہم نے دروازہ نہیں کھولا۔ باہر سے آوازیں آ رہی تھیں اور لوگ ٹارچ مانگ رہے تھے لیکن ہم ڈر کے مارے دروازہ کھول نہیں رہے تھے۔ صبح دیکھا کہ برامدہ میں ایک بکری مری پڑی ہے۔ دراصل رات کو ریچھ نے ریوڑ پر حملہ کیا اور ایک بکری کھا رہا تھا لیکن گڈریوں کے شور پر اپنا شکار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ گڈریوں نے وہ بکری اس لیے وہاں رکھ چھوڑی تھی کہ ریچھ اس گوشت کی خوشبو پر اگلی رات دوبارہ وہاں آئے گا تو وہ اسے مار سکیں گے۔

اس وَیلی میں چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک جگہ ''موسیٰ کا مصلّٰی'' ہے۔ مولانا غلام باری سیف کو بھاری جسم اور ڈھلتی ہوئی عمر کی وجہ سے چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ چڑھائی مشکل ہے یا اترائی۔ فرمانے لگے: یہی سوال کسی نے اونٹ سے پوچھا تو اس نے جواباً کہا تھا: بر ہر دو لعنت۔ یہی میرا حال ہے۔
موسیٰ کا مصلّٰی اتنی بلندی پر تھا کہ بادلوں کے گرجنے کی آواز بہت نیچے سے آتی تھی۔

لئیق طاہر مزید بتاتے ہیں: طلبہ کے لیے لازمی تھا کہ وہ جامعہ میں تعلیم کے دوران کم از کم ایک بار ۱۵۰ میل پیدل سفر بھی کریں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ربوہ سے براستہ چنیوٹ، جھنگ، نیا لاہور اور فیصل آباد ہوتے ہوئے واپس ربوہ پہنچے تھے۔ تکان سے ہمارا جو حال تھا ناقابلِ بیان ہے۔ طلبہ پانچ روپے اور دو روٹیاں یا نصف سیر چنے گھر سے ساتھ لے کر جا سکتے تھے اور انہیں اجازت تھی کہ وہ ناگہانی ضرورت پر ایک وقت میں چار آنے تک خرچ کر سکتے ہیں۔ دورانِ سفر انہیں کسی کو یہ بتانے کی اجازت نہ تھی کہ وہ کہاں سے آ رہے ہیں

اوران کی منزل کیا ہے۔ ہم رات کے وقت سڑک کے قریب کسی مسجد میں چٹائی پر سوجاتے اور صبح فجر کی نماز سے قبل وہاں سے روانہ ہوجاتے تا لوگ ہم سے سوال و جواب نہ کرسکیں۔ کسی سے کچھ مانگنا ممنوع تھا البتہ اگر کوئی ازخود پیشکش کردیتا تو اسے قبول کرنے کی اجازت تھی۔

مجھے یاد ہے ایک سال ایک گروپ جس میں راجہ نصیر احمد (سابق ناظر اصلاح وارشاد مرکزیہ) بھی شامل تھے سرگودھا اور نخلہ کی طرف روانہ ہوا۔ نخلہ کے قریب کسی نے ان سے پوچھا کہ وہ ٹھنڈا پئیں گے یا گرم۔ راجہ نصیر بہت زندہ دل تھے، کہنے لگے: کھانے سے پہلے ٹھنڈا اور بعد میں گرم۔ میزبان کو چاروناچار سب کو کھانا کھلانا پڑا اور چائے بھی پلانا پڑی۔

خاکسار جب درجہ مُمہدی یا اولیٰ میں تھا جمیل الرحمٰن رفیق، آخری کلاسوں میں تھے۔ آٹھ نو اساتذہ صرف اس ایک طالب علم کو پڑھاتے تھے کیونکہ ان کے ساتھی انہیں دغا دے کر پچھلی کلاسوں میں رہ گئے تھے چنانچہ موصوف کو اپنی تعلیم ''قیدِ تنہائی'' میں مکمل کرنا پڑی۔

اس وقت کے جن طلبہ کو اللہ تعالیٰ نے مقبول خدمت کی توفیق سے نوازا ان میں مولوی عبدالعزیز بنگالی، مربی سلسلہ مقیم بنگلہ دیش؛ آغا سیف اللہ سابق ناظم دارالقضا و منیجر الفضل؛ مولانا کریم الدین شاہد آف قادیان؛ عبدالحکیم جوزا مرحوم اور عثمان چینی شامل ہیں۔

یہاں یہ ذکر شاید بے جانہ ہو کہ عثمان چینی کے مخصوص لب ولہجہ کی وجہ سے ان سے بات کر کے بڑا مزا آتا تھا۔ سالانہ امتحان میں پرچے کو باندھنے کے لیے ٹیگ کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: میں نے پرچہ باندھنا ہے۔ رسّی دیں۔ انہیں جب آخری سال میں طب کی کلاس میں داخل کیا گیا تو کچھ ہی عرصے کے بعد میر داؤد احمد نے انہیں وہاں سے نکال لیا کیونکہ دیسی ادویہ از قسم ہرڑ، جُند بیدستر، تخم بالنگو، اسپغول وغیرہ کے نام کچھ ایسے لہجے میں بولتے تھے کہ اگر کوئی حکیم اسے سمجھ پاتا تو یقیناً نوبل پرائز کا حقدار ٹھہرتا۔

محمد عیسیٰ اور داؤد حنیف ہمارے ساتھی تھے۔

میرے جامعہ کے پہلے ایک یا دو سال میں مرزا عبدالشکور (جو اَب انگلستان منتقل ہو چکے ہیں) پرنسپل آفس میں کام کیا کرتے تھے۔ پھر مولوی محمد شریف، قریشی محمد سعید اور عبدالعزیز خدمت سرانجام دیتے رہے۔ مولوی محمد شریف اور قریشی محمد سعید تو قدرے معروف بزرگان میں شامل تھے۔ جہاں تک عبدالعزیز کا تعلق ہے، موصوف کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت شریف الطبع اور دیانت وامانت کا مرقع تھے۔ ہمیشہ مسکراتے رہنے کا نسخہ کوئی ان ہی سے لے تو لے۔

حمید احمد خالد ایم اے عربی کا امتحان دینے کے بعد جامعہ میں داخل ہوئے۔ واقفِ زندگی تھے۔ ان کے میلانِ طبع کو دیکھ کر میر داؤد احمد نے انہیں لائبریرین مقرر کردیا اور پھر انہوں نے جرمنی میں اپنے بچوں کے پاس منتقل ہونے تک لمبا عرصہ سلسلے کی خدمت کی۔

محمد سلیم اور ''میجر نذیر'' ہمارے زمانے کے ہردلعزیز مددگار کارکن تھے۔ نذیر کو پیار سے میجر کہا جاتا تھا۔

وہ مسکین شکل وصورت کے ساتھ بے حد عاجزی سے بات کرتے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کا نام غلطی سے نذیر (بمعنی ڈرانے والا) رکھ دیا گیا ہے۔

میرے جامعہ میں قیام کے دوران مجلسِ علمی یا مجلسِ ارشاد کے تحت علماءِ سلسلہ اور مربیان کی تقاریر ہوتی رہتی تھیں۔ اسی طرح کبھی کبھار ادبا اور سیاسی شخصیات بھی مدعو کی جاتی تھیں۔ ان میں سے دو نام اب تک ذہن میں محفوظ ہیں: دیوان سنگھ مفتون اور چوہدری ظفر اللہ خان۔ دیوان سنگھ مفتون کی جامعہ میں تقریر کا کچھ ذکر ان کے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل میں موجود ہے لہٰذا اسے چھوڑتے ہوئے میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب چوہدری ظفر اللہ خان خطاب کے لیے تشریف لائے تو سوال و جواب کے دوران ایک طالب علم نے ان سے پوچھا کہ ان کی تنخواہ کیا ہے۔ چوہدری صاحب تقسیم سے قبل کئی اہم عہدوں پر خدمت بجا لا چکے تھے، وہ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ تھے اور یو این او کی جنرل اسمبلی کے صدر رہ چکے تھے اور اسی نسبت سے انہیں بھاری مشاہرہ ملتا تھا تاہم انہوں نے اس مجلس میں اس کا انکشاف مناسب نہ سمجھا اور فرمایا کہ وہ اس سوال کا جواب اس طالب علم کو علیحدگی میں دینا پسند کریں گے۔

لئیق طاہر مزید بتاتے ہیں: میرے زمانۂ طالب علمی میں جامعہ کا ہوسٹل ابتداءً اس جگہ واقع تھا جہاں اب بیتِ محمود، دفاتر تحریک جدید اور دارالضیافت کا ایک حصہ ہے۔ کچے کمرے تھے لیکن چونکہ سارا ربوہ ہی کچے مکانوں پر مشتمل تھا اور دفاتر بھی کچے تھے لہٰذا یہ بات عجیب نہ محسوس ہوتی۔ مجھے یاد ہے عثمان چینی بھی اس ہوسٹل کے ایک کمرے میں مقیم تھے۔ ہم ان کے پاس دعا کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہ دعا شروع کرتے تو چالیس مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھتے اور پھر اتنی لمبی دعا کرتے کہ بعض دفعہ اکتاہٹ ہونے لگتی۔ وہ زمانہ یاد آتا ہے تو ایک لذّت محسوس ہوتی ہے۔ اس ہوسٹل میں میرے بعض اور کلاس فیلوز بھی رہتے تھے اور ہم اس کے سامنے والی بال کھیلا کرتے تھے۔

جامعہ کے ہوسٹل کے میرے زمانے کے سپرنٹنڈنٹ شیخ عبدالخالق سابق مربی ایران، سیّد سمیع اللہ شاہ اور قریشی نورالحق تنویر تھے۔

ہماری ٹک شاپ میرُو نامی ایک دوست کے انتظام میں ربوہ بھر میں مشہور تھی۔ یہاں میر داؤد احمد کی توجہ سے صفائی کا مثالی انتظام تھا۔ میرُو کی دودھ پتّی ہمیشہ یاد رہے گی۔ میر داؤد احمد کو یہ دودھ پتی بے حد پسند تھی چنانچہ وہ ان طلبہ کو جو چائے پینے کے عادی تھے دودھ پتی پینے کا مشورہ دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ چائے سے بہت بہتر ہے۔

میر داؤد احمد طلبہ کو جفاکش بنانے کی نت نئی ترکیبیں سوچتے رہے تھے۔ کبھی قصر خلافت کے باڈی گارڈ، زبیر کو بلا کر نمازِ فجر سے پہلے ہمیں ورزش کرواتے اور کبھی اندھیرے منہ دوڑا کر ربوہ کی سب سے بلند پہاڑی پر لے جاتے۔ چڑھائی اور اترائی کے دوران ہمیں لحظہ بھر کے لیے رکنے کی اجازت نہ تھی۔ بعض اوقات جنوری فروری کے مہینہ میں ہوسٹل کے طلبہ کو یخ بستہ پانی سے نہانے کو کہا جاتا۔ ہر طالب علم کے لیے ضروری تھا کہ وہ

صاف ستھرالباس پہنے، اس کے جوتے پالش کیے ہوئے ہوں اور ناخن تراشے ہوئے ہوں۔

سال میں دو تین بار طلبہ کی پکنک ہوتی تھی۔ یہ پکنک بالعموم یکّو والا، بُرج نہر یا دریائے چناب پر منائی جاتی۔ اس روز جامعہ کے کچن سے دیگیں پک کر پکنک کے مقام پر پہنچ جاتیں۔ بیت بازی اور تیراکی کے مقابلے ہوتے۔ نمازیں باجماعت ہوتیں۔ غرض ہم خرما و ہم ثواب والا معاملہ ہوتا۔

جامعہ میں فٹ بال، والی بال، میرؔ وڈبہ، بیڈمنٹن، رِنگ اور کبڈی کی کھیلیں رائج تھیں۔

سالانہ تقریری مقابلے ہمارے زمانے میں بڑی کشش رکھتے تھے۔ ان مقابلوں میں چوٹی کے علماء جج کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ میں نے کہیں سے ہز ہائی نیس اور ہز ایکسیلنسی کے الفاظ سن رکھے تھے۔ ایک بار میں نے جوشِ خطابت میں مولانا غلام باری سیف کو مخاطب کرتے ہوئے ہز ہائی نیس کہا تو ججز کے چہروں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بس یہی مسکراہٹ میرا انعام تھا کیونکہ میں غالبًا اسی غلطی کی وجہ سے مقابلے میں کوئی پوزیشن نہ لے سکا تھا۔

جامعہ کی ٹیمیں تعلیم الاسلام کالج کے سالانہ بین الکلیاتی مباحثات میں بھی حصہ لیتی تھیں اور کبھی کبھار انعام بھی جیت لاتیں۔

شاہد کلاس میں ہمیں ہفتہ وار ڈائری پیش کرنا ہوتی تھی جس میں پانچوں نمازوں کی باجماعت ادائیگی، تہجد، تلاوت اور رات کے مطالعے کا ذکر ضروری تھا۔

میر داؤد احمد میرے آئیڈیل تھے۔ بہت نفیس الطبع، دھیمی طبیعت کے بارعب انسان تھے۔ وہ عجیب دہرے مزاج کے ولی اللہ تھے۔ ان سے دل میں محبت بھی جوش مارتی تھی لیکن خوف بھی بہت آتا تھا۔ دعا ہے کہ خداتعالیٰ میری اس مادرِ علمی کی عظمت برقرار رکھے اور اس کی گود میں پلنے والے گہر ہمارے دین، ملک اور ملت کا نام روشن کرنے والے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے لئیق طاہر قابلِ رشک حافظے کے مالک ہیں۔ انہیں جامعہ میں اپنی تعلیم کے دور کی اور بہت سی باتیں بھی یاد ہیں لیکن انہیں کسی اور وقت پر مؤخر کرتے ہوئے اب ہم عزیزالرحمٰن خالد کے پاس چلتے ہیں جو تحریک جدید کے ایک قدیمی کارکن، خوشی محمد کے صاحبزادے اور اسی ادارے کے ایک مرحوم کارکن، حبیب الرحمٰن کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ ۱۹۶۹ء میں جامعہ احمدیہ سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد انہیں تحریک جدید کے مختلف شعبوں اور دفتر پرائیویٹ سیکرٹری میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کے اپنے الفاظ میں: اسی دوران ایک روز حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے نمازِ ظہر کے لیے جاتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تیاری کرلوں، مجھے سیرالیون بھجوایا جا رہا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ میں مجلسِ شوریٰ ۱۹۷۰ء کے پہلے اور دوسرے دن کی کارروائی سن سکتا ہوں، تیسرے دن مجھے روانہ ہونا ہے۔ مجھے یاد ہے ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو ربوہ ریلوے سٹیشن پر سینکڑوں لوگوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی اقتدا میں مجھے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ ربوہ سے روانگی بذریعہ چناب ایکسپریس ہوئی جب کہ میں کراچی سے سیرالیون جہاز کے ذریعے پہنچا۔

وہ قریباً چار سال سیرالیون میں رہے اور واپسی پر چھ سال کوئٹہ میں تعینات رہے۔ بعدۂ انہوں نے ایک لمبا عرصہ نائیجیریا اور غانا میں گزارا۔ پھر وہ تنزانیہ جانے سے پہلے چار سال سرگودھا میں مربی ضلع رہے۔ ۱۹۹۵ء میں تنزانیہ سے واپسی کے بعد سے دفتر تحریک جدید انجمن احمدیہ سے وابستہ ہیں۔ وہ جامعہ میں گزرے ہوئے دور کی یادداشتیں بیان کرتے ہوئے بتایا کرتے ہیں کہ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول کی ساتویں کلاس میں تھے کہ ایک روز صبح کی اسمبلی میں قاضی محمد نذیر لائلپوری نے اپنے ایک خصوصی خطاب میں طلبہ کو جامعہ میں داخلے کی تحریک کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیکچر میں ایسی تاثیر پیدا کردی کہ اسے سنتے ہی تیس کے قریب طلبہ نے جامعہ میں جانے کا ارادہ کرلیا۔ عزیز بھی ان میں شامل تھے۔

جب یہ لوگ جامعہ پہنچے تو وہاں مختلف علاقوں سے بعض اور امیدوار بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کا انٹرویو ہوا۔ انٹرویو بورڈ دو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ انٹرویو مکمل ہوتے ہی کامیاب طلبہ کی فہرست آویزاں کردی گئی۔ اس فہرست میں میرا نام بھی شامل تھا چنانچہ میں جامعہ کے درجہ مُمہدّ ی میں داخل ہوگیا۔

وہ وضاحت کرتے ہیں: میری عمر اس وقت قریباً گیارہ سال تھی لیکن جامعہ میں داخلے کا فیصلہ خالصتاً میرا ذاتی تھا۔ آپ حیران ہوں گے میں نے گھر آ کر بھی نہیں بتایا کہ میں نے تعلیم الاسلام ہائی سکول چھوڑ کر جامعہ میں جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ چند روز بعد جب ہمیں وقف فارم پُر کرنے کے لیے موصول ہوا تو اس وقت گھر میں اس بات کا ذکر ضروری ہوگیا۔ میرے والد بہت مخلص احمدی تھے۔ انہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ان کا بیٹا خدمتِ سلسلہ کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتا ہے چنانچہ انہوں نے مجھے اپنے اس فیصلے پر مبارکباد دی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے میری والدہ کو، وہ بھی اس وقت حیات تھیں۔ ان کے لیے بھی یہ خبر بے حد خوش آئند ثابت ہوئی اور وہ اپنی قسمت پر بار بار رشک کرتی تھیں کہ ان کے ایک بیٹے نے کسی بیرونی تحریک یا دباؤ کے بغیر زندگی وقف کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھے بے شمار دعاؤں سے نوازا اور میں سمجھتا ہوں مجھے بعد میں جتنی خدمت کی بھی توفیق ملی اس کے پیچھے میری والدہ کی دعائیں کام کر رہی تھیں۔

عزیز کہتے ہیں: جامعہ کے چہرے تو ہمارے دیکھے بھالے لیکن ماحول بالکل مختلف تھا۔ پہلے ہی دن جب یہ سنا کہ ہر روز اکیس پیریڈ ہوا کریں گے تو میں گھبرا گیا۔ میں اس وقت بچہ تھا اور کھیل کود کا شوقین۔ سوچا کرتا تھا کہ اس مصروفیت میں سے کھیل کا وقت کہاں نکل سکے گا لیکن انتظامیہ کی مہربانی سے ہمیں ایک رِنگ اور فٹ بال مہیا کر دیا گیا۔ ہمارے لیے یہ بھی بہت تھا چنانچہ اگر کوئی پیریڈ خالی ہوتا تو ہم ان کھیلوں سے دل بہلانے لگتے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم نے ہاکی کی ٹیم بھی تیار کرلی۔ راقم اس ٹیم کا سیکرٹری مقرر ہوا اور کیپٹن نواب دین کے صاحبزادے، عبدالباری قیوم جو کچھ عرصہ قبل وفات پا گئے ہیں اس کے کیپٹن۔ یاد رہے باری قیوم کسی وجہ سے جامعہ کی تعلیم تو مکمل نہ کر سکے تاہم انہیں تالیف وتصنیف کا شوق تھا چنانچہ ان کے مضامین جماعتی اخبارات وجرائد کی زینت بنتے رہے اور انہوں نے جماعتی موضوعات پر بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی تالیف کیں مثلاً ''عقیدت کے پھول'' (احمدی شعراء کا نعتیہ مجموعہ) ''قادیان دارالامان'' ''مہدی موعود کے علمی خزانے'' اور ''ربوہ''۔

تمام اساتذہ نہایت پیار اور محنت سے پڑھاتے تھے لہٰذا کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوا اور خدا کے فضل سے دس سال میں جامعہ کی تعلیم مکمل کر لی۔

جامعہ احمدیہ دارالصدر غربی سے کچے کمروں پر مشتمل ایک اور عمارت میں اس جگہ جہاں آج کل دارالضیافت ہے منتقل ہوا اور ہماری کلاسیں یہاں لگنا شروع ہوگئیں۔

بالآخر جامعۃ المبشرین کے ساتھ الحاق کے بعد جامعہ احمدیہ جامعۃ المبشرین کی عمارت میں جو تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ساتھ تھی (جہاں اس وقت جامعہ سینئر ہے) شفٹ ہوگیا۔ اس کے پرنسپل مولانا ابوالعطا جالندھری تھے۔ اس طرح اس عمارت کا نام جامعہ احمدیہ مشہور ہوگیا جس میں پاکستان اور بعض دیگر ممالک کے طلبہ بھی تعلیم کے حصول کے لیے آتے تھے۔

بفضلہٖ تعالیٰ میں ۱۹۶۹ء میں جامعہ سے فارغ التحصیل ہوا۔ تعلیم کے دوران مجھے ورنیکولر فائنل اور میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کی توفیق ملی اور اسی عرصے میں میری شادی بھی ہوگئی جس کی خصوصی اجازت حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے مرحمت فرمائی تھی۔

۱۹۶۹ء میں جامعہ کی تاریخ میں پہلی بار دس شاہدین کامیاب ہوئے۔ ان میں میرے علاوہ عطاء المجیب راشد (امام بیت الفضل لندن)؛ اللہ بخش صادق (وکیل التعلیم تحریک جدید انجمن احمدیہ)؛ محمد اعظم اکسیر مرحوم (نگران متخصصین تحریک جدید انجمن احمدیہ)؛ ڈاکٹر محمد جلال شمس (مربی سلسلہ مقیم لندن)؛ ڈاکٹر عبدالغفار (مربی جرمنی)؛ صدیق احمد منور (مربی جنوبی امریکہ)؛ حمیداللہ (پاکستان)؛ نصیر احمد شاد مرحوم اور منور احمد سٹھیالوی مرحوم شامل تھے۔

یہ تو تھیں جامعہ احمدیہ کے بارے میں عزیز الرحمٰن خالد کی کچھ یادداشتیں۔ اب میں آپ کی ملاقات ڈاکٹر محمد جلال شمس سے کروا رہا ہوں جنہوں نے موصوف کے ساتھ ہی جامعہ احمدیہ سے شاہد کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں: ۱۹۶۱ء میں جب میں تعلیم الاسلام ہائی سکول کی دسویں کلاس میں تھا ایک دن اتفاق سے میرا گزر دفتر تحریک جدید میں سے ہوا۔ میں نے وہاں شلوار قمیص میں ملبوس کچھ لڑکے دیکھے جن کے سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا وہ انسان نہ ہوں بلکہ ننھے منّے فرشتے ہوں۔ میں نے ازراہِ تجسس ان سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں جمع ہیں۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ان کا جامعہ احمدیہ میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے اور ان کا انٹرویو ہونے والا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں بھی یہ انٹرویو دے سکتا ہوں تو انہوں نے مجھے دفتر سے رابطے کا مشورہ دیا۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ میں جامعہ احمدیہ میں داخلے کا فیصلہ تو بہت عرصہ پہلے کر چکا تھا اور والدین سے اس امر کی اجازت بھی لے رکھی تھی لیکن سوچ رہا تھا کہ سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہاں داخلہ لوں گا لیکن اُن بچوں کو دیکھ کر میرا شوق دوچند ہوگیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میرا جامعہ میں ابھی داخل ہو جانا بہتر ہے۔ بس یہی سوچ کر میں وکالتِ تعلیم میں چلا گیا اور دریافت کیا کہ کیا میں بھی اس انٹرویو میں شامل ہو سکتا ہوں۔ انہوں نے میرے سوال کا اثبات میں جواب دیا اور مجھے ایک فارم پُر کرنے

کو دے دیا۔ جب یہ مراحل طے ہوگئے تو انٹرویو کے بعد مجھے جامعہ میں داخل کر لیا گیا۔

موصوف ۱۹۶۹ء میں جامعہ سے فارغ ہوئے جس کے بعد انہیں نظارت اصلاح وارشاد کے تحت مختلف مقامات بشمول اوکاڑہ وحیدرآباد میں بطور مربی سلسلہ خدمت کا موقع ملا۔ انہوں نے نمل، اسلام آباد سے ابتدائی ترکی زبان بھی سیکھی اور پھر استنبول یونیورسٹی سے ترکی زبان وادب میں پی ایچ ڈی کی۔ بعدۂ وہ ایک لمبا عرصہ جرمنی میں مقیم رہے اور آج کل لندن میں ٹرکش ڈیسک کے انچارج ہیں۔ انہوں نے میری درخواست پر جامعہ کے اپنے زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا: اُن دنوں جامعہ احمدیہ کی عمارت نئی نئی تعمیر ہوئی تھی اور پرانی عمارت کو ہوسٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہوسٹل کے کمروں کی اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور خالی جگہوں کو لکڑی کی تختیاں لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ، نو نو طالب علم رہتے تھے۔ اس بوسیّدہ عمارت کی چھتوں سے ہر وقت مٹی اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں گرتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ تو نہ جانے کس طرح مٹی کا قریباً دو اڑھائی کلو وزنی ایک ڈھیلا نیچے آ گرا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی طالب علم زخمی نہیں ہوا۔ پورے ہوسٹل میں بجلی کا صرف ایک ایگزاسٹ فین تھا جو نماز والے کمرہ کی دیوار پر نصب تھا اور باہر سے ہوا کمرے کے اندر پھینکتا تھا۔ اکثر طالب علم دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد اسی کمرے میں آرام کیا کرتے تھے۔

میر داؤد احمد جامعہ کے پرنسپل تھے۔ جلال شمس کہا کرتے ہیں: جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ موصوف نہایت ہی خوش شکل، بارعب اور خوب سیرت انسان تھے۔ ان کی شفقتوں کی ایک لمبی فہرست ہے جن کا تعلق خاکسار کی ذات کے ساتھ ہے۔ اگر مولا کریم نے توفیق دی تو ان کی محبتوں اور عظیم احسانات کا الگ سے تفصیلی ذکر کروں گا۔ فی الحال صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ

یہ ہے ان کا مجھ پہ احساں جسے عمر بھر نہ بھولوں
میری زندگی بنا دی میرے ساتھ ساتھ چل کے

وہ یہ شعر سنانے کے بعد خود ہی کہتے ہیں: سچ پوچھیں تو ''ساتھ ساتھ چل کے'' کے الفاظ میرے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہر مرحلے پر میری رہنمائی کر کے مجھے اس قابل بنا دیا کہ آج ایک واقفِ زندگی کی حیثیت سے خدماتِ دینیہ بجا لا رہا ہوں۔ اس میں ان کی دعاؤں کا بھی بہت حصہ ہے۔

جامعہ سے فراغت کے کچھ عرصہ بعد میں ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ وہ مجھے آٹوگراف عنایت فرمائیں۔ انہوں نے لکھا: ''فی امانِ اللہ! ہر دم، ہر آن، میری دلی دعاؤں کے ساتھ جن کی گہرائیوں کو یا میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔''

میر داؤد احمد اپنے والدِ مرحوم، حضرت میر محمد اسحاق کی تتبّع میں جامعہ میں حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے اندر علم کی گہرائی تھی۔ وہ اپنے مضمون پر خوب حاوی تھے اور طلبہ میں تحقیق کا جذبہ بیدار کرنے کی سعی فرماتے۔ کج بحثی ان کو پسند نہ تھی لیکن کلاس میں طلبہ کو بہت کم ڈانٹتے۔

جامعہ میں ننگے سر جانا منع تھا۔ ایک دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد پہلے دن جامعہ جاتے ہوئے مجھے اپنی ٹوپی نہ ملی۔ تلاش بسیار کے باوجود ناکامی ہوئی تو میں نے گھر میں پڑی ایک پی کیپ پہن لی جو رِواجاً ایک ناپسندیدہ بات تھی۔ دراصل جامعہ کے طلبہ عام طور پر جناح کیپ یا رامپوری کیمپ استعمال کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں جامعہ پہنچا تو میر داؤد احمد سامنے کھڑے تھے۔ طلبہ انہیں سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو انہوں نے میرے سر سے پی کیپ اتار لی اور نصیحت فرمائی کہ ٹوپی جامعہ کے وقار کے مطابق ہونی چاہئے اور کھلنڈروں والی یہ ٹوپی پہن کر جامعہ میں آنا کسی طور پر مناسب نہیں۔

ہمارے زمانے میں جامعہ کے درجہ رابعہ کے طلبہ کو کسی استاد کی نگرانی میں تربیتی سفر پر بھیجا جاتا تھا۔ ہماری کلاس گجرات اور جہلم کے سفر پر گئی تھی۔ اس سفر کے دوران طلبہ کو باری باری تقریر کرنے کا موقع بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کی سیر بھی ہو جاتی اور تقریر کی مشق بھی ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ جامعہ سے فراغت کے بعد جب میں حیدرآباد میں بطور مربی کام کر رہا تھا میں نے میر داؤد احمد سے درخواست کی کہ اس سال طلبہ کو ہمارے پاس بھیجا جائے چنانچہ انہوں نے طلبہ کو وہاں بھجوا دیا۔ میں نے ان کا استقبال کیا اور انہیں حیدرآباد کی مختلف جماعتوں میں ساتھ لے کر گیا۔ طلبہ اور ان کے نگران اس سفر سے بے حد محظوظ ہوئے۔

میر داؤد احمد ایک سخت منتظم لیکن انتہائی رقیقُ القلب تھے۔ مجھے یاد ہے میری رہائش دارالرحمت شرقی میں تھی۔ ہمارے ایک دوست کے والد وفات پا گئے اور ان کا جنازہ ربوہ لایا گیا۔ میں زعیم خدام الاحمدیہ تھا چنانچہ جنازے کے انتظامات میں اس طرح مصروف ہو گیا کہ اس روز جامعہ نہ جا سکا۔ اگلے روز میر داؤد احمد نے مجھے طلب کیا اور پوچھا کہ میں کل جامعہ کیوں نہیں آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں ایک دوست کے والد کے جنازے کے انتظامات کی وجہ سے نہیں آ سکا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا جنازے میں شرکت فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین؟ میرے جواب پر میر داؤد احمد نے دریافت کیا کہ کیا جامعہ کی پڑھائی میرے لیے فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ؟ میرے جواب پر انہوں نے فرمایا: تم نے ایک فرضِ کفایہ کو فرضِ عین پر ترجیح دی لہٰذا تم پر پچاس روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے جو پانچ برابر اقساط میں تمہارے الاؤنس سے منہا ہوگا۔ یہ جرمانہ وصول کر لیا گیا لیکن جب میں چھٹے مہینے اپنا الاؤنس لینے گیا تو اکاؤنٹنٹ نے مجھے دس روپے فالتو ادا کیے۔ اس نے میرے استفسار پر صرف اتنا ہی بتایا کہ یہ رقم پرنسپل صاحب کی طرف منظور کی گئی ہے۔ اس سے اگلے ماہ بھی ایسا ہی ہوا اور پانچ ماہ تک ہر ماہ مجھے دس روپیہ کی رقم الاؤنس سے زائد ملتی رہی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میر داؤد احمد نے ایک طرف تو مجھے جرمانہ کر کے توبہ کی طرف توجہ دلائی اور دوسری طرف وہ ساری رقم مجھے واپس کر کے میرا مالی خسارہ پورا کر دیا۔ یہ تھا ان کی شفقت و تربیت کا ایک انداز جس کی مثال آسانی سے نہیں ملتی۔

ایک دفعہ میری والدہ بیمار ہو گئیں۔ اُن دنوں ہماری رہائش محلّہ دارالعلوم غربی میں تھی۔ ایک دن عصر کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ میر داؤد احمد تشریف لائے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ہارلیکس کا ایک ڈبہ تھا۔ انہوں نے یہ ڈبہ مجھے عنایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنی والدہ صاحبہ کو دے دینا،

اس کے استعمال سے ان شاء اللہ ان کی جسمانی قوت بحال ہونے میں مدد ملے گی۔

میر صاحب کی اہلیہ، بی بی امتہ الباسط اُس تعلق کو خوب جانتی تھیں جو میرے مرحوم استاد اور عاجز کے درمیان تھا۔ اسی بنا پر آپ نے شفقت فرماتے ہوئے اس عاجز کو حضرت مسیح موعود کی پوشاکِ مبارک کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا جس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ چند شعر جو فوری طور پر یاد آ رہے ہیں سناتا ہوں:

سیّدہ میں ہوں گدائے بے نوا
تختِ شاہی پر بٹھایا آپ نے
دے کے مجھ کو ایک ٹکڑا آپ نے
بادشہ مجھ کو بنایا آپ نے
خاک سے مجھ کو اٹھایا آپ نے
عرش پر مجھ کو بٹھایا آپ نے
جو تعلق تھا مجھے استاد سے
خوب ہی اس کو نبھایا آپ نے
میر صاحب یاد مجھ کو آ گئے
آج پھر مجھ کو رُلایا آپ نے

ہمارے باقی اساتذہ میں ملک سیف الرحمٰن ہمیں فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ وہ کوئی مضمون بیان فرماتے ہوئے چاروں ائمہ کی رائے طلبہ کے سامنے رکھتے۔ بڑے نرم خُو اور مہربان استاد تھے۔ مولانا غلام باری سیف ہمیں علمِ کلام پڑھاتے تھے۔ میر محمود احمد عیسائیت اور تقابلی ادیان کا درس دیتے۔ قریشی نورالحق تنویر عربی ادب پڑھاتے۔ ملک مبارک احمد بھی عربی کے استاد تھے۔ ان سے بڑھ کر عربی جاننے والا آج تک کوئی اور میں نے اپنی جماعت میں نہیں دیکھا۔ دیگر اساتذہ میں مولانا محمد احمد جلیل، مولانا محمد احمد ثاقب اور سیّد سمیع اللہ شاہ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام اساتذہ اپنے اپنے شعبہ کے ماہرین تھے جنہوں نے ہمیں زیورِ علم سے آراستہ کیا۔

صبح کے وقت اسمبلی ہوتی اور حاضری لی جاتی۔ جو طالب علم لیٹ آتا اسے جرمانہ ہوتا تھا۔ جرمانے سے بچنے کے لیے طلبہ وقت پر پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اس سے ان کے اندر وقت کی پابندی کا احساس اجاگر ہوتا اور نظم و ضبط کی عادت پڑتی۔

جامعہ میں ہر سال تین زبانوں یعنی اردو، انگریزی اور عربی میں تقریری مقابلے ہوتے۔ کبڈی، والی بال، فٹ بال اور اتھلیٹکس کے مقابلہ جات بھی ہوتے۔ جامعہ کے طلبہ کو پانچ بلاکس میں تقسیم کیا گیا تھا اور علمی اور ورزشی مقابلہ جات ان ہی بلاکس کے مابین ہوا کرتے تھے۔ ان مقابلوں میں ایک دلچسپ مقابلہ ہرڈل ریس کا ہوتا تھا۔ یہ مقابلہ اتنا دلچسپ ہوتا کہ اہالیانِ ربوہ کی کثیر تعداد اسے دیکھنے کے لیے آتی۔ اس کے علاوہ سائیکل ریس اور پیدل سفر کے مقابلہ جات بھی ہوا کرتے تھے۔ سائیکل ریس قریباً پچاس میل کی ہوتی تھی اور

پیدل سفر ایک سو بیس یا ایک سو تیس میل کا ہوتا تھا۔ ہر طالب علم کے لیے پیدل سفر میں ایک بار شامل ہونا لازم تھا۔

میں نے بھی ایک پیدل سفر میں حصہ لیا۔ پیدل چلنا صحت کے لیے جس قدر ضروری ہے اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ مجھے اس پریکٹس نے زندگی بھر بہت فائدہ پہنچایا۔ یوں ہی مجھے یاد آ گیا ہے کہ ایک دفعہ گوجرانوالہ سے لاہور کی طرف جاتے ہوئے ہماری بس کو حادثہ پیش آ گیا۔ سب لوگ نیچے اتر گئے۔ اس روز بسوں میں بے حد رش تھا اور کوئی بس راستے کے مسافروں کو قبول نہیں کر رہی تھی۔ قریب ترین قصبہ جہاں سے کوئی سواری مل سکتی تھی جائے حادثہ سے قریباً چار میل دور تھا۔ ان مسافروں میں سے جو شخص سب سے پہلے اس قصبے کی طرف پیدل روانہ ہوا وہ میں تھا۔ یہ سب ہمارے جامعہ کے پیدل سفر کی برکت تھی۔ بعد میں اور بھی بہت سے مسافر میرے پیچھے چل پڑے۔

جامعہ میں تعلیم کے دوران ایک دفعہ ہائیکنگ کے لیے پاکستان کے شمالی علاقوں کا سفر بھی کیا۔ میں نے جس قافلے کے ساتھ سفر کیا وہ چترال اور کافرستان گیا تھا۔ اس حسین سفر کی یادیں آج بھی دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔

جلال شمس کہتے ہیں: الغرض جامعہ ہماری تربیت کی جگہ تھی جہاں ہم نے علمِ دین کے علاوہ زندگی گزارنے کے اسلوب بھی سیکھے۔ میں نے ایک نظم جامعہ کو الوداع کہتے وقت لکھی تھی جو ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں:

دل حزیں ہے آج تجھ کو چھوڑ کر جاتے ہیں ہم
تجھ سے وہ رشتہ پرانا توڑ کر جاتے ہیں ہم
یاد ہے اک ایک لمحہ جو گزارا تھا یہاں
کیا ہی اچھا وقت تھا گزرا جو تیرے درمیاں
بے ہنر، ناسمجھ تھا جب کہ یہاں آیا تھا میں
ہاں مگر اخلاص سے بھرپُور دل لایا تھا میں
علم کی دولت سے دامن تو نے میرا بھر دیا
واقفِ اسرارِ عالم تو نے مجھ کو کر دیا
ہیں سبھی تعریف کے قابل اساتذِ کرام
جن کے ہاتھوں نے پلائے اُلفتِ احمد کے جام
رفعتیں جن کی ثریا سے فزوں تر ہو گئیں
ہر قدم پر جن کی باتیں میری رہبر ہو گئیں
کیا کریں مجبور ہیں اب چھوڑ کر جاتے ہیں ہم
تجھ سے وہ رشتہ پرانا توڑ کر جاتے ہیں ہم
مجھ سے بڑھ کر آئیں گے طلّاب، بے شک آئیں گے
علم سے بھر کر وہ دامن اپنا واپس جائیں گے

شمسِ بے مایہ خدا سے کرتا ہے یہ التجا
اپنی رحمت سے تجھے آباد رکھے وہ سدا

جلال شمس کی باتیں آپ نے سنیں۔ آپ کے پاس وقت ہو تو لگے ہاتھوں جامعہ کے ایک اور سابق طالب علم، منصور احمد عمر سے بھی ملتے جایئے جو ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ وہ جامعہ میں اپنے داخلے کا پس منظر بتاتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے ۱۹۶۰ء میں میٹرک کا امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول سے پاس کیا تھا جس کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور تین سال تک وہاں پڑھتا رہا۔ اسی دوران میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں حضرت مسیح موعود کی کتب کا مطالعہ کروں چنانچہ میں نے خلافت لائبریری جا کر یہ کتب اپنے نام جاری کروانا شروع کر دیں۔ چھوٹی کتب تو میں دن میں دو دو اور بعض دفعہ تین تین بھی پڑھ لیتا تھا لیکن ضخیم کتب کے مطالعے میں کچھ وقت لگا۔ میں پہلی رِیڈنگ میں ان کتب کے مفاہیم کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تاہم میں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ ایک دفعہ یہ کتابیں میری نظر سے گزر جائیں تو ان کا گہری نظر سے مطالعہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ الغرض اللہ کے فضل سے میں نے یہ کتابیں ایک مختصر مدت میں پڑھ ڈالیں۔ اس مطالعے کے بعد مجھے دن رات یہ خیال رہنے لگا کہ انسان کی زندگی مختصر ہے لہٰذا اسے خدمتِ دین میں صرف کرنا ہی اس کا بہترین استعمال ہے اور اس کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں جامعہ میں داخل ہو جاؤں اور باقاعدہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میدانِ عمل میں نکل جاؤں۔ اس وقت میرے بڑے بھائی رشید احمد طیّب زندگی وقف کرنے کے بعد وقفِ جدید کے سب سے پہلے معلّم کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے چنانچہ میں نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔ انہیں میری اس تجویز سے کوئی اختلاف تو نہ تھا تاہم ان کی رائے تھی کہ مجھے ڈاکٹر بننا چاہیے جس کے بعد میں زندگی وقف کر کے جماعت کی خدمت کر سکتا ہوں۔ اُن کی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہ پا کر میں نے اپنے بعض بزرگوں سے بات کی جن میں مولانا ابوالعطا جالندھری (جو بعد میں میرے سسر بنے) بھی شامل تھے۔ انہوں نے میری بات پوری طرح سنی اور پھر کہا کہ آپ کو اپنے والدین کے فیصلے سے بغاوت نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے بعد میں میر داؤد احمد کے پاس گیا اور ان سے مشورے کا طلبگار ہوا۔ انہوں نے میرے والد صاحب کے نام ایک خط لکھ کر میرے حوالے کیا جس میں کہا گیا تھا کہ بعض دفعہ بچوں کو ان کی اپنی مرضی کے مطابق تعلیم نہ دلانے سے ان کا مستقبل مخدوش ہو جاتا ہے لہٰذا اگر میں جامعہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں تو وہ مجھے نہ روکیں۔ میں نے وہ خط (جو ابھی تک میرے پاس موجود ہے) والد صاحب کو نہیں دیا اور یہ سوچنے لگا کہ میں ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں، کیوں نہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور استخارہ کر کے رہنمائی طلب کروں۔ میں نے نیت کی کہ میں چالیس دن تک استخارہ کروں گا۔ خدا کی شان دیکھیے، ابھی دس ہی دن گزرے تھے کہ ایک رات خواب میں لئیق طاہر جو سکول میں میرے کلاس فیلو تھے اور آج کل انگلستان میں بطور مربی سلسلہ تعینات ہیں میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کالج کی بیتُ الذّکر کا قبلہ درست نہیں ہے۔ اس اشارے سے میرا ذہن بالکل صاف ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ خدمتِ دین کے لیے میں جو

راستہ اپنانے کا خواہشمند ہوں وہ خدا کے فضل سے درست ہے۔ جب میں نے اپنے والدین کو یہ بات بتائی تو انہوں نے میرے فیصلے کی مخالفت ترک کردی چنانچہ میں جامعہ میں داخل ہوگیا۔

موصوف نے ۱۹۷۰ء میں شاہد کا امتحان پاس کیا جس کے بعد وہ تین سال تک نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں جرمن زبان پڑھتے رہے۔ اس کے بعد انہیں وقفے وقفے سے جرمنی میں خدمتِ دین کا موقع ملا اور وہ کچھ عرصہ جرمنی کے نیشنل امیر اور مربی انچارج بھی رہے۔ وہ ربوہ میں بھی مختلف دفاتر میں فرائض انجام دیتے رہے جن میں سے دفتر پرائیویٹ سیکرٹری اور جامعہ احمدیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جب اُنہیں جامعہ میں گزرے ہوئے وقت کی یاد تازہ کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ بعض دلچسپ واقعات سناتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب جامعہ احمدیہ میں داخلے کا وقت آیا تو میر داؤد احمد رخصت پر تھے اور ان کی جگہ ملک سیف الرحمٰن قائمقام پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انٹرویو بورڈ کو جب علم ہوا کہ داخلے کا امیدوار حضرت مسیح موعود کی تمام کتب کا مطالعہ کر چکا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے جامعہ کی ابتدائی دو کلاسز کی رعایت دیتے ہوئے انہیں تیسرے سال میں داخل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب جامعہ کھلا تو وہ انٹرویو بورڈ کے فیصلے کے مطابق تیسری جماعت میں جا بیٹھے۔ اسی اثنا میں میر داؤد احمد رخصت سے واپس آگئے۔ انہوں نے منصور عمر کو اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ انٹرویو بورڈ کا انہیں دو سال کی رعایت دینے کا فیصلہ کسی لحاظ سے قابلِ اعتراض معلوم نہیں ہوتا البتہ اس پر عملدرآمد سے ان میں عربی کی کمزوری رہ جائے گی لہٰذا اگر وہ ایک سال کی رعایت قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ منصور عمر بتاتے ہیں کہ میں میر داؤد احمد کی اس رائے سے کیسے اختلاف کرسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے جامعہ کی تعلیم کا آغاز تیسری کلاس کی بجائے دوسری کلاس سے کیا۔ میر داؤد احمد کا یہ فیصلہ میرے حق میں بہت بہتر ثابت ہوا اور آج میں محسوس کرتا ہوں کہ بصورتِ دیگر میرے اندر رہ جانے والی کمی شاید کبھی پوری نہ ہوسکتی۔

منصور عمر کو میر داؤد احمد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے چنانچہ انہیں موصوف کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: میر داؤد احمد بہت سخت ایڈمنسٹریٹر تھے اور جانتے تھے کہ جامعہ کا نظم و نسق اس ادارے اور اس کے طلبہ کے لیے کس قدر اہم ہے۔ ایک دفعہ ربوہ میں شدید بارش ہوئی۔ سڑکوں پر اس قدر پانی کھڑا تھا کہ اس میں سے گزرنا مشکل ہوگیا چنانچہ بہت سے طلبہ صبح کی اسمبلی میں نہ پہنچ سکے۔ جب آہستہ آہستہ موسم کھلا تو طلبہ جامعہ پہنچنے لگے۔ آپ نے انہیں ہال میں اکٹھا کیا اور کہا کہ جو طالب علم صبح کی اسمبلی میں شامل نہ ہو پائے تھے کھڑے ہو جائیں۔ معدودے چند طلبہ کے علاوہ سب کو کھڑا ہونا پڑا۔ میر داؤد احمد نے ان میں سے ہر طالب علم سے باری باری پوچھا کہ وہ کیوں لیٹ آئے تھے۔ لڑکے حیران تھے کہ کیا پرنسپل رات کی بارش سے لاعلم ہیں۔ جب طلبہ سے پوچھ گچھ تمام ہوگئی تو میر داؤد احمد نے اعلان کیا کہ آج کی تاخیر تو نظر انداز کی جاتی ہے لیکن آئندہ یہ تاخیر صرف اسی صورت میں برداشت کی جائے گی کہ خدانخواستہ آپ کے اپنے گھر کی چھت گر جائے یا آپ کا پورا گھر پانی سے بھر جائے۔ ان کا یہ ارشاد اس بات کا غماز تھا کہ وہ طلبہ کو کسی صورت جامعہ سے غیر حاضر

نہیں دیکھنا چاہتے۔

ہمارے اس دوست کو یہ واقعہ بھی یاد ہے کہ ایک بار کوئی استاد وقت پر کلاس میں نہ پہنچ پائے تو طلبہ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ شور میر داؤد احمد کے کانوں تک جا پہنچا چنانچہ وہ غصے کے ساتھ کلاس میں داخل ہوئے اور ضروری تحقیق کے بعد چار یا پانچ طلبہ کی نشاندہی کی جو پڑھائی میں کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کے بھی عادی تھے۔ انہوں نے ان طالب علموں کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، بید کے ساتھ ان کی خوب دُھنائی کی اور پھر انہیں بستے اٹھا کر جامعہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم صادر کیا۔ اس وقت تو وہ لڑکے چلے گئے لیکن جلد ہی انہیں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوگیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اسی کیفیت میں گھر چلے گئے تو والدین کی ناراضگی کا بھی مُورد بنیں گے چنانچہ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ کچھ پھل لے کر ربوہ کے ایک معروف بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کے لیے کہا جائے۔ انہوں نے اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ مالٹے خریدے اور اس بزرگ کے پاس حاضر ہوگئے۔ جب بزرگ نے یہ واقعہ سنا تو انہوں نے مالٹے ان کے منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ جامعہ میں شرارتیں کرتے ہو اور مجھے رشوت دینے آئے ہو، نکل جاؤ میرے گھر سے۔ وہ کئی روز تک پریشان پھرتے رہے اور ادھر ادھر سے پرنسپل کو سفارشیں بھی کرواتے رہے مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ بالآخر بہت منّت سماجت اور یقین دہانیوں کے بعد انہیں کلاسز میں بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی۔ بطور امرِ واقعہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے سوائے ایک طالب علم کے جو بعد میں مربی بن گئے اور آج کل خدمتِ سلسلہ میں مصروف ہیں باقی طلبہ کی جامعہ کی تعلیم مختلف وجوہ کی بنا پر ادھوری ہی رہ گئی۔

منصور عمر کو اس حوالے سے اور بھی کئی باتیں یاد ہیں اور وہ مسکراتے ہوئے بتاتے ہیں: ایک بار طلبہ کو شرارت سُوجھی اور انہوں نے رات کے وقت گول بازار اور بعض دیگر مقامات سے دکانوں کے کئی چھوٹے بڑے بورڈ اتار لئے اور جامعہ کے اندر پر جابجا آویزاں کر دیئے۔ واپڈا کا بورڈ جس پر جلی حروف میں ''خطرہ ۴۴۰ وولٹ'' لکھا تھا پرنسپل کے کمرے پر لگا دیا اور ہاضمون والا بورڈ ٹائلٹ پر آویزاں کر دیا۔ غرض جامعہ میں کوئی ایسی جگہ نہ بچی جہاں یہ بورڈ نصب ہوں۔ صبح اسمبلی سے پہلے طلبہ نے یہ بورڈ دیکھے تو بڑے محظوظ ہوئے اگرچہ انہیں یہ علم نہ تھا کہ یہ شرارت کس کی ہے۔ اسمبلی ہوئی تو میر داؤد احمد بڑی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ کھڑے رہے اور اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ دفتر جاتے ہی انہوں نے نوٹس بورڈ پر یہ اعلان لگوا دیا کہ جن لڑکوں نے یہ کام کیا ہے وہ فوراً ان کے ساتھ پیش ہو جائیں۔ طلبہ اگرچہ شرارتی تو ضرور تھے لیکن اپنی تربیت کے زیرِ اثر سچ بولنے والے کے عادی تھے۔ وہ فوراً پرنسپل آفس میں پہنچے اور اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کیا مگر میر داؤد احمد نے انہیں جامعہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں نے یہ سارا واقعہ لکھ کر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں بھجوا دیا ہے، اگر حضور نے آپ کو معاف کر دیا تو آپ کو جامعہ کی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دے دی جائے گی ورنہ میں دوبارہ آپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ حضور کو یہ رپورٹ پہنچی

تو آپ نے وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان طلبہ کو معاف کر دیا جس کے بعد انہیں کلاسز میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

میر داؤد احمد کو خلافت سے عشق کی حد تک وابستگی تھی اور وہ اس یقین پر قائم تھے کہ اپنی پریشانیوں کے ازالے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے خلیفۂ وقت ہی کو دعا کے لیے کہنا چاہئے۔ منصور عمر بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں ربوہ کے ایک بزرگ کا بہت چرچا تھا اور لوگ ان کے پاس بکثرت دعا کے لیے جاتے رہتے تھے۔ جامعہ کے طلبہ بھی اس سے مستثنٰی نہ تھے۔ جب موصوف کو اطلاع ملی تو انہوں نے ان طلبہ کو سمجھایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے خلیفۂ وقت سے زیادہ کسی اور شخص کی دعائیں قبول کرنا ہوتیں تو وہ اسے ہی خلیفہ مقرر کر دیتا لہٰذا آپ لوگ کسی اور کے پیچھے جوتیاں چٹخانے کی نسبت حضور کو دعا کے لیے خط لکھنے کو ترجیح دیا کریں۔

انہیں اعتماد تھا کہ جامعہ کے طلبہ ہر قسم کی صورتِ حال سے مناسب طور پر عہدہ برا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جماعتی انتظامیہ نے ان سے استفسار کیا کہ کیا جامعہ کے طلبہ فلاں فلاں ڈیوٹی دے سکیں گے۔ اس پر انہوں نے بڑے جوش کے ساتھ کہا کہ ہم نے جامعہ میں چُوزے تو نہیں پالے ہوئے، ان کے سپرد جو کام بھی کیا جائے گا ان شاء اللہ کریں گے۔

منصور عمر کو اب تک یاد ہے کہ میر داؤد احمد ہر کلاس کی عربی، انگریزی اور اردو کی کاپیاں اپنے دفتر میں منگوا کر چیک کیا کرتے تھے۔ وہ صرف اغلاط کی نشاندہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ بعض دفعہ تفصیلی ہدایات دیتے۔ ان کی طبیعت میں اس قدر عاجزی تھی کہ وہ بعض اوقات پھٹی ہوئی کاپیوں کی اپنے ہاتھ سے مرمت بھی کر دیا کرتے تھے۔

اس دور کی اور بھی بہت سی یادیں ہمارے اس دوست کے پاس موجود ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو خود ان سے ملنا پڑے گا۔

اب تک آپ نے جامعہ احمدیہ ربوہ کا ذکر ان لوگوں کی زبانی سنا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی زندگیاں وقف کرنے اور اس عظیم الشان ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت ہوئی۔ صفحاتِ گزشتہ کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مختلف ادوار میں یہاں کے طلبہ کی زندگی کیسی تھی، انہیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں کس سخت تربیت میں گزرنے کے بعد ہی مربی کا درجہ حاصل ہوتا تھا لیکن کیا آپ کو یہ پتا ہے کہ جامعہ نے کن سربراہان کی شبانہ روز محنت سے یہ مقام حاصل کیا کہ اس کے فارغ التحصیل دنیا کے گوشے گوشے میں اشاعتِ احمدیت کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کر سکیں؟

قیامِ پاکستان کے بعد جماعت کے جن علماء کو اس ادارے کی سربراہی کا فخر حاصل ہوا ان میں مولانا ابوالعطا جالندھری اور قاضی محمد نذیر لائکپوری کے نام نامی سب سے نمایاں ہیں تاہم وہ بزرگ جنہیں غالباً سب سے طویل عرصے تک اس ادارے کی پرنسپل شپ کا اعزاز حاصل رہا میر داؤد احمد ہیں۔ موصوف کم و بیش سولہ سال تک اس عہدے پر متمکّن رہے۔ انہوں نے اس ادارے کو اس خوبی اور عمدگی سے چلایا کہ انہیں اب

تک یاد کیا جاتا ہے تاہم میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی رحمدل اور خدا ترس شخص تھے جو معاشرے کے مظلوم اور مقہور طبقے کی مدد کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے کچھ احباب نے الفضل میں ان پر مضامین لکھے اور بعض دوستوں نے انہیں بزبانِ شعر خراجِ عقیدت پیش کیا تاہم اس حوالے سے سب سے سنجیدہ کوشش جمعیۃ العلمیۃ بالجامعۃ الاحمدیۃ کی طرف سے ہوئی جس نے ''سیرتِ داؤد'' کے نام ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ یہ کتاب غالباً موصوف کی وفات کے فوراً بعد شائع ہوئی تھی لیکن ان کی صاحبزادی، امتہ الواسع ندرت نے حال ہی میں اسے کچھ اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں موصوف کی مختلف دفتری حیثیتوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک حیثیت پرنسپل جامعہ احمدیہ کی بھی ہے۔ ذیل میں کتاب کے اسی باب کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے یکم جولائی ۱۹۵۷ء کو میر داؤد احمد کو جامعہ احمدیہ کا پرنسپل مقرر فرمایا۔ جب آپ کا تقرر ہوا تو اس وقت آپ اپنی عمر اور تجربے کے لحاظ سے بالکل نو آموز تھے اور اس عظیم درسگاہ کی ذمہ داریاں بڑی اہم، نازک اور گرانبار تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے آپ کا تقرر کرتے ہوئے فرمایا: ''سرِ دست سیّد داؤد احمد صاحب کو جامعہ احمدیہ کا پرنسپل مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے کام سنبھال لیا تو انہیں، ورنہ کسی اور مناسب آدمی کو پرنسپل لگایا جا سکتا ہے۔'' خدا تعالیٰ نے جس سے کام لینا ہوا سے اس کی توفیق اور طاقت بھی عطا فرما دیتا ہے۔ میر داؤد احمد بھی جواں عمر اور ناتجربہ کار تھے اور ایک خاص مشکل یہ بھی تھی کہ جامعہ کے اکثر اساتذہ آپ کے استاد رہ چکے تھے اور اب انہیں اپنے ایک شاگرد کے تحت کام کرنا پڑ رہا تھا لیکن ان ساری مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے بے پناہ اخلاص، ذہانت، قدر شناسی، شبانہ روز محنت اور حسنِ کارکردگی کے باعث اس منصب کا اپنے آپ کو پورا اہل ثابت کیا اور اس درسگاہ کے لیے نہایت عمدہ اور قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ وہ انتظام اور نگرانی کے لحاظ سے بھی بڑے کامیاب رہے اور اساتذہ و طلبہ کی محبت کا مرکز بنے رہے جس کا ایک حزن آگیں نظارہ آپ کی وفات و تدفین کے وقت دیکھا گیا جب کہ اساتذہ و طلبہ ان کی تدفین اور زیرِ خاک مستور ہونے کے بعد بھی باچشمِ اشکبار اور دلِ خونبانہ بار وہاں سے ہٹنے کو تیار نظر نہ آتے تھے۔

مولانا محمد احمد جلیل کے الفاظ میں: ''انہوں نے پندرہ، سولہ سال نہایت کامیابی سے جامعہ کے استاد اور پرنسپل کے فرائض سرانجام دیئے۔ اپنی شبانہ روز محنت اور کوشش سے ایک علمی درسگاہ کو ہر جہت سے بامِ عروج پر بفضلِ اللہ پہنچا کر اسے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ جامعہ احمدیہ کی نفیس بلڈنگ، اس کی پھلواڑیاں اور روشیں، لائبریری، دفتر، سٹاف روم، اس کا وسیع ہوسٹل اور عالیشان بیت الذکر آپ کی مساعی کی مرہونِ منت ہیں۔ جامعہ کا نصاب اور سلیبس، اس کا طرزِ تدریس، امتحانات کا طریق اور اس کا معیار و نتائج، پڑھائی کے علاوہ طلبہ کو مختلف زبانوں میں تقاریر کی مشق اور مقابلوں کی ترویج اور اس کے ساتھ ساتھ خدام الاحمدیہ اور جماعت کے عملی کاموں میں حصہ لینے کا شوق، ورزش اور جفاکشی کی عادت، صفائی اور پابندیٔ وقت کا احساس،

غرضیکہ ہر شعبے میں میر صاحب نے ایک انقلاب پیدا کیا اور جامعہ کے نظام میں کئی ایسی اصلاحات کیں جو لمبے عرصے تک آئندہ آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ آپ کے پندرہ سولہ سالہ زمانۂ قیادت میں جامعہ کے سٹاف میں کبھی کوئی خلفشار یا پارٹی بازی کی رو نہیں چلی۔ سٹاف کے اکثر ممبر باوجودیکہ آپ کے اساتذہ رہ چکے تھے دل سے آپ کا احترام کرتے اور بشاشت کے ساتھ آپ سے تعاون کرتے تھے۔ میر صاحب اپنے والدِ ماجد کی طرح بڑے زیرک اور سخت منتظم تھے خصوصاً طلبہ کو قواعد و ضوابط کی پابندیوں میں کس کر رکھتے لیکن آپ کی سختی میں تلخی نہیں تھی۔''

محمود احمد بنگالی مرحوم کی رائے میں ''بلحاظ استاد ہونے کے آپ صحیح معنوں میں پڑھانے کا حق ادا کرتے تھے۔ باوجود پرنسپل ہونے کے آپ ٹھیک وقت کی پابندی کے ساتھ کلاس لیتے اور وقت ختم ہوتے ہی چھوڑ دیتے تاکہ دوسرے استاد کو زحمت نہ ہو۔ روزانہ سبق کی تیاری کرکے آتے۔ بغیر تیاری کے کبھی نہیں پڑھاتے تھے حالانکہ کتنے سال سے حدیث کا مضمون پڑھا رہے تھے۔ ایک دفعہ تھوڑا پڑھا کر چلے۔ کسی طالب علم نے وجہ دریافت کی۔ فرمانے لگے: آج اتنی ہی تیاری تھی۔''

جامعہ میں بحیثیت پرنسپل ان کی باقیاتُ الصّالحات میں سے وہ بنیادی اور انتظامی کام بھی ہیں جو اس عظیم درسگاہ کی بہتری اور ترقی کے لیے انہوں نے کئے۔ ان میں سب سے پہلا کام تو جامعہ احمدیہ کی خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت کی تعمیر ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب میر صاحب جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے تو آپ نے اس کی عمارت کو غیر مکتفی دیکھ کر وسیع تر عمارت بنوانے کا پروگرام بنایا اور خلیفۃ المسیح الثّانی کی منظوری سے آخر ۱۹۵۹ء میں نئی عمارت کی تعمیر کے لیے ابتدائی کام شروع کر دیا۔ نئی عمارت کی بنیاد ۲۹ مارچ ۱۹۶۰ء کو رکھی گئی۔

تعمیر عمارت کا کام قریباً دو سال کی محنت شاقہ اور دو لاکھ روپیہ کے مصرف سے مکمل ہوا۔ اس سارے عرصے میں میر داؤد احمد نے پورے انہماک اور گہری توجہ سے دن رات اس کی نگرانی کی۔ جب عمارت تیار ہو چکی تو ۳ دسمبر ۱۹۶۱ء کی سہ پہر کو اس کے افتتاح کی خوش کن تقریب منعقد ہوئی۔ حضرت مرزا بشیر احمد نے اللہ تعالیٰ کے حضور خاص دعاؤں کے ساتھ اس کا افتتاح فرمایا۔ آپ نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس وقت مجھے قریباً نصف صدی پہلے کا واقعہ یاد آ رہا ہے جب کہ میں مدرسہ احمدیہ کا مینیجر ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ایک روز حاجی غلام احمد صاحب کریام ضلع جالندھر اور میاں امام الدین صاحب مولوی ابوالعطا صاحب کو مدرسہ میں داخل کروانے کے لیے لائے۔ اس وقت میں مدرسہ کے (کچے۔ ناقل) کمروں میں ایک کمرہ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کچے کمرے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہر زمانے کا قشر الگ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے وہ کچے کمرے ہی قشر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن آج کل کے حالات کے لحاظ سے ضروری ہے کہ اچھی عمارت بھی ہو نیز ایک اعلیٰ درجہ کی لائبریری کا بھی اس میں انتظام ہو اور اسی طرح تمام دوسرا سامان اور ضرورت کی چیزیں بھی مہیا کی جائیں۔'' پھر فرمایا: ''پہلے جب اساتذہ باہر سفر پر جاتے تھے تو ان کے ساتھ بعض شاگرد بھیج دیئے جاتے تھے اور وہ سفر میں انہیں درس دیتے رہتے تھے۔ یہ طریق بہت مفید تھا۔ اس طرح اساتذہ کے سفر پر

جانے سے طلبہ کی تعلیم میں حرج واقع نہیں ہوتا تھا بلکہ...... وہ اساتذہ کے ساتھ ہر وقت رہنے کی وجہ سے وہ کچھ سیکھ لیتے تھے جو مدرسہ کے محدود اوقات میں ان کے لیے سیکھنا ممکن نہ ہوتا تھا۔''

آپ کے اس بیان کے مدنظر میر صاحب نے اُس سفر کا اجرا فرمایا جس میں درجہ رابعہ کے طلبہ موسم بہار کی چھٹیوں میں کلام کے اساتذہ کے ساتھ مختلف جماعتوں کا دورہ کرتے اور وہاں جلسے منعقد کر کے تقاریر کی مشق کرتے ہیں اور صبح کی نماز کے بعد قرآن، حدیث اور ملفوظات حضرت مسیح موعود کا درس دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے کلام کے استاد کو فرمایا کہ جب جماعتیں آپ کو بلائیں یا نظارت اصلاح و ارشاد کسی جماعت میں جلسے کے لیے بھجوائے تو آپ جامعہ کی اوپر کی جماعت کا کوئی طالب علم اپنے ساتھ ضرور لے جایا کریں۔

جامعہ احمدیہ کی نئی عمارت میں منتقلی کے بعد اس کی پرانی عمارت طلبہ کے ہوسٹل کے طور پر استعمال ہوتی رہی لیکن جلد ہی میر داؤد احمد نے اس کی جگہ جدید طرز کے ہوسٹل کی نئی عمارت کی تعمیر شروع کروائی اور طلبہ کے لیے نہایت عمدہ اور آرام دہ کمرے بنوائے۔ ابھی یہ عمارت پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی تھی کہ میر صاحب اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

نو تعمیر شدہ عمارتوں میں اہم ترین اور مقدم ترین عمارت جامعہ کی ''بیتِ حسن اقبال'' ہے جو میر صاحب کی خاص توجہ، کوشش اور محنت سے بنی۔ اس بیت کی تعمیر کے اخراجات بابو محمد اقبال خان آف گوجرانوالہ نے ادا کئے تھے۔ بیت کی تعمیر گو میر صاحب کی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی لیکن اس کی تکمیل آپ کی زندگی میں نہ ہو سکی۔

میر داؤد احمد کے جامعہ احمدیہ میں بطور پرنسپل مقرر ہونے سے قبل ''حافظ کلاس'' بیتِ مبارک میں ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جامعہ احمدیہ کی نئی عمارت تعمیر ہونے پر اس کلاس کو بھی جامعہ کے احاطہ میں ہی جگہ دینے کا فیصلہ کیا اور سٹاف کوارٹرز کے ساتھ حافظ کلاس کے لیے کلاس رُومز اور طلبہ کے لیے رہائشی کوارٹرز بنوائے۔

طلبہ کا ذوقِ جستجو بڑھانے اور ان میں تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا کرنے کے لیے انہوں نے ''مجلۃ الجامعہ'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری فرمایا۔ یہ رسالہ قادیان سے شائع ہونے والے رسالہ ''جامعہ احمدیہ'' کا ایک رنگ میں دوبارہ احیا تھا۔ یہ خبر سن کر مولانا ابوالعطا جالندھری نے پیشکش کی کہ ''اگر البشریٰ پسند ہو تو جامعہ احمدیہ اسے بخوبی اپنا سکتا ہے۔ آخر جامعہ ہمارا ہے اور ہم جامعہ کے''۔

یاد رہے کہ البشریٰ نامی رسالہ مولانا کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے سامنے جب یہ تجویز رکھی گئی تو حضور نے اسے پسند فرمایا۔ اس طرح وسط جنوری ۱۹۵۹ء سے رسالہ ''البشریٰ'' جامعہ احمدیہ کی طرف منتقل ہو کر میر صاحب کی نگرانی میں آ گیا۔ ملک مبارک احمد اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ مئی ۱۹۵۹ء میں ''البشریٰ'' کا پہلا رسالہ نئے انتظام کے تحت منصۂ شہود پر آیا۔ حضرت مرزا بشیر احمد نے اس کے پہلے پرچہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''کچھ عرصے سے ایک ماہوار رسالہ ربوہ سے عربی زبان میں ''البشریٰ'' کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ اب یہ رسالہ جامعہ احمدیہ ربوہ کے انتظام میں آ گیا ہے چنانچہ اس کا پہلا پرچہ میری نظر سے گزرا۔ خدا کے فضل سے یہ پرچہ ہر جہت سے بہت خوب ہے بلکہ کاغذ تو شاید ضرورت سے زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ رسالہ باقاعدہ اور خوبی کے

ساتھ شائع ہوتا رہا تو ان شاء اللہ...... بہت مفید اور بابرکت ہوگا...... جامعہ احمدیہ کے طلبہ بلکہ دوسری احمدی پبلک میں عربی نویسی کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لیے۔

پس احبابِ جماعت کو اس رسالہ کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور زیادہ سے زیادہ توجہ سے کام لینا چاہئے اور اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ عربی زبان تمام زبانوں کی ماں ہے۔ اس لحاظ سے یہ گویا نہ صرف قرآنی زبان بلکہ تمام زبانوں کی خدمت ہے۔''

میر داؤد احمد نے پچیس اپریل ۱۹۷۳ء کو ربوہ میں وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ وہ جامعہ کے طلبہ سے بے نظیر شفقت ومحبت رکھتے تھے۔ مرتبِ ''سیرتِ داؤد'' کے الفاظ میں:

''طلبائے جامعہ کو آپ سے محبت تھی کس قدر، اس کا ایک نظارہ ہم نے اس روز دیکھا جس روز محترم میر صاحب کی تدفین عمل میں آئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث جب دعا کرانے کے بعد احاطۂ خاص سے باہر تشریف لے گئے تو طلبہ کے صبر کا جیسے بند ٹوٹ پڑا، صبر کا دامن چھوٹ گیا...... بعض اساتذہ نے جب انہیں صبر کی تلقین کی تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے، جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں: کیا کبھی کسی باپ نے اپنے بچوں سے اتنی محبت کی تھی کہ ہم اس کی امید رکھیں۔ وہ تو ہماری بھلائی اور خیر خواہی کے لیے جئے اور ہماری بھلائی اور خیر خواہی کی تمنا لئے اپنے پیدا کرنے والے کے بلاوا پر اس جہان سے رخصت ہوگئے۔''

سیّد ادریس احمد عاجز عظیم آبادی نے ان کی وفات پر گویا ان کی بہت سی خوبیوں کو ان اشعار میں سمو دیا:

دست و بازوئے خلافت، خادمِ دینِ متین
صاف باطن، خوش طبع، عالی نسب و الاتبار
نظم و نسقِ جلسہ سالانہ کے تھے وہ امین
میزبانِ مہمانانِ مسیحِ نامدار
جذبہ ہمدردیٔ خلقِ خدا سے متصف
تھے یتیموں اور بیواؤں کے وہ کہف و حصار
دستگیرِ بے کساں، ماوائے درویش و ضعیف
غمزدوں کے دکھ میں تھے ہر آں شریک و غمگسار

یہ تو تھا میر داؤد احمد کا ذکرِ خیر۔ جامعہ احمدیہ ربوہ کے بارے میں اپنی معروضات ختم کرنے سے پہلے میں اسی ادارے کے تین سابق طالب علموں یعنی محمد شفیق قیصر، محمد اسلم قریشی اور شکیل احمد صدیقی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میرے دوست نہ سہی، میرے جاننے والوں میں ضرور شامل تھے اور ان سے بعض ملاقاتوں کی خوشگوار یاد آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔

جہاں تک شفیق قیصر جو منشی محمد صادق نامی ایک بزرگ کے صاحبزادے تھے کا تعلق ہے وہ بارہ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو محمود آباد (سندھ) میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی

خدمتِ دین کے لیے وقف کردی اور ۱۹۶۳ء میں جامعہ احمدیہ سے شاہد کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران انہوں نے فاضل عربی کا امتحان بھی پاس کرلیا جس کے بعد انہیں بعض دیگر جماعتی ذمہ داریاں ادا کرنے کے علاوہ طویل عرصے تک مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی گرانقدر خدمت کی بھی توفیق ملی۔

وہ عرصۂ دراز تک وکالتِ تبشیر کے تصنیف و اشاعتِ کتب کے شعبے میں خدمت بجالاتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے ایک سال تک یوگنڈا میں مربی کے فرائض ادا کئے۔ وہ جماعت کے متعدد اشاعتی اداروں مثلاً قران پبلیکیشنز اور نصرت پرنٹرز لمیٹڈ کے انتظامی سربراہ کے طور پر کام کررہے تھے۔ ازحد محنتی، مخلص اور سلسلے کے وفادار خادم تھے۔ اونچا علمی ذوق رکھنے والے، کتابوں کے رسیا اور کثیر المطالعہ نوجوان تھے۔ اپنی مختصر عمر میں بعض بہت اہم کام سرانجام دیئے اور خدمتِ سلسلہ کے دوران ہی ۲۲ مارچ ۱۹۷۹ء کو اکتالیس سال کی عمر میں کار کے ایک حادثے میں جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

تفصیلات کے مطابق شفیق قیصر قرآنِ مجید کی طباعت کے سلسلے میں ۱۳ مارچ ۱۹۷۹ء کو ربوہ سے ہانگ کانگ جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے جماعت احمدیہ برما کے بعض تنظیمی امور طے کرانے کے لیے رنگون بھی ٹھہرنا تھا چنانچہ وہ چار روز رنگون میں قیام کے بعد وہ ۱۹ مارچ کو جماعت احمدیہ برما کے بعض عہدیداروں کے ہمراہ بذریعہ موٹر کار مانڈلے روانہ ہوئے جو رنگون سے ساڑھے چار سو میل دور ہے۔ پندرہ افراد پر مشتمل عہدیدارانِ جماعت کا یہ قافلہ ایک موٹر کار اور ایک لینڈ روور میں روانہ ہوا اور اگلی صبح مانڈلے جاپہنچا۔

بعض جماعتی امور سرانجام دینے کے بعد یہ سب احباب اسی شام مانڈلے سے رنگون کے لیے روانہ ہوگئے۔ واپسی کے سفر میں کار میں شفیق قیصر اور سلیمان نامی ایک احمدی کے علاوہ (جو کار چلا رہے تھے) دو یا تین اور دوست بھی سوار تھے۔ قریباً نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد جب یہ قافلہ دو بجے رات ''ٹانگو'' نامی مقام پر پہنچا تو موٹر کار کا ایک لاری سے براہِ راست تصادم ہوگیا۔ شفیق قیصر اور سلیمان کو سر میں شدید چوٹیں آئیں اور وہ بیہوش ہوگئے۔ باقی دوست بھی زخمی ہوئے۔ مجروحین کو فوری طور پر ٹانگو ہسپتال میں داخل کرایا گیا جہاں ابتدائی مرہم پٹی ہوئی۔ بعد ازاں انہیں رنگون کے جنرل ہسپتال میں منتقل کردیا گیا۔ اس تمام عرصے میں شفیق قیصر پر بیہوشی طاری رہی۔ ڈاکٹروں نے جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ ۲۲ مارچ کی رات آپریشن ٹیبل پر ہی وفات پاگئے۔

شفیق قیصر کا جنازہ چھ اپریل کو ربوہ پہنچا جس کے بعد ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں ہوئی۔ وہ ایک نادر وجود تھے لیکن قسّامِ ازل کی طرف سے بس اتنی زندگی ہی لے کر آئے تھے۔ موصوف کی موت ان کے جاننے والوں کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو وہ تحریک جدید کوارٹرز میں مقیم تھے اور مجھے ان کے ساتھ دو تین بار ماہنامہ خالد کے لیے اپنے کسی مضمون کے حوالے سے ملنا یاد ہے۔ دُبلے پتلے، دراز قد شفیق قیصر کی خوش خلقی مجھے ابھی تک نہیں بھولی۔

مرحوم کی وفات پر قائدینِ اضلاع مجالس خدام الاحمدیہ، مجلس عاملہ لجنہ اماء اللہ، مجالس خدام الاحمدیہ

لاہور و فیصل آباد اور جماعتِ احمدیہ کراچی نے اپنی قراردادوں میں جو الفضل میں چھپی ہوئی موجود ہیں ان کی خدماتِ جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کیا اور حسن محمد عارف، نائب وکیل التبشیر نے اپنے مضمون ''شفیق جو واقعی شفیق تھا'' میں مرحوم کی بہت سی خوبیوں کو بڑے اچھوتے انداز میں اجاگر کیا ہے۔

شفیق قیصر کے بارے میں فی الحال اتنا ہی کچھ۔ اب ذکر محمد اسلم قریشی کا جن کے خاندان سے میرا پہلا تعارف ان کے چچا، قریشی محمد اکمل کے ساتھ ملاقات سے ہوا جو گول بازار، ربوہ میں افضل بردرز کے نام سے ایک جنرل سٹور چلایا کرتے تھے۔ وہ اباجی کے حلقۂ احباب میں شامل تھے اور اباجی اپنی سٹیشنری کی جملہ ضروریات ان ہی کی دکان سے پوری کرتے تھے۔ اگر کبھی وہ خود دکان پر نہ جاسکتے تو مجھے بھجوا دیتے۔ نقد رقم نہ ہوتی تو چِٹ لکھ کر دے دیتے۔ قریشی محمد اکمل وہ چِٹ اپنے پاس رکھ لیتے اور مطلوبہ اشیاء فراہم کردیتے۔ اباجی کی وفات کے بعد یہ سلسلہ تو آگے نہ چلا البتہ میری ان کے ساتھ ملاقاتیں جاری رہیں۔ قریشی محمد اکمل کی ایک ہمشیرہ نسبتی، امتہ الرشید المعروف ''اچھی'' آپی کی کلاس فیلو تھیں اور ان کا برادرِ نسبتی، ودُود میرا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ اس حوالے سے ان دونوں کی ہمارے گھر میں آمد و رفت رہتی اور ان کے خاندان کے بہت سے افراد کا ذکر ہمارے ہاں ہوتا رہتا۔ اسی ناتے میری ملاقات قریشی محمد افضل، مربی سلسلہ اور ان کے صاحبزادے، شاہد قریشی سے بھی ہونے لگی۔

اسلم قریشی ان ہی قریشی محمد اکمل کے بھتیجے اور داماد تھے۔ میں نے ان کے والدِ بزرگوار کو تو نہیں دیکھا البتہ ان کی سب سے بڑی بہن، سعیدہ احسن اپنے زمانے میں ربوہ کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھیں اور دوسری بہن، اختر آپی کی ہم جماعت اور سہیلی تھیں۔ ان کے بھائی، ارشد قریشی بھی اتفاقاً میرے حلقۂ احباب میں شامل ہوگئے۔ اس حوالے سے اسلم قریشی میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ خدا تعالیٰ نے ایک قابلِ رشک موت ان کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی چنانچہ وہ فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے دوران ٹرینیڈاڈ میں کسی دشمن کی گولی کا نشانہ بن کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے۔

مرحوم ۸ نومبر ۱۹۳۹ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، قریشی محمد احسن تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان میں ٹیچر تھے اور دادا، حافظ محمد حسین حضرت بانی سلسلہ کے رفقا میں سے تھے۔ اسلم قریشی نے ابتدائی تعلیم قادیان اور پھر ربوہ میں حاصل کی اور ۱۹۵۶ء میں جب ان کی عمر بمشکل سترہ سال تھی انہوں نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کردی اور ۱۹۵۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعہ میں داخل ہوگئے۔ جامعہ سے فراغت پر ان کی پہلی تقرری دفتر اصلاح و ارشاد میں ہوئی۔ جون ۱۹۶۴ء میں ان کی تقرری چکوال ضلع جہلم میں بطور مربی سلسلہ کے ہوئی جہاں وہ کئی سال مقیم رہے۔ مئی ۱۹۶۹ء میں وہ ماریشس بھجوا دیئے گئے جہاں وہ چار سال تک اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ ماریشس میں قیام کے دوران موصوف کو برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اور بھارت کی وزیر اعظم، اندرا گاندھی سے ملاقات کرکے انہیں قرآن کریم کا تحفہ پیش کرنے اور جماعت احمدیہ کا تعارف کرانے کا بھی موقع ملا۔ مئی ۱۹۷۵ء میں وہ گی آنا چلے گئے اور ایک مختصر سے وقفے کے علاوہ جب وہ

پاکستان آگئے تھے، وہ وہاں آٹھ سال تک خدماتِ سلسلہ بجالاتے رہے۔ بعدہٗ ان کی تقرری ٹرینیڈاڈ میں ہوئی جہاں وہ دمِ آخر تک مصروفِ کار رہے۔

موصوف انتہائی مخلص و دیندار احمدی اور وقف کی حقیقی رُوح سے سرشار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر خدا تعالیٰ انہیں توفیق دے تو وہ احمدیت کا پیغام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا کر دم لیں۔ ان کے عزائم کا اظہار اس قدرے طویل نظم سے بخوبی عیاں ہے جو انہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں لکھی تھی اور جنوری، فروری ۱۹۶۱ء کے مصباح میں شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ فرمایئے یہ نظم:

دین کی راہ میں اے زندگی دینے والو!
اس درسگاہ کی حسیں چھاؤں میں پلنے والو !
آج مَیں تم کو بتاتا ہوں عزائم اپنے
جو میری رُوح کی گرمی سے لگے ہیں تپنے
یہ ہیں اِن سوز میں ڈوبی ہوئی آہوں کا اثر
لہلہا اُٹھا ہے جن سے کہ اُمیدوں کا شجر
اس لیے میں نے بھی ہمّت کی کمر باندھی ہے
اور نئے عزم سے اک طرحِ سفر ڈالی ہے
سب سے پہلے مَیں اُسی ہستی کے گُن گاتا ہوں
جس کی اُلفت کی مَیں سینے میں خلش پاتا ہوں
جس کے دَم سے ہی ملا ہے میری ہستی کو ثبات
جس کے دَم سے ہی تو قائم ہے مرا سازِ حیات
اُسی ہستی نے ہے دی خدمتِ دیں کی توفیق
وقفِ جاں راہ میں مولا کی ہے اس کی تصدیق
اس درسگاہ میں اب مجھ کو ہے رہنا جب تک
زیورِ علم سے ہو جاؤں مزیّن جب تک
پھر جب اس مادرِ علمی سے میں رُخصت ہوں گا
اس کی یادوں کو لیے سینہ میں رُخصت ہوں گا
ظُلمتِ شب کے لیے بن کے مَیں اک طبلِ رحیل
صبحِ تاباں کے لیے دوں گا میں پیغامِ جلیل
کُفر و الحاد کے مٹ جانے کا وقت آیا ہے
دینِ فطرت کے جِلا پانے کا وقت آیا ہے

کوئی تدبیر جو اِس راہ میں حائل ہوگی
صورتِ دُود وہ اک لمحہ میں زائل ہوگی
جس جگہ کوئی نفس مجھ کو نظر آئے گا
بِن سُنے بات مری مجھ سے نہ چُھٹ پائے گا
وہ یہودی ہو یا مُلحد ہو یا عیسائی ہو
وہ مجُوسی ہو کہ بُدھ مت کا وہ شیدائی ہو
کوئی بھی میرے مقابل پہ نہیں ٹھہرے گا
حق کی تلوار کے نظارے سے یوں لرزے گا
جیسے شاہین کے تعاقب سے کوئی سُست حمام
اپنی پرواز کی رفتار سے ہو جائے تمام
مَیں اسے زندگیٔ رُوح کا ساماں دُوں گا
اس کی راحت کے لیے فکر بداماں ہوں گا
اس طرح مَیں ...... میں ہوجاؤں گا اپنی مشغول
پھر شب و روز رہے گا میرا یوں ہی معمول
کاش کہ عمر مری ساری یوں ہی کٹ جائے
تاکہ پھر رُوح مری عرش کی قُربت پائے
اے خدا میری امنگوں کو تُو پُورا کر دے!
اپنے انوار کی اسلم پہ تو بارش کر دے!

بتایا جاتا ہے کہ ٹرینیڈاڈ میں تقرری کے دوران موصوف نو اگست ۱۹۸۵ء کو اپنے بیٹے، محمد نصیر کے ہمراہ گھر سے نکلے۔ انہیں کسی احمدی کے گھر سے حدیث کی ایک کتاب لانا تھی۔ یہ گھر ان کے اپنے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ روانگی کے وقت ان کی اہلیہ نے انہیں روکا کہ اس وقت نہ جائیں، یہ کام صبح کے وقت بھی ہوسکتا ہے لیکن غالبًا اگلے روز کسی تقریب میں ان کی تقریر تھی جس میں انہوں نے اس کتاب میں سے کوئی حدیث پیش کرنا تھی۔ کتاب لے کر واپس ہوئے ہی تھے کہ ایک موڑ پر کچھ افراد نے جو تین یا چار کاروں میں سوار تھے ان کی کار کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے قریشی محمد اسلم کو کار سے باہر نکال کر ان کی کنپٹی پر گولی چلا دی اور پھر ان کی موت کی اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد وہاں سے فرار ہوگئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے پہلے خطبۂ جمعہ میں جماعت کو اس تکلیف دہ حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا:

''اب میں ایک دردناک خبر سے بھی آپ کو مطلع کرتا ہوں جو میرے لیے انتہائی درد کا موجب بنی مگر یہ ہے

ایسی چیز جیسا کہ مَیں نے کہا تھا کہ اس درد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اعزاز بھی پایا جاتا ہے، احسان بھی پایا جاتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جو وہ اپنے پیاروں کو ہمیشہ عطا کرتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جو وہ اپنے دشمنوں کو عطا نہیں کرتا یعنی (راہِ مولیٰ میں جان کی قربانی) کا درد۔ ابھی چند دن پہلے ہمارے ایک بہت ہی مخلص اور فدائی ...... واقفِ زندگی قریشی محمد اسلم صاحب کو بڑے ظالمانہ طریق پر بعض کرائے کے ٹٹوؤں سے قتل کروایا گیا ہے۔ یہ ٹرینیڈاڈ، ویسٹ انڈیز میں ہمارے (مربی) تھے۔ وہاں کرائے کے قاتل لے کر ان کا پیچھا کروایا گیا۔ یہ کسی تقریب پر گئے ہوئے تھے۔ جب یہ واپس چلے ہیں تو ان وحشیوں نے باقاعدہ گھیر کر ان کو موٹر سے نکالا اور مضبوطی سے پکڑ کر سر کے پاس سے چھ انچ سے فائر کر کے ہلاک کیا اور پھر اس کے بعد پوری طرح تسلّی کی کہ مر چکے ہیں۔ پھر وہاں سے رُخصت ہوئے اور وہاں ایسا ہوتا رہتا ہے اور جہاں تک جماعت کا تعلق ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں قیاس آرائیاں نہیں کرنی چاہئیں۔ اگرچہ پس منظر وہی ہے جو مَیں نے بیان کیا ہے لیکن تقویٰ شعاری کا یہ تقاضا ہے کہ جب تک تحقیق نہ ہو دشمن پر بھی الزام نہ لگایا جائے۔ ...... جب تک کوئی ثبوت نہ ہو احمدی ان پر بھی الزام نہیں لگائے گا، نہ میں لگاتا ہوں ...... اِس لیے اس پس منظر میں جب مَیں نے یہ بیان کیا ہے تو یہ ہرگز مقصد نہیں ہے کہ یہ کہوں کہ یہ علماء جنہوں نے آ کر کُھلم کُھلا قتل کی تلقین کی ہے اور وہ حکومتیں جو اُن کی پشت پناہی کر رہی ہیں انہوں نے یہ قتل بھی پیسے دے کر کروایا ہے بلکہ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس پس منظر کے باوجود آپ بدظنیوں سے کام نہ لیں۔ ایک آزاد حکومت تحقیق کروا رہی ہے۔ اس کو تحقیق کرنے دیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذمہ دار کوئی اور عناصر ہوں ......''

اس موقع پر حضور نے مرحوم کی ہمشیرہ، سعیدہ احسن (جو اُن دِنوں جامعہ نصرت، ربوہ میں عربی کی لیکچرر تھیں) کے نام اپنے اکتیس اکتوبر ۱۹۸۵ء کے تعزیتی مکتوب میں لکھا:

''پیاری عزیزہ سعیدہ احسن صاحبہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پُرخلوص خط محررّہ ۸۵-۱۰-۲۹ موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ...... بھائی قریشی محمد اسلم صاحب کو اعلیٰ علییّن میں جگہ عطا فرمائے۔ انہوں نے اپنی قربانی سے احمدیت کے باغ کو سیراب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو دین اور دنیا کی دولتوں سے مالا مال کرے ......

اللہ تعالیٰ آپ کے مخلص خاندان کو احمدیت کی بیش از بیش خدمت کی توفیق بخشے اور اپنے فضلوں سے نوازے۔
میری طرف سے تمام عزیزوں کو محبت بھرا سلام کہہ دیں۔

والسلام
خاکسار
مرزا طاہر احمد
خلیفۃ المسیح الرّابع''

اسلم قریشی کی دردناک وفات پر بعض احمدی شعراء نے انہیں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ چوہدری شبیر احمد،

وکیل المال اول تحریک جدید نے کہا:

دیارِ غیر میں پیغامِ حق سناتے ہوئے
دِلوں کو نغمۂ توحید سے لُبھاتے ہوئے
کرشنِ ثانی کی پُرسوز نَے بجاتے ہوئے
گلی گلی میں چراغِ ہُدیٰ جلاتے ہوئے
متاعِ جاں کو سرِراہ لٹا دیا تُو نے
وفورِ شوقِ ...... دکھا دیا تُو نے

ترے قدم سے ہوا باوقار غربُ الہند
ترے لہو سے ہوا لالہ زار غربُ الہند
تری جُدائی پہ ہے اشکبار غربُ الہند
تری وفات پہ ہے سوگوار غربُ الہند
گلی گلی تیرے پیغام کی صدا گونجی
ترے لہو نے جزیرے کو زندگی بخشی

مرے ...... برادر سلام ہو تجھ پر
رہِ ...... کے رہبر سلام ہو تجھ پر
وفا شعار دلاور سلام ہو تجھ پر
اے چرخِ دین کے اختر سلام ہو تجھ پر
ہمیں بھی تیرے ہی نقشِ قدم پہ چلنا ہے
ہمی نے نقشۂ عالم کو اب بدلنا ہے

ہمارا صبر بھی اب رنگ لانے والا ہے
خدا زمیں پہ بہت جلد آنے والا ہے
عدُو کو خائب و خاسر بنانے والا ہے
نظامِ ظلم و ستم بھاگ جانے والا ہے
ہمیں وہ آتشِ نمرود سے بچائے گا
ہمیں خلیل کا پھر معجزہ دکھائے گا

اسلم قریشی کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ جہاں تک شکیل احمد صدیقی کا تعلق ہے وہ گیارہ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو ربوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ بزرگوار کا نام بشیر احمد صدیقی تھا اور وہ حضرت حکیم محمد صدیق، رفیق حضرت بانی سلسلہ (اباجی کے تایازاد بھائی) کے پوتے تھے۔ شکیل صدیقی اپنے والدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اس لیے سب کے لاڈلے تھے۔ اچھی شکل صُورت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بچپن ہی سے نیک اور خوش مزاج تھے اور شرارت یا ضد سے مجتنب رہتے۔

شکیل صدیقی نے ابتدائی تعلیم محلّہ دارالرحمت وسطی والے پرائمری سکول سے حاصل کی لیکن ۱۹۸۷ء میں جب ان کا خاندان لاہور منتقل ہوگیا تو انہوں نے سلیمانیہ پبلک ہائی سکول، سمن آباد میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے ۱۹۹۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران انہوں نے تقریر کا خاص ملکہ حاصل کرلیا جس کی وجہ سے وہ اساتذہ کے منظورِ نظر بن گئے۔ دراصل وہ زمانۂ طالب علمی سے ہی مجلس اطفال الاحمدیہ کے پروگراموں میں جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے اور اسی کی برکت سے انہیں اپنے سکول میں نمایاں مقام حاصل ہورہا تھا۔

انہوں نے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ربوہ میں خدام الاحمدیہ کی تربیتی کلاس میں شمولیت اختیار کی۔ وہیں ایک مربی نے انہیں جامعہ احمدیہ میں داخلے کی تحریک کی جسے انہوں نے بے حد پسند کیا چنانچہ واپس آتے ہی والدین کی اجازت سے زندگی وقف کرکے باقاعدہ خدمتِ سلسلہ کا ارادہ کرلیا۔

شکیل صدیقی نے ۱۹۹۱ء میں جامعہ احمدیہ میں داخلہ لیا اور وقف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو ہر چیز پر ترجیح دیئے رکھی۔ ان کے بھائی مقبول صدیقی الفضل مورخہ ۷ ستمبر ۲۰۰۵ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک بار گھر کے افراد نے کوئی تفریحی پروگرام مرتب کیا لیکن شکیل صدیقی صرف اس لیے اس میں شامل نہ ہوئے کہ انہیں جامعہ سے غیر ضروری طور پر رخصت لینا پڑے گی اور اس طرح ان کا وقت ضائع ہوگا۔ وہ اپنے اساتذہ کا دل و جان سے احترام کرتے اور ان کی خوبیوں کا اپنے گھر والوں سے تذکرہ کرتے رہتے۔ وہ دعوتِ اِلی اللہ کے لیے ربوہ کے گردونواح میں بھی بکثرت جایا کرتے تھے۔

وہ ۱۹۹۶ء میں جامعہ سے فارغ ہوئے جس کے بعد ان کا تقرر دوالمیال ضلع چکوال میں ہوگیا۔

شکیل صدیقی نے دوالمیال میں اپنی تعیناتی کا عرصہ کچھ اس طرح گزارا کہ احمدیانِ دوالمیال انہیں تادیر یاد رکھیں گے۔ ان کی وفات پر جماعت احمدیہ ضلع چکوال کے امیر، ملک ریاض احمد کی طرف سے روزنامہ الفضل مورخہ ۶ جون ۲۰۰۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں:

''جامعہ احمدیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ دوالمیال ...... میں بطور مربی ...... خدمات سرانجام دیں اور اپنی خوش خلقی، خوش طبعی اور ہر ایک سے حسنِ اخلاق سے پیش آ کر محبت اور الفت سے مثالی خدمت کے نقوش ...... احباب کے دلوں میں چھوڑے ...... جب کوئی پیغام دینا ہوتا تو ایسے نپے تلے الفاظ میں کہ سننے والا ضرور اس کا اثر قبول کرتا ...... آپ اطفال، خدام، انصار، لجنہ میں یکساں مقبول تھے۔ کیا اخلاق تھا اس ہنس مکھ چہرے کا، کیا دلرُبا انداز تھا تقریر کا۔ ہر وقت چاق و چوبند، خدمتِ خلق اور سلسلے کی خدمت کے

لیے تیار اور دعوت اِلی اللہ کے لیے کوئی موقع نہیں گنوانا۔ چوبیس گھنٹے مستعد، محبتوں کے دیپ جو انہوں نے ہمارے دلوں میں جلائے وہ دیپ اب بھی جل رہے ہیں۔''

فاضل مضمون نگار نے چکوال کی تاریخِ احمدیت کا ایک حالیہ ایمان افروز واقعہ اور اس میں مرحوم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''دوالمیال کی احمدیہ بیتُ الذّ کر تاریخِ احمدیت میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ پولیس کی بھاری نفری مورخہ ۴ جولائی ۱۹۹۷ء...... جمعہ سے کچھ وقت قبل احمدیہ دارالذّ کر پہنچ گئی اور جماعت...... کو...... جمعہ پڑھنے سے روک دیا۔ یہ بہت صبر آزما موقع تھا۔ جماعت نے کمال صبر کا مظاہرہ کیا۔ امیر صاحب جماعت احمدیہ دوالمیال، حاجی عبدالعزیز نے تمام جماعت کو صبر کا مظاہرہ کرنے کی تلقین فرمائی اور حکم دیا کہ انتظامیہ چونکہ ہمیں احمدیہ دارُالذّ کر میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں دے رہی اس لیے آج جمعہ احمدیہ دارُالذّ کر...... سے ملحقہ شمالی جانب بڑی گلی میں پڑھا جائے گا...... ہر کوئی پریشان تھا انتظامیہ کے اس غلط اور رُوکھے رویّے سے لیکن اللہ کی رضا کی خاطر اور اطاعتِ امیر کی خاطر یہ ظلم سہا جا رہا تھا۔ اڑھائی بجے کا وقت، کڑکتی دھوپ میں سروں پر تپتے سورج کے نیچے...... انتظامیہ کے سامنے بڑی گلی میں صفیں بچھا دی گئیں۔

کیا سماں تھا، کیا پُرسوز منظر تھا۔ ایک عجیب نظارہ تھا جو آج تک دوالمیال میں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تاریخی خطبۂ جمعہ شکیل صدیقی نے ہی پڑھایا تھا۔ مربی صاحب کی زبان بھی جوش سے تھرتھرا رہی تھی، ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔

انہوں نے...... فرمایا: گھبرانا نہیں اور ہر حال میں اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر دعاؤں میں تقویٰ کے رنگ چڑھاتے ہوئے اس کے فضلوں کے طلبگار بننا ہے۔ ابتلاؤں میں صبر کا دامن نہیں چھوڑنا، اطاعتِ امیر اور اطاعتِ خلیفۃ المسیح کو نہیں چھوڑنا، ابتلاؤں سے گھبرانا نہیں۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی ہتھیار ہے، دعا کا۔ اللہ کے حضور دعاؤں میں لگ جاؤ۔ اپنی سجدہ گاہوں کو دعاؤں سے تر کر دو۔ آخر میں آپ نے حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کا پیغام جو ایک دن قبل موصول ہوا تھا جس میں صبر کی تلقین تھی اور گلیوں میں نکل کر نمازیں پڑھنے کی پیشگوئی تھی...... سنایا۔

خطبے کے بعد نماز جمعہ پڑھائی گئی اور سجدوں میں اطفال، خدام اور انصار نے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ محلّہ کی عورتیں اور لوگ چھتوں پر چڑھ گئے کہ کیا ہو گیا ہے۔ ان آہوں نے، ان دعاؤں نے، ان دل سے نکلی ہوئی آہوں نے دوالمیال کے کناروں کو ہلا دیا۔''

دوالمیال میں تعیناتی کے دوران ہی ان کی شادی بشریٰ طیبہ بنت ناصر احمد، سابق محاسب، صدر انجمن احمدیہ کے ساتھ ہوئی۔ اس شادی میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس (جو اُن دنوں ناظرِ اعلیٰ، صدر انجمن احمدیہ کے عہدے پر فائز تھے) نے بھی شرکت فرمائی۔

ساڑھے تین سال تک دوالمیال میں قیام کے بعد انہیں وکالتِ تبشیر میں بلا لیا گیا اور فرانسیسی زبان سیکھنے پر مامور کیا گیا۔ فرانسیسی زبان میں شُدبُد حاصل کر چکے تو ان کی تعیناتی مغربی افریقہ کے ایک ملک،

بورکینا فاسو میں ہو گئی چنانچہ وہ جنوری ۲۰۰۱ء کی ایک صبح لاہور سے بورکینا فاسو کے لیے روانہ ہو گئے۔

بورکینا فاسو میں کچھ عرصہ مرکزی مشن واگاڈوگو میں قیام کے بعد ان کی تقرری ودوگو شہر کے نئے مشن میں ہو گئی۔ یہ شہر انتہائی پسماندہ تھا لیکن مشکلات کے باوجود انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی انتہائی احسن طریق سے ادا کئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں ملک کے دوسرے بڑے شہر، بولوجلاسو میں تعینات کر دیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اپنے دورہ افریقہ، ۲۰۰۴ء کے دوران بولوجلاسو میں آپ کے گھر کھانے پر آنا تھا۔ حضور کی متوقع آمد پر یہ گھرانہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا کہ عین موقع پر ان کی اہلیہ جو اُن دنوں امید سے تھیں شدید بیمار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں ماں اور بچے میں سے کسی ایک کو ہی بچایا جا سکتا تھا۔ حضور سے دعا کی درخواست کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اگر دونوں میں سے صرف ایک ہی کی جان بچائی جا سکتی ہے تو ترجیحاً ماں کی زندگی بچانے کی کوشش کی جائے چنانچہ حضور کی آمد سے چند گھنٹے پہلے شکیل صدیقی کو یہ افسوسناک خبر ملی کہ ان کا بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ اس موقع پر انہوں نے صبر و رضا کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور بچے کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی حضور کے استقبال کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔

شکیل صدیقی کو اپنے آقا سے بے حد پیار تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے آقا کے ساتھ گزاریں۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضور بولوجلاسو سے دارالحکومت واگاڈوگو تشریف لے جا رہے تھے تو شکیل صدیقی شرفِ ہمرکابی چاہتے تھے اور پروگرام بنائے بیٹھے تھے کہ حضور کو بورکینا فاسو سے الوداع کر کے ہی واپس آئیں گے لیکن حضور نے یہ کہہ کر انہیں اپنی اہلیہ کے پاس رکنے کا پابند کر دیا کہ ''تم نے میرے ساتھ نہیں جانا۔ تم بیگم کے پاس رہو۔''

۲۰۰۴ء کے آخر میں شکیل صدیقی کو اچانک بخار نے آ لیا جو علاج معالجہ کے باوجود کم ہونے کی بجائے بڑھنے لگا۔ پھر چہرے اور جسم پر پیلاہٹ طاری ہو گئی۔ دراصل انہیں یرقان تھا لیکن ڈاکٹر ملیریا سمجھ کر انہیں بڑی مقدار میں کونین دیتے رہے۔ کونین کے بے تحاشہ استعمال سے ان کا جگر متاثر ہو گیا۔ بدقسمتی سے وہاں اس مرض کا کوئی علاج میسر نہ تھا چنانچہ ان کا مرض بڑھتا ہی گیا اور بالآخر یکم فروری ۲۰۰۵ء کو انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

مرحوم کی نمازِ جنازہ مورخہ ۲ فروری کو بیت المہدی، واگاڈوگو میں محمود ناصر ثاقب، امیر و مشنری انچارج بورکینا فاسو نے پڑھائی جس کے بعد ان کی میّت سڑک کے راستے غانا کے دارالحکومت، اکرا پہنچائی گئی اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دبئی کے راستے پاکستان لائی گئی۔ اس سفر پر تقریباً پانچ روز لگ گئے اور میّت ۶ فروری ۲۰۰۵ء کو ربوہ پہنچی۔ ان کی نمازِ جنازہ اسی روز مرزا خورشید احمد، ناظر اعلیٰ و امیر مقامی نے پڑھائی۔ تدفین بہشتی مقبرے میں ہوئی۔

مقبول صدیقی اپنے محولہ بالا مضمون میں لکھتے ہیں: ''پیارا شکیل مورخہ ۱۶ جنوری ۲۰۰۱ء کو لاہور سے بورکینا فاسو کے لیے روانہ ہوا تھا۔ چار سال بعد مارچ ۲۰۰۵ء میں اس نے پاکستان آنا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور

ہی منظور تھا کہ مارچ سے پہلے ہی ۶ فروری کو پیارا شکیل ایک ایسے بند بکس...... میں لایا گیا جہاں سے ہم نہ اپنے پیارے کو چھو سکتے تھے، نہ پیار کر سکتے تھے۔ اس طرح امی جان کی دو سالہ ایک...... خواب پوری ہوئی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ باہر سے شکیل کے کپڑے تو آئے ہیں مگر وہ نہیں آیا اور آپ کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہیں: پھول تم پر فرشتے نچھاور کریں۔"

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے مرحوم کی وفات کے بعد اگلے خطبۂ جمعہ میں جو روزنامہ الفضل میں ۲۴ مئی ۲۰۰۵ء کو شائع ہوا ان کی وفا کا خاص طور پر ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کو اپنی مغفرت کی چادر میں لپیٹ لے۔ وہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان میں بڑی ہی اطاعت کا جذبہ تھا۔ بورکینا فاسو کے مربیّان کی طرف سے جو افسوس کا، تعزیت کا خط آیا ہے اس میں جو انہوں نے خوبیاں لکھی ہیں وہ حقیقت میں وہ تمام باتیں ہیں جن میں مَیں کہہ سکتا ہوں کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ بہت محنتی تھے، بڑی غیرت رکھنے والے تھے، اللہ کے نام کی غیرت رکھنے والے تھے، بنی نوع انسان کی خدمت کرنے والے تھے اور بے نفس آدمی تھے۔ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ یہ لکھتے ہیں کہ جب بھی اجتماع وغیرہ یا جلسہ ہوتا تو شکیل صدیقی اپنے کاموں میں اتنے مصروف ہوتے کہ نہانے، دھونے، کھانے وغیرہ کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی اور جب میں دورے پر گیا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ یہ مستقل خدمت پہ تھے۔ باقی بھی تھے لیکن ان کی اہلیہ اُن دنوں میں بہت بیمار ہوگئیں اور ہسپتال میں داخل تھیں۔ اس کے باوجود جو اُن کے ذمے کام تھے وہ پوری طرح کرتے رہے۔ ہسپتال بھی دوڑ کے جاتے تھے۔ پھر آ کے کام کرتے تھے اور پھر دوسرے کو یہ احساس نہیں دلواتے تھے کہ مجھے مجبوریاں ہیں اور پھر بھی میرے سے کام کروایا جا رہا ہے بلکہ خوشی سے یہ کام کر رہے تھے باوجود یہ کہنے کے کہ آپ زیادہ اہلیہ کی فکر کریں۔ کھانے پینے کی ان کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی اور ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے...... امیر صاحب نے ایک بات لکھی ہے اور یقیناً صحیح ہوگی۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ہر وقت ہنسنے والا شخص تھا لیکن کہتے ہیں مَیں نے ان کو روتے بھی دیکھا کہ جب یہ ذکر ہوتا تھا کہ بیعتوں کا ٹارگٹ پورا کرنا ہے، بیعتیں نہیں ہوئیں یا وہ ٹارگٹ حاصل نہیں ہوا جتنا ان کا خیال تھا کہ ہونا چاہئے اور مجھے رپورٹ بھجوانی ہے۔ اس وقت وہ رویا کرتے تھے کہ کس طرح اپنی ایسی رپورٹ بھجواؤں اور دعا کے لیے درخواست کیا کرتے تھے اور حقیقتاً انہوں نے حق ادا کیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو امانتوں کا بھی حق ادا کرتے ہیں اور اپنے عہدوں کا بھی حق ادا کرتے ہیں...... اس وقت بھی بیماری سے چند گھنٹے پہلے، آخری رات، وہ کہتے ہیں کہ سارے مربیان (۔) بیٹھے ہوئے تھے (۔) کرنے کا کوئی پروگرام بن رہا تھا تو اس میں بھی پوری طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، تجاویز پیش کر رہے تھے۔ تو دعا کریں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کی چادر میں لپیٹے، ان کو اپنے پیاروں کے قرب میں جگہ دے اور ان کی ایک چھوٹی بچی اور اہلیہ کو صبر دے۔ ان کے والدین زندہ ہیں ان کو صبر کی توفیق دے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیثِ مبارکہ ہے: خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَ اَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ یعنی

تم میں سے بہترین وہی ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بہترین ہے۔ مرحوم کی اہلیہ کا وہ انٹرویو جو شازیہ انجم نے لیا اور الفضل مورخہ ۶ جولائی ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا اس امر پر شاہد ہے کہ شکیل صدیقی اس حدیث کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنی اہلیہ کے آرام و سکون کا ہمیشہ خیال رکھا اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے سے گریز کیا۔

وہ جماعتی نظام کی ممکن حد تک پابندی کرتے۔ مقبول صدیقی کا بیان ہے کہ ایک بار انہوں نے کہیں جانا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ شکیل صدیقی ان کی موٹر سائیکل پر ان کے پیچھے بیٹھ جائیں تا کہ وہ جلد اپنی منزل پر پہنچ سکیں مگر شکیل صدیقی نے یہ تجویز قبول کرنے سے صرف اس لیے معذرت کر لی کہ یہ اُن جماعتی ہدایات کی خلاف ورزی ہوتی جن کے مطابق مربیان کو موٹر سائیکل کی سواری سے منع کیا گیا ہے۔

مرحوم جذبہ خدمتِ خلق سے سرشار تھے۔ انہوں نے دوالمیال میں قیام کے دوران گھر میں ہومیو پیتھک ڈسپنسری بنا رکھی تھی جہاں سے وہ مریضوں کو مفت ادویہ دیتے۔ بورکینا فاسو میں بھی انہوں نے یہ خدمت جاری رکھی۔ مقبول صدیقی بیان کرتے ہیں: "آپ کی میّت کے ساتھ جو آپ کے گھر کا سامان آیا تو اس میں خاکسار نے بے شمار ایسی فائلیں بھی دیکھیں کہ جن میں مختلف امراض کے حوالے سے...... حضرت امام جماعت رابع کے نسخہ جات لکھے ہوئے تھے۔ افریقہ کے غریب لوگوں اور غربت سے آپ کا دل خوب دکھی ہو جاتا۔ آپ حتی المقدور ان کے دکھ سکھ کا خیال رکھتے۔ بولوجلاسو میں ایک چھوٹی عمر کی بیوہ لڑکی گھر کے کام کاج کے لیے آپ کے ہاں ملازمہ تھی۔ بشریٰ شکیل...... کہتی ہیں کہ آپ مجھے کہتے کہ پہلے اسے کھانا کھلاؤ، پھر ہم کھانا کھائیں گے۔ اسی طرح ایک بار جب آپ نے اپنے گھر کے باہر ٹیوب لگوائی جو رات کو روشن ہوتی تھی آپ نے اپنی بیگم سے کہا کہ بچوں کو کہو کہ اس روشنی میں کھیلو اور پڑھنے والے بچے پڑھ لیں کیوں کہ غریب علاقوں میں رات کو نہ روشنی، نہ بجلی ہوتی تھی۔ اسی طرح جب آپ کی بیگم روٹیاں پکانے لگتیں تو آپ انہیں کہتے کہ چند مزید روٹیاں پکا لو تا کہ ان میں جو بچے بھوکے ہوں انہیں روٹی میسر آ جائے اور پھر کہتے کہ یہ کام اپنی بیٹی غزالہ سے کراؤ تا کہ اس کے دل میں بھی ہمدردی کی عادت پڑے۔ اسی طرح بچوں کو ٹافیاں اور چھوٹے موٹے تحائف بھی بھجواتے۔ دوگو میں پانی کی شدید ضرورت ہوتی تھی کیوں کہ ان علاقوں میں کہیں کہیں اور بعض اوقات بہت دور سے پانی ملتا۔ ایک بار آپ نے اپنے بڑے بھائی...... مبشر احمد صدیقی آف لندن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ایک بیت الحمد دوگو میں تعمیر کی جائے اور وہاں نلکا بھی لگوایا جائے تا کہ لوگوں کو پانی بھی میسر آئے۔ آپ کی اس خواہش کو اب مبشر بھائی پورا کر رہے ہیں۔ دوگو میں جہاں آپ پہلے مربی تھے بیت الحمد کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔"

شکیل صدیقی بہت محنتی اور لگن سے اپنے فرائض سرانجام دینے والے تھے۔ محمود ناصر ثاقب، امیر جماعت احمدیہ بورکینا فاسو دوگو جیسے پسماندہ علاقے کے لیے شکیل صدیقی کی خدمات کے حوالے سے ان کے والدِ گرامی کے نام اپنے تعزیتی خط میں لکھتے ہیں:

"جس جانفشانی سے شکیل صدیقی نے اس علاقہ میں خدمت کی توفیق پائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

بلاخوف وخطر، راستے کی مشکلات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جس جذبہ سے آپ نے خدمت کی وہ بیان سے باہر ہے۔ اگر آپ کی خدمت کا اندازہ لگانا ہوتو دورے سے واپسی پر آپ کی حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ موٹرسائیکل پر ہفتہ کا دورہ عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ گردوغبار میں لت پت، پسینے سے شرابور، غیر بھی جب آپ کواس حالت میں دیکھتے تو رشک کی نگاہ ڈالتے۔''

مرحوم کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے ان کے والد، بشیر احمد صدیقی کے نام اپنے خط میں لکھا:

''آپ کے پیارے بیٹے اور ہمارے پیارے...... بھائی کی چھوٹی عمر میں اوراچانک وفات کا بڑا دکھ اور صدمہ ہوا۔ بڑھاپے میں جوان اولاد کا صدمہ نا قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن ہم اپنے خدا کے حکم کے مطابق یہی کہتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ کواور آپ کی اہلیہ کوصبر اور حوصلہ سے یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔ یہ بڑا اعزاز پانے والا بچہ تھا جو مجاہد بھی تھا، غازی بھی تھا اور ......بھی ہے۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھا جو جان کی بازی لگا دیتے ہیں لیکن قول کو پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ وہ یقیناً ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، ان کا نام زندہ ہے۔

اس عزیز بچے اور بھائی کی شادی پر بھی میں شامل ہوا تھا۔ ابھی تک نظروں کے سامنے وہ معصوم سا چہرہ پھر رہا ہے۔ پھر مختلف اوقات میں ملاقات ہوتی رہی۔ ہمیشہ اسے اخلاص و وفا کا نمونہ پایا۔ پھر گزشتہ سال جب میں بورکینافاسو کے دورے پر گیا ہوں تو وہاں اپنی اہلیہ کی بیماری اور بچے کے ضائع ہو جانے کے صدمہ کے باوجود جس اخلاص اور لگن سے اسے ہمہ وقت خدمتِ سلسلہ اور دورے کے انتظامات میں مصروف دیکھا اس سے اور زیادہ اس سے تعلق بڑھا۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ اسے جنت نصیب کرے۔ آمین!

امیر صاحب نے بتایا کہ وفات سے چند گھنٹے پہلے بھی وہ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا مربیّان کے ساتھ ملک میں (اشاعتِ حق) کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کا تو لحہ لحہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے اور اس کے دین کی اشاعت کے لیے وقف تھا۔ وہ صبر و رضا اور اخلاص و وفا کا ایک نمونہ تھا۔

اللہ تعالیٰ آپ دونوں، اس کی اہلیہ اور دوسرے بہن بھائیوں کو بھی عزیز مرحوم کے صبر اور حوصلے کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ کی رضا پر راضی ہوتے ہوئے صبر دکھانے کی توفیق دے۔ صدمے کے وقت آنسو تو بہتے ہیں لیکن یہ آنسو اللہ تعالیٰ کے حضور دعاؤں میں ڈھل جانے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھے اس کے لیے اور اس کے بیوی بچی کے لیے دعاؤں کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو برداشت کی توفیق دے۔

سب کو میری طرف سے تعزیت اور محبت بھرا سلام۔''

حضور نے شکیل صدیقی کی اہلیہ، بشریٰ طیبہ کے نام بھی ایک تعزیتی خط لکھا جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''آپ کے خاوند اور ہمارے پیارے...... کی اچانک اور جوان موت کا بہت دکھ اور صدمہ ہوا لیکن ہم اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عزیز مرحوم نے یقیناً وقف کے تقاضوں کو پورا کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کو صبر اور حوصلہ سے یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دے۔ آپ نے بھی جس طرح میدانِ عمل میں ......مرحوم کے ساتھ ہمیشہ صبر اور حوصلہ دکھایا ہے اب بھی اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بچی کا بھی حافظ و ناصر ہو۔ خود اپنی جناب سے آپ دونوں کی تسلّی کے سامان پیدا فرمائے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ آئندہ ہمیشہ آپ دونوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے پیاروں کے قرب میں جگہ دے۔ آمین''

اگر چہ مرحوم میرے دُور کے رشتہ داروں میں سے تھے لیکن میری نالائقی کی وجہ سے میرا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ ایک بار میں بچوں سمیت راولپنڈی سے اور میری بھانجی، ڈاکٹر بشریٰ ثوبیہ اپنے میاں ڈاکٹر احسان اللہ ہاشمی اپنے بچوں سمیت لاہور سے دوالمیال صرف اس غرض سے گئے کہ انگریز حکومت کی طرف سے جنگِ عظیم اول میں دوالمیال سے فوج میں بھرتی ہو کر محاذِ جنگ کو جانے والوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر اس گاؤں کو حکومت کی طرف سے تحفتاً پیش کی گئی توپ دیکھ سکیں، رشید ملک مرحوم کے جمع کردہ نوادرات کا جائزہ لے سکیں اور احمدیہ بیت الذّکر، دوالمیال اور منارۃ المسیح کے تتبع میں تعمیر کردہ اس کے بلند و بالا منار کی زیارت کر سکیں۔ بیت احمدیہ میں نماز عصر ادا کی تو شکیل صدیقی سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے جانے کس طرح مجھے پہچان لیا اور خود اس رشتے کے حوالے سے اپنا تعارف کراتے ہوئے گھر پر چائے پینے کی دعوت دی۔ ہمیں واپسی کی جلدی تھی لیکن اس کے باوجود ہم ان کی اس پُرخلوص دعوت کو ٹھکرا نہ سکے اور ان کے ہمراہ ان کے گھر جا کر ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوئے۔ وہیں یہ انکشاف ہوا کہ ان کی اہلیہ میری بھانجی، عزیزہ امتہ الشافی کی جاننے والی ہیں اور شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم جتنی دیر ان کے ہاں رُکے وہ بہت محبت سے ہماری میزبانی میں مصروف رہیں۔

ہم دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تھے اور چند روز بعد ہماری فون پر گفتگو بھی ہوئی لیکن قدرت نے ہمیں دوبارہ ملاقات کا موقع فراہم نہیں کیا۔ میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ میں اس ایک ملاقات میں ہی ان کے حسنِ اخلاق اور مہمان نوازی کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

جامعہ احمدیہ کے ان تین معزز و محترم سابق طلبہ کے ذکرِ خیر کے بعد میں آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس عظیم الشّان ادارے کے فارغ التحصیل علماء کو بفضلہٖ تعالیٰ سلسلے کی بے مثال خدمت کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔ اس حوالے سے سیّد کمال یوسف، مربی سکنڈے نیویا نے ازراہِ مہربانی مجھے ایک تفصیلی نوٹ لکھ کر ارسال فرمایا ہے جو اِن بزرگان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ امید ہے یہ مضمون بہت سے قارئین کی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگا۔

''دینی علم و معرفت کی تدریس و تعلّم کی مقدّس پنیری جس کی داغ بیل سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود و مہدی معہود

کے بابرکت عہد میں قادیان دارُالامان میں ڈالی گئی تھی کی دوسری شاخ کو تقسیمِ ہند کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ربوہ میں قائم فرمایا۔ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو برکت سے نوازا چنانچہ اسی کے فضل و کرم سے اب یہ ادارہ بہت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔

قادیان کے جامعات سے فارغ التحصیل زمرہ علماء کرام نے چار دانگ عالم میں جو زرّیں کارنامے سرانجام دیئے وہ ایک الگ قابلِ تحسین باب ہے اور جن عظیم المرتبت اساتذہ کرام نے اس ادارے میں زیرِ تربیت تلامذہ کو علم و معرفت سے فیضیاب کرکے کندن بنادیا ان کی شیریں اور دلکش یادیں تاریخِ احمدیت میں ہمیشہ زندہ رہیں گی مگر اس مختصر مضمون کا موضوع جامعہ احمدیہ ربوہ کے مخزنِ علم و معرفت کی کوکھ سے پیدا ہونے والے زمرہ علماء اور پاکستان اور بیرونِ پاکستان خدمتِ دین اور خدمتِ انسانیت کے میدان میں ان کا قابلِ صد تحسین کردار ہے۔

جامعہ احمدیہ ربوہ نے جن علمی میدانوں میں دین کے مخلص خدمت گزار پیدا کئے ہیں ان میں سرِ فہرست خدمتِ قرآنِ پاک کا میدان ہے۔ جامعہ احمدیہ کے تعلیم یافتہ ایک چینی نژاد محمد عثمان چو چنگ شی ہیں جنہوں نے سالہا سال کی محنتِ شاقہ سے چینی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔

اسی درس گاہ کے تلامذہ میں سے ڈاکٹر محمد جلال شمس اور ڈاکٹر عبدالغفار نے ترکی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر سالہا سال کی تگ و دو سے قرآن مجید کا ترکی زبان میں ترجمہ مکمل کرنے کی سعادت حاصل کی۔

البانین زبان میں ڈاکٹر محمد زکریا خاں نے یدِ طُولیٰ حاصل کیا اور پھر اپنی تمام تر صلاحیتوں کو خدمتِ قرآن کے لیے وقف کرکے قرآنِ مجید کا اعلیٰ معیار کا البانین ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس ترجمے کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

منصور احمد مبشر بھی اسی درسگاہ کے فاضل اور پروردہ ہیں۔ انہوں نے دس سال کی طویل محنت سے ڈینش زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ تقریباً مکمل کرلیا ہے۔

عدیم الفرصتی کے باعث لغت اور صرف و نحو کے زیرِ نظر ادق مسائل کی نظرِ ثانی اور ضروری حوالہ جات کی مزید چھان پھٹک کے لیے ترجمہ قرآن اردو کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے معاونت کے لیے جن احباب کو شرف بخشا ان میں پاکستان میں سیّد عبدالحیٔ شاہد، میر محمود احمد ناصر، مولانا دوست محمد شاہد اور جمیل الرحمٰن رفیق اور برطانیہ میں نصیر احمد قمر، عبدالماجد طاہر اور منیر الدین شمس تلامذہ جامعہ احمدیہ شامل ہیں۔

اخلاقِ جمیلہ اور اوصافِ حمیدہ ختمی مآب حضرت اقدس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ حق نما اولاً تو قرآن کریم (کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ) ہی ہے اور اس کی جملہ تفصیلات اور تعبیرات کی ترجمانی احادیثِ نبویہ کی روشنی میں ہوتی ہے۔

سیرتِ طیبہ ہمارے آقا و مولیٰ فداہُ نفسی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر حافظ مظفر احمد کی

تصنیفِ لطیف ''اُسوۂ انسانِ کامل'' ایک قابلِ صد تحسین کاوش ہے۔ اس تسلسل میں ازواجِ مطہرات امّہاتُ المومنینؓ پر ان کی دوسری تصنیف ''اہلِ بیتِ رسول'' ہے۔ اس کتاب میں ان تمام وضاحت طلب اہم امور جنہیں مصنفینِ کتب سیر و تاریخ نے بالعموم نظرانداز کردیا ہے کے حسن و جمال کو نکھار کر پیش کرتے ہوئے متعصّب مستشرقین کے اعتراضات کو بڑے عالمانہ رنگ میں مضبوط دلائل اور براہین کے ساتھ رد بھی کیا گیا ہے اور ان پر گرفت بھی کی گئی ہے۔

اس علمی درس گاہ کے فیض یافتہ اور حضرت سلطان القلم کی فوج کے ایک اور قلمکار ہادی علی چوہدری، مدیر المہام جامعہ احمدیہ، کینیڈا نے حضرت مرزا بشیر احمد کی کتاب ''سیرتِ خاتم النبیّین'' (جو نامکمل رہ گئی تھی) کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور طویل عرصے کی گہری تحقیق اور تفحّص کے بعد ''سیرتِ خاتم النبیّین'' ہی کے نامِ نامی کے ساتھ ماشاء اللہ اپنی تصنیف کو پیش کیا ہے۔

خدمتِ احادیثِ صحاحِ ستہ کے باب میں ایک اہم پیش رفت (حضرت سیّد زین العابدین ولی اللہ شاہ کی کئی جلدوں پر مشتمل شرح جامع صحیح بخاری کے بعد اس کی تکمیل کے سلسلے میں) شبیر احمد ثاقب اور عطاء اللہ مجیب کے ذریعے جاری ہے جب کہ نور فاؤنڈیشن کے ذریعے میر محمود احمد، جمیل الرحمٰن رفیق، حافظ مظفر احمد، تصوّر احمد، عبدالسمیع خان، مبشر احمد ایاز، عباس احمد، عبدالقدیر قمر، حافظ مظہر احمد اور مسعود احمد سلیمان نے پہلے شمائلِ ترمذی کا ترجمہ کرکے شائع کیا پھر صحیح مسلم کا ترجمہ۔ اب علمائے قادیان یعنی منیر احمد خادم، محمد حمید کوثر، محمد نسیم خان اور زین الدین حامد کا ابنِ ماجہ کا ترجمہ زیرِ نظرِ ثانی ہے۔

صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کے اس جدید دور میں سلطان القلم کے مخلص پیروکاروں نے جرأتِ رندانہ دکھاتے ہوئے آزادیٔ اظہارِ خیال پر قید و بند کے خوف کے ہوتے ہوئے اپنے زورِ قلم کا سکّہ اپنے مدّمقابل پر بھی جمایا۔ روزنامہ الفضل پاکستان کا ایک وقیع اور معتبر اخبار ہے جس کی داغ بیل قادیان میں ڈالی گئی تھی۔ دنیا بھر میں غالبًا یہ واحد روزنامہ ہے جو ایک صدی سے کسی دینی جماعت کے دینی، ملّی اور قومی رجحانات کی ترجمانی کا حق ادا کرتا آیا ہے۔

آج کے انتہائی نامساعد حالات میں اس اخبار کی کٹھن ادارت کا بیڑا خدا کے فضل اور اسی کی امان میں عبدالسمیع خان نے اٹھا رکھا ہے۔ وہ اور ان کا ادارتی عملہ جامعہ احمدیہ کے خمیر ہی سے اٹھایا گیا ہے۔

ایک مختصر سے عرصے کے لیے الفضل ربوہ بوجوہ چھپ نہ سکا تو اس کا متبادل جامعہ احمدیہ کے ایک سپوت، محمد شفیع اشرف کی زیرِ ادارت کراچی سے ''المصلح'' کی صورت میں جاری ہوا جس نے الفضل کی تشنگی دُور کرنے کی سعی کی۔

الیکٹرانک میڈیا اور جدید ذرائع ابلاغ کے دباؤ میں روزنامہ اخبارات کی وہ اہمیت و مانگ نہیں رہی جو اس سے پہلے تھی لہٰذا کئی چوٹی کے معروف اخبارات ہمیشہ کے لیے گوشۂ گمنامی میں چلے گئے اور بعض اخبارات نے باہمی اشتراک سے ایک ہی اخبار پر کفایت کرلی مگر صحافتِ احمدیہ کی تو رِیت ہی نرالی ہے چنانچہ ایک

روزنامہ کے ہوتے ہوئے بعض غیر معمولی عالمی تقاضوں کے مدنظر ایک مزید عالمی اہمیت کا حامل ہفت روزہ ''الفضل انٹرنیشنل'' اس وقت لندن سے نصیر احمد قمر کی ادارت میں منظرِ عام پر آ کر اپنا لوہا منوا رہا ہے۔ اس ہفت روزہ کا حلقہ بھی الفضل ربوہ کے وسیع حلقے کی طرح ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔

جامعہ احمدیہ ربوہ کی نگرانی میں لندن سے شائع ہونے والا ایک منفرد مجلّہ ''موازنۂ مذاہب'' کے نام سے میر محمود احمد ناصر اور ان کی تربیت یافتہ مجلسِ علماء کی ادارت میں چھپ رہا ہے۔ اس مجلّے میں مذاہبِ عالم کی تعلیمات اور ان کی تہذیب و روایات اور ثقافت پر تحقیقی مقالات اور ریسرچ پیپرز شائع کئے جاتے ہیں اور اس مجلّے کی محققانہ طرزِ فکر کو مشرق و مغرب کا سنجیدہ طبقہ بنظرِ تحسین دیکھتا ہے

بشیر احمد رفیق سابق امام بیت لندن متعلم جامعہ احمدیہ جو اردو اور انگریزی زبان میں بعض کتب کے مصنف بھی تھے کی ادارت میں ''مسلم ہیرلڈ'' اور شعر و سخن کا ادبی رسالہ ''قندیل'' کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔

ایک حیران کن علمی تحقیق سے ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کا الہامی ماخذ عربی زبان ہے اور عربی زبان کو امّ الالسِنہ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تمام زبانیں اس کی کوکھ سے نکلی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے فصیح و بلیغ عربی زبان کا ایک مجلّہ "اَلتَّقویٰ" کے نام سے موجود ہے جس کی ادارت عبدالمومن طاہر، منیر جاوید اور عبدالمجید عامر کر رہے ہیں۔

''تاریخِ احمدیت'' کی مستند تدوین و ترتیب کا کام محنت طلب ہے۔ اس کی پہلی انیس جلدوں کی تدوین مولانا دوست محمد شاہد نے فرمائی اور بعد کی جلدیں اسفندیار منیب نے مدوّن کی ہیں۔ مزید کام بھی ان ہی کی نگرانی اور ہدایت میں ہو رہا ہے۔

عبدالباسط شاہد نے ''سوانح فضلِ عمر'' (جس کی پہلی دو جلدیں حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے رقم فرمائی تھیں) کی تین مزید جلدوں میں تکمیل کی ہے۔

سیرت و سوانح حضرت اقدس مسیح موعود و مہدی معہود کو پچاس جلدوں میں تحریر کرنے کے عظیم منصوبے کا آغاز مبشر احمد ایاز، پرنسپل جامعہ احمدیہ ربوہ پہلی دو جلدوں کی اشاعت سے کر چکے ہیں۔

دنیا بھر سے احمدی مصنفین کی رقم فرمودہ کتب و رسائل کی اشاعت سے قبل مرکزی نگرانی میں ان کی منظوری اور اس کی ذمہ داری ایک کارِ دارد ہے اور اس بے نام علمی کام کا سارا بوجھ ایک طویل مدت تک سیّد عبدالحئی شاہد نے اٹھائے رکھا جو جامعہ احمدیہ ربوہ ہی کے سابق طالب علم تھے۔ ان فرائض کے ساتھ ساتھ لٹریچر کی تقسیم کی اہم ذمہ داری بھی موصوف ہی کے کندھوں پر رہی ہے۔

بیرونِ پاکستان لکھی گئی احمدی مصنفین کی نئی کتب کی قبل از اشاعت منظوری منیر الدین شمس کی ذمہ داری ہے جو ساتھ ہی ساتھ ایم ٹی اے کی کم از کم آٹھ زبانوں میں برابر چوبیس گھنٹوں پر پھیلی ہوئی عالمی نشریات کی نگرانی کا کام بھی کر رہے ہیں۔

قومی اور ملّی خدمات کے باب میں جامعہ احمدیہ کے طلبہ نے بیرونِ پاکستان جو اہم کردار ادا کیا ہے اور

ملکی مفادات کے مؤثر حصول اور عوام الناس کی بہبود کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا احاطہ اس مختصر مضمون میں تو ممکن نہیں ہوگا البتہ اختصاراً جستہ جستہ ایک دو باتیں عرض کرنے پر اکتفا کروں گا۔

تنزانیہ کے صدر، نیرے رے نے عمری عبیدی کو جب کہ وہ مربی کے فرائض ادا کر رہے تھے بٹورا کا ریجنل کمشنر تعینات کیا۔ موصوف نے حضور کی اجازت سے یہ عہدہ قبول کیا۔ اس کے بعد انہیں وزارتِ قانون اور کمیونٹی ڈیویلپمنٹ و کلچر کا قلمدان تفویض کیا گیا۔ عمری عبیدی نے اپنے اس قومی فریضہ کو بہت خوبصورتی سے نبھایا اور قوم نے ان کی جدوجہد کو خوب سراہا۔

عبدالوہاب آدم وہ پہلے غیر ملکی احمدی تھے جنہیں خلافتِ ثالثہ کے بابرکت عہد میں مرکز احمدیت ربوہ کے امیر مقامی ہونے کی سعادت سے نوازا گیا۔ اسی طرح وہ پہلے افریقن ہیں جو جماعت احمدیہ، غانا کے امیر بنائے گئے۔ غانا جماعت احمدیہ عالمگیر کی جماعتوں میں سے ایک بہت بڑی اور فعّال جماعت ہے جس کے وہ لمبا عرصہ امیر رہے۔ موصوف غانا کے تمام مذہبی اور سیاسی و غیر سیاسی دانشور طبقوں میں اپنی نورِ بصیرت، ہمدردی خلائق اور دانشوری کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتے تھے اور امورِ مملکت کے اہم مسائل میں آپ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ غانا کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور یگانگت، استواری، قیام امن و آشتی، ملکی استحکام، عوام الناس کی بہبود اور اس کی ضروریات اور ملک کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے میں عبدالوہاب آدم نے بلاتفریقِ مذہب و ملت بے حد خدمت کی اور خدا تعالیٰ نے ان کی خدمات کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور شیریں پھل سے نوازا۔ ملک کے عوام نے بھی ان کی خدمات کو بہت سراہا۔

یہ عبدالوہاب آدم ہی تھے جن کی وفات پر غانا کے مؤقر اخبار ''دی کرانیکل'' نے اپنی ۲۴ جون ۲۰۱۴ء کی اشاعت میں ''مولوی عبدالوہاب واز پیس پرسانیفائیڈ'' کے عنوان سے اپنے ایک طویل مضمون میں بتایا تھا کہ قومی محاذ پر وہ غانا پیس کونسل کے ممبر؛ غانا اِنٹیگرِٹی اِنیشیٹیو کے وائس چیئر مین؛ سنٹر فار ڈیماکریٹک ڈیویلپمنٹ کے بورڈ ممبر اور نیشنل رِی کنسِلیئیشن کمیشن کے ممبر رہے تھے۔ اخبار یہ بھی لکھتا ہے کہ ملک میں امن کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں کے طفیل انہیں کئی ایوارڈز سے نوازا گیا جن میں غانا کا اپنا سب سے بڑا ایوارڈ ''کمپینین آف دی آرڈر آف وولٹا'' شامل ہے۔ انہیں امریکہ کی لُوسیانہ سٹیٹ یونیورسٹی کی طرف سے انٹرنیشنل لنکن ڈِسٹِنگوشڈ لیڈرشپ ایوارڈ بھی عطا ہوا اور یونیورسٹی آف کیپ کوسٹ نے انہیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔

عبدالوہاب آدم کے بارے میں فی الحال اتنا ہی۔ اب میں ذکر کرنے جا رہا ہوں جامعہ کے پرنسپل، میر داؤد احمد کا۔ جس درس گاہ میں کسی زمانے میں انہوں نے پہلی کلاس کے طالب علم کی حیثیت سے قدم رکھا تھا اسی عظیم درس گاہ میں ایک دن انہیں استاذ الاساتذہ کی حیثیت میں مدیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ میر صاحب مرحوم کے حسنِ تدبیر، توکّل علی اللہ اور مربیانہ تدریسی روایات سے جامعہ، جامعہ کا نظام اور جامعہ کے زیرِ تعلیم طلبہ کا ہر قدم تیز رفتاری سے ترقی کی طرف گامزن رہا۔

میر داؤد احمد کی وفات کے بعد ان ہی کے برادرِ اصغر، میر محمود احمد ناصر جامعہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان کے دل و دماغ میں علوم کا جو بحرِ زخّار چھلک رہا تھا اس کے فیضِ عام سے طلبہ نے بھرپور استفادہ کیا اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جامعہ کے پرنسپل کی ذمہ داری سے فراغت کے بعد وہ ریسرچ سیل کی سربراہی کر رہے ہیں۔ اس ادارے کی تحقیقاتی مساعی کا کچھ تذکرہ آپ کے علمی مجلّہ ''موازنۂ مذاہب'' میں پڑھنے کو ملتا رہتا ہے۔

کینیڈا اور امریکہ کے اربابِ حل وعقد تک رسائی، ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے والوں سے وسیع تعلقات اور ان سے گہرے دوستانہ مراسم قائم کرنے میں بڑے کامیاب مربیان میں سے ایک نسیم مہدی، سابق امیر جماعت کینیڈا ہیں۔ کینیڈا میں ریاستی سطح پر ہر طبقہ میں ان کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور ممنونیت کے جذبات سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ جماعتی وقار کو سیاسی، معاشرتی اور دانشور حلقوں میں تقویت دینے میں موصوف کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔

مسعود احمد جہلمی کو بھی مشرق ومغرب میں ہر جگہ پبلک ریلیشنگ کی فیلڈ میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا اور ان کی مساعی مشکور بھی جماعت کی نیک نامی میں اضافے کا باعث رہی ہیں۔

شفیق قیصر صرف سیاسی، معاشرتی اور دانشور طبقہ سے ہی میل ملاپ میں نیک شہرت نہیں رکھتے تھے بلکہ مشرق کے ہر مذہبی اور علمی طبقہ کے بعض بڑوں سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ وہ خود بھی مشرقی علوم میں دسترس رکھنے والے تھے لہٰذا ان کی اپنے جیسے لوگوں سے گہری چھنتی تھی۔ مرحوم نے بھی اس میدان میں خوب نام کمایا۔

عربی ادب اور صرف ونحو، آدابِ ترتیلِ قرآن اور مشرقی افریقہ کی قومی زبان، سواحیلی کے ماہر، جمیل الرحمٰن رفیق، میر محمود احمد ناصر کے بعد جامعہ احمدیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور جب وکیل التصنیف کے عہدے پر مقرر کئے گئے تو ان کی جگہ ''راہِ ھدیٰ'' پروگرام کے مشہور ومعروف مقرر اور کئی کتب کے مصنف، مبشر احمد ایاز پرنسپل مقرر ہوئے۔ پاکستان سے باہر جامعہ یوکے کے پہلے پرنسپل، لئیق احمد طاہر مربی امریکہ و برطانیہ اور ان کے بعد عبدالسّلام ظافر بھی جامعہ کے طالب علم رہے ہیں۔ کینیڈا میں اس وقت جامعہ کے پرنسپل ہادی علی چودھری کا تعلق بھی بنیادی طور پر اسی ادارے سے ہے۔ غانا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے جامعات کی سربراہی کی توفیق بھی ربوہ کے تعلیم یافتہ اساتذہ ہی کو مل رہی ہے چنانچہ اس وقت فرید احمد نوید، عزیز احمد سیوطی اور محمد امداد الرحمٰن صدیقی علی الترتیب ان جامعات کے پرنسپل ہیں۔ وقف جدید کے زیرِ انتظام چلنے والے مدرسۃُ الظفر کے سربراہ بھی جامعہ احمدیہ کے ایک فارغ التحصیل، اقبال احمد عابد ہیں۔

جماعت احمدیہ ربوہ کے مرکزی اداروں میں سے سب سے اہم ادارہ ''صدر انجمن احمدیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس انجمن کی تاسیس بانی احمدیت حضرت اقدس مسیح موعود نے کی تھی۔ اس انجمن کے ہر شعبے کا منتظمِ اعلیٰ ناظر کہلاتا ہے۔ جامعہ احمدیہ ربوہ کے فارغ التحصیل طلبہ جو ناظر کے عہدے پر فائز ہوئے میں سے چند کے اسمائے گرامی پیشِ خدمت ہیں:

سیّد محمود احمد شاہ، ناظر اصلاح وارشاد (مرکزیہ)؛ مبشر احمد کاہلوں، مفتیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ و ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد (دعوت الی اللہ)؛ حافظ مظفر احمد ناظر اصلاح وارشاد (مقامی)؛ راجہ نصیر احمد، ناظر اصلاح وارشاد؛ سلطان محمود انور، ناظر اصلاح وارشاد؛ مرزا عبدالصمد، ناظر خدمتِ درویشاں؛ سلیم الدین، ناظر امور عامہ؛ مرزا محمد الدین ناز، ناظر تعلیم القرآن؛ محمد شفیع اشرف؛ ناظر امور عامہ؛ سیّد عبدالحیٔ شاہد، ناظر اشاعت؛ بشیر احمد قمر ناظر تعلیم القرآن اور منیر احمد بسمل، ایڈیشنل ناظر اشاعت۔ دیگر خدمات بجالانے والوں میں مجلس کارپرداز کے سیکرٹری محمد بشیر شاد اور چوہدری نصیر احمد؛ سیّد میر مسعود احمد، سیکرٹری صد سالہ جوبلی اور ناصر احمد شمس، سیکرٹری فضل عمر فاؤنڈیشن شامل ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے بعد دوسرا بڑا ادارہ ''تحریک جدید'' ہے جس کی بنیاد حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے رکھی تھی۔ تحریک جدید کے ہر صیغہ کے ناظمِ اعلیٰ کو وکیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ادارے میں جن طلبہ جامعہ احمدیہ کو خدمت کی توفیق ملی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

نواب منصور احمد خاں، وکیل التبشیر و نائب صدر تحریک جدید انجمن احمدیہ؛ عبدالماجد طاہر، ایڈیشنل وکیل التبشیر یوکے؛ اللہ بخش صادق، وکیل التعلیم؛ منیر الدین شمس، ایڈیشنل وکیل التصنیف یوکے؛ نصیر احمد قمر، ایڈیشنل وکیل الاشاعت۔

حضرت خلیفۃ المسیح کا پرائیویٹ سیکرٹری ہونا ایک بہت اہم خدمت اور سعادت ہے۔ جن خوش قسمت طلبہ جامعہ کے نصیب میں یہ اعزاز آیا ان میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

بشیر احمد رفیق، عبدالحکیم اکمل، مسعود احمد جہلمی، مبارک احمد، محمد یحییٰ، ہادی علی، نصیر احمد قمر، نسیم مہدی اور منیر احمد جاوید۔ منیر جاوید کو خدا کے فضل سے لمبے عرصے سے اس فریضہ کی ادائیگی کی توفیق مل رہی ہے۔

مرکزی مجلس انصار اللہ کے صدر کے طور پر حافظ مظفر احمد اور مرکزی مجلس خدام الاحمدیہ کے صدر کے طور پر اب تک میر داؤد احمد، مرزا رفیع احمد، صاحبزادہ مرزا طاہر احمد، حافظ مظفر احمد، راجہ منیر احمد، سیّد محمود احمد شاہ، فرید احمد نوید اور سہیل مبارک شرما کو خدمت کی توفیق ملی ہے۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت اقصائے عالم میں خلافت احمدیہ کی مؤیَد مِنَ اللہ فعّال روحانی قیادت کی برکت سے آئے دن جو نئے مراکزِ احمدیت اور نومبائعین کی نئی جماعتیں معرضِ وجود میں آ رہی ہیں ان کی تعداد دوصد ممالک سے تجاوز کر چکی ہے۔ اکمالِ دین اور اشاعت رشد وہدایت کی اس عالمگیر بابرکت مہم میں نئی سے نئی سرزمینوں میں فتوحاتِ دین کے دروازے کھلتے چلے جا رہے ہیں اور ان معرکوں کے دوران دینی خدمات پیش کرنے والوں کی فہرست میں جامعہ احمدیہ کے خدام کا نام صفِ اول کے مجاہدین میں شامل ہے۔

خدا کے فضل اور خلافت کی برکت سے طلبہ جامعہ نے ایک ایسی غیر معمولی خدمت کی بھی توفیق پائی جس کا تعلق اس مدرسہ کی نصابی سرگرمیوں سے نہیں تھا اور وہ ہے تحفظِ پاکستان کی سنہری خدمت۔ حضرت مصلح موعود

کے حکم سے طلبہ جامعہ نے رضا کارانہ طور پر عسکری تربیت حاصل کر کے بغیر کسی معاوضے کے آزاد کشمیر کے جہاد میں بھرپور حصہ لیا اور محاذِ کشمیر کی وہ سرحدیں جن کا تحفظ ان کا فریضہ قرار دیا گیا تھا اس کی حفاظت مجاہدین کی طرح دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ اور توپوں کی اندھادھند بمباری کے سامنے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر کی اور ابتلا کے اس کڑے وقت میں اپنے پیارے وطن، مملکت اسلامیہ پاکستان سے وفاداری کا عملی نمونہ پیش کیا۔

ہمارے پیارے امام سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے اپنی حیاتِ طیبہ کے کچھ قیمتی لمحات بنفسِ نفیس طلبہ جامعہ کی معیّت میں گزار کر اس ادارے کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

طلبہ جامعہ اپنی تمام تر کم مائیگی، تقصیرات، نااہلیوں اور ناسپاسیوں کے باوجود عملی زندگی میں کچھ قابلِ ذکر کر پائے تو خدا کی خاص عطا کی ہوئی توفیق، خلفائے وقت کی توجّہات کریمانہ اور ان کی دعاؤں ہی سے کر پائے ہیں۔ خدا کرے طلبہ جامعات احمدیہ کو اس کی پسندیدہ راہوں پر چلنے کی ہمیشہ توفیق ملتی رہے اور انجام بخیر ہو۔''

یہ تو تھا اُن لوگوں کی خدمات کا اجمالی جائزہ جو جامعہ احمدیہ، ربوہ کے فارغ التحصیل تھے تاہم میرے زمانۂ ربوہ میں اس شہر میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اس ادارے سے باقاعدہ طور پر تعلیم تو حاصل نہ کی تھی مگر انہوں نے خدمتِ سلسلہ کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور اُن میں سے بعض اشاعتِ دین کی خاطر سالہا سال ممالکِ غیر میں زندگی گزار چکے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہمارے ماحول میں عام طور پر ''واقفینِ زندگی'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اگلے باب میں جامعہ کے فارغ التحصیل بعض مزید افراد کے علاوہ ایسے ہی کچھ احباب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

جن کی نظروں سے بدلنے کو ہے تقدیرِ جہاں: عام ہیں وہ صاحبِ اِیقان تیرے شہر میں

ربوہ میں اپنے مستقل قیام جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۵ء تک کے سولہ سالوں پر محیط تھا کے دوران مجھے جن احباب سے میل جول کا موقع ملا ان میں سے بہتوں کا ذکر ''قریۂ جاوداں'' میں آ چکا ہے۔ ان میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میرے اساتذہ اور تعلیم الاسلام کالج میں میرے پروفیسر صاحبان، میرے کلاس فیلوز اور میرے محلّہ داران شامل ہیں۔ اسی طرح ربوہ کے کاروباری لوگوں، ڈاکٹروں، حکیموں اور عطائیوں اور کھلاڑیوں حتّٰی کہ مجذوبوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے تاہم میری دانست میں اس کتاب میں واقفینِ زندگی کا ذکر قدرے کم ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تحریک پر اپنی زندگی جماعت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی اور جن میں سے بہتوں کا زیادہ وقت بیوی بچوں سے دور ممالکِ غیر میں اشاعتِ دین میں گزرا تھا۔ ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے اور ان سب کے حالاتِ زندگی یا محاسن بیان کرنا میرے بس میں بھی نہیں لیکن کچھ لوگ یقیناً ایسے تھے جن کے ساتھ میری جان پہچان کے متنوّع حوالے موجود تھے۔ اگرچہ میں ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دوستی یا گہرے ذاتی تعلقات کا دعویٰ نہیں کر سکتا تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان سے تعارف حاصل تھا اور کبھی کبھار ان سے ملاقات کا موقع بھی ملتا رہتا تھا مجھے ان کی مجلس میں بیٹھنے کا کم موقع ملا لیکن اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ میں ان سب سے براہِ راست متعارف تھا، وہ مجھے پہچانتے تھے، میری عزت کرتے تھے اور کبھی دیکھ لیتے تو رک کر حال احوال پوچھے بنا آگے نہ جاتے۔ ظاہر سی بات ہے ان کے ساتھ میرے تعارف کا بڑا حوالہ اباجی کی ذاتِ گرامی ہی تھی۔ خدا تعالیٰ اباجی کے ساتھ ساتھ ان سب بزرگان کی بھی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔

ان احباب میں سے سب سے پہلے کچھ ذکر حضرت قریشی محمد اسماعیل معتبر کا لیکن کیا آپ کو پتا ہے کہ ان سے میری پہلی ملاقات کس طرح ہوئی تھی؟

۱۹۵۰ء کی دہائی کے نصف آخر میں جب میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ، صادقہ کے لیے قریشی سعید احمد اظہر، مربی سلسلہ کے رشتے کی تجویز زیرِ غور تھی تو میں نے پہلی بار ان کے والدِ مرحوم، حضرت ماسٹر محمد علی اظہر اور ان کے چچا، حضرت قریشی محمد اسماعیل معتبر کا نام سنا اور انہیں دیکھا۔ اگرچہ میری اور ان دونوں بزرگان کی عمر میں تفاوت کے سبب میرے ان سے بے تکلفانہ مراسم کا تو کوئی امکان نہ تھا لیکن ان کے ساتھ احترام کا جو رشتہ پہلے دن قائم ہوا ساری زندگی برقرار رہا۔ جب یہ ربط مزید بڑھا تو میں اسماعیل معتبر کے صاحبزادوں قریشی مقبول احمد، مربی سلسلہ؛ قریشی محمود احمد، نائب امیر جماعت احمدیہ، لاہور؛ قریشی مسعود احمد جو مدتوں سے امریکہ میں مقیم ہیں

اور قریشی شجاع الدین مقیم پشاور اور ان کی صاحبزادی، منظور النساء پروفیسر جامعہ نصرت کے حلقۂ احباب میں شامل ہوگیا۔ اسماعیل معتبر تحریک جدید کوارٹرز میں میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب، واقفِ زندگی نمبر ا کے پڑوس میں رہتے تھے چنانچہ میں جب اپنے ماموں کے ہاں جاتا تو بسا اوقات ان سے بھی ملاقات ہوجاتی۔ وہ اُن دنوں آڈیٹر تحریک جدید انجمن احمدیہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خاندان سے روابط مزید مضبوط ہوئے تو احساس ہوا کہ اس میں شرافت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے اور یہ خاندان بہت محبت کرنے والے افراد پر مشتمل ہے۔

اسماعیل معتبر جنہیں حضرت مسیح موعود کی رفاقت کا شرف بھی حاصل تھا ۱۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو مانسہرہ میں بعمر ۷۲ سال وفات پاگئے۔ مرحوم اپنی صاحبزادی، منظور النساء کے پاس گئے ہوئے تھے کہ دستِ اجل نے آلیا۔ ان پر چند روز پہلے نماز جمعہ کے دوران فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ ان کی نعش ربوہ لائی گئی۔ تدفین بہشتی مقبرے کے قطعہ رفقائے خاص میں عمل میں آئی۔ مجھے یاد ہے میں بھی مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شامل ہوا تھا۔ اباجی کی وفات ان سے قریباً ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اباجی کی طرح مرحوم کا جنازہ بھی صاحبزادہ مرزا ناصر احمد نے پڑھایا اور بعد از تدفین دعا بھی آپ ہی نے کرائی تھی۔

الفضل ۱۳ نومبر ۱۹۶۴ء کی اطلاع کے مطابق: ''مرحوم ۱۹۰۶ء میں سیّدنا حضرت مسیح موعود کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے تھے۔ ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اس دوران میں آپ مختلف مقامات پر سیکرٹری مال، پریذیڈنٹ یا امیر جماعت خدمات بجالاتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے خدمتِ سلسلہ کے لیے اپنی زندگی وقف کی۔ آپ پہلے پنشنر تھے جن کا تحریک جدید میں وقف منظور ہوا۔ آپ نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک تحریکِ جدید میں بطور آڈیٹر کام کیا۔ بعد ازاں آپ آخر تک وقفِ جدید اور ادارۃ المصنفین میں بطور آڈیٹر خدمات سرانجام دیتے رہے۔''

حدیث پاک میں ہے کہ تم میں سے بہتر اسی شخص کو قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے اہل وعیال کے لیے بہتر ہو۔ مجھے ذاتی طور پر تو ان کی زندگی کا یہ پہلو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم منظور النساء بتاتی ہیں: قیامِ پاکستان کے وقت اباجان جھانسی میں تھے۔ آپ نے وہاں سے کوئٹہ تبادلہ کرانے کے بعد ریٹائرمنٹ لے لی اور زندگی وقف کر کے پہلے لاہور اور پھر ربوہ آگئے۔ اس وقت یہاں کچے مکان بن چکے تھے۔ ہم نے بھی اسی طرح کے ایک مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ میں نویں کلاس میں نصرت گرلز ہائی سکول میں داخل ہوئی اور ۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میں اللہ کے فضل سے یونیورسٹی میں پانچویں نمبر پر رہی تھی اور میری خواہش تھی کہ میں کالج میں پڑھوں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اُسی سال جامعہ نصرت، ربوہ کی ابتدا ہوئی جس کی شاید پورے قصبہ میں سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی تھی مگر میرے والدین میری اس خواہش سے لاتعلق ہو کر میری شادی کا پروگرام بنا رہے تھے چنانچہ مجھے کالج میں داخل ہونے کے لیے بہت پاپڑ بیلنا پڑے۔ میری والدہ کی رائے تھی کہ مجھے کالج میں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اباجان نے مخالفت تو نہیں کی مگر امی کی رائے کے احترام میں کالج میں داخل ہونے کی

اجازت بھی کھلے دل سے نہ دی۔ میرے اصرار پر انہوں نے آہستہ آہستہ میری والدہ کو بالآخر میرے کالج میں داخلے پر رضامند کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اباجان امی کی بے حد عزت کرتے تھے اور میں نے اپنی پوری زندگی میں اُنہیں امی کو ایک سخت لفظ بھی کہتے نہیں سنا تھا۔

اسماعیل معتبر کے ایک داماد، قاضی محمد یوسف نے الفضل ۲۹ نومبر ۱۹۶۴ء میں مرحوم کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے ان کی بعض ایسی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو ہم سب کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں: ''میں ۱۹۴۱ء میں فوجی ملازمت کے دوران کوئٹہ میں مقیم تھا۔ بیتِ احمدیہ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں ہر روز چھاؤنی سے چل کر بیت میں نماز پڑھنے آیا کرتا اور مغرب وعشاء دونوں باجماعت پڑھ کر واپس جاتا۔ میرے اس شوق کو دیکھ کر آپ نے مجھے اپنا داماد ہونے کا شرف عطا فرمایا اور اس سلسلے میں مزید کسی تحقیق کو ضروری نہ سمجھا۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی تھی اور ان کی دین کے ساتھ محبت کی ایک جھلک ......

آپ سلسلے کی خدمت میں بہت راحت محسوس کرتے یہاں تک کہ اس کے مقابلہ میں دنیوی منفعت کو بھی ٹھکرا دیتے۔ ایک دفعہ سرکاری ملازمت میں ترقی کا موقع پیدا ہوا جس کے لیے دوسری جگہ تبدیل ہو کر جانا تھا مگر آپ نے اس تبدیلی سے انکار کر دیا کیونکہ اس جگہ پر سلسلے کی اہم خدمات آپ کے سپرد تھیں اور وہ ان خدمات کو ترجیح دیتے تھے......

جب حضور نے احبابِ جماعت کو تلقین فرمائی کہ واقفینِ زندگی آپ سب کے لیے معزز ہیں، ان سے رشتہ ناتہ کرنے میں تأمل نہیں کرنا چاہیئے تو آپ نے اس حکم کی تعمیل میں اپنی دوسری بیٹی مولوی غلام احمد مبشر، سابق مربی عدن سے بیاہ دی۔ اس سے پہلے آپ کی بڑی لڑکی خاکسار کے عقد میں آچکی تھی۔ آپ کا بڑا لڑکا پہلے ہی وقف میں تھا۔ آپ کی سب سے چھوٹی لڑکی منظور النساء ایم اے جامعہ نصرت میں پروفیسر ہیں۔ گویا آپ کی اولاد میں سے نصف عملاً سلسلے کی خدمت بجالانے کی توفیق پا رہے ہیں۔''

یہاں شاید یہ امر قابلِ ذکر ہو کہ ربوہ میں ریلوے سٹیشن کے قیام پر ریل کے سفر کے لیے ربوہ سے پہلا ٹکٹ اسماعیل معتبر نے خریدا تھا۔ ملاحظہ ہو کیپٹن (ر) خادم حسین کی کتاب ''ربوہ: دارالہجرت'' کا باب بعنوان ''بعض قابلِ ذکر باتیں''۔

میں جب بھی بہشتی مقبرہ جاتا ہوں تو اسماعیل معتبر کی قبر جو ''برلبِ سڑک'' ہے دیکھ کر مرحوم کی ساری خوبیاں یاد آجاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے قریشی مقبول احمد ان ہی اسماعیل معتبر کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور ان سے میرا پہلا تعارف اسی وقت ہوا جب ان کی زوجۂ اول، نعیمہ اپنے بھائی کے رشتے کے سلسلے میں ہمارے گھر آنے جانے لگیں۔ ان دنوں ان کی رہائش بھی تحریک جدید کوارٹرز میں تھی اور ان کی ایک ہی بیٹی، نصیرہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ نصیرہ عمر میں مجھ سے کتنی چھوٹی تھی لیکن مجھے اس کے ساتھ کھیلنا یاد ہے۔ بعد میں اس کی شادی پروفیسر حبیب اللہ خان کے صاحبزادے، کلیم اللہ سے ہوگئی۔ قریشی مقبول احمد کے امریکہ ہی میں آباد

ہو جانے کے بعد ان کی یہ بیٹی اور بعد میں پیدا ہونے والا بیٹا، نصیر بھی امریکہ منتقل ہو گئے۔

مقبول جب ربوہ ہوتے ان سے ملاقات رہتی تھی لیکن ان کے امریکہ منتقل ہونے کے بعد یہ ملاقات محدود ہو کر رہ گئی۔ کبھی وہ آتے اور اتفاقاً مل جاتے تو بہت محبت کا اظہار فرماتے۔

موصوف ۳۰ جون ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی حلیم الطّبع اور منکسرُ المزاج تھے اور اسماعیل معتبر نے ان کی اوائل عمری میں ہی انہیں وقف کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالی اور والد بزرگوار نے ان سے اس بارے میں رائے طلب کی تو مقبول نے ان کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور فوراً اپنی زندگی سلسلے کی خدمت کے لیے وقف کر دی جس کی منظوری جولائی ۱۹۴۶ء میں موصول ہوئی۔ یہ دن مقبول اور ان کے والد، دونوں کے لیے عید کا دن تھا۔

منظور النساء بیان کرتی ہیں: ہمارے ابا جان کی تبدیلی جگہ جگہ ہوتی رہتی تھی اس لیے انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر قادیان کے محلّہ دارالرحمت میں میرے تایا، ماسٹر محمد علی اظہر کے مکان کے ساتھ ہی گھر تعمیر کرا کے ہمیں ہماری والدہ اور بھائی مقبول کے ہمراہ چھوڑ دیا تا کہ ہماری تعلیم و تربیت قادیان کے پاکیزہ ماحول میں ہو۔ بھائی مقبول نے اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی۔ انہوں نے ہی ہم سب بہن بھائیوں کو نماز سکھائی، پنج وقتہ نماز کا عادی بنایا اور قرآن کریم پڑھایا۔ انہوں نے حصولِ تعلیم میں بھی اپنے بہن بھائیوں کی ہر ممکن مدد کی۔ وہ سارے گھریلو معاملات کی سرپرستی کرتے اور ہمارے ساتھ پیار بھرا سلوک روا رکھتے جس کی وجہ سے ہمیں والد صاحب کی کمی زیادہ محسوس نہ ہوتی۔

موصوفہ بتاتی ہیں: قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ جماعتی حالات بے حد مخدوش تھے مگر بھائی کو انگلستان بطور مربی بھیجنے کا انتظام ہو چکا تھا چنانچہ انہیں ۲۴ جنوری ۱۹۴۸ء کو درد بھری دعاؤں کے ساتھ لاہور سے رخصت کر دیا گیا۔ کراچی سے بحری جہاز پر روانہ ہوتے وقت آپ کی اہلیہ اوّل کی یہ حالت تھی کہ پاؤں بھی بھاری اور سر بھی بھاری اور گود میں دو سالہ کی بچی کی آہ و زاری۔ بیٹی کو بخار کی تپش، ماں کو جدائی کی خلش۔ انجانے خوف سے بہتے ہوئے آنسوؤں اور دعاؤں سے شوہر کو ترویجِ دین کے لیے دیارِ غیر کے لیے رخصت کیا۔ کوئی ایک ماہ بعد یہ جہاز ساحلِ انگلستان سے لگا۔ وہ لندن میں تقریباً چار سال تک ظہور احمد باجوہ کے ماتحت بحیثیت سیکرٹری مشن خدمتِ دین کی بجا آوری میں مصروف رہنے کے بعد ۹ دسمبر ۱۹۵۱ء کو مرکز واپس آئے۔ اس عرصہ میں ان کا دو سالہ بچہ منصور جو اُن کی بیرونِ ملک روانگی کے بعد پیدا ہوا تھا وفات پا چکا تھا۔ نہ دُور افتادہ باپ بچے کی شکل دیکھ سکا اور نہ اپنے جیون ساتھی کو صدمے کی اس کیفیت میں رفاقت دے سکا۔

ربوہ آنے پر وہ جامعۃ المبشرین میں پروفیسر مقرر ہوئے اور تدریس کے علاوہ جامعہ کے لائبریرین کے فرائض کی ادائیگی بھی ان ہی کی ذمہ داری ٹھہری۔

۱۹۶۰ء میں انہیں آئیوری کوسٹ میں نئے مشن کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی۔ چونکہ یہ ملک ان ہی دنوں آزاد ہوا تھا اس لیے انہیں وہاں کے ویزے کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑی۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۰ء کو ربوہ

سے روانہ ہو کر لیگوس پہنچے۔ اس زمانے میں فرانسیسی سفارت خانہ آئیوری کوسٹ کے سیاسی و ملکی مفادات کا نگران تھا۔ ویزے کی درخواست دی گئی مگر تین ماہ تک کوئی جواب نہ ملا۔ مرکز کی ہدایت کے مطابق غانا جا کر کوشش کی گئی اور فرانسیسی سفارت خانہ کی ہدایت و یقین دہانی پر کہ انہیں ایئر پورٹ پر ویزا دے دیا جائے گا وہ ۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو آئیوری کوسٹ کے صدر مقام، آبی جان جا پہنچے مگر انہیں ویزا دینے کی بجائے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ملک چھوڑنے کو کہا گیا چنانچہ وہ واپس غانا آ گئے اور نئے سرے سے ویزے کی درخواست دی۔ اسی دوران وہ سینیگال اور گیمبیا میں پیغامِ حق پہنچانے میں مصروف رہے جس کے بعد انہیں آئیوری کوسٹ کا ویزا مل گیا چنانچہ وہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو وہاں پہنچے۔

آئیوری کوسٹ میں قیام کے دوران انہیں علم ہوا کہ اٹلی کی ایک کمپنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی فلم بنانے یا پیش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اٹلی کے سفیر کو توجہ دلائی تو موصوف نے جواب دیا کہ آپ خاطر جمع رکھیں اگر ہماری کوئی کمپنی ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی بھی ہے تو حکومت اسے اس امر کی اجازت نہیں دے گی۔

اسی دوران احمدیہ مشن کی طرف سے جولا اور فرنچ زبان میں قرآن کریم کے پہلے پارہ کا ترجمہ ڈُپلیکیٹنگ مشین پر طبع ہو کر شائع ہوا جو مقبول ہی کی کوششوں کا رہینِ منت تھا۔

آئیوری کوسٹ میں قریباً تین سالہ قیام کے بعد وہ ربوہ واپس آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ایم اے (عربی) کا امتحان پنجاب یونیورسٹی میں اول رہ کر پاس کیا جس کے بعد انہیں بطور مشنری امریکہ بھیجا گیا۔ وہ ۶ ستمبر ۱۹۶۷ء کو وہاں پہنچے اور ڈیٹن ان کا ہیڈ کوارٹر طے پایا۔

منظور النساء کے الفاظ میں: وہ ایک دراز قد، دبلے پتلے، چاق و چوبند اور سادہ منش انسان تھے۔ عموماً شیروانی اور پتلون پہنتے۔ سر پر ہمیشہ قراقلی ٹوپی رکھتے۔ کبھی کبھار شیروانی کے ساتھ شلوار بھی پہنے نظر آتے۔ یوں تو وہ تیز رو تھے مگر طبع و میلان میں تحمل تھا۔ تصنع اور ظاہر داری نام کو نہ تھی۔ خلافت کے فدائی اور تعلیم و تدریس کے شیدائی تھے۔ ہر ایک سے عزت و تکریم سے پیش آنا ان کا شیوہ تھا۔ وضع قطع سے ان کی شرافت اور بات چیت سے ان کی ظرافت ہویدا تھی۔ علمی مجالس میں ان کے تبحّر علمی کا اندازہ ہوتا اور بذلہ سنجی کے پہلو نمایاں ہوتے۔ رہن سہن میں سادگی تھی۔ وسعتِ قلبی کا یہ عالم تھا کہ اپنا پیٹ کاٹ کر نادار و مستحقین کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ طبیعت میں اتنی انکساری اور غیوری تھی کہ کسی سے اپنا کام لینا یا کہنا دوبھر ہو جاتا۔ احسان لینے سے ہمیشہ گریزاں رہتے۔ بغیر بتائے کسی کے ہاں نہ جاتے۔ اگر بوجوہ کسی کے ہاں رات ٹھہرنا پڑتا تو حجاب محسوس کرتے اور میزبان کو دعائیں دیتے رخصت ہوتے۔ اپنی تکلیف اور غم و غصہ کو دبا جاتے اور دوسروں کی تند و تلخ سن کر سہہ جاتے مگر مشفقانہ اور ناصحانہ انداز میں اصلاح کے واسطے حق کی نشاندہی کر دیتے۔ اپنے تو اپنے بیگانے بھی ان کی منصفانہ تحمل مزاجی دیکھتے ہوئے اپنے دکھڑے لے آتے اور مشورے کے طالب ہوتے۔ کئی لوگ اپنی امانتیں ان کے حوالے کر جاتے۔

موصوفہ کہتی ہیں: میرے بھائی سچے، سادہ اور سیدھے انسان تھے۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔

والدین کی دل و جان سے خدمت کرتے۔ ان پر بیماری یا اور کوئی تکلیف آجاتی تو سخت پریشان ہوجاتے۔ دُور کے رشتے داروں کے ساتھ بھی تعلق رکھتے، ان کی ضروریات پوری کرتے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ مشنری تھے اور ان کی آمدنی محدود تھی مگر وہ کفایت شعار تھے، کنجوس نہ تھے اور موقع محل کے مطابق وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے۔ جب میری بہن امتہ الحفیظ بیوہ ہوئیں تو لمبا عرصہ تک ماہوار اُن کو کچھ نہ کچھ رقم بھیجتے رہے۔ انہوں نے بڑی فعّال اور پُروقار زندگی گزاری اور عمر کے آخری حصے میں جسمانی کمزوری کے باوجود کسی پر بوجھ بننا پسند نہ کیا۔ اپنی گاڑی خود چلا کر ضرورت کی اشیاء لاتے اور صبح اپنا ناشتہ خود ہی تیار کرتے۔ کہتے تھے کہ میری بیوی نماز پڑھ کر سو جاتی ہے لہٰذا اُسے جگانا مناسب نہیں۔ اپنے بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ بے تکلف تھے چنانچہ ہم جب کبھی میری لینڈ جاتے تو میرے بچے گھنٹوں ان کے پاس بیٹھتے، ان کی باتیں سنتے اور بہت کچھ سیکھ کر واپس گھر آتے۔ آپ اپنی خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کی خوشیوں کا خیال رکھتے تھے۔

منظور النساء موصوف کی بعض دیگر خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں: ضعیف العمر اور دل کے مریض ہونے کے باوجود وہ آخری وقت تک جمعہ کی نماز ادا کرنے بیتُ الذکر جاتے رہے۔ اس دن تمام رشتے دار اُن کے ہاں جمع ہوتے۔ وہیں کھانا ہوتا اور سب لوگ مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھنے کے بعد گھروں کو لوٹتے۔ یہ آپ کے حسنِ سلوک اور آپ کے وجود کی برکت تھی۔ وفات سے دو سال قبل جب کہ ان کا دل بہت کمزور ہوچکا تھا وہ جلسہ سالانہ انگلستان کے لیے تیار ہوئے اور اپنے ڈاکٹر سے اجازت لینے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کا دل تو اتنا کمزور ہے معلوم نہیں اگلے منٹ میں دھڑکنا چھوڑ دے اس لیے آپ ضرور جائیں اور اپنی زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ اس کے بعد آپ اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ میرے دوسرے بھائی، قریشی محمود احمد بھی لاہور سے آئے ہوئے تھے سو جلسہ کے بعد دونوں بھائیوں نے ایک ماہ آپا قیوم کے ہاں اکٹھے گزارا اور تینوں بہن بھائی طویل عرصہ کے بعد اپنی اس ملاقات پر بہت خوش ہوئے۔ بعدازاں وہ دو سال زندہ رہے۔ کافی کمزور تھے مگر خدا کے فضل سے پچاسی سال تک فعّال اور نافع الناس زندگی گزاری۔ آخر میں پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا جس کی وجہ سے آپ ۲۴ مئی ۲۰۰۷ء کو مولائے حقیقی سے جا ملے اور امریکہ میں ہی اپنی اہلیۂ اول کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوفہ کہتی ہیں: اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتی ہوں کہ جس زمانے میں خلیفۃ المسیح الرّابع جامعہ میں پڑھتے تھے بھائی مقبول وہاں پڑھاتے تھے اور اس بات کا ذکر خود حضور نے میرے ساتھ ایک ملاقات میں فرمایا اور میرے بھائی کے ساتھ ملاقات میں بھی کیا۔

قریشی مقبول احمد کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ اب میں ذکر کرنے جا رہا ہوں ایک اور واقفِ زندگی کا جو مقبول کے بہنوئی تھے اور جن کی ساری زندگی خدمتِ سلسلہ میں گزری۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ قاضی محمد یوسف کی طرف ہے جو اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ ہمارے خاندان کا ان کے سسرالی خاندان کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ وہ پرانی وضع کے بزرگ تھے لہٰذا ان بظاہر غیر اہم رشتوں کو بھی اہمیت دیتے چنانچہ

جہاں ملتے بے حد محبت کے ساتھ۔ یوں بھی اپنے ماموں زاد بھائی، مرزا محمد اسماعیل، کارکن دفتر تحریک جدید کی وجہ سے میرا اس دفتر میں آنا جانا لگا رہتا تھا چنانچہ گاہے بگاہے ان سے آمنا سامنا ہوجاتا۔ ہمیشہ مسکرا کر ملتے اور سب کی خیریت معلوم کیے بغیر نہ جانے دیتے۔

موصوف شیخ پور ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں خدمتِ دین کے لیے زندگی وقف کرنے کی سعادت پائی۔ کچھ عرصہ سندھ کی اراضیات پر بطور اکاؤنٹنٹ کام کرتے رہے۔ بعدۂ تحریک جدید کے مختلف دفاتر میں اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ رہ کر طویل خدمات کی توفیق پائی۔

۱۹۸۵ء میں وہ اپنے بیٹے، محمد سلیمان کے پاس انگلستان چلے گئے اور حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی ہدایت پر لندن مشن میں بطور اکاؤنٹنٹ کام کرنے لگے۔ اسی دوران بیمار ہوئے۔ علاج معالجہ کے باوجود جب خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تو حضور کی اجازت سے اگست کے اوائل میں پاکستان واپس آگئے۔ علاج یہاں بھی جاری رہا لیکن کمزوری دن بدن بڑھتی رہی۔ آخر ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء بروز جمعہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے۔

ضمیمہ ماہنامہ انصاراللہ بابت ستمبر ۱۹۸۶ء کے مطابق ''قاضی صاحب بہت سیر چشم، متوکّل اور قناعت شعار واقع ہوئے تھے۔ نمازِ باجماعت خاص التزام سے ادا کرتے۔ سالہا سال تک بیت المحمود میں امام الصلوٰۃ کے فرائض ادا کیے۔ فارغ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت بکثرت کرتے۔ قرآن مجید کا خاصہ حصہ حفظ کیا ہوا تھا۔''

قاضی محمد یوسف کے بعد اب کچھ ذکر حافظ بشیر الدین عبیداللہ کا جو اباجی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ میں ''قریۂ جاوداں'' میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب وہ پہلی بار بیرونِ ملک تشریف لے گئے تو کراچی میں قیام کے دوران انہوں نے میرے لیے دو روپے تحفتاً بھجوائے تھے جس سے کئی دن میری لذّتِ کام و دہن کا سامان فراہم ہوتا رہا۔ بعد میں وہ جب ربوہ آتے ضرور ملاقات کا موقع عنایت فرماتے اور اتفاقاً آمنا سامنا ہونے پر ضرور حال احوال دریافت کرتے۔ ان کے بڑے صاحبزادے، منیر الدین عبیداللہ مجھ سے ایک یا دو سال سینئر تھے جب کہ چھوٹے صاحبزادے، نصیر الدین عبیداللہ سکول اور کالج میں میرے ہم جماعت رہے اور ان کی اہلیہ نصیرہ نزہت جو حضرت ماسٹر مولا بخش، رفیق حضرت مسیح موعود کی صاحبزادی تھیں اور لمبا عرصہ ماہنامہ ''مصباح'' کی ایڈیٹر رہیں میری کرمفرماؤں میں سے تھیں۔ ۱۹۸۹ء میں جب میں پہلی بار انگلستان گیا اور نصیر الدین عبیداللہ کے پاس ٹھہرا تو ان دنوں وہ بھی وہیں مقیم تھیں چنانچہ لندن میں اپنے قیام کے دوران مجھے ان سے خصوصی اکتسابِ فیض کا موقع ملتا رہا۔ اب نہ بشیر الدین عبیداللہ حیات ہیں، نہ نصیرہ نزہت۔ نصیر الدین عبیداللہ کی ذات غنیمت ہے جو اپنی صحت کے بہت سے مسائل کے باوجود میرے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں۔ خدا انہیں عمرِ خضر عنایت فرمائے۔

حافظ بشیر الدین عبیداللہ حافظ عبیداللہ کے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۰ء کو ماریشس میں پیدا

ہوئے جہاں ان کے والدِ بزرگوار اعلائے کلمۃ اللہ کے سلسلے میں مقیم تھے۔ موصوف ابھی بمشکل تین سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا چنانچہ ان کے دادا، حضرت حافظ غلام رسول وزیر آبادی، رفیق حضرت مسیح موعود ماریشس سے اس بچے کو قادیان لے آئے اور مدرسہ احمدیہ میں داخل کرادیا۔ انہوں نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کردی۔ انہیں پہلی بار ۱۹۵۱ء میں ماریشس بھجوایا گیا جس کے بعد وہ مشرقی افریقہ، گنی، سیرالیون، لائبیریا اور گیمبیا میں بطور مربی خدمات بجالاتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۵ء تک جاری رہا۔ ہاں! دسمبر ۱۹۷۵ء میں ربوہ واپس آنے کے بعد وہ تادمِ آخر یہیں مقیم رہے۔

موصوف کی وفات پر جو سات اور آٹھ نومبر ۱۹۸۰ء کی درمیانی شب ہوئی سیّد احمد علی سیالکوٹی، نائب ناظر اصلاح وارشاد مقامی نے الفضل (۲ دسمبر ۱۹۸۰ء) میں اپنے مضمون میں لکھا:

''حافظ بشیرالدین عبیداللہ...... میرے ساتھ جنوری ۱۹۷۸ء سے اب تک...... کام کررہے تھے۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مرحوم بہت خوش خلق، ملنسار، محبّ، غم خوار، غریب پرور، منکسرُ المزاج، فرمانبردار، اطاعت گزار، وقت کے پابند، مہمان نواز، غربا کی خفیہ طور پر مدد کرنے والے تھے۔ مرحوم پنجابی، اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، فرانسیسی اور یوگنڈی زبان جانتے تھے۔ بیرونی ممالک سے آمدہ فرانسیسی زبان کے خطوط کا ترجمہ اکثر ان ہی سے کروایا جاتا۔ آپ نہایت شیریں زبان مقرر، خوش الحان، بہت عمدہ طرز و آواز سے تلاوتِ قرآن کریم کرنے والے تھے......

آپ دوسرے کی تکلیف سے بہت بے چین ہو جاتے تھے۔ گزشتہ دنوں میں میری تین دفعہ بیماری میں میں نے ان کو یوں پریشان اور بے چین دیکھا جیسا کہ میری بجائے وہ خود ہی بیمار ہیں۔ کہیں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں میرے لیے دعا کے خط لکھ رہے ہیں، کہیں ڈاکٹر صاحب کو بلانے اور دوائیاں لانے میں مصروف ہیں۔''

میں سمجھتا ہوں حافظ بشیرالدین عبیداللہ کا ذکرِ خیر نامکمل رہے گا اگر یہاں پر ان کے برادرِ نسبتی، مولانا عبدالقادر ضیغم کا ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ماسٹر مولا بخش، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے اور عطاالرحمٰن طالب، پروفیسر جامعہ احمدیہ کے بھائی تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احمدیہ اور پھر جامعہ احمدیہ میں حاصل کی اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور بعدہٗ ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی طرف سے وقفِ زندگی کی تحریک پر انہوں نے لبیک کہا چنانچہ انہیں دو مختلف اوقات میں امریکہ بطور مربی بھجوایا گیا۔ وہ مجموعی طور پر قریباً گیارہ سال وہاں رہے جس کے بعد وہ تحریک جدید کے مختلف شعبوں میں اپنے مفوّضہ فرائض نہایت اخلاص، محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ نائب وکیل التبشیر کے طور پر کام کررہے تھے۔ انہیں اباجی کے حافظ بشیرالدین عبیداللہ کے ساتھ مراسمِ دوستانہ کا علم تھا اور اسی لحاظ سے وہ مجھ سے بھی ہمیشہ بہت محبت اور حسنِ اخلاق سے پیش آتے۔

انہوں نے پندرہ اور سولہ فروری ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب بعمر ۵۴ سال وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں

دفن ہوئے۔ وہ ابوالعطا جالندھری کے شاگردِ رشید تھے چنانچہ انہوں نے الفضل (۲۲ فروری ۱۹۷۷ء) میں مرحوم کے بارے میں اپنے ایک مختصر مضمون میں لکھا کہ ''ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ وہ کام کر کے اِترانے والوں میں سے نہ تھے۔ خاکساری ان کا طریق تھا۔''

ان کی وفات کے بہت عرصہ بعد سید کمال یوسف مربی سلسلہ کے ساتھ ایک حالیہ ملاقات میں نہ جانے کس طرح عبدالقادر ضیغم کا بھی ذکر آ گیا۔ کمال یوسف نے بتایا کہ مرحوم نے ۱۹۷۴ء کے پُرآشوب دور میں مختلف جماعتوں کے باہمی رابطے کے سلسلے میں بعض ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی تھیں۔ خداتعالیٰ انہیں ان کی خدماتِ جلیلہ کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

عبدالقادر ضیغم کے بعد اب کچھ باتیں معروف خادمِ سلسلہ، مولانا ابوالمنیر نورالحق کے بارے میں جو سلسلے کے ان خدّام میں سے تھے جن کا نام خدمتِ قرآن کے حوالے سے جماعت کی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

۱۹۳۴ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے احمدی نوجوانوں کو سلسلے کی خدمت کے لیے زندگیاں وقف کرنے کی تحریک فرمائی تو مولانا کے والد حضرت منشی عبدالحق، رفیق حضرت مسیح موعود نے مولانا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنا وقف قبول فرمانے کی درخواست کرنی چاہئے چنانچہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ان کے والد انہیں اپنے ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ انہوں نے اپنے اس بچے کی پیدائش سے پہلے ہی اسے وقف کرنے کا ارادہ کرلیا تھا اور مدّعائے حاضری بیان کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان دنوں حضور خود درخواست دہندگان کا انٹرویو لے کر وقف قبول کرنے کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔ حضور نے مولانا سے دریافت کیا کہ مولوی فاضل کے امتحان میں ان کی کیا پوزیشن تھی۔ عرض کرنے پر کہ وہ یونیورسٹی میں دوم آئے ہیں حضور نے ان سے مزید کچھ کہے سنے بغیر ان کا وقف قبول کرلیا۔

مولانا اس وقت سے لے کر حضور کی زندگی کے آخری دن تک آپ کے قدموں میں رہ کر قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر میں حضور کی معاونت کرتے رہے اور انہیں آپ کی دعا اور برکت سے سلسلے کی بعض دیگر اہم خدمات سرانجام دینے کا موقع بھی ملا۔

اباجی نے بھی عملاً اپنی ساری زندگی حضور کی خدمت میں گزاری تھی۔ ترجمہ اور تفسیر القرآن کے سلسلے میں یہ دونوں بزرگان حضور کی ہدایات کے مطابق معاونت کرتے تھے لہٰذا ان دونوں کا آپس میں بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ حضور کے کئی دوروں میں ساتھ ساتھ رہے اور دونوں کو حضور کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا ارادہ ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی روشنی اباجی کی سوانح لکھتے ہوئے ڈالی جائے لہٰذا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے یہاں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا ایک زمانے میں تحریک جدید کوارٹرز میں مقیم تھے۔ ان کے والدِ بزرگوار کاتب تھے اور تفسیر صغیر کے پہلے ایڈیشن کی کتابت انہوں نے ہی کی تھی۔ میں اباجی کی طرف سے بھجوائے گئے کاغذات یا کوئی پیغام انہیں پہنچانے جاتا تو کبھی کبھار منشی صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

مولانا کے بڑے صاحبزادے' منیرالحق شاہد سکول اور کالج میں مجھ سے کچھ جونیئر تھے۔ بعد میں انہوں نے لائبریری سائنس میں ڈپلومہ یا شاید ماسٹرز کر لیا تھا اور راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن میں خواجہ عبدالغفار ڈار کے مکان میں کرایہ دار کے طور پر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ جمعہ کو بیت النور میں ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ پتا نہیں کب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کینیڈا چلے گئے۔ مدت سے ان کو نہیں دیکھا لیکن جماعت کی برکت سے ان کا نام سننے میں آتا رہتا ہے اور کبھی کبھار ان کی کوئی تحریر بھی پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ قریباً ایک سال پہلے یعنی نو اپریل ۲۰۱۶ء کے الفضل میں ان کا مولانا کے بارے میں ایک مضمون بعنوان ''ابا جان محترم مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب کا خلفائے سلسلہ کی بے پایاں شفقتوں سے حصہ پانے کا ذکر'' چھپا ہے جسے پڑھ کر مولانا کے ساتھ ساتھ بعض اور بھولے بسرے بزرگان کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر سلسلے کے بعض پرانے خدام کا ذکر کرتے ہوئے میاں عبدالرحیم احمد کا نام نظر انداز کر دیا جائے۔ موصوف کے ساتھ میری جان پہچان تو اس سے بہت پہلے کی تھی لیکن ان کے ساتھ میری پہلی مفصّل ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میرا تقرر فیصل آباد میں انکم ٹیکس آفیسر کے طور پر تھا۔ انہیں اس دفتر میں کچھ کام تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس سلسلے میں ان کی کچھ مدد کر سکتا ہوں اور میرے دفتر میں ان کی آمد اسی حوالے سے تھی۔ میں ان کے نام اور مقام سے واقف تھا لہٰذا میں نے عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے جو کچھ بن پڑا کیا۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کے بعد میرا ان سے مستقل تعلق قائم ہو گیا۔ ان دنوں بھی سرکاری دفاتر اتوار کے روز بند ہوتے تھے چنانچہ میں اس روز ربوہ چلا جاتا جہاں ہفتہ وار تعطیل جمعہ کو ہوتی تھی۔ تحریک جدید کے دفاتر سے گزر ہوتا تو چک اٹھا کر ان کے دفتر میں جھانکتا اور اگر وہ تشریف فرما ہوتے تو ان سے ضرور ملاقات کرتا اور ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو کر واپس آتا۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ دو تین بار جب مجھے بسوں کی ہڑتال کی وجہ سے ربوہ سے لائلپور جانے میں دقّت پیش آ رہی تھی انہوں نے مجھے اپنی کار فراہم کر کے میری یہ مشکل حل کر دی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزا۔

مارچ ۱۹۷۶ء میں راقمُ الحروف کے نکاح کا اعلان حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے بیت مبارک میں فرمایا۔ نکاح فارم پر میرے کوائف کی تصدیق جن دو بزرگان نے کی ان میں ایک عبدالرحیم احمد تھے۔ دوسرے بزرگ چوہدری صلاح الدین تھے جو اس زمانے میں صدر انجمن احمدیہ کے ناظم جائیداد اور مشیرِ قانونی تھے۔

عبدالرحیم احمد پروفیسر علی احمد بھاگلپوری کے صاحبزادے تھے جو ۱۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام عبدالرب رکھا۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے تک تعلیم پائی اور دورانِ تعلیم ہی ۱۹۳۶ء میں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ ایم اے میں پڑھ رہے تھے کہ حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر لبیک کہا اور تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے خود کو خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے یکم جولائی ۱۹۴۰ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء تک پینتالیس سال خدمت کی توفیق پائی۔ ابتدائی دس سال سندھ میں بطور لوکل ایجنٹ ایم این سنڈیکیٹ گزارے اور تحریک جدید اور حضرت مصلح موعود کی زمینوں کی نگرانی ان کے سپرد رہی۔ ۱۹۵۵ء میں ربوہ آ گئے

اور تحریک جدید انجمن احمدیہ میں وکیل التعلیم، وکیل الزراعت اور وکیل الدیوان کے عہدوں پر کام کیا۔

موصوف بچپن ہی سے نیک سیرت تھے چنانچہ ہوسٹل میں ان کے ایک رُوم میٹ، علی بن عبدالقادر کی روایت کے مطابق علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران بھی تہجد میں باقاعدہ تھے۔ لطیف احمد قریشی کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل ۲۰ جنوری ۲۰۰۱ء کے مطابق وہ اِنڈین سِول سروس کا تحریری امتحان پاس کر چکے تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے انہیں سندھ بھجوا دیا۔ انہوں نے بظاہر ایک روشن مستقبل کو خدمتِ دین پر قربان کر دیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو حضور نے ان کا نکاح اپنی صاحبزادی امتہ الرشید سے پڑھا۔ یاد رہے کہ صاحبزادی امتہ الرشید سیّدہ امتہ الحیی کی بیٹی اور حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی نواسی تھیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے والدین نے عبدالرحیم احمد کا نام عبدالرب رکھا تھا اور وہ اسی نام سے معروف تھے لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے ان کے رشتے کے سلسلے میں استخارہ کے دوران ایک رؤیا کی بنا پر ان کا نام تبدیل کر کے عبدالرحیم احمد رکھ دیا اور وہ باقی عمر اسی نام سے پکارے جاتے رہے۔

عبدالرحیم احمد کو کچھ عرصہ سے عارضہ قلب لاحق تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ انہوں نے ۱۷ جون ۲۰۰۰ء کو چوراسی برس کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

ان کی وفات پر محمد شفیع خان ایڈووکیٹ کے قلم سے الفضل ۲۸ فروری ۲۰۰۱ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ موصوف بے حد منکسرُ المزاج اور اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھنے والے تھے۔ فاضل مضمون نگار اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے محکمہ انکم ٹیکس کے ملازم تھے۔ عبدالرحیم احمد بھی اپنے کسی کام سے اس دفتر میں آتے جاتے تھے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے انہیں دیکھا تو مصافحہ کر کے دعا کا طلبگار ہوا۔ ''میاں صاحب نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ پھر ایک بار آپ تشریف لائے۔ آپ نے اپنی گاڑی دفتر کے باہر پارک کی جس میں آپ کے اہل وعیال بھی تھے۔ دفتر کے مین گیٹ سے میں بھی اسی وقت دفتر کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے حسبِ معمول میاں صاحب سے مصافحہ کیا اور چلتے چلتے اپنا تعارف کرایا۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کس کام سے بار بار تکلیف اٹھا کر اس دفتر میں تشریف لاتے ہیں۔ میں اسی دفتر میں ملازم ہوں، اگر یہاں کا کوئی کام ہے تو مجھے ارشاد فرماویں۔ میں کام مکمل کر کے آپ کو ازخود اطلاع کر دوں گا اور پھر آپ کو یہاں آنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔ میں خدا کے فضل سے احمدی ہوں اور خاندان مسیح موعود کا ادنیٰ غلام ہوں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوگی کہ میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ آپ بہت خوش ہوئے، مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور کاغذات میرے حوالے کر کے خود وہیں سے واپس تشریف لے گئے۔ چند یوم بعد ہی کام مکمل ہو گیا جس کی اطلاع میں نے ازخود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دی۔ اس وقت آپ تحریک جدید میں وکیل الدیوان تھے۔ آپ نے مجھے بہت سی دعاؤں سے نوازا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ میرے لیے آپ کی شفقت اور آپ کی محبت گراں قدر تھی۔

چند یوم بعد آپ میرے دفتر تشریف لائے۔ گاڑی دفتر کے باہر کھڑی کی۔ اپنا خادم بھیج کر مجھے باہر

بلوایا۔ فرمانے لگے: مجھے آج یہاں کوئی کام نہیں۔ صرف تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ میں نے عرض کیا: میاں صاحب! آپ نے جماعت احمدیہ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی ہے۔ میں نے تو یہ ادنیٰ سی خدمت آپ کی کی ہے۔ پھر یہ کہ آپ کا جائز کام تھا جو آج نہیں تو کل ہونا ہی تھا۔ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے؟ فرمانے لگے: تم نے میرا کام کیا ہے اس لیے مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ آپ کی بیگم ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔ آپ نے مجھے آواز دے کر گاڑی کے قریب بلوایا اور استفسار فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟ تم کس کے بیٹے ہو؟ میں نے عرض کیا: میرا نام شفیع ہے۔ میں محمد شہزادہ خان مولوی فاضل مرحوم کا بیٹا ہوں۔ یہ سن کر بیگم صاحبہ نے فرمایا: اچھا تو تم زینب کے بیٹے اور عائشہ پٹھانی کے نواسے ہو۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بیگم صاحبہ نے میاں صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: میاں صاحب! شفیع تو میرا بھانجا ہے۔ زینب، اس کی والدہ میری رضاعی بہن ہے۔ میں نے اس کی نانی عائشہ پٹھانی کا دودھ پیا ہے۔ اس نے کون سا کسی غیر کا کام کیا ہے، اپنی خالہ کا کام کیا۔ بیگم صاحبہ کی بات سن کر آپ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ آپ نے مجھے سینے سے لگا کر...... بہت سی دعائیں دیں اور بیگم صاحبہ سے فرمایا: تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے کہ جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ تبارک تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں۔ کیا میں اس حدیث نبوی پر عمل نہ کروں؟

یہ میرا میاں صاحب سے پہلا قریبی تعلق تھا جو آخر تک قائم رہا۔ میں جب بھی ربوہ جاتا میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کرتا۔ آپ مجھے نہایت شفقت سے قریب بٹھا کر میرا حال پوچھتے اور پھر دعاؤں سے نوازتے۔ میں جب بھی دعا کے لیے عرض کرتا تو جواب میں آپ فرماتے: تم نے میرا کام کیا ہے، میں کیسے تمہیں بھلا سکتا ہوں؟ متعدد بار آپ سے بیتِ اقصیٰ میں جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد ملاقات ہوئی اور راستے میں چلتے چلتے بھی کئی بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ باوجود بسیار کوشش کے ہمیشہ آپ نے سلام کہنے میں پہل کی۔ آپ ...... ملنے پر اس قدر خوشی کا اظہار فرماتے کہ آپ کا مبارک ہاتھ مصافحہ کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔''

عبدالرحیم احمد کے اخلاقِ فاضلہ کے بارے میں بہت سی اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن ان کا ذکر کسی اور وقت پر موقوف کرتے ہوئے میں آپ کا تعارف کرا رہا ہوں چوہدری عطاء اللہ وڑائچ سے جو میرے سکول کے زمانے کے ایک دوست، صفی اللہ چوہدری کے والدِ بزرگوار تھے اور میرے ساتھ ان کے مراسم کا سب سے بڑا حوالہ صفی کے ساتھ میری دوستی کا ہی تھا۔

موصوف ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو قادیان کے قریبی موضع کھارا میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت حافظ رحیم بخش وڑائچ کے صاحبزادے تھے جو شادیوال ضلع گجرات کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اوائل ۱۹۰۸ء میں حضرت مسیح موعود کے حلقۂ رفقا میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اور ان کی اہلیہ، رسول بی بی دونوں موصی تھے اور بہشتی مقبرہ قادیان میں دفن ہیں۔

عطاء اللہ وڑائچ نے مدرسہ احمدیہ میں تعلیم حاصل کی جہاں وہ مولانا غلام حسین ایاز اور عبدالعزیز بھامبڑی کے ہم جماعت تھے تاہم کسی وجہ سے یہ تعلیم ادھوری رہ گئی۔ انہوں نے پرائیویٹ ملازمت کے ذریعے معاش کمانا شروع کیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کی شادی مشہور بزرگ، حضرت حافظ غلام رسول وزیرآبادی کی صاحبزادی، رضیہ خانم سے ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد باقی لوگوں کی طرح انہیں بھی شدید مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے یہ وقت نہایت صبر اور شکر سے گزارا۔ انہیں احساس ہو چکا تھا کہ اولاد کی تربیت کے لیے گاؤں کا ماحول سازگار نہیں چنانچہ جوں ہی ربوہ کا قیام عمل میں آیا انہوں نے اپنے اہل و عیال کو یہاں منتقل کر دیا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب میرا اس خاندان سے پہلا تعارف ہوا۔ میں نے اور ان کے سب سے بڑے بیٹے صفی نے اپنی باقاعدہ تعلیم کا آغاز نصرت گرلز ہائی سکول کے ایک کچے کمرے سے لکڑی کے تختوں پر بیٹھ کر استانی مومنہ کی رہنمائی میں شروع کیا تھا۔ ہم نہ صرف سکول کے زمانے میں اکٹھے رہے بلکہ کالج اور یونیورسٹی میں بھی ایک ساتھ رہے۔ ایم ایس سی کے بعد وہ جاپان چلے گئے۔ لوٹے تو پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر۔ مدتِ دراز سے امریکہ میں ہیں لیکن جب تک والدین زندہ رہے وقفے وقفے سے پاکستان آتے رہے۔ ان کی آمد کا پتا چلتا تو ملاقات ہو جاتی اور یوں وہ رابطہ جو پینسٹھ سال پہلے نصرت گرلز ہائی سکول میں قائم ہوا تھا آج تک اسی طرح قائم ہے۔

عطاء اللہ وڑائچ کے چھوٹے صاحبزادے، رضی اللہ جو یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ، ربوہ میں منیجر رہے بھی میرے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ کبھی وہاں سے گزرتا تو چند منٹوں کے لیے ہی سہی، ان سے ضرور ملتا۔ اچانک ان کی وفات کی خبر ملی تو شدید صدمہ ہوا لیکن سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون کہنے کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

مجیب جو امریکہ میں ہیں ایک فارمیسی چلایا کرتے تھے۔ میں ایک ہی بار امریکہ گیا ہوں اور وہ بھی چھبیس ستائیس سال پہلے۔ ان سے فلاڈلفیا میں ان کی فارمیسی پر ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد اپنی والدہ کی وفات پر ملے تو معلوم ہوا کہ اب وہ رئیل اسٹیٹ کا کام کر رہے ہیں۔

حافظ سمیع اللہ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی ہیں۔ سنا ہے اپنا ایک ڈائیگناسٹک سنٹر چلا رہے ہیں۔ امریکہ میں شاید اسے کچھ اور کہتے ہوں لیکن یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے ایکسرے، سی ٹی سکین اور بعض ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں جو تشخیصِ امراض میں ممد ٹیسٹس کرتی ہیں۔

عطاء اللہ وڑائچ کو صفی کے ساتھ میرے تعلق کا بخوبی پتا تھا اس لیے دفتر تحریک جدید میں یا باہر جہاں بھی ملاقات ہوتی بہت خندہ پیشانی سے ملتے۔ انہوں نے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو وفات پائی جب کہ ان کی اہلیہ اس کے قریباً بیس سال بعد چودہ اگست ۲۰۱۶ء کو فوت ہوئیں۔ دونوں بہشتی مقبرے میں مدفون ہیں۔

ربوہ کے قدیم باسیوں میں سے ایک مولانا محمد صادق سماٹری بھی تھے جو اکتوبر ۱۹۶۴ء میں اباجی کی اچانک وفات کے بعد انچارج صیغہ زودنویسی مقرر ہوئے تھے۔

موصوف ۱۹۰۷ء میں کنجاہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ محترم، برکت اللہ جنہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے زمانے میں احمدیت قبول کی تھی نے اپنے اس بچے کو خود وقف کیا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کنجاہ کے کسی سکول میں اور پھر مولوی نظام الدین گولیگی کی سرپرستی میں ہوئی جن کی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ایک ایک سال میں دو دو کلاسیں بھی پاس کیں۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے مدرسہ احمدیہ قادیان سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ہم جماعت ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں سماٹرا گئے اور پانچ سال بعد واپس آئے۔ دوسری مرتبہ وہ ۱۹۳۸ء میں وہاں گئے اور تیسری مرتبہ ۱۹۴۹ء میں۔ وہ ربوہ سے بیرونِ ملک جانے والے پہلے مربی تھے چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی خود انہیں الوداع کہنے کے لیے ریلوے سٹیشن پر تشریف لائے۔ ۱۹۵۷ء میں واپس آ کر اگلے ہی سال ملائشیا کے لیے روانہ ہو گئے اور پانچ سال بعد وطن واپس آئے۔ انہیں کراچی میں مربی مقرر کیا گیا تھا جہاں انہوں نے قریباً دو سال کام کیا۔ ۱۹۶۴ء میں انہیں انچارج صیغہ زودنویسی مقرر کیا گیا۔

بتایا جاتا ہے کہ سنگاپور میں قیام کے دوران مفوضہ امور کی سرانجام دہی کے علاوہ انہوں نے ملائیشین زبان میں قرآن پاک کا مکمل ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی اور متعدد نئی جماعتیں قائم کیں۔

ان کے بیٹے، عبدالرشید سماٹری راوی ہیں (دیکھئے الفضل اٹھائیس اپریل ۱۹۸۵ء) کہ سطان آف سلانگور، سرہشام الدین عالم شاہ نے ۲۳ جولائی ۱۹۵۱ء کو آپ کا مناظرہ علمائے ریاست سلانگور کے ساتھ کروایا جو اڑھائی گھنٹہ تک جاری رہا۔ مناظرہ کی صدارت سلطان نے خود کی اور آخر میں فرمایا: ''ہم نے احمدیوں کے معاملہ میں کوئی غلطی نہیں پائی۔''

مولانا نے ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر عبدالرحیم راٹھور نے کہا:

آسمانِ علم کا اک اور تارا گر گیا
محفلِ انجم کا اک روشن ستارا گر گیا
دل حزیں ہے، آنکھ پُرنم، آج دنیا چھوڑ کر
سوئے فردوسِ بریں (......) کا ماہر گیا
وہ فدائے احمدیت، خادمِ دینِ متیں
ہر مہم پر شادماں باخاطرِ عاطر گیا
چھوڑ کر خویش و اقارب اور سب اہل و عیال
ملکِ انڈونیشیا (......) کی خاطر گیا
فاتحُ الدین کی الٰہی فوج کا مخلص جواں
کامیاب و کامراں ہرگام پر ظافر گیا

اس کو علیّون میں اعلیٰ مراتب مل گئے
اس جہاں سے اک مبشر، عارف و باصر گیا
اس کے اہل و آل کا ہو حق تعالیٰ پاسباں
حق ادا کر کے خدا کا صابر و شاکر گیا

بتایا جاتا ہے کہ مولانا بے حد متوکل اور صاحب رؤیا تھے۔ مولانا ظفر احمد ظفر نے ان کے بارے میں الفضل آٹھ اپریل ۱۹۸۰ء میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے چار پانچ واقعات بیان کئے ہیں جن میں سے دو ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں:

دوسری جنگِ عظیم میں جب جاپان ایشیا کے جنوب مشرقی جزائر پر چھا گیا در پردہ مولانا کو پھانسی دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس بات کا علم کسی طرح مولانا کو بھی ہو گیا چنانچہ وہ دعاؤں میں لگ گئے جس پر انہیں خواب میں بتایا گیا کہ دانیال نبی کی کتاب کی فلاں فلاں آیات دیکھو چنانچہ بیدار ہونے پر جب انہوں نے مُشارالیہ آیات دیکھیں تو لکھا تھا کہ ہم نے تم کو حکومت دی مگر تم نے ظلم کیا لہٰذا یہ حکومت تم سے واپس لے لی جائے گی۔ انہوں نے اپنے اُن تمام ساتھیوں کو جن کے متعلق پھانسی کا فیصلہ ہو چکا تھا قبل از وقت بتا دیا کہ جاپان کی حکومت کو عنقریب شکست ہو جائے گی اور ہمیں پھانسی دینے سے پہلے وہ خود ہی ختم ہو جائے گی۔ جن لوگوں کو آپ نے یہ بشارت دی ان میں سے بعض سکھ بھی تھے۔ وہ آپ کی اس بات پر بہت حیران ہوئے اور جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تو وہ سکھ آپ کے ارادت مند ہو گئے۔

ظفر محمد ظفر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک احمدی دوست سے پانچ صد روپے قرض لئے اور وعدہ کیا کہ وہ یہ رقم فلاں تاریخ تک لوٹا دیں گے۔ مقررہ تاریخ کو وہ دوست اپنی رقم وصول کرنے کے لیے آپ کے گھر پہنچ گئے لیکن مولانا کے پاس ادائیگی کے لیے موعودہ رقم موجود نہ تھی۔ دل میں سخت پریشان تھے لیکن اپنے مہمان کی خاطر مدارات کرتے رہے اور دل ہی دل میں دعا کرتے رہے: یا اللہ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اسی اثنا میں گلی میں سے ایک ٹرک گزرا جسے ایک سکھ چلا رہا تھا اور ان سکھوں میں شامل تھا جنہیں جاپان حکومت پھانسی دینا چاہتی تھی۔ ٹرک مولانا کے مکان کے پاس آ کر رک گیا اور ڈرائیور نے آواز دی: مولوی جی! ذرا باہر آنا۔ مولانا باہر گئے تو اس نے پورے پانچ صد روپے ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ انہوں نے پوچھا کہ یہ رقم کیسی ہے تو اس نے جواب دیا: ایک شخص نے عرصۂ دراز سے میرا ایک ہزار روپیہ دینا تھا۔ میں نے بارہا مانگا مگر وہ ٹالتا رہا۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ مجھے یہ روپیہ واپس کر دے تو میں آدھے پیسے مولوی جی کو پیش کر دوں گا۔ آج اس نے میری رقم ادا کر دی ہے جس میں سے یہ پانچ سو روپے آپ کے ہیں۔

اگرچہ میں مولانا کے صاحبزادے، رشید سماٹری کو جو مجلس خدام الاحمدیہ کے ایک سرگرم رکن اور شاید کوئی عہدیدار بھی تھے اوائل جوانی سے پہچاننے لگا تھا مگر مولانا سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب اباجی کی ناگہانی

وفات کے بعد موصوف کا بطور انچارج صیغہ زودنویسی تقرر ہوا۔ اباجی کی وفات آناً فاناً ہوگئی تھی چنانچہ ان کے بعض دفتری کاغذات گھر میں پڑے تھے۔ مجھے یاد ہے میں نے ان کاغذات میں سے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے تفسیری نوٹس بابت سورۃ فاتحہ، سورۃ بقرہ، سورۃ نساء، سورۃ مائدہ، سورۃ انعام، سورۃ اعراف، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ کی پینتالیس فائلیں باقاعدہ رسید لے کر مولانا کے حوالے کی تھیں۔ یہ رسید آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ آپ دیکھنا چاہیں گے؟

"مندرجہ بالا مسودات وصول پائے۔

خاکسار محمد صادق

انچارج صیغہ زودنویسی

19-7-65"

جہاں تک میرا علم ہے مولانا کو زودنویسی کا کوئی قابلِ ذکر تجربہ نہ تھا کہ ان کی زندگی ایک بالکل مختلف ماحول میں گزری تھی اور ان کا عملی تجربہ میدانِ دگر کا تھا لیکن اس زمانے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی بسترِ علالت پر تھے اور مولانا کو حضور کے درُوس القرآن، مجالسِ عرفان، خطبات جمعہ یا جماعتی تقریبات میں حضور کی موقع بموقع تقاریر کو محفوظ نہ کرنا پڑتا تھا چنانچہ انہوں نے ریکارڈ پر پہلے سے موجود غیر مطبوعہ خطبات و تقاریر کو نظرِ ثانی کے بعد بمطابق رواجِ قدیم صیغہ زودنویسی کی اپنی ذمہ داری پر شائع کرانا شروع کر دیا۔

مولانا محمد صادق سماٹری کے بعد اب ذکر چوہدری شبیر احمد کا جن سے میرے تعارف کی کئی جہتیں تھیں۔ اوائل ربوہ میں ایک صاحب سلائیڈز کی مدد سے جماعت کی ممالکِ غیر میں سرگرمیوں پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ اخبار الفضل اور بیوت الذّکر میں اعلانات کے ذریعے اہلِ ربوہ کو اس امر کی پیشگی اطلاع دے دی جاتی چنانچہ لوگ جوق در جوق یہ سلائیڈز دیکھنے کے لیے پہنچ جاتے۔ ان لوگوں میں راقم بھی شامل ہوتا۔ یہ سلائیڈز چوہدری شبیر احمد دکھایا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ رنگ کمنٹری بھی کرتے چلے جاتے۔ میرا ان سے ابتدائی تعارف تو اسی حوالے سے تھا لیکن بعد میں جب وہ اور میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب تحریک جدید کے کوارٹرز میں ایک دوسرے کے پڑوسی بن گئے تو میرا ان سے براہِ راست تعارف ہوگیا۔ اگرچہ اس زمانے میں ہمارے مابین تفصیلی گفتگو کا کوئی موقع تو پیدا نہ ہوسکا لیکن وہ جب بھی مجھے دیکھتے مسکرا کر ملتے اور محبت سے حال پوچھتے۔ آہستہ آہستہ یہ راز بھی کھلا کہ وہ میرے کلاس فیلو اور اچھے دوست، عبدالعلی المعروف 'عبدی' کے پھوپھا ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بات بھی مجھ پر ان کی کرم فرمائی میں اضافے کا باعث بنی تاہم جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے تکمیلِ تعلیم کے بعد مجھے ایک باعزت روزگار مل گیا اور میری ایک ذاتی شناخت بھی بن گئی تو میں وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات کرنے لگا اور ہر بار ان کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہوکر واپس آتا۔

موصوف اچھا شعری ذوق رکھتے تھے اور ان کا کلام الفضل کے علاوہ جماعتی جرائد میں بھی چھپتا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ خوش الحان تھے چنانچہ ربوہ میں منعقد ہونے والے بعض اجتماعات کے علاوہ جلسہ سالانہ کے موقع پر ان کی زبان سے حضرت مسیح موعود کا کلامِ بلاغت اثر سننے کا موقع ملتا رہتا اور یوں ان سے ہر وقت ایک قلبی رابطہ رہتا۔ ان سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہوئی۔ میں ربوہ گیا ہوا تھا۔ میرا تحریک جدید کے دفتر سے گزر ہوا تو سوچا آپ سے بھی ملتا جاؤں۔ حاضر ہوا تو اپنی ضعیف العمری کے باوجود مجھے پہچاننے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ ادھر ادھر کی کچھ باتیں ہوئیں جن میں مرزا محمد یعقوب کے ساتھ ہمسائیگی کے دور اور ان کے بیٹے مرزا محمد اسماعیل اور میرے خالہ زاد بھائی، قاضی منظور احمد کا ذکر آیا۔ انہوں نے ان تینوں مرحومین کا جس محبت سے ذکر کیا یہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔

سلسلے کے یہ نامور خادم ۲۸ نومبر ۱۹۱۷ء کو حضرت حافظ عبدالعزیز، رفیق حضرت مسیح موعود کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب انہوں نے سکاچ مشن مڈل سکول، سیالکوٹ چھاؤنی سے آٹھویں جماعت پاس کر لی تو ان کے والدِ گرامی نے انہیں تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان میں داخل کرا دیا۔ انہوں نے میٹرک اسی سکول سے اور بی اے مرے کالج، سیالکوٹ سے کیا اور پھر عملی زندگی کا آغاز ہفت روزہ "سدابہار" کے ساتھ وابستگی سے کیا۔ یاد رہے اس رسالہ کے ایڈیٹر سیّد ضمیر جعفری تھے اور موصوف اس کا بچوں کا صفحہ مرتب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شعر کہنے کا ملکہ عطا فرما رکھا تھا تاہم روایت کے مطابق انہوں نے کبھی کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ اگرچہ انہوں نے کچھ وقت ریلوے کی ملازمت میں بھی گزارا تاہم اگست ۱۹۴۰ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازمت اختیار کر لی۔

انہوں نے اپنے آپ کو ۱۹۴۴ء میں وقف کے لیے پیش کر دیا تھا تاہم عملاً یہ وقف جلسہ سالانہ ۱۹۵۰ء کے موقع پر منظور ہوا اور وہ چند ماہ بعد ملازمت سے مستعفی ہوکر ربوہ آگئے۔ پہلی تقرری نائب وکیل المال کے طور پر ہوئی۔ چند سالوں بعد وہ وکیل المال اول مقرر ہوئے اور تادمِ آخر اسی حیثیت میں خدمت سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے مجلس خدام الاحمدیہ اور مجلس انصاراللہ میں بھی اہم ذمہ داریاں ادا کیں۔ وہ ایوب دور میں ربوہ سے بی ڈی ممبر رہے اور اس حیثیت میں ربوہ ریلوے سٹیشن پر صدر ایوب کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے بیگم حضرت مرزا بشیر احمد کی طرف سے حجِ بدل کیا۔ انہیں آسٹریلیا، سنگاپور، ماریشس، کینیا اور یوگنڈا کے جماعتی دوروں کا بھی موقع ملا۔ اسی طرح جلسہ سالانہ بنگلہ دیش اور جلسہ سالانہ برطانیہ میں بھی کئی بار شرکت کی توفیق ملی۔

تحریک جدید کے لیے ان کی خدمات تاریخ احمدیت میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی سوچ اور مصروفیات کا زیادہ حصہ تحریک جدید کے لیے اور خاص طور پر شعبہ مال کے لیے وقف تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ تحریک جدید کے وعدوں اور ان کے حصول کے لیے ہمہ وقت پروگرام بناتے رہتے۔ وہ اس حوالے سے مختلف جماعتوں کے دوروں کے علاوہ روزنامہ الفضل میں اعلانات اور ارشاداتِ خلفاء بھی چھپواتے رہتے۔

۱۹۸۵ء میں ان پر ایک مقدمہ ماہنامہ "انصاراللہ" میں ایک مضمون چھپنے پر بنایا گیا تھا۔ یہ مضمون "زمین کے کناروں تک" کے عنوان سے اگست ۱۹۸۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ وہ ایف آئی آر جس کی بنیاد پر یہ

مقدمہ قائم ہوا تھا اللہ یار ارشد، خطیب جامع مسجد احرار، ربوہ کی طرف سے اکیس اگست کو درج کرائی گئی تھی اور کتاب ''ایف آئی آر: ۱۹۸۴ء تا ۲۰۰۲ء'' شائع کردہ صدر انجمن احمدیہ پاکستان کے صفحات ۱۱۴ و ۱۱۵ پر چھپی ہوئی ہے۔ یہ مقدمہ رسالہ سے تعلق رکھنے والے سب کارکنوں پر قائم ہوا تھا۔ باقی کارکنوں کی تو ضمانتیں ہوگئیں مگر کسی وجہ سے ان کی ضمانت نہ ہوسکی چنانچہ انہیں ایک انسپکٹر پولیس کی تحویل میں ربوہ سے جھنگ لے جایا گیا۔ ان کو جھنگ میں ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور خوش قسمتی سے کچھ ہی دیر میں ان کی درخواست ضمانت منظور ہوگئی۔ اس طرح انہیں فجر سے دوپہر تک تقریباً دس گھنٹے پولیس کی تحویل میں رہنے کے باعث اسیر راہِ مولیٰ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ بعد میں وہ اس کیس سے بری ہوگئے۔

ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں میں ''لمعاتِ نور''، ''سنبل وگل'' اور ''پھول اور کانٹے'' شامل ہیں۔

موصوف نے ۲۲ جولائی ۲۰۱۲ء کو بعمر پچانوے سال وفات پائی۔ ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں عمل میں آئی۔

انہوں نے چار خلفاء کا زمانہ پایا اور بہت پیار حاصل کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کئی بار انہیں قصرِ خلافت طلب فرما کر ان سے حضرت مسیح موعود کی نظمیں سنا کرتے تھے اور جلسہ سالانہ پر پڑھنے کے لیے خود درثمین میں سے اشعار منتخب فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس نے اپنے خطبۂ جمعہ فرمودہ ۲۷ جولائی ۲۰۱۲ء میں فرمایا کہ مرحوم نے موجودہ جماعتی نظام میں اگر بنیادی اینٹ کا نہیں تو درمیانی اینٹ کا کردار ضرور ادا کیا ہے۔ انہیں حضرت مصلح موعود کی تربیت سے فیض پانے کی توفیق عطا ہوئی۔ ان کے والد اور والدہ دونوں حضرت مسیح موعود کے رفقا میں سے تھے۔ اچھے معروف شاعر تھے، کچھ وقت صحافت میں بھی گزارا۔ ترنم کے ساتھ اچھی لہر میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضور انور نے ان کے تفصیلی کوائف اور جماعتی خدمات کا نہایت عمدہ رنگ میں تذکرہ کیا اور فرمایا حضرت مصلح موعود نے جب ان کا وقف قبول کیا تو انہیں نصیحت فرمائی کہ جماعت کے کاموں کی اس طرح فکر کرنا جس طرح ایک ماں اپنے بچے کی فکر کرتی ہے۔ انہوں نے اس نصیحت کو پلے باندھ لیا اور اس پر ہر ممکن عمل کیا۔ فرمایا کہ یہ بزرگ تھے جو وفا کے ساتھ جہاں اپنے کام میں مگن تھے وہاں خلیفہ وقت کے سلطانِ نصیر بھی تھے اور پھر اس کے ساتھ ہی خلیفہ وقت کے لیے بے انتہا دعائیں بھی کیا کرتے تھے۔

اُن کی وفات پر عبدالکریم قدسی نے درج ذیل قطعۂ تاریخِ وفات کہا:

کون اٹھا لحن داؤدی کے ساتھ
سُونا سُونا سا ہے باغِ شاعری
کہہ رہی ہے آج افسردہ ''ہوا''
''بجھ گیا قدسی چراغِ شاعری''

چوہدری شبیر احمد کے بعد اب جس بزرگ کا ذکرِ خیر کیا جا رہا ہے آپ ان کے نام سے یقیناً واقف ہوں گے۔ میری مراد مولوی محمد ابراہیم خلیل سے ہے جنہیں سسلی اور سیرالیون میں پیغامِ حق پہنچانے کا موقع ملا۔ وہ

قادیان کے ایک قریبی موضع، نواں پنڈ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے نامساعد حالات میں تعلیم حاصل کی اور پھر ڈسٹرکٹ کونسل، شیخوپورہ کے ماتحت انگلش ٹیچر کے طور پر ملازمت کرنے لگے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے اس مطالبے پر کہ پنشنر حضرات خدمتِ دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کریں انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی زندگی وقف کردی۔ وہ تحریک جدید کے ان ابتدائی مجاہدین میں شامل تھے جنہیں حضور نے ۱۹۴۶ء میں بغرضِ اعلائے کلمہ حق یورپ بھجوایا اور جو کچھ عرصہ لندن میں مولانا جلال الدین شمس کے زیرِ تربیت رہ کر بغرضِ اشاعتِ دین یورپ کے مختلف ملکوں میں متعین کئے گئے تھے۔

ابراہیم خلیل اسی سال لندن سے سسلی پہنچے اور سخت مشکلات کے باوجود راستے میں روم، مارسیلز، فلورنس و دیگر مقامات پر احمدیت کا پیغام پہنچانے میں مصروف رہے۔ وہ دو سال اٹلی میں رہے لیکن جنگِ عظیم ان ہی دنوں ختم ہوئی تھی اور انہیں لاتعداد مشکلات کا سامنا تھا لہٰذا ۱۹۴۸ء میں مرکز کے ارشاد کے تحت سیرالیون چلے گئے جہاں انہیں ۱۹۵۶ء تک تعلیم وتربیت اور خدمتِ خلق کی نمایاں خدمات سرانجام دینے کی توفیق ملی۔ آپ ہی کو فری ٹاؤن میں پہلی بیت الذکر تعمیر کروانے کی توفیق ملی جو ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گی۔

کچھ عرصہ بعد فری ٹاؤن کالونی اور سیرالیون پروٹیکٹوریٹ کے مشن انتظامی لحاظ سے الگ کردیئے گئے چنانچہ ابراہیم خلیل بطور انچارج فری ٹاؤن مشن خدمت انجام دینے لگے۔ اپنی اہلیہ اول کی وفات پر کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آئے لیکن جلد ہی اپنی دوسری اہلیہ کے ہمراہ دوبارہ فری ٹاؤن چلے گئے۔

مولوی محمد صدیق امرتسری نے ان کے ساتھ بحرِ اوقیانوس کے کنارے گزری ہوئی ایک یادگار شام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۱۱ جون ۱۹۷۵ء) میں لکھا ہے: ''فری ٹاؤن کے اردگرد سمندر کے کناروں پر کئی سیرگاہیں ہیں جہاں عموماً عیاش اور فارغ البال لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے لیکن شرفاء کا طبقہ بھی وہاں آجاتا ہے۔ مکرم خلیل صاحب مرحوم اکثر دن ڈھلے اُدھر چلے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے کہ ایک روز بعد عصر خاکسار اور خلیل صاحب چلتے چلتے اور کچھ پمفلٹ تقسیم کرتے ہوئے ذرا دُور سمندر کے طوفانی علاقہ تک جا پہنچے اور ساحلِ سمندر پر ایک بڑے پتھر پر ایسی آرام دہ اور مزیدار جگہ پاؤں نیچے پسار کر بیٹھ گئے کہ پانی کی زوردار لہریں باری باری ہماری طرف آکر ہمارے پاؤں دھونے میں مصروف ہوگئیں اور گرمی کی شدت میں یہ منظر ایسا مزا اور لطف پیدا کر رہا تھا جس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔

وہاں بیٹھے بیٹھے اچانک حضرت مسیح موعود کا الہام ''میں تیری ..... کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا'' میرے ذہن میں اُبھر کر زبان پر آگیا اور اس پر ذرا غور کرنے سے میری طبیعت میں ایک انبساط کی لہر اور عجیب خوشکن ولولہ اور ہیجان سا پیدا ہوا...... چنانچہ میں نے اُن سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ان احسانوں پر اظہارِ تشکر کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ جیسے آپ کے باپ کوئی نواب یا راجہ نہ تھے کہ آپ کو دنیا کے ایسے حسین مناظر اور زرخیز علاقوں کی سیر کراتے ویسے ہی میں بھی ریلوے کے ایک عام ملازم کا بیٹا ہوں۔ اگر ہمیں حضرت مسیح موعود کے روحانی بیٹے اور ادنیٰ مجاہدین ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں کراچی یا بمبئی دیکھنا بھی

نصیب نہ ہوتا۔ کیا ہماری یہ کم خوش قسمتی ہے کہ زمین کے کناروں تک اپنے پیارے مسیح کا بابرکت نام و پیام پہنچانے کا شرف خداتعالیٰ نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں، راجاؤں، نوابوں، دانشمندوں اور لیڈروں کو پیچھے دھکیل کر صرف ہمیں عطا فرمایا ہے اور ہم آج غلبہٗ احمدیت کی اس الٰہی سکیم اور مہم کی صفِ اول میں مصروفِ کار ہیں۔ میں نے کہا: کیا یہ صحیح نہیں کہ ہم احمدی مجاہدین کے ان علاقوں میں دخول سے پہلے یہاں کی اکثر نیگرو قومیں اور قبیلے...... خدا کے مقدس رسول اور دینِ کامل سے بے بہرہ اور بیگانہ اور دینی ماحول سے ناآشنا محض تھے اور پھر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ حضرت مسیح محمدی کے ہمارے جیسے ادنیٰ خدام کے ذریعے آج اس ملک کے ان علاقوں میں، ان فضاؤں میں دن رات ندائیں گونج رہی اور بیوت بن رہی ہیں جہاں گزشتہ تیرہ چودہ صدیوں میں پہلے کبھی کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور نداؤں کی پُرکیف صداؤں نے فضاؤں کو معطر نہیں کیا تھا۔

اب شام ہونے کو تھی۔ سورج کی ٹکیا ہمارے سامنے دُور سمندر میں نصف اندر اور نصف باہر بڑا مسحور کن منظر پیدا کر رہی تھی۔ محترم خلیل صاحب میری یہ کسی قدر جذباتی مگر سچی اور صحیح باتیں سن کر وجد میں آ گئے اور الحمدللہ اور سبحان اللہ کا وِرد کرنے لگے۔ پھر سورج غروب ہونے پر ہم نے اسی جگہ ساحلِ سمندر پر نماز مغرب ادا کی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر ہمیں بڑی ہی پُرسوز اور رِقّت انگیز دعائیں کرنے کی توفیق ملی۔ محترم خلیل صاحب نے بلند آواز سے ایسی درد بھری پُرخلوص اور دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی قرآنی دعائیں پڑھیں کہ ہم دونوں کے دامن آنسوؤں سے تر ہو گئے اور واپس شہر کو قدم اٹھاتے ہوئے ہمارے دل اس اطمینان اور خوشی سے لبریز معلوم ہوتے تھے کہ آج ہمارے دامنِ عصیاں دُھل کر پھر صاف اور سفید ہو گئے ہیں اور ہمارے خدا نے ہمارے سب سابقہ گناہ بخش کر شاید ہمیں نئی زندگی اور نیا جنم دیا ہے۔''

بتایا جاتا ہے کہ محمد ابراہیم خلیل کو لوگوں تک احمدیت کا پیغام پہنچانے کا جنون تھا۔ تقسیم لٹریچر تو دُور کی بات ہے انہوں نے چولہ بابا نانک کی طرز کا ایک چولہ سِلا رکھا تھا جس پر دینِ حق کی بعض بنیادی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے باہر نکلتے تو یہ چولہ زیبِ تن کر لیتے۔ اس وجہ سے وہ علاقے میں ''چولے والے مولوی صاحب'' کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ انہیں اس لباس میں دیکھتے ہی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور پھر سوال و جواب کا ایک سلسلہ چل نکلتا جس دوران وہ انہیں حضرت مسیح موعود کی آمد کی خوشخبری سنا کر احمدیت قبول کرنے کی دعوت دینے لگتے۔ جماعت احمدیہ، سیرالیون کے پرانے دوست موصوف کی خدماتِ سلسلہ کی وجہ سے انہیں ''پاپا ابراہیم'' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔

وہ محمد ابراہیم سے محمد ابراہیم خلیل کیسے ہوئے، اس حوالے سے ان کے صاحبزادے، محمد زکریا ورک کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں اپنی اہلیہ کو خط لکھا کہ یورپ میں فیملی نیم کا بہت رواج ہے لہٰذا حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے درخواست کی جائے کہ وہ میرے لیے کوئی تخلص تجویز فرما دیں۔ وہ یہ خط لے کر حضور کے پاس حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا کہ ابراہیم کے ساتھ تو خلیل کا لفظ ہی جچتا ہے۔ اس روز سے وہ

محمد ابراہیم خلیل کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

موصوف نے ۲۷ مئی ۱۹۷۵ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کے صاحبزادے، محمد ادریس کی روایت کے مطابق مرحوم کو کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا چنانچہ ان کی ایک کتاب ''موازنۂ ادیان'' کے نام سے شائع ہوئی جس کا پیش لفظ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کا لکھا ہوا ہے۔ انگریزی میں بھی انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "Muslim Catechism"۔ فری ٹاؤن میں تعیناتی کے دوران انہوں نے انگریزی رسالہ ''البشریٰ'' جاری کیا۔

ان کی اہلیہ اول، زینب بی بی حضرت منشی محمد دین، واصل باقی نویس (یکے از رفقائے حضرت مسیح موعود) کی صاحبزادی تھیں۔ یہ وہی منشی محمد دین ہیں جنہیں احمدیت کی نعمت میری امی کے دادا، حضرت مرزا جلال الدین کے ذریعے نصیب ہوئی اور جن کے درمیان قائم ہونے والا تعلق ان دونوں کی نسلوں نے بھی خوب نباہا۔ اگرچہ زینب میری ہوش سے بھی پہلے وفات پا چکی تھیں مگر محمد ابراہیم خلیل اور ان کے سب بچوں کو اس رشتے کا بخوبی علم تھا اور وہ اس کا خوب لحاظ رکھتے تھے لہٰذا جہاں ملتے انتہائی محبت و احترام کے ساتھ۔ خداتعالیٰ ان دونوں کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

میں ربوہ پر اپنی پچھلی کتاب میں ذکر کر چکا ہوں کہ ان کا ایک بیٹا، یحییٰ سکول کی ابتدائی جماعتوں میں ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ ''پھر آناً فاناً کہیں غائب ہو گیا۔ پتا چلا کہ اس کا ذہن مختل ہو چکا ہے اور اس نے خود کو گھر کے اندر محبوس کر رکھا ہے۔'' ربوہ کلاتھ ہاؤس والے لطیف نے جو یحییٰ کے پڑوس میں رہائش پذیر تھے یہ کتاب پڑھی تو مجھے بتایا کہ یحییٰ ماشاءاللہ حیات ہیں، گھر سے باہر بھی نکلتے ہیں، جی چاہے تو ان کے پاس آ بیٹھتے ہیں اور پھر کھانا کھانے کے لیے دارالضیافت یا گھومنے پھرنے کے لیے ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ میری خواہش پر انہوں نے یحییٰ کے ساتھ میری ملاقات کرائی۔ اگرچہ ان کے ساتھ قریباً ساٹھ سال کے بعد ملاقات ہو رہی تھی لیکن انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔ انہیں اپنے سکول کی بعض باتیں اور کچھ کلاس فیلوز کے نام بھی یاد تھے تاہم مجھے زیادہ تعجب اس وقت ہوا جب مجھے علم ہوا کہ بہت کم تعلیم یافتہ اور ذہنی کمزوری کا شکار ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں زبردست قوتِ تحریر سے نواز رکھا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی ہمشیرہ، صادقہ قدسیہ کی وفات پر فروری ۱۹۶۳ء کے مصباح میں ''بھائی کا دل'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

''کہاں ہو تم؟ ذرا آواز دو، ہم یاد کرتے ہیں...... آنٹی اپنی سریلی آواز میں یوں ہی گنگناتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں اور میں حال سے پلٹ کر ماضی میں اپنی کھوئی ہوئی بہن، قدسیہ کو آواز دینے لگا۔ کہاں ہو تم......؟

اس بے ثبات دنیا میں مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے والی بہن تم میرے پاس نہیں ہو لیکن تمہاری یادوں کے حسین پھول میرے ذہن میں اب بھی موسمِ بہار کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ وقت کا سمندر دل سے کسی کی یادوں کی تحریر کو دھو ڈالتا ہے؟ میں نے تجھے بھول جانا چاہا اور تمہاری یادوں کے نقوش

مٹانے کی ہردم کوشش کی لیکن یادِ ماضی کے خاکے ایک ایک کر کے میری نمناک آنکھوں کے آگے سانپ بن بن کر لہرانے لگے۔ میں نے اپنے ذہن سے تمہارے تصور کا دروازہ بند کرنا چاہا لیکن اس ایک دروازے نے میری سوگوار یادوں کے سینکڑوں دروازے کھول دیئے اور ہر دروازے پر مجھے بھولے بسرے گیتوں کی صدا آنے لگی۔

کائنات کی بے اعتنائی پر غور کریں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ یہاں انسان کے مجبور اَرمانوں کا جنازہ اُٹھ جاتا ہے مگر کسی سے یہ امید بھی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی حسرتوں کی لاش کو کفنا سکے۔ نہ زمین کو اس کی بے بسی پہ جنبش ہوتی ہے اور نہ ہی آسمان اس کی بے کسی پہ آنسو بہاتا ہے۔ زندگی جیسی نایاب چیز اپنی حسرتوں کے مزار اپنے سینے میں بنا کر ختم ہو جاتی ہے مگر کسی کو اس کی قیمتی جان کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ عزیز و اقارب وقتی طور پر یوں ہی ظاہرداری کے رنگ میں ہمدردی اور غمگساری کا اظہار کرتے ہیں اور ٹسوے بہاتے ہیں اور پھر زندگی کی مسرتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

...... میری بہن بڑی زندہ دل، خوشگوار اور قرآنی تعلیم پر عمل کرنے والی عورت تھی۔ اپنے مزاج میں ظرافت کی وجہ سے ہر دلعزیز تھی۔ ...... ہم ہر وقت کھیلتے رہتے۔ ہمارے بلند قہقہوں کی جھنکار خاموش فضا میں گہما گہمی پیدا کر دیتی۔ ہر وقت کی ہنگامہ آرائی اور ایک دوسرے کو چڑانا ہمارا مخصوص مشغلہ تھا۔ وہ مجھے ''......'' کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ لفظ مجھ پر ایٹم بم کا کام کرتا۔ میں روٹھ جاتا تو وہ اور چڑانے لگتی اور آئینہ میرے منہ کے سامنے رکھ کر کہتی: ''ذرا اپنی صورت دیکھو۔ جیسے کہیں سے پِٹ کر آئے ہو۔''

ہمارے یہ حسین لمحات تتلیوں کی طرح اُڑ گئے اور ایک روز ان کو اپنڈیکس کا درد ہوا...... دوا میں کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دو چار دن بعد اپریشن ہوا۔ پھر ایک صبح ان کی موت کی منحوس خبر سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ آنکھوں کی یخ بستہ جھیلیں آتشِ کرب سے پگھل کر بہہ نکلیں۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میں ایک جہاز پر سوار ہوں جو گھٹا ٹوپ اندھیروں میں تند و تیز آندھیوں اور طوفان میں گھرا تھپیڑے کھا رہا ہے۔ اُختی کو غش پر غش آ رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاروں طرف عزیزوں کی آہ و فغاں تھی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پُرنم نہ ہو۔

ان کی وفات کے بعد گھر سائیں سائیں کرنے لگا۔ خوشیوں نے اداسیوں کے کفن اوڑھ لئے۔ کائنات میں دلکشی کے سارے سامان اجڑ گئے۔ قہقہے سو گئے۔ زندگی ویران، بالکل خزاں زدہ ہو گئی۔ وقت ایک غمگین راگ الاپ کر خاموش ہو گیا لیکن ان دردانگیز حالات میں چند زندگیاں اپنے بے رنگ تسلسل کے ساتھ رواں رہیں۔ وقت کا چکر بدستور چلتا رہا۔ دنوں سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال بنے اور آج یہ گھر بفضلِ تعالیٰ خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ چند زندگیوں سے نئی چہل پہل ہو گئی ہے۔ وفورِ مسرت سے بات بات پر ہر شخص کا تبسم روکے نہیں رکتا۔ افرادِ خانہ کے مثالی قہقہے لوگوں پہ زندہ دلی اور شگفتگی کے پھول لٹا رہے ہیں۔ ہر طرف پیار ہی پیار ہے۔ پھول مہک رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں کائنات جھوم رہی ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ ناچ رہے ہیں۔ سکون و اطمینان کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے مگر نہ جانے میں کیوں

بسا اوقات اپنے چاروں طرف اس پھیلی ہوئی روشنی میں آنکھیں میچ کر رونے لگتا ہوں۔ یہ دنیا کتنی عجیب ہے۔ اس مہکتے ہوئے گلستان کا ایک پھول اپنے چمن سے جدا ہو چکا ہے لیکن کسی کو یاد تک نہیں۔ شاید ماں کے بعد بھائی کا دل ہی ایک ایسا گوشہ ہے جہاں بہن کی یاد ہر حال میں مقیم رہتی ہے۔''

افسوس! اب یحییٰ بھی اس دنیا میں موجود نہیں رہے۔ انہوں نے ۲۰۱۵ء میں وفات پائی اور ربوہ ہی میں دفن ہوئے۔

آپ نے میرے پرائمری کلاسز کے ایک ہم جماعت کا لکھا ہوا وہ مضمون پڑھا جو اس نے اپنی بڑی بہن کی وفات پر تحریر کیا تھا۔ یہ تحریر ایک ایسے شخص کی ہے جو دنیا والوں کے نزدیک ''نارمل'' نہ تھا لیکن اس کے احساسات اور اندازِ بیان دیکھئے تو وہ مجھے نارمل لوگوں سے بھی زیادہ نارمل محسوس ہونے لگتا ہے۔

اب میں ذکر کر رہا ہوں پنجاب یونیورسٹی میں اپنے سے ایک سال سینئر ایک احمدی طالبہ کا جنہوں نے میری طرح پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا، جامعہ نصرت میں پڑھانے لگیں اور بوقت ریٹائرمنٹ وہ اس ادارے کی سربراہ بن چکی تھیں۔ میرا اشارہ صادقہ قمر کی طرف ہے۔ مولوی محمد شریف جو موضع مانگٹ اونچے کے رہنے والے اور واقفِ زندگی تھے ان ہی صادقہ قمر کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی رہائش تحریک جدید کوارٹرز میں ہوا کرتی تھی۔ نہ جانے کس کس دفتر میں کام کرتے رہے ہوں گے لیکن مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب وہ جامعہ احمدیہ میں غالباً اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ قریشی محمد حنیف قمر سائیکل سیاح کے صاحبزادے، سعید بھی وہیں ہوتے تھے اور مجھے ایک دو بار ان دونوں سے ملاقات کے لیے جامعہ احمدیہ جانا یاد ہے جب کہ ان کے گھر پر بھی ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے۔

مولوی محمد شریف کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ غالباً وہ ہے جو اُن کے حجِ بیت اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ موصوف اپنی والدہ سمیت ۱۹۷۴ء میں حج کے لیے گئے تاہم دونوں گرفتار ہو گئے اور قید و بند کی شدید صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے۔

انہوں نے یہ سارے واقعات خود قلمبند کر کے جماعتی ریکارڈ میں محفوظ کرا دیئے ہیں۔ میرے سامنے جماعت احمدیہ، امریکہ کے مجلّہ ''النور'' کا اکتوبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ موجود ہے جس میں ان کا یہ مضمون نقل کیا گیا ہے۔

تفصیلات کے مطابق بارہ احمدی اور تین غیر از جماعت دوستوں (جنہیں باقی بارہ افراد کے احمدی ہونے کا علم نہ تھا) نے مکہ معظمہ میں اپنی رہائش کا انتظام اکٹھا کیا تھا۔ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد ان تینوں افراد کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ان بارہ افراد کا تعلق جماعتِ احمدیہ سے ہے چنانچہ انہوں نے ان کی مخبری کر دی۔ موصوف کے اپنے بیان کے مطابق: ''ایک دن ہمارے مکان پر تین آدمی آئے ...... انہوں نے مجھے کمرہ سے باہر بلا کر کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہاں مرزائی رہتے ہیں، آپ ہمیں تسلی کرا دیں ورنہ معاملہ سعودی عرب کی حکومت تک پہنچ چکا ہے۔ آپ کو اور آپ کی مستورات کو بھی عدالت میں جانا پڑے گا۔ اگر آپ مسلمان ہو جائیں تو یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا جائے گا۔'' محمد شریف لکھتے ہیں کہ وہ ان کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور ''یہ کہہ کر چلے گئے

کہ ہمارا مقصد حل نہیں ہوا۔''

جب فاضل مضمون نگار کے ساتھیوں کو پتا چلا کہ ان کی احمدیت باقی لوگوں پر کُھل گئی ہے تو ان میں سے کچھ مدینہ منورہ چلے گئے اور کچھ جدّہ روانہ ہوگئے اور موصوف اور ان کی والدہ ان غیر از جماعت احباب کے ساتھ اکیلی رہ گئیں۔ وہ بتاتے ہیں: ''خاکسار مارچ کی سولہ سترہ کی درمیانی رات کو مسجد حرام میں عشاء کی نماز کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ ایک آدمی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور مجھے کہنے لگا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ آپ کا پیشہ کیا ہے؟ میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہا۔ اتنے میں ایک جوشیلا آدمی میری طرف آیا اور اس نے آتے ہی مجھ سے قرآن مجید چھین لیا اور کہا کہ شریف آدمی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور آپ کوئی توجہ نہیں کرتے۔ اس نے کہا کہ میں حرم کا نقیب ہوں'' اور موصوف کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اپنے بارے میں سچ سچ نہ بتایا تو انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ محض گیدڑ بھبکی نہ تھی چنانچہ مطمئن نہ ہونے پر اس نے پولیس کے ایک سپاہی کو بلا کر موصوف کو اس کے حوالے کر دیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں: ''پولیس کا سپاہی مجھے حرم کی پولیس کے دفتر لے گیا۔ وہاں منظور احمد چنیوٹی اور وہ تینوں غیر از جماعت احباب جو ہمارے مکان پر گئے تھے موجود تھے۔''

ہمارے اس احمدی دوست کو مدیر الحرم یعنی تھانیدار کے سامنے پیش کیا گیا جس نے موصوف سے اس تصدیق کے بعد کہ وہ احمدی ہیں انہیں جیل بھجوا دیا۔ بعد میں ان کی والدہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

عدالت میں اپنی پہلی پیشی کا ذکر کرتے ہوئے موصوف بتاتے ہیں: ''مجھے اور والدہ صاحبہ کو عدالت میں قاضی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ سرکاری ترجمان ساتھ تھا۔ مولوی منظور احمد چنیوٹی اور تینوں غیر احمدی بھی ساتھ تھے۔ مولوی منظور احمد چنیوٹی نے قاضی کے سامنے حضرت مسیح موعود کی کتاب حقیقۃ الوحی پیش کی'' اور حضرت مسیح موعود کے بعض الہامات کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی جس کے بعد بالفاظ محمد شریف ''قاضی کہنے لگا کہ آپ ہمارے نزدیک مرتد ہیں اور واجبُ القتل ہیں۔ آپ توبہ کر کے ہمارے نظریات قبول کر لیں ورنہ ہم آپ کو قتل کی سزا دیں گے۔ میں نے کہا کہ مرنا ایک دن ضرور ہے۔ میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا۔ میں کسی حالت میں بھی احمدیت سے تائب نہیں ہو سکتا۔''

عدالت میں اپنی اگلی پیشی کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ اس روز آٹھ دس کے قریب قاضی تھے۔ ان کا بیان پڑھ کر سنایا گیا اور کہا گیا کہ یہ شخص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے۔ موصوف کے جواب پر قاضی القضا نے انہیں ابلیس، ملعُون اور شیطان کے القابات سے نوازتے ہوئے کہا: ''تم مرتد ہو۔ اگر تم نے قادیانی دین سے توبہ نہ کی تو ہم تم کو قتل کی سزا دیں گے...... کچھ اور باتیں بھی ہوئیں جس کے بعد محمد شریف کے الفاظ ہیں ''قاضی کہنے لگا کہ یہ قادیانی مبشر ...... معلوم ہوتا ہے اور یہاں جاسوسی کرنے آیا ہے۔ اس کو تنہائی کی جیل میں رکھا جائے۔ یہ واجب القتل ہے۔''

فاضل مضمون نگار بتاتے ہیں کہ یہ بات سن کر ''میں نے ان سے کہا...... اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو میری

میّت میرے وطن پہنچائی جائے۔ کہنے لگے...... میّت جہنم میں دفن کی جائے گی، تمہارے وطن نہیں بھجوائی جا سکتی۔''

عدالت کا رویّہ دیکھ کر فاضل مضمون نگار کو یقین ہو گیا کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا چنانچہ انہوں نے یہ وصیت نامہ لکھ کر اپنی والدہ کے حوالے کر دیا:

''میرے متعلق میرے کمرے کے ایک غیر احمدی نے جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں حکومت کو رپورٹ کر دی کہ یہ احمدی ہے اور حکومت سعودی عرب نے مجھے رات عشاء کی نماز کے بعد قرآن مجید پڑھتے ہوئے پکڑ لیا۔ قرآن مجید مجھ سے چھین لیا (میں قرآن مجید حرم میں مقامِ ابراہیم کے پاس بیٹھ کر پڑھ رہا تھا)، مجھے حرم کی پولیس میں لے گئے، وہاں بیان لیا گیا اور اس کے بعد جیل پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن والدہ صاحبہ بھی میرے ساتھ شامل ہو گئیں۔ ہمیں عدالت میں لے جایا گیا۔ بیان لیا گیا۔ اس کے بعد قاضی نے کہا کہ یا تو تم احمدیت سے توبہ کر کے مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہاری سزا قتل ہے۔ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے اپنے بیان پر قائم ہوں۔ یہاں کا قانون بڑا سخت ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔ میری رفیقۂ حیات! آپ میری تمام خطاؤں کو معاف کر دیں، میری موت پر ماتم نہ کریں۔ یہ میری آپ کو وصیت ہے۔ میری بیٹی رانی کا نکاح کر دینا۔ میری تمام بیٹوں کو وصیت ہے کہ وہ تمام نمازیں باجماعت ادا کرنے کی کوشش کیا کریں اور وہ احمدیت کے بہادرانہ جانباز سپاہی بنیں اور احمدیت کی خاطر اپنی جان کی قربانی دینے سے ہرگز ہرگز گریز نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ سب کا حافظ و ناصر ہو۔ تمام رشتے داروں کو فرداً فرداً سلام پہنچا دیں۔ حضور کی خدمت میں بھی میرا سلام پہنچا دیں۔ صفیہ کے خاوند بشیر احمد کے نام میری وصیت یہ ہے کہ وہ میری بیٹی صفیہ سے حسنِ سلوک کرے۔ میرا صفیہ اور بشیر احمد کو سلام پہنچا دیں۔''

عدالت میں دوسری پیشی کے بعد موصوف کو مکہ معظّمہ کی کسی جیل میں قید تنہائی میں رکھا گیا تاہم ان کے مطالبہ پر انہیں قرآن شریف مہیا کر دیا گیا۔ وہ بتاتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا میرا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ فرصت کے اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت کر کے اپنی گھبراہٹ دُور کر لیتا تھا۔ جیل میں مجھے روزانہ تین وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ مکہ معظّمہ کی جیل میں خوراک اچھی ملتی رہی۔ میں نمازیں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا تھا اور مجھے سلسلۂ احمدیہ کی ترقی اور احبابِ جماعت نیز اپنے لیے، رشتے داروں کے لیے خوب دعائیں کرنے کا موقع ملا۔ پورے ایک ماہ کے بعد مجھے مکہ معظّمہ کی جیل سے...... جدّہ پہنچا دیا گیا اور وہاں کی جیل میں انفرادی کمرے میں بند کر دیا گیا یعنی میرے ساتھ کوئی اور قیدی نہیں تھا۔ وہاں بھی میں نے جاتے ہی قرآن مجید حاصل کر لیا اور روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کر کے اپنا دل بہلا لیتا تھا......

پچیس اپریل کو مجھے جیل سے جدّہ کے تھانے میں لے جایا گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔ تھانہ پہنچ کر میرے شناختی کارڈ کے چھ فارموں پر دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیوں کے نشان ثبت کئے گئے۔ اس کے بعد لکڑی کی ایک تختی پر میرا نام لکھ کر تختی میرے دونوں ہاتھوں میں پکڑا دی گئی اور فوٹو لیا گیا۔ والدہ صاحبہ کو مکہ معظّمہ کی عورتوں کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ مجھے والدہ صاحبہ کے حالات کا کوئی علم نہیں تھا اور والدہ صاحبہ کو میرے متعلق کچھ علم نہ

تھا۔ آخر دو مئی کو قریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد جدّہ میں میری اور والدہ صاحبہ کی آپس میں ملاقات ہوئی۔ اس دن مجھے اور والدہ صاحبہ کو جیل سے رہا کر کے مکہ معظّمہ بھجوا دیا گیا کیونکہ ہمارے پاسپورٹ مکہ معظّمہ میں تھے......

جب ہم مکہ معظّمہ پہنچے تو مدیرالحرم نے فرمان جاری کیا کہ جب تک ان کا جہاز روانہ نہیں ہوتا ان کو جیل میں ہی رکھا جائے چنانچہ ہمیں جدّہ بھجوا کر پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔ ۶ مئی کو ہمیں جدّہ کی جیل کے دفتر میں بلایا گیا۔ وہاں میں نے اپنا اور والدہ کا پاسپورٹ دیکھ لیا۔ اس سے مجھے تسلی ہوگئی کہ ان شاء اللہ ہم اب ضرور وطن واپس جائیں گے......

تیرہ مئی کو مجھے سخت بے چینی تھی کہ آج مجھے رہا کرتے ہیں یا نہیں تو میں نے اسی بے چینی کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت شروع کردی۔ جب میں عین قرآن مجید کی اس آیت پر پہنچا کہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ تو اسی وقت جیل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مجھے کمرہ سے باہر نکالا گیا اور والدہ صاحبہ کو بھی جیل سے باہر لایا گیا۔ پھر ہمیں......اِدَارَۃُ التَّرْحِیْل پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے سیدھا جدّہ کی بندرگاہ پر پہنچایا گیا۔ جہاز کی سیڑھی پر ہمیں پاسپورٹ دیا گیا۔ ہمیں دراصل جیل سے رہا نہیں کیا گیا تھا بلکہ ملک بدر کیا گیا تھا اور ہمیں کہا گیا تھا کہ سعودی عرب پھر بالکل نہ آنا۔‘‘

مولوی محمد شریف اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انہوں نے ۲ مارچ ۲۰۰۱ء کو وفات پائی۔ اس موقع پر ان کے بیٹے، کریم احمد شریف نے ’’باپ کا سایہ‘‘ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار جن میں حج کے موقع پر ان کی گرفتاری والے واقعے کا ذکر ہے پیشِ خدمت ہیں:

زندگی وقف رہی دینِ محمد کے لیے
اور سکھایا کہ عبادت میں مزا ہوتا ہے
راہِ مولیٰ میں سہی قیدِ دیارِ کعبہ
سب کو دکھلایا کہ حق یوں بھی ادا ہوتا ہے
موت سے ڈرنا ہے کیا حکمِ الٰہی مانو
جان سے بڑھ کے بھی ایمان بڑا ہوتا ہے
اپنی خاموش طریقت سے سکھایا مجھ کو
جس کا کوئی بھی نہیں اس کا خدا ہوتا ہے
تیرا محبوب تھا بندہ سو تجھی کو سونپا
حق کہاں ہم سے امانت کا ادا ہوتا ہے

مولوی محمد شریف کا ذکر فی الحال اتنا ہی۔ اب میں اپنے قارئین کو متعارف کرا رہا ہوں مولوی محمد صدیق امرتسری سے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ دنیا کے مختلف ملکوں میں پیغامِ حق پہنچانے میں گزارا۔ وہ جماعت کے معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے اور سچ پوچھیں تو میرا ان سے پہلا تعارف اباجی کی وفات پر الفضل ۶ نومبر ۱۹۶۴ء میں چھپنے والے ان کے ایک مضمون کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ اسی مضمون

سے مجھے معلوم ہوا کہ ایک زمانے میں وہ الفضل کے ادارتی عملے میں شامل تھے اور انہیں بعض دفتری امور میں اباجی کی معاونت کا موقع مل چکا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

’’۱۹۳۶ء میں بیت اقصیٰ میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے درس القرآن کے نوٹ لینے کی ذمہ داری دفتر الفضل کی طرف سے محترم مولوی صاحب پر تھی اور میں ان کا معاون تھا۔ حضور کے منشا کے مطابق وہ نوٹ موٹی قلم سے لکھ کر روزانہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں لے جانا اور بعد اصلاح واپس لانا میرے سپرد تھا۔ اگرچہ وہ نوٹ بعد میں شائع نہ ہو سکے مگر محترم مولوی صاحب نے محفوظ رکھے اور قادیان سے ہجرت کے وقت دوسرے مسودات کے ساتھ وہ نوٹ بھی اپنے ساتھ ربوہ لے آئے تھے۔ یہ سب امور میرے ذہن سے نکل چکے تھے لیکن سنگاپور آنے سے ایک دو روز قبل جب محترم مولوی صاحب کے دفتر میں خاکسار انہیں الوداع کہنے گیا تو وہ تفسیر کبیر کے لیے جملہ تفسیری نوٹوں کو یکجا کرنے کا کام کر رہے تھے اور اتفاق سے اُس وقت میرے ہی ہاتھ سے موٹے لفظوں میں ۱۹۳۶ء کے لکھے ہوئے اور حضور کے قلم سے اصلاح شدہ نوٹس بھی اُن کے سامنے میز پر پڑے تھے۔ وہ دکھا کر کہنے لگے: کیا آپ پہچان سکتے ہیں کہ یہ نوٹس کس کے ہاتھ کے اور کب کے لکھے ہوئے ہیں؟ میں یہ دیکھ کر مولوی صاحب کی دُور اندیشی پر حیران رہ گیا کہ تقریباً ربع صدی سے زائد عرصہ کے لکھے ہوئے نوٹس محترم مولوی صاحب کس طرح نہ صرف بالکل محفوظ رکھ سکے بلکہ بحفاظت تمام قادیان سے ربوہ بھی لا سکے۔‘‘

صدیق امرتسری پندرہ جون ۱۹۱۵ء کو موضع بھڈیار ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں پائی اور پھر قادیان کے مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۳۷ء میں مرحوم نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کردی۔ انہیں تحریک جدید کے تحت کئی غیر ملکوں میں بطور مربی سلسلہ خدمت کی توفیق ملی۔ ان ممالک میں انگلستان، سیرالیون، لائبیریا، سنگاپور اور فجی شامل ہیں۔ وہ ۱۹۷۳ء کے بعد پاکستان ہی میں رہے اور نظارت تالیف و تصنیف اور بعض دیگر جماعتی اداروں میں کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ پشاور اور لاہور میں بطور مربی سلسلہ بھی تقرر رہا۔ ۱۹۷۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

انہوں نے تین کتابیں لکھی ہیں جن میں سے دو اِن کے شعری مجموعے بعنوان ’’نغماتِ صدیق‘‘ اور ’’دل کی دنیا‘‘ ہیں اور ایک ان کے خدمتِ دین کے اپنے اور بعض دیگر بزرگانِ سلسلہ کے واقعات کا مجموعہ ہے۔

ان کی وفات دل کے عارضے سے ہوئی۔ وہ فضل عمر ہسپتال ربوہ اور میو ہسپتال، لاہور میں زیرِ علاج رہے۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے راولپنڈی گئے ہوئے تھے اور بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر ضیاء الحسن کے گھر پر قیام فرما تھے۔ یکم ستمبر ۱۹۸۴ء کی صبح جب انہیں اٹھایا گیا تو ان کی روح خالقِ حقیقی کی طرف پرواز کر چکی تھی۔

مرحوم نہایت نیک سیرت، متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ خرابی صحت کے باوجود مضمون نگاری اور شعروشاعری کا شغل جاری رہا۔ ان کی تحریر میں روانی اور جاذبیت تھی۔ احباب جماعت کی کثیر تعداد ان کی شاعری کی مدّاح تھی۔

عبدالسلام اختر کی شاعری کے مجموعہ ’’نقوشِ جاوداں‘‘ میں صدیق امرتسری کی ایک نظم بعنوان ’’عورتوں کا

راج'' کے حوالے سے بھی کچھ اشعار شامل ہیں۔ صدیق امرتسری نے کہا تھا:

سر میں ہر آن درد رہتا ہے
اور بدن سرد سرد رہتا ہے
آج کل راج رانیوں کا ہے
تخت اور تاج رانیوں کا ہے
شوہرانِ کرام بیچارے
لوٹتے ہیں جو گھر تھکے ہارے
لُوٹ لیتی ہیں پَل میں جیبیں سب
روز ہوتا ہے بس یہی کرتب
سخت مہنگا ہے بیویوں سے پیار
رَبَّنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

عبدالسّلام اختر نے صدیق امرتسری کا یہ دُکھڑا سن کر جواباً یہ اشعار کہے:

اے میرے دوست یہ فغاں تیری
دل نے سن لی ہے داستاں تیری
عرض کرتا ہوں میں بھی اک تجویز
میں کہ ہوں ایک بندۂ ناچیز
آنکھ، منہ، ناک، کان رکھتا ہوں
یعنی منہ میں زبان رکھتا ہوں
آپ ہمت کی اک لگائیں جست
جست جس سے ہو ہر مخالفت پست
ایسی عورت جہاں پہ ہو موجود
لائیں ویسا ہی ایک اور وجود
یعنی جوبن پہ اور جوبن لائیں
ایسی عورت پہ ایک سوکن لائیں
سامنے اس کے اس کو پیار کریں
اور یہ کھیل بار بار کریں
کھلبلی جب مچے گی چند اِک بار
سوکنوں پر پڑے گی سب پھٹکار

آپ اتنے میں دُور جا کے کہیں
ایک کونے میں بیٹھ جائیں کہیں
پھول ہو سبزہ ہو فِضائے ریاض
چائے کا کپ ہو، شاعری کی بیاض
کتنی رنگیں حیات ہو جائے
بے ثباتی ثبات ہو جائے

موصوف نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ اس حوالے سے لاہور کی عابدہ فوزیہ خان کا ایک مضمون مطبوعہ الفضل ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء پڑھنے کے لائق ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''آج سے چند سال پیشتر مولانا مرحوم بغرض علاج مغلپورہ لاہور اپنی ہمشیرہ صاحبہ کے ہاں آ کر ٹھہرے تو مجھے بھی آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی طبیعت خاصی مضمحل تھی...... کمزوری ونقاہت کا غلبہ تھا اور آپ زیادہ گفتگو نہ کر سکتے تھے مگر آپ نے مجھ سے باتیں کیں...... میرا تعارف حاصل کیا، مشاغل پوچھے۔ جب آپ کو پتا لگا کہ میں بھی ادبی ذوق رکھتی ہوں تو کہا: اپنا کلام اور نگارشات لے کر آنا۔ دوسرے دن میں صبح ۱۰ بجے خالہ جی کے گھر گئی...... آپ نے مجھے سلامتی کی دعا دی اور پھر مجھ سے میری فائل لے لی جس میں چند نظمیں اور مضمون تھے۔ آپ نے میری تحریر کا بغور مطالعہ کیا، چند شائع شدہ غزلیں پڑھیں اور چند مضامین کے مسوّدے۔ مجھے پوچھا کہ آپ کس صنف کو اپنانا چاہتی ہیں؟ میں نے کہا شاعری ہی اظہار کی بہترین صنف ہے اور میں اسی طرف راغب ہوں۔ کہنے لگے: پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ ابھی تم طالبہ ہو۔ ہاں شوق رکھتی ہو تو ادبی کہانیاں لکھو۔ مضامین لکھو۔ تمہارے الفاظ میں گہرائی ہے، وسعت ہے، شاعری اچھی کرتی ہو مگر قافیہ ردیف کا خیال رکھنا ابھی تمہارے لیے مشکل ہے۔ تمہارا تخیل خوبصورت ہے، اسے قافیے ردیف میں قید نہ کرو، لامحدود ہو کے لکھو۔ پھر آپ نے میری ایک دو غزلیں رکھ لیں۔ کہا کل منگوا لینا اور مجھے نثر کی طرف بار بار متوجہ کیا جب کہ مجھے نثر لکھنا خاصا مشکل لگ رہا تھا مگر آپ کے کہنے پر میں نے نثر لکھی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اور آپ کی مناسب رہنمائی سے مجھے خاصا مقام ملا اور یہ مقام محض مضامین کی بدولت تھا۔

اس مختصر سی نشست میں آپ نے بہت سی باتیں کیں اور میرے ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تین کتابیں جن میں دو شعری مجموعے تھے مجھے عطا کئے اور کہا پڑھ کر مجھے بتانا۔ پھر آپ نے اپنی تازہ غزل جو کہ الفضل میں ارسال کرنا تھی پڑھ کر سنائی۔''

مولانا کی وفات پر بعض احباب نے مضامین لکھے اور کچھ نے بزبانِ شعر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سیّد ادریس احمد عاجز کرمانی نے جو اپنے اشعار کی ان سے اصلاح لیتے رہے تھے اس موقع پر کہا:

آہ کس کی یاد میں ہر احمدی ہے سوگوار
کس کے غم میں سب کی آنکھیں ہوگئی ہیں اشکبار

مولوی صدیق، فاضل، متقّی، نیکوشعار
چل دیئے سُوئے جناں از حکمِ ربِ کردگار
سربسر حسنِ عمل، سرمایۂ مہر و وفا
جملہ اوصافِ حمیدہ کے تھے وہ آئینہ دار
وقف تھے وہ فی سبیل اللہ، مردِ حق شناس
راہِ اُلفت میں سدا اُن کا قدم تھا استوار
عندلیبِ خوشنوائے باغِ مامورِ زماں
شاعرِ شیریں بیاں، بزمِ سخن کے افتخار
نکتہ سنج و نکتہ داں، باریک بیں، نکتہ نواز
کِلکِ عنبر بار سے اُن کی فضا تھی مشکبار
وہ جہاں استاد، فنِ شاعری میں طاق تھے
نثر میں تحریر ان کی ہوتی تھی اک شاہکار
شہسوارِ رزم و بزم و عاملِ شرع متیں
طالبِ خوشنودیٔ ربِ جہاں پروردگار
شاعرانِ احمدیت سب کے سب ہیں بالخصوص
ان کے جانے پر ہوئے غمگیں، حزیں و سوگوار
شاعری کے فن میں وہ استاد اس عاجز کے تھے
اُن کی رحلت پر نہ ہو کیوں غمزدہ اور دلفگار

صدیق امرتسری کا ذکر ہوتو ذہن لامحالہ مولانا محمد صدیق گورداسپوری کی طرف بھی نکل جاتا ہے جو اپنے اس معزّز ہم نام کی طرح مدتِ دراز تک دُور دیسوں میں اشاعتِ پیغامِ حق میں مصروف رہنے کے بعد ۱۵فروری ۲۰۱۵ءکو وفات پاگئے۔

مرحوم کے ساتھ میرے تعارف کا اوّلین حوالہ ان کے خسر اور ہمارے پڑوسی، خلیل احمد، مٹھائی ساز تھے جن کی گول بازار، ربوہ میں دکان ہوا کرتی تھی اور جن کا ایک بیٹا سکول میں میرا ہم جماعت تھا۔ اگرچہ میں مولانا کے ساتھ دوستی کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا لیکن گاہے بگاہے ملاقات ہوتی تو ہم ایک دوسرے کی خیریت معلوم کئے بغیر نہ رہ سکتے۔

انہوں نے ۱۹۵۲ء میں جامعہ احمدیہ سے شاہد کا امتحان پاس کیا اور پھر تین مختلف اوقات میں سیرالیون، ایک بار غانا اور ایک بار امریکہ میں خدمتِ دین کی توفیق پائی۔ ان بائیس سالوں کے دوران وہ مدتِ دراز تک امیر جماعت احمدیہ، سیرالیون بھی رہے۔ خوش قسمت تھے کہ انہیں ۱۹۷۰ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کے

دورۂ سیرالیون کے موقع پر اور ۱۹۷۶ء میں حضور کے دورۂ امریکہ کے دوران آپ کے استقبال کا موقع بھی ملا۔

ان کی آخری تعیّناتی بطور نائب وکیل التبشیر تھی جس کے بعد وہ فالج کی وجہ سے صاحبِ فراش ہوکر اپنے گھر میں محدود ہوکر رہ گئے۔ یہی وہ دور تھا جب میں ''قریۂ جاوداں'' کے لیے ان کے سسرال کے بارے میں کچھ معلومات کے حصول کے لیے ان کے گھر واقع محلّہ دارالرحمت وسطی حاضر ہوا تھا۔ وہ اس وقت وِیل چیئر پر تھے اور بات چیت میں بھی دقّت محسوس کرتے تھے۔ افسوس! اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں ہوسکی حتّٰی کہ ان کی سناؤنی آ گئی۔ الفضل نے ان کی وفات کی خبر دیتے ہوئے ان کی سیرت کے بعض نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے کتنا درست لکھا تھا:

''آپ منکسر المزاج، بے نفس و بے ریا، محنتی اور خاموش خدمت گار تھے۔ طبیعت میں سادگی تھی، گہرا علم اور تحقیق کا ذوق تھا...... حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے مقامِ نعیم پر فائز افریقہ کے بعض مربیان کا تذکرہ فرمایا تو آپ کو بھی ان خوش قسمت مربیان میں شامل فرمایا۔ اطاعتِ امام اور اطاعتِ نظام آپ کی سیرت کا حسین پہلو ہے۔ آپ عبادت گزار، پنجوقتہ نمازی اور تہجد میں کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ آپ کا اپنے گھر والوں کے ساتھ انتہائی نرم رویّہ تھا۔ آپ نے صبر اور شکر کے ساتھ زندگی گزاری۔ آپ عالمِ باعمل، فرشتہ سیرت اور ہر ایک کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے والے بزرگ تھے۔''

صدیق گورداسپوری کے بعد اب کچھ ذکر مولانا بشارت احمد بشیر کا!

میں مولانا کو اس زمانے سے پہچانتا تھا جب میرے ماموں مرزا محمد یعقوب تحریک جدید کے میڈیم کوارٹرز میں مقیم تھے اور بشارت بشیر کی رہائش ان کے گھر کی پشت پر جونیئر کوارٹرز میں تھی۔ میں اور میرا ماموں زاد بھائی، مرزا محمد اسماعیل اُس وقت اِس عمر میں تھے جب ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ آنے جانے میں کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ یوں بھی بشارت بشیر کے ایک برادرِ نسبتی، ہدایت اللہ (جو بعد میں ڈاکٹر بنے، مرزا حفیظ احمد کے داماد ہوئے اور آج کل امریکہ میں مقیم ہیں) سکول میں اسماعیل کے ہم جماعت تھے لہٰذا ہم دونوں ان کے گھر میں بے تکلفانہ چلے جاتے اور کھیلتے رہے۔ بشارت بشیر کی اہلیہ رشیدہ جنہیں اسماعیل کی دیکھا دیکھی میں بھی ''آپا رشیدہ'' کہنے لگا تھا بڑی خوش اخلاق اور زندہ دل تھیں۔ وہ ہمیں اپنے گھر میں پاکر ہمیشہ خوش ہوتیں اور موقع بموقع تھوڑی بہت خاطر مدارت بھی کر دیتیں۔

سچ پوچھیں تو اس کے علاوہ مجھے بشارت بشیر یا ان کی اہلیہ کی کوئی اور بات یاد نہیں آ رہی۔ کچھ عرصہ بعد جب مرزا محمد یعقوب نے اپنی رہائش فیکٹری ایریا میں منتقل کرلی تو میرا اس گھر میں آنا جانا ختم ہوگیا تاہم بشارت بشیر سے جان پہچان کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوا اگرچہ ان سے بے تکلفی کا بھی کوئی موقع پیدا نہ ہوا۔ میں کبھی ربوہ جاتا اور وہ اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آ جاتے تو ہم رُک کر ایک دوسرے کو سلام ضرور کرتے لیکن الاّ ماشاء اللہ کبھی تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اس کے باوجود ۲۲ جنوری ۱۹۹۲ء کے الفضل میں ان کی وفات کی خبر پڑھی تو دل کو سخت رنج ہوا۔ تبھی کسی دوست کے ذریعے معلوم ہوا کہ مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے دفتر کے بالمقابل تعمیر شدہ ''انس مارکیٹ''

بشارت بشیر ہی کی تھی جس کا نام انہوں نے اپنے لے پالک ''انس'' کے نام پر رکھا تھا۔

الفضل کی اطلاع کے مطابق موصوف جنوری ۱۹۲۴ء میں صوبہ سندھ کے گاؤں کمال ڈیرو تحصیل کنڈیارو ضلع نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، ماسٹر محمد پریل حضرت مسیح موعود کے رفیق تھے۔ بشارت بشیر نے پرائمری تک تعلیم نواب شاہ میں حاصل کی۔ بعدازاں انہیں قادیان بھجوا دیا گیا جہاں انہوں نے احمدیہ سکول اور پھر مدرسہ احمدیہ میں تعلیم حاصل کی اور مولوی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۴۶ء میں انہیں پہلی بار بطور مربی بیرونِ ملک بھجوایا گیا۔ انہوں نے مغربی افریقہ کے ممالک نائیجیریا، گھانا اور سیرالیون میں مختلف اوقات میں پندرہ سال تک خدمتِ دین کی توفیق پائی۔ اس کے علاوہ کم و بیش اتنا ہی عرصہ مرکزِ سلسلہ میں نائب وکیل التبشیر کے طور پر گزارا۔ بعدازاں جامعہ احمدیہ میں تعلیمی خدمات انجام دیں اور بوقتِ وفات قاضی کے طور پر کام کررہے تھے۔

وہ اردو، انگریزی اور عربی پر عبور رکھتے تھے۔ وسیع مطالعہ تھا۔ انہوں نے ریاض الحدیث کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور انگریزی میں ہی ایک کتاب نماز کے موضوع پر لکھی۔ جماعتی اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً علمی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ عیسائیت کا گہرا مطالعہ تھا۔ اگرچہ مولوی فاضل پاس کرنے کے بعد عملی زندگی میں داخل ہوگئے تھے تاہم آہستہ آہستہ ذاتی شوق سے میٹرک سے لے کر ایم اے کے امتحانات پاس کرلئے۔

بشارت بشیر کی وفات پر ان کے بعض دوستوں نے ان کے بارے میں الفضل میں مضامین لکھے۔ ان میں سے ایک بشیر احمد رفیق کا لکھا ہوا ہے جو ۲۵ فروری ۱۹۹۲ء کے الفضل میں شائع ہوا۔ فاضل مضمون نگار ان کی بعض خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ سلسلۂ احمدیہ کے ان معدودے چند علماء میں سے تھے جنہیں اردو، عربی اور انگریزی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ان کا اوڑھنا اور بچھونا مطالعہ تھا۔ اخبارات و رسائل اور کتب کا ایک انبار ان کی چارپائی کے اردگرد یا میز پر ہوتا۔ ان کا دل پسند مشغلہ مستشرقین کے اُن اعتراضات کا جواب دینا تھا جو انہوں نے قرآنی آیات پر کئے ہیں۔ جواب کے لیے وسیع مطالعہ کرتے تھے۔ حضرت بانی سلسلہ کی کتب، حضرت فضلِ عمر کی تصانیف، آئمہ کرام کی کتب کے علاوہ علماء سلسلہ اور غیراز جماعت علماء کی کتب کے مطالعہ کے بعد زبان کھولتے تھے۔ عیسائیت پر ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ آپ کسی مسئلہ پر تحقیق کے دوران صرف حوالہ جات پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اصل ماخذ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ مطالعہ کے اس شوق کا ہی نتیجہ تھا کہ گھر پر ہی ایک کمرہ لائبریری کے طور پر مختص کر رکھا تھا جس میں نایاب و نادر کتب جمع کرکے رکھی تھیں۔ اخبارات و رسائل کو مجلد کرکے اس لائبریری کی زینت بنایا تھا۔ سلسلے کے اخبارات و رسائل میں بہت سارے علمی و تحقیقی مضامین لکھ کر شائع کرائے جن پر علماء نے داد و تحسین ادا کی۔

خود مہمان نواز تھے۔ سندھی یوں بھی مہمان نوازی میں مشہور ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک اور عظیم نعمت سے انہیں نوازا تھا اور وہ نعمت ان کی اہلیہ محترمہ ہیں جنہوں نے ان کے دوستوں اور احباب کی مہمان نوازی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ بیوی کا تعاون نہ ہو تو خاوند خواہ کتنا بھی دریادل کیوں نہ ہو مہمان نوازی سے عہدہ برا

نہیں ہوسکتا۔ بیگم بشارت بشیر مہمان نوازی میں ایک اعلیٰ نمونہ رکھتی ہیں۔ بشارت صاحب کے ہاں مہمانوں، دوستوں، ماتحتوں اور طلبہ کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرے مہمان ان کی بیٹھک میں داخل ہوتے تھے اور اندر سے محترمہ بیگم صاحبہ مسلسل ماکولات و مشروبات بھیجتی رہتی تھیں اور اس طرح بشارت صاحب کلیتاً اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر علمی اور روحانی گفتگو کرتے تھے۔

طبیعت میں خوشگواریت تھی۔ نہ خود افسردہ رہتے اور نہ ان کی محفل میں بیٹھنے والا افسردگی محسوس کرتا۔ علمی گفتگو کے ساتھ ساتھ لطائف و ظرائف بھی چلتے۔ مزاح کی باتیں بھی ہوتیں۔

افریقہ میں عظیم خدمات سرانجام دیں خصوصاً سیرالیون میں سکولوں کے قیام کے سلسلے میں ان کا نام یادگار رہے گا۔ ۱۹۶۷ء میں مجھے مغربی افریقہ کے بعض ممالک میں جانے کا موقع ملا۔ اس دورہ کے دوران جب میں سیرالیون پہنچا تو میرے جانے سے کچھ عرصہ قبل ہی مولوی صاحب واپس پاکستان تشریف لے جاچکے تھے۔ مشن کی طرف سے مجھے بعض وزراء سے بھی ملایا گیا۔ ان میں سے ہر ایک نے بڑی محبت سے ان کا ذکر کیا۔ ۱۹۶۵ء میں سیرالیون کے وزیرِ تعلیم لندن تشریف لائے۔ اچانک ایک دن بغیر اطلاع کے مشن ہاؤس میں آئے اور مجھے کہنے لگے کہ میں نے کل واپس سیرالیون جانا ہے وہاں مولوی بشارت احمد بشیر مجھ سے پوچھیں گے کہ احمدیہ مشن گئے تھے تو میں کیا جواب دیتا اس لیے آج بعض مصروفیات منسوخ کرکے حاضر ہوا ہوں تا مولوی بشارت صاحب کے سامنے سرخرو ہوسکوں۔''

حسن محمد خان عارف نے بشارت بشیر پر اپنے مضمون مطبوعہ الفضل ۲۵ مارچ ۱۹۹۲ء میں ان کی علم دوستی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

''لائبریری اس علم دوست کی محبوب آماجگاہ تھی۔ اکثر دفتر سے اُٹھ کر وہاں چلا جاتا تھا۔ واپس آتا تو سائیکل کے پیچھے چار پانچ موٹی موٹی کتابیں لدی ہوتی تھیں۔ میں نے نیم سنجیدگی سے پوچھا کہ ہمیں تو لائبریری والے دو سے زیادہ کتابیں دیتے نہیں تم چار پانچ کیسے لے آتے ہو تو میرے کان میں کہا کہ یہ راز ہے۔ کسی کو بتا نہیں سکتا۔ وہ راز میں جانتا تھا۔ وہ ذوقِ علم تھا، علم کی بُھوک تھی جو وہاں سے اتنی کتابیں لانے کی تدبیریں انہیں معلوم تھیں۔ انس مارکیٹ میں گھر بنوایا تو جب اپنی لائبریری ترتیب دی تو مجھے خاص طور پر بلایا۔ نہایت لذیذ چائے پلائی۔ پھر ساری کتابیں دکھائیں اور ہر کتاب کو دکھاتے وقت چہرہ زعفران ہوتا۔''

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میں ان کا ذکرِ خیر ختم کرتے ہوئے اپنے قارئین کو سلسلہ کے ایک اور دیرینہ خادم، ملک سیف الرحمٰن سے متعارف کرانا چاہتا ہوں جو مسلسل بیالیس سال تک جماعت احمدیہ کے مفتی کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

ان کی وفات پر الفضل (اٹھائیس اکتوبر ۱۹۸۹ء) میں ان کے حالاتِ زندگی شائع ہوئے جن سے پتا چلتا ہے کہ موصوف ۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا نام دوست محمد تھا اور وہ موضع کھوتکہ ضلع خوشاب کے رہنے والے تھے۔ احمدیت قبول کرنے سے قبل انہوں نے کامرہ ضلع کیمبلپور اور اسی ضلع کے

موضع تمن کے بعض مدارس سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ جامعہ عباسیہ، بہاولپور اور مدرسہ نظامیہ، حیدرآباد دکن میں بھی پڑھتے رہے تھے۔

ان کا وجود ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ جماعت احمدیہ کے خلاف برپا ہونے والی احرار شورش کا ایک شیریں پھل تھا۔ اس شورش کے دوران موصوف نیلا گنبد، لاہور کی ایک مسجد سے احمدیت کے خلاف تقریریں کیا کرتے تھے۔ احمدیت کے خلاف مہم تیز ہوئی تو آپ کو جماعتی لٹریچر پڑھنے کی طرف توجہ ہوئی۔ طبیعت سعید اور فطرت نیک تھی۔ مطالعہ کے بعد ۱۹۳۶ء میں احمدیت کی آغوش میں آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایمان و اخلاص میں وہ ترقی کی کہ بہتوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ انہوں نے مارچ ۱۹۳۹ء میں اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ اس سے قبل وہ قادیان سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے چنانچہ وہ مدرسہ احمدیہ میں صرف ونحو اور ادب و منطق کے مضامین پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی رہنمائی میں ان کی تعلیم کا ایک نیا دور شروع ہوا چنانچہ ضلع ہزارہ سے ایک عالمِ دین، مولوی سکندر علی خاص طور پر منگوائے گئے جن سے انہوں نے فقہ اور اصولِ فقہ پڑھا۔ انہوں نے حضرت سیّد محمد سرور شاہ سے تفسیر پڑھی اور پھر دہلی، سہارنپور اور لاہور میں مختلف ماہرین سے فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم مکمل کی۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں قادیان واپس آئے۔ تقسیم کے بعد جب جماعت کا عارضی مرکز لاہور میں قائم ہوا تو کچھ دیر ناظر ضیافت رہے۔

ملک سیف الرحمٰن سے پہلے حضرت سیّد محمد سرور شاہ مفتی سلسلہ کے عہدے پر فائز تھے۔ جون ۱۹۴۷ء میں ان کے انتقال پر حضور کے حکم کے تحت آپ مفتی مقرر ہوئے۔ یہ تقرری آپ کی وفات کے دن تک قائم رہی۔

وہ کم و بیش سینتیس سال تک جامعہ احمدیہ میں پروفیسر اور میر داؤد احمد کی وفات پر تقریباً دس سال تک پرنسپل رہے۔ انہوں نے ادارۃ المصنفین میں بھی کام کیا۔

وہ ۱۹۸۴ء میں کینیڈا منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے خدمتِ دین کا سلسلہ جاری رکھا اور حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی ہدایت کے مطابق کئی علمی موضوعات پر تحقیق کرتے رہے۔ انہوں نے پچیس اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ایڈمنٹن میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔

میں اپنی محرومی پر جس قدر بھی افسوس کروں کم ہے کہ مرحوم کے ساتھ میرے تعلقات علیک سلیک کی حد سے کبھی آگے نہ بڑھے البتہ میرے ایک محترم دوست، گروپ کیپٹن (ر) تنویر باجوہ ان کے نیازمندوں میں سے ہیں۔ انہیں اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں ربوہ میں ملک سیف الرحمٰن کے پڑوس میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ تنویر باجوہ موصوف کے حسنِ اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے چنانچہ ربوہ چھوڑنے کے بعد ایک عرصہ تک ان کی موصوف کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی۔ ان کے پاس ملک صاحب کے کچھ خطوط ہیں جو انہوں نے مجھے عنایت فرماتے ہوئے اجازت دی ہے کہ میں انہیں شاملِ کتاب کر لوں۔ ان خطوط سے ملک صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں مثلاً خدا تعالیٰ کی قدرت پر ایمانِ کامل، دعا کی اہمیت، باہمی تعلقاتِ اخوت و محبت کی

ضرورت، صلہ رحمی کی قدر و قیمت، غریب پروری......غرضیکہ بہت سی باتیں ہیں۔ یہ خطوط اس لیے شائع کیے جا رہے ہیں تا قارئین کو ملک سیف الرحمٰن کے بارے میں کچھ جاننے کا موقع مل سکے اور ان کے لیے دعا کی تحریک بھی ہو۔

ان خطوط میں ملک سیف الرحمٰن نے بار بار اپنے بیٹے، مجیب کی پڑھائی کے بارے میں اپنی فکرمندی کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس کی نمایاں کامیابیوں پر سجدہ شکر بجا لاتے ہیں اور اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتے ہیں۔ دیکھیے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ان دعاؤں کو کس طرح قبول کیا اور اس ''بچے'' کو ایک ایسے مرتبے تک پہنچا دیا جہاں کم لوگ پہنچ پاتے ہیں۔

انہوں نے اپنے داماد، مرزا بشیر احمد کو مناسب ملازمت نہ ملنے پر بھی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کی یہ پریشانی بھی دور فرما دی۔ مرزا بشیر احمد کا تقرر صوبہ سرحد کے محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرر ہو گیا اور وہ کوہاٹ، سوات اور نوشہرہ کے مختلف کالجوں میں اپنی مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہونے اور پھر کچھ عرصہ ربوہ میں گزارنے کے بعد ورجینیا (امریکہ) منتقل ہو گئے جہاں وہ آج کل خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

ملک سیف الرحمٰن نے اپنے ایک خط میں اپنے دو چھوٹے بیٹوں، ہشام قمر اور بشیر اطہر کے بارے میں بھی اپنی فکرمندی کا اظہار کیا ہے۔ اب وہ بچے بھی بیرون ملک ہیں۔ ہشام قمر الیکٹریکل انجینئر بن چکے ہیں اور ایڈمنٹن (کینیڈا) میں مقیم ہیں جب کہ بشیر اطہر ورجینیا میں ہیں اور کمپیوٹر کے شعبے سے منسلک ہیں۔

خطوط میں آغا سیف اللہ اور محمد عیسیٰ نامی دو اصحاب کا ذکر ہے۔ دونوں جامعہ احمدیہ میں ملک سیف الرحمٰن کے شاگرد تھے اور بعد میں مربی بنے۔ آغا سیف اللہ اب انگلستان میں مقیم ہیں جب کہ محمد عیسیٰ کئی سال ہوئے وفات پا چکے ہیں۔ ایک جگہ ''چوہدری رشید الدین شاہد'' کا ذکر ہے۔ وہ چوہدری سلیم الدین، ناظر امور عامہ، صدر انجمن احمدیہ کے والدِ بزرگوار تھے۔

کُل چھ خطوط ہیں جو ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ خطوط ''عزیز محترم'' یا ''میرا تنویر'' کے القاب سے شروع ہوتے ہیں اور ''والسلام۔ خاکسار۔ ملک سیف الرحمٰن، ربوہ'' کے الفاظ پر ختم ہوتے ہیں۔

(۱)

خط مرقومہ ۶ نومبر ۱۹۶۹ء

''یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ عزیز تنویر کے دل میں یاد ہو اور یہ دل غافل ہو۔ دونوں طرف کے تعلق کے بغیر یکطرفہ خیالِ تعلق ممکن نہیں۔ یہ تو قدرت کا فرمان بھی ہے کہ اگر یہ دیکھنا ہو کہ خدا کے ہاں تمہارا کیا مقامِ محبت ہے تو اپنے دل میں جھانک لو کہ تمہارے دل میں خدا کی کیا محبت ہے۔ یہی فطرت انسانی وجود میں بھی جلوہ گر ہے کہ یاد دلوں میں ایک دوسرے کے دلی تعلق کی علامت ہے۔ میں نے ہمیشہ آپ کی کامیابی اور روشن مستقبل کے لیے دعا کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آئندہ بھی دعا کرتا رہوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ خداوند تعالیٰ آپ کو صحابہ کا صحیح نمونہ بنائے جن کے بارے میں آتا ہے کہ دن ان کے گھوڑوں کی پشت پر گزرتے دشمن کے مقابلہ میں اور

رات مصلّٰی کی پشت پر یعنی اللہ تعالیٰ، اپنے پیارے خدا، محسن خدا، محبوب خدا کی یاد میں۔ آمین

یہ سن کر آپ کو خوشی ہوگی کہ عزیز مجیب سالِ اول میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیاب ہوگیا ہے۔ یونیورسٹی میں اپنی چھ سو کی کلاس میں اس نے چوتھی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ڈرائنگ کا پرچہ اس کا خراب ہوگیا تھا اور اسے فکر تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور اس کمی کا اس کے رحم و کرم نے تدارک کر دیا۔ فالحمدللہ۔ اس کی انگریزی اور ڈرائنگ شروع سے کچھ کمزور ہے اس لیے دعا کی سخت ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کمی کو پورا کرنے کی توفیق دے تاکہ وہ اس سے بھی بڑھ کر امتیاز کے ساتھ آئندہ کے مراحل طے کرے۔ آمین

تین چار ماہ سے خاکسار کی صحت خاصی خراب چلی آ رہی ہے۔ اور بھی بعض پریشانیاں رہیں۔ ادھر کام کی بھرمار ہے...... جامعہ جانا' افتا کا کام، تصنیفِ سیرت کا کام۔ غرض گوناگوں مصروفیات اور صحت کی غیر تسلی بخش صورتِ حال نے بہت سے فرائض سے محروم رکھا ہے۔ ان ہی فرائض میں آپ کے مخلصانہ اور الفت بھرے خطوط کا جواب بھی تھا۔ یہ خوشی ہوئی کہ جلد ہی آپ دوسری منزل میں قدم رکھ رہے ہیں۔ خدا بہت بہت مبارک کرے اور شاندار ترقیات عطا کرے۔ آغا سیف اللہ صاحب اجتماع پر ملے تھے۔ آپ کے ان کے ہاں قیام کا ذکر بھی آیا تھا۔ عزیزم محمد عیسیٰ صاحب کی شادی خانہ آبادی کی بہت خوشی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بہت مبارک کرے۔ مجھے بھی دعوت آئی تھی لیکن عوائق کی وجہ سے شمولیت کی مسرت حاصل نہ کرسکا۔ آپ کا خط دیر سے ملا۔ دوسرے یہ علم نہ تھا کہ لاہور میں آپ کا قیام کہاں ہوگا ورنہ ضرور کوشش کرتا کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملاقات کی مسرت حاصل کروں۔ لاہور پہنچنا تو خاصا آسان تھا۔ بہرحال امید ہے مستقبل قریب میں یہ مسرت جلد حاصل ہوسکے گی۔

گھر سے سب السلام علیکم کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔

عزیز مجیب آج چوہدری رشید الدین شاہد کے چک ۳۷ جنوبی سرگودھا سیر کی غرض سے گیا ہوا ہے۔ اس کی یونیورسٹی نومبر سے کھل رہی ہے۔ آج کل چھٹیوں میں گھر آیا ہوا ہے۔''

(نوٹ از مصنف: اس خط میں ملک سیف الرحمٰن نے تصنیفِ سیرت کے کام میں محویت کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی وفات پر فضل عمر فاؤنڈیشن کی طرف سے آپ کی سیرت مرتب کرنے کی ذمہ داری ملک سیف الرحمٰن کے سپرد ہوئی تھی تاہم جیسا کہ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نے اپنی کتاب ''سوانح فضلِ عمر'' کے دیباچہ میں ذکر کیا ہے ملک سیف الرحمٰن نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ کئی سال تک اس بارے میں متفرق مواد یکجا کیا اور ابتدائی چند ابواب کی تصنیف بھی مکمل کر لی لیکن بعد ازاں بعض مصالح کے پیش نظر یہ ذمہ داری خاکسار راقم الحروف کے کندھوں پر ڈال دی'' گئی گویا تصنیفِ سیرت سے مراد تدوینِ سوانح حضرت فضل عمر ہے)

(۲)

خط مرقومہ ۲۷ فروری ۱۹۷۰ء

''یادنامہ ملا۔ دلی تعلق جو دو روحوں میں ہوتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں اور یہی قیمتی متاع اللہ تعالیٰ نے

آپ کے قلبِ صافی کو ارزانی فرمائی ہے جو بہت مبارک ہے اور بڑی ہی قابلِ قدر ادا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اعلیٰ سے اعلیٰ ترقیات عنایت فرمائے اور پھر دین کا جری خادم بنائے۔ آپ کے گھر میں اس کی بین الاقوامی مثال موجود ہے۔ میری مراد حضرت چودھری صاحب سے ہے کہ عالمی شہرت اور خدمتِ دین دونوں نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ان کو دی ہیں۔ علم اور ہر قسم کے علم کا مطالعہ اپنی زندگی کا ایک حصہ بنا لیجئے اور پھر اسے استعمال کرنے کا ملکہ پیدا کیجئے کہ شرفِ انسانی کا یہ لازمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

ایک کام بھی لکھ رہا ہوں۔ میرے ایک مخلص دوست اور مخلص احمدی کے لڑکے، سیّد منیر احمد شاہ نے ایف اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اچھا قد اور اچھی صحت ہے لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ زندگی کی مشکلات سے دوچار ہے۔ مشورہ لکھیں کہ وہ نیوی میں کوشش کرے تو کیا کامیابی ہوسکتی ہے؟ اس کے لیے کس طرح کوشش کرے؟ کیا فارم آپ کہیں سے مہیا کر کے بھجوا سکتے ہیں یا کوئی اور دوست فوج کے کسی حصے کی ملازمت کی؟ اس کی عمر کوئی اکیس سال سے کچھ کم ہے۔

اور کیا حالات ہیں؟ کل سے ربوہ میں خاصی بارش ہو رہی ہے۔ سردی پھر سے واپس آتی نظر آتی ہے۔ دیکھئے کب تک اپنے کس بَل دکھاتی ہے۔ سارے حالات باعثِ اطمینان ہیں۔ فالحمدللہ عزیز مجیب لاہور ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتے رہیں۔ جزاکم اللہ''

(۳)

خط مرقومہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۰ء

''آپ کا یادنامہ ملا۔ یہ خواہش کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک مسرت بھری کامیاب زندگی عطا ہو میرے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ کئی بار انتہائی درد و الحاح کی شکل میں دعا بن کر بارگاہِ الٰہی میں عرضِ تمنا ہوا۔ زندگی کی رفاقتوں میں اس رفاقت کو سرفہرست مقام حاصل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ خدا کرے خدا کرے آپ کے دل کو مطمئن کرنے والے حالات میسر آ جائیں۔ ہمت اور حوصلہ بھی بعض اوقات حالات کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔ اگر حالات کا یہی تقاضا ہے کہ آپ اپنے بزرگوں کی بات مانیں تو ہمت و حوصلہ کے ساتھ دعائیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ دعا ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتی ہے۔ ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ شروع میں طبائع کا انتہائی بُعد تھا لیکن بعد میں یہ مصنوعی ملاپ حقیقی رفاقت میں بدل گیا تاہم اپنی طبیعت کو پرکھ کر، اس کا وزن کر کے ہر فیصلہ کی طرف آئیں۔ عملِ زندگی جو آپ نے اختیار کیا ہے وہ بھی اسی حقیقت کا مظہر ہے اور حوصلہ مند انسان ہی اس میں کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے والی بات ہے کہ اگر کسی حقیقت نے چند سال بعد ہونا ہی ہے تو اُس کا اِس وقت ہی سامنا کرنے میں بھلائی ہے۔ آج بزرگوں کے احترام میں طبیعت پر جبر کر کے آپ ایک فیصلہ کرتے ہیں صرف اس لیے کہ میرے بزرگ مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوں لیکن اس اقدام کے بعد اس کے تقاضوں سے آپ عہدہ برا نہیں ہوسکتے اور وہ جس سے آپ ڈرتے تھے کچھ عرصہ بعد وہی ہوتا ہے ظاہر ہے کہ یہ دُہری

پریشانی والی بات ہوگی۔ بزرگوں کی ناراضگی ایک طرف، گھر کا سکون الگ برباد۔ خود بھی پریشان اور ایک اور روح بھی (جو ہوسکتا ہے بالکل معصوم ہو) بتلائے مصیبت۔ بہر حال اس فیصلہ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنا عندیہ اور اپنی پسند صاف صاف بلا جھجک اپنے بزرگوں پر ظاہر کر دیں یا کسی سے کرادیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اپنی رائے پر اصرار کریں تو پھر آپ ان کی بات مان جائیں۔ دعا ہے کہ مولا کریم اس فیصلہ میں آپ کی ایسی رہنمائی فرمائے جو مستقبل کے لحاظ سے بہت ہی مبارک ہو۔ آمین

فارم وغیرہ کے بارے میں معلومات بھجوانے کا شکریہ۔ جب بھی اس قسم کا کوئی کام لکھتا ہوں تو اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ معلومات اگر آپ کے علم میں ہوں تو لکھ دیں۔ یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ایسی تکلیف دوں جو آپ کے وسائل اور آپ کی پہنچ سے باہر ہو یا خاص اہتمام کر کے اسے سرانجام دینے کی ضرورت پڑے۔ چونکہ ہمارا دائرہ معلومات محدود ہے خصوصاً دنیوی معاملات میں اس لیے عزیزوں سے یہ کام لینے میں مسرت محسوس کرتا ہوں۔

عزیز مجیب لاہور ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اچھا چل رہا ہے۔ فالحمدللہ۔ آج کل ہڑتالوں کے زور کی وجہ سے پڑھائی اس طرح نہیں جس طرح پہلے زمانوں میں تھی یا ہونی چاہئے اس لیے اس کمی کے پورے ہونے کے لیے آپ دعا کریں۔

عزیز مرزا بشیر احمد صاحب آج کل یہیں آئے ہوئے ہیں۔ عزیزہ حمید کی طبیعت کچھ علیل ہے۔ عزیز بشیر ابھی کسی کام پر نہیں لگے۔ خاص دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کسی بہتر اور باعزت روزگار کے سامان عطا فرمائے۔

گھر سے سلام کہتے ہیں اور دعا۔

امید ہے آپ کے لیل ونہار کامیابی کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حفظ وامان آپ کو حاصل رہے۔''

(۴)

خط مرقومہ ۲۵ مئی ۱۹۷۰ء

''کافی دنوں کے انتظار کے بعد آپ کا یادنامہ ملا۔ کئی خیالات دل میں آئے۔ شاید خط میں کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو ناگوار گزری ہو یا پریشانیوں نے اس قدر گھیر رکھا ہو کہ

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

کی کیفیت فرصت کے لمحات میں رخنہ اندازی کرنے لگی ہو یا مصروفیت ہی ایسی ہو کہ شدید خواہش کے باوجود موقع نہ ملا ہو۔ غرض کئی خیالات آئے اور گئے۔ دراصل شاید ہی کوئی دن گزرتا ہو کہ آپ یاد نہ آتے ہوں۔ یہ جو کسی بزرگ کا قول ہے کہ اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ اس کی رُو سے یوں پاتا ہوں جیسے میری روح کو آپ کی روح سے ایک ربط سا ہے ورنہ یوں دل کی یاد ممکن نہیں۔ بہر حال میں آپ کے لیے ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ روشن مستقبل ہو، اطمینان ومسرت والی زندگی ملے اور مرادیں حسبِ مراد پوری ہوں۔ آمین۔

عزیز مجیب آج کل لاہور ہی ہے۔ پچھلے دنوں دو دن کے لیے آیا تھا۔ بتا رہا تھا کہ آج کل تو زور وشور سے پڑھائی ہو رہی ہے۔ غالباً اس کا امتحان پندرہ اگست سے شروع ہو۔ بہت لیٹ کر دیا ہے اور پھر خاصی گرمیوں میں۔ آپ اسے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ کامیابی عطا کرے اور روشن مستقبل بنائے۔ آمین۔

عزیز مرزا بشیر احمد صاحب آج کل پشاور میں ہیں۔ ابھی انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی۔ اس وجہ سے سخت پریشانی ہے۔ کوشش میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور کوئی اچھی جگہ انہیں مل جائے۔ ان کے لیے بھی ضرور دعائیں کریں۔ جزاکم اللہ

بلآخر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حوصلہ اور ہمت، فکر اور ذہانت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیجئے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ پر یقین رکھئے۔ بزرگوں کو ہمیشہ دعا کے لیے لکھتے رہئے خصوصاً حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں بکثرت دعائیہ خطوط لکھئے کہ یہ تعلق ایک احمدی کے لئے سب سے زیادہ بابرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو اور اس کی رہنمائی آپ کو حاصل ہو۔ آمین''

(۵)

خط مرقومہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

''آپ کا یادنامہ ملا۔ دل کو مسرت حاصل ہوئی۔ یاد ایک نعمت ہے۔ جس دل میں ہو اس کی قدر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا محض احسان ہے کہ اس لاشے محض کی ''یاد'' وہ عزیزوں اور بزرگوں کے دل میں قائم رکھتا ہے۔ فالحمدللہ علی ذالک۔ اللہ تعالیٰ ایسے سب عزیزوں اور بزرگوں کو اپنے خاص فضلوں سے نوازے، ان کے دل کا خلوص ان کے لیے بے انتہا مسرتوں اور نعمتوں کے حصول کا موجب بنے۔ آمین۔

بدین کا موسم آپ کو پسند آیا۔ یہ اپنی جگہ ایک اچھی خبر ہے گو اس کے ساتھ آپ نے بارشوں کی کثرت کی وجہ سے فصلوں کے نقصان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ یہ دونوں پہلو انسانی زندگی کا حصہ ہیں اور اس کے لیے تازیانہ بھی کہ خیر کی وجہ سے وہ لاپروانہ ہو اور تکلیف اور پریشانی کی وجہ سے مایوس نہ ہو۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ آپ جو پاکستان کے ایک روشن مستقبل نوجوان ہیں ساری مشکلات پر قابو پالیں گے۔ پریشانی کے اندر سے اطمینان ومسرت کی راہیں پھوٹ نکلیں گی۔ انسان ایک حد تک اپنی مرضی کے لیے کوشش کرتا ہے لیکن اگر خدا کو کچھ اور ہی منظور ہو تو دل سے پریشانی کو نکال دینا چاہئے اور حالات سے سازگاری پیدا کر لینی چاہئے۔ یہ کامیابی اگر حاصل ہو جائے تو غیر متوقع طور پر دل کے اطمینان کے سامان میسر آنے لگتے ہیں اور کئی برکتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ آیت کریمہ وَ عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال جو آپ کے بس میں تھا وہ کوشش آپ نے کر لی۔ اب دعا پر زور دیجئے اور اپنے مولا کریم پر بھروسہ کیجئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کا مستقبل حسبِ مراد ہوگا۔

آپ کا پہلا خط ہر روز میرے سامنے آتا اور ارادہ کرتا کہ بس جواب لکھوں لیکن کچھ طبعی سستی، کچھ جسمانی کمزوری، کچھ دوسری اِدھر اُدھر کی مصروفیات ...... یہ سب مل ملا کر جواب لکھنے سے محروم رکھے رہیں ورنہ جیسا کہ

میں نے بتایا ہے خط روز سامنے آتا کہ انگیٹھی پر رکھا ہوا تھا اور آپ کی یاد اس طرح تازہ ہوتی رہتی۔ دعا کا موقع ملتا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ میری طبیعت کچھ ایسی اچھی نہیں۔ شوگر کی تکلیف کی وجہ سے بہت جلد تھک جاتا ہوں۔ اس وقت کہ رات کے نو بجے ہیں باہر سے اٹھ کر آپ کو خط لکھنے کمرے میں آیا ہوں ورنہ طبیعت کا میلان ادھر ہی ہے کہ جلد چارپائی پر دراز ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ فرائض کی ادائیگی کی ہمت دے۔

عزیز مجیب نے دوسرے سال کا امتحان دیا ہے۔ خدا کے فضل سے اس کے پرچے اچھے ہو گئے ہیں۔ اس کی اعلیٰ کامیابی کے لیے دعا کرتے رہیں اور دوستوں کو بھی دعا کے لیے کہتے رہیں۔ پانچ اکتوبر تک امید ہے نتیجہ نکل آئے گا۔

عزیز مرزا بشیر احمد صاحب آج کل ایبٹ آباد میں ہیں۔ ان کو کوئی کام نہیں ملا۔ اس وجہ سے بہت پریشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے۔ عزیز ہشام قمر، بشیر اطہر بھی بفضلہٖ تعالیٰ بخیر و عافیت ہیں۔ پڑھنے کا اتنا شوق نہیں رکھتے۔ خدا انہیں لائق بنائے اور پڑھنے کا شوق دے۔

میرے گھر سے بہت بہت سلام کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں آپ کی اعلیٰ ترقیات کے لیے۔

بدین کے احبابِ جماعت کی خدمت میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔''

(۲)

خط مرقومہ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۰ء

''آپ کے دو خط ملے۔ ان دونوں خاکسار کی طبیعت ناساز اور سخت پریشان رہی ہے۔ اس وجہ سے ضروری فرائض کی انجام دہی میں بھی تاخیر ہو گئی ہے جس کا مجھے بے حد احساس اور افسوس ہے۔ آپ کی نانی محترمہ کی وفات رنج و غم کا باعث ہے خصوصاً جب کہ آپ کی پرورش اور تربیت ان ہی کے رہینِ منت تھی۔ ایسے بزرگوں کی برکات سے محروم ہونا انتہائی صدمہ کا موجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس نقصانِ عظیم کی خود تلافی بن جائے، وہ ان برکات کو جاری رکھے جو بزرگ خاتون کے وجود سے آپ سب خاندان والوں کو میسر تھیں اور مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت اور قرب میں جگہ دے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین

آپ نے جو نوٹ بھجوایا تھا وہ ٹھیک ٹھاک کر کے خاکسار نے الفضل میں بھجوا دیا ہے۔ مصباح میں بھی آ جائے گا۔ ۱۰ روپے اعانتِ مصباح بھی ادارہ مصباح میں جمع کرا دی ہے۔ اس سے پہلے میں نے دو خط لکھے تھے لیکن آپ کے خطوط میں اس کا ذکر نہیں تھا۔ کیا ملے نہیں یا ذکر کرنا بھول گئے؟ اللہ تعالیٰ آپ کا مستقبل روشن اور شاندار بنائے، دینی و دنیوی برکات سے مالا مال کرے، بزرگوں کی دعاؤں کا مستحق بنائے۔ آمین

جلسہ پر خدا کرے آپ آئیں اور ملاقات کی مسرت حاصل ہو۔ آمین۔ اور یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح سے خیر و عافیت ہے۔ فالحمدللہ۔ عزیز مجیب جو کہ خدام الاحمدیہ لاہور کا رکن ہے اس لیے الیکشن کے سلسلے میں کل ہی لاہور گیا ہے۔ خدام الاحمدیہ نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے خوب کام کیا ہے۔''

ملک سیف الرحمٰن کے بعد میں معروف مربی سلسلہ، مولانا عبدالحکیم اکمل کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نہ

جانے کس طرح تحریک جدید کوارٹرز میں اپنے قیام کے دوران مجھ سے متعارف ہوئے اور پھر جب تک آمنا سامنا ہوتا رہا حد درجہ محبت سے پیش آتے رہے۔

موصوف میرے پرائمری سکول کے ایک استاد، خواجہ عبدالکریم کے بھتیجے تھے اور اپنے والدِ بزرگوار کی جوانا مرگ کی وجہ سے ان ہی کے زیرِ کفالت رہے۔

عبدالحکیم اکمل نے ۱۰ مئی ۲۰۰۰ء کو ہالینڈ میں وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر الفضل میں شائع ہونے والی خبر سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو قادیان میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ۶ نومبر ۱۹۵۰ء کو اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کی اور وہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں بطور مربی سلسلہ ہالینڈ تشریف لے گئے تھے۔ پاکستان واپسی پر کچھ عرصہ معتمد، مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ پھر ۱۹۶۷ء سے ۱۹۹۴ء تک ہالینڈ میں بطور مربی انچارج رہے۔ اس دوران کچھ عرصہ کے لیے بیلجیم مشن کے انچارج بھی رہے۔ قیامِ ہالینڈ کے دوران متعدد بار پاکستان آئے اور اس عرصہ میں مختلف خدماتِ دینیہ بجا لانے کی توفیق پائی تاہم اپریل ۱۹۹۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر ہالینڈ ہی میں قیام پذیر ہو گئے۔

روزنامہ الفضل کے مطابق: ''موصوف دعا گو، محنتی، خلافت کے فدائی، خاموش طبع اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔''

میں موصوف کے اہل و عیال میں سے کسی سے متعارف نہیں البتہ چند ماہ پہلے ماسٹر عبدالکریم کے صاحبزادے، زین العابدین نے مجھے بتایا کہ عبدالحکیم اکمل کی اہلیہ، مسعودہ اکمل جو لمبا عرصہ نصرت گرلز ہائی سکول میں معلّمہ رہی ہیں پاکستان آئی ہوئی ہیں۔ اس وقت وہ واپس جانے کی تیاری میں تھیں اور لاہور میں اپنی کسی صاحبزادی کے پاس مقیم تھیں۔ زین العابدین ہی نے مجھے ان کا نمبر فراہم کیا چنانچہ میں نے ان سے عرض کی کہ وہ مجھے اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں ایک مضمون لکھ کر دیں جو میں اس کتاب میں شامل کر سکوں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ تو کیا لیکن تادمِ تحریر انہیں موعودہ مضمون لکھ کر بھجوانے کا موقع نہیں مل سکا لیکن خیر چھوڑیں اس موضوع کو اور دیکھیں کہ مولانا محمد اسماعیل منیر کون تھے۔

موصوف حضرت فضل کریم، رفیق حضرت مسیح موعود کے صاحبزادے تھے جو ۲۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جامعہ احمدیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور متعدد بیرونی ممالک کے علاوہ مرکز میں کئی شعبہ جات میں خدمت کی توفیق پائی۔ انہیں سری لنکا، مشرقی و مغربی افریقہ کے کئی ممالک اور ماریشس میں احمدیت کا پیغام پہنچانے اور جامعہ احمدیہ، مجلس نصرت جہاں، حدیقۃ المبشرین اور تعلیم القرآن و وقفِ عارضی کے شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ رکن مجلس کارپرداز؛ رکن مجلس افتا؛ مہتمم اطفال، مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ اور قائد اصلاح و ارشاد انصار اللہ مرکزیہ کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے معروف کتابچے ''کامیابی کی راہیں'' کے نام سے تحریر کئے جو بعد میں اطفال الاحمدیہ کے نصاب کا مستقل حصہ بنا دیئے گئے۔

وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ ان کے اندر دعوت الی اللہ کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تحریر اور تقریر

کے ذریعے وہ ہر موقع اور ہر جگہ خدا اور اس کے رسول کا نام بلند کرتے نظر آتے۔ انہوں نے تقریباً پچیس سال تک ربوہ اور بیرونِ ربوہ جماعت احمدیہ کے تعارف اور دعوت الی اللہ کے موضوعات پر پروجیکٹر کے ذریعے سلائیڈز دکھانے کا کام بھی سرانجام دیا جو بے حد پسند کیا جاتا رہا۔

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئے تھے جہاں انہیں یکے بعد دیگرے دو ہارٹ اٹیک ہوئے۔ طبیعت سنبھلنے پر وہ امریکہ چلے گئے جہاں انہوں نے ۲۲ ستمبر ۲۰۰۴ء کو وفات پائی۔ ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں ہوئی۔

میری اسماعیل منیر کے ساتھ باقاعدہ خط و کتابت تو نہیں رہی لیکن اپنے نام اُن کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے انہیں اپنا ایران و ترکی کا سفرنامہ بھجوایا تھا۔ ان دنوں وہ ناظر تعلیم القرآن کے طور پر خدمت بجا لا رہے تھے۔ انہوں نے ازراہِ مہربانی اس کتاب کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے خط محررہ چار اگست ۱۹۹۸ء میں لکھا:

''آپ کی دوسری کتاب ''سفر زندگی ہے'' پڑھنے کا موقع ملا۔ بہت مفید کتاب ہے۔ دلی دعا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈالے اور مزید ایسی کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔

آپ کی پہلی کتاب سے آپ کے احمدیوں سے رابطوں کا پتا چلتا تھا مگر اس میں وہ عنصر مفقود ہے۔ اگر کوشش کرتے تو ضرور رابطے ہوتے اور آپ کو مزید خوشی ہوتی اور ہمیں بھی۔

کئی جگہ پڑھتے پڑھتے آنکھوں میں آنسو آجاتے رہے اور دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلتیں۔ بہرحال خوشی ہے کہ آپ ہماری بہن راشدہ کے پاس آخر بخیریت پہنچ ہی گئے......

سات اگست کا جمعہ بیت النّور راولپنڈی میں پڑھوں گا۔ خدا کرے آپ سے ملاقات بھی ہو جائے اور مزید باتیں ہوں۔''

اسماعیل منیر بہت سی ایسی صفات سے متصف تھے جو لوگوں میں عام طور پر کم پائی جاتی ہیں۔ بحوالہ الفضل ۱۱ فروری ۲۰۰۵ء پروفیسر میاں محمد افضل کے الفاظ میں ''مولانا بڑے سادہ، بڑے محبت کرنے والے، ہر ایک کا خیال رکھنے والے بلکہ احترام کرنے والے انسان تھے۔ خیال کیا تو وقتی نہیں اور احترام کیا تو زبانی نہیں۔ دوسروں کی خاطر قربانی کرنی پڑی تو اس میں بھی ہچکچائے نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت کی تو خوشی سے۔ میرا ان سے تعارف اور وہ بھی غائبانہ کوئی بیس پچیس سال پہلے ہوا۔ وہ کچھ عرصہ گوجرانوالہ میں مربی سلسلہ رہے۔ وہاں میری پھوپھی جان رہائش پذیر تھیں۔ ایک سال اپنے بیٹے کے ساتھ جلسہ سالانہ پر تشریف لائیں۔ کوئی مناسب جائے رہائش نہ مل سکی۔ مربی صاحب کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ہر ایک کی مدد کو تیار رہتے ہیں اس لیے ان کا دروازہ آن کھٹکھٹایا۔ یہاں تو ایک خلیق، ایک مہمان نواز، ہر کسی کے کام آنے والے مربی سلسلہ تھے۔ جلدی سے انہوں نے اپنا کمرہ خالی کیا، اپنا بستر باورچی خانہ میں جا بچھایا اور مہمانوں کو اپنا کمرہ پیش کر دیا۔ اب دیکھیں نہ کوئی رشتہ نہ تعلق مگر مولانا اتنے مہمان نواز، اتنے قربانی کرنے والے کہ ایک فیملی جس سے محض شناسائی ہے ان کے لیے اپنا آرام قربان کر دیتے ہیں۔ خود بخوشی تکلیف اٹھاتے ہیں مگر خیال ہے تو مہمانوں کے آرام اور سہولت کا۔ دوسروں کے لیے کام آنے کا سبق دینا تو آسان ہے مگر عملی طور پر قربانی کر کے اس کا ثبوت دینا کوئی

آسان بات نہیں مگر آپ نے بصد خوشی ایسا کیا۔ اپنے چھوٹے سے مکان کا ایک کمرہ مہمانوں کو پیش کر دیا اور پھر ہر سال ایسا ہی ہوتا رہا۔''

میاں محمد افضل مزید لکھتے ہیں: ''میں نے ان کے متعلق یہ سب سن رکھا تھا لیکن ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہوئی تو اس وقت جب مہمان نوازیاں اس رنگ میں ختم ہو چکی تھیں کہ ہمارے جلسوں پہ پابندی عائد ہو چکی تھی مگر پھر بھی جماعت کے افراد مل بیٹھنے کی کوئی نہ کوئی تقریب پیدا کر لیتے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ محترم نسیم سیفی صاحب نے ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ ایم ٹی اے کے لیے ایک تعلیمی پروگرام ترتیب دیا۔ مجھے بلا بھیجا۔ ربوہ سے ایک صاحبِ علم بھی شریک ہوئے۔ تعلیم کے نصاب کی بات، امتحانات کی بات ہوئی۔ کچھ تفصیل پیش کی۔ کچھ سوالوں کے جواب دیئے۔ چند لوگ سننے والے اور سوال کرنے والے موجود تھے۔ مولانا اسماعیل منیر بھی تشریف رکھتے تھے۔ شاید انہیں کوئی بات پسند آئی کہ شام کو دارالضیافت جہاں میں ٹھہرا تھا تشریف لائے اور یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ کافی باتیں ہوئیں۔ پھر مجھ سے واپسی کے پروگرام کے متعلق پوچھا۔ میں نے صبح کی گاڑی سے جانے کی بات کی۔ اس ملاقات کے بعد میں تو تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک معروف خادم سلسلہ اتنے خلیق، اتنے ملنسار، اتنے محبت کرنے والے بھی ہیں کہ مجھے خدا حافظ کہنے سب کام چھوڑ چھاڑ علی الصبح سٹیشن پر تشریف لے آئیں گے مگر ہوا ایسے ہی۔ میں گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہوں کہ مولانا کو جلد جلد اپنی طرف آتے دیکھتا ہوں۔ معمولی شناسائی مگر یہ خلیق انسان اسے بھی فرض جان کے ادا کرنے چلے آرہے ہیں۔ پھر آنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو جو اتفاق سے اسی گاڑی سے جا رہے تھے میرے لیے گاڑی میں مناسب جگہ بنانے کو کہا اور وہ کھڑے رہے جب تک انہیں اطمینان نہ ہو گیا کہ مجھے مناسب جگہ مل گئی ہے۔ کتنے خلیق، کتنے مہمان نواز، کتنے دوسروں کا خیال رکھنے والے بزرگ، کون بھول سکتا ہے ان کی یہ دل نوازیاں۔''

محمود مجیب اصغر کے مضمون مطبوعہ الفضل تیرہ اپریل ۲۰۰۵ء کے مطابق ''مولانا محمد اسماعیل منیر کی زندگی کا ایک اور روشن پہلو دعا پر یقین اور دعا میں استقامت ہے۔ جب ان کے واقفِ زندگی صاحبزادے، محمد الیاس منیر، مربی سلسلہ ساہیوال کیس میں ملوث کر لیے گئے تو انہیں عدالت نے سزائے موت سنائی اور پھر اپیل کے بعد سزائے موت ٹل گئی لیکن دس سال تک وہ اسیری کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس دوران ان کے والد مولانا محمد اسماعیل منیر نے بڑی ہمت اور بڑے صبر کا مظاہرہ کیا اور مسلسل دعا کرتے رہے اور دعاؤں کی تحریک کرتے رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ باپ کی دعا بیٹے کے حق میں بطورِ خاص سنتا ہے چنانچہ ایک طرف محمد الیاس منیر کے روحانی باپ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی دعاؤں نے عرش پر شور مچایا اور ادھر ان کے جسمانی باپ مولانا محمد اسماعیل منیر نے دعاؤں کا سہارا دیا۔''

راجہ نصر اللہ خان اسی بات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مضمون مطبوعہ الفضل ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء میں لکھتے ہیں: ''حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع اپنے اسیرانِ راہِ مولیٰ کے لیے برابر دعائیں کر رہے تھے۔ آخر ان مظلوموں کے لیے آپ کا دلی درد اور شفقت ایک نہایت ہی پُرسوز نظم کی شکل میں ڈھل گیا جسے جلسہ سالانہ یُوکے کے موقع

پر پڑھنے والے نوجوان نے ایسے پُر درد ترنّم کے ساتھ پڑھا کہ حاضرینِ جلسہ اور ایم ٹی اے کے دنیا بھر کے مشاہدین و ناظرین کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ اس اشک ریز نظم کے دو تین اشعار پڑھتے ہیں:

کیا تم کو خبر ہے رہِ مولا کے اسیرو
تم سے مجھے اک رشتۂ جاں سب سے سوا ہے
گم گشتہ اسیرانِ رہِ مولیٰ کی خاطر
مدت سے فقیر ایک دعا مانگ رہا ہے
خیرات کر اب ان کی رہائی میرے آقا
کشکول میں بھردے جو میرے دل میں بھرا ہے

آخر یہ آہ وفغاں عرش پر پہنچی اور وہاں سے ساہیوال کے اسیرانِ راہ مولیٰ کی معجزانہ رہائی کا فیصلہ صادر ہوا''

محمد اسماعیل منیر ''محمد اسماعیل'' سے ''محمد اسماعیل منیر'' کیسے ہوئے اس سوال کا جواب منیرالدین احمد کے اس مضمون سے ملتا ہے جو الفضل ۶ نومبر ۲۰۰۴ء میں چھپا ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار اس وضاحت کے بعد کہ آپ دونوں کا بچپن گوجرانوالہ میں اکٹھے گزرا تھا لکھتے ہیں:

''میٹرک کے بعد وقف کر کے قادیان چلے گئے اور جامعہ احمدیہ میں داخل ہوگئے۔...... گوجرانوالہ سے روانگی پر مجھے کہنے لگے: منیر صاحب! آپ تو یہاں دوستوں اور عزیزوں میں ہوں گے۔ میں وہاں اکیلا ہوں گا۔ وہاں واقفیت کوئی نہیں۔ بس دعاؤں میں یاد رکھنا۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے دعا کروں گا۔ آپ اکیلے جارہے ہیں میں ساتھ نہیں جارہا...... آپ میرا نام ساتھ لے جائیں۔ پھر آپ اکیلے نہیں ہوں گے یعنی اپنے نام محمد اسماعیل کے ساتھ منیر کا اضافہ کرلیں۔ اس طرح وہ محمد اسماعیل منیر کہلانے لگے۔''

اسماعیل منیر کے بعد اب ذکر سلسلے کے اس جیّد عالم کا جو لمبا عرصہ ناظم دارالقضا اور مفتی سلسلہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ میرا اشارہ مولانا محمد احمد جلیل کی طرف ہے جو جولائی ۱۹۱۰ء میں قادیان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا آبائی گاؤں حلال پور ضلع سرگودھا تھا۔ ان کے والد ماجد، مولانا محمد اسماعیل نے اپریل ۱۹۰۸ء میں حضرت مسیح موعود کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور پھر قادیان ہی کے ہوکر رہ گئے۔

موصوف نے ابتدائی تعلیم کا آغاز تعلیم الاسلام ہائی سکول سے کیا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ زندگی وقف کردیں جب کہ ان کا اپنا ارادہ ایم اے کے بعد زندگی وقف کرنے کا تھا تاہم حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تحریک پر انہوں نے جامعہ احمدیہ سے فارغ التحصیل ہوتے ہی ۱۹۳۵ء میں وقف کی درخواست دے دی جسے قبول فرمالیا گیا۔

جب ۱۹۳۹ء میں ان کے والد محترم وفات پاگئے تو حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے فرمایا کہ جس طرح تمہارے والد ذاتی شوق اور محنت سے عالم بنے تھے تم بھی پڑھو اور عالم بنو جس کے بعد انہوں نے قادیان، دہلی، دیوبند اور لاہور سے علمِ حدیث اور دیگر علوم حاصل کئے۔ ابتداءً وہ واقفینِ زندگی کی تدریس پر مامور

ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہیں احمد نگر اور ربوہ میں جامعہ احمدیہ میں بطور استاد خدمت کی توفیق ملی۔ ۱۹۵۱ء میں قاضی مقرر ہوئے اور لمبا عرصہ ناظم دارالقضا اور مفتی سلسلہ کے مناصب پر فائز رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جامعہ احمدیہ میں تدریس کے دوران انہیں قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ میں ملک غلام فرید کی معاونت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ بعدازاں وہ آرپیکو کے چیئرمین اور مینجنگ ڈائریکٹر رہے۔ انہیں پاکستان سے باہر کئی جماعتی دورہ جات کا موقع ملا۔ انہوں نے جلسہ سالانہ لندن اور بیت بشارت سپین کے افتتاح میں بھی شرکت فرمائی۔

انہوں نے ستائیس اپریل ۲۰۰۵ء کو برمنگھم میں بعمر ۹۵ سال وفات پائی۔ لندن میں ان کی نمازِ جنازہ عطاالمجیب راشد نے پڑھائی جس کے بعد ان کا جسدِ خاکی ربوہ لایا گیا۔ ربوہ میں نمازِ جنازہ مرزا خورشید احمد نے پڑھائی جس کے بعد بہشتی مقبرے میں تدفین عمل میں آئی۔

مرحوم کی وفات پر الفضل میں شائع ہونے والے مضامین میں سے کم از کم دو میری نظر سے گزرے ہیں اور اتفاق سے دونوں ان کے دامادوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز جہاں ان کے دامادوں کی سعید الفطرتی کی مظہر ہے وہیں اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے دامادوں کے ساتھ بے حد محبت کرنے والے اور انہیں عزت کی نظر سے دیکھنے والے بزرگ تھے۔ ان دو میں سے ایک مضمون پرویز پروازی کا لکھا ہوا ہے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ اس میں موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی اس خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے کہ دل بے اختیار واہ واہ کر اٹھتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں: ''جن بزرگوں کے بارے میں لکھنا آسان لگتا ہے ان کے بارے میں ہی لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اب مولانا محمد احمد جلیل کی وفات پر دور ونزدیک سے ان کے شاگردوں، دوستوں اور دیگر احبابِ جماعت کی طرف سے تعزیت کے پیغامات کا تانتا بندھا ہے مگر میرا قلم رک رک کر چل رہا ہے کہ کیا لکھوں کیا چھوڑوں؟ ان کی ہمہ جہت باغ و بہار شخصیت اور عالمانہ وجاہت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی قد آور تھی کہ اس کا پورا بیان اور احاطہ کرنا محال ہے۔ ایک بار عزیزی یوسف سہیل شوق نے الفضل کے لیے ان کا انٹرویو کیا اور چھپا۔ انٹرویو چھپ کر آیا تو مولانا بہت محظوظ ہوئے۔ اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے: الفضل والوں نے وہ کچھ لکھ دیا ہے جو لوگوں کے مرنے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ میرے مرنے پر میرے بارے میں یہ کیا لکھیں گے؟ لکھنے کو ان کے پاس رہ ہی کیا گیا ہے؟ یہ ان کا کسرِ نفسی کا ایک انداز تھا۔ ان کی طبیعت میں بڑائی یا تفاخر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ نہایت مسکین طبع آدمی تھے۔ دوسروں کے پاسِ خاطر کی خاطر قربانیاں دینے والے اور ہر تکلیف کو اپنے نفس پر جھیل جانے والے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میں ان کا بڑا داماد ہوں۔ ہم دونوں میاں بیوی جماعت کے کالجوں میں خدمت پر مستعد تھے اس لیے ان ہی کے گھر میں ہم لوگ رہے اور ہمارے بچے ان ہی کے گھر میں پلے بڑھے۔ اس لحاظ سے میں ان کا گھر داماد ہوں۔ میں نے اپنے اس تقریباً پینتالیس سالہ تعلقِ صہری میں انہیں ایک بار بھی کبیدہ خاطر یا رنجیدہ یا ملول نہیں پایا۔ یہ نہیں کہ ان پر حوادثِ زمانہ کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہوتا تھا مگر وہ اتنے وسیع الحوصلہ تھے کہ ہر بات کو خندہ پیشانی سے

جھیل جاتے تھے۔ میں گواہ ہوں کہ میں نے ان کی زندگی کو صبر و تحمل کا کامل نمونہ پایا۔ ان کی پچانوے سالہ زندگی کا نصف تو میری آنکھوں کے سامنے گزرا۔ میں نے انہیں صرف ایک بار آب دیدہ پایا۔ وہ موقع تھا ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالکریم کی وفات کا۔ جب ان پر نزع کا عالم طاری ہوا تو اباجی نے آگے ہو کر صرف اتنا کہا ''عبدالکریم! جا رہے ہو۔ اہل اللہ سے میرا السلام علیکم کہنا۔'' اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دونوں بھائیوں میں پیار بھی غضب کا تھا۔ ان کا یہ فقرہ اس یقین کا بھی غماض تھا کہ میرا بھائی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے مرتبہ تک پہنچے گا کہ اہل اللہ کے تقرّب سے فیضیاب کامگار ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

میں نے ان سب بھائیوں کو نیک، خدا ترس اور ہمدرد پایا۔ اب پانچ میں سے دو باقی ہیں۔ مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی عبداللطیف صاحب ہمارے سویڈن کے امیر جماعت ہیں اور ان سے بڑے عبدالقادر انجینئر (جنہیں ربوہ کا ایوانِ محمود بنوانے کی سعادت ملی) آج کل امریکہ میں ہیں اور دل کے ہاتھوں لاچار۔ بہن ایک ہی حیات ہے پھوپھی حفصہ اہلیہ قریشی محمود الحسن۔ بزرگوں کا یہ خاندان متفرق ہو گیا۔ قبلہ مولانا کا آخری وقت بھی برمنگھم میں آیا مگر ان کی مٹی ڈاکٹر مبشر احمد سلیم نے ربوہ پہنچائی۔ سنا ہے اہلِ ربوہ نے پورے تپاک سے انہیں رخصت کیا۔ ہم دونوں میاں بیوی علالت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے۔ ہمارا بیٹا ماہر احمد ماں باپ اور بہن بھائیوں کی نمائندگی میں ربوہ پہنچا اور اپنے عظیم نانا کو مٹی دی۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے اور جزا دے۔ آمین

مولانا جلیل بنیادی طور پر جامعہ کے استاد تھے مگر سلسلے کے مفتی کے فرائض بھی لمبے عرصہ تک ان کے سپرد رہے۔ دارالقضا کے قاضی رہے اور پھر ناظم بھی رہے۔ ان کے ساتھ پہلا تعارف بھی ان کے قضا کے ایک فیصلے کے سلسلے میں ہوا۔ ہم حضرت مرزا بشیر احمد کے ساتھ خدمت کر رہے تھے۔ ان کے خلاف قضا میں ایک مقدمہ کسی صاحب نے دائر کر رکھا تھا جو قادیان کے زمانے سے چل رہا تھا۔ میاں صاحب کسی کام میں ضامن تھے اس لیے مسئلہ یہ تھا کہ ضامن ہر حال میں ضامن ہوتا ہے یا نہیں؟ حالات کے بدل جانے سے ضامن کی ضمانت ختم ہو جاتی ہے یا قائم رہتی ہے؟ انہی دنوں قضا کی طرف سے فیصلہ حضرت مرزا بشیر احمد کے خلاف صادر کیا گیا کہ بطور ضامن ان کو پوری ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔ یہ فیصلہ مولانا جلیل نے کیا تھا۔ سارے ربوہ میں اس فیصلہ کا چرچا ہوا۔ حضرت مرزا بشیر احمد نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی اور مرافعہ میں یہ فیصلہ قائم نہ رہا۔ ہمیں یاد ہے حضرت مرزا بشیر احمد اس فیصلہ سے بہت پریشان تھے مگر ایک بار بھی، جی ایک بار بھی، قضا کے اس فیصلہ یا مولانا جلیل کے خلافِ احترام کوئی بات ان کے منہ سے، ہم نے جو اُن کے قریب رہ کر کام کر رہے تھے، نہ سنی بلکہ ان ہی دنوں ہم سے دفتر میں ایک غلطی ہوئی۔ پانچ روپے کی ایک رقم کا دوبار اندراج ہو گیا۔ جب میزان میں پانچ روپے کم نکلے تو حضرت میاں صاحب نے ایک یک رکنی کمیشن تحقیقات کے لیے قائم کیا۔ یہ کمیشن مولانا جلیل پر مشتمل تھا یعنی حضرت مرزا بشیر احمد کو مولانا کی دیانت اور اصابتِ رائے پر پورا اعتبار تھا اور اپنے خلاف فیصلہ دینے کی وجہ سے ان کے دل سے سلسلے کے کارکن کا احترام زائل نہیں ہوا تھا۔ اس کمیشن نے تحقیقات کے بعد اس بات کا اعلان کیا کہ کارکن مذکور سے وہ رقم دوبار درج ہو گئی ہے، اس میں کسی بد دیانتی

کا امکان نہیں۔

ہمارا مولانا سے یہ پہلا تعارف تھا۔ بعد کی زندگی میں بھی ہم نے دیکھا کہ حضرت مرزا بشیر احمد مولانا جلیل کا دوسروں سے بڑھ کر احترام کرتے تھے اور کہیں ملنا ہو جاتا تو آگے بڑھ کر ان سے ملتے تھے۔ دعا کے لیے دوسروں کو خط لکھتے رہنا میاں صاحب کی سنتِ جاریہ تھی اور دعا کے لیے جن بزرگوں کو خط لکھے جاتے تھے ان میں ایک نام مولانا جلیل کا بھی تھا۔ خاندان کے دیگر افراد بھی اکثر مولانا کو دعا کے لیے خط لکھتے رہتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس جب ناظرِ اعلیٰ تھے تو ان کے دفتر افتا میں اکثر ان کی خدمت میں تشریف لاتے اور ان کی باتوں سے متمتع ہوتے تھے۔ حضرت اقدس برمنگھم تشریف لے گئے تو میں نے فیکس کے ذریعے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو حضور مولانا کی عیادت کے لیے تشریف لے جائیں تو عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس تشریف آوری کی برکت سے مولانا کو شفا عطا فرما دے مگر حضرت صاحب کی مصروفیت ایسی تھی کہ ایسا وقوع میں نہ آ سکا مگر حضرت صاحب کی جانب سے فیکس کا جواب فیکس ہی میں آیا کہ اگرچہ بے پناہ مصروفیت کی بنا پر عیادت کے لیے میرا جانا نہ ہو سکا مگر اس سے دعا کی مزید تحریک ہو گئی ہے اور حضور ان کی صحت کے لیے التزام سے دعائیں فرماتے رہے۔

ہمارا نکاح حضرت مولانا غلام رسول راجیکی نے پڑھایا تھا۔ خطبۂ نکاح میں فرمایا کہ جس بچی کا میں نکاح پڑھانے جا رہا ہوں اس کے باپ کا نکاح بھی میں نے پڑھایا تھا۔ گویا ہمارے رشتہ میں حضرت مولانا راجیکی کی دوہری دعائیں شامل تھیں۔ الحمدللہ۔ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کا طریق یہ تھا کہ سلسلے کے علماء کے نام بغیر حضرت کا سابقہ استعمال کئے نہ لیتے تھے۔ ہم نے اکثر مولانا راجیکی کو حضرت مولانا جلیل فرما کر ان کے بارہ میں بات کرتے سنا۔ مولانا کا اپنا ردِعمل یہ ہوتا تھا کہ ایسی بات سنتے تو اور زیادہ استغفار فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ دوسروں کا حسنِ ظن ہے کہ وہ اس طرز پر تخاطب روا جانتے ہیں۔ حضرت مولانا غلام رسول راجیکی کی ولایت کا مرتبہ ایسا ہے کہ آدمی کو ان کی بات کی لاج رکھنے کے لیے اپنی اصلاح کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کی شخصیت کے جس پہلو کا بہ تواتر ذکر کیا وہ ان کی زندہ دلی اور مہمان نوازی ہے۔ حضرت مولانا کی شخصیت بڑی باغ و بہار شخصیت تھی۔ وہ اپنے شاگردں کے ساتھ یک گونہ بے تکلفی بھی روا رکھتے تھے۔ ان کے اور ان کے طالب علم کے درمیان مغائرت کا پردہ حائل نہیں ہوتا تھا۔ استاد کی بات کو سادہ اور پراثر انداز میں کہنے کا ایک طریق علمائے ادب نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنی بات کو علمیت سے بوجھل نہ کرو۔ جو بات ہلکے پھلکے انداز میں کی جا سکتی ہے وہ سیدھی دل میں اترتی ہے۔ جب استاد اور شاگرد کے ذہنی روابط میں استاد کی علمیت روک بننے لگے تو استاد بے فیض ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا جلیل اپنے شاگردوں سے ان کی سطح پر اتر کر بات کرتے تھے اور انہیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کا استاد علمی لحاظ سے کس بلند مرتبہ کا عالم ہے۔ علمی مسائل پر بحث مباحثہ کے لیے ان کا میدان اور تھا۔ سلسلے کے علمائے کرام سے ان کی صحبتیں رہتی تھیں۔ حضرت مولانا قاضی محمد نذیر لائلپوری کے ساتھ ان کا بڑا گہرا

ذہنی ارتباط تھا۔ مولانا اکثر علمی مباحث کے لیے ان کو روک لیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت مولانا جلیل ازراہِ تفنّن ان سے کہنے لگے "مولانا آپ نے مجھے اپنا بُزِاخفش سمجھا ہوا ہے؟ میں بھی بیٹھا ہوا سر ہلاتا رہتا ہوں"۔ مگر اس بات کی گواہی تو ہم بھی دے سکتے ہیں کہ جماعت کے کئی علماء اپنی علمی مشکلات کے حل کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے استفسار کا شافی جواب پاتے تھے۔ ان کے تبحرِ علمی کا ایک عالَم قائل تھا مگر خود انہیں اپنے علم کی نمائش مقصود نہ تھی۔ دیکھنے والے بادیٔ النظر میں ان کے علمی مرتبے کو نہیں جان سکتے تھے۔ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد۔ یہ بات بھی ہم نے دیکھی کہ اگر کسی مسئلہ پر انہیں اپنے سے کم عمر لوگوں کے لیے استمداد کرنا ہوتا تو بغیر کسی جھجک کے کرتے تھے۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کو گوشت کی بھنی ہوئی ران پیش کی تو انہیں تناول میں انقباض کیوں ہوا؟ میں نے اپنی ناقص رائے دی تو مولانا نے اس بات کو رد نہیں کیا۔ فرمانے لگے: ہاں! اس پہلو پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی خورد نوازی تھی کہ دینی مسئلہ میں ایک جاہلِ مطلق کی رائے کو بھی رد نہیں فرمایا۔

مولانا سٹیج کے آدمی نہیں تھے۔ ہم نے اپنی ہوش میں انہیں کسی سٹیج پر تقریر کرتے نہ سنا۔ ان کی ساری تگ و تاز کلاس روم تک محدود تھی یا قضا کے فیصلوں سے ان کی فقہی بصیرت عیاں ہوتی تھی۔ طالب علموں کے سوالات کا جواب ایجاز و اختصار سے اپنے مخصوص انداز میں دیتے تھے، ان پر اپنی علمیت کا بوجھ نہیں لادتے تھے۔ ان کے مزاج پر اپنے عالم والد حضرت مولانا محمد اسماعیل حلال پوری کا بہت اثر تھا۔ ہمیں تو اس بات کا علم نہ ہوتا، خود مولانا نے اپنے والدِ مرحوم کے باب میں یہ بیان فرمائی۔ حیف کہ مولانا مرحوم کی توجہ لکھنے کی طرف مبذول نہ ہوئی ورنہ ان کا علمی کام بہت وقیع ہوتا۔ تفسیر القرآن کے انگریزی ترجمہ کے سلسلے میں آپ مدتوں ملک غلام فرید کے ساتھ منسلک رہے۔ پیر صلاح الدین نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کیا تو مولوی صاحب کی عملی اعانت ان کے شاملِ حال رہی۔ میں نے خود اپنے لیے قرآن کریم کا اردو ترجمہ حبلُ الورید کے نام سے کیا تو قبلہ پاکستان سے اپنے دیگر مشاغل سے وقت نکال کر بھی اس ترجمہ پر نظرِ ثانی فرماتے اور باقاعدگی سے میرا ترجمہ مجھے واپس بھجواتے رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو میں تساہل کا شکار ہو جاؤں اور اس بابرکت کام سے ہاتھ اٹھا لوں۔ یہ ان ہی کی حوصلہ افزائی تھی کہ وہ کام مکمل ہوا اور میرے لیے خیر و برکت کا موجب ہے۔ الحمد للہ۔ غرض نیکی کے کسی کام میں آدمی ان کی اعانت پر پورا بھروسہ کر سکتا تھا۔ پیر صلاح الدین کے ترجمہ کی اشاعت تک بلکہ اس کے پروف تک دیکھنے میں انہیں ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی رہی۔ یہ ساری تگ و تاز محض ثواب کے لیے کرتے تھے۔ اس میں کوئی دنیاوی فائدہ انہیں مطلوب نہ تھا۔

دوسرا وصف مہمان داری کا شاگردوں کی زبان پر ہے۔ ان کا دولت کدہ جامعہ کے احاطہ میں تھا۔ ان کے شاگرد بے تکلف انہیں ملنے کو آتے جاتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مہمان چائے کے بغیر اور کھانے کا وقت ہوا تو کھانے کے بغیر ان کے گھر سے واپس ہو گیا ہو۔ اس مہمان داری میں ہماری امی یعنی ان کی اہلیہ مرحومہ

بھی برابر کی شریک تھیں کہ ان کی پیشانی پر کبھی بَل نہیں آیا کہ یہ ہر وقت کے آنے جانے والے لوگ ہیں ان کی اتنی خاطر داری کی کیا ضرورت ہے؟ وقت بے وقت جب بھی کوئی طالب علم آیا چائے حاضر کی گئی اور چائے کے ساتھ اگر لوازمات موجود ہیں تو وہ بھی۔ کھانے کا وقت ہوا تو ایک طالب علم ہوا یا دو ہوئے یا چار ہوئے سب کو ماحضر پیش کیا گیا۔ ہماری امی اللہ تعالیٰ کے فضل سے بڑی کشادہ دل اور کشادہ دست تھیں۔ اباجی بعض اوقات ہوسٹل کے کسی بیمار طالب علم کے لیے کہہ کر کوئی پرہیزی کھانا تیار کرواتے تھے اور امی خندہ پیشانی سے کرتی تھیں۔ ابھی پچھلے دنوں حضرت اقدس کینیا میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ایک افریقی ترجمان ساتھ کے ساتھ اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا۔ میری بیوی کہنے لگیں کہ کئی برس پہلے افریقہ کا ایک چھوٹا سا بچہ جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا۔ اباجی اس بچے کو کئی مہینے تک اپنے گھر لاتے اور اسے ڈبل روٹی کا کھانا کھلاتے رہے کہ ابھی یہ بچہ ہے، یہاں ہاسٹل کے کھانے سے مانوس نہیں کہیں بیمار نہ پڑے۔ میری بیوی اس ترجمان کو دیکھ دیکھ کر بار بار کہتی تھیں: عین ممکن ہے کہ یہی وہ چھوٹا بچہ ہو جو آج خلیفۂ وقت کے اردو خطبے کا اپنی زبان میں فرفر ترجمہ کر رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اگر یہ وہی بچہ تھا تو فَبِہا اگر نہیں بھی تھا تو وہ بچہ کسی اور ملک میں جماعت کی خدمت پر مستعد ہوگا اور اپنے محسن کے لیے دعا گو۔ حسنِ سلوک کی نیکی ضائع تھوڑے ہی ہو جاتی ہے؟ ہمارے اپنے خاندان کی طرح میرے سسرال والے بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے کثیرُ الرّماد لوگ ہیں۔

صلہ رحمی بھی قبلہ کی شخصیت کا خاص وصف تھا۔ دور پار کے عزیزوں سے بھی اسی لطف اور محبت سے سلوک کرتے جیسے اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرتے تھے۔ بھانجوں بھتیجوں کے لیے تو ان کا گھر اپنا ہی گھر تھا۔ سردار کرم داد خان کی بیٹیاں جو ہماری پھوپھی عارفہ کی بیٹیاں تھیں انہیں ماموں کہتی تھیں اور ہماری امی کو ممانی اور اسی رشتہ سے اس گھر میں آتی جاتی تھیں اور ماموں ممانی کے حسن سلوک کی مورد تھیں۔ اسی طرح ان کے سسرال والے بھی ان کی محبت کے مورد رہتے۔ ہماری امی تو اپنے احمدی ابا کی زندگی میں ایک احمدی کے نکاح میں آ گئیں مگر اُن کے خسر کی بے وقت اور اچانک وفات کی وجہ سے ان کے باقی بچوں کی تولیت غیر احمدی رشتہ داروں میں چلی گئی۔ امی کے بہن بھائی بعد کو خود احمدیت میں شامل ہوئے۔ ملک فدا محمد اور ان کی سب سے چھوٹی ہمشیرہ خالہ عزیز۔ ان کی ساس ربوہ میں بھی رہیں مگر زیادہ تر اپنے چھوٹے بیٹے ملک فدا محمد کے گھر میں رہیں اور لاہور میں دفن ہوئیں۔ باقی بھائی اگرچہ احمدیت میں شامل نہ ہوئے مگر مخالفت کا وہ رنگ بھی نہ رہا۔ امی کی سب سے چھوٹی بہن، خالہ عزیز کے میاں ملک غلام حبیب بھی بعد کو احمدی ہوئے اور اب ربوہ میں مقیم ہیں۔ ان کے سب بچے اللہ تعالیٰ کے فضل سے مخلص احمدی ہیں۔ ایک بیٹی منصورہ تو ایک واقفِ زندگی کارکن عزیزم عبدالحلیم قریشی کے عقد میں ہے۔ یہ سب کچھ مولانا جلیل کے حسنِ سلوک کی وجہ سے ممکن ہوا۔ خالہ عزیز اور ان کے بچوں کا حد سے سوا مولانا صاحب کو خیال رہتا تھا اور ان کے لیے دعائیں بھی بہت کرتے تھے۔ جب خالہ عزیز اپنے بچوں کو لے کر ربوہ آ گئیں تو مولانا صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔

ان کے بچوں کے دوست بھی ان کی محبت سے وافر حصہ پاتے تھے۔ ہمارے دوستوں سے اسی تلطّف

-ـ پیش آتے جیسے وہ خود ان کے دوست ہوں۔ اسی طرح اپنی بچیوں کی سہیلیوں کو بھی اپنے لطف و محبت سے بہرہ وافر عطا فرماتے۔ ہماری بیگم کی سہیلیوں میں سے ہماری بہن، رشیدہ تسنیم (مسز ڈاکٹر محمد شریف خاں ابوحنیفی) تو ہمارے گھر کا فرد ہی سمجھی گئیں اور ان کے بچوں کو بھی مولانا صاحب کی شفقت نصیب رہی۔

مولانا کو اپنے بچوں کی تعلیم میں بہت شغف تھا۔ سب بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ دو بچیاں ایم اے تک پڑھیں۔ ان میں میری بیوی پروفیسر امتہ المجید ناصر جامعہ نصرت کی پرنسپل ہو کر وظیفہ یاب ہوئیں۔ دوسری امتہ السمیع ڈاکٹر شاہنواز کی بہو بنی اور ونگ کمانڈر حمید احمد بھٹی کے عقد میں آئی۔ اب کراچی میں ہے۔ دو بچے ڈاکٹر بنے...... صرف ایک بیٹی امتہ الشکور ہے جو بی اے تک رہ گئی۔ مولانا تو اسے بھی آگے پڑھاتے مگر اس کا حیدرآباد دکن کے ایک معزز مخلص خاندان کا مناسب رشتہ آ گیا تو امی اڑ گئیں کہ اس رشتہ کو رد نہیں کرنا چاہئے چنانچہ وہ بیٹی انجینئر محمد سلیمان کی بیوی ہے جو سیٹھ محمد غوث جیسے بزرگ کے نواسے اور سیٹھ محمد اعظم کے بھانجے ہیں۔ بیٹے ڈاکٹر مبشر احمد سلیم نے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی، افریقہ میں مشنری ڈاکٹر کے طور پر کام کیا اور اس کے بعد برمنگھم میں بطور ڈاکٹر کام کر رہے ہیں۔ ابا جی کی لمبی بیماری میں انہیں اور ان کی اہلیہ آمنہ کریم بنت مولوی عبدالکریم کو قابلِ رشک خدمت کی توفیق ملی۔ قبلہ نے آخری سانس بھی اپنی بہو اور بھتیجی کی گود میں سر رکھے ہوئے لیا۔ سب سے چھوٹی بچی امتہ النصیر ڈاکٹر تو بنی مگر ڈاکٹری پر قائم نہ رہی۔ اپنے ماموں زاد سلطان محمود ابن ملک فدا محمد سے بیاہی گئی اور اب کیلیفورنیا امریکہ میں ہے۔ غرض سارے بچے ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا نمونہ ہیں۔ الحمدللہ۔

مولانا کا علمی اور ادبی ذوق بھی قابلِ رشک تھا۔ پاکستان سے ہجرت کے بعد میں اپنے اکثر مضامین جو قادیان یا جماعت کے بزرگوں کی یادوں پر مشتمل تھے چھپنے سے پہلے ان کو دکھا لیتا تھا۔ زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں جو مجھ سے سرزد ہوتی تھیں ان کے باب میں بڑے پیار اور سلیقہ سے مجھے متنبہ کیا کرتے تھے۔ میں نے اردو کے کئی محاورے ان سے سیکھے۔ عربی تو خیر ان کا مضمون تھا فارسی زبان و ادب پر بھی ان کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ حوصلہ افزائی کا انداز بھی ان کا اپنا تھا اور نرالا تھا۔ ان کے شاگرد بھی ان کی حوصلہ افزائی کی باتیں یاد کرتے اور سناتے ہیں۔ یہ وصف ہر استاد میں ہونا چاہئے مگر مولانا کا اپنا انداز تھا۔ ہلکے مزاح کا انداز جس میں شگفتگی بھی ہوتی تھی اور اگر اصلاح کا پہلو مدنظر ہوتا تو ذرا سی سرزنش بھی ایسے معمولی طریق پر کہ سننے والا بددل نہ ہو۔ قرآن کریم کے ترجمے کے سلسلے میں میرا ان سے بہت قریبی ذہنی رابطہ رہا۔ کہیں انہوں نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے عربی زبان و بیان اور محاورہ پر پوری دسترس نہیں ہے اور ترجمہ کے لیے صرف ایک زبان پر دسترس کافی نہیں ہوتی۔ میرے سامنے اردو اور انگریزی کے بعض تراجم کے علاوہ فارسی کے بعض تراجم بھی تھے۔ مولانا ان کے اس کام پر بھی بڑی باریک بینی سے نگاہ رکھتے تھے۔ میں ان کے علمی مرتبہ کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ رہا کہ میرا کام نہیں سلسلے کے علماء کا میدان ہے مگر اتنا جانتا ہوں کہ آج ان کے پڑھائے ہوئے لوگ دنیا بھر میں تربیت کا کام کر رہے ہیں گویا ان کا فیض ساری دنیا میں جاری ہے اور سب کو پہنچ رہا ہے۔ ان کا علم ان کی ذات تک محدود نہیں رہا، دوسروں تک منتقل ہوا ہے اور یہی ایک استاد کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ان کے شاگردوں میں ایسے مربی،

محدّث اور فقیہہ پیدا ہوئے جو اَب ان کے ورثہ کے امین ہیں اور اسے دوسروں تک منتقل کر رہے ہیں۔

خلافتِ ثالثہ کے زمانے میں مولانا ایک بار بڑے سخت بیمار ہو گئے۔ میں اس امر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کے جامعہ کے شاگردوں نے سیّد میر داؤد احمد پرنسپل سمیت ان کی خدمت اور تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ دن میں ایک گروپ حاضر رہتا۔ شام کو دوسرا گروپ ان کی جگہ لے لیتا۔ رات کو تیسرا گروپ حاضر ہو جاتا۔ غرض جامعہ کے بچوں نے خدمتِ خلق کا حق ادا کر دیا۔ پھر خلافتِ رابعہ کے زمانے میں ان کا آپریشن ہوا۔ ہسپتال میں جامعہ کے بچوں کی وہی خدمت جاری رہی۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا مگر تیماردار بھی اسی تواتر کے ساتھ خدمت پر مستعد رہے۔ مولوی صاحب کے کمرہ میں گھر کی مستورات ہوتیں تو جامعہ کے بچے دربانی کرتے اور باہر کے چھوٹے موٹے کام کرنے پر مستعد رہتے۔

مولانا کی انگریزی کی تعلیم صرف ایف اے تک تھی یا شاید بی اے بھی آپ نے کر لیا ہو مگر ان کی انگریزی لغت پر اتنی گرفت تھی کہ مشکل سے مشکل انگریزی لفظ کے ہجے اور معانی انہیں آتے تھے۔ انگریزی تفسیر کے ساتھ منسلک تھے اور تفسیر چھپتی تو اس کے پروف پڑھنا بھی ان کی ذمہ داری تھی۔ ہم نے ملک غلام فرید کو یہ کہتے سنا ہے کہ مولانا کو انگریزی مترادفات پر بھی کمال کا عبور حاصل ہے۔ اس کا ایک ثبوت پیر صلاح الدین کا ترجمہ قرآن کریم ہے کیوں کہ پیر صاحب مولانا صاحب پر بہت انحصار کرتے تھے اور ان کی تجویز کو کبھی رد نہیں کرتے تھے مگر آسانی سے قبول بھی نہیں کرتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دونوں کسی لفظ کے معانی پر بحث کر رہے ہیں۔ پیر صاحب ایک معنی پر مصر ہیں مولانا صاحب کو اس معنی پر شرح صدر نہیں۔ دنوں کی بحث چلتی رہتی۔ آخر پیر صاحب کہہ اٹھتے: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں نے بہت سی انگریزی لغات کو چھانا ہے، وہ زیادہ تر آپ کے تجویز کردہ معانی کی تائید کرتی ہیں۔ ان کے ہاں استواری بھی تھی۔ یہ نہیں کہ اپنی رائے کو جلدی بدل لیتے ہوں۔ جو رائے ایک بار قائم کر لیتے اس پر قائم رہتے مگر غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

شعر فہمی بھی ان کا خاصہ تھی۔ ہم نے تو کبھی اپنے شعر سنانے کی جرأت نہیں کی ہاں اکثر شعرا کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ حسن رہتاسی کے ساتھ تو ان کا بہت گہرا تعلق رہا اور گھر میں آپ اکثر ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد صدیق امرتسری بھی ان کے قریبی دوست تھے۔ ان کے کلام کے چھاپنے میں بھی ان کی تشویق شامل رہی ورنہ شاید وہ نہ چھپواتے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار قبلہ نے ہمیں گھر کے اندر سے بلوایا اور فرمایا مولانا کی اک نظم سنو۔ ہم نے سنی اور بہت داد دی۔ کہنے لگے اب ان کے کلام کے بارے میں کچھ لکھ بھی دو چنانچہ ہم نے لکھ بھی دیا۔ ہمیں اب یہ مستحضر نہیں کہ ہماری وہ تحریر مولانا امرتسری کے کلام کے ساتھ چھپی یا نہیں لیکن اتنا کیا کم ہے کہ ہم نے مولانا کے ارشاد کی تعمیل کر دی اور اس پر وہ خوش ہوئے۔ مولانا محمد صدیق امرتسری کی یادگار رہ گئی۔

قبلہ کی طبیعت میں انسانی ہمدردی تو تھی ہی جانور بھی ان کی محبت سے محروم نہیں رہتے تھے۔ ایک سے زیادہ شاگردوں نے یہ بات بتائی کہ جامعہ کے احاطہ کی باڑ کے ساتھ ایک کتیا نے بچے دے رکھے تھے۔ کئی

لوگوں نے دیکھا اور بیان کیا کہ مولانا بارش میں چادر کی اوٹ کئے ہوئے کوئی چیز چھپا کر لئے جاتے ہیں۔ شاگردوں کو تجسس ہوا کہ مولانا یہ کیا چھپا کر لے جارہے ہیں؟ پیچھا کیا تو دیکھا کہ اس باڑ کے پاس رکے ہوئے ہیں اور کتیا کے سامنے دودھ سے بھرا برتن رکھ رہے ہیں کہ بارش میں یہ بیچاری اپنے بچوں کو چھوڑ کر رزق کی تلاش میں کہاں ماری ماری پھرے گی۔ میں اس بات میں اتنی بات ایزاد کر رہا ہوں کہ دودھ کی ترسیل میں مولانا کی محبت کے علاوہ ہماری امی کا اصرار بھی شامل ہوتا تھا۔ وہ بھی انتہا کی ہمدرد تھیں۔

قبلہ کی نیند بہت ہلکی تھی مگر انہیں نیند پر قابو بھی بڑا تھا۔ بیٹھے بیٹھے سو جاتے تھے۔ دراصل ان کی راتیں بیدار راتیں تھیں۔ شب زندہ دار آدمی تھے۔ خدا جانے کس وقت سوتے تھے اور کس وقت نوافل کے لیے اٹھتے تھے مگر گھر والوں نے رات کے پچھلے پہر انہیں ہمیشہ نماز کی حالت میں پایا۔ باوضو رہتے تھے اور اس میں بہت اہتمام والتزام رکھتے تھے۔

ان کے ہر شاگرد کے پاس مولانا کی ہلکی پھلکی باتوں کا ایک ذخیرہ ہے جو وہ بیان کرتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ گھر کے اندر بھی مولانا کا یہی طور تھا۔ یوں ان کے سارے لطائف بیان کرنے لگوں تو کہاں تک بیان کروں۔ میں دوایک باتیں محض مثال کے لیے بیان کر رہا ہوں۔ ایک مرتبہ ہمارے ہاں سویڈن تشریف لائے ہوئے تھے۔ کھانے میں میٹھا انہیں بہت مرغوب تھا اور میٹھے میں بھی زردہ ان کا پسندیدہ کھانا تھا۔ ہمیں ذیابیطس کی وجہ سے میٹھا کھانا منع ہے۔ دوسرے ہمارے کھانے کے اوقات بھی مولانا کے کھانے کے اوقات سے مختلف تھے مگر میں حصولِ برکت کی غرض سے ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ دوپہر کا کھانا تناول فرمارہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا، یکا یک فرمانے لگے: یہ کیا تم میرے لقمے گن رہے ہو؟ میں نے کہا: نہیں ابا جی میں تو اس انتظار میں ہوں کہ آپ اس زردہ کا تبرک بچائیں تو میں برکت حاصل کروں۔ مسکرائے اور کہنے لگے تو کیا برکت صرف زردہ سے حاصل ہوتی ہے؟

ایک بار دفتر قضا میں ناظم کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں گھر کے کسی کام کے مشورے کے لیے حاضر تھا۔ اتنے میں ایک صاحب دروازہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ابا جی نے نرمی سے پوچھا ''آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟'' میرے منہ سے نکلا ''قضا انہیں لے آئی ہے''۔ ابا جی کہ منصب قضا پر بیٹھے تھے نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی اور فرمانے لگے: ''ہم بھی یہاں قضا راہی بیٹھے ہیں۔''

ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالکریم کی وفات ہوئی تو ابا جی جیسے بجھ سے گئے۔ میں سویڈن سے جنازے میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا۔ تدفین کے بعد سب لوگ مل بیٹھے تو کہنے لگے: اب عبدالکریم کی ہلکی پھلکی باتیں سناؤ۔ میں نے جلسہ سالانہ کے موقع پر وہ واقعہ سنایا جس کا ہمارے سارے خاندان میں بہت چرچا تھا۔ مولوی عبدالکریم جلسہ میں شرکت کے لیے لندن سے گئے ہوئے تھے۔ اب جامعہ کے ایک کوارٹر میں ہر ایک مہمان کے لیے پوری جگہ تو میسر نہیں ہوتی۔ مولوی صاحب کے حصہ میں برامدہ میں پڑا ہوا تخت پوش آیا اور وہ اس پر بڑے مطمئن اور قانع ہوئے۔ میں جلسہ کی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر رات کو دیر سے آیا اور دیکھا کہ ایک

جھلنگا سی چارپائی برآمد میں پڑی ہے۔ میں نے اس کو غنیمت جانا اور ایک لحاف آدھا نیچے بچھایا آدھا اوپر اوڑھا اور لیٹ گیا۔ مولوی عبدالکریم نیند سے چونک گئے۔ لحاف کے کونے سے ذرا سا منہ نکال کر کہنے لگے: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَہْلَ الْقُبُوْرِ۔ میں نے کہا: وعلیکم السلام! آپ ابھی تک تختے پر ہی پڑے ہیں۔'' بس یہ کہنا تھا کہ سارا گھر جاگ گیا اور ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ حضرت مولانا صاحب نے یہ لطیفہ بہت لوگوں کو سنایا حتّٰی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کو بھی سنا دیا اور حضرت صاحب خوب محظوظ ہوئے کیونکہ وہ مولوی صاحب کی لطافتِ طبع سے واقف تھے۔ لطافتِ طبع ان سب بھائیوں میں موجود ہے۔ مولانا کا وصف یہ تھا کہ نہ صرف ان کی باتوں میں موہنی تھی وہ دوسروں کی ہلکی پھلکی باتوں کی داد بھی دے سکتے تھے۔ یہ وصف بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے کہ علمیت میں بھی فرد ہوں اور لطافت طبع میں بھی فرد۔

اللہ تعالیٰ اس مخلص، بے لوث، عالمِ دین اور خادمِ سلسلہ کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کی اولاد میں اپنے فضل سے ان کے علم و حلم کا سلسلہ جاری رکھنے کے اسباب پیدا فرمائے۔ آمین''

آپ نے مولانا محمد احمد جلیل کے بارے میں ان کے داماد، پرویز پروازی کا مضمون ملاحظہ فرمایا۔ اب ذرا سے فرق کے ساتھ ان ہی کے ایک ہم نام، مولانا محمد احمد ثاقب کا ذکر کیا جارہا ہے جو ۱۵ مئی ۱۹۱۷ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے خاندان میں احمدیت ان کے دادا حضرت مولوی محمد عبداللہ کے ذریعے آئی جنہوں نے ۱۹۰۲ء میں بیعت کی تھی۔ ان کے والد حضرت حکیم محمد عبدالعزیز کو ۱۹۰۴ء میں حضرت مسیح موعود کی دستی بیعت کا شرف حاصل ہوا۔

محمد احمد ثاقب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی تحریک پر اپنی زندگی وقف کی اور دہلی، دیوبند، سہارنپور اور لاہور کے مختلف مدارس میں فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعۃ المبشرین میں استاد مقرر ہو گئے۔

میں نے اپنے قیامِ ربوہ کے زمانے میں مولانا کو ادھر ادھر آتے جاتے بارہا دیکھا۔ مجھے ان سے سرسری تعارف حاصل تھا لہٰذا علیک سلیک ہو جاتی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ موصوف تحریک جدید کوارٹرز میں رہتے ہیں اور جامعہ میں پڑھاتے ہیں تاہم ملازمت میں آجانے کے بعد ربوہ سے میرا رابطہ کمزور پڑ گیا اور بدقسمتی سے علمائے ربوہ سے میل جول بھی کم ہو گیا۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے خیال پیدا ہوا کہ ربوہ کے ان دوستوں سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے طولُ العمری کی نعمت سے نوازا ہے ملاقات کروں۔ اسی حوالے سے مولانا کا نام بھی میرے ذہن میں آیا۔ میں نے انہیں مدتِ دراز سے نہیں دیکھا تھا اور مجھے ان کی جائے رہائش کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک بار چوہدری نصیر احمد، سیکرٹری نظارت بہشتی مقبرہ سے ان کے گھر واقع محلّہ دارالعلوم شرقی میں ملاقات ہوئی تو نہ جانے کس طرح گفتگو کے دوران مولانا کا ذکر بھی آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اسی محلّہ میں رہائش پذیر ہیں اور ضعیف العمر ہونے کے باوجود نمازوں کی باجماعت ادائیگی کے لیے اب بھی بیتُ الذکر آتے ہیں تو مجھے ان سے ملاقات کی تحریک ہوئی لیکن جب میں ان کے پاس حاضر ہوا تو ان کی کمزوری بہت بڑھ چکی تھی اور ان کی ذہنی غیر حاضری میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں نے انہیں اپنا تعارف کرانے کی کوشش تو کی لیکن جلد ہی مجھے احساس

ہوگیا کہ یہ کوشش بارآور نہیں ہوسکتی۔ وہیں پر ان کے ایک داماد اور ایک معذور بیٹے ''للّی'' سے ملاقات ہوئی۔ ان سے مولانا کی صحت کی کیفیت کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ موصوف کو اس وقت شدید بے چینی تھی اور جہاں تک میرا احساس ہے وہ اپنے تیمارداروں سے بار بار نماز کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ غالباً ایک یا دو بار انہوں نے نماز شروع بھی کی لیکن غنودگی انہیں آلیتی۔

انہوں نے ۱۸ مئی ۲۰۱۵ء کو بعمر ۹۸ سال وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات پر الفضل ۲۰ مئی ۲۰۱۵ء میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق اِس وقت: ''آپ کے بیسیوں شاگرد اکنافِ عالم میں مختلف اعلیٰ حیثیتوں سے خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔ آپ کو دارالقضا میں تقریباً دس سال بطور قاضی بھی خدمت کی توفیق ملی اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ دارالقضا میں بطور وکیل بھی کام کرتے رہے۔

خدام الاحمدیہ میں شعبہ خدمت خلق کے تحت آپ کو سیلاب کے دوران شیخوپورہ اور لاہور بھیجا گیا جہاں آپ خوراک اور راشن وغیرہ کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ کے متعدد مضامین روزنامہ الفضل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اسی طرح جامعہ احمدیہ کے مجلّہ میں بھی میں کئی مضامین لکھے نیز روزنامہ نوائے وقت میں بھی کچھ مضامین شائع ہوئے۔

آپ دعا گو، منکسر المزاج اور دھیمی طبیعت کے مالک تھے...... خلافت کے ساتھ والہانہ عشق تھا۔''

روزنامہ الفضل ۱۵ فروری ۲۰۱۶ء میں موصوف کے ایک بیٹے، ط حنیف کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ان کے حالاتِ زندگی کے علاوہ ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس مضمون کے مطابق ''مولانا نے مڈل تک تعلیم اپنے آبائی گاؤں بھینی شرقپور سے حاصل کی۔ اس کے بعد قادیان چلے گئے اور مدرسہ احمدیہ قادیان میں سات سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد زندگی وقف کر کے جامعہ احمدیہ قادیان میں مولوی فاضل کیا۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے آپ کو چند اور بزرگوں کے ساتھ دہلی کے ایک مشہور مدرسہ میں بغرضِ تعلیم بھیجا۔ جانے سے قبل حضور نے ہدایت فرمائی کہ وہاں جاکر بتانا ہے کہ آپ قادیان سے آئے ہیں اور احمدی ہیں اور کچھ تحائف لے کر جائیں۔ وہاں کے مولوی صاحب نے جب آپ کو داخل کرلیا تو انہوں نے حضور کو خط لکھا کہ حضور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بہتر طور پر تعلیم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے جواب میں حضور نے لکھا کہ میں نے آپ کو پڑھنے نہیں بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ سیکھیں وہ کیسے پڑھاتے ہیں۔ مولانا چار سال وہاں زیرِ تعلیم رہے اور فقہ اور حدیث میں تدریس کی ٹریننگ حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مصلح موعود نے آپ کو طلبہ کو پڑھانے پر مقرر کیا جنہیں آپ نے فقہ اور صرف و نحو کی تعلیم دی۔ اس کے بعد پارٹیشن سے قبل وہ چار سال تک امورِ عامہ اور وصایا کے دفاتر میں بھی کام کرتے رہے۔

پارٹیشن کے بعد انہیں حضرت مصلح موعود نے پروفیسر جامعہ احمدیہ مقرر فرمایا۔ حضور کے ارشاد پر وہ فقہ و حدیث دونوں مضامین پڑھاتے رہے۔ موصوف طلبہ کو بہت شفقت سے پڑھاتے اور ان سے دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ آپ نرم گفتار، خوش لباس اور حلیم الطبع ہونے کی وجہ سے اپنے شاگردوں میں بے حد مقبول تھے۔

جامعہ احمدیہ سے وہ ۱۹۷۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ کے سوانح حیات کے بعض قابلِ ذکر واقعات اور سیرت کے مختلف پہلو حسب ذیل ہیں:

پارٹیشن کے بعد جب مہاجرین کو ہندوستان میں ان کی جائیداد کے عوض پاکستان میں پراپرٹیز الاٹ ہو رہی تھیں اس وقت لاہور میں انارکلی کے علاقہ کے الاٹمنٹ آفیسر جو موصوف کے دوست تھے نے آپ کو یہ آفر دی کہ انارکلی میں جس عمارت کو الاٹ کرانا چاہتے ہیں وہ الاٹ کردیں گے۔ آپ نے یہ آفر یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ ہمارے امام کا حکم ہے کہ کوئی احمدی قادیان میں اپنی پراپرٹی کے عوض پراپرٹی الاٹ نہ کروائے۔ کچھ عرصہ قبل آپ کے بچوں میں سے ایک نے کہا کہ اس وقت اگر آپ پراپرٹی الاٹ کروالیتے تو آج اربوں کی جائیداد کے مالک ہوتے۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ یہ دنیوی فائدہ اٹھا کر اگر آپ دین کی نعمت سے محروم ہوجاتے تو کیا فائدہ؟

بحیثیت واقفِ زندگی قلیل آمدنی کے باوجود اپنی ساری اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور اکثر نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ قلیل آمدنی کے باوجود غربا کی حتی المقدور خدمت کرتے رہے اور اپنے گاؤں کے ایک عیسائی لڑکے کو ربوہ لاکر میٹرک کروایا اور ملازمت دلوائی جو کہ جنگلات کے محکمہ کا اعلیٰ آفیسر بنا۔ اسی طرح گاؤں کی ایک غریب لڑکی کو ربوہ لاکر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ آپ کی غریب پروری اور صلہ رحمی کا یہ عالم تھا کہ کئی رشتے داروں اور ضرورت مندوں کی ماہانہ وظیفہ کی صورت میں مدد کرتے رہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں حضرت مصلح موعود نے اپنے قیام کے دوران موصوف کو ربوہ سے کچھ دستاویزات پہنچانے کا حکم دیا۔ ان دنوں شدید سیلاب کی وجہ سے آمد و رفت کا نظام درہم برہم تھا۔ آپ فوری حکم کی تعمیل میں دستاویزات لے کر ربوہ سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ بتاتے تھے کہ سڑکیں ٹوٹی ہوئی تھیں اس لیے سواری برائے نام تھی۔ کہیں کسی تانگا میں سوار ہوتے، کہیں ریڑھے وغیرہ کی سواری کرتے مگر زیادہ رستہ پیدل ہی چلنا پڑا۔ اس طرح ربوہ سے لاہور تک سفر تین دن میں طے کیا۔ کاغذات لے کر آنے پر حضرت مصلح موعود نے بے انتہا خوشنودی کا اظہار کیا۔

انہوں نے محلّہ دارالعلوم غربی کی بیتِ ثنا کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کی ڈونیشن کی وصولی میں صوفی محمد اسحاق صاحب جو اس وقت صدر محلّہ تھے کے ساتھ مل کر اہم خدمات انجام دیں۔

موصوف نے تمام جماعتی رسالہ جات گھر میں لگوائے ہوئے تھے اور باقاعدہ اس کا مطالعہ کرتے۔ نظر کی کمزوری کے بعد اپنے بچوں سے سنتے تھے اور خاص طور پر الفضل اخبار سننے کا بے حد شوق تھا اور اتنا انہماک تھا کہ سنانے والا اگر بھول جاتا کہ عبارت کہاں چھوڑی تھی تو پاپا جی بتا دیتے کہ فلاں فقرہ سے آگے شروع کرو۔

انہوں نے پسماندگان میں چار بیٹے، سات بیٹیاں...... یادگار چھوڑی ہیں...... آپ کے سب سے بڑے بیٹے محمد عبدالرشید کینیڈا کی نیشنل عاملہ میں سیکرٹری زراعت ہیں اور مختلف ممالک میں بیوت کے پراجیکٹ پر بھی کام کر رہے ہیں۔''

مولانا محمد احمد ثاقب کے بعد اب کچھ ذکر مولانا غلام باری سیف کا!

۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخری سالوں کی بات ہے۔ میرے ماموں مرزا محمد یعقوب نے جو قبل ازیں تحریک جدید کوارٹرز میں مقیم تھے فیکٹری ایریا میں چھوٹے سے ایک کمرے پر مشتمل ایک کٹیا خرید لی۔ ان کا بیٹا، مرزا محمد اسماعیل میرا ہم عمر اور میرے دوستوں میں سے تھا چنانچہ میں اس سے ملنے کے لیے بکثرت وہاں جایا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۸ء میں میری ملازمت کے آغاز تک جاری رہا۔ اس عرصے میں فیکٹری ایریا جہاں ابتداءً خال خال آبادی تھی خاصا آباد ہو چکا تھا اور بہت سے لوگوں نے یہاں اپنے مکانات تعمیر کر لیے تھے۔ ان ہی میں سے ایک مکان مولانا غلام باری سیف کا تھا۔ وہ محلّہ کی بیت الذکر میں امام الصلوٰۃ بھی تھے چنانچہ میری اس محلّہ میں موجودگی کے دوران نماز کا وقت ہو جاتا تو میں ان ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرتا تھا۔ بار بار آمنا سامنا ہونے سے موصوف مجھے پہچاننے لگے اور یہ تعارف آہستہ آہستہ نیم دوستی میں بدل گیا اور اسی حوالے سے مجھے ایک دو بار ان کے گھر پر حاضر ہونا بھی یاد آ رہا ہے۔

غلام باری سیف جامعہ احمدیہ میں پروفیسر، بہت اچھے مقرر اور بعض کتب کے مصنّف و مؤلّف بھی تھے۔ مجھے ان کی شخصیت کے باقی پہلوؤں سے تو واقفیت نہیں ہے البتہ میں نے ان کی بعض تقریریں سنی ہیں اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک اچھے مقرر کی تمام صفات سے متصف تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم جامعہ احمدیہ، قادیان میں حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انہیں حدیث کی خصوصی تعلیم کے لیے ہندوستان کے بعض معروف دینی مدرسوں میں بھجوایا گیا۔ وہ تکمیلِ تعلیم کے بعد لمبا عرصہ جامعہ احمدیہ میں پڑھاتے رہے۔ جماعت کی ذیلی تنظیموں یعنی مجلس خدام الاحمدیہ اور مجلس انصار اللہ میں بھی انہیں خدمت کا موقع ملا چنانچہ وہ مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کے نائب صدر اور مجلس انصار اللہ مرکزیہ کے نائب صدر صفِ دوم رہے۔

روزنامہ الفضل (۱۴ جولائی ۱۹۹۳ء) نے مرحوم کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: ''مولانا موصوف کا خاص میدان دلنشیں اور جادو اثر تقریر تھی۔ عموماً سیرت کے موضوعات پر ایسی روانی اور جذب و اثر سے تقریر کرتے کہ مجمع کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ مولانا کو جلسہ سالانہ جماعت احمدیہ کے موقع پر متعدد بار تقاریر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔''

مولانا قلم کے بھی دھنّی تھے۔ وہ ماہنامہ خالد اور انصار اللہ کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ کئی کتب آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم''، ''احادیث الاخلاق''، ''روشن ستارے''، ''سیرت حضرت عمر فاروق'' اور ''منکرینِ احادیث کے اعتراضات کے جواب'' شامل ہیں۔

موصوف کو ممبر قضا بورڈ، رکن تدوینِ فقہ کمیٹی اور ممبر مجلس افتا کی حیثیت سے بھی خدمت کا موقع ملا۔

انہیں ۱۹۸۸ء میں دل کی تکلیف شروع ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی خصوصی ہدایت پر انہیں انگلینڈ بھجوایا گیا جہاں ان کے دل کا بائی پاس ہوا۔ وہ صحت یاب ہو کر ربوہ واپس آئے تاہم چند سال بعد انہوں نے دل ہی کے ایک شدید حملے میں وفات پائی۔

ان کی وفات پر الفضل ۱۷ جولائی ۱۹۹۳ء نے اپنے اداریہ میں لکھا: ''آپ علم کے رسیا تھے، حصولِ علم

کے بھی اور علم دوسروں تک پہنچانے کے بھی۔ آپ ایک مصنف تھے اور اعلیٰ پایہ کے مصنف۔ آپ کی تصانیف نے احمدیہ لٹریچر میں ایک بہت مفید اضافہ کیا ہے۔ آپ ایک مقرر تھے اور پاکستان بھر کی احمدی جماعتیں تقریر کے لیے انہیں بلانے کے لیے بیتاب رہتی تھیں۔ آپ کی تقاریر اگرچہ مختلف موضوعات پر ہوتی تھیں لیکن سیرت آپ کا خصوصی موضوع تھا اور سیرت بیان کرتے ہوئے آپ ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ بات دل سے نکلتی تھی اور دل میں اتر جاتی تھی۔ اگرچہ تقریر میں جذب و اثر کے تمام عناصر شامل ہوتے تھے لیکن آپ نے کبھی تصنّع سے کام نہ لیا اور لچھے دار تقاریر سے بھی آپ گریز کرتے تھے۔ بس ہلکی پھلکی زبان میں بات کہتے تھے اور وہ بات دلوں پر اثر کرتی تھی۔ لوگ آنسو بھی بہاتے تھے اور خوش ہو کر مسکراتے اور ہنستے بھی تھے۔ آخری سالوں میں کمزوری کے باعث ڈاکٹروں کی رائے ہوتی تھی کہ وہ تقریر نہ کریں لیکن جذبہ کشاں کشاں تقریر کے لیے لے جاتا اور آخری دو چار تقاریر تو آپ نے کرسی پر تشریف رکھ کر ہی کیں۔ ان تقاریر کا اثر ایک لمبے عرصہ تک یاد رہے گا۔

آپ نے بچپن ہی سے حصولِ علم کے شوق کا اظہار کیا چنانچہ آپ کو حصولِ علم کے مواقع نہ صرف پاکستان میں ملے بلکہ پاکستان سے باہر بھی آپ کو جانے کا موقع ملا اور حاصل کردہ علم کو آپ نے جامعہ احمدیہ میں تدریس کے ذریعے سینکڑوں، ہزاروں افراد تک پہنچایا۔ ساری دنیا میں آپ کے شاگرد موجود ہیں اور یہ شاگرد ذکر تو تمام اساتذہ کا کرتے ہیں لیکن مولانا موصوف کا ذکر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور وہ آپ کے اندازِ تدریس کا نتیجہ ہے۔''

یہ بات ہے بھی درست چنانچہ حافظ مظفر احمد نے جو جامعہ احمدیہ میں ان کے شاگرد رہے تھے الفضل آٹھ اگست ۱۹۹۳ء میں مولانا کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا: ''جامعہ میں آپ حدیث اور علمِ کلام میں ہمارے استاد مقرر ہوئے۔ محنت سے نوٹس تیار کرتے اور لیکچر دیتے تھے۔ آپ طبعاً و مزاجاً مقرر تھے اور آواز بھی ایسی بلند پائی تھی جو نہ صرف کلاس رُوم میں بلکہ اس کے ماحول میں بھی ان کی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ سٹاف روم بھی آپ کی موجودگی میں پُر رونق رہتا تھا بالخصوص جب آپ اور مکرم سیّد محمود احمد کے دلچسپ مکالمے ہوتے تھے۔ جامعہ کی آخری گھنٹی (جو تقاریر کے لیے مختص ہوتی تھی جس میں طلبہ جامعہ ہال میں اکٹھے ہوتے تھے) لیتے تھے۔ آپ اصلاحِ تلفّظ کے علاوہ تقریر کے گُر بھی سکھایا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بہترین مربی کے لیے فنِ تحریر اور تقریر میں مہارت پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ بڑے بڑے مقررین کی مثالیں دے کر بتایا کرتے کہ وہ کس اہتمام سے تقریر تیار کرتے، لکھتے، مزاحیہ حصوں یا پُر جوش مقامات پر نشان لگاتے تھے۔ تقریر کے لیے اچھے اشعار یاد رکھنے اور برمحل استعمال کرنے کی طرف بھی توجہ دلاتے تھے...... آج بھی جب عہدِ رفتہ کا تصور کرتا ہوں تو ذہن کے کسی گوشے سے آپ کی اس مانوس آواز کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔ آپ تقریر کے لیے مطالعہ اور غور و فکر کی عادت پیدا کرنے کی طرف خاص توجہ دلاتے تھے۔ الغرض تقریر کے بہت گُر سکھائے۔ یہ اور بات کہ سامعین کو رُلانے اور ہنسانے کا فن

(جس پر آپ کو کمال قدرت حاصل تھی) نہ جانے کیوں ہم سے چھپائے رکھا یا ہم ہی نہ سیکھ پائے اور یہی درست ہوگا کیونکہ وہ تو سخن میں جان ڈال کر مجمع میں ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ سچ ہے

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے''

ڈاکٹر عبدالخالق، صدر مجلس انصاراللہ مرکزیہ ان ہی کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی عنایت ہے کہ میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ ایک بات جو میں آج تک انہیں نہیں بتا سکا یہ ہے کہ ان کی اہلیہ کے دادا، مرزا معظم بیگ میرے نانا حضرت مرزا محمد اشرف کے بے تکلف دوست تھے اور اس دوستی کا ذکر میں نے امی کی زبان سے بارہا سنا تھا۔ خداتعالیٰ ان دونوں بزرگان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اور احمدیت کی برکت سے قائم ہونے والے اس مخلصانہ تعلق کو ان کی نسلوں میں بھی جاری وساری رکھے۔

اس مختصر مضمون میں غلام باری سیف کے محاسن پر مزید گفتگو ممکن نہیں لہٰذا اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے اب ذکر کیا جا رہا ہے شیخ نور احمد منیر کا جو جماعت کے جیّد علماء اور میرے مہربانوں میں سے تھے۔

نور احمد منیر اٹھارہ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ محمد دین، مختارِ عام صدر انجمن احمدیہ کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی دین کی خاطر وقف کی اور تیرہ سال تک بلادِ عربیہ یعنی مصر اور لبنان میں بطور مربی سلسلہ خدمت کی سعادت پائی۔ عربی زبان میں انہیں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی۔ وہ نائجیریا میں بھی متعین رہے؛ پاکستان کے مختلف شہروں بشمول ڈھاکہ، بہاولپور، جہلم اور رحیم یار خاں میں بطور مربی خدماتِ سلسلہ بجالاتے رہے؛ جامعہ احمدیہ میں استاد رہے؛ وقفِ جدید میں کام کیا اور زندگی کے آخری ایام میں نظارت اصلاح وارشاد مرکزیہ میں تعینات رہے۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے۔ جماعتی رسائل واخبارات میں بکثرت مضامین لکھتے رہتے تھے۔ انہوں نے بعض کتب تصنیف فرمائیں اور کچھ مناظروں میں بھی حصہ لیا۔ وہ رمضان میں بیت مبارک میں درسِ قرآن بھی دیتے رہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ان کا جنازہ غائب پڑھاتے ہوئے فرمایا: ''آپ کو بلادِ عربیہ میں ایک لمبا عرصہ تک بطور مربی سلسلہ اپنے فرائض سرانجام دینے کی توفیق ملی۔ جامعہ احمدیہ ربوہ میں بھی بطور استاد خدمت بجالاتے رہے۔ تحریر وتقریر کا ملکہ بھی تھا۔ الفضل اور دوسرے جماعتی رسائل میں آپ کے علمی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ انتہائی مسکین طبع، ملنسار، علمی شخصیت کے مالک تھے اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔''

مجھے اب یاد نہیں کہ میرا نور احمد منیر سے تعارف کب اور کس جگہ ہوا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب بھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا وہ رُک کر مجھے سلام کرتے اور حال احوال پوچھتے۔ میری ان سے بے تکلفی تھی نہ ہی کبھی ہماری کسی علمی موضوع پر بات ہوئی لیکن اس کے باوجود میرا چہرہ دیکھتے ہی اس قدر خوشی کا اظہار کرتے کہ دل باغ باغ ہو جاتا۔ یقیناً ان کی عنایات کا ایک سبب اباجی کی ذاتِ گرامی تھی جو ربوہ کے ماحول میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھے اور پھر میری اپنی شناخت بھی جس کی وجہ سے مجھے بہت سے لوگوں کی قربت کے حصول کا نادر موقع میسر آ گیا تھا۔

نور احمد منیر نامور خادمِ سلسلہ، شیخ مبارک احمد کے بھائی تھے۔ میری ان دونوں بزرگان سے جان پہچان تھی اور میں نے اس بات کو اپنے لیے ہمیشہ باعثِ عزت سمجھا ہے کہ میں ان کے دیگر برادران، شیخ فضل احمد اور شیخ بشیر احمد سے بھی بہت اچھی طرح متعارف ہوں اور وہ بھی مجھے ہمیشہ شفقت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

موصوف کی وفات ۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کو ہوئی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

اُن کی وفات پر جامعہ احمدیہ میں ان کے ایک شاگرد، محمد اقبال عابد، مربی سلسلہ نے الفضل ۱۶ جولائی ۲۰۰۱ء میں اپنے ایک مضمون میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا: ''ان کی دینی خدمات کا دائرہ تقریباً نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ موصوف کو زیادہ تر عرب ممالک میں خدماتِ دینیہ کی توفیق ملی اور عربی زبان پر ان کو اگر کہا جائے کہ بہت دسترس تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

عربی زبان کا لب ولہجہ ایسا تھا کہ جیسے عرب گفتگو کر رہا ہو۔ شیخ صاحب ان جیّد علمائے کرام میں سے تھے جن سے عربی زبان کے بارے میں حتمی رائے لی جاتی تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا بے بہا ذخیرہ تھا۔ عربی زبان میں تقریر کرتے تو بکثرت مترادفات استعمال کرتے۔

انہیں عرب شعرا اور ادبا کا کلام بکثرت یاد تھا۔ موقع کی مناسبت سے ان کے پاس عربی شعر بکثرت موجود ہوتے تھے۔

(ریٹائرمنٹ کے بعد) مولانا ...... بیت النور، ماڈل ٹاؤن کے قریب ہی اپنے صاحبزادے طاہر منیر کے ہاں قیام کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے تھے کہ یہاں سے بیتُ النّور بہت قریب ہے۔...... ہر روز بلاناغہ نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے بیتُ النّور تشریف لاتے۔ نمازِ مغرب کی ادائیگی کے بعد مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال فرماتے۔ اپنے قیامِ لبنان کے واقعات زیادہ تر ان کا موضوع رہتے۔ ایک دفعہ انہوں نے بیان کیا کہ لبنان میں قیام کے دوران حکیم فضل الرحمٰن، مربی افریقہ نائیجیریا سے واپس پاکستان آ رہے تھے۔ بیروت میں بحری جہاز نے چند دن ٹھہرنا تھا۔ حکیم صاحب نے ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور کسی مقامی دوست سے پوچھا کہ یہاں کسی پاکستانی کو جانتے ہو۔ اس نے بتایا کہ ہاں یہاں ایک پاکستانی موجود ہے اور فلاں لبنانی کی دوکان پر اکثر میں اس سے ملتا ہوں۔ حکیم صاحب مقامی دوست کو ساتھ لے کر اس لبنانی کی دکان میں داخل ہوئے ہی تھے کہ میری ان پر نظر پڑی اور میں نے لپک کر انہیں گلے لگا لیا اور خیر وعافیت دریافت کی۔ میں نے پوچھا کہ سامان وغیرہ کہاں ہے۔ فرمانے لگے کہ فلاں ہوٹل کے کمرے میں پڑا ہے۔ میں نے حکیم صاحب کو ساتھ لیا، ہوٹل سے سامان اٹھوایا اور اپنے ساتھ مشن ہاؤس میں لے آیا۔ حکیم صاحب کہنے لگے کہ بحری جہاز کے انگریزی کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں اور طبیعت اکتاہٹ محسوس کر رہی ہے۔ میں نے دیسی مرغ منگوایا اور شوربے والا سالن خود پکایا جس میں سرخ مرچ بھی ڈالی گئی تھی۔ حکیم صاحب نے سیر ہو کر کھایا اور بہت خوش ہوئے۔

اگلے دن لبنان کے تمام اخبارات کے نمائندوں کے ساتھ حکیم صاحب کی پریس کانفرنس کرائی گئی۔

صحافی حضرات نے مولانا حکیم فضل الرحمٰن کے بیانات کہ دینِ حق افریقہ میں کیسے تیزی سے پھیل رہا ہے شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کئے۔ نیز حکیم صاحب کا تفصیلی انٹرویو بھی مختلف اخبارات نے شائع کیا......

شیخ صاحب کی طبیعت بذلہ سنج تھی اور علمی حوالے سے مناظرانہ رنگ نمایاں تھا۔ بڑے بڑے علماء کے ساتھ اپنے مناظروں کا حال سنایا کرتے تھے۔ طبیعت میں مزاح بھی تھا۔

اکثر یہ ذکر کیا کرتے تھے کہ انہیں مصر کے مشہور علاّمہ مفتی محمود الشلتوت جو الازہر یونیورسٹی کے پروفیسر تھے کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی علامہ ہیں جنہوں نے ......فتویٰ دیا تھا کہ قرآن کریم کی آیات کی رُو سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام وفات پا چکے ہیں اور شیخ صاحب نے اپنی ملاقات میں اس فتویٰ کی تصدیق بھی کروائی اور علامہ موصوف نے اس بات کا بَرملا اظہار کیا کہ ہاں! میری تحقیق کے مطابق یہ بات درست ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام وفات پا چکے ہیں۔

شیخ صاحب ہمیشہ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ انہیں جامعہ احمدیہ جیسی عظیم درس گاہ میں پڑھانے کا کئی سال موقع ملا اور اس وقت پوری دنیا میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے اشاعتِ دین کا اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔''

موصوف نے ایک بار اپنی ایک بہن حمیدہ بیگم کے خسر شیخ کریم بخش آف کوئٹہ کی فاطمہ جناح کے ساتھ ایک ملاقات کا احوال سنایا تھا جو مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تفصیلات میرے ذہن سے محو ہوگئیں۔ کچھ عرصہ پہلے الفضل میں شیخ کریم بخش کے صاحبزادے گروپ کیپٹن محمد لطیف کے ایک مضمون میں یہی واقعہ بیان ہوا تو مجھے وہ ساری تفصیلات بھی یاد آ گئیں۔ بحوالہ الفضل تیرہ اگست ۲۰۰۹ء فاضل مضمون نگار کے الفاظ میں:

''قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام زیارت میں گزارے۔ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں آپ نے ایک جلسۂ عام میں کوئٹہ کے عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اللہ نے ہمیں رہنے کے لیے ایک بے بہا خطہ زمین عطا کیا ہے۔ سروں پر چھت اور کھانے کو وافر گندم عطا کی ہے لیکن یہاں انڈسٹری اور کارخانوں کی کمی ہے۔ آپ نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ صاحبِ ثروت وحیثیت لوگ آگے بڑھیں اور کپڑے کی ضروریات کو فوری طور پر پورا کرنے کے لیے کھڈیاں لگائیں اور کھڈی پر کپڑا تیار کریں۔

اس جلسہ گاہ میں میرے والد مکرم شیخ کریم بخش صاحب بھی موجود تھے جو کہ کوئٹہ کے ایک معروف تاجر تھے اور جماعت احمدیہ کوئٹہ کے نائب امیر بھی تھے۔ وہ قائداعظم سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ قائداعظم کا پیغام سن کر وہ بے چین ہوگئے اور اسی وقت انہوں نے مصمّم ارادہ کیا کہ اور کوئی آگے بڑھے یا نہ بڑھے وہ اس کام کو حتی المقدور آگے بڑھائیں گے۔ اگرچہ وہ کھڈی اور اس پر کپڑا بنانے کی حرفت سے کلیۃً لاعلم تھے مگر وہ ہمتِ مرداں مددِ خدا کے قائل تھے۔ وہ اپنے محترم قائد کی ایک خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جلسہ گاہ سے پُرعزم اٹھے اور بلا تاخیر اس حرفت کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دیں۔ بالآخر ان کی دوڑ دھوپ رنگ

لائی۔ چند ہفتوں میں ایک احاطہ فیکٹری لگانے کے لیے کرایہ پر حاصل کیا۔ گوجرانوالہ اور گجرات سے کھڈیاں منگوائیں اور کاریگر لائل پور سے لے کر آئے اور سُوت وغیرہ حاصل کیا۔ چند ہی دنوں میں اس کارخانے نے کپڑا بننے کی صلاحیت حاصل کر لی۔

والد صاحب فوراً لٹن روڈ پر واقع قائداعظم کی رہائش گاہ پر حاضر ہوئے اور ان کے سیکرٹری سے قائداعظم سے شرفِ ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا اور وجہ ملاقات بتائی۔ شیخ صاحب کو پیغام ملا کہ قائداعظم اس وقت مصروفِ کار ہیں لیکن محترمہ فاطمہ جناح سے اسی وقت ملاقات ہوسکتی ہے۔ انتظارگاہ میں آپ نے چند منٹ انتظار کیا اور محترمہ فاطمہ جناح تشریف لے آئیں۔

جناب شیخ صاحب نے آداب کے بعض عرض کیا کہ قائداعظم کے ارشاد کے مطابق انہوں نے کھڈیاں لگائی ہیں اور اب یہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں کہ کس قسم کا کپڑا تیار کیا جائے۔ محترمہ نے خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ پہلے آپ دسترخوان یعنی ٹیبل نیپکنز بنائیں اور ان کے لیے بارہ عدد دسترخوان بنا کر لائیں جن کا سائز ۱۲"x۱۲" ہو۔ آئندہ ملاقات کا وقت اور دن مقرر کر دیا گیا۔

اس مختصر ملاقات کے بعد شیخ صاحب وہاں سے رخصت ہوئے اور کارخانے کے ماہرین کو جمع کر کے تلقین کی کہ بارہ نہایت عمدہ دسترخوان بناؤ جو ۱۲"x۱۲" سائز کے ہوں۔ کام کا آغاز بلا تاخیر شروع کر دیا گیا۔ اس ضمن میں شیخ صاحب کئی بار کارخانہ میں گئے اور کوالٹی اور معیار پر زور دیتے رہے۔ بالآخر تین درجن دسترخوانوں میں سے بارہ کا انتخاب کیا اور وقتِ مقررہ پر قائداعظم کی رہائش گاہ پر پہنچانے کے لیے روانہ ہوگئے لیکن یہ دیکھ کر پریشان ہوئے کہ لِٹن روڈ پر قائداعظم کی رہائش گاہ کے سامنے دونوں جانب بے پناہ ہجوم ہے۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم نے سٹاف کالج کوئٹہ میں خطاب کرنے جانا تھا اور لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہوئے تھے لیکن شیخ صاحب کو تو وقت مقررہ پر محترمہ فاطمہ جناح سے بہرصورت ملاقات کرنا تھی چنانچہ موقع پر موجود ایس پی سے ملے اور قائداعظم کی رہائش گاہ میں داخل ہونے کی اجازت پر اصرار کیا۔ اگرچہ اس افسر کی شیخ صاحب سے پرانی جان پہچان تھی مگر اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا۔ شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ قائداعظم کی ہمشیرہ نے خود مجھے بلایا ہے اور ملاقات کا وقت مقرر کیا ہے اور ان کو بہرصورت اسی وقت وہاں پہنچنا ہے۔ اس افسر نے سیکرٹری قائداعظم سے بات کی تو سیکرٹری نے کہا کہ شیخ صاحب کو فوراً یہاں پہنچا دو، محترمہ فاطمہ جناح ان کا انتظار کر رہی ہیں چنانچہ شیخ صاحب نے اس ہجوم کو کاٹ کر سڑک عبور کی اور سیکرٹری قائداعظم کے پاس پہنچے جو اپنے دفتر میں قائداعظم کی روانگی کے انتظار میں ایستادہ تھا۔ عین اس وقت شیخ صاحب نے دیکھا کہ قائداعظم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹوپی پہن رہے ہیں اور پھر تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔

شیخ صاحب کی جلد ہی محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب نے بصد احترام بارہ عدد نیپکن محترمہ کو پیش کئے۔ محترمہ نے پیمائش کرنے والا فیتہ منگوایا۔ ایک ایک نیپکن کا بغور جائزہ لیا اور پھر نیپکن کے

چاروں اطراف کی فیتے سے پیائش کی اور چار نیپکن ایک طرف اور باقی نیپکن دوسری طرف رکھ کر فرمایا کہ یہ چار ٹھیک ہیں لیکن باقی آٹھ کی اطراف میں نصف انچ سے پون انچ کی کمی بیشی ہے جو درست نہیں ہے اور تلقین فرمائی کہ انڈسٹری میں ترقی کرنے کے لیے کوالٹی کنٹرول لازم ہے۔ شیخ صاحب نے شکریہ ادا کیا اور غیر معیاری آٹھ نیپکن کے ہمراہ یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ محترمہ کی نصیحت پر عمل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی جائے گی۔''

فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں:

''اس واقعے کے بعد مدتِ مدید تک شیخ صاحب محترمہ فاطمہ جناح کی قائدانہ صلاحیت پر رطبُ اللّسان رہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ بجائے اس کے کہ وہ میرے جذبات کی تعریف کرتے ہوئے تمام نیپکن قبول کر لیتیں انہوں نے یہ سبق سکھایا کہ قوموں کی ترقی کے لیے جذبات کی بھٹی میں اصولوں کو نہیں جھونکا جاتا۔''

شیخ نور احمد منیر اور ان کے بہنوئی شیخ کریم بخش آف کوئٹہ اور ان کے حوالے سے محترمہ فاطمہ جناح کا ذکرِ خیر تمام ہوا۔ اب میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا ہوں تو ایک دراز قد اور قدرے بھاری جسم والے عربی کے ایک فاضل ربوہ کی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ملک مبارک احمد، پروفیسر جامعہ احمدیہ کی بات کر رہا ہوں جو امیر جماعت احمدیہ دوالمیال، ملک عبدالرحمٰن کے صاحبزادے اور حضرت ملک عبدالصمد، رفیق حضرت مسیح موعود کے پوتے تھے۔ وہ اباجی کے حلقۂ احباب میں شامل تھے اور گاہے بگاہے ان سے ملاقات کے لیے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے رہتے تھے۔ ہمارا گھر دو کمروں والے ایک کوارٹر پر مشتمل تھا۔ اگرچہ اس کا ایک کمرہ جس کا دروازہ گلی میں کھلتا بیٹھک کہلاتا تھا مگر اباجی کے مہمان بیٹھک میں بیٹھنے کی بجائے عموماً انہیں اپنے ساتھ باہر لے جاتے اور چہل قدمی کے دوران ہی ضروری امور پر گفتگو کر لیتے۔ اس حوالے سے جان پہچان تو میری بھی موصوف کے ساتھ تھی مگر کبھی ان کے ساتھ کسی موضوع پر گفتگو یاد نہیں۔ اب کبھی ربوہ جاؤں تو بہشتی مقبرے کے گیٹ کے پاس ہی ان کی قبر پر دعائے مغفرت کے لیے اکثر رک جاتا ہوں۔

ملک صاحب موصوف کی ابتدائی تعلیم جامعہ احمدیہ، قادیان میں ہوئی جس کے بعد عربی زبان میں ان کی دلچسپی کے مدنظر انہیں شام اور مصر کی بعض یونیورسٹیوں میں بھجوایا گیا اور وہ اس زبان پر دسترس حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے۔

انہوں نے ۲۳ ستمبر ۱۹۸۸ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی عملی زندگی کا زیادہ حصہ جامعہ احمدیہ میں درس و تدریس میں گزرا تھا۔ ان کی وفات پر اس ادارے نے اپنی قراردادِ تعزیت میں اظہارِ افسوس کے دوران ان کی خدمات کو تفصیلی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

''اکیس سال کی عمر میں آپ نے زندگی وقف کی اور اسی سال ۱۹۴۳ء میں آپ نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ شام تشریف لے گئے جہاں شامی یونیورسٹی میں داخل رہے۔ پھر چند ماہ تک قاہرہ یونیورسٹی، مصر میں

بھی تعلیم حاصل کی۔ اس دوران میں دمشق اور حلب سے شائع ہونے والے عربی رسالوں میں آپ کے عربی مضامین بھی شائع ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ واپس تشریف لائے۔ جامعہ احمدیہ میں بطور استاد آپ کی تقرری ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ شام سے واپس آ کر سلسلے کے لٹریچر کے عربی میں تراجم کرنے میں مصروف رہے۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں حضرت مصلح موعود کے ساتھ سفر یورپ میں شرکت کی سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔ جون ۱۹۵۷ء میں آپ دوبارہ جامعہ احمدیہ میں بطور استاد منسلک ہوگئے۔ آپ نے کئی اہم کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا جن میں ''ہماری تعلیم'' ''دعوۃ الامیر'' ''سیرِ روحانی'' ''سیرتِ طیبہ'' ''مسئلہ قادیانیہ کا جواب المودودی فی المیز ان''...... قابل ذکر ہیں۔

آپ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک جامعہ کے عربی رسالہ ''البشریٰ'' کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہونے کے بعد بھی جامعہ احمدیہ میں تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ ترجمہ کے کام میں مصروف رہے۔ دسمبر ۱۹۸۵ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک آپ کو قائم مقام پرنسپل کے طور پر خدمت انجام دینے کا موقع بھی ملا۔

ملک صاحب نہایت نیک خصلت، دعا گو، عبادت گزار اور درویش صفت انسان تھے۔ نہایت خاموش کارکن تھے۔ اپنا سارا وقت بھرپور طور پر خاموش خدمتِ دین میں لگا کر آپ نے عہدِ وقف خوب نبھایا۔ آپ عربی کے مستند عالم تھے۔''

اب ذکر ملک بشارت احمد کا جنہیں میں تحریکِ جدید کے ایک ذیلی ادارے، Oriental and Religious Publishing Corporation، گول بازار کے منیجر اور ملک جی بردرز والے ملک سعادت احمد کے بھائی کے طور پر پہچانتا تھا۔ وہ تحریک جدید کوارٹرز کے پرانے باسیوں میں سے تھے۔ ان کا خاندان ان کے دادا کے زمانے میں کشمیر سے امرتسر آباد ہوا تھا تاہم اس خاندان کو احمدیت کی نعمت ان کے والدِ بزرگوار، ملک مولا بخش کے ذریعے ۱۹۰۰ء میں نصیب ہوئی۔ کتنے خوش نصیب تھے کہ رفاقتِ حضرت مسیح موعود کا شرف پایا۔

موصوف سے میرا پہلا تعارف اس وقت ہوا جب وہ نصرت آرٹ پریس کے منیجر تھے۔ دراصل اباجی نے میری ایک ہمشیرہ کی شادی کے لیے دعوتی کارڈ چھپنے کے لیے اس پریس پر دیئے ہوئے تھے۔ میں ان کارڈوں کی چھپائی ہی کے سلسلے میں دو چار بار پریس پر گیا تھا۔ شاید اسی زمانے کی بات ہے سعیداللہ نام کے ایک کارکن یہاں کام کرتے تھے۔ فیکٹری ایریا کے رہائشی تھے اور سکول میں مجھ سے ایک یا دو سال سینئر تھے۔ میں کبھی ان سے ملاقات کے لیے بھی پریس جانے لگا اور یوں بشارت سے بھی میل جول رہنے لگا۔

بتایا جاتا ہے کہ موصوف نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پشاور میں اپنے بہنوئی، کرامت اللہ کی دکان ''کاز ریڈیو'' پر اکاؤنٹنٹ کے طور پر کیا تھا تاہم ۱۹۴۴ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے نوجوانوں کو زندگیاں وقف کرنے کی تحریک فرمائی تو ان کے دل میں بھی تعمیلِ حکم کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ انہوں نے حضور کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ کچھ عرصہ وکالتِ دیوان میں رہے اور پھر کنری (سندھ) میں جماعت کی ایک جننگ فیکٹری میں بطور اکاؤنٹنٹ بھجوا دیئے گئے۔ وہ ۱۹۵۱ء تک سندھ میں رہے

اور پھر مرکز کی ہدایت پر ربوہ آ گئے جہاں انہوں نے باقی تمام زندگی خدمتِ سلسلہ میں گزاری۔

فرزندانِ ملک بشارت احمد کے نام سے الفضل ۲۵ فروری ۱۹۹۳ء میں ان کی یاد میں چھپے ہوئے ایک مضمون سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک نیک نفس انسان تھے اور جہاں کوئی غلط بات دیکھتے یا محسوس کرتے فوراً اپنے افسروں کے علم میں لاتے اور ضروری ہوتا تو خلیفہ وقت کو بھی اس سے آگاہ کرتے۔ فاضل مضمون نگاران کے الفاظ میں ''ایک دفعہ جماعت احمدیہ کے ایک مخلص کارکن زمین کی منتقلی کا آرڈر لے کر آئے اور کہا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ ایسا کر دیا جائے یعنی ایک کنال زمین فلاں کے نام کر دی جائے۔ اباجی نے کہا کہ حضور کے دستخط اس آرڈر پر نہیں ہیں اس لیے میں ایسا نہیں کر سکتا...... اس پر کارکن موصوف نے تعجب کیا اور حضور کی خدمت میں شکایت کر دی۔ حضور نے فرمایا: وہ درست کہتا ہے۔ جب تک میں دستخط نہیں کرتا وہ ایسا نہیں کر سکتا۔''

اس مضمون میں موصوف کی بہت سی ذاتی خوبیوں اور ان کے بعض اشغال کا ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ خطوط لکھنے میں بہت باقاعدہ تھے اور شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا جب وہ خط لکھنے میں ناغہ کرتے ہوں۔ کسی کا خط موصول ہوتا تو فوراً اس کا جواب دیتے۔ ۱۹۷۳ء میں جب ان کے بیٹے منیر احمد جاپان گئے تب سے آخری دم تک خطوط کا ایک سلسلہ تھا جو جاری رہا۔ سالانہ ستر یا اسی خطوط وہ صرف ان ہی کو لکھا کرتے تھے۔ یہی معاملہ باقی بہن بھائیوں اور عزیز واقارب کا تھا۔ وہ ہر خط میں باقی امور کے علاوہ مکتوب الیہ کو جماعت کے ساتھ وابستگی اور خدمتِ سلسلہ کی ضرور تلقین کرتے۔

بشارت جو بالعموم بے داغ سفید لباس پہنا کرتے تھے اپنے لباس کی طرح بے داغ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے صاحبزادے رفیع مقیم آسٹریلیا کا بیان ہے کہ گھر میں عسرت تھی لیکن ان کی والدہ بلاناغہ ان کے کپڑے دھوتیں تاکہ باہر نکلیں تو ان کے کپڑے صاف ہوں۔ ربوہ کے ایک اور صاحب جو اس معاملہ میں ان کے ہم پلّہ تھے مولوی قمر الدین تھے جن کا لباس ہمیشہ سفید برّاق ہوتا تھا۔

تحریک کوارٹرز کی رہائش ترک کرنے کے بعد موصوف فیکٹری ایریا میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ انہیں وہاں بھی خدمت کی توفیق ملتی رہی چنانچہ وہ لمبا عرصہ تک صدر محلّہ رہے۔

وہ فضلِ عمر ہومیو پیتھک ریسرچ ایسوسی ایشن کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے چنانچہ ان کے خاندان کے پاس صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کا بحیثیت پریذیڈنٹ، فضلِ عمر ہومیو پیتھک ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے نام لکھا ہوا ایک خط موجود ہے جس میں آپ نے حضور کو ''سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدکم اللہ تعالیٰ!'' کے القابات سے مخاطب کرتے ہوئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کا ہدیہ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا: ''حضور کی خدمت میں عرض ہے کہ فضلِ عمر ہومیو پیتھک ریسرچ ایسوسی ایشن پاکستان، ربوہ کی مجلسِ عاملہ کے جملہ ممبران حضور سے ملاقات کر کے ایسوسی ایشن کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حضور براہِ کرم ملاقات کا موقع عطا فرما کر ممنون فرمائیں۔'' اس کے بعد آپ نے مجلسِ عاملہ کے اراکین یعنی مولوی ابوالمنیر نورالحق؛ ملک بشارت احمد؛ راجہ نذیر احمد ظفر؛

صوفی خدابخش عبدزیروی اور ناصر احمد صدیقی کے اسمائے گرامی کے بعد آخر میں اپنا نام ''خاکسار مرزا طاہر احمد'' کے الفاظ میں لکھا تھا اور خط پر بطور ''پریذیڈنٹ، فضلِ عمر ہومیو پیتھک ریسرچ ایسوسی ایشن'' دستخط فرمائے تھے۔

ملک بشارت احمد نے تین اکتوبر ۱۹۸۲ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی اولاد اب پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔ منیر کو جاپان میں آباد ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے؛ طارق اور رفیع آسٹریلیا میں ہیں؛ مبارک نے انگلستان کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا ہے اور بہن، منصورہ منیر ہی کے آس پاس رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سلسلے کے اس خدمت گزار خاندان کو تمام دنیاوی نعمتوں سے نواز رکھا ہے لیکن سلسلے کے ساتھ محبت وعقیدت میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ یوں تو میرا ان کے سب سے بڑے صاحبزادے، منیر کے ساتھ بھی کچھ رابطہ ہے لیکن رفیع کے ساتھ وٹس ایپ پر بکثرت پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور مجھے ان کی خیریت کی خبر ملتی رہتی ہے۔

یہاں یہ ذکر شاید بے جا نہ ہو کہ رفیع کے ایک صاحبزادے جن کا نام ان کے دادا کے نام پر بشارت احمد ہی رکھا گیا تھا اور واقفِ نو تھے چوبیس سال کی عمر میں ایک لمبی بیماری کے بعد ۷ ستمبر ۲۰۱۲ء کو ٹوکیو میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کے بارے میں الفضل ۱۶ مئی ۲۰۱۳ء میں چھپے ہوئے ایک مضمون کے مطابق ''بشارت احمد ذہین اور خوش اخلاق، پنج وقتہ نمازوں کا پابند، چندوں میں باقاعدہ، خلافت سے والہانہ تعلق رکھنے والا، خاموش طبع اور مخلص اور باوفا نوجوان تھا۔''

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ملک بشارت احمد اور ان کے پوتے عزیز بشارت احمد، دونوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مدارج عطا فرمائے اب ذکر کیا جا رہا ہے سردار عبدالحق شاکر کا جو مولانا مقبول احمد ذبیح، مربی سلسلہ کے والدِ بزرگوار اور پرانے واقفین زندگی میں سے تھے۔ میں اب یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ ہی مقیم تھے یا انہیں تحریک جدید کی طرف سے الگ کوارٹر ملا ہوا تھا مگر اتنا جانتا ہوں کہ ان کی رہائش تحریک کوارٹرز میں تھی۔ اب یہ بھی یاد نہیں کہ ان سے تعارف کس حوالے سے ہوا البتہ یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف تھے۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے ان کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں آ رہا کہ وہ دفتر تحریک جدید کے شعبہ تعمیرِ بیوت الذکر میں کام کرتے تھے اور بے حد خوشخط تھے لیکن ان کی صفاتِ حسنہ کا قدرے تفصیلی ذکر حسن محمد عارف نے ان کی وفات (جو ستائیس اگست ۱۹۸۰ء کو ہوئی) پر اپنے مضمون مطبوعہ الفضل ۱۷ دسمبر ۱۹۸۰ء میں کیا ہے۔ اس مضمون کا یہ حصہ ذیل میں اس خیال سے نقل کیا جا رہا ہے کہ مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی تحریک ہو:

''میں ۱۹۴۵ء میں وقف کر کے قادیان گیا تو یہ وکالتِ مال میں کام کیا کرتے تھے۔ صاف ستھرے بُرّاق سے کپڑے پہنتے تھے۔ لمبی قمیص اور تہمد باندھتے تھے۔ یہ ہمارا دیہاتی لباس ہے۔ اکثر دیکھا کہ ان ہی کپڑوں میں دفتر چلے آ رہے ہیں۔ گاڑھے کا کرتہ اور معمولی لٹھے کا تہمد لیکن اتنا صاف کہ کوئی داغ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ سفید صافہ باندھتے تھے۔...... نماز کے اس قدر پابند کہ پانچ نمازوں میں سے شاید ہی کوئی

ایسی ہوتی ہوگی جو یہ بیتُ الذکر میں ادا نہ کرتے ہوں۔ بیت محمود گھر کے ساتھ ہی تھی اس لیے اکثر نمازیں تو یہیں ادا کرتے لیکن عصر کی نماز کے لیے بڑی باقاعدگی اور بڑی پابندی سے بیت مبارک تشریف لے جاتے اور چاہتے کہ کم سے کم ایک نماز حضور کی امامت میں ادا کرلیں۔ روزے بڑے باقاعدگی سے رکھتے اور اکثر اعتکاف بھی بیٹھتے۔ ایک سے زائد بار ایسا بھی ہوا کہ بیت مبارک میں اعتکاف بیٹھنے والوں کی محدود تعداد کے پیشِ نظر اجازت نہ ملی تو میرے پاس تشریف لائے اور بیت محمود میں معتکف ہونے کی اجازت طلب کی۔ بیت محمود کی خدمت اور انتظام تحریک جدید کی طرف سے میرے سپرد ہے اس لیے میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی کہ بیتِ محمود میں بھی اللہ کا کوئی نیک بندہ اعتکاف بیٹھے گا اور عبادت کرے گا۔ میں خوشی خوشی اجازت دے دیتا۔ شاکر صاحب خود ہی چادریں تان کر حجرہ بنالیتے اور دس دن عبادتوں اور ریاضتوں میں مصروف رہتے۔

......ان کے سپرد روپیہ کی فراہمی کا ایک شعبہ تھا اور وہ تھا تعمیر بیوت الذکر کا۔ اس مد میں روپیہ فراہم کرنے کے لیے وہ نت نئی سکیمیں سوچتے اور ان پر عمل کرتے۔ کتابت کے فن سے واقفیت تھی اس لیے اس سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ دفاتر میں چونکہ احبابِ جماعت آتے رہتے ہیں اس لیے ان کو تحریک کرنے کے لیے بیوت الذکر کے بارے میں مختلف قسم کے دلچسپ نقشے اور چارٹ تیار کرکے آویزاں کرتے تاکہ ان کے پڑھنے سے بیوت الذکر کی تعمیر کے لیے چندہ دینے کی تحریک ہوجائے۔ دفتر کے باہر دیوار پر ایک تختہ سیاہ لٹکا رکھا تھا۔ اس پر بیوت الذکر کی اہمیت اور اس کی تعمیر میں حصہ لینے کے بارے میں قرآنی احکام وارشاداتِ نبوی اور خطبات میں سے اہم اقتباسات نہایت خوشخط لکھ دیتے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ اس بابرکت تحریک میں حصہ لیں اور یوں وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے جنت میں مکان تعمیر کروانے کا انتظام کرتے رہتے۔

اخبار الفضل ہمارا قومی آرگن ہے۔ احباب اس میں اپنی تکلیفوں کے ازالے کے لیے دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے اپنی اور اپنے عزیزوں کی خوشیوں کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ کوئی بیمار ہے۔ کوئی مقدمات میں مبتلا ہے۔ کوئی مالی مشکلات میں مبتلا ہے یا کوئی اور مصیبت آن پڑی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی کے بیٹا پیدا ہوا ہے، کسی کو ملازمت ملی ہے، کسی کو ترقی ملی ہے، کسی کی شادی ہوئی ہے۔ احباب اس بارے میں الفضل کو لکھتے ہیں اور ہمارا یہ اخبار خوشی خوشی یہ سب اعلان شائع کرتا ہے تاکہ پڑھنے والے ان کے دکھوں اور سکھوں میں شریک ہوں اور ان سب کے لیے دعا کریں۔ اللہ کا بندہ عبدالحق شاکر روزانہ اخبار الفضل لے کر بیٹھ جاتا اور ان سب کی فہرست تیار کرتا جن کے اس قسم کے اعلان شائع ہوتے۔ خوشیوں والے احباب کو رنگین اور خوشخط حاشیوں والے کاغذ پر مبارکباد کے خطوط لکھتا اور آخر پر درخواست کرتا کہ ان خوشیوں میں بیوت الذکر کی تعمیر کو بھی یاد رکھیں، اس کے لیے بھی چندہ دیں، اللہ اس سے راضی ہوگا اور آپ کی خوشیوں کو دوچند کرے گا۔ اس کے برعکس مصیبت زدگان یا سوگواران کو ہمدردی کے خطوط لکھتے، ان کے دکھوں میں شریک ہوتے اور ساتھ ہی چندہ بیوت الذکر کی تحریک کرتے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے سے مصیبتیں ٹل جایا

کرتی ہیں۔ یوں لوگوں کو تحریک ہوجاتی۔

ربوہ سے باہر رہنے والوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ یہ درویش، جواں ہمت اور سلسلے کا درد رکھنے والا اپنے وقت کا اکثر حصہ دین کی خدمت میں گزارتا۔ دفتر میں تو سب اپنا وقت گزارتے ہی ہیں لیکن دفتر کے بعد شاکر صاحب روزانہ بازار کھلتے ہی اپنی کاپی پنسل لے کر پہنچ جاتے اور دکان دکان پھرتے اور تعمیر بیوت الذکر کے لیے ان کے سامنے دس بیس پیسوں کے لیے جھولی پھیلا دیتے۔ کوئی دس پیسے ڈال دیتا، کوئی بیس، کوئی آٹھ آنے اور کوئی روپیہ۔ یہ لیتے جاتے اور دینے والے کا نام پتا بھی لکھتے جاتے۔ شام کو تھکے ماندے گھر آتے تو باقاعدہ ان کی فہرست بناتے۔ ہر شخص کا علیحدہ کھاتہ کھولا ہوا تھا، اس میں بھی درج کرتے اور صبح ہوتے ہی پوری رقم خزانے میں جمع کروادیتے۔ مہینے کے آخر پر ہر دکاندار کا حساب مکمل کرکے اسے خط کے ذریعے اطلاع دیتے کہ اس ماہ ان کی طرف سے اتنی رقم وصول ہوئی ہے، اللہ ان کو جزا دے، ان کے کاروبار میں برکت دے، ان کی مشکلات دُور فرمائے۔

......بیوت الذکر میں نمازوں کے اوقات کا ایک چارٹ ہوتا ہے......ربوہ کی اکثر بیوت الذکر کے لیے شاکر صاحب نے ہی چارٹ بنا کر مہیا کئے ہیں۔ یہ بھی بیوت الذکر کی ایک رنگ میں بے لوث خدمت ہے۔

دس برس ہوئے تحریک جدید کی طرف سے انہیں پنشن مل گئی لیکن پنشن مل جانے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ شاکر صاحب اب چین سے گھر بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے دوبارہ کام کی درخواست کی، معاوضے کے ساتھ نہیں، بلامعاوضہ اور پنشن لینے کے بعد تادمِ مرگ آنریری خدمت سرانجام دی۔''

سردار عبدالحق شاکر کے ذکرِ خیر کے بعد میں آپ کا تعارف کرارہا ہوں سلیم الجابی سے جو اُن غیرملکی نوجوانوں میں سے ایک تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے قبولِ احمدیت کی توفیق عطا فرمائی اور پھر وہ اپنا گھربار چھوڑ کر زیارتِ مرکز اور دینی تعلیم کے حصول کے لیے ابتدائے ربوہ میں یہاں آکر کئی سال تک مقیم رہے۔ ان نوجوانوں میں محمد افضل ترکی، عبدالشکور گُنزے اور رشید امریکن شامل تھے۔ مجھے اپنی صغرسنی کے سبب ان میں سے کسی سے ملاقات یا تبادلہ خیال کا موقع تو میسر نہ آسکا البتہ میں ان کو ان کے ناموں سے پہچانتا تھا اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ کس مقصدِ عالیہ کے تحت مرکزِ سلسلہ میں تشریف فرما ہیں۔ جہاں تک سلیم الجابی کا تعلق ہے ان کی رہائش تحریک جدید کوارٹرز میں تھی اور میں انہیں اِدھر اُدھر آتے جاتے اکثر دیکھا کرتا تھا لیکن ان کے بارے میں مجھے اس کے علاوہ اور کوئی بات یاد نہیں کہ رشید امریکن کی طرح وہ بھی بیت مبارک میں کبھی کبھی نِدا دیا کرتے تھے۔

موصوف کا ایک انٹرویو جو ثاقب زِیروی نے لیا تھا الفضل ۹ مئی ۱۹۵۲ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس انٹرویو میں سلیم الجابی کے خاندانی پس منظر، ان کے قبولِ احمدیت، ان کی مرکز میں آمد کی وجوہات اور مستقبل کے عزائم کا تفصیلی ذکر ہے لہٰذا اس انٹرویو کو من وعن شاملِ کتاب کیا جارہا ہے:

''آپ سے ملئے۔ آپ ہیں ہمارے نووارد شامی بھائی السیّد سلیم الجابی، دمشق کے مشہور ومعروف الجابی

خاندان کے چشم و چراغ جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول، حضرت ابوبکر کے قبیلہ سے جاملتا ہے۔ جابی کہتے ہیں ٹیکس فراہم کرنے والے کو اور اس...... خاندان کا طرۂ امتیاز اخراجاتِ حرم کے لیے ٹیکس فراہم کرنا ہی ہے۔ گویا یہ وہ خاندان ہے جو صدیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ حرمِ مقدس کی حفاظت کی سعادت حاصل کرتا چلا جارہا ہے......

یہ چھریرے بدن کا ۲۳ سالہ حسین جابی نوجوان اپنی جبین کی نوجوان شکنوں میں ایک بے پناہ عزم اور آنکھوں میں مستحکم ارادوں کی ایک جاذب چمک لیے ہوئے ہے۔ اسے پہلی دفعہ ہی دیکھ کر متکلم یہ اندازہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اک نہ ایک دن اپنے قبیلے کے دوسرے ہونہار فرزندوں کی طرح یہ بھی ملک وملت کی وہ بے بہا خدمات انجام دے گا کہ جابی خاندان اس پر بجا طور پر فخر کا اظہار کر سکے گا۔ اس کا تیکھا ناک، عقابی نگاہیں، سفید جاذب چہرے پر سیاہ چمکدار سبزہ، بات کرتے وقت نگاہوں میں یقین اور وثوق کی جلا، گفتگو میں تأدب اور احترام، القصہ ہر حرکت اس کی فطری نجابت اور سعید الطبعی پر دال ہے۔ انگریزی برائے نام جانتا ہے اور اردو زبان لفظ ''نہیں'' سے آگے نہیں بول سکتا لیکن اس ناآشنائی پر بھی حسنِ اظہار کا یہ عالم کہ جب وہ اس اجنبیت کی وجہ سے آگے نہیں چل سکتا تو نگاہوں میں مخصوص و محبوب مسکراہٹ کچھ اس طرح ابھارتا ہے کہ متکلم اسے دیکھ کر یکسر مایوس نہیں ہوتا۔ باقی رہی عربی اور شستہ عربی وہ تو خیر اس نے ماں کے دودھ میں پی ہے۔

دمشق میں عام مرغوب لباس کی طرح سلیم الجابی بھی کوٹ پتلون ہی پہنتے ہیں۔ میں نے خود جب انہیں پہلی دفعہ چناب ایکسپریس سے ربوہ میں وارد ہوتے دیکھا تو وہ اسی قسم کے مغربی لباس میں لپٹے ہوئے تھے جو ٹائی سے بے نیاز تھا۔ میں نے یوں ہی برسبیلِ تذکرہ اس بے نیازی کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے: مجھے اس سے طبعاً نفرت ہے، شاید اس لیے کہ اس کی ایک مشابہت صلیبی نشان سے بھی ہے اور میری بات کاٹ کر کہنے لگے: ربوہ سے واپس جا کر عمامہ اور شلوار کا مستقل اضافہ اپنے معمول کے لباس میں کروں گا۔ جب سے ربوہ آئے ہیں اکثر شلوار پہنتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کے اوقات کے علاوہ عموماً سر پر ترکی ٹوپی، گلے میں کھلی قمیص اور شلوار۔ بیت مبارک میں نمازِ باجماعت پڑھنے کے عادی ہیں......اور مغرب کے وقت اکثر پہلے آکر ندا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں جون ۱۹۴۹ء میں السیّد محمد زہب نامی ایک شامی احمدی کی...... مساعی کے طفیل احمدیت کے انعام سے نوازا۔ یہی مہینہ ان کے لیے مذہبی منافرت کی بنا پر گھریلو مصائب و تکالیف کے دور کا آغاز تھا لیکن الحمدللہ کہ گھر والوں کی کوئی بے پروائی، سختی اور پہلوتہی آپ کو اپنے مقصدِ وحید سے جدا نہ کر سکی۔ گھر سے نکل جانے کو کہا گیا تو آپ چپکے سے گھر سے نکل گئے۔ جیب خرچ اور دیگر اخراجات روک لیے گئے تو آپ نے اُف تک نہ کی اور اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا حتّٰی کہ ان کا مجاہدہ رنگ لے آیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دو چھوٹی بہنوں کو بھی احمدیت کے نور سے منور کر دیا اور اب خیر سے احمدیت سے مستفیض خاندان کے پانچ بچوں میں سے تین احمدی ہیں۔

آپ کو دینی کتب کے مطالعہ کا شوق پہلے دن ہی سے تھا چنانچہ اوائل ہی سے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر آئمہ عظام کی تصانیف ان کے زیرِ مطالعہ رہیں لیکن وہ ملول تھے کہ اس دور میں یہ نُور مفقود سا کیوں ہے کہ السید محمد زہب نے حضرت مسیح موعود کی تصنیفِ مبارک ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کا عربی ترجمہ آپ کو دیا جس نے آپ کو تعلق باللہ کی صحیح روح سے آشنا کر کے احمدیت پر ایمان لے آنے کی توفیق دی اور وہ اس مبارک سلسلے میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد امیر جماعت ہائے دمشق، السیّد منیر الحصنی نے انہیں حضرت مسیح موعود کی دیگر عربی کتب مطالعہ کے لیے دیں اور...... ماہنامہ اَلْبُشْریٰ کا اہتمام کر دیا جو اُن کے ایمان و یقینِ احمدیت کے استحکام کا باعث بنا۔

سلیم الجابی نے بتایا کہ ان کے والدین احمدیت کے سخت مخالف ہیں۔ انہوں نے اول اول نہ صرف مجھے تنگ کیا بلکہ دو ایک دفعہ تو قتل کی دھمکی تک بھی دی لیکن میں انتہائی خاموشی اور صبر کے ساتھ ان کی سختی برداشت کرتا چلا گیا اور دل ہی دل میں ان کے لیے دعا کرتا رہا کہ میرا خدا انہیں حق سے آشنا کرے حتّٰی کہ ان کا دل نرم ہو گیا۔ ایک دن کا ذکر ہے میں اور میرے والدِ محترم اچانک ایک ہی تنگ راستہ کی مخالف سمتوں سے آئے ہوئے ملاقی ہو گئے۔ راستہ تنگ ہو گیا۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے بڑھ کر حسبِ معمول ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ ان دنوں میں گھر سے نکالا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے گھر ساتھ چلنے کو کہا جس کی میں نے تعمیل کی۔ گھر لے جا کر اوّل انہوں نے مجھ سے بحث شروع کی لیکن جب میرے دلائلِ حقّہ کا جواب بن نہ آسکا تو بالآخر پوچھا: تمہاری خواہش کیا ہے۔ میں نے کہا: میں مرکزِ احمدیت، ربوہ میں جا کر علمِ دین حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور یوں میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو گئی جس میں صرف ان کی نارضامندی حائل تھی اور جس کے متعلق حضرت امیر جماعت، السیّد منیر الحصنی کا ارشاد تھا کہ میں والدین کی اجازت کے بغیر ہرگز نہ جاؤں۔

احمدیت کے متعلق اپنے انشراح کا ذکر کرتے ہوئے السیّد سلیم الجابی محترم نے کہا کہ وہ اب تک پچاس سے زائد رؤیائے صالحہ اس سلسلے میں دیکھ چکے ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کا رُوئے انور دیکھ لینے کے بعد تو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بتایا کہ آپ کا ارادہ ربوہ میں اردو اور انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد حضرت مسیح موعود کی کتب کا ان زبانوں میں ترجمہ کرنے کا ہے۔ ربوہ میں اب بھی آپ فارغ وقت میں حضرت مسیح موعود کی عربی کتب کو اپنے قلم سے لکھنے میں گزارتے ہیں۔ میں نے آپ کے پاس کئی نسخے نہایت خوبصورت اور مجلّد ان کے اپنے لکھے ہوئے دیکھے۔

سلیم الجابی تلاوتِ کلامِ پاک نہایت ہی محبوب انداز میں کرتے ہیں، اس طرح جیسے ہر لَے سوز و جگر سے منجھی ہوئی ہو اور جیسے

قلب کھنچتا آرہا ہو سانس میں لپٹا ہوا

میں نے پہلی دفعہ جب بیت مبارک میں ایک دن مغرب کے وقت ان کی ندا سنی تو آنکھیں نمناک ہو گئیں

اور حضرت مسیح موعود کا وہ پاک الہام کانوں میں گونجنے لگا: یُصَلُّوْنَ عَلَیْكَ اَبْدَالُ الشَّامِ وَ صُلَحَآءَ الْعَرَبِ یعنی عرب کے صلحاء اور شام کے ابدال تجھ پر درود بھیجیں گے۔ اس ملاقات کے دوران میں جب میں نے اس مبارک الہام کا ذکر کیا تو کہنے لگے: وَادْعُوالـلّٰهَ دَائِمًا اَن یَّجْعَلَنِیْ مِنْ اَبْدَالِ الشَّامِ یعنی میں تو ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ میرا خدا مجھے ان ابدال میں سے ایک کرے۔

اس کے بعد دوسری دفعہ انہوں نے مجلس شوریٰ پر تلاوت کر کے اپنے سوز و گداز سے سامعین کو محظوظ کیا اور تیسری دفعہ اس جلسہ میں حضرت مسیح موعود کا الہامی قصیدہ پڑھ کر سامعین پر وجدانی کیفیت طاری کی جو حضرت اماں جان کے مناقب و محامد بیان کرنے کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا۔

پاکستان کے قیام پر شامی عوام کے تاثرات کا ذکر آیا تو سلیم الجابی بولے: شامی عوام اسے مسلمانوں کی عظمت کے دوبارہ عروج کے سلسلے میں ایک نیک فال تصور کرتے ہیں اور پاکستان میں شامی وزیر مختار، السیّد عمر بہاءُ الامیری (جو میرے اچھے کرم فرماؤں میں سے ہیں) دونوں ملکوں کو قریب تر لانے میں بے بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سلیم الجابی کے خیال میں دمشق کے نوجوانوں کی موجودہ ذہنی افراتفری اس سیاسی یلغار کے باعث ہے جو مغربی اقوام نے ایک عرصہ تک شامی تمدن پر روا رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بظاہر مذہب سے برگشتہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی فطرتوں میں سعادت ہے اور جوں ہی ان کے سامنے کوئی چیز بہ دلائل پیش کی جاتی ہے تو وہ اسے بصد انشراح قبول کر لیتے ہیں۔ آپ نے کہا: مجھے یقین ہے کہ احمدیت جلد از جلد ان کے ذہنی کسل کو دور کر کے ان کے قلوب کو یقین و امید کے ساتھ بھر دے گی اور جوں جوں وہاں (دینِ حق) زور پکڑتا جائے گا شامی نوجوانوں میں توحید، بے باکی اور حق گوئی ترقی کرتی چلی جائے گی۔

ملاقات کے دوران میں امام جماعتِ احمدیہ کا ذکرِ خیر آیا تو کہنے لگے: میں نے دمشق میں حضرت کے جتنے فوٹو دیکھے وہ جوانی کے تھے۔ خوابوں میں بھی جتنی دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کی زیارت ہوئی وہ بھی عین جوانی کے عالم میں ہوئی لیکن کراچی آ کر میں نے جو رؤیا دیکھی اس میں حضور قدرے بوڑھے نظر آئے اور پھر جب اگلے دن حیدر آباد سندھ میں میں خدمتِ حضرت اقدس حاضر ہوا تو میں نے حضور کو اپنے اس آخری رؤیا کے مطابق ہی پایا لیکن جوں ہی میری نظر مسلوں کے انبار، حضور کی دیگر جماعتی، تمدنی، مذہبی اور گھریلو مصروفیات پر پڑی مجھے اپنے پہلے رؤیا کی حقیقت سمجھ میں آ گئی کہ پہلے رؤیا میں حضور کی جوان روح دکھائی گئی تھی اور اس آخری میں ظاہری جسم۔

سلیم الجابی نے گفتگو کے دوران جہاز اور ریل گاڑی میں مغربی عوام سے مذہبی مذاکرات کا ذکر بڑے مزے لے لے کر بیان کیا اور پھر یکدم چونک کر جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو کہنے لگے: عام ثقافت و تمدن کے لحاظ سے پاکستانی بھی شامیوں کے مقابلے میں فرنگیت و مغربیت کی بے راہ روی سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں بلکہ میں نے تو دیکھا ہے کہ شامی نوجوانوں میں بڑوں کا احترام، مجالس کے آداب اور طریقِ گفتگو کے انداز

اب بھی پاکستانی نوجوانوں کی نسبت زیادہ احسن شکل میں موجود ہیں۔

مرکزِ احمدیت سے حصولِ علم دین میں فراغت کے بعد میں واپس جا کر کیا کروں گا، یہ پوچھنے پر کہنے لگے: میں اس سوال کا جواب دینے کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور وہ جس حال میں بھی مجھے رکھنا پسند کریں گے رہوں گا اور زندگی کی جو ڈگر وہ میرے لیے تجویز فرمائیں گے اسی پر عمل پیرا ہونے میں نجات گردانوں گا۔“

سلیم الجابی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج بھی حیات ہیں اور ان کا شمار سلسلے کے مخلص خدام میں ہوتا ہے۔ اس دعا کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ انہیں صحت و عافیت والی لمبی فعّال زندگی عطا فرمائے اب ذکر کیا جا رہا ہے مولانا نورالدین منیر کا جن سے میرے تعارف کے کئی حوالے تھے۔ وہ میرے ایک سینئر دوست، ضیاء الدین (جو اپنے دوستوں کے حلقہ میں ”ضیا پدّی“ کے نام سے معروف تھے) کے والد، سکول میں ہمارے ایک استاد، ماسٹر حبیب احمد اور ربوہ کی دو معروف خواتین، استانی امتہ الرشید شوکت اور استانی امتہ المنان قمر کے بھائی تھے۔ وہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی چراغ الدین تھے اور والدہ، سارہ بیگم حضرت میاں جمال الدین سیکھواں یکے از ۳۱۳ رفقا کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد حضرت مصلح موعود کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کر دی۔ وہ صدر انجمن احمدیہ اور تحریک جدید کے دفاتر میں ایک لمبا عرصہ مختلف مناصب پر متعین رہے لیکن زیادہ عرصہ بطور نائب وکیل التبشیر (تصنیف) کے کام کیا۔ اس دوران ملک غلام فرید کے ساتھ تفسیر القرآن انگریزی کے کام کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور قرآن کریم کے مضامین کا انڈیکس تیار کیا جو قرآن کریم کے انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۶۹ء کا حصہ ہے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک کینیا میں بطور مربی اور ایڈیٹر ایسٹ افریقن ٹائمز کام کیا۔ کچھ عرصہ ماہنامہ ”تحریک جدید“ اور "Review of Religions" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انہوں نے تاریخ لجنہ اماء اللہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا نیز احمدیت کی ایک مختصر تاریخ انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ ان کی تین تالیفات ”احکامُ القرآن: سورۃ فاتحہ“ ”احکامُ القرآن: سورۃ بقرہ“ اور ”احکام القرآن: سورۃ آل عمران، النساء اور المائدہ“ شائع ہو چکی ہیں۔

انہوں نے ۲۲ جون ۲۰۰۸ء کو تقریباً ترانوے سال کی عمر میں کراچی میں وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

آیئے اب ذکرِ خیر کریں مولانا محمد سعید انصاری کا جو دس مارچ ۱۹۱۶ء کو تھمبہ غلام نبی تحصیل بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی تعلیم قادیان میں مکمل کی اور قریباً دس سال تک مختلف اداروں میں ملازمت کے بعد ۱۹۴۶ء میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ وقتاً فوقتاً ملایا، سماٹرا، برٹش نارتھ بورنیو، سنگاپور اور ملائشیا میں مربی سلسلہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہیں ایک طویل مدت تک جامعہ احمدیہ میں تدریس اور کم و بیش تین سال تک دارالقضا اور کچھ عرصہ دفاتر تحریک جدید میں بھی خدمت کا موقع ملا۔ انہوں نے متعدد کتب کا انڈونیشن زبان میں

ترجمہ کیا اور تقریباً ۵۷ سالہ خدمت کے بعد ۹ جنوری ۲۰۰۴ء کو ۸۸ سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

وہ بہت دعا گو اور عالمِ باعمل بزرگ تھے۔ انہوں نے نہایت اخلاص، محنت اور لگن کے ساتھ طویل بے لوث خدماتِ سلسلہ کی توفیق پائی۔

بتایا جاتا ہے کہ ان کے والدِ بزرگوار کو خلیفۃ المسیح الاوّل کے ہم پیشہ اور ہم مسلک ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی اور وہ آپ کے تقویٰ اور طبّی مہارت کے قائل اور بڑے مداح تھے۔ اسی بنا پر وہ اکثر قادیان آ کر ان کے درسِ قرآن میں بھی شریک ہوتے حالانکہ اس وقت تک انہوں نے باقاعدہ بیعت نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سعید انصاری کو تعلیم کی غرض سے تعلیم الاسلام ہائی سکول، قادیان میں داخل کیا جہاں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۱۱ء میں بیعت کر کے جماعت میں شامل ہو گئے تاہم ان کے والد نے حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے ابتدائی ایامِ خلافت میں بیعت کی۔

عادتاً ہمدرد انسان تھے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ مولوی فاضل کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے تو حافظ محمد رمضان (جو آنکھوں سے نابینا تھے) ان کے پاس آئے اور اس پریشانی کا اظہار کیا کہ ان کا مولوی فاضل کا امتحان سر پر ہے لیکن انہیں پرچۂ سوالات کا جواب لکھنے والا کوئی نہیں مل رہا۔ سعید انصاری کو ان سے ہمدردی پیدا ہوئی اور انہوں نے حافظ صاحب سے کہا کہ وہ فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا فرما دے گا۔ انہیں صبر کی تلقین کے بعد سعید انصاری نے اپنے والدِ بزرگوار سے حافظ صاحب موصوف کی اس پریشانی کا ذکر کیا تو انہوں نے مشورتاً کہا کہ صرف ایک سال کی قربانی دے کر اگر حافظ صاحب کی مدد کی جا سکتی ہو تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ حافظ صاحب اپنی خداداد ذہانت اور سعید انصاری کی بروقت امداد سے مولوی فاضل میں اعلیٰ نمبروں پر پاس ہو گئے جب کہ سعید انصاری نے مولوی فاضل کا اپنا امتحان برضا و رغبت اگلے سال پر مؤخر کر دیا۔

بتایا جاتا ہے کہ وہ لطیف ادبی ذوق رکھتے تھے۔ میر انجم پرویز موصوف کے بارے میں اپنے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۱۴ فروری ۲۰۰۴ء) میں لکھتے ہیں: شعر و شاعری میں بھی دلچسپی تھی لیکن آپ باقاعدہ شعر نہیں کہتے تھے۔ کبھی کبھی بے ساختہ اپنے جذبات کا اظہار کر لیا کرتے تھے مثلاً جب ایم ٹی اے کی باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوا اور حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کو ہر روز ایم ٹی اے پر دیکھنے کا موقع ملا تو وفورِ محبت سے بے اختیار یہ قطعہ لکھ کر حضور کو ارسال کیا جسے حضور نے بہت پسند فرمایا:

روز سنتا ہوں آپ کی باتیں
روز کرتا ہوں آپ کا دیدار
پھر بھی ملنے کی پیاس باقی ہے
کاش فرقت کی یہ گرے دیوار

سعید انصاری کے محبت بھرے ذکر کے بعد اب ذکرِ خیر سلسلے کے ایک اور مجاہد، چوہدری محمود احمد چیمہ کا جن کی ایک صاحبزادی، طیّبہ سلیمہ جو جامعہ نصرت کی پرنسپل رہ کر حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہیں میری کرمفرماؤں میں سے ہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ، میری کتاب ''قریۂ جاوداں'' ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ جب مجھے اس کتاب کی تصنیف کا خیال آیا اور دل میں جامعہ نصرت کے بارے میں کچھ باتیں شامل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی تو میرا ان سے فون پر رابطہ ہوا۔ بہت اخلاق سے پیش آئیں اور میرے ہر سوال کا جواب تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مجھے جامعہ نصرت کے بارے میں کچھ لکھنا ہے تو مجھے اس کالج کی عمارت ضرور دیکھنی چاہیے۔ انہوں نے مجھے ایک سے زیادہ بار کالج وِزِٹ کرنے کی دعوت دی اور اس کا پروگرام بھی طے ہو گیا لیکن میری طبیعت کی اچانک خرابی کی وجہ سے یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ اس کے جلد ہی بعد وہ ریٹائر ہو گئیں۔

جب مجھے علم ہوا کہ ان کے والدِ بزرگوار کو سلسلے کی طویل خدمت کا موقع ملا ہے تو میں نے ان سے موصوف کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ چھ اگست ۱۹۲۸ء کو چک نمبر ۳۵ جنوبی ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ پیدائشی احمدی اور اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں انہیں حصولِ تعلیم کے لیے قادیان بھجوایا گیا جہاں وہ جامعہ میں داخل ہو گئے۔ وہیں سے انہوں نے مولوی فاضل اور ربوہ آ کر شاہد کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی نے انہیں سیرالیون اور بعد میں جرمنی بھجوا دیا۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث نے انہیں انڈونیشیا بھجوایا جہاں انہیں فروری ۲۰۰۲ء تک یعنی پورے اکیس سال بطور مربی و امیر اور پرنسپل جامعہ احمدیہ، انڈونیشیا کام کرنے کا موقع ملا۔

طیّبہ بتاتی ہیں: انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک بیرونِ پاکستان سلسلے کی خدمت کی توفیق پائی۔ اس تمام عرصہ میں ان کی فیملی پاکستان میں مقیم رہی۔ کئی دفعہ ان کا بیرونِ ملک قیام لگاتار سات سات آٹھ آٹھ برسوں پر محیط ہوتا۔ جو بچہ پرائمری میں چھوڑ کر جاتے واپسی پر وہ کالج یا یونیورسٹی کا طالب علم ہوتا۔ ان کی ازدواجی زندگی کا عرصہ اکتالیس سال پر محیط ہے لیکن آپ نے اپنی اہلیہ کے ساتھ صرف دس سال گزارے۔ جب طویل عرصہ کے بعد پاکستان آنے کا موقع ملتا تو اپنے بچوں میں سے کسی کو بھی نہ پہچان پاتے اور کہا کرتے کہ بچیاں اتنی بڑی ہو گئی ہیں کہ مجھے ان سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

اس زمانے میں رابطے کی آج جیسی سہولتیں میسر نہ تھیں اس لیے مربیانِ سلسلہ کا اپنے خاندانوں کے ساتھ رابطہ صرف بذریعہ خطوط ہی ہو سکتا تھا۔ طیّبہ بتاتی ہیں: ایک دفعہ وہ انڈونیشین وفد کے ہمراہ جلسہ سالانہ پر ربوہ آئے لیکن ان کے آنے کی اطلاع ہمیں نہ تھی۔ میری والدہ انڈونیشین وفد کی خواتین کے استقبال کے لیے گیسٹ ہاؤس گئیں تو اچانک ابا جی کو دیکھ کر ایسا گھبرائیں کہ ان سے ملنے کی بجائے فوراً گھر لوٹ آئیں۔ شدتِ جذبات سے ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ ہمیں صرف اتنا کہہ سکیں کہ تیاری کرو، تمہارے ابا بھی آئے ہوئے ہیں۔ امی نے تن تنہا زندگی کے تمام مسائل کا سامنا کیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور آخر میں ان کی شادیاں بھی ابا جی کی عدم موجودگی

میں ہی ہوئیں۔

۱۹۹۲ء میں ان کی اہلیہ، فاطمہ بیگم کی وفات کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے خطبۂ جمعہ میں فرمایا:

''اس کو وقف کہتے ہیں۔ خاوند نے وقف کیا اور کامل وفا کے ساتھ۔ بیوی نے اپنی...... ساری جوانی دین کے حضور پیش کر دی اور سارے دکھ خود اٹھائے اور خاوند کو بے فکر کر کے دین میں چھوڑ دیا۔''

محمود احمد چیمہ کی وفات پر جو ۱۴ جولائی ۲۰۰۹ء کو ہوئی امیر جماعت احمدیہ، انڈونیشیا نے وکیل التبشیر تحریک جدید انجمن احمدیہ سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ''ہم ممبران جماعتِ احمدیہ انڈونیشیا نہایت افسردہ اور غمگین ہیں کہ ہمارے نہایت پیارے مہربان استاد، مربی اور درویش صفت، دعا گو بزرگ ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنتُ الفردوس میں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مکرم محمود احمد چیمہ صاحب کا نام انڈونیشین جماعت مشکل سے بھلا پائے گی کیونکہ اس قدر نافع الناس وجود نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت انڈونیشیا کی اکتیس برس تک بہت خدمت کی۔ بحیثیت مربی، امیر جماعت اور انچارج مربی کے علاوہ آخر میں جامعہ احمدیہ، انڈونیشیا کے پرنسپل کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ہم ان کی کمی کو شدت سے محسوس کریں گے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کی تمام خدمات قبول فرمائے، ان سے راضی ہو اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔''

ان کی وفات کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے فرمایا:

''چوہدری محمود احمد چیمہ جو ہمارے بڑے پرانے مربی سلسلہ تھے ۱۴ جولائی ۲۰۰۹ء کو وفات پا گئے۔ بڑے نیک، مخلص، فدائی واقفِ زندگی تھے۔ ان کی طبیعت میں بڑی سادگی تھی۔ خلافت سے انتہائی وفا کا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیاں ان کی نسلوں تک جاری رکھے۔''

ملاقات تو دور کی بات ہے میں نے محمود احمد چیمہ کو دیکھا تک نہیں ہے لیکن ان کی طویل خدماتِ سلسلہ اور عظیم الشان قربانیوں کے مدنظر میرے دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا نکلتی ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ علیّین سے نوازے۔

اور اب ذکر میجر (ر) ڈاکٹر شاہنواز خان کا جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع اور فوج میں ملک و قوم کی خدمت کے اعزاز سے نوازا بلکہ ریٹائرمنٹ کے بعد لمبا عرصہ جماعتی خدمات کی توفیق بھی ملتی رہی۔ ان کی وفات پر جو ۱۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو لندن سے کراچی پہنچنے پر اچانک ہوئی محمد احمد جلیل کے ایک مضمون مطبوعہ الفضل ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء سے پتا چلتا ہے کہ انہیں ۱۹۵۹ء میں جماعت کی طرف سے سیرالیون میں میڈیکل مشن پر بھجوایا گیا تھا۔ وہ افریقہ کے کسی ملک میں بطور میڈیکل مشنری بھجوائے جانے والے پہلے ڈاکٹر تھے جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جماعت کو افریقہ کے مختلف ملکوں میں کئی ہسپتال قائم کرنے اور دکھی انسانیت کی بیش قیمت خدمت کے مواقع عطا فرمائے۔

وہ ایک اچھے مضمون نگار تھے چنانچہ تاریخ احمدیت مؤلفہ دوست محمد شاہد (جلد ۲۰) میں ان کا نام ان فاضل

دوستوں میں شامل کیا گیا ہے جنہوں نے ماہنامہ ''انصاراللہ'' کی اشاعت پر ابتدائی چوبیس سالوں میں اپنے رشحاتِ قلم سے اس رسالہ کو مزیّن کیا۔ اسی طرح تاریخ احمدیت جلد ۲۱ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سیرالیون میں مذہبی مکالموں اور مباحثوں میں بھی خوب حصہ لیا کرتے تھے اور جماعت احمدیہ، سیرالیون کی سالانہ کانفرنسوں میں تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ سیرالیون سے واپسی اور انگلستان منتقل ہونے سے پہلے وہ کچھ عرصہ ربوہ میں مقیم رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میرا ان سے تعارف ہوا۔ اگرچہ میری اور ان کی عمر میں بڑا تفاوت تھا لیکن نہ جانے کس طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے چنانچہ وہ جب بھی ملتے، سراپا محبت بن کر۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد جب میں تلاشِ معاش میں الجھ گیا اور موصوف انگلستان منتقل ہو گئے تو یہ رابطہ منقطع ہو گیا۔ اچانک ان کی وفات کی خبر سنی تو میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ بہشتی مقبرے کے قطعہ مبشرین میں دفن ہوئے جہاں سلسلے کے بعض دیگر نامور خدام دفن ہیں جن میں سے بہتوں کے ساتھ میرا ذاتی تعارف بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جب بھی بہشتی مقبرے جانے کا موقع ملے تو میں بالعموم ان کی قبر پر بھی دعا کے لیے رکتا ہوں۔

اور اب کچھ ذکر لیڈی ڈاکٹر نصرت جہاں کا!

لیڈی ڈاکٹر نصرت جہاں جو نامور خادمِ سلسلہ، مولانا عبدالمالک کی صاحبزادی تھیں سلسلے کی ان جانثار خواتین میں سے تھیں جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا بیشتر حصہ فضلِ عمر ہسپتال میں بیمار خواتین کی بے لوث خدمت میں بسر کر دیا۔

اگرچہ میں موصوفہ کے نام اور کام سے تو عرصۂ دراز سے واقف چلا آ رہا تھا تاہم ان سے میرا تعارف کچھ سال پہلے اس وقت ہوا جب میں راولپنڈی میں تعیّنات تھا۔ ایک روز میرے گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف کوئی خاتون بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا تعارف ''ڈاکٹر نصرت جہاں'' کے طور پر کرایا اور بتایا کہ انہوں نے محکمۂ انکم ٹیکس کی بعض ''زیادتیوں'' کے خلاف انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل میں اپیل کر رکھی ہے اور اگر میں اس حوالے سے ان کی کچھ مدد کر سکوں تو وہ اسے میرا احسان سمجھیں گی۔ مجھے اب یہ تو یاد نہیں کہ میری کوشش ان کی اس پریشانی کا مداوا کر سکی یا نہیں البتہ اتنا ضرور علم ہے کہ اس کے بعد وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگیں اور خوشی غمی کے ہر موقع پر مجھے یاد رکھتیں۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے رخصتانے کے موقع پر راقم کو بھی یاد رکھا چنانچہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے اس بچی کو اپنی عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ شاید اسی دور کی بات ہے کہ میری پہلی کتاب ''شوق ہمسفر میرا'' شائع ہوئی۔ میں نے اس کا ایک نسخہ موصوفہ کو بھجوایا تو انہوں نے فون پر میرا شکریہ ادا کیا اور پھر از راہِ مہربانی کتاب پڑھنے کے بعد اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اسی طرح جب میری سب سے بڑی ہمشیرہ، عزیزہ مسرت کی وفات ہوئی تو وہ بطورِ خاص افسوس کے لیے میری جائے قیام پر تشریف لائیں۔

ان کے ساتھ قائم ہونے والا یہ تعلقِ محبت دمِ آخر تک قائم رہا۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر مجھے اپنی اہلیہ

کے بعض طبی مسائل کے لیے ان سے مشورے کی ضرورت پیش آئی تو میں نے اٹھارہ اپریل ۲۰۱۵ء کو انہیں ایک میسیج کیا جو اتفاق سے میرے فون میں ابھی تک محفوظ ہے۔ میں نے انہیں لکھا تھا:

Dear Ms. Dr. Nusrat Jahan Sahiba!

Assalam-o-Alaikum

My wife, Rashda has some problems for which biopsy has been recommended. Tomorrow I have to see Dr. Noori at about 11:00 AM. If you can also give an appointmnet to her, kindly let me know so that I should also bring her along, if needed.

Regards

Daud Tahir

انہوں نے بکمال مہربانی میری سہولت کے مطابق میری اہلیہ کو دیکھ لیا۔ معمولی سرجری کی ضرورت تھی جو انہوں نے مکمل کر کے ہمیں اسی روز فارغ کر دیا چنانچہ ان کی عنایت و محبت کے لیے شکریئے کا میسیج کرتے ہوئے لکھا:

ڈیئر ڈاکٹر صاحبہ!

السّلام علیکم

میں آپ کی اس محبت اور مہربانی کا شکریہ ادا کرنا بھی چاہوں تو ساری زندگی ادا نہیں کرسکتا۔ خدا آپ کو اس نیکی کا اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔

ریگارڈز

داؤد طاہر

اس سے اگلے روز طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں میری اینجیوگرافی ہوئی۔ یہ معلوم کر کے کہ خدا کے فضل سے میری ہر چیز نارمل ہے تو انہوں نے نہ صرف مبارکباد کا پیغام بھیجا بلکہ کچھ دیر بعد خود چل کر میرے پاس آئیں اور میرے لیے تقویتِ قلب کا باعث بنیں۔ میں جب کبھی ان کی عنایات کا شکریہ ادا کرتا تو وہ کہا کرتی تھیں: کیسی عنایت اور کیسی مہربانی! یہ تو سب آپ کا حق ہے۔ ان کا ۸ جون ۲۰۱۵ء کا یہ میسیج میرے لیے باعثِ صد اعزاز ہے:

I am humbled with your expression of gratitude. You had helped me once by going out of your way.

It is my pleasure that Allah enabled me to do an iota for you. Besides, you have so many factors to be eligible for a VIP courtesy. Please remember me in your special prayers.

Dr. N.J.

موصوفہ ایک پیچیدہ بیماری کا شکار ہو کر اچانک اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ خدا تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ اب بہشتی مقبرے میں آسودۂ خاک ہیں جہاں میری طرح ان کے بہت سے چاہنے والے ان کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔

اب تک میں نے ان واقفینِ زندگی میں سے بعض کا ذکر کیا ہے جنہیں اپنی زندگی کے بہت سے ماہ و سال اعلائے کلمہ حق کے لیے ممالکِ غیر میں گزارنے یا جماعت کے ذیلی اداروں میں خدمت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اب میں جن دوستوں کا ذکر کر رہا ہوں ان کے زمرۂ واقفین میں شامل ہونے کے بارے میں مجھے حتمی معلومات حاصل نہیں ہیں البتہ وہ وقف کی روح سے سرشار تھے اور ان کی ساری زندگی خدمتِ سلسلہ میں ہی گزری۔ انہوں نے جس فدائیانہ رنگ میں جماعت کی خدمت کی قابلِ تحسین ہے۔ ان میں سے اکثر دوست وفات پا چکے ہیں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اور جو زندہ ہیں خدا انہیں صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔

قاضی رشید الدین اور سیّد منعم الحسن تحریک جدید کے کارکنان میں سے تھے۔ قاضی رشید الدین تحریک جدید کوارٹرز میں میرے ماموں، مرزا محمد یعقوب کے نیکسٹ ڈور نیبر تھے۔ ان کا ایک بیٹا، صفی الدین سکول میں میرا ہم جماعت بھی تھا اس لیے رشید الدین مجھے بہت اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سیّد منعم الحسن جو حافظ سیّد نذیر حسین کے صاحبزادے اور فی الاصل جنبھانہ ضلع مظفر نگر، بھارت کے رہنے والے تھے قاضی رشید الدین کے پڑوسی تھے اور ان سے میرے تعارف کی وجہ بھی ماموں کے ہاں میری آمد و رفت ہی تھی۔ اتفاق سے ان کا ایک بیٹا، ظفر بھی میرا ہم جماعت رہا۔

میں ۱۹۷۱ء میں اپنے ایک کزن ملک مسعود احمد جو اُن دنوں شیزان جوس فیکٹری میں کام کر رہے تھے سے ملنے گیا تو میں نے قاضی رشید الدین کو فیکٹری کے مین گیٹ پر ڈیوٹی پر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ تحریک جدید کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ ایک بار قطعہ شہدا میں اچانک سیّد منعم الحسن کی قبر نظر آ گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ظفر نے ان کے بارے میں یہ عجیب بات بتائی کہ ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات ایک ہی ہے یعنی وہ ۱۹ نومبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے اور انہوں نے اکاسی سال کی عمر میں ۱۹ نومبر ۱۹۸۹ء کو وفات پائی۔

محمد اسماعیل وِرک جو مربی سلسلہ، محمد ابراہیم خلیل کے سب سے بڑے صاحبزادے؛ چوہدری غلام مرتضےٰ، وکیل القانون کے بھانجے اور مبارک مصلح الدین، وکیل التعلیم کے پھوپھی زاد بھائی تھے دفتر تحریک جدید میں مددگار کارکن ہوا کرتے تھے۔ بہت سادہ طبیعت کے مالک لیکن انتہائی مخلص و ملنسار تھے۔ انہیں میرے ننہیال اور اپنے ننہیال کے مراسمِ خصوصی کا علم تھا لہٰذا وہ راقم سے بے انتہا محبت سے پیش آتے۔ میری ان سے جب ملاقات ہوتی وہ میرا اور میری تمام بہنوں کا نام لے کر حال پوچھتے اور ہم سب کو اپنی مخلصانہ دعاؤں سے نوازتے۔

۱۹۸۷ء میں جب امی کا انتقال ہوا تو وہ افسوس کے لیے میری جائے قیام پر تشریف لائے، ان کی

نمازِ جنازہ میں شامل ہوئے اور تدفین تک بہشتی مقبرے میں موجود رہے۔

میری ان سے علیک سلیک تو رہتی تھی تاہم مجھے ان کے کچھ حالات اور بہت سی ذاتی خوبیوں کا علم ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی، محمد زکریا وِرک مقیم کینیڈا کے لکھے ہوئے ایک مضمون مطبوعہ الفضل (۷ جون ۲۰۰۳ء) سے ہوا۔ وہ کھاریاں سے فرقان فورس میں بطور رضا کار شامل ہوئے تھے اور محاذِ کشمیر پر حکومتی ہدایات اور جماعتی نظم وضبط کے تحت فوجی خدمات بجالاتے رہے؛ وہ کبڈّی کے ایک اچھے کھلاڑی تھے اور ابتدائے ربوہ میں لگّھے کے ساتھ اس کھیل میں حصہ لیا کرتے تھے؛ وہ سالہا سال تک بیرونی ممالک میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے والے مربیان کے اہلِ خانہ مقیم تحریک جدید کوارٹرز کو سودا سلف لاکر دیتے رہے اور لمبا عرصہ بیتِ محمود کی خدمت کرتے رہے۔ جانے شعر کہتے تھے یا نہیں البتہ انہیں تخلّص بدلنے کا شوق تھا چنانچہ وہ اپنے نام کے ساتھ بعض دفعہ صوفی لکھنا شروع کر دیتے اور کبھی تبسّم کہلانے کو ترجیح دیتے۔ ایک دور میں انہوں نے اپنے لیے ساقی کا تخلّص بھی پسند کیا تاہم آخری عمر میں وہ وِرک کہلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔

ان کے مراسمِ بے تکلّفانہ تحریک جدید کے جملہ وکلاء سے تھے اور وہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے خاندانی حالات سے اپنے ان چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی باخبر رکھیں جو اپنی صغرسنی میں والدہ سے محرومی کے باعث نہ جان پائے تھے۔ زکریا وِرک کے الفاظ میں: ''ایک روز مجھے وہ دفاتر تحریک جدید میں لے گئے اور تمام اعلیٰ افسران سے میری ملاقات کروائی۔ بہشتی مقبرے بھی میرے ساتھ وہ گئے اور قبروں کی نشاندہی کرتے رہے۔''

ایک اندازے کے مطابق انہوں نے اُنھتّر سال کی عمر میں چھ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو وفات پائی۔ خوش قسمت تھے کہ بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

تحریک جدید انجمنِ احمدیہ کے ایک اور مددگار کارکن جنہیں میں نے ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا خوشی محمد تھے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ وہ اپنی ملازمت کے آخری حصہ میں کس وکالت میں کام کرتے تھے لیکن میں جب بھی اپنے ماموں زاد بھائی، مرزا محمد اسماعیل سے ملنے کے لیے دفتر آڈیٹر جاتا تو کہیں نہ کہیں اُن سے ضرور ملاقات ہو جاتی۔ وہ جس انداز میں مزاج پرسی کرتے اس سے طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔

اُن کے صاحبزادے، عزیز الرحمٰن خالد، مربی سلسلہ کے بیان کے مطابق موصوف ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہ ہوشیار پور میں رہائش پذیر تھے۔ تقسیم کے بعد اُن کی اہلیہ بچوں کو لے کر اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ ایک فوجی ٹرک کے ذریعے لاہور آ گئیں لیکن خوشی محمد کسی وجہ سے وہیں رہ گئے۔ عزیز الرحمٰن خالد کے الفاظ میں ''ہمارے وہاں سے چلے آنے کے بعد سکھوں نے ہمارے مکان پر بلوہ کر کے والد صاحب کو پکڑ لیا اور ان کے سر اور بازوؤں پر کاری زخم لگائے۔ ان کے ایک سکھ دوست کو پتا چلا تو وہ ان کی مدد کو آیا اور بلوائیوں سے چھڑوا کر ہسپتال لے جا کر مرہم پٹی کرائی اور پھر کسی فوجی ٹرک کے ذریعے لاہور بھجوا دیا۔ یہاں والدہ صاحبہ خود ان کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔ ربوہ کی آبادکاری شروع ہوئی تو وہ یہاں آ گئے۔ انہیں دفتر تحریک جدید کا کارکن ہونے کے ناتے ایک خیمے میں رہائش مل گئی۔ تقریباً چھ ماہ بعد بقیہ فیملی بھی ربوہ شفٹ ہو گئی۔

عزیز الرحمٰن کی روایت کے مطابق ان کے والدِ بزرگوار نے دفتر میں خدمت کے دوران دینی رنگ میں حسبِ توفیق خاصی ترقی کی۔ قرآنِ مجید کے بہت سے حصے اور آخری پارے کی متعدّد سورتیں زبانی یاد کر لیں۔ تہجد کے وقت بلند آواز سے ان کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ انہیں حضرت مسیح موعود کا عربی قصیدہ

یَا عَیْنَ فَیْضِ اللّٰہِ وَالْعِرْفَان

بھی مکمل یاد تھا اور دفتر اور بیتُ الذّکر آتے جاتے اسے دہرایا کرتے تھے۔

وہ اپنی والدہ کی یہ روایت فخر سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوار میں سلسلے کی خدمت کا جذبہ اس وقت سے بیدار تھا جب وہ کوئٹہ میں ایک بیکری پر کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے زلزلہ کے بعد وہ واپس ہوشیار پور آ گئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اگر انہیں دین کی خدمت کی توفیق مل جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کام میں مگن ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کو لاہور اور بعد میں ربوہ میں تحریک جدید کے تحت خدمت کی توفیق عطا کر کے پورا کر دیا۔''

خوشی محمد مختصر سی علالت کے بعد ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء کو وفات پا گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔ الفضل (۲۸ مئی ۱۹۶۸ء) نے ان کی وفات کی خبر شائع کرتے ہوئے لکھا کہ ''مرحوم بہت نیک، دعا گو اور منکسر المزاج تھے...... طبیعت میں سادگی اور خاکساری کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ اپنے دفتری فرائض بڑی محنت سے ادا کرتے تھے۔ آپ نے قریباً بیس سال تک تحریک جدید میں کام کیا۔'' مرحوم موصی تھے لہٰذا بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔

موصوف کے بڑے بیٹے حبیب الرحمٰن (جو دفتر آبادی تحریک جدید میں کارکن تھے) سے ہماری یاد اللہ تھی لیکن نہ جانے کب چپکے سے اگلے جہان سدھار گئے۔ جیسا کہ پہلے اشارۃً ذکر ہو چکا ہے، ان کے دوسرے بیٹے، عزیز الرحمٰن بھی راقم کے بہی خواہوں میں ہیں۔

ان کی وفات پر امین اللہ سالک نے کیا خوب کہا تھا:

چل بسا آج وہ اِک خادمِ شاہِ لولاک
غمزدہ دل ہے تو مُضطر ہیں یہ فہم و ادراک
تجھ کو ملحوظ رہی خاطرِ احبابِ کرام
صبح گاہی وہ ترا شوق سے پُرجذب سلام
تجھ کو تحریک کے دفتر میں وہ ترتیب کا شوق
اپنے احباب کی آمد پہ وہ ترحیب کا شوق
اپنے افسر کی ہر آواز پہ لبیک کہا
جو بھی کرنے کو ملا کام بصد شوق کیا
تُو بجالایا محبت کے پُرانے آداب

تیرے خوں سے بھی ہوا مزرعِ عالم شاداب
خالقِ ہر دو جہاں تجھ کو مسرت بخشے
مالکِ کون و مکاں تجھ کو وہ جنت بخشے

ربوہ کے قدیم باسیوں کو یاد ہوگا کہ ایک فربہ سا شخص اپنے بائیکل پر ادھر سے اُدھر آتا جاتا بکثرت نظر آتا تھا۔ وہ ہر راہ چلتے کو سلام کرتا، مسکرا کر نظروں ہی نظروں میں اس کا حال پوچھتا اور کبھی کبھار رُک کر مزاج پُرسی بھی کر لیا کرتا تھا۔ ان کا نام بشیر احمد تھا۔ وہ یوں تو صدر انجمن احمدیہ کے ملازم تھے لیکن حضرت مرزا بشیر احمد کے گھر رہائش پذیر تھے اور ہمہ وقت ان کی خدمت بجا لاتے۔ الفضل ۲۸ مارچ ۱۹۵۶ء میں چھپے ہوئے ان کے اپنے ایک نوٹ کے مطابق وہ ۱۹۴۴ء سے خاندان حضرت مسیح موعود کی خدمت پر مامور تھے اور حضرت اماں جان نے اپنی وفات کے بعد ان کے خواب میں آ کر انہیں حضرت مرزا بشیر احمد کی خدمت کرتے رہنے کی تلقین کی تھی۔ میاں صاحب کو بھی اس بات کا بہت لحاظ تھا کہ بشیر ان کے پرانے خدمت گزار ہیں لہٰذا وہ ان کا ممکن حد تک خیال رکھتے۔ ۲۵ جون ۱۹۶۱ء کو ان کا نکاح ہوا تو آپ نے اپنے قلم سے اس نکاح کی اطلاع الفضل کو لکھ کر بھجوائی جو ۲۸ جون ۱۹۶۱ء کے اخبار میں ان الفاظ میں شائع ہوئی:

"عزیز بشیر احمد ولد لقا محمد مرحوم جو دفتر نظارتِ علیا میں کارکن ہے اور قریباً سترہ اٹھارہ سال سے بڑی وفاداری کے ساتھ ہمارے گھر پر رہتا ہے کل بعد نمازِ مغرب بیت مبارک ربوہ میں محترم سیّد ولی اللہ شاہ نے اس کے نکاح کا نصرت بیگم بنت حکیم فضل غفور صاحب سکنہ آنبہ کالیا ضلع شیخوپورہ کے ساتھ پانچ سو روپے مہر پر اعلان فرمایا ہے۔ دوست دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس نکاح کو فریقین کے لیے موجبِ برکت کرے اور ان دونوں کو راحت و برکت کی زندگی عطا فرمائے۔ آمین"

وہ حضرت مرزا بشیر احمد کے ایک نواسے کی دعوتِ ولیمہ میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے کہ ۲۴ فروری ۱۹۸۹ء کی رات ایک بجے حرکتِ قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔ وہ موصی تھے چنانچہ بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ الفضل (۲۶ فروری ۱۹۸۹ء) نے ان کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: "انہوں نے تمام عمر سلسلے اور خاندانِ مبارک حضرت بانی سلسلہ کی خدمت میں گزاری۔"

"قریۂ جاوداں" میں یہ ذکر موجود ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا خلافت لائبریری میں دو مددگار کارکن ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک راجوری سے تعلق رکھنے والے محمد عبداللہ تھے تو دوسرے سلیم اللہ۔ یہی دونوں لائبریری کھولتے، دفاتر کی جھاڑ پونچھ کرتے، کتابوں کی ضروری صفائی کرتے اور جاری شدہ کتابیں واپس آنے پر انہیں الماریوں میں اپنی جگہ پر رکھتے۔ یوں تو یہ ذمہ داری بھی بہت بڑی تھی لیکن یہ دونوں صاحبان حسبِ ضرورت مولوی محمد صدیق، انچارج خلافت لائبریری؛ راجہ محمد یعقوب؛ اباجی؛ مولوی سلطان احمد پیر کوٹی اور مولانا دوست محمد شاہد کے ذاتی کام کاج بھی کر دیا کرتے تھے۔ اباجی دفتری عملے سے ذاتی خدمت لینے کے خلاف تھے البتہ بہ امرِ مجبوری کبھی کبھار ان کی خدمات سودا سلف لانے یا گندم پسوانے کے لیے استعمال کر لیتے اور اس

حوالے سے ان دونوں کا ہمارے گھر میں وقتاً فوقتاً آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے علم اور تجربے کے مطابق یہ دونوں صاحبان حد درجہ فرض شناس اور شریف النفس تھے اور جہاں تک میری یادداشت ساتھ دیتی ہے میں نے اباجی کی زبان سے بھی ان کے طرزِ عمل کے بارے میں کبھی کوئی شکایت نہیں سنی۔ اب سلیم اللہ وفات پا چکے ہیں البتہ محمد عبداللہ حیات ہیں۔ ان دونوں کا ایک ایک بیٹا آج کل خلافت لائبریری میں اپنے اپنے والد کا حق جانشینی ادا کر رہا ہے۔

آخر میں کچھ ذکر شادی کا!

یوں تو تعلیم الاسلام کالج میں بہت سے مددگار کارکن ہوا کرتے تھے اور فرائض کی ادائیگی یا اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ اپنی محبت و اخلاص میں کوئی کسی سے پیچھے نہ تھا لیکن "شادی" تو گویا منفرد خصوصیات کا حامل تھا اور ہر اک کی آنکھ کا تارا۔ نہ جانے کب سے کالج میں ملازم تھا اور اس نے طلبہ کے کتنے ہی بیچز آتے جاتے دیکھے تھے لہٰذا وہ ان کے ساتھ اپنے بچوں کا سا سلوک کرتا اور ترنگ میں ہوتا تو ڈانٹ ڈپٹ سے بھی گریز نہ کرتا لیکن تھا سب کا خدمت گزار۔ اس کے متعلق ایک سے زیادہ لوگوں نے لکھا ہے لیکن اس تحریر میں تو پرویز پروازی نے گویا دریا کوزے میں بند کر دکھایا ہے۔ آپ پڑھیے یوں محسوس ہوگا جیتا جاگتا شادی آپ کے سامنے گھوم پھر رہا ہے حالانکہ اس کی وفات پر نہ جانے کتنے سال بیت چکے ہیں:

"کالج کا مددگار کارکن، بابا شادی تو اپنی ذات میں انجمن تھا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

اتنا مخلص، اتنا مستعد، اتنا جاں نثار، دُھن کا پورا، کام کا پکّا۔ آدمی کیا تھا مولوی اسماعیل میرٹھی کی پن چکّی تھی:

نہر پر چل رہی ہے پن چکّی
دُھن کی پوری ہے، کام کی پکّی

شادی اور کالج لازم و ملزوم تھے۔ دونوں ایک دوسرے میں یوں مدغم تھے کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شادی دو چار دن کے لیے بھی کہیں کالج سے باہر چلا جاتا تو کالج کی فضا سُونی سُونی لگتی تھی۔ وہ سٹاف اور طلبہ میں یکساں مقبول تھا۔ خدا جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا ہم نے کیا کسی نے بھی اسے تھکتے نہیں دیکھا۔ دن رات مستعد، دن میں کالج کی مددگار کارکنی، رات میں کالج کی چوکیداری۔ اس کی چوکیداری کا یہ عالم تھا کہ ہم نے رات کے اوقات میں بھی اسے کم ہی سوتے دیکھا یا غافل پایا۔ وہ اساتذہ اور طلبہ کو ان کی چال سے پہچان لیا کرتا تھا اور اس کی یہ پہچان کبھی غلط نہیں ہوئی۔ ہم دو سال کالج کے ہوسٹل میں بھی رہے۔ رات کو دیر سے ہوسٹل واپس آتے تو شادی کو چوکنا پاتے۔ وہ بغیر دیکھے اپنے لحاف کے اندر سے ہی ہمیں نام لے کر پکارتا اور کہتا کہاں سے آ رہے ہو؟ طلبہ میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پچھلے برس جرمنی میں کالج کے ایک پرانے طالب علم کے ہاں شادی کا ذکر آ گیا۔ وہ اٹھا، اندر گیا اور اپنے البم میں سے شادی کے دو فوٹو نکال لایا کہ یہ دیکھیں شادی کی تصویر۔ کون کہتا ہے وہ مر گیا، وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی دوستی کی بہت سی وجوہات میں

سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے شادی کے ہاتھوں میں کھیل کر کالج کی تعلیم حاصل کی تھی اور پھر اس کے سامنے ہی کالج کے سٹاف پر ہماری تعیناتی ہوئی تھی۔ شادی اس تعلق پر بہت خوش تھا۔ ایک دو بار بعض لوگوں نے کہا بھی کہ یہ تم کیا اس کے لیے ہر وقت چائے ڈھوتے رہتے ہو؟ کہنے لگا، یہ میری آنکھوں کے سامنے اسی کالج میں پڑھا اور اسی کالج میں پروفیسر بنا ہے اس لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ شادی کی محبت تھی۔ ہم بھی حتی الوسع اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے مگر خدا شاہد ہے کہ شادی نے ہماری خدمت کے عوض کبھی کسی معاوضہ کی توقع نہیں رکھی۔ اتنا بے لوث اور اتنا بے نفس آدمی ہم نے نہیں دیکھا......

شادی کا کالج میں رعب داب بھی بہت تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سب لوگ اس کے خلوص کے گرویدہ تھے۔ ایک بار حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث خلافت پر فائز ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل کئی دنوں بلکہ مہینوں تک کالج میں تشریف نہ لا سکے کیونکہ ان کے کندھوں پر انجمن اور جماعت کے دیگر اداروں کا بوجھ تھا۔ ایک روز ذرا سی فرصت ملی تو کالج تشریف لائے۔ گاڑی کاریڈور میں کھڑی کی اور دفتر میں جانے کے لیے بڑھے۔ شادی نے دیکھا تو دور سے ہی آوازہ لگایا: واہ جی واہ! اج فوجاں کدھر بھل پیاں نیں؟ یعنی آپ آج بھول کر کدھر نکل آئے ہیں؟ یہ شادی ہی کا جگرا تھا۔ حضرت صاحب نے مسکرا کر شادی کی طرف دیکھا اور دفتر میں چلے گئے۔ خلافت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد حضرت صاحب کالج تشریف لائے۔ سارا سٹاف استقبال کے لیے ایستادہ تھا۔ شادی بھی ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ جب سٹاف سے مصافحہ کر چکے تو شادی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا: حجور صاحب جی! ایک عرض کروں؟ حضرت صاحب نے فرمایا: ہاں شادی کہو۔ کہنے لگا: بس اتنی ہی عرض ہے کہ مر جاؤں تو یہیں کہیں کالج ہی میں توپ تاپ دینا۔ باہر نہ پھینکنا۔ شادی نے اتنے خلوص سے یہ بات کہی کہ سب کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کالج قومیایا گیا۔ شادی نے خدمت جاری رکھی مگر ریٹائرمنٹ کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اپنے کسی عزیز کو ملنے کے لیے سرگودھا کے قریب کسی گاؤں میں گیا۔ وہاں موت نے آلیا۔ کسی نے اس کی خبر بھی کالج والوں کو نہیں دی۔ شادی بے چارہ اجنبی زمین میں پیوندِ خاک ہو گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ شادی کالج میں مرتا تو کالج سے باہر نہ دفنایا جاتا۔ مگر شادی مرا کہاں ہے؟ کالج کے اساتذہ اور طالبعلموں کے دلوں میں زندہ ہے۔''

''قریۂ جاوداں'' اور ''شہرِ خوباں'' میں اب تک مجموعی طور پر پانچ جماعتی تعلیمی اداروں یعنی نصرت گرلز ہائی سکول، جامعہ نصرت، تعلیم الاسلام ہائی سکول، تعلیم الاسلام کالج اور جامعہ احمدیہ کا تفصیلی ذکر آچکا ہے لیکن کسی وجہ سے فضلِ عمر کے جی سکول کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے۔ کتاب زیرِ نظر کے موضوع کی مناسبت سے ذیل کے صفحات میں اس سکول اور اس میں پڑھنے والے بچوں اور انہیں پڑھانے والی معلمات میں سے کچھ کا تفصیلی ذکر کیا جا رہا ہے۔

فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول

یہ معابد، یہ دفاتر، یہ سکول اور کالج: الغرض ربوہ ہمارا کوئی دیکھے تو سہی

یوں تو فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول جسے ابتداءً کے جی سکول کے مختصر نام سے یاد کیا جاتا تھا بہت سالوں سے چل رہا تھا لیکن سچ پوچھیں تو میرا اس سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا تاہم جب میری سب سے بڑی بھانجی، بشریٰ ثوبیہ کے سکول میں داخلے کا وقت آیا تو اس کے والدین اٹلی کی ایمپری جیلو کمپنی کے کیمپ واقع بلند ہل ضلع سرگودھا میں مقیم تھے اور بشریٰ اپنے ننھیال میں یعنی ہمارے ہاں ہوا کرتی تھی۔ باہمی مشورے سے ۱۹۶۸ء میں اسے کے جی سکول کی دوسری جماعت میں داخل کروادیا گیا۔ اگرچہ داخلے کی ساری کارروائی تو امی کے ہاتھوں انجام پائی تاہم داخلے کے بعد بشریٰ کو وقت پر سکول پہنچانے اور چھٹی کے وقت سکول سے گھر لانے کی ذمہ داری میری تھی۔ میرے پاس ان دنوں بائیسکل ہوا کرتی تھی چنانچہ میں اسے بائیسکل پر بٹھاتا اور سکول کھلنے سے پہلے اسے وہاں پہنچا آتا۔ اسی طرح چھٹی سے پہلے میں سکول کے گیٹ پر موجود ہوتا تاکہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ مجھے اب یاد نہیں کہ یہ سلسلہ کتنی دیر تک چلا تاہم جب تک میں ملازمت کے سلسلے میں ربوہ سے باہر نہیں چلا گیا یہ ڈیوٹی میں ہی ادا کرتا رہا۔

اس زمانے میں کے جی سکول کا کیا نقشہ تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے بشریٰ بتایا کرتی ہیں: سکول کے لیے سیّدہ چھوٹی آپا اور سیّدہ امِ وسیم کے مکانات کی درمیانی دیوار منہدم کر کے ایک مربوط عمارت کی شکل دے دی گئی تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی کچا صحن تھا جس کے بعد ایک بڑا چبوترہ اور اس کے سامنے کچھ کمرے تھے۔ ان کمروں میں سے ایک سکول کی ہیڈ مسٹریس کے دفتر کے طور پر مستعمل تھا اور باقیوں میں کلاسیں ہوتی تھیں۔ ان کمروں کے پیچھے پھر صحن تھا جس میں صبح کے وقت اسمبلی ہوتی۔ اس صحن کے ورے پانچ یا چھ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جن میں پرائمری کلاسز ہوتی تھیں۔ ہمیں مس زاہدہ ہاشمی حساب، امۃ الرشید شوکت دینیات اور فریدہ حمید سائنس پڑھاتی تھیں۔ سکول میں آکسفورڈ سلیبس، ریڈیئنٹ وے پڑھایا جاتا تھا۔ ساتھ کے ساتھ پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کا نصاب بھی رائج تھا۔ ہماری کلاس ٹیچر صالحہ طلعت تھیں جو جوانی ہی میں کینسر کے عارضہ سے وفات پا گئی تھیں۔ میں نے اس سکول میں صرف دو سال پڑھا جس کے بعد میں نصرت گرلز ہائی سکول میں چلی گئی تھی۔

یہ تھا کے جی سکول کے ساتھ میرا پہلا تعارف۔ اس کے بعد کچھ عرصہ بعد بشریٰ کے چھوٹے بھائی، زبیر احمد خالد بھی اس سکول کی پہلی جماعت میں داخل ہو گئے لیکن اس وقت تک میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں ربوہ سے باہر جا چکا تھا لہٰذا ان کے ذریعے اس سکول کے بارے میں مجھے حاصل ہونے والی معلومات نہ ہونے

کے برابر ہیں۔ ہاں! جو کچھ وقتاً فوقتاً معلوم ہوتا رہا اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ پہلی جماعت میں ان کی کلاس انچارج بشریٰ پروین تھیں جن کے بھائی رحمت بازار، ربوہ میں فینسی جنرل سٹور کے نام سے ایک دکان کیا کرتے تھے اور جو شادی کے بعد سکول کی ملازمت چھوڑ کر انگلستان منتقل ہو چکی ہیں۔ زبیر کو بشریٰ پروین کے علاوہ صالحہ طلعت اور فریدہ حمید سے بھی پڑھنے کا موقع ملا اور ان کے کلاس فیلوز میں سے عبدالسلام اختر کے ایک صاحبزادے المعروف جامی؛ قاضی منظور احمد (جو اُن دنوں محلّہ دارالبرکات میں مقیم تھے لیکن بعد میں انگلستان جا کر اب وفات پا چکے ہیں) کے صاحبزادے، منیر احمد جاوید؛ راجہ نذیر احمد ظفر آف کیوٗر ریٹو میڈیسن کمپنی، ربوہ کے صاحبزادے، راجہ رشید احمد؛ ڈاکٹر لطیف احمد قریشی کے صاحبزادے، محمود احمد اور چوہدری نذیر احمد، صدر محلّہ دارالصدر جنوبی کی صاحبزادی، نبیلہ شامل تھیں۔ ان میں سے جامی آج کل فیصل آباد کی کسی پرائیویٹ کمپنی میں کام کر رہے ہیں؛ راجہ رشید احمد اپنے والدِ بزرگوار کے چھوڑے ہوئے کاروبار کی نگرانی کر رہے ہیں، منیر احمد جاوید کئی سال پہلے وفات پا چکے ہیں اور محمود ڈاکٹر بن چکے ہیں۔

اگرچہ زبیر پانچویں جماعت تک اس سکول میں پڑھتے رہے ہیں تاہم اب انہیں اس دور کی کوئی خاص بات یاد نہیں ماسوا اس کے کہ مِس نے انہیں کلاس مانیٹر مقرر کر رکھا تھا اور جب کبھی گھنٹی بجانے والی مائی ادھر ادھر ہوتی تو وہ اپنی مِس کے حکم پر جا کر گھنٹی بجایا کرتے تھے اور یہ کہ سکول میں بدنی سزا کا رواج نہ تھا اگرچہ طلبہ کی ڈانٹ ڈپٹ عام تھی۔

آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس سکول کے بارے میں میری معلومات کبھی سطحی حد سے آگے نہ بڑھ سکی تھیں تاہم وہاں کی بعض ٹیچرز کو میں کسی نہ کسی حوالے سے پہچانتا تھا۔ الفضل کا مطالعہ میں بچپن سے کرتا آ رہا ہوں چنانچہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۷ء کے الفضل میں یہ اعلان میری نظر سے گزر چکا تھا کہ ''ربوہ میں کے جی سکول لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے زیرِ اہتمام نومبر ۱۹۵۷ء میں کھل رہا ہے۔ جن بہنوں نے اپنے بچوں کو داخل کرانا ہے وہ فارم داخلہ وغیرہ دفتر لجنہ اماء اللہ سے حاصل فرماویں۔'' تاہم ۱۱ دسمبر ۱۹۵۷ء کے الفضل سے معلوم ہوا کہ اس سکول میں باقاعدہ کلاسز ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء بروز پیر سے شروع ہوئیں اور داخلہ لینے والے بچوں کو کتابیں کاپیاں سکول سے فراہم کی جاتی تھیں۔

یہ تو تھیں کے جی سکول کے بارے میں کچھ عمومی باتیں۔ جہاں تک اس کی مصدّقہ تاریخ کا تعلق ہے ''تاریخ لجنہ اماء اللہ'' (جلد دوم مطبوعہ ۱۹۷۲ء) میں اس سکول کے قیام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے مذکور ہے کہ ''لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے تعمیری کاموں میں سے ایک اہم کام...... ۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول کا اجرا ہے۔ ربوہ میں لڑکوں اور لڑکیوں کے سکول موجود تھے تاہم کوئی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں صحت مندانہ ماحول میں چھوٹے...... بچوں کا تعلیم کے ساتھ ساتھ صفائی اور تربیت کا خاص خیال رکھا جا سکے۔ اس کے علاوہ ایک غرض سکول کے قیام کی یہ بھی تھی کہ مبلّغینِ سلسلہ کے بچوں کو خاص مراعات دی جائیں۔ اسی غرض کے لیے...... یہ سکول جاری کیا گیا۔ سکول کی کوئی عمارت نہ ہونے کے باعث ایک کوٹھی کرایہ پر حاصل کی گئی۔ ابتدا میں صرف تین جماعتیں تھیں۔ پہلی ہیڈ مسٹریس...... نصیرہ جابی...... تھیں جنہوں نے تین ماہ تک نہایت محنت سے کام کیا۔ پھر مجبوری کے باعث استعفیٰ دے دیا۔ آپ کے بعد ریحانہ ستار...... نے اپنی خدمات سکول کے لیے پیش کیں۔

آپ ڈھاکہ سے تشریف لائیں اور دو سال تک ادارہ کی اَن تھک خدمت سرانجام دی۔ ستمبر ۱۹۶۰ء سے...... امۃ القدیر ارشاد...... بنت چوہدری علی محمد...... بی اے بی ٹی اس ادارہ کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔......

۱۹۵۷ء میں قریباً ایک سو بچوں نے داخلہ لیا۔ اس وقت (۱۹۷۱ء میں) بچوں کی تعداد پونے تین سو ہے۔

۱۹۶۰ء تک یہ سکول پرائمری رہا۔ جماعت پنجم تک لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جماعت پنجم کے لڑکے امتحان دے کر ہائی سکول میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ چھٹی جماعت پہلی مرتبہ ۱۹۶۱ء میں کھولی گئی۔ ۱۹۶۴ء میں پہلی دفعہ پانچ طالبات مڈل کے امتحان میں شامل ہوئیں۔ سوائے ۱۹۶۵ء کے...... ہر سال نتیجہ سو فیصد رہا ہے اور ہر سال ایک یا دو طالبات وظیفہ حاصل کرتی رہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ایک طالبہ ضلع جھنگ میں اول رہی۔ ۱۹۷۰ء سے ہائی کلاسز جاری کر دی گئی ہیں۔''

محولہ بالا تاریخ لجنہ اماء اللہ سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں پہلی دفعہ اس سکول کی طالبات میٹرک کے امتحان میں شامل ہوئیں۔

۱۹۷۰ء تک آٹھ خواتین یعنی صالحہ طلعت بنت مرزا برکت علی؛ امۃ الرشید اور امۃ السلام بنت مولوی عطا محمد؛ بشریٰ پروین بنت سیّد اقبال حسین شاہ؛ بشریٰ شاہدہ اہلیہ منور شمیم خالد؛ سعیدہ جواد اہلیہ سیّد جواد علی مربّی امریکہ؛ شریفہ بیگم اہلیہ سیّد مسعود مبارک شاہ اور بشریٰ ناہید ملک سکول کی خدمت سرانجام دینے کے بعد اپنے اپنے حالات کی وجہ سے سکول سے فارغ ہو چکی تھیں۔ ہاں! امۃ الحفیظ مرزا بنت حافظ عبدالسّلام؛ زاہدہ ہاشمی اہلیہ محمد اکرم خان؛ امۃ الرشید شوکت اہلیہ ملک سیف الرحمٰن؛ عطیہ بیگم بنت حافظ غلام رسول وزیر آبادی؛ صغریٰ مرزا بنت مرزا عبدالعزیز؛ حبیبہ مجید بنت چوہدری مجید احمد؛ زکیہ نیّر بنت غلام رسول؛ فریدہ حمید بنت میاں عبدالحمید جنجوعہ؛ امۃ القدوس بنت سیّد بدرالحسن؛ صادقہ نسرین بنت چوہدری ہدایت اللہ؛ بشریٰ پروین بنت عبدالغفار خان؛ طاہرہ خاتون بنت عنایت حسن خاں پیلی بھیت (بھارت) اور امۃ القدیر ارشاد اُس وقت اِس سکول میں تعلیم دے رہی تھیں۔

جہاں تک امۃ القدیر ارشاد کا تعلق ہے وہ سب سے لمبا عرصہ اس سکول کی ہیڈ مسٹریس رہیں اور بعدہٗ لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے زیرِ انتظام چلائی جانے والی امۃ الحیٔ لائبریری کی انچارج رہنے کے بعد وفات پا چکی ہیں۔

موصوفہ بی ٹی صاحب کی صاحبزادی اور عبدالسّلام اختر کی چھوٹی ہمشیرہ تھیں جنہوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے نصرت گرلز ہائی سکول، قادیان سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کی شادی چوہدری شبیر احمد، وکیل المال تحریک جدید کے بڑے بھائی، ارشاد احمد سے ہوئی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی، امۃ الشافی سے نوازا۔ بدقسمتی سے ان کے شوہر اس شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۹۵۰ء میں وفات پا گئے۔ اُن دنوں وہ سیالکوٹ میں مقیم تھیں تاہم اس حادثے کے چند سال بعد ان کے والدِ بزرگوار انہیں اپنے پاس ربوہ لے آئے۔ امۃ الشافی کی روایت کے مطابق ''میرے نانا مجھے اور امی کو حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے پاس لے کر حاضر ہوئے اور ہمارے حالات بتائے۔ آپ نے امی سے فرمایا کہ لڑکیوں کا کالج کھل چکا ہے اس میں داخلہ لے لیں'' چنانچہ انہوں نے غالباً ۱۹۵۵ء میں یہاں داخلہ لیا اور ۱۹۵۹ء میں بی اے کا امتحان پاس

کرلیا۔ انہوں نے اس سے اگلے ہی سال لیڈی میکلیگن کالج، لاہور سے بی ٹی کرلیا اور ستمبر ۱۹۶۰ء سے کے جی سکول میں ہیڈمسٹریس کے طور پر کام کرنے لگیں۔

وہ اعلیٰ ادبی ذوق کی مالک تھیں اور شعر کہنے کی صلاحیت انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ ان کا کلام جس میں بسا اوقات طنز و مزاح کی آمیزش بھی ہوتی جامعہ نصرت کے رسالہ النصرت میں بکھرا پڑا ہے۔ ان کی ہمعصر طالبات بھی شہادت دیتی ہیں کہ وہ بہت عمدہ شعر کہنے والی تھیں اور یہ کہ نہ صرف زمانۂ طالبِ علمی میں بلکہ اس کے بعد بھی وہ جامعہ نصرت کے مشاعروں میں شرکت کرتیں اور ان کا کلام بہت شوق سے سنا جاتا۔ بعض اوقات انہیں بطور میر مشاعرہ بھی مدعو کیا جاتا۔

امۃ الشافی کے پاس ان کی والدہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کچھ غیر مطبوعہ نظمیں موجود ہیں جن میں سے ایک کا عنوان ہے ''مہمانِ خصوصی''۔ اس نظم پر مرحومہ کے اپنے نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم جامعہ نصرت میں بزمِ ادب کے زیرِ اہتمام کسی انٹر کالجیئٹ مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے یہ نظم:

وہ شام مجھے آج بھی بھولی نہیں پیارو
جب مجھ کو بنایا گیا مہمانِ خصوصی
دل کانپ رہا تھا، میرے ہاتھوں میں تھا رعشہ
سہما ہوا بیٹھا تھا یہ بے جانِ خصوصی
آنکھیں بھی مری زرد تھیں، چہرہ بھی مرا زرد
لگتا تھا کہ باجی کو ہے یرقانِ خصوصی
یہ عارضہ شاید مجھے اُس دن سے لگا ہے
جب اُن سے میں کر بیٹھی تھی پیمانِ خصوصی
اپنوں نے، عزیزوں نے دیا حوصلہ مجھ کو
ہوتا ہے اسی طرح پہ انسانِ خصوصی
جب میں نے لرزتے ہوئے پاؤں کو اٹھایا
پہلو میں دبائے ہوئے دیوانِ خصوصی
جو کچھ بھی گزرنی ہے گزر جائے اسی شب
کرنا نہ کبھی مجھ پہ یہ احسانِ خصوصی
میں کس طرح اِس کرسیٔ اعزاز پہ پہنچی
اب تک بھی خطا ہیں میرے اوسانِ خصوصی
مہمانِ خصوصی نہ بنایا مجھے ہوتا
یوں آپ سے دو باتوں کا حیلہ بھی نہ ہوتا

مرحومہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۳ء تک، تئیس سال فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول کی ہیڈمسٹریس اور ۱۹۹۱ء سے اپنی وفات تک جو چار اگست ۲۰۰۶ء کو ہوئی امۃ الحیٔ لائبریری کی انچارج رہیں۔ یوں عملاً ان کی تمام زندگی ربوہ میں گزری۔ وہ اس کیفیت میں ربوہ پہنچی تھیں کہ بیوگی کا زخم تازہ تھا اور وہ سخت آزردہ اور غمگین تھیں تاہم اس شہر نے ان کا کھلے بازوؤں سے استقبال کیا، انہیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کئے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ انہوں نے تمام مشکلات کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور اس قابل ہوگئیں کہ اپنی زندگی عفت اور وقار کے ساتھ گزار سکیں۔ اندریں حالات ربوہ کے ساتھ ان کی وابستگی قابلِ فہم ہے اور ان کی اس (غالباً نامکمل) نظم میں ان ہی جذبات کا اظہار ہے:

مجھ کو واں جاکے بھی یاد آئیں گے ربوہ والے
میرا دکھ درد، میرا ساتھ نبھانے والے

میں نے اک عمر گزاری ہے اسی ربوہ میں
لمحہ لمحہ میرا گزرا ہے اسی ربوہ میں
دولتِ دین بھی پائی ہے اسی ربوہ میں
آپ کا پیار بھی دیکھا ہے اسی ربوہ میں
ان ہی باتوں سے تو یاد آئیں گے ربوہ والے

جب یہاں آئی تھی بے یار و مددگار تھی میں
نہ کوئی در تھا، نہ گھر تھا نہ کوئی آسائش
سب نے شفقت سے، محبت سے نوازا مجھ کو
میری شافی کو بھی بے لوث محبت بخشی
علم بھی بخشا میرے رب نے اسی ربوہ میں

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ امۃ الشافی ان کی اکلوتی بیٹی ہیں لہٰذا ان کے بارے میں ان کی والدہ کے جذبات سمجھنا مشکل نہیں۔ وہ یقیناً ان کے مستقبل کے بارے میں فکرمند رہتی ہوں گی۔ یہی وجہ تھی کہ جب پڑھنے لکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں محبت کرنے والا شوہر عطا فرما دیا تو امۃ القدیر نے کہا:

میری شافی پہ بھی ہیں اس کی عنایات و کرم
اپنی رحمت سے کیے دُور سبھی غم و الم
اُس کا گھر بھر دیا افضالوں سے، انعاموں سے
اچھا ساتھی بھی دیا، کر دیا خوش و خرم

پچھلے تیس سال سے پاکستان میں مہنگائی کے سیلاب اور اس کے نتیجے میں اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں روزافزوں اضافے نے غریب بلکہ متوسّط طبقے کے لیے بھی جو مشکلات پیدا کی ہیں، ان کے بارے میں کچھ کہنے کی چنداں حاجت نہیں اور اب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ بہت سے لوگ دوا کے بغیر مر رہے ہیں اور کچھ لوگ محض اس لیے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگیاں ختم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے بال بچوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ امۃ القدیر انتہائی حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ انہوں نے بھی اس درد کو محسوس کیا جو اس مہنگائی کے نتیجے میں متوسّط طبقہ کے دل و دماغ کو متاثر کر رہا تھا۔

ساحر لدھیانوی نے تو اپنی مشہور نظم ''تاج محل'' کسی اور حوالے سے کہی تھی لیکن دیکھئے امۃ القدیر نے اسی زمین پر شعروں کی ایک ایسی عمارت کھڑی کی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ دید ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کی یہ نظم اور دیکھئے کہ انہوں نے روزافزوں مہنگائی سے ڈسے ہوئے عوام کی حالتِ زار کا کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''موجودہ مہنگائی سے گھبرایا ہوا نوجوان''۔ فرماتی ہیں:

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
سادہ پانی کے علاوہ کوئی مشروب نہ مانگ

پیاز جب تیس کا ہو پیار کی لذّت کیوں کر؟
آٹا نایاب ہو اظہار کی جرأت کیوں کر؟
چائے پینے کو جو دل چاہے تو بی پی بڑھ جائے
جب ہو یہ صورت احوال محبت کیوں کر؟
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

ہائے وہ دن بھی تھے ہر شے کی فراوانی تھی
دال روٹی کا تھا مسئلہ، نہ پریشانی تھی
دن بھی دلکش تھے، طبیعت میں بھی جولانی تھی
پیار ہی پیار تھا اک حالتِ وجدانی تھی
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اللہ تعالیٰ نے باجی قدیر کو جن صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا اُن میں شاعری کا خداداد ملکہ شامل تھا اور اس ملکہ کا اظہار ان کی طرف سے شاعری کی مختلف اصناف میں ہوتا رہتا تھا۔ ان کی یہ قدرے طویل نظم جسے عمدہ پیروڈی کا درجہ حاصل ہے یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ مزید کہتی ہیں:

اب مری جان فقط پیار کا وعدہ لے لو
عشق و الفت کی حکایات سے دل بہلا لو
بجلی کے بل میں ہر اک شوق چھپا لو اپنا
گیس کے بل سے محبت بھرا دامن بھر لو
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

میرا دل آج بھی ہے تیرا طلبگار مگر
دل میں اب بھی ہے تیرے پیار کا اک تاج محل
اُس کی رحمت سے نہ مایوس کبھی ہونا ہے
اُس کے فضلوں سے درخشاں رہے یہ راج محل
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

آؤ پھر عہدِ محبت کو فروزاں کرلیں
یہ حقیقت ہے تو پھر اس میں چراغاں کرلیں
بھول جائیں غمِ ہستی کی ہر اک سختی کو
پیار سے زیست کو پھر رشکِ بہاراں کرلیں
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

میں یہاں پر ان کی ایک اور نظم پیش کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے یہ نظم حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع کی ۱۹۹۱ء میں قادیان کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے موقع پر کہی تھی۔ امۃ الشافی کی روایت کے مطابق یہ نظم ابھی تک کہیں شائع نہیں ہو سکی لہٰذا اسے بھی قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ اس نظم کے آخر میں یہ نوٹ درج ہے: ''اگلے صفحہ پر'' تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اگلا صفحہ ضائع ہو چکا ہے لہٰذا ان ہی اشعار کو مکمل نظم سمجھ کر نقل کیا جا رہا ہے۔ نظم کا عنوان ہے: ''حضور ایدہ اللہ الودود کے بھارت پہنچنے پر بھارتی ہوا کا استقبال''۔

آ مسافر! میں تجھے تیرے وطن تک لے چلوں
تُو جہاں تک جا سکے تجھ کو وہاں تک لے چلوں
آ دکھاؤں میں تجھے تیرے وطن کی سرزمیں
وہ مقاماتِ مقدس، اُن گھروں تک لے چلوں
جن سے پھوٹا چشمۂ انوار کا سیلِ رواں
جن سے روشن اک جہاں ہے، اُن جگہوں تک لے چلوں

آج پھر بیتُ الدّعا میں سجدۂ عجز و بُکا
دل پگھل جائیں جہاں، اُن عظمتوں تک لے چلوں
آج بھی اللہ کے بندے جہاں مدفون ہیں
اُن مطہّر ہستیوں کے مقبروں تک لے چلوں
اے غلامِ احمدِ مُرسل کے فرزندِ جلیل
دِید کو تیری ترستے، اُن دلوں تک لے چلوں

موصوفہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ انہوں نے جس اوالوالعزمی کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا تھا اس کا اعتراف اپنوں اور بیگانوں سبھی نے کیا۔ ایسے تو نہیں کہا تھا صاحبزادی امۃ القدوس نے ان کی وفات پر:

''سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں''
مشکل وہ کون سی ہے جو تجھ پہ پڑی نہیں
اک کانچ کا کھلونا تیرے ہاتھ میں دیا
بہلا کے تجھ کو یوں ترا ساتھی بھی چل دیا
پھر حوصلہ ترا ہوا دنیا پہ آشکار
کتنا کڑا تھا وقت جو تنہا دیا گزار
پھر بھی شگفتہ چہرہ، شگفتہ خصال ہے
کم ہمتوں کے واسطے روشن مثال ہے
ہر غم کو چٹکیوں میں ہی تو نے اڑا دیا
ہنس ہنس کے زندگی کو تماشہ بنا دیا
اَب یہ دعا ہے تجھ پہ ہوں مولا کی رحمتیں
حاصل ہوں تجھ کو دین کی، دنیا کی نعمتیں

یہ تو تھا امۃ القدیر ارشاد کا ذکرِ خیر۔ اب میں اس سکول کی دو پرانی معلّمات، فریدہ حمید اور حبیبہ مجید اور حال ہی میں ریٹائر ہونے والی ایک معلّمہ یعنی بشریٰ پروین کے ساتھ سکول کے روز وشب کے بارے میں ہونے والی اپنی گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں جس سے آپ خود وہ فضا محسوس کر سکتے ہیں جس میں یہ سکول کام کر رہا تھا۔

فریدہ بشیر چوہدری بشیر احمد، نائب امیر جماعت احمدیہ، ملتان کی اہلیہ ہیں جو آج کل ملتان کینٹ میں مقیم ہیں۔ ملتان میں اپنی تقرری کے دوران مجھے نہ صرف چوہدری بشیر احمد بلکہ ان کی علم دوست اہلیہ سے بھی تفصیلی تعارف رہا ہے۔ موصوفہ عبدالحمید جنجوعہ کی صاحبزادی ہیں جو ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کی سکول کی ساری تعلیم ربوہ کی ہے تاہم انہوں نے ایف ایس سی (پری انجینئرنگ گروپ) کا امتحان گورنمنٹ کالج، لائلپور سے پاس کیا جس کے بعد وہ جامعہ نصرت، ربوہ میں داخل ہوگئیں۔ ۱۹۷۰ء میں انہوں نے بی اے کا امتحان دیا لیکن ابھی نتیجہ

بھی نہ نکلا تھا کہ الفضل میں فضلِ عمر جونیئر ماڈل سکول میں ٹیچرز کی ضرورت کا ایک اشتہار ان کی نظر سے گزرا۔ اپنی فراغت کے پیشِ نظر انہوں نے بھی درخواست دے دی۔ وہ بتاتی ہیں: انٹرویو کے لیے پہنچی تو معلوم ہوا کہ چھوٹی آپا امیدواران کے انٹرویو کر رہی ہیں۔ میری باری آنے پر انہوں نے سرسری سی دو تین باتیں پوچھیں، قرآن کریم کا ایک رکوع پڑھوایا اور اردو اور انگلش اخبار کی کچھ ریڈنگ کروائی اور مجھے بتا دیا کہ میں اس جاب کے لیے منتخب کر لی گئی ہوں۔ مجھے چھ اپریل ۱۹۷۰ء تک یہ سکول جوائن کرنا تھا۔

موصوفہ کا تقرر بطور کے جی ٹیچر ہوا تھا لیکن ان کے الفاظ میں: کچھ ہی دنوں بعد ہیڈ مسٹریس نے (جنہیں ہم سب ''باجی'' کہا کرتے تھے) مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ وہاں زاہدہ ہاشمی اور امۃ الحفیظ مرزا بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا میں نویں کلاس کو فزکس، کیمسٹری اور مَیتھ پڑھا سکتی ہوں۔ میں نے چونکہ ایف ایس سی کے بعد بی اے کیا تھا لہٰذا ان مضامین کی کچھ شُد بُد تھی چنانچہ میں نے وعدہ کر لیا کہ اگر مجھے یہ ذمہ داری دی گئی تو میں اسے نبھانے کی پوری کوشش کروں گی۔ میری رضامندی پر نویں کلاس کی اُن طالبات کو جو یہ سکول چھوڑ کر نصرت گرلز ہائی سکول جا چکی تھیں واپس بلا لیا گیا۔ اس طرح مجھے جن طالبات کو یہ مضامین پڑھانے کا موقع ملا وہ تھیں ناصرہ صبیحہ، تقیّہ حیٔ، تسنیم نکہت اور امۃ الحیٔ۔ ایک دو ماہ کے بعد امۃ الحیٔ سائنس چھوڑ گئیں چنانچہ اگلے دو سال میں نے صرف تین طالبات کے ساتھ گزارے۔ ناصرہ صبیحہ بعد میں ڈاکٹر بنیں اور اس وقت ڈاکٹر ناصرہ داؤد کے نام سے راولپنڈی میں پریکٹس کر رہی ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں میری چھوٹی بیٹی، دانیہ کے ہاں بچے کی پیدائش کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت محبت سے ملیں۔ تقیّہ حیٔ گروپ کیپٹن عبدالحیٔ کی صاحبزادی تھیں، تسنیم نکہت چوہدری ظہور احمد باجوہ کے قریبی عزیزوں میں سے تھیں اور امۃ الحیٔ میاں عبدالرحیم احمد کی بیٹی تھیں۔

وہ بتاتی ہیں: وسط ۱۹۷۰ء میں باجی کی بیٹی امۃ الشافی (جن کی ایک سال قبل شادی ہوئی تھی) بچے کی پیدائش کے لیے سکول میں آ گئیں۔ آپ حیران نہ ہوں، آخر ہمارا سکول ہی تو ان کا میکہ تھا۔ وقتاً فوقتاً ان کے شوہر طاہر بھی لاہور سے آ جاتے۔ باجی کے پاس رہنے کے لیے محدود سی جگہ تھی لہٰذا ان کی پذیرائی کی خاطر کسی نہ کسی کلاس روم کو ان کے بیڈروم میں تبدیل کرنا پڑتا چنانچہ بعض اوقات جب ہم صبح سکول پہنچتے اور برقع اتار کر حاضری رجسٹر ہاتھ میں تھامے کلاس روم کا دروازہ کھولتے تو اندر کا منظر ہی بدلا ہوا ملتا۔

موصوفہ اس دور کا ذکر آج بھی بہت محبت سے کرتی ہیں اور کہتی ہیں: عُرفِ عام میں یہ سکول ربوہ کا ''کانونٹ سکول'' تھا۔ دوسرے سکولوں کے مقابلہ میں اس کی فیس کچھ زیادہ تھی لیکن کارکنان کے بچوں سے فیس نہیں لی جاتی تھی۔ خاندان حضرت مسیح موعود کے علاوہ ربوہ کے اچھے گھرانوں کے بچے بھی یہاں تعلیم حاصل کرتے۔ آدھی چھٹی کے دوران جب بچوں کی کھیل کود کا وقت ہوتا ایک ٹیچر اس بات کی نگرانی کرتی کہ کوئی بچہ بھاگ دوڑ میں خود کو چوٹ نہ لگوا لے۔ لڑکے زیادہ شرارتی ہوتے ہیں چنانچہ انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ ٹیچرز کے قابو میں نہ آتے۔ ایک دفعہ میں نے ایک بچے کو غصہ میں ''خبیث'' کہہ دیا تو باجی نے میری سخت

سرزنش کی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں بچوں کے لیے دوبارہ یہ لفظ کبھی استعمال نہ کروں گی۔ میں نے یہ بات اپنے پلّے باندھ لی اور پھر ہمیشہ اس لفظ کے استعمال سے اجتناب کیا۔

انہیں یاد ہے کہ سکول کی بلڈنگ دو کوٹھیوں پر مشتمل تھی۔ ایک کوٹھی تو چھوٹی آپا کی تھی جب کہ دوسری ان کی بہن، امۃ القدوس بیگم اہلیہ مرزا وسیم احمد کی تھی۔ دونوں کوٹھیوں کی درمیانی دیوار نکال دی گئی تھی۔ اس عمارت میں کلاس رومز اور آفس کے علاوہ ایک کمرہ باجی کی ذات کے لیے مختص تھا جسے ٹیچرز کامن روم کے طور پر بھی استعمال کرتی تھیں۔ ایک کمرہ راج بی، مددگار کارکنہ اور اس کے لمبے چوڑے خاندان کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ راج بی باجی کے لیے کھانا بناتی اور ان کے دیگر کام کاج بھی کرتی تھی۔

فریدہ بتاتی ہیں: ایک دفعہ اسی کمرے میں راج بی بی کی بہو کے ہاں بچہ پیدا ہوا لیکن وہ خناق کے مرض میں مبتلا تھا۔ جب فضلِ عمر ہسپتال میں اس کی بیماری کی تشخیص ہوگئی تو سکول فوری طور پر بند کر دیا گیا اور اگلے چند دنوں کے لیے اسے دفتر لجنہ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ بچہ تین دن کے بعد اللہ کو پیارا ہوگیا جس کے بعد سکول کے حالات معمول پر آ گئے۔

سکول میں رِیسیس کا وقت کیسے گزرتا، ملاحظہ ہو ان کا یہ بیان: آدھی چھٹی کے وقت تمام سٹاف باجی کے کمرے میں اکٹھا ہو جاتا۔ حبیبہ مجید کی ڈیوٹی چائے بنانے کی ہوتی۔ وہاں سب ٹیچرز اپنا اپنا لنچ باکس کھول کر بیٹھ جاتیں۔ ہم سب یہ رنگ برنگے کھانے شیئر کرتے جس کے بعد چائے کا دور چلتا۔ غرض خوب مزا رہتا۔

موصوفہ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع جو اُس زمانے میں ''میاں طاہر'' کہلاتے تھے کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا کرتی ہیں: میاں طاہر کی رہائش سکول کے ساتھ ہی تھی اور آپ کی دو بیٹیاں، فائزہ اور شوکت جہاں المعروف شوکی میری سٹوڈنٹس تھیں۔ ان دنوں مڈل کا امتحان ہونے والا تھا چنانچہ باجی نے مجھے بچیوں کے داخلہ فارمز پُر کرنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ان کی تاریخِ پیدائش رجسٹر داخلہ سے لے لوں۔ میں نے رجسٹر نکال کر سب کی تاریخِ پیدائش ایک کاغذ پر نوٹ کر لی اور فارم بھرنا شروع کر دیئے۔ جب فائزہ اور شوکی کے فارم پُر کر رہی تھی تو میں نے نوٹ کیا کہ رجسٹر میں ان کی تاریخ پیدائش درج کرتے وقت کچھ غلطی ہوگئی ہے کیونکہ دونوں کی عمر میں صرف چار ماہ کا فرق بنتا تھا۔ میں سارے کاغذات اٹھا کر باجی کے پاس لے گئی تو انہوں نے مجھے کہا: جاؤ، میاں صاحب اپنے ہومیو پیتھک کلینک میں ہوں گے۔ ان سے کہو کہ بچیوں کی تاریخ ہائے پیدائش درست کر دیں۔ میں یہ پلندہ اٹھا کر آپ کے پاس چلی گئی اور اپنا مدّعا بیان کیا۔ مجھے آپ کا حسین چہرہ اور دلفریب مسکراہٹ آج بھی یاد ہے۔ آپ نے مجھ سے قلم لے کر اپنے ہاتھ سے درست تاریخیں فارمز پر درج کر دیں۔ یہ ملاقات شاید دو منٹ سے بھی زیادہ نہ رہی ہوگی لیکن مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہیں اپنے بعض شاگرد نہیں بھولے۔ وہ ذکر کیا کرتی ہیں: اپنے دوسرے سٹوڈنٹس میں سے مجھے چوہدری صلاح الدین، مشیر قانونی، صدر انجمن احمدیہ کا بیٹا سلیم الدین ابھی تک یاد ہے۔ ہم اسے پیار سے ''موٹو'' کہتے تھے۔ بعد میں کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ سنا ہے جرمنی میں آباد ہو

چکا ہے۔ وہ شرارتی ہونے کے باوجود مجھے بہت پیارا تھا۔ خواہش ہے کہ کبھی ملے تو میں اس کا ماتھا چُوم کر اسے پیار دوں کہ ان بچوں پر مجھے اپنے بچوں ہی کی طرح پیار آتا ہے۔ ایک بچہ طارق رشید بھی بہت پیارا اور ذہین تھا۔ وہ سکواڈرن لیڈر رشید کا بیٹا اور خالہ مسعودہ کا پوتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے ملتان ملا تھا۔ اس کی شادی مرزا رفیع احمد کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ایک اور نہایت ہی پیارا چہرہ مرزا غلام قادر ابن مرزا مجید احمد کا تھا جنہیں ۱۹۹۹ء میں راہِ مولیٰ میں قربان کر دیا گیا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث کا نواسہ اور بی بی شُکری کا بیٹا، علی باسل اور سیّد میر محمود احمد کا بیٹا، منیب بھی مجھے آج تک نہیں بھولا۔

انہیں اپنی شاگرد بچیوں میں سے بھی بہتوں کے نام ابھی تک یاد ہیں اور ان کے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ کہتی ہیں: مجھے چونکہ صرف ایک سال پانچویں جماعت کو انگلش پڑھانے کا موقع ملا تھا اس لیے لڑکوں کی بہت کم تعداد میرے سٹوڈنٹس میں شامل ہے لیکن لڑکیوں کی تو ایک لمبی لائن ہے۔ اب بھی ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ بہت محبت اور عزت و احترام کے ساتھ ملتی ہیں۔

میری نمایاں سٹوڈنٹس میں سے بشریٰ بشیر (بعد میں پرنسپل جامعہ نصرت) کی بیٹیاں رضوانہ اور فرحانہ؛ ڈاکٹر ناصرہ داؤد؛ میاں عبدالرحیم احمد کی بیٹی، امۃ الحئی اہلیہ ڈاکٹر خالد عطا مقیم امریکہ؛ ملتان کے ملک عمر علی کھوکھر کی چھوٹی بیٹی طاہرہ ملک جو آج کل لاہور ہوتی ہیں اور نواب عباس احمد خان کی بہو ہیں؛ چوہدری ظہور احمد باجوہ کی بیٹی امۃ النصیر؛ چنیوٹ سے ایک غیر از جماعت فیملی کی بیٹی خالدہ؛ نائلہ جو بعد میں ملک سیف الرحمٰن کی بہو بنیں اور اب وفات پا چکی ہیں؛ پیر معین الدین کی بیٹیاں امۃ الغفور اور امۃ النور؛ مرزا رفیع احمد کی بیٹی سارہ امۃ الحفیظ؛ مرزا حنیف احمد کی بیٹی ٹتّو جو اَب ڈاکٹر خالد تسنیم، آئی سپیشلسٹ کی اہلیہ ہیں؛ میر داؤد احمد کی بیٹیاں مُدرت اور نُصرت؛ امۃ الناصر بے بی جو بعد میں ڈاکٹر نصیر احمد خاں کی بہو بنیں؛ عبدالرحمٰن سندھی کی بیٹیاں سلمٰی، بشریٰ اور ناصرہ اور ایک ایرانی النسل بچی (جس کا نام شہرزاد تھا لیکن عام طور پر زری کہلاتی تھی) شامل ہیں۔ ان سب بچیوں کو خواہ وہ کہیں بھی ہوں میرا بہت پیار اور سلامتی کی دعا پہنچے۔

وہ بتایا کرتی ہیں: چونکہ مجھے زیادہ تر بڑی کلاسز کو سائنس کے مضامین پڑھانے کا موقع ملا لہٰذا چھوٹے بچوں سے میرا رابطہ کم ہی ہوتا لیکن مجھے چھوٹے بچوں سے پیار سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا لہٰذا میں فارغ اوقات میں اکثر پرائمری سیکشن کی کسی کلاس میں چلی جاتی اور اپنا شوق پورا کر لیتی۔ مجھے یاد ہے کے.جی کے بچے تو مجھ سے چپک ہی جاتے تھے۔

بچوں کی معصومیت کا ذکر ہو تو وہ بعض دلچسپ واقعات سناتی ہیں۔ کہتی ہیں: ایک دفعہ کے.جی کلاس کے لیے ایک نئی ٹیچر کا تقرر ہوا۔ وہ انڈیا سے آئی تھیں اور ان کا لب و لہجہ بچوں کے لیے پوری طرح قابلِ فہم نہ تھا۔ بی بی شکری کی چھوٹی بیٹی ان کی کلاس میں تھی۔ کسی وجہ سے بچی اس ٹیچر کے ساتھ کمفرٹیبل محسوس نہ کرتی تھی چنانچہ جب بی بی اسے کلاس میں چھوڑ کر واپس چلی جاتیں تو وہ اپنی کلاس میں سے نکل آتی اور مجھے ڈھونڈ کر میری گود میں چڑھ جاتی اور رو رو کر کہا کرتی کہ میں تو آپ سے پڑھوں گی۔ یہ معصوم بچی تکلّفات سے مبریٰ تھی چنانچہ کہا کرتی

کہ مجھے یہ ''ہندومس'' اچھی نہیں لگتیں۔

سکول میں مجلس ناصرات الاحمدیہ اور لجنہ اماء اللہ کی اپنی سرگرمیاں بھی جاری رہتی تھیں۔ فریدہ بتاتی ہیں: سکول میں مجلس ناصرات الاحمدیہ قائم تھی جس میں سکول کی تمام طالبات شامل تھیں۔ اس کے علاوہ لجنہ کی مجلس بھی قائم تھی جس میں جیواں جمعدارنی کے علاوہ تمام سٹاف شامل تھا۔ ہماری صدر امۃ الرشید شوکت تھیں۔ اگرچہ وہ تمام کام خود ہی کرلیتی تھیں لیکن رپورٹ فارم میں سیکرٹری کے طور پر میرا نام درج ہوتا۔ دیگر کاموں کے علاوہ سٹاف کی سینئر ممبران سکول کی غیرشادی شدہ ٹیچرز کے رشتوں کی تگ ودو میں بھی مصروف رہتیں۔ باجی اور زاہدہ ہاشمی رشتوں کے پیغام ٹیچرز کے والدین تک پہنچاتیں لیکن مائی ہاجرہ تو اس کام میں بہت تیزی دکھاتیں اور بسااوقات رشتہ دکھانے کے لیے عورتوں کو سکول میں ہی لے آتیں۔

کے جی سکول میں کینٹین کے نہ ہونے سے پیدا ہونے والے مسائل کی بات ہو تو وہ کہتی ہیں: چھوٹی آپا کی ہدایت تھی کہ بچے گھر سے پیسے لے کر نہ آیا کریں بلکہ کھانے پینے کی اشیاء بنوا کر ہمراہ لائیں۔ اس ہدایت کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب سٹاف ممبرز میں سے کسی نے کوئی ٹریٹ دینا ہوتی تو مشکل پیش آتی چنانچہ اس کام کے لیے مائی ہاجرہ کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ وہ ہمیں گول بازار سے کھانے پینے کی اشیاء لا دیتیں۔ گرمیوں میں تو آئس کریم والے کی مشین سائیکل پر رکھوا کر ساتھ ہی لے آتیں اور ہم سب اگلی پچھلی ٹریٹس نمٹا لیتیں۔ اس روز ہم خوب انجوائے کرتے۔

سکول کی نیشنلائزیشن اور اس کے بعد کے دور کی باتیں شروع ہو جائیں تو گفتگو کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے اور وہ کہا کرتی ہیں: ۱۹۷۲ء میں پورے ملک کے تعلیمی اداروں کی طرح ہمارا سکول بھی نیشنلائز ہو گیا اور حکومتی اداروں کی طرف سے وقتاً فوقتاً بہت سے فارمز موصول ہونے لگے جن میں سکول سے متعلق معلومات مہیا کرنا ہوتی تھیں۔ ہمارے سکول میں کلرک کوئی نہیں تھا جو یہ انفرمیشن تیار کرتا چنانچہ یہ خدمت بھی مجھے انجام دینا پڑتی۔ اس طرح مجھے ہیڈ مسٹریس اور اپنی رفقا سے لے کر مددگار کارکنات اور جمعدارنی تک سب کے نام، تاریخ ہائے پیدائش اور تعلیمی کوائف تقریباً زبانی یاد ہو گئے۔ پھر باجی کے ساتھ سرکاری دفاتر میں جانا بھی میرا معمول بن گیا۔ میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

فریدہ بتاتی ہیں: جب میرا تقرر ہوا تو میری تنخواہ ایک سو بیس روپے ماہوار تھی لیکن سکول کی نیشنلائزیشن کے بعد امید ہو چلی تھی کہ ہمیں تنخواہیں سرکاری سکیل کے مطابق ملا کریں گی لیکن یہ معاملہ حتمی صورت اختیار کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ اسی دوران باجی نے ہمیں پرائیویٹ بی ایڈ کرنے کی اجازت دے دی کیونکہ اب اس سکول سے ٹیچنگ پریکٹس کا سرٹیفکیٹ لیا جا سکتا تھا جو پرائیویٹ امتحان کے لیے ضروری تھا چنانچہ پہلے سال میں نے اور زاہدہ ہاشمی نے یہ امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ اگلے سال مزید دو ٹیچرز نے بھی بی ایڈ کر لیا۔

سکول میں اپنے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں: ۱۹۷۴ء میں ہم چاروں یعنی میرا، امۃ القدوس

بنت سیّد بدرالحسن؛ صادقہ نسرین بنت چوہدری ہدایت اللہ اور بشریٰ پروین بنت عبدالغفار خان کے رشتے طے پا گئے جس کے بعد سب سے پہلے امۃ القدوس کی شادی ہوئی، پھر میری، پھر بشریٰ پروین کی اور اسی سال کے آخر میں صادقہ نسرین کی شادی ہو گئی۔ بشریٰ عبدالوحید نامی ایک نوجوان سے بیاہ کر لندن چلی گئیں؛ صادقہ نسرین جو شادی کے بعد صادقہ منصور کے نام سے معروف ہوئیں کراچی پدھار گئیں اور میری قسمت میں باقی زندگی ملتان گزارنا لکھی تھی۔ امۃ القدوس نے تو شادی کے بعد بھی سروس جاری رکھی۔ بعد میں ہم جب جب ملتان سے ربوہ جاتے تو تقریباً سب سے ملاقات ہو جاتی۔

میں نے ۱۹۷۶ء میں استعفیٰ دے دیا لیکن اس سے پہلے ہمیں گورنمنٹ سکیل مل چکے تھے۔ چونکہ نئے سکیل نیشنلائزیشن کے وقت سے ملے تھے اس لیے عین شادی کے موقع پر تین سال کے بقایا جات اکٹھے مل گئے۔ مجھے یاد ہے یہ رقم تقریباً ساڑھے چار ہزار روپیہ بنتی تھی جو اس زمانے کے لحاظ سے خاصی بڑی رقم تھی۔

یہ تو تھیں فضل عمر جونیئر ماڈل سکول کے بارے میں وہ باتیں جو فریدہ بشیر کے ذریعے معلوم ہوئیں۔ اب میں آپ کی ملاقات کرا رہا ہوں سکول کی ایک اور سینئر ٹیچر، حبیبہ مجید سے جو پاکستان ریلوے کے ایک کارکن، چوہدری مجید احمد کی صاحبزادی اور سیّد عبدالستار، ٹیکنیشن، پاکستان ایئر فورس کی اہلیہ ہیں۔ وہ انتالیس سال تک اس سکول میں پڑھاتی رہی ہیں۔ وکٹوریہ گرلز ہائی سکول، لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد انہوں نے دو اکتوبر ۱۹۶۲ء کو یہ ملازمت اختیار کی اور ۳۱ مارچ ۲۰۰۱ء کو ریٹائر ہوئیں۔ اسی دوران انہوں نے بی اے اور سی ٹی کے امتحانات بھی پاس کیے۔

موصوفہ محلّہ دارالرحمت غربی میں مقیم ہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ ان کی صحت اچھی اور ذہنی قویٰ مضبوط ہیں۔ وقت ہو تو وہ اپنے دورِ ملازمت کی بہت سی دلچسپ یادیں آپ کے ساتھ شیئر کرتی ہیں اور میں اِن لوگوں میں شامل ہوں جنہیں ان کے ساتھ ملاقات کا موقع مل چکا ہے۔ ان کی باتوں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث، حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع، حضرت خلیفۃ المسیح الخامس، چھوٹی آپا اور خاندانِ حضرت مسیح موعود کی بہت سی صاجزادیوں اور صاجزادوں کا محبت بھرا ذکر بھی آتا ہے۔

وہ بہت فخر کے ساتھ بتاتی ہیں: حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث مغربی افریقہ کے کامیاب دورے کے بعد واپس وطن تشریف لائے تو سکول کی طرف سے آپ کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دینے کا فیصلہ ہوا۔ حضور نے بکمالِ مہربانی یہ دعوت قبول کرلی۔ تقریب لجنہ اماء اللہ ہال کے احاطے میں ہوئی۔ اس تقریب کے جملہ انتظامات میرے سپرد تھے جو چھوٹی آپا اور سکول کی ہیڈ مسٹریس کی ہدایات کے مطابق اللہ کے فضل سے بطریقِ احسن انجام پائے۔ اُس وقت ہیڈ مسٹریس سمیت سکول میں گیارہ ٹیچرز تھیں۔ بوقتِ رخصت حضور نے ازراہِ شفقت گیارہ روپے سکول سٹاف میں تقسیم کے لیے عنایت فرمائے۔ ایک نوٹ دس روپے کا اور ایک نوٹ ایک روپے کا تھا۔ ہر ٹیچر کے حصے میں ایک ایک روپیہ آیا۔ میں نے ایک روپے کا وہ نوٹ لیا جو حضرت صاحب نے دیا تھا۔ دنیاوی اعتبار سے یہ کوئی بڑا انعام نہ تھا لیکن ہم نے اسے اپنی خوش نصیبی سمجھ کر قبول کیا۔ باقیوں کا تو مجھے علم

نہیں، میں نے برکت کے خیال سے اس نوٹ کو خرچ کرنے کی بجائے ہمیشہ اپنی جان سے عزیز رکھا۔ یہ نوٹ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ میں اس کی برکتوں سے وافر حصہ پا رہی ہوں۔

بات چھوٹی آپا کی شفقتوں کی ہو تو حبیبہ مجید بہت سے واقعات سناتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں: چھوٹی آپا نے اپنے نواسے، غلام احمد فرخ کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا اور وہ دن رات ان ہی کے پاس رہتا تھا اور بچے کے طور پر کہیں نہ کہیں من مانی بھی کر بیٹھتا ہوگا۔ وہ میرا شاگرد تھا چنانچہ چھوٹی آپا بعض دفعہ فرمایا کرتی تھیں: فرخ میری بات تو نہیں سنتا لیکن تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ تم اسے جو کہوگی مان جائے گا لہٰذا اسے سمجھاؤ نا۔ میں اسے کبھی پچکار کر اور کبھی ڈرا دھمکا کر اپنی بات منوا لیتی تھی۔ یہ بچہ اللہ کے فضل سے بہت ذہین ثابت ہوا اور غالباً چوتھی جماعت کے بعد لارنس کالج، گھوڑا گلی چلا گیا۔ ایف ایس سی کے امتحان میں وہ بورڈ میں سوم رہا اور اسے تمغہ ملا تھا۔ اس کی اس شاندار کامیابی پر چھوٹی آپا بے حد خوش تھیں چنانچہ مجھے اپنے گھر بلا کر خوشی کی یہ خبر خود سنائی اور وہ میڈل بھی دکھایا جو اسے بطور انعام ملا تھا۔ اس موقع پر غلام احمد فرخ کو بھی بلایا گیا اور مجھے اپنے اس ہونہار شاگرد کی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ بعد میں اس بچے نے قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی اور کسی امریکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر لی۔ وہ اب ماشاءاللہ جماعتی خدمت میں مصروف ہے۔

حبیبہ بتاتی ہیں: چھوٹی آپا کی ہدایت کے مطابق سکول کے پانچویں کے طلبہ کا سالانہ امتحان تعلیم الاسلام ہائی سکول لیا کرتا تھا۔ سنٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کرتا اور یہ امتحان تعلیم الاسلام پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے اب سن تو یاد نہیں لیکن ایک بار جب یہ امتحان ہوا تو پہلی دس پوزیشنوں میں سے زیادہ تر پوزیشنیں ہمارے سکول کے بچوں نے حاصل کیں۔ چھوٹی آپا کے لیے یہ خبر بے حد خوش آئند تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل پر بار بار شکر ادا کرتیں۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے بھی پندرہ روپے کی ایک سپیشل اِنکریمنٹ سے نوازا۔ مجھے یاد ہے اس وقت میری تنخواہ نوّے روپے ماہوار تھی جو یک دم بڑھ کر ایک سو پانچ روپے ہوگئی تھی۔

موصوفہ کا تمام زندگی بچوں سے واسطہ رہا۔ وہ بچوں کی معصومیت کے کئی واقعات سناتی ہیں اور بتاتی ہیں: ایک بار میں نے کلاس میں اُس حدیثِ مبارکہ کا حوالہ دیا جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جنت تمہاری ماں کے قدموں تلے ہے۔ میری شاگردوں میں سے ایک میر داؤد احمد کی بیٹی، امۃ الناصر نصرت بھی تھی۔ اس نے اس حدیث کو نہ جانے کس طرح لیا کہ گھر جا کر اپنی والدہ (صاحبزادی امۃ الباسط بنت حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی) کے پاؤں کا تلوا کھرچنا شروع کر دیا۔ وہ اپنی بیٹی کی اس غیر معمولی حرکت پر قدرے حیران ہوئیں اور پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ تب اس نے اس حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ جنت تلاش کر رہی تھی۔

حبیبہ بتاتی ہیں: جب میں نے ملازمت شروع کی تو مجھے پہلی اور دوسری جماعت کو پڑھانے کی ذمہ داری ملی۔ جب پہلی جماعت کے بچوں کا کورس ختم ہوا تو سال ختم ہونے میں کافی وقت باقی تھا چنانچہ میں نے انہیں دوسری جماعت کا کورس بھی پڑھا دیا۔ مجھ سے یہ غلطی اپنی ناتجربہ کاری اور کم علمی کی وجہ سے ہوئی۔ چھوٹی آپا کو

پتا چلا تو انہوں نے میری سرزنش کرنے کی بجائے فرمایا کہ اگر یہ بچے دونوں سالوں کا کورس ختم کر چکے ہیں تو ان کا امتحان لے کر دیکھ لیتے ہیں۔ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ امتحان ہوا تو بچے دوسری جماعت کے کورس میں بھی پاس ہو گئے۔ چھوٹی آپا یہ ریزلٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے تمام بچوں کو ڈبل پروموشن دے کر تیسری جماعت میں چڑھا دیا۔

کے جی سکول کی یہی استاد بتاتی ہیں کہ ان کی ایک شاگرد، صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی بیٹی، شوکی کو سانس کی تکلیف رہتی تھی اور اسے سکول سے بہت چھٹیاں کرنا پڑتی تھیں۔ طویل غیر حاضری سے پڑھائی میں کمزوری کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔ سکول کی طرف سے والدین کو ایک مقررہ مدت کے بعد پراگریس رپورٹ بھجوائی جاتی تھی۔ جب حبیبہ مجید کی طرف سے شوکی کی رپورٹ بھجوائی گئی تو میاں صاحب نے بچی کی کمزوریوں کی نشاندہی کو بہت سراہا اور اس بات کو پسند فرمایا کہ میں نے ان سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے میرے نام ایک بہت ہی پیارا خط لکھا جس میں ازراہِ حوصلہ افزائی میری تعریف کی گئی تھی۔ باجی ارشاد نے وہ خط فریم کروا کر اپنے دفتر میں آویزاں کر رکھا تھا اور وہیں رہ گیا جس کا مجھے افسوس ہے۔ کاش! یہ خط آج میرے پاس ہوتا اور میری آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کر سکتیں۔

باجی ارشاد اپنی اکلوتی بیٹی، امۃ الشافی کے ہمراہ سکول کے ایک کمرہ میں مقیم تھیں۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوگئی۔ دشمن کے جہاز بعض اوقات ربوہ کی فضا میں سے گزرتے اور بمباری کی نیت سے سرگودھا کی طرف جاتے۔ رات کے وقت بلیک آؤٹ ہوا کرتا تھا اور ہدایت یہ تھی کہ کسی گھر سے روشنی باہر نہ نکلے۔ کبھی افواہ پھیل جاتی کہ دشمن کے پیراٹروپرز ربوہ کے نواح میں پہاڑیوں کے پیچھے اتر گئے ہیں۔ گھروں کے اندر خندقیں کھودی جا چکی تھیں اور ہدایت تھی کہ ہوائی حملے کے خطرے سے خبردار کرنے کا سائرن بجتے ہی لوگ ان میں پناہ لے لیں۔ الغرض خوف و ہراس کا ایک عجیب سا عالم تھا جس سے ربوہ کا ہر شخص دوچار تھا۔ ظاہر ہے یہ فضا باجی ارشاد کے لیے بھی بے حد پریشان کن تھی جو گھر میں کسی مرد کی عدم موجودگی میں طرح طرح کے نفسیاتی اور عین ممکن ہے حقیقی خطرات سے دوچار ہوئی ہوں۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد ہمارے سکول کے بالکل پڑوس میں رہتے تھے۔ حبیبہ کی روایت کے مطابق باجی ارشاد بتایا کرتی تھیں کہ صاحبزادہ صاحب نے انہیں کہہ رکھا تھا کہ خدانخواستہ کسی خطرے کی صورت میں وہ بے تکلفی سے آپ کے ہاں آ جایا کریں اور وہ بارہا ان کی طرف چلی بھی جاتی تھیں۔

حبیبہ نے اس سکول کے دونوں ادوار دیکھے ہیں یعنی وہ دور بھی جب یہ سکول لجنہ کے ماتحت تھا اور وہ دور بھی جب سکول حکومتی انتظام کے تحت آ گیا تھا۔ وہ کہتی ہیں: نیشنلائزیشن کے بعد کی بات ہے۔ سکولوں کے علمی اور ادبی مقابلہ جات ضلعی صدر مقام، جھنگ میں ہوا کرتے تھے۔ ہمارے سکول سے بھی طلبہ تقریر اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ساتھ جانے کی ڈیوٹی میری اور صغریٰ مرزا کی ہوتی تھی۔ ہم لوگ بالعموم گورنمنٹ گرلز ہائی سکول، جھنگ صدر میں ٹھہرا کرتے تھے لیکن جب مذہبی منافرت کی وجہ سے وہاں

ٹھہرنا مشکل ہوگیا تو ہم ماسٹر منیر احمد کے گھر قیام کرنے لگے جو ایک احمدی ٹیچر تھے۔ ہمارے طلبہ بعض اوقات ان مقابلوں میں انعام جیت کر بھی لایا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کا گھر سکول سے تقریباً ملحق تھا۔ حبیبہ بتاتی ہیں: میاں صاحب گھر ہوتے تو آدھی چھٹی کے وقت اپنے گیٹ پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کی جیبیں ٹافیوں سے بھری ہوتی تھیں جو وہ بچوں میں تقسیم کرتے جاتے۔ آہستہ آہستہ بچوں کو پتا چل گیا کہ یہاں سے ٹافیاں مل سکتی ہیں چنانچہ آدھی چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی علی الخصوص نرسری اور پریپ کے بچے میاں صاحب کے گھر کی طرف بھاگ اٹھتے اور اگر آپ وہاں موجود ہوتے تو آپ پر یلغار کر دیتے۔ بعض شرارتی بچے آگے بڑھ کر اچھل اچھل کر آپ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ میاں صاحب اس صورتِ حال سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے اور اگر کبھی محسوس فرماتے کہ کوئی بچہ آپ کی طرف بڑھنے سے جھجک رہا ہے تو آپ اسے بے تکلفانہ آواز دے کر فرماتے: دیکھو بیٹے! میرے پاس کیا ہے۔ بچہ قریب آتا تو آپ جیب سے ٹافی نکال کر اسے دے دیتے۔ جب تک آپ کے پاس ٹافیوں کا سٹاک ختم نہ ہو جاتا آپ وہیں کھڑے رہتے۔ یہ تھا بچوں کے ساتھ آپ کی شفقت کا ایک نمونہ۔

سکول کے نلکے کا پانی شیریں نہ تھا تاہم بچے یہی پانی پینے پر مجبور تھے۔ دراصل وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ میٹھا پانی ابھی عام نہ ہوا تھا اور ربوہ کے بہت سے گھرانے کڑوا کسیلا پانی پینے کے عادی تھے لہٰذا عموی طور پر سکول کا پانی بچوں کی طبیعت میں قابلِ ذکر انقباض پیدا نہ کرتا تاہم انتظامیہ کو احساس تھا کہ اس صورتِ حال کا تدارک ہونا چاہیے۔ حبیبہ کہتی ہیں: مرزا خورشید احمد کی رہائش قریب تھی چنانچہ انہوں نے اپنے مکان سے باہر ایک نلکا لگوا دیا جس کا پانی قابلِ برداشت تھا۔ سکول کی مددگار کارکنات، راج بی اور ہاجرہ یہ پانی بالٹیوں میں بھر بھر کے لاتیں اور گھڑوں میں ڈالتی جاتیں۔

اس سکول کے واحد کلرک کا نام محمد الیاس تھا۔ بہت محنتی کارکن تھے۔ انہوں نے نیشنلائزیشن کے بعد یہ سکول جوائن کیا اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ ماشاء اللہ حیات ہیں اور محلّہ دارالعلوم شرقی میں مقیم ہیں۔

حبیبہ کہتی ہیں: باجی ارشاد کی ایک اور بات یاد آ گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی تو سیالکوٹ، قصور اور بعض دیگر مقامات کی احمدی فیملیز اپنے گھروں سے اجڑ کر ربوہ ہجرت پر مجبور ہو گئیں اور ایک لمبا عرصہ یہاں مقیم رہیں۔ کچھ خاندان تو واپس ہی نہیں گئے۔ اِن خاندانوں کے اُن بچوں کو جو سکول میں داخلے کی عمر میں تھے باجی نے آنکھیں بند کر کے سکول میں داخل کر لیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان پریشانِ حال خاندانوں کی ری ہیبلیٹیشن ہو سکے اور ان کے بچوں کا تعلیمی سال ضائع نہ ہو۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض بچے اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے شاید اس سکول میں داخلہ کے اہل نہ تھے تاہم باجی کی اس فراخدلانہ پالیسی کو عمومی طور پر بہت سراہا گیا۔ ہم اساتذہ نے ان بچوں پر خوب محنت کی اور ان کی کمی پوری کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ باقی بچوں کے ساتھ چل پڑیں۔ الحمدللہ اس حوالے سے بعد میں کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کے صاحبزادے، مرزا وقاص احمد یوں تو ناصر کنڈرگارٹن میں پڑھتے تھے البتہ حبیبہ کو انہیں ان کے گھر جا کر پڑھانے کی سعادت حاصل رہی۔ ہاں! آپ کی صاحبزادی امۃ الوارث ان کی شاگرد رہی ہیں۔ آٹھویں جماعت تک وہ اس بچی کی کلاس انچارج تھیں اور نویں اور دسویں میں انہوں نے اسے مطالعہ پاکستان کا مضمون پڑھایا۔

حبیبہ مجید کی باتیں تمام ہوئیں۔ اب ہم اسی سکول کی ایک اور معلمہ، بشریٰ پروین سے آپ کی ملاقات کرا رہے ہیں جن کے والدِ بزرگوار کا نام عطا الٰہی اور خاوند کا نام عبدالصمد رفیق تھا اور جو ۱۹۷۶ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک اس سکول میں پڑھاتی رہیں۔

بہت سے قارئین یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ ان کی زندگی عجیب و غریب حادثات سے عبارت ہے۔ وہ بہت چھوٹی تھیں جب ان کے والد جو پاکستان نیوی میں ملازم اور ماہر تیراک تھے دریائے چناب کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ شادی ہوئی تو ان کے خاوند کراچی اور حب کے درمیان کسی جگہ ایک حادثے کا شکار ہو کر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔

جہاں تک ان کے والدِ بزرگوار والے اندوہناک حادثے کا تعلق ہے، یہ واقعہ ۱۹۵۳ء میں ہوا جب میری عمر بمشکل نو سال تھی۔ میں نے اُن دنوں اپنے گھر میں ہونے والی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ مرحوم رشتے میں ہماری ایک ممانی، امۃ الحفیظ کے عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے میری نظر سات اکتوبر ۱۹۵۳ء کے الفضل میں شائع شدہ اس حادثے کے تفصیلی اعلان پر پڑ گئی جو جلال الدین اختر کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے یہ اعلان:

''برادرِ عزیز چوہدری عطاء الٰہی صاحب ابن جناب ماسٹر فضل الٰہی صاحب، کارکن بیت المال ۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء ساڑھے گیارہ بجے دوپہر دو خورد سال برادرانِ نسبتی (جن میں ایک کی عمر تیرہ سال اور دوسرے کی گیارہ سال ہے) کے ہمراہ دریائے چناب پر غسل کے ارادہ سے گیا مگر دورانِ غسل قضا نے ایسا گھیرا کہ باوجود اچھا تیراک ہونے کے موت کے زبردست پنجہ سے نجات نہ حاصل کر سکا اور اس کے ڈوبنے کے ڈھائی گھنٹہ بعد لاش برآمد کی گئی جو ڈاکٹر صاحب اور پولیس کی محکمانہ کارروائی کے بعد پانچ بجے شام برائے تدفین متعلّقین کے سپرد کی گئی۔ غسل دینے کے بعد مرحوم کی نمازِ جنازہ تین چار سو کے مجمع نے ادا کی اور ایک محزون و غمزدہ انبوہ نے اسے سپردِ خاک کر دیا۔

عزیزم مرحوم رائل پاکستان نیوی میں گزشتہ نو سال سے ملازم تھا۔ اس کے بعض رفقا سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک فرض شناس، حسّاس اور مستعد کارکن تھا۔ طبیعت بے حد سادہ، نیک اور محجوب پائی تھی۔ حسنِ کارکردگی کی وجہ سے محکمانہ طور پر درخشاں مستقبل متوقع تھا مگر موت نے جوہر نہ کھلنے دیئے۔ احمدیت سے اسے ایک مضبوط تعلق تھا۔ چونکہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اسے اکثر بیرونی ممالک میں جانا پڑتا تھا اس لیے جب اور جہاں بھی ممکن ہوا...... وہاں کے احمدیوں سے ملتا تاکہ سلسلے کے حالات سے باخبر رہے۔''

جیسا کہ میں اشارۃً ذکر کر چکا ہوں مرحوم میری امی کے چچازاد بھائی، مرزا محمود احمد (جو لمبا عرصہ تلمبہ

اور کبیروالا کے سکولوں میں تعینات رہے اور جن کے اشعار الفضل اور بعض جماعتی جرائد میں بکثرت شائع ہوتے رہتے تھے) کے ہم زلف تھے۔ مرزا محمود احمد کئی سال پہلے وفات پا چکے ہیں البتہ ان کی اہلیہ امۃ الحفیظ خدا کے فضل سے حیات ہیں اور ربوہ ہی میں مقیم ہیں۔ میں نے ان سے اس واقعے کی تفصیلات بیان کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے اپنے بیٹے، مرزا رفیق احمد عابد کے ذریعے مندرجہ ذیل نوٹ لکھ کر بھجوایا۔ اس نوٹ سے الفضل میں شائع ہونے والی خبر کی کچھ مزید وضاحت ہوتی ہے لہٰذا اسے بھی شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔ موصوفہ بیان کرتی ہیں:

''عطاء الٰہی کے والدِ بزرگوار، ماسٹر فضل الٰہی ۱۹۴۷ء میں قادیان سے ہجرت کے بعد ابتداءً سیالکوٹ میں آباد ہوئے لیکن ۱۹۵۰ء میں ربوہ منتقل ہوگئے۔ انہوں نے محلہ دارالیمن میں اپنا ذاتی مکان بنایا اور صدر انجمن احمدیہ میں کارکن کی حیثیت سے پانچ سال خدمات انجام دیں۔

جہاں تک عطا الٰہی کا تعلق ہے وہ ۱۹۴۷ء سے پاکستان نیوی میں بطور سیلر ملازم تھے۔ وہ انتہائی ملنسار، اطاعتِ امام کے جذبہ سے سرشار، مخلص احمدی تھے۔ ان کی شادی، چوہدری غلام محمد اوورسیئر کی بیٹی، امۃ القیوم سے ہوئی۔ وہ ایک محبت کرنے والے شوہر اور پیار کرنے والے باپ تھے۔ وہ چند روزہ رخصت پر کراچی سے ربوہ آئے ہوئے تھے۔ اسی دوران ایک روز اپنی اہلیہ کے ہمراہ دریائے چناب پر کپڑوں کی دھلائی سے فراغت کے بعد اپنے دو برادرانِ نسبتی کے ہمراہ نہانے کی غرض سے دریا میں اتر گئے۔ وہ بہت اچھے تیراک تھے لیکن چند ہی لمحوں کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھ اس طرح پھیلائے جیسے مدد کے لیے بلا رہے ہوں اور پھر پانی میں غائب ہوگئے۔ وہاں موجود افراد نے شور مچا دیا اور اس حادثے کی اطلاع فوری طور پر ربوہ پہنچ گئی۔

اس وقت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد بیت مبارک سے نماز ظہر سے فارغ ہوئے ہی تھے۔ وہ کچھ احباب کو لے کر فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچے اور گھنٹوں کی تھکا دینے والی کوشش کے بعد مرحوم کی نعش باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ معلوم ہوتا ہے دریا میں اترتے ہی مرحوم کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور ان کا جسم دریا برد ہوگیا۔''

چھوٹی عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے والی بشریٰ پروین نے زمانے کی نہ جانے کون کون سی سختیاں جھیل کر میٹرک اور اس کے بعد پی ٹی سی کا امتحان پاس کیا اور پھر سرکاری ملازمت کے حصول میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ کہتی ہیں: حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں میرا تقرر ۲ مئی ۱۹۷۴ء کو میٹرک پی ٹی سی ٹیچر کے طور پر ہوا تو میری پہلی پوسٹنگ لنگر مخدوم میں ہوئی۔ میری رہائش ربوہ میں تھی اور میں وہاں پڑھا کر روزانہ گھر واپس آ جایا کرتی تھی تاہم ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کے افسوسناک واقعات کے بعد میری بھی مخالفت شروع ہوگئی۔ میں ان حالات کی وجہ سے سخت پریشان تھی۔ میرا تبادلہ ایک دو جگہوں پر ہوا لیکن کسی جگہ سکون میسر نہ آ سکا۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کے پاس حاضر ہوگئی۔ آپ نے ازراہِ شفقت اسی وقت مجھے ایک رقعہ راجہ غالب احمد کے نام دے دیا جو اُن دنوں سرگودھا بورڈ کے چیئرمین یا شاید سیکرٹری تھے۔

میں نے ان سے ملاقات کی تو انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ان شاء اللہ میرا کام جلد ہی ہو جائے گا اور واقعی ہوا بھی ایسے ہی۔ چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ میرا تبادلہ اس سکول میں ہوگیا جہاں مس عطیہ کے ترکِ ملازمت کی وجہ سے ایک سِیٹ خالی ہوئی تھی۔

بشریٰ پروین کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس سکول کی ملازمت کے دوران انہیں خاندان حضرت مسیح موعود کے بہت سے بچوں اور بچیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ کہتی ہیں: اس وقت ان تمام بچوں کی فہرست تیار کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا مگر جو نام فوری طور پر میرے ذہن میں آ رہے ہین ان میں بی بی امۃ القدوس کے دو بچے ناصر اور احسان شامل ہیں۔ اسی طرح مجھے مرزا رفیع احمد کی بیٹی وردہ کو بھی پڑھانے کا موقع ملا۔ ان بچوں کی معلّمہ ہونے کے ناتے بشریٰ پروین کو حضرت مسیح موعود کے خاندان کی بہت سی خواتین سے ملنے جلنے کا موقع ملتا رہا اور انہیں خاندان کی بعض شادیوں میں شمولیت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ وہ بتاتی ہیں: میں نے ان شادیوں میں جتنی سادگی دیکھی باہر کہیں نظر نہیں آئی۔ حضور کے خاندان کو کس چیز کی کمی ہے؟ اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن انہوں نے سادگی کا ایک ایسا معیار قائم کر دکھایا ہے جو ہم سب کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان شادیوں میں غربا و مساکین بھی بکثرت مدعو ہوتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

موصوفہ خاندانِ حضرت مسیح موعود کی خواتین کے حسنِ اخلاق کے بہت سے واقعات سناتی رہتی ہیں۔ وہ بتایا کرتی ہیں: بی بی امۃ القدوس اکثر سکول آتیں اور بہت عزت اور پیار سے ملتیں۔ اب بھی کہیں اتفاقاً ملاقات ہو جائے تو گلے لگا لیتی ہیں اور لوگوں کو بتاتی ہیں کہ یہ میرے ناصر اور احسان کی ٹیچر ہیں۔ ایک دفعہ پاکستان سے باہر گئیں تو نہ صرف میرے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ لے کر آئیں بلکہ انہوں نے مس کوثر اور مس حبیبہ مجید کو بھی یاد رکھا۔

بشریٰ پروین کو یہ بھی یاد ہے کہ صاحبزادی امۃ الباسط المعروف آپا باچھی کے پاس ایک بے سہارا عورت رہا کرتی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں، شگفتہ اور صفیہ۔ آپا باچھی نے ان دونوں بچیوں کو اس سکول میں داخل کرا رکھا تھا۔ صفیہ ان کے پاس پڑھتی تھی۔ وہ کہتی ہیں: مجھے یاد ہے آپا باچھی کئی بار سکول آ کر صفیہ کی تعلیمی پراگریس کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ انہیں ان بچیوں کا بہت فکر رہتا ہے اور ابھی سے ان کے لیے زیور بھی بنوا لیا ہے تاکہ جب وہ بڑی ہو کر پیا دیس سدھارنے کے لائق ہو جائیں تو اس وقت انتظامات میں زیادہ دقت نہ ہو۔

وہ مزید کہتی ہیں: ایک بار صاحبزادی امۃ الحکیم المعروف آپا حکمی کے گھر مظفر آباد سے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے اور صاحبزادہ مرزا طاہر احمد کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں مقیم تھے۔ ان کی دو بچیاں بھی میرے پاس پڑھتی تھیں۔ بڑی لڑکی بہت سمجھدار تھی جب کہ چھوٹی ذرا لاپروا تھی۔ آپا حکمی خود اسے پڑھاتیں۔ وہ ان کی تربیت کے بارے میں اس قدر فکرمند رہتیں کہ ایک دن اس کے پاس ایک نیا بیگ دیکھا تو مجھے بلایا اور کہنے

لگیں: اس سے پوچھو اس نے یہ بیگ کہاں سے لیا ہے، میں نے تو لے کر نہیں دیا۔

صاحبزادی امۃ النصیر جو بی بی چھیرو کے نام سے مشہور ہیں کا ذکر آ جائے تو وہ بتانے لگتی ہیں: ان کی خادمہ کی پانچ چھ سال کی بیٹی ہمارے پاس پڑھتی تھی۔ اکثر قاعدہ پھاڑ دیتی یا گم کر دیتی۔ بی بی ضعیف ہونے کے باوجود کئی بار اس کے متعلق پوچھنے سکول آ جاتیں اور اسے خود پڑھاتیں۔ اسی طرح سیّدہ مہر آپا کے پاس ایک بچی رہتی تھی جو ہمارے پاس پڑھتی تھی۔ موصوفہ خود کئی دفعہ اس کا پتا کرنے سکول آتیں۔ جب مہر آپا فوت ہو گئیں تو یہ کچھ عرصہ آپا نصیرہ کے گھر میں رہی اور پڑھ لکھ کر ٹیچر بن گئی۔

دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی کسی بھی سکول کا ایک اہم فنکشن سمجھا جاتا ہے۔ بشریٰ پروین بتاتی ہیں: چھوٹی آپا، مہر آپا، آپا طاہرہ، صاحبزادی امۃ القدوس اور بی بی چھیرو اس موقع پر بالعموم سکول تشریف لاتیں اور بچیوں کے پروگرام دلچسپی سے دیکھتیں۔ چھوٹی آپا دعا کرواتیں اور قیمتی نصائح سے نوازتیں۔ ایک دفعہ سکول میں بچیاں ایک دوسرے کی تصویریں بنانے لگیں تو چھوٹی آپا نے منع فرمایا کہ ایسا نہ کیا جائے کیونکہ ان تصاویر کی وجہ سے بعد میں بعض دفعہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

بشریٰ پروین یہ بھی بتاتی ہیں کہ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث افریقہ کے دورہ پر گئے تو ایک افریقی احمدی نے اپنی ایک بچی کو حضور کی کفالت میں دے دیا تھا۔ اس کا نام ولیّہ تھا۔ بشریٰ اس بچی کو بھی پڑھاتی رہی ہیں۔ بعد میں اس بچی کی شادی ایک افریقن مربّی سے جو جامعہ احمدیہ، ربوہ کے فارغ التحصیل تھے ہو گئی۔

سکول میں پینے والے پانی کی کمی کا ذکر آپ باقی معلّمات کی زبانی بھی سن چکے ہیں۔ بشریٰ پروین کی روایت کے مطابق: ہمارے سکول میں پانی نہیں تھا۔ آپا حکمی خود بھی قیمتاً پانی لیتی تھیں۔ بچے رِیسیس میں ان کے گھر جا کر پانی پی آتے تھے۔ بعد میں ان کے ایک بیٹے نے سکول میں واٹر کولر لگوا دیا تھا۔

اس زمانے کے بچے بڑے فرمانبردار، محنتی اور اساتذہ کی عزت کرنے والے تھے۔ ایک دفعہ ایک سرکاری ٹیم سکول کے معاینہ کے لیے آئی۔ اس وقت آدھی چھٹی ہو چکی تھی۔ میڈم نے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ اس ٹیم کو نمٹاتے ہوئے چھٹی کا وقت ہو گیا۔ میڈم یہ دیکھنے کے لیے کہ سارے بچے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں میری کلاس میں آ چکیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بچے بیٹھے اپنا سبق یاد کر رہے ہیں۔ میڈم نے ان سے کہا کہ آپ چھٹی کر لیں تو انہوں نے جواب دیا کہ جب تک ہماری ٹیچر خود آ کر ہمیں چھٹی نہیں دیں گی ہم نہیں جائیں گے۔ میڈم نے واپس آ کر مجھے کہا کہ میں بچوں کو چھٹی دے کر واپس آؤں۔ میڈم نے بعد میں کئی بار اس بات کا ذکر تعریفی رنگ میں سٹاف کے سامنے کیا۔

ہمارا سکول ابتداءً دو کوٹھیوں پر مشتمل تھا جو خاندان کی بعض خواتینِ مبارکہ کی ملکیت تھیں۔ یہ کوٹھیاں ہائی سکول کی ضروریات سے کم پڑ گئیں تو ابتدائی کلاسیں کبھی دارالصدر غربی اور کبھی دارالصدر شمالی میں کرائے کی عمارات میں منعقد ہونے لگیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ سکول پھر اکٹھا ہو گیا اور جیسے تیسے بیگم صاحبہ مرزا وسیم احمد کی کوٹھی میں گزارا ہوتا رہا۔ ۲۰۰۸ء میں سکول محلّہ دارالشکر میں سرکاری عمارت میں شفٹ ہو گیا۔

۱۹۷۶ء میں جب میں اس سکول میں آئی تو میڈم امۃ العزیز ارشاد ہیڈ مسٹریس تھیں۔ معلّمات میں مس امۃ الحفیظ، مس زاہدہ سلطانہ، طاہرہ ہاشمی اور امۃ الرشید شوکت شامل تھیں۔ مس ذکیہ، مس صغریٰ مرزا، مس حبیبہ مجید، مس امۃ الفردوس نعیم وغیرہ بھی یہیں ہوا کرتی تھیں۔ مس زاہدہ سلطانہ ہاشمی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو پڑھایا بلکہ ان کی بیٹی کو بھی تعلیم دی اور خاندان کے بہت سے دیگر بچوں کو بھی پڑھایا۔

سکول میں راج بی بی، ہاجرہ بی بی اور جیواں مددگار کارکنات تھیں جو اپنی ڈیوٹی بڑی ایمانداری سے سرانجام دیتیں۔ بچوں کو بھی عزت سے مخاطب کرتیں اور اساتذہ سے بھی عزت و احترام سے پیش آتیں۔ اب یہ سب خواتین وفات پا چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے مغفرت کا سلوک فرمائے اور درجات بلند کرے آمین۔

اس سکول کا نام حضرت مصلح موعود کے الہامی نام ''فضلِ عمر'' پر رکھا گیا تھا۔ اس نام کی برکت سے سکول میں پڑھنے والے کئی بچے ڈاکٹر اور استاد بنے۔ خلیل ڈھلوں کی بیٹی خالدہ ڈھلوں جو مجھ سے پڑھتی رہی تھی ڈاکٹر بنی اور کچھ عرصہ فضل عمر ہسپتال میں بھی کام کیا۔ بشریٰ حکمت نرس تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بھانجی، فرح تبسم میرے پاس پڑھتی تھیں۔ وہ تینوں خدا کے فضل سے ڈاکٹر بنیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے ایک بار فرح تبسم مجھ سے ملنے آئی اور اس نے بتایا کہ وہ مجھے دو خوشخبریاں سنانا چاہتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس نے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیا ہے اور دوم یہ کہ وہ لاہور سے خود گاڑی ڈرائیو کر کے ربوہ آئی ہے۔ آپا طاہرہ صدیقہ حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثّالث بھی اسی سکول میں پڑھی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر بنیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے مسیح کے تیسرے خلیفہ کی زوجیت بھی عطا کی۔

میں جولائی ۲۰۱۳ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئی۔ جیسا کہ شروع میں بیان کر چکی ہوں میری ملازمت کا سارا عرصہ اسی سکول میں گزرا۔ اس زمانے کی بہت سی خوبصورت یادیں میرے دل و دماغ پر حاوی ہیں لیکن ان سب کا بیان اس وقت ممکن نہیں۔

یہ تو تھا سکول کی چار معلّمات یعنی امۃ القدیر ارشاد، فریدہ بشیر، حبیبہ مجید اور بشریٰ پروین کا قدرے تفصیلی ذکر۔ جہاں تک اس سکول کی باقی معلّمات کا تعلق ہے ان میں سے امۃ الرشید مولوی عطا محمد، ہیڈ کلرک دفتر بہشتی مقبرہ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی ہیں۔ وہ سکول اور کالج میں آپی کی کلاس فیلو تھیں اور ان کا ہمارے گھر بکثرت آنا جانا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں اور اہلِ خانہ میں ''اچھی'' کے نام سے معروف تھیں۔ امۃ الرشید کی کئی بہنیں اور بہت سے بھائی تھے۔ بھائیوں کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ خلیل، مجید، رفیق، ودود، جلیل اور نصیر۔ خلیل کسی زمانے میں خلافت لائبریری، ربوہ میں کلرک ہوا کرتے تھے لیکن وہاں سے کراچی اور کراچی سے کینیڈا منتقل ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے باقی بھائیوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ وہ اور ان کے سب سے چھوٹے بھائی، نصیر اَب وفات پا چکے ہیں۔ ودود میرے ہم جماعت اور قریبی دوست تھے۔

''اچھی'' نے اپنی شادی سے کچھ عرصہ پہلے اس سکول میں پڑھایا۔ ان کی شادی چوہدری حمید اللہ،

وکیل الاعلیٰ تحریک جدید کے بھائی، عبدالغنی سے ہوئی جو مرچنٹ نیوی میں چیف پیٹی افسر ہوا کرتے تھے۔ وہ لمبا عرصہ کراچی رہیں لیکن اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اب کینیڈا منتقل ہو چکی ہیں جہاں ان کا ایک بیٹا لطیف احمد خاور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے جب کہ دوسرا بیٹا، بابر جرمنی میں ہے۔

امۃ السلام ان ہی امۃ الرشید کی بڑی بہن تھیں۔ وہ راجہ نسیم احمد حال جرمنی کی اہلیہ تھیں۔ انہوں نے چند سال پہلے جرمنی میں وفات پائی اور ان کے بھائی رفیق کی روایت کے مطابق جرمنی میں ہی دفن ہوئیں۔ اس سکول میں ان کے عرصہ ملازمت کا تعیّن نہیں ہو سکا تاہم رفیق کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ یہاں پڑھایا تھا۔

عطیہ بیگم حضرت حافظ غلام رسول وزیر آبادی کی صاحبزادی اور قاضی فیملی کے ایک رکن، قاضی عبدالوحید کی اہلیہ تھیں۔ قاضی عبدالوحید نے کچھ عرصہ فوج میں گزارنے کے بعد اپنی زندگی خدمتِ سلسلہ کے لیے وقف کر دی تھی تاہم ۱۹۵۳ء میں کمزوری صحت کی بنا پر انجمن کی ملازمت سے فراغت حاصل کر لی۔ وہ اس کے بعد چند ہی سال زندہ رہے اور ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کو صرف تنتالیس سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرے میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات سے عطیہ بیگم پر گویا مشکلات کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر انہوں نے اپنی بیوگی کا سارا وقت انتہائی صبر و استقامت سے گزارا۔ انہوں نے سلائی میں ڈپلومہ کر لیا تھا چنانچہ وہ اس سکول میں بچیوں کو سلائی سکھانے اور دینیات پڑھانے پر مامور ہو گئیں۔ وہ تقریباً پندرہ سال یہ خدمت بجا لاتی رہیں۔

ان کی ایک ماموں زاد بہن سعیدہ احسن، لیکچرر جامعہ نصرت نے اپنی کتاب ''حافظ محمد حسین'' میں موصوفہ کا قدرے تفصیلی ذکر کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ طبعاً بہت معصوم، ہمدرد، نماز کی بے حد پابند، عاشقِ قرآن، صفائی پسند اور پاکیزہ حسِ مزاح کی مالک تھیں۔ وہ کم و بیش بارہ سال تک لجنہ اماء اللہ، محلّہ دارالرحمت وسطی کی صدر رہیں۔ خاندان حضرت مسیح موعود کے ساتھ بے حد عقیدت رکھتی تھیں اور جلسہ سالانہ کے موقع پر لگنے والی صنعتی نمائش کی کامیابی کے لیے سر توڑ کوشش کرنے والی تھیں۔

۱۹۷۶ء میں وہ اپنے اکلوتے صاحبزادے، قاضی مبارک احمد (جو سکول اور کالج میں میرے ساتھ رہے اور میرے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں) کے پاس کینیڈا منتقل ہو گئیں۔ وہ تین سال وہاں رہیں تاہم اپنی علالت کے باعث ۱۹۷۹ء میں پاکستان واپس آ گئیں۔ ان پر ایک ایسی بیماری نے حملہ کر دیا تھا جس سے ان کا جسم آہستہ آہستہ مفلوج ہوتا گیا۔ انہوں نے اسی کیفیت میں ۲ فروری ۱۹۸۱ء کو وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

مبارک کے بیان کے مطابق موصوفہ کو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کو قرآن پاک پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ مرزا منصور احمد کے گھر جا کر ان کے دونوں صاحبزادگان کو قرآنِ پاک کی تعلیم دیتی تھیں۔ ان کے باقی نمایاں شاگردوں میں مرزا رفیع احمد کے بیٹے، مرزا عبدالصمد؛ مرزا انور احمد کے بیٹے، مرزا احسن احمد اور افضل بردرز، گول بازار، ربوہ والے قریشی محمد افضل کے بیٹے، ہارون قریشی مقیم کینیڈا شامل ہیں۔

اس سکول کی ایک اور معلمہ، بشریٰ شاہدہ مولوی فضل دین وکیل کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی

۱۹۶۴ء میں شیخ محبوب عالم خالد کے صاحبزادے منور شمیم خالد سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کے نتیجے میں انہیں ایک بیٹے، انور خالد سے نوازا۔ بیٹا چار سال کا ہوا تو وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء کو اسے خدا کے سہارے چھوڑ کر اچانک راہیِ ملکِ عدم ہو گئیں۔ سنتے ہیں ان کے دل میں کوئی خلقی نقص تھا جو اُن کی بظاہر بے وقت موت پر منتج ہوا۔

سکول کی معلّمات میں سے ایک اور نام صغریٰ مرزا کا ہے جو مرزا عبدالعزیز نامی ایک بزرگ کی صاحبزادی اور محمود احمد باجوہ، انسپکٹر الفضل کی اہلیہ تھیں۔ وہ نصرت گرلز ہائی سکول کی سابق طالبہ تھیں جہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے ایس وی بھی کر لیا تھا۔ انہوں نے ۱۶ مئی ۲۰۰۷ء کو تقریباً چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی اور بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

انہوں نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بیٹا، مقبول احمد باجوہ اور ایک بیٹی، رضوانہ شہناز انگلستان میں آباد ہو چکی ہیں جب کہ ایک بیٹی، بشریٰ فرناز اہلیہ اعجاز احمد محلّہ دارالرحمت، ربوہ میں مقیم ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق موصوفہ نے کم و بیش تیس سال اس سکول میں پڑھایا اور تکمیلِ ملازمت کے بعد ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئیں۔ اس عرصے میں انہوں نے ہزاروں طلبہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا تاہم ان کی نمایاں شاگردوں میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کی بیگم کے علاوہ ڈاکٹر خالد تسلیم ابن مرزا مبارک احمد اور میر غلام احمد فرخ ابن میر محمود احمد ناصر شامل ہیں۔

صغریٰ مرزا کے بعد اب کچھ ذکر استانی امۃ الرشید شوکت کا جو اپنے مخصوص حلقے میں ''آپا شوکت'' کے نام سے معروف تھیں اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۸ء تک نصرت گرلز ہائی سکول میں دینیات پڑھانے پر متعیّن رہی تھیں۔ ان کے بیٹے، ملک مجیب الرحمٰن مقیم امریکہ کی روایت کے مطابق انہیں نصرت گرلز ہائی سکول سے فراغت پر پندرہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز چھوٹی آپا کے گھر لجنہ کے کسی کام سے گئیں۔ اتفاق سے کے جی سکول جو اُن ہی دنوں جاری ہوا تھا، کی ہیڈ مسٹریس بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی آپا نے ہیڈ مسٹریس سے کہا کہ انہیں دینیات پڑھانے کے لیے رکھ لیا جائے۔ اُس وقت یہ سکول پرائمری تک تھا چنانچہ موصوفہ پہلے پرائمری سکول میں پڑھاتی رہیں لیکن بعد میں جب اس سکول میں مڈل اور ہائی کلاسز جاری ہو گئیں تو روزانہ کبھی سات اور کبھی آٹھ پیریڈ دینیات اور عربی کے لیتی رہیں۔ دینیات کے کورس میں طلبہ اور طالبات کو چوتھی کلاس تک قرآن کریم ناظرہ ختم کرایا جاتا، پانچویں میں ایک پارہ باترجمہ پڑھایا جاتا اور دسویں تک پورا قرآن کریم باترجمہ ختم کرایا جاتا۔ اس سکول میں موصوفہ نے ۱۹۸۰ء تک کل بائیس سال ملازمت کی۔

مجیب بتاتے ہیں: موصوفہ لجنہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ یہ شوق تب سے تھا جب سیّدہ امِ طاہر لجنہ کی صدر تھیں۔ اُسی زمانے میں دینیات کلاس کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور سیّدہ امِ طاہر کے ہاتھوں میڈل وصول کیا۔ ان ہی دنوں حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی سے ملنے گئیں تو حضور نے انہیں دیکھ کر فرمایا: ''شوکت! تمہارا کیا حال ہو گا جب تم لندن میں کھڑی برقع پہن کر تقریر کر رہی ہو گی؟'' کہاں قادیان اور کہاں لندن۔ اس زمانے کے حالات میں وہ لندن جانے کا سوچ بھی نہ سکتی تھیں مگر خدا کی قدرت کہ تیس سال کے بعد انہیں ۱۹۷۷ء میں لندن

جانے اور لجنہ کے جلسوں میں تقریریں کرنے کا موقع ملا اور حضور کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرّابع نے ان کی وفات کے موقع پر اور ایک اردو کلاس میں بھی اس بات کا ذکر فرمایا تھا۔

وہ اٹھارہ سال مصباح کی ایڈیٹر رہیں۔ عمر کے آخری پندرہ سال کیلگری (کینیڈا) میں گزارے۔ ۱۹۹۹ء میں وہیں وفات پائی اور ربوہ میں بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔''

آپ نے اس سکول کی ابتدائی معلّمات میں امۃ الحفیظ کا نام بھی دیکھا ہوگا۔ موصوفہ جو حافظ عبدالسّلام، وکیل المال تحریک جدید کی صاحبزادی تھیں اپنے چھوٹے بھائی، مرزا طاہر احمد مقیم گلبرگ، لاہور کے بیان کے مطابق ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۰ء تک کے جی سکول میں پڑھاتی رہیں۔ اپنی ناکام شادی کے بعد وہ اپنی بیٹی، نصرت کے ہمراہ اپنے والدِ بزرگوار کے ساتھ ہی مقیم رہیں۔ شائد وہ اپنی ملازمت جاری رکھتیں لیکن کمر کی شدید تکلیف (جس میں آپریشن کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوسکا تھا) کے باعث معذوری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئیں اور ان کے آخری پچیس سال وِیل چیئر پر گزرے۔ انہوں نے ۲۳ مارچ ۲۰۰۶ء کو وفات پائی۔ موصیہ تھیں چنانچہ بہشتی مقبرے میں دفن ہوئیں۔

زاہدہ ہاشمی جو اس سکول کی بالکل ابتدائی ٹیچرز میں سے تھیں ماہل پور ضلع ہوشیار پور کے شاہ دین ہاشمی کی صاحبزادی؛ صدر انجمن احمدیہ کے ایک معروف کارکن، مختار احمد ہاشمی کی چھوٹی بہن؛ صدر انجمن احمدیہ کے ایک کارکن، محمد اکرم کی اہلیہ اور ضیاء الاسلام پریس والے گلزار ہاشمی کی پھوپھی تھیں۔ شروع ہی سے لائق طالبات میں شمار ہوتی تھیں چنانچہ وہ ۱۹۵۴ء کے میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی کی جملہ طالبات میں دوم رہیں چنانچہ الفضل (۱۵ جون ۱۹۵۴ء) نے ان کی کامیابی کی خبر نمایاں طور پر شائع کی۔ یاد رہے کہ زاہدہ ہاشمی نے یہ امتحان نصرت گرلز ہائی سکول سے دیا تھا تاہم معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بعد کی تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کی اور بی اے بی ایڈ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ ۱۹۵۷ء میں اس سکول میں پڑھانے پر مامور ہوئیں اور ۱۹۹۶ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک یہیں رہیں۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں وہ فضلِ عمر ہسپتال کے عقب میں مقیم تھیں۔ انہوں نے ۱۲ ستمبر ۲۰۱۶ء کو وفات پائی اور اگلے روز جو عیدالاضحیٰ کا دن تھا ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی تدفین بہشتی مقبرے میں عمل میں آئی۔

میں نے قریباً ایک ڈیڑھ سال پہلے ان سے فون پر درخواست کی تھی کہ وہ مجھے کے جی سکول کے اپنے زمانے کے حالات لکھ کر دیں اور انہوں نے بخوشی وعدہ بھی کیا تاہم جب میں نے دوسری بار اس معاملے میں پیش رفت کا جائزہ کے لیے رابطہ کرنا چاہا تو فون ان کے شوہر نے پکڑ لیا اور کہا کہ چونکہ میں سکول کے حالات اپنے شوق سے جمع کر رہا ہوں اور جماعتی منشا واضح طور پر اس کے پیچھے نہیں ہے لہٰذا وہ زاہدہ ہاشمی کو اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ مجھے کچھ لکھ کر دیں۔ میں نے اس وقت تو کج بحثی مناسب نہ سمجھی لیکن بعد میں ایک بار ان کے پاس حاضر ہوکر اپنی درخواست دہرائی تاہم وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے اور انہوں نے مجھے دروازے پر کھڑے

کھڑے ہی فارغ کر دیا۔

اس سکول کی ایک اور معلّمہ زکیہ بیگم تھیں جو چوہدری غلام رسول نامی ایک بزرگ کی صاحبزادی، محمد شریف خالد پروفیسر تعلیم الاسلام کالج، ربوہ کی بھتیجی اور مظفر احمد قریشی کی اہلیہ ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز تو منڈی بہاء الدین کے کسی سکول سے کیا تھا مگر میٹرک اور گریجوایشن ربوہ سے کی اور بی ایڈ لاہور سے۔ وہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۹۷ء تک اس سکول میں پڑھاتی رہی ہیں۔ اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہیں اور محلّہ دارالصدر غربی میں رہائش پذیر ہیں۔

یہ تو تھا اس سکول کی بعض معلّمات کا ذکرِ خیر۔ جہاں تک اس سکول کے فارغ التحصیل طلبہ کا تعلق ہے ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہوگی۔ سب سے نمایاں طالب علم تو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ہیں جن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ جب میں نے اپنی یہ کتاب حضور کے ملاحظہ کے لیے ارسال کی تو حضور نے اپنے خط محررّہ ۲۶ مئی ۲۰۱۷ء میں اِس سکول کے حوالے سے اپنی بعض یادداشتیں بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''آخر پر آپ نے کے جی سکول کا ذکر کیا۔ میں بھی اس کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھا۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ ابتدا میں ہم چھ سات لڑکے لڑکیاں تھے بلکہ میں چند دن اکیلا لڑکا تھا۔ پھر یہ تعداد دس پندرہ تک ہوگئی۔ آدھی چھٹی کے وقت ہمیں سکول کی طرف سے بسکٹ وغیرہ بھی کھانے کو دیئے جاتے تھے۔ آپ نے ریحانہ ستار صاحبہ کا ذکر کیا ہے جو بڑی قواعد کی پابند ہیڈ ٹیچر تھیں۔ ریحانہ ستار صاحبہ سے خلافت کے بعد بھی ملاقات ہوتی رہی۔ انہیں وہ پرانی باتیں اور یادیں بھی یاد تھیں۔ پھر مسز قدسیہ ارشاد بھی میری استانی رہیں، اسی طرح دوسری تمام استانیاں جنہوں نے بڑی محنت سے تمام بچوں میں دنیاوی تعلیم کے علاوہ دین سے محبت پیدا کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔ اس عرصہ میں مبارک ساقی صاحب کی اہلیہ جو انگریز تھیں اور شادی سے پہلے کچھ عرصہ ربوہ میں رہیں وہ ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں اور کیونکہ ہمیں براہِ راست انگریزی سمجھنا مشکل تھا اس لیے میجر عارف زماں صاحب کی اہلیہ عموماً ان کے ساتھ کلاس میں ہوتی تھیں۔ ساقی صاحب کی شادی بھی اُنہیں دنوں میں ربوہ میں ہوئی اور وہی عورت جو چند دن پہلے بغیر پردے کے تھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ پورا نقاب گرائے ہوئے ربوہ میں پھرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ پھر ساقی صاحب کے بطور مبلغ باہر جانے کی وجہ سے جلد ہی وہ چلی گئیں۔''

حضور کی یہ یادداشتیں پڑھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے اس سکول کے ابتدائی طلبہ کے درخواست فارم، سکول کا داخل خارج رجسٹر اور پہلے پانچ سال کے حاضری رجسٹر مل جائیں تو میں اِن طلبہ کے بارے میں بعض حتمی معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں مگر افسوس مجھے ایسی کسی دستاویز تک رسائی حاصل نہیں ہوسکی۔ ہاں ایک روایت کے مطابق ۱۹۵۸ء کی کے جی وَن کلاس اور ۱۹۵۹ء کی کلاس ٹُو فارم کے حاضری رجسٹر موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس سکول کا سب سے پہلا طالب علم عمر احمد تھا جس نے شروع میں ہی سکول چھوڑ دیا تاہم جو طلبہ ان دو سالوں میں اس سکول کے مسلسل طالب علم رہے ان میں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس کا نامِ

نامی سب سے نمایاں ہے۔ رجسٹروں میں حضور کا نام ''مسرور احمد'' درج ہے۔ ان طلبہ کے کوائف جو اس عرصے میں حضور کے ساتھ رہے ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں:

عمر احمد	فروری ۱۹۵۸ء		
محمد اسلم خالد/محمد اسلم	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
توفیق کمال	فروری ۱۹۵۸ء		
انوری صوفی	فروری ۱۹۵۸ء	تا	مئی ۱۹۵۸ء
رفیق اختر	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
حمید احمد	فروری ۱۹۵۸ء	تا	جون ۱۹۵۸ء
نعیم اللہ	فروری ۱۹۵۸ء	تا	جون ۱۹۵۸ء
ناصر احمد	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
مقصود/مقصود احمد	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
علیم اختر	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
عزیز الحق/عزیز الحق بابر	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	ستمبر ۱۹۵۸ء
کلیم احمد	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	جون ۱۹۵۸ء
لطف الٰہی	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۸ء
مطہر احمد	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	جون ۱۹۵۸ء
امجد/امجد احمد	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	مئی ۱۹۵۸ء
عبد الہادی	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	مارچ ۱۹۵۹ء
مجیب الرحمٰن	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	اپریل ۱۹۵۸ء
ظفر سلیم	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
مسرور احمد	مئی ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
طارق محمود	نومبر ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
اکرام الحق	نومبر ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
ظہیر احمد	نومبر ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
منصور احمد	فروری ۱۹۵۹ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء

ان طلبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل طالبات بھی پہلی دو کلاسوں میں حضور کی کلاس فیلوز رہیں:

نسرین اختر	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
مبارکہ	فروری ۱۹۵۸ء	تا	اکتوبر ۱۹۵۸ء

خالدہ پروین	فروری ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۸ء
نصرت جہاں	فروری ۱۹۵۸ء	تا	مئی ۱۹۵۸ء
نصرت بیگم	فروری ۱۹۵۸ء	تا	مارچ ۱۹۵۹ء
صالحہ بشریٰ	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	اکتوبر ۱۹۵۹ء
یاسمین	مارچ ۱۹۵۸ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
مبشرہ حفیظ	اپریل ۱۹۵۹ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء
مسعودہ حیات	اکتوبر ۱۹۵۹ء	تا	دسمبر ۱۹۵۹ء

اس فہرست سے عیاں ہے کہ ان دو سالوں میں حضور کے ساتھ سب سے لمبا وقت گزارنے والے طلبہ و طالبات میں محمد اسلم، رفیق اختر، ناصر احمد، مقصود احمد اور نسرین اختر شامل ہیں۔

میں نے کے جی سکول کے ابتدائی طلبہ کے بارے میں یہ کوائف حضور کی منظوری سے شاملِ کتاب کئے ہیں۔ حضور نے اس منظوری کی اطلاع دیتے ہوئے میرے نام اپنے خط مرقومہ ۲۸ جون ۲۰۱۷ء میں تحریر فرمایا:

''اس میں عمر احمد غالباً مرزا عمر احمد صاحب مرحوم ابن مکرم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب مرحوم ہیں۔ اسلم خالد صاحب آج کل میرے ساتھ پی ایس کے دفتر میں ہی کام کر رہے ہیں۔ رفیق اختر روزی صاحب بھی لندن میں ہی ہیں۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے لڑکوں، لڑکیوں کو بھی پہچان لیا ہے۔

میں اس سکول میں چوتھی تک پڑھا ہوں۔ پھر کچھ دیر گھر میں پڑھ کر چھٹی میں ٹی آئی سکول داخل ہو گیا تھا اس لیے میں نے میٹرک ان میں سے اکثر سے شاید ایک سال پہلے کر لیا تھا۔ ''شاید'' اس لیے لکھ رہا ہوں کہ عمر میں جو مجھ سے ایک سال بڑے لڑکے لڑکیاں تھے انہیں کے جی سکول میں ہی ایک سال آگے کر دیا گیا تھا۔ شاید پڑھائی کا معیار دیکھ کر انہیں آگے کیا ہو لیکن اس وقت یاد نہیں۔''

یہ تو تھا اس سکول کے بعض ابتدائی طلبہ کا ذکرِ خیر۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کچھ طلبہ نے اور ان کے بعد آنے والے طلبہ میں سے بہتوں نے زندگی میں نمایاں مقام حاصل کیا ہوگا لیکن میرے جیسے کم علم کے لیے ان کی فہرست تیار کرنا ممکن نہیں۔ ہاں میری درخواست پر ڈاکٹر غلام احمد فرخ ابن میر محمود احمد نے جو اس سکول میں پڑھتے رہے اپنے زمانے کے بعض حالات لکھ کر دیئے ہیں جو شاید قارئین کے لیے اپنے اندر کچھ دلچسپی رکھتے ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے اُن کا لکھا ہوا یہ نوٹ:

''ہمارے بچپن میں یہ سکول اُمی کے اپنے مکان (جس کا نام بعد میں آپ نے ''الصفہ'' رکھا) اور سیّدہ عزیزہ بیگم حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اُم وسیم) کے مکان میں قائم تھا۔ سینئر کلاسیں اُمی کے مکان میں ہوتی تھیں اور سکول کا دفتر بھی وہیں تھا جب کہ جونیئر کلاسیں اُم وسیم کے مکان میں ہوتی تھیں۔ جب حکومتِ وقت نے ۱۹۷۲ء میں نیشنلائزیشن کی پالیسی کے تحت سکول اور کالج قومیائے تو یہ سکول بھی حکومتی تحویل میں چلا گیا لیکن ایک لمبا عرصہ تک ان ہی مکانات میں قائم رہا اور اس میں وہی ماحول قائم رہا جسے پیدا کرنے کے لیے

اسے قائم کیا گیا تھا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب مجھے اس سکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ اُمی خود مجھے لے کر گئی تھیں اور آپ کے ساتھ آپ کی ایک خادمہ، رحمت بی بی بھی تھیں۔ جس کمرے میں مجھے لے کر گئی تھیں وہ بطور دفتر استعمال ہوتا تھا۔ گو میں سکول میں داخل ہونے پر خوش تھا لیکن سکول میں رہنے پر بالکل خوش نہیں تھا۔ مجھے اب بھی اپنا رونا یاد ہے۔ مجھے نرسری میں داخل کروایا گیا تھا۔ میں نے وہاں سے چوتھی جماعت پاس کی اور پھر گھوڑا گلی میں واقع لارنس کالج میں مزید تعلیم کے لیے بھجوا دیا گیا۔

اُس زمانے میں لڑکیاں سکول میں نرسری سے میٹرک تک تعلیم پاتی تھیں جب کہ لڑکے نرسری سے پانچویں جماعت تک پڑھتے تھے۔ اس کے بعد وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول یا کسی اور سکول میں چلے جاتے تھے۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود کے ربوہ میں رہنے والے اکثر بچے اور بچیاں کے جی سکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ گو اس زمانے میں جب میں یہاں پڑھتا تھا یہ سکول حکومتی تحویل میں لیا جا چکا تھا لیکن پھر بھی جماعتی ماحول قائم تھا اور تمام ٹیچرز احمدی تھیں۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس امۃ لقدیر تھیں جن کی رہائش بھی سکول میں ہی تھی۔ سکول میں دیگر ٹیچرز کے علاوہ دو خادمائیں بھی مجھے یاد ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہاجرہ بی بی تھا۔ ایک میڈم کے ساتھ ہی سکول میں رہتی تھیں اور ان کی خدمت بھی کرتی تھیں۔

ہمارے دور میں طریقِ تدریس اور نصاب سہل اور واجبی سا تھا۔ تعلیم بھی عام اور واجبی سی ہوتی تھی۔ آج کل کے دور کی طرح نہیں کہ طلبہ اور والدین کے لیے مقابلے کی سخت دوڑ اور مشکلات ہوں۔ کے جی سکول اور نصرت گرلز سکول کے درمیان فطری رقابت بھی مجھے یاد ہے گو اس بارے میں کوئی واقعہ مستحضر نہیں۔

ہم کتابیں اور کاپیوں کے علاوہ تختی بھی سکول لے کر جاتے تھے۔ تختی کے ساتھ قلم دوات بھی لے جانا پڑتے تھے اور ان کا انتظام اچھا خاصا مسئلہ تھا۔ پھر گھر آ کر تختی دھونا اور اسے گاچنی لگانا۔ شکر ہے کہ آج کل کے بچوں کو بہتر تعلیمی سہولیات میسر ہیں۔ چوتھی جماعت میں انگریزی کی ہینڈ رائٹنگ اچھی کرنے کے لیے کاپیاں بھی استعمال کی تھیں۔

سکول کے ساتھ والے گھروں میں سے ایک گھر میری والدہ محترمہ، صاحبزادی امۃ المتین کا تھا۔ اس مکان میں میرے والدین، تین بھائی اور ایک بہن رہتے تھے جب کہ میں اُمی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس مکان، جس کا نام بیت البرکات ہے، میں جامن کا ایک درخت تھا جو سکول والی دیوار کے اتنا قریب تھا کہ اس کی کچھ شاخیں سکول میں بھی لٹکی رہتی تھیں۔ جامن کے موسم میں بچے ان سے خوب لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ چونکہ میرے بڑے بھائی بھی کے جی سکول کے ہی پڑھے ہوئے ہیں اس لیے اُن کے دوست، حقوقِ دوستی اور حقوقِ ہمسائیگی کا لطف لینے کے لیے جامن کھانے گھر کے اندر بھی چلے آیا کرتے تھے اور جامن کے علاوہ کسی نہ کسی سوغات سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ واہ! کیا بے تکلفی کا زمانہ تھا۔

میڈم قدیر بہت سخت مشہور تھیں اور ڈسپلن توڑنے والوں اور حد سے بڑھنے والوں کو خود سزا دیا کرتی

تھیں۔ ان کے پاس لوہے کا ایک فُٹہ ہوا کرتا تھا جس سے وہ پٹائی کرتی تھیں۔ ہماری ٹیچرز اور مانیٹرز ہمیں میڈم سے بہت ڈرایا کرتی تھیں لیکن ایک مرتبہ بعض طلبہ کو میڈم کے ہاتھوں لوہے کے فُٹے پڑتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ فُٹہ تو ہوا میں ہی مڑ جاتا ہے اور سزا دینے میں بے اثر ہے۔ غالبًا ایک مرتبہ کسی شرارت پر مجھے بھی فُٹے کھانے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ میڈم اکثر وقت سکول کے سینئر حصہ میں رہتی تھی اور جونیئر حصہ (جس میں لڑکے بھی تھے) کا انتظام کسی اور کے سپرد تھا۔

اب مجھے جو ٹیچرز یاد ہیں ان کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔ میں جس کلاس میں داخل ہوا اس کو پڑھانے کی ذمہ داری مس حبیبہ کے سپرد تھی۔ آپ نہایت شفیق تھیں۔ آج میں ان ہی کے پڑھانے کا پھل کھا رہا ہوں۔ بنیادی تعلیم تو ان ہی کی دی ہوئی ہے۔ آپ کو میری امی سے بہت محبت تھی اور امی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور صحت میں برکت دے۔ میں بہت شرارتی تھا اور انہوں نے میری شرارتوں کو بڑے حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ مجھے سکول کے زمانے میں تعلیم سے زیادہ شرارتوں سے شغف تھا۔ آپس میں کھیل کود، مار کٹائی کا سلسلہ خوب ہوتا تھا۔ ٹیچرز کے سامنے آ جانے یا منع کرنے سے منع بھی ہو جاتے تھے۔

صبح سکول کا آغاز اسمبلی سے ہوتا تھا۔ اس میں کوئی نہ کوئی نصیحت آموز بات بتائی جاتی تھی۔ پھر بچے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جاتے۔ بریک میں کھانے پینے یا کھیل کود کی طرف توجہ رہتی تھی۔ اس کے بعد پھر کلاسیں۔ جمعرات کو آدھی چھٹی ہوتی تھی اور جمعہ کو چھٹی حالانکہ اس زمانے میں حکومتی طور پر اتوار کی چھٹی ہوتی تھی۔ بعد میں بھٹو صاحب کے خلاف نظامِ مصطفیٰ کی تحریک چلی تو انہوں نے ملک بھر میں جمعہ کی چھٹی شروع کروا دی۔

سکول میں جماعتی اور قومی اہمیت کے مواقع کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا رہتا تھا۔ زیادہ تفصیل تو یاد نہیں لیکن ایک مرتبہ جب میں چوتھی کلاس میں تھا تو یوم دفاع کی مناسبت سے ایک پروگرام میں شامل ہونا یاد ہے جس کی باقاعدہ ریہرسل بھی کئی دن ہوتی رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مرزا خلیل احمد اور میر داؤد احمد کی وفات پر سکول میں ایک دن کی چھٹی ہوئی تھی۔ میں ۱۹۷۴ء کے زمانے میں کے جی سکول میں تھا۔ بالکل محفوظ ماحول کے باوجود سکول آتے جاتے احتیاط برتی جاتی تھی۔

بعض کلاسیں برآمدوں میں بھی لگتی تھیں اور سردیوں میں باہر صحن میں بھی۔ سکول کے لیے عمارتیں ناکافی تھیں۔ یہ دو مکانات تھے جن کی درمیانی دیوار نکال دی گئی تھی۔ ایک حصہ میں جونیئر سیکشن اور ایک حصہ میں سینئر سیکشن تھا۔ سکول کی دونوں اطراف میں نام نہاد ٹوائلٹ تھے اور ان کے بارے میں جتنا کم لکھا اور سوچا جائے اتنا ہی بہتر ہے لیکن چونکہ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے مجبوراً ذکر کیا ہے۔ ویسے بھی اب بچے بہت بہتر حالات میں سکول جاتے ہیں اس لیے شکر گزاری کے طور پر اس کا ذکر ہونا چاہئے۔

اس زمانے میں ایک واقعہ ہوا جو ساری عمر کے لیے میرے لیے ایک رہنما اصول بن گیا۔ میری سکول فیس بہت کم تھی اور اس رعایت کی وجہ یہ تھی کہ سکول کی عمارت امی کی ملکیت تھی۔ غالبًا ایک ماہ یا دو ماہ کی فیس

۹۰ پیسے تھی۔ ایک بار اُمی نے مجھے پانچ روپے دیئے۔ فیس جمع کروانے کے بعد میں نے باقی ماندہ چار روپے بیس پیسے حضرت مرزا بشیر احمد کے مکان کے ساتھ والے کھوکھے پر اپنے بھائی، کچھ کزنز اور دوستوں کی دعوت پر اڑا دیئے۔ گھر پہنچا تو امی نے مجھ سے باقی رقم کا مطالبہ کیا اور جواب سننے پر مجھے ان کی سخت ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا اگرچہ بدنی سزا سے بچا رہا۔ کے جی سکول میں اگر میری ساری تعلیم کا نچوڑ ہے تو یہ واقعہ ہے جو آج بھی میرے لیے رہنما ہے۔

سکول میں ایک مس زاہدہ ہاشمی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ مس صغریٰ، مس طاہرہ، مسز جواد اور مسز امۃ الرشید شوکت بھی ہوا کرتی تھیں۔

مسز امۃ الرشید سینئر سکول میں پڑھاتی تھیں۔ لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے کام بھی کرتی تھیں اس لیے امی سے ملنے ہمارے گھر میں آنا جانا بھی ہوتا تھا۔ بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ آپ ملک سیف الرحمٰن، مفتی سلسلہ کی اہلیہ ہیں۔ میرے امریکہ کے قیام کے دنوں میں آپ سے بہت تعلق رہا۔ آپ اکثر کینیڈا سے امریکہ اپنے بچوں کے پاس آتی تھیں۔ جلسوں پر بھی ملاقات ہوتی تھی۔ جہاں بھی آپ کے موجود ہونے کا علم ہوتا میں اور میرا بھائی محمد احمد آپ کو سلام کرنے اور سر پر محبت بھرا ہاتھ پھروانے کے لیے ان کے پاس حاضر ہوتے تھے۔ اب تو آپ بھی خلدِ بریں میں آرام کی زندگی گزارتی ہیں۔ اللہ آپ کے روحانی مقام بلند فرمائے۔

ہماری یہ سب معلّمات ہمارے لیے بہت قابل احترام تھیں۔ ان میں سے اکثر تو اب راہیٔ ملک عدم ہو چکی ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

میڈم قدیر سکول سے ریٹائر ہو کر لجنہ اماء اللہ کی لائبریری میں کام کرنے لگی تھیں اور دارالرحمت منتقل ہو گئی تھیں۔ پاکستان واپس آنے کے بعد مجھے چند مرتبہ ان کو اپنے ساتھ ان کے گھر پہنچانے کا موقع ملا۔ آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب خلافتِ خامسہ کی پہلی عیدالاضحیٰ کے موقع پر حضور کی طرف سے دعوت کا اہتمام تھا۔ دعوت کے بعد مجھے میڈم کو ان کے گھر چھوڑنے کا موقع ملا۔ مجھے ان کی یہ بات آج تک یاد ہے کہ میری صحت تو اس قابل نہ تھی کہ میں دعوت میں شامل ہو سکتی لیکن میں نے سوچا کہ یہ مسرور کی پہلی دعوت ہے اس لیے آ گئی۔ یاد رہے کہ حضور بھی میڈم کے سکول میں پڑھتے رہے تھے۔ اللہ میڈم کے روحانی درجات بلند فرمائے۔ آمین''

اب تک آپ نے ان خواتین وحضرات میں سے بعض کا ذکرِ خیر ملاحظہ فرمایا ہے جنہیں ابتدائے ربوہ میں جماعتی تعلیمی اداروں میں تدریس کا موقع ملا۔ اسی طرح بعض ایسی خواتین وحضرات کا ذکر بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے جنہوں نے ان اداروں میں تعلیم حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں ایک فعال اور کامیاب زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میری دعا ہے کہ ان میں سے وفات پا جانے والے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقامات سے نوازے اور باقیوں کو صحت والی کامیاب زندگی عطا فرمائے۔

میں اب قارئینِ کرام سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرتے ہوئے اس امید پر اجازت چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ جلد ہی دوبارہ ان سے ملاقات ہوگی۔

ضمیمہ جات

دوسری واپسی

غالب احمد کی یہ دوسری واپسی ہے۔ پہلی واپسی پر یار تتر بتر ہو چکے تھے مگر جہاں تہاں موجود تھے مگر اس دوسری واپسی کی مبارک ساعت میں تو اور کوئی یار نظر نہیں آ رہا۔ بس میں اکیلا اس کے استقبال کے لیے موجود ہوں۔

مگر یہ واپسیاں تو بعد کی بات ہیں، کچھ آمد کا بھی تو پتا چلے کہ وہ کیسے ہوئی تھی۔ اصل میں پاکستان کے ابتدائی برسوں میں جب مظفر علی سیّد ابھی گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے دن گزار رہا تھا تو جیسے اس نے ٹھیکہ لے رکھا تھا کہ یہاں سے ادب کے نام کے نگ اسے ٹی ہاؤس لے جانے ہیں۔ سو کتنے اچھے بُرے نگ اس نے یہاں سے بٹورے اور ٹی ہاؤس لے جا کر ناصر کاظمی کی میز پر بکھیر دیئے۔ ناصر نے اچھے اچھے نگ چُن لیے اور یہ نگ ناصر سے جتنے قریب ہوتے گئے مظفر سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔ مظفر کو اپنی سادہ دلی کا احساس دیر میں ہوا۔ خیر یہ الگ داستان ہے۔ اس ذکر کا مطلب یہ تھا کہ غالب احمد کی آمد بھی ٹی ہاؤس میں مروّجہ دستور کے مطابق ہوئی تھی اور اسی طور ناصر سے رشتہ استوار ہوا تھا۔ جلد ہی اس نو وارد کا تخلیقی جوہر آشکار ہوا اور جلد ہی اس کی خوشبو پھیل گئی۔

یہ وہ برس تھے جب عسکری صاحب ابھی تو تصوّف کی منزل سے کوسوں دور تھے۔ ان برسوں میں وہ جانے مانے ادیبوں سے بیزار یہ جاننے کی ٹوہ میں رہتے تھے کہ ادب کے نوواردوں میں جوہرِ قابل کون کون ہے۔ ناصر کے واسطے سے وہ ایک نئے شاعر کی آمد کا اعلان پہلے ہی کر چکے تھے۔ ان ہی برسوں میں جب وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی سے لاہور پہنچے تو ایک شام مال پر ایک لمبی ٹہل کے بعد جب وہ پلٹنے لگے تو وائی ایم سی اے کے قریب آ کر میں ٹھٹھکا۔ انہوں نے میری نیّت کو بھانپا اور پوچھا: ''اب تم ٹی ہاؤس جاؤ گے؟''

میں نے کہا: ''ہاں نیت تو یہی ہے۔''

''تمہاری پارٹی آ گئی ہوگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ ٹی ہاؤس کے دروازے تک ساتھ آئے۔ ناصر اور باقی یار دروازے کے برابر والی میز پر جمے بیٹھے تھے۔ شیشے کے دروازے کی وجہ سے باہر سے ان کی شکلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ عسکری صاحب نے ان سب صورتوں کا جائزہ لیا، پھر پوچھا: ''ان میں غالب احمد کون ہے؟''

میں نے بتایا کہ جو ناصر کے برابر بیٹھا ہے، وہ غالب احمد ہے۔ پھر میں نے کہا: ''اندر چلیے۔ مل لیجیے۔'' کہا کہ ''بس دیکھ لیا'' اور مجھے چھوڑ کر تیزی سے وہ کرشن نگر جہاں ان کا گھر تھا، روانہ ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ اس نونہال کا چرچا ہونے لگا تھا مگر حادثہ یہ گزرا کہ جھٹ پٹ اس کا تعلیمی سلسلہ مکمل

ہوگیا اور فوراً ہی ملازمت بھی مل گئی۔ ایئر فورس میں بھرتی ہوا اور شتابی سے یاروں کی بھری محفل چھوڑ کر لاہور سے دور چلا گیا۔ ادھر ناصر کسی نہ کسی بہانے اس کا ذکر چھیڑ دیتا تھا اور اس کا اِکا دُکا شعر سنا کر ہمیں اس کا قائل کرتا تھا۔ مطلب صرف اتنا تھا کہ یار بھول نہ جائیں کہ ان کے بیچ ایک آشفتہ سر غالب احمد کے نام کا بھی تھا مگر آخر کب تک۔ یہ ذکر بھی آخر نیا پرانا ہوگیا۔

ایک زمانے بعد ایئر فورس سے نبٹ کر غالب واپس آیا تو ادھر زمانہ ہی بدل چکا تھا۔ اس وقت کے کئی ایک یارِ غار کہہ لیجئے کہ بھیگتی راتوں کے سنگھی ساتھی ہماری میز سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ اِکا دُکا نئے چہرے آ گئے تھے۔ پھر غالب کو اسی میں عافیت آئی کہ بس حنیف اور شیخ صاحب پر قناعت کرے۔ تو وہ واپس آیا بھی اور نہیں بھی آیا۔ اصل میں واپسی کا باقاعدہ اعلان اس نے ''راحتِ گمنام'' کی اشاعت کے ساتھ کیا، اس وقت جب ناصر ہم سے بچھڑ کر بہت دور جا چکا تھا۔

میں نے اس وقت غالب سے یہ پوچھا تھا کہ لکھنے کا شوق تمہارے پاس کم و بیش پاؤ صدی تک معطّل رہا۔ اس کی آسانی سے تجدید کیسے ہوگئی؟

اس کا جواب تھا کہ کیسا تعطّل، کوئی دن ایسا نہیں گیا جب مجھے لکھنے کی خواہش نہ ستاتی ہو۔

مطلب یہ لکھا ہو یا نہ لکھا ہو مگر لکھنے کی خواہش برقرار رہی۔ چلیے مان لیا مگر ہوا یہ کہ مجموعہ کی اشاعت کے بعد غالب احمد تھوڑے دنوں تک متحرک نظر آیا۔ ادبی محفلوں میں صورت بھی نظر آتی رہی۔ لگتا تھا کہ اب خالی لکھنے کی خواہش ہی نہیں، ادبی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی بھی خواہش جاگ اٹھی ہے۔ یہ اچھی علامت تھی مگر ہوا یہ کہ تھوڑے دنوں بعد پھر غائب۔ نہ اس کے شعر کسی رسالہ میں نظر آئے نہ محفلوں، مجلسوں میں صورت دکھائی دی۔ پھر ایک لمبی خاموشی، ایک لمبا غوطہ۔

تو یار تو یہی سمجھے تھے کہ رات گئی بات گئی مگر وہ عزیز تو ایک مرتبہ پھر کتاب دربغل واپس آ گیا ہے۔ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود اور یہ جو واپسی ہوئی تھی، وہ بجھتے چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ واپسی مبارک مگر زمانہ ایک دفعہ پھر بدل گیا ہے بلکہ پہلے سے بڑھ کر بدل گیا ہے، اجتماعی حساب سے بھی اور نجی حساب سے بھی۔ نجی حساب سے یوں سمجھئے کہ اس بیچ کتنے دوست کتنے ہم سفر ہمارے بیچ سے سدھار گئے ہیں اور یہ جو نیا مجموعہ ہے ''زحمتِ سفر'' اور جس میں اگلا پچھلا سارا کلام شامل ہے، اسے دیکھ کر عجیب احساس ہو رہا ہے جیسے کوئی دوست پردیس چلا جائے اور برسوں تک نہ اپنی صورت دکھائے نہ خط پتر لکھے اور اچانک ایک سہانی صبح غیر متوقع طور پر آن دھمکے۔ خوشی بھی بہت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ مانوس ہونے میں کچھ دیر بھی لگتی ہے۔ ''ارے یار، تم تو بالکل بدل گئے ہو۔'' بس اس قسم کے روایتی فقروں کی مدد سے پچھلی یگانگت کو واپس لانے کا جشن کیا جاتا ہے اور اس مجموعہ کی صورت یہ ہے کہ اس کے ایک حصے سے گزرتے ہوئے تو سمجھ لیجئے کہ تجدیدِ ملاقات ہو رہی ہے مگر دوسرے حصے سے نئی نئی ملاقات ہونے لگی ہے۔

ایسے پچھلے اشعار کو یا ایسی کسی بھی تحریر کو پڑھنا جس سے آپ کی نجی یادیں وابستہ ہوں اپنے ساتھ ایک

اور ہی طرح کی لذت لے کر آتا ہے۔ ابتدائی کتنی غزلیں ایسی ہیں کہ جنہیں پڑھتے ہوئے احساس ہو رہا ہے کہ میں انہیں اکیلا نہیں پڑھ رہا، دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھ رہا ہوں۔ یاد آتا جا رہا ہے کہ یہ غزل سننے کے بعد یاروں کا کیا ردّ عمل تھا اور ناصر نے کیا کہا تھا۔ اس شعر کو سنتے ہوئے مشتاق کا ردّ عمل کس طرح ظاہر ہوا تھا اور فلاں شعر کو سنتے ہوئے حنیف نے کس طرح آنکھیں موند کر فضا میں انگشتِ شہادت بلند کر کے ایک پیکر تراشا تھا۔

مگر جب دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے تو میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ کسی نظم، کسی غزل کے ساتھ یادوں کا کوئی سلسلہ منسلک نہیں ہے۔ اگرچہ انتساب کے واسطے سے شاعر نے یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں وہی پرانا غالب ہوں جو یاروں کے رت جگوں میں شریک رہا ہوں اور جس نے انہیں راتوں میں یہ اداس کر دینے والی پیشگوئی کر دی تھی کہ

بجھ گیا شہر، گئے رات کے لوگ
اک رمق تھی سرِ محفل نہ رہی

مگر کسے یاد دلایا جا رہا ہے؟ رات کے لوگ تو دیر ہوئی جا چکے ہیں مگر لیجئے اسی شعر کے حوالے سے مجھے ان ہی دنوں میں کہے ہوئے اور کتنے شعر یاد آ رہے ہیں:

اک زمانہ ہوا خزاں گزرے
دل اجڑنے کی اب خبر آئی

شہر سے دُور دن کا پھول کھلا
دشت میں بھی ہے گلستاں کوئی
دُور اپنوں سے ہو رہے ہیں لوگ
دیکھیے کب ملے کہاں کوئی

چاندنی رات میں وہ پھول مرا
ہوگا شبنم میں شرابور کہیں

آئے تھے اس زمین پہ جائیں گے اب کہاں
دے گا جواب کون ہمیں اس سوال کا

ان شعروں کو دوسرے قارئین اپنے حساب سے پڑھیں گے اور پسند کریں گے۔ میں انہیں کچھ گزرے رت جگوں سے منسلک کر کے دہرا رہا ہوں۔ ویسے وہ زمانہ بھی خوب تھا۔ رنگ رنگ کے یار کس طرح جمع ہوئے تھے اور کس کس طرح انہوں نے راتوں کو آباد کیا تھا۔ کوئی دیوانہ، کوئی ہوش مند، سب اپنی اپنی کھال میں

مست۔ کسی کو شاعری نے خراب کیا، کسی کو اسی شاعری نے جینے کا سلیقہ سکھایا کہ حسن سے بھی لگاؤ چلتا رہے اور زندگی بھی عزیز رہے۔ ہمارے بیچ دیوانگی کی مثال اگر ناصر کاظمی تھا تو سلیقہ مندی کی مثال غالب احمد، زندگی کی مصروفیات سے تھوڑا تھوڑا وقت بچایا اور شاعری کی۔ کیا ضرور ہے کہ موسلا دھار بارش کا انتظار کیا جائے کہ جل تھل ہو جائے بوند بوند کر کے بھی تو تالاب بھر جاتا ہے۔ سو دیکھ لو تالاب بھرا ہوا ہے اور ''رختِ ہنر'' ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ مصروف زندگی کے سفر میں اتنا زادِ راہ فراہم کر لینا چھوٹی بات نہیں ہے۔ ناصر نے کہا اور غالب نے کر کے دکھایا کہ

تیرا پیغام بھی ضروری ہے
اور مجھے کام بھی ضروری ہے

زندگی کے ضروری کاموں کے بیچ پیغامِ شعر کو یاد رکھنا کوئی چھوٹا کام نہیں ہے۔ یاد کرو غالب احمد کے اس بیان کو جو ابھی نقل ہوا کہ کوئی دن ایسا نہیں گیا کہ مجھے لکھنے کی خواہش نہ ستاتی ہو اور پھر یاد کرو مرزا غالب کے اس شعر کو

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تو غالب نے شاعری سے بے شک غفلت برتی شاعری کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہا یعنی درد اندر ہی اندر پلتا رہا۔ جب موقع ملا باہر آ گیا۔ اس کا جو حاصل ہے وہ اب ہمارے سامنے ہے۔

ضمیمہ ب

''چراغوں کا دھواں'' میں راجہ غالب کا ذکر

''بھٹو صاحب ویسے تو بہت دانا و بینا تھے مگر اسلام کا عَلَم بلند کرتے وقت اس نکتہ کو فراموش کر گئے۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام، جمعہ کی چھٹی، گھڑ دوڑ پر پابندی، شراب پر پابندی مگر عجب ہوا کہ ایسے کام انجام دینے کے باوجود ان کی مسلمانی مشکوک رہی۔ ہاں یہ جو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام تھا اس کا تھوڑا اثر ہماری دوستیوں پر بھی پڑا۔ میں غالب احمد کو کب سے مسلمان سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اچانک پتا چلا کہ وہ تو غیر مسلم ہے۔ مجھے تو خیر جانے دو، ہمارے دوستوں کے حلقہ میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تو اپنے شیخ صلاح الدّین چلے آ رہے تھے۔ ان کے دو ہی تو محبوب موضوعات تھے: وقت کا مسئلہ اور اسلام۔ انہوں نے اسلام کے بیچ سے کیسا کیسا فلسفہ کشید کر کے ہمارے ذہن نشین کیا تھا مگر حیف کہ غالب احمد کی نامسلمانی ان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اس انکشاف کی سعادت ہمارے سیکولر رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی۔ خیر دوستی تو نبھانی تھی۔ کتنے زمانے سے اس یار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں نے سوچا آئینِ دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ اب جب کہ دوست مسلم سے غیر مسلم بن گیا ہے تو اس حادثے پر اس سے جا کر اظہارِ ہمدردی کیا جائے یا تعزیت کی جائے۔ میرے ہوتے ہوئے میرے سوا جو دوسرا دوست غالب احمد سے تعزیت کرنے آیا تھا وہ حیات احمد خاں تھے۔'' (چراغوں کا دھواں صفحہ ۲۶۴)

’’جستجو کیا ہے‘‘ میں راجہ غالب کا ذکر

’’ان خوابوں نے یا اس خواب نے ان دنوں جا کر رنگ پکڑا جب میں لاہور شہر میں رَچ بس چکا تھا اور چھوڑی ہوئی بستی خواب و خیال بن چکی تھی۔ ناصر کاظمی کے ساتھ جو شب و روز بسر ہوئے یہ ان کا فیض تھا۔ ان دنوں ناصر کے ساتھ نہیں یاروں کی پوری منڈلی کے ساتھ اس شہر میں اتنا گھوما پھرا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ سڑک سڑک۔ سمجھ بیٹھا کہ ناصر کے ساتھ میں بھی اس شہر کا روڑا بن چکا ہوں۔ سو اب اپنی چھوڑی ہوئی بستی کی گلیاں کوچے بھی کم کم یاد آتے تھے مگر خوابوں میں تو وہ اب زیادہ ہی آنے لگے تھے۔ شاید انہوں نے لاہور کے گلی کوچوں میں رَچتا بستا دیکھ کر میرے بیدار شعور سے پسپا ہو کر میرے خوابوں میں پناہ لے لی تھی۔ شاید میرے اندر وہ چھپ کر بیٹھ گئے تھے اور مجھے نیند میں غافل پا کر مجھے یاد دلانے آتے تھے کہ نیا دیار نئے کوچے برحق مگر ہم بھی یہیں کہیں تمہاری یادوں میں شاد آباد ہیں۔

وہ راتیں بھی خوب تھیں۔ گھومتے پھرتے رات زیادہ ہو جاتی تو کوئی کوئی یہ سوچ کر کہ گھر دُور ہے ہمارے رات کے کسی ہم سفر کے ہمراہ اس کے گھر جا پسرتا۔ کسی ایسی ہی شُبھ گھڑی میں غالب احمد میرے ٹھکانے پر آ گیا۔ تنہائی میں دل کی باتیں کہنے کا موقع ملا تو میں نے یہ سوچ کر کہ غالب کا مضمون نفسیات ہے اسے اپنے خوابوں کی نوعیت بتائی۔ سوچا کہ وہ اس کی معنویت پر کچھ روشنی ڈالے گا مگر اس نے کچھ اور ہی بات کی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے ایک سوال کر ڈالا: تم نے کافکا کا ناول ’’کیسل‘‘ پڑھا ہے؟

نہیں۔ میں نے کہا۔ بس میں نے اس کا ایک ہی ناول پڑھا ہے: ’’ٹرائل‘‘ اور کچھ کہانیاں۔

اس ناول کو پڑھ لو۔

میں نے اس مشورہ کی وضاحت چاہی۔ جواب دیا بس تم یہ ناول پڑھ لو۔

...... پڑھا...... میں حیران کہ یہ میں ناول پڑھ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ارے یہ تو میں خود اپنے خوابوں کے بیچ بھٹک رہا ہوں۔ (جستجو کیا ہے صفحہ ۱۷)

Sir Iftikhar Ahmad Ayaz (Awards)

Civic Awards/Honours

Medal for Distinguished Services to Her Majesty the Queen's Realms	2016
KBE-Knight Commander of the Most Excellent Order of the British Empire	2015
Role Model of the Year, Pakistan Achievement Awards	2015
OBE - Officer of the Most Excellent Order of the British Empire	1998
Alfred Einstein Nobel Medal	1991
Albert Einstein Genius Dedication Medal	2008
The Noble Order of Inernational Ambassadors	2008
The World Medal of Freedom	2007
One of the Greatest Minds Honour	2007
One of the Global 100	2007
Magna cum Laude	2009
Iftikhar Ayaz Award Foundation	2006
Man of the year in Education	2011
Man of the Year	2010
Man of the Year	2009
Man of the Year	2007
Lifetime Achievement Award	2006
Global Prize for Services to Humanity	2012
Intellectual of the Year	2012

American Biographical Institute Scholar of the Year	2012
One of the 500 Great Leaders	2010
Award of Excellence	2011
United Cultural Convention's Peace Prize	2005
Glory of India	2005
Gem of India	2006
India Nine Jewels Gold Medal	2003
Jewel of India Gold Medal	2002
ABI Presidential Seal of Honour	2005
Medal of Noble Distinction	2010
World Laureate	2009
Nomination for Wandsworth Civic Award	2000
Shortilisted for Membership of U.K. House of Lords	2001
Gold Medal for England	2007
Universal Award of Accomplishment	2008
Legion of Honour of the United Cultural Convention	2007
Order of Inernational Merit	2007
World Record Holder in Services to Human Rights	2007
Most Notable Intellectual	2009
The Seat of Wisdom Honour	2010
A Legendary Leader	2010
One of the Great Minds of the 21st Century	2011
Distinguished Services Order	2011
Profile of Courage	2010
Commonwealth Diplomats Induction Certificate	2006
Accomplished Leader	2006
One of the Greatest Genuises of the 21st Century	2006
Extraordinaire Non Resident Indian	2006

Eminent Non Resident Indian	2007
Ron Hubbard Humanitarian Services Award	2012
Outsanding Professional Award	2004
The UK Highland Council Plaque	2012
Staffordshire County Council Plaque	2012
Services to the Highland Council Distinction	2012
Yogyakarta, Indonesian University Honour	2015
U.K. House of Lords Honour of Distinction	2001
Merit of Distinction for Services to AMJ International	2013
Merit of Distinction, Majlis Ansarullah Bangladesh	2009
Peace Symposium Honour, AMJ Finland	2015
Peace Symposium Honour, AMJ Norway	2016
Merit of Distinction, Majlis Ansarullah Germany	2015

<u>Some Scholarships and Academic Awards</u>

Teacher Training Scholarship, Kenya	1956
Study Visit to U.K, British Council	1966
Commonwealth Fellowship for Higher Education in the U.K.	1973
Commonwealth Fellowship forPostgraduate Studies in U.K.	1975
Doctorate Emeritus in Education, USA	1987
Honoured as `Cambridge Blue'	2005
Fellow of the American Biographical Institute	2005
Honorary Master Diploma World Academy of Letters	2006
Diploma of Experience in Education	2006
Certificate of Academic Excellence, India	2007
Academician of the Year	2011
Ambassador of Knowledge, Cambridge University	2012

Some Extra-Curricular Achieveents

Boy Scouts Master Cook	May 1952
Ambulance Proficiency	Jun 1952
Interpreter's Proficiency	Jun 1952
Handyman	Jun 1952
Despatch Rider	Dec 1952
Backwoodsman	Dec 1952
Venture Proficiency	Jan 1953
Orator	Jan 1953
Fireman Proficiency	Jan 1953
Public Health	Jan 1953
Meteorologist	Feb 1953
Pioneering	Feb 1953
Climb Kilimanjaro	Dec 1956

Some Inernaional / National Conferences Attended

International Association of Teachers of English as a Foreign Language, Goldsmith College, London	1979
Integrated Health Plan for Rural Children, Nepal	1982
FAO Seminar on Computing for Integrated Rural Development	1983
FAO Workshop on Training of Health Personnel for Rural Africa	1983
World Conference on Agrarian Reform and Rural Development for Africa	1983
Transformation of Agrarian Systems in Centrally Planned Economies in Africa	1983
FAO Colloquium on World Food Security	1983

FAO Workshop on High Level Training for Rural Development	1984
Convention on Disablement in the Community and the Commonwealth	1984
ILO Workshop on Employment Opportunities for Rural Women	1984
The Alliance of Formal, non-Formal and Informal Education, New Zealand	1988
UNESCO General Conference	1991
Education Leadership Summit, Guam, South Pacific	1992
Peace Syposium, Iceland	2005
PeaceSymposium, Malta	2006
U.N. World Summit on Conflict Resolution. Racismand Xenophobia, Durban	2006
Education for Peace, Washington, USA	2009
Public Relations Seminar, New York, USA	2010
Climate Change, Poland	2010
UPF World Summit on Peace, Korea	2010
Peace Symposium Malta	2011
Education and Islam, Peace Conference Sri Lanka	2011
European Union Conerence on Freedom of Religion, Belgium	2012
Peace Syposium Philippines	2013
Peace Symposium Thailand	2013
World Summit on Peace, Korea	2014
UNHRC Conference on Human Rights	2015
Peace Symposium Indonesia	2015
Peace Symposium Malaysia	2015
Peace Symposium Greece	2015

Secretary Literary Lights, Tanga, Tanzania	1950
President, Bazm-i-Urdu, Tanga, Tanzania	1950
National Training Commission,Boy Scouts, Tanzania	1967
Fellow Commonwealth Institute, London	1976
Secretary General, Commonwealth Society, Tanzania	1978
East African Representative, Royal Commonwealth Society for the Blind	1982
Member Commonwealth Council for Education	1991
Counsul General of Tuvalu in the U.K.	1995
Member UNHRC Workshop on Rights of Minorities	1995
International Vice President, Non-Resident Indians	2001
Adviser, Human Development / Human Rights / Poverty Alleviation & Conflict Resolution	1996
Ambassador of Peace, UPF	2001
Vice-Chancellor World Academy of Letters	2008
Senator World Nations Congress	2008
International Ambassador, World Forum USA	2009
Member Amnesty International	2013
Member Commonwealth Association	1997
Deputy Governor ABI	2009
Secretary General of the United Cultural Convention	2009
Distinguished Chair of Education World Academy of Letters	2010
Cultural Attache World Forum USA	2011
Fellow Advisory Directorate International	2008
Advisor Grassroot Diplomat U.K.	2013
Member Pakistan Professional Association	2012

Position held - Jamaat

Peace Syposium Finland	2016
Peace Symposium Norway	2016

Publication, Presentations and Papers

Scores of Papers in Journals, Magazines, and Newspapers in USA, Canada, U.K., Europe, Tanzania, Mauritius, Pakistan, India, Australia, New Zealand, Fiji, Africa, etc.

Presentations made at Inernational Conferences, Conventions and Universities in UK, Poland, European Union, UNHCR, UNHRC, Canada, USA, South East Asia, Korea, etc. on:

Peace, Human Rights, Freedom of Religion, Justice, Poverty Alleviation, Conflict Resolution, Social Integration, Tolerance, Interfaith Bridging and Climate Change.

Educational Papers

Education for life, Basic Education, Moral Education,Sociology, Teaching Foreign Languages,etc.

Religious Books

Blessings and Importance of Devotion of Life in Urdu, English, French and Arabic

Blessings and Importance of Khilafat

Inspiring Narrations of Devotion of Life

Blessings and Importance of Obedience

Position held - General

General Secretary, Jamaat Tanga, Tanzania	1949
General Secretary, Jamaat Dar-es-Salaam, Tanzania	1961
SecretaryTablish, Jamaat Dar-es-Salaam, Tanzania	1962
Regional President, Western Region, Tanzania	1963
General Secretary, Jamaat, Morogoro, Tanzania	1967
President, Jamaat Arusha, Tanzania	1981
HonoraryMissionary, Tuvalu, South Pacific	1985-1992
Assistant Secretary Tabligh U.K.	1993
Member Qaza Board, U.K.	1994
Acting President Qaza Board, U.K	1994
Qaid Tablish, Ansarullah U.K.	1995
National President Ansarullah U.K.	1996
National President Jamaat U.K.	1997
Honorary Member Majlis-i-Ufiah, Rabwah, Pakistan	1997
Secretary Khariyya, U.K.	2001
Director Tahir Foundation International	2004
Director World Media Forum International	2009
Member MTA I Board	2013
Acting Managing Director MTA I	2014
Honorary Member Ansarullah U.K.	2016
Chairman International Human Rights Committee	2012

Profiles Pulished in the following World Renowned Biographies

500 Greatest Genuissesof the 21st Century

Great Minds of the 21st Century

The Cambridge Blue Book of 2005/2006

Debrett's People of Today

Who's Who International	2016
Dictionary of International Biography 2010	
International Dictionary of Experts and Expertise	2008
Asian Who's Who	2006

بربط کے نظارے

مکمل نظم جو بربط میں فرقان فورس کے مجاہدوں کی جولانیوں اور وادی کی شاداب رعنائیوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی:

اِک طرفہ خوشی چھن جانے پر بے تاب ہے دل، رنجور ہوں میں
گو حسن کے طوفاں خواب ہوئے، اِک پاک نشہ میں چُور ہوں میں
دیکھا ہے جو دل کی آنکھوں سے، کہنے کے لیے مجبور ہوں میں
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

خوابیدہ نظاروں کے چہرے صہبائے ضیا سے ڈھلتے ہوئے
شبنم کے لرزتے موتی بھی کانٹوں میں گلوں کے تلتے ہوئے
ظلمت کی ردائیں اٹھتی ہوئی، جلووں کے دریچے کھلتے ہوئے
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

وہ رات کے عبرت نامے پر تصدیق سحر کا فرمانا
مدہوش فضاؤں میں یکدم آوازِ اذاں کا لہرانا
اور صبح کے چپے چپے کو چاندی کی قبائیں پہنانا
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

شبنم کے دُھلے گلزاروں میں چھن چھن کے ہواؤں کا آنا
بربط کے دمکتے سینے پر برکھا کا وہ موتی برساتا
جھرنوں کے حسیں فواروں کی چھل مل میں جنوں کا افسانہ
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

جذباتِ نمو کا یہ عالم ذرّوں میں دھڑکنے کے ارماں

ہر راہ میں نظمیں بکھری ہوئیں، ہر ذرہ فسانے کا عنواں
ہر موڑ سراپا انگڑائی، ہر گام پہ لغزش کا امکاں
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

جب سانولے کھیتوں کو چُھو کر رنگین ہوائیں گونجتی ہیں
تاریک خموشی میں یکدم توپوں کی صدائیں گونجتی ہیں
بے باک مجاہد جھومتے ہیں، بے باک ندائیں گونجتی ہیں
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

آزاد مجاہد وادی میں جب شب کو طرارے بھرتے ہیں
اور چرخ کے پختہ کار ستارے آنکھ ملاتے ڈرتے ہیں
تکبیر کے نعرے سُن سُن کر بے موت بھی دشمن مرتے ہیں
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

کچھ پوچھ نہ اُن دیوانوں کی یلغار پہ جب آ جاتے ہیں
گردوں پہ کُلیلیں کرتے ہیں، کہسار سے ٹکر کھاتے ہیں
باطل کو ہزیمت ہوتی ہے، دولت کے دھوئیں اُڑ جاتے ہیں
بربط کے نظارے اُف توبہ! افسوس کہ ان سے دُور ہوں میں

فرقان فورس

ثاقب زیروی کی محاذِ جنگ پر آمد کا ذکر ہوا ہے تو آپ کو بتاتا چلوں کہ موصوف نے اپنی خودنوشت ''تجربات جو ہیں امانت حیات کی'' میں تین مختلف عنوانات کے تحت ان اسفار کا حال بیان کیا ہے: ''جنگِ کشمیر کے دوران'' ''یادِش بخیر'' اور ''ناقابلِ فراموش'' ۔ان اَبواب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثاقب زِیروی نے پہلا سفر صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی تحریک پر اور دوسرا سفر حضرت خلیفۃ المسیح الثّانی کے حکم پر آپ کی معیت میں کیا تھا۔سب سے پہلے ملاحظہ فرمایئے محاذِ کشمیر کے اس سفر کی داستان جو جنگ کے دوران صاحبزادہ مرزا ناصر احمد کی تحریک پر کیا گیا تھا۔ثاقب زِیروی 'جنگِ کشمیر کے دوران'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل تھے اور کالج لاہور میں تھا۔ایک دن فرمایا: ''حضور کی خواہش ہے اپنے مجاہدوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بربط جائیں اور ایک دن اُن کے ساتھ گزاریں۔''عرض کیا: ''میں ان شاء اللہ ساتھ چلوں گا۔'' چنانچہ ایک صبح یہ قافلہ جو چھ سات افراد پر مشتمل تھا مارف ہیڈکوارٹرز کی طرف روانہ ہوا۔اس میں مولوی عصمت اللہ بہلولپوری، چودھری محمد اکبر ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس، محمد احمد حیدر آبادی، سید میر محمود احمد ناصر، ثاقب زیروی اور فاتح الدین (حضرت مرزا ناصر احمد صاحب) شامل تھے۔علاوہ ازیں م۔ش بھی شریکِ قافلہ تھے۔

مارف ہیڈکوارٹرز میں بی ایم بہادر اور فضل الرحمان (ڈی کیو) نے ہمیں مرحبا کہا۔تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد ہم سے پانچ پانچ فائر کرائے گئے اور پھر وردیاں پہن کر اگلے سفر کی تیاری کا مرحلہ تھا۔مجھے فوجی وردی پہننے میں انقباض تھا کہ میں نے اس سے قبل پتلون یا نیکر یا سوٹ کبھی نہ پہنا تھا لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب نے میرے پاس آ کر اس پھرتی سے نئی وردی پہن لی کہ مجھے بھی پہنتے ہی بنی۔اس کے بعد ہم نہر عبور کر کے پیدل سفر کرتے کرتے گہری شام کے وقت بھمبر پہنچ گئے جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں دو مسافر اور بھی تھے۔فرمایا: ''دو گھنٹے آرام کر لیں۔چاند نکلتے ہی ہمیں اگلے سفر پر چل پڑنا ہے۔رات کے وقت تاراسنگھ یعنی دشمن کے ہوائی جہاز کا کوئی خطرہ نہیں۔''

مجھے خوب یاد ہے میں پیشاب کرنے کے لیے باہر گیا۔واپس آیا تو سوائے حضرت صاحبزادہ صاحب کے سب سو رہے تھے۔فرمایا: ''اب میرے پیٹ پر سر رکھو اور مولوی عصمت اللہ صاحب کے پیٹ پر ٹانگیں اور......سو جاؤ۔''

مجھے اتنا تو یاد ہے کہ میں نے تعمیل ارشاد میں حضرت صاحبزادہ صاحب کے پیٹ پر سر رکھا۔اس کے

بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔تھکاوٹ کا یہ عالم تھا۔دو گھنٹے کے بعد اُٹھ گئے یا اٹھا دیئے گئے۔ایک گائیڈ ملا جو ایک پگڈنڈی پر لے کر ہمیں چلنے لگا۔ابھی دو ایک میل کی مسافت ہی طے ہوئی ہوگی کہ گائیڈ ''ہائے ماں'' کہہ کر بیٹھ گیا۔معلوم ہوا اسے ''بچھوا بوٹی'' نے کاٹا ہے۔حضرت صاحبزادہ صاحب مڑے اور بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اُس کی ٹانگوں کو اس جگہ سے سہلانے لگے جہاں بوٹی نے کاٹا تھا۔چند منٹوں ہی میں اس کا درد، جلن اور تپش سب رام تھے۔وہ سراپا عقیدت بن کر کہنے لگا: ''حضور آپ تو بڑے کرنی والے ہیں۔آپ کے ہاتھوں میں تو الٰہی تاثیر ہے۔''حضرت صاحبزادہ صاحب سمجھ گئے کہ وہ کدھر چل پڑا ہے۔فوراً قضیہ زمین کو برسرِ زمین طے کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ کوئی خوبی کی بات نہیں۔ایسی کرنی والے تم بھی ہو سکتے ہو۔جب آموں کا بُور پھوٹے تو اس کچے بُور کو چار پانچ روز ہاتھوں میں مل لیا کرو۔اس میں اتنی تاثیر ہے کہ ہر زہر، ہر جلن اور درد کو رام کر دے۔'' گائیڈ آپ کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

''سُوکھے تالاب'' کے بعد دن چڑھ آیا تھا۔ہم پر تین دفعہ تاراسنگھ نے جھپٹنے کی کوشش بھی کی لیکن ہر دفعہ ہم کھیتوں میں اوندھے منہ لیٹ کر بچ جاتے رہے یہاں تک کہ بعد دوپہر بربط پہنچ گئے جہاں حضرت صاحبزادہ فاتح الدین اور ان کے قافلے کا نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے خیر مقدم کیا گیا۔کھانا مجاہدوں کے ساتھ سُرخ دال والا کھایا گیا جس کے بعد ''دمدمے'' الاٹ ہوئے۔میرے اور صاحبزادہ صاحب کے حصے میں میجر حمید احمد کلیم کا دمدمہ آیا جو قدرے کُھلا تھا۔رات زیادہ نہیں گزری تھی کہ فائرنگ شروع ہوگئی اور حضرت صاحبزادہ صاحب رائفل اُٹھا کر ''سکائی لائن'' کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے مجھے کہہ کر کہ ''آ جاؤ رائفل لے کر۔''

حضرت صاحبزادہ صاحب جس قدر صاحبِ علم و عرفان تھے اُسی قدر حوصلہ مند، بہادر اور شجاع بھی تھے۔تھوڑی دیر کے بعد لوٹے تو فرمایا: ''ہمارے مجاہدوں کے پاس دستی بم پرانے تھے۔ان میں سے دو ایک پھٹ گئے تو ریچھ (دشمن کی پہاڑی کا کوڈ نام) کی پٹرول پارٹی نے سمجھ لیا کہ آج بربط کی پٹرول پارٹی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔انہوں نے بھی فائر کھول دیا مگر جلد ہی غلط فہمی دُور ہوگئی۔''

......ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ فائرنگ دوبارہ شروع ہوگئی۔حضرت صاحبزادہ صاحب پھر رائفل اُٹھا کر ننگے پاؤں ہی بھاگ گئے۔

اگلے دن کوئی دوپہر تک مختلف کمپنیوں کا جائزہ لیتے رہے۔قلعہ باگسر کے مکین کپتان زنجانی نے کھانے کے لیے کہہ رکھا تھا۔وہاں پہنچے۔یہ بڑا ہی دشوار گزار راستہ تھا۔قلعہ کے باہر چھوٹے سے صحن میں ایک پچیس پونڈ کا توپ کا گولا پڑا تھا جس کا فیوز تو نکالا جا چکا تھا لیکن م۔ش اس کے باوجود اس پر بیٹھنے سے گریزاں رہے۔ان کا خیال تھا کہ جونہی میں بیٹھوں گا یہ چل پڑے گا اور میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔کھانا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ درختوں کے ساتھ تین ''ہاتو'' لٹک رہے ہیں۔''بھئی یہ کیا؟'' کپتان زنجانی نے بتایا کہ: ''ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کے دفاع کے لیے اس کوہستان میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں مگر یہ آٹھ دس آنے یومیہ پر ہماری مخبری

کرنے آتے ہیں۔ بس انہیں ان کے بعد آنے والوں کی تنبیہہ کے لیے لٹکایا ہوا ہے۔''

دو دن میدانِ جنگ میں رہنے کے بعد ہمارا دل بھی چٹکیاں لینے لگا۔ میں نے حضرت صاحبزادہ صاحب سے عرض کیا کہ ''اگر ناممکن نہ ہو تو جنگ کا کوئی منظر ہمیں بھی دکھایا جائے۔'' اس پر انہوں نے امام بربط، کرنل محمد حیات صاحب قیصرانی سے کہا جنہوں نے خاربین اور چمک (کوڈ نام) کی پہاڑیوں کے امام صاحبان کو فون کئے۔ ''آج ان کی مرغیوں کو تین تین انڈے دینے چاہئیں۔ پانچ انڈے ہماری مرغیاں دیں گی۔''

مولوی عصمت اللہ اور چودھری محمد اکبر صاحب بہت خوش تھے کہ آج سرخ دال کی بجائے انڈے کھانے کو ملیں گے۔ جب منصوبہ بندی طے ہوگئی تو میں ''او پی'' کے پاس آ بیٹھا۔ چودھری صاحبان پہاڑی پر لیٹ گئے۔ ہماری مارٹروں نے ''دو سموک بم'' پھینکے۔ اس کے بعد تین بم بھی جس کے بعد خاربین اور چمک نے بھی آغاز کیا کہ اتنے میں بڑی گونج کے ساتھ ایک دو سو پچاس پونڈ کا بم آ کر لیٹرینوں پر گرا جس سے وہ حصہ ہی اُڑ گیا۔ چودھری صاحبان لڑھکتے لڑھکتے نیچے جا گرے۔ جب نکلے تو کہنے لگے میری طرف دیکھ کر: ''انڈوں کی بجائے گولے...... اگر وہ بم ہمارے سروں پر آ کر گرتا تو؟''

کچھ عرصہ کے بعد جب سیز فائر ہوگیا تو بہ الفاظِ ثاقب زیروی ''ایک دن مجھے بطور خاص بلوا کر ہمارے آقا حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد...... نے حکم دیا کہ وہ فرقان فورس کے شہدا کی قبروں پر فاتحہ کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ اگر تمہارا کوئی صحافی دوست بھی ساتھ جانا چاہے تو دریافت کرلو۔ طے شدہ پروگرام کے تحت سفر میں قریباً تین دن تھے۔ میں نے یارانِ صحافت سے اپنے طور پر بات کی تو ان میں سے یہ لوگ شامل ہوئے:

م ش (پاکستان ٹائمز) پروفیسر سرور (ہفتہ وار آفاق) اور سردار فضلی (چیف رپورٹر احسان)۔ میں نے یارانِ صحافت کے لیے لورینگ سے اہتمام کے ساتھ ناشتہ تیار کرالیا تھا لیکن مجاہدوں کی سرخ دال دیکھی تو ان کی بھی رال ٹپک پڑی اور صحافیوں نے وہ دال کھانے ہی کو ترجیح دی۔ کھانے کے بعد نمازیں ہوئیں۔ ظہر عصر کی اور پھر فاتحہ خوانی کے بعد قافلہ واپسی کے لیے تیار تھا۔

مجھے، پروفیسر سرور اور سردار فضلی کو جیپ کی اگلی سیٹوں پر جگہ ملی اور م۔ش کو حضرت صاحب کی ڈاج میں۔ ابھی کوئی ایک دو میل کے قریب ہی یہ کوہستانی سفر طے ہوا ہوگا کہ ہماری جیپ جو سب سے آگے تھی ایک موڑ کاٹنے کی کوشش میں پہاڑی سے ٹکرا کر لڑھک گئی۔ میں نے بآوازِ بلند انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا مگر اللہ کا کرنا یہ ہوا پروفیسر سرور، سردار فضلی اور میں کھڈ میں گرنے کی بجائے Sappers and Miners کی بنائی ہوئی سڑک پر گرے اور لڑھکتے لڑھکتے ایک پتھر پر جا گرے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا ہم کھڈ کی بجائے ایک پتھر پر گرے ہیں اور ہمیں خراشوں کے سوا کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تو اپنے ساتھیوں سے اٹھنے کو کہا اور اٹھتے ہی اپنا اوورکوٹ لہرا لہرا کر ڈاج کو کسی متوقع خطرے سے آگاہ کرنا چاہا۔ ڈاج میری حرکتیں دیکھ کر رُک گئی۔ حضرت صاحب نے مجھ سے اوورکوٹ لہرانے کی وجہ دریافت کی اور پھر احتیاط سے اتر کر ڈاج کی سواریاں ہم تک پہنچیں۔ میں اس وقت اپنے ساتھیوں کی اچکنیں جھاڑ رہا تھا کہ میرے آقا ہمارے پاس آتے ہی میرا

اوورکوٹ جھاڑنے لگے جسے میں نے جلد ہی اتار پھینکا تو بڑے پیار سے آقا نے فرمایا: ''ثاقب! میرے تو تم بھی مہمان ہو۔ یہ تو خدائے بزرگ و برتر کا خاص فضل ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ جیپ ٹیڑھی کھڑی ہو جانے کی بجائے کھڈ میں گر جاتی اور تم اللہ کو پیارے ہو جاتے تو تمہارے والدین کو مجھ پر ذرا بھی شک نہ گزرتا۔ وہ سمجھتے کہ حادثہ ایسا ہی ہوا ہے لیکن اگر واقعی جیپ کھڈ میں گر جاتی اور تم سب ہلاک ہو جاتے تو اگلے دن کے اخبارات یہ سرخیاں لے کر طلوع ہوتے کہ مرزا محمود نے فلاں فلاں صحافیوں کو ساتھ لے جا کر کھڈ میں گرا کر ہلاک کر دیا۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں شکرانے کے نفل پڑھ کر آتا ہوں۔''

اتنے میں سَیپرز اینڈ مائنرز پہنچ گئے۔ انہوں نے ہماری خراشیں وغیرہ سہلا کر اُن پر ادویہ چھڑک دیں لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ اب میرے دوست اس حادثہ زدہ جیپ میں بیٹھنے کو تیار نہ تھے اور جیپ اِدھر اُدھر دو ایک دفعہ چلانے کے بعد واپسی کے لیے مستعد تھی۔ حضرت صاحب فوراً ہماری ہچکچاہٹ کی وجہ بھانپ گئے اور آپ نے بخوشی اپنی ڈاج ہمیں دے دی اور بقیہ سفر ہماری جیپ میں طے فرمایا اور ہم کوئی دن ڈھلے ''سُوکھا تالاب'' پر پاکستانی فوجیوں کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے۔ جب ہم گاڑیوں سے اُتر کر کیکر کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے سائے سائے جا رہے تھے تو کیکر کا ایک کانٹا چلتے چلتے حضور کی دائیں آنکھ کے بالائی پپوٹے کو اس طرح چیرتا ہوا گزر گیا کہ حضور کو اپنے شملے سے اس سرخ قطرے کو صاف کرنا پڑا۔ حضور نے جب اپنا خون شملے پر دیکھا تو فوراً ہماری طرف مڑ کر ہم سے یوں مخاطب ہوئے: ''دوستو! تمہیں اب مجھ پر کوئی فضیلت نہیں۔ اس سفر کے خون میں اب میرا خون بھی شامل ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تحریریں اسی زمانے کی ہیں جب ثاقب زیروی محاذِ جنگ اور بعد میں خطِ متارکہ پر گئے تھے جب کہ قریباً سترہ سال بعد انہوں نے ان ہی اسفار کو ذہن میں رکھتے ہوئے ''ناقابلِ فراموش'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون ادبی چاشنی میں پہلے دو مضامین سے زیادہ بہتر ہے اور اس میں سفر کی تفصیلات بھی کچھ زیادہ ہیں لہٰذا یہ مضمون بھی نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ ثاقب زیروی لکھتے ہیں: ''انسانی ذہن بھی ناقابلِ فراموش یادوں کا عجیب و غریب خزینہ ہے زمانے کی کوئی یورش جن کے گداز اور تاثر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتی۔ آج قلم اور فکر دونوں ایک ایسی ہی محبت آفریں یاد سے دوچار ہیں ساڑھے سترہ سال گزرنے پر بھی جس کی آب و تاب جوں کی توں لوحِ ذہن پر محفوظ و ثبت ہے۔ میرا خدا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اوائل مارچ ۱۹۴۹ء میں جن کی بابرکت معیّت میں ہم چند صحافیوں کو وہ جوان اور امنگوں بھرا ماحول دیکھنے کا بابرکت موقع میسر آیا جہاں قوم کے سجیلے جوان مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے ہتھیلیوں پر سر رکھے ہوئے چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ جمے بیٹھے تھے۔ شجاعت اور مردانگی کے ان پُتلوں کو دیکھتے ہی دل نے بآوازِ بلند کہا: انسان اور حیوان میں یہی ایک جذبہ تو امتیاز پیدا کرتا ہے۔ ایک حیوان کی محبت اپنے نفس، حد اپنے بچوں تک محدود رہتی ہے لیکن ایک متمدن انسان کی محبت اپنے سے بڑھ کر اپنی قوم اور اپنے وطن سے ہوتی ہے۔ وہ جس طرح دکھ درد میں اپنے لیے ہر قربانی کر گزرتا ہے بعینہٖ اسی

طرح جب اس کی قوم یا وطن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اپنی تمام آسائشوں اور راحتوں کو تج کر مادرِ وطن کی آواز پر لبیک کہتا ہوا مصائب کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس بابرکت سفر میں ہم نے دیکھنے والی آنکھوں سے ان شیروں کو دیکھ لیا جن کے دم قدم سے غریبوں کو استبدادی طاقتوں سے چھٹکارا اور مصائب سے نجات حاصل ہوئی۔ مسلسل تکالیف اور مظالم کے روندے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں مجبور و مقہور انسان پورے ایک سال ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد پھر اپنے آبائی گھروندوں کی سمت لوٹے اور اب خدا کے فضل سے اور ان مجاہدین کے زور بازو کی ضمانت پر کشمیر کے اس خطہ میں کھیتیاں پھر بوئی جا رہی تھیں، ہل چل رہے تھے، چولہوں میں آگ دہک رہی تھی اور بچے پورے ایک سال کی دربدری کے بعد پھر دامنِ کوہ میں مسرت و انبساط سے طرارے بھرنے لگے تھے۔

اخبار نویسوں کا یہ مختصر سا قافلہ جس میں راقم الحروف کے علاوہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر (میاں محمد شفیع)، روزنامہ احسان کے چیف رپورٹر (سردار فضلی) اور ہفت نامہ آفاق کے مدیر و مالک (پروفیسر سرور جامعی) شامل تھے اتوار کی صبح کو بھارتی اور ڈوگرہ فوجوں کے ہاتھوں بری طرح مسمار شدہ قصبہ بھمبر سے ہوتا ہوا جیپ کاروں کی سخت جانی اور تیز رفتاری کے طفیل سنگین بلندیوں کو ٹاپتا پھاندتا نوشہرہ کے جنوب میں ''بکسر'' کے اس مشہور قلعے کے قریب جا نکلا جس کی پیشانی پر احمد شاہ ابدالی کی سطوت کا لیبل چسپاں تھا اور جس کی مستحکم دیواروں سے ٹکرا کر دشمن کی دُور مار توپوں کو بیسیوں نہیں سینکڑوں دفعہ منہ کی کھانی پڑی تھی اور پھر اس کے قرب و جوار میں ایک جگہ سکائی لائن پر فرقان فورس کے مجاہدین کے دمدموں میں کھڑے ہو کر دشمن کے مورچوں کا جائزہ لیتے وقت مجاہدین کے امام (کمانڈر) نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں کہا: ''ہم سے پوچھئے گا تو یہ سچ مچ متارکے کا وقت نہ تھا۔ دشمن اپنی پوری طاقت صرف کرنے کے بعد حوصلہ ہار چکا تھا اور ہم نے ادھر ادھر سے اس پر جوابی یلغار بھی شروع کر دی تھی۔ آئندہ دس پندرہ دن میں ہمارے لیے اس کے قدم اکھاڑ دینا ہرگز مشکل نہ تھا۔ پھر خدا کے فضل سے نوشہرہ تک کا محاذ ہمارے ہاتھ میں ہوتا لیکن جناب ہم تو حکم کے بندے ہیں، ہمارے ذاتی عزائم اور ارادے کیا معنی؟ لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اگر کار پردازانِ ملت نے التوائے جنگ کے سمجھوتے پر صاد کر دیا ہے تو اب دشمن کی در پردہ سرگرمیوں پر ضرور نظر رکھی جائے مبادا ہماری غلط مروّت اور وعدہ ایفائی لٹیا ہی ڈبو کر رکھ دے اور پھر اس نے ایک ہاتھ میں دُوربین سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے ہمیں اشارے کرتے ہوئے کہا: ''دیکھئے یہ سامنے کی پہاڑی پر دُور جیپوں اور ٹرکوں کی آمد و رفت کا سلسلہ کس تیز رفتاری سے جاری ہے، سڑکیں بن رہی ہیں، تازہ دم فوجیں اُتر رہی ہیں اور جونہی ہم میں سے ہر ایک نے باری باری دُوربین کی وساطت سے اس طرف صرف ڈیڑھ دو میل دور پہاڑی پر نظر دوڑائی تو ہمارے مشاہدے نے امام بربط کے ہر لفظ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ ابھی اس دُور بینی اور دُور شناسی کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک دم ایک ایسے بھیانک دھماکے سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوا جیسے ہمارے بالکل پاس ہی کہیں پچیس پونڈ کا گولہ پھٹا ہو۔ ہم ذرا پریشان ہوئے تو امیر مجاہدین نے کہا: ''یہ توپ کے گولے کی آواز نہیں بلکہ ڈائنامائیٹ کے پھٹنے کی آواز ہے۔ دشمن اس کی مدد سے پہاڑوں کو

کاٹ کاٹ کر سڑک تعمیر کر رہا ہے۔'' اور پھر ہم جب تک وہاں رہے تیس تیس چالیس چالیس منٹ کے وقفوں کے بعد اسی طرح کے ارتعاش انگیز دھماکوں سے فضا دہلتی لرزتی رہی۔

رضا کار مجاہدین کی اس بٹالین میں ہر عمر کے جاں نثار دیکھنے میں آئے۔ بڑی عمر کے آزمودہ کار اور پختہ کار سپاہی بھی، کالجوں کے عشرت زدہ ماحول کے پلے ہوئے کھلنڈرے بھی اور ایسے خورد سالہ نوخیز بھی جو ابھی تک زندگی کی کشمکش سے پوری طرح دوچار بھی نہیں ہو پائے تھے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ امام جماعت کی آواز سنتے ہی کوئی کالج کی خوش آئند فضا پر میدانِ جنگ کو ترجیح دیتا ہوا چلا آیا ہے، کوئی والدین کا اکلوتا بیٹا ہے اور کسی کی شادی محض دولہا کی غیر حاضری کے باعث پورے ایک سال سے رُکی ہوئی ہے۔ پھر ان ہی میں سے ایک تیرہ چودہ سالہ دلیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بٹالین کے کمانڈر نے ہمیں بتایا کہ: ''یہ جس کا ہاتھ بمشکل ٹریگر تک پہنچتا ہے پورے دو ماہ سے مسلسل بصد اصرار دشمن کی پہاڑی کے اردگرد پٹرول کے لیے جاتا رہا ہے جب کہ دوسری طرف دشمن کی جواں ہمتی کا یہ حال ہے کہ اس کے سپاہیوں نے پٹرول پر آنا تو ایک طرف کبھی پہاڑی کے اس طرف جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔''

سب سے زیادہ دلچسپ اور جرأت آفریں بات (جس کا نقش آج بھی میرے ذہن کی تختی پر جُوں کا تُوں اُجاگر ہے) یہ تھی کہ کوئی مجاہد ہماری زبان سے اسلحہ گولہ بارود یا خوراک کے متعلق کوئی سوال نہ سُن سکتا تھا۔ ہم جب بھی لفظی آنکھ مچولی کی آڑ میں سوال کرتے یہی جواب ملتا: ''خوراک اگر نہ بھی ملے تو کیا ہے۔ یہ پتے، یہ گھاس اور یہ پھل کیا کم نعمتیں ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد نے بھی تو یہی کچھ کھا کر ساری دنیا پر قبضہ کیا تھا اور یہ تو آپ جانتے ہیں فتح کے لیے صرف گولہ بارود ہی کافی نہیں اس کے لیے دل چاہئے، گولوں سے بھی کھیل جانے والا دل، توپوں سے ٹکرا جانے والا حوصلہ!''

اور اس سے کہیں زیادہ ایمان افروز تھے وہ لمحات جب ہم ان کے ورزشی کرتب دیکھنے کے بعد ایک جماعت کی صورت میں پہاڑی کے دامن میں مدفون اُن جوانوں کی قبروں پر دعا کے لیے پہنچے جو مادرِ وطن کے لیے دادِ شجاعت دیتے ہوئے خدا کے حضور حاضر ہو گئے تھے۔ ہر مجاہد کی آنکھ بہہ رہی تھی۔ بعض کی تو فرطِ رقّت سے ہچکیاں بندھ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے یہ زندہ نقوش زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنے لیے دعا کرنے والے مجاہد بھائیوں سے کہہ رہے ہوں: ''دیکھو! ہم نے مر کر بھی اس سرزمین کو نہیں چھوڑا۔ تم جیتے جی دشمن کے قدم اس خطۂ پاک پر نہ آنے دینا ورنہ ہماری لاشوں کی بے حرمتی ہوگی اور تم جانتے ہو جو قوم خدا کی راہ میں جان دینے والوں کی لاشوں کی بے حرمتی برداشت کر لیتی ہے اس سے زندہ اور قائم رہنے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔''

اس مختصر سے قیام کے دوران میں جہاں فرقان فورس کے ان مجاہدین نے اپنی مردانہ شجاعت، قومی حمیّت اور وطن سے محبت کے عظیم نقوش ہمارے دلوں پر ثبت کئے وہاں ساتھ کے ساتھ ہمیں جنگی کرتبوں سے بھی روشناس کرایا اور روایتی مہمان داری کے معاملہ میں تو حد ہو گئی۔

واپسی پر جب ہماری جیپ ایک پہاڑی موڑ سے ٹکرا کر اُلٹ گئی (جس میں ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے ایک برگزیدہ بندے کی پُرسوز دعاؤں کی برکت سے شدید قسم کی ضربات سے محفوظ رہے) تو ان مجاہدوں نے اپنی محبت اور ہمدردی کے پھول ہم پر اس فراخدلی سے نچھاور کئے کہ ہمارے دل تڑپ تڑپ اٹھے۔ میں تو اسے بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور کرم ہی کہوں گا کہ جیپ کے اُلٹ جانے کا یہ حادثہ ہمیں اس مقام پر پیش آیا جہاں سے ''سفرمیاں'' کا کیمپ قریب تھا۔ وہ جیپ کو غلط کروٹ بدلتے دیکھتے ہی لپکے اور ہمیں ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاں لے گئے۔ ہمیں جھاڑا، پونچھا، زخموں پر ٹنکچر لگایا، پٹیاں باندھیں اور جوں جوں فرطِ تشکر سے ہماری نگاہیں جھکتی چلی گئیں ان کی محبت و دلداری بڑھتی چلی گئی۔ بے شک

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

اور اس تاریخی سفر کا یہ رُخ از حد خوشکن اور خوشگوار ہے کہ جاتے وقت اور برلب سے واپسی پر آزاد کشمیر کے علاقے کے عوام نے جب بھی ہمارے قافلے کو دیکھا ہمیشہ ہمارا ''پاکستان زندہ باد'' کے گرم جوش نعروں سے استقبال کیا۔